مجموعہ

پروفیسر احمد رفیق اختر

کشتِ زربار، پسِ حجاب، بست وکشاد، اُٹھتے ہیں حجاب آخر

پروفیسر احمد رفیق اختر

Marfat.com

102830
DATA ENTERED

مجموعہ

پروفیسر احمد رفیق اختر

(کشتِ زربار، پسِ حجاب، بست وکشاد، اُٹھتے ہیں حجاب آخر)

پروفیسر احمد رفیق اختر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

Marfat.com

297.4 Ahmad Rafiq Akhtar, Prof.
Majmuah Prof. Ahmad Rafiq Akhtar : Kisht-i Zarbar, Pas-i Hijab, Bast-o Kushad, Utathay Hain Hijab Akhar/ Prof. Ahmad Rafiq Akhtar.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2005.
599pp.
1. Islam - Sufism. I. Title.

69496

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2005
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1565-X

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

Marfat.com

فہرست

کشتِ زر بار

پیش لفظ 11

خطبہ اول — ترجیح اولیٰ 13

خطبہ دوم — علم اور اللہ 34

خطبہ سوم — خدا اور کائنات 44

خطبہ چہارم — حضرت محمد رسول اللہ ﷺ 61

خطبہ پنجم — نظریہ جمال پروردگار 74

خطبہ ششم — اسلام اور عصر حاضر 91

پسِ حجاب

آغاز کیسے ہوا؟ 101

کسی خاص مکتبۂ فکر سے تعلق 103

باطن میں جھانکنے کی صلاحیت 103

بھٹکنے سے بچ گئے 105

تحقیق و جستجو و اخلاص 105

تصوف کی مشکل لائن 108

مذہبی تعلیمات بمقابلہ تصوف 109

روحانیت کی طرف سفر 110

روحیت اور روحانیت 112

ذہنی اور روحانی سفر 113

تصوف اور سائنس میں ارتباط 113

مولوی اور صوفی کے مظاہر 116

بابے اور رومانٹسزم 118

ذکرِ الٰہی، صورت اور اہمیت 121

وظیفہ اور تسبیح میں فرق 122

تسبیحاتِ بلاناغہ ضروری 124

تسبیح کی رکاوٹیں 126

وظائف و اذکار پر نظر ثانی 127

میری تسبیحات کا انتخاب 129

علمِ باطن، خصوصی پراسس 133

علمِ نجوم، علم الاعداد، ٹیلی پیتھی 134

اوراد و وظائف، چلّہ کشی 136

مراقبے کا مقام 137

تصورِ شیخ کی حیثیت 138

فورسز بیانڈ کی تسخیر 139

اسمائے حسنہ کا موضوع 140

متعین اسمائے حسنہ ہی کیوں 141

یکساں نام نشاندہی کیونکر 143

اسمِ اعظم کی حقیقت 144

اسمِ اعظم کا تصرف 145

کیفیات بسلسلہ خدا 149

الجھنوں کے بھنور سے نجات 151

Marfat.com

عشق کی تعریف	152	**حضورؐ رحمت للعالمین**	180
محبت پر غفلت کا غلبہ	153	حضورؐ وجہِ تخلیقِ کائنات	182
وقت کیا ہے؟	154	احد اور احمد میں فرق	182
زمان ومکاں کی تخلیق	155	شرک اور اللہ کی حساسیت	185
چھ دنوں میں پیدائش	156	اپنی جان سے زیادہ محبت	186
زمانۂ آخرت میں	157	لامحدود سے ملاقات	187
جنت میں وقت	158	قصۂ نور وبشر	187
آخرت کے مختلف قوانین	159	خود اپنی ذات پر درود	188
عہدِ میثاق' اتمامِ حجت	161	**اقبال کا مکتبۂ فکر**	190
روح کا وجودِ لازوال	162	اعتدال کی احسن صورت	191
مسئلہ تناسخ یا آواگون	162	ذاتی اور پیغمبرانہ حیثیت	193
آدم کی اصل	163	آزادی میں حائل خدا	195
تخلیقِ آدم کا نظریہ	165	موسیقی سننے کی آزادی	197
آدم کی برتری علم	166	الیاس کے معانی	198
آدھ دن کا اضافہ	168	اعتدال' اسلام کو مطلوب	198
صورِ اسرافیل کے پراسس	169	صدقات' اہمیت واثرات	201
شمسی نظام کی قیامت	169	اسلام یا مقصدِ اسلام	205
باقی کائناتوں کی قیامت	170	**اطمینان بخش آئیڈیا**	207
یومِ حساب یکساں یا الگ	171	نجات کے لیے کلمہ	209
دوزخ میں جلنے کا عمل	171	بازیافتِ خدا بغیر علم	210
قیامِ جنت ودوزخ	172	نسبت کی اہمیت	213
"کل من علیها فان"	174	حقیقی راہنمائی کی طلب	214
غیب کا تصور	175	علم اور اہلِ علم	215
پیغمبروں کا علم غیب	175	گیارھویں کیوں منائیں؟	216
غیب کے باوجود اضطراب	177	بدعت کی تعریف	217
غیب جاننے کے طریقے	178	چار شادیوں کی اجازت	218
ناسٹرڈیمس کی پیشین گوئیاں	178	حسین بن منصور حلاج	219

Marfat.com

فطرت کی تعریف 221
علم کی انتہا حیرت 221
ماننے والوں میں فرق 222
قبر کی بھینچ 224
تلاشِ خدا سے لاتعلقی 224
دعا مانگنے سے احتراز 225
انسانی کیمسٹری میں فرق 226
غلام احمد پرویز کا تھیسز 228
جعلی نبوت اور کامن سینس 228
تعلیم سے آراستہ کون؟ 230
تعلیمی پالیسی کیسی ہو؟ 233
دینی تعلیم، نہج اور سطح 234
آزادی نصاب اور تعلیم 235
سکول آف ایکسی لینس 237
اسلامائزیشن آف نالج 240
تعلیم میں زبان کا کردار 242
قومی زبان کا کمپلیکس 243
قومی زبان اردو یا انگریزی 244
یورپ سے علم کی واپسی 246
مرض، علاج اور خدا 247
سائکاٹری اور روحانیت 248
علاج بذریعہ قرآنی آیات 249
طبِ نبوی کی حیثیت 250
میڈیسن، روحانیت سے انکار 250
کلینیکل ڈیتھ، سہل موت 253
میڈیسن سے زندگی کا اختتام 254
ازخود زندگی کا خاتمہ 254
برصغیر کی تقسیم نامناسب 256
پاکستان، راہِ فرار 257
پاکستان کا مسئلہ 258
پاکستان، تعمیر میں خرابی 260
پاکستان، ایک نیشن سٹیٹ 262
پاکستان میں اسلام 264
پاکستان کا مستقبل 265

بست و کشاد

خدا ترجیح اول 267
بنیادی سوسائٹی میں توحید 276
وحدت الوجود کی بحث 278
بازیافت خدا، ہندووانہ اپروچ 279
علم، حواس، ادراک خدا 280
خدا کے وجود کی دلیل 282
خدا ہے، نہیں ہے 283
خدا کی پہچان کیسے 287
قریب ترین راستہ 288
خدا کس دل میں 288
خدا تک رسائی کے ذرائع 289
خدا کی چاہت کا اسلوب 289
اللہ کا تمثیلی تعارف 291
اللہ شاہ رگ سے قریب 293
خدا یا مذہب کیوں ضروری 294
تشکیل الٰہیات جدید 296
اجتہاد اور تشکیل نو 307
اکیسویں صدی کا مذہب 308

Marfat.com

اجتہاد بغیر علم اور مسلمان	309	میلادالنبیؐ کی مخالفت	375
حدیث، ثبوت قرآن	310	واقعۂ معراج کی حقیقت	379
اندھا عقیدہ اور عقل و شعور	311	حضورؐ پر جادو	382
مسلمان فلسفے یا فقہ تک محدود	312	**اسلام اور عورت**	385
مسئلۂ جبر و قدر	313	میاں بیوی اور والدین	391
جبر و قدر اور تقدیر	328	نکاح و طلاق، سوشل کنٹریکٹ	392
لاانتہا امکانات کا سیٹ	330	عائلی زندگی کا حسن اور توازن	392
نظر سے تقدیر میں رد و بدل	333	عورتوں اور مردوں کا کردار	393
مرضی کس حد تک آزاد	334	تعدد ازدواج کا مسئلہ	394
مقدر، توکل، دعا	334	حجاب اور بے حجابی	396
گمراہی، ذمہ دار، ذمہ داری	336	پالش والے ناخنوں کا وضو	397
قسمت اور تقدیر یکساں	336	جنت میں بیوی مثل حور	397
جبر اور جزا و سزا	337	**مستقبل، قرآن و حدیث کی روشنی میں**	399
عقل اور خدا کی مرضی	338	اسلام کی قبائلی تعبیر	415
جبر، اختیار اور بے اختیاری	339	ملا عمر کا خواب اور افغانستان	417
عمرؓ کے لیے دعا کی قبولیت	343	ملا عمر، جواب در جواب	418
مقام وسیلہ	344	اسامہ، افغانستان، امریکہ	419
وسیلہ کی تعریف	357	دو مسلمان فریقوں میں جہاد	419
وسیلے کے لیے جدوجہد	357	رسولؐ کا خواب اور حنیف مذہب	420
وسیلے کی حد اور شرک	358	دجال اور مہدی کا وقت	420
اولیاءاللہ: وسیلہ کس طرح	359	دجال کا ساتھ دینے والے	422
محمدؐ، احمدؐ اور مقام محمود	360	یہود و ہنود کا وقت آخر	422
شفاعت سے محروم کون	361	چینی تہذیب کا رول	424
شناخت منزل	363	ظہور مہدی اور انڈیا	424
استاد، طریقۂ تعلیم، ظرف	372	امریکہ اور مغرب کا کردار	426
حضورؐ کی تعریف اور پیغام	373	پاکستان بمقابلہ ہندو اسرائیل	426
یوم مسرت و انبساط	373	غزوۂ ہند کی حدیث	427
حضورؐ کا دیدار	374	پاکستان اور بنگلہ دیش	427

Marfat.com

اُٹھتے ہیں حجاب آخر

زمان ومکاں اور انسان 429
وقت کے مختلف تصورات 430
کائنات کی تخلیق 430
چھ دن یا کن فیکون 433
سائنس اور قیامت 433
میٹافزکس پر اعتراض 433
کائنات میں حسن 436
کائنات اور داخلی بدی 436
کائناتوں تک رسائی 436
معراج، سائنسی توجیہ 439
شہاب ثاقب اور سائنس 440
خدا کی دید کا امکان 441
قصۂ ابلیس وآدم 442
ارضی وسماوی آدم 442
مختلف رنگ اور نسلیں 444
امانت کی بحث 444
انسان' ظالم اور جاہل 444
خدا اور مردانِ کار 446
فرشتوں کا کردار 447
معین وقت میں کمی بیشی 448
علم نجوم اور علم ہیئت 449
ماورائی قوتیں' پیشین گوئی 450
شفاعت اور قانونِ عدل 452
نجات کی کم سے کم شرط 452
حور وقصور اور شراب طہور 453
جنت دوزخ' ذہنی کیفیت 454
جنت زمین پر ممکن 456
نفس اور روح 457
نفس کی درغلاہٹیں 457
جسے روح کہتے ہیں 459
روح' پراسس' مراحل 459
روح کی واپسی 460
انسانی جسم اور روح 460
گوتم بدھ کی روشنی 462
دانیال کے بارے میں 462
ہندو اور تبدیلی مذہب 463
آلِ ابراہیم اور یہودی 464
مدر ٹریسا کے لیے صلہ 465
مدر ٹریسا کا انجام 466
کافر بچے کا انجام 466
جستجو وآرزوئے خدا 468
تعقل' دلیل' شناختِ خدا 469
تعلق باللہ اور ترقی 471
اللہ کا دائمی ساتھ 472
پلٹنے کی اہمیت 476
آزمائش کی پہچان 477
عذاب اور آزمائش 478
علم بطور انسٹرومنٹ 479
علم' دعوی' دجال 481
تعقل اور متضاد رستے 481
تساہل' حادثہ' بیداری 482
طوفان اور رسول اللہؐ 482
پیار' محبت اور عشق 483
اسلام' پرپیچ رستہ 484

Marfat.com

اسلام' دینِ فطرت 485
علماء کرام کی تفرقہ بازی 486
مذہبی جماعت کی تشکیل 487
تنظیم سازی کی ضرورت 487
انقلاب بغیر رضامندیٔ خدا 488
مذہب کا استحصال 489
تشخیص کے ساتھ علاج 494
اسلام میں تصوف 495
Mystic or Mystique 495
تصوف کی مزید وضاحت 496
تصوف شریعت سے متصادم 498
شریعت یا طریقت 499
رہبانیت اور مناقب تصوف 500
تصوف اور انتقال پذیری 501
وحدت الوجود اور تصوف 503
اولیاء اللہ میں درجات 505
مناصب کی تلاش 506
خواتین' ولیہ کاملہ 508
پیر کی حقیقت اور شناخت 508
پیر کی بیعت ضروری 509
مرشد کی بیعت اور فیض 510
مردِ مومن اور تبدیلیٔ تقدیر 510
مجذوب اور عالم غیب 511
مجذوب اور علماء حقانی 512
حال پڑنے کی حقیقت 512
نماز اور اللہ کا ذکر 514
اطمینانِ قلب کی تلاش 516
ذکر اللہ کی فوقیت 518
مصیبت اور اطمینانِ قلب 519
ذکر' تسبیح' اہمیت 522
ذکر اور ذاتی جائزہ 522
تسبیح' اسلوب' اثر 523
تسبیح اور احساس گناہ 523
تعویذ گنڈے اور احادیث 525
Occult پر ردعمل 528
ذکر میں ارتکاز 529
تسبیح میں اونگھ کیوں 529
وظائف' حصولِ دنیا 529
حروفِ مقطعات کے اشکال 530
حروفِ مقطعات کا علم 531
کلوننگ کی سائنسی تشریح 534
میکڈوگل کو جواب 535
عرب کلچر کا انتخاب 535
تخلیق کار پر اعتراض 536
سورہ بقرہ کی آیات 537
دانشگاہ' مذہب و سائنس 537
رجوع کس سے 539
زندگی میں تشنگی 540
دعا سے متعلق تصورات 540
قبولیتِ دعا کا فلسفہ 541
عاجزی کے لیے دعا 541
کافر رشتہ دار اور دعا 541
کثرتِ عبادت' کثرتِ مسائل 543
حسنِ اخلاق اور منافقت 544
خواب' تعبیر' اہمیت 545
دلوں پر مہر کیسے 546

Marfat.com

مومن ہونے کا ٹائٹل	547
صبر کیا ہے	549
فطرت کے بارے میں	549
فطرت کے خلاف کام	550
انسان کے حیوانی مدارج	550
تقسیم انسانیت اور مذہب	551
سود عصرِ حاضر میں	552
سود اور ذریعۂ معاش	554
صدقات کا نظام	555
مہارتوں کا حصول	556
رزقِ حلال کا جہاد	556
ہر سسٹم کا متبادل سسٹم	557
حلال و حرام گڈ مڈ	558
قرآن کی تلاوت یا مطالعہ	559
دنیاوی یا قرآنی علم	560
قرآن اور زبان عربی	561
فقہا اور فقہی مسائل	562
استخارے کا پراسس	564
نفاق' نماز' شیطان	564
علم ذریعہ گمراہی	566
انسانی کلوننگ اور اسلام	567
توہینِ رسالت کا قانون	568
ظہار قرآن میں	569
ادائیگی زکوٰۃ اور ریا	569
صلۂ رحمی کے احکام	570
یسئلونک عن الخمر والمیسر	571
منصوبہ بندی اور عزل	572
نماز قطبین پر	573
کافر کے ساتھ تجارت	574
قبروں پر سنگ مرمر	574
ایصال ثواب اور اعزہ	575
عورت' قبرستان' ہیجڑہ	577
دل اور مصنوعی دل	577
میڈیا یلغار میں چوائس	578
میڈیا' بچے اور مستقبل	579
ڈش کہاں تک خطرناک	579
موسیقی سننے کی اجازت	581
موسیقی' شاعری' قوالی	581
پتھروں کا استعمال	582
تصویر اور مجسمہ سازی	582
حضورؐ کی شبیہ	583
اسبابِ زوالِ امت	584
خدا کا قانون اور مسلمان	588
اپنے آپ سے دوری	589
نظاموں میں فرق	591
دہشت گرد' بنیاد پرست	591
دہشت گردی اور مسلمان	593
اسامہ اور خودکش حملے	595
خودکش حملے' شرعی حیثیت	596
جہاد کے چند اصول	596
کشمیر اور جہاد	597
شہید کی اقسام	597
قتال اور صحابہ	598
مسلمانانِ برصغیر' نسل خاص	599
سب سے پہلے پاکستان	600
پاکستان' آئندہ ہدف	600

Marfat.com

Marfat.com

کشت زر بار

پیش لفظ

علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا ہونے والا وہ عظیم عطیہ ہے، جس کا کوئی بدل نہیں اور جب علم کو عرفانِ پروردگار کی منزل سے آشنا کر کے علمِ لاہوتی بنا دیا جائے تو یہ معراج انسانیت کے حصول کی موثر اور نتیجہ خیز سبیل قرار پاتا ہے۔ اسلام دنیا کی تمام تہذیبوں، مذاہب اور نظام ہائے زندگی میں اس لحاظ سے امتیازی مقام کا حامل ہے کہ اس کا نقطہ آغاز علم ہی ہے۔ ''کشت زر بار'' میں پروفیسر احمد رفیق اختر کی علم اور مقصودِ علم پر گفتگو اپنی معنویت اور ندرت کے حوالے سے بے مثال ہے۔ یہاں لفظ خود بولتے اور معانی لب کھولتے محسوس ہوتے ہیں۔ قرآنیات کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر وہ فکری تازگی جو ذہن جدید کی تشفی کا سامان ثابت ہو، خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پروفیسر صاحب کے ہاں عصری افکار اور مسائل کے تناظر میں قرآنی حقائق کا بیان جدا رنگ رکھتا ہے۔ ''خدا اور کائنات'' میں تسخیر کائنات کے حوالے سے جدید سائنس کی تحقیقات کا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تجزیہ قرآنی حقائق و معارف کے نئے پہلوؤں کے بیان کے ساتھ ہمارے ایمانی، اعتقادی اور علمی سرمائے پر یقین افروزی کا سامان بھی ہے۔ اسی طرح ''اسلام اور عصر حاضر'' میں جس طرح پروفیسر صاحب نے اسلام کے امتداد زمانہ کے اثرات سے وراء ہونے اور ہر دور میں دین مکمل ہونے کو بیان کیا ہے، اس سے مغرب کی مرعوبیت کے تار ہائے عنکبوت شکستگی سے دوچار ہوتے نظر آتے ہیں۔

خداشناسی، جس کے تصور کو پروفیسر صاحب نے ''ترجیح اولیٰ'' میں واضح کیا ہے، کائنات کے کامل و اکمل خداشناس حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور سے طلب ہدایت کے بغیر ممکن نہیں۔ آپ ﷺ کی عظمت، رب کائنات کے حضور آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ اور کائنات ارض و سماء میں آپؐ کے پیکر جمال کی عدیم المثلیت کو پروفیسر صاحب نے ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' اور ''نظریہ جمال پروردگار'' میں بیان کیا ہے جو قارئین کے قلوب

میں عشق ومحبت رسولؐ کے شعلہ ہائے جوالہ پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ یہی جذبہ عشق ومستی اور تعلق نبویؐ فلاح ابدی کا ضامن اور روح دین وایمان ہے:

بمصطفیؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است!

''کشت زر بار'' اہل علم اور اصحاب ذوق کے لیے بیش بہا سرمایہ کی امین ہے، جس کی تاثیر ہمارے علمی وفکری ورثے میں عرصے تک محسوس کی جاتی رہے گی۔

طاہر حمید تنولی
۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ
۱۳ دسمبر ۱۹۹۹ء
لاہور

خطبہ اول

ترجیحِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا O (۱۷:۸۰)(بنی اسرائیل)

مذہبی فکر اپنی منزل سے کس طرح ہٹی اور اس میں فکری و عملی لحاظ سے کس طرح انحطاط آیا' میں اسے ایک ایسے وقت سے شروع کر رہا ہوں جب سلطان سلیمان ذیشان کی افواج یورپ کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ یوگوسلاویہ' البانیہ اور بوسنیا ترک شہسواروں کی تگ وتاز کی زد میں تھے۔ اتنا بڑا بادشاہ کہ تاریخ میں آج بھی اسے سلطان سلیمان ذیشان (The Magnificent) کے نام سے جانا جاتا ہے اور ادھر ایک ایشیا کو چک میں نہیں' وہ یورپ کے دروازوں پر بھی دستک دے رہے تھے۔ مزید یہ کہ اس زمانے میں پندرہویں اور سولہویں صدی میں' دوسری طرف بھی اگر دنیا میں کسی شہنشاہ کا سکہ چلتا تھا تو وہ مسلمان ہی تھے۔ سلطان عباس صفوی جسے عباس اعظم بھی کہا جاتا تھا' ہندوستان میں جلال الدین محمد اکبر' جسے اکبر اعظم کہا جاتا تھا' ایک ایسے زمانے میں جبکہ قوت وشوکت اور سطوت اسلامیہ اپنے انتہا درجے پر تھی کہ دنیا میں اگر تین بڑے بادشاہ تھے تو تینوں مسلمان تھے۔ عین اس وقت پورے یورپ پر ایک ایسا زمانہ تھا جسے متفق علیہ دور تاریک (Dark Age) کہتے تھے۔ بحیرۂ روم (Mediterranean) کو ترکوں نے بند کیا ہوا تھا۔ دنیا میں ترقی اور کاروبار کا واحد راستہ بحیرۂ روم تھا جو امیر خیر الدین باربروسا کی زد میں تھا۔ اس کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ جب اس وقت یورپ کی مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی تھیں تو وہ کہتی تھیں:

"Hush the Turks are coming!"

''بچو' خاموش ہو جاؤ ورنہ ترک آ جائیں گے۔''

جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو ایک بہت بڑی تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ مذہبی فکر میں بنیادی انحطاط کا آغاز فتح سے ہی ہوا۔ جب فتح ونصرت کے علم بلند ہوئے اور مسلمانوں نے بہت زیادہ معاشرتی' اخلاقی اور عملی عروج حاصل کیا تو انہوں نے مملکت اسلامیہ کو بہت دور تک پہنچا دیا۔ اس فتح کے ساتھ ہی مسلمانوں پر تکبرات کی دبیز تہہ کی چادر چھا گئی اور وہ قومی رویوں میں غیر محتاط ہو گئے۔ اگرچہ فتح بڑی اچھی چیز ہے' مگر فتح کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ

Marfat.com

انسان اس کی پائیداری کے احساس میں اس کے تحفظ کے سلسلے میں Relax ہو جاتا ہے اور تفاخرات میں ڈوب جاتا ہے۔ یہی المیہ ہندوستان میں ہوا' اسی طرح ایران اور سلطنت عثمانیہ اس المیے سے گذرے۔

قطعی طور پر مسلمانوں کے انحطاط کا آغاز سلطنت عثمانیہ کے زوال سے شروع ہوا' مگر یہ زوال ہتھیاروں سے نہیں ہوا۔ فتح قسطنطنیہ کے وقت اہل یورپ کا یہ حال تھا کہ جب کسی کے سر میں درد ہوتا تو وہ کسی پادری کے پاس جاتا اور پادری اسے بتاتا کہ اس کے سر میں شیطان گھس گیا ہے اور پھر اس شیطانی دخل اندازی کا واحد علاج یہ ہوتا تھا کہ اس کے سر پر بڑے بڑے ڈنڈے مارے جاتے اور اس طرح مرض کا باعث شیطان مریض کے ساتھ ہی مر جاتا اور سر درد رہنے کی گنجائش بھی ختم ہو جاتی۔ اس وقت عیسائیت کی تبلیغ کرنے والے پادری عوام میں سندنجات (Certificate of Redemption) بھی تقسیم کیا کرتے تھے اور لوگوں کو کہا جاتا تھا کہ اگر تم نے جنت میں جانا ہے تو پانچ پاؤنڈ اور اگر درجات جنت میں بلندی چاہیے تو دس پاؤنڈ اور اگر اعلیٰ ترین جنت میں جانا ہے تو بیس پاؤنڈ ادا کریں۔ اس نوعیت کے سرٹیفکیٹ پادری جاری کرتے تھے۔ اس کے بالمقابل آج اس جدید زمانے میں بھی پاکستان میں ایک مولوی صاحب نے اپنے ایک شاگرد سے کہا کہ اگر آپ کھل کر فلاں جماعت کو چندہ دیں تو آپ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو وہ برخوردار اسی طرح پریشان حال مجھ تک آ گیا۔ اس نے کہا" پروفیسر صاحب! یہ بات میں نے سنی ہے کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟" میں نے اسے کہا کہ" کاغذ اور پنسل لے جاؤ اور اس مولوی صاحب سے کہو کہ آپ جنت کی تصدیق لکھ دیں" مگر اس مولوی صاحب سے یہ نہ ہو سکا!

احساس فتح کا ایک ناقص ترین نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں علم کی طلب' ذوق' تحقیق اور علم کی جستجو ختم ہو گئی۔ یہ ایک عمومی اطمینان کی کیفیت تھی جو عالم اسلام پر چھا گئی۔ جہاں ابن سینا' حجتہ الاسلام امام محمد بن احمد الغزالی اور ابن رشد جیسے محقق پیدا ہوتے تھے' وہاں اب علم و تعلیم اتنے خسارے میں چلی گئی کہ ایک طویل عرصے تک عالم اسلام میں فلسفہ' علم' سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہمیں کوئی نمایاں فرد نظر نہیں آتا۔ یہ ایک بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ فتح نے ایک عمومی ذہنی تبدیلی پیدا کر دی۔ تفاخرات میں ڈوب کر ملت اسلامیہ اس بنیادی عنصر فتح سے محروم ہو گئی جسے ہم علم و جستجو کہتے ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال تحصیل علم اور تحقیق و جستجو سے مرتب ہوتے ہیں۔ جب عالم اسلام سے علم رخصت ہونا شروع ہوا تو علم یہاں سے منتقل بھی ہونے لگا۔ عین اس وقت علم کی رو فارابی و ابن رشد یعنی قرطبہ سے لندن یونیورسٹی تک آ گئی۔ کیمبرج اور آکسفورڈ تک آ گئی۔ یورپ میں نئی تخلیقات نے جنم لیا جنہیں ہم نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور تحریک اصلاح (Reformation) کہتے ہیں۔ تحریک احیائے مذہب اور تحریک احیائے علوم شروع ہوئی' یعنی ہم نے علم کو کھونا اور مغرب نے علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ تحریک احیائے علوم کے بڑے بڑے سکالرز نے جو کچھ بھی پیش کیا وہ مسلمانوں سے ہی لیا ہوا تھا۔ آج بھی ماڈرن سائیکالوجی کے بانی کی کتابیں پڑھیں تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوتا ہے کہ اس نے غزالی کی کتابیں اپنے نام سے شائع کر دی ہیں۔ ڈیکارٹ (Descartes 1596-1650ء) نے اپنی کتب میں یہ سب کچھ سوچے بغیر شامل کر دیا کہ کسی اور کے کام کو میں اپنے نام کے ساتھ منسوب کر رہا ہوں۔ اس طرح اس دور زوال کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ ملت اسلامیہ زوال پذیر ہوتی گئی' مگر ان کی علمی جرأتوں اور افکار کی تازگی نے اہل مغرب کو ترقی کی

طرف گامزن کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں سے ان کی عسکری، سیاسی اور علمی و تحقیقی حاکمیت چھن گئی۔ یورپ کی آگاہی نے اسے تینوں سے آگے بڑھاتے ہوئے مسلمانوں کو پس پشت ڈال دیا اور جہاں جہاں بھی متقابل صورت حال پیش آئی۔ سیاسی، ادبی یا فلسفیانہ تحقیق میں مسلمان مغربی تحقیقات کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہ تھے اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ اس دوران کوئی بڑا صوفی استاد پیدا نہیں ہوا۔ اسلام میں بقاء کی بڑی صورت جو رہی، یہ تھی کہ اسلام میں بڑی خطرناک صورت حال پیش آئی تو کوئی بڑا صوفی استاد آیا اور اس نے موجودہ صورت حال کو بدل دیا، اس طرح از سرِ نو پورے اسلام کی ہی سادگی اور عظمت برقرار رہی۔ اس نے امت مسلمہ پر اپنے ذہنی اور اخلاقی اثرات چھوڑے۔ جب سپین میں مسلمانوں کی حکومت تباہی کے کنارے پہنچ گئی تو غزالی کے شاگرد الیعقوب المومن نے المواحدین کی تحریک کا آغاز کیا اور دو سو سال کے لیے سپین میں پھر اسلام قائم ہو گیا۔ المواحدین کے بعد المرابطین جو یوسف بن تاشفین کی تحریک تھی، ان دونوں نے اس علمی منبع سے حیات پائی اور ایک نئی تازگی مذہبی ماحول نے بخشی اور وہ اس قابل بنے کہ اسلام کو شکست کے بحران سے نکال لیں۔ جب بغداد میں خلفاء مکمل تباہی اور اضمحلال کا شکار ہو گئے تو قدرت نے بغداد ہی سے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو پیدا کیا اور ان کی وجہ سے انحطاط زمانہ رکا۔ جب مسلمان اپنی حقیقی روح مذہب کی طرف واپس لوٹے تو انہوں نے اس زوال کو دو سو سال تک تھامے رکھا۔ ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی جہاں فتوحات کی ایک بارات لے کر آیا، وہاں وہ علم کی بھی ایک سوغات لے کر آیا اور یہ سیدنا علی بن عثمان ہجویریؒ تھے جن کے وجودِ مسعود نے علمِ معرفت کی ایک ایسی شمع روشن کی جسے بعد میں چشتیہ اصحاب نے اٹھایا۔ محبتوں سے، اخلاق سے، نرمی سے اور مروت و حسن عالم گیر سے اور اس وقت سے لے کر ایک طویل سلسلہ اللہ کے دین کی طرف عامتہ الناس کے رجوع کا شروع ہوا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ ہوں یا خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، خواجہ بختیار الدینؒ ہوں یا خواجہ چراغ دہلویؒ، ان لوگوں نے محبت کے ایسے سوتے جاری رکھے کہ اہل کفر اور اہل شرک خدا کی واحدنیت کی طرف مائل ہوئے، تاہم بھگتی تحریک نے اس پر بند باندھنے کی کوشش کی۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی اسلام پہنچا اور جہاں جہاں بھی یہ اللہ کے بندے پہنچے، یہ خالی عالم دین نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ان کی مذہبی جہتوں کے ساتھ ان کے اخلاقی رتبے چلتے تھے۔ ان کی اعلیٰ ترین ذہنی صلاحیت تھی۔ یہ پورے مذہب کو بار بار اس مرکزی نقطے پر لاتے رہے جو ہمارا مرکز بحث ہے۔ تمام صوفیا کا ایک رویہ رہا۔ ادھر انحطاط ملت اسلامیہ میں ان کا ایک رول رہا کہ عالموں کی طرح انہوں نے صرف اعمال کی تبدیلی پر ہی زور نہیں دیا بلکہ اعمال کی نیت درست کرنے کے لیے ایک ذہنی جدوجہد کی، کیونکہ نیت کے بغیر عمل صرف قول و فعل ہے اور قول و فعل کی ہم آہنگی بھی منافقانہ ہو سکتی ہے۔

تصوف میں، صوفی میں، مومن میں، عدل میں، متقی میں اور اللہ کے نیک بندوں میں اور عام علماء میں صرف ایک فرق تھا کہ جہاں اچھے عالم قول و فکر کے تضاد کو ختم کرنے پر زور دیتے تھے وہاں اہل خدا قول و فکر اور فعل تینوں کے تضاد کو ختم کرنے پر زور دیتے تھے، یہ ایک حتمی یقینی تعلیم تھی جو صوفیا نے، ان مومنین کے گروہ نے دی کہ تمام افعال مذہب کی بجائے خدا کے لیے ہونے چاہئیں۔ رستے میں گم ہونے کی بجائے منزل کی طرف بڑھنا چاہیے۔ مذہب چلنے کا راستہ ہے اور منزل صرف اللہ ہے۔

شعلہ درگیر زد بر خس و خاشاک من!
مرشد رومی کہ گفت ''منزل ما کبریا است''

(اقبال)

اور جب آپ اپنی حتمی منزل کو پہلے متعین نہیں کریں گے' بہت بڑی غلطی کا پوری امت شکار رہے گی اور یہ غلطی ہے اختلاط ترجیحات (Confusion of Priorities) کی۔ جب تک ہم اس بنیادی سوال کو حل نہیں کرتے کہ ہماری ایمان واسلام میں ترجیحِ اول کیا ہے' اس وقت تک ہمیں خدا نہیں مل سکتا۔ چاہے ساری عمر طلب خداوندی میں گذار دی جائے مگر پروردگار کسی بھی صورت میں ''ترجیح اول'' سے نیچے اترنے کو تیار نہیں ہے۔ یہ ایک سنت اللہ ہے اور اس پر کوئی مصالحت ممکن نہیں۔ وہ ایک اعلیٰ ترین اور مکمل ترجیح ہے۔ وہ تعلیقات کے نیچے اپنے مقام سے گریزاں ہے' جس دن کوئی مسلمان اسے ذہنا ترجیح اول قرار دیتا ہے تو خدا اس کی ہمسائیگی میں اترتا ہے۔ وہ کبھی بندے سے دور نہیں ہوتا' مگر کیا عجیب بات ہے کہ جس مذہب کے چرچے ہم صبح وشام کرتے ہیں' جس مذہب کے قصیدے صبح وشام اخباروں میں' رسائل میں' کتابوں میں پڑھتے ہیں' جس کو ہم خدا کا دین کہتے ہیں جس کو ہم خدا کا واحد معتبر مذہب قرار دیتے ہیں' وہ ہمیں ایک خداشناس نہیں دے رہا۔ یہ ہمارا اجتماعی الیہ ہے۔ شاید ہم سے کہیں Approach میں غلطی ہوگئی ہے۔ اگر تمام مذہب اسلام مل کر بھی ہمیں ایک خداشناس نہیں دے رہا' ایک عبدالقادر جیلانیؒ نہیں بخش رہا' ایک علی بن عثمان ہجویریؒ نہیں بخش رہا تو دورِ حاضر میں ضرور کوئی غلطی ہو چکی ہے۔ کیوں ہم اپنی صحت خیال کو حتمی سمجھ رہے ہیں۔ ہم اس پر کیوں نہیں سوچتے کہ کیا وجہ ہے کہ ہمیں خدا نہیں مل رہا۔ وہ خدا جو کہتا ہے کہ وہ ہماری رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔

ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (۱۶:۵۰) ق

ترجمہ: اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

وہ لوگ کون ہیں جنہیں پروردگار رگ جان سے بھی زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔ رکاوٹ کیا ہے؟

پروردگار نے فرمایا:

زین للناس حب الشھوت من النساء و البنین و القناطیر المقنطرة من الذھب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث' ذلک متاع الحیوة الدنیا واللہ عندہ حسن المآب O (۱۴:۳) الِ عمران)

ترجمہ: لوگوں کے لیے عورتوں' بیٹوں' سونے چاندی کے ڈھیروں' نشان کیے گئے گھوڑوں' مویشیوں اور کھیتوں کی محبت خوشنما بنادی گئی ہے۔ یہ تو دنیا کا (عارضی) نفع ہے اور اللہ ہی کے پاس اعلیٰ اور اچھی تر منزل ہے۔''

یعنی عورتیں' بیویاں' بچے' گاڑیاں' گھوڑے منصب یہ سارے کے سارے اللہ نے حضرت انسان کے خیالات کو ان شھوات سے زینت دینے کا سبب بنادیئے کہ تلاش حق میں اس کی خالصیت سامنے آسکے۔ اگر اس نے اللہ پر اس کی مخلوق کو ہی ترجیح دینی ہے تو اللہ ان کو نہیں مل سکتا۔ اگر انہوں نے اپنی بہترین صلاحیت عقل اور وقت مخلوق کو دینا ہے تو خالق تک رسائی ناممکن ہے۔ آج سے 70 سال قبل علامہ اقبال نے ایک بہت بڑے مسئلہ کی نشاندہی کی۔ جب یورپ اپنی

Marfat.com

جدید ترین ٹیکنالوجی کے ساتھ ہمارے سامنے آیا تو مسلمانوں میں دو Attitudes پیدا ہوئے۔ وہ دونوں مسلمانوں کے لیے صحت مند نہ تھے۔ ایک تقلید مغرب کا اور دوسرا تردید مغرب کا۔ جنہوں نے مغرب کی تردید کی انہوں نے علم کی شناخت کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ بالکل نہ سوچا کہ آج یورپ جس سوغات علم پر قائم ہے وہ ہمارے آباؤ اجداد کا ہی ورثہ ہے۔ وہ اس حدیث کو بھول گئے کہ حکمت مومن کی میراث ہے جہاں سے بھی اس کا ذرہ ملے اٹھالو۔ انہوں نے بنیاد پرستانہ رویہ (Fundamentalist Attitude) اختیار کیا جس کا مطلب ہے علم اور علمی تحقیق کو قبول نہ کرنا اور غور وخوض کی روش کو ترک کر دینا۔ یہ رویہ دراصل یورپ سے شروع ہوا۔ سپین کی انکوزیشن سے شروع ہوا جب وہاں مذہبی پابندیوں کا نفاذ ہوا اور ازابیلا کی حکومت کے بعد جب مسلمانوں کو سپین سے ملک بدر کرنا تھا تو Inquisition بیٹھی اور اس نے صرف دو Choices دیئے:

Christianity or Expatriation

یا تو عیسائیت قبول کر و یا ملک چھوڑ دو۔ یہ فیصلہ اس وقت دیا گیا جب ایک متجسس فکری روح، گلیلیو نے کائنات پر غور کرتے ہوئے کوپرنیکس کی مخالفت میں ایک اصول کائنات دریافت کیا لیکن اس فیصلہ کے خوف سے اس نے معافی نامہ پر دستخط کر دیئے کہ میں اپنے خیالات سے باز آیا۔ اگرچہ علمی طور پر وہ صحیح تھا۔ ہم جدید Cosmology کا بانی گلیلیو کو قرار دیتے ہیں۔ یعنی بنیاد پرستانہ رویہ مغرب سے شروع ہوا مگر آج یہ عالم اسلام میں جاری وساری ہے۔ جب پہلی مرتبہ لاؤڈ سپیکر آیا تو علماء اسلام نے اس پر شیطان ہونے کا فتوٰی دے دیا۔ جب علماء دیوبند سے آلہ مکبر الصوت کے جواز سے متعلق فتوٰی طلب کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ ناجائز ہے اور ثبوت کے طور پر قرآن حکیم کی آیت پیش کی گئی کہ جب حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی تعریف کرتے تھے تو بیچ میں لات ومنات کے الفاظ آئے تو اہل کفر نے کہا آج ہمارا محمد ﷺ سے جھگڑا ختم ہو گیا۔ آج تو وہ بھی لات ومنات کی بات کر رہے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا صدمہ ہوا کہ اللہ تعالٰی نے اس پر قرآن حکیم کی یہ آیت اتاری کہ اے پیغمبرؐ! تم سے پہلے پیغمبروں سے بھی یہ المیہ ہوا کہ جب وہ کچھ بولتے تھے تو شیطان اس میں کچھ ملا دیتا تھا۔ تو اس آیت کو بنیاد بنا کر فتوٰی جاری کر دیا گیا کہ چونکہ لاؤڈ سپیکر ایک جگہ ہوتا ہے اور آواز دوسری جگہ آتی ہے تو بیچ میں شیطان آکر کچھ ملا دیتا ہے۔

ایک چیز ہوتی ہے جسے Cult کہتے ہیں۔ بت پرستی کہتے ہیں۔ بت پرستی جسمانی طور پر کم ہوتی ہے اور ذہنی طور پر زیادہ۔ عقل جہاں رکتی ہے۔ ایک بت پیدا ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ تعصبات کا بت ہو چاہے وہ محبت کا بت ہو عقل جہاں آئے گی وہاں ایک Cult ایک مندر سا بن جاتا ہے اور انسان اپنی صحت خیال کا اس قدر قائل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی نرگسیت (Narcissism) میں لذت وجود خیال میں ڈوب کر اپنے آپ کو مکمل سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جن کے نزدیک ایک عقل کا بنیادی وظیفہ خدا تک پہنچنا ہے۔ علم وحکمت کی بنیادی اساس قرب خداوندی کو سمجھتا ہے جو اپنے شوق کی منزل پروردگار عالم کو قرار دیتا ہے اور جو اس علیم وحکیم رب کی قربت کی سعی کے لیے دن رات سراپا عمل رہتا ہے۔ یہ اہل تصوف کا قاعدہ ہے۔

جب زمانے میں بہت بڑا بحران پیدا ہوا۔ Scepticism کے تحت بہت بڑے شکوک وشبہات پیدا ہونے

Marfat.com

شروع ہو گئے۔ یونانی فلسفہ نے ہماری مبادیات کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس وقت بھی بنیاد پرستی (Fundamentalism) کے حامی علماء جواب دینے کے قابل نہیں تھے۔ تحقیق و جستجو کے میدان میں اس وقت بھی ایک ایسا گروہ اٹھا' جس نے اعلیٰ ترین تحصیل علم کی' یونانی فلاسفی اور رومن افکار بھی سیکھے۔ انہوں نے غور و فکر سے علوم اسلامیہ کو نئی جہت بخشی اور ہر زمانے میں خدا کے وجود پر حجت و دلیل کو قائم کیا۔ خود پروردگار نے فرمایا:

لیہلک من ہلک عن بینۃ ویحییٰ من حی عن بینۃ (۴۲:۸) (الانفال)

ترجمہ: تاکہ جو بھی ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو بھی زندہ رہے وہ دلیل سے زندہ رہے۔

کیسی عجب بات ہے کہ خدا یہ کہہ رہا ہے کہ جو ہلاک ہوا وہ دلیل سے ہلاک ہوا اور جو زندہ ہوا وہ بھی دلیل سے زندہ ہوا اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اندھا اعتقاد ہی سب کچھ ہے۔ اگر ہم جستجوئے پروردگار کی راہ میں اپنے اخلاص کو جذباتی تعلق کے بغیر اور غور و فکر و تجسس کے ساتھ دیکھیں تو ہم اسے اتنی اہمیت بھی نہیں دیتے جتنی ایف اے' بی اے کے امتحان کو دیتے ہیں۔ ہم نے بغیر غور و فکر کے ایک سوغات سنبھالی ہوئی ہے' جو پچھلی نسلوں سے چلی آ رہی ہے۔ خدا اہل کفر کو ایک طعنہ دیتا ہے کہ تم اگر اپنے آباؤاجداد کے دین پر قائم نہ ہوتے اور تھوڑا سا غور و فکر کرتے تو مجھے ضرور پہچان لیتے۔ کیا یہی بات ہمارے اوپر صادق نہیں آتی؟ آپ اللہ کو بے انصاف سمجھتے ہیں کہ جو طعنہ کافر کو دیتا ہے آپ کو نہ دے گا؟ تم جو اندھا دھند پیچھے سے آئی ہوئی بات کو قبول کر کے اندھے اعتقاد کو زندگی کی معراج بنا بیٹھے ہو' کیا یہ خدا کے ساتھ انصاف ہے؟ اس نے تو عقل و شعور کا صرف ایک مقصد بتایا ہے۔ عقل و شعور کا اساسی مقصد اپنے ذاتی مسائل کا حل' حکومتیں چلانا یا دوسرے دنیاوی کاروبار ی نہیں بلکہ یہ کہ تمہیں عقل و شعور عطا کر دیئے گئے ہیں۔ اب چاہو تو مجھے مانو چاہو تو نہ مانو:

وقل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفر (۲۹:۱۸) (الکھف)

ترجمہ: اور کہہ دیجیے' کہ جو اللہ کی طرف سے ہے جو چاہے وہ ایمان لائے اور جو چاہے انکار کرے۔

یہ عقل و شعور تو معاملات زندگی میں ہمیں پرکھ کے آلے (Instruments of Judgement) کے طور پر عطا کیا گیا تھا۔ یوم میثاق جب سوال کیا گیا تو ہمارا جواب بھی اسی حقیقت کا غماز تھا:

الست بربکم' قالوا بلیٰ شھدنا (۱۷۲:۷) (الاعراف)

ترجمہ: (جب اللہ نے سوال کیا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا کیوں نہیں ہم نے اس کی گواہی دی۔

یعنی جانتے پہچانتے تو انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جلوہ یزداں سامنے تھا۔ کسی نے سید ہجویرؒ سے پوچھا کہ خدا ظاہر کیوں نہیں ہو گیا؟ کہ ایمان اور بے ایمانی کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا۔ تو جناب شیخ نے فرمایا اگر خدا ظاہر ہو جاتا تو خدا کا اقرار اور ایمان جبر ہو جاتا' مگر ایمان جبر نہیں ہے۔ تمام عقل و شعور کی عطائیگی کا واحد مقصد اس ترجیح اولیٰ کی پہچان اور اس کا صحیح یقین ہے۔ جب خدا مسلمان کی ترجیح اولیٰ (Top Priority) نہ رہا تو انحطاط کا آغاز ہوا' کیونکہ حصول پروردگار کی کوئی خواہش امت مسلمہ میں نہیں رہی۔ یا وہ سکالرز جنہیں ہم صوفیاء کہتے ہیں' وہ علماء جو جنید بغدادی کی صورت میں تھے' علی بن عثمان ہجویری کی صورت میں تھے' ان کے کمال علمی کا یہ عالم ہے کہ انسان کی تفہیم (Understanding) میں انہوں نے جو جو بات کہی آج تک یورپ کا کوئی سائیکالوجسٹ یا فلاسفر یا فرائیڈین سکول کا کوئی مدبر اس تک پہنچ نہیں سکا جس

کو علم نفس کے باب میں صوفیا، (Mystics) واضح کر گئے۔

مگر تصوف کے ساتھ بھی بڑی زیادتی ہوئی۔ کسی نے کہا کہ یونانی فلسفہ کا اثر ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ خانقاہی نظام ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ انسان کے ذہن کی اسیری ہے۔ کسی نے کہا کہ گئے گذرے ادوار کا بقیہ ہے' حالانکہ دراصل طریقت شریعت کی نیت ہے' جب تمام شرعی اعمال بغیر نیت حصول خداوند کے لیے کیے جائیں وہ شرع ہے' جب اعمال رضا و محبت خداوند کے لیے کیے جائیں تو وہ طریقت ہے۔ اس لیے جب امام بخاریؒ نے احادیث کو مرتب کیا' اس کے پس منظر کو بیان کیا تو ساتھ ایک بات ابتدائیہ میں کہی کہ میں باب ایمان میں سب سے پہلے حدیث نیت (انما الاعمال بالنیات) کو لایا ہوں' کیونکہ تمام اعمال فلاسفی آف ایکٹ کے بغیر بے کار محض ہیں کہ جب تک آپ کا موقف واضح نہیں عمل کی حیثیت غیر متعین رہے گی۔

یہ وہ وقت ہے کہ یورپ کے چڑھتے ہوئے فشار علمی کی وجہ سے' ابلاغ کی وجہ سے' اور اتنی زیادہ مسحور کن ایجادات کی وجہ سے آج مذہبی موضوع پر اور حصول رضائے خداوند کے موضوع پر گفتگو کتنی مشکل ہو چکی ہے۔ بقول اکبر:

رقیبوں نے یہ رپٹ جا کر لکھوائی تھانے میں
اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!

آج فائیو سٹار ہوٹلز کے کلچر میں خدا کی بات کرنا عجیب لگتا ہے! کیونکہ ہمارے علمی انحطاط کا یہ عالم ہے کہ خدا کا ماحول جدید ماحول سے جدا ہے اور ہمارا تصور خدا دور وسطی سے آگے نکلا ہی نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر اور قرآن کا ابلاغ دور وسطی سے آگے نہیں آیا۔ کوئی تفسیر اٹھا کر دیکھ لیں رازی ہو یا ابن کثیر یا دیگر مفسرین یہی حقیقت ہر جگہ نظر آئے گی۔ میں جدید مفکرین کی بات نہیں کر رہا جبکہ علمی استدلال بعض اوقات اتنے ناقص ہوتے ہیں کہ وہ خدا اور رسول ﷺ پر جو رائے دیتے ہیں وہ ان کی اپنی احمقانہ سند بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک حدیث کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ حضور گرامی مرتبت ﷺ نے فرمایا اے ابوذر! کیا تمہیں پتہ ہے کہ سورج کہاں جاتا ہے؟ فرمایا' اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ ارشاد ہوا سورج عالم بالا پر عرش بریں پر جاتا ہے پھر اسے کہا جاتا ہے تو لوٹ جا' تو پھر یہ پلٹتا ہے۔ پھر ایک دن اسے کہا جائے گا کہ تم نے پلٹنا نہیں ہے۔ اس جانب سے طلوع ہونا ہے۔ اس پر غلام جیلانی برق نے اعتراض کیا' غلام احمد پرویز نے اعتراض کیا کہ یہ حدیث خلاف واقعہ ہے کہ سورج تو کہیں نہیں جاتا یہ تو اپنی Elliptical Movement میں گردش کرتا رہتا ہے! مگر انہوں نے اس پر صبر نہیں کیا کہ اگر کوئی چیز سمجھ نہیں آتی تو نقطہ علم کی تلاش کی خاطر رک جائیں۔ اپنی رائے کو Cult اور بت پرستی نہ بنائیں' کیونکہ انسان سوچتا ہے کہ اس کا علم ہی حرف آخر ہے۔ اگر وہ جلدی نہ کرتے تو وہ آج کے اس سائنسی انکشاف کو دیکھ لیتے کہ سورج مع اپنی Constellation کے بالا عرش تک جاتا ہے تو وہ مذکورہ حدیث مبارکہ پر معترض نہ ہوتے۔ اس طرح زیادہ تر جو ہمارے علماء اس دور میں پیدا ہوئے وہ بجائے علمی فکر میں اضافے کے مزید انحطاط کا باعث بنے کہ ہر آدمی کو قرب یزداں میں آگہی میسر نہ تھی۔ وہ اخلاص میسر نہ تھا' جس سے اللہ کا قرب چاہا جانا تھا اور جب انہوں نے ارد گرد بھی وہ لوگ نہ پائے جو علم و معرفت کی انتہا پر بھی ہوتے اور قلبی علوم اور انکشافات ذات کی بھی انتہا پر ہوتے تو انہوں نے ایک چیز فرض کر لی کہ تصوف یا یہ درجہ ایقان مفقود ہے اور

Marfat.com

تمام کا تمام زور عملیات پر چلا گیا' اس طرح عملیاتی (Pragmatist) مسلمان پیدا ہوئے جو حد درجہ نماز روزہ کی پابندی کے تو قائل تھے مگر انہیں اس کے سوا کچھ نصیب نہ ہوا۔ اس خیال سے کہ امت مسلمہ کے انحطاط کا سبب اعمال میں کمی ہے۔ اس کی آرگنائزیشن میں پڑ گئے۔ انہوں نے بہترین کوشش کی کہ انجمنیں بنا کر دین کو آرگنائز کریں۔ مگر پچھلے ستر سال سے ایک بھی ایسی آرگنائزیشن نہیں جس نے کوئی مؤثر کام کیا ہو' مگر دس دس' پندرہ پندرہ سال میں تو صوفیائے اساتذہ نے چاہے وہ غزالی تھے' علی بن عثمان ہجویریؒ تھے یا عبدالقادر جیلانی تھے' انہوں نے پوری کائنات اسلام بدل دی۔ مگر دوسری طرف جن لوگوں نے ستر سال عملیت کی آرگنائزیشن تعمیر کی' وہ امت مسلمہ کے انحطاط کو نہ روک سکے۔ یہ انحطاط اس لیے جاری رہا کہ یاد دین کا کبھی بھی مقصد نہیں رہا۔ دین کا واحد مقصد خدا طلبی اور خدا رسیدگی ہے۔ جب لوگوں کے دلوں سے آرزو و طلب و جستجوئے پروردگار اٹھ جائے تو تمام دین بالکل اس طرح ہے جیسے عیسائیت کے رسوم و اطوار۔ تمام دین اپنے اپنے ایک ضابطے اور اصول پر قائم ہیں۔ ہم کسی دین کو اس لیے برا نہیں کہتے کہ گو وہ دین نہیں مگر ایک نظام ضرور ہیں۔ وہ تبت کا لاما ہو یا صیہونیت کا فری میسنری یا افریقہ کے شامان ہوں۔ اگرچہ یہ بھی مذاہب ہیں مگر اسلام ان سب سے جدا اور امتیازی شان کا حامل ہے۔ اگر سارے مذاہب کا مقصد جیسا کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا ہے تو ان کی راہ کو اپنانا مؤثر کیوں نہیں؟

میں کیوں عیسائیت یا یہودیت قبول نہیں کرتا؟

میں بدھ مت کا پیروکار کیوں نہیں بن جاتا؟

میں ہیانا (Hiyana) یا ماہایانہ (Mahayana) آرڈر کو کیوں اختیار نہیں کر لیتا؟

دنیا میں بڑے بڑے افکار اور فلسفے موجود ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان کا تفکر و خیال بنیادی طور پر خدا کی طرف جاتا ہے مگر عملاً وہ خدا طلبی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسلام ہر اس اہل دل کی مجبوری ہے جو اللہ کا طالب ہے۔ اگر کسی اور مذہب سے بھی خدا ملتا ہو تو اسلام ضروری نہیں رہتا' جس کو خدا چاہیے اسے ہر صورت میں مسلمان ہونا پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ چاہے آج ایک ارب مسلمان عملاً خدا تک نہیں پہنچ پا رہے' مگر جسے خدا کی طلب ہے اسے ہر قیمت پر اسلام قبول کرنا پڑے گا۔

تبت کا لاما پچیس برس کی ریاضت کے بعد مسلمان ہو گیا۔ بھگدیشو آرڈر اس کی نگرانی کرتا تھا۔ جب اسے کہا گیا کہ اس نے اپنا مذہب کیوں تبدیل کیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھے تسکین قلبی اور خدا کی طلب ہے جو پچیس سال تک لاما ہونے کے باوجود میں حاصل نہیں کر سکا۔ اس لیے میں مسلمان ہو گیا۔ اسے کہا گیا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو' دراصل بطور لاما تمہاری توانائیاں ختم ہو گئی ہیں' اس لیے اب تم نے اسلام قبول کیا ہے۔ جب اس جھگڑے نے طول پکڑا تو ہانگ کانگ میں ایک بہت بڑا مناظرہ ترتیب دیا گیا جس میں اس لاما کو چیلنج کیا گیا۔ ریکارڈنگ کے لیے بہت سارے کیمرے اور ٹیلی ویژن بھی نصب کیے گئے۔ اس سے وہاں پوچھا گیا کہ تم نے اسلام قبول کر کے بغاوت کیوں کی؟ اور لاما کے آرڈر کو کیوں ترک کیا؟ تو اس نے کہا بھائیو! میں نے تمہیں پہلے بھی کہا کہ میں پچیس سال تک لاما رہا ہوں' میں نے انتہائی گہری ریاضت کی ہے' مگر اس آرڈر سے مجھے امن اور خدا نہیں ملا۔ اس لیے میں نے اسلام قبول کیا اور ان

Marfat.com

دونوں کو پالیا۔ جب اسے کہا گیا کہ تم اپنی طاقت کھو چکے ہو تو اس نے بڑے لامے سے کہا کہ سٹیج پر آجاؤ اور میری طاقت کو آزما لو۔ جب وہ سٹیج پر آیا تو اس نے کہا اگر تم طاقتور ہو تو یہاں سے نیچے چھلانگ لگا دو۔ جب بڑا لاما سٹیج سے اترنے لگا تو ایک سناٹا چھا گیا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو بڑے لامے کا آدھا پاؤں بالکل ساکت ہو گیا اور وہ بالکل بت کی طرح لٹک گیا۔ وہاں پر تقریباً ساری دنیا کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر ہاتھ سیدھا کیا تو وہ نیچے گر گیا۔ اس پر اسلام قبول کرنے والے لامے نے کہا، بہنو اور بھائیو! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میری طاقتیں ہرگز ختم نہیں ہوئیں، مگر 25 سال تک لاما بننے کے باوجود مجھے امن اور خدا نہیں ملا اور سکون و خدا کو پانے کا واحد راستہ اسلام ہے۔ سو میں نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ نعمت ہم میں موجود ہے، مگر ہم اس نعمت کو ضائع کر رہے ہیں۔ ہم اپنے غور و فکر کو معطل کر کے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری ہو کر جب ہم خدا کو مکمل طور پر نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں تو ہم اللہ کی اس عظیم نعمت کی توہین کر رہے ہوتے ہیں۔

جب اصحاب رسول ﷺ میں سے ایک نے گندی سڑی ہوئی کھجوریں مسجد نبوی پر لٹکائیں۔ رسم یہ تھی کہ جس کا کچھ زیادہ ہوتا وہ خوراک مسجد نبوی پر رکھ دیتا اور وہ اصحاب جو رزق و اسباب کی سبیل نہیں رکھتے تھے وہ وہاں سے اٹھا لیتے تھے۔ ایک صحابی نے جب کچھ گلی سڑی کھجوریں وہاں رکھ دیں تو پروردگار عالم کو اتنا غصہ آیا کہ فرمایا کہ اگر تم اپنی بہترین چیز مجھ کو نہیں دے سکے تو بدترین نہ دو، درمیانی دے دو۔ مقام فکر ہے کہ اگر ہم اپنے اللہ کو بہترین عمر نہیں دے سکے تو کم از کم بدترین عمر تو نہ دیں۔ جب سماعت نہ رہی، جب بصارت نہ رہی، جب زندگی کے تمام لذات ترک ہو گئے اور اس مجبوری میں جب دنیا نے ہم کو ریٹائر کر دیا، بہترین صلاحیتیں ہم نے دنیا کو دے دیں اور پھر دنیا نے ہمیں ایک دن کہا کہ اب اسے ینگ بلڈ کی ضرورت ہے۔ اب آپ گھر جائیے، اللہ اللہ کیجیے، آپ ریٹائر ہوئے۔ جب یہ نوبت آئے کہ اب کوئی راستہ نہیں رہا، اس بڑھاپے میں اس نوبت کی عمر میں جسے پروردگار ارذل عمر کہتا ہے ہم پروردگار کی طرف لوٹتے ہیں:

ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئاً (۱۶:۷۰)، (۲۲:۵)(الحج)

ترجمہ: اور تم میں سے کچھ وہ ہیں جو عمر کے بڑے دور کی طرف لائے جاتے ہیں، یہ علم کے بعد بھی انہیں کچھ علم نہیں رہتا۔

اس سے بڑا تضاد اور کیا ہوگا کہ جو بہترین صلاحیتوں کا وقت تھا، جب ہمیں پروردگار عالم کے لیے خلوص و محبت سے جدوجہد کرنی چاہیے تھی، تب ہم نے طاقت، تمام قوت، تمام شعور ایک چھوٹے مقصد کو دے دیا اور جب ہم بے کار محض ہو گئے، جب ہماری زندگی میں Protracted Cells کے سوا کچھ نہیں رہا، جب دنیا نے ہمیں اپنے پاس سے فارغ کر دیا، اب ہم چلے ہیں، کائنات کے خالق کی تحقیق کے لیے! یہ علمی فکر کے بنیادی انحطاط کے باعث ہے کہ ہم نے خدا کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا، حالانکہ خدا زندگی میں ترجیح اول سے نیچے آنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ اعمال میں نہیں ذہن میں ہے۔ یہ آپ کے تجسس فکری کا نچوڑ ہونا چاہیے اور یہ بات بھی یاد رکھ لیجیے کہ تمام علمیت اور تمام ذہنی فکر کا صرف ایک فطری نتیجہ ہے اور وہ اللہ ہے۔ اگر آپ غور و فکر کے باوجود تخلیق اور جستجو کے باوجود آپ اللہ تک نہیں پہنچ سکے تو واپس مڑ کر دیکھیے کہ آپ کا علم کہاں غلط ہے؟ آپ کی فکر کہاں غلط ہے؟ یہ ایک قدرتی انجام ہے کہ غور و فکر اللہ کے سوا کہیں اور نہیں پہنچتا۔ وگرنہ علم کا

Marfat.com

ارتقاء رک جائے گا۔ کوئی علم رسل پر آ کر رک جائے گا تو کوئی Wittgenstein پر اور کوئی سگمنڈ فرائیڈ پر آ کر رک جائے گا۔ یہ علم تو بڑا مختصر ہے' جسے آ کر تھوڑا سا بھی وقف دیا جائے تو ختم کیا جا سکتا ہے۔ چند بڑے نام' چند بڑی تحریریں' کوانٹم کی تھیوری' نظریۂ اضافیت' Gestalt کا سکول اور Behaviourism اس کے علاوہ علم جدید کیا ہے؟ یہ علم اتنا زیادہ نہیں۔ مدتیں گذریں انسان نے تحقیق و جستجو میں اتنی تیزی سے ترقی نہیں کی۔ آئن سٹائن نے اضافیت کا قانون دیا اور یہ تصور دیا کہ $E=mc^2$ یعنی توانائی اور مادے کو باہم دگر تبدیل کیا جا سکتا ہے' مگر آج تک اس کا دوسرا قانون ثابت نہیں ہو سکا۔ یعنی علم و تحقیق کی رفتار اتنی سست ہے کہ آئن سٹائن نے جو بات برسوں پہلے کہی تھی وہ آج جا کر Fusion کی صورت میں سامنے آئی۔ انسانی ترقی کتنی محدود ہے اور کتنی سست رفتار ہے اس کا اندازہ ان ترقیوں سے کر لیں جو انسان کر رہا ہے۔

ایک بڑا کام جو علامہ اقبال نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' میں انجام دیا' وہ مذہب کا دفاع ہے۔ اس میں بھی انہوں نے اس بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آج کے مسلم فکر میں بنیادی نقص یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مغرب سے کمتر سمجھنے کے احساس میں مبتلا ہے۔ ہم میں اتنی خود اعتمادی نہیں کہ آج بھی ہم میں سے بہترین لوگ بھی یورپ کے فکر سے مرعوب ہیں۔ آج بھی ہم اپنی عقل و ہدایت کے شعور کے لیے یورپ کی طرف دیکھتے ہیں۔ ایک طرف جو مولوی صاحب ہیں وہ اس حقیقت کو بالکل ماننے ہی سے انکاری ہیں اور دوسری طرف جو سیکولر ہیں' ان کا خدا اور رسول ہی یورپی فکر ہے۔ وہ اللہ اور رسول کو اسی فکر سے مرتب کرتا ہے جس کو اس نے یورپی فلسفہ کی روشنی میں حاصل کیا اور ان دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ ایک جہالت کی ابتداء اور انتہا پر ہے' ایک تقلید اور مغلوبیت کی انتہا پر۔ اور کسی کو بھی آزاد فکر مسلم نہیں کہا جا سکتا۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا
(اقبالؒ)

غلام سے لذت قرآن مت حاصل کرو چاہے حافظ قرآن ہی کیوں نہ ہو' جس ذہن پر کسی بھی مغلوبیت کا گمان ہو' مگر ناظرہ قرآن سے آگے جانے کی ہماری نوبت نہیں آتی' کیونکہ ہمارا عالم اس سے آگے کچھ دے ہی نہیں سکتا۔

آج علمی فکر میں انحطاط کیسے نہ آئے کہ قرآن حکیم کے معیار پر مسلمان پہنچ نہیں رہا۔ اللہ میں انحطاط نہیں آیا۔ اس نے تو اپنی ہدایت کا Package مکمل کر دیا ہے۔ وہ دن اس نے بتا دیا ہے کہ اے انسان تو نے اس منزل تک آنا ہے کہ سورج لپیٹ دیا جائے گا' چاند مدھم پڑ جائے گا اور ستارے بجھ جائیں گے اور ہم سورج اور چاند کو دوبارہ جمع کر دیں گے۔ بگ بینگ ختم ہو جائے گا۔ ساری کائنات تباہ ہو جائے گی۔ اے انسان تیرا یہ انجام ہے! مقام فکر ہے کہ وہ خدا جو آپ کا انجام متعین کر چکا ہے' جو آخرت کا وقت متعین کر چکا ہے' کیا اس سے بعید ہو گا کہ اس کے درمیان میں انسانی ذہن کے Intellectual Process سے آگاہ نہیں۔ جو عرصہ حیات کو متعین کر چکا ہو' جو انجام دین کو مکمل کر چکا ہو' کیسا بے خبر انسان ہے جو جدید ہو کر بھی یہ سمجھتا ہے کہ میرے Intellectual Process کی خدا کو کوئی خبر نہیں۔ میں جب جدید سائنسی انکشافات پر بحث کر رہا ہوں' جب میں جینیاتی انجینئرنگ کے جدید قوانین پر گفتگو کر رہا ہوں تو یہ خیال کہ شاید خدا آج کے ان جدید افکار کو نہ سمجھے گا۔ یہ آج کے انسان کی بنیادی غلطی ہے جس میں وہ مبتلا ہے۔ اس کے

69176

Marfat.com

نزدیک خدا کا خیال یہودیت کے خدا کا ہے۔ یہودیت کا تصور ہے۔ وہ اسلام کے خیال کو بھی یہودی تصور خدا کے طور پر لے رہا ہے۔ اسے قطعاً اس بات کا علم نہیں کہ خدا تو بہت دور کی بات ہے وہ جن گلیکسیز کا شہنشاہ ہے' ان میں سے ایک گلیکسی کو سمجھنے میں ابھی تک انسانوں کو اس کی مدت کا اور اس کے فاصلے کا تعین نہیں ہو سکا۔

ایک معمولی ترین گلیکسی کی حد ابھی حضرت انسان کو پتہ نہیں لگی۔ ایک حیرت انگیز انکشاف ہبل ٹیلی اسکوپ نے کیا کہ آج سے 11.5 بلین سال قبل جو دھما کہ ہوا اور جس میں ستارے ٹکرائے تھے' اس کی روشنی اب ہبل ٹیلی اسکوپ تک پہنچی ہے۔ انہوں نے کہا کہ جس گلیکسی میں ہم رہ رہے ہیں' یہ پندرہ ارب سال کی ہے۔ اگر ہم زیادہ مؤثر اور مضبوط ٹیلی اسکوپ بنالیں تو ہم ابتدائے کائنات کو دیکھ سکتے ہیں۔ تخلیق و جستجو کی جو دنیا ہمارے اردگرد آباد ہو رہی ہے۔ یہ قرآن کو غلط ثابت نہیں کر رہی۔ بارہویں' تیرہویں صدی میں کسی نے ابن رشد سے پوچھا کہ عاد و ثمود کون تھے؟ اور ان کا حشر کیا ہوا؟ ابن رشد اپنے زمانے کا سب سے بڑا افلاسفر تھا۔ وہ کسی تحقیق کے بغیر کسی چیز کو تسلیم کرنے سے عاری تھا۔ اس نے کہا عاد و ثمود کون تھے؟ تم مجھ سے ان کے حشر کی بات کرتے ہو' میں تو ان کے وجود تک سے ناواقف ہوں۔ یہ رویہ تھا' کہ محقق بغیر تحقیق کے قرآنی آیت کو تسلیم نہیں کر رہا۔ یہ تو اب اردن میں Preserves نکلے۔ ان لوگوں نے جنہوں نے پہاڑوں کے اندر گھر بنائے تھے' مگر یہ آثار علما نے نہیں ماہرین آثار قدیمہ (Archaeologists) نے دریافت کیے ہیں' یعنی جن حقائق کا تذکرہ قرآن کرتا ہے' جدید تحقیقات ان کا ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

اسی لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ تمام زمانوں کے علوم میں اس امت کا حصہ ہے۔ اگر آپ جدید علوم کی آگاہی حاصل نہ کریں گے تو آپ کی تحقیق و جستجو ناکافی رہ جائے گی۔ دو آیات میں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ آپ ان پر غور کیجیے اور یہ دیکھ کر بتائیے کہ کیا یہ آیات کسی طور پر بھی آپ کو سمجھ میں آسکی ہیں:

كيف تكفرون بالله و كنتم امواتا فاحيا كم ثم يميتكم ثم يحييكم ثم اليه ترجعون (۲۸:۲)

ترجمہ: تم اللہ کا انکار کس طرح کر سکتے ہو' حالانکہ تم مردہ تھے' اس نے تمہیں زندہ کیا' پھر تمہیں موت دے گا پھر زندہ کرے گا' پھر تم اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

یہاں ایک چیلنج کے انداز میں کہا جا رہا ہے کہ تم میرا انکار کس طرح کر سکتے ہو' اس کے لیے تمہارے پاس کوئی Authority نہیں ہے۔ دوسری طرف فرمایا:

اولم یرالذین کفروا ان السموات و الارض کانتا رتقا ففتقنهما (۲۱:۳۰)(الانبیآء)

ترجمہ: کیا کفر کرنے والے نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین اکٹھے تھے۔ پھر ہم نے انہیں پھاڑ کر علیحدہ کر دیا۔

یہ دونوں آیات آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک علم ہیئت پر نظر نہ ہو۔ جب تک آپ کو بیالوجی کے علم کی جدید تحقیقات کی آگاہی نہ ہو۔ زمین کے وجود میں آنے سے متعلق مختلف سائنس تھیسز ہیں اور ہر تھیسز ایک بات ہی بیان کرتا ہے کہ شروع میں زمین و آسمان ایک ہی تھے۔ پھر ایک بڑا دھما کہ ہوا اور زمین آسمان سے الگ ہو گئی۔ اسی طرح سورج اور دوسرے ستارے بھی۔ زندگی کے بارے میں کبھی کہا گیا کہ ہوا سے پیدا ہوئی' کبھی آگ سے کہا گیا' کبھی اس کی ابتداء کو Spontaneous کہا گیا یعنی سائنس ایک مفروضہ قائم کرتی ہے۔ اسے قانون کی شکل دیتی ہے۔ اسے قانون کی

Marfat.com

شکل ایک تجربہ و مشاہدہ کی مسلسل جدوجہد کے بعد قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی کسی مفروضے کے قانون بننے کا مطلب یہ ہے کہ مدتوں کی تحقیق اور جستجو کے بعد ہم نے سائنس میں ایک باب فائنل کر دیا ہے۔ وہ قانون آج سائنس نے یہ فائنل کیا ہے کہ تمام زندگی پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ قرآن اسے نقل نہیں کرتا بلکہ صدیوں پہلے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

وجعلنا من الماء کل شیء حی (۳۰:۲۱)(الانبیآء)

ترجمہ: اور ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا ہے۔

اگر آپ نے قرآن کو سمجھنا ہے تو قرآن سے پہلے جو علوم گذرے ہیں ان کی آگاہی بڑی ضروری ہے۔ یونان کا بطلیموس (Ptolemy) جس نے کہا زمین کھڑی ہے اور ستارے اس کے گرد گردش کر رہے ہیں' یہ نظریہ 1500ء تک کم و بیش جاری رہا۔ اس کے بعد کوپرنیکس نے کہا کہ بطلیموس غلط تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سورج کھڑا ہے اور باقی ستارے اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ مگر جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ بالکل الگ بات کی:

والشمس تجری لمستقرلها ذلک تقدیر العزیز العلیم (۳۸:۳٦)(یٰسٓ)

ترجمہ: اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چل رہا ہے اور یہ اندازہ ہے غلبے والے' جاننے والے رب کا۔

وکل فی فلک یسبحون (۴۰:۳٦)(یٰسٓ)

ترجمہ: اور تمام (اجرام فلکی) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔

قرآن نے بحیثیت قانون کے بیان کیا کہ سورج' چاند' ستارے میں نے مسخر کیے' ان میں سے کوئی بھی کھڑا نہیں ہے بلکہ سب متحرک ہیں۔ 1980ء تک جنھوں نے پرانا جغرافیہ اور معلومات پڑھیں تو ہم سب یہ پڑھتے تھے کہ کچھ اجرام فلکی ساکن ہیں' کچھ چل رہے ہیں۔ قرآن پڑھتے ہوئے ان لوگوں کو کتنی مشکل ہوتی ہوگی جب وہ پڑھتے ہوں گے کہ ساکن کچھ بھی نہیں سب کچھ متحرک ہے۔ یہ 1980ء کی بات ہے جب بڑی بڑی دوربینیں میسر آئیں۔ ستاروں کا مطالعہ ہوا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ دنیا میں ساکن تو کچھ بھی نہیں۔ اس طرح پروردگار کی بات سچ نکلی اور تمام فلاسفی و سائنس غلط!

کیا ہمیں مطالب قرآن پاک تک پہنچنے کے لیے مطالعہ کی ضرورت نہیں' ہمیں اپنی زندگی کی بہترین جدوجہد کی ضرورت نہیں' ہمیں گہرے تفکر کی ضرورت نہیں؟ ہمیں اس محبت کی ضرورت نہیں؟ اس کی جو ہمیں پروردگار تک رسائی کا باعث بنے۔ ایک بات اچھی طرح یاد رکھیے کہ انسانی ذہنی تجسس کی ایک ہی ترجیح ہے اور وہ ترجیح اول و آخر اللہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ذہن باقی کام کیوں کرتا ہے؟ باقی کام پروٹوکول ہیں۔ اگر میں قیامت کے دن اللہ کے حضور پیش ہوں تو میری تو اس سے بے تکلفی ہے۔ مجھے وہ سوال کرے گا تو میں اسے جواب دے دوں گا کہ ساری عمر اس کے ساتھ اِدھر اُدھر گذاری ہے' کبھی اس سے بھاگتے ہوئے کبھی اس کے پاس جاتے ہوئے۔ تو جب وہ مجھ سے کہے گا اے میرے بندے! میں نے تجھے عقل و معرفت بخشی تھی' اپنی پہچان کے لیے اپنی شناخت کے لیے تو تو نے مجھے پہچانا کیوں نہیں؟ میں نے قبر کے ایئرپورٹ پر ایک ٹیکنیکل سوال پوچھا تھا کہ اس کے آگے جانا ہے تو ایک سوال بتا کر جاؤ: ''من ربک'' تم نے صحیح جواب کیوں نہ دیا تھا۔ تو میں کہہ سکتا ہوں کہ پروردگار! تو نے مجھے فرصت ہی کب دی' اس مسئلے کو سوچنے کے لیے میں تو بیوی بچوں

کی فکر میں رہا۔ مکان کی' بلڈنگ کی فکر میں رہا' سینس کی فکر میں رہا۔ مجھے تو نے تو ایک لمحہ فرصت نہیں دی۔ میری ساری عقل تو ادھر لگ گئی۔ میں تو ان پر غور کرتا رہا۔ خدا کہتا ہے میرا بندہ جھوٹ کہتا ہے' ان میں سے کسی چیز کی بھی ذمہ داری اس کی نہیں تھی۔ تمام مقدر تو پروٹوکول ہے۔ اس میں سے کسی چیز کی بھی ذمہ داری آپ کی نہیں تھی۔ آپ کو جس کام کے لیے بھیجا گیا تھا وہ اس سے مختلف تھا۔ آپ کو عقل و شعور اور تجسس و فکر شناخت خداوند کریم کے لیے دیا گیا تھا' مگر آپ اسے کم ترجیح دیتے رہے! آپ نے بیوی پر توجہ لگا دی' بچوں پر توجہ لگا دی اور وقت چلا گیا۔ تو آپ مسلمان تو ہیں مگر آپ اللہ کے محبوب بندے نہیں بن سکتے۔ اللہ نے آپ کو اپنی بخشش سے نوازا تو یہ کرم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے لرزتے ہوئے آنسوؤں نے آپ کی نجات کا بندوبست کر دیا' ورنہ جو نعمت اللہ نے ہمیں دی تھی ہم اس کے حق دار نہیں ہیں۔ ہم نے اسے اس کے بنیادی مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ میں اپنے بھائی کو کہتا ہوں' بھائی یہ پیسے لے جاؤ پنڈی جا رہے ہو' اچھا کھاؤ پیو' اچھے ہوٹل میں ٹھہرو' لیکن میرا یہ خط وہاں پہنچا دو۔ تین دن بعد وہ میرے پاس آتا ہے کہتا ہے' بھائی صاحب میں نے بہت انجوائے کیا' بڑا اچھا وقت گذارا' میں نے دو موویز دیکھیں' فلاں ایکٹر کا تو جواب ہی نہیں تھا' میں مسجد بھی گیا' فلاں جگہ بھی گیا! میں اسے کہتا ہوں بھائی ٹھیک ہے سیر بھی کر لی اور سرمایہ بھی لگا دیا لیکن میرے خط کا کیا بنا؟ وہ کہنے لگا" سوری سر' خط تو میں Deliver نہیں کر سکا!" (گویا وقت نہیں ملا) اب تصور کریں کہ میرے غصے اور جھنجلاہٹ کا کیا عالم ہوگا؟

اسی طرح خدا نے ہمیں رزق دیا۔ بیوی بچے دیئے' تفریح دی' ہر چیز اس نے ہمیں عطا کر دی' مگر جو لیٹر ہم نے ڈلیور کرنا تھا' وہ ہم نے واپس اللہ کو لوٹا دیا۔ نفسیات کا ایک اساسی نکتہ اور اصول یاد رکھیں کہ ذہنی طور پر جس چیز نے آپ کو Possess کیا' مرتے دم تک وہی آپ کے ساتھ رہے گی۔ زندگی میں آپ نے جس چیز کو ترجیح دی جس کی خاطر صبح و شام اپنے تصور کے چراغ جلائے اور جس خیال کو اپنے آغوش ذہن میں پالا اور اس کی خاطر راتیں جاگیں اور صبحیں ضائع کیں' وہی آپ کے ساتھ قبر تک جائے گا۔ اس لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے' کائنات کے سب سے بڑے سائیکالوجسٹ نے آپ کو بتایا کہ اللہ سے گمان ٹھیک رکھنا خاص کر مرتے وقت! یہ گمان کیا چیز ہے؟ ایک بدّو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کو حساب کون لے گا؟ فرمایا' اللہ خود! وہ ہنسا اور چل دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حیران ہوئے کہ اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں تھی۔ فرمایا' دوڑو اور اسے واپس بلا کر لاؤ۔ جب وہ واپس آیا تو پوچھا تو ہنسا کیوں؟ اس نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے دیکھا ہے کہ جب کوئی زندگی میں اعلیٰ ظرف حساب لیتا ہے تو نرم لیتا ہے۔ اللہ سے بڑا اعلیٰ ظرف کون ہوگا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' دیکھو اس بدّو کا گمان اللہ پر کتنا اچھا ہے۔ اور فرمایا کہ آخرت پہ گمان اللہ سے درست رکھنا۔

لوگ کہتے ہیں کہ تقلید اچھی نہیں ہوتی۔ بہت سارے مذہبی فکر میں ایسے لوگ پیدا ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ تقلید اچھی نہیں ہوتی' مگر اب ذہن کی استطاعت جو ہے وہ اتنی محدود ہے کہ ایک ریڑھے والے کو آپ کا دماغ دے دیا جائے تو وہ اگلے دن ہی مر جائے گا۔ اسے صبر و سکون اور بوجھ اٹھانے کی طاقت اور استطاعت اللہ نے دی ہے' جو آپ میں نہیں ہے۔ آپ کا ذہن اسے ملتے ہی وہ بے چینی اور اضطراب سے مر جائے گا' تمام اذہان کو خدا نے اس کے کام کے مطابق

Marfat.com

ترتیب دیا ہے، اور جبر کی تعریف یہ نہیں کہ مقدر میں کیا لکھا ہے اور کیا نہیں لکھا' جبر کی ایک خوبصورت تعریف ایک مغربی نے Scientific Determination کا فلسفہ دیتے ہوئے یوں کی:

"A moment of time is filled into a piece of space."

اگر اللہ ایسا نہ کرتا تو ایک بحران زندگی پیدا ہو جاتا۔ زمین پر کسی کو گھر نہ ملتا۔ کسی کو شناسائی نہ ملتی۔ انسانیت کا باہم ایسا افراتفری پر مشتمل ملاپ ہوتا کہ ایک ہی جگہ سارے اکٹھے ہوتے' نہ کسی کو گلی نظر آتی نہ کسی کو دروازہ' نہ آج ہم یہاں ہوتے۔ تو خدا نے اس لمحہ زمانہ کو اس نظام کے ساتھ جوڑ کر آپ کو زحمت شنوائی کی اور مجھے بخت گفتار بخشی۔ اس طرح اللہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس محدود دورویے کو ترک کرنا ہوگا' جس پر ہم قائم ہیں۔ دیکھیں ایک لڑکا ایف ایس سی میں داخلہ لیتا ہے پھر ایم بی بی ایس کرتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ پیشہ وارانہ مہارت کے کمال پر ہوتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ زندگی میں اس نے بڑی علمی تحقیق اور جستجو کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے۔ ایک سادہ موٹر مکینک بھی بیس سال بعد اس کا پورا علم جانتا ہے اور پھر وہ سلف کو کنجی لگا کر کہتا ہے کہ اس میں فلاں نقص ہے۔ ہر جگہ علم و حکمت ترقی کرتی ہے سوائے مسلمانوں کے ہاں! یہاں ایک شخص اسلام کو نماز اور روزے سے شروع کرتا ہے اور پھر اسی پر مرتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کی چھوٹی چھوٹی یونیورسٹیوں کے طالب علم تو بہت ترقی کر گئے مگر خدائے علیم و حکیم کی طرف جانے والا بالکل وہیں کھڑا ہے جہاں وہ ازل سے کھڑا تھا۔ اس میں اللہ میاں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بنیادی طور پر یہ ہماری خامی ہے کہ ہم اس مکتبہ علمیہ تک نہیں پہنچ سکے' جس پر خدا اور اس کا قرآن قائم ہے' جس پر وہ تعلیم قائم ہے۔ بنیادی طور پر دو خامیاں ہیں۔ ایک تو ہمارا مغربی فکر کے سامنے احساس کمتری ہے۔ کبھی ہم اس کا شدت سے انکار کر کے Stubborn Animals ہو جاتے ہیں اور کبھی شدت سے قبول کر کے ہم اپنا احساس ذہن کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ دونوں خامیاں ہم میں موجود ہیں اور دوسرا یہ کہ ہم سے مدت ہوئی ہماری ترجیح اول کھو گئی ہے۔ ہم اسلام مانگتے ہیں' ہم مذہب کی پرستش کر رہے ہیں' ہم خدا کی پرستش نہیں کر رہے' جب تک ہمارے اذہان میں یہ ابہام Clear نہیں ہوگا کہ ہماری سمت کا تعین ترجیح اول کی صحیح تعیناتی کے بغیر نہ ہو سکے گا' اس وقت تک ہمارا مذہب صحیح بنیاد پر استوار نہیں ہوگا۔ خدا نے تو ہم سے وعدہ کیا ہے بہت بڑا وعدہ اتنا کھلا اور کشادہ وعدہ کہ پروردگار کے اس وعدے پر اعتبار نہ کرنا عجیب سا لگتا ہے:

ولاتهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين (۱۳۹:۳)(الِ عمران)

ترجمہ: اور سستی نہ کرنا اور غم نہ کرنا اور تم ہی غالب ہو' اگر تم اہل ایمان ہو۔

فرمایا سستی اور غم نہ کرنا۔ مجھے اپنے عزّ و جلال کی قسم ہے کہ اگر تم اہل ایمان ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔ ہم غالب کیوں نہیں؟ بڑی مدت سے نہیں' بہت صدیوں سے نہیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ بہت سادہ سی ہے۔ ہمارے علمی فکر کے مکمل انحطاط نے ہمیں ترجیحات سے غافل کر دیا۔ ہم دین اور عمل کی بہت زیادہ باتیں کرتے ہیں' مگر دین کی غرض و غایت سے ناواقف ہیں۔ ہماری زندگی کی نفسیات اللہ کے احکام سے مرتب نہیں ہوتی۔ ہماری فکر پر کسی الوہی رہنمائی کا سایہ نہیں ہے۔ ہم تمام ترجیحات سے نمٹنے کے بعد بالآخر عمر کے آخری حصے میں اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہم اپنے علمی مسلک میں اتنے کمزور ہیں کہ ہم نے دین کی وضاحت کا کام سب سے کم تر علم والوں کو دے رکھا ہے اور ہم نے کبھی محنت نہیں کی۔

سوچا تک نہیں کہ ایک بی اے کرنے کے لیے چودہ برس گذر گئے تو اتنی بڑی کائنات کے رب کی علمی تحقیق اور جستجو کے لیے کیا ایک سال بھی نہ لگے گا۔ کیا ہم نے زندگی کا کوئی وقت بھی سنجیدگی سے خدا کو دیا ہے؟ اس سے کچھ سیکھنے کے لیے دیا ہے؟ اس کو جاننے کے لیے دیا ہے؟ یہ وہ بنیادی نقائص ہیں جو ہمارے انحطاط کا باعث ہیں۔ رب کعبہ کی قسم! اگر آج بھی مسلمان محقق، مسلمان طالب علم خدا کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیم حاصل کریں تو خدا شناس ہو سکتے ہیں۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ علم برائے علم نہیں رہا، علم برائے خدا تو بڑی دور کی بات ہے۔ عالم اسلام میں یہ ایک حادثہ اور المیہ ہے کہ تمام علم برائے مال حاصل کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر اس سے مال کما رہا ہے، انجینئر اس سے مال کما رہا ہے، مگر علم برائے خدا یا علم برائے علم کا وجود اٹھ گیا ہے۔ ایسا علم ہمیں کہاں لے جا سکتا ہے۔ وہ تو آپ کے دیار ذہن کا جلاوطن ہے۔ پتہ نہیں بے چارہ کہاں کھو گیا ہے اور انتظار کر رہا ہے کہ کب یہ مجھے گھر بلائے اور کب میراث مومن اپنے گھر کو پلٹے؟ کہ کب یہ رب ذوالجلال کی آیات کو پورا کرے؟ کب یہ حکمت و میراث مرد مومن کو طلب کرے؟ کب یہ خدا کے لیے خدا کو جاننا پسند کرے؟ بغیر علم کے حقیقت اشیاء نہیں ملا کرتی۔ علم کی دین میں اس سے عجیب کوئی بات نہیں جو رسل نے کہی:

"We only know the relationship of things, we do not know the nature of things."

بیسویں صدی کا علم آج اس مقام پر پہنچ رہا ہے کہ ہم صرف اشیاء کے تعلق کو جانتے ہیں اور اشیاء کی حقیقت نہیں جانتے، مگر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم اس نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں جو پندرہ سو برس قبل دعا مانگ رہے ہیں:

اللھم ارنی حقائق الاشیاء کماھی (الحدیث)

اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت ایسے دکھا جیسے کہ وہ ہیں۔

آپ کا رہبر کیسا عجیب استاد ہے وہ جو انداز فکر اور علم آپ کو سکھا رہا ہے۔ وہ آپ کو بتا رہا ہے کہ جب بھی اللہ سے مانگو۔ حقیقت اشیاء کی دعا مانگو کہ اے پروردگار! مجھے حقیقت اشیاء کا علم دے۔ مجھے اس کی گہرائی فکر عطا کر دے کہ میں علم شش جہات کی تہہ تک پہنچوں۔ مجھے، ایسا علم دے ایسا تجسس دے کہ میں دامن یزداں کو چاک کر کے گذروں۔ اقبال نے بڑی خوبصورت بات کہی:

جبریل زبوں صیدے در دشت جنون من
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

کہ میرے جنون و عقل کے صحرا میں جبریل بہت ہی معمولی قیدی ہے۔ بہت ہی معمولی شکار ہے۔ میں کیوں ملائکہ کی جستجو کروں؟ اگر تم میں ہمت ہے تو کمند اللہ پر پھینکو۔ کیونکہ اسے اس سے محبت ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ اللہ نے بھی یہ بڑی بات کہی۔ اللہ تعالیٰ نے قطعی یہ کہا کہ مجھے اس طرح چاہو جس طرح محبوب کو چاہتے ہو۔ اس سے کم تر پر میں تمہیں نصیب نہیں ہو سکتا۔ ارشاد فرمایا:

فذکروا اللہ کذکرکم اٰبآء کم او اشد ذکرا (۲:۲۰۰)(البقرۃ)

ترجمہ: پس اللہ کو ایسے یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

Marfat.com

مجھے اس طرح چاہو جیسے اپنے Belonging کو چاہتے ہو۔ عرب کے سب سے مضبوط تعلق آباؤ اجداد سے تعلق تھے۔ تو اللہ نے کہا کہ خوف و وحشت والی بات مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ ڈرامہ عذر کا چھوڑو۔ اگر تم نے مجھے یاد کرنا ہے تو بعینہٖ اسی طرح محبت کرو جیسے اپنے آباؤ اجداد سے کرتے ہو۔ ایسے لگتا ہے کہ آسمانوں پر تنہائی نے اسے صرف محبت ہی سکھائی ہے۔ وہ آپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ آپ میں سے کتنا چوائس (Choice) رکھتا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ لاکھوں کروڑوں میں سے اور ارب ہا ارب لوگوں میں سے وہ کتنوں کی ہوس رکھتا کہ حضور گرامی مرتبت نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی' جب زمین پر ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہوگا۔ دیکھئے دنیا کتنی بڑی لیبارٹری ہے' اس میں Wastage کتنی زیادہ ہے اور چانسز کتنے محدود ہیں کہ اگر چھ ارب میں سے ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہو تو اللہ قیامت برپا نہیں کریگا۔ اسے اپنے یاد کرنے والے سے محبت ہے۔ اس لیے قرآن حکیم میں یہ تعلیم دی گئی:

اتل ما اوحی الیک من الکتب (۴۵:۲۹)

ترجمہ: اے پیغمبرؐ! جو کتاب آپ کو دی گئی ہے اس کی تلاوت فرمائیں۔

تلاوت کتاب سے مراد اللہ کا ذکر ہے۔ اسے دوسرے مقام پر واضح کر دیا گیا کہ قرآن حکیم دراصل اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون (۹:۱۵)(الحجر)

ترجمہ: بے شک ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اسی طرح دوسرے مقام پر نماز کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

واقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنہی عن الفحشاء والمنکر (۴۵:۲۹)(العنکبوت)

ترجمہ: اور نماز قائم کرو' بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

پھر فرمایا کہ نماز میرے ذکر کے لیے قائم کرو۔ قرآن بھی ذکر ہے۔ مگر کیا پروردگار کا منشاالٰہی اذکار تک ہے یا ذکر کا کوئی اور Pattern بھی ہے۔ فرمایا:

ولذکر اللہ اکبر (۴۵:۲۹)

ترجمہ: اور اللہ کا ذکر بہت بڑا ہے۔

کہ قرآن پڑھو' نماز ادا کرو' مگر میری یاد بہت بڑی بات ہے۔ یہ کیسی یاد ہو سکتی ہے؟ یہ یاد کوئی رسم نہیں ہے۔ یہ طریق کار کی قید نہیں ہے۔ اس کا کوئی مخصوص انداز نہیں ہے۔ یہ پگڑیاں باندھ کر نہیں کی جاتی' مصلے سمیٹ کر نہیں کی جاتی' عطر لگا کر نہیں کی جاتی' یہ تو بدترین غلاظت میں' اندھیروں میں' تاریکیوں میں' بدبو اور تعفن کے ماحول میں بھی ممکن ہے۔

فنادی فی الظلمت ان لا الہ الا انت سبحنک انی کنت من الظلمین (۸۷:۲۱)(الانبیآء)

ذرا غور کیجیے! آج آیت کریمہ پڑھنے کے لیے کیا کیا اسباب و سامان مہیا نہیں کیے جاتے۔ خوشبوئیں' رنگ و روغن' چاندنیاں فرش دھلے ہوئے اور بڑے اہتمام سے ہر ایک دانے پر پڑھا جاتا ہے' مگر پڑھنے والے نے اسے کیسا پڑھا؟ کیا پڑھنے والے کو جواب نہیں ملا؟ کیا پڑھنے والے نے اسے جواب نہیں دیا؟ نہیں بلکہ اس آیت کریمہ کو سب سے

پہلے پڑھنے والے کو جواب بھی دیا گیا اور پھر اس جواب کو ایک اصول بھی بنا دیا کہ ہم نے ایسے پڑھنے والے کو بھی نجات دی اور آیندہ کے لیے بھی یہ ضابطہ قرار فرمایا۔

فاستجبناله ونجینه من الغم وكذلك ننجي المومنین (۸۸:۲۱)(الانبیآء)

ترجمہ: پس ہم نے اس کی پکار کو قبول کیا اور ہم نے اسے غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم اہل ایمان کو نجات دیتے ہیں۔

یہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس آیت کریمہ میں کیا ہے؟ یہ ایک بڑی سادہ سی سٹیٹمنٹ ہے:

"Oh God! You are right, I am wrong, sorry."

سادہ سی بات ہے کہ اے پروردگار مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ مکمل تو آپ ہو کہ آپ سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ میرے کمپیوٹر میں تم نے پہلے ہی غلطی کی گنجائش رکھی تھی' سو غلطی ہوگئی۔ میں خسارے میں چلا گیا ہوں۔ میری خطا معاف کیجیے! اس سادہ سے اعتراف پر پروردگار نے قرآن میں لکھا ہوا وعدہ دے دیا کہ: "وكذلك ننجي المومنین" کہ ہم نے اسے غم سے نجات دی اور نہ صرف اسے بلکہ رہتی دنیا کے لیے یہ ایک اصول بن گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بھائی یونس علیہ السلام کو پہلی مرتبہ یہ اسم گرامی عطا ہوا تھا' مگر میری امت کو ویسے ہی مل جائے گا جو کلمہ عالیہ ان کی نجات کا باعث تھا' جو یونس علیہ السلام کے لیے اتنے کرب وبلا اور اذیت وابتلاء میں نجات کا باعث بنا' وہ ہمیں حضور ﷺ کے طفیل ویسے ہی عطا ہوگیا۔ فرمایا اے اہل ایمان! جب تم بھی اس انکسار اور محبت سے یہ دعا مانگو گے تو یقین جانو ہم تمہیں بھی معافی اور نجات عطا کریں گے۔ اس کے بعد کون ہے جو خدا کے وعدے پر اعتبار نہ کرے گا۔

میں اس حقیقت کو بھی واضح کرتا چلوں کہ اللہ کا تشکیل دیا ہوا سارا نظام سائنٹفک ہے۔ اللہ کے ہاں کوئی بے ترتیبی نہیں ہے۔ سپر کمپیوٹر لگا ہوا ہے' بہت بڑا کمپیوٹر اپنے کام میں مصروف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک بہت بڑا درخت ہے اور موت کے زیر اثر اس سے ایک پتہ نیچے گرتا ہے اور اس پر گئے گذرے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ ملائکہ اسے اٹھاتے ہیں اور مرنے والے کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ صرف درخت کو کمپیوٹر میں بدل دیا۔ کارڈ باہر نکل رہے ہیں اور اٹینڈنٹ کھڑے ہیں۔ کارڈ پنچ ہو رہا ہے۔ وہ کارڈ اٹھاتے جاتے ہیں۔ معراج کی شب کے متعلق رسول گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے لے کر جبریل امینؑ ایک درخت کے پاس آئے۔ وہ اوپر سے درخت کی طرح تھا۔ اس میں دو جگہیں بیٹھنے کی بنی تھیں۔ ایک پہ جبریل بیٹھے اور ایک پہ مجھے بیٹھنے کا کہا' پھر اشارہ کیا۔ اس سواری سے شرارے اور آگ نکلی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ آفاق کو چھو گیا۔ یہاں گھوڑے کی جگہ کا سمک ہیلی کا پٹر کر دیں جس پر دو سیٹیں بنی تھیں۔ جناب جبریل امین علیہ السلام نے حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کو بٹھایا اور ایک اشارہ کیا اور پھر اچانک اس کا فیول نکلا اور وہ روشنی کی رفتار سے نکلتا ہوا آفاق کی حدوں سے بھی آگے نکل گیا۔ اس زمانہ میں وہ محاورہ آگے نہیں بڑھ سکتا' یعنی علوم جدیدہ کا حامل ہوتے ہوئے ہمیں مفاہیم کی تفہیم کے لیے تعبیر کرنا ہوگی۔ آج سے تقریباً ایک سال قبل میں نے ایک حدیث کا تذکرہ کیا کہ اس کی رو سے بہت جلد جینٹک انجینئر انسان کی کاپی بنالیں گے۔ تو ہر ایک نے کہا کب؟ میں نے کہا کہ سال دو سال میں بنالیں گے مگر صرف تین ماہ ہی گذرے تھے کہ کلوننگ آگئی۔ پھر پوچھا گیا کہ وہ حدیث کون سی تھی' جس سے

میں نے یہ اخذ کیا؟ میں نے اس حدیث سے اندازہ کیا کہ حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' دجال کے پاس ایک شخص آئے گا اور اسے کہے گا کیا تو میرا بھائی زندہ کر سکتا ہے۔ دجال کہے گا ہاں کر سکتا ہوں اور وہ اس کا بھائی زندہ کر دے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا یہ وہی شخص ہوگا؟ فرمایا نہیں بلکہ اس کی مثال ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ جس لیکچر میں یہ بات بیان کی اس پر تاریخ لکھی ہے' ورنہ دانشور کہتے کہ سائنس کی دریافت ہو چکی اور پروفیسر صاحب اب بیان کر رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور حدیث ہے۔ اگر یہ دور' یہ زمانہ اسی طرح چلتا رہا تو وہ بھی ضرور پوری ہوگی کہ انسان مردہ ہونے سے قبل تین مرتبہ موت سے دوچار ہوگا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا' دجال کے پاس ایک شخص جائے گا اور کہے گا کہ کیا تو مجھے مار کر زندہ کر سکتا ہے؟ دجال کہے گا ہاں! اسے مارے گا پھر زندہ کرے گا' پھر اسے مارے گا پھر زندہ کرے گا پھر مارے گا پھر زندہ کرے گا مگر چوتھی مرتبہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ یہ حدیث بالکل واضح طور پر اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ طب اور جینیٹک انجینئرنگ تین مرتبہ مردہ شخص کو زندہ کرنے کی اہلیت حاصل کر لیں گے' مگر چوتھی مرتبہ وہ ایسا کرنے سے قاصر ہوں گے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی یہ عمر جسے ہم آج 45' 50 سال تک ہی محدود سمجھتے ہیں یہ ہماری اپنی فہم کی وجہ سے اتنی محدود ہے نہ کہ مقدرات کی وجہ سے۔ جب ہم اس درجہ تک اپنی تحقیق و جستجو کے ذریعے پہنچ جائیں جہاں یہ مدت بڑھتے تو یہ حد بدل جائے گی۔ جیسے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم ہزار سال تک جیو تو کیا پھر مرو گے نہیں؟ گویا کم از کم انسانی زندگی کا Span ایک ہزار سال کا ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص تھوڑا سا علم قرآن رکھتا ہو تو قرآن کو پڑھنے کے بعد وہ بہ آسانی محسوس کر لیتا ہے کہ قرآن بہت آگے کی بات کرتا ہے اور انسانی ترقی کو بہت پہلے سے Visualise کرتا ہے' جس طرح فرمایا کہ اے حضرت انسان! میں نے سات آسمان اور ایسی ہی سات زمینیں بنائیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان تمام افلاک و زمینوں کے درمیان میرا حکم بھی اترتا ہے:

اللہ الذی خلق سبع سموت و من الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علے کل شیءٍ قدیر' وان اللہ قد احاط بکل شیءٍ علما O (۱۲:۵٦)(اطلاق)

ترجمہ: اللہ وہی ہے جس نے ساتوں آسمان اور اتنی ہی زمینیں پیدا کیں۔ ان کے درمیان اس کا امر اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ بے شک اللہ نے اپنے علم سے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔

اور امر قرآن کو کہا گیا ہے کہ ان تمام زمینوں پر میرا حکم اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ ہم کتنی بڑی قدرت والے ہیں۔ آیندہ آنے والے زمانوں میں چاہے Nasa ہو یا Hubleوہ یقیناً دور کے Glaxial Order میں وہ Life Belts ضرور دریافت کر لیں گے جو اللہ کی اس قرآنی آیت کی تصدیق کریں گے۔ قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے اور حدیث مسلم میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اس زمین کے لوگوں کا حساب ہو چکا ہوگا تو پھر بھی جنت میں جگہ خالی رہ جائے گی۔ پھر اللہ نئے لوگ پیدا کرے گا اور انہیں پھر آزمائشوں سے گذارے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین پہلی زمین نہیں ہے اور نہ ہی یہ آخری زمین ہے۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے' جو پروردگار کے ساتھ جاری ہے اور تخلیق کا لامتناہی پراسس ہے' مگر ہمارا تصور خدا بہت ہی محدود ہے' جس طرح ایک چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی کو خدا سمجھتی ہے۔

Marfat.com

جب ہم بلیک ہول کے تصور سے نکل کر پھیلی ہوئی کہکشاؤں کو دیکھتے ہیں جو اب دریافت ہوئی ہیں اور ہم سے کئی بلین نوری سال کے فاصلے پر ہیں' مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کا یہ طریق جستجو بہت ہی تھکا دینے والا ہے۔ اس کے پاس اتنی عمر اور زندگی نہیں کہ وہ اس مقصد شناخت کی تکمیل کر سکے گا۔ اس پر انسان پر ایک ڈیپریشن اور اداسی چھا جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار تو نے مجھے Glaxial Order کی عمر دی ہوتی کہ اتنی لمبی عمر میں' میں سوچتا اور ستاروں' آسمان اور فلکیات کے اس دور سے گذرتا ہوا اشراق صدی تک پہنچ جاتا۔ میں اس طاق تک جھانک لیتا جہاں تو بیٹھتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں تو پھر میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟ اور کس طرح تلاش کروں؟ مگر اس مایوسی کا علاج موجود ہے کہ خدا کی تلاش کا ایک آسان راستہ بھی ہے' جس کی رفتار بہت زیادہ ہے۔ دنیا کا تیز ترین پیغام وہ ہے جو Biokinetics میں گذرتا ہے۔ اس کو زمین پر کچھ پھول مریخ پر موجود پھولوں کو پیغام ارسال کریں تو وہ کمال تیزی کے ساتھ پہنچ جائے گا۔ ایک بات جس کا میں ہمیشہ قائل رہا ہوں یہ ہے کہ سائنس اس چیز کو سائنس کہتی ہے جس کے اصولوں کو اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔ سائنس اس چیز کو سائنس نہیں کہتی جس کا کوئی واضح اصول مرتب نہ کر سکے۔ میرا یہ یقین ہے اور امید ہے کہ میرے کچھ پڑھے لکھے دوست اس پر کام کریں گے کہ جذبات' احساسات اور خیالات بھی ایک Scientific Pattern رکھتے ہیں۔ یہ بھی مکمل سائنسز ہیں' مگر مصیبت یہ ہے کہ ابھی تک حضرت انسان نے اسے سائنس نہیں کہا' کیونکہ اس کے لیے کوئی واضح اور مصدقہ اصول مرتب نہیں ہوئے۔ صوفیا ہی وہ طبقہ ہے جو اس اصول پر عمل پیرا ہیں۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ کہیں سماتا ہے؟ تو فرمایا کہ اللہ دو عالم میں کہیں نہیں سماتا مگر قلب مومن میں! گویا ہمیں کچھ ایسے Instruments دیئے گئے ہیں جو خدا کا ادراک وتحصیل کر سکتے ہیں۔ جہاں اللہ کے قرب کی سعادت ممکن ہے جو شناخت پروردگار کی اہل ہے۔ اگر انسان اس کا اہل نہ ہوتا تو قبر میں ہر انسان سے یہ سوال کیوں کیا جاتا؟ من ربک؟ کیا کسی ان پڑھ کا یہ حق نہیں کہ وہ اللہ سے کہے کہ تو نے تو مجھے تعلیم ہی نہیں دی' میں تو بالکل ان پڑھ ہوں۔ میں تمہیں کس طرح جواب دوں؟ کہ میرا رب کون تھا۔ خدا نا انصاف نہیں ہے۔ اس نے انسان کو کوئی دوسری صلاحیت بخشی ہو یا نہ بخشی ہو' ایک صلاحیت ہر انسان کو ودیعت کی ہے کہ وہ خدا کو پہچان سکتا ہے۔ سوائے دو انسانوں کے' جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو انسانوں سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ وہ جو سویا ہوا ہے اور مجنوں' باقی تمام انسانوں میں صلاحیت شناخت پروردگار موجود ہے۔

مگر جمال پروردگار ان آنکھوں سے نہ دیکھا جا سکے گا۔ میں کل ویلڈنگ میں آکسیجن کا شعلہ دیکھ رہا تھا اور اسے نہ دیکھ سکا۔ تو میرے دل میں خیال آیا کہ حضرت انسان کی تعلی بہت بڑی ہے۔ یہ کائنات کے ستر ہزار حجابات نوری وناری والے پروردگار کو بے حجاب دیکھنا چاہتا ہے اور حال یہ ہے کہ آکسیجن کے نیلے شعلے پر نظر نہیں ٹکا سکتا۔ مگر کیا ہوا نظر آتی ہے؟ کیا اس کا چھونا محسوس نہیں ہوتا؟ کیا جب یہ ٹھنڈی اور نرم ہوتی ہے تو ہر کوئی اسے نسیم سحر نہیں کہتے؟ کیا جب وہ دوپہر کو سخت چلے تو اسے باد سموم نہیں کہتے۔ کیا شام کو ساحلوں پر چلنے والی ہوا کو Breeze نہیں کہتے؟ کیا آندھی اور تاریکیوں میں اٹھتے ہوئے طوفان کو ہم نہیں پہچانتے۔ ہم ہوا کا ہر رنگ پہچانتے ہیں۔ خدا نظر آئے یا نہ آئے ہم اللہ کا ہر رنگ پہچانتے ہیں۔ وہ ہمارے قریب سے گذرتا ہے۔ ہم اس کی سرسراہٹ محسوس کرتے ہیں۔ ہم اس کا یقین اپنے دل میں پاتے ہیں۔ اس کی

Marfat.com

محبت کا سرور ہماری نگاہوں میں چھلکتا ہے۔وہ ہر لمحے میں اپنے وجود کا احساس دیتا ہے۔اپنی موجودگی کا تعین دیتا ہے' مگر ان لوگوں سے وہ زیادہ ڈیمانڈ نہیں کرتا۔زیادہ متقی نہیں ڈھونڈتا۔وہ تو کہتا ہے کہ:

فلا تزکوا انفسکم هو اعلم بمن اتقی (۳۲:۵۳)(النجم)

ترجمہ: پس تم اپنی صفائی وتزکیہ خود نہ بیان کرو۔اللہ بہتر جانتا ہے کہ تم سے کون زیادہ متقی ہے۔

میرے سامنے تم دعویٰ لے کر نہ آنا۔مت کہو کہ تم پاک ہو' تم مقدس ہو' میں تمہیں اس دن سے جانتا ہوں جب ہم نے تمہیں دامن زمین میں رکھا تھا اور اس وقت سے بھی جانتا ہوں جب میں نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں رکھا تھا۔دونوں ہی آغاز غلیظ ہیں۔جب برستی ہوئی آگ اور برسات تھم گئی' پانچ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا فشار کرسٹ پر سے ختم ہوا اور زمین پر ایک ارب سال تک بارشیں برسیں اور کیچڑ ہوا' پانی سوکھا اور اوپر کی سطح سیاہ ہوگئی:

انا خلقنهم من طين لازب (۱۱:۳۷)(الصفت)

ترجمہ: بے شک ہم نے تمہیں چپکتی ہوئی سیاہ مٹی سے پیدا کیا۔

کھنکھناتے ہوئے خشک گارے کی مٹی کے نیچے سیاہ گلا سڑا لیس دار طین لازب پیدا ہوا اور پروردگار نے اس کی نشاندہی کی کہ تم اپنے تقدس کی بات کرتے ہو' حالانکہ تم تو کسی شمار میں نہ تھے۔تمہیں تو ابھی تک انسان بھی نہ کہا گیا تھا۔آدم تو بڑے دور کی بات ہے۔اے حضرت انسان آدم علیہ السلام تو بہت بعد کا تذکرہ ہے۔تو تو ایک ایسے زمانے سے گذرا ہے جب تو کوئی قابل تذکرہ شے بھی نہ تھا:

هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شياء مذكورا (۱:۷۶)(الدهر)

ترجمہ: انسان پر ایک ایسا وقت بھی گذرا جب وہ کوئی قابل تذکرہ شے نہ تھا۔

یعنی کسی پرانے سمندر کے کنارے جما ہوا کائی کا ٹکڑا۔سائنس دان کہتے ہیں کہ ایک طویل عرصے تک حیات و موت کی جنگ ہوئی۔پھر نسل انسان نے ایک سودا کیا کہ اے پروردگار میں کہ حقیر کائی کی صورت پڑا ہوں۔موت قبول کرتا ہوں تو مجھے زندگی عطا کر دے۔اس طرح موت وحیات کی کشمکش کا آغاز ہوا۔آج جو کچھ آپ کا وجود ہے' یہ ایک واحد Cell سے پیدا ہوا جسے Amebia Proteus کہتے ہیں' جو دو نہیں ہے بلکہ ایک ہی مرکز سے تقسیم ہوتا ہے۔پھر دوسری منزل آئی:

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنه سميعا بصيرا (۲:۷۶)(الدهر)

ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو مخلوط (دھرے) نطفے سے پیدا کیا کہ اسے آزمائیں' پس ہم نے اسے سنتا دیکھتا بنایا۔

اب اس مرحلے پر نطفہ مخلوط کر دیا گیا۔نیوکلیس کے Male اور Female ہونے کی وضاحت کر دی گئی۔ اس مرحلے پر لاکھوں سال گذر گئے۔پھر اللہ نے چاہا کہ اسے بہتر بنا دے کہ اسے جانچا اور پرکھا جائے تو اسے دو سسٹم یعنی سماعت اور بصارت دیئے گئے۔آج کوئی بھی سائنسی تحقیق اس کے خلاف نہیں جاتی۔اکبر الہ آبادی نے جب جدید سائنسی تحقیقات کو دیکھا تو گھبرا گئے۔انہوں نے کہا کہ دین و مذہب میں کوئی ایسی صورت نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔سو انہوں نے طنزیہ انداز اختیار کیا' حالانکہ ڈارون نے تحقیق اور جستجو کے بعد دس سال کی محنت شاقہ سے صرف یہ بتایا کہ دنیا کا کوئی

Marfat.com

ذی حیات بغیر خاندان کے نہیں ہے۔اس نے بتایا کہ تمام ذی حیات مختلف فائلمز پر مشتمل ہیں اور پھر ان کے سب فائلم اور فیملی ہیں۔Genesis ہیں۔یعنی اس نے اشیائے زندگی کے خاندانوں کی نشاندہی کی۔ذرا دیکھئے کہ قرآن کیا کہتا ہے:

وما من دابة فی الارض ولا طٰئر یطیر بجنا حیه الاامم امثالکم (۳۸:۶)(الانعام)

ترجمہ:اور زمین پر کوئی چلنے والا جانور اور اپنے پروں سے اڑنے والا پرندہ نہیں' مگر یہ سب تمہاری طرح کے (مخلوق کے) گروہ ہیں۔

کہ تمام مخلوق تمہاری طرح کی امتیں ہیں۔یعنی پندرہ سو سال قبل قرآن نے حیات کی اس نوع کی نشاندہی کردی۔ڈارون نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ Homoerectus انسان نے زندگی میں بڑے ادوار گذارے ہیں' وہ کبھی سماعت سے محروم تھا' کبھی بصارت سے محروم تھا' کبھی ڈبل سیل کی شکل میں تھا' کبھی واحد خلیہ کی شکل میں تھا۔ جب وہHomoerectus بن گیا' تو اسی وقت وہ قتل وغارت گری میں پڑ گیا۔پروردگار کا حکم آیا کہ ہم نے اسے زمین پر عقل و معرفت کا نمونہ حکمت بنایا ہے۔اسے خلیفۃ اللہ بنایا ہے تو وہ فرشتے جو اس تمام Progress of Homoerectus کو دیکھ رہے تھے عرض کرنے لگے:

قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفک الدمآء (۳۰:۲)(البقرة)

ترجمہ:فرشتے کہنے لگے' اے اللہ کیا تو اسے خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فساد کرتا ہے اور خون بہاتا ہے۔

یعنی اس کو تو ہم صبح وشام قتل وغارت کرتے دیکھ رہے ہیں۔اے اللہ تو اسے خلیفہ بنائے گا۔

ارشاد ہوا:

قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السموت و الارض واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون (۳۳:۲)(البقرة)

ترجمہ:(اللہ نے) فرمایا کہ میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمینوں کے غیب جانتا ہوں اور وہ کچھ جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہوئے اور وہ بھی جو تم چھپاتے ہو۔

یعنی میں جانتا ہوں اور تم نہیں جانتے۔یہ وہ حضرت انسان تھا جو پراگریس کرتے ہوئے پہلے شناخت شدہ آدم کہلایا۔غرضیکہ ایک نہیں بے شمار سائنسی ایجادات ہیں جو قرآنی حقائق کی تصدیق کرتی ہیں اور انسان کے اندر داعیہ پیدا کرتی ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ عقل وشعور کی نعمت کو اپنی ترجیح اول یعنی اللہ تعالیٰ کی شناخت کے لیے وقف کرے۔

وماعلینا الاالبلغ المبین O (یٰسٓ)

Marfat.com

خطبہ دوم

علم اور اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا O (۱۷:۸۰)(بنی اسرائیل)

یہ موضوع میری زندگی میں بھی ایک انتہائی اہم موضوع رہا ہے۔ تجربات، علم اور حوادث شعور سے گذرتے ہوئے نصف صدی کے بعد تمام سوال و جواب کی کاوشوں سے نمٹتے ہوئے ایک انتہائی انکشاف علمیہ جو مجھ پر پہلے بھی ہوا اور آج بھی ہے، وہ بڑا سادہ سا ہے۔ میں اس انکشاف کو اس گفتگو کی بنیاد بنا رہا ہوں کہ تمام تحقیق و تجسس فکر کا صرف ایک فطری انجام ہے اور وہ اللہ ہے۔ اسے غور سے سمجھئے گا کہ تمام تحقیق علمیہ اور تمام تجسس فکر کا ایک انجام ہے اور وہ اللہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی علم و جستجو اور فکری کاوشوں کے بعد اللہ تک نہیں پہنچا، اسے شناخت خداوند حاصل نہیں ہوئی تو اسے واپس پلٹ کر دیکھنا چاہیے کہ اس کی تحقیق علم کہاں ناقص رہی۔ اس کی کاوش فکری کہاں خام رہی۔ سب سے بڑا نقص جو اس وقت علمی فضا میں جاری ہے، وہ تقسیم علم (Compartmentalization of Knowledge) ہے۔ تمام علم اجزاء میں منتشر ہے۔ جو چند فکری حلقوں میں بٹ کر ایک مکمل نظریاتی کاوش قائم نہیں کرنے دیتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آج جسے تخصص (Specialization) کہتے ہیں اور جو یقیناً آج کے زمانے میں بڑی علمی مقدریت کی بات ہے۔ وہی علمی تخصص علم محدود کرنے کا باعث بھی ہے۔ اللہ خود علیم ہے اور جب اس نے کائنات کو تخلیق کیا، اول و آخر کو سمیٹا تو ظاہر و باطن پر ایک کلی نگاہ ڈالی اور اپنے احاطہ ادراک میں وضاحت کرنی چاہی، تو اس نے ایک بڑی مختصر سی قرآنی آیت میں ہمیں بتایا کہ اللہ کے نزدیک علم کتنا ضروری ہے۔ اس کا اظہار اس نفرت اور حقارت سے ہوتا ہے، جو وہ علم سے محروم ذہن کے لیے رکھتا ہے اور اس نے واضح طور پر کہا:

ان شر الدواب عنداللہ الصم البکم الذین لا یعقلون۔ (۸:۲۲)(الانفال)

ترجمہ: بے شک اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں، جو بہرے گونگے ہیں اور عقل استعمال نہیں کرتے۔

پروردگار عالم کی عظیم ترین پیدا کردہ تخلیقات پر شعوری کاوشوں سے بہرہ مند نہ ہونے والے عقل و شعور سے

محروم لوگوں کو بدترین جانور قرار دیا گیا۔ وہ کون سا شعور ہے جو پروردگار کی پہچان دیتا ہے‘ وہ کیا علم ہے جو ہمیں اللہ کو ہم پر زیادہ بہتر انداز سے اجاگر کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلمؤا۔ (۲۸:۳۵)(فاطر)

ترجمہ: بے شک اللہ سے سب سے زیادہ وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

یعنی اللہ کا علم رکھنے والے ہی سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ یہ ڈرنا کیا ہے؟ یہ دراصل اس کی حیثیت کا ادراک ہے۔ پروردگار کی حیثیت کا پہچانا جانا۔ اگر چہ وہ کلی طور پر کسی جزوی حیثیت میں نہیں سما سکتا مگر جب تک ہم اپنی شعوری حیثیت کو بالاتر نہیں کریں گے ہمارا تصور خدا بالکل وہیں تک محدود رہے گا۔ جیسے یورپی فلاسفر نے کہا کہ اللہ کا تصور انسانوں میں بالکل ایسا ہی ہے‘ جیسے چھوٹی مچھلی بڑی مچھلی کو خدا سمجھتی ہے۔

وہ پروردگار عالم جو علم کی بنیاد پر انسانوں کے درجات مرتب کرتا ہے۔ وہ پروردگار عالم جو اپنے لیے تجسس فکر کو لازم قرار دیتا ہے‘ ضروری قرار دیتا ہے کہ بغیر علم تم معرفت الٰہی حاصل نہیں کر سکتے۔ جو بار بار یہ Assert کرتا ہے کہ مجھے جاننے کے لیے تمہیں اپنا جاننا ضروری ہے۔ تمہیں اپنا جاننے کے لیے ان تمام فکری اور نظری کاوشوں کی ضرورت ہے‘ جسے آپ دنیاوی علوم کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ مذہب میں اس وقت زوال پذیری شروع ہوئی‘ جب اخلاق اور سائنسز زوال آشنا ہونے لگے۔ کبھی وہ وقت تھا کہ مدرسہ اسلامیہ میں چار مضمون لازم تھے اور یہ مذہبی تعلیم کا لازمی جزو تھے۔ ان میں ایک Cosmology ہے‘ علم ہیئت ہے‘ علم ہندسہ ہے اور علم منطق ہے۔ ہر اس مسلمان طالب علم کے لیے لازمی سمجھے جاتے تھے‘ جو دینی اور دنیاوی علوم کے حصول کی کوشش کر رہا ہوتا تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اتنے جدید تر فشار معلومات (Flux of Information) کے دور میں آج ہم ایسے دینی علوم کی پیروی کر رہے ہیں‘ جس میں تمام دنیاوی علوم کا اخراج باعث تفاخر سمجھا گیا ہے۔ جس میں الیکٹرانکس کو نہ جاننا‘ ریاضیاتی اصول (Mathematical Proposition) کا نہ جاننا‘ جس میں زمان و مکاں کی علم ہیئت کی رو سے تفرقی کو نہ سمجھنا‘ جس کے اندر پروردگار کی وسیع ترین کائنات بکھری ہوئی ہے۔ بے شمار کہکشاؤں کو نہ جاننا مذہب کا کمال سمجھا گیا۔ مذہبی عالم کی فراست کا یہ عالم ہے کہ وہ تمام تر جدید ترین معلومات کو نقص فطرت اور نقص اسلام سمجھتا ہے۔

جس پروردگار کے نظام میں کوئی بھی چیز غیر سائنسی اور غیر اصولی نہ ہو‘ کیا اسے بغیر علم کے سمجھا جا سکتا ہے؟ یہاں میں آپ کو ایک جدید ترین بات بتا دوں۔ اتنی حیرت انگیز کہ وہ انسان کے ذہن کو مسحور کر دے‘ کیونکہ انفس و آفاق میں پروردگار کی انسانی ذہن کو مسحور کر دینے والی ان گنت نشانیاں موجود ہیں۔ جہاں انسان نے تھوڑی سی تحقیق سے کئی غیر معمولی کائناتی مظاہر پر قابو پالیا ہے۔ ان نظری شہادتوں میں سے ایک شہادت ہبل ٹیلی سکوپ کے ذریعے سے ملی ہے کہ 11.5 بلین سال قبل کائنات میں پہلا دھاکہ ہوا تھا۔ اب جو کائنات کی عمر متعین ہوئی ہے وہ 15 بلین سال ہے اور یہ کائنات دراصل ہمارے احاطہ علمی تک ہی محدود ہے۔ عین ممکن ہے کہ جب ہم اس کائنات کے کنارے پر پہنچیں تو ایسی ہی بے شمار کائناتیں ہمارا انتظار کر رہی ہوں۔ بگ بینگ کے ذریعے صرف یہی ایک کائنات معرض وجود میں نہیں آئی جس کا تصور ہم نے کیا ہوا ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ آج سے 11.5 بلین سال قبل جو دھماکہ ہوا‘ جس نے بے شمار Galaxial

Bodies کا آپس میں تصادم ہوا' اس کی روشنی اب زمین پر پہنچی ہے اور سائنس دانوں نے اس سے بڑا عجیب استنباط کیا ہے کہ اگر ہمارے پاس ہبل ٹیلی سکوپ سے زیادہ طاقتور اور بہتر ٹیلی سکوپ ہو تو ہم اس وقت کو بھی پا سکتے ہیں جب ہماری کائنات شروع ہوئی۔ یعنی اگر آج کے دن ہم 11.5 بلین سال قبل کے آثار تک پہنچ سکتے ہیں تو ایک موثر دوربین سے ہم اس دھماکے کا سراغ بھی لگا سکتے ہیں' جو 15 بلین سال قبل ہوا تھا۔

اتنے بڑے Galaxial Order پہ جہاں اس کی وسعتوں پر فاصلے ختم ہو جاتے ہیں' جہاں Space ختم ہو جاتی ہے' جہاں صرف زمانہ ایک اکائی رہ جاتا ہے کہ جس سے ہم فاصلے ماپ سکتے ہیں اور اس طرح معمولی سے معمولی فاصلے کو بھی ناپا جا سکتا ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس لامحدود فاصلے کی پیمائش کے لیے لائٹ ایئر کو متعارف کیا گیا۔ ہم نے روشنی کی شعاع سے چلتے ہوئے ایک سیکنڈ کو لے کر اس کی بنیاد پر فاصلے گنے تو معلوم ہوا کہ یہ کائنات اتنی بڑی ہے کہ اس کی وسعت کے سامنے نوری سال (Light Year) کا پیمانہ بھی ناقص پڑ جاتا ہے۔ اب مجبوراً سائنس دانوں کو روشنی کی رفتار کے بھی Billion years strength کے پیکٹ تیار کرنا پڑتے ہیں۔ اور ان پیکٹس کو وہ بحیثیت پہلی اکائی استعمال کرتے ہیں' تا کہ ایسے بلین پیکٹس جمع کر کے شاید ہم کائنات کے ان وسیع ترین پیمانوں کو یا اس پھیلی ہوئی کائنات کی وسعتوں کو کسی قدر احاطۂ انسانی میں لا سکیں۔

اتنی بڑی وسیع کائنات کا مالک کسی طرح بھی کسی جاہل ذہن میں نہیں آ سکتا۔ کسی کم علم ذہن میں نہیں آ سکتا اور یہ کہ اس وسیع تر کائنات کے ایک طرف میکرو کارڈز بھی پھیلے ہوئے ہیں۔ کائنات بالا بھی پھیلی ہوئی ہے اور اس مختصر ترین کائنات کے بارے میں پروردگار کا ارشاد ہے:۔

وفی الارض ایت للموقنینo و فی انفسکم افلاتبصرونo (۵۱:۲۰'۲۱)(الذریت)

ترجمہ: اور زمین میں یقین والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ اور تمہارے انفس میں بھی کیا تم نہیں دیکھتے۔

گویا فرمایا جا رہا ہے کہ اگر میں نے کائنات بالا میں اپنی نشانیاں رکھ دی ہیں جو تمہیں اتنی وسیع نظر آتی ہے کہ اس کے اقطار السمٰوات سے تمہارا ذہن نکل نہیں سکتا' تو کم از کم اس کائنات کو دیکھنے کی کوشش کرو جو تمہارے اندر ہے۔ وہ نشانیاں' جو تمہارے اپنے اندر اور تمہارے اپنے سسٹم میں ہیں۔ کیا تمہیں یہ حیرت انگیز تجاوزات نظر نہیں آتے؟ بڑی باتوں کا ذکر کیا' جو جلتا ہوا چراغ ہے اس کا ذکر کیا۔ چاند کا ذکر کیا جو اس کے پیچھے آتا ہے۔ جو اس سے روشنی ادھار لیتا ہے۔ اس نے رات کا ذکر کیا جو اندھیری ہے۔ اس نے دن کا ذکر کیا' جو روشن ہے۔ اس نے زمین کا ذکر کیا' جس کی حکمت اس نے اس کے پھیلاؤ میں رکھی ہے۔ اس نے فرمایا:۔

ونفس وما سوھاO فالھمھا فجورھا وتقوھا (۹۱:۷'۸)(الشمس)

ترجمہ: اور نفس کی قسم اور اس کی کہ اسے درست کیا اور اس میں الہام کیا' اس کا گناہ کرنا اور تقویٰ اختیار کرنا۔

پھر اے حضرت انسان میں نے تمہارے نفس کو درست کیا۔ میں نے ایک Original انسان کے Makeup کو درست کیا اور پھر میں نے اس نفس انسان کو درست کرنے کے بعد' برابر کرنے کے بعد' اس میں خیر و شر کے پہلو متوازن کرنے کے بعد' اس پر میں نے الہام کیے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ پروردگار فرما رہا ہے کہ نیکی کا خیال تمہارا

Marfat.com

نہیں' شرکا، خیال تمہارا نہیں۔ دونوں طرف کے خیالات میں ہی الہام کرتا ہوں۔ میں نے ہی اس پر الہام فسق و فجور کیا۔ میں نے ہی اس پر الہام کیے نیکی اور تقویٰ کے خیالات۔ تمہارا کام صرف سوچنا' سمجھنا' غور کرنا اور انتخاب کرنا رہ گیا۔ یعنی ہر انسان کو زندگی میں اس پل صراط سے گذرنا ہوگا' علم و تعلیم کے اس معیار سے گذرنا ہوگا' اسے جانچ پرکھ کی ہر کڑی کو سیکھنا ہوگا۔ اس لیے کہ کوئی انسان خدا کی معرفت کو حاصل نہیں کر سکتا' جب تک کہ اس کے پاس علم اور شناخت نہ ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سارے علم والے تو نہیں ہو سکتے۔ وہ کہاں جائے گا جس کی گنجائش علم اتنی نہ ہو سکے' جس کی فکری کاوش شاید اس ابلاغ کے اظہار تک نہیں پہنچ سکی' جو کسی یونیورسٹی میں نہیں پڑھا' جس نے فلکیات نہیں پڑھے' جس نے علوم دینی و دنیاوی کی کوئی تکمیل نہیں کی۔ تو عقل یہاں آ کر دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ کہ محرومی عقل تو صرف مجنون کو ہے' اختلاج عقل تو صرف بے شعور کو ہے اور جہاں تک ایک بے عقل و مجنون کا ذکر ہے تو پروردگار نے بالکل واضح طور پر کہہ دیا: حدیث نبویؐ ہے کہ مجنون کو رخصت دے دی گئی ہے' مگر جس کے پاس عقل' معرفت کو سمجھنے کا پیمانہ موجود ہے' تو اللہ اس سے توقع کرتا ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ ضرور میری معرفت کو پا لے گا۔ اگر پانے کی کوشش کرے گا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے: کہ اس وقت ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ تو اس کے جواب میں' میں چند جملے تقلید کے بارے میں کہوں گا۔ ایک گروہ فکر ہے' جو تقلید کو انتہائی برا کہتا ہے اور ایک گروہ فکر ہے' جو تقلید کو ادب سمجھتا ہے۔ اور معیار اخلاق تصور کرتا ہے۔ ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ عاقل کے لیے' پڑھے لکھے کے لیے تو معرفت و تحقیق و جستجو ہے اور کم پڑھے لکھے کا معیار عقل یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے مناسب استاد تک پہنچے۔ یعنی کم پڑھے لکھے کی معراج یہ ہے کہ وہ خدا شناس تک پہنچے۔ اگر اسے تقلید ہی کرنی ہے' اگر اسے جاننے کی کوشش میں کچھ مشکل نہیں آتی ہے' اگر اسے پتہ ہے کہ میرے پاس وہ Instrument نہیں ہے' میرے پاس تو وہ سہولت موجود نہیں ہے' میں کسی جبر و اکراہ کی وجہ سے' کسی مجبوری کی وجہ سے علم کے معیار تک نہیں پہنچ سکا' جس کے لیے میں ذاتی طور پر خدا شناسی کا اہل ہو سکوں' تو اس کے لیے معراج عقل یہ ہے کہ وہ اپنے جبلی شعور کو اپنی عمومی ذہانت کو استعمال کرتے ہوئے کسی خدا شناس تک پہنچ جائے' تو اس کا کام بھی پورا ہو جائے گا اور پروردگار کی اس پر سے ذمہ داری بھی اٹھ جائے گی۔

تصور علم کے باب میں یورپ میں تمام لوگوں کی معرفت علمیہ بڑی عجیب سی تھی۔ مفکرین نے اور مبلغین فکر نے جو یورپ میں ہیں' فلسفیوں نے' دانشوروں نے جتنی بھی رائے کو جمع کیا اور علم کے بارے میں جتنی بھی رائے جمع کی انہیں مختصراً انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا ایک جملے میں یوں سمیٹتا ہے:

''تمام علم کا مطلب شعور ذات ہے۔''

یعنی یونانی' رومن' مصری دیو مالائیت سے لے کر آج تک' بابل و نینوا کے مفکرین ہوں یا وادی فرات کی تہذیب کے مفکرین' تمام تہذیبوں کے مفکرین کو سامنے رکھتے ہوئے' دور حاضر کے فلسفیوں کو سامنے رکھتے ہوئے جب ان کی آراء کا خلاصہ (Nutshell) نکالا جاتا ہے تو وہ یہی ہے کہ علم صرف اور صرف ایک ہی حقیقت ہے اور وہ ہے اپنے آپ کو جاننا یا بالفاظ دیگر ''شعور ذات۔'' اس جگہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا ایک فرق بھی بیان کرتا ہے' جو مغرب و مسلم دنیا کے مفکرین کی رائے میں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مسلمانوں میں علم کا مفہوم بالکل مختلف ہے۔ جہاں تمام غیر اسلامی مفکرین کی رائے اس امر پر

Marfat.com

متفق ہے کہ علم اور Intellectual Capacity کا مطلب ہے اپنے آپ کو جاننا وہیں تمام مسلم مفکرین کا نقطۂ نظر ہے کہ علم اور Intellectual Capacity کا مفہوم ہے ''خدا کو جاننا۔''

گویا دورِ جدید میں آ کر علم کے نقطۂ نظر کے باب میں ہمارے سامنے دو طرح کی شعوری کاوشیں آتی ہیں کہ علم کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایسی دلیل تلاش کرنا' جو علم کے نظریہ کی تصدیق کر سکے۔ نظریہ خواہ غلط ہو' خواہ صحیح' تمام علم کا مقصد یہی ہے کہ آپ جس نظریے پر قائم ہیں' اس کے مطابق دلائل تلاش کرنا اور اگر آپ اس کے مطابق دلیل تلاش نہیں کر سکے' تو جس نظریہ علم پر آپ کھڑے ہیں' وہ غلط ہے۔ اگر دلیل تلاش کر لیتے ہیں تو وہ نظریہ علم صحیح ہے' چاہے اصلاً اور فی الحقیقت وہ اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی' عملی ہو یا عمومی نوعیت کا۔ اس امر سے بحث نہیں ہے کہ وہ نظریہ علم فی نفسہٖ بھی ثقاہت اور صحت کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں' بلکہ تمام تر انحصار دلیل پر ہی کیا جائے گا کہ آپ کے نظریہ علم کی درستی اسی میں ہے کہ آپ کو دلیل مل جائے۔ کچھ مفکرین کی رائے ہے کہ علم سماجی و معاشرتی ربط وضبط (Social Relationship) کا نام ہے۔ اگر آپ کے علم سے ایک معاشرہ ہموار نہیں ہو رہا تو پھر آپ کے علم میں خامی ہے' لہٰذا ایک نئے اصول علم کی تلاش کرنا ہوگی اور ایک نئے نظریاتی استدلال کا نظم قائم کیا جائے گا' جو آپ کے معاشرتی اور سماجی بحران کو متوازن کر سکے۔

مگر یہ بات اسلام اور اہل اسلام میں نہیں ہے۔ یہاں علم کا ماخذ اللہ ہے۔ اسلام میں پہلا اور اول و آخر عالم اللہ ہے۔ اسلام میں اللہ کے بعد سب سے بڑے عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسلام میں علم کی وہ نوعیت نہیں' جو آج کے مغربی مفکرین و فلاسفر کہہ رہے ہیں۔ جیسے لارڈ برٹرنیڈ رسل کہتا ہے آج ہم تمام جدید ترین تحقیقات اور علمی کاوشوں کے باوجود حقیقت علم سے آگاہ نہیں بلکہ:

"We only know the relationship of things.

We do.not know the nature of things."

اگر یہ بات کسی عام شخص نے کہی ہوتی تو شاید نظر انداز کر دی جاتی' مگر یہ بات رسل کہہ رہا ہے' جسے اپنی صدی کا نمایاں اور سرکردہ سکالر اور فلسفی قرار دیا گیا ہے۔ جو آج کی یورپی قیادت علمیہ کا نمایاں ترین فرد ہے۔ جسے آج معزز اور مقتدر استاد کہا جاتا ہے' جس کی وفات کے بعد بیسویں صدی کو اس کے نام کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔ یہ ساری تفصیل اس لیے عرض کی جا رہی ہے تاکہ آپ کو اس کے علمی اقتدار کا اندازہ ہو سکے کہ وہ علمی اقتدار کی اس منزل پر پہنچ کر علم کی شناخت کے بارے جو بیان دیتا ہے کہ ہم صرف اشیاء کے مابین تعلق کو جانتے ہیں اور فطرت اشیاء کو نہیں جانتے' اس کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔

اب نبی امی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعا پر غور کیجیے جو آپؐ نے بارگاہ رب ذوالجلال میں فرمائی:

اللھم ارنی حقائق الاشیاء کماھی (الحدیث)

ترجمہ: اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت ایسے ہی دکھا جس طرح کہ وہ ہے۔

یعنی مغرب جس مقام علم پر اپنی بے پناہ تحقیق و جستجو کی وجہ سے پہنچا ہے' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علمی سفر کا آغاز اس مقام سے فرما رہے ہیں اور اسے اپنی امت کے لیے طلب علم کا نکتہ اول متعین فرما رہے ہیں۔

Marfat.com

یہ بات قابلِ غور ہے کہ حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ وحی ہے۔ جو کلام مقدس کا حصہ ہے وہ متلو اور جو حصہ نہیں ہے وہ وحی غیر متلو ہے۔ اس لیے کہ پروردگار عالم نے قرآن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کی ''لعمرک'' فرما کر قسم اٹھائی۔ ایسے لگتا ہے کہ خدا اپنے دوست کے ذکر پر جذباتی ہو گیا۔ یہ تو ایسے ہی ہے جس طرح کسی کے سر کی قسم اٹھانا۔ اللہ کو اپنے پیغمبر سے اتنی محبت ہے کہ وہ آپ کی عمر کی قسم اٹھاتا ہے۔ کہ اے پیغمبر محمدؐ! تیری عمر مقدس کی قسم ہے' مگر یہ اللہ کا جذباتی بیان نہیں ہے۔ یہاں عمر مقدس کی قسم اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ پروردگار نے اس وقت سے جب رسول اللہ ﷺ کا نور پہلی مرتبہ تخلیق کیا اور پھر جب خدا نے اپنے دوست کو جدا کر کے زمین پر رخصت کیا' اور پھر وہ عمر جو زماں و مکاں کے تصرف سے بالا ہے اور وہ عمر جو زمین پر ہے اور قیود زماں و مکاں میں ہے' غرضیکہ آپ کی عمر کا ہر ہر لمحہ اللہ نے گنا ہوا ہے اور جب اس ایک ایک لمحے پر اللہ کا اتنا نگران کنٹرول ہے' تو پھر اس رسول کی کوئی بات بھی بغیر حکم الٰہی کے نہیں ہو سکتی۔ کوئی بات اپنی طرف سے نہیں ہو سکتی۔ اس کا ایک لفظ بھی خدا کے فرمان سے جدا نہیں ہو سکتا' چاہے' ہمیں اجتہادی طور پر غلط ہی کیوں نہ لگے۔

ارشاد ربانی ہے:-

وما ینطق عن الھوی o ان ھو الا وحی یوحیO (۵۳:۳'۴)(انجم)

ترجمہ:''اور یہ رسول ﷺ اپنی خواہش نفس سے کچھ نہیں فرماتے' بلکہ ان کا کلام تو وہی کچھ ہے جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔''

جیسے ہمیں ایک دو احادیث پر اجتہادی طور پر غلطی کا گمان گذرتا ہے کہ آپ نے ایک بات کہی اور وہ پوری نہ ہو سکی' مگر جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑی Well-Studied Mistake تھی۔ ایک دفعہ کچھ اصحاب حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم کھجور کو پیوند لگانا چاہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تو پیوند پسند نہیں کرتا۔ ان اصحاب کرام نے اگلے سال پیوند نہیں کی! اس طرح فصل کو نقصان ہوا۔ جب وہ اگلے برس آئے تو بہت اداس تھے۔ کہنے لگے یا رسول اللہ! آپ کے کہنے پر ہم نے پیوند نہیں کی۔ فصل بڑی خراب ہو گئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسے کیا کرو جس طرح تمہارا تجربہ کہتا ہے۔

اللہ کے رسولؐ نے تجربیت (Experimantation) کو اتنی وسعت بخشی کہ آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو بھی دنیوی معاملات میں آزادانہ سوچ کا موقع دیا۔ اس حدیث کا مطلب ہے کہ آپ گمان اور وسوسوں میں نہ رہیں بلکہ تجربہ کو بھی اس کی اہمیت دیں کہ یہ خدا کی دین ہے۔ انسان کو تو ملائکہ پر برتری ہی اللہ نے ایک علمی وصف سے بخشی۔ ملائکہ کے پاس ترجیح کوئی نہیں۔ سابقہ چیز کوئی نہیں۔ علم کے تسلسل کو قائم رکھنے کی روایت کوئی نہیں۔ ملائکہ تو مخصوص پروگرام پر چلنے والی مخلوق ہیں۔ جتنا ان کو ریکارڈ میں دیا جاتا ہے اس سے آدھا لمحہ آگے جا سکتے ہیں نہ ہی پیچھے جا سکتے ہیں۔ جب استاد اول و آخر نے اپنے شاگرد کو علم سکھایا:

وعلم آدم الاسماء کلھا (۲:۳۱)(البقرۃ)

ترجمہ: اور (اللہ نے) آدمؑ کو ہر (چیز کے) اسماء کا علم سکھایا۔

Marfat.com

کہ آدمؑ تو بھی ان اسماء کو سیکھ اور اے ملائکہ تم بھی سیکھو اور میں نے جس نقطہ علم پر انسان کی معراج عقل رکھی اور جس نقطہ علمی پر میں نے تمہیں فوقیت بخشی ہے' وہ تم خود جان جاؤ۔ انسان کی زبان کے ارتقاء میں ہزاروں سال لگ گئے۔ انسان نے اشارہ سے بولنا سیکھا' پھر وہ کلام تک پہنچا۔ پہلے اس کے پاس صرف علامت تھی۔ پھر وہ علامت سے اشارے تک آیا۔ علم کائنات اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ انسان نے سب سے پہلے وہی علم سیکھا جس کی قرآن میں نشاندہی ہو رہی ہے:۔

ثم عرضهم على الملئكة فقال انبئوني باسماء هؤلاء ان كنتم صدقين (۳۱:۲)(البقرة)

ترجمہ: پھر (اللہ نے) یہ سب کچھ فرشتوں کے سامنے رکھا اور فرمایا مجھے ان کے اسماء بتاؤ اگر تم سچے ہو۔

قالوا سبحنك لاعلم لنا الاما علمتنا انك انت العليم الحكيم (۳۲:۲)(البقرة)

ترجمہ: فرشتے کہنے لگے کہ اے اللہ! تو پاک ہے' ہمیں اس کا علم نہیں۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو جاننے والا حکمت والا ہے۔

اے علیم و حکیم! ہمیں صرف اتنی بات کا علم ہے' جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے۔ اس سے آگے ہم کسی چیز کا استنباط نہیں کر سکتے۔ ہم کوئی چیز اخذ نہیں کر سکتے۔ ہم کوئی چیز اس میں شامل نہیں کر سکتے۔ ہم ماضی سے کوئی تجربہ نہیں اٹھا سکتے۔ ہم مستقبل تک وہ تجربہ نہیں پہنچا سکتے۔ یہ صرف انسان کی یادداشت کی صلاحیت ہے۔ اسے اختراعی ذہن بخشا گیا ہے۔ وہ ذہن کی ان توارادات میں فیصلہ کرتا ہے۔ وہ اپنے سابقہ زندگی سے علم اٹھاتا ہے' اسے موجود میں استعمال کرتا ہے۔ مستقبل میں آنے والی نسلوں کے لیے اشارات چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے جب پروردگار نے فرمایا کہ اے آدمؑ! تو نے اس تختی کا کیا کیا؟ تو اس نے فرفر سنانا شروع کر دیا۔ ایک ایک حرف سے اس نے ایک ایک کتاب ترتیب دی تھی اور اس کائنات میں موجود ہر چیز کا نام اس نے حروف تہجی کی مدد سے رکھ لیا تھا۔ یہی وہ علمی سعادت تھی' جو انسان کو نصیب ہوئی اور جس کو اللہ نے قائم کیا اور اس علمی سعادت کے بعد اسے عملاً ثابت کرنے کے بعد جب اس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اب اسے سجدہ کرو تو چونکہ ملائکہ اس تجربہ کی ناکامی سے گذر چکے تھے' سو وہ سجدے میں گر پڑے۔ جس کی وجہ سے اللہ نے انسان کو مقرر کیا۔ علم ہی وہ متاع ہے' جس کی بنیاد پر انسان کو اللہ کا جاننا قرار پایا۔ جب اللہ نے انسان کی ابتدا گنوائی' اس کی طبیعیاتی ترقی کا ذکر کیا' اس کی حیاتیاتی زندگی کا ارتقا گنوایا' اس کے بعد اس کے تعقل کو گنوایا تو فرمایا:۔

هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيئًا مذكورا (۱:۷۶)(الدهر)

ترجمہ:۔ انسان پر ایک ایسا وقت بھی گذرا جب وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔

بلاشبہ زمانے میں انسان پر بہت طویل عرصہ ایسا گذرا ہے' جس میں کہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی وجود کے Pattrern میں نہیں تھا۔ وہ کوئی ایلجی تھا۔ کوئی نباتاتی فارم میں' وہ کسی یک خلوی پوزیشن میں تھا۔ وہ کوئی امیبا تھا۔ وہ کیا چیز تھا کہ قابل ذکر تک نہ تھا' کیونکہ آدم تو بہت ہی قابل ذکر ہے۔ خدا تو ایک ایسے وجود کی نشاندہی کر رہا ہے اور اسے سنا رہا ہے' اسے فرمائش کے انداز میں سنا رہا ہے کہ اے حضرت انسان! کبھی تم نے اپنی ابتدا پر غور کیا؟ کبھی تم نے یہ جاننے کی کوشش کی۔ اس آیت میں دھر استعمال کیا کیونکہ دھر ایک ایسی حقیقت ہے' جس کے

Marfat.com

بارے میں کہا گیا:

لاتسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ (الحدیث)

ترجمہ: زمانے کو برا نہ کہو اللہ ہی زمانہ ہے۔

زمانے کو برامت کہو زمانہ میں خود ہوں۔ اس لیے انسان کے ناقابل تذکرہ دور کے بارے رب ذوالجلال نے دہر کا لفظ استعمال کیا اور پھر کروڑوں سال بعد وہ مرحلہ آیا:

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتلیه فجعلنه سمیعا بصیرا (۲:۷۶)(الدھر)

ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو (باہم آمیختہ) دوہرے نطفے سے پیدا کیا کہ ہم اسے آزمائیں پس ہم نے اسے سنتا دیکھتا بنایا۔

دوہرے نطفے سے مراد یہ ہے کہ انسان کو یک خلوی (Uni-Cellular) حالت سے نکال کر دوہری خلوی حالت (Double Cellular) میں ڈال دیا گیا۔ یہ ایک اتفاق کی بات ہے کہ انسان کی اس منزل کا گواہ آج بھی ہم میں موجود ہے۔ ہر آدمی میں ہر انسان میں وہ گواہ موجود ہے جسے ہم Amoeba Proteus کہتے ہیں۔ ڈاکٹر حضرات گواہ ہیں کہ انسان کو ذرا سا بھی اسہال ہو جائے تو آن کی آن میں اسے بے حال کر دیتا ہے۔ یہ اتنی زیادہ تعداد میں بڑھتا ہے۔ یہ یک خلوی مخلوق آگے چل کر دو خلوی ہو گئی۔ جب انسان کو اس طرح ارتقاء کی منزل سے گزارا گیا تو اس کا مقصود پروردگار نے یہ بیان کیا کہ میں انسان کو آزماؤں اس لیے اسے ''سمیعاً بصیراً'' بنایا گیا۔ اور یہ حیرت ہے کہ پہلا سسٹم جو تخلیقات کو دیا گیا وہ بصارت کا نہیں بلکہ سماعت کا تھا۔ اب خدا نے انسان کو سماعت اور بصارت کی منزل تک اٹھا دیا۔ مگر ابھی خدا نے انسان کو وہ استعداد نہیں دی تھی کہ وہ شناخت خداوند حاصل کر سکتا۔ ابھی تک تجربہ میں احتیاط مفقود تھی۔ مگر اگلے مرحلہ پر انسان کو امانت علمیہ سپرد کی گئی کہ اب اسے عقل و شعور بخشا گیا۔ اسے ذوق فہم اور حس جمالیات سے نوازا گیا۔ اسے نور بصیرت عطا کیا گیا۔ اس لیے یہ خلاف عقل ہوگا کہ پروردگار کسی عالم سے توقع کرے کہ وہ ان پڑھ والی بات کرے یا یہ کہ ایک بے علم اٹھ کر اس کی تبلیغ کرے یا بغیر علم و حکمت کے لوگ اس کے بارے میں بات کریں۔ وہ اس کی سخت ممانعت کرتا ہے۔ وہ یہ وضاحت کرتا ہے کہ اگر تم نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے اگر تمہیں تبلیغ کا شوق ہے تو بغیر علم کبھی بھی اللہ کو بلانے والا نہیں ہونا چاہیے:

ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی احسن۔ (۱۲۵:۱۶)(النحل)

ترجمہ:- اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور (اللہ کے منکروں سے) اچھی طرح مجادلہ (مکالمہ اور بحث و گفتگو) کرو۔

کہ اللہ کی طرف بلاؤ حکمت سے اور اچھی بات سے مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ خالی اچھی بات سے بلکہ بحث و تمحیص سے کہتا ہے۔ خدا کے لیے بحث کرو خدا کے لیے Dialectical Experiment میں جاؤ۔ اس لیے کہ جدلیات (Dialectics) کا موضوع جو آج کے فلاسفر دے رہے ہیں نیا نہیں ہے۔ یہ تصور تو صدیوں قبل قرآن دے چکا ہے۔ یہ

Marfat.com

امر باعث حیرت ہے کہ Dialectics کا ترجمہ ہی جدلیات کیا گیا ہے' چاہے وہ ہیگل کی ہو یا مارکس کی' وہ جدلیات توحید کی ہو یا مادیت کی۔ اس میں بحث ضرور کرنا پڑتی ہے اور خدا کہتا ہے ان سے بحث کرو۔ ان کی دلیل سن کر انہیں اپنی دلیل دو' مگر طریقہ ٹھیک ہونا چاہیے۔ بحث میں تعزیر نہیں ہونی چاہیے۔ غضب نہیں ہونا چاہیے۔ اہل علم کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اچھا برابرتتے ہیں اور غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے کہ پروردگار یہ کہتا ہے کہ خالی عبادات سے خوش نہیں ہوتا' میرے بہترین بندے وہ نہیں ہیں جو عبادات کے مالک ہیں' بلکہ ہر عبادت گذار سے عالم کو پہنچیں اور ہر عالم سے فقیہ کو پہنچیں۔ اس لیے کہ عالم علم کے حساب سے جانتا ہے' مگر وہ صاحب اختراع نہیں بنے اور فقیہ مخترع ہے' جو نئی صورت حال کا انتخاب کرتا ہے۔ وہ تفقه في الدين سے قائم ہے۔ عالم اور فقیہ کی مثال ایسے ہے جس طرح ابوسفیان ثوری اور امام اعظم ابوحنیفہ کی مثال ہے۔ جب ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے امام ابوسفیان ثوری سے پوچھا کہ ایک شخص ایک سیڑھی پر چڑھا ہوا تھا کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر میں اس سیڑھی سے نیچے اتروں تو تجھے طلاق ہے۔ ابوسفیان ثوری نے سوچا اور کہا کہ طلاق ہوگئی۔ اب اور کوئی چارہ نہیں رہا۔ مگر یہاں مسئلہ عائلی اور خاندانی زندگی کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا تھا' جسے امام ابوسفیان ثوری کا علم نہ سنبھال سکا۔ جب امام اعظم کے پاس گئے تو انہوں نے کہا میں چل کر دیکھوں گا۔ وہ آئے اور دیکھ کر فرمایا ایک اور سیڑھی لاؤ اور اس کے ساتھ لگادو۔ اور اس شخص کو کہو کہ وہ اس سیڑھی سے نیچے اتر آئے۔ اب ایک فقیہ ہے اور ایک عالم ہے۔ اللہ کے نزدیک وہ شخص جو علم میں گنجائش پیدا کرتا ہے' وہ عالم جو قرآن کو انسانوں کے لیے مشقت کا باعث نہیں بناتا' جو علم کو حصول علم میں آسان کرتا ہے جو علم کو تعلیل علم میں آسان کرتا ہے' وہ اتنا بڑا عالم ہے کہ خود حضور گرامی مرتبت صلی اللہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

انما بعثت معلماً۔ (حدیث)

بے شک مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا۔

حضور ﷺ نے کبھی کسی چیز پر تفاخر نہیں کیا۔ جتنا اس پر کہ اللہ نے آپ کو علم دینے والا پیدا کیا ہے۔ یہ وہ علم ہے جو معرفت انسانی کے لیے ضرورت تھا۔ دیکھئے معرفت انسانی کیا ہے؟ وہ علم کیا ہے جسے پروردگار کہتا ہے:

وفی انفسکم افلا تبصرون۔ (۲۱:۵۱)(الذریت)

ترجمہ: اور تم اپنے اندر (نفس میں) غور کرو' کیا تم دیکھتے نہیں۔

یعنی اگر تم اپنی ذات پر غور کرو اور اپنے نفس کی تربیت پر غور کرو' اپنی زندگی پر غور کرو تو تم مجھے پالو گے۔ یعنی علم کی انتہا کو پالو گے۔ یہاں یہ بات قابل تذکرہ ہے کہ خدا کے پاس علم کا اس سے زیادہ کوئی مصرف نہیں ہے کہ علم برائے زندگی نہیں، علم برائے علم نہیں بلکہ علم صرف برائے خدا ہے۔ باقی علم کا جتنا بھی استعمال ہے وہ دنیاوی اور ادنیٰ ترجیح ہے۔ ترجیح اولیٰ نہیں ہے۔ اگرچہ ادنیٰ درجوں میں انسان علم کو اور بہت سے مقاصد کے لیے بھی استعمال کرتا ہے' مگر انسانی ذہن کی فکری جستجو کی اعلیٰ ترین منزل صرف اور صرف پروردگار ہے۔ یہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ اللہ نے آپ کو علم اور کسی کام کے لیے نہیں عطا کیا۔ رہی زندگی کی بات تو یہ علم کی سب سے بڑی غلطی ہے کہ وہ زندگی کی ذمہ داری خود لیتا ہے۔ یعنی یہیں سے علم خطا کا شکار ہوا کہ بجائے اس کے کہ علم کو ترجیح اولیٰ کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے' انسان نے اسے نظر انداز

کر کے علم کو اپنی ثانوی ترجیحات کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ آج کے علم فکر اور فرد کا المیہ ہی یہ ہے کہ اس نے کم تر ترجیحات کو زیادہ توجہ دی اور اعلیٰ ترین ترجیحات کو مؤخر کر دیا ہے۔

جس علم کو اپنی ترجیح کا علم نہیں' جسے اپنے اصابت کا انشراح نہیں' جسے اپنے مقصد کی آگاہی نہیں وہ علم کبھی بھی اپنی منزل شناخت حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر آج بھی ہم علم کو اس کی صحیح ترجیح کے لیے استعمال کریں تو کسی بھی انسان کو کوئی پریشانی اور بگاڑ نہیں رہ جاتا۔ علم جبر وقدر کے مسائل حل کرتا ہے۔ آپ سوچئے کہ تمام علمی ترقی جبر وقدر تک آ کر رک جاتی ہے۔ حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب لوگ یہ سوال کرنا شروع کر دیں کہ اللہ سے پہلے کیا تھا تو وہاں سے ہٹ جاؤ۔ کیونکہ بڑی سادہ سی بات ہے کہ جو سوال کر رہا ہے وہ اپنی ذہنی استعداد سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کی معلومات نہیں ہیں۔ اس کا حساب کتاب کم ہے۔ اس کی انفارمیشن اتنی معمولی ہے کہ وہ زندگی میں اپنے قرینے درست نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنی گلی محلے کے افراد کا علم نہیں ہے۔ مگر وہ جسارت کر رہا ہے کائنات کے سب سے بڑے سوال کی! ایسے لوگ ذہنی انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔ کسی سائنس کے پاس اس کا جواب نہیں ہے کہ پہلا بادام کہاں سے آیا؟ پہلا جانور' پہلا درخت کہاں سے آیا؟ ان سب سوالوں کو حل کرتے کرتے وہ پہلے زندہ خلیہ تک تو پہنچ سکتے ہیں' مگر پھر یہ سوال رہتا ہے کہ پہلا زندہ خلیہ کہاں سے آیا؟ پندرہ ہزار سینٹی گریڈ کے جلتے ہوئے درجہ حرارت میں زندگی کا وجود کس طرح ممکن ہوا؟ اگر اس طرح کے حالات آج زمین پر پیدا ہو جائیں تو زندگی محال ہو جائے۔ اگر سورج ایک لاکھ میل آگے یا پیچھے ہو تو زندگی جل جائے یا منجمد ہو جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو ارب سال زمین جلتی رہی' اسے ٹھنڈا ہونے میں اربوں سال لگ گئے اور اربوں سال تک یہ مختلف حوادث سے گزرتی رہی۔ جہاں زندگی کا ابتدائی سراغ تلاش کرنا ایک امر محال ہے۔ انسان کو تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ انسان نے پہلے کیسے سوچنا شروع کیا؟ پہلا سوچ والا دماغ کہاں سے آیا؟ یہاں بھی انسان کی مجبوری ہے کہ وہ مفروضوں پر انحصار کرے۔ یعنی جب بھی علم اپنی حدود سے تجاوز کی جسارت کرے گا' وہ شک وشبہ میں پڑ جائے گا۔ اضطراب اور انتشار میں پڑ جائے گا۔ علم کی دو بنیادی خصوصیات ہیں:

"(۱) اپنی ترجیح کا تعین کرنا اور (۲) اپنی حدود کو متعین کرنا۔"

بہترین علم وہ ہے جس کے ہاتھ میں قینچی ہو وہ زائد کو کاٹ دے۔ وہ اس تصور کو کاٹ دے جس کی سمجھنے کی اہلیت ابھی اس میں نہیں ہے۔ اگر آپ اپنی حد سے آگے بڑھتے ہوئے ان سوالوں کا جواب ڈھونڈیں گے جن کا بنیادی ڈیٹا ہی آپ کے پاس نہیں ہے' جس کی ریڈنگ ہی آپ کے پاس موجود نہیں ہے تو آپ ایک بے چین اور مضطرب شخصیت کے مالک ہوں گے۔ جب آپ علم کو اس کی Priority دیتے ہیں' جب آپ علم کو اس کا مقصد اولین دیتے ہیں۔ جب اسے اللہ دیتے ہیں تو وہ بغیر کسی وسوسے اور فریب کے اپنی منزل حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ہر حال میں اللہ کو پالیتا ہے۔ اس کی شناخت ہے' جسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمام تحقیقات علمیہ اور تمام جسارت فکریہ کا ایک فطری انجام ہے اور وہ اللہ ہے' قرآن حکیم کے الفاظ میں:

"وان الی ربک المنتھیٰ: اور ہر ایک حقیقت کی انتہا تیرا رب ہی ہے!"

وما علینا الا البلاغ المبین O

Marfat.com

خطبہ سوم

خدا اور کائنات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا O (۸۰:۱۷)(بنی اسرائیل)

رب ذوالجلال کی عرفان ومعرفت اور علم کی حقیقت کے حوالے سے ایسے پہلو کو زیر بحث لایا جارہا ہے اور میں ایسے مباحث پیش کررہا ہوں جو شاید خدا اور کائنات کے بارے میں نہیں کیے گئے۔ رب ذوالجلال اور قرآن برس ہا برس‘ قرن ہا قرن سے تمام علمائے ظاہر و باطن سے کائنات کے بارے میں بہت آگے رہے۔ اور آج تک ایسا وقت نہیں آیا کہ حضرت انسان کی تحقیق کے باوجود اس کی جستجو پیہم میں کوئی ایسا مقام یا مرحلہ آیا ہو یا انسان قرآنی معلومات سے آگے بڑھا ہو۔ علم کی ایک نوعیت ایسی بھی ہے جو اسے روایتی علم سے الگ تھلگ کرتی ہے۔ ایک علم وہ ہے‘ جو خدا کا اپنا ہے۔ اس کی تعلیم اور اس کی Judgment بالکل الگ ہے۔ اس کا معیار اپنا ہے۔ اس اعلیٰ ترین الٰہیاتی معیار پر کوئی انسان‘ کوئی بشر اور کوئی مخلوق نہیں پہنچ سکتی۔ اس علم کلی کے عقل انسانی کے دائرہ سے ماورا ہونے کے باوجود پروردگار عالم نے اپنی کچھ رحمت انسان کو عطا کی اور کچھ علم اسے منتقل کیا‘ جو اسے سمجھنے‘ اس کی کتاب قرآن کو سمجھنے‘ اسرار کائنات اور اسرار حیات کو سمجھنے کے لیے ہے۔ ہمارے جو قدیم علماء گذرے ہیں‘ وہ علم کے متلاشی اور حقائق کے سمندر میں ڈوب کر علم کے موتی نکالنے والے تھے‘ مگر اب صدیوں سے یہ بدقسمتی ہوگئی ہے کہ آج قرآنی معیار عقل تک پہنچنے والے انسان بہت کم ہوگئے۔ وہ معیار جو اللہ نے قرآن کے فہم کے لیے متعین کیا تھا۔ اس معیار عقل کے حامل اتنے کم ہوگئے کہ گذشتہ تین چار سو برسوں سے قرآنی آیات کی جو تفاسیر اور وضاحتیں ہوئیں‘ وہ تمام تر نہ صرف محدود تھیں‘ بلکہ جملہ علوم سے بھی خالی تھیں اور تحقیق وجستجو کا وزن ان کے پلڑے میں نہیں تھا۔ خدا منتظر تھا کہ شاید کوئی مسلمان پھر سے علم کو مقصد شناخت الٰہیہ بنائے۔ شاید کوئی مسلمان علم برائے علم حاصل کرے۔ مگر بدقسمتی واقع ہوئی کہ مسلمان جو علم کو صرف خدا کے لیے حاصل کرتا تھا یا کم از کم نچلے درجے پر آکر کہیں تو وہ علم کو علم کی خاطر حاصل کرتا تھا‘ اس نے علم کو سوائے بدن کی ضرورت کے اور کہیں نہیں پہنچایا۔ حالانکہ حصول علم کے مقصد کے اس تغیر وتبدل نے ہی اس کی تاثیر کی سمت کو بدل دیا:

علم را بر دِل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

(رومی)

Marfat.com

جب علم کو آپ تسکین قلبی کے لیے' شناخت حیات کے لیے استعمال کرتے ہیں' تو یہ آپ کو غیر معمولی اور معجزہ آفریں علیت دیتا ہے۔ مگر جب علم کا حصول تمام تر بدن ہی کے لیے ہوگا' ضروریات زندگی کے لیے ہوگا یا محض ذاتی اغراض ومقاصد کے لیے ہوگا تو وہ علم کبھی بھی فہم قرآن کی سطح تک نہیں پہنچ سکتا' جو اللہ کو اس کائنات کو اور اس کائنات کے اغراض ومقاصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

کائنات کی شناخت کے موضوع کو زمان ومکاں کے تصور سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں ایسی حقیقتیں ہیں کہ ان کو ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ اگرچہ آج اضافیت اور کوانٹم پر سوچنے والے بہت سے مفکرین اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ماورائے کائنات کچھ ایسے اصول دریافت کریں' جن سے فہم کائنات آسان ہو جائے۔ مگر اس سے پہلے ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا انسان کے لیے کائنات کی تسخیر مقدر ہے؟ کیا انسان نے اس کائنات کو مسخر کرنا ہے؟ یا اس کائنات کو اور اس کی تحقیق کو انسان کے لیے صرف شناخت کا ایک آلہ بنایا گیا ہے۔ گویا اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اس جستجو وتحقیق سے کام لے کر بڑے تھوڑے سے عرصے میں اپنے رب کائنات سے آگاہی حاصل کر لیں۔ اس کے لیے ہمیں اس نکتہ آغاز کی طرف متوجہ ہونا ہوگا' جب رب ذوالجلال نے حضرت آدمؑ کی شکل میں پہلے انسان کو اس کرۂ ارض پر آباد کیا اور انسان کو اس کرۂ ارض پر اتارتے ہی ارشاد فرمایا:

ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین۔ (۳۶:۲)(البقرۃ)

ترجمہ: ''تمہارے لیے زمین میں تھوڑا سا ٹھہرنا ہے اور ایک مقررہ وقت تک کے لیے فائدہ ہے۔''

یہاں رب ذوالجلال نے مستقر فرمایا کہ یہ کرۂ ارضی انسان کے لیے کوئی مستقل جائے قیام نہیں ہے' بلکہ یہاں اس نے تھوڑا سا ٹھہرنا ہے۔ گویا انسان کی زندگی اتنی مختصر ہے کہ اگر اس کے تسلسل کو وسیع تر کائنات کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی کوئی بھی اوسط نہیں بنتی۔ کیونکہ اس کائنات کا چوتھا دور ساٹھ کروڑ سالوں سے اوپر شروع ہوتا ہے۔ گنتی میں تمام مروجہ آلات پیمائش معطل ہو جاتے ہیں۔ وہ کائنات جو اربہا ارب نوری سالوں کے فاصلوں تک پھیلی ہوئی ہے' جبکہ نوری سال کا ایک سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ سے شروع ہوتا ہے۔ اس طرح تو اتنی بڑی کائنات کو جاننے' پرکھنے کے لیے وہ عمر جو بیس سال تک اپنی آگہی حیات ہی حاصل نہیں کرتی اور جس کے آخری بیس سال بھی نذر تغافل ہو جاتے ہیں' اس مختصر سی عمر میں کائنات کی کتنی تسخیر ممکن ہے؟ مگر اس کے لیے انسان کو عقل ومعرفت کا پیمانہ اور آلہ عطا کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ رب ذوالجلال کی جستجو میں کائنات میں غور وفکر کرنا کام آئے گا۔ ارشاد فرمایا:

الذین یذکرون اللہ قیما وقعودا وعلی جنوبھم ویتفکرون فی خلق السموت والارض ربنا ماخلقت ھذا باطلا سبحنک فقنا عذاب النارo (۱۹۱:۳)(آل عمران)

ترجمہ: (اہل ایمان وہ لوگ ہیں) جو اللہ کو یاد کرتے ہیں' کھڑے' بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق میں غور کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے' پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ زمین وآسمان کی تخلیق پر غور کیا جائے اور غور وخوض اس لیے ہو کہ یہ

جاننے کی کوشش کی جائے کہ اس زمین وآسمان کا کوئی خالق ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہی اعزاز بخشا گیا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوئے' جہاں ستارے خدا تھے' جہاں علم نجوم کو آخری علم کا درجہ حاصل تھا' جہاں سیدنا ابراہیمؑ نے غور وفکر کے ذریعے لا الہ سے الا اللہ تک رسائی حاصل کی۔ نجوم و سماوات اور شمس وقمر کو خدا ماننے کے بجائے ان کے خالق کو خدا مانا اور بالآخر تجسّی طریق کار سے وہ اپنے اللہ کو جاننے میں کامیاب ہو گئے۔ (القرآن۔ ۶:۷۵ تا ۷۹)

اگر ہم جستجو خداوندا اور معرفت کائنات کے حوالے سے حضرت ابراہیمؑ کو دیکھیں تو حضرت ابراہیمؑ نے کوئی نیا کائناتی اندازِ فکر نہیں دیا۔ وہ تحصیل علوم میں یا علم کائنات میں کوئی بڑا نام نہیں سمجھے گئے' مگر اللہ کو جاننے میں وہ اتنے بڑے انسان سمجھے گئے' مقصد کائنات اور معرفت کائنات کے باب میں وہ اتنی بلند مرتبہ شخصیت قرار پائے کہ پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا:

قال انی جاعلک للناس اماما (۲:۱۲۴)(البقرة)

ترجمہ:- فرمایا اے ابراہیمؑ (تیری اس جستجو' تیری اس تحقیق' تیرے اس خلوص کے عوض) ہم نے تمہیں جملہ انسانوں کا امام مقرر کیا۔

کائنات کی تخلیق میں غور وفکر اور آج کا فکری ارتقا ہمیں کس حد تک معرفت خداوندی عطا کر سکتا ہے' اس کے لیے ہمیں آج کے علم کائنات میں ہونے والی علمی وتحقیقی ترقی کو دیکھنا ہوگا۔ آج کا علم کائنات اور علم اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تمام کائنات شروع میں چند Gases (ہیلیم اور ہائیڈروجن کی آمیزش) کا مجموعہ تھی۔ یہ بڑے بڑے بادلوں کی شکل میں تھے۔ ان بادلوں نے سکڑنا شروع کیا' خشک ہونا شروع کیا اور اس طرح اس پختگی کے نتیجے میں تخلیق کائنات شروع ہوئی۔ اگر اس حقیقت کو ہم قرآن وحدیث کی روشنی میں پرکھنا چاہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اللہ زمین وآسمان بنانے سے پہلے کہاں تھا تو فرمایا: دھند میں تھا' دخان میں تھا۔ اب قرآن حکیم کی طرف آتے ہیں:

ثم استویٰ الی السمآء وھی دخان فقال لھا وللارض ائتیا طوعا او کرھا قالتا اتینا طائعین۔ (۴۱:۱۱) (حمٓ السجدة)

ترجمہ:- پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ اور یہ دھواں تھا۔ تو اللہ نے اسے اور زمین کو کہا کہ دونوں برضا یا بغیر رضا کے اطاعت کرو۔ تو ان دونوں نے کہا ہم بخوشی اطاعت کرتے ہیں۔

یہی دخان' بادل' شہابیئے اور Siddin اور Gaseous Volumes اب بھی موجود ہیں۔ جن سے اس کائنات کا آغاز ہوا۔ اگر آج کے علماء اس انوکھی حقیقت کو جان کر پریشان اور شرمسار نہ ہو جائیں' تخلیق کائنات کے ہی عمل کو رب ذوالجلال نے یوں بیان کیا:

اولم یر الذین کفروا ان السموت والارض کانتا رتقا ففتقنھما وجعلنا من الماء کل شئی حی افلایومنون۔ (۲۱:۳۰)(الانبیآء)

ترجمہ: کیا کافر لوگ نہیں دیکھتے کہ بے شک آسمان وزمین اکٹھے تھے۔ پھر ہم نے انہیں پھاڑ کر الگ کیا۔ اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا وہ ایمان نہیں لاتے؟

Marfat.com

مگر چونکہ آج سے ایک ہزار سال پہلے اس قسم کا کوئی بھی تصور رومنوں کے طریقیاتی علوم (Methodological Sciences) میں موجود نہ تھا' یونانیوں کے طریقیاتی علوم میں موجود نہ تھا۔ Asil اور بابلیوں میں موجود نہیں تھا' میسوپوٹیمیئس میں موجود نہیں تھا۔ Aevinious میں موجود نہ تھا' اس لیے جب یہ علمی روایت آج کے عالم تک پہنچی تو وہ اس امر پر مجبور تھا کہ وہ الفاظ قرآن کو سادہ ترین معانی میں بدلے۔ مگر یہ امر باعث حیرت ہے کہ اصحاب رسولؐ نے کوئی ایسی غلطی نہیں کی۔ جس طرح ہمارے ادوار کے مترجمین نے کیا۔ جس طرح شاہ رفیع الدین نے دخان کا ترجمہ کیا کہ بلند ہوا آسمان کو اور وہ دھواں تھا۔ دھواں لفظ دخان کا ترجمہ نہیں ہے۔ شاہ رفیع الدین بہت اچھے مترجم ہیں' مگر ان کو شاید اس کا مترادف اردو لفظ نہیں مل سکا۔ پھر اس ترجمہ کو نواب وحید الزمان نے دہرایا کہ بلند وہ آسمان کو اور وہ دھواں سا تھا۔ اس طرح یہ ترجمہ پہلے سے بھی زیادہ اصل سے دور ہو گیا۔ اس پر تو اشتباہ عمومی پڑ گیا کہ وہ دھواں سا تھا' حالانکہ قرآن کہہ رہا ہے ''وھی دخان'' اور قرآن نے کسی قسم کا ابہام نہیں چھوڑا۔ دخان کی وضاحت میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:

''دخان سے مراد ایسا دھواں ہے' جس میں پانی ملا ہو۔ یعنی بخارات والا۔ یہ وہ لفظ ہے جو مرطوب گیسوں کے معنی پر پورا اترتا ہے۔ یہ گیسیں وہ بنیادی مواد ہیں' جس سے یہ کائنات وجود میں آئی۔ خدا اور اس کا رسولؐ اس مواد کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اس طرح آج کی تحقیقات کو خدا کے قریب پہنچنے کے لیے مزید سفر طے کرنا ہے۔ کیونکہ جب تک پورے قرآن کی حقانیت ثابت نہیں ہو جاتی' جب تک آیات قرآنی میں ایک بھی اشتباہ موجود ہے' اس وقت تک اللہ تعالیٰ اس دنیا میں تحقیق و جستجو کے دامن کو تنگ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ قرآن ہر حال میں اپنی حقانیت کو پورا کرے گا اور اللہ ہر حال میں اپنی سچائی کو پورا کرے گا' چاہے اس کی جستجو کا سفر مسلمان کریں یا کافر۔

مندرجہ بالا آیات کریمہ میں پروردگار عالم نے بالکل واضح طور پر قرآن حکیم میں بیان فرمایا ہے کہ ہم آسمانوں کو بلند ہوئے اور یہ بھی ہے کہ زمین و آسمان پہلے اکٹھے تھے اور ہم نے ان کو ایک بہت بڑے دھماکے سے ایک دوسرے سے جدا کیا۔ اس طرح کسی چیز کو پھاڑ کر جدا کرنا آسان نہیں ہوتا' بلکہ یہ صرف پروردگار عالم ہی کی قدرت کاملہ کے تحت ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اس کو آج Big Bang تصور کیا جاتا ہے۔ جس پر سب متفق ہیں۔ اور اس کی جزئیات کو آج کی سائنس بھی ثابت کر رہی ہے۔ جو آگے بڑھتے ہوئے مزید دھماکوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس آیت کریمہ کی تفہیم کے لیے مزید غور و فکر کرتے کہ ایک Huge Mass ہے' جو دامن سے' باطن سے پھٹ کر جدا ہو رہا ہے اور اس کائنات کے آسمان و زمین تخلیق ہو رہے ہیں' تو پھر اسی آفاقی تخلیق کے بارے میں اشتباہ نہ رہتا۔

تخلیق کائنات کے حوالے سے یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ جب پروردگار عالم آسمان بنانے کی بات کرتا ہے تو سات آسمانوں کی بات کرتا ہے اور سات زمینوں کی بات کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اللہ الذی خلق سبع سموٰت ومن الارض مثلھن۔ یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر وان اللہ قداحاط بکل شیءٍ علما O (۱۲:۶۵)

ترجمہ: اللہ تو وہ ہے' جس نے سات آسمان پیدا کیے اور سات زمینیں اس کی طرح کی ان کے درمیان اس کا امر اترتا ہے تاکہ تم جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور بے شک اللہ نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے (اپنے) علم کے ساتھ۔

Marfat.com

یعنی اس کائنات کے مابین کوئی زمین ایسی نہیں کہ جہاں حیات کا کوئی بیج نہیں اگتا اور قانون خداوند نہیں اترتا۔ باوجود اس کے کہ آج تمام سائنسی حقائق متعدد اور ان گنت شمسی وجودوں کی طرف جارہے ہیں اور اسی قسم کی جیسی ہماری مجموعہ ہائے نجوم (Constellations) ہیں۔ ہماری کہکشاؤں جیسے بے شمار سورجوں کا وجود ہے۔ جن کی طرف سائنس نشاندہی کررہی ہے۔ مگر اس وقت تک سائنس اس کائنات میں کسی دوسری حیات کا سراغ نہیں ڈھونڈ سکی اور کسی دنیا میں زندگی کا ظہور دریافت نہیں ہو سکا (ماسوائے زمین کے)۔ اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سبع سموات سے مراد اللہ نے ایک کائنات نہ لی ہو۔ ہم لوگوں کی محدود عقل ومعرفت اللہ کی کائنات کو صرف ہمارے سامنے کی کائنات تک ہی محدود کرتی ہے' جبکہ سبع سموات سے مراد ایسی ہی کئی کائناتیں ہیں۔ ہمیں ہماری ایک کائنات جس کی گہرائیوں' پہنائیوں اور اتھاہ قوتوں کو سمجھنے میں انسان ابھی تک ابتدائے حال سے بھی فارغ نہیں ہوا۔

یہاں سبع سموات سے سات کائناتوں کا استنباط اپنے ظاہری خیال سے نہیں کیا جارہا بلکہ یہ تصور براہ راست قرآن حکیم کی آیات سے لیا جارہا ہے۔ پروردگار عالم نے جب آسمان دنیا کا تذکرہ کیا تو فرمایا:

انا زينا السماء الدنيا بزينة الكواكب o (۳۷:۶)(الصفت)

ترجمہ: بے شک ہم نے آسمان دنیا کو تاروں سے سجایا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

واوحى فى كل سماء امرها وزينا السماء الدنيا بمصابيح (۴۱:۱۲)(حمٓ السجدہ)

ترجمہ: اور (ہم نے) ہر آسمان میں اپنا حکم نازل کیا اور آسمان دنیا کو ہم نے چراغوں سے سجایا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کو چراغ کہا:

وجعل القمر فيهن نورا وجعل الشمس سراجا (۷۱:۱۶)(نوح)

ترجمہ: اور ہم نے ان میں چاند کو روشن اور سورج کو دمکتا ہوا چراغ بنایا۔

آسمان کی بات کرتے ہوئے پروردگار عالم نے سماوات یعنی جمع کا صیغہ استعمال کیا اور پھر آسمان دنیا کا الگ سے تذکرہ فرمایا کہ اسے چراغوں سے سجایا گیا۔ اگر ہم اپنی ایک کھرب یا دو کھرب کے قریب کہکشانی وسعتوں کو دیکھیں تو ان میں ہمیں بے پناہ ارب ہا ارب جو سورج نظر آتے ہیں۔ یہ آسمان دنیا کے چراغ ہیں۔ قرآن حکیم ان آسمانوں کو جلتے ہوئے چراغ اور روشن شدہ چراغ کہتا ہے اور چاند کو منور شدہ۔ قرآن حکیم میں ایک آیت میں بھی چاند کو از خود روشن نہیں کیا گیا۔ اگر اللہ کے وجود کا کوئی اور ثبوت نہ ہوتا تو بھی یہی ایک حقیقت کہ پندرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے سورج اور چاند کے اس فرق کو بیان کردیا' انسان کو اللہ کی موجودگی اور اس کے وجود کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے۔ جس طرح جوش ملیح آبادی نے کہا کہ ہم جیسے اہل یقین کو ثبوتِ حق کے لیے اگر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی۔ یہ کائنات جو اپنے خالق کے وجود کی دلیل ناطق ہے۔ اپنی وسعتوں کے لحاظ سے صرف ان سات آسمانوں' زمینوں اور ان سات کائناتوں تک ہی محدود نہیں' بلکہ اس کے بارے میں قرآن حکیم کی کہی ہوئی بات بڑی مختلف سی ہے۔ قرآن حکیم اور حدیث نبویؐ اس وسعت کو ایک ہی طرح بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

Marfat.com

وسارعواالی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا السموت والارض اعدت للمتقین O (۱۳۳:۳)(اٰلِ عمران)

ترجمہ:- اور اپنے رب کی مغفرت کے حصول کے لیے جدوجہد کرو اور اس جنت کے لیے کہ جس کی چوڑائی میں آسمان وزمین آ جائیں' جو متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔

سابقوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا کعرض السماء والارض۔ (۲۱:۵۷)(الحدید)

ترجمہ: اپنے رب کی مغفرت کے لیے (ایک دوسرے سے) آگے بڑھو اور جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان وزمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔

کائنات کی یہ وسعت ادراک میں نہیں آ سکتی۔ یہ کسی دنیاوی پیمانہ یا انسانی فکر کے پیمانہ سے شمار نہیں کی جا سکتی۔ ابھی تک کوئی ایسا کمپیوٹر بھی نہیں ملا' جو وسعت افلاک کو پوری طرح ذہن میں لا سکے۔ چہ جائیکہ اس جنت کو جس کی چوڑائی میں زمینوں اور آسمانوں کی وسعتیں اور بلندیاں آ جائیں۔

کسی نے حضور گرامی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر جنت اتنی بڑی ہے تو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوزخ کہاں ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ جب دن طلوع ہوتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے؟ اگر بظاہر دیکھیں تو سوال وجواب میں کوئی مناسبت نہیں دکھتی۔ کہ سوال میں تو Space کا تذکرہ ہے' اس کی وضاحت کے لیے Space ہی سے مثال دی جا سکتی ہے۔ جیسے اس طرح کہ ہال اتنا ہی بڑا ہے جتنا بڑا باہر کا میدان۔ یعنی ان میں کوئی مماثلت ہونی چاہیے۔ مگر یہ کہنا کہ ہال اتنا بڑا ہے جتنی بڑی وہ روشنی ہے تو یہ عجیب لگتا ہے۔ مگر اس عدم مناسبت کے پیچھے آپؐ کے جواب میں ایک بڑی عجیب و غریب حکمت کارفرما ہے۔ اللہ کے رسولؐ کی یہ بات اعلیٰ ذہنی سوچوں کو کشادہ کرتی ہے اور اس سے عقل وفہم اور حیرت و استعجاب کے نئے باب کھلتے ہیں کہ جس نبیؐ کو لوگ سادہ فہم' اُمّی اور مطلق کم تعلیم یافتہ پیغمبر گردانتے ہیں' کیا آپؐ کے سوا کوئی اور اس طرح کی بات کر سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کے اس جواب سے بڑھ کر اس حوالے سے عقل کی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ ذرا اس بلیغ ارشاد کو دیکھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دن اور رات تو سورج کے محتاج ہیں۔ ایک ہی سورج' جس حصہ زمین کو منور کرتا ہے وہاں دن ہے اور دوسرے میں رات ہوتی ہے۔ تو حضور گرامی مرتبت ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ پروردگار کا جمال جہاں آفریں جدھر رخ کرے گا وہ جنت ہوگی اور جدھر سے اس کے چہرۂ مبارک کا اعراض ہوگا وہ دوزخ! اگر قرآن حکیم کو دیکھیں تو یہ حقیقت قرآن بیان کرتا ہے کہ جنت والے دوزخ والوں کو اوپر سے دیکھیں گے اور کہیں گے کاش! تمہارے اعمال اچھے ہوتے تو تم بھی ہماری طرح اس خوبصورت جگہ ہوتے اور جنت ودوزخ کے درمیان بھی ایک جگہ ہے' جسے اعراف کہتے ہیں۔ اعراف والے نیچے دیکھ کر خدا کے خوف کا اظہار کریں گے اور اوپر دیکھ کر آرزو کیا کریں گے کہ پروردگار ہمیں کبھی تو اگر معاف کر دے' بخش دے تو ہم بھی تیری جنت میں داخل ہو سکیں۔

رب ذوالجلال نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے خود کو ذی المعارج (۳:۷۰) فرمایا۔ مگر ذی المعارج کی حقیقت تاحال آج کے علوم کے ادراک میں نہیں آ سکی۔ اس حوالے سے میرا ہمیشہ سے خیال تھا کہ کائنات بالا میں ایسے کچھ چور

Marfat.com

دروازے ضرور ہیں، جہاں سے ہم رب ذوالجلال تک رسائی پا سکتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اتنی وسعتوں کو محدود کرنے والی کوئی لازمانی اور لامکانی معارج (Corridor) ضرور موجود ہے۔ جہاں سے انسان جھانکتا ہو اور اپنے پروردگار پر نگاہ ڈال سکتا ہو۔ جب ایک موقع پر امریکہ کے کچھ ریاضی اور کوانٹم کے ماہر اساتذہ اور پروفیسروں سے میری گفتگو ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ:

"This is strange they didn`t call it corridor but a few ladders, timeless and spaceless ladders, to which the latest quantum has been able to discover."

اب ایسی سیڑھیاں دیکھی گئی ہیں اور ایسی Tragectories دریافت ہوئی ہیں، جو کروڑوں میل کا فاصلہ منٹوں میں ختم کر دیں۔ اس نے خصوصاً Saturn سے Earth کے فاصلے کا تذکرہ کیا۔ اگر ہم کسی ایسی Tragectory میں داخل ہو جائیں تو یہ فاصلہ دو سے آٹھ منٹ میں طے ہو سکتا ہے۔ ابھی سائنس دان ان نتائج کو عام نہیں کر رہے۔ تاہم ان لوگوں کی تحقیق و جستجو سے ہمیں یہ بات سمجھنے میں مدد ملی کہ رب ذوالجلال نے خود کو ذی المعارج کیوں کہا؟ اسی طرح جدید سائنس کی تحقیقات اس امر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کہ جب رب ذوالجلال نے دن اور رات کے بدلنے کا تذکرہ کیا اور اس کے لیے ''لپیٹ لینے'' کے الفاظ استعمال کیے تو اس کا مفہوم کیا ہے؟ ارشاد ربانی ہے:

خلق السموت والارض بالحق یکورالیل علی النهار ویکورالنهار علی الیل وسخر الشمس والقمر۔ (۵:۳۹)(الذمر)

ترجمہ: ''اس نے آسمان اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ دن کو رات سے اور رات کو دن سے ڈھانپ دیتا ہے۔ اور اس نے سورج و چاند مسخر کیے۔''

قیامت کی نشاندہی کرنے والا رب کریم اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ اس نے انسان کو کتنا علم دینا ہے اور کس خاطر دینا ہے۔ انسان نے کتنی ترقی کرنی ہے اور کس قدر آگے بڑھ کر خدائی دعوؤں کو چیلنج کرنا ہے۔ مگر بدقسمتی سے آج کا انسان ستاروں کی گذرگاہوں کا مسافر ہونے کے باوجود اپنی زندگی کی شب تاریک کو سحر نہیں کر سکا۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اتنی تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے انسان کی تحقیقات بالآخر عرصہ زماں تک آ کر رک جاتی ہیں اور بغیر اذن پروردگار، کوئی نیا نکتہ کوئی نئی تحقیق انسان کو نہیں بخشی جاتی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر نئی تحقیق مغرب ہی کو کیوں سونپی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حکمت کے جن معانی کو قرآن نے استعمال کیا ہے ان کے لیے مسلم و غیر مسلم کی کوئی قدغن نہیں لگائی:

یو تی الحکمة من یشاء ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا۔ وما یتذکر الا اولو الالباب۔ (۲۶۹:۲)(آل عمران)

Marfat.com

ترجمہ: اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کی گئی اور نصیحت تو اہل عقل لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

اسی طرح رب ذوالجلال اولادِ آدم کی کرامت و عزت کی بات کرتا ہے:

ولقد کرمنا بنی آدم وحملنهم فی البر والبحر۔ (۱۷:۷۰)(الانبیآء)

ترجمہ: اور تحقیق ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی اور انہیں خشکی و سمندروں میں اعلیٰ مقام عطا کیا۔

اس بنی آدم میں مسلمان و غیر مسلم سبھی شامل ہیں۔ اس میں ایک فرق ضرور ہے کہ اہل مغرب اپنے مقاصد کو سنجیدگی سے لیتے ہیں اور اپنی تحقیق و جستجو کے لیے اپنی عمر کا ایک حصہ تج دیتے ہیں۔ تاہم وہاں ہمیں علم برائے خدا نظر نہیں آتا۔ مگر علم برائے علم ضرور نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے خدا نے انہیں خصوصی حکمتوں سے نوازا اور ہمارے ہاں جسے میں نے اپنی بدقسمتی کہا علم برائے علم بھی نظر نہیں آتا اور علم برائے خدا تو بالکل ہی مفقود ہے۔ اور وہ لوگ جو خدا کے نام اور اس کی نشاندہی کرنے والے ہیں' بدقسمتی سے وہ سب سے زیادہ کم علم واقع ہوتے ہیں۔ وہ خدا کی صفت علمیہ سے متعارف نہیں ہوتے' حالانکہ اللہ کے نزدیک تمام درجات انسانی علم پر ہیں:

والذین اوتو االعلم درجت۔ (۵۸:۱۱)(المجادلة)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو علم والے ہیں' ان کے درجات اللہ بلند فرماتا ہے۔

اور یہ کہ:

نرفع درجت من نشاء وفوق کل ذی علم علیم۔ (۱۲:۷۶)(یوسف)

ترجمہ: ہم جس کے درجات چاہیں بلند کرتے ہیں اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔

خداوند کریم بار بار اور مسلسل آپ سے یہ کہہ رہا ہے کہ میرے نزدیک ظاہری عبادات کے درجے نہیں ہیں۔ وہ درجے جو آپ ظاہری عبادات کے ذریعے حاصل کرتے ہیں' ان کا معاوضہ جنت ہے' ان کا معاوضہ آرام و سکون ہے۔ ان کا معاوضہ آپ کو دنیا میں بھی ملے گا۔ مگر میری شناخت' میری آگہی اور میرا دیدار کہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے' جب تک آپ درجات علمیہ میں ترقی نہ کریں گے۔ جب تک آگہی اور شعور حاصل نہ کریں گے' جب تک آپ کمال عرفان نفس اور علم نفس حاصل نہ کریں گے۔ مگر دیکھئے تو سہی ہم کمال عرفان نفس کے متعلم ہوتے ہوئے بھی تعلیمات نفسیہ کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں جانتے اور یورپ کو دیکھئے' سائیکالوجی' پیراسائیکالوجی' کلینکل سائیکالوجی' اخلاقی نفسیات کی صورت میں انہوں نے علوم نفسیہ کی مہارت میں کیا کچھ فروغ دے دیا۔ علم کے ساتھ اور اس آج کی جدید علمی و سائنسی تحقیقات کے ساتھ جس کی کچھ وضاحت عرض کی گئی آج مشاہدۂ حق کی گفتگو ہو سکی ہے' بقول غالب:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو!
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اسی طرح کچھ تصورات کے بغیر شاید کائنات ہماری سمجھ میں بھی نہ آ سکے۔ مگر یہ تصورات کہ فلسفیانہ ہیں نہ ریاضیاتی بلکہ بنیادی طور پر یہ وہ تصورات ہیں جو انسانی ذہن کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ایک عام انسان

Marfat.com

اپنے خیالات کی دنیا میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے اور دوسری طرف دنیائے ذہن کا جو بلند ترین ذہنی استعداد کا حامل ہے' وہ اپنے خیالات سے نکلتا ہے' جنہیں ہم زمان و مکاں کے تصورات کہتے ہیں۔ زمان و مکاں پر غور و فکر انسان کا بنیادی وصف ہے' ہر ذہین آدمی کہیں نہ کہیں ان تصورات پر ضرور غور کرتا ہے۔ اگرچہ یہ موضوع بہت طویل ہے اور ''زمانہ'' ہی اسے محدود کر سکتا ہے:

نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

(اقبال)

تاہم چند بنیادی فلسفی افکار کے مطابق تصور زمان و مکاں کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ لوگ جو زمانے کو غیر متغیر اور ابدی سمجھتے ہیں مثلاً زینو (Zeno, the Stoic of Elia) اور پارمینڈیز (PARMENIDES)۔ انہوں نے زمانے کو غیر متحرک سمجھا۔ ان کا خیال یہ ہے کہ زمانہ میں کوئی حرکت نہیں ہے۔ بلکہ حرکت جو ہے سراب تخیل ہے۔ دراصل یہ ایک سکوت مستقل ہے۔ یہ ایک لامتناہی امر استقلال ہے اس میں کوئی حرکت نہیں ہے۔ جیسے ایک تیر بظاہر فضاؤں سے گذرتا ہوا لگتا ہے کہ وہ کوئی فاصلہ طے کر رہا ہے مگر زینو کہتا ہے ایسا نہیں ہے۔ جب زمانے کو تقسیم کیا جائے تو تیر کہیں نہ کہیں کسی زمانے کے حصے میں ساکت ہوگا۔ دراصل یہ سکوت ہے تغیر نہیں ہے۔ مگر بہت سے لوگ ایسے آئے جنہوں نے زینو اور پارمینڈیز کے ان خیالات کے خلاف کیا۔ کچھ لوگ زمانے کو قطعاً حقیقی نہیں سمجھتے کہ زمانہ ایک سراب' ایک خیال یا ایک تصور ہے۔ ایک وہم ہے' ایک سہولت ہے جسے انسان نے اپنے معاملات کو سرانجام دینے کے لیے متعین کیا ہے۔ ان میں سے لائب نیس (Leibniz) کہتا ہے کہ زمانہ کوئی حقیقی شے نہیں بلکہ ایک اضافت مسلسل ہے۔ ایک اضافیت ہے۔ ایک کام کو دوسرے کام سے جدا کرنے کے لیے ہم زمانے کا نام لیتے ہیں۔ اگر کام جدا نہ ہوں تو زمانہ بھی نہیں ہے۔ جو کاموں میں فراغت اور فرق ڈالتا ہے اس کو از خود ہم زمانہ کہتے ہیں۔ حالات و واقعات کو اوقات میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

ان تصورات میں سائنسی جبریت (Scientific Determinism) زمانے کو اور مکاں کو کسی اور صورت سے دیکھتا ہے۔ ہمارے نظریہ جبر و قدر کے سب سے زیادہ قریب یہی ہے۔ بلکہ ایسے لگتا ہے کہ اس مغربی فکر نے مقدر کو زیادہ بہتر سمجھ لیا ہے۔ وہ کہتا ہے جبر یہ ہے کہ اللہ نے زمانے کے ایک لمحے کو ایک مقام دنیا سے جوڑ رکھا ہے اور جوڑنے والا جبار کہلاتا ہے۔ تو اللہ کا بنیادی کام یہ ہے کہ اگر وہ زمانے کو مکاں سے نہ جوڑتا تو دنیا میں کوئی کام درست طور پر نہ ہو سکتا تھا۔ کسی قسم کا کوئی واقعہ وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس صورت میں اپنے اپنے مقام پر ''کبھی تو نہیں''؛ ''کبھی ہم نہیں'' کا سا حال پیدا ہو جاتا۔ کہیں زمانہ خوف ہو جاتا تو کہیں مکاں۔ اس طرح زماں کے اندر کوئی ربط و مطابقت باہمی نہ رہتی۔ نہ پتا لگتا کہ بچے کب پیدا ہونے ہیں' نہ پتا چلتا کہ نوکری پر کب جانا ہے' زندگی کب پیدا ہو رہی ہے' موت کب آ رہی ہے؟ تو پروردگار نے انسانی زندگی کے ضبط کے لیے' پروٹوکول کے لیے' زندگی کو آسان کرنے کے لیے' حفاظتی تدابیر کے طور پر زماں اور مکاں کو اس طرح جوڑ رکھا ہے کہ ہم اس میں اپنی اپنی ساعتوں سے گذر کر اپنے اپنے مقام (مکان) کے فوائد حاصل کر رہے ہیں۔

Marfat.com

گویا لائب نیس حقیقت کو تجربہ سمجھتا ہے۔ زمانے کو ایک تجربہ سمجھتا ہے۔ ایک وہم وگماں اور خیال تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح وہ ماضی، حال اور مستقبل کو اضافتیں سمجھتا ہے۔ وہ اسے کوئی تسلسل قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ بغیر ان کے زمانے کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ حال مستقبل کی صورت میں ہماری تخلیقات اور ہماری تقسیمات ہیں۔ یہی زمانے کو معانی دیتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو زمانہ جو ایک تسلسل رواں و پیہم ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ وہ حال، مستقبل اور ماضی سے زمانے کے وجود کو سمجھتا ہے کہ زمانہ بحیثیت خود کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ زمانہ الٹتا پلٹتا ہے، زمانہ بدلتا ہے تو اس چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ صرف ہم نے جو مکانی تقسیم کی ہوئی ہے، ہم نے جو ماضی، حال اور مستقبل کا تعین کیا ہوا ہے اس لیے ہم زمانے کو ان سے منسوب کر دیتے ہیں اور زمانے کو ایک منفرد اکائی بنا دیتے ہیں۔ ارسطو اور ابن رشد نے کہا ہم واپس جا رہے ہیں، کیونکہ یہ نیا زمانہ ہے اور اس میں نئے تصورات شروع ہونے والے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ زمانہ حرکت سے ہے۔ زمانے کو حرکت پر تقدم حاصل نہیں ہے۔ حرکت زمانے میں موجود ہے اور سکون تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر زمانہ حرکت پر غالب ہے اور ایک بڑا وجود رکھتا ہے۔ حرکت اس کا جزو ہے۔ حرکت زمانے کا کوئی مستقل اور مقدر حصہ نہیں ہے۔ لارڈ رسل کو کون نہیں جانتا۔ دور حاضر کا یہ عظیم فلسفی زمانے کو فریب قرار نہیں دیتا۔ اسی طرح وہ تغیر و حرکت اور زمان و مکاں کو فریب نہیں سمجھتا، بلکہ ان سارے تصورات کو حقیقت قرار دیتا ہے۔ جو ریاضیاتی حدوں کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے وہ اس میں ریاضیاتی عنصر کو شامل کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ریاضی کے طریق کار میں جو چیزیں آ جاتی ہیں وہ فریب نظر نہیں ہوسکتیں، وہ حقیقی ہیں۔ اس لیے وہ زمانے اور تغیر کو حقیقی سمجھتا ہے۔ اقبال نے شاید اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ؎

تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است!
کشائے چشم کہ ایں خواب خواب بیداری است

(زبور عجم)

اگر تو آنکھ بند کر لے گا تو یہ سارا تصور تجھے خواب نظر آئے گا۔ مگر جب تو آنکھ کھولے گا تو یہ خواب تجھے خواب بیداری نظر آئے گا۔ آئن سٹائن کا تصور تمام تر اضافی تاثرات کے گرد گھومتا ہے۔ وہ زمان و مکاں کو باہم اضافی حقیقت تصور کرتا ہے۔ جب اس کے ہاں سہ جہتی مکاں اور یک جہتی زماں ملتے ہیں، تو یہ ہمارے لیے بھی اضافی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے بھی اضافی تاثرات ہی پیدا کرتے ہیں۔ مگر اس کی وضاحتیں تا حال نہیں آسکیں۔ اس حوالے سے جو آخری تحقیق موجود ہے، میں اس پر گفتگو کر رہا ہوں۔ جب ستاروں کی حرکت کو دیکھا گیا تو چار سمتوں سے ہٹ کر کچھ اور بھی دریافت ہو چکی ہیں۔ یعنی اب چہار سمتی تصور کی یکجائی ٹوٹ رہی ہے اور شاید اگلے دو تین برس میں مطلقاً ہی ٹوٹ جائے اور اب خیال کیا جاتا ہے کہ کثیر الجہاتی کائنات میں صرف تین، چار جہات (Dimensions) ہی نہیں ہیں، بلکہ زمانہ کی اور بھی کئی جہات ہیں۔ بقول اقبال ؎

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور بھی زمانے ہیں کئی جن کا نہیں کوئی نام

(بال جبریل)

آج مغرب میں اس حوالے سے جو جدید ترین تحقیقات ہو رہی ہیں' وہ باعث حیرت واستعجاب ہے۔ شاید آنے والے زمانے میں مطالعہ کائنات میں بے شمار جہات کا وجود انسان کے لیے ایک دردسر بن جائے گا۔

بڑی پرانی بات ہے۔ ہراقلیتوس (Heraclitus) نے کہا تھا:

"You can not step twice into the same river because other waters are ever flowing on."

کہ ہم ایک دریا سے دوبار نہیں گذرتے۔ ایک لہر جو دریا سے گذر جائے دوبارہ وہاں نہیں پلٹتی۔ اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ زمانہ متحرک ہے اور ہمیں ایک زمانے کا دو مرتبہ ادراک نہیں ہو سکتا۔ برگساں نے 1809ء اور 1914ء کے درمیان زمانے کے دوراں (Duration) کو بڑی اہمیت دی اور اسے ہی حقیقت بتایا۔ وہ سب چیزوں کو فریب تصور کرتا ہے۔ وہ جسم اور مکانی حیثیت کو فریب قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ''دوراں'' کو ہی دوام حاصل ہے۔ دوران زمانہ ہی اہمیت کا حامل اور حتمی ہے اس لیے جب اسے اقبال نے یہ حدیث رسولؐ سنائی:

لاتسبوا الدهر ان الدهرهو الله (حديث)

ترجمہ: زمانے کو برا نہ کہو بے شک اللہ ہی زمانہ ہے۔

تو اپاہج ہونے کے باوجود وہ اپنی کرسی سے اچھل کر نیچے آ رہا۔ اس نے کہا میں گذشتہ پچیس سال سے اس پر غور کر رہا ہوں اور میں نے زمانے کو ایک حتمی تخلیقی عامل کی حیثیت دی ہے کہ زماں مکاں پر اس طرح عمل کرتا ہے جس طرح سینما کی تصویریں۔ جہاں زمانے میں آپ فلم چلاتے ہیں۔ ایک وقت کے دوران وہ متحرک تصاویر کو پیش کرتا ہے۔ اسی طرح زمانے میں جو مادی وجود ہیں' وہ ایک حرکت مسلسل میں وجود پا کر آگے جاتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح زمانے میں دوراں ہی حتمی صداقت ٹھہرتا ہے۔

اسی طرح کانٹ (Immanual Kant 1724- 1804) ہیگل (Friedrich Hegel 1770- 1831) نے اپنے اپنے تصورات دیئے۔ یہ بھی زمانے کو تصوراتی حد تک ہی وجود مانتے ہیں اور اس کو تصور سے باہر کی نوع کی حقیقت ماننے سے انکاری ہیں کہ ادراک زماں ہمارے حواس پر منحصر ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ تصور زمانہ ایک خیال کا انعکاس ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ نیٹشے (Friedrich Nietzsche 1844- 1900) نے زمانے کا انوکھا تصور دیا۔ اس کا خیال ہے کہ توانائی وقت میں اپنی صورتوں کو اختتام پذیر کرتی ہے۔ جب ایک مرتبہ زمانہ تمام موجودہ تصورات کو ختم کرلے گا تو پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ ان کو دہرانا شروع کر دے گا۔ ایک زمانہ تھا جب میں نے نیٹشے کے اس تصور کا مطالعہ کیا تو اس نے مجھے بہت ہی Fascinate کیا کہ ایک وقت آئے گا جب زمانے میں موجودہ اشیاء ختم ہو جائیں گی' یہ صورتیں اور وجود ختم ہو جائیں گے تو زمانہ پھر انہیں دہرانا شروع کر دے گا۔ گویا ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب دوبارہ اس حال میں آپ مجھے بولتا ہوا پائیں گے اور میں آپ کو سنتا ہوا۔ چونکہ قرآن اس تصور کی نفی کرتا ہے سو اس طرح کا واقعہ ظہور پذیر ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ قرآن کے تصور زماں میں رجعت نہیں اقدام ہے:

وحرم على قرية اهلكنها انهم لايرجعون ۔ (۹۵:۲۱)(الانبيآء)

Marfat.com

ترجمہ: وہ بستیاں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ہے ان پر دوبارہ لوٹ آنا حرام کر دیا گیا ہے۔
اس لیے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اقبال نے سچ کہا تھا

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
اقبال اس کو بتلاتا کہ مقام کبریا کیا ہے؟

(بال جبریل)

آج تصورات بدل رہے ہیں۔ سٹیفن ہاکنگ زمان ومکاں پر گفتگو کسی اور انداز سے کرتا ہے۔ جب سے تخصصات (Compartmentalization) شروع ہوئی ہے' سائنسز اپنے مختصر سے دوائر میں قید ہوگئی ہیں اور اب کوئی بھی زمان ومکاں کی آزادی نہیں مانتا۔ بلکہ آج یہ تصور کیا جاتا ہے کہ زمان ومکاں کو ایک دوسرے سے آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ جب کائنات کی تفہیم ایک واضح اور باہم فریم ورک میں ممکن ہوگی تو متحرک زمان ومکاں کا تصور زیادہ آسان ہو جائے گا کہ زمان ومکاں باہم مربوط ہیں اور زماں' مکاں اور حرکت ایک ہی قسم کے اثرات رکھتے ہیں۔ ان کو جدا جدا کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ سب کچھ اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ زمان ومکاں پر موجود تمام مواد کا احاطہ مشکل کام ہے۔ اب زمان ومکاں کے باب میں میں اپنی ذاتی رائے رکھنا چاہوں گا۔ ذاتی اس لیے کہا کہ میں قرآن کے حتمی فہم کا دعویٰ نہیں کرتا۔ کچھ اور مفکرین آئیں گے جو دوسرے علوم میں بھی ماہر ہوں گے۔ وہ قرآن کو ایک بہتر جہت علم کے طور پر سمجھیں گے۔ اس طرح ہم جدید دنیا کو بہتر علمی سوغات دے سکیں گے۔ جس طرح اقبال نے ''پیام مشرق'' کی صورت میں مغرب کو سلام بھیجا۔ اندریں حالات ہم قرآن حکیم سے کوئی مستقل تصور زماں اخذ نہیں کر سکتے۔ زمانہ ایک انائے مطلق کے اشارے پر علیحدہ علیحدہ حرکت کرتا ہے۔ زمانہ ایک ایسی ابدیت ضرور ہے جسے ہم لامحدود نہیں کہہ سکتے:

وسخر الشمس والقمر کل یجری لاجل مسمی (۱۳:۲)(الرعد)
(۳۵:۱۳)'(۳۹:۵)

ترجمہ: ''اور (اللہ نے) سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ یہ سب ایک مقررہ مدت تک چل رہے ہیں۔''

تمام کائنات ایک مقررہ وقت تک چل رہی ہے۔ تمام تخلیقات ایک وقت مقررہ تک موجود ہیں۔ تمام کائنات وقت کے ایک مخصوص فریم میں ہے۔ اس لیے اللہ نے بھی ہمارے سامنے یہ حقیقت رکھی کہ تمہیں میں۔ سمجھ آئے یا نہ آئے' مگر کائنات کا وقت لامحدود نہیں' بلکہ محدود ہے۔ اس کی کارکردگی کس طرح ظہور پذیر ہوتی ہے' تو زمانے کی ہر حرکت کو خدا اپنے ساتھ متعین کرتا ہے۔ اپنے کلام کے ساتھ متعین کرتا ہے۔ اس کی مثال حضرت عزیرؑ کے واقعہ میں بڑے واضح انداز سے نظر آتی ہے۔ اس مثال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمان ومکاں کے پھیلاؤ کے بارے میں آج کی جدید سائنس اتنی واضح نہیں ہے' جتنا خدا کا کلام ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

والسماء بنینھا باید وانا لموسعون۔ (۵۱:۴۷)(الذریت)

ترجمہ:- ہم نے آسمانوں کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور ہم انہیں وسیع کر رہے ہیں۔

آج نظریہ اضافیت کے تحت سائنس میں یہ تصور رواج پا رہا ہے کہ دنیا پھیل رہی ہے۔ اسی طرح موجودہ

Marfat.com

سائنس آگے بڑھے گی۔ قرآن کے تصورات کی مزید تصدیق ہوتی چلی جائے گی۔ کائنات بالا کے گیسی اجسام (Gaseous Volumes) کی حرکت کے دوران عظیم تر بادلوں کی حرکت سے جو اشارات ہمیں مل رہے ہیں۔ وہ کائنات کے پھیلاؤ کو ایک مثبت خیال دے رہے ہیں اس لیے کائنات کے پھیلاؤ پر کسی قسم کا شبہ نہیں رہا۔ مگر کائنات اور زمانے کا استعمال اور رفتار کا استعمال اللہ تعالیٰ نے جس حیثیت سے کیا ہے' وہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے۔ خداوند کریم اس طرف اشارہ حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعہ میں کرتے ہیں۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام نے پروردگار سے پوچھا کہ تو مردوں کو زندہ کس طرح کرتا ہے:

او کالذی مر علی قریة وھی خاویة علی عروشھا قال انی یحی ھذہ اللہ بعد موتھا فاماتہ اللہ مائة عام ثم بعثہ قال کم لبثت قال لبثت یوما اوبعض یوم قال بل لبثت مائة عام فانظرالی طعامک وشرابک لم یتسنہ وانظرالی حمارک ولنجعلک اية للناس وانظرالی العظام کیف ننشزھا ثم نکسوھا لحما فلما تبین لہ قال اعلم ان اللہ علی کل شی ءٍ قدیرO (۲۵۹:۲)(البقرة)

ترجمہ: ''یا اس شخص کی طرح (عزیرؑ) جو ایک ایسی بستی سے گذرا جو ویران ہو چکی تھی تو کہنے لگا اللہ اسے کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا اس کی موت کے بعد۔ پس اللہ نے اسے ایک سو برس تک موت سے ہمکنار رکھا پھر اسے اٹھایا اور پوچھا تو کتنے عرصہ تک اس حالت میں رہا تو کہنے لگا ایک دن یا اس کا کچھ حصہ۔ فرمایا نہیں بلکہ ایک صدی تک۔ اب تو اپنے کھانے اور پینے کے سامان کو دیکھ کہ باسی تک نہیں ہوا۔ اور اپنے گدھے کو دیکھ تا کہ ہم تجھے لوگوں کے لیے نشانی بنائیں کہ کس طرح ہم نے اس کی ہڈیوں کو باہم جوڑا اور ان پر گوشت چڑھایا جب یہ حقیقت اس پر کھل گئی تو کہنے لگا میں جان گیا کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یہ ایک عبرتناک واقعہ ہے۔ اس واقعہ پر انسان جتنا بھی غور کرے' زمان و مکاں کی حیرت انگیز نوعیت سامنے آتی ہے کہ خداوہ ہے جو زمانے کو روکتا ہے' زمانے کو سکیڑ دیتا ہے۔ وہ زمانے کو نارمل رفتار سے چلنے دیتا ہے جیسے ہم اسے دیکھ رہے ہیں۔ اس طرح زمانہ اللہ سے باہر' اس کے حکم سے باہر کوئی وجود نہیں رکھتا۔ زمانہ وہ احساس تفریق اشیاء ہے' جو پروردگار نے انسان کے دل و دماغ میں ڈال دیا ہے۔ زمانہ اللہ کی دریافتِ اندروں کی سکیم ہے' جس کے تحت اس نے اشیاء و واقعات کو باہم Friction سے بچالیا ہے۔ اس نے مقام Friction کو معطل کرنے کے لیے زمانے کو وسعتیں بخش دیں' مگر یہ محدود ہے۔ اس کے مقدر کی ایک حد ہے۔ زمانہ مسلسل (رِوِرواں) ہے۔ زمانہ انسانی ذہن کی وہ سہولت ہے' جس کے تحت اشیاء و حوادث نارمل روٹین سے گذرتے ہوئے Friction سے بچتے ہیں اور ان میں Jumble پیدا نہیں ہوتا۔ امام شافعیؒ نے فرمایا:

الوقت سیف

یعنی زمانہ کاٹتی ہوئی تلوار ہے جو اشیاء کو الگ الگ کر دیتی ہے۔ اگر زمانہ نہ ہو تو اشیاء کی تفریق ختم ہو جائے۔ زمانہ کو پروردگار نے کلیتاً اپنی مرضی کا پابند رکھا ہے۔ جہاں چاہتا ہے اسے گذارتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اسے نہیں گذارتا۔ اصحاب کہف پر نہیں گذارتا ہم پر گذارتا ہے۔ گدھے پر گذار دیتا ہے' کھانے پر نہیں گذارتا۔ ایک دن کی وسعت سے

Marfat.com

سوسال کو چوبیس گھنٹے میں محدود کر کے اسے عزیر پر گذار دیتا ہے اور شب معراج میں پوری کائنات کا وقت ساکت کر کے واپسی پر کنڈی کو اسی طرح ہلتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ شب معراج میں اس پورے زمانے کی کسی چیز کو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرنے دیتا۔ ایک مکمل سکوت زمانہ ہے اور اس سکوت زمانہ میں حرکت اس وقت ملتی ہے' جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام ہانی کے گھر دوبارہ داخل ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مجھے پتا نہیں کہ کتنا وقت گذرا ہے' مگر جب میں اندر داخل ہوا تو دروازے کی کنڈی ابھی ہل رہی تھی۔

مگر فہم انسانی نے ابھی اپنے ارتقا کا بہت کم سفر طے کیا ہے۔ کائنات کی ان بعید سمتوں کی طرف انسان کے قدم نہیں پہنچے۔ ابھی سات زمینوں کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ کائنات کی ان سات زمینوں کا دور پہنچا ننے میں انسان نے وہ اشارے وصول کرنا شروع کر دیئے ہیں جن پر گمان ہے کہ یہ کسی اور حیات اور سرزمین سے آنے والے ہیں۔ انسان نے پندرہ کھرب نوری سال کے فاصلوں پر ایک چمکتے ہوئے شہر کو دیکھنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق وما کنا عن الخلق غفلین۔ (۲۳:۱۷)(المؤمنون)

ترجمہ: "اور بے شک ہم نے تمہارے اوپر سات راستے پیدا کیے۔ اور ہم (اپنی) تخلیق سے غافل نہیں ہیں۔"

مگر انسان ان آسمانوں کی عظیم ترین وسعتوں میں سے ابھی پہلے آسمان کی وسعت سے بھی نہیں گذرا۔

جو سوال ہمارے سامنے آغاز کلام میں تھا ہم پھر اسی سوال کی طرف پلٹتے ہیں۔ قرآن حکیم کی ایک آیت سے استنباط کیا جاتا ہے کہ انسان کبھی نہ کبھی اس کائنات کی تسخیر کو ضرور پا لے گا' مجھے بھی آپ کے سامنے اس آیت کو پیش کرنا ہے اور اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ کیا ہم اس قرآنی آیت کو سمجھنے کے بعد یہ گمان کریں کہ انسان کائنات کی کلی تسخیر کے قابل ہو جائے گا۔

یمعشرالجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السموت والارض فانفذوا لاتنفذون الابسلطن۔ (۵۵:۳۳)(الرحمٰن)

ترجمہ: "اے اجتماع جن وانس! اگر تم سے ہو سکے تو آسمانوں اور زمینوں کی حدوں سے نکل جاؤ۔ تم ان حدوں سے نہیں نکل سکتے' مگر سلطان کے ساتھ۔"

یعنی اگر تم زمینوں آسمانوں کی سرحدوں سے نکل بھاگ سکتے ہو تو نکل بھاگو مگر تم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے بڑی قوت کی ضرورت ہے۔ بغیر دلیل' بغیر قوت کے تم ان اقطار السمٰوات والارض سے نہیں نکل سکتے۔ یہاں توضیح کے دو گروہ ہوں گے۔ ایک گروہ نے یہ کہا کہ اس آیت سے تسخیر کائنات کا اشارہ ملتا ہے' ایک گروہ کہتا ہے کہ اس آیت سے مراد ہے کہ اگر تمہیں سلطان حاصل ہو جائے تو تم اقطار السمٰوات سے گذر سکتے ہو۔ دوسرے نے کہا نہیں ایسا نہیں ہے' بلکہ اللہ یہ کہہ رہا ہے کہ تم جتنی بھی قوت کو پا لو میرے زمین و آسمان اتنے وسیع ہیں کہ تم کبھی بھی اقطار السمٰوات والارض سے نہیں گذر سکتے۔ مگر تاریخ انسان و مذہب ہمیں بتاتی ہے کہ شاید دونوں معنی اس آیت کے مطلب کو پورا نہیں کرتے۔ اس لیے کہ ایک انسان زمین و آسمان سے گذرا ہے۔ ایک انسان اقطار السمٰوات والارض سے گذرا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سلطان کی تعریف قرآن خود بیان کرتا ہے:

وقل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا

Marfat.com

نصیرا۔ (۸۰:۱۷)(بنی اسرآئیل)

ترجمہ: ''اور فرما دیجیے! اے میرے رب مجھے داخل کر صدق کے ساتھ اور نکال صدق کے ساتھ اور مجھے اپنی جانب سے سلطان نصیر (مددگار دلیل ونصرت) عطا فرما۔''

سلطان نصیر کا تعلق اللہ سے ہے۔ سلطان غلبہ اور دلیل بھی ہے۔ غلبہ کی دلیل کا تعلق اللہ کی شناخت اور پہچان سے ہے۔ یہ اللہ کے جاننے سے متعلق ہے۔ یعنی آیۃ سلطان میں فرمایا کہ اگر تم خدا کو جا ہو گے' اگر پروردگار کی اطاعت کرو گے' اگر مجھے ساتھ رکھو گے کہ میں ہی اصل سلطان نصیر ہوں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پلک جھپکنے میں رات کی رات ان قیود سے نکل سکو گے:

سبحان الذی اسری بعبده لیلا من المسجدالحرام الی المسجدالاقصی الذی برکنا حوله لنریه من ایتنا انه هو السمیع البصیرO (۱:۱۷)(بنی اسرآئیل)

ترجمہ: ''پاک ہے وہ ذات جو لے گیا راتوں رات اپنے بندے کو مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرد اس نے برکت رکھی تا کہ اسے اپنی نشانیاں دکھائے۔ بے شک وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں اللہ نے اپنی قدرت اور اپنی برکت کو اس طرح ظاہر کیا کہ ایک انسان کو زمان ومکاں کے تعطل سے گذار دیا۔ ان مضبوط ترین اقطار السمٰوات سے گذار کر اپنا ظہور بخشا۔ یہاں بھی اس کی مراد یہ ہے کہ اے بندگان خدا اگر تم اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہو' مگر کسی تحقیق وجستجو کے لیے آپ کے پاس تسلسل نہیں' آپ اتنی بڑی کائنات میں اگر ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ میں بھی بدل جاؤ' تو بھی اس کائنات کی وسعتوں کو جو کھرب ہا کھرب نوری سالوں تک پھیلی ہیں' نہیں پا سکتے۔ کیونکہ تسخیر کائنات کا یہ طریق مشکل ہے۔ مگر ایک آسان ترین راہ بھی ہے۔ اللہ نے آپ کو عقل وحکمت اس لیے دی کہ زمین وآسمان کی ان تخلیقات پر غور کرتے ہوئے آپ اسم اعظم کو حاصل کر لیں۔ آپ اللہ کی دوستی کو حاصل کر لیں۔ جب کو خدا کے وجود اور موجودگی کا اور اس بات کا کہ جب آپ لا الہ سے غور کرتے ہوئے الا اللہ تک پہنچ جائیں وہ آپ کا ہمسفر ہو جائے' آپ کا ہمسایہ ہو جائے تو پھر آپ کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ آپ اقطار السمٰوات سے نکل سکو۔

جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ایک جن نے کہا میں بہت جلدی تین ہزار میل فی ثانیہ کے حساب سے آپ کے محفل سے اٹھنے تک' ظہر کے وقت تک آپ کے سامنے تخت سبا لا کر رکھ سکتا ہوں۔ مگر ایک ایسا شخص جسے کتاب کا علم دیا گیا تھا یعنی آصف بن برخیا! اس نے کہا کہ اے نبی اللہ! اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں پلک جھپکنے میں اسے آپ کے پاس پہنچا دوں:

قال الذی عنده علم من الکتب انا اتیک به قبل ان یرتدالیک طرفک (۴۰:۲۷)(النحل)

ترجمہ:۔ ''کتاب کا علم رکھنے والے نے کہا کہ میں تخت اس سے بھی پہلے آپ کے سامنے لا رکھوں گا کہ آپ اپنی پلک جھپکیں۔''

Marfat.com

خدا کی معیت میں' خدا کی نصرت کے ساتھ' اس کی تائید کے ساتھ آپ یقیناً ان لطیف ترین کائناتی دریچوں تک پہنچ سکتے ہیں' جہاں اللہ تعالیٰ آپ کو ان زمینوں اور آسمانوں کی وسعتوں سے بڑے اطمینان و آرام سے' بڑی حفاظت سے گذار سکتے ہیں۔ جب جبرائیل امین علیہ السلام آسمان اول کے دروازے پر پہنچے تو محافظ فرشتے نے کہا کہ کون؟ تو فرمایا جبرائیل۔ جواب آیا اکیلے ہو یا کوئی ساتھ ہے۔ فرمایا محمد ﷺ ہیں۔ پوچھا گیا خود آئے ہیں یا بلائے گئے ہیں؟ اس سارے سوال و جواب کے بعد فرمایا گیا اھلاً و سھلاً مرحبا! حدیث بخاری ہمیں بتاتی ہے کہ تقریباً ہر دروازہ آسمان پر اس طرح سوال و جواب ہوئے۔ یہاں اقطار السمٰوات سے گذرتے ہوئے رسول ﷺ کی ہر دروازے پر ایک گارڈ باضابطہ چیکنگ کرتا ہے۔ یہی سلطان ہے' کہ اللہ تعالیٰ نے کہا اس سفر و تسخیر کے لیے امکان تب ہے جب تم اللہ کو ساتھ لے لو۔ یہ غلط ہے کہ اس کے لیے صرف سائنسی تحقیقات ممد ہوں گی کیونکہ نہ زمین کے پاس اتنا وقت ہے' نہ آسمانوں کے پاس کہ اپنے آپ کو قائم و باقی رکھیں۔ نہ تقدیر الٰہی میں اتنی گنجائش ہے کہ آپ اتنا عرصہ زندہ رہیں اور اتنی دور جا سکیں اور جن تباہ کاریوں کے اسباب آج کے انسان نے جمع کر لیے ہیں وہ ضرور اس دنیا کو ایک بار پھر تہذیب انسانی کے اس کھنڈراتی ماحول میں پہنچا دیں گے جہاں سے' غار سے یہ چلی تھی۔ حدیث رسول ﷺ ہے کہ: ''اگر ایک قدیمی انسان نے ایک گوہ کے سوراخ میں ہاتھ دیا تو تم بھی ضرور اس گوہ کے سوراخ میں ہاتھ دو گے۔'' اور تہذیب انسانی یہ ایک اجتماعی کلیت کا توارد مرتب ہوتا ہے کہ جیسے انسان جوان ہوا' عقلمند ہوا' بوڑھا ہوا اور خاک ہوا۔ اسی طرح پوری نسل انسانیت بھی ابتدائے حال میں غار سے چلتے ہوئے' Neolithic Age سے چلتے ہوئے' نئے حجری دور سے چلتے ہوئے آج کی جدید تہذیبوں میں اپنے شعور اور اپنے شباب تک پہنچی۔ اب وہ بڑھاپے کی طرف مائل ہے۔ خداوند کریم ہمیں توفیق دے کہ ہم باقی ماندہ عرصہ میں علم کو خدا کے لیے حاصل کریں اور اس جدوجہد کی کوشش کریں کہ اگر دنیا نے باقی رہنا ہے تو خدا کے توسط سے سیکھتے ہوئے ہم دنیا سے آگے بڑھ جائیں گے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ محنت و مشقت میں سستی نہ کرنا' میری یاد میں تغافل نہ برتنا' کائناتی حقائق اور میری تفہیم میں تغافل نہ کرنا۔ اگرچہ اس راہ میں دکھ اور کوفتیں بھی ہوں گی' کیونکہ آزمانا ہماری عادت شریفہ ہے:

ولنبلو نکم بشی ء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرت وبشر الصبرین۔ (۱۵۵:۲)(البقرة)

ترجمہ: ''اور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ خوف اور کچھ بھوک اور مال و جان اور پھلوں کے نقصان سے اور بشارت ہے ان کے لیے جو (اس سب پر) صبر کرنے والے ہیں۔''

ہم آزمائیں گے ضرور' خوف سے' نقص سے' نقصان سے' بلا سے' جور سے اور جبر سے۔ انسان کو تو چاہیے کہ اللہ سے کہے کہ یہ جو جور و جبر کی آزمائش ہے یہ ہمارے پائے استقامت میں لغزش نہیں لا سکتی۔ ہمیں چاہیے کہ اللہ سے کہیں کہ ہمیں اور آزمائیے۔ ابھی ہمارا حال بہتر ہے۔ ابھی ہم آپ کے حضور اور خدمت کر سکتے ہیں۔

تو جب عہد بلا گذرے گا تو مژدہ فلاح بھی آئے گا۔ اے بندے تو عرصہ آزمائش میں غم نہ کر' اگر کوفت اور تکلیف آ جائے تو انا للہ وانا الیہ راجعون تیرا وطیرہ ہونا چاہیے۔ تو ہماری طرف رجوع کر۔ یہ نہ کہنا کہ میرا رزق کسی جادوگر

Marfat.com

نے بند کر دیا ہے۔ یہ نہ کہنا کہ مجھ پر آسیب ہو گیا ہے۔ تو رجوع ہماری طرف کر' جادوگروں کی طرف نہ کر۔ یہ نہ کہنا کہ بندشیں انسان کرتے ہیں' بلکہ جب یہ بندشیں ہو جائیں' جب کچھ تنگی اور عسرت ہو جائے تو "ان مع العسر یسرا" یاد رکھنا کہ ہر تنگی کے بعد کشادگی ہے بلاشبہ ہر تنگی کے بعد کشادگی ہے۔ اے انسان اگر تیرا رویہ یہ رہا تو:

ولا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ (۱۳۹:۳)(الِ عمران)

ترجمہ: "اور تم سستی نہ کرنا اور غم زدہ نہ ہونا اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم صاحب ایمان ہو۔"

تو مجھے اپنے جلال و اقتدار کی قسم ہے کہ میں تجھے زمین و آسمان میں غالب کروں گا اور اگر تم ان دو پہلوؤں (ولا تہنوا ولا تحزنوا) سے دامن بچا کر نکل گئے تو میرا وعدہ ہے کہ تمہیں زمین و آسمان میں غالب کر دوں گا۔ یہی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے!

وما علینا الا البلغ O

Marfat.com

خطبہ چہارم

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمO

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیراO (۱۷ : ۸۰) (بنی اسرائیل)

صحرائے گوبی میں ترکمانوں کے قافلے جب دن بھر کی تگ و تاز کے بعد رات کو اپنے خیموں کے کنارے اترتے تھے اور آگ کے الاؤ کے گرد مسحور کن داستانوں میں مگن ہو کر اپنی تھکان کو دور کرنے کا سامان کرتے تھے تو وہ نہیں جانتے تھے کہ حضرت انسان کی زندگی' اس کے واقعات اور ان کی ترتیب' زمان و مکاں میں حضرت انسان کا ظہور اور پھر اس کا فنا ہو جانا...... یہ سب کچھ ان کی سب داستانوں سے بڑی داستان ہے' اس داستان کا آغاز کب ہوا؟ ارشاد ربانی ہے:

هل اتٰی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شیئًا مذکورا (۷۶:۱)(الدهر)

ترجمہ:۔ بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گذرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نہ تھا (اس کا نام و نشان بھی نہ تھا' پھر بتدریج کئی مراحل سے گذرتے ہوئے انسان بنا)۔

یعنی اربوں سال تک انسان پر ایسا زمانہ بھی گذرا جب وہ کوئی قابل تذکرہ شے نہ تھا۔ پھر وہ مرحلہ آیا جب انسان کو ناقابل تذکرہ شے سے قابل تذکرہ شے کے مرحلے میں داخل کیا گیا۔

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتلیه فجعلنه سمیعا بصیرا (۷۶:۲)(الدهر)

ترجمہ:۔ بے شک انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا جسے ہم پلٹتے رہتے ہیں۔ پھر ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔

یہ سارے مراحل کس مقصد کے لیے تھے؟ ان کا تذکرہ الدھر: ۳ میں یوں کیا گیا:

انا هدینه السبیل اما شاکراً و اما کفورا (۷۶:۳)(الدهر)

ترجمہ:۔ ہم ہی نے اسے راہ حق دکھا دی' خواہ وہ شکر گذار ہو یا ناشکر گذار رہے۔

یعنی دراصل یہ ایک امتحان تھا کہ انسان اپنی ترجیح اولیٰ کے طور پر رب ذوالجلال کو چنتا ہے یا اس کا انکار کرتا ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ تمام حیاتیاتی مخلوقات کو ایک ہی جینیاتی مرکز سے تخلیق کیا گیا اور پھر برسوں تک انسان

Marfat.com

حیوانات سے کسی طور مختلف نہ تھا۔ اس کی اپنی کوئی بھی الگ شناخت نہ تھی۔ مدتوں تک ماہرین عمرانیات اس امر میں متردد تھے کہ انسان کا سراغ کیسے تلاش کریں اور اس حقیقت کو کس طرح دریافت کریں کہ انسان دوسری مخلوق سے کب الگ ہوا اور اس کی شناخت کا آغاز کب سے ہوا۔ اس مسلسل تحقیق کے نتیجے میں اس نوعیت کا پہلا سراغ نو کروڑ سال قبل کا ملتا ہے اور پہلے انسان نما مخلوق کا سراغ پانچ' چھ کروڑ سال قبل کے زمانے میں نظر آتا ہے۔ جب مخلوقات کے تصادم باہمی میں دو گروہ ہو گئے۔

1- وہ مخلوقات جنہوں نے زمین کی طرف رخ کیا اور زمین کے بطن یعنی سوراخ وغیرہ کو اپنا مسکن بنایا مثلاً سانپ وغیرہ۔

2- وہ مخلوقات جنہوں نے زمین کے مخالف سمت یعنی درختوں کی بلندیوں کی طرف رخ کیا۔ یہ ابتداء حیوان کہلائے۔ اس نوع کی مخلوق انسان تو نہ تھی کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں جڑے ہوئے تھے' قد چھوٹا تھا' آنکھیں برائے نام تھیں اور اس کا دماغ 475CC تھا جبکہ آج ایک نارمل بچے کا دماغ 1750CC ہوتا ہے۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس مخلوق کا ارتقاء شروع ہوا۔ اس نے اپنی جبلتوں کو ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ آنکھوں کے ڈیلے حرکت کرنے لگے۔ اگر آج کا یہ ترقی یافتہ انسان اس دور کے انسان کو دیکھ لے تو اس تصور سے ہی شرما جائے کہ کبھی اس نوع کی کوئی مخلوق بھی اس کے آباؤ اجداد میں شامل تھی۔ اس دور کا یہ انسان درختوں سے آگے بڑھنے کے لیے تگ و دو کر رہا تھا مگر یہ انسانی دور میں تب داخل ہوا جب اس نے اپنے جینیاتی رویے (Genetic Behaviour) اور اپنی جبلیت (Instinct) کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ وہ جینیاتی رویہ جو اس میں نسل در نسل چلا آ رہا تھا' وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرنے لگا اور اس نے اس پورے پیٹرن سے جدا ہونے کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

انسان کی یہ ابتدائی (Primitive) شکل معاشرے کے قابل نہ تھی مگر انسان کے اعلیٰ تر درجے تک پہنچنے کے لیے بنیاد اس کی یہی شکل تھی اور اس سے آگے بڑھتے ہوئے ہم آج کے انسان کے مرحلہ تک پہنچے ہیں۔ سائنس نے دور اول کے اس انسان کو دور جدید کے انسان کے ساتھ مشابہت کی وجہ سے Homonides کہا ہے۔ Homo انسان کو کہتے ہیں اور Homonides کا مطلب ہے انسان سے مشابہہ مخلوق مگر یہ گوریلا اور چمپینزی سے بھی زیادہ بدشکل تھے۔ تاہم یہ زندگی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ ایک آدھ دن میں نہیں ہوا بلکہ چھ کروڑ سال کے سفر کے بعد ہمیں ایک ایسی مخلوق کا سراغ ملتا ہے جو بہت ہی کمتر درجے میں انسان سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس سے آگے بڑھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کو تقسیم کرنے' انہیں تباہ کرنے' زندگی کو از سر نو شروع کرنے اور انسانی حیات میں متنوع تبدیلیاں پیدا کرنے کا باعث دو عوامل رہے ہیں:-

1- ماحولیاتی تبدیلی اور موسم کا تغیر و تبدل

2- برفانی طوفان (Glaciers) سے ہونے والی برفانی بارش (Ice Rain)

یہ برفانی بارش چھوٹی موٹی برفباری نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایک میل تہہ ہوتی تھی اور یہ اب تک چار سو ریکارڈ ہوئی ہیں۔ اسے اللہ تعالیٰ نے قطع و برید کے عمل (Process of Elimination) کے طور پر استعمال کیا کہ وہ تمام غیر مطلوبہ

Marfat.com

مخلوق ختم کر دی جائے جو اپنے اندر ارتقاء کی گنجائش نہیں رکھتی تھی یا جو بدلتے حالات میں بہتر طور پر اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتی تھی اور ایک تازہ Genetic Trend سے ابھرتی ہوئی مخلوق کو فروغ دیا جائے۔ یہ ایک طرح کا مرحلۂ انتخاب تھا جو مدتوں میں جا کر مکمل ہوا۔ ارشاد ربانی ہے:-

وجعل فیھا رواسی من فوقھا و بٰرک فیھا و قدرفیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام ط سواء للسائلین (۴۱:۱۰)(حٰمٓ السجدہ)

ترجمہ:- اور اس نے اس زمین میں اوپر سے بھاری پہاڑ رکھے اور اس میں بڑی برکت رکھی اور اس میں مخلوق کے لیے سامان معیشت مقرر کیا۔ چار دن کے اندر جو تمام طلبگاروں کے لیے یکساں ہے۔

گویا انسان کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہر اس چیز کو پیدا کیا جس کی انسان کو ضرورت تھی۔ یہ ایک عملِ انتخاب تھا جس کے تحت انسان کو مختلف مراحل سے گذارتے ہوئے پیدا کیا گیا۔ حال ہی میں تنزانیہ میں ایک ڈھانچہ ملا جو Ice age کے پگھلنے سے سامنے آیا۔ اس ڈھانچہ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ یہ انسان گھر بنانے کے لیے پتھر استعمال کرتا تھا یعنی اس نے اپنی نسل کی حفاظت کے لیے بندوبست کرنا اور عمومی زندگی میں ذرائع استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہاں سے انسان اور جانوروں میں واضح فرق شروع ہوا کیونکہ جانور ایسے ذرائع نہیں بناتے اور نہ وہ اپنی زندگی ہی کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ منصوبہ بندی کرنا ان کا کلچر نہیں ہوتا۔ یہ انسان Austro Flixin مخلوق تھی جو واضح طور پر سوچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر سوچ کی یہ ابتدائی کوشش محدود تھی جو بتدریج اضافہ پذیر تھی۔ اس کا دماغ بھی بڑھ رہا تھا جو اب 700CC ہو چکا تھا۔ یہ نوع (Species) چلی کہاں سے؟ اس کا واضح جواب ماہرین حیاتیات (Biologists) اور ماہرین بشریات (Anthtropologits) نہیں دے سکے مگر اس سارے عمل میں یہ الوہی طریق کارفرما رہا کہ وہ یک بیک کوئی کام نہیں کرتا بلکہ اس نے انسان کو عقل کی نعمت آہستہ آہستہ ودیعت کی:-

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلنه سميعا بصيرا o (۷۶:۲)(الدھر)

ترجمہ:- بلاشبہ ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا تا کہ اسے آزمائش میں ڈالیں اور اسے ہم نے سننے والا' دیکھنے والا بنایا۔

اسی انسان نے آگے بڑھ کر عظیم ذمہ داریوں کا حامل بننا تھا۔ اس کے بتدریج ارتقاء کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ایک گوریلا کا دماغ 850CC ہے جبکہ Austro Flixin انسان کا دماغ 700CC تھا۔ اس کے بعد دس' بیس لاکھ سال قبل کے درمیان افریقہ اور یورپ میں ایک اور انسان کا سراغ ملا جسے Homo Habilis یا Homo Erectus کہا گیا ہے۔ یہ نسبتاً چالاک تھا۔ اس کا نشان کلہاڑا ہے۔ یہ اس کی دھار تیز کرنے کے فن سے آگاہ تھا۔ یہ شکاری تھا اور اپنے منصوبہ بنا سکتا تھا۔ اگر آج ہم انسان کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آج لوگوں کو غم روزگار ہی اتنا زیادہ ہے کہ خدا کے خیال کے لیے کسی کے پاس فرصت ہی نہیں ہے۔ یہی المیہ اس دور کے انسان کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا جس کا ادراک خداوند تعالیٰ کو بھی تھا' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے جانور پیدا کیے جو ہاتھی سے بھی بڑے تھے۔ ان جانوروں کا شکار کرنے کے بعد انسان کے پاس بڑا وقت بچتا تھا کہ وہ کچھ وقت ذات باری تعالیٰ کے لیے غور و فکر کرنے میں بھی صرف

Marfat.com

کر سکے۔اس طرح کا ایک واقعہ ہمیں دور نبوت میں بھی ملتا ہے کہ جب صحابہ کرامؓ ایک مرتبہ جہاد پر گئے ہوئے تھے تو ان کی خوراک ختم ہو گئی۔بھوک کی شدت نے جب انہیں آ گھیرا تو انہوں نے دعا کی۔ایک جانور پانی سے باہر آیا جو اتنا بڑا تھا کہ اس کے جبڑے کے نیچے سے اونٹ نکل جاتا تھا۔صحابہ رسولؐ اسے مہینہ بھر کھاتے رہے۔اسی طرح زمانہ قدیم میں بڑے بڑے جانوروں کو پیدا کرنے میں حکمت تھی کہ وہ کچھ دیر کے لیے فکر معاش سے آزاد ہو کر غور و فکر اور تفکر کر سکیں۔

اس انسان نے جسے Homo Erectus کہتے ہیں' آہستہ آہستہ سیدھا چلنا شروع کر دیا۔اس کا نشان کلہاڑا تھا۔اب اس کا دماغ 950CC سے 1050CC ہو چکا تھا۔یہ بات قابل غور ہے کہ آج انسانی بچے کا دماغ 1750CC ہوتا ہے۔اگر چہ اس مرحلے پر اس کا دماغ بڑھ چکا تھا مگر یہ انسان نہیں تھا۔ابھی صرف انسان کے آباؤ اجداد آ رہے تھے اور کاروان حیات بتدریج آگے بڑھ رہا تھا۔

اس کے بعد جرمنی میں انسان کا ایک سراغ ملا۔یہ ایک دو سے لے کر آٹھ دس لاکھ سال پہلے کا انسان ہے۔ اسے Homo Sapian Neamderthen کا نام دیا گیا۔یہ بھی آج کے انسان کے آباؤ اجداد میں شامل تھا۔اس میں بہت سی صفات تھیں جو اس سے پہلے کے انسان میں موجود نہیں تھیں یعنی ہر لحاظ سے ارتقاء جاری تھا۔غور و فکر اور تفکر کی جس نہج پر قدرت انسان کو چلانا چاہتی تھی' اس کے اثرات اس کی خارج کی زندگی میں نظر آنے لگے تھے۔یہ انسان اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔اسی دور سے تعلق رکھنے والے ایک بچے کی قبر تاشقند میں اور ایک بڑے فرد کی قبر عراق میں ملی ہے۔یہی نہیں بلکہ اس دور کے انسان کے اندر فن کی حس و شعور بھی موجود تھا۔وہ آرٹ جانتا تھا اور اپنے اعزہ کی قبروں پر پھول بھی چڑھاتا تھا مگر کیا اس دور کے انسان کے پاس خدا کا تصور بھی موجود تھا؟ ہرگز نہیں۔کیونکہ ابھی اس کی ذہنی استعداد اتنی بلند نہیں ہوئی تھی کہ وہ خدا کا تصور کر سکتا اور معرفت خداوندی کے بوجھ کو اٹھا سکتا۔تاہم اس میں اور اس سے پہلے دور کے انسان میں اتنا فرق ضرور تھا کہ اس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔اس میں اخلاقیات کو واضح کیا جانے لگا تھا۔عورت اور مرد الگ الگ ہو چکے تھے اور اچھے برے کی تمیز کے پیمانے وضع کیے جانے لگے تھے۔اس لیے اس دور کے انسان کو Homo Sapian کا نام دیا گیا۔Homo انسان اور Sapian سوچنے والے کو کہتے ہیں یعنی سوچنے والا انسان۔چونکہ باقی جانوروں کی نسبت انسان کا بچہ دیر سے بڑا ہوتا ہے' اس لیے اس دور کے انسان نے اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے بھی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔اس نے کالونیاں بنانا شروع کر دی تھیں۔

اگر چہ انسان کے شعور میں ارتقاء بتدریج جاری تھا مگر اس کی عقل' شعور اور تفکر کی صلاحیت کے ارتقاء میں بڑی پیش رفت تب ہوئی جب کسی نوع نے اپنے Genetic Code کی صدیوں کی روایات کے خلاف بغاوت کر دی۔یہ بغاوت بھی Homo Sapian Neamderthen ہی کے دور میں وقوع پذیر ہوئی۔

اس کے بعد Homo Sapian کا دور آیا۔اس کے بعد پتھر کا قدیم زمانہ آیا۔ایک ترقی یافتہ اور بلوغت شدہ انسان کا سراغ آج سے دس ہزار سے پچیس ہزار سال پہلے کے عرصے میں ہے۔یہ ایک بہتر اور برتر انسان تھا جس نے طویل صدیوں کا سفر طے کر کے یہ منزل حاصل کی تھی۔اس نے اپنے کلچر کی تشکیل شروع کر دی تھی اور اپنے لیے' اپنے معاشرے کے لیے قوانین بنانے کا آغاز کر دیا تھا۔آدمؑ کا وجود اسی عرصے میں ہے۔جب انسان نے شعور کی اعلیٰ منزل کو

حاصل کر لیا تھا اور وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ وہ توحید اور معرفت ربانی کی عظیم امانت کا بار اٹھا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول کر سکتا اور اس کے عطا کردہ حسن و قبح' اچھے و برے کے معیار پر مبنی زندگی کو اختیار کر سکتا۔ جب رب ذوالجلال نے انسان کو اپنا خلیفہ فی الارض بنانے کا فیصلہ کیا اور فرشتوں کو جب اس مشیت ایزدی کا علم ہوا تو ان کے سامنے Homo Sapian Neamderthen تھا۔ جو فکر و شعور میں پست اور فطرت و طبیعت کے لحاظ سے بھی اتنا زیادہ بالیدہ اور مہذب نہ تھا۔ اسی لیے جب رب ذوالجلال نے فرمایا:

واذ قال ربک للملٰئکة انی جاعل فی الارض خلیفة (۲:۳۰)(البقرة)

ترجمہ:- اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک نائب بنانے والا ہوں۔

تو اس کے جواب میں:

قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفک الدماء (۲:۳۰)(البقرة)

ترجمہ:- فرشتوں نے عرض کیا (اے پروردگار) کیا تو زمین میں ایسے کو نائب بنائے گا جو شر و فساد پھیلائے گا اور خونریزی کرے گا۔

اسی طرح کا مضمون ہمیں ایک حدیث میں ملتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو معتبر اور معزز قرار دے کر اسے اپنا خلیفہ فی الارض بنانے کا اعلان فرمایا تو ملائکہ نے کہا ''اے پروردگار تو اسے اپنا خلیفہ بنائے گا جو کھاتا پیتا ہے' مباشرت کرتا ہے' دنیا داری کے حقیر امور میں مصروف رہتا ہے تو دنیا انہیں دے دے اور آخرت کی عزت و شرف ہمیں عطا کر دے۔'' تو اس پر رب ذوالجلال نے ارشاد فرمایا ''اے ملائکہ۔ میں نے تمہیں حرف ''کن'' سے پیدا کیا ہے مگر انسان کو ''کن'' سے نہیں بلکہ اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ تم برابر نہیں ہو سکتے۔''

Homo Sapian ہی کا زمانہ ہے۔ جب انسان نے شعور کی پہلی جھلک کو پایا۔ یہ آج سے دس ہزار سے چالیس ہزار سال قبل تک کا زمانہ ہے۔ جب انسان نے اپنے شعور کو پوری طرح استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس پورے ارتقائی عمل سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب تک ایک مسلسل تجرباتی دور مکمل نہ ہو' کوئی اصول وضع نہیں ہوتا اور جب تک انسان نے اپنے شعور کو مکمل طور پر استعمال کرنا شروع نہیں کر دیا' اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی ہدایت کو محفوظ اور غیر منزل ہی رکھا۔ تاآنکہ وہ دور آیا' جب حضرت آدمؑ کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا گیا۔ عین ممکن ہے کہ صحیفہ آدمؑ ایک ہی آیت یا ایک ہی ہدایت پر مشتمل ہو۔ چونکہ آدم کو ان تمام داخلی اور خارجی حالات میں بے شمار حالات کو از سر نو سیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک نئے ماحول میں ایک نوع کے ترتیبی اور ارتقائی دور میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس لیے انہیں ایک حکم اور ایک آیت کا سہارا دیا گیا کہ تم نے اس پر عمل کرنا ہے۔ زندگی کے ایک محدود سے حصے میں انہیں حکم الٰہی کا پابند کیا گیا جبکہ بقیہ زندگی میں انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا کیونکہ ابھی اس انسان کا دماغ اور ذہن اتنا بالیدہ نہ ہوا تھا کہ وہ زیادہ احکام کا بوجھ اٹھاتا۔

اس لیے آدمؑ کی عمر بھی ایک ہزار سال ہے کیونکہ اس دور کے انسان کا ذہن اتنا زیادہ فنکشنل نہیں تھا۔ اندریں حالات یہ ایک قدرتی بات تھی کہ عمر زیادہ عطا کی جاتی تاکہ تفکر اور غور کے لیے زیادہ وقت مل سکتا۔

تاریخ انسانیت میں یہ ایک الوہی اصول رہا ہے کہ کسی بھی نسل انسانی میں پیغمبر وہی ہوتا ہے جو نہ صرف ہدایت

Marfat.com

یافتہ ہوتا ہے بلکہ اپنے معاشرے کا اعلیٰ ترین ذہن بھی ہوتا ہے کیونکہ اگر معاشرے میں نبی سے سوا کوئی دوسرا زیادہ ذہین فرد بھی موجود ہوتو یہ انصاف سے بعید ہوگا۔ گویا امانت علم اسے ہی ملے گی جو زیادہ سے زیادہ ذہین ہوگا۔ چونکہ آدمؑ اس دور کی نسل انسانی میں ذہین ترین فرد تھے' سو آپ کو پیغمبری اور رہبری کے لیے چنا گیا۔ اس طرح ہدایت اور شرف انسانیت کو عطا کیا گیا۔

انسان کو موجودہ ارتقائی دور تک پہنچنے میں کروڑوں سال لگ گئے کیونکہ وہ جبلت جو جانوروں سے مشابہ تھی' اس سے ایک آدھ صدی میں انسان الگ نہ ہو سکتا تھا۔ اسی جبلت کو ''نفس'' کہتے ہیں جو ان خصوصیات پر مشتمل ہے جو انسان نے جینیاتی طور پر وراثہ میں حاصل کی ہیں۔ مثلاً قتل و غارت گری' حملہ آوری' نفرت اور اس طرح کے دیگر عیب۔ انہی کے خلاف انسان کی جد و جہد اسے خدا تک لے جاتی ہے۔

واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى (۷۹:۴۰)(النذعت)

ترجمہ:۔ اور جو کوئی (قیامت کے دن) اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور اپنے نفس کو (ہر بری) خواہش سے روکا ہوگا (اللہ کے حقوق ادا کرنے میں نفس پر قابو پایا ہوگا۔ اپنے نفس پر دوسروں کو ترجیح دی ہوگی اور دوسرے کے فرائض ادا کیے ہوں گے' انہی کے لیے فلاح ہے)

آج کی جدید حیاتیات اور علم بشریات کی تحقیقات کا نتیجہ سامنے آیا ہے کہ انسان کی عقل کا آغاز اس وقت ہوا' جب اس نے جبلی اقدار کے خلاف لڑنا شروع کیا۔ جب انسان اس تجربے سے گزرا اور جوں جوں اس کے تفکر' تعقل اور شعور نے ارتقائی منزلوں کو طے کیا' اس کی یہ لڑائی شدید تر ہوتی گئی۔ اس دوران اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی رہنمائی میسر رہی۔ اہل مذہب یہ سمجھتے ہیں کہ انسان اوپر سے بھیجا گیا ہے اور دوسرے لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ انسان کی تخلیق و ارتقاء ایک فطری عمل ہے۔ کوئی علم اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اس سوال کو حل نہیں کر لیتا۔ چونکہ اس کا حل صرف میسر ذرائع سے ہی ممکن نہیں ہے۔ سو انسان کی Colonial Plantation کا پورا پورا حل ہمیں تب ملتا ہے' جب ہم خدا کی طرف دیکھتے ہیں۔

نوحؑ نے 950 سال تک اپنی قوم کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وحدت کا پیغام رکھا مگر معاشرے کی طرف سے آپ کو مثبت جواب نہ ملا کیونکہ ابتدائی انسان کی جبلت اس میں حائل تھی۔ جبلت ہی کی اس جنگ میں آپ کا بیٹا بھی چلا گیا۔ اتنے طویل عرصہ تک تبلیغ کے باوجود آپ کو صرف چند افراد ہی ایسے ملے جنہوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسے قبول کیا۔ کیا آپ کی دعوت میں نقص تھا؟ پیغام موثر نہ تھا؟ دراصل اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ مضبوط ترین جبلی گرفت میں تھے جو انہیں راہ نبوت پر آنے سے روکتی تھی۔ اگرچہ اس امت پر اتنا زیادہ بوجھ نہ ڈالا گیا تھا مگر صرف دعوت توحید کو قبول کرنا بھی ان لوگوں کو گوارا نہ تھا۔ آج اگر ہمیں اس طرح کی دعوت دی جائے کہ صرف خدا کو واحد مانو اور کام چھوڑ دو تو ہم جشن منائیں مگر ہم پر اس کے سوا بھی قوانین الٰہی کا بوجھ ہے جبکہ اس وقت ایک قانون بھی لوگوں سے برداشت نہ ہوتا تھا۔ چونکہ شعور کا ارتقاء مکمل نہ ہوا تھا' اس لیے اس کے لیے آنے والا پیغام بھی مکمل نہ تھا۔

اس کے بعد تاریخ کی ایک بڑی شخصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جن کے کردار کی عظمت اور مثالی ہونے

Marfat.com

کو قرآن یوں بیان کرتا ہے:-

ان ابراھیم لحلیم اواہ منیب (۱۱:۷۵)

ترجمہ:- بے شک ابراہیم بڑے بردبار، رقیق القلب اور ہر وقت خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

آپ کی عظمت کو رب ذوالجلال نے بیان کیا اور آپ کی کوئی ادا اتنی پسند آئی کہ آپ کو رب ذوالجلال نے خلت کے مقام پر فائز کیا۔ آپؑ نے اللہ کی تلاش کے لیے عقل کو کمال احسن طریقے سے استعمال کیا۔ آپ کی تلاش حق کے طریقے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں استدلال، استنباط اور استخراج کے رویئے پیدا ہونے شروع ہو گئے اور انسانی ذہن کتنا پختہ ہو گیا۔ وہ انسان جو جانوروں کی سطح سے اٹھا تھا، اس سے ایک اعلیٰ درجے کا ذہین شخص پیدا ہوا جو ہر معاملے میں چھان بین اور تحقیق کر رہا تھا۔

فلما را الشمس بازغة قال ھذاربی ھذا اکبر فلما افلت قال یقوم انی بری مما تشرکون انی وجھت وجھی للذی فطر السموت والارض حنیفا وما انا من المشرکینO (۶:۷۸، ۷۹)(الانعام)

ترجمہ:- پھر جب آپ نے سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا (کیا) یہ میرا رب ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ غروب ہو گیا تو بول اٹھے، اے میری قوم میں ان سب سے جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو، بیزار ہوں۔ میں نے تو اپنا منہ اسی ذات کی طرف یکسو ہو کر کر لیا جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

یعنی تمام امکانات کو سامنے رکھ کر ابراہیمؑ اس نتیجے پر پہنچے کہ خدا لازوال ہونا چاہیے۔ اب انسان عموم (General) سے خصوص (Particular) کی طرف آ رہا تھا۔ اب استقرائی اور استخراجی منطق کی تکمیل ہو رہی تھی اور یہ عمل حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے تکمیل پا رہا تھا کیونکہ پیغمبر سے زیادہ ذہین اس کے دور میں کوئی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانے میں تمام حکومتیں Theocratic ہوتی تھیں یعنی مذہبی لوگ ہی حکمران بھی ہوتے تھے اور رہنما بھی۔ پیغمبروں کو حکمت اور حکم دونوں چیزیں عطا ہوتی تھیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ کے لیے فرمایا گیا:-

واذا بتلی ابراھیم ربہ بکلمت فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماما۔ (۲:۱۲۴)(البقرۃ)

ترجمہ:- اور (یاد کرو) جب حضرت ابراہیمؑ کو ان کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو وہ پورے اترے تو اللہ نے فرمایا، میں تم کو سب لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔

یعنی جب رب ذوالجلال نے آپ کو آزمالیا اور مطلوبہ امتحان سے گذار لیا تو پھر آپ کو نسل انسانی کا امام بنایا۔ وہ بنیادی خصوصیت جس کی بنیاد پر ابراہیمؑ کو امام بنایا گیا، وہ شعور و عقل کی گراں مایہ دولت تھی جو اللہ نے انسان کو عطا کی اور یہی انسان کو بنانے کا مقصد تھا جس کے لیے ہدایت آتی رہی کہ انسان ہدایت ربانی کی بنیاد پر اپنی عقل اور شعور کو استعمال کرے اور اسے حضرت ابراہیمؑ نے اتنی عمدگی کے ساتھ استعمال کیا کہ دنیاوی مظاہر سے آپ ذات باری تعالیٰ تک جا پہنچے۔ آپ کے ہی زمانے میں حضرت لوطؑ بھی تھے مگر آپ کی قوم میں بدبختی جاری تھی کیونکہ قوم لوط میں جانوروں جیسے رویے کی گرفت مضبوط تھی اور جب وہ اس گرفت سے نکلنے پر تیار نہ ہوئے تو رب ذوالجلال نے اس قوم کو نشان زدہ پتھروں سے تباہ و برباد کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ تمام پسماندہ قومیں تباہی سے دوچار ہوئیں۔ کسی کو مسخ کر دیا گیا اور کوئی طوفان اور زلزلوں

Marfat.com

کی نذر ہوگئی کیونکہ تباہ ہونے والی قومیں جانورانہ جبلت کی طرف مائل تھیں۔عقل سے کام نہ لینے کی وجہ سے ان پر ہر نوع کی نصیحت بے اثر اور ناکارہ تھی اور انہوں نے معاشرے میں بطور انسانی رویہ کے اپنی نااہلیت ظاہر کر دی تھی۔تعقل، تفکر اور الوہی پیغام کو قبول نہ کر کے انہوں نے Total Failure ریکارڈ کر دی تھی اور اللہ کے پاس ان کی تباہی (Elimination) کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔اگرچہ اب بھی اس نوع کی گمراہیاں نظر آتی ہیں مگر اس زمانے میں اقوام کو پہلے کی طرح عذابوں سے نہیں تباہ کیا جاتا۔اگرچہ اب عادات جانورانہ ہیں مگر عقل و شعور پختہ ہے۔اس لیے توقع رکھی جاتی ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ اپنی روش بدل لے گا۔

اس کے بعد موسیٰ کا زمانہ آیا ہے۔آپ کا زمانہ 1170 قبل از مسیح کا زمانہ ہے۔آپ نے ایک گری پڑی قوم کو عزت سے آشنا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔اگرچہ قوم موسیٰ میں عقل و تفکر نظر آتا ہے مگر اس کا استعمال تلاش حق کے لیے وہ کم ہی کرتے تھے۔عقل و فکر کے ہوتے ہوئے بھی وہ تعقل سے عاری اور جبلت سے مغلوب تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب انہیں موسیٰ کی طرف سے کچھ احکام دیئے گئے تو انہوں نے عقل کو اسی نہج پر استعمال کیا جہاں ان کے نفس کی ضرورت پوری ہوتی تھی:۔

ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت فقلنا لهم کونوا قردة خسئینO(۲:۶۵)(البقرة)

ترجمہ:۔اور اے یہود! تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو۔انہوں نے ہفتہ کے دن زیادتی کی تھی (یعنی ہفتہ کا دن عبادت کے لیے تھا' اس دن مچھلی کا شکار منع تھا۔انہوں نے حیلہ سے اس دن شکار کرنا شروع کیا اور عدول حکمی کی) تو ہم نے ان سے کہا تم ذلیل بندر ہو۔(پھٹکارے ہوئے)

اسی طرح جب انہیں یروشلم میں داخلے کا حکم ملا۔

واذ قیل لهم اسکنوا هذه القریة و کلوا منها حیث شئتم وقولوا حطة وادخلوا الباب سجدا نغفر لکم خطیئتکم سنزید المحسنین O فبدل الذین ظلموا منهم قولا غیر الذی قیل لهم فارسلنا علیهم رجزا من السماء بما کانوا یظلمون (۷:۱۶۱'۱۶۲)(الاعراف)

ترجمہ:۔اور جب ان کو حکم ہوا کہ اس شہر میں جا بسو اور جہاں سے چاہو کھاؤ اور حطۃ کہتے ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے شہر کے دروازوں سے داخل ہونا تو ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور نیکوکاروں کو اس سے بھی زیادہ دیں گے۔ پس ان میں سے ظالموں نے جو بات ان سے کہی گئی تھی' اس کو بدل ڈالا۔پس ان کی حکم عدولی پر ہم نے ان پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ وہ حد سے بڑھ گئے تھے۔

یعنی اس کے باوجود کہ انہیں ایک محفوظ شہر عطا کیا گیا۔ان کی اولاد کو قتل ہونے اور انہیں معدوم ہونے سے بچایا گیا' انہوں نے کلمات شکر کو حطۃ سے بدل دیا اور سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔گویا وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اپنی ذہانت سے انہوں نے خدائی قانون کو استعمال کیا۔اسی طرح جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اسے تمسخر اور مذاق بنا لیا۔

واذ قال موسی لقومه ان الله یامرکم ان تذبحوا بقرة قالو اتتخذنا هزوا قال اعوذ بالله ان اکون من الجهلین (۲:۶۷)(البقرة)

Marfat.com

ترجمہ:۔اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔انہوں نے کہا کہ کیا تم ہم سے ہنسی کرتے ہو۔موسیٰ نے فرمایا اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوں۔

یہی نہیں بلکہ اس قوم میں اور بھی بڑے عیب تھے۔وہ الزام جو خود رب ذوالجلال نے ان پر لگائے' وہ قتل انبیاء اور تحریف کتاب تھے۔

وباء و بغضب من الله ذلک بانهم كانوا يكفرون بايت الله ويقتلون النبيين بغير الحق (۶۱:۲)(البقرۃ)

ترجمہ:۔اور وہ اللہ کا غصہ لے کر پھرے اور یہ سب اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔

افتطمعون ان يومنوا لكم وقدكان فريق منهم يسمعون كلام الله ثم يحرفونه من بعد ماعقلوه وهم يعلمون (۷۵:۲)(البقرۃ)

ترجمہ:۔ کیا اب تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مانیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا اور پھر اسے جان بوجھ کر بدل ڈالتا تھا اور وہ خوب جانتے تھے کہ اللہ کی طرف سے کیا اترا ہے اور اس کا منشاء کیا ہے؟

قوم موسیٰ ظاہری عبادات میں تو بڑی پکی اور باکمال تھی۔اندرونی جذبات واحساسات سے یہ قوم بالکل عاری تھی۔سوائے چند ایک جو انبیاءؑ کی پیروی کرنے والے تھے' اس کی وجہ یہ تھی کہ اب تک انبیاءؑ کے ذریعے جو تعلیم دی جارہی تھی' وہ ظاہری زندگی سے ہی متعلق تھی۔اس کی نوعیت کلیتاً خارجی تھی۔اب یہ فیصلہ ہوا کہ انسانیت کو اندرونی کیفیات کی تعلیم بھی دی جائے۔اب صرف معروضی حقائق پر ہی متوجہ رہنے کی بجائے اللہ نے اگلا قدم اٹھایا اور ایک ایسا پیغمبر بھیجا جنہوں نے اندرونی تعلیم دی جنہوں نے اندرونی مناقشات کے حل کے لیے دین کا داخلی تصور پیش کیا۔یہ حضرت عیسیٰؑ تھے۔آپ نے کوئی شریعت نہیں پیش کی بلکہ آپ کے تمام اقوال وفرامین کا تعلق انسان کی داخلی کیفیات سے ہے۔مثلاً یہ کہ کوئی آپ کے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے رکھ دو۔یا یہ کہ ہمسائے کی بیوی کو بری نظر سے دیکھنا بھی زنا ہے۔ان سب کا مقصود یہ تھا کہ اندر کا شدت پن ختم ہونا چاہیے۔یہ وہ احکامات تھے جن کے لیے کچھ دیر سوچنا پڑتا تھا۔پھر ان میں سے کچھ لوگ افراط وتفریط کا شکار ہو گئے اور وہ رہبانیت کی راہ پر چل پڑے۔حالانکہ پوری کی پوری زندگی کو رہبانیت کی نذر کر دینا مسئلہ کا حل نہ تھا۔

اب خدا نے انسان کے بارے میں سوچا کہ پہلے جو بھی حکم دیا جاتا ہے' وہ افراط وتفریط کی وجہ سے مطلوبہ نتائج تک نہیں لاتا۔تاہم ایک مثبت پہلو بھی تھا کہ اب انسان کی ذہنی استعداد اور سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں کافی بڑھ چکی تھیں یعنی اب انسان اس قابل ہو چکا تھا کہ خدا اپنے پیغام کو مکمل کر دیتا کہ انسان میں جبلی اور عقلی شعور کا مکمل توازن پیدا ہو جاتا اور انسان اب اصول کائنات کے ساتھ ساتھ رب کی ہدایت کے تحت زندگی گذار سکتا۔

انا هدينه السبيل اماشا كراً واما كفورا (۳:۷۶)(الدهر)

ترجمہ:۔ہم ہی نے اسے راہ حق دکھا دی' خواہ وہ شکر گذار ہو یا ناشکر گذار (دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں)

Marfat.com

اب رب ذوالجلال نے اعلان فرمایا:۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (۵:۳)(المآئدۃ)

ترجمہ:۔ آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر میں نے اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے۔

اس آیت میں دو چیزوں کا تذکرہ ہوا۔ دین اور نعمت۔ دین سے مراد معروضی صداقت ہے اور نعمت سے مراد حاصل انسانیت اور خلاصہ ہدایت حضرت محمد ﷺ ہیں۔ جس طرح زمانے میں بہترین عقل پیغمبر ہی کی ہوتی ہے' اسی طرح آنے والے تمام زمانوں میں بھی جبکہ انسانی عقل اور تفکر کا ارتقاء جاری رہے گا' حضرت محمد ﷺ کے تعقل کا درجہ بلند تر اور برتر ہی رہے گا اور آپ کی تعلیمات بھی ہمیشہ آنے والے زمانوں کے لیے ایک نعمت رہیں گی جس طرح بودلیئر نے کہا:

"Writer's every word is an act of generosity."

کہ ادیب کا ہر لفظ معاشرے کے لیے ایک فیاضی ہے۔

آپؐ نے پوچھا' سب سے زیادہ فیاض کون ہے؟ صحابہ کرامؓ نے فرمایا' اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ سب سے زیادہ فیاض وہ ہے۔ جس نے علم سیکھا اور دوسرے کو سکھایا یعنی فیاضی کا وہ مفہوم جو آج کے مفکر لے رہے ہیں' پیغمبر اسلام نے صدیوں پہلے دے دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے علم کی بھی تعریف کی کہ وہی علم فلاح ہے جو بامقصد ہو۔ آپ نے فرمایا:

اللھم انی اعوذبک من الدعا لایسمع ومن العلم لاینفع

ترجمہ:۔ اے اللہ' میں اس دعا سے پناہ مانگتا ہوں جو سنی نہ جائے اور اس علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع نہ دے۔

وہ علم جو نفع کثیر عطا کرتا ہے اور حقیقی علم کے درجہ کا حامل ہے' وہ خدا کی شناخت عطا کرنے والا علم ہے۔ جو بندگی کی حالت پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلموٴ (۳۵:۲۸)(فاطر)

ترجمہ:۔ بے شک علماء ہی وہ لوگ ہیں جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں۔

آپؐ کے اسی منصب علمی کی وجہ سے آپ ہر آنے والے دور میں چاہے اس میں انسانیت علم کی کتنی ہی منزلیں کیوں نہ طے کر لے' سب سے زیادہ صاحب علم ہوں گے۔ احادیث کے وسیع ذخیرے میں کئی ایسی احادیث ہیں جو اس امر پر گواہ ہیں کہ انسانی عقل و شعور نے ابھی تک ان کے مفاہیم تک کو بھی مکمل طور پر نہیں سمجھا۔

آپؐ نے ابوذرؓ سے پوچھا۔ اے ابوذرؓ سورج کدھر جاتا ہے؟ ابوذرؓ نے فرمایا واللہ و رسولہ اعلم آپ نے ارشاد فرمایا کہ سورج غروب ہونے کے بعد عرش بریں کو جاتا ہے۔ اس حدیث پر کئی معترضین نے اعتراض کیا کہ سورج کا عرش بریں کی طرف جانا ناقابل فہم ہے اور اسے حدیث ہی تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ حالانکہ حدیث سے انکار کے بجائے انہیں اپنے کمی علم کا اعتراف کرنا چاہیے تھا۔ آج کی سائنسی تحقیق اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ سورج کی گردشیں تین طرح کی ہیں:

1- سورج ایک گردش اٹھارہ کروڑ سال میں کہکشاں کی طرف مکمل کرتا ہے۔

Marfat.com

2- سورج کی دوسری گردش ایک سو پچاس میل فی سیکنڈ کی رفتار سے Solar Epic کی طرف ہے' جسے عرش کہتے ہیں۔

3- اور سورج کی تیسری حرکت وہ ہے جس کا ہم شب و روز مشاہدہ کرتے ہیں۔

اس حدیث اور اس نوع کی دیگر احادیث کو متشابہات حدیث کہا جا سکتا ہے۔ ان کا متشابہات قرآن سے فرق یہ ہے کہ قرآن کے متشابہات میں زبان کا Pattern نہیں بدلتا۔ مثلاً و جعلنا من الماء کل شی حی میں لفظ کی تاویل نہیں بدلے گی' تاہم معانی کی تعبیر ہر دور میں جدید تر ہوتی جائے گی۔ مثلاً یہ آیۂ مبارکہ:-

اولم یر الذین کفروا ان السموت والارض کانتا رتقا ففتقنھما و جعلنا من الماء کل شیءٍ حی افلایومنون (۲۱:۳۰)(الانبیآء)

ترجمہ:- کیا جو لوگ کافر ہیں' انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ آسمان و زمین ملے جلے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے تخلیق کیا۔ پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

ان آیات کا معنی ہر دور میں ارتقاء پذیر ہوتا رہے گا لفظ میں تغیر نہیں ہوگا اور فہم علوم میں کمی کی وجہ سے لفظ کی تعبیر نہیں بدلے گی مگر حدیث کے متشابہات میں فرق ہے کہ آپ کو جو زبان عطا کی گئی' اس کی دائمی صورت نہیں ہے۔ جس طرح آپ نے معراج کے واقعات کے باب میں ارشاد فرمایا کہ مجھے جبریل امین' ام ھانی کے گھر سے لائے' پھر براق پر بٹھایا۔ پھر اسے اشارہ کیا اور اس کے پاؤں سے شعلے نکلے۔ براق سے کیا مراد ہے؟ یہ اس زمانے کے محاورے کا لفظ ہے تاکہ اس دور کے لوگوں کے سامنے مفہوم واضح ہو سکے۔ اسے سمجھنا ہمارا کام ہے کہ اس زمانے میں آپ کے ادا کردہ الفاظ کا مفہوم متعین کریں۔ ایک حدیث کو بنیاد بناتے ہوئے میں نے کہا تھا:

Human Being will be able to create exact replica of Human Being.

تو مجھ سے پوچھا گیا کہ میں نے کس حدیث کو بنیاد بناتے ہوئے یہ استنباط کیا۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: عصر دجال میں دجال مردہ کو زندہ کرے گا۔ پوچھا گیا' کیا وہ وہی شخص ہوگا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ اس کی مثال ہوگا۔ یہی کلوننگ ہے جس کے متعارف ہونے سے چھ ماہ قبل سیالکوٹ میں مَیں نے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ جب تک ہم محدود محاورے سے نکل کر اعلیٰ ذہنی استعداد کے مطابق سوچنے کی کوشش نہیں کریں گے' ہم آپؐ کے فرامین کو کماحقہ نہیں سمجھ سکیں گے۔ سب سے بڑی سنت علم سیکھنا ہے۔ اگر علم نہیں ہوگا تو اتنے بڑے کائناتی ذہین و فطین کی بات کو سمجھنا کس طرح ممکن ہوگا؟

جب آپ کی حدیث مبارکہ لاتسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ دور حاضر کے ایک بڑے فلسفی برگساں کے سامنے پڑھی گئی تو اپاہج ہونے کے باوجود وہ اچھل پڑا اور اقبال سے کہنے لگا:-

I swear that your Prophet was a Prophet

یعنی ایسا علم صرف خدا ہی دے سکتا ہے۔ وہ خود اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا۔ میں تیس برس سے اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں مگر میں زمان و مکاں کے اس فلسفے تک نہیں پہنچ سکا۔

Marfat.com

ایک اور حدیث کے مندرجات بھی بادی النظر میں محل نظر ٹھہرتے ہیں جس کے مطابق صحابہ کرامؓ کو اس وقت نقصان اٹھانا پڑا جب انہوں نے حضور گرامی مرتبتؐ کے فرمانے پر کھجور کے پیوند نہ لگائے تو ان کی پیداوار میں نقص واقع ہوا مگر یہاں بھی عقل کے کئی دروازوں کی کشادگی کا سامان موجود ہے۔ اس کے پس پردہ اس استاد عظیم نے تھوڑی سی ملامت عقلی دے کر انسانیت کو ایک ابدی سبق دیا کہ جو بڑے بڑے روحانی دعویدار ہیں انہیں انسانی تجربے پر فوقیت نہ دینا کیونکہ تجربہ کمال کو تب پہنچتا ہے جب اس کے پیچھے پوری زندگی کا پس منظر اور جدوجہد ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑی نصیحت ہے کہ ایک بزرگ جو کسی میدان کا متخصص نہیں ہے اس میں وہ رائے زنی کرتا ہے اور وہ صائب نہیں تو اس سے مذہب سے کلی طور پر اعتبار اٹھ جاتا ہے۔

ایک اور حدیث جس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ جس نے اذان سننے کے بعد لاحول کہا اس پر جنت واجب ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟

مگر وہ لاحول جس کی ادائیگی سے جنت کا وجوب عمل میں آتا ہے اتنا آسان نہیں۔ یہ تو ایک شعوری کاوش ہے جہاں تقدیر اور تدبیر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ جب بندہ شعوری طور پر کہتا ہے۔

''مجھے کچھ اختیار اور قوت حاصل نہیں ہے مگر اللہ ہی کی تائید و نصرت سے۔''

یہی وہ لمحہ ہے جب بندہ عبادت کا حق ادا کرتا ہے مگر یہ شعوری کوشش اتنی آسانی سے ممکن نہیں ہوتی۔ تقدیر کی اہمیت یہ ہے کہ اگر کوئی تقدیر الٰہی کا قائل نہیں تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ تقدیر اور توفیق باہم ساتھ ساتھ ہیں۔ توفیق انسان طلب کرتا ہے جبکہ تقدیر اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ تقدیر کی کوئی وضاحت پیغمبرانہ درجہ استدلال تک نہیں پہنچ سکی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''کام کرو جو اللہ نے تمہارے لیے مقدر کر دیا ہے وہ سہل کر دیا ہے۔'' یعنی اس میں انسان کی جبلی اور شعوری کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر تقدیر کے بارے میں اور کوئی دلیل نہ بھی ہوتی تو اس کے لیے یہی کافی تھا کہ کوئی شخص بھی اپنا گھر، مقام پیدائش، ماں باپ اور موت کو نہیں چنتا ورنہ ہر غریب بچہ چاہتا کہ وہ بل گیٹس کے گھر پیدا ہو۔ ہر قتل ہونے والی بچی اپنے والدین کے گھر سے گریز کر لیتی یعنی تقدیر و تدبیر ساتھ ساتھ ہیں اور یہ کہ تقدیر کو ماننے سے بے عملی نہیں پیدا ہوتی بلکہ انسان کی فاعلیت اور اہلیت بڑھ جاتی ہے کہ اللہ نے مجھ سے ایک کام لینا ہے تو بندہ اس کے لیے تیار رہتا ہے۔

ایک اور حدیث جو عصری شعور پر آپ کے تفکر و تعقل کی ابدی برتری کو بیان کرتی ہے وہ حدیث ابن صیاد ہے۔ جب ابن صیاد کے بارے میں آپؐ کو اطلاع دی گئی تو آپؐ اسے دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپؐ اس جگہ گئے جہاں ابن صیاد تھا اور اس کے پیچھے کھڑے ہو کر اس کا کلام سننے لگے کہ دریں اثناء اس کی ماں کے شور نے اسے آپؐ کی طرف متوجہ کر دیا۔ آپ نے ابن صیاد کی ماں سے فرمایا اگر تو مجھے اس کی بات سننے دیتی تو میں اس کا مرض پا لیتا یعنی آپ کائنات انسان کی وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے تحلیل نفس کا طریقہ دیا۔ آج بھی تحلیل نفس اسی طرح ڈیٹا کے جمع کرنے پر انحصار کرتی ہے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان کا عرش پانی پر ہے۔ شام کو اس کا اجلاس ہوتا ہے۔ اس کے تمام چیلے اس کے سامنے اپنی دن بھر کی کارگزاری پیش کرتے ہیں۔ جب کوئی اس بات کی اطلاع لاتا ہے کہ اس نے میاں

Marfat.com

بیوی کے درمیان فرق کروا دیا ہے تو وہ اسے اپنے پاس اپنی مسند پر جگہ دیتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ میاں بیوی کے درمیان بہت سے مسائل کی وجہ سے ان کی باہمی افہام وتفہیم کا نہ ہونا ہے اور پھر یہ کہ ایک خاوند اور بیوی کی ناراضگی پورے معاشرے کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ اس سے ناراضگیاں اور اختلافات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ آپؐ نے معاشرے کو درپیش مسائل کی ترجیحات میں اسے اتنا بڑا مسئلہ قرار دے کر اس کی طرف کتنا پہلے اشارہ کر دیا۔ اس کا کوئی ماہر عمرانیات (Socialogist) ہی اندازہ کر سکتا ہے۔

انسانی معاشرے کی تشکیل میں اجتماعی رائے کی کتنی زیادہ اہمت ہے' اسے بھی آپ نے کمال موثر طریقے سے بیان کیا۔ ارشاد فرمایا کہ شیطان انسانوں کا بھیڑیا ہے۔ اجماع امت سے گریز کرنے والوں کو شیطان اچک لے گا۔ انسان کا انفرادی شعور محدود ہوتا ہے جبکہ اجتماع کا شعور مجموعی رائے کا درجہ رکھتا ہے' جو معاشرے کی رہنمائی کے لیے بہترین رائے ہوتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری امت کا اجماع کبھی غلط نہیں ہوتا یعنی امت کی اجتماعی بقاء کو اجماع میں قیام پذیر ہونے کو قرار دیا گیا۔

انسان کی نفسی اصلاح کے حوالے سے ایک انتہائی وسیع المعنی حدیث ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اگر تم اپنی جانوں پر سختی کرو گے تو اللہ بھی سختی کرے گا۔ اگر اعتدال اختیار کرو گے تو اللہ بھی تمہارے ساتھ یہی سلوک کرے گا۔ یہی انسانیت کا ارتقاء ہے کہ انسانیت کروڑوں سال کی مسافت طے کر کے محمد رسول اللہ تک پہنچی مگر ہم اعتدال کا دامن چھوڑ کر دس سو سال میں آپؐ کی تعلیمات سے انصاف نہیں کر سکے۔ ہمیں ایمان کامل کے حصول کے لیے اپنے بنیادی تعقل کے سنگِ میل کو بدلنا ہوگا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے اللہ کے لیے محبت کی' اللہ کے لیے نفرت کی' اللہ کے لیے منع کیا اور اللہ کے لیے ہی کسی عمل کو اختیار کیا' اس نے ایمان کامل حاصل کر لیا۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے۔ اس کے بعد آسانی ہے۔ ظاہری زندگی کا سارا سفر قبر تک ہے۔ زندگی کے جملہ اعمال واحوال کے بارے سوال قبر میں جا کر ہوگا۔ اگر ہم اس ظاہری زندگی میں وضاحتیں حاصل نہیں کریں گے تو قبر میں جواب نہ دیئے جا سکیں گے۔ جب اللہ اور رسولؐ کے بارے سوال ہوگا اور بندہ جواب نہ دے پائے گا تو ارشاد ہوگا' یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اسے ہم نے پورا کلام (قرآن) عطا کیا۔ رسولؐ بھیجا' زندگی کی ہر سہولت بخشی اور رسول اللہؐ نے ایک ذہنی ترجیح انسانوں تک پہنچائی جسے قرآن نے ان کے سامنے رکھا۔ اس طرح ہر ذہین آدمی قرآن پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ قرآن الوہیت کو بیان کرتا ہے۔ چونکہ اس نے اس ترجیح اولیٰ کو نظر انداز کیا' سو اسے حوالہ عذاب کر دیا جائے۔

آج ہمیں راہ اعتدال کی طرف لوٹنا ہوگا۔ راہ اعتدال سے انحراف ہی یہودی ذہنیت ہے۔ راہ اعتدال سے ہی ہم اپنی ترجیحات کا صحیح تعین کر کے زندگی اس ترجیح اولیٰ کو دے سکیں گے جس کی شناخت میں ہماری دنیوی اور اخروی فلاح ہے اور جو مقصود ہے بعثت محمد رسول اللہ ﷺ کا۔

وما علینا الا البلغ O

Marfat.com

خطبہ پنجم

نظریہ جمال پروردگار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا O (۱۷ : ۸۰) (بنی اسرائیل)

جمالیات کا عنوان بظاہر تو حسن و جمال ہے مگر اس پر گفتگو اتنی حسن و جمال سے پُر نہیں بلکہ کئی پیچیدہ مباحث پر مشتمل ہے۔ یوں تو بے شمار موضوعات ہیں مگر قریباً دنیا بھر کے فلاسفر مشرق و مغرب نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے اور اگر جمالیات کے موضوع کو تکنیکی اعتبار سے پرکھا جائے اور اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو شاید عام آدمی حسن سے ہی بیزار ہو جائے۔ جمالیات کا اصل مطلب ہے گفتگوئے اظہار۔ ذہنوں کے مابین گفتگو۔ یہ حسن و ذوق کے مطالعے کا نام ہے۔ اس کی وضاحت اس لیے دشوار ہے کہ یہ ذہن انسانی کے اختلافی درجات کی طرح فرد سے فرد اور قوم سے قوم جدا ہوتا ہے۔ ایک ہی انسان میں بلوغت فکری سے بدلتی ہوئی معاشی و معاشرتی صورتحال میں کم و بیش اور بلند و پست ہوتا رہتا ہے۔ حسن و ذوق کے مختلف انداز' مختلف حالات میں' تعیش میں' جبر میں' قدر میں' فراخی میں' بخیلی میں جمالیات اپنا انداز جدا کر لیتی ہے۔ کبھی افادیت کا پہلو اس کی ناگزیریت پر غالب آ جاتا ہے' کبھی محبت افادیت پر غالب آ جاتی ہے۔ کبھی جذبہ سائنس اور فکر کو جھٹلا دیتا ہے' کبھی تقلید شخص اجتہاد کو نامنظور کر دیتی ہے۔ کبھی معاشرتی رجحانات معاشی وجوہات پر غالب آ جاتے ہیں اور کبھی غم دوران غم جاں پر غالب آ جاتے ہیں۔

جمالیات صورت' بدصورت اور بے صورت کی تصویر کشی ہے۔ یہ پست و بالا' بدتر و بہتر' اعلیٰ و ادنیٰ کی تعریف ہے۔ یہ ذوق کی تنقید ہے۔ فنون لطیفہ کا بیان ہے۔ یہ غور و فکر کی ہم آہنگی اور توازن ہے۔ یہ محسوس کی جانے والی اشیاء کا مس ہے اور غیر محسوس کا ادراک ہے۔ یہ حسن و لطافت کا تذکرہ ہے۔ رنگ و نور کا بکھراؤ ہے۔ یہ معبد شمس کے خداوند رع کی نقاشی ہے۔ یہ قدیم انسان کا طرز تکلم ہے۔ نینوا اور بابل کے آویزاں باغ ہیں۔ یہ جنت شداد کے نقوش ہیں۔ گلگامش اور انکدو کی داستان کے اوراق کی وضاحت ہیں۔ اجینٹا اور الورا کے جنسی اور روحانی ترفع کی داستان ہیں۔ جمالیات ہی وہ واحد موضوع ہے جس نے فطرت کی ہولناک اور ناقابل تسخیر صلاحیتوں کے جواب میں سپین کے منقش غار میسوپوٹیمیا کے احرام (Pyramids)' بابل و نینوا کے کتبات (Epitaph) اور انطاکیہ اور حمص کے مندر و دیوات پیدا کیے اور ہڑپہ و

Marfat.com

موہنجوداڑو کی تخلیق وزیبائش کے اسباب پیدا کیے۔

جمالیات وہ صلاحیت شوق ہے جو حسن وعشق کا سنگ بنیاد ہے' مدافعت ہے' ارتقائے زندگی ہے' فردوس گم گشتہ ہے۔ درد وسوز کی منزل ہے۔ رنگ انگشت حنا ہے۔ قوس قزح ہے۔ علم کتاب ہے۔ دل کی دھڑکن کی سرگوشی ہے۔ پہاڑوں سے گرتے ہوئے جھرنوں کی صدا ہے۔ بکھرے ہوئے جلووں کی آواز ہے۔ یہ نغمہ سکوت صحرا ہے۔ نغمہ وسرود کی ہیجان انگیز تال ہے۔ یہ زندگی کے وجود بقا سے متعلق ہے۔ جمالیات کی پستی طین لازب ہے۔ صلصال کالفخار ہے۔ اس کی بلندی جمال پروردگار ہے۔ حسن عارضی وپسماندہ دنیا ہے۔ حسن ازل وابد ماورائے افلاک ہے۔ یہ کائنات پست وبالا کی ترتیب وتدوین ہے اور بین الاقوامی فلسفہ وجود وشہود ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ جمالیات کی تعریف ہے' ہر ذہن یہ حق رکھتا ہے کہ اس میں کمی وبیشی کرے۔

اب ہم اِس موضوع پر آتے ہیں کہ دنیا بھر کے جمالیاتی مفکروں نے اس موضوع پر کیسے غور وفکر کیا؟

ہمارے پاس جو قدیم ترین تہذیب ہے' وہ ہندوستان کی ہے۔ قبل از اسلام ہندوستان میں حسیات کی دنیا کو محض مایا' فریب اور دھوکہ سمجھا جاتا تھا۔ تمام ہندو فلسفہ میں جمالیات کو تین لفظ بیان کرتے ہیں۔ مایا۔ کرما۔ رسا جسے اب رس کہا جاتا ہے۔ اس طرح مایا اور کرما کے تصور نے مل جل کر ہندوؤں کے عقائد اور جمالیات کے تصور پر گہرا اثر مرتب کیا حتیٰ کہ کرشنا کے گرد وپیش جنسی اور جسمانی طاقتوں کے مظاہر کو کثرت سے ہندو مندروں میں اجاگر کیا گیا۔ جنسی بلوغت اور Sexual Presentation کے ساتھ ساتھ یہ نجات کے پہلو کو نمایاں کرتے تھے۔ دراصل ہوا یہ کہ کرما کا انجام کار کا جو فلسفہ تھا' جس میں ہندو اس بات کا قائل تھا کہ جس نے اچھے کام کیے' اس کی مکتی ہے اور جس نے اچھے کام نہ کیے' اسے دوبارہ زندگی میں آنا پڑتا ہے۔ اس طرح ان کے حیات کے فلسفہ پر کرما کا گہرا اثر پڑا۔ جس شخص کے نام پر ملک بھارت کا نام بھارت پڑا' وہ رشی بھارت تھا۔ وہ جمالیات کا سب سے پہلا اور بڑا فلاسفر تھا۔ اس نے تصور رقص دیا۔ اس نے تصور دیا کہ انسانی جبلت میں کچھ خصوصی آثار موجود ہیں۔ جس طرح انسانی جذبوں میں خوشی ہے' مسرت ہے' ہنسی ہے' غم وغصہ ہے' نفرت ہے' اس کے بالکل برعکس اس کی جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں' وہ ترحم ہے' تشدد ہے' مسکراہٹ ہے' غضب وغصہ ہے۔ اس طرح شاندار اور اثر انگیز کلمات کو ڈھال کر انہوں نے اپنے فلسفہ کو مرتب کیا۔

چین میں بہت سے بڑے عظیم استاد پیدا ہوئے' مثلاً کنفیوشیس تاؤ اور ماؤ۔ چین کے عظیم اساتذہ نے جمالیات کو اخلاقی اور سیاسی تعلیم کا اہم جز قرار دیا۔ انہوں نے اس میں سے فنون لطیفہ کو نکال دیا بلکہ کنفیوشس فنون لطیفہ کو قطعاً غلط سمجھتا ہے اور الاؤازم یا تاؤازم کے بانیوں نے فنون لطیفہ کو باعث خرابی سمجھا ہے اور جمالیاتی احساس کو ذہن کی بربادی قرار دیا ہے۔ بعد میں زین بدھ نے اس کی طرف کچھ نرمی برتی اور مہاتما بدھ کی تماثیل میں سنگ تراشی اور مصوری کو جگہ دی۔ یہ زہد کا رویہ اس وقت تک جاری رہا حتیٰ کہ ماؤزے تنگ کے زمانے میں اور جنگ انقلاب میں جمالیاتی فکر کو تہ وبالا کر دیا گیا اور بہت ساری معروضیت اور معروضی تفہیم کے ساتھ حسن کے اس تصور کو جو پہلے سے بدھ مت' تاؤازم یا کنفیوشیس ازم میں موجود تھا' اس کو سراسر مسترد کر دیا گیا۔

جاپان جو ایک اور قدیم تہذیب ہے' وہاں Chinji کی کہانی لکھی گئی۔ اس میں اس نے جمالیات کو اعلیٰ ترین

Marfat.com

ذوق حسن کو انسان کی اعلیٰ ترین کوالٹی قرار دیا۔ تیرہویں اور چودہویں صدی میں ایک اور بڑے مفکر نے جسے مونو چو کہتے ہیں، حسن کو گہرائی اور پُر اسراریت کا نام دیا۔ اس نے حسن کی اس طرح تعریف کی کہ حسن گہرائی اور پُر اسراریت کا نام ہے۔ اس کا خیال ہے ادب اور آرٹس کا ہر اشارہ اور کنایہ خیال سے مطابقت رکھنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال ہے جو بھی حسن کا فن پارہ ذہن انسانی کے تصور کے مطابق نہ ہوگا تو وہ ایک خارجی اور ناکام کوشش ہوگا اور اسے ہم فن پارہ یا حسن کا کوئی نمونہ قرار نہیں دے سکتے۔ اٹھارویں صدی میں جاپان ہی کے موری ناگانے جو بڑے مصنف ہیں، تمام جمالیاتی کاوشوں کو ایک جملے میں یوں بیان کیا:۔

''کہ حسن اداس چیزوں کا احساس ہے۔''

اگر اس سارے سلسلے کو دیکھیں تو چینی اور جاپانی جمالیات میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے ترک لذات۔ بدھ مت، چینی مفکرین اور جاپانی مفکرین نے لذت خیال یا جمال حسن کو جمالیات کا کوئی ایسا حصہ نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس انہوں نے جمالیات دراصل اداس چیزوں کے احساس کو قرار دیا۔

دنیا کے نامی گرامی دانشوروں میں سے کوئی ایسا مفکر نہیں گزرا جس نے جمالیات کے موضوع پر غور نہ کیا ہو۔ جس نے حسن کی تحقیق دکشش کی چبھن اپنے سینے میں نہ پائی ہو مگر اس موضوع کا تنوع، اس کا پھیلاؤ، اس کی گیرائی اور گہرائی کا احاطہ ایک انسان کے بس کی بات نہ تھی حتیٰ کہ اس کا ابہام اور اس میں اختلاف رائے کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان نے حسن و جمال کو اور خیالات کو اپنے خیال کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی۔

سقراط کلیٹو (Clito) کے بت خانے میں گیا۔ اس نے اس سنگ تراش کو دیکھا اور اسے کہا۔ بہترین سنگ تراش وہ ہے جس کے مجسمے قلب کے اندرونی جذبات کا بہترین اظہار کرتے ہیں۔ جب تک قلبی احساسات اور خیالات اور قلب کے جذبات تمہارے آرٹ میں داخل نہیں ہوتے، تم کبھی اچھے سنگ تراش نہیں بن سکتے۔ کوئی شخص بھی غیر مرئی حقیقت کی نقل نہیں کر سکتا۔ فن حقیقت کو بعینہٖ پیش نہیں کرتا۔ شاعری ہو یا مصوری یا کوئی اور چیز ہو، کوئی انسان بھی اسے بعینہٖ پیش نہیں کر سکتا۔ دراصل فنکار جو کچھ بھی کرتا ہے، فن کی نقالی کرتا ہے۔ فن نفسیات کی کیفیات کی تصویر کشی نہیں کرتا۔ فن افادیت کے بغیر ہے۔ فن سے عقل بہتر ہے۔ سقراط فن کو روحانی اور اخلاقی قیادت کے قابل نہیں سمجھتا۔ سقراط یہاں ایک لفظ بھی حسن کے خدوخال کے بارے میں نہیں کہہ رہا بلکہ اس کا کلام صرف افادیت اور خیر سے متعلق ہے۔ اس کا خیال ہے کہ حسن جو کچھ بھی ہے، عالم ملکوت یا کائنات کی بالائی حقیقت کا عکس ہے۔ جب تک کسی کا فن خیر سے منسلک نہیں ہوگا، اس کی کوئی افادیت نہیں ہے اور وہ ناقص چیز ہوگی۔ اس کے شاگرد افلاطون کو ایک ناز تھا کہ وہ یونانی ہے، وہ آزاد ہے اور عہد سقراط میں پیدا ہوا ہے۔

وہ ہندوستان بھی آیا۔ وہ ایک خیالی اور مثالی دنیا اور جمہور کے تصور کا خالق تھا۔ وہ بھی حقیقت مطلقہ کو حسن کہتا ہے۔ وہ تمام اشیاء اور خیالات کو عالم بالا کے ایک دائمی اور ابدی حسن کی دوسرے درجے کی تصویر قرار دیتا ہے۔ وہ خدا کو خیر اور خیر کو خدا سمجھتا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے کہ حسن کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ وہ اسے خیر کی کیفیت اور اشیاء کی معروضی صفت اور مادی وجود سے ماورا سمجھتا ہے۔ وہ حسن کو وجود سے بالاتر سمجھتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک نقال اور بے اخلاق حسن کو نہیں

Marfat.com

پا سکتا۔اس لیے وہ شاعر کو اپنی جنت ارضی سے نکال دیتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو ادب حسن و جمالیات کی پیشکش کا نام ہے۔اگر ادیب بھی افلاطون کے ہاتھوں چڑھے ہوتے تو اس کی یوٹوپیا سے خارج کردیئے جاتے۔

اس کے بعد تیسرا بڑا استاد پیدا ہوا ارسطو۔مگر ارسطو نے ان کی رائے سے انحراف کیا۔اس نے نہ تو حسن کو انائے مطلق سمجھا اور نہ ہی خیر سمجھا بلکہ وہ فطرت کو حسن کہتا ہے۔وہ حسن کو جبلت' ملکیت اور تصرف سے آزاد حقیقت تصور کرتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ حسن کے پانچ بنیادی عناصر ہیں۔

1- نظم وضبط(Order)

2- تناسب(Proportion)

3- قطعیت(Definitness)

4- تعین(Magnitude)

5- جلال(Magnificance)

ارسطو فن سنگ تراشی' مصوری اور شاعری کو نقالی نہیں بلکہ فن کی بہتر صورت سمجھتا ہے۔یہ تخلیقی استعداد ذہانت کی وجوہات کا نام ہے۔یہاں ارسطو ایک بڑا عجیب وغریب سوال کرتا ہے کہ کیا خوشی اور مسرت کا نام بھی حسن ہے؟ وہ کہتا ہے کہ نہیں۔جب غم اور خوف طاری آتا ہے تو اس کا اثر اتنا پڑتا ہے کہ جب وہ روتے ہیں تو اس سے رقت پیدا ہوتی ہے۔دراصل حسن کا کام ہے ایک Cathoretic Process انجام دینا۔کیتھارسس کا مطلب ہے انقباض دل کا انشراح یعنی جب جذبے کشیدہ ہو جائیں' دل تنگ ہو جائے اور وہ اس وقت کسی فن پارے کو دیکھے' شعر سنے یا کوئی دھن سنے تو دل کو قرار اور سکون آجائے۔اسے جذبات کی تطہیر کہتے ہیں۔یہی کیتھارسس ہے۔ارسطو کے نزدیک یہی وظیفہ فن ہے۔اس لفظ کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی یونانیوں میں سے ایک بڑا فلسفی Epicurius پیدا ہوا جو اطمینان اور مسرت کا باعث عقل کو سمجھتا ہے اور حسن کو ملال سے تعبیر کرتا ہے۔یہاں سے اندازہ ہوتا ہے کہ لذت سے مراد عقلی لذت ہے جو اس کے نزدیک اعلیٰ ترین لذت ہے۔

اس کے بعد قریباً قریباً پکا مسلمان فلسفی پیدا ہوا جو فلسفہ الوہیت کا قائل تھا۔اسے Zino, the Stoic of Elia کہتے ہیں۔اس نے ترک دنیا اور ترک لذات کو حسن کہا۔یہ لذت پرستی کا مخالف تھا۔وہ کہتا ہے حسن ریاضت و پاکیزگی ہے' لذت پرستی نہیں۔کائنات مکمل ہے مگر انسان نامکمل ہے۔فطرت پر غور کرنا ہی حسن ہے۔اس کو رواقیہ بھی کہتے ہیں۔وہ سمجھتا ہے کہ کسی چیز سے متاثر ہو جانا علم وعقل کی کمی کا باعث ہے۔اصلاً اگر غور کیا جائے تو دیکھنے میں تو یہ بڑے زاہد لوگ ہیں' پاک لوگ ہیں مگر دراصل ان کی زاہدانہ صفات بھی خودغرضانہ ہیں۔بقول حافظ شیراز ؎

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رخاں
کنجے گرفت و ترس خدا را بہانہ ساخت

Marfat.com

اگر رواقیہ پر تنقید کسی شعر سے ممکن ہے تو وہ حافظ کا یہ شعر ہے یعنی حسن سے متاثر نہ ہونا زہد نہیں کہ یہ فطرت انسانی ہے کہ خوبصورتی اسے بھاتی ہے۔ وہ خوبصورتی کا قائل ہے۔ اسے حسن اچھا لگتا ہے۔ جب بھی کوئی انسان خلاف فطرت کام کرے گا تو اسے معتدل و معقول انسان نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اب رومنز کی باری ہے۔ تاریخ روما میں سسرو (Cicero) سے بڑھ کر کوئی استاد نہیں ہے۔ اس کے بغیر تاریخ روما مکمل نہیں ہوتی۔ سسرو حسن و خیر کی یکجائی کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسن و خیر ایک ہی چیز ہے۔ تناسب میں جیسا رنگ ملا دیا جائے تو وہ حسن بن جاتا ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے رنگ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے پہلی بار یہ نئی بات کی ہے۔ کلام میں وزن، قافیہ اور ردیف کر دیا جائے تو حسن بن جاتا ہے۔ سسرو حسن کے متحرک نظریہ کا قائل ہے۔ وہ اسے اضافی اور تغیر پذیر سمجھتا ہے۔ اس کے بقول:

''دنیا میں ایسی کوئی خوبصورت شے نہیں جس سے زیادہ خوبصورت شے دنیا میں موجود ہو۔''

دیموقراطس کہتا ہے:

''ایک مہذب اور غیر فانی قوت ہی کائنات میں حسن ہے۔''

یہ ایک دیوتائی نظام کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ یہ لوگ محض الوہیت خداوند کے قائل نہ تھے۔ جب آج ہم اجرام فلکی کی دنیا دیکھتے ہیں تو یہ رومن زمانے کے ہی وضع کردہ ہیں۔ آج ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ یہ میرا اسٹار ہے مگر اولمپک خداؤں کے بعد یہ روم کی Mythology ہے اور ان کے دیوتاؤں کے نام ہیں جنہیں ہم اپنے سٹار قرار دے رہے ہیں اور بڑے تفاخر سے ان کے نام لیتے ہیں۔

اس کے بعد ایک بڑا شاعر ورجل (Virgil) پیدا ہوا۔ وہ کہتا ہے کہ حسن لوگوں کو غیر محسوس سے محسوس کی طرف لاتا ہے اور منازل فکر میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے بعد پلوٹارچ (Plutarch) آتا ہے جو روما کا بڑا مورخ ہے۔ اس نے فلسفیانہ موضوعات پر بھی رائے دی ہے۔ یہاں ہم مارکس اوری لیس (Marcus Aurilius) اور پلوٹارچ کا اکٹھا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں۔

پلوٹارچ کہتا ہے کہ حسن بدل نہیں سکتا۔ بدصورت ہمیشہ بدصورت رہے گا اور حسین ہمیشہ حسین مگر جو فنکار بدصورتی کو پیش کرتا ہے، اس کی پیشکش کی تعریف ہو سکتی ہے۔ گو یہ خوبصورتی نہیں بن سکتی۔ صرف فن کو خوبصورت کہہ سکتے ہیں۔ یہاں سے موضوع تھوڑا ہٹ جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی بھی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ یہ اس کی ادائیگی پر منحصر ہے۔ مارکس اوری لیس جو روم کا بادشاہ تھا اور صاحب فکر انسان تھا، اس کا خیال ہے کہ حسن اثرات کی صفت مطلق ہے مگر جوں جوں ان دانشوروں کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے، اس کے نظریہ حسن میں بھی تبدیلی آتی جاتی ہے۔ مارکس اوری لیس حسن کے بارے میں کہتا ہے کہ حسن کے متعلق کچھ کہا جائے یا نہ کہا جائے، وہ حسن ہی رہتا ہے۔ گو ظاہراً یہ عوامی سی رائے لگتی ہے مگر یہ اشیاء کے وجود میں حسن مطلق کے وجود کو ثابت کرتی ہے۔ فروسٹانس کہتا ہے'' دراصل مصور وہ ہے جو حسن کو پہلے ذہنی اور جذباتی سطح پر محسوس کرتا ہے اور پھر اس کو پیش کرتا ہے۔'' یہاں ایک اور بڑے مصنف لونجائنس (Longinus) نے ایک انحراف کیا۔ اس نے حسن زوال کی بجائے عظمتوں اور جبروت کی رفعتوں کو قرار دیا۔ اس نے کہا دراصل بات یہ ہے کہ جب ہم کائنات

میں پھیلے ہوئے بہت بڑے بڑے نظارے دیکھتے ہیں تو ہم اس عظیم حسن کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ہم پر حسن دراصل کبریائی کے جلال کی طرح وارد ہوتا ہے۔

اب ہم مصر کی طرف آتے ہیں۔ یہاں ہم مصر کی اس شخصیت کا تذکرہ کریں گے جس کا نام تو اتنا معروف نہیں مگر اس نے عالم اسلام کے افکار پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور آج تک مسلسل ڈال رہا ہے۔ نقشبندیہ کے دوائر اس سے لیے گئے ہیں۔ اسلام کے تمام بڑے بڑے صوفی فلاسفہ اس سے متاثر تھے۔ اس کا نام افلاطینوس (Platinous) ہے۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اللہ کا باضابطہ شعور دیا۔ یہ فلسفہ اشراق کا بانی ہے اور اشراقیہ کا بھی۔ اس کے نزدیک اللہ ہی حسن و نور ہے۔ انسانی مقصود بھی اللہ ہی ہے۔ اسی سے کیف و سرور اور وجد کی کیفیتیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ عقل کی بجائے بصیرت اور وجدان کا قائل ہے۔ وہ صوفیانہ کشف کے ذریعے حسن مطلق کی آگہی کو حسن کہتا ہے۔ اس کا نظریہ حسن زندگی ہے، نور ہے۔ وہ کہتا ہے حسن مردہ کا نہیں ہو سکتا۔ اگر حسین ترین شے بھی زندگی سے محروم ہو جائے تو وہ زندہ کے حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ زندگی کو وصف حسن سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے حسن اس شے میں ہوتا ہے جو زندہ ہے۔ دو انسان اگر ایسے حال میں ہوں کہ ایک بدصورت اور ایک حسین مگر حسین مر چکا ہو اور بدصورت زندہ تو حسن کا امین زندہ ہوگا نہ کہ مردہ حسین۔ عشاق رنگ و نور سے نہیں بلکہ روح سے محبت کرتے ہیں۔ روح ذہانت سے حاصل ہوتی ہے اور اجسام حسن کا رنگ ہیں جو حسن ہے، وہ فطرت کے مطابق ہے اور بدصورت وہ ہے جو حسن سے دور ہے۔

اب ہم سینٹ آگسٹائن کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ بڑی جمالیاتی بدذوقیوں سے گذر کر، بڑی اخلاقی برائیوں سے گذر کر، انحطاط سے گذر کر بالآخر وہ فلاح کی طرف پلٹا اور باوجود اس کے کہ عیسائی تثلیث کے قائل ہیں۔ وہ اپنے فلسفہ خیال میں شدت سے تثلیث کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ خدائے واحد کا پرستار ہے اور اس نے حسن کے بارے میں ایک انوکھا نظریہ دیا۔

"کائنات کا حسن توازن اور ہم آہنگی سے ہے۔ جو اس کے خلاف ہے، وہ بے توازن ہے۔"

یعنی جو چیز آپ کو حسین لگتی ہے، وہ توازن ہے اور جو چیز غیر متوازن ہے، اس میں بھی حسن ہے۔ ادھر بھی ایک اصول کارفرما ہے۔ گو ان کے قوانین الگ الگ ہیں، اسے ہم نے مختلف عنوانات دے دیئے ہیں یعنی عدم تناسب میں بھی تناسب کا وجود ہے اور یہی حسن کا باعث ہے۔ آگسٹائن کے ہاں ہر حسین کا حسن اس کے اجزاء کا تناسب اور اعتدال سے ہے۔

اب ہم جدید فلسفہ کی طرف آتے ہیں۔

سپنوزا ایک Depressive فلسفی ہے۔ اس کے نزدیک اس کائنات میں نہ حسن ہے نہ بدصورتی۔ نہ یہاں کوئی شے اچھی ہے اور نہ بری۔ وہ سرے سے اس تصور ہی کا منکر ہے۔ اس کے نزدیک حسن ایک بے معنی اصطلاح ہے اور عقل کے الجھاؤ کا باعث ہے۔ تمام اشیاء انسان کے لیے ہی معرض وجود میں آتی ہیں تو پھر جس چیز کا اثر نہیں اچھا لگے، اسے حسین و اعلیٰ خیال کرتے ہیں یعنی وہ انسان کے نقطہ نظر سے کسی مقامی تاثر کو بھی حسن کہتا ہے کہ کوئی چیز اچھی لگے تو اچھی ورنہ بری ہے مگر یہ انفرادی تجربہ ہے۔ اس طرح وہ کائنات میں غیر وابستہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے جب عام انسان بلند ہوتا ہے تو وہ کسی اچھی چیز سے اپنی زندگی کا ماخذ ڈھونڈتا ہے اور وہ عمومیت سے ہٹ کر خصوصیت کی طرف بڑھتا ہے۔

لارڈ ہوبز (Lord Hobbes) اس قبیل کا فلسفی ہے جنہیں رومانی مفکرین کے بعد انگلستان کے خدائے عقل سمجھا گیا ہے۔ انہوں نے مادیت کے وجود کی مخالفت کی۔ عام پھولدار جھاڑیوں سے معمور میدان بھی اتنا ہی خوبصورت ہوسکتا ہے جتنے کہ انگور یا زیتون کے درختوں کا منظر لیکن ان کی قدر سے ناواقف شخص کو ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ حسن ایک ایسی قدر ہے جو اس کو نظر آتا ہے' جو اسے جانتا ہے بغیر علم کے قدر کا ادراک نہیں ہوسکتا۔

باؤم گارٹن کے نزدیک احساس اور جذبے کی تکمیل کا نام حسن ہے۔ یہ کائنات جو کئی تضادات کی حامل ہے' یہ اپنے ان تضادات اور عدم تناسب میں بھی ایک مکمل تناسب رکھتی ہے جسے ہم وحدت کا نام دیتے ہیں۔ یہ وحدت کمال ہے اور کمال مظہر حسن ہے' لہٰذا جس میں کمال نہیں ہے یا جو حریف کمال ہے' وہ حسن نہیں ہے۔

ہوز اس کہتا ہے کہ بہت سارے ٹیڑھے خطوط ہوں تو وہ آپ کو اچھے نہیں لگیں گے مگر ان میں موجود ایک سیدھا خط آپ کو اچھا لگے گا۔ یہ حسن ہے' اس لیے پُرتکلف ڈیزائن حسن آفرینی کے لیے ضروری ہے۔

ھنیال طریق فن کو حسن کہتا ہے کہ جو طریقہ فطرت کا اسلوب ہے اور جس طرح وہ حسن کا اظہار کرتی ہے' وہ حسن ہے۔

لیسنگ کہتا ہے حسن صرف خارجی اور محدود مادی پہلو کا نام ہے اور مادی پہلو جو خارجی اور مرصع ہے' وہ حق ہے یعنی وہ خد و خال کو حسن کہتا ہے۔ وہ ناک نقشے اور سجاوٹ کو حسن کہتا ہے۔

اب ہم ان تین بڑے دعوؤں کی طرف آتے ہیں جن کے بغیر کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔ میری مراد کانٹ' نطشے اور ہیگل سے ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اتنے بڑے اور فلسفہ و حکمت میں اتنے بے مثال ہیں کہ ان کے بغیر فلسفہ و عقل کی کوئی بات مکمل نہیں ہوتی۔

جمالیات کے باب میں کانٹ کا موقف ہے کہ جب ہم حسن کو سراہتے ہیں تو ہم عقل سے لاتعلق ہو جاتے ہیں کیونکہ حسن کو سائنسی اندازوں کے معیار پر پرکھا نہیں جاسکتا۔ حسن کو پرکھنے کے لیے لاتعلق ہونا ضروری ہے کیونکہ اس میں کچھ ایسی چیزیں موجود ہیں جن کی توجیہ و تعلیل نہیں ہوسکتی۔ حسن ایک ایسی مسرت بخش شے ہے جو آفاقی اور ضروری ہے مگر یہ دونوں داخلی اور موضوعی ہیں۔ خارجی حقائق میں ان کی کوئی دلیل نہیں دی جاسکتی۔ ایک حد تک اس میں مقصدیت ہے۔ اگر یہ بغیر مقصد ہی ہو تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ حسن کا تعلق افادیت اور کمال سے نہیں کہ حسن ضرور فائدہ مند ہو۔ حسن کو جاننے کا شعور نہ تو مجرد عقل سے ہے' نہ صرف احساس سے ہے' نہ صرف اخلاق سے۔ ان میں سے کوئی بھی ادراک حسن کے حوالے سے آخری حوالہ نہیں ہے۔

جمالیاتی شعور عقل و احساس کا مقام ہے۔ وہ ایک آزاد حسن (Free Beauty) کا تصور پیش کرتا ہے۔ وہ حسن پاکیزہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ کسی چیز کے توسل سے محسوس ہوتا ہے۔ اگر وسیلہ نہ ہو تو حسن محسوس بھی نہ ہو۔ چونکہ حسن داخلی اور موضوعی ہے اور اس کا ادراک بھی داخلی ہے۔ اس طرح جلال (Sublimity) کا ادراک بھی جذبہ عقل پر ہے۔ فن اس وقت حسین ہوتا ہے' جب وہ فطرت کے قوانین سے آزاد ہوتا ہے۔ فطرت حسین ہوتی ہے' جب وہ مقصدیت فن کی حامل ہو۔

شیلر کہتا ہے کہ حسن بلاشبہ خارجی اور معروضی شے ہے۔ یہ اندر نہیں' باہر ہے۔ غور وفکر ایک ضروری شے ہے۔ یہ اندر نہیں باہر ہے۔ جس کے تحت ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ہماری حالت بھی ہے اور ہمارا عمل وفعل بھی۔ جمالیات میں شیلر نے مشابہت کے نظریئے کا اضافہ کیا۔ مشابہت کا مطلب Presentation of the Likeness ہے۔ اس کو وہ فن کہتا ہے۔

نطشے جو بہت سارے مضامین میں اقبال کا استاد ہے' جن لوگوں نے اقبال پڑھا ہے' ان کو اس بات کا علم ہے کہ اقبال نے اپنا فلسفہ خودی نطشے سے اخذ کیا ہے۔ اگرچہ اس نے اسے اسلامی رنگ میں ڈھالا ہے اور اس کی ہیئت کو بدل دیا ہے۔ جب ہم جمالیات کے موضوع پر نطشے کا نکتہ نظر دیکھتے ہیں تو لگتا ہے' ہم اقبال کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

نطشے کہتا ہے کہ حسن اضافی اور اعتباری ہے۔ کائنات میں حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب حتمی خودی سے مستعار لے کر انسان اپنی خودی کے مظاہرات پیدا کرتا ہے۔ جب انائے کبیر سے متاثر ہو کر انسان جو انائے صغیر کا مالک ہے' مظاہرات پیدا کرتا ہے

خودی کا سرنہاں......لا الہ الا اللہ

یہ وہ بنیادی فلسفہ ہے جو اقبال نے نطشے سے لیا اور اسے اسلامی رنگ دیا۔ نطشے کا کہنا ہے کہ جب انائے صغیر اپنا اظہار کرنا چاہتی ہے اور حسن میں کرنا چاہتی ہے تو انائے صغیر کا مالک انسان اپنی خودی اور اپنے اندر کے ذریعے اس کا اظہار کرتا ہے۔ یہ خارجی نہیں ہے' خالصتاً داخلی ہے۔ مختصراً عقل اور احساس کی وحدت کو جمالیاتی وحدت کہتے ہیں۔

ہیگل کہتا ہے کہ خیال یا حقیقی تصور مطلق جب ہمارے حواس پر اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے تو اسے حسن کہتے ہیں کہ جب کوئی خیال مطلق یا حسن مطلق ہمارے حواس پر وارد ہوتا ہے تو ہم اس کا احساس کرتے ہیں۔ حقیقت مطلقہ اصل ہے اور کائنات اس کی فرع ہے۔ اس لیے حسن کی حیثیت اعتباری اور اضافی ہوگی۔

شوپن ہاور قوت ارادی کو تخلیق کی قوت اور ہستی و موجودات کی اصل قرار دیتا ہے۔ ہر چیز کچھ نہ کچھ خصوصیت رکھتی ہے اور وہ کسی نہ کسی تعداد میں اس قوت ارادی کو ظاہر کرتی ہے اور یہ ارادے کے مظاہر ہی کسی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور حسن کہلاتے ہیں جبکہ بدصورتی اس ارادے کے ناقص مظاہر ہیں یعنی ارادے کی بہتر کارکردگی حسن اور ناقص کارکردگی بدصورتی کہلائے گی۔

کروچے ایک جدید فلسفی ہے۔ اس نے کہا کہ حسن' اظہار مکمل ہے کیونکہ جو حقیقی اظہار نہیں ہوتا' وہ مکمل نہیں ہوتا۔ اگر اس نے حسن اور صداقت میں سے کسی چیز کا انتخاب کرنا ہو تو وہ صداقت کا نہیں حسن کا انتخاب کرے گا۔ کروچے کے نزدیک فن تصورات کو تشکیل کرنے کی قوت کا نام ہے۔ فنکار کا اصل سرمایہ تخیلات ہیں۔

وائٹ ہیڈ اقبال کے استاد اور بہت بڑے فلسفی ہیں۔ اس کا مطالعہ انسانی شعور کی بلاغت کا باعث ہے۔ اس کے نزدیک:

''موجودہ ترتیب حسن ہے۔''

جس ترتیب سے کسی چیز کو مرتب کیا جائے گا' وہ حسن کہلائے گی۔ حسن کی تعریف تب مکمل ہوتی ہے' جب ترتیب

Marfat.com

کے مقاصد کا تعین ہو جائے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ بذاتِ خود حسن کی تعریف نہیں ہو سکتی مگر جس ترتیب سے آگے بڑھ کر حسن وجود میں آیا، جب اس کا تجزیہ ہو گا تو ہم حسن کی بہتر تعریف کر سکیں گے۔ حسن داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ اس کی وحدت کو جو کمال ملتا ہے، اسے وہ حسن تصور کرتا ہے۔ وہ ہم آہنگی میں ہم آہنگی (Harmony of the Harmony) کو کمال حسن قرار دیتا ہے۔

ہم نے قدیم تہذیبوں سے لے کر آج تک تمام وہ معتبر فلاسفر اور دانشور جو اہم ہیں، ان کا حوالہ دیا ہے اور اس کا خلاصہ یوں ہے کہ بوطیقا میں ارسطو کہتا ہے:

"Beauty is not an end of the product. It is an enquiry. Work of art is a cultural product. It is not an everyday product."

پہلی بات جو اس نے کہی، وہ یہ ہے کہ:۔
حسن بذاتِ خود ایک مکمل شے نہیں ہے۔
فن کی تخلیق دراصل ثقافتی حاصل ہے اور اس کا انوکھا پن ہے اور
ہر روز کا حاصل نہیں ہے۔
یعنی حسن ''انوکھا پن'' ہے۔

کسی بھی فن پارے کا معیار اور نقاد کا معیار جدا ہے۔ جمالیات کی پرکھ کا انحصار ایک فرد پر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے دو افراد کی ضرورت ہو گی۔ ایک حسین اور ایک اس کی تعریف کرنے والا۔ یہ جمالیات کا بنیادی نظریہ ہے کہ اگر حسین از خود اپنے اندر ہی حسن کا حامل رہے تو اس کی توصیف کبھی نہ ہو سکے گی۔ اس لیے اسے ایک نقاد کی ضرورت ہو گی۔ اس ضمن میں میرا یہ خیال ہے کہ:

نقاد کی رائے کبھی آزاد نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ کبھی بھی مقامی تعصبات سے آزاد نہیں ہوتا۔ مثلاً Johnson Swift انگریزی ادب کا مشہور مزاح نگار ہے مگر انتہائی تلخ ہے کیونکہ تمام زندگی اس کا پیٹ خراب رہا۔ اس کو کبھی ڈھنگ کا کھانا نصیب نہ ہوا۔ اس نے اس کے مزاح میں اتنی تلخی پیدا کر دی کہ اس نے معاشرے پر سخت تنقید کی۔ جب ایک چھوٹی سی بیماری کے اثر کا یہ عالم ہے تو ایک نقاد معاشرے اور ماحول سے کس طرح آزاد ہو سکتا ہے۔ اس لیے فن پر تمام تنقید جزوی اور ایک خصوصی اندازِ نظر سے ہو گی اور نامکمل۔

اس طرح Catharesis کے خلاف یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر زمانہ حاضر کو دیکھیں تو سارے کا سارا کیتھارسس مار پیٹ کی فلموں اور ظلم و ستم کے واقعات میں نکل گیا۔ اس طرح فحش اور ننگے گیتوں میں نکل گیا مگر جب کیتھارسس کو عام لوگوں کے زاویہ سے دیکھیں گے تو یہ کبھی اعلیٰ وارفع نہیں ہوتا۔ اس طرح خیر بھی ہمیشہ ہر آدمی کے لیے باعث خیر اور قابل پسند نہ ہو گا۔ اعلیٰ اقدار و اخلاق کو آرٹ میں پیش کرنے کے لیے کئی مراحل ہوں گے مثلاً۔
اظہار کرنا۔
معلومات میں پیش کرنا۔

Marfat.com

ایک عمومی جائزہ لیناوغیرہ۔

تمام فنکاروں کوایک ہی ماحول ملتا ہے مگران کی پیشکش میں بڑافرق ہوتا ہے۔ جمالیات میں ہم نے یہ کبھی نہیں دیکھا کہ تمام فنکار متنوع نہ ہوں' باوجود ہم زمانی کے کہ ان کی تعلیم وشعوراور مقصد ایک نہیں ہوتے مگران کا انداز ثقافتی اور شخصی اہمیت کا حامل ہوگا۔اس طرح کلچراور شخص مل کرادب وفن میں اسٹائل تخلیق کرتا ہے۔

اب ہم قرآن حکیم کی طرف آتے ہیں۔

امام راغب فرماتے ہیں:

''حسن وہ شے ہے جو مسرت بخش ہے۔'' عقل اس کی خواہش کرتی ہے اور یہ عقل کو مرغوب ہے۔حسن کا الٹ سوء'بدصورتی ہے اور سووہ بات ہے جو باعث غم ہے۔جو نفسیاتی 'ذہنی اوراخلاقی رنج کا باعث ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشادفرمایا:

قال انه يقول انها بقرة صفراء فاقع لونها تسر النظرين (۶۹:۲)(البقرة)

ترجمہ:- موسیٰ نے کہا' وہ فرماتا ہے کہ وہ گہرے زرد رنگ کی گائے ہے۔اس کا رنگ دیکھنے والوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

یعنی اس کے رنگ میں تمہارے لیے مسرت ہے' خوشنمائی ہے۔قرآن حکیم میں جمالیاتی تفاصیل کے باب میں رنگ تک کا تذکرہ فرمایا ہے۔دوسری جگہ ارشادفرمایا:

هو الله الخالق البارى المصور له الاسماء الحسنى (۵۹:۲۴)(الحشر)

ترجمہ:-وہی اللہ تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا' بنانے والا اورصورت عطا کرنے والا ہے۔اسی کے لیے اچھے اچھے نام ہیں۔

اب اس مصور عظیم کی' اس پروردگار عالم کی تصاویر کے کچھ رنگ دیکھتے ہیں کہ اس کا فلسفہ حسن کیا ہے؟ ایک مقام پر قرآن حکیم نے شام کا منظر بیان کیا ہے کہ جب چرواہے شام کو اپنے جانور چرانے کے بعد گھر لے کر آتے ہیں تو اس وقت کے منظر کے حسن کا کیا عالم ہوتا ہے؟

ولكم فيها جمال حين تريحون وحين تسرحون (۱۶:۶)(النحل)

ترجمہ:-اور جب (تم چوپاؤں کو) شام کے وقت چرا کر لاتے ہو اور صبح چرانے لے جاتے ہو تو اس میں تمہاری عزت وشان ہے۔

یہاں ابلاغ کے کمال کا یہ عالم ہے کہ پورے منظر کو ان جامع الفاظ میں بیان کر دیا۔"ولكم فيها جمال" کہ اس میں تمہارے لیے حسن ہے۔یہ حسن اس نے پیدا کیا۔اسے معلوم ہے کہ یہ حسن ہے مگر یہ حسن اس آدمی کو پیارا لگے گا جو اس کی توصیف کا جذبہ رکھے گا۔

دوسری جگہ ارشادفرمایا:

فلا تعلم نفس ما اخفى لهم من قرة اعين جزا بما كانوا يعملون (۳۲:۱۷)(السجده)

Marfat.com

ترجمہ:۔پس کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔یہ ان کے نیک اعمال کا صلہ ہے۔

یعنی انعامات الہٰی اور جنت کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنایا گیا ہے یعنی قرآن کے تصور جمالیات کے ذیل میں:

1-رنگ۔

2-اس کا متحرک ہونا' حسن نظارہ اور

3-آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا۔

کو بیان کرتا ہے۔اس تصور کو حدیث مبارکہ میں یوں بیان کیا گیا:

قرة عينى فى الصلوة (الحديث)

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

حسن کی گذشتہ تمام تعریفات کے مقابل قرآن حسن کی یہ تعریف کرتا ہے:

الذی احسن کل شی خلقه وبدا خلق الانسان من طين (۳۲:۷)

ترجمہ:۔وہی ہے جس نے جو شے بنائی' خوب بنائی اور انسان کی تخلیق کی ابتداء اس نے گارے سے کی۔

یعنی پروردگار نے ہر چیز کو حسن سے بنایا۔ترتیب سے بنایا یعنی یہاں قبح کے تصور کو کلیتاً رد کر دیا گیا ہے یعنی

"There is no concept of ugliness with God."

اس نے ہر چیز کو اچھا اور خوبصورت بنایا ہے۔ان کی اچھائی یا برائی ہمارے انتخاب پر مرتب ہوتی ہے۔اب تخلیقات اسی انداز سے جمادات سے حیوانات تک بڑھتی چلی جاتی ہے۔اس نے ارشاد فرمایا:

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقويم(۹۵:۴)(التين)

ترجمہ:۔بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین تناسب (واعتدال) پر بنایا ہے۔

تمام چیزیں تو تناسب اور خوبصورتی سے بنائی گئیں مگر انسان کو خصوصی توجہ دی گئی ہے اور خداوند نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔گو ہر چیز میں حسن رکھا گیا ہے مگر انسان کی تخلیق میں اس سے کچھ سوا بھی ہے یعنی خدا عمومی فن پاروں سے خصوصی فن پارے کی طرف بڑھ رہا ہے۔اگرچہ کائنات میں اللہ کی خلاقی اس کے حسن کی دلیل ہے مگر پھر فرمایا:

ذلک متاع الحيوة الدنيا (۳:۱۴)(الِ عمران)

ترجمہ:۔یہ (تمام ترنعمتیں) دنیوی زندگی کا سرمایہ ہے۔

اور

واللہ عنده حسن الماب (۳:۱۴)(الِ عمران)

ترجمہ:۔اور (اہل حق کے لیے) اللہ کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے کہ اللہ کے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے جو کچھ یہاں ہے۔

فوقهم الله شر ذلک اليوم ولقهم نضرة و سرورا (۷۶:۱۱)(الدهر)

Marfat.com

ترجمہ:- پھر اللہ (اہل حق کو) اس دن کے شر سے بچالے گا اور ان کو شگفتگی اور سرور عطا فرمائے گا۔

یعنی وہاں حسن ہے' شائستگی ہے کہ کوئی اونچی آواز سے وہاں بات بھی نہیں کرتا۔ وہاں بات بھی یہ ہوگی

ونادوا اصحب الجنة ان سلم علیکم (۴۶:۷)(الاعراف)

ترجمہ:- اور اہل جنت کو وہ پکار کر کہیں گے' اللہ کی تم پر رحمت و سلامتی ہو۔

وہاں کوئی آلائش اور میل نہیں ہے۔ اسی طرح جب صورتیں پیدا کیں تو تمام صورتوں کے بارے میں فرمایا:

وصورکم واحسن صورکم ورزقکم من الطیبت (۶۴:۴۰)(المومن)

ترجمہ:- اور اللہ نے تمہاری صورتیں بنائیں تو کیا اچھی صورتیں بنائیں اور پاکیزہ چیزوں سے تم کو رزق عطا کیا۔

الذی خلقک فسوک فعدلک۔ فی ای صورة ماشاء رکبک (۸'۷:۸۲)

ترجمہ:- جس نے تجھ کو پیدا کیا' پھر تمہارے اعضاء کو درست کیا' پھر ان میں تناسب رکھا اور جس صورت میں چاہا' تجھے ترتیب دیا۔

کہ اللہ نے تمام صورتیں اچھی بنائیں اور تناسب کے ساتھ بنائیں۔ اس طرح ارشاد ہوا:

اللہ نور السموت والارض (۳۵:۲۴)(نور)

ترجمہ:- اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

زمین و آسمان کی ہر تصویر میں اس کا رنگ نور جھلکتا ہے۔ اس کی چمک ہے۔ اس کی روشنی ہے۔ اس کا حسن ہے۔ لیس کمثلہ شی یعنی اس کی مثال بھی نہیں دی جا سکتی۔ اس کے مظاہر کی نقل تو ہو سکتی ہے مگر اس جیسی ممکن نہیں مگر وہ خود ادراک حرف و بیان میں نہیں آ سکتا۔ وہ معروضی بھی ہے اور تخلیقی بھی۔

فرمایا

والارض مددنہا والقینا فیہا رواسی وانبتنا فیہا من کل شیءٍ موزون (۱۹:۱۵)(الحجر)

ترجمہ:- اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس پر سخت وزن کے پہاڑ رکھ دیئے اور اس میں ہر طرح کی چیز موزوں مقدار میں اگائی۔

یعنی ہم نے ہر چیز تناسب اور حسن سے تخلیق کی۔

لایحل لک النساء من بعد ولا ان تبدل بہن من ازواج ولو اعجبک حسنہن الا ما ملکت یمینک (۵۲:۳۳)(الاحزاب)

ترجمہ:- (اے رسولؐ مذکورہ عورتوں کے علاوہ) اور عورتیں آپ کو جائز نہیں' نہ یہ جائز ہے کہ آپ ان بیویوں کی جگہ دوسری بیویاں کر لیں خواہ ان کا حسن آپ کو کتنا ہی اچھا لگے۔

یعنی حسن تعجب خیزی کو بھی آواز دیتا ہے۔ یہ عجز خیال و عقل ہے' بقول شاعر ؎

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

Marfat.com

گویا حسن کبھی کبھی حیرت زدہ بھی کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا

فطرت اللّٰہ التی فطر الناس علیھا (۳۰:۳۰)(الروم)

ترجمہ:۔ یعنی صاحب حسن مطلق نے مخلوق کو اپنے حسن کا عکاس بنایا مگر اس کی اپنی شان یہ ہے کہ:

کل یوم ھو فی شان (۲۹:۵۵)(الرحمٰن)

حسن عطا و بخشش بھی ہے اور ظہور ذات بھی۔ تحصیل حسن کی استعداد تو اس نے ہر ایک کے اندر رکھ دی ہے مگر تکمیل حسن تب ہوگی جب وہ رب ذوالجلال کو منزل قرار دے گا ورنہ جمالیات کی تمام تعریفیں ادھوری ہیں۔

جہاں تک بیان حسن کا تعلق ہے، رب ذوالجلال تو مچھر تک کی مثال لے آتا ہے۔ ممکن ہے کسی کو گمان گذرے کہ کیا مچھر بھی اس قابل ہے کہ اس کی تخلیق پر رب ذوالجلال فخر کرے تو ارشاد ہوتا ہے کہ اسے نہیں بلکہ اس کی ٹیکنالوجی کو دیکھو۔ تم کوشش بھی کر لو تو اس کی مثل نہ لا سکو گے۔ اگر تم اس حقیر مخلوق میں موجود پروٹو پلازم کی تفصیل میں چلے جاؤ تو اس کی تفصیلات کے تصور سے ہی تم پاگل ہو جاؤ گے۔ اس تخلیق کے حسن کو دوسرے مقام پر یوں بیان کیا:

وزینا السماء الدنیا بمصا بیح و حفظا ذلک تقدیر العزیز العلیم (۱۲:۴۱)(حمٓ السجدة)

ترجمہ:۔ اور ہم نے سب سے قریب والے آسمان کو چراغوں سے زینت بخشی اور اس کو محفوظ کر دیا۔ یہ انتظام ہے زبردست اور علم والے پروردگار کا۔

اگر ہم ان ستاروں اور سورج کو قریب سے دیکھ لیں تو خاکستر ہو کر رہ جائیں مگر یہ ساری اذیتیں الوہی تناسب کی وجہ سے فرحت کا باعث بن گئے اور زینت کا باعث بن گئے ہیں۔

انا جعلنا ما علی الارض زینة لھا لنبلوھم ایھم احسن عملا (۷:۱۸)(کھف)

ترجمہ:۔ اور جو کچھ زمین پر ہے، ہم نے ان کو ان کے لیے باعث رونق بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ کون (دنیا سے محبت کرتا ہے اور کون مالک دنیا سے محبت کر کے) نیک عمل کرتا ہے۔

یعنی زمین کے سجاؤ اور بناؤ سنگھار کا بھی انتظام کر دیا کہ بنیادی طور پر انسان کو وہی کام دیا گیا جو الوہی ہے کہ یہ فطرت پر تخلیق کیا گیا ہے۔

ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفوت، فارجع البصر ھل تریٰ من فطور (۳:۶۷)(الملک)

ترجمہ:۔ اے دیکھنے والے تو رحمٰن کی کاریگری میں کوئی فرق نہیں دیکھے گا۔ ذرا دوبارہ آنکھ اٹھا کر دیکھ، کیا تجھے کہیں کوئی خلل (رخنہ) نظر آتا ہے۔

ہمارے سارے مکانوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں مگر یہ ایک آفاقی چھت ہے جو بغیر ستونوں کے کھڑی ہے۔ وہ شجر و حجر اور پہاڑ اور سمندروں پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کیونکہ آج تک کسی نے بھی حسن کی تعریف میں اس کی ٹیکنالوجی کے حسن کو شامل نہیں کیا جبکہ حسن تکمیل میں نہیں بلکہ اس کے Process میں بھی ہے۔ گویا

حسن متوازن اور معقول ہے۔

حسن باعث تسکین جسم و روح ہے۔

Marfat.com

حسن آگہی اور عقل ونور ہے۔

حسن ذاتی اور خارجی بھی ہے۔

حسن ابتداء اور انجام کے درمیان متغیر ومتبدل ہے۔

حسن میں تناقص باعث حیرت وعبرت ہے۔

حسن ناآگاہی بھی ہے اور آگاہی بھی۔

حسن اضافی ہے' زمانی ہے' واقعاتی ہے اور متحرک ہے۔

حسن تقسیم درجات بھی رکھتا ہے مگر انجام میں لازوال اور لاانتہاء ہے۔

حسن مادی بھی ہے اور غیر مادی بھی۔

حسن تخیلاتی' وجدانی اور رومانی بھی ہے۔

حسن کمال بدن وروح ہے۔ کمال فکر وجذبات بھی ہے۔

حسن زوال پذیر بھی ہے اور لازوال بھی۔

حسن ایک قدر ہے جو اشیاء کو مادی وجود اور نوری تصور میں عطا کی گئی ہے۔

حسن کا حقیقی نقاد اور تعریف کرنے والا خود خدا ہے۔ وہ ایک ایسا مصور ہے جو سب سے اعلیٰ اور منفرد ہے۔

ہم اکثر ایک جملہ سنتے ہیں کہ مصور نے اس میں جان ڈال دی ہے یا ہو بہو اصل کو بیان کر دیا ہے۔ یہی وہ صفت الٰہی ہے جس سے ہمیں وجود ملا۔ ہم اللہ کی بنائی ہوئی تصویر ہیں جنہیں مصور نے زندگی دے دی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو تخلیق کے درجے سے بھلا دیا ہے۔ حالانکہ یہی تصور ہمارے لیے اس کے حضور حیرت وانکسار کا باعث تھا۔ خالق حقیقی انسان کے علاوہ اپنی کسی بھی مخلوق پر ناز کر سکتا تھا۔ وہ انسان کو معیار حسن اور تصور حسن سے محروم کر سکتا تھا۔

وما تشاء ون الا ان یشاء اللہ ان اللہ کان علیما حکیما (۳۰:۷۶)(الدھر)

ترجمہ:۔اور لوگو تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے۔ بجز اس کے کہ جو خدا ہی کو منظور ہو۔ بے شک اللہ جاننے والا اور بڑا حکمت والا ہے۔

مگر اس نے انسان پر اپنا یہ انعام فرمایا۔ حسن کی مکمل آگہی ذہن انسانی سے بالا ہے کیونکہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے قابل نہیں ہے۔ انسان کی تمام تر تعریف حسن تقلیل علم ومواد (Deficiency of Data) کی پیداوار ہیں' مختصر ہیں' محدود ہیں' اضافی اور غیر مکمل ہیں۔ اللہ انسان کو جمادات' نباتات اور عالم حیوانات کے تصور جمال سے گذارتے ہوئے اپنے نظریہ جمال تک پہنچاتا ہے۔ اللہ کا نظریہ جمال

محمد رسول اللہ ﷺ

ہے۔ اللہ جمیل ہے اور جمال سے محبت رکھتا ہے۔ جس جمال سے وہ محبت رکھتا ہے' اس کی تھوڑی سی تعریف یہ ہے کہ:۔

وہ احمد ہے۔

Marfat.com

وہ محمدؐ ہے، صادق ہے، امین ہے، رؤف ہے، رحیم ہے۔
جوامع الکلم ہے۔ شاہد و نبی ہے۔
حسن ہے، حسین ہے، احسن التقویم ہے۔
کمال فکر و عمل ہے، کمال اخلاق و کرم ہے۔
وہ بے مثال اور بے عیب ہے۔

شکل و شباہت میں، ادا و انداز میں، خد و خال میں، رنگ و بو میں، تکلم و تبسم میں، تفکر و تدبر میں، تکرم و ترحم میں، اشارہ و کنایہ میں، علم بے پایاں میں، ابلاغ میں، ترفع میں، داخلی و خارجی زندگی میں، دوستی و رشتے میں، بچپن و بلوغت میں، صلح و جنگ میں، افتخار و اعجاز میں، حیات و ممات میں، تحصیل و ترویج علم میں، وہ پیکر حسن و جمال کل بھی بے مثال تھا، آج بھی ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہ اللہ کا بندہ ہے، شاہد ہے، محبوب ہے، اللہ کا محمد ہے، اللہ کا احمد ہے۔

یہ تصویر جمال کیسی ہے؟ اس کا بیان اس کی زبان سے سنیں جس نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ایک نادان اور سادہ مزاج بڑھیا جس سے اللہ کے رسولؐ کے دشمنوں نے پوچھا کہ کیا یہاں سے رسول اللہ گذرے تو ام معبد نے کہا:

''ہاں وہ جو پاکیزہ روح، کشادہ رو، پسندیدہ خو، نہ توند نکلی ہوئی، زیبا، صاحب جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال لمبے و گھنے، آواز میں بھاری پن، بلند گردن، سرگیں چشم، باریک و پیوستہ ابرو، سیاہ گھنگریالے بال، خاموش وقار کے ساتھ چال گویا دلبستگی لیے ہوئے۔ دور سے دلفریب قریب سے شیریں و کمال حسن، شیریں کلام، کلام کی و بیشی سے معرا، تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی، میانہ قد کہ کوتاہی سے حقیر نہیں نظر آتے۔ نہ اتنے طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرے۔ والا قدر، رفیق ایسے کہ اس کے دائیں بائیں رہتے ہیں۔ جب وہ کچھ کہتا ہے تو چپ چاپ سنتے ہیں۔ مخدوم اور مطاع، وہ جو حکم دیتا ہے، اس کے رفیق تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں۔

کیا اس سے بہتر کوئی تصویر ہو سکتی ہے۔

امام ابن حزم نے آپ کا حلیہ مبارک اس طرح نقل کیا ہے۔

''رسول اللہؐ نہ بہت لامبے تھے نہ پستہ قد۔ آپ کا قد مبارک میانہ تھا۔ رنگ کے اعتبار سے نہ بالکل سفید نہ گندمی گوں بلکہ رنگ سفید کے ساتھ ساتھ سرخی لیے ہوئے تھا۔ چہرہ مبارک چودھویں رات کی طرح روشن تھا۔ چمکدار سر کے بال نہ بالکل سیدھے نہ پیچدار بلکہ ہلکی سی پیچیدگی کے ساتھ گھنگریالے تھے۔ اعضاء کے جوڑوں کی ہڈیاں موٹی اور پُر گوشت، دندان مبارک خوبصورت اور چمکدار۔ دہن اعتدال کے ساتھ فراخ و تنگ نہ تھا۔ ناک خوبصورت تھی۔ رفتار تیز تھی۔ چلتے تو معلوم ہوتا جیسے ڈھلوان سے اتر رہے ہیں۔ توجہ فرماتے تو پورے بدن کے ساتھ توجہ فرماتے یعنی صرف گردن پھیر کر متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ نگاہ نیچی رہتی تھی۔ پنڈلیاں پُر گوشت اور ملائم تھیں۔ ایڑھیوں پر گوشت کم تھا۔ ریش مبارک گھنی اور بال سیاہ تھے۔ آپؐ کے پاؤں کے تلوے قدرے گہرے تھے۔ سر کے بال لامبے ہوتے تو کانوں کی لو یا شانے تک پہنچتے ورنہ نصف کانوں کی لو تک رہتے۔ سر یا داڑھی کے بال زیادہ سفید نہ تھے۔''

یہ تو آپؐ کے جسمانی جمال کا خاکہ ہے۔ آپؐ کے روحانی اور اخلاقی جمال کا یہ عالم تھا کہ عبداللہ بن عباس سے

Marfat.com

روایت ہے کہ آپؐ مال دینے میں سب سے زیادہ سخی تھے۔ آپؐ اس میں چلتی ہوا سے بھی زیادہ سخی تھے۔ انسؓ کا بیان ہے کہ میں نے دس برس تک آپؐ کی خدمت کی۔ آپؐ نے کبھی مجھے اف نہیں کہا۔ ایک مرتبہ آپؐ نے مجھے کسی کام کے لیے فرمایا۔ میں بازار میں بچوں سے کھیلنے لگا۔ ناگاہ میں نے آپؐ کا ہاتھ اپنی گردن پر پایا۔ میں نے دیکھا تو آپؐ ناراض نہیں تھے' مسکرا رہے تھے۔ فرمایا حضورؐ سب لوگوں سے زیادہ اچھی عادات رکھتے تھے۔

رسول اللہ سے جس نے کوئی چیز مانگی' آپؐ نے نہیں' نہیں فرمایا۔

نہ رفت لا بزباں مبارکش ہرگز
مگر در اشھد ان لا الہ الا اللہ

انسؓ نے حدیث بیان کی کہ ایک بدوی آپؐ کے پاس سے پلٹ کر گیا تو اس نے کہا' اے میری قوم محمدؐ اتنا کچھ دیتے ہیں کہ پھر احتیاج نہیں رہتی۔ صفوانؓ نے کہا حضورؐ نے مجھے دیا جو دیا' وہ آپ سب لوگوں میں زیادہ مجھے غیر محبوب تھے۔ آپؐ مجھے دیتے رہے' اتنا دیتے رہے کہ آپؐ میرے لیے سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو گئے۔ غرضیکہ کسی کو آپؐ کے جمال کا کوئی پہلو نظر آیا تو کسی کو کوئی۔

جب آپؐ کے فرزند حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ نے فرمایا۔ آنکھ روتی ہے' دل رنج کرتا ہے مگر میں زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ سوائے اس کے جو اللہ کو پسند ہو۔ جب ایک بدو نے آپ سے سوال کیا۔ یا رسول اللہؐ کیا آپ بچوں سے پیار کرتے ہیں اور ان کو چومتے ہیں؟ قسم خدا کی ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ فرمایا کیا کروں؟ خدا نے تمہارے دلوں سے رحم نکال دیا ہے۔ حیا و شرم کا یہ عالم تھا کہ آپؐ میں پردے میں رہنے والی کنواری لڑکی سے زیادہ شرم و حیا تھی کہ جس چیز کو آپ برا سمجھتے' صحابہ کرامؓ آپؐ کے چہرے سے پہچان لیتے۔ یہ اظہار کی انتہا تھی۔ فرمایا تم میں سے بہتر وہ ہیں جن کے خلق اچھے ہیں۔

انداز بیان کی نزاکت و لطافت کا یہ عالم کہ جب ایک مرتبہ ایک صحابی بیگمات کو جو اونٹوں پر سوار تھیں' تیز رفتاری سے لے جا رہے تھے تو فرمایا ''آہستہ لے چلو ان شیشوں کو۔'' ہاتھوں میں نور و برکت کا یہ عالم کہ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں۔ مدینہ کے لوگ اپنے پانی کے برتن آپؐ کے پاس لے آتے اور آپؐ اپنا دست مبارک اس میں ڈبو دیتے اور سردیوں میں بھی یہ معمول ہوتا اور آپ کو سخت تکلیف بھی ہوتی۔

حجام آپ کا سر بنایا کرتے تو صحابہ قریب ہوتے کہ آپؐ کا کوئی بال زمین پر نہ گرے۔ آپ معتدل اور فطری تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب آپؐ کو دو کاموں کا اختیار دیا گیا تو آپؐ نے آسان کو چنا۔ آپؐ نے کبھی اپنے لیے بدلہ نہیں لیا۔ کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا' نہ عورت کو نہ خادم کو۔

جابر بن سمرہؓ فرماتے ہیں' آپؐ ظہر کی نماز کے لیے نکلے۔ سامنے کچھ بچے آئے۔ آپؐ نے ہر بچے کے رخسار پر ہاتھ پھیرا' میرے رخسار پر بھی ہاتھ پھیرا۔ آپؐ کے ہاتھ میں وہ خوشبو اور ٹھنڈک تھی جیسے خوشبو ساز کے ڈبے سے ہاتھ نکلا ہو۔ انسؓ نے فرمایا۔ میں نے عنبر و مشک میں اور کسی خوشبو میں ایسا حسن نہیں دیکھا جو آپؐ کے جسم مبارک کی خوشبو میں تھا۔ میں نے دیباج و حریر میں ایسی نرمی نہیں دیکھی جیسی آپؐ کے جسم مبارک میں تھی۔ آپؐ کا رنگ مبارک سفید چمکتا ہوا تھا اور سینہ مبارک موتی جیسا تھا۔ ام سلیم سے پوچھا' جب وہ پسینہ جمع کر رہی تھیں تو وہ کہنے لگیں' وہ یہ خوشبو جمع کر رہی ہیں۔ ابن

Marfat.com

عباسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ پیشانی پر پہلے بال لٹکایا کرتے تھے پھر مانگ نکالنے لگے۔

حضرت براءؓ کہتے ہیں۔ آپؐ میانہ قد تھے۔ سینہ کشادہ تھا۔ بال کانوں کی لو تک تھے۔ آپ سرخ و زرد لکیروں والا جوڑا پہنتے تھے۔ میں نے آپؐ سے بڑھ کر کوئی حسین نہیں دیکھا۔ آپؐ کا چہرہ مبارک سب سے خوبصورت تھا۔ قتادہؓ فرماتے ہیں، حضورؐ کے بال میانہ تھے، گھنگھریالے تھے، نہ سیدھے یعنی اگر دنیا کی بہترین تصاویر اور نقش و نگار کا بھی تصور کریں تو اس کا آپؐ سے مقابلہ ناممکن ہے حتیٰ کہ جب اس اعلیٰ ترین تخلیق بیان کرنی چاہی تو پروردگار عالم کو بھی مشکل پیش آئی اور جب اس نے اس تصویر کامل کا نام رکھنا چاہا تو دیکھا کہ کسی موزوں لفظ سے بات نہیں بنتی اور اس کے لیے اس نے منفی لفظ استعمال کیا۔ فرمایا حریص علیکم یعنی اتنا مبالغہ کہ پروردگار عالم نے ایک انتہائی بڑے موزوں فن پارے کو ایک منفی لفظ سے بیان کیا۔

حضورؐ نے بھی ایک بات فرمائی کہ اگر کسی شخص کے سامنے میرا نام لیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے تو وہ بخیل ہے۔

بخیل صرف حرص و ہوس کا ہی نام نہیں بلکہ یہ وہ شخص ہے جس میں کسی اچھی چیز کی کوئی صفت موجود نہیں ہے۔

اور حضورؐ اس معراج حسن پر ہیں کہ اگر آپؐ کا نام لیا جائے اور انسان میں ذرا بھی توصیفی حس موجود ہوگی تو وہ ضرور درود پڑھے گا اور یہ بات ہے کہ وہ کافر ہو، مشرک ہو، جب بھی انسانی اقدار اور ذاتی حسن و جمال کا تذکرہ ہو تو چاہے وہ کارلائل ہو، وہ اپنے پیغمبر کو نہیں محمد رسول اللہؐ کو ہی ہیرو قرار دے گا۔ چاہے وہ ''The 100'' کا مائیکل ہارٹ ہو، اسے نقطہ معراج پر آپؐ ہی نظر آئیں گے۔ اس لیے کہ آپؐ کے اخلاق کریمانہ کا یہ عالم ہے کہ:-

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ماعنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم o
(التوبہ ۹:۱۲۸)

ترجمہ:- تحقیق تمہارے پاس تمہیں میں سے رسول آئے۔ جنہیں تمہاری تکلیف گراں گزرتی ہے اور وہ تمہارے لیے خیر پر حریص ہیں اور اہل ایمان کے لیے سراپا راحت و رحمت ہیں۔

ہم تصویر کو اس وقت عظیم مانتے ہیں جب وہ زندگی کے قریب تر ہو اور الوہی کمال حسن کی انتہاء یہ ہے کہ وہ اپنی تصویروں میں حقیقتاً جان ڈال دیتا ہے۔ اگرچہ تمام بنی نوع انسان اس کی تصاویر ہی ہیں مگر جو سب سے اعلیٰ تصویر اللہ نے بنائی، وہ محمد رسول اللہؐ ہیں کہ اس تصویر میں اس نے تمام جمالیاتی پہلوؤں کو جمع کر دیا۔

ظاہر میں، باطن میں، ترفع میں، کمال میں، یہ پیکر جمال آج تک ہمارے لیے باعث فخر، باعث نجات اور باعث رحمت ہے اور باعث صلوٰۃ و درود ہے۔

یا صاحب الجمال ویاسیّد البشر
من وجھک المنیر لقد نور القمر
لایمکن الثناء کما کان حقه
بعد از خدائے بزرگ توئی قصه مختصر
اللهم صل علے محمد وعلے ال محمدؐ
وماعلینا الاالبلغ O

Marfat.com

خطبہ ششم

اسلام اور عصر حاضر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطنا نصیرا O (۸۰:۱۸)(بنی اسرائیل)

تمام نظام ہائے حیات اور فلسفہ ہائے خیال کے مقابل اسلام اس قدر زبردست فلسفہ حیات کا حامل ہے کہ آج تک کوئی دوسرا نظریہ اسلام پر غالب نہیں آ سکا۔ مگر آج ہم اسلام کو اس طرح دیکھ رہے ہیں گویا کوئی بہت قدیم سی روایت دور جدید میں آ کر کھو سی گئی ہے۔ گویا اسلام ایک پژمردہ حقیقت ہے جس کا تذکرہ آج فائیو سٹار ہوٹلوں کے کلچر میں نہیں کیا جا سکتا، مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ کوئی بھی دور جدید اسلام کو پژمردہ یا پرانا نہیں کر سکتا۔ عصر حاضر ہو یا پھر عصر قدیم یہ ہمارے نزدیک وقت کی بندشیں ہیں۔ ہم نے زمانے کو اس طرح تقسیم کر دیا ہے مگر جس نے اسلام اور قرآن دیا ہے اس کے نزدیک وقت کی ایسی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ رب ذوالجلال نے اس دنیا کو تخلیق کرنے سے پہلے اس کے ماسٹر پلان میں جسے لوح محفوظ کہا جاتا ہے، اس کے رنگ و بو اور جملہ تفصیلات کو لکھ کر بند کر دیا تھا اور اس پر سے اپنا قلم اٹھا دیا۔ پھر زندگی کو حرف کن کا حکم دیا اور زندگی کی سکیم کو رواں دواں کر دیا۔ اس خدا کے لیے نہ عصر حاضر کوئی شے ہے نہ آنے والے زمانے کوئی الگ سے حقیقت۔ چاہے کئی اکیسویں صدیاں بیت جائیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اولم یر الذین کفروا ان السمٰوت والارض کانتا رتقا ففتقنھما وجعلنا من الماء کل شی ءٍ حی افلا یومنون (۳۰:۲۱)(الانبیآء)

ترجمہ: کیا جو لوگ کافر ہیں انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ آسمان و زمین ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا۔ اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے تخلیق کیا۔ پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

یعنی ساری کائنات ایک Whole Mass تھی۔ اسے الگ الگ کیا۔ اس سے تمام عالم اور عالم انسانیت وجود میں آیا۔ اس پر اربوں سال لگ گئے۔ قرآن نے اس کے لیے یوم کا لفظ استعمال کیا، مگر یوم کی وضاحت کیا ہے؟ جو اربوں سال کے برابر ہے۔ اس کی وضاحت اسی طریق پر ہوگی، جیسے کسی نے حضرت امام زین العابدینؓ سے سورۂ حدید کی آیت

هو الاول والآخر الخ کی تفسیر پوچھی تو فرمایا:

نزلت للمتعقلين فی آخر الزمان

ترجمہ: یہ آخر زمانے کے اہل عقل وفکر کے لیے نازل ہوئی ہے۔

آج جب ہم دیکھتے ہیں کہ سکائی لیب خزائن الارض کی اطلاع دے رہے ہیں، سیارے کا کیمرہ چیونٹی تک کی تصاویر دے رہا ہے تو ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ امام کا قول کتنا صحیح ہے۔ آج ہم پروردگار عالم کی اس آیت کا مطلب زیادہ درست طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ قرآن کی وضاحت آنے والے زمانوں میں کس طرح کی جائے گی تو فرمایا:

القرآن يفسره الزمان

ہر زمانہ قرآن کی وضاحت خود کرتا ہے۔

اگر آج ہمیں اسلام اور قرآن پیچھے نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مفسر اپنے زمانے کے علوم سے آگاہ نہیں ہے۔ یعنی قرآن زوال پذیر نہیں ہوا بلکہ مفسر زوال پذیر ہو گیا ہے۔ آج ہم ایک عام علم کی تحصیل کے لیے بیس پچیس سال لگا دیتے ہیں۔ اس میں اتھارٹی حاصل کرنے کے لیے پوسٹ گریجوایشن کرتے ہیں، سپشلائزیشن کرتے ہیں، ڈاکٹریٹ کرتے ہیں، مگر کائنات کے سب سے بڑے علم کی جستجو کے لیے ہم ان لوگوں کی طرف جاتے ہیں جو میٹرک جتنی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ اسلام، قرآن اور اللہ کسی زمانے میں بھی سائنسی اثر سے پیچھے نہ تھا۔ اسی طرح آج بھی ہے۔ زمانے کے عمومی تصور ہی کو لیں، قرآن نے بہت پہلے یہ تصور دے دیا کہ زمانہ محدود ہے، لامحدود نہیں ہے۔

الله الذى رفع السمٰوت بغير عمد ترونها ثم استوى على العرش وسخر الشمس والقمر كل يجرى لاجل مسمى (۲:۱۳)(الرعد)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے بلاستونوں کے آسمان کو بلند کر رکھا ہے۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، پھر عرش پر قائم ہوا اور سورج کو چاند کو اپنے اپنے کام پر لگا دیا۔ ہر ایک معین وقت تک چلتا رہے گا۔

یعنی یہ تمام کائنات جس میں تم موجود ہو ہم نے اسے ایک محدود وقت کے لیے بنایا ہے۔ مگر یہ تمام وسعتیں جن کی پیائش کے لیے ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے کوانٹم ہو یا اضافیت ہمیں اپنے ہر اندازے کو کسی دوسرے پیمانے کے لیے منتقل کرنا پڑتا ہے، کیونکہ انسان اسے لاانتہا سمجھتا ہے مگر دراصل وہ محدود ہے۔ ایک طرف اس کی ابتداء ہے:

وجعلنا من الماء كل شئ حى۔ (۲۱:۳۰)

ترجمہ: اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے پیدا کیا۔

دوسری طرف اس کی انتہا اور انجام ہے۔

اذا الشمس كورت ○ واذا النجوم انكدرت ○ (۸۱:۱،۲)(التکویر)

ترجمہ: جب یہ روشن آفتاب لپیٹ دیا جائے گا اور سب تارے بے نور ہو جائیں گے۔ (ٹوٹ کر گر پڑیں گے)

كل من عليها فان ...... (۵۵:۲۶)(الرحمٰن)

Marfat.com

ترجمہ: جو کچھ بھی زمین پر ہے سب فنا ہونے والا ہے۔

اللہ ہر چیز سے باخبر ہے جو اسرار ہائے کائنات کو آج کے انسان کے سامنے صدیوں پہلے رکھ چکا ہے۔ کیا وہ زمانہ آخر کے انسانوں کے ذہن سے آگاہ نہ ہوگا۔ درحقیقت تمام زمانے قرآن تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہر زمانے کی نئی اور جدید سائنسی دریافتیں اس قرآنی دعویٰ کی تصدیق و وضاحت کے لیے ہی ہیں' جنہیں قرآن پہلے بیان کر چکا ہے۔ مثلاً یہ ارشاد ربانی:

والسمآء بنینھا باید وانا لموسعون...... (۴۷:۵۱)(الذریت)

ترجمہ: اور ہم نے آسمان کو اپنے دست قدرت سے بنایا اور ہم ہی صاحب قدرت ہیں کہ کائنات کو وسیع سے وسیع تر کرتے جاتے ہیں۔

سولہویں صدی تک یہ آیت ناقابل فہم تھی۔ یہ متشابہات قرآن میں سے ہے جو پہلے قابل فہم نہ تھی' مگر آنے والے زمانوں میں قابل فہم ہوئی۔ تمام مفسرین نے اس کا مفہوم زور بازو اور رزق لیا ہے۔ یہ درست نہ تھا یہ اس آیت کا لغوی مفہوم تھا۔ اگرچہ اہل اسلام اس آیت کی معنویت کو واضح کرنے کے قابل نہ ہوئے تھے' اس طرح یہ علم وحکمت اغیار کو مل گئی۔ دور جدید کے مایہ ناز سائنس دان آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت میں بھی انکشاف کیا کہ تمام کائنات پھیل رہی ہے۔ اس طرح اس کی ایک عملی کاوش نے قرآن کی تفسیر کر دی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت کی وضاحت' ہمیں موجود تفسیروں میں مل جائے گی؟ ہرگز نہیں' اس کے لیے ہمیں آئن سٹائن اور جدید سائنسی تحقیقات کی طرف آنا ہوگا۔

یہاں قصور اللہ کا یا قرآن کا نہیں ہے بلکہ ان مفسرین کا ہے جو قرآن کو ایک معقول ومنقول کی کتاب سمجھ رہے ہیں۔ جنہوں نے ناظرہ حروف سے آگے بڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ حالانکہ قرآن کائنات کی سب سے بڑی علمی دستاویز ہے۔ اس قوم نے شاید کبھی کسی چیز کی اتنی بے توقیری اور بے حرمتی نہیں کی جتنی قرآن کی کر رکھی ہے' حالانکہ پروردگار عالم انہیں یہ سرزنش اور تنبیہ کر رہے ہیں کہ اگر تم غور وفکر کے حامل ہوتے تو ہمیں اپنے عزت وجلال کی قسم کہ تم کبھی بھی کافر نہ رہ سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں کی آج کی صورت حال کو دیکھیں تو الوہی دعوے کی حقیقت کتنی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد!
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

آج قرآن وضاحت کے لیے ان لوگوں کے سپرد ہو چکا ہے جنہوں نے گذشتہ صدیوں کے تفسیری لٹریچر پر ایک حرف کا اضافہ نہیں کیا۔ اگر تفسیر کے حوالے سے صحابہ کرامؓ کا رویہ دیکھیں تو وہ بھی جدید تر نظر آتا ہے۔

واعبد ربک حتی یاتیک الیقین (۹۹:۵۱)(الحجر)

کی وضاحت کرتے ہوئے تمام صحابہ رسولؐ نے یقین کا ترجمہ موت کیا۔ اس لیے کہ یقین کا حصول کسی عبوری لمحے میں ممکن نہیں ہے' کیونکہ ہر لمحہ تبدیل ہونے والا ہے۔ اس کی ہر حیثیت بدل جائے گی۔ یہ صرف موت کی دہلیز' لمحہ سکرات ہی ہے جو علمی یقین دے سکتا ہے۔ گویا یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ اے انسان! اس وقت تک تم اپنی تعلیم وتربیت کو ترک نہ کرنا جب تک تم اپنی موت کو نہ پہنچو۔ اس کی عملی مثال ہمیں حضرت علیؓ کی زندگی میں ملتی ہے کہ جب ابن ملجم نے

Marfat.com

آپ کو زخمی کیا اور آپ شہید ہو رہے تھے تو فرمایا کہ خدا کا شکر ہے کہ میں منزل ہستی سے ایمان سلامت لے کر نکل رہا ہوں' چونکہ علیؑ کا مقام علمی اتنا بلند تھا کہ آپؐ نے فرمایا '' میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ'' جب آپ کا مقام علمی اتنا بلند تھا تو حرف '' یقین '' کی وضاحت بھی آپ سے بہتر کون جان سکتا تھا؟

اسلام ایک ذہنی رویے (Mental Approach) کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد تحصیل علم پر ہے۔ ایمان ہی کی تعریف کو لیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا ایمان '' بیم ورجا'' کے درمیان ہے یعنی جسے تقدیر الٰہی کا خوف نہ رہا' وہ بھی اللہ کی گرفت سے غافل ہو گیا اور جس پر اس خوف کا غلبہ بڑھ گیا وہ زندگی سے ہی ناامید ہو گیا۔ الغرض اسلام کا ذہنی رویہ تحصیل علم سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ جب مسلمانوں نے تحصیل علم ختم کی تو زوال پذیر ہونے لگے۔ ایک وقت تھا جب دنیا میں تین بڑی قوتیں تھیں اور وہ تینوں عالم اسلام کی تھیں جبکہ مغربی یورپ پر حماقتوں اور جہالتوں کا دور دورہ تھا اور اسلام کی عظمتوں کا عالم یہ تھا کہ ایک طرف سلطان سلیمان ذیشان المعظم یورپ کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا' اکبر اعظم ماوراء النہر اور ایشیا تک حکمران تھا اور تیسری قوت سلطان عباس اعظم صفوی کی تھی۔ اکبر اعظم کے سامنے جب برطانوی حکومت کی وزارت آئی اور ملکہ انگلستان کا تذکرہ کیا تو اس نے اپنے وزیر سے پوچھا:

ایں جزیرہ نما چرا است؟

مگر فتح کا بھی ایک نقصان ہوتا ہے اور سب سے بڑا نقصان جو ہمیں ہوا وہ یہ تصور تھا کہ فتح' اقتدار ہمارا داخلی استحقاق ہے۔ اس کے لیے کسی کاوش کی ضرورت نہیں۔ اس طرح ایک روز جمود کا آغاز ہوا۔ عالم اسلام میں نئے نئے فتنے اٹھنے لگے اور عالم اسلام پر ایسا زوال آیا کہ آج ہمیں سائنسی' علمی' تحقیقی اور فکری میدان میں کوئی بڑی مستند شخصیت ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتی مگر یہ دور زوال وزمانہ جمود زیادہ عرصے تک نہیں رہے گا' زمانہ اب پھر پلٹ رہا ہے۔

نکل کر صحرا سے جس نے سلطنت روما کو الٹ دیا تھا!

سنا ہے قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا!

مگر ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا کہ خداوند عالم نے جس چیز پر اقوام عالم کے عروج وزوال کی خشت اول رکھی' وہ صرف اور صرف علم ہے۔ اقتدار علمیہ ہر اقتدار سے بالاتر ہے:

نرفع درجت من نشاء وفوق کل ذی علم علیم (۷۶:۱۲)(یوسف)

ترجمہ: ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کرتے ہیں۔ اور ہر صاحب علم سے اوپر (بڑھ کر) صاحب علم موجود ہے۔

عصر حاضر اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ عالم اسلام کو عصر حاضر کی ترقی دیکھ کر کسی احساس کمتری میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر آج ہمیں مغرب کی اچھی زندگی کی چکا چوند نظر آتی ہے تو یہ ان کی ہنرمندی اور ٹیکنالوجی ہے جو کسی بھی وقت ادھر منتقل ہو سکتی ہے۔ یورپ کی علمی ترقی بھی پچھلے ڈیڑھ دو سو سال سے رکی ہوئی ہے۔ علمی سطح پر یورپ نے کوئی بڑا کمال نہیں دکھایا۔ اضافیت کا قانون آج سے سو سال قبل دریافت ہوا۔ مگر دوسرا قانون آج تک ثابت نہیں ہو سکا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ نے ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے علم میں ترقی نہیں کی ہے۔ اصل اصول اور بنیاد علم

Marfat.com

ہے۔ جب ہائنرخ ہرٹس(Heinreich Hurts) نے بجلی کی لہروں کی فریکونسی دریافت کی اور پہلا ریاضیاتی فارمولا دیا اور مارکونی نے اس پر پہلا Instrument بنالیا۔ اس کے بعد سائنس نے بجلی کے معاملات میں جتنی ترقی کی' وہ ٹیکنالوجی کی ترقی ہے' علمی ترقی نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم یورپ کی ترقی کا تذکرہ سنتے ہیں تو اس کے بارے میں ایک غلط تاثر قائم کرلیتے ہیں۔ ہم ان کی ٹیکنالوجی کی ترقی کو علمی ترقی قرار دیتے ہیں۔

اہل مغرب کا خیال ہے کہ مسلمان ہمیں ایک سو پچاس سال تک نہیں پہنچ سکتے' مگر ڈاکٹر قدیر نے ان کے اس دعوے کو عملاً رد کردیا' کیونکہ یہ علمی نہیں بلکہ تکنیکی ہنرمندی تھی۔ علمی طور پر بھی قرآن ہمیشہ اپنے زمانے سے آگے رہا۔ چاہے یہ بطلیموس کا زمانہ ہو گلیلیو کی دریافتیں ہوں یا آج کے دور میں ہوپکنز کے تصورات' ہر زمانے میں قرآن جدید تر ہے مگر شرط اسے سمجھنے کی ہے۔

بطلیموس نے کہا کہ زمین ساکت ہے اور باقی ساری کائنات اس کے گرد محوِ گردش ہے۔ 1542ء میں کاپرنیکس اور گلیلیو وغیرہ نے کہا کہ سورج ساکت ہے مگر قرآن پہلے بیان کرچکا ہے۔

اللہ الذی رفع السمٰوت بغیر عمد ترونھا ثم استوٰی علی العرش وسخرالشمس والقمر کل یجری لاجل مسمی (۱۳:۲)(الرعد)

ترجمہ: اللہ ہے وہ جس نے بلاستونوں کے آسمانوں کو بلند کر رکھا ہے۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ پھر عرش پھر قائم ہوا اور سورج و چاند کو اپنے اپنے کام پر لگا دیا۔ ہر ایک معین وقت تک چلتا رہے گا۔

آئن سٹائن نے 1905ء میں کہا کہ کائنات چل رہی ہے' مگر قرآن اس سے پہلے بیان کرتا ہے کہ کائنات وسعت پذیر ہے:

والسمآء بنینھابایدٍ وانا لموسعون (۵۱:۴۷)(الذریت)

ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں کو اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور ہم ہی اسے وسیع کر رہے ہیں۔

سائنس آج Big Bang کی بات کرتی ہے۔ قرآن اسے پہلے بیان کر رہا ہے۔

اولم یرالذین کفروان السمٰوت والارض کانتا رتقا ففتقنھما وجعلنا من الماء کل شیءٍ حی افلا یومنون (۲۱:۳۰)(الانبیآء)

ترجمہ: کیا جو لوگ کافر ہیں۔ انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ آسمان اور زمین ملے جلے تھے۔ پھر ہم نے ان کو جدا جدا کردیا اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے تخلیق کیا۔ پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔

یہی نہیں بلکہ قرآن سات کائناتوں کا نقشہ دے رہا ہے۔ آسمان دنیا کو چراغوں سے سجانے کا تذکرہ کرکے قرآن بتا رہا ہے کہ یہ سب سامنے کی گلیکسی وغیرہ پہلی دنیا کی ہیں۔ تم نے ابھی تک بگ بینگ دریافت کیا ہے۔ ہماری سات کائناتیں ہیں۔ ہر کائنات میں ایک زمین ہے۔

اللہ الذی خلق سبع سمٰوت ومن الارض مثلھن (۶۵:۱۲)(الطلاق)

ترجمہ: اللہ وہی ہے جس نے سات آسمان اور انہیں کی طرح زمین بھی (اپنی قدرت وحکمت سے) پیدا کیں۔

Marfat.com

ہر کائنات میں اس کی اپنی Life Belt ہے مگر ہم نے ابھی تک ایک سے زیادہ زمین دریافت نہیں کی کیونکہ ہم ابھی ایک آسمان سے بھی نہیں گذرے۔ کیا ہر زمین پر زندگی ہے:

یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علیٰ کل شی ء قدیر (۱۲:۶۵)(الطلاق)

ترجمہ: ان میں اللہ کا ہی حکم نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔

ہمارا پروردگار اتنی بڑی قوتوں اور کائنات کا مالک ہے مگر ہماری ذہنی پستی کا یہ عالم ہے کہ ہم اس کے کلام کو زوال پذیر سمجھتے ہیں اور آج کے انسان کو زیادہ آگاہ اور باخبر سمجھتے ہیں۔ رب ذوالجلال نے اہل ایمان کے لیے جو جنت بنائی اسے باغ کہا۔ آج کا مفسر اسے عام باغ سمجھتا ہے' مگر اس کی وسعتوں کا یہ عالم ہے کہ حدیث نبویؐ میں ہے کہ جنت میں ایک گھر دوسرے سے پانچ سو نوری سال کے فاصلے پر ہوگا اور ان کے درمیان مسافت براق سے طے کی جائے گی۔ اس کا حدود اربعہ قرآن حکیم نے یوں بیان کیا:

سابقوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضھا کعرض السماء و الارض (۲۱:۵۷)(الحدید)

ترجمہ: اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف سبقت لے جاؤ اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کی سی وسعت ہے۔

یہ تو جنت کی وسعتیں ہیں۔ اس کائنات ارضی کی وسعتیں اتنی زیادہ ہیں کہ تاحال انسان اس قابل نہیں ہوا کہ ان کی پیمائش کر سکے۔ عصر حاضر کے جدید ترین محققوں نے جو زمین سے قریب کا ایک ستارہ دریافت کیا ہے' اس کا زمین سے فاصلہ پندرہ ٹریلین نوری سال ہے جبکہ اقطار السمٰوت تو اس ستارے سے بھی کہیں آگے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے۔

یمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوت و الارض فانفذوا لاتنفذون الابسلطن O (۳۳:۵۵)(الرحمٰن)

ترجمہ: اے گروہ جن وانس! اگر تم سے ہو سکے تو آسمان و زمین کی حدود سے نکل جاؤ۔ لیکن تم اس سے بلا سلطان (اللہ کی مدد) کے نہیں نکل سکتے۔

یعنی اقطار السموات و الارض سے گذرنے کی واحد سبیل صرف سلطان ہے اور پروردگار کے نزدیک سلطان وہ خود ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں نو کروڑ سال کی تاریخ میں جو پہلا انسان تھا' اس سے ترقی کر کے جب وہ مہذب معاشرے کی سطح تک پہنچا تو فلسفہ عمرانیات و بشریات کا فیصلہ ہے کہ پہلا انسانی شعوری معاشرہ مذہبی معاشرہ ہے۔ یعنی سب سے پہلے انسان کو جو شعور عطا ہوا وہ مذہبی شعور تھا۔ قرآن حکیم انسان کے ارتقاء کے جملہ مراحل کو بیان کرتا ہے۔ کبھی انسان ناقابل تذکرہ تتے بھی تھا:

ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیًا مذکورا (۱:۷۶)(الدھر)

ترجمہ: بے شک انسان پر زمانے میں ایسا وقت بھی گذرا ہے جب وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔

یعنی محض ایک جرثومہ' الجی' کائی یا کسی بھی شکل میں تھا۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ اسے سنگل سیل سے ڈبل سیل کر دیا گیا اور اس مرحلے پر نر اور مادہ کو الگ الگ کر دیا گیا۔

Marfat.com

انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج (۲:۷۶)(الدھر)

ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔

یعنی یہاں پروردگار نے انسان کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا کہ اسے آزمائے کہ یہ شعور کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچتا ہے یا نہیں۔

نبتليه فجعلنه سميعا بصيرا (۲:۷۶)(الدھر)

ترجمہ: تا کہ ہم اسے آزمائیں۔ ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا ہے۔

یہ عمل جاری رہا۔ اسے سمیع و بصیر بنا دینے کے باوجود انسان کا ارتقاء تکمیل پذیر نہ ہوا تھا۔ انسان سوچتا سمجھتا نہ تھا۔ ماہرین بشریات کہتے ہیں کہ انسان جانور سے جدا تب ہوا جب اس نے جبلی عادات کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔

انا هدينه السبيل اما شاكرا و اما كفورا (۳:۷۶)(الدھر)

ترجمہ: ہم ہی نے اسے راہ دکھادی۔ خواہ وہ شکر گزار ہو یا نہ شکر گزار ہو۔

کہ ہم نے اسے عقل و شعور بخشا' مگر ابھی اس پر شناخت کا بوجھ نہیں ڈالا۔ ابھی صرف رہنمائی دی گئی' انسانی شعور نے سب سے پہلے پیغمبروں سے ہی روشنی حاصل کی۔ پہلا انسان پیغمبر ہی تھا۔ وہ انسان جو نئے حجری دور میں بستیاں بساتا نظر آتا ہے۔ اپنے تحفظ کی فکر کرتا نظر آتا ہے۔ جو اسباق سیکھتا اور آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ جسے آدم کہتے ہیں۔ وہی شناخت پروردگار کا حامل اور مظہر تھا۔ جو آخری برفانی دور کے گم شدگان کی آخری یادگار ہے۔ اس طرح ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کی معدومیت کا عمل بھی جاری رہا۔ آج کا یہ ہدایت یافتہ انسان اب سے دس سے پچیس ہزار سال قبل کا انسان ہے۔ جب اس کی ارتقاء کی تشکیل تکمیل پذیر ہوگئی تو سزا و جزا کے قانون کی تشکیل بھی اس کے مطابق ہوئی۔ رب ذوالجلال نے انسان کے شعوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ انہیں ہدایت و آگہی بخشی۔ اسے ایک قانون ملا۔ اس کے مطابق اس سے پرسش بھی ہوگی۔ اس طرح انسانی شعور بدلتا رہا' مگر شعور پروردگار مستقل رہا۔ جب انسان کا شعور مکمل ہو گیا تو رب ذوالجلال نے اپنے پیغام ہدایت کی بھی تکمیل کر دی۔

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا (۳:۵)(المآئدة)

ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔

کہ اب اللہ کا پیغام مکمل ہو گیا۔ یہ آخری اور محفوظ پیغام ہے۔ اس میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ قیامت تک کے علوم کا حامل ہے۔ اس کی ایک ایک آیت ناپ تول کر اتاری گئی ہے۔ اس طرح انسان کو امانت عقل و شعور دیا گیا اور یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ اگر انسان نے اس امانت کا تحفظ نہ کیا اور اس کی قدر نہ کی تو خلافت الٰہیہ کا اہل نہ رہے گا۔

آج کے دور تک پہنچتے ہوئے ہمارا سب سے بڑا احساس قرآن کی زوال پذیری کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ ہم اس امانت علیہ کا حق نہیں ادا کر رہے۔ ہم اللہ پر' اس کی کتاب پر ایک مقلدانہ اور جابرانہ انداز سے سوچ رہے ہیں۔ ہم نے

Marfat.com

دہلیز غور وفکر کو پار نہیں کیا۔ ہم نے ان مسائل کو سمجھنے کے لیے امام بخاریؒ کی طرح تین تین ہزار میل کا سفر نہیں کیا' کسی مشقت سے نہیں گذرے۔

قرآن سے عدم آگہی کی وجہ سے آج ہم دانشوران مغرب سے مرعوب ہیں۔ آج ہم اپنی صدیوں کو رسل' فرائیڈ' برگساں' نطشے اور وائٹ ہیڈ کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں مگر حقیقی دانش کی اور حقیقت کا کام ہے۔ اگر کسی نے خدا کی شناخت کا سفر طے نہیں کیا تو اس سے اپنی پہلی شعوری کاوش کا آغاز نہیں کیا' چاہے وہ Principia Mathematica لکھ دے' چاہے فلسفہ کی دنیا میں کہیں سے کہیں پہنچ جائے مگر وہ پروردگار عالم کی اس آیت کا مصداق ہے:

والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعة یحسبه الظمان ماءً حتی اذا جاء ہ لم یجدہ شیئًا ووجد اللہ عندہ فوفہ حسابه واللہ سریع الحساب (۳۹:۲۴)(النور)

ترجمہ: اور جو لوگ کافر ہیں۔ ان کے اعمال کی مثال بیابان میں سراب کی طرح ہے کہ پیاسا اس کو پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو کچھ نہیں پاتا اور اپنے پاس اللہ کو موجود پاتا ہے۔ بالآخر اللہ نے اس کا حساب پورا پورا چکا دیا اور اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم انہیں جہالت سے مسترد کریں ہ ہرگز نہیں' ہم نے ان کے تصورات دیکھنے ہیں' فکر وفلسفہ دیکھنا ہے' مگر وہ ہمیں رہنمائی نہیں دے سکے۔ ہمیں رہنمائی عطا کر دی گئی ہے۔ دولت علم ہماری میراث ہے مگر احساس کمتری اور غلامی سے علم نہ سیکھا جا سکے گا۔

از غلاماں لذت قرآں مجو!
گرچہ باشی حافظ قرآں مجو

(اقبال)

کہ جب ہم اغیار سے متاثر ہوں گے تو ان کے اثرات علم کے تحت تشکیک کے میدان سے گذرتے رہیں گے اور اپنے فکر وفلسفہ کی مضبوطی ہمیں میسر نہ آ سکے گی۔

اسلام کو کسی بھی نسل سے' کسی بھی عصر حاضر سے ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہر زمانے میں غالب تھا۔ آج کے زمانے میں بھی غالب ہے۔ اگر ہم اس غلبے کی آرزو کریں تو اس میں کوئی اکیسویں صدی اہمیت نہیں رکھتی' مگر جب ہم وہ بنیادی کام ترک کر دیتے ہیں جو صدیوں سے گذرنے کا چراغ ہے تو ہم اللہ کا حق ادا نہیں کرتے۔ اللہ نے ہمیں جو عقل وشعور عطا کیا وہ اپنے لیے عطا کیا ہے۔ خدا کے علم میں سارے علوم گم ہیں۔ جب اللہ کی جستجو کو چراغ بنایا جائے گا تو عصر حاضر سے آگے تھا۔ آداب واحترام اور محض قرأت قرآن رسم ورواج کی حفاظت' اس کے ساتھ تدبر اور تفکر بھی ضروری ہے۔ بصورت دیگر قرآن کا موقف یہ ہے کہ:

ان شر الدواب عنداللہ الصم البکم الذین لایعقلون (۲۲:۸)(الانفال)

ترجمہ: بے شک سب جانوروں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہی بہرے گونگے ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔

ہم اللہ کی تلاش کی راہ میں اپنے وسوسوں میں سے نہیں نکلے۔ اپنے حریف تصورات سے نہیں نکلے۔ قرآن کے

Marfat.com

خیال سے اپنے خیال کا موازنہ نہیں کرتے۔ ہم چھوٹی سی بیماری کے لیے لندن کے ماہر ڈاکٹروں سے رجوع کرتے ہیں' مگر قرآن کے فہم کے لیے ہمارا معیار کچھ اور ہے۔ ہماری عقل حسینؑ کے ساتھ ہے مگر عمل اپنی جبلت کے ساتھ یزید کے ساتھ ہے۔ آج کا زمانہ بھی ہم سے جہاد کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم صرف غم حسینؑ ہی کو نہ بیان کریں بلکہ عمل حسینؑ کی بھی تقلید کریں۔ اس کے لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ حسینؑ نے عملاً اپنی زندگی میں اپنی ترجیحات کا تعین کس طرح کیا۔ آپ نے لمحہ آخر میں بھی دو رکعت نماز کی اجازت چاہی کہ دنیا سے گذرتے ہوئے بھی آپ کو حق پروردگار کی ادائیگی کا فکر دامن گیر ہے۔ آج بھی اسلام حسینؑ کی جگہ پر ہے اور عصر جدید یزید کی جگہ پر۔ دجال عصر اپنے پورے زور پر ہے۔ جو اپنے آپ کو وقت کا خدا کہتا ہے۔ اپنی تصور آزادی دیتا ہے۔ نام نہاد آزادی' جس نے تمام اخلاقی حدوں کو بھی پامال کر دیا ہے۔ اس کو بت بنا دیا گیا ہے اور تعقل کی منفی تحقیق نے اس طلسم ہوش ربا میں انسان کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔

جبکہ دوسری طرف اگر اسلام کے مزاج کو دیکھا جائے تو تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی زمانے میں چاہے وہ عروج کا زمانہ ہو یا زوال کا مسلمانوں پر تعصب کا الزام نہیں لگا۔ کسی مسلمان کو غیر مسلموں نے متعصب نہیں کہا۔ صلیبی جنگوں کو دیکھیں۔ جبلت اور تعصب مغرب کی طرف سے سامنے آ رہا ہے۔ ایک انگریزی مصنف نے اپنے ناول Rabeca میں اپنی ہیروئن کی زبان سے کہلوایا کہ انگلینڈ سے نکل کر الجزائر ہجرت کر جاتے ہیں' کیونکہ مسلمان بڑے فراخ دل ہوتے ہیں۔ آج دنیا پر جو تعصب کی حکمرانی ہے یہ سوغات مسلمانوں نے نہیں' اسلام نے نہیں بلکہ خود مغرب نے دنیا کو دی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وحشت' دہشت گردی' قتل و غارت گری' یہ سب مغربی دنیا کے تحفے ہیں۔ نیویارک کی سڑکوں سے گذرتے ہوئے ہر آدمی نادانستہ طور پر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ یہ ان کی بقاء کا خوف ہے۔ باوجود حفاظتی بند باندھنے کے ساری قوم مصیبت کا شکار ہے۔ ان المیوں کا حل صرف اسلام دیتا ہے۔ عصر حاضر میں بھی پریشانی اور اضطراب کے لیے قرآن کہتا ہے:

من امن باللّٰہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون (۶۹:۵)(المآئدۃ)

ترجمہ:- جو اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرتا رہے اسے نہ خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ کہ اگر میری طرف آؤ گے' اگر مجھ سے مانگو گے تو خوف اور حزن نہیں رہے گا۔

May Allah give us the honesty, knowledge-ability, the courage and the stability of mind.

اللہ ہمیں اپنے علم کے لیے فراغت عطا فرمائے۔ اپنا تجسس عطا کرے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ہم کہہ سکیں: قل رب زدنی علماO

اللھم انی اعوذبک من قلب لایخشع و علم لاینفع و دعاء لا یسمع

آج کوئی بھی عصر ایسا نہیں جو اللہ کی گرفت سے آزاد ہو۔ ہر عصر جدید میں رجعت اللہ ہی کی طرف ہے۔ ہر عصر کا مالک اللہ ہے۔ اسے ہمیں اپنے اوپر ایک خوف کے طور پر مسلط نہیں کرنا چاہیے۔ جب ہم اللہ کے ساتھ ہیں تو ہم زمانوں' علوم اور ترقی و عزت کے وارث ہیں۔ اور اگر اللہ سے جدا ہیں تو مسلمانوں کے لیے پسماندگی سے کوئی مفر نہیں۔ یہ

اسلام ہی ہے کہ گیارہ سو برس تک غالب رہنے کے باوجود اس میں وہ تکبرات نہیں آئے جو سو سال کے عروج میں مغرب میں آ چکے ہیں اور وہ کسی دوسرے کو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں دے رہے۔ اس کردار کے حامل یورپ کے سو برس کے عروج سے ہم کیوں مغلوب ہوں گے؟ ایسا تصور دراصل جہالت علمیہ اور تجسس کی کمی کی وجہ سے ہے۔ صاف ستھری کاوشوں کا فقدان اور محنت و عمل سے گریز کی وجہ سے ہے۔

اللہ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم امت کے فرد کے احساس سے اللہ کی بندگی کے احساس سے جئیں کہ اللہ کو علم سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ ہم اس کی شناخت کی طرف بڑھیں کہ ہمیں زمین و آسمان کی سیادت عطا ہو اور بارگاہ الوہیت سے یہ مژدہ عطا ہو:

ولا تہنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنینO

وماعلینا الاالبلاغ O

Marfat.com

پسِ حجاب

آغاز کیسے ہوا......؟

میرا طرزِ زندگی ذرا سا مختلف رہا ہے۔ یہ بہت عام سا نہیں ہے۔ میں نصابی کتابوں کا بہت پڑھنے والا، بلکہ بے انداز پڑھنے والا لڑکا تھا، جو اپنی کتابوں کے علاوہ یہ چاہتا تھا کہ دیمک کی طرح ہر صفحہ چاٹ جاؤں۔ میرے اندر تجسس بے پناہ تھا۔ آپ دیکھیں میرا تعلیمی ریکارڈ بڑا خراب ہے۔ میں اتنا تھوڑا سا کام کر لیتا تھا کہ ایف اے، گریجویشن اور ایم اے کر لوں۔ سوا سوا سال کلاسوں میں نہیں گھستا تھا اور اس چکر میں رہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اقسام کا علم حاصل کر لوں۔

زیادہ سے زیادہ ورائٹی کا تھوڑا سا ثبوت آپ کو دے دوں۔ میں نے فرسٹ ایئر میں ڈاکٹر ژواگو کو بھی پڑھا ہوا تھا۔ بخاری کی حدیث بھی اور موپساں کے 88 افسانے بھی پڑھے ہوئے تھے۔ میں ایک وقت میں تقریباً تمام ہی علوم پر کنٹرول رکھتا تھا۔ اس وقت مجھے خیال نہیں تھا کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں۔ شاید میرا اندر عجب تھا۔ ایک انا تھی کہ مجھے دنیا کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا شخص ہونا چاہیے۔ میرے اس تنگنائے خیال کا باعث تھا کہ مجھے کوئی فرد کسی بھی انفارمیشن کے میدان میں ممکنہ حد تک چیلنج نہ کر سکے۔

یہ خالی مشرق کی بات نہیں تھی۔ میں مغرب کو بھی سامنے لے کر چل رہا تھا۔ رسل، وائٹ ہیڈ، ہیگل یا برگساں ہے۔ اس میں مجھے کوئی عجیب و غریب حادثہ نہیں پیش آیا، نہ کوئی شکستہ دل کا معاملہ تھا۔ میں قدرتی علم میں تجسس کی وجہ سے اتنا کچھ پرکھ رہا تھا، تو علم ایک حد کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ تھوڑا سا لٹریچر ہے، میتھالوجی، فلاسفی ہے ان کو آپ پڑھ لیتے ہیں۔ سائنسز ہیں۔ یہ اتنی زیادہ نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ ایم ایس سی فزکس کریں۔ اگر آپ کو فلسفۂ طبیعیات کا پتہ ہے، تو پھر آپ کو آئن سٹائن کی تھیوری جاننے کے سوال میں دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ جب فلسفہ اور سائنس ختم ہو گئے، تو میں حیران ہو گیا۔ اتنے نالج سے میرے تجسس کو جو اطمینان ملنا چاہیے تھا، وہ میسر نہیں آ سکا۔ فرسٹریشن سے زیادہ میرا درد بڑھ گیا۔ یعنی جس چیز کو میں نالج ایبلٹی Entity کہتا تھا، وہ نالج ایبلٹی نہیں تھی، وہ اشیاء کے بارے میں چند معلومات تھیں۔ یہ سچائی نہیں تھی، وہ محض تعلق کا علم تھا۔ یہ چیز اس اصول کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی بھی فطرت اشیاء کا علم نہ تھا۔ سادہ تعلق کی بات تھی۔ اس وقت مجھے بہت کرب محسوس ہوا۔

Marfat.com

اس کرب میں میرے پاس پانچ جدید فلسفے ایک وقت میں موجود تھے اور یہ پانچوں کے پانچوں خدا کا انکار کرتے تھے۔ بظاہر یہ لگتا تھا کہ یہ سارے علم و تعلم انکار کو جا رہے ہیں۔ بغیر اللہ کو وقت دیئے، کسی تصور کو جانچے اور اعلیٰ فکری سطح پر اس کو پرکھے بغیر آپ اللہ کا انکار کر رہے ہیں۔ ایک دم اتھراپالوجسٹ نے بغیر تحقیق کیے کہہ دیا کہ اللہ انسان کی ضرورت نہیں۔ جس چیز کے بارے میں کوئی تحقیق نہیں کی، اس کے بارے میں رائے دے دی۔ میں نے چانس لے لیا۔ آٹھ سال خدا کے تصور پر غور و خوض کیا اور آٹھ سال کے بعد میں ناک آؤٹ ہو چکا تھا۔ مجھے حتمی دلائل مل گئے، جو آج تک خدا کے بارے میں ٹوٹ نہیں سکے۔ میں خدا کے فیور میں نہیں تھا۔ مَیں انسان کی آزادی کے فیور میں تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ میری آزادی اور غلامی میں ایک چیز حائل ہے اور وہ اللہ ہے۔ میں اللہ کو کیسے مان لیتا۔ مجھے سب سے مشکل، عجیب اور سب سے بڑا دشمن، جو انسان کا لگتا تھا، وہ خدا کا تصور تھا۔ اس وجہ سے میں اس تصور کے بہت خلاف تھا۔ میں نے بہت محنت اور بڑی کوشش کی، مگر میں اپنی جگہ پر قائم نہ رہ سکا۔ میرے تمام اعتراضات، شکوک و شبہات اور میرے دانشورانہ تجسس میں جو شک و شبہ پیدا ہوا تھا، وہ ختم ہو گیا۔ جب یہ ایک دفعہ ختم ہو گیا، تو خدا مستحکم ہو گیا۔ یہ ایک بہت طویل دلیل کا سلسلہ اور پورا تھیسس ہے، جو آج تک میں مرتب نہیں کر سکا۔

چنانچہ سب سے پہلا لیکچر جس موضوع پر میں نے دیا، وہ تھا Allah is the top priority۔ اللہ ترجیح اول ہے۔ میں نے اس پوری تحقیق کو ایک گھنٹے میں ایک چھوٹی سی دلیل کی صورت میں واضح کیا۔ No argument against Him۔ میرا اگلا فیصلہ یہ تھا کہ آیا اس کی طرف چلا جائے کہ نہ چلا جائے۔ یہ جاننے کے بعد بھی یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ادھر جانا ہے یا نہیں۔ نہ جانا ناممکن تھا۔ جانا ہی ممکن تھا۔ جب ہم جانے کا نام لیتے ہیں، تو وہ حق میں آگے بڑھنے کو متصور کرتے ہیں۔ اس کا پہلے حصے سے کوئی تعلق نہیں۔ تصوف وہ تحریک ہے جس میں وکیل اور اچھی طرح خدا کو جاننے کے بعد، آپ اس کے قرب اور ہمسائیگی کے لیے پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ اس کو ہم تصوف کہتے ہیں۔

پہلا قدم ہے دلیل۔ ذہن کا پوری طرح صاف ہونا۔ اسے قرآن علم الیقین کہتا ہے۔ وہ علم آپ نے حاصل کر لیا، یہ اس کا مظہر ہے۔ آپ اپنے طور پر اظہار کر رہے ہیں۔ اللہ کو اول ترجیح مان کر اس کے رستے میں آنے والی مشکلات کے ساتھ رہنا شروع کرتے ہیں اور سب سے بڑی مشکل جو رستے میں آتی ہے، وہ آپ کی اپنی انا ہے۔ خواہشات نفس، ترددات اور احساسات ہیں۔ آپ کے افسانوی اور تابناک تصورات ہیں۔ آپ کا تجسس ہے۔ یہ تمام آپ کے رستے میں حائل ہوتے ہیں۔ آپ ان رستوں سے گذرتے ہیں۔ اللہ کی نشانیاں اور مظاہرات دیکھتے ہیں۔ اسباب کو منقطع کیا جاتا ہے اور پروردگار اکیلے ہی آپ کو صرف اپنے وجود کی دلیل مستحکم کرتا جاتا ہے، اس کو ہم عین الیقین کہتے ہیں۔

جب خدا کے خیال سے گذر جائیں اور مشاہدے سے آپ بیزاری کا اعلان کر دیں، تو کہتے ہیں، NO more to see anything about God اب آپ یہ نہیں کہتے کہ اے پروردگار اگر پانچ کا نوٹ میرے رستے میں پڑا ہوا نظر آیا، تو میں آپ کو مان لوں گا۔ اب آپ کو مشاہدات کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک بھی مشاہدہ نہ ہو، تو بھی آپ اللہ کو اسی طرح مانتے ہیں، جیسے پہلے مانتے تھے۔ جب یہ مقام آ جائے، تو پھر حق الیقین کا مرحلہ آتا ہے۔ اس سطح پر آ کر خدا وصال

Marfat.com

سے محسوس نہیں ہوتا، فراق سے محسوس ہوتا ہے۔ جب آپ کے ساتھ ہوگا، آپ نارمل ہوں گے۔ جب آپ کے ساتھ نہیں ہوگا، آپ بے چینی محسوس کریں گے۔

حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو خط لکھا۔ اس نے اپنے لاؤلشکر کو اکٹھا کیا اور کہا، مجھے ایک زبردست بادشاہ کا پیغام آیا ہے۔ کیا صلاح دیتے ہو؟ درباریوں نے کہا، ہم نے تمہارے لیے پہلے بھی بہت بڑی فتوحات حاصل کی ہیں اور بڑی جانفشانی سے لڑے ہیں، تو حکم دے، ہم لڑیں گے۔ ملکہ سبا نے کہا کہ بادشاہ جس بستی میں داخل ہوتے ہیں، اسے اجاڑ اور ویران کرتے ہیں اور اس کے امراء اور رؤسا کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا بالکل اسی طرح اللہ جس جسم میں داخل ہوتا ہے، اس کو پہلے تباہ و برباد کرتا ہے اور دل میں خواہشات اور آرزوؤں کے جو بڑے بڑے امراء بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے سر نیچے کر دیتا ہے۔ جب وہ اس بستی کو اچھی طرح اجاڑ لیتا ہے، تو خود آپ آ کے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر یہ بستی از سرِنو آباد ہوتی ہے۔ پہلے اس تعمیر کو ویران کرتے ہیں، پھر اس تعمیر کو دوبارہ استوار کرتے ہیں۔ یہی کارِ تصوف ہے۔ یہی اللہ کا طریق ہے، لیکن اس میں کوئی غیر معمولی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔

کسی خاص مکتبۂ فکر سے تعلق

مکتبۂ فکر (School of thought) سے مراد یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے آغاز سے جو اعلیٰ ترین مفکرین تھے، جو تاریخ اسلام کے ہر دور میں بڑے استادوں کی حیثیت سے گذرے ہیں۔ حسن ابن علی سے آغاز کیجیے جو All Time Top Intellectual ہیں۔ پھر خواجہ حسن بصریؒ، جنید بغدادیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تھے۔ اس سکول کی کوئی حدود اور کوئی چاردیواریاں نہیں ہیں۔ مگر جو ان میں عمومی انداز ہے، میں اس کو سکول کی حیثیت سے پہچانتا ہوں۔ میرے فوری شیخ سید علی عثمان ہجویری رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ ان ساروں کی اپروچ میں بنیادی اور واضح فرق ہے۔ یہ بنے بنائے پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ یہ اعلیٰ ترین خصوصیات کے مالک ہیں اور بے پناہ علمی فراست اور جدوجہد کے بعد اپنے مسلک پر ایک یقینی اعتماد سے پہنچے ہیں۔ اپنے اپنے وقت میں یہ تمام بزرگ خدا کے وجود پہ دلیل و برہان بنے رہے ہیں۔

باطن میں جھانکنے کی صلاحیت

کسی بھی علم کے لیے جو دنیا میں وجود رکھتا ہے، بیک گراؤنڈ ڈیٹا بے حد لازم ہے۔ حتیٰ کہ غیر معمولی علوم میں بھی جیسا کہ یہ سمجھے جاتے ہیں، زائچے، ہاتھ کی لکیریں، یہ سب کچھ چاہیے۔ جہاں تک نفسیات کا تعلق ہے، کوئی ماہر نفسیات تب تک اپنی رائے دے ہی نہیں سکتا، جب تک وہ اپنا ہوم ورک پورا نہ کر لے۔ یہ ہوم ورک انٹرویوز، لائف ڈیٹا اور رویوں کے مطالعے وغیرہ پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ میں نے ایسا کوئی ڈیٹا جمع نہیں کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شخصیات کے بارے میں رائے دیتے وقت میری کیا حیثیت ہوتی ہے، فیصلے سنانے سے متعلق دنیا میں اگر بہترین علم بھی موجود ہے، تو اس میں بھی کم از کم تیس فیصد غلطیوں اور کمیوں کا امکان ہوگا اور ان غلطیوں کی گنجائش کسی علم کے مثبت ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے برعکس منفی اور کالے علوم میں تناسب تین اور سات کا ہوتا ہے۔ یعنی تین باتیں ٹھیک

Marfat.com

ہوں، تو سات ضرور غلط ہوں گی۔

علاوہ ازیں، جتنے بھی ارتکازِ توجہ کے آرٹ ہیں، وہ زندگی کے ظاہر سے متعلق رائے دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، پرسوں آپ جہاز پر جائیں گے اور کوئی کہتا ہے کہ بھئی تیرے تو گھر میں بکری مری پڑی ہے۔ یہ ایک خارجی صورتحال کی نشاندہی ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا سپیشلسٹ موجود نہ ہوگا، جو بنیادی علوم کے توسط سے آپ کے اندرون ذات سے متعلق اپنی رائے دے۔ یہ فرق ہے، اس علم میں جو خدا کی طرف سے ملتا ہے اور ان علوم میں، جو بنیادی طور پر ترقی کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے حد مشکل ہے کہ اس علم کا ذریعہ کیا ہے۔ اس میں میں نے کوئی غیر فطری رویہ اختیار نہیں کیا۔ دیکھیے کہ متعدد افراد جمع ہوئے اور جو مظاہرہ ہوا ہے، وہ محض مظاہرہ نہیں تھا بلکہ تمام افراد سے متعلق ایک فطری تفہیم تھی۔ اس میں شاید سو میں سے ایک غلطی کا امکان ہو کہ میں مکمل نہیں ہوں۔ علم درست سہی، لیکن میں مکمل طور پر درست نہیں ہوں۔ تھکن اور عجلت وغیرہ کے باعث کوئی بھی غلطی ممکن ہے۔

تاہم بنیادی بات، جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ یہ اللہ کا ثبوت ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک برہان قاطع ہے۔ جب خدا کسی کو علم اور شناخت دینا چاہے، تو وہ ہر حال میں دوسروں سے آگے ہوتا ہے۔ یہاں جتنے مروجہ علوم کی شناخت موجود ہے، آج یا کل، پاکستان سے امریکہ تک، زمین پر کوئی بھی شخص، جس کی ذمہ داری اللہ کے توسط سے مجھ پر عائد ہوگی، وہ ضرور اس امر کی صداقت کی گواہی دے گا کہ He has been able to understand me۔ اس بات کو مختصراً یوں کہیے کہ

He has been able to know me without my knowledge

مگر بعض اوقات انسان کے حجابات اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ ہم ایک شخص کو ایک بات بتا رہے ہوتے ہیں، مگر وہ انکار کیے جاتا ہے کہ یہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ہم ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ یہ بات تم میں ہے، تو سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ?But should I be so much interested in any body

ہمیں تو غرض ہے کہ ایک بندہ اصلاح کار، اصلاحِ ذات اور توجہ علی اللہ کے لیے آتا ہے۔ ہمیں اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی بھی کرنا ہے اور اس کی اچھائیوں کی بھی، تاکہ وہ آگہی کے ساتھ آگے بڑھے۔ اس کو کہتے ہیں، من عرف نفسه فقد عرف ربه۔ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا۔ یہ سائنس آپ کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔ ہم حیاتیاتی اور کیمیائی سطح پر ایک اکائی ہیں۔ ہم میں سے ہر ہر آدمی، آپ اور میں کوئی مختلف نہیں ہیں۔ اسی لیے صوفیاء کرام کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بھی شخص کی کسی بھی کمی کمزوری کا مذاق اڑانے کا حق نہیں رکھتا۔ کوئی بھی وقت ایسا آ سکتا ہے کہ آپ کی کیمسٹری بالکل اسی طرح ہو جائے، جس کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ سو بچوں کا قاتل جاوید اقبال بھی انسان تھا اور آپ بھی۔ اگر اس کی کیمسٹری کا فرق اسے سو بچوں کا قاتل بنا سکتا ہے، تو یہ خوش ہونے کی بات نہیں، ڈرنے کی بات ہے کہ مجھ پر اللہ کا احسان ہے اور باوجود اسی کی طرح کا انسان ہونے کے، میں اگر اس عادت یا حالت سے بچا ہوا ہوں، تو یہ اللہ کی مہربانی ہے، توفیق اور احسان ہے ورنہ Diabolically speaking ہم سب ایک سے ہو سکتے تھے اور ایک سے عمل کر سکتے تھے۔

بھٹکنے سے بچ گئے

علم میں ایک صفت بہت بڑی ہے۔ اگر آپ نتائج عامیہ کو دیکھیں، تو سب سے پہلے نتیجہ ہمیں یہ علم دیتا ہے کہ تکبرات اور تمام تفاخرات جہالت کی اقسام ہیں۔ علم کے مثبت نتائج آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں۔ ہماری اس زمین میں جن دو چار امراض سے میں آگاہ ہوں، ان میں ایک خودساختہ اصطلاح Religious Schizophrenia بہت عام ہے۔ کسی کو تھوڑا سا مذہبی کلام یا دو چار مسائل آ گئے، یا کسی نے تھوڑا سا بولنا سیکھ لیا، تو ان میں سے ہر کوئی مہدی بننے کا خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ تمام علماء، جو کچھ بولنے اور مسائل کو تھوڑا سا جاننے کے قابل تھے، انہوں نے اپنے ساتھ لفظ امیر لگانا اور جماعتیں بنانا ضروری خیال کیا۔ یہ تفاخرات تمام کے تمام ان کی جہالت کا حصہ بنتے چلے گئے۔ نہ صرف انہوں نے اپنے آپ کو، بلکہ اپنے ساتھ بے شمار لوگوں کو گمراہ کیا۔

مذہب میں کسی قسم کے گروہ کی تخلیق کی گنجائش نہیں۔ میں عام لوگوں میں بیٹھ کر عام انداز میں اللہ اور رسول کی بات کر سکتا ہوں۔ جب کوئی گروہ بنتا ہے اور کوئی فکری رستے علیحدہ کرتا ہے، تو وہ عجب اور تکبر کے رستے پر چل نکلتا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ میں تو برتر ہوں اور میرا بھائی اتنا برتر نہیں ہے۔ میں اپنے دوسرے بھائی کے بارے میں یہ سوچوں کہ وہ مجھ سے کمتر ہے، اس کا مذہب ٹھیک نہیں ہے۔ میرا مذہب ٹھیک ہے، تو اس کا مطلب ہے میں ایک ایسا مذہبی ہوں جو عجب سے کام لے رہا ہوں اور یہ کبھی میری نجات کا باعث نہیں بن سکتا۔ یہ ان تمام بڑی تنظیمات والوں میں خرابی تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ اپنے آپ کو متقی کہا، حتیٰ کہ ایک جماعت والوں نے صالحین والے لفظ استعمال کیے، جو صرف اللہ نے قرآن میں پیغمبروں کو کہا۔ دوسروں کو انہوں نے باہر نکالا اور پھر ان کی اصلاح کے درپے ہوئے۔

ان سب کے پیچھے ایک مذہبی انقلاب لانے کا تصور تھا۔ ایک عام سے مغربی نے ایک بڑی خوبصورت سی بات کی ہے۔ ان تمام لوگوں کا علم اکٹھا ہو کے بھی ایک عام سے مغربی کے برابر نہیں۔ اگر ایک مذہبی عالم کو اس کا مطلب معلوم ہو جائے تو وہ یقینی طور پر ایک اچھا مسلمان بن جائے۔ اس نے کہا Nobody can stop a revolution the time of which has come. کہ کوئی شخص اس انقلاب کو نہیں روک سکتا، جس کا وقت آ چکا ہے۔

قابل غور بات ہے کہ یہ لوگ گزشتہ ستر برس سے وہ انقلاب لانے کی کوشش کر رہے ہیں، جس کا وقت نہیں آیا۔ طاہر القادری بھی یہی کر رہے ہیں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی یہ کرتے کرتے فوت ہو گئے اور ڈاکٹر اسرار بھی اسی لائن میں لگے ہیں۔ ان کو ایک بات سمجھ ہی میں نہیں آتی کہ اللہ نے ان کے ہاتھوں اس تبدیلی کا وقت مقرر نہیں کیا اور وہ وقت ابھی آیا ہی نہیں۔ وہ اللہ پر اپنی پسند و ناپسند کو مسلط کر رہے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو متقی ڈیکلیئر کر کے خدا سے اس کا وقت اور اس کی رضا چھیننا چاہتے ہیں۔ کم از کم کوئی سادہ سا پڑھا لکھا مسلمان اس حماقت کا شکار نہیں ہو سکتا۔

تحقیق و جستجو و اخلاص

میری اپروچ یہ رہی ہے کہ میں اللہ پر اندھا دھند یقین نہیں رکھنا چاہتا۔ میری مشقت اس لیے بڑھ گئی کہ میں

ایک باضابطہ نظریاتی اساس اور تحقیق وجستجو کے باعث اپنے خدا کو دلائل میں بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کیا ہوا، اگر خدا نظر نہیں آ تا۔ ہوا بھی مجھے نظر نہیں آتی، لیکن اس کا احساس مجھے ہے۔ اگر خدا نظر نہیں آ تا، تو اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں کہ خدا محسوس نہیں ہوسکتا، بل نہیں سکتا یا کسی اور نظر سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ ہم بہت ساری ایسی چیزوں پر یقین رکھتے ہیں، جن کا وجود نظری نہیں ہے۔ ان میں ایٹم کے ذرات وغیرہ شامل ہیں۔ انسان نے ایسی سینکڑوں چیزوں کو تسلیم کرلیا، جو کہ دکھائی نہیں دیتیں۔ مگر وہ کسی نہ کسی تجربے اور مشاہدات میں آ جاتی ہیں۔

اب اللہ کو اس سطح یا کسی انٹلکچوئل دلیل کے ذریعے اپروچ کرنا، ہوسکتا ہے کہ ہر آدمی کا کام نہ ہو۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب کی وجہ سے دنیا آج تک آباد چلی آ رہی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کے اولیاء بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح ہوں گے اور بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا واحد کام نبوت تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شہادت غیب ہی میں اللہ ہے۔

اسی طرح حضورؐ جب دنیا سے رخصت ہوئے، تو ظاہر ہے کہ پیچھے بہت بڑا خلا پیدا ہوا۔ ایک ایسا خلا، جس میں ذاتی شہادتیں کم ہوگئیں۔ اس لیے امت مسلمہ کے اولیاء نے ذاتی مجاہدات اور ریاضتوں کے ذریعے وہ شہادت حاصل کی اور تاریخ ان سے بھری ہوئی ہے۔ قریباً دنیا کے ہر خطے میں جہاں مسلمان آباد ہیں، اولیاء کرام وہاں موجود رہیں گے اور قیامت اس وقت قائم ہوگی، جب زمین پر ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا شخص نہیں رہے گا۔ بحران یہ نہیں کہ اولیاء اللہ نہیں رہے، سب سے بڑا بحران اولیاء اللہ کی پہچان ہے۔ اس وقت اتنا کنفیوژن اور اتنا جھوٹ شامل ہوگیا ہے، جو ہمیں بنی اسرائیل کے زمانے میں، حضرت دانیال علیہ السلام کے دور میں نظر آ تا ہے۔ وہاں ایک وقت میں سو جعلی پیغمبر اور ایک اصلی ہوتا تھا۔ نبی کی اس وقت پہچان خدا کی جانب سے خصوصیت تھی کہ کیا ملتی ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کو اس لیے نبی مانا گیا کہ انہوں نے بادشاہ وقت کے اس خواب کو بیان کیا، جو اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ میں نبی اس کو مانوں گا، جو میرا خواب مجھے سنائے گا۔ وہ خواب میں زبانی نہیں بتاؤں گا۔ اگر کوئی نبی ہے، تو اسے پتہ ہونا چاہیے کہ میں نے کیا خواب دیکھا ہے اور اس کی تعبیر کیا ہے۔ جبریل امین تشریف لائے اور حضرت دانیالؑ کو خواب اور اس کی تعبیر بتائی۔

بسا اوقات ہمارا مسئلہ یہی ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس بحران کا شکار رہا ہوں۔ سب سے بڑا بحران یہی ہے کہ ہم اللہ کے بندے کو پہچان نہیں پاتے۔ یہ سوال میں نے اپنے شیخ و مرشد سید ہجویریؒ کے پاس جا کر پوچھا کہ آپ نے لکھا ہے، آپ نے خراسان کی پہاڑیوں میں 365 اولیاء اللہ دیکھے۔ اب ہم کیا کریں کہ 365 تو کجا، یہاں جوتیاں چٹخاتے مدتیں گذر گئیں۔ جسے دیکھتے ہیں، اول کم علم ہے۔ دوسرا Claimant (دعوے دار) ہے، تیسرا غیر مرئی قوتوں پر مقدار علم کی بنیاد رکھتا ہے، اور چوتھا تنظیمی طاقت طلب کر رہا ہوتا ہے۔ ان سب عناصر کے ہوتے ہوئے ہم کیسے کسی پر اعتبار و اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔

یہ سوال کر کے جب میں واپس آیا، تو بے حد رنجیدہ تھا۔ دیکھا کہ ''کشف المحجوب'' سامنے پڑی ہے۔ ایسے ہی بے دھیانی میں صفحہ الٹ دیا، تو دیکھا کہ ابو سعید مخزومی کا یہی سوال موجود ہے۔ شیخ ہجویریؒ نے جواب میں لکھا...... اور اس کو

محض حسن اتفاق نہیں کہا جا سکتا..... کہ جب ہم خدا کی تلاش میں نکلے، تو ایسے بہت سے اولیاء اللہ اور برگزیدہ بندے نظر آئے، جن سے ہم نے سبق سیکھا۔ ان کی دعائیں لیں اور برکتوں سے آشنا ہوئے۔ اے سائل! ایک وقت ایسا آئے گا کہ تو زمین ڈھونڈ مارے گا اور تجھے خدا کا بندہ نظر نہیں آئے گا۔ پھر کیا تجھ پر لازم ہے کہ تو خدا کی تلاش چھوڑ جائے؟ بس اتنا یقین رکھنا کہ جس اللہ نے پچھلوں کو دیا ہے، وہ زندہ و جاوید تجھے بھی عطا کرے گا۔ اس دن کے بعد میری وہ مایوس کن کوشش، یعنی خدا کا بندہ ڈھونڈنے کی ختم ہوگئی۔

میں نے سوچا، یہ سچ ہے کہ خدا زندہ ہے۔ بندے کا حق خدا کو پہچاننا اور خدا کا حق بندے سے اپنی عبادت کی تسلی لینا ہے۔ یہ پہلی Equation ہے، جو ہر آدمی میں موجود ہے اور چاہے اسے استاد یا ولی اللہ ملے نہ ملے، یہ اس کا بنیادی حق اور اللہ پر یہ لاگو ہوتا ہے کہ وہ اسے عطا کرے۔ بندگی کے لیے دو چیزیں لازم ہیں۔ ایک اخلاص اور ایک ذکر خدا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ولایت کے اس معیار تک نہ پہنچے، جو شیخ عبدالقادرؒ، علی عثمان ہجویریؒ یا جنیدؒ بغداد کا ہے۔ مگر وہ خدا کا بندہ ضرور ہو سکتا ہے اور مقبول ترین بندہ بھی۔

اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ تعلیمی اور علمی معیار بلند ہو۔ قرآن حکیم میں اللہ فرماتا ہے کہ جس کے چاہتا ہوں، درجات بلند کرتا ہوں اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔ ہوسکتا ہے، کوئی اساسی اور بنیادی علم موجود ہو، مگر وہ خدا کی دوستی سے محروم ہو۔ خدا کی دوستی شرط ہے۔

Marfat.com

تصوف کی مشکل لائن

تصوف کی لائن مشکل نہیں ہے۔ یہ ایک انٹلکچوئل سوال اور ایک ذہنی اپروچ ہے۔ اس میں آپ اپنے ذہن کو تیار کر لیتے ہیں کہ میں نے خدا کا انتخاب کرنا ہے۔ مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ تصوف کی کیا تعریف کریں گے؟ میں نے کہا کہ معقول وقت میں معقول ذرائع عقل کے ساتھ جو شخص خدا کو ترجیح اول چن لیتا ہے، اور باقی زندگی اس اجتہاد میں صرف کرتا ہے، وہ صوفی ہے۔ یہ مشکل نہیں ہے۔ لوگ اسے مشکل اس لیے کہتے ہیں کہ وہ معیار اعلیٰ سے شروع کرتے ہیں۔ ہم شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کا معیار لیتے ہیں۔ وہ قطب عالم اور غوث زمانہ تھے۔ ہم ایسی ہی اور بڑی ہستیوں سے معیار لیتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے۔ بات یہ ہے کہ معین الدینؒ اور فرید الدینؒ نے ایک دن آغاز بھی کیا تھا۔ تب وہ معین الدین نہیں تھا۔ ایک سادہ سا لڑکا تھا، جب ابوالحسن خرقانیؒ ان کے پاس آئے۔ لڑکے کا روشن ماتھا دیکھا، اسے کہا، انگور لاؤ۔ انگور چبایا۔ اس کے منہ میں رکھا۔ اس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک دعا دی، اے پروردگار! یہ ایک لڑکا ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ تحصیل علم دین کی طرف جائے۔ تب اس نے کام چھوڑا۔ بارہ برس سفر کیا۔ صحرا صحرا پھرے۔ علم حاصل کیا۔ ہندوستان آئے اور ہندالولی ہوئے۔

آپ لوگوں کو معراج سے دیکھتے ہیں۔ آغاز سے نہیں دیکھ رہے۔ جب ان کو آغاز سے دیکھو گے، تو آپ ان میں سے ایک ہو جاؤ گے۔ یہ بڑا آسان لگے گا۔ اس لیے کہ اللہ نے قرآن میں دو ولی گنے ہیں، تیسرا نہیں۔ الله ولی الذین آمنو یخرجھم من الظلمت الی النور۔ اللہ ولی ہے اہل ایمان کا کہ ظلمتوں سے نکال کر انہیں نور کی روشنیوں میں لے جاتا ہے۔ والذین کفرو اولیھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمت اور اہل کفر طاغوت کے ولی ہیں۔ ان کو روشنیوں سے اندھیروں کو لے جایا جاتا ہے۔ زمین پر دو ولی ہیں اور تیسرا کوئی نہیں۔ وہ جو ظلمات سے نور کو جا رہے ہیں اور وہ جو نور سے ظلمات کو جا رہے ہیں۔ وہ جو حجاب سے کشادگی اور جو کشادِ قلب سے حجاب کو پلٹ رہے ہیں۔ تیسرا کوئی ولی نہیں ہے۔ ہر انسان کا ولایت پر حق ہے، کیونکہ انسان کو پیدا ولایت ہی کے لیے کیا گیا ہے۔

اس لیے یہ کہنا بالکل غلط ہو گا کہ انسانوں میں خدا معیار پرکھتا ہے۔ ہاں ان کو اپنے اپنے مقامات پر فکس کر دیا

Marfat.com

جاتا ہے۔ایک آدمی ہوسکتا ہے کہ موچی ہو۔موسیٰ کو اللہ نے کہا، میں بیمار ہوں۔اس نے کہا، یا اللہ! تو بیمار بھی ہوتا ہے۔ ہاں ہاں جب میرا کوئی دوست بیمار ہوتا ہے، تو میں بیمار ہوتا ہوں۔تم اس کی عیادت کو جاؤ۔موسیٰ گیا، تو اس نے دیکھا، ایک موچی ایک بڑی ساری جوتی لے کے بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے، اے اللہ! میں بیمار ہو گیا ہوں۔ مجھے تیرے سائز کا نہیں پتہ۔ مگر میں نے بڑی محنت سے یہ جوتی بنائی ہے، ہو سکے، تجھے پوری آ جائے، ورنہ میری خطا معاف فرما دے۔حضرت موسیٰ روئے اور کہا یہ واقعی اللہ کا ولی ہے۔وہ انٹلکچوئل اور کوئی بڑا دانشور نہیں تھا۔مگر اللہ نے اس کو احساسات کی Refined ذہنی سطح دی تھی۔ایسے ہماری دنیا میں ہزاروں ہیں۔

ہوسکتا ہے، ایک سیب بیچنے والا، جب ایک برے سیب کو اٹھانے لگے، تو اس کو اللہ کا خیال آئے اور کہے نہیں۔ اس نے اللہ کی وجہ سے گاہک کو گندہ پھل نہیں دینا، تو وہ اللہ کا ولی ہو جائے۔ایک کمشنر جو سمجھ کر فائل پر غلط سائن کر رہا ہے، وہ اولیا، طاغوت میں شامل ہو جائے گا۔بعض اوقات ایک ٹاپ انٹلکچوئل انحراف کر سکتا ہے اور ایک بڑا سیدھا سا آدمی ترقی کر سکتا ہے۔

مذہبی تعلیمات بمقابلہ تصوف

روایتی میل جول میں مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔اس لیے کہ جہاں بھی روایتی پیٹرن شامل ہوتا ہے، میں وہ استاد نہیں رہتا، جو میں رہنا چاہتا ہوں۔سیدھی سی بات ہے کہ ایک عام آدمی کا خدا پر حق ہے کہ وہ اسے چاہے اور خدا کا حق ہے کہ وہ اپنے کمزور ترین بندوں تک آئے۔ یہ میرے تصوف کا بنیادی تھیسز ہے۔ میں تصوف کو تخصیص نہیں سمجھتا۔میرا سب سے مشہور لیکچر اس موضوع پر ہے کہ صرف تصوف ہی طرز زندگی طریق زندگی ہے۔اپنی زندگی سے اسے آپ نکال نہیں سکتے۔البتہ عمومی طور پر کبھی توبہ کی نیت سے اس لحہ تصویف کو پرکھتے ہیں اور کبھی زندگی میں مصائب و آلام میں خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔یہی تصوف ہے۔

ایک ہمہ وقتی رجوع کو آپ تصوف کہیں گے اور کبھی کبھار رجوع کو اور پھر اس کے بعد دوبارہ اپنی زندگی کے پیٹرن کو پلٹ جانا عمومی زندگی ہے۔تصوف یہ ہے کہ آپ ہر حال میں، گناہ و ثواب اور زندگی کے شب و روز میں خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہی ہمارا طریقہ کار ہے۔تصوف کبھی بھی غیر معمولی شے نہیں رہی۔غیر معمولی شے اس میں صرف ایک ہے کہ کوئی مادی وجود والا بندہ کسی غیر مادی وجود کے ساتھ کتنا ربط رکھ سکتا ہے۔اکثر لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ پروفیسر صاحب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم جو مادیت کی جکڑ بندیوں میں اردگرد کے آزاد اسباب میں الجھے ہوئے ہیں، ہم کیسے پروردگار عالم سے محبت کر سکتے ہیں، جو حواس خمسہ سے بہت ورا ہے؟ ٹریپ بھی یہی ہے۔

لاہور میں ایک دفعہ انتہا درجہ کی گرمی پڑ رہی تھی۔ میں اس وقت تسبیح کر رہا تھا۔ میں نے اللہ میاں سے چلتے ہوئے سوال کیا کہ اے اللہ میاں! کیا تو بندوں کو بیوقوف سمجھتا ہے۔اب تو ہی بتا کہ تو ذائقے، احساس اور نظر میں نہیں ہے۔ لوگ بیچارے کیا کریں، تجھے کہاں سے ڈھونڈیں؟ میرے دل میں خدا نے مجھے کہا کہ بندۂ خدا! اس کے علاوہ میں نے اور کیا ٹریپ رکھا ہے؟ یہی تو رکھا ہوا ہے۔جو شخص حواس خمسہ سے ذرا سا آگے گذر گیا، مجھے پالے گا۔تم آخر یہ کیوں نہیں

Marfat.com

خیال کرتے کہ یہ فریب اور یہ حواس جعلی ہیں۔ یہ پابندی کے حواس ہیں۔ یہ صرف وقتی طور پر زمین پر اپنے آپ کو سمیٹنے کے لیے دیئے گئے ہیں۔ اس زمین سے اوپر گلیکسیز میں، ٹاپ خلا میں چلے جائیں، یہ سارے حواس ختم ہو جاتے ہیں۔ وزن اور ذائقہ ختم ہو جاتا ہے۔ تم کیوں نہیں غور کرتے کہ یہ تو حجاب ہیں۔ میں اس حجاب سے آگے بستا ہوں۔

حدیث قدسیہ میں خداوند کریم کا ایک قول ہے۔ اس شخص کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ حرام ہو گی، جس کی آنکھ سے میرے لیے ایک آنسو بہا۔ میں نے بڑا غور کیا۔ اس آنسو کے لیے کہ جو میری وجہ سے نہ ہو۔ جو میری کسی اذیت، آرزو یا میرے کسی دکھ کی وجہ سے نہ ہو۔ میری آنکھ سے وہ آنسو نکلے، جو صرف خدا کے لیے ہو۔ تو مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ نے کتنی مشکل بات کی ہے۔ بظاہر کتنی آسان اور کتنا مشکل ہے اس پر عمل کرنا۔

مسئلہ یہ ہے کہ لوگ مجھ پر بڑی پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے یہ کیوں کیا، یہ کیوں نہ کیا؟ فلاں کام کیوں نہ کیا اور فلاں کیوں نہ کیا؟ لوگوں کے اپنے تصورات ہیں اور مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں اس کے مطابق زندگی گذاروں، جیسے کہ یہ دوسرے مسلمان ہیں۔ سب سے بڑا قانون یہ ہے کہ It is very common to be uncommon and it is very uncommon to be common. لوگ اعتدال کے دشمن ہیں۔ لوگ اس بندے پر اعتراض کرتے ہیں، جو اپنے آپ کو ایک پیٹرن میں نہیں ڈھالتا۔

ابھی میں نے پالٹیکس میں حصہ لیا۔ ہم نے خدا کے فضل و کرم سے ضلع تک کے الیکشن کلیئر کیے۔ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ سیاست میں کیوں حصہ لیتے ہیں؟ سیاست تو جھوٹ ہے۔ میں کہتا ہوں، ٹھیک ہے، جھوٹ ہے۔ جب میں جھوٹ بولوں گا، تو تب مجھے بتانا کہ سیاست جھوٹ ہے۔ اگر بہت ساری جگہیں اصلاح اور بہتری کے لیے ہیں، تو میرا حق بنتا ہے کہ میں ادھر بھی اپنے اور لوگوں کے لیے ایک رابطہ وضع کروں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس ملک کی اصلاح کسی جنرل میں نہ کسی سیاستدان میں ہے۔ اس ملک کی اصلاح ہم لوگوں میں ہے۔

مگر ''ہم لوگوں'' سے مراد میں یہ نہیں لیتا کہ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں ہی امیر دعوت اصلاح ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ ان لوگوں میں سے جو خدا کے حضور سربسجود ہوں گے، ان میں اخلاص کی ایک رتی ہوگی، تو خدا ان میں سے کسی شخص کو زمین کا حکمران کرے گا، بلکہ آسمان پر بھی سرفراز کرے گا۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ برتر کرے گا۔ کسی جنرل یا کور کمانڈر کو نہیں۔ یہ آپ سیاست اور فوج میں جو ذلت و افلاس دیکھ رہے ہیں، سارے کے سارے وہ کام کر رہے ہیں، جو انہیں نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ اس کا جاب ہے، جسے خدا برکت دے گا۔

روحانیت کی طرف سفر

حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا گیا، خدا کو کیسے پہچانیں؟ فرمایا Know thyself and you shall know the God (اپنے آپ کو پہچانو، خدا کو پہچان لو گے) اسی طرح کا مشہور قول من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ حضور گرامیؐ سے جب اللہ کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا، اللہ جسے اپنا علم دینا چاہتا ہے، اس کی آنکھ اس کے اوپر کھول دیتا ہے۔ اب اگر ہم تینوں بیانات کو یکجا کریں، تو پتہ چلتا ہے کہ یہ عملی

Marfat.com

عبادات کا رستہ نہیں ہے۔ عملی عبادات کسی معاشرے میں گذر اور آشتی کے لیے بہت ضروری ہیں۔ نماز اجتماعیت اور ذاتیت بھی ہے۔ اسی طرح صدقات وزکوٰۃ اگر ایک سطح پر اس کی مخلوق کو راحت پہنچا رہے ہیں، تو دوسری سطح پر وہ اس کے اپنے اندر سے بھی بخل کو دور کر رہے ہیں۔ زکوٰۃ کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو بھی میل کچیل سے پاک کرتے ہیں اور اپنی اضافی رقم سے معاشرے کے ضرورت مندوں کی ضرورت کو بھی پورا کرتے ہیں۔ حضور گرامی مرتبتؐ نے فرمایا کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مسلمانوں کا تم پر حق ہے اور اس کو ہم صدقات کہتے ہیں۔ صدقات کی وسعت اتنی طویل ہے کہ ایک اچھی بات اور ایک اچھا کلام بھی صدقہ ہے اور ایک اچھا مشورہ اور ایک اچھا خیال بھی صدقہ ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں، جن کی معاشرتی زندگی میں مسلمان مشق کریں، تو اس سے ایک ایسی بنیاد مہیا ہوگی، جس میں خدا کے چاہنے والے نکل سکتے ہیں۔ سابقون الاولون میں خدا کو چاہنے والے جب اپنی ترجیح اول اللہ کو کرتے ہیں، تو وہ اپنے اعمال کا سارا رخ اس کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اعمال میں عبادات کے علاوہ جو سب سے بڑا عمل ہے، وہ خدا نے خود ہی بتایا ہے۔ الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو کھڑے بیٹھے کروٹوں کے بل مجھے یاد کرتے ہیں۔ و یتفکرون فی خلق السموٰت والارض اور زمین وآسمان کی تخلیقات پر غور کرتے ہیں۔ سو یاد کرنا اور زمین وآسمان کی تخلیقات پر خدا کے حوالے سے غور کرنا، یہ دو باتیں اللہ کے بہت قریب لے جاتی ہیں۔

اب یاد کرنے کا طریق کار جو اللہ نے ہمیں بتایا ہے، وہ Power intoxicant نہیں ہے۔ خدا سے شیطان نے یہ کہا کہ میں تیری مخلوق کو دائیں بائیں آگے پیچھے سے آؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا، ٹھیک ہے، تم بہت سارے لوگوں کو گمراہ کرو گے، الا عباداللہ المخلصین مگر میرے مخلص بندوں کو تم کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح ایک حدیث رسولؐ ہے کہ قیامت کے دن جب بہت سارے بندوں کو جنت لے جایا جا رہا ہوگا، تو خدا ملائکہ کو حکم دے گا، ان کو جہنم میں لے جاؤ۔ ملائکہ عرض کریں گے، اے پروردگار! ان کے نامۂ اعمال میں خوبیاں لکھ لکھ کے ہمارے صفحات ختم ہو گئے ہیں اور آپ فرما رہے ہیں کہ ان کو جہنم میں پھینک دو؟ اللہ فرمائے گا، میرا اور میرے بندے کا ایک معاملہ ہے، جسے میں ہی جانتا ہوں۔ وہ اخلاص ہے۔ سو خدا اور انسان کے درمیان محبت کی پہچان کی کسوٹی اخلاص ہے۔ اخلاص دنیاوی محبت کی بھی بنیاد ہے۔

اب محبت کے طریق میں سب سے بڑا طریق یاد ہے۔ وصال میں کسی محبت کا تعین نہیں ہوتا۔ جب فراق اور جدائی ہوگی، تو پتہ چلے گا کہ کس کو کس سے کتنی محبت ہے۔ فراق کا اصول یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ یاد آئے گا، آپ کو اس سے اتنی ہی زیادہ محبت ہوگی۔ اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ محبت کو جاننے کا نہیں ہے۔ آپ کے دل اور کسی کی محبت کی آزمائش ایک تو فراق میں نمایاں ہوتی ہے یا فراق میں جس کی زیادہ یاد ہو، اس میں نمایاں ہوتی ہے۔

اب محبت ہمیشہ ان پانچ حواس خمسہ سے آگے چلی جاتی ہے۔ بظاہر اداس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود آپ اداس ہوتے ہیں۔ آپ نے کھانا بھی کھایا ہوتا ہے۔ خوشبو بھی لگائی ہوتی ہے۔ ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے، لیکن اس کے باوجود آپ لوگ اداس ہیں۔ حواس خمسہ سے آگے گذرتے ہوئے ایک ریفائن ادراک کو ہم اللہ کی محبت کہتے

Marfat.com

ہیں۔ جب تک ہم حواس خمسہ کی گرفت میں رہتے ہیں، ہم پر شرع غالب ہوتی ہے اور جب ذرا آگے Intellectual Refinement میں جاتے ہیں، تو پھر ہمیں اللہ بڑے واضح طور پر نظر آنا شروع ہوجاتا ہے۔

عملی طور پر بھی دیکھیں۔ جیسے لارڈ برٹرینڈ رسل نے کہا تھا کہ When we hit a wall, there is no wall and we have no fist. ہم کبھی بھی دیوار کو مکہ نہیں مارتے۔ مگر درد اور تکلیف اور اس کا احساس تو ہوتا ہے۔ مگر سائنسدان کہتا ہے، وہ دیوار تھی ہی نہیں۔ یہاں مکا ہی کوئی نہ تھا۔ یہ تو الیکٹرون اور پروٹون کا جنونی رقص ہے۔ اگر عملی طور پر پروٹون اور الیکٹرون آپس میں مل جائیں، تو چین ری ایکشن میں ایک دنیا تباہ ہوجائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا بصری اور عملی پہلو جھوٹا ہے۔ اگر ہم سائنسدانوں میں یقین کریں، کہ ہمارا بصری پہلو جھوٹا ہے اور اس کی اصلیت یہ ہے کہ نہ وہاں دیوار ہے، نہ میں مکے کو مارتا ہوں۔ اس کے برعکس بڑی سخت سرکولیشن میں الیکٹرون اور پروٹون کے دائرے ہیں، جو کبھی بھی آپس میں نہیں ملتے اور اگر یہ ایک دوسرے میں مدغم ہوجائیں، تو چین ری ایکشن ہوجائے اور شاید آدھی دنیا تباہ ہوجائے، تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ خدا کی ترجیح کو برقرار رکھنے کے لیے ہم اس کو یاد کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ خدا کی یاد کا اور کوئی مقصد نہیں۔

روحیت اور روحانیت

تصوف اور باقی علوم میں ایک بڑا فرق ہے۔ تصوف میں ذات کو خدا کے حق میں نفی کیا جاتا ہے۔ خدا کے لیے نفس کو مسترد کیا جاتا ہے، اس کی تردید کی جاتی ہے۔ یہ اکیس بائیس جبلتوں کا ایک پیکیج ہے، سنگل نہیں ہے۔ ہماری بنیادی جبلتیں ہیں، جیسے محبت، جارحیت اور سب سے پہلی بقا ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ بھوک لگتی ہے، تو بھوکا آدمی کفر کے قریب ہوتا ہے۔ اسے کچھ کھانے کو ملنا چاہیے۔ ورنہ وہ ہر چیز سے انکار کردے گا۔ مگر جب اٹھارہ جبلتیں ایک دوسری پر اثر انداز ہوتی ہیں تو اصل نفس پیدا ہوتا ہے۔ یہ نفس انسان اتنا پیچیدہ اور مشکل ہوجاتا ہے کہ معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص اسے سمجھ نہیں سکتا، بلکہ ایک ماہر نفسیات بھی اسے سمجھ نہیں سکتا کیونکہ تمام سائنسز اور تصوف میں ایک فرق ہوتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ پیچیدہ اور اعلیٰ سائنس ہے۔ یہ اعلیٰ ترین سائنس ہے، آرٹ نہیں ہے۔

تصوف ایک ایسی سائنس ہے کہ باقی سائنسز میں آپ کے احساسات شامل بھی ہوجائیں، تو نتائج پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ آپ ایک تجربہ کریں۔ چاہے آپ ناراض ہیں، بیمار ہوں، خوش یا ناخوش ہیں۔ آپ کے تجربے کی روٹین اور اس کے نتائج پر فرق نہیں پڑتا مگر تصوف میں آپ کا ایک ذرہ برابر وجود کا شائبہ اس میں شامل ہوجائے، تو آپ کی معروضیت اور آپ کے نتائج خراب ہوجاتے ہیں۔ اس لیے یہ اتنی پیچیدہ سائنس ہے کہ اس کے عدم توازن کو توازن میں بدلنا بڑا ہی مشکل ہے۔ اسی وجہ سے یہ علم دنیا کے مشکل علوم کے زمرے میں آتا ہے۔ بڑے سے بڑے فلاسفر بھی اس پیٹرن تک پہنچتے ہوئے تھک جاتے ہیں۔ چنانچہ تمام صوفیاء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ تصوف سحر علمیہ ہے اور قرآن حکیم میں پروردگار عالم نے کہا کہ میں نے درجات، عبادات ظاہرہ میں نہیں رکھے۔

اس علم کی حدود سے اکتساب عالم کا وجود ہے۔ اسی سے اللہ کے بندوں کے درجات مقرر ہوتے ہیں۔ یہ جو

آپ سنتے ہیں، فلاں قطب عالم اور فلاں غوث زماں ہے، یہ کوئی ایسی عجیب وغریب بات نہیں ہے۔ بڑی سادہ سی بات ہے کہ پاکستان کی انتظامیہ کے افسران کے مختلف درجے اور گریڈ ہیں۔ اسی طرح خدا بھی پوری دنیا کو دیکھتے ہوئے بہترین عقل واعتدال والے بندوں کا چناؤ کرتا رہتا ہے۔ ٹاپ پر آ کر وہ چند بندے چنتا ہے اور پھران کے ٹیسٹ شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ گلنا سڑنا ساری عمر جاری رہتا ہے۔ یہ نٹوں کا کھیل ہے۔ اسی طرح آپ کو ساری زندگی توازن کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ ایک ذرا سی تاخیر، ذرا سی سستی اور ذرا سا آنکھ کا جھپکنا شیطان کو موقع فراہم کر دیتا ہے۔

ذہنی اور روحانی سفر

یہ سب اکٹھے ہوتے ہیں۔ مگر ایک قانون ہے، جو شاید ابتدا میں بندہ سیکھ لے، تو وہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کے رستے میں ایک قدم بھی مشکل ہے۔ وہ یہ کہ اپنی ذات کے ساتھ ہمدردی حرام مطلق ہے۔ ہمارے علم میں جو خدا کو چاہتے ہیں، اپنے ساتھ کسی بھی قسم کی ہمدردی کو حرام سمجھتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ساتھ ہمدردی کریں گے اور اس میں مصروف ہوں گے، تو آپ ایک نکتہ بھی نہیں سیکھ سکتے Any Sympathetic consideration about own self will never lead you to knowledge۔ وجہ یہ ہے کہ اگر آپ کہیں کہ میرے ساتھ اس بندے نے یہ کیا، اس کا مطلب ہے کہ میں حقدار نہیں تھا۔ اگر میں کہوں کہ میں نے یہ جاب حاصل کرنا تھا، دوسرا لے گیا، تو دوبارہ اپنی ذات سے ہمدردی کر رہا ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ میرا حصہ تھا، میرے باپ نے نہیں دیا، تو میں Self - sympathetic ہو گیا۔ ہماری زندگی کے ہر لمحہ حیات میں یہ ہمدردی کام کرتی ہے۔ فرض کریں، آپ کے باپ نے سب بیٹوں کو دیا، آپ کو نہیں دیا اور اگر آپ نے اللہ کو کہا، اے میرے مالک! میرے باپ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ میں شاید یہی استحقاق کرتا تھا اور جناب سے مجھے یہی ملنا تھا، تو آپ ہمدردی سے گزر گئے۔

اگر آپ کے ایک دوست نے آپ کی غیبت کی اور آپ نے خود کو سمجھایا کہ اس نے تو اپنے علم کے مطابق جو کہا، سو کہا۔ اگر میں بھی ایسا کرتا ہوں تو اس کا مطلب ہے، میں بدلا لے رہا ہوں۔ میں یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ اس نے جو کچھ کہا، مجھ میں کچھ نہ کچھ خرابی ہو سکتی ہے۔ اپنی ذات کے ساتھ ہمدردی کرنے والا کبھی بھی خدا کی برأت کو نہیں پہنچ سکتا۔

تصوف اور سائنس میں ارتباط

میں نے دو تین اساتذہ دیکھے ہیں، جو شاید اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایران کے ڈاکٹر حسین نصر اور امریکہ میں کوئی ڈاکٹر ہیں۔ مگر میں نے وہاں ان کی کیسٹس سنیں۔ میں نے امریکہ میں تصوف کی ایک گروپ میٹنگ دیکھی ہے۔ وہاں شاذلیہ مسلک بے حد مقبول ہے، لیکن میں اس کے دروازے پر کھڑا پلٹ آیا۔ رات ایک بجے وہاں پہنچا، تو ذکر کا ایک حلقہ تھا، جس میں دف بج رہے تھے۔ چھوٹا چھوٹا ڈانس ہو رہا تھا اور اللہ ہو، اللہ ہو ہو رہا تھا۔

تقریباً ہر جگہ میں ہمہ نوع مذاق دیکھتا ہوں۔ شاید وہ اسلام میں اچھے انٹلکچوئل ہوں، لیکن دین اسلام کے

Marfat.com

کاز میں کمیٹڈ نہیں۔ میں گزشتہ پندرہ بیس برس سے استاد کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ میرے پاس پبلسٹی کے ذرائع بھی نہیں تھے اور نہ میں نے اختیار کیے۔ کئی مرتبہ مجھے ٹی وی پر آنا تھا اور اخباروں میں بھی۔ پھر جو کچھ بھی اخباروں نے میرے بارے میں لکھا، اپنے طور پر لکھا، جس میں میری کوئی مرضی شامل نہ تھی۔ بلکہ کچھ اخبار نویسوں سے مجھے گلہ بھی رہا کہ میں کچھ اور کہتا تھا اور انہوں نے کچھ اور لکھ دیا۔ As a teacher I don't want to see myself polluted by the high figures of miraculous happenings. بلکہ جو میں کہہ رہا ہوں، وہی لوگوں تک پہنچ جائے، تو میرا خیال ہے بہتر ہوگا۔

اگرچہ میں نے الٰہیات کی سائنسز کے طالب علم کی حیثیت سے آغاز کیا۔ تاہم، میں کبھی صاف ستھرا نہ تھا۔ تقدس کی فضا مجھ میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ میں جو ایک گندے، سڑے، کالے کیچڑ سے پیدا ہونے والا آدمی ہوں، اپنے آپ کو مقدس کیسے کہہ سکتا ہوں یا دعویٰ پاکیزگی کر سکتا ہوں۔ ادھر خدا بھی کہتا ہے، میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم لوگ کتنے پاکباز ہو۔ اس صورت حال کے باوجود میں کم از کم ایک یکسوئی حاصل کرنے کی سعی کرتا رہا ہوں اور وہ یکسوئی شروع سے اللہ تعالیٰ نے مجھے نصیب فرمائی۔

انٹلکچوئل جب دنیا کے فلسفوں کے مقابل اپنا سفر شروع کرتا ہے، تو شروع شروع میں بہت نظر ثانی کرتا ہے۔ میں بھی کبھی وجودیت (Existantialism) کی جانب مڑا، کبھی کیمونزم اور سوشلزم کو اعتقاد و ایمان تبدیل کیے بغیر کچھ عرصے کے لیے سراہا کہ عقیدہ تبدیل نہیں ہوتا، البتہ قابل سوال ہوتا ہے۔ میں خود اپنے ایمان کا محاسبہ کرتا رہا۔ اس کی کمی و بیشی دیکھتا رہا، لیکن کبھی اس پر نظر ثانی کی نوبت نہیں آئی۔ جب میں اس دلیل سلطان نصیر تک پہنچا...... و قل رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطاناً نصیرا اور میں نے استاد کی حیثیت سے آغاز کیا، تو قرآن حکیم کے الفاظ میں اپنے رب سے دعا کی کہ اگر تو چاہتا ہے کہ میں تیرے لیے کوئی بات کروں، تو کم از کم مجھے سلطان نصیر سے ضرور آشنائی عطا فرما۔ مشرق و مغرب میں متعدد لوگوں سے میں نے ملاقات کی، مغرب کے بڑے بڑے استادوں، یوگا کلچر کے چیف اور یہودی Oraclists سے ملا۔ ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے تسلیم نہ کیا ہو بلکہ وہ اتنے خوفزدہ ہوتے تھے کہ ڈر کر کہتے تھے، کیا تم ہمارا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟ میں ان سے کہتا کہ مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں، میرے ملک سے ایک دو کروڑ منافق مسلمان لے جاؤ، ان کو تبدیل کراؤ۔ چہ جائیکہ، میں تمہارا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے تمہارا کیا فائدہ؟

میں اس بارات عاشقانہ کو کیسے ضائع کر سکتا ہوں، جو خدا کی اپنی دین سے انسانوں کے دلوں میں ظہور پاتی ہے، وہ اخلاص، مروت اور محبت، جو اللہ کسی کے دل میں اپنے لیے ڈالتا ہے۔ جن آٹھ چیزوں پر دوزخ حرام کی گئی، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ نوجوان، جس کی آنکھ سے اللہ کے لیے ایک آنسو نکلتا ہے۔ یہ آنسو عاشقی کی بارات ہے مگر وہ آنسو اپنے لیے، اپنی اغراض، غم جاناں اور غم دوراں میں تو نکلتا ہے، مگر غم پروردگار میں نہیں نکلتا۔ وہ آنسو اخلاص کے بغیر نہیں نکل سکتا۔ ایک ذرہ برابر اخلاص آپ کو خدا تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر ہم اپنا تجزیہ کیوں نہیں کرتے؟ خدا سے دوری کس لیے ہے؟ کیا ہمارے مسائل کی وجہ سے ہے؟ کیا اس میں تنگ نظری، تنگ دلی اور ہمارے ہندووانہ کلچر کا عمل دخل ہے، جو

Marfat.com

ایک گرفت ہمارے مزاجوں، ہمارے برادری سسٹم اور ہمارے تمام ماحول پر رکھتا ہے۔

ہندو ہم سے خدائے واحد نہیں چھین سکا۔ اب بھی کسی مسلمان سے خواہ وہابی ہو یا بریلوی، پوچھ کر دیکھ لیجیے، اللہ کتنے ہیں؟ وہ کہے گا کہ ایک ہی خدا ہے۔ صرف یہ حصہ بچ گیا۔ باقی سب کچھ وہ سمیٹ کر لے گیا۔ ہماری عادات اور معاشرت ہندووانہ ہے۔ ایک ہزار سال کے مشترکہ کلچر نے ہمیں دیمک کی طرح چاٹ لیا ہے۔ ہم زندہ رہنے کی سعی کر رہے ہیں۔ جو خدائے واحد کی پرستش کرتا ہے، وہ اتنا منافق نہیں ہو سکتا کہ ہر چڑھتے سورج کی پوجا کرے۔ وہ گنیش کی پوجا نہیں کر سکتا۔ امڈتے ہوئے بادلوں کے آگے ہاتھ نہیں جوڑ سکتا۔ اس سے ذرا اوپر خلا میں جانا پڑتا ہے۔ یہ وہ مابعد الطبیعیات ہے، جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی مابعد الطبیعیات نہیں رہ سکتی۔ مابعد الطبیعیات کا آخری حصول اللہ ہے اور اسلام کے سوا کسی کی مابعد الطبیعیات مکمل نہیں ہوتی۔ مسلمان کے سوا کسی کو اللہ نہیں مل سکتا۔

ہزاروں دھوکے اور فراڈ جو اس وقت جاری ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ یہ مذہب بھی خدا تک پہنچنے کی راہ ہے اور وہ مذہب بھی۔ اسی طرح سارے مذاہب اللہ تک پہنچتے ہیں۔ اگر پانچویں جماعت فائنل ہوتی، تو لوگوں کو پی ایچ ڈی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آدم سے لے کر محمدؐ تک مذہب، دین، ضابطہ حیات ایک ہی ہے مگر وہ کون سا عقلمند ہے، جو ایم اے کرنے کے بعد اپنے نام کی تختی پر میٹرک لکھے گا؟

ترقی آگے کی جانب ایک سفر ہے اور جب مذہب اور دین مکمل ہو چکا، تو رجعت انسانی عقل کا غیر مستحکم انداز ہے۔ اسلام کی طرف کیوں نہیں آتے؟ مگر بد قسمتی دیکھیے کہ اسلام کا مفسر اور اس کی تبلیغ کرنے والا معیار سے بہت ہی گرا ہوا ہے۔ میں اسلامی یونیورسٹی کے ایک غیر ملکی ڈاکٹر کو بتا رہا تھا کہ اس آیت کی یہ تعبیر ممکن ہے، تو وہ جواب میں مجھ سے کہنے لگا کہ ہاں، ہو تو سکتی ہے مگر ہم یہ جرأت نہیں کر سکتے۔ ذرا سطحی پن کا تصور کریں۔

ادھر، جس شخص کو اللہ کے رسولؐ نے تاویلِ قرآن کی دعا دی ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہہ رہے ہیں کہ :القرآن یفسرہ الزماں...... ہر زمانہ قرآن کی اپنی تفسیر کرتا ہے۔ اگر میں اپنے علوم اور قرآن کے ساتھ کوئی مفاہمت پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر بڑھتا ہوا زمانہ قرآن سے جدید تر ہے، تو خدا پرانا ہو چکا۔ اسے کیوں تسلیم کیا جائے؟ اگر فائیو سٹار ہوٹلز، سکائی سکریپرز اور ناسا کی لیبارٹریوں میں خدا پرانا ہو جاتا ہے تو ہمیں ایسے کسی خدا کی کوئی ضرورت نہیں۔

مگر خدا تو وہ ہے جو قیامت کی پیشین گوئی کر کے کتاب بند کر کے بیٹھا ہے۔ جو ابتدا کی خبر دے چکا ہے اور کہتا ہے، تمہیں نہیں معلوم کہ زمین و آسمان پہلے ایک Mass تھے؟ پھر ہم نے جبراً، زور سے انہیں پھاڑ کر جدا کر دیا۔ یہاں سے وہ آغاز کرتا ہے اور آخر میں یوں بتاتا ہے۔ اذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت جب سورج ماند پڑ جائے گا، ستارے گدلے پڑ جائیں گے، زمین اپنی کششِ ثقل سے نکل جائے گی اور چاند اور سورج پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ جو اتنی سائنٹیفک تفصیل میں آپ کو انجام بتا رہا ہے، وہ خدا کیا درمیان کی تخلیق سے نا آشنا ہوگا؟ نہیں پتہ کہ ٹیکنالوجی کہاں پہنچیں گے؟ کیا اسے خبر نہ ہوگی کہ کوانٹم کی تھیوریاں کیا ہوں گی؟ Relativity کیا ہوگی؟ کیا اسے پتہ نہ ہوگا American progressive thought یا Genentic سائنس دان کہاں پہنچیں گے۔

جو اللہ دابۃ الارض کی بات کرتا ہے، کیا اس خدا کو علم نہیں کہ جنیٹک تجربات کہاں تک جائیں گے؟ جس کا رسولؐ

Marfat.com

یہ فرماتا ہے کہ دجال کے پاس ایک شخص جائے گا اور کہے گا کہ کیا تو میرے لیے میرا بھائی زندہ کرسکتا ہے؟ وہ ہاں کرے گا اور اس کے لیے اس کا بھائی زندہ کردے گا۔ اصحابؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ کیا یہ وہی ہوگا؟ فرمایا نہیں۔ اس کی مثال ہوگا۔ اس کی بہتر وضاحت کلوننگ کے سوا کوئی اور ہوسکتی ہے؟ انسان کی کلوننگ ہونے والی ہے۔ جاؤ، اپنا مرا ہوا بھائی، بھتیجا، ماں باپ اور بچے بنوالو۔ آپ کو اپنی Replacements مل جائیں گی۔ آخری اور تازہ ترین جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی نشاندہی کی جاچکی ہے۔ قرآن و حدیث نشاندہی کر بیٹھے ہیں۔ پھر کون کہتا ہے کہ اسلام فرسودہ ہے؟ فرسودہ تو وہ ہے، جو اسلام کی نمائندگی کر رہا ہے، جو میٹرک فیل ہے جسے قرآن زبردستی حفظ کرادیا گیا اور چار روٹی کی طلب پر لگا یا گیا۔ آپ لوگ اگر قرآن اور خدا کو اپنا حصہ نہیں دو گے۔ اگر آپ کی جدت خیال خدا کی طرف نہیں مڑتی۔ آپ کی ندرت کے تصورات اللہ کو نہیں مانتے اور اگر ہارورڈ کی یونیورسٹیوں میں خدا نہیں پایا جاتا، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم لوگ مناسب چیزوں کو مناسب وقت نہیں دے رہے۔ آپ اپنے کو اس احمقانہ پیروی کے حوالے سے چیلنج نہیں کر رہے۔

ہم تو نفس کے مارے ہوئے ہیں۔ زمانے کی ہر چیز ہم پر مسلط ہوچکی ہے۔ آپ اس میں کیا دیکھتے ہیں، جب سارا دن ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں؟ سارا دن فحاشی میں گذر جاتا ہے۔ اس معاشرے کا حال اس عرب معاشرے سے بڑھ کر تو نہیں، جہاں ماؤں کو لوگ بیویاں بنا لیتے تھے۔ جہاں ننگے لوگ گھنٹیاں بجاتے، ڈانس کرتے ہوئے طواف کعبہ کرتے تھے۔ کیا اس سے بڑھ گیا ہے یہ زمانہ؟ اگر اس زمانے میں پیغمبر آسکتے تھے اور اس جیسے معاشرے میں پیغمبر خدا شمع ہدایت و علم روشن کرسکتے تھے، تو اب اتنی مایوسی کیوں؟ لیکن ذمہ داری میری نہیں، آپ کی ہے۔

مولوی اور صوفی کے مظاہر

یہ ایک تعلیمی ڈگری ہے۔ جیسے ایک پانچویں جماعت اور پی ایچ ڈی میں بڑا فرق ہے، اسی طرح صوفیا میں کہا جاتا ہے کہ عارف ہمیشہ عالم ہوتا ہے، لیکن عالم ہمیشہ عارف نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر اگر میں عارف یا صوفی ہوتا، تو میں یہ دعویٰ ضرور کرتا کہ میں مذہب کی تمام شاخوں سے آگاہ ہوں۔ مذہب کم از کم آٹھ شاخوں پر محیط ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، اسماء الرجال اور حدیث کی پرکھ کا علم ہے؟ اس کے علاوہ سیرت اور مواضع ہے اور یہ ساری چیزیں اکٹھی حاصل کیے بغیر آپ اچھے مذہبی اسکالر نہیں ہوسکتے مگر اس کے برعکس جب ہم اپنے عالموں سے ملتے ہیں تو، انہیں تاریخ میں بہت کمزور پاتے ہیں، بلکہ ان کے ہاں خرافات کی روایات جمع ہیں۔ فقہ میں فقیہہ سرے سے ناپید شے ہے کیونکہ فقہ ایک اعلیٰ ترین اور ایک مذہب کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ خشیت کی جو تعریف ابن عباس نے کی کہ محدث و عالم کثرت روایت و کثرت مذہب سے نہیں بنتا، بلکہ خشیت سے بنتا ہے۔ جس خشیت کو کہا گیا کہ اللہ سے ڈرو، وہ یہ خوف نہیں ہے کہ اللہ مجھے مارے گا یا میں اللہ کو غصے میں دوسنا بیٹھوں گا۔ خشیت کا اصل مطلب یہ ہے کہ ہر اس کام سے پرہیز کیا جائے، جس کے بارے میں یہ گمان ہو کہ یہ آپ کو خدا سے دور کردے گا۔ اہل دل اس کام سے ضرور ڈرتے ہیں، جو انہیں خدا کی محبت سے ذرا دور لے جائے۔ محبت کے چھن جانے کو خشیت کہتے ہیں۔

اللہ نے قرآن مجید میں ایسے لوگوں کے تین درجے رکھے ہیں۔ وہ جو کم اعمال رکھتے ہیں، جو درمیان میں ہیں

Marfat.com

اور جو خیر کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں اوران کے لیے سابقوں الاولون کا نام استعمال کیا گیا۔ اس طرح بعض جگہ قرآن مجید نے کہا کہ الا ان اولیآء اللہ لا خوف علیہم و لاھم یحزنون۔ اللہ کے اولیاء اور دوستوں کی پہچان یہ ہے کہ ان پر خوف اور حزن نہیں ہوتا۔ یہ لفظ صوفی صرف Lingustic addiction ہے۔ اس کو ہم بار بار اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ Being more current the modren time آپ اسے صوفی کہتے ہیں۔ اگلے بندے کے خیال میں فوری یہ ادراک چلا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں احساسات میں سپیشلسٹ ہوسکتا ہے۔ فرض کریں، اس کی بجائے آپ یہ کہیں کہ یہ ولی اللہ ہے، تو ولی اللہ زیادہ گمبھیر تاثر چھوڑتا ہے۔ ہم نے لفظ ولی کے ساتھ اتنی طاقت اور مناسبتیں تخلیق کر رکھی ہیں کہ صوفی کا لفظ بھی ولی اللہ کے لفظ کو Comensate نہیں کرتا، لیکن کسی کو کیا پتہ کہ ولی اللہ کتنی مرتبہ دن میں گناہ کرتا ہو۔

جہاں تک اللہ کے نزدیک کیٹیگریز اور درجات کا تعلق ہے، اللہ نے فرمایا، نرفع درجت من نشآء، جس کے میں چاہتا ہوں، درجے بلند کرتا ہوں۔ و فوق کل ذی علم علیم، کہ ہر علم والے کے اوپر علم والا ہے۔ اب تصوف میں بھی سب سے بڑے صوفی کو عارف کہتے ہیں۔ یہ لفظ عموماً غیر مستعمل ہے۔ آج تک کسی نے کسی کا تعارف نہیں کرایا کہ جناب یہ عارف ہیں۔ یہ اتنا بڑا درجہ ہے اس میں دوسرا بڑا حجاب یہ ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ کو اللہ کا ولی نہیں کہلا سکتا۔ ولایت کا دعویٰ آدمی کے اپنے پاس نہیں ہے۔ یہ دعویٰ ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کون اس کا ولی ہے اور کون نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ساری زندگی کوئی آدمی اللہ کے ولی کے تاثر کو پورا کر رہا ہو اور ولی شیطان نکلے۔ کیونکہ شیطان کے بھی اولیاء ہیں۔ اولیاء رحمان کی طرح اولیاء طاغوت بھی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں سب کچھ بتایا ہوا ہے۔ عبادت احسان اسی کو کہتے ہیں۔ اخلاص، ایمان، احسان، تینوں تصوف کے معنوں میں آتے ہیں مگر ہم ان کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ نہیں کرتے۔ اگر ہم قرآن کے لفظوں میں کسی بندے کی سند کا ذکر کریں، تو ہم کہیں گے کہ یہ اللہ کا ولی ہے مگر وہ لفظ شاید باعث شرمندگی بن جائے، اگر وہ خود کہتے، میں اللہ کا ولی ہوں۔ حالانکہ یہ ایک عام آدمی بھی دعویٰ کرسکتا ہے، کہہ سکتا ہے کہ تم شیطان کے ساتھی ہو، میں اللہ کا ولی ہوں۔ مطلب ہے، میں اللہ کا ساتھی ہوں، دوست ہوں۔

مگر ہمارے معاشرے کے تناظر میں اور خاص طور پر ہمارے برصغیر کی تہذیب میں یہ لفظ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی یا شیخ علی بن عثمان ہجویری اور معین الدین چشتی سے کم کسی شخصیت پر لفظ ولی اللہ نہیں ہوسکتا۔ اس وجہ سے اسے لفظ احترام سمجھ کر استعمال نہیں کیا جاتا۔ جبکہ صوفی عمومی سا لفظ ہے۔ اس میں اتنا احترام Involve نہیں ہوتا۔ حالانکہ صوفی میں بھی Sophistication ہے۔ صوفی کا لفظ چار رتبوں سے آیا ہے۔ ایک تو یونان کے ٹیچر چلتے پھرتے علم دیتے تھے۔ ان کو Sophists کہتے تھے۔ بہت سارے علماء فکر کا خیال ہے کہ Sophists بعد میں صوفی ہوتے تھے۔ استاد اچھا وہی ہوتا ہے، جو بیٹھ کے نہ پڑھائے۔ گھومتے پھرتے جہاں جاتا ہے، رستے میں اس کا ہر قدم علم کا قدم ہوتا ہے۔ جہاں سے گذر جاتا ہے، تھوڑی بہت تعلیم دیتا جاتا ہے۔ تو ایک خیال یہ ہے کہ صوفی Sophists سے نکلا ہے۔

دوسرا نبی اکرم ﷺ کے دور میں جو غریب احباب تھے، ان کا بدترین لباس اس وقت اونٹ کے بالوں کا بنا ہوتا تھا۔ اس کو لباس صوف کہتے تھے۔ جو لوگ اسے پہنتے تھے، ان کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ انتہائی غریب ترین لوگ

ہیں۔ مذہب میں جدوجہد کررہے ہیں۔ ان کو بھی صوفی کہا کرتے تھے۔ تیسرے وہ ماہرین تعلیم تھے جو بالکل غریب تھے۔ وہ صبح و شام حضور ﷺ کی خدمت میں رہتے تھے۔ بھاگتے دوڑتے ہوئے کام کرتے تھے اور قرآن و حدیث کا تھوڑا بہت علم رکھتے تھے۔ ان کو اہل صفہ کہتے تھے۔ یہ اصحاب اہل صفہ تھے۔ حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابو ہریرہ اور دیگر اصحاب انہی لوگوں میں سے تھے۔ عبداللہ بن مسعود انہیں کفش بردار رسول کہتے تھے۔ ان کے طرز پر چلنے والوں کو صوفی کہتے تھے۔

آخری قسم کے بارے میں میرے استاد محترم سید علی ہجویر فرماتے ہیں کہ اہل صفا کو صوفی کہتے ہیں۔ یہ لفظ ان کے لیے ہے، جو صفائی قلب کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ جن کی جدوجہد ہے کہ ساری زندگی وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی یاد کے ساتھ اپنے دل کو صاف کرسکیں۔ ان میں سے کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جو غیر مذہبی یا غیر اسلامی ہو یا مذہب کے حوالے سے غیر قدرتی ہو۔ سوائے جن کو ہم یونانی فلاسفی میں Sophists کہتے ہیں، لیکن اس زمانے کے Sophists بھی مذہبی ہوتے تھے۔ ڈاؤنی سی ایس، ڈائی جی نس یا زینوڈی سٹوئیک آف ایلیا اپنے اپنے زمانے کے اولیاء ہی تھے۔

بابے اور رومانٹسزم

مشینی دور میں بابے کا تصور ایک ذہنی سہولت ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض اوقات میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ بابوں کا کچھ زیادہ ہی ذکر کررہے ہوتے ہیں، انہیں شاید توقع ہوتی ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر انہیں بھی کسی نہ کسی طرح بابا سمجھ لیا جائے۔ ممتاز مفتی صاحب زندہ تھے، اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے اور جنت سے نوازے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ نے یہ بابا شاہ کاکو کی روایت غلط لکھی ہے۔ اسی کے ساتھ اسلام آباد میں سکوٹر والا واقعہ بھی غلط لکھا گیا ہے۔ میں نہیں جانتا، آپ نے اسے کیوں لکھا؟ مفتی صاحب پریشان ہوئے، انہوں نے اشفاق صاحب سے جا کر کہا، پروفیسر صاحب نے کیسے یہ سمجھ لیا کہ یہ دونوں واقعات غلط ہیں۔ انہوں نے وہاں جا کر یہ بھی کہا کہ پروفیسر صاحب کے اردگرد ایک ہالہ (Aura) ہے۔ میں نے بے شمار مرتبہ انگلیاں ادھر ادھر ماری ہیں، مجھے تو وہ ایسا ہالہ نظر نہیں آیا۔ یہ مفتی صاحب کی اپنی سوچ ہے۔

اصل میں اس دوران پیرا سائیکوجیکل انسٹی ٹیوشن کا کچھ علم اور مذہب تصوف ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئے ہیں۔ جیسے عظیمیہ سلسلے کے ایک بزرگ نے بہت ملاوٹ کی ہے۔ بہت سارے تبت کے لامائی تصورات اور افریقہ کے شامان کے تصورات اسلامی تصوف میں ملائے ہیں۔ اس سے اسلام کا عمومی تصوف کا تصور کافی مبہم ہوگیا ہے۔

ہماری اصل مشکل یہ ہے کہ ہم صوفیاء کو ان کے اعلیٰ ترین پیڈسٹل سے دیکھتے ہیں۔ ہم ایک آدمی کو اس لیے صوفی نہیں کہتے کہ وہ شیخ عبدالقادر یا عثمان علی ہجویر نہیں ہوتا، لیکن آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی پچاس پچاس برس کی زندگی اس کانسپٹ سے گذرتی ہیں اور اللہ ان کو مخلوقات عالم میں محبوب کردیتا ہے۔ وہ خود شہرت کی تلاش نہیں کرتے۔ شیخ عبدالقادر پچیس برس پہلے کیسے جا کر اعلان کرتے کہ میں ولی ہوں، مجھ کو مانو۔ وہ کبھی ایسا نہ کرتے اور کوئی بھی ولی ایسا نہیں کرتا۔ کوئی شخص اپنے ولی ہونے کا تشخص نہیں ابھارتا۔ یہ لوگوں اور خدا پر ہے، جو کسی کی محبوبیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان سے

Marfat.com

صوفی کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔صوفی انتہائی ناطاقت وجود ہوتا ہے۔اگر اس کے وجود میں اثر ہے،تو یہ اللہ کی مہربانی ہے۔وہ تو اپنے آپ کو ذاتی طاقتوں سے فارغ کر رہا ہوتا ہے۔تبھی وہ خدا کے پیچھے ہوتا ہے۔حضور کی دعا ہے،یا حی یا قیوم برحمتک استغیث کہ اے اللہ! اپنی رحمت سے میری مدد فرما۔و اصلحنی شان کله اور میرے تمام حالات کی اصلاح فرما ولا تکلنی الانفسک طرفة عین اور اے اللہ ایک نفس جھپکنے کے بھی مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر۔صوفی تو یہ دعا مانگ رہا ہوتا ہے۔

اب اگر ایک صوفی یہ کہے کہ مجھ میں یہ اور وہ طاقت ہے میں یہ کر دوں گا،وہ کر دوں گا،تو ایک عمومی معیار کے مطابق وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔جب مجھ سے مفتی صاحب نے پوچھا کہ یہ دو واقعے آپ نے کیسے جانے؟ میں نے کہا کہ یہ صوفی ازم کی لائن کے مطابق نہیں ہیں۔صوفی کوئی پیشین گوئی نہیں کرتا اور نہ دعویٰ کرتا ہے۔تاہم صوفیوں میں فرق دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے۔کسی کی دعا سال کے بعد سنی جاتی ہے کسی کی چھ مہینے کے بعد،کسی کی مہینے بعد اور کسی کی منہ سے نکلتے ہی سنی جاتی ہے۔دعا کی پہنچ ہی ان کا فیصلہ کرتی ہے۔تصوف فی الوجود صوفیاء کے نزدیک بے معنی ہے،کیونکہ خداوند کریم نے آگ کی نوعیت کو پیغمبر کے لیے تبدیل کر دیا۔

اب مجموعی طور پر صوفیاء کے روحانی اور تعلیمی معیار بھی کم ہو گئے ہیں۔حالانکہ یہ Most top intellectual order کا سکول ہے۔اس میں میں کسی وہم اور وسوسہ کی گنجائش نہیں پاتا۔اس میں کسی تعویذ،دھاگے یا کسی جادو کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔اس میں توحید کے بارے میں شیخ جنید کی تعریف دیکھ لیں،پوری زندگی صرف ہو جاتی ہے۔کسی نے پوچھا،توحید کیا ہے،تو فرمایا،توحید قدیم کو حاضر سے علیحدہ کرنے کا نام ہے۔یعنی Separating the eternal from the accidental ایک ہی قدیم ہے اور وہ اللہ ہے۔باقی سب Accidental ہیں۔اسلام اسی توحید کا سبق دیتا ہے۔

ایک شخص گھوڑے پر بیٹھا تھا،اس کا کوڑا نیچے گر گیا۔اس نے ایک شخص سے کہا،مجھے کوڑا اٹھا دو۔حدیث کے مطابق آپ نے فرمایا،بہتر ہوتا،اگر تو نیچے اتر کے لے لیتا۔ایک نے مدد کے لیے کہا،تو آپ نے فرمایا،تجھے مدد تو دے رہا ہوں،مگر بہتر ہوتا تو اللہ پر توکل کرتا۔اس طرح اللہ پر اعتبار اور اعتماد کے عملی سبق سکھائے گئے۔

حضرت براٴ بن مالک کے بارے میں روایت ہے کہ وہ بڑے برے حال میں آئے۔صوف کے لباس میں تھے۔جوتوں سے بو اٹھ رہی تھی۔کپڑے گندے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔گرد وغبار میں اٹے بڑی دور سے آئے تھے۔اصحاب رسولؐ کے سامنے آئے۔حضورؐ نے یہ عالم دیکھ کر فرمایا کہ کچھ لوگ اس عالم میں آتے ہیں،بظاہر وہ بڑے غیر صاف لگتے ہیں اگر وہ قسم اٹھالیں،تو خدا ان کی قسم ہر حالت میں پوری کرتا ہے۔یہ وہ براٴ تھے۔جب مسلیمہ کذاب پر مسلمانوں نے آخری حملہ کیا،تو ہر مرتبہ براٴ بن مالک سے کہا جاتا،آپ قسم اٹھائیں کہ کل فتح نصیب ہوگی۔جب دو چار مرتبہ کہا گیا،تو براٴ بن مالک نے کہا،آپ نے اللہ کے رسول ﷺ کی دعا،جو میرے حق میں تھی،کو مذاق بنا دیا ہے۔میں قسم اٹھاتا ہوں کہ کل قلعہ فتح ہوگا اور میں قسم اٹھاتا ہوں کہ میں کل شہید ہو جاؤں گا اور دونوں باتیں پوری ہوئیں۔

وہ بڑے عجیب وغریب لوگ تھے۔ان کی ترجیحات بالکل کلیئر تھیں۔ان کے نقش پر چلنے کے لیے عقل کے بغیر اتنی ہائی لیول Integrity پیدا ہی نہیں ہوتی۔یہ اعلیٰ ترین کمٹمنٹ ہے۔اگر قدم قدم پر معجزے ہوتے ہیں،تو انہیں آپ

معجزے نہیں کہیں گے۔ یہ اصحاب کے لیے بڑی قدرتی چیز تھی۔ خدا کے پیغمبروں کے لیے تھی۔ وہاں خدا تھا اور وہ ان کے ساتھ تھا۔

سعد بن ابی وقاص قادسیہ کی فتح کو گئے۔ دریا بہت بڑا اور طغیانی پر چڑھا ہوا تھا۔ سامنے ایرانی بڑے خوش تھے۔ سعد بن وقاص نے ادھر ادھر دیکھا اور کہا، کون میرے ساتھ آتا ہے۔ انہوں نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ جب باقی لوگوں نے دیکھا کہ سردار نے پھینک دیا ہے، تو انہوں نے بھی پھینک دیا۔ پورے کا پورا لشکر دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا، تو ایک آدمی کے پاس صرف ایک لوٹا گم ہوا تھا۔ جب پارسیوں نے دیکھا کہ یہ لوگ اتنے سمندر اور طغیانی میں دریا عبور کر رہے ہیں، تو پکار اٹھے، دیواں آمدند، دیواں آمدند اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

اسی طرح آج بھی ہم دعا حزب البحر پڑھتے ہیں، جو حضرت علاء الحضرمی کی ہے۔ حضر موت کی فتح کے وقت بیچ میں ایک جھیل آ گئی۔ یہ جھیل کے کنارے کھڑے تھے اور جھیل بڑی گہری تھی۔ حضرت علاء نے کہا، میں تو چلا ہوں، میں نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے اپنا گھوڑا جھیل میں ڈال دیا۔ باقی سارے بھی پیچھے گئے اور یہ معرکہ بڑا مشہور ہوا۔ انہوں نے جیتا۔ اگلا اطمینان سے گاؤ خر کا شکار کر رہا تھا۔ مطمئن تھا کہ یہ لوگ کہاں جھیل پار کر کے نکل سکتے ہیں۔ اس موقع پر جو کلمے علاء نے پڑھے، یا علی یا عظیم یا حلیم یا علیم، وہ ابھی تک حزب البحر کا آغاز ہیں۔

اگر اللہ ہے اور اس کی طاقتیں وہی ہیں، جو مختلف کتب ہائے علم میں مذکور ہیں، تو کون اسے نقصان پہنچا سکتا ہے، شکست دے سکتا ہے۔ یہ ہماری اپنی کمزوریاں ہیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں، تو ہمارا ایمان کم تر اور گھٹیا ہوگا۔ وہ اس درجہ اعتقاد تک نہیں پہنچ رہا۔ اسی لیے یہ ساری خرابی پیش آ رہی ہے۔ خدا خود کہتا ہے، و انتم الاعلون ان کنتم صدقین مگر وہ کہتا ہے۔ ام حسبتم تدخل الجنة تم گمان کرتے ہو کہ میں تم کو یونہی جنت میں داخل کر دوں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا، یا تکم مثل الذین خلو من قبلکم اس سے پہلے بھی میں نے بہت ساری قوموں کو بڑی شدت سے مستھم الباساء و ضرآء و زلزلوا، بیماریوں، دکھوں اور بہت ساری چیزوں سے آزمایا۔ حتی یقول الرسول والذین آمنوا معه ایمان والے تو دور کی بات ہے، پیغمبر تک پکار اٹھے کہ متی نصر الله کہاں ہے تیری نصرت؟ اے اللہ تو کہاں ہے؟ تو اتنا بڑا اور اتنا پاورفل ہے، یہ جو ہم چیخ چلا رہے ہیں، کب سے تیری عبادت کر رہے ہیں، وہ تیری مدد کب پہنچے گی۔ فرمایا، ان نصر الله قریب، بہت قریب ہے۔ صرف ایک ججمنٹ کا ایریا ہی اس میں حائل ہے۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون کس حد تک مجھ پر اعتبار کرتا ہے اور اگر آپ اس کے اعتبار کے دشت میں کامیاب ہو جائیں، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو کسی شے کا محکوم نہیں کر سکتی۔

Marfat.com

ذکرِ الٰہی، صورت اور اہمیت

اصول یہ ہے کہ وہ وقت ضائع سمجھا جاتا ہے، جو خدا کی یاد کے بغیر گذرے۔ مگر یہ کہنا آسان ہے، لیکن تسبیح کو دل کا مائل ہونا مشکل ہے، جو صبح وشام اس کو جاری رکھنا مشکل بنا دیتا ہے، جب تک بڑے قدرتی طریقے سے انسان کے دل میں خواہش بن جائے وہ تسبیح بھی ایسی ہو، جو انسان ہر حال اور ہر رنگ میں جاری رکھ سکے۔ ہمیں تسبیح کا طریقہ کار کہیں سے ملا ہوا ہے۔ وہ طور طریقوں کے تحت کسی حال میں بھی جاری نہیں رہ سکتا۔ اس کے لیے آپ کو ایک پیٹرن بنانا پڑتا ہے۔ ایک ماحول پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے بیشتر لوگ اللہ کی یاد جاری نہیں رکھ سکتے۔

دوسرے کچھ نا سمجھ، جبراً لوگوں کو خدا کی یاد سے روکتے ہیں کہ یہ اجازت آپ نے نہیں لی۔ فلاں اسم جلالی اور فلاں اسم جمالی ہے۔ خدا کو یاد کرنے والا کوئی بھی نام انسان کے لیے ضرر رساں نہیں۔ آپ اللہ کا جو نام بھی لیں اور جس حوالے سے بھی تسبیح کا ورد کریں، یہ اسماء آپ کو اللہ کی پہچان کراتے ہیں۔ فرض کریں، اسم ولی ہے۔ اس کا مطلب ہے، مولیٰ، دوست، مددگار۔ اللہ کو دوست، مددگار اور اس کے ساتھ اچھی دوستی کے حوالے سے جاننے کے لیے پھر یہ ضروری ہوگا کہ خدا کے سوا کسی کو مولیٰ یا مددگار نہ سمجھا جائے۔ اسی طرح اسم سلام ہے۔ یہ امن اور سکون کے حوالے سے ہے۔ اگر آپ وہ جاننا چاہیں گے، تو آپ کی ذہنی بے چینیاں اور کرب ضرور سامنے آئیں گے اور آہستہ آہستہ کم ہوں گے۔ حقیقت میں یہ کبھی بھی نہیں ہوا کہ آپ کے اندر کا فساد نکلے بغیر آپ کو امن نصیب ہو۔ وہ نکلے گا ضرور اگر تسبیح جاری رہے گی، تو تسبیح اس کرب اور فساد کو ہمیشہ کے لیے ختم کرتی جائے گی اور وہ کیفیتیں دوبارہ اسی طاقت کے ساتھ آپ میں پیدا نہیں ہوں گی۔

اسی کو زکوٰۃ کہتے ہیں۔ زکوٰۃ کا مطلب ہے، میل کچیل کو صاف کرنا۔ یہ آپ کا میل کچیل اور معاشرے میں آلائشیں، جو آپ کے ذہن اور دل میں پیدا ہوتی ہیں، انہیں صاف کرتا ہے۔ دریں اثنا تسبیح آپ کے دل کی وہ آلائشیں دور کرتی ہے، جو خدا کے رستے میں حائل ہوتی ہیں اور جب یہ نکل جاتی ہیں، تو آپ کی تسبیح رکے گی نہیں۔ آپ چاہیں گے بھی، تو اسے چھوڑیں گے نہیں۔ دل اور ذہن اسے قبول کر لیتا ہے۔

Marfat.com

زیادہ تر تسبیح کی رکاوٹیں ذاتی صلاحیت سے متعلق ہیں۔ کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے ذہین لوگ ہیں۔ چوبیس گھنٹے یہ نام لینے کا کیا فائدہ۔ وہ اسے مناسب وقت بھی نہیں دے سکتے۔ تجربے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آپ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے یہ دیکھا اور میں فیل ہو گیا بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ ہم صبح و شام یہ تسبیح نہیں کر سکتے۔ توجہ نہ ہو، تو تسبیح کا کیا فائدہ۔ حالانکہ تب بھی ہم ایک کم ڈگری زبانی ادائیگی پر قائم رہ سکتے ہیں اور یہ بھی خیر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ شروع شروع میں ذہن کنفیوز ہوتا ہے۔ بہت ساری چیزیں اس میں مل جاتی ہیں، لیکن جوں جوں تسبیح آگے بڑھتی ہے، یہ کنفیوژن کم ہوتا جاتا ہے۔

اس کا ایک اور فائدہ ہے کہ خدا پر آپ کو کوئی اعتراض نہیں رہتا۔ وہ وقت ہوتا ہے، جب بھی اللہ کو یاد کرتے ہیں، تو آپ کو پتہ ہوتا ہے کہ میں ایک حقیقی وجود کے ساتھ بات کر رہا ہوں۔ بات جب پانچ حواس سے آگے جاتی ہے، تو خدا کا احساس قریب تر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ذہانت، علم اور دانش ہے، جس سے انسان اللہ کو قریب تر محسوس کرتا ہے۔ جبلت خدا کی حریف ہے اور عقل و معرفت خدا کی پہچان کا ذریعہ ہے۔

وظیفہ اور تسبیح میں فرق

خدا وظائف سے کبھی نہیں ملتا۔ وظیفہ اور تسبیح میں ایک بنیادی فرق ہے کہ جو وظیفہ پڑھیں گے، اس کا ایک انداز ہوتا ہے۔ اس انداز کے پس منظر میں کسی نہ کسی طاقت کا حصول ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو کوئی وظیفہ دیتا ہے کہ آپ اتنی دفعہ درود پڑھ لیں۔ اس کے بعد آپ کو حضور نظر آئیں گے، تو یہ بھی سو فیصد غلط بات ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس عمل کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے، تو وہ بھی غلط ہے۔ اس لیے کہ یہ تقدیر کو پابند کرنے والی بات ہے۔ تعویذ، وظیفے وغیرہ سب کار شیطان ہیں۔ اگر آپ قرآن حکیم پڑھیں، تو یہ ساحروں کی کارروائیاں ہیں، صوفیوں کی کارروائیاں نہیں ہیں۔ اس قسم کے تعویذات اور عملیات قرآن حکیم کے الفاظ میں میاں بیویوں میں فرق ڈالنا، محبتیں پیدا کرنا، جعل سازیوں کا کام ہے۔ حاضرات کا عمل، جسے جنات کی تسخیر کے اعمال کہتے ہیں، ان میں بھی آپ کسی اچھی طاقت کو نہیں پا سکتے۔ یہ منفی ماورائی طاقتیں ہمارے دماغ میں ہیں۔ انسان دو قوتوں کی بیک وقت آماجگاہ ہے۔ ایک قوت عقلیہ ہے، جو ہمیشہ مثبت استدلال دیتی ہے اور دوسری قوت واہمیہ ہے، جو منفی استدلال کی طرف جاتی ہے۔ انسان کی بہت ساری زندگی قوت واہمیہ میں گذرتی ہے۔

تسبیح کا جب تک مقصد متعین نہ ہو، تسبیح کوئی فائدہ نہیں دیتی۔ تسبیح کا صرف ایک مقصد ہے کہ ہم اپنے کم تر حالات میں، جس میں ہم کھانا روز کھاتے اور لباس ہر روز بدلتے ہیں، اسی طرح اللہ کو روز یاد کریں۔ اس کے بعد آپ خدا کو کچھ کرنے دیں۔ آپ نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ آپ نے اللہ سے کہا کہ تو میری زندگی کو ترجیح اول ہے۔ میں سانس لوں نہ لوں، تجھے یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ فاذکر الله کذکرکم اباء کم، اللہ کو ایسے یاد کرو، جیسے اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے ہو، جیسے اپنے بیٹوں، بچوں، باپوں اور ماؤں کو یاد کرتے ہو۔ او اشد اذکرا، بلکہ اور زیادہ محبت سے کرو، تاکہ اللہ کہتا ہے، مجھے یہ احساس ہو کہ آپ سب سے زیادہ مجھ سے محبت رکھتے ہو۔ لن تنالوا البر حتی تنفقو مما

Marfat.com

تحبون، تم میری محبت اور برأت کبھی نہیں پاسکتے، جب تک کہ میری محبت باقی محبتوں سے کچھ بڑھ کر نہ ہو۔

اس تسبیح کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ اصول محبت وصال میں کبھی بھی نہیں پتہ لگتا۔ محبتیں وہی لازوال ہوتی ہیں، جن کے فراق کا ہمیں علم ہوتا ہے اور فراق میں جو سب سے بڑی بات آپ کو زندہ رکھتی ہے، وہ محبوب کی یاد ہے۔ ہم اللہ سے اس قدر دور چلے گئے ہیں کہ کہاں الست کا دن اور کہاں یہ دن اور یہ بیچ میں چھوٹے موٹے گیپ نہیں، صدیوں کے فاصلے ہیں۔ ہم اس گیپ کو سوائے اس کی یاد کے پر نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اس کی یاد میں پڑے ہوئے ہیں، تو یہ ارب ہا ارب اور صدیوں کے فاصلے پر ہو جاتے ہیں۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اللہ سے بندہ زیادہ رومینٹک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ہماری رومانویت کو Fact & Figures چاہئیں۔ اللہ میں Facts & Figures نہیں ہیں۔ مگر ایک وابستگی اور وفاداری ہے، جو تمام تعلقوں سے بچا کر اس سے خصوصی تعلق پیدا کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ تاکہ مرتے وقت میں کہہ سکوں کہ میں ہر قسم کے آسیب اور فتنے کی زد میں رہا۔ مگر اے پروردگار،

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

صرف اتنی سی بات ہے۔ ہم مکمل نہیں ہیں اور پھر ہم متوازن بھی نہیں ہیں۔ اعلیٰ ترین توازن کے نمونے گذر گئے۔ محمد رسول ﷺ گذر گئے۔ آپ ﷺ کیا ہستی تھے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ایک جملہ مجھے ساری زندگی نہیں بھول سکتا۔ فرمایا، رسول ﷺ گذر گئے۔ ہمیں اور کسی چیز کا کیا غم ہو سکتا ہے۔ اگر دیکھیں، تو یہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کا انتہائی ذہین Statement ہے۔ اگر ایک انسان سے اس کا پرفیکٹ آئیڈیل چھن جاتا ہے۔ ایک اعلیٰ ترین شخصیت، ہر ویلیو کی آماجگاہ اور ہر قدر کی سردار شخصیت ہم سے جدا ہو جاتی ہے، تو باقی انسانوں میں ہم کیا ادب اور کلچر ڈھونڈتے پھریں۔ کوئی اور کس طرح میرے دل اور دماغ کا امیج بن سکتا ہے۔ اب ہمیں اور کس کا غم ہو سکتا ہے؟ میرا بچہ کون سا اتنا بڑا دانشور اور عالی دماغ ہوگا کہ میں اسے روتا رہوں۔ میرے ماں باپ میں کیا غیر معمولی خوبی ہے کہ وہ اگر رخصت ہو گئے، تو میں ان کا ماتم کرتا رہوں۔ اصل رونا تو یہ ہے کہ رسول اللہ گذر گئے۔ جب وہ گذر گئے، تو اب اس قسم کا غم کسی کو نہیں ہونا چاہیے۔ ایک Creator of situation گیا، اب Created situation رہ گئی۔

میں عقیدت سے نہیں ایمانداری سے کہتا ہوں کہ دنیا کے تمام مسائل کو ذہنی طور پر حل کرنے کے بعد بھی مجھے اگر کنفیوژن ہوتا ہے۔ ذہنی بے چینی یا اضطراب محسوس ہوتا ہے، تو میں حدیث رسولؐ سے رہنمائی لیتا ہوں۔ پوری دنیا کی کوئی کتاب، فلسفہ، خیال، حساب، کلچر نہ سائنس، کوئی اس میں کام نہیں آتا۔ میں نے محدثین کو دیکھا، مجھے حیرت ہے کہ وہ خدا کے رسول ﷺ کے پیچھے اس ذہانت کو نہیں دیکھتے کیونکہ رسول صرف رسول نہیں ہوتا، وہ اپنے وقت کا ذہین ترین انسان ہوتا ہے۔ مگر ہمارے رسول ﷺ کی صفات عالی یہ ہے کہ وہ ہر وقت کے ذہین ترین انسان ہیں۔ میں نے اپنے مضامین

Marfat.com

میں نظریہ جمال پروردگار اور محمد رسول اللہؐ دونوں میں یہی چیز اجاگر کی ہے کہ جمالیاتی اور ذہنی طور پر بھی کسی شخصیت میں کاملیت (Perfection) قریب نظر آتی ہے، تو وہ رسولؐ اللہ کی ذات ہے۔ وہ ایک اعلیٰ ترین اعتدال گذر گیا۔ ہم ایک صحابی بھی نہیں ہوسکتے۔ اصحاب رسول بھی گذر گئے۔ دوسرے درجے کا اعتدال گذر گیا۔ ہم تابعین بھی نہیں ہوسکتے۔ ہمارا یہ بھی اعتدال کا درجہ گذر گیا۔ ہم اپنی پوری کوشش کریں کہ ہم اعتدال کے قریب رہیں۔

ہمارا کاز کتنا مشکل ہے۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی خوبیاں جمع کرنی ہیں۔ و من یعمل مثقال ذرة خیراً یرہ۔ و من یعمل مثقال ذرة شراً یرہ۔ دو چار ذرات خیر جمع کر لیں۔ شر تو ہم جمع کر ہی رہے ہیں۔ دو چار ادھر، دو چار ادھر سے خیر جمع کر کے متاع فقیر سنور جائے گی۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ خدا ہر وقت دستیاب ہے۔ آپ اسے نہیں طلب کر رہے ہوتے، وہ آپ کی ہمسائیگی کی آرزو کر رہا ہوتا ہے۔ اس نے آپ کو اپنے لیے بنایا ہے۔ ہم نے اس کو اپنے لیے نہیں بنایا۔ اسی لیے جب حضرت شیخ بایزید بسطامی نے کہا کہ میں چالیس برس خدا کی تلاش کرتا رہا۔ جب میں نے اسے پایا، تو معلوم ہوا، وہ مجھ سے پہلے میری تلاش میں تھا۔

خدا ہمیں تلاش کر رہا ہے، ہم اسے ڈھونڈ نہیں رہے۔ ہم میں کوئی صلاحیت تو ہو، جسے وہ اٹھا لے۔ کوئی صحتمندیٔ خیال تو ہو۔ ہم تو وہم اور وسوسہ کی سرزمین میں سفر کرتے ہیں۔ جسے آپ ماڈرن ورلڈ کہتے ہیں، یہ میٹرکس کی دنیا ہے۔ آسیب کا جہان ہے۔ آپ جا کر دیکھیں، سڑکوں پر جنونیوں کی طرح سیلاب پھرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم سب کمپیوٹر کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ کسی ویرانی خیال کو بڑھ رہے ہیں۔ جہاں کوئی امید، کوئی شگوفہ حیات نہیں۔ مشرق جذباتی ہے۔ مغرب معروضی ہے۔ مگر حل ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ ہماری جذباتیت ہمیں ان نالائقوں کے پیچھے لے جاتی ہے، جن کے پاس علم، خلوص اور نہ ایمان ہے۔ جو دوسروں کے خیر کے جذبات کو مسخ کرنا جانتے ہیں۔ مغرب ان چیزوں کو مانتا ہی نہیں۔ کیونکہ ہماری یہ کیفیت اس کے حساب و کتاب اور شمار میں نہیں آتی۔

مگر دونوں کے درمیان رستہ وہی اعتدال ہے کہ محبت کا جذبہ ہماری رگوں میں سلامت رہے مگر ساتھ ساتھ ہمارا شعور ہمیں معروضیت سے بھی آگاہ رکھے۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ اللہ کو مانو۔ مگر جب دنیا کے حقائق پر غور کرو، تو یہ نہ کہنا کہ یہ باطل ہے۔ بلکہ یہ کہنا کہ سبحانک ربنا ماخلقت ھذا باطلا، اے اللہ! اسے تو نے باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ غلط نہیں، صحیح ہے۔ میری ہر چیز کا امتحان میری دنیا میں ہے۔ میرے اخلاق، میرے کاروبار، میری جدوجہد اور مشاغل کا امتحان میری دنیا میں ہے۔ جتنا عرصہ ہم یہاں ہیں، ہمیں اس انداز زندگی سے گذرنا ہوگا۔

تسبیحاتِ بلاناغہ ضروری

اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ وفا پسند ہے۔ یہ نہیں کہ آج پڑھا اور کل ناغہ کر لیا۔ وہ پوچھے گا ضرور کہ آج مجھ سے کیا چیز تمہیں زیادہ اہم لگی کہ تم نے ناغہ کر لیا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تسبیح میں ناغہ نہ آئے۔ باقی جیسا مرضی ہے، پڑھ لیجیے۔ تھوڑا، زیادہ، رات کو، دن کو، سارا دن، ساری رات، جب چاہے پڑھ لیجیے۔ جب آپ کو یہ یقین ہو جائے کہ تسبیح آپ کا جزو دل و دماغ ہو گئی ہے، تو جس کو چاہیں، بتائیں۔ ہر شخص کے لیے اس کے تیکنیکی پہلوؤں کے مطابق تسبیح ہے۔ اس ضمن

Marfat.com

میں کوئی حجاب اور کوئی ستر نہیں ہے کہ اس کے اثرات افشا کیے جائیں۔ یہ پرانے زمانے کے یہودیوں کے طریقے تھے کہ کہیں دوسرا بندہ کسی چیز سے آگاہ نہ ہو جائے۔ گھٹیا پہلوان سارے گر نہیں سکھاتا تھا، تاکہ شاگرد اچھا گر سیکھ کر کہیں اسے ہی نہ گرا دے۔ راز داری اور خوف پیدا کرنا Occult اور جادوگروں کا پیشہ رہا ہے، اللہ کے بندوں کا نہیں۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ خدا کا ذکر، اس کی یاد اور اس سے تعلق عام ہو۔ مگر اہم یہ ہے کہ کسی آدمی کو سمجھا جائے اور اس کے مطابق تسبیح دی جائے۔ یہ ٹیکنالوجی شاید ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔

تسبیح، مہندی کی طرح یا سبز چائے کی طرح ہے، جو ہولے ہولے رنگ چھوڑتی ہے۔ اس علم میں دنیاوی علوم کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں سادہ پوسٹ گریجویٹ ہوں۔ سرکاری طور پر ہزاروں، لاکھوں پوسٹ گریجویٹ انگلش میں ہوں گے، لیکن وہ تمام شاید اسی رجحان کے مالک نہیں ہوں گے۔ اس بچے کا تصور کیجیے، جس نے پانچ سال کی عمر سے بھاری مطالعہ شروع کر دیا ہو۔ دسویں جماعت تک میں نے ڈاکٹر ژواگو اور مائیکل شولوخوف پڑھ رکھے تھے۔ اسی طرح بخاری اور مسلم کا مطالعہ کر لیا تھا۔ علمی تجسس آگے بڑھتا ہوا فطری استحکام تک پہنچتا ہے۔ جس کو دعویٰ عقل اور دعویٰ جستجو و تحقیق ہو، اس کا فطری انجام اللہ ہے۔ آپ اور کہیں جا ہی نہیں سکتے اور جہاں علم رکے گا، آپ کسی کلاس کے خوگر ہو جائیں گے۔ کسی Partisanship میں چلے جائیں گے یا کسی جماعت کے پیروکار ہو جائیں گے۔ وہاں ایک بت پیدا ہو جائے گا۔ آپ کی ذہنی ترقی رک جائے گی۔ آپ آگے بڑھنے سے انکار کر دیں گے۔ سو جسے Occult کہتے ہیں، وہ جماعتوں سے پیدا ہوتا ہے اور مسلمان ہر حال میں آزاد ہوتا ہے۔ جب مجھے خدا کے بارے میں سوچنے کی آزادی ہے، تو مجھے بس اتنا پتہ ہونا چاہیے کہ میں وہ سوال نہ اٹھاؤں، جس کے لیے میرے پاس ڈیٹا پورا نہیں ہے اور اگر میں نے سوال اٹھالیا ہے، تو اتنا صبر کروں کہ مکمل ڈیٹا حاصل ہو جائے۔

میرے ذہن میں خدا کا سوال ہمیشہ سے رہا ہے۔ لیکن میں صبر سے وہ تمام ڈیٹا جمع کرتا رہا، جو خدا کے بارے میں لازم اور ضروری تھا۔ میری ساٹھ سال سے اوپر عمر ہے۔ آخر کار میں نے وہ دلیل پالی، جو آج تک مجھ سے نہیں ٹوٹی، مجھ سے رد نہیں ہو پائی۔ اللہ کو پانے کے لیے میں نے جو دلائل کا طریق کار وضع کیا ہے، وہ آج تک کسی فلاسفر سے رد نہ ہو سکا نہ کسی عملی مثال سے ٹوٹا ہے۔ اپنے پہلے لیکچر میں، میں نے اس دلیل کا صرف نقشہ اور خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کی بنیاد حقائق پر ہے، تصور پر نہیں۔ میری دلیل کی بنیاد فلسفے اور کسی انکوائری سے نہیں مل سکتی کہ Allah is the top priority اس کی بنیاد صرف ایک اصول پر قائم ہے اور چار سوالات ہیں۔

ایک تو مجھے اپنے بارے میں یہ سوال کرنا ہے کہ میں آزاد ہوں یا غلام۔ مجھے یہ طے کرنا ہے کہ اللہ ہے یا نہیں ہے۔ میری آزادی یا میری غلامی میں صرف اللہ حائل ہے۔ اگر اللہ حائل ہے، تو انسانی آزادی کے چیمپئن کے طور پر اللہ مجھے پسند ہوگا یا نہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ نہیں ہوگا سو جب آپ اللہ پر گفتگو اور بحث کرنے چلتے ہیں، تو یہ بنیادی عنصر ہے کہ خدا آپ کی آزادی کا سب سے بڑا حریف ہے۔ اس کو نہ ماننا عین فطرت ہے اور ماننا مشکل۔ اس لیے یورپ اس کو نہ ماننے میں آسانی سمجھتا ہے۔ ان کے آزادی کے نظریات کا سب سے بڑا حریف مذہب ہے اور مذہب کی بنیاد پر کھڑا ہوا اللہ ہے۔ مگر ان بے وقوفوں نے ایک سوال حل نہیں کیا کہ اللہ ہے یا نہیں۔

Marfat.com

دوسرا سوال جس کا سامنا ہمیں تمام تر فلسفوں میں کرنا پڑتا ہے، یہی ہے کہ اللہ ہے یا نہیں۔ بقول برٹرینڈرسل، مگر مسلمان کے پاس ڈیٹا ہے۔ یہ ان کی حماقت ہے کہ وہ ڈیٹا نہیں جانتے۔ مگر جس شخص کے پاس پوری 365 صفحے کی کتاب ہو، اور دعویٰ کر رہی ہو کہ میں اللہ کا ڈیٹا ہوں۔ شاید آپ نے قرآن کریم کو اس حیرت سے نہ دیکھا ہوگا، جو غیر مرئی قوت زمین و آسمان کے ادراک سے بالاتر ہے، اس کے الفاظ اس 365 صفحات کی کتاب میں درج ہیں، مرقوم ہیں اور اس کی ایک آیت کو چیلنج کر دینے سے ہمارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ آپ کی فکر کے لیے میں ایک اور تجویز پیش کروں کہ میں ہزار جھوٹ بول کر بھی انسان رہ سکتا ہوں، لیکن خدا ایک غلطی کر کے بھی خدا نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ آپ قرآن میں ایک غلطی کی نشاندہی کریں اور آپ آزاد ہیں مگر آپ ایسا نہیں کر پاتے، تو پھر آپ کو خدا کی ذات پر ایمان لانا ہوگا۔

تسبیح کی رکاوٹیں

اہم مسئلہ یہ ہے کہ جو میں تسبیح دیتا ہوں، یہ نفس پر بوجھ ہے۔ کسی بھی نئی عادت کا اختیار نفس پر بوجھ ہوتا ہے۔ کسی نئے کام کا بیڑا اٹھانا، کسی بھی نئی عادت میں ڈھلنا اور خاص بات یہ کہ اس عادت کو اپنانا بہت گراں ہوتا ہے، جس کے مخالف بہت ہوں۔ اللہ کی یاد کے آگے تو بہت سارے حصار یا دشمن ہیں۔ ان میں ایک تمہارا اپنا نفس ہے، جو صبح و شام نئے طرز معاشرت کے بہانے کرے گا۔ نئے راستے نکالے گا۔ کاہلی و سستی کی دعوت دے گا اور دوسرا شیطان رجیم ہے۔ وہ کیسے پسند کر سکتا ہے یا کرے گا کہ آدمی ذکر الٰہی میں مصروف ہو جائے۔ شیطان جانتا ہے کہ جس نے ذکر خدا شروع کر دیا وہ اس کی قید اور حدود و اختیار سے باہر نکل گیا۔ شیطان ہر کام کر سکتا ہے، مگر کسی آدمی کے اخلاص کو اللہ کی یاد کی راہ نہیں بتا سکتا۔ یہ ناممکن بات ہے کہ وہ اللہ کی طرف رہنمائی کرے۔ وہ ہم پر مختلف دباؤ ڈالے گا۔ شیطان اس پر زور دے گا کہ اسمائے الٰہیہ بار بار دہرانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ قینچی مارنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا کہ ایک دن نہ پڑھی، تو اس سے کیا نقصان ہوگا۔

تیسرا یہ اعتراض کرے گا کہ گنتی کا کیا فائدہ ہوگا۔ بے حساب پڑھو۔ اگر وہ تمہیں یہ مشورہ دیتا ہے کہ بے حساب پڑھو۔ کیوں گنتی کر کے پڑھتے ہو یا Counting کرتے ہو۔ اسے اچھی طرح پتہ ہے کہ فطری طور پر یہ اس قابل نہیں ہے کہ لگاتار پڑھ سکے۔ پہلے تین سو پڑھتے ہو، پھر سو پر آ کر رکتے ہو۔ پھر تینتیس پر ٹھہرتے ہو اور آخر کار تسبیح صفر ہو جاتی ہے۔

مشورہ وہ صحیح دے رہا ہے کہ بے حساب یاد کرو مگر انسانی عادات کا اس سے زیادہ کوئی فہم نہیں رکھتا۔ وہ کئی ارب سالوں سے ہمارا دشمن ہے۔ اس کے دفاتر میں ہماری فائلوں پر فائلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اسے ازبر ہیں کہ انسان کس طرح کا سلوک کرتا ہے۔ کس طرح کا طرز عمل اختیار کرتا ہے یا کس طرح پیش آتا ہے۔ شیطان کے عملے سے زیادہ ذی روح انسانی جبلتوں کی اتنی واقفیت و آگہی کوئی نہیں رکھتا۔ کوئی ذی روح اس سے زیادہ ہم سے شناسا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، میں بہت عقلمند اور مدلل سوچنے والا انسان ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ اس کم بخت کے پاس مجھ سے بہتر ڈیٹا موجود ہے۔ یہ وہی امریکہ والا حساب ہے۔ میں کتنا بھی ذہین و فطین بن جاؤں۔ میرے پاس اتنے سپر کمپیوٹرز نہیں ہیں۔ ہم یہاں حیران رہ جاتے ہیں کہ امریکہ بہادر ہمارے بارے میں ڈیٹا فراہم کر رہا ہوتا ہے۔ ان کے پاس کتنی اطلاعات ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں کتنے واقف ہیں۔

Marfat.com

یہی شیطانی طریقہ کار ہے۔ ہر وہ انسان، جو خدا کی طرف راغب ہونے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس کی تمام عادات واطوار اور اس کے تمام نظام سے واقف ہے۔ اس کے بھی کمپیوٹرز کام کر رہے ہیں۔ اس کے پاس ڈیٹا موجود ہے وہ کہتا ہے کہ صاحب کہاں جائے گا۔ فلاں قدم پر میں اسے اچک لوں گا۔ اگلے قدم پر پکڑ لوں گا۔ انسان ایک عورت کی حد تک ہی نہیں رکتا، اس نے تو چھ عورتیں لائن میں لگائی ہوتی ہیں۔ چلو اس عورت پر کوشش کرتے ہیں۔ اگر اس پر نہیں پکڑا جاتا تو دوسری عورت پر ضرور ڈھیر ہو جائے گا۔ اس کی یہ کمزوری ہے۔ یہ ماں سے بڑی عورت کے ساتھ ٹریپ ہو جائے گا۔ اسے ہر نفسیاتی اعداد وشمار کا علم ہے۔ جہاں کہیں آپ اس کے ہاتھ لگ جاتے ہیں، مارے جاتے ہیں۔

سوائے ایک چیز کے اگر آپ تلاشِ حق میں مخلص ہیں، تو وہ زیادہ دیر تک مکر وفریب اور دھوکہ دینے کے قابل نہیں ہوگا۔ اسی بات کو اللہ نے قرآن مجید میں شیطان کے بالمقابل کہا ہے فاغوینا کہ میں ان کو ضرور اغوا کروں گا۔ اوپر سے، نیچے سے، دائیں سے، بائیں سے۔ اللہ نے فرمایا کہ تو ضرور کرے گا، مجھے علم ہے الاعباداللہ المخلصین مگر تو ان بندوں کا کچھ نہیں کر سکے گا، جن کا ذرہ برابر اخلاص بھی میرے ساتھ ہوا۔

بے حساب پڑھو، جتنا اپنی مرضی سے پڑھ سکتے ہو، لیکن مجھے اتنا علم ہے کہ اگر تمہاری عادت تین سو بار پڑھنے کی راسخ ہو جائے، تو پھر تم آگے بڑھ سکتے ہو۔ تمہیں چھوڑتے وقت بہت ناگواری ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت اور وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے لوگ بہت کم استقامت رکھتے ہیں۔ اگر آپ پرانے بزرگوں کی طرف دیکھیں، تو میری تسبیح ان سے کہیں زیادہ ہے، جو میں دیتا ہوں۔ مثال کے طور پر سیدنا خواجہ مہر علی گولڑہ شریف کے پاس عام آدمی جو بھی آتا، آپ اسے دس دفعہ کلمہ، درود شریف اور استغفار کا ذکر دیتے۔ یہ کافی ہے۔ اگر کسی نے دس مرتبہ ہی پڑھ لیے، تو یہ کافی ہے، لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ وقت تبدیل ہو گیا۔

وظائف واذکار پر نظرِ ثانی

یہ کوئی ایسی خصوصی سٹیج نہیں ہے بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ تسبیح کے فوراً بعد انسان مستحکم ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ مجھے فوائد مل گئے ہیں۔ واقعتاً اسے فوائد مل گئے ہوتے ہیں۔ پھر کچھ عرصے کے بعد صورتحال بدل جاتی ہے۔ نیا بحران آتا ہے۔ اس کے لیے باڈی اور مائنڈ تیار نہیں ہوتا۔ آپ کے ذہن میں آتا ہے، میں اب پریشان ہوں تو نئے چیلنجوں اور نئے بحرانوں کے لیے آپ رجوع کرتے ہیں۔ استاد کا صرف یہی کام ہے کہ وہ نئے چیلنجوں کے درپیش آپ کو اللہ کے اسمائے حسنیٰ تجویز کرے۔ اللہ کو یہ پسند ہے کہ یہ شخص مجھے زیادہ یاد کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ وہ آپ کو کوئی اور مصیبت ڈال دیتا ہے، تاکہ آپ کا رجوع تیز تر اور طاقتور ہو۔

ایک کام جس کے لیے ہم پیدا ہوئے ہیں۔ ہمیں ٹاسک دیا گیا، وہ کام ہے جو تخلیق کا باعث ہے اور جس میں خدا نے ہر ممکنہ ہمیں سہولت دی ہے۔ تعیشات اور بیویاں دیں۔ رزق اور کاروبار دیا۔ یہ سارے کے سارے کام سہولت ہیں۔ ان میں سے کوئی ہمارا کام نہیں۔ ان کاموں کو نکال کر آپ اس ویران اور بنجر پوری دنیا کی زمین پر ایک آدھ آدمی کی پیش رفت دیکھیے، جو شواہد و آثار سے جہنم جاتا ہے یا جنت کا راستہ بتاتا ہے۔ اس کی بقا ہر وقت داؤ پر ہے۔ اس کو خوف و

Marfat.com

وحشت اور تنہائی سے آزادی کا کیسے ایک لمحہ بھی مل سکتا ہے کہ وہ اللہ سے رجوع کرے۔ اب قدرتی سی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب، محبت، شناخت اور پہچان کے لیے بہت پہلے سے ہماری Arrangement کر دی۔ حدیث رسولؐ ہے کہ قلم خشک ہو چکا، پچاس ہزار سال پہلے، جو لوگوں کی تقدیریں بناتا ہے۔

اگر تقدیریں بن چکی ہیں تو یہ سارا ڈھونگ اور سب فراڈ سا لگتا ہے کہ ہم Repeated Circumstances سے گذر رہے ہیں۔ ایسے جیسے کہ ہمیں جہنم اور جنت کی مشق کرائی جا رہی ہو۔ مگر ایسا ہے نہیں۔ جنت اور جہنم کے حالات زندگی ہوتے نہیں۔ دنیا کی کامیابی یا ناکامی، وہ تمام حالات ہیں، جنہیں کسی ذات کے لیے خصوصی طور پر ایسی سہولتیں سمجھا جائے گا، جو اسے اپنے مقصد تک بہتر پہنچا دیں۔ اگر مصائب کی زندگی میں نے گذاری ہے، تو میں اسے مصائب کی زندگی سمجھتا ہوں۔ مگر اوپر بالائے کائنات سائنسی طور پر کام کرنے والا میرا کمپیوٹر اسے مصائب نہیں سمجھے گا۔ اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ کسی کا رزق نہ ہو، تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ کسی کا زیادہ ہو، تو وہ کافر ہو جاتا ہے، کسی کو غربت کافر کر دیتی ہے، کسی کو امارت کافر کر دیتی ہے۔ قدرتی طور پر اوپر بڑا ہی سائنسی اعتبار سے طے کر دیا گیا ہے کہ اس شخص کی بہترین ذہنی صلاحیتیں اجاگر ہو سکیں گی، اگر یہ حالات ہوں گے وہاں اچھے برے نہیں دیکھے جاتے، وہاں صرف بہتر جگہ پاتے ہیں، اس کو اللہ کی رحمت کہتے ہیں کہ کسی بھی انسان کے حالات اگر اس کی وجودی استطاعت کے مطابق ہوں۔

ایک آدمی بڑا ظالم، سرکش اور جنون والا ہے۔ اس کے معاملات میں سختی زیادہ لکھی ہے، تا کہ اس کو بار بار مار پڑے، ناکامیاں ہوں، اس کی ذات کی طاقت ٹوٹے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو کہ مجھ سے بھی بڑا کوئی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسے مضبوط اور اٹل ارادے والے شخص بھی کہتے ہیں کہ میں نے خدا کو اپنی ناکامیوں سے پہچانا اور ارادوں کی شکستگی سے شناخت کیا۔

اس سطح پر جب میں سوچتا ہوں، تو لگتا ہے کہ خدا کو شاید پانا، یاد کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے۔ اس میں کوئی پیچ نہیں۔ جن لوگوں نے بھی پچھلے صوفیاء کو پڑھا ہے، ان میں کوئی رکھ رکھاؤ نہیں تھا۔ یہ برصغیر کے طور طریقے ہیں۔ جنید، شیخ عبدالقادر جیلانی میں کوئی Mannerism نہیں ہے۔ اپنی ذاتی زندگی میں انہوں نے سختیاں ضرور اٹھائیں اور یہ سختیاں انہوں نے خود اختیاری کے تحت اٹھائیں۔ یہ نہیں کہ ان پر مسلط کی گئیں کہ بھوکے مرو۔ جب کوئی چیز بندے کا چوائس بن جائے تو اس کی نوعیت مختلف ہو جاتی ہے۔ اس کی نوعیت چوائس کے مطمحِ نظر پر ہے۔ فرض کیجیے، میں نے سرکاری نوکری کبھی نہ کرنا چاہی۔ اگر نہیں کی یا نہیں کرنا چاہی تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میں کسی قیمت پر بھی حکومت کی Wishful thinking کا حصہ نہیں ہونا چاہتا۔ میں ٹیچر بننا چاہتا تھا اور میں اپنے تمام کیریئر میں ٹیچر ہی رہا۔

اب وہ میرا چوائس تھا۔ شروع میں مجھے چوائس دیا گیا کہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر انڈسٹری یا ڈی سی ہو جاؤ۔ اگر میں ابتدا میں کوئی ایسا فیصلہ کرتا، تو میں اس وقت سیکرٹری انڈسٹری یا ڈائریکٹر جنرل ہو جاتا۔ یہ ہو جاتا، وہ ہو جاتا وغیرہ۔ مگر اپنے چوائس استعمال کرنا میرا مطمعِ نظر ہی نہیں تھا۔ سٹیٹس، دولت، نہ کرپشن۔ میں نے ٹیچر بننے کو ترجیح دی۔

اب میں نے ٹیچر بننا کیوں پسند کیا؟ کیونکہ میں زیادہ سوچنا چاہتا تھا۔ میں اپنے آپ سے اور خدا سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا، میں کلیئر ہوں۔ میرا خیال یہ تھا کہ زندگی کے انجام تک پہنچنے کے لیے آئیڈیل بڑا ہونا چاہیے۔ میں

نے حساب لگایا، کیا عورت آئیڈیل ہو سکتی ہے؟ اندازہ ہوا، بالکل نہیں ہو سکتی۔ دو چار سال میں اسے بڑی شدت سے پیار کروں گا، پوجوں گا، تراشیدم، پرستیدم، شکستم۔ میری انا اس قسم کی ہے کہ میں ساری زندگی ایک عورت کی پرستش نہیں کر سکتا نہ اسے چاہ سکتا ہوں۔

جب میں نے دولت کے بارے میں غور کیا، میں نے کہا، اگر اتنے سارے پیسے ہو بھی گئے۔ خدا نے دے بھی دیئے تو کیا میں انہیں خرچ کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہلکان کرتا رہوں گا؟ میں نے تو مرنا ہے اور میں کتنے بھی وسائل کا مالک ہو جاؤں، میں نے اسے دوسروں کے لیے چھوڑ کر جانا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ پیسہ ویسے بھی ایسی چیز ہے کہ جو سوچتا نہیں ہے۔ سوچتے تو آپ رہے ہیں اور پیسہ اکٹھا کر کے پھر بھی آپ نے سوچنے کی طرف مائل ہونا ہے، تو کیا آپ صرف پیسے کے بارے میں سوچو گے کہ اسی کو اکٹھا کرنا ہے؟ اسی کو جمع کرنا ہے؟ مجھے Shylock اپروچ نظر آئی۔ پیسے والے لوگ دیکھے تھے۔ ان کی بھری دیکھی۔ آزمائش بھی دیکھی تھی، تو اس نے مجھے اپیل نہیں کیا۔ میں جتنا کچھ چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے گذر اوقات کے لیے وسائل دے، اس سے زیادہ کبھی کہا نہیں۔

تیسری چیز تعلیم اور نالج ہے۔ یہ مجھے لالچ تھا کہ میں ایک اچھا دانشور بنوں۔ کافی عرصہ تک میں انائے علمیہ کا شکار رہا۔ میں نے خیال کیا کہ لٹریچر، زبان اور سائنس میں حرف آخر ہونا کیا ہی بات ہو سکتی ہے اور اس کے لیے بے اندازہ مطالعہ آپ کو مطمئن کر سکتا ہے، لیکن میں نے سوچا کہ اس سے مسئلہ تو حل نہیں ہوتا۔ اگر پھر بھی مجھے لوگوں کے توسط سے دیکھنا اور سوچنا ہے اگر میں نے یہ دیکھنا ہے کہ لوگوں کی Appreciation میرے لیے کیا ہے تو ساری زندگی میں ایک ناجائز اور ناقص پروجیکشن کے لیے جدوجہد کروں گا۔

میری تسبیحات کا انتخاب

میری تسبیح کے انتخاب میں کہیں عملیاتی قدرت کا ماحول نہیں ہے۔ واحد وجہ یہ تھی کہ میں خدا کو ہر اچھے انداز میں یاد کروں۔ ان میں کچھ پیغمبرانہ لہجے بھی تھے، جو مجھے بے حد پسند تھے وما ابری نفس نفس سے بری چیز کیا ہے ان النفس لا مارۃ بالسوء نفس تو ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے الا ما رحم ربی کہ جب تک اللہ رحم نہ کرے ان ربی غفور رحیم بے شک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ حضرت یوسفؑ کے الفاظ مبارکہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ پیغمبروں کے لہجے میں بڑی حسن وخوبی ہوتی ہے کہ وہ عام آدمی یا خارجی افراد کی طرح بات نہیں کرتے۔

مجھے پیغمبروں کا طرزِ تکلم بہت خوبصورت لگتا ہے۔ اس جیسا لب ولہجہ جو قرآن میں موجود ہے، وہ تمام میری تسبیحات بن گئیں۔ حضرت شعیبؑ قرآن مجید میں جب گویا ہوئے ان ربی علی کل شی حفیظ کہ بیشک میرا رب ہر چیز کی حفاظت پر قادر ہے۔ میں نے ان کا بھی انتخاب کر لیا۔ حضرت سلیمان علی شان نے فرمایا ان ربی غنی کریم بے شک میرا رب غنی وکریم ہے۔ یہ تسبیح بھی میں نے اچک لی۔ یہ بارہ کی تعداد میں تسبیحات ہیں۔ اسی طرح حضرت ہودؑ کی تسبیح ہے ان ربی علی کل شیءٍ علیم کہ میرا رب ہر شے کا عالم ہے۔ جتنی بھی تسبیحات میں نے قرآن کریم سے حاصل کیں، یہ میرا پیکیج ہیں۔

Marfat.com

حسبی اللہ ایک جملہ ہے اور عام طور پر سارے لوگ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ اللہ کافی ہے۔ یہ معتبر انداز ہے۔ مگر اس کے پانچ انداز ہیں۔ ایک حدیث کا، جبکہ چار قرآن مجید کے انداز ہیں۔ میرے سوا شاید یہ کسی کی کم ہی تسبیح ہو گی حسبی اللہ علیہ یتوکل المتوکلون کہ اللہ کافی ہے اور تمام بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ کتنی پیاری اور خوبصورت بات ہے۔ میں کبھی اسے نہیں چھوڑ سکا۔ حضور گرامی ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے کہ حسبی اللہ حسیب اللہ تمہارے لیے بہت کافی ہے، جو اچھا حساب کرنے والا ہے۔ اگر تم یہ تسبیح پڑھتے ہو، تو پھر حساب کے جھنجھٹ سے آزاد ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد باری ہے حسبنا اللہ و نعم الوکیل یہ بھی تسبیح ہے حسبی اللہ لا الہ الا ھو توکلت علیہ و ھو رب العرش العظیم یہ عرش کے ملائکہ کی تسبیح ہے اور یہ بھی میرے پاس ہے۔ پھر ابوالانبیاء حضرت ابراہیمؑ کو جب دہکتی آگ میں ڈالا گیا، تو جبرائیلؑ نے عرض کی آپ کو کیا میری معاونت درکار ہے؟ تو ابراہیمؑ نے کہا کہ کیا میرا رب مجھے نہیں دیکھ رہا؟ تو یہ ارشاد فرمایا حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔ یہ حسبی اللہ کے پانچ انداز ہیں۔ چونکہ مجھے بہت پسند ہیں، لہٰذا شروع ہی سے یہ پانچوں میری تسبیحات ہیں۔

اگر آپ میں جمالیاتی حس موجود ہے، تو پھر اس انداز تعریف سے آگے نہیں نکل سکیں گے لا الہ الا ھو رب العرش الکریم کیا انداز ہے اللہ کا! اللہ خالق کل شیء و ھو الواحد القھار، اللہ خالق کل شیء و ھو علی کل شیء وکیل یہ وہ انداز و ادا ہیں کہ آپ اللہ کی بزرگی و عظمت کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے انداز میں اپنی حمد و ثنا کے لیے فرماتے ہیں، تو وہ بڑی تابناک اور حیرت انگیز ہے۔ کیسا خوبصورت انداز تکلم ہے! زبان و بیان کے حوالے سے کیا جمالیاتی عنصر ہے لا الہ الا اللہ الملک الحق المبین اس میں کس قدر خوبصورتی بیان ہوئی ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ تسبیح ضروریات کے تحت بھی کی جاتی ہیں مگر ذوق تسبیح کچھ اور ہے۔ ایک دفعہ میں تسبیح پڑھ رہا تھا کہ مجھے سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی انگوٹھی پر لکھا ہوا جملہ پڑھنے کو ملا نعم القادر اللہ، مجھے وہ اتنا دیدہ زیب لگا کہ اس دن سے میری تسبیح ہے۔ مجھے تو ہر وہ انداز دلکش لگتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف بیان کی گئی ہو نعم القادر اللہ کا مطلب ہے، سب سے بہترین طاقتوں میں سے بہترین طاقت رکھنے والا اللہ ہے۔ اسی طرح حضرت شیخ عبدالقادرؒ کے وظائف دیکھتے ہوئے ان کا ایک جملہ بڑی فصاحت سے نظر آیا یا مولائے یا قادر یا مولائے یا غافر یہ جوں جوں اور جس جس انداز میں مجھے علم ہوتا گیا، انہیں میں اپنی تسبیحات میں شامل کرتا گیا۔

جب صبح ہوتی ہے اور میں یہ تسبیحات شروع کرتا ہوں، تو میں ان جملوں کی دلکشی سے مخمور ہو جاتا ہوں سبحان ربک رب العزة عما یصفون وسلم علی المرسلین والحمد للہ رب العلمین مجھ پر نشہ چڑھ جاتا ہے۔ دوسروں کا مجھے علم نہیں۔ یہ تسبیحات میری اللہ سے شدید محبت کی میراث ہیں۔ اب بھی مجھے چند ایک تسبیحات اتنی پرکشش اور خوبصورت لگتی ہیں، لیکن میں ان کو اختیار نہیں کر سکتا کیونکہ شاید میں انہیں اس طرح انجوائے نہ کر سکوں۔ جیسے جیسے میری لوگوں سے مصروفیات وسیع تر ہوتی جا رہی ہیں، میرے لیے روٹین سے گزرنا مشکل ہو گیا ہے۔ پہلے ہزار کے اوپر تسبیحات کرتا تھا۔ اس سے نیچے مجھے تشفی بھی نہیں ہوتی تھی۔ اب میں تین سو کے قریب تسبیح کرتا ہوں۔ ان تسبیحات میں سورة اخلاص ابھی بھی ایک ہزار مرتبہ سے کم نہیں کی۔ میرا ایک گھنٹہ صرف ہوتا یہ بلکہ کبھی دو ہزار مرتبہ پڑھتا ہوں، کبھی تین ہزار تک پہنچ

Marfat.com

جا تا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ قول برحق ہے کہ یہ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ جب آپ سورۃ اخلاص پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، تو اس کے پڑھنے کی عادت مضبوط اور راسخ ہو جاتی ہے۔ مجھے افسوس ہے، لوگ اللہ کی یاد اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور غرضوں کے لیے تسبیح ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ سچی بات ہے کہ تسبیح کے بعد کوئی غرض نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بہتر اور خوبصورت چیز عطا کر دیتا ہے۔

میں ڈیڑھ سو کے قریب دعائیں پڑھتا ہوں۔ دعا تو میں نے اپنے ایک نالائق شاگرد سے سیکھی۔ وہ روز مجھ پر کوئی طنز آ کر کرتا تھا۔ ایک دن تشریف لایا، تو دعاؤں کی کتاب پکڑی ہوئی تھی۔ زبان میں لکنت بھی تھی۔ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا کہ پروفیسر صاحب! یہ کیا آپ تسبیح اور دم درود کرتے رہتے ہیں؟ یہ تو فضول باتیں ہیں۔ آپ کو نہیں علم کہ دعا کے وقت کوئی تسبیح کام نہیں آتی۔ یہ دیکھو! رسولؐ کی کتنی اچھی دعائیں ہیں۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ مجھے بھی ایک بار یہ کتاب پڑھ لینی چاہیے۔ میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کیا اور اس کی کہی بات پر غور کیا۔ مجھے احادیث میں وہ دعائیں نظر آئیں۔ اللہ نے اپنا خاص کرم فرمایا۔ محمد بن شیخ عبدالرحمان الجذری کی کتاب احادیث سے استفادہ کیا، جس میں صحاح ستہ کی کتابوں سے دعائیں اخذ کر کے ترتیب دی گئی ہیں۔

ایک عادت شروع سے یہ رہی ہے کہ میں نے زندگی میں غیر مصدقہ کوئی وظیفہ کیا نہ کوئی دعا پڑھی ہے۔ میرے اندر کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ پیروں، فقیروں کے وظیفے ایک وقت میں بے معنی ہو جاتے ہیں۔ جب تک تمہارا ڈائریکٹ کسب موجود ہے، ان کا فائدہ ہوتا رہتا ہے۔ آپ کوئی رسالہ دیکھ کر کسی کو وظیفہ بتا دیں، اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا بلکہ الٹا تم پر مشقت پڑے گی۔

احتساب کی بنیادی صفت تو یہ ہے کہ خود اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اب صبح جب میں تسبیح شروع کرتا ہوں، تو وہ تقریباً ڈیڑھ سو دعائیں ہیں، نبی کریمؐ کی جو میں پڑھ کر آگے چلتا ہوں۔ ''فواد الفوائد'' میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء جب بھی اپنے شاگرد کے ہاں تشریف لاتے، اس کو کچھ تسبیحات عطا کرتے اور ان کے فوائد سے آگاہ کیا کرتے۔ اس میں کسی قسم کی پردہ پوشی، حسد یا خلوت کی کوئی بات نہیں۔ خدا کے بندوں کے ساتھ کوئی راز نہیں ہے۔ وہ احمق پیر ہے، جو یہ چاہتا ہے کہ اللہ کی باتیں دوسروں تک نہ پہنچیں۔ راز چھپانا کس بات کا؟ راز داری کس لیے ہے؟ راز داری تو سب سے بڑی قرآن میں ہونی چاہیے تھی۔ قرآن ہی تسبیحات کا مرکز ہے۔ قرآن کا پیغام ہی یہی ہے **سبح اسم ربک الاعلی** بڑے اور عظیم رب کی تسبیح کرو **فسبحان اللہ تمشون و حین تسبحون** اللہ ہی کی تسبیح کرو صبح اور شام **وعشی و انا تظھرون** عشا کو کرو اور ظہر کے وقت تسبیح کرو۔ کیا انداز ہے! **اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشآ و تعز من تشآ و تزل من تشآء**

میں یہاں کیوں بیٹھا ہوں؟ اگر مجھے اتنی ہی راز داری قائم کرنی ہے، تو مجھے لوگوں سے فرار اختیار کر لینی چاہیے۔ پھر تو مجذوبیت اور تنہائی بڑی شے ہے۔ میں لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوں۔ میں اٹھا ہی اس لیے ہوں کہ خدا کی یاد کا ان کو احساس دلاؤں اور ان کو اوصاف عطا کروں۔ میں ان کا اللہ کی طرف کوئی رخ متعین کر سکوں۔ میں کیوں چھپا کے رکھوں؟ البتہ اتنا سا راز ضرور ہے کہ ہم لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ الحمدللہ! جو لوگ میرے ہاں

Marfat.com

چاہے دین کے لیے آتے ہیں یا دنیا کے لیے، انہوں نے اللہ کے ساتھ بہت وفا کی ہے۔ وہ لوگ جنہیں میں نے بیس سال پہلے تسبیح دی تھی، ابھی بھی وہ ان تسبیحات پر عمل پیرا ہیں اور بڑے ثابت قدم ہیں کیونکہ وہ ان سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

دوسری بڑی سنجیدہ بات یہ ہے کہ لوگ صوفیاء، اولیاء اور بزرگوں کی کرامات ضرور بتاتے ہیں۔ اگر آپ اس قسم کی کتاب نوٹ کرنا شروع کر دیں، تو میرا خیال ہے، بے شمار کرامات مل جائیں گی۔ اس دوران میرے ساتھ لوگوں کی وابستگی رہی۔ یہ میرا کوئی کریڈٹ نہیں ہے۔ یہ صرف ان کا اخلاص اور اللہ کی تسبیحات کا کریڈٹ ہے، جو انہیں پہنچا ہے۔ اس کا صوفی ازم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

خواجہ مہر علی کے پاس ایک شخص آیا کہ تم اللہ کو بہت یاد کرتے ہو۔ کیا اللہ بھی تمہیں یاد کرتا ہے؟ فاذکرونی اذکرکم کی کیا تفسیر ہے؟ چار دن کی تسبیح کے بعد ہم لوگ مر جاتے ہیں۔ اللہ زندہ اور قائم و دائم ہے۔ قیامت تک کے لوگ اولیاء اللہ کے مزاروں پر حاضری دیتے رہیں گے۔ تسبیحات وہاں جا کر کرتے ہیں۔ تلاوت قرآن ہوتی ہے اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسے اللہ انہیں موت کے بعد یاد کر رہا ہے۔ یہ اللہ کی یاد ہی ہے۔ کون سا ایسا صوفی نہیں ہے، آپ جس کی قبر پر جائیں اور چوبیس گھنٹے اس کے مزار پر ذکر و تسبیح نہ ہوتی ہو؟ قرآن شریف پڑھ کر ثواب نہ بخشا جا رہا ہو؟ اس سے بڑھ کر کیا ثواب دارین ہوتا ہے۔ یہ کسی مرے ہوئے کے لیے کتنا ثواب کا کام ہے۔

اس میں میتھوڈسٹ بڑا بخیل ہے۔ اگر وہ پیسہ روٹی پر نہیں خرچ کرنا چاہتا، تو نہ خرچ کرے، لیکن خیرات کا مخالف تو نہ بنے۔ ان کا المیہ یہ ہے کہ انتہا درجے میں چلے گئے ہیں۔ میں نے ان میں کسی کو بھی کشادہ دل نہیں دیکھا، جو صدقات و خیرات کا خیرخواہ ہو۔ اعتراض کریں گے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ فائدہ مردے کا تم نے قرآن و حدیث کی رو سے دیکھنا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ میرے پاس اسے ثواب پہنچنے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ مگر جب میں صحیح مسلم و صحیح بخاری کا مطالعہ کرتا ہوں، تو مجھے ایسی حدیث کی صداقت نظر آ جاتی ہے۔

باب الصدقات کا آغاز ہی حضرت سعد کی اس حدیث سے ہوتا ہے کہ ان کی والدہ رحلت فرما گئیں اور وہ مدینہ سے باہر تھے۔ لوگوں نے اسے دفنا دیا۔ واپس آئے۔ سیدھے نبی اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یارسول اللہ! میری والدہ وفات پا گئیں اور میں مدینے سے باہر تھا۔ اب میں اس کے لیے کوئی خیرات و صدقہ کروں، تو کیا اسے ثواب پہنچے گا؟ فرمایا نعم نعم۔ دوسرا کوئی لفظ اس حدیث میں نظر نہیں آتا۔ فرمایا، اے نبیؐ! گواہ رہیے، میں نے اپنا فلاں باغ اپنی ماں کے لیے صدقہ کر دیا۔ یہ بخاری کی متواتر حدیث ہے۔ چونکہ یہ آپ کی مرضی کے خلاف ہے، آپ کہیں کہ فلاں راوی کمزور ہے، اس کی سند مستند نہیں ہے۔ ایک طرف آپ بخاری کو صحیح الصحیین کہتے ہیں کہ اس کے بعد حدیث کی کوئی صحیح کتاب نہیں ہے، لیکن جب آپ کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو، اس وقت جاہلانہ رسم و رویے کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں اور اس کی حدیث پر اعتراض کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ذرا غور کریں کہ معیار کس نے بنائے ہیں؟ اگر معیار روایت کے محمد بن اسماعیل نے بنائے ہیں اور وہ تمام احادیث کو پرکر رہے ہیں، تو آج کے زمانے میں ان کی احادیث میں مداخلت کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں۔ آپ اس زمانے میں کہتے کہ یہ راوی صحیح نہیں ہے اور وہ راوی کذب بیانی سے کام لیتا ہے۔ آپ کو تو کسی بات کا علم ہی نہیں

Marfat.com

ہے۔ آپ کو اسماء الرجال کا علم ہی نہیں ہے جبکہ چیکنگ سسٹم وہی ہے، جو بخاری شریف کا ہے، تو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث کمزور ہے؟

ایک شخص نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میری ماں نے حج کی نیت کی تھی اور اب اگر میں اس کے لیے حج کروں، تو اس کو اس کا ثواب پہنچے گا؟ کتنا خوبصورت جواب حضور عالی مرتبت نے دیا ہے۔ فرمایا کہ اگر تیرے باپ کا قرض ہوتا اور وہ مرجاتا اور تو ادا کرتا، تو اس کا قرض ادا ہوتا کہ نہ ہوتا؟ اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ! بالکل ہو جاتا۔ فرمایا، تیری ماں کی نیت تجھ پر قرض ہے۔ اگر تو حج کرے گا، تو اس کو ثواب ضرور پہنچے گا۔ کتنا فصیح و بلیغ جواب ہے؟ آپ حد درجہ بخیل ہیں۔ اپنی خفت، تنگ نظری اور خجالت کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ذمے کیوں لگاتے ہیں؟ یہ ہے سب سے بڑا مسئلہ۔

علمِ باطن، خصوصی پراسس

اس کے لیے ایسی کوئی سپیشلسٹی اور پیچیدگی نہیں ہے۔ میرے بعض شاگرد لوگوں میں بھی یہی جذبہ تھا کہ وہ سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہت سارے مسائل میں ان کی توجیہات بڑی واضح تھیں۔ وہ سیکھنا اور جاننا چاہتے تھے۔ رفتہ رفتہ کچھ نہ کچھ سوال و جواب کا سلسلہ چلتا رہتا۔ تمام علم سوال سے ہے۔ ان میں باقی لوگوں کی نسبت کافی Clarity ہے اور وہ بڑے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ تعلیم کا مطلب یہ نہیں کہ خالی ڈگری حاصل ہو جائے بلکہ وہ اچھا سوچنے والے تھے۔ ان میں سے بعض امریکہ، فرانس وغیرہ میں ہیں۔ میرے ایما پر Nature of God and Reality پر لیکچر دیتے رہتے ہیں۔ یہ وقت کے ساتھ تسبیحات اور توکل کے سبب ہی بڑھتے رہے ہیں۔ یہ بڑی دشواریوں اور مشکلوں سے گذرے ہیں۔ مگر خوش لوگ ہیں۔

عمومی طور پر ذہن کو تین خصائص میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جبلی، جو جبلت میں ہیں۔ وہ بقا کے لیے اعلیٰ ترین ذہانت پیدا کرتی ہیں۔ پھر انسان کا علم ہے، جو اسے عالمانہ سربلندی دیتا ہے۔ اس کے بعد انسان کی مکمل کمٹمنٹ اور یکسوئی ہے جو اسے وجدان دیتی ہے مگر یہ جو ذہانت، دانش اور وجدان کا علم ہے، یہ اگر خدا کے ریفرنس میں چلا جائے، تو یہ الہامی کیفیتیں پیدا کرتا ہے۔ اس کا کسی تخصیص سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بڑی قدرتی سی علمی تحریک ہے۔ اس میں کوئی بندہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔

ہاں ایک رہنمائی ضرور کر سکتا ہے۔ جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی کا قول مبارک ہے کہ کبھی ہم تمہیں کچھ نہیں دیتے۔ ہم تمہیں لا کر اس چوراہے پر کھڑا کر دیتے ہیں اور باقی رستے کاٹ کر تمہیں وہ راستہ بتا دیتے ہیں، جو خدا کی طرف جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی آدمی کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے۔ ہاں جب آدمی اللہ کی بندگی میں جاتا ہے۔ اپنی عادات، حرکات اور اپنے خیالات سے صحیح ہوتا ہے، تو ایک فطری سی بات ہے کہ اگر کوئی اللہ ہے، تو پھر اسے وہ سیراب کرتا ہے، اس کی خالی جگہ پر کرتا ہے۔ اگر خالی جگہ اللہ سے پر ہو گئی تو ظاہر ہے پھر وہ آدمی محترم تو ہو ہی جائے گا۔

یہ حقیقی بات ہے کہ ساری دنیا ایک طرف ہو اور اللہ کا ایک معمولی بندہ ایک طرف ہو جیسے اس نے موسیٰؑ سے کہا کہ 300 برس کا مستحکم معاشرہ پوری دنیا کے لیے Maniac ہے۔ اسے جا کر پڑھا۔ موسیٰ نے کہا، کیسے جاؤں، میں نے بندہ

مارا ہوا ہے۔ ڈر رہا ہوں۔ اللہ نے کہا لا تخف ۔ ڈرتے کیوں ہو، میں جو تیرے ساتھ ہوں۔ پھر دنیا اور تاریخ نے دیکھا کہ اس شخص کی وجہ سے فراعنہ مصر کا تمام جاہ وجلال نیل میں ڈوب گیا تو خدا کو اتنا لائٹ لینا بڑا مشکل ہے۔

ہمارے خدا کے بارے میں نظریات بڑے محدود ہیں۔ ایک تو ہم خدا کو ایک جذباتی سا وجود سمجھتے ہیں، جو فتوے پر سارے گناہ ثواب کے فیصلے دئے دیتا ہے۔ وہ ایسی تمام باتوں سے ماورا ہے۔ اس کی ذات گرامی بڑی عظمت والی ہے۔ وہ ان باتوں سے بہت بلند وبالا ہے۔ اگر میں آپ کو سائنٹیفک تجربے کی ایک جھلک دے دوں، تو آپ خوف سے کانپیں گے کہ خدا تک پہنچنا ممکن بھی ہے کہ نہیں۔ یہ جو ملین، بلین آف گلیکسیز کا سسٹم ایک دوسرے میں بنے ہوئے سٹائل میں رکھا ہوا ہے۔ جو نت نئے قوانین اور آفاق پیدا کر رہا ہو۔ جو کہتا ہے کہ ہر لمحہ اگر ساری کائنات کے درخت قلم بن جائیں، تو بھی میری باتیں لکھنا ممکن نہیں۔ ہم اس خدا کو بڑے محدود زاویے سے دیکھ کر فیصلہ دے دیتے ہیں۔

انسان کو تفاخر اللہ نے کیا دیا ہے کہ ہر انسان اسے اپنا خدا کہتا ہے۔ وہ کسی کا بھی نہیں۔ وہ صمدیت اور بے نیازی میں لم یلد و لم یولد و لم یکن لہ کفوا احد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے تم میں سے کسی کی ضرورت ہے نہ کسی کا بگاڑ مجھے کوئی نقصان پہنچاتا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے، تم عبادات کر کے مجھے خوش کرتے ہو۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو پروسیجرز ہیں۔ یہ تمہارے اپنے لیے ہیں۔ اچھے کام کرو گے، تمہیں فائدہ پہنچے گا۔ برے کرو گے، تمہیں نقصان پہنچے گا۔ مجھے تمہارے سوائے ایک لمحہ اخلاص کے، جس میں ساری دنیا سے خالی ہو کے تم میری طرف چہرہ کرتے ہو، اور کچھ بھی نہیں پہنچتا۔ نہ میں گوشت کی پروا کرتا ہوں نہ ہڈیوں کی کرتا ہوں۔ میں تو اس جہاں میں صرف وہ لوگ دیکھ رہا ہوں، جن کے دلوں میں ذرا برابر اخلاص میرے لیے شامل ہے۔

شیطان نے کہا، اے میرے سرکار! ٹھیک ہے، میں راندۂ درگاہ ہوں۔ میں ذلت سے آشنا ہوا۔ مگر تو نے جن لوگوں کی وجہ سے مجھے ذلت بخشی ہے، میں تجھے دکھاؤں گا، یہ کتنے کمتر لوگ ہیں اور تیرا اندازہ غلط ہے۔ میں انہیں اوپر سے، نیچے سے، دائیں اور بائیں سے آؤں گا۔ میں انہیں تھوڑا سا ٹچ کروں گا، یہ تیرے رستے سے بھٹکتے ہوئے کہیں سے کہیں چلے جائیں گے۔ خدا نے کہا، تو ایسا کرے گا، تو جو تیرا اور تیرے ساتھیوں کا حصہ لکھا ہوا ہے، اس سے جہنم کو بھر دوں گا۔ الا عباداللہ المخلصین سوائے میرے ان بندوں کے، جو میرے لیے ذرا برابر اخلاص رکھتے ہیں، ان کا تو کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔

علمِ نجوم، علم الاعداد، ٹیلی پیتھی

علم نجوم، علم الاعداد، ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی وغیرہ یہ تمام علوم اس علم اور اس شناخت کے برابر نہیں آتے، جو خدا بندے کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ میں بھی ساٹھ برس رہا ہوں۔ آپ کو حیرت کی بات بتا رہا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں اپنی حد تک کوئی حیران کن واقعہ نہیں دیکھا بلکہ میں حیران ہو کے سوچتا ہوں کہ اس دنیا میں جہاں بھی میں گیا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے پاس حیران کن علم ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ میرا علم بھی حیران کن نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ان کے بارے میں بغیر دیکھے کہوں (سائیڈ پر بیٹھے ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہ اداس طبیعت کے

Marfat.com

بندے ہیں۔ بہت حساس اور ان کی ذات کی پیچیدگیاں جڑی ہوئی ہیں، تو لوگوں کو یہ حیرت کی بات لگتی ہے مگر میرے لیے یہ ایک علم کا پہلو ہے، جس میں کوئی حیرت انگیز پہلو نہیں۔ کسی بندے کو میں نے انسان کی اندرونی فطرت پر اتنی مکمل شہادت دیتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں سمجھتا ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر کی نوازش اور کرم سے میں جس سمت اور جن خطوط پر سوچ رہا تھا، یہ سب اس کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔

میں اپنے علوم کو پرکھنے کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کا ایک قول مبارک دہراتا ہوں کہ ہم دھوکہ نہیں دیتے، مگر دھوکے کی ہر قسم جانتے ہیں۔ یہ جو ہمارے اندر حیرت کا عنصر یا انکشافات کو قبول کرنے کی حسرت ہے، اس کو چیک کرنے کے لیے میں نے تمام پراسرار علوم کا مطالعہ کیا۔ اس میں حصول سحر بھی ہے، علم الاعداد، ٹیلی پیتھی وغیرہ تمام علوم کا اکیڈیمک مطالعہ شامل ہے۔ حتیٰ کہ لاماز کے جو Lavitational processes ہیں، ان کی میں نے بڑی تحقیقات کیں اور جتنے بھی یوگا وغیرہ کے حیرت انگیز واقعات ہیں، ان کا سائنسی طریقے سے جائزہ کیا۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ کوئی بندہ، جو کراٹے کا ماہر ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک ہاتھ سے دس اینٹیں توڑ لیتا ہے۔ واقعی توڑ دیتا ہے۔ آپ کے سامنے توڑے گا، لیکن آپ کو یہ نہیں پتہ ہوگا کہ یہ اینٹیں کون سی اور پراسس کیا ہیں۔ اصول وہی سائنسی ہے کہ پہلی ضرب دوسری تک پہنچتی ہے۔ دوسری تیسری تک اور بھربھرے میٹریل کی اینٹیں ہوتی ہیں۔ اس (سیمنٹ کی ایک اینٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کو کسی کراٹے کے ماہر کے پاس لے جاؤ۔ وہ اس پر جان بھی توڑ دے، وہ اس سے نہیں ٹوٹے گی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہر علم کے پیچھے اس کی ایک خصوصی عملیت ہے، جس کی وہ بنیاد ہوتا ہے اور بہت سارے لوگوں کے تجربے کے پیچھے وہی سائنسی مشاہدہ ہے۔ ڈیوڈ کاپر فیلڈ دنیا کا سب سے بڑا شعبدہ باز ہے مگر شعبدہ باز ہوتا ہی فریب کار ہے اور وہ آپ کو فریب دے رہا ہوتا ہے۔ سوائے وہ آلات، جو اس کی بنیاد اور اس کے باطن سے نکلتے ہیں، وہ سچ ہیں اور یہ جھوٹ نہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کل کو خدا کیا چھینتا اور کیا دیتا ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر میں اپنی ذہانت اور اپروچ کو بحال رکھتا ہوں، تو یہ وہ چیز ہے، جو مجھ سے چھینی نہیں جا سکتی۔ ایک جگہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صاحب بڑی تندی اور تیزی سے مجھے پیچھے سے گھور رہے تھے۔ کیا ہوا کہ جی میں آپ کا علم سلب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے بڑی ہنسی آئی میں نے کہا، گدھے! کیا میرے ساتھ وہ سال بھی سلب کرے گا، جو میں نے تحصیل علم میں رات دن ایک کیے ہوئے ہیں؟ تیری استعداد ہوئی تو تو ایسا کر سکے گا۔

اس طرح کے اور مجاہدات کے ہمارے ہاں جتنے بھی علماء ہیں، ان میں اور مجاہدے میں یہ فریب آتا ہے۔ لوگ مجاہدات کی زیادہ تعریف کرتے ہیں کہ یہ پانی میں بارہ سال کھڑے رہے۔ میں ایک قدرتی سوال کروں گا کہ کیوں کھڑے رہے؟ بزرگانِ دین نے چلے اس لیے نہیں کیے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک آدمی کہتا ہے، مجھے بڑی بھوک لگتی ہے۔ جب تک یہ بھوک نہیں مٹے گی، میں خدا کے رستے پر چل نہیں سکتا۔ چنانچہ میں نے فاقہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ میرا پیٹ پکارتا رہا، کھانے دو۔ میں نے کہا، نہیں دوں گا۔ مجھے اللہ سے پیار ہے۔ میں چونکہ اللہ کی جانب بڑھنا چاہتا ہوں، اس لیے میں تجھے نہیں بڑھنے دوں گا۔

Marfat.com

بسا اوقات کسی فقیر کے دل میں ایک وہم سا پڑ جاتا ہے۔ ادھر اللہ کی چاہت ہے اور ادھر وہ خامی ہے، جو اس چاہت کی راہ میں حائل ہے۔ ایک آدمی بہت سیکسی محسوس کرتا ہے، وہ کہتا ہے، یار جب میں محلے سوسائٹی میں ہوتا ہوں، تو میں بہت سیکسی محسوس کرتا ہوں۔ میں تو سفر کرتا ہوں، کہیں قیام ہوگا، نہ کہیں محبت ہوگی نہ نظر بازی ہوگی۔ مسافروں کی طرح گذر چلو اور دیکھتے جاؤ۔ وہ بارہ بارہ، چودہ چودہ برس مسافرت اختیار کر لیتا ہے۔

وہ انفرادی طریق کار ہے۔ اپنے تو ساٹھ سال ہو گئے ہیں، سوسائٹی سے ایک قدم باہر نہیں نکل سکا، جو کچھ بھی جانچا پرکھا، اسی سوسائٹی ہی میں دیکھا۔ اپنے ایک ایک تعلق اور اپنے زندگی کے ایک ایک مقصد کو اسی سوسائٹی میں جانچا ہے۔ یہ الٹ پھیر، جو زندگی کے کیریئر میں میرے ساتھ گذرا ہے، وہ عوام کے اندر ہی ہوا ہے۔ جہاں جہاں میری آزمائش کے عناصر ہیں، وہاں وہاں میں پرکھا گیا ہوں۔ بہت سی ایسی جگہیں تھیں، جہاں میں ناکام ہوتا رہا ہوں اور بہت سی ایسی بھی تھیں، جہاں میں کامیاب ہوا ہوں۔ اب بھی بڑی خامیاں باقی ہیں۔

اوراد، وظائف چلہ کشی

جب کوئی بڑی تعلیمی تحریک ان پڑھوں اور کم علموں کے ہاتھ آتی ہے، تو اس میں کچھ پیشہ ورانہ رویے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ تعویذ دھاگے پیشہ ورانہ طور طریقے ہیں۔ اسلام میں صرف بچوں کو تعویذ دینے کا حوالہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بچوں کو تعویذ دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ بچے عقلی اور عملی طور پر نابالغ اور وہ تسبیح الٰہی کا شعور نہیں رکھتے۔ جب وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے تھے تو ابن عباس انہیں **اعوذ بکلماۃ اللہ تامۃ من شر ما خلق** کا تعویذ دیتے تھے۔ تعویذ سوائے بچوں کے ہمارے پرانے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ جو تعویذ دھاگے برصغیر میں نکلے ہیں، ان کا وجود اہل تصوف کے ہاں پہلے نہیں تھا۔ برصغیر میں سحر اور عملیات بہت تھے۔ اقوال کی ایک فہرست ضرور موجود ہے، جس کی وجہ سے خصوصی عملیات مرتب ہوتے ہیں۔ جیسے حاضرات جنات کے لیے ہر چیز کو ایک پیٹرن دیا گیا ہے، جس کے اندر آپ اس چیز کی پیروی کرتے ہیں اور اسے قابو کرتے ہیں، لیکن یہ تمام عملیات توجہ کے ہیں۔ آپ ایک خاص پہلو پر ارتکاز کرتے ہیں اور آپ کا سارا وجود ایک نکتے پر سمٹتا ہے۔

یہ جتنے بھی جنات کے عمل ہیں، یہ ہمارے اندر کے عمل ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ پراسیس کے دوران پہلے ایک سانپ آئے گا۔ پھر جناب ایک چیل آئے گی۔ اس سے اگلے دن ایک جن آئے گا، جو حصار توڑتا ہوا نکل جائے گا۔ یہ پہلے سے مرتب شدہ کچھ اعمال ہیں اور ذہن اس کے لیے پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ جب آدمی ارتکاز میں جاتا ہے، تو وہ ایسی چیزیں خود تخلیق کرنی شروع کر دیتا ہے۔ چالیس دن کا چلہ ہے، تو دس دن کے بعد میں سوچتا ہوں کہ سانپ میرے حصار سے نکلے گا۔ یہ جو حصار ہے، یہ انٹلکچوئل حصار ہے۔ اگر مجھے حصار کی لائن پر اعتماد ہے، تو سانپ اندر نہیں گھسے گا۔ اگر دو یقین اکٹھے پیدا ہوں، ایک مثبت اور ایک منفی، تو مثبت میں استاد یہ کہہ رہا ہے کہ اس حصار کے اندر سانپ، جن یا بھوت وغیرہ تب تک نہیں آئے گا، جب تک تو عمل کر رہا ہے۔ اگر تھوڑا سا غور کریں، تو آپ کو اس تمام حقیقت کا علم ہو جائے گا۔ استاد یہ جو لائن کھینچ رہا ہے یا وہ اپنے لیے حصار کھینچ رہا ہے وہ اس کی Positive intellect ہے کہ اگر میں اس دائرے میں

Marfat.com

رہا، تو میں محفوظ ہوں اور باہر میرے لیے آسیب ہیں۔ اگر اس کا عقیدہ کمزور ہو گیا، تو جونہی وہ آدمی حصار سے آگے گذرے گا، پاگل ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنے ہی عقیدے میں اعتماد کھو بیٹھا ہے اور اپنے تمام وجود کی نفی کر گیا، اس چیز کے لیے جو اس نے خود ہی تخلیق کی۔

یہ سارے کے سارے کام فضول ہیں۔ اتنی ساری زندگی ہو گئی ہے، بطور کریڈٹ کے نہیں بتا رہا کہ اتوار کو جو لوگ آتے ہیں، وہ مجھے اپنے بارے میں ایسی کرامات سناتے ہیں جو ان کے ساتھ ہوئیں۔ میرے خیال میں خداوند کریم کی طرف رجوع کرنے ہی میں نجات ہے۔ اس کے علاوہ زندگی میں مجھے کوئی حقیقت نظر نہیں آتی۔ نہ مجھے امریکہ نظر آتا ہے نہ برطانیہ۔ مجھے صرف ایک بات کا پتہ ہے کہ جس نے اخلاص سے اللہ کی طرف رجوع کیا، اس کی ساری زندگی معجزاتی ہو جاتی ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے اور ان تمام کے ساتھ بھی، جو حقیقی طور پر خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

بعض لوگ خدا پر شرطیں رکھتے ہیں۔ چار دن کی تسبیح کے بعد پلٹ کے آئیں گے، کہیں گے، وہ تو نہیں ہوا۔ بھئی نہیں ہوا، تو میں کرنے والا تو نہیں ہوں۔ پڑھتے رہو۔ کچھ لوگ آئیں گے کہ جی پندرہ دن پڑھتا رہا، نہیں ہوا، میں نے چھوڑ دیا۔ اس قسم کے احمقوں کا، جو پہلے سے توقعات لے کر آ جاتے ہیں کہ معجزہ رونما نہیں ہوا میرے پاس علاج ہے نہ اللہ کے پاس وقت ہے۔ معجزے ہوتے ہیں، لیکن معجزے ہونے کی ہر وقت توقع رکھنا غلط ہے۔ میں سب لوگوں کو کہتا ہوں کہ جہاں تک امن وسکون کا تعلق ہے، وہ تمہیں اللہ ضرور دے گا۔ جہاں تک معاملات کی درستگی ہے، یہ بھنچی ہوئی دنیا ہے۔ ذہنی کائنات وسیع ہے۔ جب اس کا خلل دور ہو گا، تو امن آ جائے گا مگر دنیاوی معاملات بھنچے ہوئے معاملات ہیں۔ یہ ایک ایک پل آپ کا دیکھا بھالا ہے۔ اس میں تبدیلی اسباب کے توسط سے ہے۔ یہ ایک کھلی کائنات ہے، جس میں تغیر اپنے وقت پر ہی آتا ہے۔ اسباب بنیں گے، تو تغیر آئے گا اس لیے باہر ذرا حرکت آہستہ ہوتی ہے۔ ہمیں بھی آپ دیکھیں دس پندرہ ارب سال کی زندگی ساٹھ سال میں گذاری ہے۔ پچھلا ریکارڈ تیس ارب سال کی زندگی کا ہے۔ اب اسے ہم ساٹھ سالوں میں گذارتے ہیں۔ تصور کریں کہ کس قدر دباؤ کا شکار زندگی ہے۔ اس میں تبدیلی آسانی سے نہیں آتی۔ آتی ہے، لیکن آہستہ اور بتدریج لوگ مصائب سے نکلتے ہیں، لیکن جو توقعات ہیں، وہ پوری نہیں ہوتیں۔

مراقبہ کا مقام

مراقبہ (Meditation) تصوف کے پورے تصور میں کوئی وجود نہیں رکھتا۔ مراقبہ سوچ کے عمل کے ساتھ ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ اندھوں اور بہروں کی طرح ایک جگہ بیٹھ جائیں اور ایک خیال پر اپنی توجہ مرکوز کر دیں، جب خیال کا ارتکاز ہوتا ہے تو آپ کا Inner-self خود اپنے آپ کو محدود کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس الہیات میں بے حد وسیع مطالعہ سے ذہن کو اس اعتدال کی کیفیت پر لانا ہوتا ہے کہ جس سے اسے ازخود کسی منفی خیال کی اکساہٹ نہ ہو۔ قرآن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کہتا ہے فالھمھا فجورھا و تقوٰیھا ہم نے انسان کے ذہن پر فسق وفجور اور تقویٰ الہام کیے۔

تو سب سے بڑا مراقبہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم آہستہ آہستہ وہ انسٹرومنٹ پیدا کریں، جن سے فسق وفجور کا خاتمہ ہو اور الہام باقی رہ جائے۔ پھر فسق وفجور کو قطع کرتے ہوئے بھی ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم کہیں تقویٰ کے فریب میں نہ آ

جائیں۔ نیکیوں کی الجھنوں میں نہ پڑیں۔ یہ مکمل اعتدال کی جدوجہد ہے۔ مراقبہ شاید اس میں آپ کی جزوقتی کچھ مدد کر جائے، لیکن بالآخر یہ ایک خطرناک چیز ہے۔ آخر میں اس کا فائدہ نہیں، نقصان ہے۔ بلکہ جو لوگ بھی مراقبے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ فریب نظر پر جا کر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ مراقبے کا کیا مطلب اور مقصد تھا، جس کی وہ جستجو کرتے رہے ہیں۔ شیخ ہجویری نے بڑے قول فیصل میں مراقبہ کے بارے میں فرمایا کہ تو چلتے پھرتے اللہ ہی کے بارے میں سوچ اور اسی کی تفریق اور تقسیم میں رہے۔

تصورِ شیخ کی حیثیت

ایک آدمی کہتا ہے کہ پہلے تصور شیخ ہے۔ اس کے بعد تصور رسول اللہ ہے۔ اس کے بعد تصور الہٰ ہے۔ میرے خیال میں ان سلسلے والوں نے جان بوجھ کر لفظوں کو کنفیوژ کیا ہے۔ Misnomer پیدا کیے اور فراڈ کیے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ تصور شیخ سے قطعاً یہ مراد نہیں تھا کہ آپ شیخ کی تصویر لے کر اس پر بوجھ ڈالتے پھریں یا اس کو نظروں میں لا کر اس کے چکروں میں پڑ جائیں۔ گویا تصور شیخ نہ ہوا، کسی نادیدہ محبوب کا تصور ہو گیا۔ یہ ایسے ہی ہے، جس طرح بندہ کسی عورت کے ساتھ جسمانی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس میں ارتکاز کبھی ٹوٹتا نہیں ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک تصور شیخ سے مراد ممکن ہے، ہم آہنگی شیخ ہو۔ جیسے کسی کو اپنا شیخ بہت پسند ہے تو وہ اپنی عادات و خصائل میں اس کے قریب تر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے، عادات و فضائل کی ہم آہنگی اس کے لباس اور اس کے انداز کی ہم آہنگی بھی ہو جائے۔ ہاتھ اٹھائیں گے، تو اس طرح جیسے شیخ اٹھاتا ہے، انداز ہیں، تو ویسے ہی، جیسے ان کے شیخ نے اپنا رکھے ہیں۔ تو کسی اور شخص کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کو ہم تصور شیخ کہتے ہیں۔

ایک طرح فرض کریں، ایک شخص قرآن و حدیث میں ڈوبا ہوا ہے۔ رسول اللہؐ کے انداز میں سوچ رہا ہے۔ ان کو ان کے اسوہ اور عادات و خصائل سے اتنا انس ہو گیا ہے کہ وہ کوشش کرتا ہے، اس کی تمام عادات رسول اللہ کی طرح ہو جائیں۔ وہ بہت کوشش کر رہا ہے کہ اپنے انداز، فکر اور سوچ میں پیغمبر کے ساتھ ہم آہنگی حاصل کر لے۔ اسے ہم فنا فی الرسول کہیں گے۔

اس سے آگے اللہ کی ذات آتی ہے۔ رسولؐ اور اللہ کی ذات میں تفریق آسان نہیں ہوتی۔ رسول وہی کچھ کرتے ہیں، جو اللہ چاہتا ہے۔ وہ قرآن کے حامل ہیں۔ جو فنا فی الرسول ہو گا، وہ بالآخر فنا فی اللہ ضرور ہو جائے گا۔ اللہ کی عادات کو اپنانا فنا فی اللہ، رسول اللہ کی عادات و خصائل میں ڈھلنا فنا فی الرسول اور استاد کی عادات کو اپنانا فنا فی الشیخ ہے۔ اس سے ہٹ کر ذہن میں تصویریں آپ میں اندرونی طور پر بندگی کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ غیر اللہ کے تصور کے حوالے سے ان کے پاس فضول دلائل ہیں۔ وہ پر پیچ رستوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ادھر سے ہوتے ہوئے ہم وہاں پہنچیں گے اور وہاں سے ادھر جا نکلیں گے۔ سوال ہے کہ اگر نہ پہنچو تو؟ تو کیا آپ ایک وقت کی بت پرستی میں ہمہ تن مصروف رہیں گے۔

مراقبہ شیخ جو لوگ کرواتے ہیں، وہ بہت چالاک لوگ ہوتے ہیں۔ وہ مکمل تسلط چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ

Marfat.com

پیروکاروں میں مکمل سپردگی پیدا کر دیں۔ ایک ایسی ذہنی صورتحال میں ملوث کر سکیں، جس میں ان کے لیے کوئی دوسرا رستہ کھلا نہ رہے۔ یہ اپنے اپنے آرڈر اور ڈسپلن کھڑے کرتے ہیں اور اس چیز سے خوفزدہ ہیں کہ کھلی اور صاف ستھری عقل انہیں کسی دن بھی تبدیل کر دے گی۔ مثال کے طور پر ہری پور میں بہت سے سلسلہ عظیمیہ کے لوگ تھے۔ الحمدللہ انہیں جوں ہی عقل اور فراست کی روشنی ملی، وہ سب تبدیل ہو گئے ہیں۔ مجھے اس بات کا کوئی ڈر نہیں کہ کل میرا کوئی دوست اٹھ کر کہیں اور چلا جائے اور وہ تبدیل ہو جائے۔ بیشک ہو جائے، اس کو بہتر چیز ل گئی ہے اور وہ تبدیل ہو رہا ہے، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

مگر جن لوگوں نے آرڈر، سکول اور آئیڈیاز کے جنگل اگا رکھے ہیں، ان سے کوئی بچ کر نہیں نکلتا۔ یہ چھوٹے چھوٹے ذہنوں کو محکوم کرنے کی سازشیں ہوتی ہیں، ان کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خدا کی بندگی میں حائل ہو سکتی ہیں، ان کی طرف راغب نہیں کر سکتیں۔

فورسز بی یانڈ کی تسخیر

تسبیحات کے مقابلے میں وظائف کی دنیا میں چاہے مقصد نیک ہو، اس میں جگہ، وقت، پوسچر وغیرہ اتنے خطرناک نہیں ہوتے۔ مگر جہاں بھی ارتکاز توجہ کی مشقیں آئیں گی اور انسان اپنے اندر سے تمام شکوک وشبہات اور وساوس نکالنے کی کوشش کرے گا، وہ زیادہ طاقتور ہو کر ان کے سامنے آئیں گے۔ بہت سارے لوگ وظائف میں دیوانے ہو گئے۔ ڈر کے نکلے یا ان کی صحت پر ان کے منفی اثرات پڑے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں، جو اپنے اعصاب کھو بیٹھے۔ کیونکہ ارتکاز توجہ میں باہر سے ایک جھٹکا لگ جائے تو وہ ڈیمج ہو جاتے ہیں۔

تسبیح اور وظائف میں بڑا فرق ہے، فاذ کر اللہ قیاماً و قعود او علی جنوبھم کھڑے بیٹھے کروٹوں کے بل اللہ کو یاد کرو۔ کوئی پوسچر ہے، رولز نہ کوئی ریگولیشن ہیں۔ ہر حال میں، ہر موسم اور ہر رنگ میں کر سکتے ہو۔ یہ ایک فری اور قلبی یاد بن جاتی ہے۔ جب کہ وظائف کے طور طریقوں میں قید ہو کر لوگ اپنا مقصد کھو بیٹھتے ہیں۔

Marfat.com

اسمائے حسنہ کا موضوع

اس دور میں ہم تسبیح کرتے ہیں، درود نہیں پڑھتے۔ یہ ایک الگ قصہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ آپ جو کام بھی شروع کرتے ہیں، اس کے پیچھے ہلکی ہلکی ارتکاز پیدا ہوتی اور ترویج پاتی ہے اور ہر کلمے کے پیچھے ایک Reactive Negative Reaction ہوتا ہے۔ اگر آپ اس میں سلام پڑھو گے، تو آپ کو آزمانے کے لیے کہ سلام کا کیا فائدہ ہے، اللہ آپ کی بے چینیاں بڑھا دے گا۔ اصولاً کچھ عرصے کے لیے آپ کو پتہ تو چلے کہ سلام کا فائدہ کیا ہوا۔ اگر وہ کلمہ آزمایا ہی نہیں گیا تو کیا فائدہ۔ گاڑی کتنی بھی اچھی ہو، بریکیں تو بار بار لگا کر دیکھنا پڑے گا کہ واقعی جتنے دعوے کیے جا رہے ہیں کیا وہ درست ہیں۔ یہ جو اللہ کہہ رہا ہے کہ سلامتی اس میں ہے، آخر کچھ آزمایا جائے گا۔ آپ محسوس کریں گے کہ پہلی بے چینیوں میں میرا اضطراب اس طرح کا تھا۔ اب بھی بے چینی موسم کی طرح آتی ہے اور خزاں اور بہار کی طرح گذر جاتی ہے، لیکن میں نہیں بدلتا۔ جب آپ تسبیحات شروع کرتے ہیں، تو آپ کی بڑھی ہوئی بے چینیاں کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ جب درود پڑھا جاتا ہے، تو ہر منفی کیفیت علیحدہ علیحدہ رجسٹر ہوتی ہے۔

بہت سارے لوگ مرتکز ہو جاتے ہیں۔ اکثر جعلی حکماء اور جعلی پیروں کی وجہ سے تسبیح کو طور طریقوں میں قید کر لیتے ہیں۔ اس معاملے میں قدرت اللہ شہاب جیسے لوگوں سے غلطیاں ہوئی ہیں...... کہ ایک جگہ چن لو، وہاں سجدے کرو، تسبیح کرو۔ مچھلی کے پیٹ میں کون سی مخصوص جگہ تھی کہ حضرت یونس تسبیح کر رہے تھے؟ شجر و حجر میں کون سی جگہ ملتی ہے؟ زمین و آسمان میں تسبیح کے لیے وقت اور مقام کا تعین کیسے اور کیونکر ممکن ہے؟ اس طرح تو تسبیح ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے کہ ہر وقت کی یاد کہاں ممکن ہے۔ وہ پرندے کہ فضاؤں میں پر کھولتے ہیں، تسبیح خداوند بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی عمومی سرگرمی میں ایسا کرتے ہیں۔ پھر وہ پتھر، جن کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ انسانوں سے کم سنگ والے ہیں۔ خوف خدا سے کانپتے ہیں اور ان سے چشمے پھوٹتے ہیں۔ خدا نے کیا شاعرانہ خوبصورت بات کہی ہے کہ جو پتھروں سے پھوٹتا پانی ہے، گویا خشیت الٰہی کے آنسو ہیں۔ اگرچہ اللہ شاعر تو نہیں، پھر بھی مجازی شاعری کا انداز ملاحظہ کیجیے۔ تخلیق شعر تو اسی کے بس میں ہے۔

Marfat.com

قرآن حکیم میں بڑی وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ آپ چلتے پھرتے فاذکرو اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم، میرا ذکر کرو کھڑے، بیٹھے، پہلو کے بل لیٹے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ حضور گرامی مرتبتؐ سے حدیث بخاری اور مسلم میں موجود ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے باب جنابت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا رسول اللہؐ اس عالم میں ذکر کیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا، وہ ہر حال میں خدا کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔

عورتیں مجھ سے پوچھتی ہیں کہ ہم "مخصوص دنوں" میں تسبیح کرلیا کریں؟ میں نے کہا، نہ کیا کرو۔ بشرطیکہ تم اگر اللہ کا نام سرے سے لیتی ہی نہیں۔ اگر ان پانچ سات دنوں میں اللہ کا نام نہیں لیتیں، تو نہ کیا کرو، مگر دن میں دس مرتبہ تو تم اللہ کی قسم اٹھا رہی ہوتی ہو۔ جھوٹ بولنے کے لیے اللہ کا نام لے رہی ہوتی ہو، تو اللہ سے بڑھ کر متبرک کیا نام ہوسکتا ہے۔ تسبیح کے لیے اللہ نے کوئی قید نہیں رکھی۔ آپ جس حال میں جہاں کہیں بھی ہوں، تسبیح بیان کیجیے، صبح، دوپہر، شام، چلتے پھرتے، بیٹھے، پہلو کے بل لیٹے...... اور یہ میں آپ کو بتادوں کہ وہ پیر اور فقیر جو لوگوں پر تسبیح کے رکھ رکھاؤ مسلط کرتے ہیں، وہ دراصل خدا سے دشمنی کررہے ہوتے ہیں، دوستی نہیں۔

جہاں تک پیچھے دیوار پر لٹکے ان اسمائے حسنہ کا تعلق ہے، تو لوگوں میں ایک علم چلتا ہے، جسے جفر کبیر کہتے ہیں۔ ایک جفر نارمل ہے۔ کچھ لوگ جفر کبیر میں اللہ کے تمام اسما کو لکھتے ہیں۔ وہ لکھنے کے ساتھ دوبارہ شروع کر دیتے ہیں۔ لکھتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ یہ کراچی کے ایک صاحب ہیں، جو میرے پاس آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک کام کرتا ہوں، اسمائے الٰہیہ لکھتا ہوں، پھر وہ بہت سے اس قسم کے لکھے ہوئے کاغذ مجھے دے گئے۔ جب کبھی وہ آتے پندرہ بیس کاغذ لے آتے، وہ ان کا شوق تھا۔ میرا شوق تھا کہ میں ان کو آگے بانٹ دیتا تھا۔ یہ آخری رہ گیا ہے، جو ادھر لگا ہوا ہے۔ ایک صاحب راولپنڈی میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں انہوں نے جفر کبیر میں بہت مرتبہ اسمائے الٰہیہ لکھے ہیں۔ ان کو یہ مشکل پیش آتی کہ ان کے خیال میں جفر کبیر میں خاص قسم کے فائدے ہیں، جو بعد میں کبھی انہیں ملیں گے۔ ایسا کوئی ان کو فائدہ ہوا نہیں۔

متعین اسمائے حسنہ ہی کیوں

ایک وجہ یہ ہے کہ زمانے کا ایک کی نوٹ (Key note) ہوتا ہے۔ اس زمانے کا کی نوٹ ڈر اور ذہنی انتشار ہے۔ ہسپتال بھرے پڑے ہیں۔ دوائیاں بازاروں میں موجود ہیں، لوگ اچھے نہیں ہیں۔ مزید بیمار ہوتے جاتے ہیں۔ گزشتہ تیس برس کے دوران بیماری میں ایک اور پہلو کا اضافہ ہوا ہے اور اس کا تعلق ان کی جسمانی بیماری سے نہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس پہلو میں ایک بڑی تیز رفتاری آئی ہے۔ مثلاً میں اب لاہور جاتا ہوں تو کہتا ہوں کہ صبح دس بجے چلیں گے۔ اس طرح ٹائم آگے چلا گیا ہے۔ وہ صبح چار چھ بجے جاگنے والی مخلوق ناپید ہوگئی ہے۔ اس طرح زمانے میں ایک اضافی عنصر تیز رفتار رومانویت ہے۔ پوری زندگی کی جدوجہد میں ایک تیز تر رومانویت آگئی ہے ہر چیز اور ہر اپج میں عجلت آگئی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تصوف میں سنجیدگی اور متانت کم ہوگئی ہے۔ اب آپ جدھر بھی تصوف میں جائیں، آپ کو ایک دم لگے گا کہ لوگ جذب و مستی کو پسند کرتے ہیں، کیونکہ صبر نہیں ہے۔ بے صبری میں انسان مضطرب اور بے چین ہے۔

تصوف میں متانت کیا ہوتی ہے؟ سیدنا عبدالقادر جیلانی جامعہ بغداد میں درس دے رہے تھے۔ چھت سے

سانپ ان کی گردن پر آ کے گرا۔ سارے لوگ وہاں سے اٹھ کر بھاگے۔ شیخ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ سانپ گردن سے اترا، پاؤں میں آیا۔ پاؤں سے نیچے چلا گیا۔ جب وہ نیچے اتر گیا اور لوگوں نے دیکھا کہ شیخ پر تو کوئی اثر نہیں ہوا، تو سانپ نے پلٹا ڈ کھایا اور آواز دی۔ اے عبدالقادر! میں نے مقام تمکنت میں بڑے اولیا کو آزمایا۔ کچھ ظاہراً مطمئن تھے، لیکن تیرے سوا کوئی ایسا نہ تھا، جس کا باطن متغیر نہ ہوا ہو۔ شیخ نے جواب میں کہا، اے بدبخت، تو قضا و قدر کے ہاتھوں میں ایک کیڑا ہی تو ہے، تجھ سے کیا ڈرنا۔

ہم شیخ عبدالقادر جیلانی کو اس حوالے سے زیادہ نہیں جانتے۔ ہم ان کی کرامات کے توسط سے انہیں جانتے ہیں۔ مگر وہ علم میں اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ آج کے دنوں میں اس کے باوجود کہ میں مذہب اور معلم کے اعتبار سے بہترین علم کا حامل ہوں، ان کے مقام متانت کو دیکھتا ہوں تو اپنے آپ کو کہیں کا نہیں پاتا۔ ہم اس بحران سے گذرے ہی نہیں ہیں۔ ہم بقا کے شدید سٹینس سے نہیں گذرتے۔ اتنے اطمینان سے آگے نہیں بڑھتے۔ تصوف ایک ذہنی حالت سے دوسری ذہنی حالت کو جاننے کو کہتے ہیں۔ ہماری ذہنی حالت موجودہ دور میں اختیار، دولت اور حیثیت سے آگے نہیں نکل رہی۔ خدا تک کون پہنچے گا۔ خدا تک جائیں گے تب ہی سارے کے سارے یہ نچلے پیٹرن ختم ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ میں تسبیحات میں خاص طور پر خدا کے وہ نام شامل کرتا ہوں، جیسے سلام اور مومن ہیں۔ اس میں سلام واحد اسم ہے، جو مکمل ہیجان کو توڑتا ہے۔ ذہن میں بے چینی آگ کی طرح ہے۔ جیسے باہر آگ لگی ہوئی ہو، اسی طرح آپ کے ذہن میں بے چینی بھڑک رہی ہے۔ حتیٰ کہ جب نارِ نمرود کے شعلے بلند ہو رہے تھے، تو اللہ نے آواز دی کہ اے آگ ٹھنڈی ہو جا۔ اپنی فطرت چھوڑ دے، تو اس میں بھی اسم سلام ہے۔ اسم سلام سے بندے کی فطرت بے چینی پر اثر پڑتا ہے اور وہ اس کی فطرت کو تبدیل کر دیتا ہے۔ خدا کے سوا کوئی فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔

حدیث مبارک ہے کہ اگر کوئی یہ کہے، احد سونے میں بدل گیا ہے تو مان لینا، لیکن کوئی یہ کہے کہ فلاں شخص کی فطرت بدل گئی ہے تو یہ نہ ماننا۔ اس کے لیے آج کے دنوں میں مختلف طریقوں سے مقامی اثرات کو بیلنس کیا جاتا ہے۔ پڑھائی لکھائی سے کلچر ٹھیک کر لیا جاتا ہے۔ کچھ عادات ظاہرہ بدل لی جاتی ہیں۔ مگر ہم اپنی جینیات کو تبدیل نہیں کرتے۔ نہ ان کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کروموسوم کی خاصیت تبدیل ہوتی ہے اور یہ کام صرف اللہ کی یاد کر سکتی ہے۔ شب قدر کا بھی بنیادی رول سلام ہے۔ سلم ھی حتی مطلع الفجر۔ اس دن ملائکہ عالیہ اسم سلام کے سائے تلے اترتے ہیں اور یہ رات فیصلے کی رات ہے۔ جس بندے میں ذرا سا بھی خلوص پایا جاتا ہے، جبرئیل امین اسے مس کرتے ہیں۔ اس کی صلاحیت بڑھا دیتے ہیں اور اس کے اثرات اس کے بدن پر ظاہر ہوتے ہیں۔ بدن میں مقناطیسی بیج پیدا ہوتا ہے، جو آپ کی آئندہ زندگی کو بہتری کی طرف لے جاتا ہے۔

مومن اور مہیمن حفاظت قلب کے لیے ہیں۔ دل جو اضطراب کی آماجگاہ ہے۔ جو کبھی بھی عقل کی کم ہی سنتا ہے، اس کے اپنے اندر کی سپیس ہے۔ دل سپیس پر قائم ہوتا ہے۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں کسی کو چھوٹے اور کسی کو بڑے دل والا کہتے ہیں۔ دل کی سپیس کشادہ نہیں ہوتی، جب تک آپ کے اوپر مشقتیں نہ آئیں۔ جیسے کوئی شخص پہلے دن بیمار ہوا، تو اس کا ردعمل کچھ اور تھا۔ اس کا واویلا تھا، میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھے جلدی نجات ہو۔ تین سال بعد بھی

Marfat.com

وہ اسی بیماری میں ہوتا ہے اور اسے برداشت کر رہا ہوتا ہے۔ شور اسی طرح مچا رہا ہوتا ہے کہ اس کی سپیس ہی نہیں بنی۔ اس کا صبر اس قابل نہیں ہوا کہ وہ احساسی طور پر اس سٹیج کو حاصل کر سکے، جہاں وہ اپنے درد اور المیے سے آگے جا سکتا۔

اللہ کا یہ ارشاد بجا ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ کہ ہم کسی جان پر اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔ جس انسان کو جو مسئلہ بھی ہو، اس کی برداشت کرنے کی صلاحیت اس کے پاس ہے، لیکن بالعموم لوگ اسے بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ پھر اللہ نے کہا الا بذکر اللہ تطمئن القلوب. تم ہر چیز میں مال، خواہشات اور سٹیٹس پا سکتے ہو، مگر دل کا اطمینان نہیں پا سکتے۔ یہ میرے ذکر اور میری یاد کے بغیر ممکن نہیں۔ دل کا ذکر اس کی حفاظت ہے۔ اسم مومن اور مھیمن کے دونوں الفاظ حفاظت قلب کے لیے ہیں۔

تیسرا کلمہ یا رحمٰن یا رحیم یا کریم ہے۔ بنیادی طور پر میں بڑا خود غرض سا بندہ ہوں۔ اگر مجھ سے خدا نے کوئی وعدہ کیا ہے تو میں اسے بار بار یاد کراؤں گا۔ میری دانشمندی یہ ہے کہ میں اپنا بال خدا کی کورٹ میں پھینک دوں، نہ کہ اس کا بال میری کورٹ میں ہو۔ میرا فرض تھا اللہ کو دیکھنا، سمجھنا اس کو یاد کرنا اور وہ میں کر رہا ہوں۔ اب میں اللہ سے کہتا ہوں کہ اب آپ اپنا وعدہ پورا کرو۔ اس کا وعدہ بڑا صاف ستھرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے تمہیں پیدا کرنے سے پہلے ہی ایک چیز اپنے اوپر لازم کی تھی کتب علیٰ نفسہ رحمہ. میں نے قرآن حکیم میں یہ معاہدہ لکھ کے دیا کہ اے حضرت انسان! میں ہر حال میں تم پر رحم کروں گا۔ اب اگر اس نے مجھے لکھ کر دیا ہوا ہے، تو میں تو اسے روز یاد کراتا رہوں گا اور کہوں گا کہ اے اللہ آپ نے تو یہ لکھ کے دیا ہوا ہے There is no way out, you have to be very very kind چنانچہ تسبیحات میں یا رحمٰن یا رحیم یا کریم کے اسما معاہدے کے الفاظ ہیں۔

تیسری تسبیح ہر فرد کی انفرادیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ کسی کے لیے یا ذوالجلل ولاکرام تو کسی کو یا ولی یا نصیر دیا جاتا ہے۔ یہ ہر فرد کی نیچر میں فرق کے اعتبار سے ہے۔ وہ انفرادی ٹیلنٹ، جو میرے خیال میں زیادہ مضبوط ہو کے رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے، کسی شرارت کو افزا کرتا ہے یا کسی کمال کو بڑھا رہا ہے، تو تیسری تسبیح انفرادی اور اسی پہلو سے متعلق ہوتی ہے۔

یکساں نام، نشاندہی کیونکر

دنیا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم سب ایک ہی کیمسٹری رکھتے ہیں۔ مرد ہو یا عورت، ہم سب کی کیمسٹری ایک ہے۔ اگر کوئی مجرم بن گیا ہے، تو میں اس سے نفرت نہیں کر سکتا۔ بس خوف کھاتا ہوں کہ اے پروردگار! میں بالکل اس جیسا ہی تھا۔ پھر اس کو راہ راست سے بھٹکنا پڑ گیا اور میں نے کون سا ایسا کمال کیا تھا کہ میں بہتری کو آ گیا۔ سو کسی بھی دوسرے بندے سے ہم غیریت نہیں برت سکتے۔ اجنبیت کا کوئی ایسا کام صوفی کے پاس نہیں ہوتا، نہ کسی قسم کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی برتری کا تصور کسی صوفی کے پاس ہوتا ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنے کی ہے میں بطور استاد یہ جانتا ہوں کہ میری اور اس کی ترکیب اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں۔ اس کے کرم اور نوازش سے میں اس طرف آ گیا، وہ اس طرف چلا گیا۔ جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی نے مروت کی تعریف میں فرمایا کہ تو پہلے خدا کا شکر کر کے اس طرف آ اور پھر اس کے لیے

Marfat.com

دعا کر کہ وہ بھی اس طرف آئے۔ یہ ہمارے تئیں مروت ہے۔

نام ایک جیسے ہو کے بھی علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں۔ صرف چودہ بنیادی اقسام ہیں جو اسمائے الٰہیہ میں آتی ہیں، جن کو آپ حروف مقطعات کہتے ہیں۔ وہی گروپس ہیں۔ ان کے علاوہ زمین پر کوئی پندرہواں بندہ، کوئی پندرہویں شے نہیں ہے۔ اب ان کے مزید جوڑ ہیں۔ جیسے 16+16 = 32 شطرنج کے مہرے ہوں گے۔ چالیس بلین میں جاتی ہیں۔ اسی طرح بنیادی انسانی اقسام یکساں ہیں۔ جب یہ آپس میں ملتی ہیں تو یہ بکھرتے اور پھیلتے ہیں اور اپنی شکلیں تبدیل کرتے ہیں۔ پھر سارے انسان صرف تین قسم کے ہیں۔ ہم بلیو آنکھوں والے اور وہ جو گھنگھریالے بالوں والے حبشی ہیں، چوتھا کوئی بندہ نہیں ہے۔ جتنا آپ پیچھے جائیں گے، اشیاء کی اصل سادہ ہوتی جائے گی۔ البتہ اگر مجھے مزید کوالیفکیشن طلب کرنی ہو تو میں جینیات میں چلا جاؤں گا۔ کسی سے ماں یا باپ کا نام پوچھ لوں گا۔ جیسے اس خاتون کا کہنا تھا، وہ ایسی نہیں ہیں۔ اگر میرے پاس اپنی ججمنٹ نہ ہو، تو لوگ مجھ سے جھوٹ بولیں گے۔

انسان بنیادی طور پر اپنی ذات کے ساتھ رحم کھانے والا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے آپ کو اس خطا کے لیے خود کو موردالزام نہیں ٹھہراتا، جو وہ کرتا چلا آیا ہے اس لیے ہم دوسروں کے ورژن پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ اس کا مقصد دوسروں کو متاثر یا کنفیوژ کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی مدد کرنا ہے کہ یہ بنیادی نقص ہے اور اس کے لیے یہ علاج ہے۔ بالفرض ایک آدمی خدا واسطے میرے پاس آتا ہے۔ اس کا اپنے بارے میں گمان ہے کہ میں بہتر ہوں۔ تو میرا یہ حق نہیں بنتا کہ میں اس سے الجھوں اور اس سے بحث کروں۔ ہاں اگر کوئی فرد اکیڈیمک کے لیے آئے گا تو پھر ہم اس کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ میرے پاس دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے بوسنیائی، سعودی اور ایک سوڈانی آیا ہوا تھا۔ ان کے مسائل تھے۔ ان سے مسائل اور فقہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اگر لوگ اس کے لیے آئیں گے، تو میرے پاس اس کی اتھارٹی ہے۔

بندگی میں صوفی اور ٹیچر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ پوسٹ گریجویٹ ٹیچر ہیں اور آپ گیارہویں یا بارہویں کی سطح کی کلاس پڑھا رہے ہیں تو آپ واضح طور پر کہہ سکتے ہیں کہ لڑکے تم غلط ہو، میں ٹھیک ہوں۔ یہ ہماری معلومات اور ہمارے پس منظر پر ہے کہ جو کچھ میں نے اور اس نے حاصل کیا ہوا ہے اس میں ابھی اس نے مجھے کراس نہیں کیا۔ کہ وہ کہے، میں آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ وہ اسی لٹریچر کے فریم ورک میں مجھ سے پوچھ رہا ہے یا بتا رہا ہے، جو کہ میں بطور ٹیچر اسے کہہ سکتا ہوں کہ تم غلط ہو۔ یہ تکبرات میں نہیں آتا۔ ٹیچر جب اپنے کسی شاگرد کو بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ غلط ہے، تو وہ متکبر نہیں ہوتا۔ مگر جب صوفی کسی کو غلط کہے گا کیونکہ صوفی نام ہی اس بات کا ہے کہ دوسرا بندہ خطا کار ہے، تو پھر اس کا تکرار اس سے بڑی خطا کاری کرتا ہے۔ جتنا خدا سے خدا کے قریبی لوگ ڈرتے ہیں، دور کے لوگ نہیں ڈرتے۔

اسم اعظم کی حقیقت

اس میں خدا کے حوالے ہیں۔ اس کا مطلب ہے وہ اسمائے الٰہیہ جو باقی اسمائے الٰہیہ کی تقسیم بندی کرتے ہیں۔ فرض کیجیے، ہم صفات الٰہیہ کو مختصر کرتے جائیں تو ہم نے دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ اسما کون سے ہیں جو دوسرے تمام اسما کی اقسام کو کنٹرول کرتے ہیں۔ جب حضور گرامی مرتبت ﷺ سے اسم اعظم کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: اسے سورہ بقرہ

Marfat.com

اورسورہ طہٰ میں ڈھونڈو۔سورہ بقرہ میں دو ہیں اورسورہ طہٰ میں ایک ہے۔سورہ بقرہ میں ایک،الھکم الہ واحد، لا الہ الا ھو الرحمٰن الرحیم اوردوسرا ہے، اللہ لا الہ الا ہو،الحی القیوم۔تو یہ دونوں اسمائے اعظم ہیں۔سورہ طہٰ میں دیکھیں ایک نظرآتا ہے۔ و عنت الوجوہ للحی القیوم یہ بات طے ہے کہ حی اور قیوم اسمائے اعظم ہیں۔مگر دیکھنا یہ ہے کہ جو پہلے اسما ہیں،آیا وہ بھی ہیں کہ نہیں۔چنانچہ بنیادی چار سب سے بڑے اسما رحمٰن، رحیم، حی اور قیوم ہیں۔ان کے فنکشن دیکھئے،تو آپ کو بالکل وضاحت ہوجائے گی۔

ایک کام اللہ کا تخلیق اورایک سپروژن ہے۔تخلیق کرنے کے بعدانتظامی فیکلٹی استعمال کرنااور ہےاورتخلیق کوجنم دینااوران کے سائنسی قوانین بنانااورضوابط رکھنااورکام ہے۔ان اسمائے الہیہ کوامور ثمانیہ کہتے ہیں۔آٹھ آٹھ پاورز دونوں اسما کی ہیں۔متذکرہ دونوں اسمائے اعظم ہیں،لیکن ان کے فنکشن جداجدا ہیں۔ الھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرحمٰن الرحیم۔ یہ اسم اعظم ہے۔آگے خداوضاحت کرتا ہے۔ ان فی خلق السمٰوٰت والارض و اختلاف الیل و النھار۔ اب دیکھئے، یہ شب و روز کے اختلاف سارے سائنسی قوانین ہیں۔والفلک التی تجری فی البحر اوریہ پانیوں پہ چلتی کشتیاں،و تصریف الریح والسحاب لمسخربین السمآء والارض۔ یہ جوہوائیں مسخر ہیں اور جو بادل پانیوں سے لدے ہیں،اوپرنہیں جاتے۔کشش ثقل سے نیچے ہی رہتے ہیں۔لایات القوم یوقنون اہل عقل وتدبر کے لیےان سب میں بڑی واضح نشانیاں ہیں۔ ان فی خلق السمٰوٰت والارض و اختلاف الیل و النھار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس و ما انزل اللہ من السمآء من ماء و احیابه الارض بعد موتھا وبث فیھا من کل دابۃ و تصریف الریح والسحاب المسخربین السمآء والارض لا یت لقوم یعقلون۔ یہ تمام سائنسی قوانین ہیں۔پیدائش،کشش ثقل اورتخلیق کے وہ قوانین،جن پراسم رول کرتا ہے۔ تمام تخلیقی مراحل کوجواسم رول کرتا ہے،وہ الھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرحمٰن الرحیم ہے۔

اب میں آپ کودوسرا سناتا ہوں کہ وہ تمام انتظامی صلاحیتیں کیا ہیں۔ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم لا تاخذہ سنۃ و لا نوم له ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض من ذالذی یشفع عندہ الا باذنه یعلم مابین ایدیھم و ما خلفھم و لا یحیطون بشی من علمه الی بما شآوسع کرسیه السمٰوٰت والارض ولا یودہ حفظھما و ھو العلی العظیم۔ اب عمومی بندوں کو،جنہیں اتنے سارے سائنٹفک علوم سے واسطہ نہیں ہے۔جو تدبرنہیں چاہتے،ان تمام کے لیے اسم اعظم یہ ہوا،اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم۔مگرجن لوگوں کوعلمی شوق اورتجسس ہےاوروہ دانشوری کے خبط میں پڑتے ہیں،وہ دوسرے علم کوچاہیں گے۔وہ تدبر،سائنٹیفک لاز اورسوچنے سمجھنے کوجائیں گے۔جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مجھے خداوندکریم نے سوچنے کی صلاحیت بخشی اوراپنی نوازش سے شوق تحسین بخشا ہے،تب سے میں دونوں اسما کی تسبیح کررہا ہوں۔

اسم اعظم کا تصرف

جیسے کمپیوٹر کے بہت سارے کوڈز اوراس کے بے پناہ ادارے ہیں اوران اداروں کو بہت سارے کوڈز کور

Marfat.com

کرتے ہیں۔ آپ جتنی مرضی کوشش کر لیں، اگر کوڈ صحیح نہیں ہے تو اس تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر صحیح ہو، تو اس تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ اب کسی کو یہ پتہ نہیں کہ کتنی بار پر رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی نے اسم اعظم کی تعریف کی کہ ایک مرتبہ کہنا بھی اسم اعظم ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ جب تو دل سے لفظ اللہ کہے، تو اس وقت تیرے دل میں اللہ کے سوا کوئی نہ ہو۔ ایک تو یہ اسم اعظم ہے۔

دوسرا آپ ایک اسم کی تلاوت شروع کرتے ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں ہوتا کہ اسم کس رینک پر پہنچ کر کوڈ بن جائے گا۔ فرض کیا، ایک شخص ایک کروڑ مرتبہ پڑھتا رہے اور کہے، میں نے بڑے اخلاص سے پڑھا، مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کو یہ نہ پتہ ہو کہ ایک کروڑ ایک مرتبہ پڑھنے سے کوڈ ہل سکتا ہے۔ حضرت سلیمان کے دربار میں ایک شخص آصف بن برخیہ موجود تھے۔ لوگ خدا کی کتاب کے بارے میں کتنے کنفیوژ ہیں۔ بے شمار لوگ صبح و شام قرآن پڑھتے ہیں، مگر ان میں آصف بن برخیہ کوئی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک جن نے کہا، اے شاہ والا! مجھے آپ اجازت دیں، میں تین چار ہزار میل دور سے تخت سبا آپ کی نشست برخواست ہونے سے پہلے لا دیتا ہوں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس شخص، جس کو کسب کا علم عطا ہوا تھا، نے کہا حضرت والا! مجھے اجازت دیں، میں پلک جھپکنے سے کم وقت میں یہ لا سکتا ہوں۔ اب بظاہر یہ بہت چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ آصف بن برخیہ کو اسم الٰہیہ میں اتنی کمان حاصل تھی کہ وہ اس کوڈ پر قادر تھا۔ کوڈ کرتی کیا تھی؟ Defusion اور Fusion۔ اس پر جواب آپ زور لگا رہے ہیں، وہاں حضرت آصف بن برخیہ نے اشارے کنائے سے ڈی فیوز کیا اور یہاں اسے دوبارہ یکجا کر دیا۔ سائنس، جسے بڑی مشکل سے پا سکتی ہے، خدا سے لگے ہوئے لوگوں کو اتنی آسانی سے ملتی ہے کہ ان کا اشارہ کنایہ بھی ڈی فیوژن اور فیوژن کا عمل کر دیتا ہے۔ آئن سٹائن نے جب پہلی مرتبہ کانسپٹ دیا تھا کہ تمام مادہ انرجی میں اور انرجی مادہ میں تبدیل ہو سکتی ہے تو اس کا Defusion چند سالوں میں ہی ممکن ہو گیا تھا، لیکن Fusion آج تک ممکن نہیں ہو سکا۔ قانون درست ہے۔ کہیں پچھلے چار پانچ سالوں میں ایک چھوٹے سے میٹریل کو انہوں نے Defuse کیا ہے۔ اب قانون عمل میں آ رہا ہے۔

دنیا صرف اس وقت تک ہے، جب تک قرآن انٹرپریٹ ہو رہا ہے، اس سے آگے دنیا نہیں جا سکتی۔ قرآن کے متشابہات اس وقت لوگوں کو سمجھ میں نہیں آتے۔ جیسے سلیمان نے چیونٹی سے خطاب کیا، آپ کا انٹلکچوئل اسے تسلیم نہیں کرتا۔ رب کعبہ کی قسم! Decoding سے جینیات تک پہنچیں گے اور ایک دن کہیں گے کہ ہاں ہم چیونٹیوں کی زبان سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن میں تخت کے پہنچنے کا ذکر ہے، تو آپ تخت کے پہنچنے کا اصول سیکھیں۔ وہاں تک پہنچ جائیں گے۔ متشابہات محکمات میں بدل جائیں گی۔ آپ کم از کم اس کی دلیل رکھتے ہیں۔ ایک عام سابندہ ڈی فیوژن اور فیوژن کر سکتا ہے، تو یہ اس کی دلیل ہے کہ رب کبیرا اپنے کسی بندے کو یہ الاؤنس دے سکتا ہے۔ یہ قرآن ہی پورا ہو رہا ہے۔ قرآن سے آگے کوئی زندگی نہیں۔ یہ بلیک ہول کیا ہیں؟ گلیکسیز کا گرد و غبار ہضم کرنے کی ٹوکریاں ہیں، تا کہ رفتار سیارگاں متاثر نہ ہو۔ جو کمزور ستارہ نظام شمسی میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے، وہ ڈسٹ بن کے قریب گذرتے ہی اس کی نذر ہو جاتا ہے، چیزیں بڑی سہل ہیں۔

میں نے جب پہلی دفعہ کثیر کائناتی نظریے کا تصور پیش کیا تھا تو مجھ پر بھی لوگ ہنستے تھے، لیکن آج کثیر کائناتی

Marfat.com

نظریہ ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکا ہے۔ اسی طرح اگر قرآن کہتا ہے کہ میں نے سات زمینیں بنائی ہیں، تو ایک آدھ زمین کا سراغ ضرور آپ کو ملے گا۔ ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم مغرب سے علم لے کر دباؤ اور خوف میں ہیں۔ ہمارا سائنسدان اس لیے قرآن نہیں پڑھتا، کہ اس کے ساتھ عمومی کمپلیکس وابستہ ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس نے پتہ نہیں کیا کچھ پڑھا ہوا ہے۔ کیا پتہ کوئی بات قرآن میں سے غلط نکل آئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ میاں کو نہ پتہ ہو کہ آخر سائنسز کہاں تک پہنچیں گی یا فکر دجال کیا کچھ نہیں کر سکے گی۔ اللہ تو اس آیت سے شروع کرتا ہے کہ اولم یر الذین کفرو تم کیسے میرا انکار کر سکتے ہو، ان السمٰوٰت والارض کانتا رتقا ففتقنھما، تم مجھے کیسے جھٹلا سکتے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے، شروع میں زمین و آسمان اور ہر چیز یکجا تھی، پھر ہم نے انہیں بزورِ قوت الگ کر دیا۔ یہاں سے شروع کرتا ہے اور آخر میں کہتا ہے۔ اذا الشمس کورت و اذا النجوم انکدرت سورج ماند پڑ جائے گا اور ستاروں کی روشنیاں ختم ہو جائیں گی۔

اگر خدا آغازِ کائنات سے لے کر انجامِ کائنات تک آپ کو ایک خبر دیتا ہے، تو آپ کا خیال ہے کہ اس کو یہ نہیں پتہ ہوگا کہ بیچ میں ہونس نے کیا کہا ہوگا۔ ڈبلیو ہیلیکس کتاب لکھے گا۔ یہ جو نئے نئے سکائی سکریپر بن رہے ہیں، اور جو شٹلز آ جا رہی ہیں، اسے ان کا علم نہیں ہوگا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ خدا انٹلکچوئل بنی نوع انسان کی تمام دانش کا احاطہ نہیں رکھتا ہوگا؟ یہ سوچنا کتنا احمقانہ سا لگتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں، تو اس کا مطلب ہے، آپ خدا کو نہیں مانتے۔

شروع شروع میں قرآن میں لوگوں کو دلچسپی تھی، لیکن اب ہم میں قرآن کے عمومی سٹیٹس کے لوگ بھی ختم ہو گئے ہیں۔ مجھے ایک عمومی سوال پوچھنا ہے کہ اگر آپ ایم ایس سی کی کتاب لے کر بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک پانچویں جماعت کا طالب علم آکر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے، تو آپ اسے کہتے ہیں کہ یہ کتاب تیرے معیار کی نہیں ہے۔ تم اس کو نہیں سمجھ سکو گے۔ چودھویں جماعت کا کوئی آ جائے، تو آپ اسے کہتے ہیں کہ یار یہ آپ کے معیار سے ذرا آگے ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اب آپ کا کیا خیال ہے کہ اس خدائے بزرگ و برتر کی کتاب کا کوئی معیار نہیں ہے؟ آپ کا خیال ہے کہ قرآن کا عمومی دانش کا کوئی معیار نہیں ہے؟ ایک لیول تو اس کا بھی ہوگا۔ ایک ایسا لیول، جس پر قرآن سمجھ آتا ہوگا۔ وہ بھی اللہ کا سٹیٹس ہے، میرا نہیں ہے۔ مگر اللہ نے اپنی کتاب کا ایک سٹیٹس تو رکھا ہوگا کہ جو لوگ ان چیزوں سے گذریں گے ان چیزوں میں کوالیفائی کریں گے، وہ قرآن کو کیسے سمجھنے کے اہل ہوں گے؟

دوسری طرف یہ آسانی کر دی کہ ان پڑھ کو بھی اس کے پڑھنے کا ثواب بخش دیا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ال م پر ثواب ہے اور اس طرح نہیں، بلکہ الف پر، لام پر میم پر الگ الگ ثواب ہے۔ یعنی ایک عمومی پڑھنے والے کو بھی اس کا ثواب بخشا۔ لیکن اصلی معیار تک بھی تو کسی کو پہنچنا ہے۔ یہ واحد خدا کی کتاب ہے، جو معمولی ترین معیار سے لے کر بلند ترین معیار تک یکساں قابلِ مطالعہ اور یکساں قابلِ فہم ہے۔ پھر بھی مجھے کہنا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ زمانۂ آخر میں علم ختم ہو جائے گا اور اس طرح نہیں کہ علم ختم ہو جائے گا، بلکہ عالم ختم ہو جائیں گے۔ علم تو محتاج ہے وہ انسٹرومنٹ ہے کسی کے ہاتھ میں ہوگا، تو سامنے آئے گا۔ جب عالم ختم ہو جائیں گے، تو علم خود بخود ختم ہو جائے گا اور پھر سوائے اس کے کہ قحط الرجال شروع ہو اور آپ انا للہ و انا علیہ رجعون پڑھتے رہیں۔ اولٓئِک ھم المھتدون۔

Marfat.com

خدا کہتا ہے، اہل عقل اور میرے ہدایت یافتہ لوگوں کو کچھ ٹیسٹ پاس کرنے پڑتے ہیں۔ والنبلونکم بشیء من الخوف انہیں خوف ذات اور توقعات کے ٹوٹنے سے گذرنا ہوگا۔ انہیں امیدوں کو مختصر کرنا پڑے گا۔ والجوع، جوع کی کئی اقسام ہیں۔ و نقص من الاموال ان کو ڈپریشن سے والانفس اندرونی اور ذاتی کیفیات کے بحرانوں سے گذرنا ہوگا۔ والثمرت، بہت سی چیزیں اور ان کی محنت کے پھل ان سے چھین لیے جائیں گے۔ ان کی اولادیں اور ان کے ماں باپ چھینے جائیں گے۔ ان سے ان کی ملکیتیں فنا کی جائیں گی۔ و بشر الصبرین الذین اذا اصابتهم مصيبة، میری طرف سے مبارک اور بشارت ان لوگوں کو دو، جن پر مصائب آئے، وہ ٹھہرے، رکے اور بڑے تحمل سے چھوٹی سی بات کی، قالو انا لله و انا اليه رٰجعون کہ یہ سب عارضی مرحلہ ہے۔ میں فانی ہوں۔ میری زندگی فانی ہے۔ گلیکسیز کے اربوں کھربوں سال میں میرے پاس نہایت حقیر سا وقت ہے۔ مجھے واپس خدا کے پاس جانا ہے۔ میری ہر چیز خدا کے پاس چلی گئی ہے۔ آج اس نے مجھے دشواری دی ہے، توکل مجھے سہولت دے دے گا۔ خدا کہتا ہے۔ جس کی اپروچ یہ رہی۔ اولئک علیهم صلوة من ربهم، میری طرف سے ان پر درود اور سلام ہو، و اولئک هم المهتدون اور یہ وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، دانشور ہیں، جو مجھ تک اور میری کتاب تک رسائی رکھتے ہیں۔

چنانچہ ہم اپنی ذمہ داری سے کوتاہی برت رہے ہیں۔ جب سے ہائی اکیڈیمک اور میتھوڈسٹ مولوی شروع ہوئے ہیں، نیات کا علم ہی غائب ہوگیا ہے۔ بدقسمتی سے لفظ سے لفظ سفر کرتا آ رہا ہے۔ لفظ سے اثر نے سفر نہیں کیا۔ طوطے کی طرح رٹاؤ جاری رہا ہے۔ آپ حفاظ عالم تیار کر رہے ہیں۔ قرآن حفظ ہو رہے ہیں۔ اندھوں کی طرح سر مارے جا رہے ہیں۔ ایک صاحب قرآن نہیں ملتا۔ اقبال کہتا ہے کہ غلام سے تجھے کیا لذت قرآن ملے گی، جو قرآن اس لیے پڑھ رہا ہے کہ کسی کی موت پر جا کر اس نے پڑھنا ہے اور چاول کھانے ہیں۔ جو قرآن سارے کا سارا اس لیے پڑھ رہا ہے کہ کب مولوی صاحب کسی کے گھر سے موت کی خبر لائیں میں وہاں جا کر تھوڑا سا پڑھوں اور مجھے دو چار ٹکے ملیں۔ اس نے قرآن کیا پڑھنا اور کیا سیکھنا ہے۔ اس سے بڑی خود غرضی والدین کی کیا ہوسکتی ہے کہ ان کی اپنی صلاحیت کا رصفر ہے۔ ان کے گھروں میں عبادات کے نام ونشان نہیں ہوتے، جو بچوں کو قرآن حفظ کرا رہے ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی احساس ذمہ داری ہے۔ ایک حکم پروردگار ہے۔ اگر بچوں کو پڑھا کر اور اس کے پیچھے اپنی مثال دے دیں، تو یہ ان کی فلاح کے لیے کافی ہے۔

کیفیات بسلسلۂ خدا

آپ کی یہ قدرتی کیفیات ہیں، جو ہر اداس دل میں پیدا ہوتی ہیں۔اداس دل اس لیے کہ جس دل کو بھی کسی کام کی اہلیت کا اپنے اندر احساس ہو اور وہ کام نہ کر پائے، تو جو رکاوٹیں وہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے، اس کے لیے اسے کہیں نہ کہیں پناہ لینی پڑتی ہے۔آپ بھی اس بے چارگی میں سکون کے لیے اللہ کو چاہتے اور مانتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی آپ کو جواب دیتا ہے مگر خداوند کریم نے ایک بات کی ہمیشہ ہمیں نصیحت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کبھی وہ سوال نہ اٹھایا جائے، جس کے لیے ہمارے پاس مناسب ڈیٹا نہ ہو۔ یہ اللہ کی بڑی واضح قسم کی نصیحت ہے۔ جیسے کہ آپ نے کہا کہ خدا مجھے نظر آئے، تو خدا نے ہمیشہ یہ کہا کہ کوئی آنکھ مجھے دیکھ نہیں سکتی۔ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ کی محسوسات بڑی حساس نوعیت کی ہیں۔ایسی محسوسات یا تو نشے سے پیدا ہوتی ہیں یا انسان بنیادی جینیات سے ان کا اہل ہوتا ہے۔ان محسوسات میں یہ احساس کبھی کبھی بیماری بن جاتا ہے۔انسان کبھی ایسے سمبل کو خدا سمجھنا شروع کر دیتا ہے، جو خدا نہیں ہوتا۔

ایک معیار ہمیشہ اپنی نظر میں رکھیے گا، کہ خدا ہمیشہ اعتدال میں ہے۔ جیسے اس نے کہا، ثم استوٰی الی السمآء فسوٰھن سبع سمٰوٰت کہ ہم بلند ہوئے آسمانوں پر جو بیلنس میں کیے۔ یوں پوری کائنات کے ذرے ذرے میں آپ کو علت و معلول کا توازن نظر آئے گا۔ جب ہمارے اندر وہ توازن نہیں رہے گا، تو ہماری خود پسند سوچ، وسوسہ اور تخریب کو استعمال کر کے ہمیں صحت دماغ سے نکال دے گی۔تسبیحات کے بنیادی مقاصد یہ ہوتے ہیں کہ ہمیں خدا کا ڈیٹا ملنا شروع ہو جائے۔یعنی ایک ایسا کمپیوٹر، جس میں اس کی ٹک ٹک اور ڈیٹا نہیں، وہ خالی ذہن ہے، جو اپنے اندر ہی سے محبت کے معنی نکالتا اور اپنے اندر ہی سے مسائل کے حل ڈھونڈتا ہے، لیکن اس کا ڈیٹا یا ایک فرنٹ لائن کنکشن نہ ہونے سے وہ ہمیں تسکین نہیں دے سکتا۔

ہم تسبیحات شروع کرتے ہیں، تو یہ خدا سے تقریباً براہ راست ڈائلنگ کے مترادف ہے۔ہم اس کا بار بار نام لیتے ہیں، یا اس کو ڈائل کرتے ہیں کہ ہمارے معاملات اور مسائل میں آپ ہماری مدد کرتے رہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم صحت مندی کے ساتھ اپنے خیالات کے بحران سے نکل جائیں۔ان تسبیحات میں بہت زیادہ ارتکاز توجہ بھی نہیں چاہیے۔

Marfat.com

بہت سے لوگ بہت ارتکازِ توجہ کے ساتھ تسبیحات کرتے ہیں۔ جب توجہ کو مرکوز کیا جائے، تو جو پہلے سے موجود خیالات ہیں، وہ ہمارے سامنے متشکل ہو جاتے ہیں اور ہمیں دوبارہ گمراہ کر دیتے ہیں۔ خدا نے اپنی یاد میں صرف اتنا بتایا کہ اپنے دوست کو یاد کرتے رہو، تاکہ میں بھی تمہیں یاد کرتا رہوں۔ جب وہ آپ کو یاد کرنا شروع کر دے گا، تو وہ آپ کو اس عدمِ توازن یا اس سراب تک نہیں پہنچنے دے گا، جس کی خیال رہنمائی کر رہا ہوتا ہے۔

میں نے تصوف میں جو سب سے بڑی کوالٹی پائی ہے، وہ کانٹ چھانٹ کی ہے۔ جیسے جب جھاڑیاں بہت ساری اوپر اگ آئیں، تو ان کو کاٹ کر تواتر میں لانا پڑتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ذہن میں بڑے اعلیٰ اور نفیس خیالات ہوتے ہیں۔ ان سے خود ہمیں محبت ہوتی ہے۔ وہ ہمیں اچھے اور منفرد لگتے ہیں۔ ہماری شخصیت کو اتنا اجاگر کرتے ہیں کہ جب ہم ان کا ذکر بھی کرتے ہیں، تو ہم نمایاں ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ سب جھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک قینچی ہاتھ میں ہر وقت رہنی چاہیے تاکہ یہ جھاڑ جھنکاڑ اتنے نہ آگے بڑھ جائیں کہ آپ کے سادہ سے تصورِ اخلاص پر حاوی ہو جائیں۔ ہم ان کو کاٹتے رہتے ہیں۔ جو چیز بھی زد میں آتی ہے، وہ کٹ جاتی ہے۔ چاہے وہ رسوم و رواج ہوں یا آپ کی عادات یا خیالات ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ کبھی بھی نہیں ہے، کہ آپ مکمل ہو جائیں گے۔ مکمل انسان بھی گذر گئے۔ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انداز گذر گیا۔ اس کے بعد بہترین لوگ اصحابِ رسول گذر گئے۔ پھر فرمایا ثم الذین یلونھم تابعین گذر گئے۔ اب ہمیں چوتھے اعتدال کی کوشش کرنی ہے۔ چوتھے اعتدال میں خاصی گڑبڑ ہوتی ہے۔ آپ صرف حدود اللہ کی حفاظت کریں، تو خدا کبھی بھی آپ کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ کبھی نہیں۔ وہ ہمیشہ آپ کی رہنمائی کرے گا۔ آپ کے ساتھ رابطے میں رہے گا اور جہاں بھی آپ بڑی غلطی کریں گے، آپ کا راستہ روک دے گا۔ یہ اس کی محبت کا نشان ہے۔

مذکورہ قینچی کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، کہ اپنے ساتھ اور اپنی ذات کے ساتھ کوئی خود ترحمی نہ برتی جائے۔ واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی کہ جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا، اس نے اپنے نفس کی ضرور مخالفت کی۔ یہ چیز نفسیات کے معاملے میں بجا نہیں ہے۔ نفسیات اور اس کے اعلیٰ ترین مناصب ذات (Self) کی محبت کا گمان ہمیشہ قائم رکھا جاتا ہے۔ مگر اللہ نے یہ صاف بتایا ہوا ہے کہ جو اپنی ذات سے محبت رکھے گا، وہ مجھ سے محبت نہیں کر سکتا۔ ہمارے پاس ایک قینچی ضرور ہے کہ ہم اپنے لیے ہمدردی تلاش کرنے والے نہ ہوں۔ ہم اپنے آپ کو توجہ کا مرکز نہ بنائیں۔ نرگسیت پسند، اپنے آپ سے محبت کرنے والا اور انانیت پسند کبھی خدا تک نہیں پہنچتا۔ خدا تک پہنچنے کے لیے ایک اعتدال کی راہ اور ایک ایسی سوچ چاہیے، جو اپنے مقصد کو کبھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔

میں کسی زمانے میں بہت اچھا شاعر تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ شاعری میرے مقصد میں حائل ہے، تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ نہیں کہ مجھے اس سے نفرت ہوئی یا میں اس کو غلط سمجھتا تھا۔ مگر مجھے یہ پتہ تھا کہ بذاتِ خود یہ اتنی تصنع ہے کہ مجھے اس مقصد سے ہٹا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت ساری چیزیں، جو مجھے تشہیر دینے میں بڑی معاون ہو سکتی تھیں، ان سب کو میں نے صرف اسی لیے چھوڑا کہ وہ مجھے میرے مقصد کی راہ سے ہٹا سکتی ہیں۔ جب میں اسمائے حسنہ پر ریسرچ کر رہا تھا، تو یہ اتنا بڑا وژن اور ترقی تھی کہ خیال کہتا تھا، پوری طرح اس کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اس سے تو الہام کے رستے نکل سکتے ہیں۔ پھر یہ خیال آیا کہ اس میں اختیار اور عقل کی اتنی بڑی قوت بھی ہے کہ اس میں پڑ گیا، تو خدا کی محبت کا

جو دعویٰ ہے، وہ مجروح ہو جائے گا۔ چنانچہ میں نے اسے درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔ میں نے خدا سے درخواست کی کہ میں ان چیزوں پر اختیار اور ان کی آرزو نہیں رکھتا۔ ایک بات بڑی اہم ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ برقرار رہے کہ میں تمہارا ہوں، تم میرے ہو۔ ہمارا آپس کا معاہدہ، تیری خدائی اور میری بندگی کا منقطع نہ ہو۔ الحمدللہ! کہ اس بحران سے بھی اللہ نے مجھے نکال لیا۔

میں آپ کو خدا کی مہربانی کی ایک چھوٹی سی مثال بتاؤں کہ بہت ہی جوان عمر میں، جب آدمی کے پاس بے شمار خیال اور آرزوئیں ہوتی ہیں، جس خدا نے مجھے ترجیح کا احساس بخشا اور ترجیحات کا احساس دیا ہے، وہی میں آپ کو منتقل کر رہا ہوں۔ سب سے بڑا نقص ہماری امت میں یہی ہے کہ ہم کسی درجے کی ترجیحات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور سب سے اہم ترجیح کو سب سے کم اہمیت دیتے ہیں۔ میں اب وہی خیال لیے بیٹھا ہوں کہ ہماری ترجیحات کا تعین ہونا چاہیے اور خدا کے سوا کوئی شے ترجیح اول نہیں ہے۔

الجھنوں کے بھنور سے نجات

میرا یہ یقین ہے کہ اس سوال کا جواب صرف اللہ کی محبت میں ہے۔ آپ لوگوں نے شاید بہت عرصہ ہوا، اس سے محبت کرنا چھوڑ دیا ہے۔ Love labour is always very sweet (محبت کی مشقت میں ہمیشہ بڑی لذت ہوتی ہے) اگر میرا محبوب آدھی رات کو بھی مجھے کہے کہ فلاں چیز ڈھونڈ دو، تو میں پاگلوں کی طرح جاؤں گا۔ ہر دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور اس نے جو وقت دیا ہے، اس سے ایک گھنٹہ پہلے اسے لا کر دوں گا۔ اس لیے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ مذہب میں کئی چیزیں ہمارے پیٹرن سے نکل گئی ہیں اور غلط چیزیں آ گئی ہیں۔ ہم نے اداروں سے محبت ڈولپ کر لی ہے۔ انداز و بیاں اور اپنے ذاتی بتوں سے محبتیں پال لی ہیں۔ مگر خدا کی محبت اس طرح ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔

اپنی ذاتی مثال کے حوالے سے میں بہت ست الوجود اور اٹھنے بیٹھنے اور نماز پڑھنے میں لاپروا تھا۔ میرے ذہن میں خیال یہ تھا کہ ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر بڑے بڑے اعلیٰ مابعدالطبیعیاتی تصورات سے جو روشنی ملتی ہے، وہ نماز پڑھنے سے کہاں ملتی ہے۔ کافی عرصہ میں اس بحران کا شکار رہا۔ ایک دفعہ جب ہم چار پانچ کمیونسٹ ساتھی بحث کر رہے تھے اور بحث عروج پر پہنچی، تو انہوں نے کہا، تم کیسے مسلمان ہو! اللہ کی بات ماننا تمہارے ادراک میں نہیں ہے۔ انہوں نے براہ راست ایک ذاتی سا سوال کر دیا کہ کیا تم نماز پڑھتے ہو؟ میں نے جھوٹ بول دیا کہ ہاں میں پڑھتا ہوں۔ شاید اس وقت بحث و تمحیص کا معاملہ تھا۔ میں ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ ورنہ ساری بحث خارج ہو جاتی تھی، لیکن جب میں اپنے خیالات میں آیا، تو میں نے کہا کہ ہماری کون سی محبتیں ہیں، جو معنی رکھتی ہیں۔ میں دنیا کی چھوٹی چھوٹی محبتوں کے لیے اتنی جانفشانی سے کام کرتا ہوں۔ خدا مجھے کچھ بھی نہیں کہتا۔ کہتا ہے یار! تم ایک عمومی حکم ماننے سے دریغ کرتے ہو، تم خصوصی حکم کا کیا دعویٰ رکھ سکتے ہو۔ تب سے نماز میں میرے یہ احساس رہا کہ یہ صرف اللہ کے لیے ہے۔ یہ اس کا حکم ہے۔ چاہے میں مانوں یا نہ مانوں۔ اگر میں اسے مانتا ہوں، تو نماز میں میری رضامندی یا نارضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔

Marfat.com

یہ اسی طرح ہے کہ ایک بہت بڑا باس ہے، جس کے آپ ملازم ہیں۔ بعض اوقات دل سے آپ اسے صلواتیں سنا رہے ہوتے ہیں، مگر اس کا کام بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ خدا سے تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ جب میں نہیں چاہتا تھا، تو مجھے نماز بہت مشکل لگتی تھی۔ جب اسے چاہتا ہوں، تو میں نے بڑے مشکل حالات میں نمازیں پڑھیں، کبھی پیٹرن کے بغیر اور کبھی پیٹرن کے ساتھ پڑھی ہیں۔ تب سے لے کر اب تک میری کوئی نماز ضائع نہیں ہوئی۔ میرا احساس یہ ہے کہ وجود کی سستی اور انٹلکچوئل ازم کی کاہلی کے باعث ہم رسم یا عادت کو وہ مقام نہیں دیتے، جو اس کو ہمیں دینا چاہیے۔ یعنی کچھ چیزیں تو ضرور ایسی ہوں گی، جو خدا کی طرف چلنے میں ہمارا نشان بنیں گی۔ ان میں سب سے بڑی پہچان نماز ہے۔ نماز کے علاوہ ہماری عام زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے، جو ظاہری ہو۔ باقی تمام کا تمام مذہب داخلی ہے۔ اگر غیبت سے منع کیا گیا ہے تو یہ اندرونی صفت ہے۔ کم علمی کے ساتھ تشکیک کو روکا گیا۔ حسد اور کینہ سے منع کیا گیا۔ تو وہ اندرونی صفات ہیں۔ یہ تمام ترتیب اندرونی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں مذہب کے بارے میں جتنی بھی تحریکیں اٹھی ہیں، وہ سب اعتقادی ہیں۔ یہ ساری کی ساری بنیاد پرستانہ تحریکیں تھیں، جو اعمال تک آ کر رک جاتی تھیں۔ آگے مذہب کی کوئی فلاسفی نہیں رہتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم مذہب کے تحت گیر پیروکار کے طور پر تو ترقی کر رہے ہیں، جو پاگلوں کی طرح پگڑیوں پر دین کی بنیاد رکھتے ہیں، لیکن داخلی وژن سے بالکل خالی ہیں۔

جن استادوں کی آپ نے بات کی ہے، میں انہیں استادوں کا یہ نقص سمجھتا ہوں کہ انہوں نے تعلیم دیتے وقت آپ کو اسلام کا نظریاتی ادراک نہیں دیا ہے۔ انہوں نے آپ کے ذہن میں صرف لفظی آئیڈیل تخلیق کیا، جس کو عملی نہیں کہا جا سکتا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اسلام عمل سے آئیڈیل کو حرکت کر رہا ہے۔ یہ تحریک وہ ہے کہ تھوڑے سے عملی خیالات کے بعد ہم ایک بہت بڑے آئیڈیل کو حرکت کرتے ہیں۔ میرا یہ پختہ یقین ہے کہ مابعد الطبیعیات اسلام کے سوا کہیں وجود نہیں رکھتی۔ واحد مذہب اسلام ہے، جو آپ کو خدا کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس تک پہنچانے کا راستہ دیتا ہے۔ اگر مابعد الطبیعیات میں ساری دنیا کے بھی تصورا کٹھے کر لیے جائیں تو وہ خدا تک جانے سے پہلے ختم ہو جاتے ہیں۔

یہ صرف مذہب اسلام ہے، جو مابعد الطبیعیات کے اعلیٰ ترین رستوں کی، جو اللہ تک رہنمائی کرتے ہیں، دوسروں کے مقابلے میں مکمل نشاندہی کرتا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ اسلام کی کوئی اعلیٰ اقدار اس وقت متعارف نہیں ہو رہیں۔ ہمیں یورپ کے طنز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسلام کو مغرب کی طرف سے بدترین صورت میں پیش کیا جاتا ہے، لیکن ہماری اپنی نمائندگی بھی تو معیار سے کم تر ہے۔ چنانچہ کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں، جو بہتر اسلامی آئیڈیلز کی نشاندہی کر سکتے ہیں اور وہ بھی فرضی طور پر۔ کچھ ذات سے کچھ انکار سے۔

عشق کی تعریف

عشق اسے کہتے ہیں، جو آپ کے دل و دماغ پر مسلط ہو جائے۔ جب عشق ٹوٹتا ہے، تو اس سے بے پناہ رنج و غم پیدا ہوتا ہے۔ یہ رنج و غم، ڈپریشن اور اداسیاں پیدا کرتا ہے۔ اداسیوں کے اس خلا کو پر کرنے کے لیے مذہب یا اللہ کے سوا کوئی کام نہیں آتا، کچھ کام نہیں آتا۔

Marfat.com

محبت پر غفلت کا غلبہ

میرا نہیں خیال کہ آپ اللہ کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ آپ کے ختم ہونے کے بعد قبر کے دہانے پر جو سوال آپ سے پوچھا جائے گا، وہ آپ کے معمولات زندگی سے متعلق نہیں پوچھا جائے گا۔ وہ پوچھا ہی ترجیح اول کے بارے میں جائے گا۔ من ربک: تمہارا رب کون ہے؟ اس سوال کا جواب تب تک نہیں دیا جا سکتا، جب تک ترجیحات کا تعین نہ کیا گیا ہو۔ دماغ کی عادت ہے کہ وہ جس چیز سے زیر بار ہوگا، وہی جواب دے گا۔ جب آپ قبر کے دہانے پہنچیں گے اور آپ نے خدا کے بارے میں نہیں سوچا ہوا اور بچوں کی یا خوف کی زیادہ فکر کی ہے تو آپ کا جواب وہی نکلے گا، یہ ایک نفسیاتی قانون ہے۔ کسی نفسیاتی مریض کو جو مرضی ہے، کہہ کے دیکھ لو، وہ ''جن'' کا ہی شور مچاتا ہے۔

Marfat.com

وقت کیا ہے؟

میں نے بلاشبہ زمان و مکاں کے بہت سارے پہلوؤں پر غور کیا۔ میرے نزدیک زمانہ ایک حد بندی ہے، جس میں مختلف حادثات و واقعات اس طرح پابند کیے گئے ہیں کہ وہ آپس میں رگڑ نہ کھائیں۔ اس وقت زمان و مکاں پر جتنے بھی نظریات دنیا میں موجود ہیں، ان میں زمانے کو لامحدود قرار دیا گیا ہے یا لازماں قرار دیا گیا ہے، جبکہ مذہبی طور پر زمانہ بھی چیزوں اور وقت کے تعین کے لیے خدا کا ایک آلہ ہے۔ اس کو قطعی لاانتہا نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے مقابلے میں دنیا بھر کا فلسفہ وقت کو لامحدود خیال کرتا ہے۔ ہمارے مذہبی نقطہ نظر سے وقت محدود ہے۔ اگر ہم اپنی زمین اور کائنات کی حدود سے دیکھیں، تو وقت محدود ہے۔ وقت دراصل چیزوں کی پہچان ہے۔ باپ بیٹے سے اور ماں بیٹی سے پہچانی جاتی ہے۔ پہچان عمروں سے ہوتی ہے۔ عربی محاورے کے مطابق الوقت سیف قاطع کہ وقت کاٹتی ہوئی تلوار ہے۔ یہ چیزوں کو چیزوں سے جدا کرتی ہے۔ زمانوں کو زمانوں سے اور انسانوں کو انسانوں سے جدا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا گنبد بے در ہے، جس میں ہونے والے ہنگامے کی خبر باہر نہیں جاتی۔

اگر ایک چھوٹے سے کمرے کے اندر ساری چیزیں بند کر دی جائیں اور ان میں بے ترتیبی ہو، تو ان میں سے گذرنے والا ہر وقت ٹھوکریں کھائے گا۔ سو زمانہ اشیاء کو بکھیرتا ہے۔ دور لے جاتا ہے اور ان کی حرکت کو رگڑ کو کم کرتا ہے۔ جس کو ہم زمانہ کہتے ہیں، وہ اللہ کی داخلی سجاوٹی سکیم ہے۔ کوئی چیز بے ترتیب نہ ہو۔ کوئی چیز رفتار میں کسی سے نہ ٹکرائے، مگر زمانہ بہرحال خدا کی نظر میں ایک محدود عنصر ہے۔ اسے لامحدود نہیں کہہ سکتے۔

قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں بھی زندگی کے خاتمے کے حوالے سے کل من علیھا فان کی بات کی ہے، ستاروں کی گردش، کائناتی پھیلاؤ اور اس کے رکنے کی بات کہی ہے، وہاں ایک جملہ ضرور استعمال ہوا ہے، الا اجل مسمی ایک مقررہ وقت تک۔ اب اس مقررہ وقت سے آگے وقت ہے کہ نہیں ہے، کوئی آدمی نہیں جانتا۔

مثال کے طور پر ایک شخص بین الکائناتی فاصلوں، دور زماں اور بے پناہ وسعتوں کو دیکھ کر جو اسے نظر آ رہی ہیں، یہ سمجھتا ہے کہ وقت لامحدود ہے۔ اس کا ایسا سمجھنا بجا ہے کہ اس کی جمع و تفریق اور حساب و کتاب میں ارب ہا ارب سال کی

Marfat.com

گلیکسیز کی زندگی کا وقت ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا۔ مگر جیسے خدا نے مکان کی مدت رکھی ہے، قرآن میں والسخر شمس و القمر و النجوم مسخرت با امرہ، چاند، ستاروں کے مناظر کا ذکر کیا ہے، وہاں ایک بات ساتھ ضرور کہی ہے، الا اجل مسما، ایک وقت مقررہ تک کہ انہیں ایک نصیب تک پہنچنا ہے۔

اب ظاہر ہے، اگر مکاں محدود ہے، تو وقت لامحدود نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر ہم زماں کو مکاں سے علیحدہ کرتے ہیں، تو زمانہ بے معنی تسلسل کا نام ہو کر رہ جاتا ہے۔ تمام زمانے کی قدر قیمت اس مکاں سے بنتی ہے، جو اس کے وجود میں جگہ جگہ داغ کی طرح لگا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے، جیسے آسمان سیاہ چادر کی طرح ہو اور اس پر ستارے کانچ کے ٹکڑوں کی طرح لگے ہوں۔ کانچ کے ٹکڑے نہ ہوں، تو آسمان بے قدر و نامعلوم رہے گا۔ اسی طرح زمانہ اس چادر کی طرح ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ مختلف کائناتی بصیرتوں کے ٹکڑے لگا دیئے ہیں۔ مکاں کی نشاندہی کے بغیر زمانہ از خود متعین نہیں ہوتا۔ یہ ایک ہی سمت ہے اور یہ اکٹھے رہنے والے ہیں۔ وقت بھی مقرر ہے، وہ بھی محدود ہے اور خدا ان محدود چیزوں سے ورا ایسا تحریک وجود اور تسلسل ہے کہ جس کے قریب تر کسی محدود ہونے کا عمل نہیں آ سکتا۔ خدا کے بعد شاید ایک چیز جو اپنے لامحدود ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے، وہ انسان ہے۔

زمان و مکاں کی تخلیق

ہوکن نے بھی کہا تھا کہ مجھے ایک لمحے کے لیے پتہ چل جائے کہ بگ بینگ سے پہلے کیا ہوا تھا، تو ہم ہر چیز کی تفسیر دے سکتے ہیں۔ زمان و مکاں کا جوڑ پیدا کرنے کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ پہلے تخلیق کا تصور پیدا ہوا۔ اس تصور کے بغیر زمانے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر ساری کائنات پر زمانہ محیط رہے اور اس پر غور و فکر کرنے والا کوئی نہ ہو، تو پھر زمانہ بے سود تصور ہے۔ حقیقی وجود اس وقت وجود پاتا ہے جب اس کی تیسری بڑی جہت پیدا ہوتی ہے اور سب سے بڑی جہت (Dimension) جو زمان و مکاں کو وجود دیتی ہے، وہ انسانی ذہن ہے۔ اس حکم پروردگار سے جو ہم میں جاری و ساری ہے، ہم اشیاء کو تشخص دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زمان و مکاں بذات خود وجود نہ رکھتے ہوں، مگر ہمارے ذہن میں مبدیات اس کو وجود عطا کرتے ہیں۔ جو وقت ضائع ہو جائے، وہ بھی وقت ہے۔ یہ تو نہیں کہا جائے گا کہ جو وقت ضائع ہو گیا وہ وقت نہیں تھا۔ یہ تو ہم اپنے محاورے اور اپنے انداز زمانہ کو مختلف رنگ اور مختلف نقوش دیتے رہتے ہیں۔

رواں زمانہ اللہ تعالیٰ نے کسی خارجی مقام کے لیے نہیں پیدا کیا، یہ انسانوں کی تربیت کے لیے ہے۔ جیسے ایک بچہ نو ماہ کے بعد پیدا ہوتا ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ نو ماہ بعد ہی کیوں؟ زمانہ کوئی غیر معمولی شے نہیں۔ یہ صرف ایک کاٹنے والی قینچی ہے، جو چیزوں کو چیزوں سے علیحدہ کرتی ہے۔ خدا جب چاہے زمانے کی نوعیت بدل سکتا ہے۔ جب چاہے بادل برسنا بند ہو سکتے ہیں۔ زرخیزیاں بند ہو سکتی ہیں۔ بچے لیٹ ہو سکتے ہیں۔ یہ مقامات اور افراد کو چلانے کے لیے خدا کا خصوصی ارادہ ہے اور اس کو جاننے والا صرف انسان ہے۔

یہ زمان و مکاں اور ذہن انسان تینوں ابعاد اکٹھے ہیں۔ زمان و مکاں کے وجود کو متشخص کرنے والا صرف انسان ہے۔ ورنہ بڑے بڑے زمان و مکاں بالائے کائنات جاری ہیں۔ ان کو دیکھنے والا کوئی نہیں۔ دوسری کائناتوں میں کوئی

Marfat.com

انسان نہیں ہے۔اس لیے ان کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ ہمارا کیا وقت، کیا زمانہ اور کیا مکاں ہے۔ہم یہاں بیٹھے اپنی کائنات کی عمر کا تعین کرتے ہیں کہ پندرہ بلین سال گذر گئے مگر ان پندرہ بلین سال کے عرصے میں کسی اور جگہ کوئی اور ستارہ سوائے زمین کے محقق نہیں ہو پایا۔ چنانچہ سب سے بڑی جہت جو زمان ومکاں پر حکومت کرتی ہے، وہ ذہن انسان ہے۔ یہ سب سے بڑی جہت ہے۔اس کے بغیر زمین وآسماں اور زمان ومکاں کا کوئی تشخص نہیں۔

چھ دنوں میں پیدائش

وهوالذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستة ایام و کان عرشه علی المآ لیبلوکم ایکم احسن عملا (سورہ هود۔ ٦)

(اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا۔ تا کہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سب سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے)

یہ بڑی آسان اور خوبصورت آیت ہے۔اس میں ایک تو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں نے چھ دنوں میں آپ کی یہ کہکشاں بنائی ہے۔سائنسی انداز سے اس میں وضاحت کا یہ پہلو نکلتا ہے کہ ہر چیز کا معیار وقت ذرا جدا جدا ہے۔کائنات کی تعمیر میں خدا کا ایک دن کم وبیش ایک ارب سال کا ہے۔ایک ارب سال انسانوں کا اندازہ ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ چار یا پانچ ارب سال کے عرصے میں زمین بنی ہے، تو تمام کہکشاؤں کے بننے کا مجموعی عرصہ تقریباً چھ بلین سال ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں ہماری دنیا اور کائنات کو تشکیل کیا۔ یہ خدا کا وقت نہیں ہے۔خدا کا تعمیری وقت تمثیل میں ایک بلین سال برابر ایک دن ہے۔

اس کے مقابلے میں حیات دنیا کا وقت اس نے ایک دن برابر ایک ہزار سال رکھا ہوا ہے۔اسی لیے حضورؐ کی حدیث مبارک کے مطابق ہماری زمین کا آدھا دن اللہ کے نزدیک پانچ سو سال ہے۔یہ سب کچھ بنانے کے بعد اس نے کہا، میں تمہیں سمجھاؤں کہ میں نے یہ سارا کھیل کیوں کیا ہے؟ تا کہ میں دیکھ سکوں، تم اچھے عمل کرتے ہو کہ نہیں۔اس میں زمین کے بنانے کا بنیادی مقصد زیر بحث آیا مستقراً و متاع الی حین ایک کیمپ جس میں ایک مخلوق کو زندگی دوں گا۔ یہ حیاتیات کا پہلا فلسفہ ہے۔عرش پانی پر ہونے کا مطلب ہے کہ تمام تخلیقات حیات کی ابتدا پانی سے ہوئی ہے۔ پھر اس سلسلے کو آگے بڑھایا گیا۔صدیوں کے فاصلے دیئے گئے۔ترقی دی گئی اور ترقی دینے کے بعد انسان کو بہتر کیا گیا۔انسان سے آدم نے ظہور کیا۔تب سے آدم کے اعمال زیر غور ہیں۔

سو خدا کی تمام ٹائمنگ اس حرکت کے لحاظ سے دیکھنی پڑتی ہے، جس لحاظ سے ہماری عقل اور ہمارے ترقی کردہ علوم اس کے اصل ماخذ بتاتے ہیں۔ یہ بڑی واضح اور خوبصورت آیت ہے۔اس میں دو بڑی باتیں ہیں۔ایک تو یہ زندگی کے ماخذ کو پانی سے ثابت کرتی ہے۔دوسرا تخلیق کے مقصد کو واضح کرتی ہے۔اسی کی حمایت میں سورہ دہر ہے کہ بڑی مدت انسان زمانوں میں ایسے رہا کہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔ پھر میں نے زندگی کو سنگل نطفے کی بجائے دہرے نطفے سے بنانا شروع کیا۔ پھر جب نطفہ دوہرا ہو گیا، تو اس میں ابھی عقل وشعور کی کوئی رمق نہ تھی۔ میں نے چاہا کہ اسے اب پرکھ کے

Marfat.com

انداز میں ڈالوں، تو میں نے اس کو جینیاتی نظامات دینے شروع کر دیئے۔ سماعت اور بصارت دی۔ لیکن یہ ابھی اس قابل کہاں تھا کہ یہ فیصلہ دے سکے، سن سکے یا جانچ پرکھ کر سکے۔ پھر میں نے اسے عقل و شعور بخشے۔ خاص طور پر دماغ عطا کیا۔ رہنمائی اور بخشش دی۔ کرم فرمایا اور کہا، چاہے تو مانے، چاہے تو میرا انکار کر دے۔

مگر یہ بڑا عجیب سا سٹائل ہے۔ انسانی عقل اور ذہانت میں کوئی ایسی چیز ضرور ہے کہ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ آزادی دی گئی ہے کہ چاہے تو مجھے مانے، اور چاہے، تو میرا انکار کر دے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جاپان ایک سوزوکی بناتا ہے، اس پر وزن، انداز اور اس کے فنکشن کے حوالے سے سب کچھ لکھا ہوتا ہے، لیکن جب وہ پاکستان میں چلتی ہے، تو پاکستان میں اس کا اپنا ایک استعمال ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کا پتہ ہے کہ اس نے انسان بناتے ہوئے اس میں کیا عناصر رکھے۔

خدا کی طرف سے بات کرتے ہوئے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ رحمٰن و رحیم و کریم ہے۔ وہ بندے کے لیے کبھی بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اس نے کبھی سوچا نہ ایسا سوچے گا۔ اس لیے اس نے کسی انسان کے مقدر کو جہنمی نہیں بنایا۔ ورنہ یہ دونوں آیات غلط ہو جائیں گی و کتب علیٰ نفسہ رحمۃ اس کی رحمت سے تھوڑی بہت چھڑیاں ضرور ماری جاتی ہیں اور بندہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ پر یہ نہیں گمان کیا جا سکتا کہ جس کے حق میں رحمت لکھی ہو، اس کو عذاب الٰہی سے ضرور روشناس کیا جائے گا۔ اس طرح جب رسول اللہ کو وما ارسلنک الا رحمتہ للعلمین کہا، تو فرمایا کہ میں نے رحمت عالم کو زمین پر بھی بھیج دیا ہے۔ ایک تصوراتی اور ایک جسمانی ہے۔ دونوں صورتوں کے ہوتے ہوئے وہ انسان کی برائی نہیں چاہ سکتا۔

باقی رہ گئے اعمال، تو اس میں انسان کا کچھ حصہ ہے۔ اس کی مادی جبلتیں انقلاب انگیز ہیں۔ ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ یہاں بھی میں یہی کہوں گا کہ انسان اگر لیبلو کم سے بچنا چاہے، تو اسے علم کی ضرورت ہے۔

زمانۂ آخرت میں

ہر چیز کے درجات مقرر ہیں۔ جس طرح یہ زندگی ایک بھینچی ہوئی زندگی ہے۔ اس سے ذرا باہر جاتے ہیں، تو آپ کے پاس کھربوں سال کا عرصہ کم پڑ جاتا ہے۔ اس زندگی میں ہم ساٹھ برس کا عرصہ پورا کر کے چلتے ہیں۔ پیدا ہوئے، کھائے پیے، شادیاں ہوئیں۔ بچے ہوئے، مکان بنائے، نوکری کی، یہاں تک کہ موت تک پہنچ گئے۔ اس پر اپنے آپ کو سمجھنے لگے کہ ہم نے معمول کی زندگی اور پیدائش سے موت تک کے تمام ضروری مراحل طے کر لیے مگر ایسا اوپر نہیں ہوتا۔ ایسا اوپر اس لیے نہیں ہوتا کہ وہاں آپ کو ایک ستارے سے دوسرے تک جاتے جاتے ہو سکتا ہے پانچ لاکھ نوری سال صرف ہو جائیں۔ پندرہ لاکھ، ایک کھرب نوری سال لگ جائیں۔ اس میں آپ کی زندگی کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے اس زندگی کو ہم بھینچی ہوئی زندگی کہتے ہیں۔ یہاں ہر چیز قید کی گئی ہے۔ اسے دبایا گیا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور اوپر جائیں، تو آپ کا وزن ہے، نہ آپ کا سٹینس۔ خلا میں کچھ بھی نہیں ہے۔

زندگی کو مجبور کرنے، قائم رکھنے اور اسے ایک ضابطے کا سٹائل دینے کے لیے اس پر بے تحاشا بندشیں عائد کی گئی

Marfat.com

ہیں۔ ان بندشوں کو ہم جبر کہتے ہیں۔ سورج کو ایک خاص مقام پر رکھنا جبر ہے۔ تاکہ اس فاصلے سے آگے نہ آئے، ورنہ انسان جل جائے گا۔ سورج ایک لاکھ میل پیچھے چلا جائے، تو انسان ٹھنڈک سے مرجائے گا۔ اسی طرح چاند کو اس حساب سے رکھا گیا ہے کہ وہ ٹکرانہ جائے، زمین پر نہ گر جائے۔ اسی طرح ہمارے اردگرد جیسے پہاڑ وغیرہ دیئے گئے، یہ سارے کے سارے توازن کے لیے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ زمین ہچکولے کھاتی ہوئی گڑیا کی طرح کہیں کائنات میں معدوم ہو جائے تاکہ یہ توازن کے ساتھ اور تواتر میں رہے۔

تمام کائنات کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ زمین پر ایک مصنوعی زندگی ہے۔ اصلی زندگی نہیں ہے۔ اصلی زندگی اگر وہاں جائے گی تو ہمیں اپنے وجود فانی سے نکلنا پڑے گا۔ ہم اس کے ساتھ اوپر نہیں جاسکتے۔ وہاں جانے کے لیے یہ وجود قطعی ناکافی ہے۔ اوپر جانے کے لیے ہمیں یہ پیٹرن چھوڑنا پڑے گا جبکہ یہاں رہنے کے لیے اس وجود کی ضرورت ناگزیر ہے۔ چنانچہ ہم بھیجے ہوئے ہیں۔ جیسے حضور ﷺ کی حدیث ہے کہ الدنیا سجن المومن دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔ یہ ہے ہی قید خانہ۔ یہ سانس کا، پریشر کا قید خانہ ہے۔ کشش ثقل کا پریشر ہم پر پڑ رہا ہے۔ ورنہ ہمارے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے۔ ذرا سا اوپر خلا میں آزاد رہتے۔ وہاں آپ پہاڑ ایک انگلی سے دھکیل سکتے ہیں۔ یہاں آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں بندشیں ہیں۔

فرض کیجیے، ہماری زندگی اتنی ہی طویل ہو، جتنی ہم چاہتے ہیں اور ہم خلا میں ہوں، تو خلا میں یہ سارے ڈھکوسلے کس قدر بیکار ہوں گے۔ ہوسکتا ہے ہم بیس بیس من کی چٹان انگلیوں پر چلاتے ہوئے لا رہے ہوں، انہیں فکس کرنے کی کوشش کر رہے ہوں، لیکن اس سے مکان نہیں بن سکے گا کیونکہ مکان بنانے کے لیے ایک رگڑ، دباؤ اور ایسی کشش ثقل چاہیے جو اسے دبا سکے۔ یہ صرف زمین پر ہی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی تمام زمینی زندگی ایک مصنوعی زندگی ہے اور اس کے ذہن کی آزمائش اور فیصلے کے لیے ہے۔ جب وہ اس آزمائش سے گذر جائے گا، تو اس سے یہ وجود چھین لیا جائے گا، جس کی بالائی گلیکسیز میں کوئی حیثیت نہیں۔

جنت میں وقت

میرے خیال میں ایسا کوئی تصور نہیں ہے، موجودہ زندگی اکیڈمی کی تربیت ہے۔ جس طرح ہم فوج میں داخلے کے بعد پی ایم اے میں اڑھائی سال کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ طالب علم یہی محسوس کرتا ہے کہ بڑا کم وقت ہے۔ وہاں سے نکل کر اس کا تقرر پتہ نہیں کہاں ہوتا ہے۔ اسے کہاں کہاں بھیجا جاتا ہے۔ ہماری زندگی بھی بالکل اسی طرح ہے۔ ہم یہاں صرف منتخب ہو رہے ہیں اور ہماری تربیت ہو رہی ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار اللہ تبارک وتعالیٰ یہ کہتا ہے، مستقرا و متاع الی حین کہ کچھ دیر کا قیام ہے۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ دنیا کو اللہ میاں نے ہمیشہ کا رامتحان بتایا ہے۔ ومالحیوۃ الدنیا الا لھو، وما الحیوۃ الدنیا الا قلیل، ومالحیوۃ الدنیا الامتاع الغرور جب ہم اپنے احساسات اور آزمائشوں کی دنیا سے نکل جاتے ہیں، تو پھر ہمیں اختیارات کی دنیا واضح ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تین ابتدائی اور بڑے ناموں میں ایک مرید، ایک متکلم اور ایک قدیر ہے۔ ایک میں وہ ارادہ کرتا

ہے، ایک میں بھرپور عمل میں لانے کی طاقت رکھتا ہے اور ایک میں وہ کلام کرتا ہے کہ یہ کام ہو جائے۔ انسان مرید ضرور ہے وہ متکلم بھی ہے، مگر قدیر نہیں۔ اللہ نے انسان کو اپنی صفات پر بنایا ہے۔ تاہم طاقت اس سے چھین لی۔ اس کا ارادہ اور کلام رہنے دیا۔ اشیاء کو اپنے مطابق ڈھالنے کی قدرت اس سے لے لی۔ یہ اس لیے چھین لی کہ وہ کبھی آزاد نہیں تھا۔ اس سے پہلے شیطان کا تجربہ بتا چکا ہے کہ اس کی فطرت نہیں بدلی اور ہزاروں، لاکھوں سالوں کی عبادت کے باوجود جب اس کو ذرا سا اختیار ملا، تو اس نے مزید اختیارات کی ہوس کی۔ وہ تکبرات میں چلا گیا اور خدا کے خلاف بغاوت کی۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا، تا کہ وہ اسے پرکھ سکے۔ لنبلو کم، یہ لفظ قرآن میں بار بار پڑھیں گے۔ لیبلو کم، لنبلو کم۔ میں نے چاہا کہ آزمالوں۔ آزمانے کے لیے اس نے قدرت چھین لی اور بے بسی کی زندگی دے دی۔ اس کا دماغ بڑا کر دیا۔ سوچوں میں ترمیم کر دی۔ بڑی محنتیں دے دیں۔ اس کو ایک پوزیشن، ایک نئی دنیا پیدا کرنے کی دے دی، لیکن اتنی آسانی سے نہیں۔ اس کو اپنے کام کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ بہت پڑھنا پڑتا ہے اور بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس میں قدرت نہیں ہے کہ اشارہ دست سے کسی چیز کو جیسے چاہے ڈھال دے۔

لیکن جب آپ کوالیفائی کر جاتے ہیں، تو پھر آپ کو جو چیز جنت میں واپس ملتی ہے، وہ قدرت ہے۔ اب آپ بھی قدیر ہو گئے۔ آپ نے بھی چاہا کہ آپ کے منہ میں انگور آئیں، انگور خود بخود چلا آئے گا۔ آپ نے سوچا بھنا ہوا تیتر آئے، وہ آپ کے پاس آ جائے گا، سماعت اور بصارت کے ساتھ آپ کی تینوں چیزیں ایک میں یکجا ہو جائیں گی۔ آپ بھی قدیر ہو جائیں گے۔ جب آپ ایک دفعہ سمیع و بصیر و قدیر ہو جائیں گے، تو اب آپ خدا کے نائب ہیں۔ اب تخلیقات کا ذمہ آپ پر چلا گیا۔ آپ کو ایک چھوٹا سا گھر دے دیا جائے گا۔ یہ چھوٹا سا گھر اتنا بڑا ہے کہ وہ پانچ سو نوری سال کی مسافت کا گھر ہے۔ گویا ایک بہت بڑی گلیکسی آپ کو عطا کی گئی۔ اب آپ سے کہا جائے گا کہ جاؤ، جو کرنا ہے، جا کے کرو، بناؤ۔ Now you are second to none۔ میں اب تمہارے سے زیادہ ماربٹائی کرنے کا نہیں ہوں۔ اب اپنی تخلیقات کو خود کرو، گھر اور جائیداد بناؤ، اور اپنے مکان کو سنوارو۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا، جس نے ایک دفعہ سبحان اللہ و بحمدہ، سبحان اللہ العظیم پڑھا، اس نے جنت میں اپنے گھر میں ایک درخت لگایا، وہاں تسبیح، اذکار، قوت اور جو کچھ ہمارے ذہن میں ہے، ایک ساتھ حرکت کر کے ایک نئی تخلیقات کا رستہ استوار کریں گے۔

آخرت کے مختلف قوانین

تجسس تو وہاں بھی رہ جائے گا، مگر اس میں انکار کا شائبہ اور شک و شبہ باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ شک و شبہ پیدا کرنے والا ثانوی نظام ختم ہو جائے گا۔ یعنی شیطان ختم ہو جائے گا۔ شیطان اکیلا فرد نہیں ہے۔ یہ ایک پورا شعبہ اور ایک بہت بڑا نظام ہے، جس کا وہ سربراہ ہے اور اس نظام کے ذریعے انسان کے جبلی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ یہ جبلتیں ختم ہو جائیں گی، صرف مثبت انکوائری رہ جائے گی۔ میرے خیال میں یہاں زمین پر جنت کے تصورات وہ شاید وہاں ایسے نہ ہوں بلکہ اگر کوئی حیرت ہونی ہے، وہ جنت میں جانے کے بعد ہوگی۔ یہاں تو ہم نے کچھ کمال اللہ کا دیکھا ہی نہیں۔ یہ تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ جب ہم اگلی دنیاؤں کو جائیں گے، ایک بہت بڑی وسیع کائنات کا مطالعہ ہمارے پیش نظر ہوگا۔

Marfat.com

وہاں ناشکری نہیں ہوگی۔ اس لیے اس کے لامحالہ بڑھنے کے امکانات بہت ہیں۔

میرے خیال میں اگلی تمام زندگی عبادت ہوگی۔ وہ عبادت، جس میں شاید اٹھنا بیٹھنا اتنا شامل نہ ہو مگر ذہن کی مکمل تائید، اللہ تعالیٰ سے بروقت رجوع اور محبت اور اس میں عمومی سرگرمی بھی اسی طرح جاری رہے گی۔ شک وشبہ اور رنج وغم نہیں رہے گا۔ آنسو نہیں گے، مگر وہ آنسو تشکر کے ہوں گے۔ خدا سے مزید علم حاصل کرنے کے ہوں گے۔ وہ ایسے آنسو نہیں ہوں گے، جو ہمیں کسی آرزو کی ناکامی پر ہوتے ہیں بلکہ شاید اس وقت بھی رورو کے ہم اللہ سے مزید آگہی طلب کر رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں بھی ذہنی ترقی نہیں رکے گی۔ زمین پر نہیں رکی، تو آسمانوں پر کیسے رکے گی۔

Marfat.com

عہدِ میثاق، اتمامِ حجت

عہد میثاق کے وقت اللہ تعالیٰ نے ہمیں سامنے کیا۔ عمومی کیٹیگری میں تسلیم کرنے کی بات تھی۔ پہلی مرتبہ مخلوقات آنکھ کھول رہی تھی۔ اس کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ میثاق میں اللہ نے ان پر واضح کیا کہ میں نے تم کو پیدا کیا ہے اور تم میری مخلوق ہو۔ انہوں نے کہا کہ ہاں تم نے ہمیں پیدا کیا اور ہم تمہاری مخلوق ہیں۔ اتنی مختصری بات ہوئی۔ اب قیامت کے دن اس میثاق اور مخلوق کے اقرار میں اس کے لیے بھلائی ہے۔ یہ رحمت کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے شاید دوزخ کی عمر بھی متعین نہ ہو۔ ہوسکتا ہے اربوں سال گذرنے کے بعد میثاق کا وہ عہد ان کے کام آئے۔ کسی سطح پر تو انہوں نے کہا تھا کہ اے اللہ ہم تجھے مانتے ہیں۔ خالدین فیھا ابدا کے باوجود اللہ نے یہ تخصیص کی ہے کہ جب تک میں چاہوں۔ یہ تو ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے۔ تاہم اہل دوزخ کے لیے بھی ایک کرم ہوسکتا ہے کہ ان کی وہ آگ ٹھنڈی یا کم ہو جائے اور ان کے وہ لباس کم بدلے جائیں۔ اگر وہ ستر مرتبہ دن میں لباس بدلتے ہیں، شاید اب پینتیس مرتبہ ہو جائیں۔ پھر ایک ہو جائے۔ یہ بھی ان کے لیے جنت ہوگی۔ میثاق کا ریلیف میرے خیال میں سب مخلوق کو ملے گا۔

عہد میثاق کا اثر ہماری جبلتوں میں چھپے کسی احساس کی صورت میں بھی موجود ہے۔ جیسے میں یہ کہوں کہ میں گھومتا پھرتا ہوں، مجھے کوئی شکل، کوئی بات یاد آ رہی ہے۔ مگر وہ کیا ہے، میں اس کو وضاحت سے بیان نہیں کر سکتا کہ بیچ میں اربوں سال گذر گئے۔ ممکن ہے، پندرہ ارب سال گذر گئے ہوں اور میرے ذہن میں نقشہ موجود نہ ہو، لیکن جب میں خدا کا نام لیتا ہوں تو لگتا ہے یہ نام میرے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ایسے لگتا ہے، جیسے اللہ ہمیشہ سے میرے اردگرد موجود رہا ہو۔ جب میں اللہ کی مخالفت کرتا ہوں، تو میں حقیقی اللہ کی مخالفت کر رہا ہوتا ہوں۔ اللہ کی محبت میں شاید ہمیں حقیقی اللہ کا تصور نہ آتا ہو۔ مگر جب کوئی خدا کی مخالفت کر رہا ہو 'او تہاڈا اللہ، تہاڈا......' تو ایسے لگتا ہے، وہ واقعی کسی اللہ کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ ہمارے شعور یا تحت الشعور کی گہرائیوں میں کہیں میثاق کا عہد موجود اور وژن باقی ہے۔ اس وقت بھی انسان کی سب سے بڑی حسرت اللہ کو دیکھنے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی انسانی دور کسی قسم کے خدا کے تصور سے خالی نہیں رہا۔ چاہے کہیں پیغمبر نہ بھی پہنچے ہوں، کسی نہ کسی شکل میں انسان ماورائی قوت میں یقین رکھتا رہا ہے۔ یہ شاید

Marfat.com

میثاق ہی کا اثر ہے کہ فلسفہ عمرانیات کے مطابق خدا نہ بھی ہوتا، تو انسان خدا تخلیق کر لیتا۔ قانون اور استحکام کے لیے۔ اس کے بغیر انسان ایک دوسرے کی بات مان ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے ایک ایسی اتھارٹی چاہیے، جس کا خوف اور اس کا اختیار اس پر مسلط ہو۔

زمانہ قدیم میں جب ایک شخص سرسراہٹ یا غیر مرئی بجلی کی گرج سنتا تھا، تو وہ کسی نہ کسی کو پکارنے کا جذبہ ضرور رکھتا ہوگا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ کوئی اسے اس آفت سے بچائے۔ پھر جب کوئی فرشتہ اترا ہوگا، یا اسے کہیں سے آواز آئی ہوگی، تو وہ کتنا خوش ہوا ہوگا۔ میرے خیال میں اللہ ہمیشہ انسان کی خوشی، اس کی حفاظت اور محبت کا باعث رہا ہے۔ آغاز میں وہ میرا بہت بڑا حفاظت کرنے والا تھا۔ وہ اب بھی میرا سب سے بڑا حفاظت کرنے والا ہے اور اس زمانہ زندگی سے گذر جانے کے بعد بھی مجھے اللہ سے بڑا دوست کوئی نظر نہیں آتا۔ وہ یقیناً رحمٰن، رحیم اور کریم ہے۔

روح کا وجودِ لازوال

یہ کیا ظاہر نہیں کرتا کہ خدا جو بھی کہتا ہے، سچ کہتا ہے کہ وجود ادھر ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ لازوال نہیں ہے اور روح اپنے حساب کتاب کے لیے آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس کے راستے بہت طویل اور کشادہ ہیں۔ وہ اربوں، کھربوں سال کی گلیکسیز کا سفر طے کر کے اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ یہ روح ایک وجود نہیں، جہنم اور جنت میں علیحدہ علیحدہ وجود پائے گی۔ یہ ایک قسم کی ماسٹر پروسیسنگ کی کلید (Key) ہے، جو جس مشین میں ڈال دو، چالو ہو جائے گی۔ اصل پروسیسنگ چپ تو روح ہے۔ مگر وجود کوئی بھی اس کو مل سکتا ہے۔ وجود اللہ کے لیے بنانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ وہ بتدریج اس کو بناتا رہتا ہے اور پتہ نہیں، ایسے کتنے وجود ہمیں ملیں گے۔ جہنم میں اللہ عذاب کا عادی نہیں ہونے دے گا، ممکن ہے، اس کے لیے ہمیں ایک ہی دن میں ستر مرتبہ وجود دیا جائے۔

مسئلہ تناسخ یا آواگون

مسئلہ تناسخ کرما پر بنیاد رکھتا ہے۔ ان کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ کرم جس کے اچھے نہ ہوں، اسے سات جنم زمین پر گذارنے پڑتے ہیں۔ اس کے بغیر اس کی مکتی نہ ہوگی۔ آواگون، تناسخ یا کرم یہ سب اکٹھے چلتے ہیں۔ جیسے کسی بندے نے اچھے کام کیے اور اس کی مکتی ہوگئی، وہ تناسخ سے نکل گیا۔ مگر دوسرا بندہ مثلاً بھگوان داس اچھے کام نہیں کرتا اس کو سزا کے طور پر اگلے جنم میں گدھے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اب وہ گدھے کی طرح پھر رہا ہے۔ ہندو کے خیال میں یہ اس کی سزا ہے، لیکن یہ سزا اس کی تب ہو، جب گدھے کو احساس ہو کہ یہ اس کی سزا ہے۔ فرض کریں، کسی شخص کو چمپینزی کی شکل میں لایا جاتا ہے۔ چمپینزی کا دماغ زیادہ سے زیادہ 750 سی سی کا ہے اور بندے کا برین 2000 سی سی کا۔ وہ اس کا کیسے احساس کرے گا کہ مجھے سزا کے طور پر چمپینزی بنایا گیا ہے۔ سزا احساس کے بغیر ہوتی نہیں ہے۔ اگر مجھے پتہ نہیں اور مجھے شعور ہی حاصل نہیں ہے کہ مجھے سزا ملی ہوئی ہے، تو سزا کس چیز کی؟

اس لیے یہ سارا سلسلہ تناسخ اور آواگون، جو کرما پر بنیاد رکھتا ہے، کبھی بھی Inherently اپنی صلاحیت پوری نہیں

Marfat.com

کرتا۔ اس میں تشنگی رہ جاتی ہے۔ چلیں کسی بے وقوف سی روح کو آپ نے سات مرتبہ اِس اور کبھی اُس جنم میں ڈالا۔ آپ جب کتا بنے، تو آپ نے بڑی وفاداری سے ثابت کیا کہ میں بڑا اچھا انسان ہوں۔ گدھے بنے، تو زیادہ بوجھ اٹھا کے اللہ کو قائل کرتا ہے کہ میں بڑا اچھا انسان تھا۔ پھر اللہ نے کہا کہ ٹھیک ہے، اس کو بخش دو۔ یہ تصور سارے کا سارا احمقانہ سا لگتا ہے۔ تناسخ میں یہ نظریہ کہ ایک روح اس زمانے سے، اس زمانے میں آ گئی، اس کا قطعاً کوئی وجود عملی طور پر نہیں ملتا۔ یہ مثالیں ہمیں فلمی کہانیوں یا دوسرے قصے کہانیوں میں نظر آتی ہیں اور سراسر من گھڑت ہیں۔

پھر ایک آدمی پر کوئی خبط بھی سوار ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میں بہت سی باتیں پڑھتا ہوں۔ ہمارے جنرل (پرویز مشرف) صاحب کو یہ ہو گیا ہے کہ میں نے کمال اتاترک بننا ہے۔ وہ کمال اتاترک کی اوٹ پٹانگ حرکات کیے جائیں گے۔ بالفرض کسی فرد کو ایک ہندو اشوکا کے ساتھ عشق ہو گیا ہے۔ وہ اس کی ہر چیز پڑھ رہا ہے اور اس کا انداز اختیار کر رہا ہے۔ بالآخر ایک دن وہ اعلان کر دیتا ہے کہ اشوکا کی روح مجھ میں حلول کر گئی۔ بات تو ٹھیک ہو گئی کیونکہ ہم آہنگی ہو گئی۔ تاہم وہ روح تو نہیں ہو گی۔ مجھے گولڑہ شریف میں ایک شخص ملتے ہیں وہ ٹوپی اسی طرح پہنتے ہیں کہ دور سے پیر نصیرالدین کی طرح لگتے ہیں۔ ایک اور شخص کو دیکھا، وہ بھی ایسے ہی لگتے ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں امیر خسرو ملنے گئے۔ واپس آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ ٹوپی تھوڑی سی ٹیڑھی ہے اور وہ بڑا ناچ کود رہا ہے۔ انہوں نے بھی اپنی ٹوپیاں ٹیڑھی کر لیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے دلی نے ٹوپیاں ٹیڑھی کر لیں۔ فیشن ہی بن گیا۔ کسی نے پوچھا، یہ کیا خرافات ہے، ٹوپیاں کیوں ٹیڑھی ہو رہی ہیں؟ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہ تو خسرو کی وجہ سے ہوا ہے۔ خسرو سے پوچھا، تم نے ٹوپی کیوں ٹیڑھی کر لی ہے۔ اس نے کہا

من قبلہ راست کردم برطرف کج کلا ہے

میں نے تو اپنے شیخ کی وجہ سے ٹوپی ٹیڑھی کی۔ جب اتنی یکسانیت ہو جائے، تو عمومی طور پر وہ روحی، بدنی، عملی اور روحانی مماثلت بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ روحیں بار بار اور ایک ہی جسم میں دوبارہ نہیں آتیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اسی خیال کو بعد میں مجدد نے اپنے مکتوبات میں پیش کیا۔ مگر انہوں نے اسم کے لحاظ سے پیش کیا اور لکھا کہ جب کوئی لفظ اپنی پوری تکمیل نہیں پا سکا تھا، تو مجھ میں آ کے یہ تکمیل پایا اور میں مجدد الف ثانی یعنی ہزار سال کے بعد آیا۔ یہ دعویٰ بڑا نامعقول اور فضول لگتا ہے۔

آدم کی اصل

یہ بنیادی طور پر Fossils کی تاریخ ہے۔ یہ میں نے انتھروپالوجی کے حوالے سے بنائی ہے۔ میں نے پورے تھیسز میں یہ کوشش کی ہے کہ محمد رسول اللہؐ رومانوی، دانشورانہ اور سائنسی لحاظ سے بھی دنیا کے سب سے بہتر انسان ہیں۔ میں اُسے اسی کروڑ سال پہلے کی تاریخ سے اخذ کر کے سب سے اولین تہذیبی اداراتی دائرے میں لے آیا۔ پھر ان دائروں میں مذہب کی پیدائش اور تعقل کی نمود کا ذکر کیا۔ جب سے عقل بڑھی ہے، خدا بڑھا ہے اور انسان کو خدا نے عقل دی ہی شناخت ذات کے لیے ہے۔ دانشورانہ استعداد کی سب سے بڑی خصوصیت ہی خدا کا جاننا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

Marfat.com

باقی جو کچھ بھی ہم دنیا میں کرتے ہیں، وہ دوسرے درجے کی اہمیت کا کام ہے۔ یہ ہماری کم تر ترجیح ہے بلکہ میں مسلمانوں کے بارے میں ایک ایسے مقررہ قانون پر پہنچا ہوں، جس میں ابھی تک تغیر نہیں ہو رہا اور وہ بڑا سادہ سا قانون ہے۔ کم تر ترجیحات کو زیادہ اہمیت، جبکہ اولین ترجیح کو کم اہمیت دینا۔ جس قوم یا ملت سے اس کی اولین ترجیح چھن جاتی ہے، اس کے پروان چڑھنے کی کوئی امید نہیں رہتی۔ پاکستان اور دنیائے اسلام میں اس وقت سب سے تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ ان کو اپنی اولین ترجیح کی کوئی پروا نہیں۔ ہم خدا سے خرافات میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ امت روایات میں کھو گئی ہے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سر کٹے مذہب کی پرستش کرتے ہیں۔ کسی دل میں خدا کی محبت اور اس کی ہمسائیگی کا جذبہ نہیں پیدا ہو رہا۔ ہم بڑے مذہبی لوگ ہیں، لیکن ہم اسی طرح کے مذہبی ہیں جیسے ہندو اپنے بتوں کی پوجا کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی مذہب نہیں ہے۔ مذہب میں زندگی، تحرک، طاقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہمارے تعلق کی منزل اول و آخر خدا خود ہو۔ میں نے مذہب کو اس سطح سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، جو خداوند کریم کا نقطہ نظر ہو سکتا ہے۔

ابراہیمؑ کی بے پناہ قدر و منزلت اور محبت اس لیے ہے کہ وہ سب سے پہلے فلسفیانہ طریقہ استدلال استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح آقا و رسولؐ کی سب سے بڑی صفات عالیہ میں سے ایک سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ بغیر علم اور دلیل کے بات نہیں کرتے۔ پورے کا پورا قرآن جدلیات ہے۔ یہ واحد کتاب ہے، جس کا کلمہ جدلیات سے شروع ہوتا ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یعنی پہلے آپ کو ان چیزوں کا انکار کرنا ہے، جو خدا نہیں ہیں، اس کے بعد آپ کو خدا تک پہنچنا ہے۔

اسی طرح ہمارا قرآن کہتا ہے ادعوا الی سبیل ربک بالحکمۃ کہ اللہ کی طرف عقل و دانش سے، حکمت سے بلاؤ۔ والموعظۃ الحسنۃ اور پھر مکالمات اچھے رکھو۔ تعلیم پر تیری سرداری ہو، گفتگو کرنے پر تیری کمان ہوتا کہ دو چیزیں مشترک ہو جائیں۔ ایک تو تیری جدلیات پوری ہو جائیں۔ انداز گفتگو بہتر اور دلیل بہتر ہو۔ جب یہ بہتر ہو جائیں تو وجادلھم بالتی ھی احسن تو اچھے طریقے سے ان سے مجادلہ و گفتگو کرو۔

یہ جدلیاتی انداز اللہ آپ کو بتا رہا ہے اس میں ان کوتاہ نظروں کی کیا گنجائش ہے؟ ان کا محاورہ اتنا فرسودہ ہے کہ جب میں ان کے منہ سے اللہ جل شانہ سنتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ ایک چبایا ہوا جملہ ہے بس۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یعنی مذہبی لوگوں میں کوئی ذہنی جدلیاتی اختراع اور کوئی نفسی ترفع نہیں ہے۔ وہ اتنے ہی کند ذہن ہیں، جتنی کوئی اور چیز ہو سکتی ہے۔ میں خدا کے بارے میں سوچتا ہوں کہ وہ یقینی طور پر ان سے تنگ آ چکا ہوگا۔ اتنے کم ذہن اور اتنے کم اختراع والے لوگ ہیں کہ خدا کے لیے بھی کوئی بہتر لفظ نہیں چن سکتے۔ وہی صدیوں کے خدا کے بارے میں پرانا محاورہ چلا آتا ہے۔ اشتہارات کی دنیا میں بدترین لوگ خدا بیچ رہے ہیں اور ان ہی برے انداز میں۔ باقی ساری چیزیں بک رہی ہیں۔ بس خدا کا تصور واحد ہے، جس پر زنگ لگ رہا ہے۔ منہ سے ایک لفظ نکالتے ہی ہیں، تو ہمیں خیال آتا ہے کہ خدا کے متعلق کچھ کہنے کا یہ بہت برا بیان ہے۔ محاورہ آگے بڑھ گیا ہے۔ انگریزی ہو گئی ہے۔ وقت جدید تر اور زمانہ کاسموپولیٹن ہو گیا ہے۔ شدتیں اور حدتیں بڑھ گئی ہیں۔ کائناتی محاورے، ٹیلی ویژن اور کیبلز آ گئی ہیں، لیکن ہم ابھی تک مسجدوں کے لاؤڈ سپیکرز میں بیٹھے ہیں۔ یہ سوچ کا بہت برا طریقہ ہے۔

تخلیقِ آدم کا نظریہ

اس موضوع پر سائنس اور مذہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مگر اس کے لیے ذرا قرآن اچھی نظر سے پڑھنا پڑتا ہے۔ قرآن حکیم میں انسان کا الگ اور آدم کا علیحدہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ انسان کو خدا نے کہا، هل اتی علی الانسان حین من الدهر لم یکن شیئاً مذکورا۔ بلاشبہ قرن ہا قرن سے انسان زمانے میں ایسے رہا کہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔ پھر خدا نے کہا کہ وہ ایک سنگل سیل اور نفس واحد تھا۔ میں نے اس پر کرم کیا، انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج۔ پھر میں نے اسے دوہرے سیل سے تخلیق کرنا شروع کیا۔ نطفه امشاج کر دیا۔ ابھی اس کے پاس سماعت اور بصارت نہیں تھی۔ نبتلیه، پھر میں نے اس مخلوق کو آگے بڑھانا چاہا فجعلنهم سمیعا بصیرا پھر میں نے اس کو سماعت اور بصارت دی۔ اب بھی یہ اس قابل نہیں تھا کہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا، تو پھر آخری مرحلہ زندگی میں انا هدینا السبیل و اماشاکر اوماکفورا۔ یہ تو ہے انسان۔

اب دوسری طرف قرآن حکیم نے ایک بہت بڑے ڈرامائی واقعہ کو بیان کیا۔ وہ آسمانوں پر اور جنت میں تھا۔ وہاں ایک آدم تخلیق ہوا۔ خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔ اس کا روحانی پروٹو ٹائپ تیار کیا۔ اب جبکہ آدم کا صرف روحانی وجود تھا، جس کی ہڈی، گوشت نہ پوست تھی، اگر وہ اسے زمین پر بھیجنا چاہتا تو اسے رکھتا کہاں، اس کے لیے قدرتی طور پر ایک جسمانی وجود زمین پر تیار ہو رہا تھا، Hommq hobilis, Homq erectus اور ان دونوں کو جوڑا گیا۔ وہ تقسیم اب بھی انسان میں اسی طرح موجود ہے۔ بدن نیچے بنتا ہے اور روح اوپر سے آتی ہے اور وہ تین مہینے کے بعد اس میں ڈالی جاتی ہے۔ یہ مکس اپ پہلے مکس اپ کی طرح ہے۔ بس اتنے فرق کے ساتھ کہ پہلے مکس اپ میں ماں باپ نہیں تھے۔

پوری آیات قرآنی یہ ہے کہ جب آدمی نے سیب یا پھل جو کچھ بھی کھایا، تو ایک دم سے اس کی شہوات بدنیہ بیدار ہو گئیں۔ جنت کے اس ماحول میں، جو روحانی اور نفسیاتی ماحول تھا، روحانی وجود ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس کو جلاوطن کیا جانا لازم تھا۔ اب یہ کس گھر میں جاتا؟ ایک روحانی وجود کو جانور نما مادی وجود چاہیے تھا۔ جب اسے نیچے بھیجا گیا، تو Dichotomy تخلیق ہو گئی۔ اس کا بدنی وجود اس کے لیے تیار تھا اور اسی کی طرف مذہب اور سائنس دونوں نشاندہی کرتے ہیں۔

سائنس یہ کہتی ہے کہ کسی کو معلوم نہیں، انسان نے کب سوچنا شروع کیا۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے، جو آج تک حل نہیں ہوا۔ اس کا حل وہ یہ نکالتے ہیں کہ جب انسان کا دماغ بالکل بے کار سطح پر تھا اور اس کا اور چمپینزی کا دماغ اکٹھے ترقی کر رہے تھے، تو ان کے خیال میں آگ کا ایک بڑا ہیولا اوپر سے آیا۔ ایک بہت بڑا شاک آسمانوں سے اس کے برین پر پڑا، جس سے اچانک اس کے دماغ کی مقدار بڑھ گئی۔ ایسے کسی آدمی کا وجود ہمیں آخری برفانی دور کے بعد تقریباً پندرہ بیس ہزار سال پہلے ملتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دم سے انسان نے سوچنا شروع کر دیا۔ آبادیاں بنانی شروع کر دیں اور اس نے بچوں کی حفاظت شروع کر دی، جو کہ پہلے ایسا نہیں تھا۔

یہ جو اوپر والا پروٹو ٹائپ ہے، اس کو زمین پر اتارتے ہوئے اللہ نے فرمایا قلنا اهبطو بعضکم لبعض

Marfat.com

عدوا کہ نیچے جاؤ، تم اس جگہ رہنے کے قابل نہیں ہو۔ اب بھی ٹھیک وہی ہوتا ہے کہ روحی وجود اوپر سے اترتے ہیں اور بدنی وجود نیچے بنتے ہیں اور دونوں اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ مذہب اس سے بھی آگے جاتا ہے، جہاں تک سائنس گئی ہیں۔ خدا نے انسانوں کی مثال چھوڑ کے جانوروں کی مثال دی ہے، وما من دابت فی الارض زمین پر ایسا کوئی جانور نہیں ہے وطائر یطیر بجنا حیہ اور فضاؤں میں ایسا کوئی پرندہ نہیں اڑتا، الا امم امثالکم، یہ بھی تمہاری طرح امتیں ہیں۔

ڈارون نے انسان کو صرف ایک امت ثابت کیا ہے۔ اس نے کوئی تھیوری نہیں دی۔ وضاحت کی ہے کہ انسان کیسے زمین پر تھا۔ اس نے اسے کلاسیفائیڈ کیا۔ خدا اس سے بہت پیچھے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تمام زندگی میں نے ایک سنگل سیل سے شروع کی ہے۔ پھر میں نے اسے ڈبل سیل کر دیا۔ ابھی تک ہمارے معدوں کے اندر وہ سنگل سیل کی زندگی Amoeba موجود ہے، جس سے خدا نے پروڈکشن چلائی ہے۔ اب حیرت کی بات، جس پر سائنس کو تعجب ہے، یہ ہے کہ چار بلین سال کوئی معمولی مدت نہیں ہے۔ اگر انسان نے 70 سے 80 ہزار سال کے عرصے میں یہ تبدیلی کی ہے تو باقی مخلوقات بھی تو ہمارے ساتھ زمین پر چلی آ رہی ہے مگر اس طویل عرصے میں زمینی زندگی میں ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کوئی چمپینزی بڑھ کے انسان کی طرح سوچنے والا نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ بالکل ہمارے ساتھ کی مخلوق ہے یا جو گوریلا آج سے دو ارب سال پہلے گوریلا تھا، وہ اب بھی گوریلا ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صرف ایک ہی جنس، جس میں تبدیلی آئی، وہ انسان ہے اور ان کی تبدیلی اس لیے آئی ہے کہ جو پہلا انسان تھا، وہ بھی ہدایت یافتہ تھا۔ کم از کم 10 ہزار سال پہلے کے آثار، جو ہمیں عراق اور چین میں ملے ہیں، ان میں سب سے پہلی رسم، جس سے جدید دور کی آشنائی ہوئی ہے، وہ موت کے بعد دعا اور پھول ہیں۔ انہیں معلوم تھا، وہ کیا کر رہے ہیں۔

زمین پر اولین سوسائٹی پریسٹ سوسائٹی (Priest Society) ہے، جن میں وہی بندہ پیغمبر ہے، وہی حکمران اور وہی ان کو زندگی کے معاملے میں گائیڈ کر رہا ہے۔ اندرونی طور پر ہدایت یافتہ انسان اور آدم میں کوئی بہت بڑا فرق نہیں۔ سوائے اس کے کہ ایک پروٹو ٹائپ جنت کا اور دوسرا زمین کا ہے۔ جب خدا نے مناسب سمجھا، دونوں کو جمع کر دیا۔ یہ جمع کرنا بھی ہماری قید ہے۔ اسی لیے فرمایا، دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔ یہ وجود قید ہے، جس میں ہمیں قید کیا گیا ہے۔ یہ خالی وجود نہیں تھا۔ اس میں بھی دو ارب سال کی پوری جبلتیں موجود تھیں۔ ان جبلتوں کو خدا سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ بقا کی جبلتیں ہیں۔ آج بھی بقا کی جبلتیں سب سے زیادہ تنگ کرتی ہیں۔ ہماری شہوات ہماری بقا کی جبلتوں کے ساتھ منسلک ہیں۔ عقل ہمیں بہت سے راستے اور تہذیب سکھاتی ہے۔ ہم میں موجود جانورانہ وجود، جو پیچھے سے ترقی کر رہا ہے، وہ ہمیں اب بھی جبلی راستے دکھاتا ہے۔

آدمؑ کی برتری

آپ کے پاس عمومی اہلیت، فرق کرنے اور سوچنے والی عقل ہے۔ جو قینچی کی طرح چلتی اور خیر و شر کو کاٹتی ہے۔ یہ عقل اچھے اور برے کی تمیز اور حق اور ناحق میں فرق کرتی ہے۔ یہ وہی امانت عقل و شعور ہے، جو اللہ نے تمام کائنات کی

Marfat.com

اہلیت والوں کو پیش کی تھی۔ سب انکار کر گئے اور ڈر گئے...... وحمل الانسان انسان نے کہا، ایسی کیا بات ہے، میں اس امانت کو اٹھالیتا ہوں۔ ٹاسک بہت چھوٹا سا ہے۔ خدا کو ماننا ہی تو ہے۔ کوئی بڑی بات نہیں۔ میں مان سکتا ہوں۔ خدا کہتا ہے، اس نے غلطی کی، عجلت سے کام لیا۔ انه کانا ظلوماً جهو لا۔ یہ اپنی عقل کو بہت زیادہ اہمیت دے گیا۔ آج تک یہ حماقت انسان جاری ہے۔ اگر چند ایک لوگ نہ ہوتے، پیغمبروں کے بعد اولیاء اللہ تعالیٰ العزیز، نیک نیت مسلمان اور مومن نہ ہوتے، تو شیطان کا دعویٰ مکمل ہوتا کہ واقعی انسان خلافت کے اہل نہیں تھا۔ خلافت ارضی تو ہے ہی کوئی نہیں۔ یہ تو ایک ٹیسٹ گراؤنڈ ہے۔ وہ بلین ہا بلین گلیکسیز، جو آسمانوں میں بکھری پڑی ہیں، جہاں سونے، چاندے، گھونگے اور موتی کے دریا بہہ رہے ہیں، کی امانت کی تیاری کے لیے انسان کو زمین پر بھیجنا مقصود تھا اور انسان بہت سارا فیل ہو گیا۔ مگر لیبارٹری کا معیار بھی بڑا کم ہے۔ رسولؐ گرامی مرتبت سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا، جب تک اللہ اللہ کہنے والا ایک شخص بھی زمین پر موجود ہے، قیامت نہیں آئے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر سات ارب میں سے ایک شخص اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے، تو وہ لیبارٹری اپنا کام کر رہی ہے۔

دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔ یہ عبوری کیمپ ہے اور اس میں مسافروں کو رکھا گیا، ٹیسٹ کیا گیا۔ ان کی صلاحیتیں پرکھی گئیں۔ عقل و معرفت دیکھی گئی۔ جانچی اور پرکھی گئی۔ کچھ لوگ کامیاب ہو گئے اور نعمت کو پا گئے۔ کچھ نے ترجیحات کا اندازہ نہ لگایا جب قبر کے دھانے پہنچے، تو ایک سوال کیا گیا کہ برخوردار آ گئے ہو، کھایا پیا، دنیا کی دولت سمیٹی، ہم نے زندگی کے ہر مقام پر آپ کو کوئی نہ کوئی سہولت مہیا فرمائی۔ اب یہ بتاؤ کہ جو خط تقسیم کرنا تھا، کر دیا؟ من ربک؟ اب آپ نے جواب دینا ہے۔ جو طلب زندگی بھر آپ کے سر پر سوار رہی، وہی جواب منہ سے نکلے گا۔ خدا نہیں نکلے گا۔ ایسے وقت منہ سے لا اله الا الله نہیں نکلے گا۔ اسی بات پر اللہ فیصلہ دے گا۔ قبر ایئرپورٹ اور گیٹ وے ہیں۔ گیٹ وے ٹو گلیکسیز۔ ادھر جنت کی گلیکسیز ادھر جلتے ہوئے جہنم نظر آ رہے ہیں۔ پاسپورٹ دیا گیا۔ سوال پوچھا گیا۔ لا اله الا الله کا ڈر ہے نا؟ وہاں بھی صاحبان عالی پر صاحب کرم نے تھوڑی سی گنجائش رکھی ہے۔ اگر اللہ کو بھلا دیا، تو محمد رسولؐ کو تو یاد رکھا ہو گا۔ دوسری سائیڈ کا سوال دے دیا۔ نوازشات عالی یہ ہوئی کہ من ربک کے بارے میں کہا، چلو یار میں تو دور تھا، نظر نہیں آتا تھا۔ محمدؐ تو تمہارے پاس ہیں۔ ان کو جانتے ہو، وہ کون تھے؟ یہ اس لیے کہا کہ جس کو محمد رسول اللہ یاد آ گیا، پہلا حصہ بھی یاد آ جائے گا۔ فوراً کہہ دے گا۔ لا اله الا الله محمد رسول الله۔

آدھے دن کا اضافہ

ہم اس حدیث مبارک کے مطابق کہ شاید دنیا کی زندگی میں آدھے دن کا اضافہ ہو جائے، یعنی مزید پانچ سو برس، ہم ان پانچ سو برسوں سے گذر رہے ہیں۔ میں نے حضرت دانیال کی بات نقل کی تھی کہ ایک دن اور ایک دن اور ایک آدھا دن۔ حضرت دانیال کو دو ہزار برس تو گذر ہی گئے اور میرا خیال ہے ذرا اڑھائی سو برس آگے بھی چلے گئے ہیں۔ یہ آدھا دن گذر رہا ہے۔

یہ سوال کہ آیا ہماری دنیا اس صدی سے آگے جا رہی ہے، فضول سا گیس ورک ہے۔ ویسے نوسٹرڈیمس نے اس کی تین ہزار سال مزید مدت لکھی ہے۔ بڑے حادثے اور ایک بڑی جنگ، جو بہت قریب ہے، کے بعد بھی دنیا ایک ہزار سال تک جئے گی۔ جیسے کہ میں نے کہا کہ ایک بندے تک جائے گی۔ اس کے بعد جب مکمل طور پر کفر و الحاد اور انکار خداوند ہو گا، اس کے بعد لیبارٹری کے فنکشن کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ دنیا کا ٹائم پانچ سو برس ہے۔ وہ ایک بڑے حادثے تک نزول مسیح و مہدی تک ہے۔ اس کے بعد قیامت کا دور شروع ہو جائے گا۔

حدیث رسول پر غور کریں کہ ایمان فائدہ نہیں دے گا، جب دجال کا خروج ہو گا' دابۃ الارض ہو گا اور جب سورج مغرب سے نکلے گا۔ یہ تین بڑی نشانیاں ہیں۔ دجال کا خروج میرے نزدیک ہو چکا ہے۔ دابۃ الارض کی بھی اگلے پانچ سات برسوں میں توقع ہے۔ جس طرح یہ لوگ جینٹکس میں لگے ہوئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی سائیکک قسم کی تبدیلی اور جانور کو انسانی ذہن نصب کر دیں۔ وہ ایک دم سے نئی جہت پا جائے۔ جانور کی اپنی سائیکک صلاحیتیں ہم سے زیادہ ہیں۔ گدھا شیطان اور مرغ فرشتے کو دیکھ لیتا ہے۔ اس میں انسانی ججمنٹ بھی داخل کر دی جائے، تو وہ بڑا عجیب و غریب ہی جانور بن جائے۔

پھر حضورؐ نے فرمایا کہ جانوروں سے انسان کلام کرے گا۔ ہو سکتا ہے، اس قسم کے تجربات کسی جانور کو غیر معمولی صفات سے مزین کر دیں۔ چنانچہ دابۃ الارض کا وجود بڑا امکانی نظر آتا ہے۔ قیامت کی نشانیوں میں ترتیب دجال کی آمد، اس کے بعد عیسیٰؑ کا نزول، پھر دابۃ الارض اور آخر میں سورج کا مغرب سے طلوع ہونے کا عمل ہے۔

Marfat.com

صور اسرافیل کے پراسیس

یہ بھی سادہ سائنس ہے۔ یہ ایک گونج ہے۔ اصل میں یہ تین گونجیں ہیں۔ پہلی گونج اس وقت ہے جب زمین رگڑ کھاتی ہوئی عدم توازن میں چلی جائے گی۔ پھر دوسرے مدار سے نکلنے کے وقت کی ہے، جو چالیس برس بعد ہوگی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ سارا عمل مرئی ہوگا۔ پراسیس شروع ہوتے ہی اس کی آواز آنی شروع ہو جائے گی۔ انسانی کانوں میں ایک بڑی آواز آئے گی جبکہ تیسرے مرحلے میں مکمل دھماکہ ہو جائے گا۔

صور اسرافیل کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ زمین کے مدار سے نکلنے کے پراسیس کو جو فرشتہ سپروائز کرتا ہے، وہ اسرافیل ہے۔ اس کے مدار سے نکلنے کی آواز Methodology ہے، جو ہر صورت آئے گی۔ جیسے جب کوئی جہاز آواز کی رفتار کو توڑتا ہے تو کتنی خوفناک آواز ہوتی ہے۔ اسی طرح اس وقت زمین جہاز کی طرح ہوگی۔ جب یہ سورج کی طرف بڑھتے ہوئے سکڑے گی اور انتہائی تیزی سے اوپر بڑھے گی تو پھر آپ سوچ لیں کہ کتنا خوفناک خلا میں دھماکہ ہوگا، جس میں کوئی ذی حیات زندہ نہیں رہ سکتا۔

شمسی نظام کی قیامت

پوری کائنات کی قیامت بالکل نہیں ہوگی، کیونکہ پوری کائنات کی قیامت کا ذکر اللہ قیامت کے باب میں نہیں کرتا۔ بلکہ بڑی وضاحت سے خدا کہتا ہے کہ تمہاری Constellation ختم ہو جائے گی۔ سورج اور اس کے ساتھ کے ستارے ماند پڑ جائیں گے۔ ان کے کیمیکل پراسسز اور جو ایٹم وہاں پھٹ رہے ہیں، ان کی توانائی ختم ہو جائے گی اور ویسے بھی زمین ایک ایسے معیار پر کھڑی ہے کہ ایک لاکھ میل ادھر ہو جائے، تو جل جائے اور ایک لاکھ میل ادھر ہو جائے تو منجمد ہو جائے چونکہ یہ انتہائی منضبط اور کھچے ہوئے توازن پر کھڑی ہے، اس کو ویسے ہی ختم کرنا بڑا آسان ہے۔

یہ زمین تو ایک کیمپ ہے، کوئی کائنات نہیں ہے مستقراً و متاع الی حین یہ تھوڑی سی مدت، تھوڑا سا وقفہ اور تھوڑی سی حیات ہے۔ وہ پوری ہونے کے بعد خدا کہتا ہے کہ ہم زمین کو ایک نئی زمین سے بدل دیں گے اور زمین کو جب ایک نئی زمین سے بدلیں گے، تو ظاہر ہے وہ اس Constellation میں چپٹی ہوگی، جیسی توے کی روٹی ہوتی ہے۔ اس میں گہرائی نہیں ہوگی۔ وہ زمین جس پر حساب کتاب ہونا ہے، وہ بالکل اور زمین ہے۔ آپ نے جہاں جانا ہے، وہاں جانے کے لیے آپ نے یہ عبوری کیمپ چھوڑ ہی جانا ہے، تو پھر آپ کو اس زمین و آسمان کی کیا پروا؟ جب دوسری جگہ جانا ہے، تو ظاہر ہے، دوسری جگہیں موجود ہوں گی، تو جائیں گے۔

بالائے کائنات کسی جگہ جنت موجود ہے اور سورج موجود ہے تو یہ ایک چھوٹا سا حادثہ ہے، جو ایک چھوٹی سی جگہ پر ہے مگر ہمارے لیے قیامت ہے۔ اس کو اللہ نے زلزلہ کہا ہے۔ یہ ایک شیک ہوگا، جس کے نتیجے میں ہماری زمین اپنا بیلنس کھو بیٹھے گی۔ زمین اور چاند مل جائیں گے۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ خداوند کریم نے لفظ استعمال کیا ہے کہ زمین اور چاند آپس میں مل جائیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کا جو کشش ثقل کا داخلی نظام ہے، وہ مقناطیسی کشش ختم ہو جائے گی

Marfat.com

اور جو طاقت اور کشش ہے، وہ ان کو کھینچ لے گی۔ جس طریقے سے چیزیں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں، اسی طرح وہ دوبارہ آپس میں مل جائیں گی اور ہو سکتا ہے کہ ان کے توسط سے Constellation کی تباہی کے بعد اتنی بڑی زمین تیار ہو جائے، جس پر سارے لوگ کھڑے ہو سکیں۔ یہ کوئی اتنی بڑی قیامت نہیں ہے۔ قیامت تو ہمارے لیے ہے۔ اس قیامت کا خاص طور پر ہمارے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ انسان سے ورا کوئی قیامت نہیں۔

باقی کائناتوں کی قیامت

قریباً قریباً جس کی ججمنٹ ہو رہی ہے، اس کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ جو کرہ امتحان میں ہے، اس کا وقت ختم ہو رہا ہے بلکہ خاوند کریم جب ایک لحہ بے نیازی اور الصمد میں آئے گا، تو پوری کی پوری کائنات ختم کر دے گی۔ کل من علیھا فان یہ قانون اللہ ہے کل من علیھا فان کی جب نوبت آئے گی، تو پھر ساری کائناتیں ختم ہو جائیں گی۔ یہ مرحلہ ہمارے یوم حساب سے بعد کا لگتا ہے۔ اصولاً کہہ دیا گیا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گی جب سب کچھ ختم ہو جائے گی، ہر چیز مر جائے گی۔ مجھے نہیں پتہ، حضورؐ نے فرمایا کہ جب دوبارہ اٹھایا جائے گا تو موسیٰ مجھ سے پہلے اٹھیں گے کہ بعد میں اٹھیں گے۔

یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔ برین میں اس کو Aside کہتے ہیں۔ Dramatic Aside ایک وقت ہوگا، جب اللہ تعالیٰ Dramatic Aside میں جائے گا۔ اس کو ہم کہتے ہیں کہ ایک آدمی اکیلا ہو کے پورا ڈرامہ کر رہا ہے۔ اپنی بات کر رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا، وہ اس پورے ڈرامے میں اکیلا ہو جائے گا۔ وہ کہے گا کہ کیا مجھے اس سب سلسلے کو مزید جاری رکھنا چاہیے؟ کیا مجھے اس کی ضرورت ہے؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرے گا کہ کیا اسے مزید چلاتے رہنا چاہیے؟ چونکہ اللہ کے قول سے کسی کا سچا قول نہیں، تو میرے خیال میں واحد چیز جو نسل انسان، یا دنیا یا پوری کائنات کا دوبارہ اعادہ کرے گی، انہیں واپس لا سکتی ہے، تو وہ اللہ کا وعدہ ہے۔ جب خدا یہ کہے گا کہ میں نے یہ تو کہا تھا کہ کل من علیھا فان مگر ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ میں دوبارہ بھی احیا پر قادر ہوں۔

لگتا ہے کہ ہر ذہین آدمی ایک وقت میں تنہا ہو جاتا ہے۔ وہ اکیلا سوچتا ہے۔ شاید خدا ایک ایسا حجاب تیار کرے گی، جس میں مخلوقات کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ وہ وقت ہے جب کوئی کائنات نہیں ہوگی۔ یہ وقت صرف اس کے ذہن میں آئے گا کہ بس بھئی بس۔ مثال کے طور پر میں بہت سی چیزیں سوچتا ہوں۔ عمارتیں بنا رہا ہوں۔ کام کر رہا ہوں۔ لوگ بھرتی کر رہا ہوں اور کرسی پر ذہن میں بہت کچھ لے کے بیٹھا ہوں۔ پھر اچانک میرے ذہن میں آتا ہے کہ یہ کیا بکواس ہے۔ کن خرافات میں میں لگا ہوا ہوں۔ جونہی آپ اٹھتے ہو، ہر چیز جو آپ نے بنائی ہوتی ہے، وہ ختم ہو جاتی ہے۔

خدا کے بارے میں یہ ثنویت نہیں ہے۔ وہ جو سوچتا ہے، ہو رہا ہے۔ اس کی قدرت ساتھ ساتھ جاری ہے۔ پھر جس دن اس نے کہا، چھوڑو جی، بہت ہو گیا، بہت بنا لیا۔ اس دن سارا کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس کے ذہن میں یہ سارا کچھ ہے اور کہیں بھی نہیں ہے۔ سارا منصوبہ اس کے برین کا ہے۔ سارا اختتام اس کے برین میں ہے۔ ابھی تو بڑی منصوبہ بندی فرما رہے ہیں۔ وہ ابھی بھی تخلیق کر رہا ہو۔ مگر ہماری دنیا یا دوسری کوئی ہے، تو اس کا پلان کر کے ختم کر بیٹھا ہے۔ جنت اور دوزخ میں جانے کا اسے علم ہے۔ کیوں نہ ہو۔ اس نے جنت کی ان کے احوال دیکھتے ہوئے پہلے سے اوسط رکھی ہوگی کہ اس میں تین

Marfat.com

چالیس فیصد آئیں گے یا زمانوں کے تغیر کے ساتھ پانچ فیصد مزید آئیں گے۔ اس نے کہا کہ تب تک میں دنیا سلامت رکھوں گا، جب تک ایک آدمی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے۔ یہ ہے اس پوری دنیا کا معیار۔ نہیں ہے، تو نہیں ہے۔

یومِ حساب یکساں یا الگ

ہماری زمین کا یوم حساب ایک ہی دن ہے۔ باقیوں کے ساتھ نہیں۔ اگر اللہ میاں نے فیصلہ کر رکھا ہو کہ ایک دن ہی ساتوں زمینوں پر تباہی آنی ہے، تو وہ علیحدہ بات ہے۔ ہم یوم حساب لوکل یعنی ہمارا ہے۔ اس کا کوئی تعلق دوسری زمینوں سے نہیں۔ اس زمین پر اس کے مخاطب ہم ہیں۔ ہم نے ہی اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے، اس لیے یہ ہمارا یوم حساب ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ ایسے میں بھی جب کوئی جنت میں جا رہا ہو یا کوئی جہنم میں بھیجا جا رہا ہو، اللہ کی کوئی نئی مخلوق پل رہی ہو، بڑھ رہی ہو، حضورؐ کی حدیث مبارک ہے کہ جب سب کا حساب و کتاب ہو جائے گا۔ لوگ جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے، تو پھر بھی جنت میں جگہ بچے گی۔ اللہ نئے لوگ پیدا کرے گا اور ان کا نئے سرے سے حساب کتاب ہوگا۔

سائنس اس سے اتفاق کر چکی ہے کہ ایک بگ بینگ نہیں ہوا۔ ایک سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق انہوں نے دوسرے بگ بینگ کی آواز بھی سن لی ہے۔ ابھی کم از کم سات بگ بینگ کی آوازیں آتی ہیں۔ سات کائناتوں کی وسعت میں سات زمینیں پل رہی ہیں۔ اسی لیے تو دوسری زمین مل نہیں رہی۔ اگر وہ اس کائنات کی زد میں ہو تو ملے، وہ تو دوسری کائنات کے ورا ہے اور ان کے درمیان کی رکاوٹیں کون عبور کرے؟ کیا کسی کے بس کی بات ہے؟

دوزخ میں جلنے کا عمل

میں نے اس پر غور کیا ہے کہ یہ سیکنڈ Casting (ڈھلائی) ہے۔ اسے ایسے دیکھیں کہ ہم ایک چیز بناتے ہیں۔ وہ خراب نکلتی ہے، مگر ہم میٹریل ضائع نہیں ہونے دیتے۔ اسے دوبارہ بھٹی میں ڈال دیتے ہیں۔ دو چار چیزیں ایسی ہیں، جس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ ڈھلائی طویل عرصہ جاری رہے گی۔ اس سے پہلے بھی شاید ہم ارب ہا ارب سال کے عذابوں سے گذر کے انسان بنے ہیں۔ پھر اس پراڈکٹ میں نقص آ گیا۔ جہنم میں وہی لوگ جائیں گے، جو مکمل ناکام ہوں گے۔ باقی لوگ تھوڑی بہت کانٹ چھانٹ کے بعد باہر نکل آئیں گے۔ جیسے مسلمان ہیں۔ چھوٹی موٹی خطا معاف کی گئی، آگ میں رہے، عذاب و ثواب سے گذرے، اس لیے خدا نے کہا ہے کہ ان کو بخش دیا جائے گا۔

مگر بت پرستوں کے بارے میں اللہ نے کہا ہے کہ ان کو سو مرتبہ بھی دنیا میں بھیجوں، تو پھر بھی وہ کافر ہی رہیں گے۔ وہ مکمل ناکام ہیں۔ مکمل ناکامی کے حوالے سے ایک بڑا سوال میں حل نہیں کر پایا کہ ایسے لوگوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ اس کا جواب جزواً بھی آتا ہے کہ یہ شاید ان لوگوں کی قدر افزائی کرنا مقصود ہے، جو بخشش حاصل کر چکے ہوں گے۔ مثال کے طور پر مجھے اچھا بننا ہے اور میں کچھ دشواریوں سے گذر کر آیا ہوں، تو میرے راستے میں اللہ کا یہ انصاف حائل ہے کہ برے کو سزا ملے گی اور اچھے کو جزا ملے گی۔ وہ شاید اس لیے بھی جہنم میں جائیں گے کہ اچھوں کو پتہ لگے کہ خدا کا وعدہ سچ ہے۔ ان کو سزا ملنی چاہیے اور ملے گی۔ ورنہ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔

Marfat.com

دوسری بات یہ کہ ہوسکتا ہے، خدا نے انسانی Chip بناتے ہوئے روح میں اپنے ہی حکم سے لامحدودیت اور ہمیشہ کی زندگی رکھ دی ہو۔ اب وہ مرتو سکتے نہیں، زندگی ہمیں بھی عطا ہوئی، انہیں بھی عطا ہوئی۔ اچھے اور بروں سب کو دی گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ لامحدودیت کرہ ارض میں ودیعت ہے۔

یہ جہنم کا نقشہ بھی کوئی عجیب وغریب نہیں ہے۔ زمین کی سطح کے اوپر ہم بس رہے ہیں۔ اگر زمین کے اندر ارضیاتی سروے کو دیکھیں تو آپ کو بالکل جہنم ہی لگے گا۔ نیچے دریا بہہ رہے ہیں۔ زمین کی موٹائی اور اس پر پہاڑوں کی موٹائی 2.7 ہے۔ جس سیال پر پوری زمین کھڑی ہے، اس کی موٹائی 3.5 ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اتنا بڑا سیال دریا نیچے چل رہا ہے، جس کی موٹائی 3.5 ہے جبکہ اوپر پہاڑوں کا حجم 2.7 ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نیچے بہنے والی سیال دھاتیں یا جو کچھ بھی زمین کے اندر بھڑکتے ہوئے الاؤ چل رہے ہیں، وہ اتنے گہرے، گاڑھے اور اتنے سُست رفتار ہیں کہ ان کی موٹائی پہاڑوں سے بھی زیادہ ہے۔ صحیح نقشہ جہنم کا نظر آتا ہے۔ آگ، زلزلے اور زمین کی تہوں میں گیسز اور نمک کے پہاڑ ہیں اور وہ اس آگ میں بھی موجود ہیں۔ پتھر اس کا ایندھن ہیں۔ یہ گلیکسیز کرسٹ ہیں اور جنت کے بالکل نیچے کرہ ارض کا جہنم ہے۔

قیام، جنت و دوزخ

فاما الذين شقو ففى النار لهم فيها زفير و شهيق خالدين فيها مادامت السموت و الارض الا ماشآ ربک ان ربک فعال لمايريد و اماالذين سعدوا ففى الجنته خلدين فيها مادامت السموت والارض الا ماشاء ربک عطاءً غير مجذوذ

(جو بدبخت ہوں گے، وہ دوزخ میں جائیں گے اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں۔ الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرا رب پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے، وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے، جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔ الا یہ کہ تیرا رب کچھ اور چاہے۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی، جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ (سورۃ ہود، ۱۰۶،۱۰۸)

یہ آیت بہت سارے فلسفیوں کو اس شک میں ڈالتی ہے کہ بالآخر گناہ گار بخشے جائیں گے اور جنتیوں کی بشارت جنت ایک دن ختم ہو جائے گی، کیونکہ زمین و آسمان بالآخر کل من علیھا فان ہے۔ ظاہر ہے، جب یہ ختم ہوں گے، تو باقی افسانہ بھی ختم ہو جائے گا، مگر مجھے ایک بات بتائیے کہ ستر اسی برس ایک بندہ جی لے، تو ساری دنیا اس سے تنگ آجاتی ہے اور اگر آپ ستر کروڑ یا دو ارب سال جئیں گے تو ظاہر ہے آپ کو زندگی اتنی اہم نہیں لگے کہ آپ اس کے تسلسل کی ہوس کریں۔

خدا کے دونوں وعدے بڑے واضح ہیں۔ اللہ نے دوزخیوں کے بارے میں کہا ہے کہ ان کو میں ستر مرتبہ بھی دنیا میں بھیجوں، تو یہ پھر بھی وہی حرکت اور ارتکاب جرم کریں گے۔ میرا انکار کریں گے۔ خدا ایک فیصلہ دے رہا ہے کہ یہ اپنی اصلاح نہیں کر سکتے۔ یہ ناکام کیس ہیں۔ یہ انسانی ججمنٹ کے ناکام کیس ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں، جو کسی نہ کسی طرح پاس ہو گئے۔ انہوں نے جنت کے لیے کوالیفائی کرلیا۔ وہ جنت میں چلے گئے تو دعوۃ السمٰوات ہو یا نہ ہو۔ دنیا رہے نہ رہے، جنتیوں کی مزید کرب و بلا کوئی نہیں۔ یہ فیصلہ کن عنصر ہے، چاہے اللہ یہ زمین و آسمان منسوخ بھی کردے۔

Marfat.com

اگر آج کا انسان نکل کے مریخ کو جانے کی کوشش کر رہا ہے تو مطلب کیا ہے کہ یہ ذہین لوگ ہیں، جو مریخ میں آباد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ ایک خیال یہ پایا جاتا ہے کہ ایک نہ ایک دن زمین تباہ ہو جائے گی۔ خدا نے تو واضح طور پر بتا دیا ہے کہ زمین تباہ ہوگی۔ سورج گدلا پڑ جائے گا۔ ستارے بجھ جائیں گے۔ اس کے بعد بھی زندگی ہے۔ قرآن کے اپنے پراسس میں یہ ہے کہ ایک چیز کے تباہ ہونے سے دوسری چیز کی تعمیر نو نہیں رکتی۔ ممکن ہے، کائنات کے اس پورے نظام کی ضرورت ہمیں جنت میں جانے کے فوراً بعد ہی نہ رہے۔ یہاں سے وہ آسمان اور گلیکسیز نظر آ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ موت کے بعد ہمیں اس قسم کی تفہیم کی ضرورت نہ رہے اور ہم ایسی کائناتوں کا رخ کریں، جن میں اس کائنات کے تخلیقی وجود کی کوئی وجہ باقی نہ رہ جائے۔ ہو سکتا ہے، یہ کم صلاحیت کی کائنات ہو اور کسی ایسی جگہ آپ جائیں، جہاں آپ محض تصور سے ہر چیز تخلیق کر رہے ہوں۔ ممکن ہے، جب یہ کائنات ختم ہو جائے تو انسان اتنا تربیت یافتہ ہو جائے کہ وہ اپنی کائناتیں خود تعمیر کرے۔ کیونکہ انسان بھی مرید ہے، ارادہ کرتا ہے۔ قدیر ہے، قدرت رکھتا ہے اور متکلم ہے، کلام کرتا ہے، خدائی صفات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے اور ایک وقت ضرور آ جائے کہ جنتی اپنے اردگرد نئی کائناتوں کی تخلیق کی پروانہ کریں۔ ہو سکتا ہے، آنے والی دنیاؤں کے یہ چھوٹے چھوٹے خدا ہوں۔

دوزخ کی بات چل رہی ہے۔ چونکہ اللہ رحمت کا وعدہ تخلیق کے لیے کر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ دوزخیوں کو پچاس کروڑ، دو چار بلین سال کے بعد جہنم کی آگ سے نجات دے دے۔ ہم نے یہی دیکھا ہے کہ ہر کہیں جلتا ہوا ستارہ دو چار ارب سال میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ان کے لیے بھی یہی رحمت اور کرم کی گنجائش ہے کہ دس پندرہ بیس ارب سال بعد وہ آگ ٹھنڈی ہونی شروع ہو جائے اور ان کو کسی قسم کا ریلیف مل جائے۔ یہ بھی اللہ کے کرم اور رحمت کی وجہ سے ہوگا۔ ورنہ وہ اس کے مستحق قرار نہیں پاتے۔

قرآن ہمیشہ کثیر کائناتی تصور دے رہا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ میں ایک دنیا یا ایک کائنات بنا کے تھک گیا ہوں۔ وہ کہتا ہے، میں ہر روز کئی تخلیقات کے عالم میں ہوتا ہوں۔ وہ جینئس ہے۔ یہی بات اللہ کی بہت پسندیدہ ہے۔ وہ یورپی تصور یہوداہ/ یہود کا خدا نہیں ہے۔ یہودیوں کا خدا یا وہ ایسا گاڈ نہیں ہے، جو بچے کوئی بیٹا پال رہا ہے۔ وہ اسلام کا اللہ ہے، وہ اللہ، جس کی صفات سے قرآن بھرا پڑا ہے، جس کی طاقتوں کا شمار، جس کے انداز فکر کے مناسبت سے ہم لوگ صرف ذہنی طور پر اس کی عبادت کر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ محسوس ہونا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں یہ فخر بخشا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم کائنات میں اتنے بڑے دانشور سے وابستہ ہیں، جو تخلیق اور تعمیر نو میں اکیلا ہے جو حیات و موت پر قادر ہے، حی و قیوم اور رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ سب انسان کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ بجائے اس کے کہ لوگ خدا کے وجود پر سوچیں کیونکہ ہمارے پاس کوئی ڈیٹا نہیں ہے، ہم اتنا کر سکتے ہیں کہ اس کی موجودگی کا تعین کریں مگر جب ہم جان لیں کہ وہ ہے، تو ہمارے پاس کسی چیز، کسی شخص یا کسی سسٹم کی پیروی کی دلیل نہیں رہ جاتی۔

جنت میں کوالیفائی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عنصر خارج ہو گیا، جو خدا سے مزاحمت کا عنصر ہے۔ اب اگر نفس کی وہ کیفیت ہی نہیں ہے، تو پھر خدا لوگوں کو تباہ و برباد کیوں کرے گا؟ جو اس میں اتنا یقین رکھتے ہیں، انہیں دوبارہ کسی امتحان سے نہیں گذرنا ہوگا۔ ہاں عقل کے امتحان ہو سکتے ہیں، کیونکہ خدا نے کہا ہے نرفع درجات من نشا وفوق کل ذی علیم

Marfat.com

کل من علیها فان

اللہ کا بنیادی قانون ہے کہ وہ جب کل کا لفظ استعمال کرتا ہے تو وہ ایک کیٹیگری پر محیط ہوتا ہے۔ مثلاً کل نفس ذائقہ الموت کا لفظ استعمال ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر ذی حیات کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے اور ہر وہ چیز، جس میں کیفیت نفس موجود ہے، اس کو موت آنی ہے۔ موت کے پیٹرن جدا ہیں۔ جیسے ایک درخت مرتا ہے، ایک انسان مرتا ہے، ایک کیڑا مرتا ہے مگر ہر حیات کو موت آنی ہے۔ نفس حیات سے معتبر ہوتا ہے اور ہر حیات کو موت آنی ہے مگر جب خدا قیامت کا ذکر کرتا ہے، تو وہ تخصیص کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ وہ قیامت نہیں ہے، جس کو کل من علیہا فان کہتے ہیں۔ یہاں لفظ فنا ہے۔ اس کا مطلب ہے، ہر وہ غیر اللہ شے، جو خدا سے باہر تخلیق کی گئی ہے، وہ تمام کائناتوں پر حاوی ہے۔ وہ ایک ذہنی کیفیت ہے، جس میں اللہ بیٹھے بیٹھے کہے کہ میں ان میں سے کسی کو نہیں رکھنا چاہتا اور وہ وہاں نہیں ہیں۔ کیونکہ اللہ کا ارادہ، خیال اور اس کا لفظ اکٹھا چلتا ہے۔ وہ بیٹھ کر کہتا ہے I don't need any of these things, and every thing will be lost. پھر کہتا ہے کہ چلو بیچ میں سے دو چار چیزیں دوبارہ پیدا کر لو۔

تو کل من علیہا فان کا لفظ قیامت پر لاگو نہیں ہوتا۔ وہ ایک لوکل چیز ہے، جو ایک سولر سسٹم میں برپا ہونی ہے۔ اس میں زمین کی تباہی ہے اور اس میں زیادہ سیارے بھی نہیں ٹوٹنے۔ اس میں صرف ہماری Constelation خراب ہونی ہے۔ اذاالشمس کورت، سورج لپیٹ دیا جائے گا واذالنجوم انکدرت اور ستارے گدلے پڑ جائیں گے۔ یہ صرف سورج اور اس کی Constellation کی موت ہے۔ ظاہر ہے زمین اس کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ یہ انجماد کی حد تک سرد ہو جائے گی، یا کلی طور پر جل جائے گی۔ کشش ثقل کے دائرے ختم ہو جائیں گے۔ چاند اور سورج پھر سے اکٹھے ہو جائیں گے۔ یہ ساری کی ساری لوکل صورتحال ہے۔ ان کا کائنات سے کوئی واسطہ نہیں۔ اگرچہ سورج کی توانائی کم از کم مزید دس ارب سال چل سکتی ہے، جبکہ ہماری زمینی زندگی کا عرصہ شاید ہزار سال سے زیادہ محیط نہ ہو۔ تو اس میں بھی امکان وہی ہے، جو اللہ قرآن میں دے چکا ہے۔ چاہے سورج دس ارب سال کے بعد ٹھنڈا ہو یا اس کے حکم سے ایک دن میں ٹھنڈا ہو جائے، اس کے علاوہ سائنسدانوں نے کسی گلیکسی یا اپنے سولر سسٹم کی تباہی کا کوئی اور امکان پیدا نہیں کیا۔ انہوں نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ کوئی بڑا حادثہ وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔

جیسے اللہ نے کہا کہ تم کس بات پر ناز کرتے ہو، میں آسمانوں سے ایک بڑا پتھر پھینک دوں، تو تم سب ختم ہو جاؤ گے۔ یا کوئی سیارچہ کہیں سے آکر ٹکرا جائے اور تمہاری دنیا کو تباہ و برباد کر کے رکھ دے۔ یا اللہ تعالیٰ اچانک اس چین ری ایکشن کو جو ہیلیم و ہائیڈروجن وغیرہ کا سورج میں جاری ہے، اسے ختم کر دے، ایٹم پھٹنے بند ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں اچانک ہر چیز یخ بستہ ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں انسان اللہ کے ساتھ اتفاق کر رہا ہے کہ جو طریقہ تو نے تباہی کا بتایا ہے، یہ بالکل درست ہے۔ زمین کشش ثقل سے نکل جائے گی اور کھٹ سے چاند میں جا پڑے گی۔ چاند سورج سے جا ملے گا اور تمام Constallation ایک ہو جائے گی۔ شاید ہم کسی اور گلیکسی کا حصہ بن جائیں۔ زمین پھر زندہ کی جائے مگر نئی شکل میں اور اب یہ چپاتی کی طرح چپٹی ہو گی۔

Marfat.com

غیب کا تصوّر

بالعموم لوگ غیب سے مراد ایک ہی مطلب لیتے ہیں کہ ایسی معلومات جو کسی اور کو نصیب نہ ہو، جس کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور جو خارق عادت ہو۔ اگر وہ اچانک کسی کو پیش کر دی جائے اور لوگوں میں حیرت اور چونکنے کا عمل پیدا ہو، تو اس کو غیب کہتے ہیں۔ مگر غیب انسانوں میں مقامی اور زمانوں کے اعتبار سے نسبتی چیز ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ماضی کا ایک غیب آج کے دنوں میں شہود میں واقع ہو۔ کیونکہ جو انفارمیشن پہلے نصیب نہیں تھی، آج نصیب ہے۔ اسی طرح دو بندوں میں غیب وشہود کا بڑا فرق ہے۔ ایک شخص نے کسی چیز کا مطالعہ کیا ہو اور وہ اس کے بارے میں انفارمیشن رکھتا ہو اور دوسرا جس کو یہ انفارمیشن نہ ہو، وہ غیب میں چلا جائے گا تو غیب وشہود کا تمام انداز مطالعاتی اور اطلاعاتی بنیاد پر ہے۔

پیغمبروں کا علمِ غیب

بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ کیا پیغمبروں کو غیب کا علم حاصل تھا؟ پھر ایمان بالغیب کی ہے اور اسے کس طرح ہونا چاہیے؟ دراصل اللہ میاں نے پیغمبروں کو اپنے اور بندوں کے درمیان ایک گواہ کے طور پر کھڑا کیا ہے۔ پیغمبر کی صداقت کو پہلے اس لیے قائم کیا کہ جب لوگ کسی چیز پر اعتبار لانا چاہیں تو سب سے پہلے وہ پیغمبر پر اعتبار لائیں کہ یہ سچا شخص ہے۔ اس کی زندگی میں کبھی جھوٹ ریکارڈ نہیں ہوا۔ اس کے بعد اگر پیغمبر وحی یا اللہ کی خبر دے گا، تو لوگوں کو اس کے غیب جاننے میں کوئی اعتراض نہیں رہے گا۔

مگر وہاں بھی مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اکثر لوگوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور انہیں استغفر اللہ دروغ گو قرار دیا۔ اس وجہ سے پیغمبروں کو معجزات عطا کیے گئے۔ معجزہ ماضی میں ایک دلیل کی طرح تھا۔ ایسی دلیل کہ جس سے امر محال دنیا کے سامنے ممکن ہو جائے۔ مثلاً پانی دودھ ہو جائے، یا دودھ پانی ہو جائے، تو لوگ اس بات پر اعتبار لائیں گے کہ اگر یہ امر محال ممکن ہے، تو وہ امر محال بھی ممکن ہے۔ فلسفہ معجزہ بطور دلیل اس معاشرے میں آیا ہے، جہاں علم کم اور وہم اور تشکیک

Marfat.com

زیادہ تھی۔ آج کل بھی لوگ معجزات طلب کرتے ہیں، اگرچہ علم بڑی وضاحت سے ہر چیز کو روشن کر چکا ہے۔ چنانچہ غیب بندوں کے درمیان ان کی معلومات کے تناسب کا فرق ہے۔ ایک شخص نے اگر پانچ ہزار کتاب پڑھی ہے اور دوسرے نے چھ ہزار پڑھی ہوئی ہے تو پانچ ہزار والا بندہ چھ ہزار والے بندے کے ساتھ پانچ ہزار کی حد تک تو شہود میں ہوگا مگر جہاں ایک قدم آگے چلا گیا، وہ غیب میں چلا جائے گا اور وہ شہود میں ہوگا۔

مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم پیغمبر پر کوئی شبہہ کر سکتے ہیں؟ پیغمبروں اور عمومی انسانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پیغمبروں کا ذریعہ اطلاعات صرف اور صرف اللہ ہوتا ہے۔ ہمارے حضورؐ سے یہ سختی اور بھی کی گئی کہ انہیں کسی بھی انفارمیشن سے، وہ اکیڈیمک ہے یا کوئی دوسری، کچھ بھی حاصل نہ کرنے دیا گیا اور یہ اس لیے کیا گیا تاکہ آپؐ اللہ سے جو کلام، وحی اور غیب حاصل کرنے والے تھے، اس پر کسی قسم کی ملاوٹ کا اشتباہ نہ رہے۔ اب اس امت کی نالائقی دیکھئے کہ جو اپنے پیغمبروں پر سوال کرتی ہے اور پوچھتی ہے کہ کیا اس کو غیب کا علم تھا کہ نہیں؟

اگر سارے کا سارا غیب انفارمیشن ہی ہے اور بلاکڈ انفارمیشن ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ اس کا ذریعہ کیا ہے؟ فرض کریں، ایک کے پاس آسمان میں اڑتا ہوا سیارہ ہے اور وہ زمین کو واچ کر رہا ہے اور جہاں بھی چاہتا ہے، اپنے آلات کو مرکوز کرتا ہے یا آج کل کے غیر معمولی جاسوسی آلات ہیں۔ جیسے گھر کے باہر وین کھڑی ہے وہ گھر کے اندر کے نقشے بنا رہی ہے اور لوگوں کو چیک کر رہی ہے تو جس کے پاس جو ذرائع ہوتے ہیں وہ ان کی بنیاد پر زیادہ باخبر ہوتا ہے، لیکن جس کی معلومات کا سوائے خدا کے کوئی ذریعہ نہ ہو، اس کے غیب کا کیا مسئلہ ہوگا؟ پھر جب ایک امتی یہ سوال کرتا ہے کہ نبی کو غیب حاصل ہے کہ نہیں، تو میرے خیال میں یہ بذاتہ کفر کے برابر ہے۔ یقیناً نبی کو غائب حاصل تھا۔ کیونکہ کائنات کا سب سے بڑا غیب صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے۔ نبی کو اللہ کا عرفان نصیب ہوتا ہے۔ اس کی اس سے بات چیت ہو رہی ہوتی ہے۔ اس کا ایک انداز ہے، ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس شخص کے پاس کیا غیب ہونا چاہیے جس کو خدا کا علم یا وژن حاصل ہو یا خدا کی تصدیق حاصل ہو؟

یہ سوال بالعموم جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ لفظ نبی کا مطلب ہی پرانے زمانے میں غیب کی خبر دینے والا تھا۔ بنی اسرائیل میں ایک ایک وقت میں بیسیوں پیغمبر ہوتے تھے۔ ان میں اور اصلی پیغمبر میں فرق اتنا ہوتا تھا کہ بھی غیب کی خبریں دیا کرتے تھے، جو اکثر کی جھوٹی نکلتی تھیں۔ صرف اصلی پیغمبر کی سچی نکلتی تھی۔ غیب کے بارے میں بہت ساری باتیں جو ہمارے اندر موجود ہیں، وہ صرف ضدی اور احمق مزاج کی پیداوار ہیں۔ ورنہ نبی ہوتا ہی غیب کے لیے ہے۔ جب نبی کہتا ہے کہ اللہ ہے، تو اللہ ہی غیب ہے اور نبی اس پر شہادت دے رہا ہوتا ہے۔

تمام پیغمبروں کو جزوی غیب عطا ہوتا رہا۔ کسی پیغمبر نے صرف اللہ کی آواز سنی۔ کسی نے جبرائیل مقدس کو دیکھا۔ کسی کے ہاں کسی ملائکہ کی آمد و رفت جاری رہی مگر چونکہ انسانیت کو اللہ نے یہ استحقاق بخشا تھا کہ کم از کم ایک شخص کی شہادت مطلقہ خدا کے وژن پر بھی ہو، اس لیے معراج والے دن یہ وژن دے کر باب بند کر دیا گیا اور حضور گرامی مرتبتؐ واحد وہ بندے ہیں، جو شاہد بھی ہیں اور نذیر بھی۔ جن کی وژنری شہادت بھی اللہ پر موجود ہے۔ وہی اللہ سے ڈرا سکتے ہیں اور وہی اللہ کی حتمی یقین کے ساتھ بات بھی بتا سکتے ہیں۔

Marfat.com

غیب کے باوجود اضطراب

بالکل نہیں۔ یہی تو پیغمبروں کے تقویٰ کی مثال ہے، جو ہم لوگوں میں موجود نہیں ہے۔ مجھے اللہ کہہ دے کہ کل یہ ہوگا، تو میں تو بڑا اپکا ہو جاؤں گا۔ بات کو فائنل کر دوں گا۔ بدر کے دن جب حضور دعائیں مانگ رہے تھے یا حی یا قیوم برحمتک استغیث تو سیدنا ابوبکر صدیقؓ ان کے شانوں پر چادر ڈالتے اور کہتے، یا رسول اللہؐ آپ کیوں اس طرح کرتے ہیں؟ جب اللہ نے آپ کو وعدہ دیا ہوا ہے، وہ حق ہے اور آپؐ سچے ہیں اور اللہ سچا ہے، تو آپؐ کیوں اس طرح کرتے ہیں؟ اگر غور کیا جائے، تو پیغمبر کی خشیت کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ باوجود حتمی صداقت پر یقین ہونے کے ان کے دل سے خدا کا خوف نہیں جاتا۔ کیونکہ کوئی چیز کسی وقت تبدیل ہو سکتی ہے انہیں اس کا علم نہیں ہے۔ جب تک یہ خشیت دل میں موجود نہ ہو، انسان کا تقویٰ پورا نہیں ہوتا۔

خداوند کی تدبیر سے کسی شخص کو بھی آزاد نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود کہ جو کچھ خدا کہتا ہے، اس میں یقین کیا جائے۔ اگر پیغمبر ڈرتا ہے، تو اس سے بڑا اور کیا نشان ہو سکتا ہے کہ پیغمبر سب سے بڑا متقی ہوتا ہے۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ خدا پر بے اعتباری شو کر رہا ہوتا ہے یا خدا نے قیامت تک ان کو جو وعدے دیئے ہوئے ہیں، ان پر بے اعتباری ہو رہی ہے۔ اگر بے اعتباری کی ایسی بات ہے تو اس امت کو شفاعت رسولؐ سے محروم ہو جانا چاہیے۔ یہ بھی تو خبر رسولؐ ہے کہ قیامت کے دن مجھے تین دفعہ کہا جائے گا اور تین دفعہ میں اپنی امت کو جہنم سے نکال کے لاؤں گا۔ یہ بخاری اور مسلم کی مصدقہ حدیثیں ہیں۔

اگر ان باتوں اور جو رسولؐ اللہ کو مستقبل کے وژن نصیب تھے، پر اعتبار چھوڑ دیں، تو پھر مذہب تمام تر توکل اور وقتی رہ جاتا ہے۔ مجھے پیغمبر کی آگے کیا ضرورت ہوگی، جو میں ان کی شفاعت بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کے کہے کے مطابق میں اپنے عذاب وثواب کے لیے ان کی دعا نہیں حاصل کر سکتا یا رسولؐ اللہ کا کرم اور عنایت نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے برعکس پیغمبر کی زمانہ آخر کے آخری مسلمان تک دعا، عنایت، وژن اور کرم جاتا ہے اور ان کی پیشین گوئی جاتی ہے۔ فرمایا، میں اچھی طرح جانتا ہوں، ان دس شاہ سواروں کے نام اور ان کے والدین کے پتے، جو اسرائیل کی جنگ کے لیے ان کا ہراول دستہ ہوں گے۔ میرا نہیں خیال کہ کسی مسلمان کو اس میں کسی قسم کا شبہہ کرنا چاہیے۔

ہوتا یہ ہے کہ پیغمبر کے لیے پوری دنیا کی باتوں کو ڈکٹیٹ کرنا مقصود نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ یہ بیٹھ کر کہہ دے کہ فلاں زمانے میں یہ گیسیں نکلیں گی یا فلاں ایجاد ہوں گی۔ یہ تناظر سے ہٹ کر بات ہوگی۔ بنیادی طور پر پیغمبر ایک کتاب پڑھانے آتا ہے۔ اس کا غیاب وشہود کا ایریا، کتاب اور اس کے قوانین کی حدود میں رہے گا۔ اسے مصری تہذیب یا کسی مستقبل کی تہذیب کی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر پیغمبر اپنی کتاب پڑھاتا ہے، پوری کرتا ہے اور اپنی امت کو دیتا ہے۔ اس کے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا کہ وہ ساری دنیا کی خبریں دیتا پھرے۔ پیغمبر کوئی پیشین گوئیاں کرنے والا نہیں ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک استاد، گائیڈ اور خدا کی راہ کی طرف رہنمائی کرنے والا ہوتا ہے۔ ہاں پیشین گوئیاں اس کے پیغام کا جزوی حصہ ہیں، جو اس سے منتقل ہوتی ہیں۔

غیب جاننے کے طریقے

جنات، موکلات اور اس قسم کی خرافات کی تصوف میں اجازت نہیں۔ بلکہ جو شخص بھی جن قابو کر رہا ہے، وہ ایک سفلی کام میں مصروف ہے کیونکہ ہر تسخیر کے کام میں ایک نشہ ہے۔ یعنی جذبہ تسخیر اور طاقت کا حصول۔ جبکہ صوفی طاقت کے حصول ہی کو رد کرتا ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو خالی کر رہا اور کسی کی طرف لے جا رہا ہوتا ہے اور اپنی ذات کی ہر اس خواہش کی تردید کر رہا ہوتا ہے، جس میں کسی قسم کے تکبر اور قوت کا خیال ابھرے۔

تصوف اور علم حاضرات کے اعمال میں بنیادی فرق ہے۔ یہ فرق دو بیانات سے واضح ہو جاتا ہے۔ تصوف میں Man concentrates in favour of God against his ower self (آدمی اپنی ذات کے خلاف خدا کے حق میں ارتکاز کر رہا ہوتا ہے) جبکہ باقی چیزوں میں Man concentrates in favour of self against God (آدمی اپنی ذات کے حق میں خدا کے خلاف ارتکاز کر رہا ہوتا ہے) تو جو چیز اپنی ذات کی تائید کرتی ہوئی محسوس ہوا سے ہم قطعاً کسی بھی مرتبے کا تصوف نہیں مان سکتے۔

اسی طرح میں نے سلسلہ عظیمیہ میں بزرگوں کو پڑھا۔ انہوں نے ایسے ہی بہت سارے پیچیدہ طریقے اپنائے ہوئے ہیں مگر عملی طور پر وہ سب غلط ہیں۔ مثال کے طور پر ایک حوروں کا مراقبہ ہے، جس میں آپ حوریں دیکھیں گے۔ اس کو آپ حدیث کے مقابلے میں رکھ کے دیکھیں، تو وہ لغو لگتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک حور اگر دنیا والوں کو دکھائی دے تو ساری دنیا کے بادشاہ آپس میں لڑ لڑ کے مر جائیں۔ اب جو شخص روز حوریں دیکھ رہا ہے اور اسے کچھ نہیں ہو رہا۔ یہ فرار کے طریقے ہیں۔ از خود آپ خیال کر رہے ہیں کہ آپ نے کوئی طاقت حاصل کر لی ہے، جس کا کوئی وجود نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ استادوں کے پاس کوئی چمتکار ہوتے ہیں بلکہ جو ہمارے پاس ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ ہمیں عطا کرتا ہے، وہ ایک فرد پر نہیں، ہزاروں لاکھوں کروڑوں انسانوں پر یکساں قابل عمل ہے۔ فراست الہیہ سب کے لیے ہے۔ اس میں رات دن، صبح دوپہر اور شام کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہ انسانی تعقل کا پیٹرن ہے، جو ہر وقت جاری رہتا ہے۔

ناسٹرڈیمس کی پیشین گوئیاں

ناسٹرڈیمس کی کافی تو نہیں، جزوی پیشین گوئیاں ٹھیک نکلی ہیں۔ وہ اپنی Extraordinary Sensory Perception کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کی زندگی بڑے دکھ، کرب اور بلا میں گذری اور وہ اپنے الیوں پر توجہ مرکوز کرتا رہا۔ اس پر اتنا پریشر پڑا کہ کچھ برین سیل ایسے ہیں، جو پریشر کے باعث مستقبل کو دیکھ لیتے ہیں اور کھل جاتے ہیں۔ ویسے ہی جیسے مرتے وقت ہر ایک کے برین سیل کھل جاتے ہیں۔ اللہ قرآن میں کہتا ہے کہ آج اس کی آنکھ کیا تیز ہے کہ جن چیزوں کو پہلے نہیں دیکھ سکتا تھا، وہ اب انہیں دیکھ رہا ہے اور جن چیزوں پر اس کو پہلے اعتبار نہ تھا، اب اعتبار کر رہا ہے۔

بعض جنیٹک تبدیلیوں کے باعث کچھ لوگوں میں جاننے کی غیر معمولی صلاحیت آ جاتی ہے، جسے ہم Extra Sensory Perception کہتے ہیں۔ یہ قریباً ہر بندے میں موجود ہوتی ہے۔ ہر انسان زندگی میں ایک آدھ مرتبہ مستقبل کی

Marfat.com

کسی پیشین گوئی کا واقعہ ضرور دیکھ لیتا ہے۔ مگر کچھ لوگوں میں یہ صفت زیادہ ودیعت ہوتی ہے۔ جب غم والم سے ان کی ارتکاز زیادہ ہو جائے، تو ان میں دوسروں کے مقابلے میں تو ازان زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ پھر ٹیلی پیتھی اور یوگا وغیرہ کی مختلف ارتکاز کی مشقیں بھی ان صلاحیتوں میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ آج کے زمانے میں انہیں ہم علم نہیں کہتے، بلکہ یہ ارتکاز کی مشقیں ہیں۔ جیسے کراٹے کا علم ہے۔ عام آدمی اینٹ توڑ نہیں سکتا یہ ماتھے کی ہڈی سے توڑ لیتے ہیں۔ ان کے مرتب کردہ کچھ اصول ہیں، جن کی بار بار کی مشقوں سے یہ غیر معمولی فرد بن جاتے ہیں۔

حضورؐ رحمت للعالمین

مقاصد کے حوالے سے ایک حدیث کے مطابق بنیادی مقصد تخلیق اللہ کی شناخت ہے۔ انا ھدینا السبیل واما شاکرا واما کفورا۔ یہ حدیث اس آیت کی تائید کرتی ہے کہ کنت کنزا مخفیا، میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا ما اجبت عن اعراف، میں نے چاہا کہ آشکار ہو جاؤں، و خلقت الخلق لیعرفون میں نے مخلوق کو اپنے تعارف کے لیے پیدا کیا۔ اب ظاہر ہے، انتہائی ذہین آدمی کسی جاہل شخص کی تعریف سے تو خوش نہیں ہو سکتا۔ اگر میں باہر بیٹھ جاؤں سارے صفائی والے میرے گرد ہو جائیں، میرے عربی یا فارسی اشعار پڑھنے پر مجھے داد دینا شروع کر دیں، تو میرا نہیں خیال کہ یہ چیز مجھے کسی خوشی سے سرشار کرے گی۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ نالائق اور جاہل لوگ ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں، میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ وہ محض مجھے سراہ رہے ہیں۔ ایک ناشناس کی تعریف علم و فضل کو مجروح کرتی ہے۔ جاننے والے کی خاموشی بھی اسی طرح علم و فضل کو مجروح کرتی ہے۔ ایک اچھی چیز، جو لکھی گئی اور جاننے والا جانتا ہے کہ یہ اچھی ہے اور وہ خاموش رہتا ہے، تو یہ دوسرے کے لیے عملی طور پر حوصلہ شکنی کا باعث بنتی ہے۔ اس صورتحال میں اللہ جو عقل کل اور سب سے بڑا دانشور ہے، جو تخلیق کار اور مصور بھی ہے، وہ اپنے کام کی ہر ایک سے سراہے جانے کی توقع نہیں کر سکتا۔

اب پوری نسل انسانی میں محمد رسول اللہؐ نے جیسی تعریف اللہ کی کر دی، ویسی دنیا و مافیہا اور کائنات میں تعریف اور کوئی نہیں کر سکتا۔ تعریف کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اے اللہ تو بہت بڑا ہے، تو بہت بڑا ہے، تو بہت بڑا ہے...... انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰؤ کہ اللہ کو جاننے والا ہی اللہ سے زیادہ ڈرتا ہے۔ ہمارے ذہن میں خدا کے بارے میں جو احتساب کی شدت اور اس کی قوتوں کا احساس ہے، جس طرح ہم اس کو اپنے اندر متحرک اور فعال پاتے ہیں پھر جس انسان نے سب سے زیادہ خدا کا احساس اور ادراک کیا، اس کو وسعت میں اور تنگی میں دیکھا۔ اس کو بالائے کائنات اور اندرون کائنات زار میں دیکھا، وہ صرف محمد رسول اللہؐ ہیں۔ اب قدرتی طور پر یہ شخصیت خدا کو سب سے زیادہ عزیز ہونی چاہیے۔ جس کی تعریف سے اللہ نے سمجھا کہ میں اللہ ہوں۔ چنانچہ محمد رسولؐ اللہ کو اللہ نے کریڈیٹ دیا کہ کنت کنزا مخفیا انا اعرف اور میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، فخلقت محمد میں نے محمدؐ کو پیدا کیا۔ اب جسے مخصوص

Marfat.com

انسان نے مکمل توصیف وتائید دی، اس کا اسم گرامی احمد اور محمد قرار پایا۔

اب جب یہ تخلیق ہوگئی اور رفیق اعلیٰ بن گیا، ہوسکتا ہے، شاید کہ حضورؐ کے بغیر اللہ کی گذر نہ ہوتی ہو اور صبح وشام کی توصیف کے لیے بندگی کو حاضر کیا جاتا ہو۔ مگر اس میں ایک اور بڑا وصف یہ تھا کہ یہ اختیاری تھی، جبراً عبادت نہ تھی۔ یہ ملائکہ اور جنات کی عبادت نہ تھی۔ شرارت سے نہ جبر سے یہ خدا کو چاہ رہے تھے، بلکہ یہ تشکر سے چاہ رہے تھے۔ یہ خدا کو چاہ کر خدا کو چاہ رہے تھے۔ اس لیے واضح طور پر اسم محمدؐ میں غیریت کی ہر قسم ہی ختم ہوگئی۔ سو اللہ نے کہا کہ اس شخص نے مجھے کتنا پیار کیا۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے، اس کو سراپردہ دنیا پر معزز کروں۔ اس پر آگے کی منصوبہ بندی ہوئی۔ اللہ اور محمدؐ ہوگئے۔ الف، لام اور میم ہوگئے، تو اس نے کہا، چلو اب میں دنیا پلان کرتا ہوں۔ اب باقی دنیا تخلیق کی گئی۔ مقصد دنیا تخلیق کرنے کا کیا تھا کہ جہاں جہاں مخلوقات ہو، وہ محمدؐ کی تعریف کرے۔ اس لیے اس کا نام ہی تعریف کیا گیا ہے۔

اب باقی کائنات میں جو کچھ بھی تھا، جہاں جہاں خبر محمد رسول اللہ پہنچی، اللہ کو یہ پسند آیا کہ جیسے محمدؐ مجھے پسند کررہا ہے، میری مخلوق محمدؐ کو پسند کرے۔ چاہے ان کو پتہ ہو یا نہ ہو، مگر زمین اور اس پر چلنے والے پائے رسول کو بوسہ دیں۔ پہاڑ ان کی عظمتوں کے سامنے چلیں۔ درخت ان کے ساتھ ساتھ حرکت کریں۔ ہوسکتا ہے حضورؐ کو نہ پتہ ہو۔ حضورؐ اپنی شخصیت کی متعین مدت کی قید کے لیے آرہے ہوں اور ان کا مقصد کتاب پڑھانا اور پابندی سے کتاب پوری کرنا ہو۔ وقت تھوڑا ہے۔ چند مخصوص سال میں استاد نصاب سے ادھر ادھر جانہیں سکتے۔ انہیں ہر حال میں ''والناس'' تک کتاب پوری کرانا ہے۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کہ وہ گشت وگرد کرتے، ادھر ادھر گھومتے، آسمانوں میں آتے جاتے رہتے۔ ان کے پاس اتنا ہی وقت تھا کہ جس میں وہ ذاتی کردار کا وژن اجاگر کرتے۔

مگر زمین وآسمان کی ساری مخلوقات کو پتہ تھا کہ کوئی ایسا بندہ وجود میں آگیا ہے، جس کے وجود سے رحمت کا تشخص ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام رحمتیں ایک انسان کے دست وپا میں سمیٹ دی ہیں۔ اسی کے ایک اشارے سے کائنات کا بادل برسے گا۔ اسی کے ایک اشارے سے کائنات کی چیزیں بدلیں گی اور اسی کے ایک اشارے سے جنت کے آٹھ کے آٹھ دروازے کھلیں گے۔ **وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین۔**

جب حضورؐ نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ باقی عالم کو میری رحمت عالم کا بڑا فائدہ ہے، تجھے بھی ہوا ہے؟ فرمایا یارسول اللہ! بالکل ہوا۔ جب سے عزازیل خوار ہوا اور شیطان کو رسوائی ہوئی، ہم اہل ملائکہ خدا سے بہت ڈرتے تھے۔ کہیں ہم پہ بھی کسی وقت کوئی آفت نہ آجائے، ہم ہر وقت کانپتے رہتے تھے۔ پھر جب قرآن اترا، آپ آئے، تو اللہ نے کہا کہ میں کتاب روح الامین کے ہاتھ سے بھیج رہا ہوں۔ مجھے امانت والی روح کہا، تو میرا دل ٹھہر گیا۔ اب اللہ نے فیصلہ دے دیا ہے کہ میں اچھا ہوں، اور میں بھی اچھا رہا اور یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوا۔

حضورؐ کو تو نہیں پتہ تھا مگر دنیا میں ہر شے پر اس کی رحمت کی چادر پڑی رہی، لیکن ہم نہیں جانتے۔ جیسے سلیمانؑ کو چیونٹی کی زبان سنائی دیتی ہے اور جیسے کہ سب سے تیز ترین رفتار حیاتیاتی پیغامات کی ہے، تو زمین وآسمان میں کہیں نہ کہیں حضور گرامی کا نام گرامی سنا ضرور جارہا ہوگا۔ کہا جارہا ہوگا اور برتا جارہا ہوگا۔ بلکہ ابن عباس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ باقی دنیا میں بھی اسی طرح پیغمبر ہیں۔ وہاں بھی عیسیٰؑ اور ابراہیم ہیں۔ وہاں موسیٰ ہیں تو لامحالہ وہاں محمدؐ بھی ہیں۔ اس لیے یہ

Marfat.com

رحمت عالم کا تصور ساتوں زمینوں اور ساتوں کائناتوں پہ جاری و ساری ہے۔

حضورؐ وجہ تخلیق کائنات

اگر دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کی تمام کامیاب باتیں دیکھتے دیکھتے بات بڑی سادہ سی رہ جاتی ہے۔ اللہ کا مقصد صرف یہ تھا کہ انسان مجھے پہچانے اور مجھے اللہ کی حیثیت سے مانے، لیکن سوال یہ ہے کہ اسے کس نے مانا اور کس نے پہچانا؟ کس کی تعریف اللہ کو پسند آئی؟ اب اگر سب لوگوں کی تعریف پسند نہیں آئی، قبول تو وہ کرتا ہے، لیکن قبول کرنا اور پسند کرنا دو علیحدہ باتیں ہیں۔ وہ ہر ایک کی عبادت قبول کرتا اور ہر ایک کی دعا سنتا ہے۔ وہ ہر ایک کی تعریف قبول کر لیتا ہے لیکن جو چیز اسے سب سے زیادہ پسند آئی، وہ محمد رسول اللہؐ پسند آئے۔ جیسے قیامت کے دن کی حدیث کے مطابق مجھے حکم دیا جائے گا کہ محمدؐ اُٹھو۔ کھڑے ہو جاؤ اور میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ مجھے کہا جائے گا کہو اور میں اللہ کی تعریف کروں گا، جیسی مجھ سے چاہی جائے گی۔ تو اصل میں تعریف کرنے والا تو ایک ہی ہے۔ اسی کا نام احمد ہے۔ فارقلیط اسی کو کہتے ہیں۔ اسی کا پہلے بھی کتابوں میں ذکر آیا۔ اب بھی ذکر آیا اور وہی قرآن لے کے آیا۔ وہی محمد رسول اللہؐ اور وہی احمدؐ ہے۔ اگر کوئی آدمی اس کو تسلیم نہیں کرتا، تو اس کی کیا اللہ کو پروا ہو سکتی ہے۔

جس شخصیت کی عادات اور خصائل کو اجاگر کرنے کے لیے پوری شیطنت تخلیق ہوئی ہو۔ تیکھا تضاد اس لیے تخلیق کیا گیا کہ ادھر ان کی حسن شخصیت ہے، ادھر ان کی شخصیت سے جتنی دوری لوگوں کی ہوتی جائے گی، وہ ساری برائی ہے۔ برائی کا تشخص بھی محمد رسول اللہؐ ہیں۔ جہاں برائی کا تشخص محمد رسول اللہؐ سے ہوا، وہاں خوبی کا تحفظ محمد رسول اللہؐ سے ہوا۔ قدرتی طور پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی بات پھر دہیں آ کے رکتی ہے کہ آپ کون ہو، کس کی پارٹی ہو، کس کے ساتھ ہو، کس سے دور ہو؟ اس کے علاوہ تو کوئی اور چیز مذہب میں نہیں رہ جاتی۔ یہ تو قربت کی لڑائی ہے۔ آپ کس کے قریب اور کس سے دور ہیں۔ پورے کا پورا مذہب اسی جگہ آ کے رک جاتا ہے۔ باقی سب فرائض اور اعمال نکل جاتے ہیں۔ ساری زندگی فرائض پر عمل نہ کرنے کے باوجود نیات کی وجہ سے اگر فاصلہ خیر و شر ماپا جائے اور 49 فیصد بھی خیر کا نکلے، تو میں بخشا جاؤں گا۔ میرے دل میں مجموعی طور پر مادی تصورات کے باوجود محبت رسولؐ اور خدا کی رہی تو ظاہر ہے کہ میں بخشا جاؤں گا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اعمال آپ کو ادھر لے کر جائیں گے۔ فرض کریں، ایک آدمی 90 فیصد اعمال پر قائم ہے مگر اس کی نیات میں کوئی خلوص اس قسم کا نہیں ہے، تو فاصلہ ماپنے پر پتہ چلے گا کہ 80 فیصد شر کی طرف اور 20 فیصد خیر کی طرف ہے۔ اس کو جہنم میں گھسیٹ کے لے جائیں۔ اللہ کی طرف سے حتمی نتائج آئیں گے، تو میرے خیال میں محبت فاتح عالم ہوگی۔

احد اور احمد میں فرق

احد اور احمد کے درمیان صرف ''میم'' کے فرق جیسی باتیں اصل میں دیو مالا کی مطالعات اور خاص طور پر رامائن کے تصور سے ہمارے ہاں آئی ہیں۔ بہت سارے کلچر ہم میں رہے۔ یہ انہی کا اثر ہے۔ اس کے باوجود ''انسائیکلوپیڈیا

Marfat.com

آف ریلجن'' کا مصنف لکھتا ہے کہ

"There was such a gigantical position about the oneness of God in Islam that no mythology was possible."

(اسلام میں خدا کی وحدانیت کا تصور اس قدر مضبوط ہے کہ کسی میتھالوجی کا اس میں کوئی امکان نہیں تھا) ہندو ہم سے خدا واحد کا تعین تو نہ چھین سکا، لیکن ہندو کی ایک تیکنیک یہ رہی کہ ہندوستان میں جتنے بھی مذہب تھے جین مت اور بدھ مت سمیت اس نے ان کو بتوں کی شکل دے دی۔ جبکہ وہ اچھے خاصے پیغمبر تھے۔ یہی بات راما اور مہا بھارتا کی ہے اور کرشنا بھی پیغمبروں کی طرح لگتا ہے۔ ہندو نے یہ کیا کہ سب کو کرپٹ کرتے ہوئے انہیں بتوں کی تمثیلوں میں ڈھال دیا۔ اب اتنے طویل عرصے میں، اس نے طاقت منتقل کرنی تھی چونکہ وحدانیت کا تصور مسلمانوں میں بڑا سخت تھا اس نے ایک نیا تصور اوتار کا گھڑ لیا۔ اس کے عقیدے کے مطابق بھگوان اوتاروں کی شکل میں اترتا رہتا ہے۔ وہ بدھستو وترا اور جینا وترا کی شکل میں اترا اور سب سے آخری اوتار، جسے کالکی وترا یعنی ہلاکت اور تباہی کا زمانہ کہتے ہیں اس میں انہوں نے محمدؐ رسول اللہ کو آخری وتر قرار دے دیا۔ اسے وہ بارھواں وتر کہتے ہیں۔ آخری معتبر Teacher of the teachers یہ اصولاً ہندوانہ تصور تھا۔

ہندو پتھروں کی پوجا کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ بت پرستی ان کے خمیر میں چلی گئی ہے۔ انہوں نے الوہیت کو کسی نہ کسی طریقے سے بندوں میں داخل کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہی الوہیت اثناعشریوں کے تصور میں بھی آئی۔ جب بابی مذہب آیا تو قرۃ العین طاہرہ نے محمد علی باب پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ باب نے کہا تھا کہ میں ہی باب حق ہوں۔ خدا مجھ میں حلول کر گیا ہے اور میں خدا کا دروازہ ہوں۔ اس لیے اسے باب کہتے ہیں۔ یہی تصور دستور یہ شیعہ میں اور سنیوں میں غالی پیر فقیروں میں در آیا۔ وہ پیر کو خدا ہی سمجھتے ہیں، خدا کا نائب نہیں سمجھتے۔ یہ سب جہالت کی وجہ سے ہے۔ بلکہ واصل بن عطا کی اس تشخیص کے بعد پہلا دور جو مسلمانوں پر کڑا گذرا ہے، حشیشین کا تھا۔ انہیں خدا کا مظہر گنا جاتا تھا۔ قرامطہ، باطنیہ اور ملاحدہ کی شاخ اسماعیلیہ کی ایک شاخ تھی، جنہوں نے فردوس بریں کے نام سے جنت بنائی۔

عمومی مسلمان، چاہے وہ شیعہ ہو یا سنی، وہ اس حد تک نہیں جاتا۔ ان میں سے بعض ابلاغ کرتے ہیں، جیسے شیعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی محبت میں غلو کرتے ہیں اگر وہ کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ اس کا ہمیں کوئی پرابلم نہیں۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ مجھے اس شخصیت سے زیادہ محبت ہے، تو وہ کوئی مسئلہ نہیں مسئلہ اس وقت کھڑا ہوتا ہے، جب کوئی شخص یہ کہے کہ تم جس سے محبت کرتے ہو، میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اثناعشریہ کے لیے محترم ہیں، تو ادھر سنیوں میں تمام اہل بیت محترم ہیں۔ وجہ اختلاف وہاں بنتی ہے جہاں کوئی کسی شخص کے لیے حرمت وتوقیر رکھتا ہو، اس کی دوسرا توہین کرے۔ ایسی صورت میں وہاں تلخی پیدا تو ہو گی گویا جھگڑے محبت میں پیدا نہیں ہوتے، وہ کسی سے نفرت اور تلخی میں پیدا ہوتے ہیں۔

تاہم غلو فی العقیدت کے حوالے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اپنا قول ہے کہ میری وجہ سے دو لوگ جہنم میں جائیں گے۔ ایک وہ جو میری تعریف میں بخل کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو غلو کرتے ہیں۔ جب سے میں نے حدیث خیبر

Marfat.com

پڑھی ہے، میرے ذہن میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت علی اللہ وجہ کا کیا مقام ہوسکتا ہے۔ خیبر کے بارے میں نبی اکرمؐ نے فرمایا'' میں علم آج اس کے ہاتھ میں دوں گا، جس کو خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے اور جس سے خدا اور اس کے رسولؐ کو بڑی محبت ہے۔'' حضرت کرم اللہ وجہ کو علم دیا گیا۔ پہلا بیان کہ جس کو خدا اور رسول سے بڑی محبت ہے، کے بارے میں تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بھی خدا اور اس کے رسولؐ سے بڑی محبت ہے مگر دوسرا بیان کہ جس سے خدا اور رسول کو بڑی محبت ہے، کس کو ملے گی؟

اب اگر مجھے یہ پتہ ہو کہ علیؓ سے خدا اور اس کے رسولؐ کو بڑی محبت ہے تو پھر میرے خیال میں یہ مسئلہ بیکار ہو جاتا ہے اور میں قطعاً یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان کی کسی طور سے توہین کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کوئی علیؓ سے غیر متوازن انس رکھے۔ اسی طرح جب ہم حدیث دیکھتے ہیں کہ **الحق ینطق علی لسان العصر** کہ حق کی زبان سے بولتا ہے، تو پھر ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ یہ کچھ اور ہی قسم کے لوگ ہیں۔ بظاہر ان کے آپس کے ایسے واقعات بھی نظر نہیں آتے۔ اگر کوئی جھگڑا ہوا ہوگا اور یقیناً ہوا کہ بخاری میں درج ہے تو اس جھگڑے کے لیے کوئی اتنا بڑا فساد نہیں ہوا۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابو بکرؓ Withdraw کر گئے۔ یہ ان کے اخلاق کریمانہ کی بات تھی۔

ان کا طرز عمل یہ تھا کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہ روضہ رسول پر اکٹھے پہنچے۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا، علیؓ آپ قدم بڑھائیے پھر تعریف شروع کی کہ اللہ کے رسولؐ نے آپ کو پالا، آپ ان کی محبت کے امین، آپ ان کی محبوب بیٹی کے خاوند وغیرہ بڑی تعریفیں کیں۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ اے ابو بکرؓ کیا بات کر رہے ہو، ہم نے رسول اللہؐ سے جب بھی سنا، یہی سنا، میں، ابو بکر، میں ابو بکر عمرؓ ہم نے تو کبھی آپ کو رسول اللہؐ سے جدا نہیں دیکھا۔ آپ ان کے مشیر، ان کے دوست، ان سے محبت رکھنے والے۔ آپ کی وجہ سے رسولؐ اللہ محراب پر چڑھے اور کہا کہ ابو بکرؓ میرا دوست ہے۔ آپ قدم آگے بڑھائیے اب آپ آپ شروع ہوگئی۔ حتیٰ کہ فیصلہ یہ ہوا کہ اس طرح تو جھگڑا ختم نہیں ہوتا، آئیے اکٹھے ہی قدم بڑھائیں۔ وہ بہت ڈیسنٹ، شاندار اور بڑے خوبصورت لوگ تھے۔ ان کے آپس میں جتنے بھی اختلافات تھے، انہوں نے ان پر بڑی انسانیت محبت اور بڑے خلوص سے قابو پایا۔ ہم جو آج ان کی وجہ سے لڑ رہے ہیں، جاہل لوگ ہیں۔ فساد کا آغاز وہاں سے ہوا، جب ہم نے ان کے درجات مقرر کرنا شروع کر دیئے اور ہم نے ان کی جگہ کارروائیاں کرنا شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنی جگہ کوئی کارروائی نہیں کی۔

اب یہ کتنی عجیب سی بات لگتی ہے کہ میرے ذہن میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کا ایک حق ہوا اور وہ اس پر اپنے آپ کو برحق بھی سمجھتے ہوں، پھر وہ اپنا حق کسی دوسرے کو لینے دیں۔ ایک جگہ جناب علیؓ کا یہ رتبہ ہے کہ فاتح خیبر ہیں اور دوسری طرف وہ اپنے حق کے لیے ایک کیس بھی دائر نہیں کر رہے۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ جب کیس حضرت ابو بکرؓ کے سامنے دائر ہوتا ہے، تو وہ کہتے ہیں کہ اے علیؓ تم خود فیصلہ کر لو۔ اس فیصلے میں عبداللہ بن عباس بھی برابر کے جائیداد میں شریک ہیں۔ وہ آپس میں کزنز ہیں۔ جیسی حیثیت حضرت علیؓ کی، ویسی ہی حیثیت حضرت عبداللہ بن عباس کی ہے۔ یہ مال اور یہ فدک ہے۔ یہ تم لوگ ہو، جاؤ خود جا کر فیصلہ کر لو۔ حضرت علیؓ کے اپنے زمانے میں بھی یہی فیصلہ برقرار رہا۔ میں تو نہیں مانتا کہ حضرت علیؓ نے پہلے کبھی فیصلہ غلط تسلیم کیا ہو اور میں یہ بھی نہیں مانتا کہ حضرت علیؓ اتنے گئے گذرے ہوں گے کہ انہوں

Marfat.com

نے اپنے زمانے میں بھی غلط فیصلہ تسلیم کیا ہو۔ یہ سب ہماری باتیں ہیں۔

حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی بات بڑی خوبصورت ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ پہلے خلفاء کا زمانہ کامیاب کیوں تھا اور آپ کا ناکام کیوں ہے؟ انہوں نے کہا کہ تمہیں وجہ سمجھ نہیں آتی؟ پہلے خلفا کے مشیر ہم لوگ تھے، ہمارے تم لوگ ہو۔ ان کو ہمارے جیسے مشیر نصیب تھے۔ اب ہمیں تمہارے جیسے بدبخت نصیب ہیں۔ ظاہر ہے، معاملات تو بگڑنے ہیں۔

شرک اور اللہ کی حساسیت

شرک سے تحفظ رکھنا بہت آسان ہے۔ کسی بندے کی عزت و احترام و تکریم سے قطعاً کسی قسم کا شرک لازم نہیں۔ ہمیں محبت اور شرک میں فرق کرنا پڑے گا۔ ٹیکنیکل طور پر کہا جائے، تو کسی کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ اگر ہم طاقت اور اختیار کا تصور انسانوں سے جدا کر لیں، تو کبھی بھی ہم شرک کے قیدی نہیں بن سکتے۔ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ رسول اللہؐ میں یہ طاقتیں ہیں، تو اس میں سب سے بڑی حماقت یہ ہے کہ خدا کے رسول کا تصور خدا کے بغیر ہے ہی نہیں۔ انہیں جو معجزے عطا ہوئے، اس میں لفظ ''عطا'' ضرور استعمال ہو گا۔ اگر میں یہ کہوں کہ اللہ نے اپنے رسول کو یہ مرتبہ عالی دیا، تو میں اللہ کا لفظ ضرور استعمال کروں گا۔ مگر آج تک یہ نہیں ہوا کہ کسی شخص نے مجھے یہ کہا ہو کہ اگر اللہ نہ ہوتا، تو رسول اللہ کے پاس یہ طاقت ہوتی۔ شرک اصولاً ہو نہیں سکتا۔ محبت رسول اور اللہ کے درمیان شرک ممکن نہیں ہے۔ اگر ہماری اپروچ یہ رہے کہ ہم رسول اللہ کے بغیر کچھ بھی نہیں اور ہیں بھی نہیں۔ سارے کا سارا تشخص اللہ کی وجہ سے ہے اور کسی بھی رسول کی عزت اللہ کی وجہ سے ہے، تو شرک ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر ایک لاکھ پیغمبروں کا وجود ہمیں بتا رہا ہے کہ پیغمبر ناگزیر نہیں ہیں۔ اس نے ایک لاکھ پیغمبر پیدا کیے۔ چاہتا، تو ایک لاکھ اور پیدا کر سکتا تھا۔ ایک ایک وقت اور قبیلے میں بنی اسرائیل کے دور میں بارہ بارہ پیغمبر آئے۔ جب قدرتوں اور طاقتوں کا سوال آئے گا، تو خدا بالکل اکیلا ہے۔ جب ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ خدا اکیلا، تنہا اور Totality ہے۔ ہر جگہ موجود اور ہمہ طاقت ہے۔ اس کے بعد اگر ہم نے اپنی محبتوں کا ارتکاز رسول اللہؐ میں مرتکز کر لیا، تو اس میں قطعاً کوئی شرک نہیں ہو سکتا۔

اب جھگڑا وہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ کو اللہ نے کیا دیا ہوا ہے اور وہ آگے کیا پہنچا سکتے ہیں، جس پر شرک کا گمان ہے۔ میں کہتا ہوں، یا رسول اللہؐ میری مغفرت کی دعا فرمائیے، اللہ مجھے بخش دے۔ ایک مولوی کہتا ہے، یہ شرک ہے۔ بھئی کیوں شرک ہے؟ بجائے اس کے کہ تم اسے شرک کہو، یہ دیکھو آیا یہ اجازت رسولؐ کے پاس ہے کہ نہیں ہے۔ میرے پاس ایک آفس ہے، جسے میں غلط اپلائی کر رہا ہوں۔ اگر رسول اللہؐ کے پاس بخشش لے کے دینے کا آفس ہی نہیں ہے۔ دینا تو اللہ نے ہے، پھر مولوی مجھے یہ کہہ سکتا ہے کہ تم غلط جگہ خواہ مخواہ زور لگا رہے ہو۔ ادھر جو چیز تم مانگ رہے ہو، وہ ہے ہی نہیں۔ مگر قرآن اور حدیث کے مطابق حضورؐ کے پاس مقام شاعت، مقام محبوبیت اور مقام وسیلہ ہے۔ اذان کے بعد کی دعاؤں کو پڑھ لیجیے۔ اب اگر یہ تینوں مقام رسول اللہؐ کے پاس ہیں، تو پھر میں رسول اللہؐ سے کہہ سکتا ہوں کہ یا رسول اللہ! مجھے اللہ سے بخشش لے دیں۔ مجھے اللہ سے گھر لے دیں۔ کیونکہ وہ مقام وسیلہ اور مقام شفاعت پر بھی متمکن ہیں

Marfat.com

اور مقام محمود بھی انہی کے پاس ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ اللہ بھی اس بارگین کو برداشت کرتا ہے کہ نہیں۔ بخاری کی حدیث ہے کہ اللہ معطی و انا قاسم اللہ عطا کرنے والا اور میں بانٹنے والا ہوں۔ اب رسول اللہؐ کے بغیر اللہ کی عطا تقسیم نہیں ہو سکتی۔ تقسیم ہو گی ہی نہیں۔ یعنی تقسیم کے انچارج تو وہ ہیں۔ آپ بالا بالا اللہ کے خزانے سے کوئی چیز کیسے نکال سکتے ہیں؟ ان چیزوں کے اندر اختلاف نہیں ہے۔ ان کی چھوٹی عقلوں نے فضول مسائل کو شرک بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی بھی مسلمان سے پوچھ کے دیکھ لیں، اللہ کتنے ہیں؟ اس کے اختیارات کتنے ہیں؟ وہ کہے گا، اللہ ایک ہے اور سارے اختیارات اس کے پاس ہیں۔ پھر شرک کہاں سے آیا؟ البتہ یہ ہوتا ہے کہ بعض دعوے دار جعلی دعوے کرتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو با اختیار ثابت کرتے ہوئے لوگوں کے عقیدے میں گڑ بڑ کرتے ہیں۔

ایک پیر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ کہتے ہیں، میں یہ کر دوں گا، وہ کر دوں گا۔ بندہ بے چارہ پوچھتا ہے، یار یہ پیر صاحب واقعی یہ کر دیں گے؟ مثال کے طور پر ایک بندے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پیر صاحب نے کہا تھا، میں اس کی ٹانگ توڑ دوں گا۔ اب وہ بے چارہ اس چکر میں پڑ گیا کہ پیر صاحب کے پاس وہی طاقتیں ٹانگ توڑنے کی موجود ہیں۔ وہ اس کو یہ نہیں کہے گا کہ خدا کی طرف سے اسے ٹانگ توڑنے کی طاقت ملی ہے۔ وہ طاقت کو اس شخص کے ساتھ کر دے گا۔ جیسے کسی بت کے ساتھ کوئی طاقت وابستہ ہو جائے کہ یہ گھنشام ہے، بادل برساتا ہے۔ یہ شیوا ہے، جو تباہ و برباد اور ہلاک کرتا ہے اور یہ اندرا ہے، جو سورگ دیتا ہے اور یہ کالی ہے، جو راکھشس کا سلسلہ رکھتی ہے۔ یہ ارجنا، یہ درگا اور یہ سرسوتی ہے۔ ہر دیوتا کے ساتھ ایک طاقت وابستہ ہو جاتی ہے۔ جیسے اب خدا اپنے سارے کاموں کو بانٹ کر چارپائی پر بیٹھ کر بس سگریٹ پیتا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔

بت پرستی بنیادی طور پر انتقال اقتدار کا نام ہے۔ جب پاور منتقل ہو گی اور اللہ اپنی طرف سے پاور نکال کے ان کے حوالے کر دے، تو یہ انتقال اقتدار قرار پائے گی۔ اب یہ تفویض جیسے اس کی طرف آئے گی ہی نہیں۔ جاؤ نیچے درگاہ سے جا کے کام کرا لو۔ سرسوتی سے، کالی سے کام کروا لو۔ تو یہاں پر شرک آ جاتا ہے۔ جب ایک چیز آپ خدا سے چھین کر اس کی مخلوق کے سپرد کر دیتے ہیں، چاہے وہ پیر ہیں، ملائکہ یا رسول اللہؐ صاحب ہیں، وہاں آپ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔

اور اگر ہم دوسری طرف سارا اعتقاد یہ رکھیں، کہ خدا کی عطا ہمارے رسول کریمؐ پر اور اللہ کے دیگر نیک بندوں پر بھی ہے۔ کسی کی دعا کی قبولیت میں ہے۔ کسی کے اختیار کی فضیلت میں کسی کی محبت انسان میں ہے، تو پھر آپ دیکھیں گے مذہب کس قدر صاف ستھرا، Well lined out اور Well adjusted نظر آئے گا۔

اپنی جان سے زیادہ محبت

جب تک ہم بطور امت فرد واحد کی طرح نہیں سوچتے۔ جب تک ہم رسول اللہؐ کے گرد نہیں جمع ہوتے، ہمارا یہی حال رہے گا۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم شخصیات کی پرستش کرتے ہیں اور جس شخصیت کے ساتھ ہماری وابستگی ہونی چاہیے، وہ سرے سے ہی نہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں، جو رسول اللہؐ کو اتنی اہمیت نہیں دیتے اور کچھ غلو شان کرتے ہیں۔ کچھ یہ

سمجھتے ہیں کہ وہ ایک مقامی پیغمبر تھے اور رہے ہیں، جو اپنی اہمیت ان سے بالا رکھتے ہیں۔ ان ساری چیزوں میں سے ایک چیز نہیں نکلتی۔ وہ جو حضرت عمرؓ کو رسول اللہؐ نے فرمائی تھی کہ ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا، جب تک میری محبت لوگوں کے دلوں میں ان کی جان سے بھی نہ بڑھ جائے۔ حقیقت میں یہی ہمارا مرحلہ ہے۔ عرب لوگوں کو دیکھتا ہوں، وہ بڑے جدید اور پرجوش لوگ ہیں، لیکن ان میں وہ انس اور محبت بالکل پیدا نہیں ہوتی۔ جیسے بدوی رسول اللہؐ کے پاس آیا، اور دیکھا کہ آپ ایک بچے کو چوم رہے تھے۔ کہا، یا رسول اللہؐ کیا آپ بچوں کو چومتے بھی ہیں؟ کہا ہم تو چومتے ہیں۔ ہمارے تو دل میں رحم اور رحمت ہے۔

اگر میں منطقی لحاظ سے پیٹرن کو دیکھوں، تو میرا رسول اللہؐ سے بظاہر کیا واسطہ ہے۔ مگر مجھے وہ اس لیے اپنی جان سے زیادہ بڑھ کے عزیز ہیں کہ میں ایک پورے کمپلیکس میں دیکھتا ہوں۔ مجھے کسی عرب کے فوت ہونے یا کسی لیبیائی کے مرنے کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ مگر میرا دل جل رہا ہے۔ میرا دل جس ریفرنس سے جل رہا ہے، وہ صرف محمد رسول اللہؐ ہیں۔ اللہ کے بندے تو لاکھوں، کروڑوں مرتے جیتے رہتے ہیں، ان سے ہمیں کوئی غم نہیں ہوتا۔ جس ریفرنس سے غم ہو رہا ہے، وہ بس یہی ہے۔

لامحدود سے ملاقات

نبی اکرمؐ کا وجود ان معنوں میں لامحدود ہو گیا تھا کہ اس کی خاص طور پر تیاری کی گئی تھی۔ معراج سے پہلے حضورؐ کا شق صدر فرمایا گیا اور اس میں ایسے خاص آلات ضرور رکھے گئے، جو فضاؤں سے گذرنے کے پیٹرن کو سہار سکیں۔ اگر ہم سائنسی لحاظ سے دیکھیں، تو شق صدر کائنات اور آسمانوں سے گذرنے کی تیاری ہے، جہاں اللہ کے رسول کو اس قابل کیا گیا اور پھر فرمایا گیا کہ ان کا دل اب بالکل پاک کر دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بلڈ لیول تو شائد رہا ہی نہ ہو۔ جس کے بعد جو کچھ اللہ کے رسول نے دیکھا، وہ بہت غور اور اچھی طرح سے دیکھا۔ تو شب معراج ایک ایسا واقعہ ہے، جس میں حضورؐ کو پہلے سے وژن کی تیاری کرائی گئی۔

قصۂ نور و بشر

ہماری علماء کے ساتھ عمومی جنگ میں یہ ان کی نالائقی کی جدوجہد تھی۔ انہوں نے قرآن و حدیث کو توڑ کر کے پیش کیا۔ فضول بیانات کے اپنے اردگرد انبار لگا دیئے۔ قرآن و حدیث سے منسوب غلط آراء پیش کرنے لگے۔ اس موضوع پر بحث و مباحثے ہونے لگے کہ نبی نور ہے یا بشر؟ سترہویں، اٹھارہویں صدی میں برصغیر پاک و ہند میں اس قسم کے اشوز کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اصل سوال یہ نہیں تھا، بلکہ یورپ اور ایشیا میں اس وقت یہ تھا کہ اللہ نور ہے یا مادہ۔ اس زمانے کی یہ بحث تھی۔ لوگ یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ نور ہے، تو اس سے مادہ کیسے ہے اور اگر خدا مادہ ہے، تو اس سے نور کیسے نکل سکتا ہے۔ اٹھارویں صدی تک مذاہب کے اور دوسرے عام فلاسفروں کے درمیان یہ بحث سختی سے چلی آ رہی ہے۔ اس سے مذہب پسپا ہو رہا تھا۔ ان کا سائنسی اعتراض تھا کہ الیکٹرک شعاع کو مادہ بنا کر یا اس میں سے مادی وجود نکال کر دکھائیں۔ حتیٰ کہ

Marfat.com

آئن سٹائن کا زمانہ آ گیا۔ اس نے مساوات $e = mc^2$ دے دی۔ اس کے بعد ثابت کیا کہ مادہ اور توانائی دونوں تغیر پذیر چیزیں ہیں۔ کسی بھی وقت مادے کو انرجی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جھگڑا ختم ہو گیا۔ مادہ بذاتِ خود کوئی وجود نہیں رکھتا، بلکہ یہ ایک کثیف توانائی ہے۔ یہ جھگڑا یورپ میں تو ختم ہو گیا، مگر ہندوستان میں شروع ہو گیا۔ خدا کی جگہ بات پیغمبر میں منتقل ہو گئی کہ محمد رسول اللہؐ بشر ہیں یا نور۔ آئن سٹائن کا قانون یہاں بھی استعمال کریں کہ مادہ تو کوئی وجود ہی نہیں رکھتا۔ رسول اللہؐ تو بڑی دور کی بات ہے، میں نوری ہوں۔ کیونکہ میں ایک کثیف توانائی ہوں۔ ایک تیز ولاسٹی سے گذروں، تو میں بھی نور ہو جاؤں گا۔ آپ اس قسم کے نمونے سٹار ٹریک کی فلموں میں بھی دیکھتے ہیں، جس میں ماہیت قلب ہوتی ہے۔ انسان انرجی میں تبدیل ہو کر دوسرے سیاروں کو پہنچ جاتا ہے۔

خود اپنی ذات پر درود

آپ کو ''درود'' کا مطلب سمجھنا پڑے گا۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ اُولٰئِک علیھم صلوٰۃ من ربھم و رحمۃ یہ درود ہر انسان کے کام آتا ہے۔ درود پیغمبروں کے علاوہ دوسروں پر بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ جب ایران میں انقلاب آیا، تو ''درود بر خمینی'' سنائی دیتا تھا۔ اگر آپ اپنا درود بھی پڑھیں، تو کچھ مضائقہ نہیں۔ جب آپ کہتے ہیں: وعلی الہ و اصحابہ اجمعین..... تو ''اصحابہ'' کا کیا مطلب ہے؟ یوں اصحاب رسولؐ پر بھی درود جا رہا ہوتا ہے۔

''درود'' درحقیقت Refind Blessing ہیں۔ ان میں ہدایت، رحمت اور امن، تین عناصر ہیں۔ قرآن حکیم کا مطالعہ کیجیے، تو پیغمبروں پر بار بار جو چیز نازل ہوئی ہے، وہ سلام ہے۔ سلم قول من رب الرحیم۔ و سلم علی المرسلین و الحمد للہ رب العلمین خدا کے ہاں سے جو پیغمبران اقدس پر قیمتی ترین شے نازل ہوتی ہے، وہ سلام ہے۔ سلام، امن اور سلامتی کو کہتے ہیں۔ رسول کریمؐ کے ایک صحابی نے عرض کیا، میں روز صبح جاگتے ہی اللہ جل شانہ کو ''السلام علیک'' کہتا ہوں...... رسول اللہ نے فرمایا، وہ خود سلام ہے، اس پر سلام نہیں بھیجا جا سکتا۔ وہ سلام عطا کرتا ہے۔ چنانچہ ''درود'' میں جو سب سے بڑی اور بنیادی چیز شامل ہے، وہ سلام ہے۔ اللہ کی طرف سے ایک ایسی کیفیت امن، جس کو کوئی اضطراب بھی متزلزل نہیں کر سکتا۔

دوسری بات، بخاری شریف میں حدیث نبویؐ ہے اللہ معطی و انا قاسم (بخاری شریف) اللہ عطا کرنے والا اور میں بانٹنے والا ہوں۔ قرآن کریم میں اللہ فرماتا ہے: وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین۔ اللہ نے تمام رحمت جو زمین اور آسمانوں میں، اول تا آخر، بانٹنی تھی اس کی قاسمیت پیغمبرؐ اسلام کو دے دی۔ اب اللہ رحمت کا خالق اور عطا کرنے والا ہے اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وہ رحمت ہر قیمت پر جائے گی۔ اس درود میں وہ رحمت بھی شامل ہے۔ ایک سلام شامل ہو گیا، ایک رحمت اور تیسری کیفیت ہدایت کی ہے۔ اُولٰئِک ھم المھتدون۔

ایک وقت میں ہدایت کے ہزاروں سمبل ہوتے ہیں۔ مگر جیسے ہم اپنے ٹائم کو گرین وچ ٹائم سے درست کرتے ہیں۔ باقی ٹائم سٹینڈرڈ ٹائم نہیں ہوتے۔ اسی طرح کسی زمانے کے قطب، ولی یا پیغمبر کی تعلیمات سٹینڈرڈ ایجوکیشن کہلاتی ہیں۔ اس کا ایمان سٹینڈرڈ ایمان اور اس کی ایجوکیشن سٹینڈرڈ ایجوکیشن۔ کوئی شخص، جو اس سٹینڈرڈ ایجوکیشن سے ادھر ادھر

Marfat.com

بنے گا، وہ ہدایت یافتہ نہیں کہلائے گا۔ اس لیے تیسری چیز جو درود میں شامل ہے، وہ ہدایت ہے اور ہدایت کی بنیادی مرکزیت صرف رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔

قرآن کریم میں عام لوگوں کو مخاطب کر کے خدا کہتا ہے: والنبلونکم بشی ء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرت۔ یہ پانچ چیزیں ہیں۔ ہر آدمی کو ان سے آزماؤں گا۔ بچت کسی کی نہیں ہوگی۔ تھوڑا بہت ہر آدمی کو ٹچ کیا جائے گا۔ اس کو تکلیف ضرور ہوگی تم آرام کے لیے آئے ہی نہیں ہو۔ یہ کیمپ فائر ہے۔ اس کیمپنگ میں تمہیں ناآسودہ رہنا ہے مگر جب تم ان چار پانچ ہیڈز کے ٹیسٹ پورے کر لو گے۔ وبشر الصبرین الذین اذا اصابتهم مصيبة جب تم لوگوں پر مصائب آئیں اور تم نے اتنی اپروچ رکھی کہ قالو انا لله و انا اليه رجعون۔ تم لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ کسی جادو گنڈے کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا نہ کسی نے نظر بد لگائی ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اللہ کی وجہ سے ایک اچھا وقت آنا تھا، تو برا وقت بھی آ سکتا تھا۔ اللہ کی طرف سے یہ مصیبت آئی ہے اور ادھر ہی کو لوٹ جائے گی۔ اگر یہ صاف ستھرا یقین آپ کا ہوا۔ اُولٰٓئک علیهم صلوة من رب الرحیم۔ ان لوگوں پر میری طرف سے درود و سلام ہے۔ اُولٰٓئک هم المهتدون! یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔ درود میں سلامتی ہے، رحمت ہے، ہدایت ہے۔

اب اس سوال کا جواب کہ کیا پیغمبر خود اپنی ذات پر درود بھیج سکتے ہیں؟ میں جو اپنا چہرہ آئینے میں دیکھوں، تو مجھے ہدایت ہے کہ یہ پڑھنا: اے اللہ! تو نے میری صورت گوارا بنائی ہے تو میرا اخلاق بھی احسن کر دے۔ اب جب پیغمبر کو یہ پتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں رحمت عالم بنایا ہے، تو وہ ضرور کہیں گے کہ "اے اللہ! مجھ پر سلامتی، ہدایت اور رحمت نازل فرما۔" صرف سٹائل بدل جائے گا۔ جب رسول اللہؐ لوگوں کو بتائیں گے کہ درود ایسا پڑھنا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دیکھو، میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ میری تعلیم، میری مدح اور مجھ پر درود و سلام اللہ کے نزدیک ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کا تمہیں دیگر تسبیحات سے زیادہ فائدہ ہوگا۔

حضرت کعبؓ کی حدیث موجود ہے کہ جب وہ حضورؐ کے پاس گئے تو پوچھا،

کیا پڑھتے ہو؟

عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! یہ تسبیح پڑھتا ہوں۔

فرمایا، درود پڑھا کرو

عرض کیا، یا رسولؐ اللہ! ایک تہائی کر دوں؟

فرمایا، اور پڑھا کرو

عرض کیا، یا رسولؐ اللہ نصف کر دوں؟

فرمایا، اور پڑھا کرو

عرض کیا، یا رسولؐ اللہ، تو پھر میں درود ہی نہ پڑھا کروں؟

فرمایا، کفایت کرے گا۔

اقبال کا مکتبہ فکر

اقبال پر بحران ان کی عمر آخر میں واضح ہوا۔ ابتدائی زندگی میں اقبال کے لیے نیشنلزم، مسلم کاز ان کی اولین ترجیح تھی۔ خدا کی تلاش ان کی ترجیح نہیں تھی۔ وہ ایک فلاسفر تھے اور اچھا مسلمان ہونے کے ناطے ان کے ہاں فکرمندی بہت تھی۔ مگر مغربی تصورات کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے ان کے ذہن میں یہ انکار رہا کہ علم یا تحقیق و جستجو سے خدا نہیں ملتا۔ تب وہ عشق کی جانب پلٹے، مگر وہ عشق بھی علمی ہے۔ اقبال نے عشق کی بات کی، تو علم ہی کی بات کی۔ ایک اعلیٰ، ریفائن علمی جستجو، جس میں ایک ٹوٹل کمٹمنٹ ہو۔ مگر جب اقبال بوڑھے ہو گئے، تو انہیں عمر آخر میں شدت سے احساس ہوا کہ ان کی اپروچ غلط رہی ہے۔ اب وہ خدا کو ڈھونڈنے کے لیے مجذوبوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کبھی ایک، کبھی دوسرے مجذوب تک پہنچے۔ تب ان پر انکشاف ہوا کہ یہ طریقہ درست نہیں۔

میں اس کے باوجود انہیں مجدد وقت مانتا ہوں کہ انہوں نے اپنی اقدار کا احیا ضرور کیا اور انہوں نے پہلی مرتبہ فلسفیانہ سطح پر معجزات اور وحی کا دفاع کیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد تمام دلائل شکست کھا گئے۔ کچھ Semantics والوں نے رد کر دیئے اور کچھ Logical positivists نے۔ مجموعی طور پر فلاسفی میں اقبال کی تینوں Teleological , ontological, cosmological arguments رد کر دی گئیں۔ مگر اقبال نے کوشش تو کی۔

اس وقت دین اور اعتقاد کو، جس کم ریٹنگ پر جیسے اب ہے، اٹھایا جا رہا تھا۔ باہر سے انکوائری اور معلومات کے اتنے سیلاب کا سامنا تھا کہ اس کے مقابلے میں ہمارے اس وقت کے دینی مدارس اور ادارے بڑی بری صورت پیش کر رہے تھے۔ جب جواب نہیں آتا تھا، تو وہ بے لوچ ہو جاتے تھے۔ مولوی اس اہلیت کا نہ تھا کہ پروفیسر وائٹ ہیڈ یا میکڈوگل کا جواب دیتا۔ جب ہم ان کے آلات ہی نہیں جانتے، انسٹرومنٹس ہی سے واقف نہیں۔ ان کی قینچیاں نہیں دیکھتے۔ ان کے کانٹے نہیں جانتے، تو اس کا جواب کیسے دیں گے؟ ہم تو زخمی ہو جائیں گے۔

اقبال نے پہلی مرتبہ اسلام کو جدید خطوط متعارف کرانے کی سعی ضرور کی۔ اگرچہ وہ خود اپنے دلائل اور اپنی کاوش سے مطمئن نہ تھے۔ اسی لیے انتقال کے وقت انہوں نے دو قطعات کہے، جن میں سے ایک تو وہ ہے:

Marfat.com

سرودِ رفتہ باز آید کہ نآید
نسیمے از حجاز آید کہ نآید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ نآید

اور دوسرا قطعہ یوں ہے

اگر می آید آں انائے رازے
بدہ او را پیالے جانگدازے
ضمیرے امتاں را می کند پاک
کلیمے یا حکیمے نے نوازے

یہ رباعی بتاتی ہے کہ انہیں یہ شعور تھا کہ وہ آخری استاد نہیں ہیں۔ دوسرا یہ کہ انہیں یہ یقین تھا کہ وہ جو دوسرا، اگلا کام ہے، وہ کوئی دوسرا آ کر کرے گا۔ شاید وہ اس سلسلے میں کچھ لیٹ ہو گئے تھے۔ اس سب کے باوجود، اگر میں ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کروں، تو مجھے دو آدمی برصغیر میں نظر آتے ہیں۔ ایک ولایت کی سرزمین کے آسمان سید نا مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف والے انتہائی پڑھے لکھے صوفی تھے۔ ان کی کیفیات کا میں نے جو مطالعہ اور تجزیہ کیا ہے، یہ خالصتاً اکیڈیمک، مذہبی اور اعلیٰ کلاسیکل تصوف ہے۔ جب میں اقبال کو دیکھتا ہوں، وہ جدید دور کے چیلنج کا سامنا کرتے ہیں۔ لیکن اتفاق دیکھیے کہ دونوں کی فکر کا تسلسل ناممکن ہے۔ مہر علی شاہ صاحب کی گدی کا تسلسل ممکن نہ رہا۔ صوفی ازم کا کلاسیکل انداز اپنے اختتام کو پہنچا۔ جدید ٹمپل میں تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ دوسری طرف علامہ اقبال کی جو خصوصی شاعرانہ فیکلٹی اور مہارت تھی اور اس کا جو مغربی مطالعہ اور تجزیہ تھا کیا پتہ تھا کہ آئندہ زمانوں میں فلسفہ ہی ختم ہو جائے اور اس کی جگہ جدید ترین سائنسز کو فروغ حاصل ہوگا۔

اب ایک مرتبہ پھر ایک مربوط کرنے والے کی ضرورت تھی، جو مادی اور تصوف کی دنیا کو دوبارہ اکٹھا کرنے کے بعد ایک نیا فکر تخلیق کرے۔ جس میں رکھ رکھاؤ کی قطعی گنجائش نہ ہو کیونکہ اس میز ازم نے تصوف کو تباہ کر دیا تھا۔ اکیڈیمک سختی و تنگی نے ان کو کہیں پہنچنے نہیں دیا۔ چنانچہ اس دوران ایک نئی فضا کی ضرورت تھی، جو جدید تر بھی ہوتی اور اپنے انداز میں متوازن بھی۔ اب ایک پتلون والے کی ضرورت تھی۔ ایک ایسا بندہ، جو جیکٹ اور جینز میں کمٹمنٹ کا اظہار کرے۔ اب دھوتی نہیں پہنی جا سکتی تھی۔ اب ہمارا زیادہ تر تعلیمی مرکز یورپ ہے اور اگر یورپ سے ہم اپنا Academician مذہب کی جانب واپس نہیں لے سکتے، تو ہم مکمل شکست سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب صوفی کی ضرورت نہیں۔

اعتدال کی احسن صورت

جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، پہلے عقل جبلت سے کم تر تھی۔ پھر رسول ﷺ کی صورت میں دنیا کا بہترین اعتدال پیدا ہوا اور انہوں نے ایسا ہی اعتدال پیدا بھی کیا۔ اس کو امت وسطیٰ بھی کہتے ہیں۔ جب سے انسان بنا اور

Marfat.com

جب تک انسان رہے گا، اعتدال اور توازن کی مثال صرف رسول کریمؐ کی دی جائے گی۔ ایک جانب غیر مرئی واقعات و حالات کی انتہا ہے۔ اللہ کو سامنے دیکھنا ہے۔ جبریل سے روزانہ کی ملاقات ہے۔ غیر مرئی واقعات کثرت سے پیش آ رہے ہیں۔ ہاتھوں سے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ دوسری طرف اس شخص پر اس کے اتنے عام اثرات ہیں کہ وہ انسانی رویوں کے اظہار میں بالکل میری آپ کی طرح ہیں۔ آپؐ ایک معجزاتی شخصیت ہیں مگر معجزے آپؐ کے معجزے کی وجہ سے نہیں، بلکہ آنحضرتؐ کے اعتدال مبارک کی وجہ سے ہیں۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد مبارک ہے کہ اعتدال اختیار کرو اور اگر مکمل اعتدال ممکن نہ ہو پائے، تو اس کے قریب ترین رہو۔

یہ ایک عجیب وغریب بیان ہے، جو ہمیں بتاتا ہے کہ وہ اتنے عقل مند انسان تھے کہ اعتدال کو جامد نہیں سمجھتے تھے۔ اب جو بھی شخص خدا کی طرف چلے گا، اس کا معیار اعتدال ہے۔ اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ کون اللہ کے قریب ہے، تو جان لیجیے کہ اللہ اپنے نزدیک دیوانوں اور احمقوں کو نہیں رکھتا۔ اس نے نسل انسان کو ایک ٹیلنٹ اور شرف بخشا ہوا ہے۔ وہ یہ چاہے گا کہ انسان اس شرف کو استعمال کرے۔ یہ تمام اوصاف ایک چیز سے حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی جلد سے جلد اپنی ترجیحات کا تعین۔ جتنی زندگی ضائع کر کے آپ ان ترجیحات کے تعین تک پہنچیں گے، اتنے ہی آپ مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ وہ چاہے فرد ہو، سوسائٹی یا ملک ہو، جس قدر وہ ان ترجیحات سے دور ہے، اتنا ہی پریشان اور مصیبت زدہ ہے۔

ایک آدمی پچاس سال میں اس ترجیحات کو پاتا ہے۔ مگر پچاس سال میں خدا کے نزدیک اس کی ترجیحات کی قدر و قیمت کم ہو گئی۔ ایک شخص پچیس سال میں انہیں ترجیحات کو پا لیتا ہے اور اس کو پتہ ہے کہ میری زندگی اور میری سوچ، سب کچھ کا واحد مقصد یہ ہے کہ میں خدا کو پہچانوں، جب ذہن ترجیح اول کا اعلان کر لیتا ہے، تو خدا اور بندے کے ذاتی اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بندے سے یہی توقع تھی کہ وہ غور کرے سوچے اور مجھے انٹلکچوئل ترجیح اول وضع کرے۔ ہو سکتا ہے کہ ذہنی طور پر اس کو اولیت اور اولین ترجیح قرار دینے کے باوجود آپ اپنی زندگی میں اس کی اولیت قائم نہ رکھ پائیں۔ اس لغزش کی معافی مل سکتی ہے۔

گناہوں کی بخشش اس کے ہاں صرف اس وجہ سے ہے کہ اللہ یہ دیکھتا ہے کہ آپ نے بڑا مسئلہ بنیادی سوال تو حل کر لیا ہے۔ آپ کی کمزوریاں، کمیاں، ہو سکتا ہے، آپ کو ترجیحات کے فقدان پر مائل کریں مگر یہ آپ کا ذہن اور آپ کی سوچ و فکر کی بھرپور طاقت ہے، جس نے یہ مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اللہ اپنے بندے پر فخر کر سکتا ہے کہ جس محنت اور مشقت کی بنیاد پر اس نے اپنے بندے کو اشرفیت بخشی، اس نے اسے استعمال کیا۔ حتیٰ کہ خدا انسان کی کمزوری کی وجوہ کو حکم دیتا ہے۔ تسلیم نہیں کرتا، حکم دیتا ہے کہ اگر تم بڑے گناہوں اور فواحش سے پرہیز کرو، تو چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ جب خدا خود کہہ رہا ہے کہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور کوتاہیوں کے دور تم پر آئیں گے، تو یہ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ ہر آدمی پر حماقتوں کے کچھ دور ضرور گذرتے ہیں۔ خطاؤں کے کچھ پیٹرن ضرور بنیں گے۔ اس لیے کہ خطا بذات خود سیکھنے کا بھی باعث ہے۔

دو ارب سال سے انسان دنیا میں موجود ہے۔ تہذیب تو اس نے پچھلے تین سو برسوں سے پائی ہے۔ اتنا بڑا پیوند ہے کہ دو ارب سال سے انسان کے موجود ہوتے ہوئے اٹھارہ ہزار سال سے انسانی معاشرت کا باقاعدہ عقلی وجود ملتا ہے،

تو بھی محض ہم تہذیب کے تین سو سال کے دوران سکائی سکر یپرد یکھتے ہیں بلکہ سو سال سے بھی کم۔ مطلب یہ ہے کہ خداوند کریم نے انسان کے ذہن کی کشادگی کا عمل آہستہ رکھا۔ مسلسل اور آہستہ۔ اب جو اطلاعات کا سیلاب آ گیا ہے، اس کی وجہ سے وجود ست پڑ گیا ہے۔

ذاتی اور پیغمبرانہ حیثیت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ زمین پر ایسا کوئی ذی حیات نہیں، جسے میں نے اس کے ماتھے سے نہیں پکڑ رکھا۔ چنانچہ واقعاتی اور حادثاتی کنٹرول کے لیے اللہ نے تمام ذی حیات اشیاء کو ریموٹ کنٹرول سے تھاما ہوا ہے۔ کوئی شیر کسی بکری کی چیر پھاڑ نہ کرے۔ کوئی بکری کسی شیر کا لقمہ نہ بنے۔ کوئی سانپ کسی کو نہ ڈسے۔ آپ کے پاس سے کبھی سانپ ایسے گذر جائے گا، جیسے اس نے آپ کو دیکھا بھی نہ ہو اور کبھی وہ وقت ہوگا کہ ذرا سی آہٹ پر آپ پر حملہ کر دے گا۔ یہ تمام چیزیں خدا کی طرف سے ہیں۔ کیونکہ خدا ریموٹ کنٹرول کے ذریعے دنیا میں آمدورفت کے رستے کنٹرول کرتا ہے۔ قتل و غارت، دنگا فساد، حلال و حرام دنیا بھر کے تمام واقعات و حادثات ہیں کہ جس جگہ جس خیال کو جوڑا گیا ہے، اسے تقدیر یا جبر و قدر کہتے ہیں۔ جبر کا اصل مطلب ہے زماں کو مکاں میں جوڑنا۔ ایک لمحہ زماں کو ایک لمحہ مکاں میں جوڑنے کو ہم جبر کہتے ہیں۔ یعنی یہ مقام ہے، یہ وقت ہے، اس میں آ کر ہم سارے جڑ گئے ہیں۔ یہ جبر ہے کہ اس وقت آپ اس محفل میں موجود ہیں۔

انسانی جبلت ایک زمانے میں بہت کم تر اور طاقتور تھی۔ پیغمبروں کو ایک پیغام دینا تھا۔ چنانچہ ان کی روحیں آزاد نہیں چھوڑی جا سکتی تھیں۔ پیغمبروں کی تمام زندگیاں پیغام کے مطابق تھیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلے پیغمبروں کو کچھ عملی آزادیاں اللہ نے دی ہوئی تھیں اور ایک ایک حکم نازل ہوتا تھا اور طویل طویل عمریں تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی ایک ہزار سال عمر تھی۔ حضرت نوحؑ کی 937 برس تھی۔ ایک ناممکن تسلسل نظر آتا ہے، لیکن پیغام چھوٹا سا تھا، کہ اللہ ایک ہے۔ یعنی انسانی جبلت ایک زمانے میں اتنی نیچی اور اتنی طاقتور تھی اور عقل اتنی کم کہ بار بار ہتھوڑے کے ذریعے انسانی دماغوں پر ضرب لگانی پڑی تھی کہ اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے اور نو سو برس پیغمبر کو گذر گئے اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ جبلی سختی اتنی تھی کہ نو سو برس میں بھی وہ پیغام معدودے چند کشتی میں سوار ہونے والوں کے سوا کسی تک پہنچ نہ پایا۔ یہ بالکل وہی حساب ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا دماغ چھوٹا سا ہوتا ہے۔ غیر استعمال شدہ، اس میں عادات ابھی راسخ نہیں ہوتیں۔ اس کا رویہ اردگرد کی سکھلائی سے شعور پانا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر ایک نوزائیدہ بچے کو آپ نے $e = mc^2$ پڑھانا سکھانا ہے، تو آپ کے کم از کم سات برس تو ضائع ہی ہوں گے۔ آپ اس کو روز کہیں گے کہ $e = mc^2$ لیکن چونکہ اس کے پاس سیکھنے کی وہ صلاحیت نہیں ہے، اس لیے وہ نہیں سیکھ پائے گا۔ حتیٰ کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا، حساب پڑھے گا، اسے آلات سے آگہی ہوگی، دماغ اس قابل ہوگا۔ شاید پچیس برس بعد وہ کہے کہ بس کر بابا، سمجھ آ گئی ہے۔

جب انسان ترقی یافتہ ہوا ہے، تو اس کا ایک دم سارا ذہن ترقی نہیں پایا۔ آہستہ آہستہ، ایک پورا بند پیکٹ تھا، جس کا ایک دروازہ کھلا دوسرا اور پھر تیسرا کھلا۔ اور آج جب ہم کہتے ہیں کہ انسان سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، تو اس کے

Marfat.com

کل دماغی سیلوں میں سے بمشکل ایک فیصد بھی استعمال نہیں ہوئے۔ بلکہ اگر اٹھارہ بیس کروڑ سیل ہیں، تو ان میں سے بمشکل لاکھ دو لاکھ استعمال ہونے کے قابل ہوئے ہیں۔ دماغ کی کائنات کتنی وسیع ہے اور انسان کو دیکھئے کہ وہ ابھی تک اس کی کشادگی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا ہے۔ اب تھوڑی بہت سائنسز کا آغاز ہوا ہے، تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جس صلاحیت سے نوازا ہے، وہ اچانک نہیں ہے۔ آہستہ اور تدریجی ہے۔ قرآن حکیم میں شراب کی ممانعت اٹھارہ برس میں آئی ہے۔ بائیس سال میں قرآن نازل ہوا۔ قرآن کا نزول ایک دن میں بھی ممکن ہو سکتا تھا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے طریقہ سکھا دیا ہے۔ آہستہ آہستہ لیکن بتدریج اور مسلسل قرآن نے بتایا گیا ہے کہ دیکھو، شراب بری ہے اور اچھی بھی، لیکن اس کی برائیاں اچھائیوں سے زیادہ ہیں۔ ''پوچھتے ہیں کہ شراب اور جوا کیا ہے؟ اعلان فرما دیجیے کہ اس میں لوگوں کے لیے نقصانات اور فوائد ہیں اور اس کی برائیاں اس کے فوائد سے زیادہ ہیں۔''

بس اشارہ دے کر چھوڑ دیا۔ جو زیادہ ذہین تھے، یہیں سے سمجھ گئے، باقیوں نے کہا کہ چانس ہے، اللہ نے حکم نہیں دیا۔ چنانچہ پینا پلانا جاری رکھا۔ حتیٰ کہ نمازوں میں جب پوری سائیکی پیچھے سے دباؤ ڈالتی تھی، تو لات وعزیٰ کے نام پڑھے جاتے تھے۔ پھر اللہ نے کہا، دیکھو یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ میں نے اتنی مشقتوں اور اتنے پیغمبروں کے ذریعے تمہارا ایک ایک پل سنوارا ہے اور تم آن واحد میں اس پر پانی پھیر دیتے ہو۔ تو کہا، نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم پیئے ہوئے ہو۔

اس طرح کا ایک وقفہ پانچ نمازوں کے دوران دے دیا گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے پینے سے گریز کیجیے۔ پھر متعدد واقعات ہوئے، تا نکہ آخری حکم نافذ ہوا۔ پیغمبر کی زندگی اتنی طویل نہ ہوتی، اگر یہ محض پیغام دینے کی بات ہوتی کہ آیا، پیغام دیا اور رخصت ہو گیا۔ وہ ایک لمحاتی زندگی ہوتی۔ وہ ایک سال میں قرآن پڑھ کر سناتے۔ پیغام پہنچ گیا؟ اب رخصت دیجیے لیکن اس میں ان کے 63 سال بیت گئے۔ قرآن حکیم میں اللہ قسم کھاتا ہے۔ اے پیغمبر، مجھے تیری عمر مقدس کی قسم! تیرے ایک ایک لمحہ حیات کی قسم! کہ تجھے میں نے گنا چنا وقت دیا اور تیرا ایک ایک لمحہ میں نے کاؤنٹ کیا ہے۔

اس لیے ریموٹ کنٹرول کی بجائے اسے ہم ٹوٹل کنٹرول کہتے ہیں۔ پیغمبر ٹوٹل کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ ان کی غلطیاں بھی اسی کنٹرول سسٹم کا حصہ ہوتی ہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے ایک اجتہادی خطا کی۔ اس کی قرآن سزا بھی دیتا ہے۔ ''اور چلا غصے میں بھرا ہوا ذوالنون اور اس نے خیال کیا کہ ہم اس پر دن تنگ نہ کریں گے۔ جب ہم نے اس کو گھیر لیا، تو اس نے ظلمات میں سے ہمیں پکارا، لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین۔ اب اس کا ترجمہ دیکھئے، کتنا مؤثر اور سادہ ہے کہ خدا پاک ہے غلطی سے، مجھ میں غلطی کا امکان ہے، میں نے غلطی کی ہے، آئی ایم سوری! اس پوری آیت کا ترجمہ بے حد سادہ ہے۔ You make no mistakes. I can make mistakes, I have made a mistake. I'm sorry.

یہ اتنا کہنے کے برابر ہے کہ اے پروردگار میں نے غلطی کر لی ہے، معافی چاہتا ہوں۔ اتنی سادہ آیت کو اردگرد کے صوفیا لوگ کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ پانی میں بیٹھ کر پڑھو، پہاڑ پر چڑھ کر پڑھو، یہ آیت بڑی جلالی ہے۔ فلاں بڑی جمالی ہے۔ گھروں میں جائیں، آپ کو حیرت انگیز حماقتوں سے واسطہ پڑے گا کہ موم بتیاں جل رہی ہیں، اگر بتیوں کی خوشبوئیں آ رہی ہیں، کئی اقسام کے اہتمام کیے جا رہے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے؟ یہاں آیت کریمہ پڑھی جا رہی ہے۔

Marfat.com

اب اس پیغمبر کو دیکھئے، جس نے یہ آیت پڑھی تھی۔ مچھلی کا پیٹ ہے، غلاظت اور گندگی ہے، وضو کی گنجائش نہیں ہے۔ تین دن اور تین راتوں کے بعد جب پیغمبر کو باہر نکالا گیا، تو ان کی جلد اتنی گل سڑ گئی تھی کہ خدا نے کدو کی بیل اگائی، اس کا سایہ کیا۔ جلد نارمل ہوئی، تو کدو کی بیل سوکھ گئی۔ حضرت یونسؑ بن متی نے گلہ کیا کہ اے پروردگار! اس بیل کا تھوڑا سا مجھے سکھ پہنچ رہا تھا، تو نے اسے بھی سکھا دیا۔ اللہ نے کہا، ایک بیل جو تجھے سکھ دے رہی تھی، اس کے سوکھنے کا کتنا صدمہ ہوا اور اے یونس، میں نے ایک لاکھ انسانوں کا شہر بسایا تھا، اگر میں ان کو عذاب دے کر ختم کر دیتا، تو مجھے صدمہ نہ ہوتا؟

اس میں ایک سبق ہے کسی پیغمبر کی خطا بغیر سبق اور بغیر انسان کے فیض کے نہیں۔ اب اس آیت سے کیا فیض ہے؟ فرمایا، جب اس نے اس سادگی سے مجھ سے استدعا کی، تو میں نے اسے بخش دیا۔ صرف اسی کو نہیں، بلکہ جو بھی مومن مجھ سے اخلاص کے ساتھ اس طرح معذرت خواہی کرے گا، میں اسے معاف کر دوں گا۔ وہ خطا کیا ہوئی، جو قیامت تک انسان کے لیے منفعت بخش بن گئی۔

تمام پیغمبر ٹوٹل کنٹرول میں ہوتے ہیں اور ان کا ایک ایک لمحہ چاہے خطا ہو یا جزا، آپ کے لیے ایک Symptom of creative faculty تخلیق کر رہا ہے۔ وہ آپ کے لیے ایک درس ثابت ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی دعائیں، جو قرآن کریم میں ریکارڈ ہوئی ہیں، آپ کے لیے سوغاتیں ہیں۔ ان کو خطا نہیں کہا جا سکتا۔ خطا ان کی اللہ کے نزدیک ہے۔ اللہ کے نزدیک خطا کا ایک پیٹرن تخلیق کیا گیا، جس میں سے ثواب آپ کو مل رہا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ کہنے کا قطعاً کوئی حق حاصل نہیں کہ پیغمبر غلطیاں کرتے ہیں۔

ہماری اپنی زندگیاں اتنی کنٹرول ہوتی ہیں۔ ان میں تمام حالات و واقعات و آثار ایک ٹوٹل کنٹرول میں ہوتے ہیں۔ آزادی تو صرف ذہنی اپروچ کی ہوتی ہے۔ وہ ذہن جو ایک چیز سے اچھا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ جب رسول ﷺ سے شاعری سے متعلق پوچھا گیا، فرمایا شعر اچھا بھی ہے، برا بھی ہے۔ حسان بن ثابتؓ کی شاعری کی داد دینے جبرئیل امینؑ بھی تشریف لاتے ہیں اور دوزخ میں سب سے زیادہ عذاب، جو شاید ہو سکتا ہے، وہ زہیر، سلمیٰ کو یا امراء القیس کو ہو، جو تشبیب کے علاوہ شاعری ہی نہیں کرتا۔

آزادی میں حائل خدا

یہ آپ کے علم پر منحصر ہے کہ جن چیزوں کو آپ اپنی آزادی سمجھ رہے ہیں، وہ اللہ کے نزدیک آپ کے لیے بہت مضرت رساں ہو سکتی ہے۔ اللہ نے کہا ہوا ہے، وعسیٰ ان تکرھوا شیئاً و ھوا خیر لکم کسی چیز سے تم کراہت کھاتے ہو، اس میں خیر ہوتی ہے، و عسیٰ ان تحبوشیئاً و ھو شر لکم کسی چیز سے تم محبت رکھتے ہو اور اس میں شر ہوتا ہے۔ واللہ یعلم و انتم لا تعلمون اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ سب سے بڑا کریڈٹ آپ خدا کو یہ دیتے ہیں کہ وہ آپ سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ یہ کسی بڑے سے بڑے ذہین شخص کے لیے بھی بڑی تسکین کی بات ہوتی ہے کہ مجھ سے بھی بڑا کوئی علم والا موجود ہے، جس کے سامنے میرے علم اور حیثیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ میرے لیے فیصلہ کرتا ہے اور میں اپنی سوچوں اور خیالوں میں اس سے مدد مانگ سکتا ہوں۔

Marfat.com

آزادی کا پیٹرن بڑا ناقص ہے۔ مثال کے طور پر ٹونی بلیئر کہتا ہے کہ "یہ ہم مہذب لوگوں پر حملہ ہے۔" اس نے یہ کئی مرتبہ کہا۔ مجھے یہ بات بڑی احمقانہ سی لگی کہ تم یورپین لوگوں کے سوا اور کوئی مہذب ہی نہیں ہے۔ یہ بذات خود اتنے منفی اور احمقانہ ریمارکس ہیں کہ اس سطح کے سیاستدان اور شخصیت سے اس کا بیان بچگانہ سی بات لگتی ہے مگر ان سے اگر پوچھا جائے کہ مہذبانہ رویہ ہے کیا؟ تو یہی نکلے گا کہ Homosexuality یا Lesbianism جیسے جتنے بھی کام ہیں، جنہیں ہم غیر اخلاقی سمجھتے ہیں، وہ اس قسم کی آزاد روی کو آزادی سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ وہ آزادی جو ہمیں کسی بڑی تباہی سے دوچار کر دے، اسے آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ خیالات کے پراسیس کی ایک خودساختہ سٹائل کی انفرادیت ہے، جو بندے کو قائل کر رہی ہے کہ یہ درست ہے۔ مگر چونکہ اس کو سمجھانے والا کوئی نہیں ہوتا، اور اس کے تجربات بھی محدود ہوتے ہیں، اس سے آگے چل کر وہ کسی بڑی ناکامی یا مسئلہ کا باعث بن جاتے ہیں۔

اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ خدا آپ کی آزادی میں حائل ہے۔ خدا اپنے پرسنل حقوق کے بارے میں بہت خاموش ہے۔ پورا قرآن شریف پڑھ لیں، خدا کہتا ہے، اگر تم میری عبادت کرتے ہو، تو مجھے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر نہیں بھی کرو گے، تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہے۔ عبادت میں معاشرے کے لیے ایک محفوظ ایریا رکھا ہے۔ اس ایریا سے باہر ضرور تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔ اگر اس ایریا کے بیچ میں رہو گے اور حدود اللہ کی حفاظت کرو گے، تو پھر آپ کو قیامت تک کوئی پرابلم پیش نہیں آئے گی۔

آزادی کا دوسرا رویہ ہے کہ مہذب معاشرے چوروں چکاروں، بدمعاشوں کو، جو کہ سوسائٹی کے لیے خطرہ ہیں، خیالات کی آزادی بھی دیتے ہیں اور ان سے بہت سی سزا بھی ہٹا دیتے ہیں۔ مگر سوال یہ نہیں ہے کہ قرآن کا ہاتھ کاٹنے والا قانون غلط ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ جو نظام آپ دیتے ہیں، کیا اس کے نتائج اس سے بہتر ہیں؟ پچھلے تین چار سو سالوں سے یورپین نے جرم و سزا پر اتنے تجربات کیے ہیں کہ وہ بالآخر سب کے سب ناکام ہو گئے ہیں۔ حتیٰ کہ آخری بار انہوں نے نیویارک میں سزائے موت دوبارہ نافذ کر دی ہے۔ چنانچہ جب تک آپ اچھا متبادل نہیں لاتے، اس وقت تک آپ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہوتے۔

آزادی کا مطلب یہ ہے کہ میں خدا سے بہتر سوچتا ہوں اور میرا دعویٰ ہوتا ہے کہ میں خدا سے بہتر جانتا ہوں۔ خدا اس معاملے میں بہت ہی لبرل ہے۔ بلکہ زمانہ رسالت میں جب بھی کسی شخص نے اپنے طور پر اچھی رائے دی، تو آسمانوں سے لبیک آئی کہ میرے بندے نے بہتر سوچا۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ جس طرح اذان کا پیٹرن آیا، تو اسی اذان کے پیٹرن کی تائید بھی آ گئی۔ اسی طرح اللہ کی تعریف کے بڑے بڑے پیٹرن تھے۔ جب ایک بدو نے کہا کہ الحمد اللہ حمداً کثیراً طیباً مبر کاً فیھہ تو پتہ چلا کہ آسمان کے فرشتوں کے پاس اس کا ثواب لکھنے کی کوئی حد ہی نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ فرشتے اس بات پر پریشان ہیں کہ اس کا اجر کیا لکھیں، کیونکہ یہ نصابی کتاب میں نہیں ہے۔

سو انسان اپنے اندر کوئی عجب بات پیدا کر سکتا ہے۔ اللہ ہی کے قول کے مطابق کرمنا بنی آدم ہم نے بنی آدم کو کرامت بخشی ہے۔ اللہ بڑا لبرل ہے۔ بلکہ کئی مرتبہ آپ اس سے جھگڑنے اور سوال کرنے میں لبرٹی لے لیتے ہیں۔ آپ اس کو بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں صحیح سوچ رہا ہوں۔ اللہ میاں آپ خواہ مخواہ مجھ پر جبر فرما رہے ہیں، لیکن پھر

Marfat.com

آپ کو وقت کا انتظار کرنا پڑے گا اور دیکھنا ہوگا کہ آپ صحیح تھے یا خدا صحیح تھا۔ جب یہ لمحہ آجائے اور پتہ چل جائے کہ خدا سچ کہہ رہا تھا، تو پھر آپ کا حق نہیں بنتا کہ آپ اتنے اچھے دوست کے ساتھ خواہ مخواہ الجھتے پھریں۔

خدا قرآن میں کہتا ہے کہ میں نے انسان کو ایک چھوٹے سے نطفہ سے بنایا اور یہ نکلتے ہی مجھ سے جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔ ہم خدا کے ساتھ دلیل بازی جاری رکھتے ہیں ایسا کوئی بندہ دنیا میں نہیں ہے، جو دلیل بازی نہیں کرتا۔ مگر جس بات کو آپ خدا کی متابعت یا خدا کی محبت کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف اسی کے ساتھ جھگڑیں، کسی اور سے نہ جھگڑیں۔ جب آپ کی کمٹمنٹ اتنی صاف ستھری اور پختہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں مانتے، تو لامحالہ آپ کا ہر گلہ، ہر جھگڑا اور فساد اسی کے ساتھ ہوگا مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ جھگڑے کی وجہ سے اس سے بے وفا ہو جائیں۔ وہ تمام حدود، جن کے اندر خدا نے آپ کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دی ہیں۔ ان میں آپ ہمیشہ اللہ سے دلیل بازی کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کہیں، اللہ میاں تم میری بات نہیں مانتے، چلو چھٹی۔ اللہ حافظ، میں یہ جا رہا ہوں میں کمیونزم کی طرف یا ڈیموکریسی کی طرف رخ موڑ رہا ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

موسیقی سننے کی آزادی

میں نہیں سمجھتا کہ خدا نے موسیقی کے تصور کو اس طرح مسترد کیا ہے۔ اس سے اس کا تعلق نہیں۔ تاہم اگر توریت دیکھیں، تو ہمیں نغمات سلیمان نظر آتے ہیں۔ ان کا نام ہی نغمات سلیمان ہے۔ وہ بڑے قیمتی اقوال ہیں ان کی پرانے مذاہب میں مستقل حیثیت ہے، جو کہ منع نہ تھے۔ موسیقی کے آلات moral نہیں ہیں، یہ Immoral بھی نہیں ہیں۔ یہ amoral ہیں۔ ان کا جواز آپ کے نتائج خیال سے ہوگا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم ہے کہ رسول اللہؐ کی خادمہ کا جب نکاح ہوا، تو آپ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا، اے عائشہؓ گانے والیاں ساتھ نہیں بھیجیں؟ فرمایا مجھے خیال تھا کہ آپ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ فرمایا نہیں، یہ تو رسم و رواج ہے۔ اس موقع پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے لوگوں کو تھوڑا سا انجوائے کرنے کا حق نہیں دیا۔ 10، 15 سال پہلے اخباروں میں شاہ فیصل کو ڈانس کرتے دکھایا گیا۔ وہ اپنے گاؤں میں اپنے قبیلہ میں گئے اور ہلکی ہلکی دف کی موسیقی میں ڈانس کر رہے تھے۔ یہ اشتعال کے رستے نہیں ہیں۔ ایک ڈانس جو اشتعال اور شہوات کا راستہ ہے۔ ایک صرف باڈی فگرز کی قطار بندی (Alignment) ہے۔ حج کے موقع پر اللہ نے کہا کہ ذرا شانے مار کے چلو۔ اس وقت اہل کفر تھے، ان کو پتہ چلے کہ تم کمزور لوگ نہیں ہو۔ جسمانی لحاظ سے بھی مضبوط ہو۔ خدا موزوں اور منطقی تکنیک اپنے لوگوں کے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

جس موسیقی کو وہ منع کرتا ہے، وہ موسیقی ہے، جو صرف اور صرف شہوات کو جاتی ہے۔ یورپ سے بہت سے بچے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے کہ ہم موسیقی کے بغیر سو نہیں سکتے۔ یہ موسیقی اصل میں موسیقی رہتی نہیں ہے۔ وہ شور کا ایک ٹمپر ہے، جس کے وہ عادی ہو چکے ہیں۔ وہ بڑے ذہین بچے ہیں۔ موسیقی چل رہی ہو تو پڑھتے رہتے ہیں۔ موسیقی نہ ہو، تو انہیں خلا محسوس ہوتا ہے، جس میں وہ پڑھائی نہیں کر سکتے۔ اس قسم کے پس منظر کی موسیقی کا صرف ایک اسکالر کی طرف سے تعین ہو سکتا ہے کہ آیا یہ جائز ہے یا نہیں۔ مگر اس کو ترجیح نہیں بننا چاہیے۔

Marfat.com

الیاس کے معانی

الیاس ایک پیغمبر کا نام ہے۔ وہ ان دو تین پیغمبروں میں سے ہیں، جو زندہ اٹھائے گئے۔ ان کا قرآن میں اصل نام ال یاسین ہے، جسے عمومی طور پر الیاس کہا جاتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا سراغ ہمیں اسیری بابلی تہذیب میں ملتا ہے۔ وہ قانون کا تحفظ کرنے والوں میں سے ایک تھے اور انہوں نے ان لوگوں کو قصاص کا تصور دیا تھا۔ ان نام میں چند بنیادی خصوصیات بہت اہم ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ یہ نام پیدائشی طور پر بہت زیادہ حساسیت کا مالک ہوتا ہے۔ دوسرا شروع میں یہ حجاب اور Seclusion (تنہائی) میں آتا ہے۔ اس کے لیے بڑی دشواری ہے کہ اسے نوجوانی کی عمر میں تیزی سے حرکت والا نہیں پائیں گے۔ دوسرا یہ لوکل ذمہ داریوں سے اٹھتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ بہت آغاز میں آپ احساس ذمہ داری کے بوجھ سے دبے ہوئے ہوتے ہیں، جو شاید ہی کوئی آپ کے اردگرد اس میں شیئر کرے۔ اس کی وجہ سے ایک اذیت اور دکھ کا احساس آپ کی زندگی کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے، لیکن اس سب کے باوجود یہ نام اختیارات کے حصول کا بے حد خواہشمند ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ اس کا دبا دبا غصہ بے تحاشا ہوتا ہے۔ آپ اپنی بہت کوشش کے باوجود مایوسی اور غصے سے نجات حاصل نہیں کر پاتے۔

ایک اور بڑی بات یہ ہے کہ جس نام کے ساتھ الف زیر اور لؔ لگ جائیں، یہ براہ راست اس پیٹرن میں چلے جاتے ہیں، جسے ہم اللہ کا پیٹرن کہتے ہیں۔ اس میں کمانڈ اور ذمہ داری دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ان کی اداسی دیکھئے کہ تمام زندگی میں یہ کبھی بھی خیال نہیں کرتے کہ جوان کا منصب یا محنت تھی، کیا اس کے مطابق انہیں صلہ ملا ہے۔ آخر میں پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان ان میں دل کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ دل پہ ضرور ان کے دباؤ پڑتا ہے اور جھلاہٹ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری اور امن آخر میں صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے۔ ورنہ مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔

اعتدال، اسلام کو مطلوب

حضور پاکؐ کا ارشاد عالی ہے کہ اعتدال اختیار کرو۔ اگر تم مکمل اعتدال اختیار نہ کر سکو تو اس کے قریب ترین پہنچو۔ یہ بیان اس لحاظ سے بڑا عجیب ہے کہ رسول اللہؐ نے پہلی دفعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اعتدال کوئی جامد چیز نہیں ہے۔ آپ اس میں تھوڑا سا آگے نکل سکتے ہیں، تھوڑا سا پیچھے جا سکتے ہیں مگر اس ایریا کے درمیان آپ کو خطرات کم محسوس ہوں گے۔ اس ایریا کے گرد اللہ تعالیٰ نے کچھ ''بتیاں'' لگائی ہیں۔ کوئی سنگ میل رکھا ہے اور فرمایا تلک حدود اللہ یہ اللہ کی حدود ہیں، ومن یتعد حدود اللہ فاولٰئک ھم الظلمون، جو اللہ کی حدود سے آگے بڑھا وہی ظالموں میں سے ہے۔

تصوف کے اس وقت جتنے بھی تصورات اور خیالات گردش میں ہیں، ان میں سے اکثر کا تصوف کے اصل علم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور جتنے بھی آپ کو بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں کچھ آج کے، بلکہ بہت سے آج کے ہیں اور کچھ پہلے کے، ان کو اگر ہم کڑی پرکھ پر رکھیں، تو وہ تصوف کے دائرے میں نہیں آتے۔ یہ جسے کرامت کہتے ہیں، یہ اللہ

Marfat.com

کی طرف سے اپنی محبوبیت ظاہر کرنے کی ایک نشانی ہے۔ یہ کسی صوفی کا وراثتی کمال نہیں بلکہ کسی صوفی کے لیے دعویٰ اور کسی قسم کی وجاہت طلبی سم قاتل ہے۔ اسی لیے امام غزالی نے کہا کہ آخری چیز جو سینہ انسان سے نکلتی ہے وہ حب جاہ ہے۔ صوفی کبھی وعدہ نہیں کرتا اور نہ کبھی دعویٰ کرتا ہے اس کے برعکس ہم آج کی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ صوفی یا متصوف جو آدمی بھی ہے، وہ اپنی کسی نہ کسی کوالٹی کا بڑا دعویٰ کرتا ہے۔ مجھ سے ہری پور میں کسی آدمی نے پوچھا تھا کہ کیا آپ خدا کو جانتے ہیں؟ میں نے اسے کہا کہ میں انکار کروں تو جھوٹ بولوں اور اگر اقرار کروں تو دعویٰ ہے۔ اس لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

ہمارے اردگرد جس قدر بھی کلچر اور تفہیم ڈیولپ ہوتی ہے اس میں ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ علم کیا ہے؟ احاطہ علم کیا ہے اور علم جس ہستی میں رکھا جاتا ہے، اس کا پیٹرن کیا ہے۔ کائنات میں قرآن سے بڑا علم تھا نہ ہے نہ ہوگا۔ یہ خدا کا علم ہے۔ اس میں افزائش کائنات سے انجام کائنات تک ہر چیز ہے۔ خداوند کریم نے اس بگ بینگ تھیوری سے آغاز اور قیامت تک کائنات کی تخلیق کا پورا نقشہ دیا ہوا ہے۔ اس کے بیچ میں تمام انسانی دانش ورانہ چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ انسان کس سطح پر کیا سوچے گا، کیا کرے گا؟ اس کے پاس کیا اہلیت ہوگی، کیا اہمیت ہوگی؟ یہ عجیب لگتا ہے کہ اگر مغرب کا ایک اسکالر اٹھ کر کہے کہ اللہ کے علم میں نہیں تھا کہ آئن شائن Theory of relativity (نظریہ اضافیت) دریافت کرے گا۔ Quantum دریافت ہوگی یا اسی طرح کی کئی اور تھیوریاں دریافت ہوں گی۔ یہ انسان کی طرف سے بڑی احمقانہ سی بات لگتی ہے۔

انسان ہمیشہ اپنے بارے میں مبالغہ آمیزی کرتا ہے۔ اسے دو بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ وہ بنیادی طور پر خود پسند ہے۔ اس کی خود پسندی کی ایک بات یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو اکیلا اور اہم سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ پروردگار عالم نے مجھے بنا کر پتہ نہیں کیا ایسا کمال کر دیا تھا۔ حالانکہ قرآن یہ بات نہیں کہتا، قرآن کہتا ہے کہ میں نے ایسے سات آسمان اور ایسی سات زمینیں بنائی ہیں۔ اگر انسان کو پتہ نہ ہو کہ اس قطعہ ارض جیسی سات قطعہ ارض اور ہیں۔ ان پر انسان پل بڑھ رہا ہے۔ اس کو تعلیم دی جا رہی ہے اور اس کا کلچر مرتب ہو رہا ہے۔ ایک ہی وقت میں سات کائناتوں میں سات انسانوں کی زندگی پھل پھول رہی ہے۔ ان کو ایک ہی آزمائش سے گذارا جا رہا ہے اور جس جنت کے تصور کو ہم نے اتنا محدود رکھا ہے وہ اتنی بڑی گلیکسی ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین بھی اس کی ایک چوتھائی کے برابر نہیں۔

ان ساری باتوں کو دیکھتے ہوئے دو چیزیں انسان میں ایک دوسرے کے تضاد میں ہیں۔ ایک تو ذاتی اہمیت جس میں اس کی غلطی پر اللہ نے شروع میں ہی اس سے کہا کہ انه کان ظلوماً جهولاً کہ بلاشبہ وہ دولت عرفان اور عقل کی تحصیل کرتے ہوئے ایک غلطی کر گیا۔ اپنے آپ کو Over Estimate کر گیا۔ جاب کو Under estimate کر گیا۔ اللہ تو بڑا سچا ہے۔

اب سات ارب کی دنیا میں چھ ارب تو مطلق خدا سے غافل ہیں اور جو ایک ارب مسلمان ہیں، ان کو اتنے بڑے دھوکے اور سراب پڑے ہوئے ہیں کہ بمشکل ہم 5'10 ہزار صحیح مسلمان نکال سکتے ہیں۔ خدا تو ٹھیک کہتا ہے کہ اس نے بڑا آسان سمجھ لیا تھا کہ آئیں گے۔ اللہ اللہ کریں گے۔ ہمارے پاس عقل ہے۔ ہم خدا کو کیوں نہ مانیں گے۔ اقرار خداوند کر کے جنت حاصل کر کے لوٹ جائیں گے۔ یہ انسان کی غلط فہمی ہے۔

Marfat.com

بہر حال صحت مند عقل سے خدا کا عرفان حاصل کرنا اور غور وفکر کرنا، عقل کی اصل قدر ہے۔ اللہ نے عقل کے ذمہ ایک کام لگایا ہے۔ باقی ضمنی کام ہیں۔ انا ھدینہ السبیل ہم نے تمام عقل و شعور تمہیں ایک کام کے لیے بخشا ہے۔ اما شاکراً و اما کفوراً چاہو تو مجھے مانو، چاہو، تو میرا انکار کردو۔ یہ اولین ترجیح ہمارے تجسس میں ہے اور انسان اس میں ہمیشہ غلطی کرتا ہے۔ اولین ترجیح میں تاخیر ہو جاتی ہے اور زندگی کی کم تر ترجیح حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ تمام لوگ بیک وقت یہ بڑی غلطی کر رہے ہیں۔

اس کے نتیجے میں اس کے پیٹرن بدلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ عجیب وغریب محسوس کرتا ہے۔ ایک شعر لکھنے میں کیا بڑی کوالٹی ہے۔ ایک وصف ہی تو ہے۔ یوگا والا اپنے آپ کو نرالا کہتا ہے۔ انسان جس چیز میں ارتکاز توجہ کرتا ہے یا سپیشلائزیشن کر لیتا ہے، وہ نرالا سا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یعنی دو ٹوٹے ہوئے شعر لکھنے کی صلاحیت کیا آئی، وہ بدل گیا۔ رنگ تبدیل ہو گیا، بال بکھر گئے، آنکھیں وحشت انگیز ہو گئیں۔ جیسے پتہ نہیں، کیا عجیب وغریب کمال اس کو حاصل ہو گیا۔ اب اللہ کے رسولؐ کو دیکھئے، جس پر کائنات کا سب سے عجیب وغریب عرفان اتر رہا تھا۔ جس پر صبح وشام جبرائیل اترتا تھا جس کی آنکھیں ملاء اعلیٰ کو دیکھتی تھیں۔ جو اپنے درمیان سے حجابات اٹھا کر فرشتوں کو دیکھتا تھا، وہ کبھی ابنارمل یا سب نارمل نہیں ہوا۔

اگر قرآن سب سے بڑی کتاب علم ہے، تو ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ یہ دیکھنا ہے کہ یہ کتاب علم ابنارمل کو گئی ہے یا سب نارمل کو گئی ہے۔ پتہ لگتا ہے کہ نارمل کو گئی ہے۔ جوں جوں علم اور اعتدال بڑھتا ہے، سارے انگریز منصف کہتے ہیں کہ inconsistency is the virture of genius کہ وہ آدمی بڑی عقل والا ہو ہی نہیں سکتا جس میں چند بیوقوفیاں بھی شامل نہ ہوں۔ ہم نے پیغمبر کی زندگی دیکھی ہے، جو دنیا کا نمبرون آدمی ہے۔ یہ ہم نہیں کہتے اگر کارلائل نے ہیرو چنا، تو محمد رسولؐ کو چنا۔ اگر مؤرخ نے Ten Great Men of History منتخب کیے تو نمبرون محمد رسول اللہ کو چنا۔ ہم نے نہیں کہا، انہوں نے کہا۔ جو دنیا کا نمبرون آدمی ہے وہ اتنا نارمل ہے کہ زندگی کی ہر راہ پر کھڑا آپ کو راستہ دکھاتا ہے اور یہ وہ بات ہے، جس کو میں مانتا ہوں۔ جذب مجذوبیت اپنی جگہ ایک حقیقت ہے، لیکن وہ زندگی کا بہترین حصہ نہیں۔

اگر مجذوب بڑے ہوتے۔ خدا کو یہ سستی جذباتیت پسند ہوتی، تو یقیناً اصحابؓ میں کچھ مجذوب بھی ہوتے۔ وہ تو بڑے نارمل لوگ تھے۔ تمام زندگی انہوں نے عملی انداز سے گذاری۔ مگر ایک فرق ضرور ہے کہ جب بھی انہیں اولین ترجیح میں بلایا گیا انہوں نے دیر نہیں لگائی۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک بہت بڑے استاد کے تلے ہیں۔ ایک بہت بڑی اکیڈیمی آف لیٹرز میں تھے، جو ان کا سب سے بڑی کائنات کا ٹیچر تھا۔ انہوں نے ایک سبق ضرور پڑھایا تھا کہ زندگی میں اللہ کو ہمیشہ ترجیح اول سمجھنا ہے۔

میری زندگی خلق خدا کے درمیان گذرتی ہے۔ میرا عذاب اور ثواب اللہ کے پاس محفوظ ہیں، میں ان درویشوں میں سے نہیں ہوں، جنہیں میں امرا درویش اس لیے کہتا ہوں کہ ان کے دربان ہوتے ہیں۔ رکھ رکھاؤ اور انداز ہوتے ہیں۔ آنے والا خوف اور جھجک سے آتا ہے ڈر ڈر کے قدم رکھتا ہے مگر میرے پاس الٹا حساب ہے۔ میرے اور میرے دوستوں کی محبت اتنی شدید ہے کہ ہمارے درمیان کوئی حجاب، سلام نہ دعا کا کوئی تکلف ہوتا ہے۔ ہم لوگ اتنے آزاد ہوتے

Marfat.com

ہیں کہ میں انہیں دانستہ اس کی اجازت دیتا ہوں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ انسانی ذہنی استعداد کو بڑھنا چاہیے۔ جو بھی فرد اطاعت اور بندگی کے سبق دیتا ہے، اسے اوپن ہونا چاہیے۔ عقیدت علم کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ میں محبت کی تو اجازت دے سکتا ہوں اگر دو دلوں میں ہو مگر میں اس عقیدت کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا، جو آپ سے سوال چھین لیتی ہے۔ آپ سے تجسس کا گلا آپ کے اندر گھونٹ دیتی ہے اور آپ اندھا دھند نا قابلِ فہم اور نا قابلِ یقین انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ کوئی علم، ارادت اور کوئی مسندِ ارشاد نہیں ہے۔

ہمارے ہاں مذہبی استاد، جو سب سے پہلی بات کرتے ہیں، وہ لوگوں کو بندگی اور عقیدت کا سبق دیتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ ہے کہ وہ بہت ساری تصوف کی پیچیدگیوں کو نہیں جانتے۔ تصوف علوم ذات اور اپنی ذات کی سائیکاٹری سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں دور حاضر کی نفسیات ختم ہوتی ہے، صوفی کا ادراک وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نفسیات ایک کمتر سیلف کو بہتر سیلف میں ڈال دیتی ہے۔ ایک مجبور و مقہور اور گھٹی ہوئی ذات کو کارآمد بنا کر سوشل کر دیتی ہے مگر اس کے پاس یہ ٹاسک نہیں ہے کہ وہ سیلف کو سرنڈر کر کے قوم کی خدمت کا تصور دے۔

جب تک کمتر سیلف بہتر سیلف ہوتا ہے، ہم نفسیات کے ساتھ ہوتے ہیں مگر جب نفسیات کی یہ سٹیج ختم ہوتی ہے تو ایک صوفی پھر بھی اپنے سیلف کے خلاف لڑ رہا ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کے پاس ہمارے لیے کوئی رعایت نہیں۔ و اما من خاف مقام ربه جو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا و نهى النفس عن الهوىٰ تو اس نے کبھی اپنے نفس کی مخالفت ترک نہیں کی۔ ھوٰی مروج فیشن اور رجحانات کو کہتے ہیں۔ ھوٰی زیادہ تیزی سے دل و دماغ پر قبضہ کرتی ہے۔ اگر کوئی فلاسفی آ گئی ہے تو دیکھتے دیکھتے دانشورانہ ماحول کو کھا جائے گی۔ اگر کمیونزم، سوشلزم اور تاریخی مادیت کا فلسفہ آ گیا ہے تو ایک نئی اپج کی وجہ سے ذہن ان خیالات کو بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ ذہن کو اچنبھا ہوتا ہے اور جس چیز سے اس کو اچنبھا ہو، اس کے حصول میں وہ بے چین ہوتا ہے کیونکہ تجسس دانشور کا بنیادی وصف ہے۔

صوفیا کو ان حالات سے بڑے تحمل سے گذرنا ہوتا ہے۔ وہ ایسی کسی ابتدائی سٹیج میں فیصلہ ساز نہیں ہوتا۔ اس کا ڈیٹا بہت مکمل ہونا چاہیے۔ ویسے بھی میں جن استادوں کے ساتھ کا ہوں، ان میں کم درجے کا انٹلکچوئل کوئی بھی نہیں گذرا۔ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے فلسفی، سب سے بڑے محقق ہیں۔ چاہے وہ شیخ جنید ہوں، علی ہجویری یا چاہے سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی یا خواجہ علی حسنی ہوں۔ یہ سارے کے سارے اپنے زمانے کے مکمل انٹلکچوئل ہیں اور اپنے زمانے کی انٹلکچوئل سطح سے گذر کر خدا کو پہنچتے ہیں۔ شکوک و شبہات کے صحرا کو عبور کر کے اپنے مطالب کی فضا تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی بڑا صوفی علم سے خالی ہو۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ہر عارف عالم ہوتا ہے، مگر ہر عالم عارف نہیں ہو سکتا۔

صدقات، اہمیت و اثرات

اگر کوئی چیز سود کو ختم کر سکتی ہے، تو وہ صدقات ہیں، ويمحق الله الربوا ويربي الصدقت اس کے برعکس میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں، جو جاہلوں کی طرح کہتے ہیں، آج سود ختم کرو، کل ختم کرو، اس طرح کبھی بھی سود ختم نہیں ہو

Marfat.com

سکتا، جب تک آپ متبادل مذہبی ادارے قائم نہیں کرتے۔ خدا نے ایک چھوٹا سا قانون بنادیا ہے، میں حیران ہوں، اتنے سارے علمائے دانش و مذہب ہیں۔ ان کو وہ چھوٹی سی آیت یاد نہیں آتی کہ یمحق اللہ الربوا ویر بی الصدقت کہ اللہ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ جوں جوں صدقات بڑھیں گے، سود کم ہوتا جائے گا۔ جس ملک میں صدقات کا ادارہ ہی نہیں ہے، وہاں سود کہاں سے ختم ہوگا؟ ہم قطعاً کامیاب نہیں ہوسکتے۔ یہ اللہ کا وضع کردہ قانون ہے۔

آپ اسلام کو ٹکڑوں میں نافذ کر کے اس کی توہین کرتے ہیں، رسوائی کا باعث بنتے ہیں۔ ایسا کبھی ہوا ہے کہ کسی سرمایہ دارانہ یا سوشلسٹ نظام میں کسی اور نظام کی مداخلت ہو؟ کمیونزم نے اپنے نظام میں کبھی خدا کا نام تک داخل نہیں ہونے دیا۔ میکسم گورکی نے ایک خط لینن کو لکھا کہ خدا نے چاہا تو ہم کریملن پہنچ جائیں گے۔ لینن نے اسے لکھا کہ تم نے کیوں خدا کا نام لیا۔ اس نے کہا، یار میں نے رسماً لکھا۔ اس نے کہا، جب تک ہم اس گھسے پٹے لفظ کو اپنی سوسائٹی سے نہیں نکالیں گے، خدا کا تصور زندہ رہے گا۔ ہر نظام اپنے لوازمات میں رائج کیا جاتا ہے۔ ادھر ہمارا یہ حال ہے کہ ہم ایک ایک شق اسلام کی لیتے ہیں اور اسے خوب ذلیل کرتے ہیں۔ آپ نے زکوٰۃ کے سسٹم کو اتنا رسوا اور ذلیل کیا اور اسے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے کہ لوگ زکوٰۃ دینے سے بہتر سمجھتے ہیں کہ وہ شیعہ ہوجائیں یا مرزائی۔ قرآن حکیم میں اللہ نے صاف کہا۔ یا ایہا الذین آمنو الدخلو فی السلم کافۃ کہ اگر اسلام میں داخل ہونا ہے، تو پورا پورا اسلام لاؤ۔ یہ کیا کہ دس ہزار قانون جمہوریت کے اور ایک اسلام کا۔ مگر اسلام کی جو صورت بحیثیت نظام مولوی دکھا رہا ہے، وہ اتنی ہولناک ہے کہ بڑے سے بڑے دل گردے والا شخص بھی اسلامی نظام کے تصور سے کانپ جاتا ہے۔

ادھر خدا کہتا ہے طٰہٰ ما انزلنا علیک القرآن لتشقی، ہم نے قرآن کو مشقت کے لیے نہیں اتارا۔ ہمارے سماجی تحفظ کے نظام کو زکوٰۃ سہارا دے رہی ہے۔ صدقات تو پھر پیچھے بچ جاتے ہیں۔ یعنی جو یورپ کے سماجی نظام ہائے تحفظ ہیں وہ ہمارے زکوٰۃ کے حفاظتی نظام کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہمارے پاس مزید بڑے بڑے اسلام کے ادارے ہیں۔ اسلام کیا کہتا ہے؟ اگر آپ کو پانچ وقت کی نماز کی پابندی دشوار لگتی ہے، تو آپ جائیں، یورپ اور امریکہ میں جا کے دیکھیں، آپ کو ہر جگہ دشواری نظر آئے گی۔ ہر جگہ آپ کو رکاوٹ ان کے سسٹم میں ملے گی اور دنیا کا آخر کون سا ایسا سسٹم ہے، جس کے تمام باشندے اس کو چاہتے ہوں۔ میں امریکہ گیا، تو لوگوں سے پوچھا، کیا تم اپنے سسٹم کو پسند کرتے ہو؟ ان کا جواب تھا، ہم اپنے نظام سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم نے محض ٹیکسیشن کے باعث برطانیہ سے بغاوت کی تھی۔ اب ہماری حکومت ہم پر بدترین ٹیکسیشن لاگو کرتی ہے۔ سو ایسا تو کوئی نظام نہیں ہے، جسے سارے اچھا کہیں۔

مجھ سے ایک سوال پوچھا گیا ہے کہ نماز کیوں ضروری ہے؟ کیا اس سے بچا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نماز لازم کیوں ہے؟ اس کو میں جواب یہی دے رہا ہوں کہ ادارے اہم نہیں ہوتے۔ میرے اور آپ کے لیے اسلام ماننا ضروری نہیں ہے۔ بنیادی طور پر جب میں خدا کو مانتا ہوں، تو میں یہ سوال کیوں کرتا ہوں کہ نماز اور روزے کیوں ہیں؟ اگر میں نے خدا کو مانا ہے، تو باقی سوال غیر ضروری ہیں۔ میں خدا کو مانتا ہوں، تو کہتا ہوں کہ یہ سسٹم اللہ کا ہے، اس لیے میں اس کی پابندی کرتا ہوں۔ اگر میں خدا کو مانتا نہیں، تو میرے لیے اسلام ایک بے کار سسٹم ہے۔ بنیادی سوال کبھی بھی ادارہ نہیں رہا۔ بنیادی سوال پھر واپس جائے گا اور اللہ کی ذات پر جا کر رکے گا۔

امریکہ میں خواتین پوچھتی تھیں کہ کتنا پردہ جائز اور کتنا ناجائز ہے؟ میں نے کہا، آپ نہ کرو پردہ۔ آپ کو کیا اتنی مصیبت پڑ گئی ہے؟ کیا واسطہ ہے آپ کا اللہ سے؟ کتنا مانتی ہو اللہ کو؟ ساری قوم اور امریکہ میں ایک شغل رائج ہے کہ جو چیز پسند آ گئی، وہ اسلام ہے اور جو چیز میری مرضی کے مطابق نہیں، وہ اسلام ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بہت خطرناک سیکولر رجحان ہے، جو پوری تعلیم یافتہ مسلم سوسائٹی میں در آیا ہے۔ ایک مسلم عورت سوال کرتی ہے، مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے، مجھے کیوں نہیں ہے؟ امریکہ میں ہر مسلمان عورت آپ کو یہ سوال کرتی ملے گی۔ کیا تم مجھے، نظام کو یا اللہ کو مان رہی ہو؟ پھر میں نے اس کے ان کے بڑے کھلے اور تلخ جواب دیے۔ جب میں نے ان کو واضح طور پر جواب دیے، تو کہنے لگیں، تم بڑے سنگدل ہو۔ میں نے کہا، حقیقت سنگی ہے، تو مجھے سنگدل ہونا پڑے گا۔ آپ لوگ بھی تو بڑے معروضی ہیں۔ حقیقت سنگی ہے، تو پھر حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت مرد کو تین ماہ سے زیادہ دستیاب نہیں ہے۔ جو مرضی ہے، حساب لگا لو۔ ایک عورت مرد کو تین ماہ سے زیادہ عرصہ دستیاب نہیں ہے۔ تمام وقت مرد بار آور ہے، عورت نہیں ہے۔

پھر معاشرے میں ہمیشہ جنگ و جدل اور قتل و غارت کا رواج رہا ہے۔ عورتیں ہمیشہ گھروں میں رہنے کے باعث محفوظ رہ گئیں۔ ہم مرد میدانوں میں ہونے کی وجہ سے مقتول ہوتے رہے۔ پھر کیا عورتوں کو کھلا چھوڑ دیا جائے؟ اس کا نتیجہ؟ یورپ کا ہر گھر فحاشی کا اڈا بن گیا۔ ایک جرمن عورت نے مجھے کہا۔ تمہارے پیغمبر بڑی ہوشیار شخصیت تھے۔ کاش ہمیں دوسرے لوگوں سے شادی کی اجازت ہوتی۔ ہمیں اجازت ہوتی، تو ہمارے خاندان ٹوٹنے سے بچ جاتے۔ ہمارا معاشرہ ٹوٹنے سے بچ جاتا۔ اب تو ہم بکھر گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم ایک احمقانہ سوچ رکھتے ہیں کہ وہ ایک دس سال کے لیے قانون بناتا ہے۔ اللہ دس سال کے لیے قانون نہیں بناتا۔ اللہ اولین دنیا سے لے کر آخرین دنیا تک قانون بناتا ہے۔ ایک صدی میں آپ کی آگہی آپ کو قابل کرتی ہے کہ غلاموں کو آزادی ملنی چاہیے۔ او کے! اگر ابراہام لنکن ایک اچھا انسان تھا اور اس نے غلامی بند کر دی تھی، تو اللہ آپ کو منع تو نہیں کرتا کہ غلامی بند نہ کرو۔ لیکن آپ کو کیا پتہ کہ پندرہ بیس سال کی جنگ عظیم کے بعد پھر لوگ اس انداز زندگی کو پلٹ جائیں، جہاں پھر غلام اور آقا ہوں۔ سو خدا اپنے قانون ایک صدی کے لیے نہیں بناتا۔ انسانوں کی ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ خدا کو ایک وقتی خدا کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی حیثیت کا تعین نہیں کیا جاتا۔ اسے ایک بین الکائناتی رب نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ اسے ایک لوکل اور وقتی خدا سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہماری سب سے بڑی غلطی ہے کہ قوانین خداوند پر غور کرتے ہوئے ہم اپنی محدود فکر کے ساتھ اللہ کو مقامی بنا دیتے ہیں۔ پھر ہم اسے کہتے ہیں کہ اللہ نے اس صدی کے لیے علیحدہ قانون کیوں نہ دیا؟ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خدا ایک صدی کا خدا نہیں ہے۔

وہ اول و آخر کا خدا ہے اور اس کے اچھی طرح علم میں ہے کہ آج سے دس سال بعد کیا ہونے والا ہے۔ ایک ایٹمی جھٹکا، لوگوں کو اپنے ہوش و حواس کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ وہ سوتے لوگوں کی طرح زمین پر چلیں گے اور جس کی سماعت نظر اور حواس بچ جائیں گے، وہ سینکڑوں انسانوں کو گدھوں کی طرح ہانکتا پھرے گا۔ یہ ایٹمی جنگ کے مابعد اثرات میں سے ہیں۔ تب آپ کس کو کہیں گے کہ غلام کون ہے اور آقا کون؟

آج کا دانشور صرف تالیاں بجانے والا دانشور ہے۔ اسے ایک چیز بھا جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے، اللہ اتنا

Marfat.com

غیر جمالیاتی نہیں ہوسکتا۔ اللہ میں جمالیات سب سے زیادہ ہے۔ وہ ایک مدت اور ایک بنیادی انسان کے لیے ایک قانون بناتا ہے۔ ایک Minimum Most Advance پر اس نے آپ کو دنیا میں قائم رکھا ہوا ہے۔ جنت میں جانا کتنا آسان ہے کہ جس نے دل سے ایک دفعہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دیا، اس پر نار دوزخ حرام ہے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں؟ لیکن یہ چیز تبھی ہوگی، جب خلوص قلب سے آپ خدا کو اپنی ترجیح اول قرار دیتے ہیں ورنہ ساری عمر ایک منافقانہ طرزِ عمل سے اقرار کلمہ جاری رہے گا، جواب بھی جاری ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی عالم اسلام پر آفت آئی، کوئی عبدالقادرؒ، کوئی علی بن عثمانؒ پیدا ہو گیا۔ کوئی جنیدؒ آ گیا۔ کوئی نہ کوئی فرد پیدا ہوتا رہا۔ آج انسانوں کو کیا ہوا؟ اب کیا قیامت آ گئی ہے کہ پچھلے سو برس سے امت مسلمہ گردش افلاس میں اور تباہی و ہلاکت و بربادی کی نذر ہو گئی ہے۔ نیل کے ساحل سے تا بخاکِ کاشغر، آج کوئی عبدالقادرؒ پیدا نہیں ہو رہا نہ کوئی علی بن عثمانؒ اٹھ رہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے؟

سچی بات یہ ہے کہ اس عرصے میں مسلمانوں سے ان کی حقیقی ترجیح گم ہو گئی ہے۔ مسلمان اپنے مذہب کے بغیر اس کے سربراہ کی پوجا کر رہے ہیں۔ ہم دو نقائص کا شکار ہیں۔ ایک تو ہمیں دانشورانہ احساس کمتری ہے کہ مغرب سے آئے ہر حرف کو قرآن سمجھتے ہیں۔ ہمارا سیکولر سٹاف اتنا جاہل مطلق ہے کہ چند انگریزی کے لفظوں کو معراج انسانیت سمجھتا ہے اور مانگے تانگے کے خیالات سے ننگے بدن کو اس نے ڈھانکا ہوا ہے۔ ورنہ وہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا۔ قرآن کا سمجھنے اور سوچنے کا ایک معیار ہے۔ ہمارا مولوی اس معیار کی نسبت تک نہیں آ رہا۔ وہ ان آیات کی فہم و فراست تک نہیں پہنچتا، جو خدا نے عام دانشور کے لیے رکھی ہے۔

ایک پی ایچ ڈی امریکہ میرے پاس آئے۔ وہ اسلام پر کتاب لکھ رہے تھے، کہا میں مشکل سوال لایا ہوں۔ جامع ازہر، انڈیا اور لاہور سے ہو کر آ رہا ہوں۔ مجھے جواب نہیں ملا۔ میں نے کہا ہو سکتا ہے، میں بھی نہ دے سکوں، لیکن میں کوشش کروں گا۔ اس نے کہا میرا سوال یہ ہے کہ عیسائیت میں کائنات کی عمر چھ ہزار سال ہے۔ انڈیا کی میتھالوجی کے مطابق یہ عمر 12 سے 18 ہزار سال ہے۔ اسلام آغاز کائنات کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ میں نے کہا، میں تمہیں ایک آیت سادہ ترجمے کے ساتھ سناتا ہوں۔ اگر سمجھ میں آئے تو سمجھ لینا کہ یہی آغاز کائنات ہے۔ میں نے اسے ایک آیت سنائی، اولم یر الذین کفرو...... تم میرا انکار کیسے کر سکتے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں، یہ تمام زمین و آسمان پہلے اکٹھے تھے۔ پھر ہم نے انہیں جبراً پھاڑ کر جدا کیا۔ میں نے اسے انگریزی میں ٹرانسلیٹ کیا۔

How dare you defy, in the beginning the heavens and earth were all one mass then I forcibly tore them apart تو وہ خوشی سے اچھل پڑا (By God this is big bang بخدا یہی بگ بینگ ہے) میں نے کہا Yes, You got it; This is big bang مگر میں سارے علماء کے سامنے یہ آیت پڑھ دوں، تو کوئی بگ بینگ تک نہ پہنچ سکے گا۔ کوئی ایک بھی مولوی اسے بگ بینگ نہیں سمجھے گا۔ یہ علم سے تہی دامنی کی باتیں ہیں۔ وجعلنا من الماء کل شی حی۔ ہم نے تمام حیات کو پانی سے تخلیق کیا۔ قیامت تبھی ہے، جب قرآن ثابت ہوتا ہے۔ قیامت تک انسان کی ایک جدوجہد ہے کہ قرآن کی کوئی آیت تشنہ تفسیر نہ رہے۔ یہ ساری آیات متشابہہ آیات ہیں۔

Marfat.com

جو کل متشابہ تھیں، وہ آج محکم ہیں۔ کل کسی کو کیا پتہ تھا، جب خدا کہتا ہے کہ میں نے یہ آسمان اپنے دست و بازو سے بنائے ہیں۔ میں نے انہیں تخلیق کیا ہے۔ وانا لموسعون اور ہم انہیں وسیع تر کر رہے ہیں۔

اس کا کسی کو کیا پتہ تھا کہ خدا نے کیا کہا۔ مگر جب آئن سٹائن آیا۔ اس نے نظریہ اضافیت دریافت کیا۔ پھر اس کے اوپر کوانٹم کی تھیوری آئی۔ ان دونوں تھیوریوں نے ایک ہی بات کی تصدیق کی کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ تب قرآن سمجھ میں آیا کہ دیکھو انا لموسعون ہم کائنات کو وسیع کر رہے ہیں مگر یہ وضاحت ہمیں کسی مولوی نے نہیں دی۔ یہ علم کا بحران ہے کہ کسی مسلمان نے قرآن کی یہ وضاحت نہیں دی۔ بلکہ ان لوگوں نے دی ہے، جو زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کر رہے ہیں۔

اب ذرا اللہ کو دیکھیں کہ یہ لوگ یا کہ ہم لوگ اسے پسند ہیں؟ خداوند کریم بالکل صاف لہجے میں بغیر کسی پیچ پیچ کے کہتا ہے کہ میرے پسندیدہ لوگ وہ ہیں الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبھم، جو کھڑے بیٹھے کروٹوں کے بل مجھے یاد کرتے ہیں۔ و یتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض اور زمین و آسمان کی تخلیقات پر غور کرتے ہیں۔ غور تو ہاکنز اور واٹسن کر رہا ہے۔ ہمارا کون سا بندہ غور و فکر کر رہا ہے؟ کیا یہ بدقسمتی نہیں ہے کہ وہ کائنات میں غور و فکر کر رہے ہیں اور پہلے حصے سے خالی ہیں۔ ہم پہلے حصے میں ہیں اور آخری حصے سے خالی ہیں۔

میری تمام جدوجہد ان دو باتوں کے درمیان ربط باہم اور تحقیق کی ہے، تا کہ ہر فرد مسئلے کی نوعیت سے آگاہ ہو۔ جو مسئلہ ہمیں درپیش ہے، وہ ترجیحات کو گڈمڈ کرنا ہے ہمیں اللہ کو ترجیح اول قرار دینا چاہیے۔ تبھی ہم مذہب کے رستے پر صحیح طرح چل سکیں گے۔ اسی لیے ہمارا عصر حاضر میں کوئی کردار نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ خدا کہتا ہے، ولا تھنو ولا تحزنوا، سستی اور غم نہ کرنا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے، تمہیں غالب ہو۔ اگر ہم میں کوئی غالب نہیں ہے، تو اس کا مطلب ہے، اس آیت کا آخری حصہ درست ہے۔ اگر ہم غالب نہیں ہیں، تو گویا ہم مومن نہیں ہیں۔ جب ہم مومن ہوں گے، تو ہم ضرور غالب ہوں گے۔ دعویٰ مومنیت سے کام نہیں چل سکتا نہ ظاہر و باطن کے فضول دعوؤں سے کام چلتا ہے۔ غلبہ اس کو ضرور نصیب ہوتا ہے، جو اللہ کا احساس ترجیح اپنے دل میں باندھ لے۔ یہ وہ بات ہے، جو ہمیں اپنی قوم کو سکھانی ہے۔ اپنے لوگوں کو ذہن نشین کرنے اور اپنے علماء کرام کو سمجھانے کی ہے۔

اسلام یا مقصد اسلام

لندن سے مجھے ایک نوجوان نے پوچھا، مجبوری ہے۔ مجھے بتائیں کہ میں سور کا گوشت کھا لوں؟ میں نے کہا، کھا لو۔ کہنے لگا، کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں نے کہا، کیوں پوچھ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ اللہ نے منع نہیں کیا ہوا؟ میں نے کہا کہ اللہ سے محبت ہے، تو نہ کھاؤ۔ ہم لوگ اداروں کی قید میں پڑ گئے ہیں۔ جائز اور ناجائز کی کوئی حیثیت نہیں ہے، لیکن پہلا قدم یہ ہے کہ آپ اللہ کو کتنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اسلام میں ایک خصوصی سبق، جو آپ کسی چھوٹے یا بڑے کو دے سکتے ہیں، یہ ہے کہ اللہ اور صرف اللہ میری زندگی کی ترجیح اول ہے۔

ایک عیسائی سوال کرتا ہے کہ ہم بھی خدائی مذہب پر ہیں۔ ہم بھی عبادات کرتے ہیں۔ آپ کیوں اتنے اسلام

Marfat.com

کے بارے میں حساس ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ خدا کی قسم تم سچ کہتے ہو۔تم بھی اللہ کے مذہب ہو، ہم بھی اللہ کا مذہب ہیں اور مذہب میں صبح و شام صرف تمہاری نمازیں ہی تو ہوتی ہیں۔ اگر مجھے تمہارے مذہب میں ایک چیز مل جاتی اور بغیر میرے مذہب کے مل جاتی، تو عیسائیت مجھ پر آسان ہو جاتی۔ میں ضرور اس کو اختیار کرتا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ ومن یبتغی غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ اگر تم اسلام کے سوا کسی اور رستے پر چلو گے، تو وہ قبول نہیں ہوگا۔ اللہ مقصود جب کسی ذات کا ہوتا ہے، تو اسلام اس کی مجبوری اور مقصدِ زندگی بن جاتا ہے۔ اسلام ہی وہ واحد راستہ ہے، جو آپ کو خدا تک پہنچا سکتا ہے۔ وہ اولین طالب، جس کے تحت جستجوئے حق اور اللہ کی تلاش میں جو شخص نکلے گا، جب اردگرد دیکھے گا، تو اسلام کے سوا کوئی راستہ نظر نہ پائے گا۔ ان الدین الاسلام اسلام اس کے چاہنے والوں کی مجبوری ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

مگر غلط بات یہ ہوگی کہ آپ اسلام کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں اور مقصد اسلام کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں۔ شریعتیں بدلتی رہتی ہیں۔ آدمؑ کی کوئی اور شریعت تھی۔ نوحؑ اور شیثؑ کی کوئی اور تھی۔ اسی طرح ادریسؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی کوئی اور تھی۔ یہ کل ہی کی بات ہے کہ Ten Commandments اور شریعت محمدیؐ میں بہت فرق ہے۔ جو چیزیں ان کے ہاں حرام تھیں، وہ ہمارے ہاں حلال ہیں۔ جو رشتے ان پر حرام تھے، وہ ہم پر حلال ہیں۔ شریعتوں میں بڑا فرق ہے مگر اس پورے عرصے میں آدم سے لے کر محمدؐ تک دین کا ایک مقصد جو کبھی نہیں بدلا، وہ خدا کی محبت، خدا کی تلاش، اس کا قرب اور قرب ہمسائیگی کی آرزو اور جستجوئے حق کا وہ مقصد اکیلا ہے، جو تنہا چلا آتا ہے۔

Marfat.com

اطمینان بخش آئیڈیا

Schizophrenic Idealism کو ہم مذہب تو نہیں کہہ سکتے، جس میں ضد اور پاگل پن ہے۔ میں ایک مسلمان ہوں۔ سادہ مسلم۔ میں آپ کو بے تکلفی سے بتاتا ہوں کہ اسلام میرا انتخاب ہے۔ میں کوئی آباؤ اجداد کا پیدا کردہ مسلمان نہیں ہوں۔ دنیا کے بہترین نظریات کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے خدا کے بارے میں سب سے زیادہ آرام دہ اور سب سے زیادہ اطمینان بخش نظریہ، جو میں نے پایا اور اسے اختیار کیا، وہ اسلام ہے۔ اس کے بعد اگر میں اسلام کو لے کر بیمار ہو جاؤں، جیسے کہ بہت سارے لوگ دیکھے ہیں۔ ان کی صورتوں پر ہر وقت کرختگی نمایاں ہوتی ہے، تو اسلام انسان کے ساتھ اس قسم کی بات نہیں کرتا۔ اسلام کہتا ہے ما انزلنا القرآن لتشقی کہ اس سسٹم میں کوئی مشقت اور کرختگی نہیں۔ یہ آپ کے لیے سکون وعافیت کا دائرہ ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس کے باوجود کرخت اور بیمار ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ عام آدمی جو اتنا خدا کی طرف نہیں ہے، وہ تو ٹھیک ہے مگر جو مذہبی بنتا ہے، پہلی چیز جو ہمیں اس کے بارے میں معلوم ہے، وہ اس کا اوکھا پن (Odd) ہے۔ وہ ایک مختلف انسان ہے۔ اس کا طور طریقہ مختلف ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم مذہب اختیار کر کے نفسیاتی طور پر کچھ مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلام کا انتخاب نہیں کرتے۔ ہم اپنے احساس خطا اور عذر غیر معقول کے تحت اسلام کی طرف رخ موڑتے ہیں۔ میں اسے بھی ایک خوبی شمار کرتا ہوں۔ یہ برصغیر کے انسانوں میں واحد خوبی ہے کہ باقی دنیا کے لوگ تو گناہ کی اذیت کے باعث کسی اور طرف چلے جاتے ہیں، مگر ہمارے لوگ اتنے اچھے ہیں کہ وہ کوئی خطا کر کے پلٹنے کے لیے اللہ کے راستے ہی کا انتخاب کرتے ہیں۔

مگر مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ واپسی کا رستہ تلاش کرتے ہیں، تو انہیں راہ میں اس قدر غلط فہمیاں پیدا کرنے والے لوگ ملتے ہیں کہ وہ خدا تک نہیں پہنچ پاتے۔ کیونکہ عقل تو انہوں نے استعمال ہی نہیں کرنی۔ وہ پیروں، فقیروں اور جہلا کے پیچھے بھاگتے ہیں، جو انہیں ترغیب وتحریص کے ذریعے ایک اور ہی قسم کی نااہل مشین کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ ساری بیماری۔

Marfat.com

دوسری بات یہ ہے کہ ہم سب حرف سے عمل کو جاتے ہیں۔ ہم سب کا الفاظ کی حد تک بہت اچھا عقیدہ ہے۔ آپ سارے معاشرے سے جا کر پوچھ لیں، خدا کتنے ہیں؟ کہیں گے ایک۔ اس کی تعریف پوچھ لیں، کہیں گے، وہی مارتا ہے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی رزق اور بیوی بچے دیتا ہے۔ ہر چیز پر اسی کی قدرت اور اسی کا اختیار ہے مگر جب عملی طور پر نکلیں، تو خیال کریں گے کہ کسی نے کچھ کیا تو نہیں؟ کسی نے کاروبار تو بند نہیں کیا ہوا؟ کہیں گے، کسی نے میرے اوپر جادو تو نہیں کیا ہوا؟ ہم خدا کی موجودگی میں سینکڑوں ہزاروں خدا تخلیق کر لیتے ہیں۔

اب بت تو واپس نہیں آئیں گے۔ حجتہ الوداع والے دن رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ شیطان اپنی عبادت سے مایوس ہو چکا ہے۔ اب مسلمان کسی بت کی پرستش نہیں کرے گا۔ مگر یہی تمام کے تمام بت اب تجریدی ہو گئے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے خدا کے اختیارات کو ہزاروں خداؤں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پورا معاشرہ جادو اور سحر کی زد میں آیا ہوا ہے۔ جس عورت سے پوچھیں، وہی کہے گی، کسی نے کچھ کیا ہوا تو نہیں؟ جس پڑھے لکھے سے پوچھیں، کہے گا، کچھ ہوا ہوا تو نہیں؟ یہ کس قسم کا بیہودہ پن ہے، جو ہر جگہ اور ہر شخص میں پایا جاتا ہے؟ جبکہ اللہ میاں نے کسی ہیچ پیچ کے بغیر کہا ہوا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتا۔ خالق اپنی کسی مخلوق کے ساتھ اختیارات شیئر نہیں کرتا۔ ہاں البتہ جب وہ ادارے بنا لیتا ہے، تو اس کے اختیارات کسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ جیسے اس نے رحمت کا ایک ادارہ بنایا اور کہا وما ارسلنک الا رحمة للعلمین رسول اللہؐ سے کہا، جاؤ جا کر میری رحمت کو تقسیم کرو اور اسی حوالے سے حدیث ہے کہ اللہ معطی و انا قاسم کہ خزانے سب اللہ کے ہیں، میں تقسیم کرنے والا ہوں۔ میرے پاس شفاعت، رحمت اور آپ لوگوں کے لیے کرم ہے۔ مجھے امت کی فلاح و بہبود کی حرص ہے۔ میں تقسیم کرنے والا ہوں۔

اب تھوڑا سا فرق ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے خدائی کو آپ الگ کر دیں۔ باقی جتنا بھی احترام، شوق اور جتنی بھی محبت ہے، وہ رسول اللہؐ کے حوالے کر دیں۔ یہ ہے عقیدہ۔ اس اعتبار سے تمام مسلمان بنیاد پرست ہیں۔ یعنی ایک خدا میں ایمان اور رسولؐ کی محبت سے سرشار ہم تمام بنیاد پرست ہیں۔ میں جتنا بھی پڑھ لکھ جاؤں اگر کبھی رسول اکرمؐ کے لبادہ مقدس پر خراش آئے گی، تو میں طیش میں آ جاؤں گا اور اس لیے کہ ان کے ساتھ میری محبت ہے وہ میرے باپ بھی ہیں، ان کی بیویاں اگر میری مائیں ہیں، تو وہ میرے باپ ہیں۔

اور کیا اللہ کا کرم ہے کہ ہزاروں کے ماں باپ ان کی توقعات پر پورا نہیں اترتے۔ میرے اور کئی دوسروں کے ماں باپ کا یہی حال ہے۔ اگر کوئی ایسے والدین کی پیروی کرے گا، تو اسے مایوسی ہوگی، وہ اپنی روایات اور خاندان سے مایوس ہوگا، لیکن اللہ کی مہربانی سے ہمارا ایک باپ ایسا ہے، جس نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔ وہ خود پیغمبر کی ذات ہے۔ پیغمبر ہونا تو بہت بڑی بات ہے، ذاتی احساس جو اپنے باپ سے کسی بچے کو ہوتا ہے، اس کی نوعیت ہی کچھ اور ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ رسولؐ اللہ کو آواز نہ دو۔ کیا وہ میرے باپ نہیں ہیں؟ ان کو میں کیوں آواز نہیں دے سکتا؟ اگر مجھے اپنے باپ کی ضرورت ہے، تو میں تو انہیں پکاروں گا۔

یہ حدیث رسولؐ بخاری اور مسلم دونوں میں نقل ہوئی ہے کہ اگر رستہ کھو جاؤ، گم ہو جاؤ، تو آپ اس طرح آواز دے سکتے ہیں اعیونني يا عباد الله اے اللہ کے بندوں میری مدد کو پہنچو۔ کیا کوئی بندہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے بھی بڑا

Marfat.com

ہوسکتا ہے؟ اور رسولؐ تو تمام امت کے زندہ باپ ہیں۔ ہم بھی تو آواز دیتے ہیں کہ یارسولؐ اللہ آپ کا بیٹا بڑے برے حال میں ہے، نکما، نالائق ہو چکا ہے، کچھ کرم فرمائیں۔ دعا کریں، قرآن کی کیا خوبصورت آیت ہے۔ ''اے پیغمبرؐ! لوگ جب تیرے پاس آئیں اور مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں'' ذرا انداز دیکھیں۔ انداز کیا ظاہر کر رہا ہے۔ خدا کہتا ہے ''اے پیغمبر! لوگ جب تیرے پاس آئیں اور مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور تو بھی ان کے لیے دعائے شفاعت کرے، تو میں انہیں بخش دوں گا۔''

فرض کریں کہ میں پیغمبرؐ کے پاس جاتا ہوں اور کہتا ہوں یارسول اللہؐ دعا فرمائیں، میری استعانت فرمائیں۔ میں خدا سے مغفرت کا طلب گار ہوں۔ آپ بھی میرے لیے مغفرت کی دعا مانگیں۔ یہ ہے دعا، نہ صرف رسول اللہؐ کے ساتھ، بلکہ ہر اس بزرگ کے ساتھ، جن کے بارے میں آپ کا اچھا گمان ہے۔

نجات کے لیے کلمہ

کلمہ خدا کی وحدانیت اور نبوت رسول اللہ کا اقرار ہے۔ آپ اپنے آپ کو دانشورانہ معیار سے دیکھتے ہیں۔ کیا خیال ہے کہ جس نے اللہ کو مانا اور آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اس نے کہا کہ اللہ تو ہے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کام پورا ہو گیا؟ مگر ہم نے یہ نہیں دیکھنا کہ مذہب کیا ہے؟ میرا انداز فکر اور میری مذہب کی تعبیر کیا ہے؟ جس نے کائنات بنائی ہے، کیوں بنائی ہے؟ مذہب کیوں بنایا ہے؟ اس کے مقاصد تخلیق اور مقاصد نبوت کیا تھے؟ مقاصد کتاب اور مقاصد معاشرہ کیا تھے؟ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اللہ کی تخلیق کا ایک سادہ سا مقصد تھا کہ انا ھدینہ السبیل و اما شاکراً و اما کفورا چاہو تو مجھے مانو اور چاہو تو میرا انکار کر دو، یہی انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد ہے۔

لیکن اللہ کہتا ہے کہ میرا ماننا کافی نہیں ہے۔ میرے ماننے کا طریقہ ایک ہے۔ تم ہوسکتا ہے، ہزاروں طریقوں سے آؤ، لیکن وہ میرے طریقے نہیں ہیں۔ میرا طریقہ وہ ہے، جس کا آدم سے لے کر محمدؐ تک میں نے تعین کر دیا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے۔ اس میں میرے احکامات پابند ہیں۔ تمہیں ایک معاشرہ تخلیق کرنے کے لیے اصول دے دیئے ہیں۔ اگر تم اصولوں کو نہیں مانو گے یا معاشرے کے تخلیق کردہ وہ پیٹرن تسلیم نہیں کرو گے، تو تم کبھی بھی مجھ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام

اب سوال یہ ہے کہ اسلام ہی کیوں؟ قرآن اسلام کے بارے میں کہتا ہے کہ اب یہی خالص مذہب ہے، جو آپ کو لے کے آگے جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے جزوی خدا کو تسلیم کرنے کا مرحلہ تھا۔ جزوی معاشرہ تھا۔ اس میں کلیتاً ایک بڑی تخلیق کاری نہیں ہوسکتی تھی۔ آدمؑ، شیثؑ، نوحؑ، عیسیٰؑ اور موسیٰؑ بھی اللہ کو لے جاتے تھے۔ مگر یہ سارے پیغمبر یہ کہہ چکے تھے کہ ہم جزوی پیغام دے رہے ہیں۔ ہم اس معاشرے کی مکمل تخلیق نہیں کر رہے۔ ایک ایسا معاشرہ، جو سارے کا سارا مل کر ایک خدائی صورتحال پیدا کرے اور اس میں سے کچھ لوگ خدارسیدہ ہوں۔ جب اسلام آیا، تو اس نے کھلے بندوں اعلان کیا کہ میں نہ کوئی نیا دین ہوں نہ کوئی نیا مذہب ہوں۔ بلکہ وہی کھلا پیغام خدا مجھ سے مکمل ہو گیا ہے۔ اب پانچویں جماعت پی ایچ ڈی ہو گئی ہے۔ اب کون ایسا شخص ہے، جو پی ایچ ڈی کے بعد پھر تختی پر پانچویں لکھے گا؟

اللہ نے واضح کر دیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی کہ آج میں نے دین تمام کیا، ادھر نعمت تمام کر دی۔ ادھر دین مکمل کیا۔ ادھر پیغمبر پورے کر دیئے۔ اس کے بعد کوئی شخص مجاز نہیں ہے کہ تمہیں میرے راستے کی طرف گائیڈ کرے۔ پیغمبر مکمل ہو گئے، پیغام مکمل ہو گیا۔ پیغام ناقابل تبدیل ہے اور پیغمبر ناقابل تبدیل ہے۔ حضور عالی مرتبت آخری پیغمبر ہیں۔ اس کے بعد کہا، ان الدین عند اللہ الاسلام سن لو کہ اب جو بقیہ ماندہ طریقے میرے طرف آنے کے ہوں گے، وہ سب ناقص ہیں، کم ہیں۔ وہ کلی طور پر میرے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر سکیں گے۔ اب واحد دین جس پر چل کر تم مجھ تک پہنچ سکتے ہو وہ اسلام ہے۔ پھر مزید آگے جا کر کہا و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ میرے پاس تم اسلام کے سوا کسی اور رستے پر چل کے آئے، تو میں قبول نہیں کروں گا اور حتمی طور پر کہہ دیا کہ میں ہی مقصود ہوں۔ رستہ اسلام ہے اور واسطہ محمدؐ ہے۔ ان تینوں کے بغیر تم مجھ تک نہیں آسکتے۔

یہ میری عائد کردہ پابندی نہیں ہے۔ میں چاہتا تو کہتا کہ اگر مجھے عیسائیت سے خدا ملتا ہے تو مجھے اسلام میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ اگر مجھے بدھ ازم میں خدا مل جائے، تو مجھے تو بڑی آسانی ہے۔ اگر ہندو ازم میں خدا مل جائے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے ہندو ہو جاؤں۔ مگر جس کو خدا چاہیے، اس کو کسی اور مذہب میں خدا نہیں ملے گا۔ تبدیلی مذہب کا آپ تناسب دیکھیں، تو آپ کو پتہ لگے گا کہ ہر فرد واحد، جو خدا کی تلاش میں تھا، اسے بالآخر اسلام سے رجوع کرنا پڑا۔ تبت کا عظیم لاما مسلمان ہوا، تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا تو ڈر کے مارے مسلمان ہوا؟ کیوں مسلمان ہوا؟ کیا تو مشقیں نہیں کر سکا؟ اس نے کہا نہیں! میرے پاس ویسی ہی طاقتیں ہیں، جیسے کہ کسی اور لاما کے پاس ہو سکتی ہیں، لیکن میں خدا چاہتا تھا اور امن چاہتا تھا، جو مجھے اسلام میں آ کے ملا۔

کے۔ ایل۔ گابا جیسے لوگ مسلمان اس لیے ہوئے کہ وہ خدا کی تلاش میں تھے۔ جس کو خدا کی تلاش ہے، اس کو اسلام کی تلاش ہے۔ جس کو اسلام کی تلاش ہے، وہ اللہ کے رستے پر محمد رسول اللہؐ کے بغیر کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ باقیوں کو دعوے کرنے دیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ پوری امت میں سے ایک خدا رسیدہ بندہ ڈھونڈ کے دکھائیں، جو خدا، اسلام اور محمدؐ کے بغیر ہو۔ اگر آپ کو مل جاتا ہے، تو ضرور بتایئے۔ ایسا دعویٰ کرنے والا سب سے بڑا ڈھونگ اور ناٹک ہے۔ اس میں اتنی بھی فراست نہیں ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کی پشت کو دیکھ کر کچھ بتا سکے۔ چہ جائیکہ خدا اس کو علم دے کہ وہ لوگوں کے سینوں میں جھانک کر دیکھ سکے۔ ان کے پس منظر پر نگاہ دوڑا سکے یا ان کی پیشانیوں میں جھانک کر کچھ بتا سکے۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

بازیافتِ خدا بغیر علم

انسان کی اپنی ذات سے جدائی سب سے مشکل کام ہے۔ جب انسان اپنے آپ سے جدا ہونے لگتا ہے، تو اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے ساتھ رضامند رفیق رکھتے ہیں، جسے نفس کہتے ہیں۔ جب ہم نا رضامند ہوں، تو پھر خدا کے ساتھ ہماری رفاقت میں زیادہ آمادگی ہوتی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ خدا کی طرف جاتے وقت قدم قدم پر نفس انسانی ہمیں زنجیر ڈالتا ہے۔ اسی لیے خدا نے کہا ہے کہ اما من خافا مقام ربہ ونھی

Marfat.com

النفس عن الہوی جو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس نے اپنے سیلف اور فیشن ایبل تصورات کی مخالفت کی۔

مگر کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی نامعقول چیز کو پسند کرے گا، جبکہ وہ اپنے آپ کو عقل کل کہتا ہے؟ ھوالاول ولآخر و الظاھر و الباطن و ھو بکل شیءٍ علیم وہی اول، وہی آخر، وہی ظاہر، وہی باطن ہے اور سب کو اس نے اپنے علم سے گھیر رکھا ہے۔ آیت الکرسی میں اس کا یہی ادعا ہے کہ میرا اختیار بہت ہے۔ میں جابر و قاہر ہوں ولایحیطون بشیءٍ من علمه الابماشآء مگر میں نے اپنے علم سے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے۔ اتنا بڑا عالم کیا مجھ سے یہ توقع رکھے گا کہ میں اس کی جاہلوں کی طرح پیروی کروں؟ یہاں ہمیشہ خدا کے حق میں دلیل موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس نے اس کو پایا؟ وہ جسے ہم استاد کہتے ہیں؟ وہ خوش قسمت روح ہے، جس نے تجسسات کی انتہا تک پہنچ کر ہر سطح کی دلیل دریافت کر لی۔ یہی دلیل حضرت ابراہیم نے پالی۔ یہی دلائل آقا و رسولؐ نے دیئے۔

نام نہاد جدید دنیا کی ساری فلاسفی میں نقص یہ ہے کہ انہیں آج تک اپنے فلسفے میں اس نقص کا پتہ نہیں چلا۔ دیکھیں کتنی عجیب سی بات ہے۔ مجھے کوئی ایک فلاسفر بتائیں، جس نے خدا کی تلاش کی ہو اور آخر بیس سال کی تلاش کے بعد کہا ہو کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی خدا کو تلاش ہی نہیں کیا۔ آج تک کسی فلاسفر نے اللہ کو تلاش کیا ہی نہیں۔ وہ تو استدلال کے ایک پیٹرن میں سماجی ڈھانچے کے مسائل کے حل کی کھوج میں ہیں یا وہ ایک ذہنی انتشار کو درست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مزہ تو تب ہے کہ رسل خدا کی تلاش میں نکلے اور واپس آ کر کہے کہ میں نے اسے بہت ڈھونڈا، مگر اسے نہیں پایا۔ اتفاق کی بات ہے کہ رسل یہ کام نہیں کرتا، بایزید بسطامیؒ کرتا ہے۔ اس نے کہا، میں نے چالیس برس اللہ کو تلاش کیا۔ جب میں نے اسے پایا، تو معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ہی وہ میری تلاش میں ہے۔ یہ ہے بڑا فرق۔

کسی انتھراپالوجسٹ نے کہا کہ اگر خدا نہ بھی ہوتا، تو انسان نے تخلیق کر لینا تھا۔ کیونکہ یہ اس کی ضرورت ہے۔ شروع کے انسانی معاشرے میں مذہب کا وجود کیوں پایا جاتا ہے؟ انسان خدا کی تلاش نہیں کر رہا، بلکہ اسے تو پتھر کے دور میں عجیب و غریب منظر نظر آتا ہے کہ پہلا انسان ہی خدا پرست اور پریسٹ ہے۔ پہلا انسان قبریں بنا رہا ہے۔ ان پر پھول نچھاور کر رہا ہے اور دعائیہ کلمات پڑھ رہا ہے۔ وہ کہتا ہے، یہ کیا چکر ہے؟ یہ کیسے ہوا کہ پتھر کے دور کا Homosapian پہلا کام مذہب لانے کا کرتا ہے۔ کیا یہ بڑی عجیب و غریب بات نہیں ہے؟

یہ واقعی بہت عجیب و غریب بات ہے۔ اسے یہ لازماً سمجھنا چاہیے کہ کیا مذہب ان کا اپنا تھا؟ میں اس سے انکار کرتا ہوں۔ یہ ان کا نہیں ہو سکتا کیونکہ میری اپنی زندگی کی شہادت یہ کہتی ہے کہ مذہب perception کی آخری ڈگری ہے۔ خدا کو تلاش کرنا اور ڈھونڈنا، جب تک علوم ظاہرہ کی تکمیل نہیں ہوتی، ان میں جب تک تجسس شروع نہیں ہوتا اور آپ اپنے کشف حقائق میں نہیں جاتے، خدا کا ملنا آسان نہیں ہے۔ چنانچہ میں خدا کی تلاش میں اس کو انسانی انکوائری کی فائنل سٹیج سمجھتا ہوں، چہ جائیکہ کوئی احمق ان پڑھ، خدا شناس بن جائے۔ ایک دنیا کی کامن سول سروس اپنے چھوٹے افسر منتخب کرنے کے لیے ممکنہ حد تک بہترین امتحان لیتی ہے، جبکہ رب کائنات کو یہ لولے لنگڑے چننے کے لیے ملے ہیں۔ سب سے نکمے اور جاہل لوگ خدا کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی Dichotomy ہے۔

ہم تو اتنا سا وقت بھی اللہ کو نہیں دیتے، جتنا ہم میٹرک پاس کرنے کے لیے دیتے ہیں۔ یہ ناانصافی ہے عقل و

Marfat.com

تجسس میں، میں نے دیکھا کہ ایم اے کرتے کرتے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ ایک غیرملکی زبان کی چھوٹی سی ڈگری، جسے میں اب ایک بہت سنوپڈ زبان قرار دیتا ہوں، اس کی تھوڑی سی مہارت حاصل کرنے کے لیے میرے پچیس برس لگ گئے۔ اگر میں اور مہارت حاصل کرتا، تو میرے مزید پانچ برس خرچ ہوجاتے۔ تیس برس میں میں ایک زبان باضابطہ طور پر نہیں سیکھ سکا۔ ڈاکٹری کے لیے بیس بائیس سال صرف ہوجاتے ہیں۔ اتنے عرصے میں صرف بیچلر آف سرجری، آلات سے آگہی اور موٹی موٹی میڈیسن سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ بیس سال مزید لگاتے ہیں تاکہ ٹاپ سپیشلسٹ بن جائیں۔ اس کے برعکس خدا کے سپیشلسٹ ہونے کا ایک تصور بھی نہیں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ کہ پوری دنیا میں نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ ہم میں نہیں ہے۔ آج دنیا میں قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ مشرق و مغرب میں خدا کی آگہی کو مطمع نظر بنا کر چلنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ کوئی وزیراعظم، چپڑاسی کی کرسی پر بیٹھنا پسند نہیں کرسکتا۔ خدا جب تک آپ میں موزوں جگہ نہیں پائے گا، آپ کبھی خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے تو بڑا آسان طریقہ تلاش کیا ہوا ہے۔ یہ وہ سوالات ہیں، جو ایک انسان کے چھوٹے شکوک کو دور کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ انسان میں آگے جا کر بڑے بڑے شکوک پیدا ہوتے ہیں، جو انسان کے اندر سے اٹھتے ہیں۔

مثال کے طور پر مجھے اس کا کیسے علم ہوا کہ آپ کا ذہن کن باتوں میں الجھا ہوا ہے؟ مشرق و مغرب میں کوئی استاد اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اسے اتنی آگہی دوسری ذات کی حاصل ہے کہ وہ بغیر جانے کسی قسم کی حتمی رائے دے سکے۔ جب آپ علوم کی اس سٹیج پر پہنچتے ہیں، تو پردہ رہتا ہے۔ حیرت نہ کوئی انکشاف ہی باقی رہتا ہے۔ زندگی تمام تر حادثاتی اور واقعاتی غلطیوں کا مجموعہ رہ جاتی ہے۔ انسان اپنی پاکدامنی نہیں دیکھتا، وہ اپنی غلطیوں اور خطاؤں پر نظر رکھتا ہے۔ ایک عمر ایسی آتی ہے، جب خطا یاد رہ جاتی ہے، جزا کوئی بھی یاد نہیں رہتی۔ کیوں؟ اس لیے کہ خطا آپ کو روکنے والی ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ مرنے سے پہلے میں نے تجھے پاک کر کے ہی دم لینا ہے، چاہے کوڑے مارنے پڑیں۔ آدمی کو سزا ملتی ہے۔ لیکن انسان کو عزت اور محبت ملتی ہے، لیکن اسے سزا بھی ملتی ہے، جب ایک بڑے استاد کے پاس چیز چلی جاتی ہے۔

میں نے تو استادی اللہ کے رسولؐ سے سیکھی ہے۔ بخدا مجھے حیرت ہے۔ سینہ اس کی علمیت پر شق ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی بدترین اور بدتمیز ترین کلاس کا استاد تھا کہ شاگرد اس کے گلے میں کپڑا ڈالتے تھے۔ اس پر پتھر برساتے تھے۔ اس کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ کیا عورتیں اور کیا مرد کون سی دنیا کی اذیت ایسی ہے، جو اس استاد کو انہوں نے نہیں پہنچائی۔ مگر استاد کا سلوک دیکھیں کہ کسی کو گالی دی نہ کسی کو چھڑی ماری۔ نہ کسی پر لعنت بھیجی۔ اس کے برعکس وہ صرف محبت، محبت اور محبت تھا۔ اس نے جنگ جیتی اور بدتمیز ترین کلاس کے افراد اس کے توسط سے دنیا کے بہترین اصحاب رسولؐ بن گئے۔

میں ایسے پیٹرن کو پسند کرتا ہوں۔ وہ کون سا استاد نہیں ہے، جو الٹی سیدھی بات کو اپنی ذاتی عزت بنا نہیں لیتا؟ جوابی طور پر ہٹ کرتا ہے۔ غصے ہوتا ہے، شاگرد کی حاضریاں شارٹ کر دیتا ہے اور اس کو کلاس سے نکال دیتا ہے۔ اس کے گھر جاتا ہے اور اس کے والدین سے شکایت لگاتا ہے۔ میں نے کسی کو محمد رسول اللہؐ سے بڑھ کر بڑا ٹیچر نہیں پایا۔ وہ سب سے بڑے استاد کیوں تھے؟ کیونکہ وہ اس واحد ہستی کے ذریعے تعلیم دیتے تھے، جس واحد ہستی کو ہی شرف استادی حاصل

Marfat.com

ہے۔ علم والا کس طرح آرام سے بیٹھ سکتا ہے؟ اس نے آگے کچھ نہ کچھ دینا ہی ہوتا ہے۔ خدا علیم تھا، تو یہ تعلیم شروع ہوئی و علم آدم الاسما کلہا بڑا شوق تھا اللہ میاں کو استاد بننے کا۔ وہ فرشتوں کا استاد نہیں ہو سکتا تھا کہ جن کو اس نے ایک خاص مقصد کے تحت ایک ڈیٹا دے کر مکمل کر دیا تھا۔ ان کو اس نے کیا پڑھانا تھا؟

دیکھیں، فرشتوں نے کتنی معقول بات کی تھی۔ ان بے چاروں کو جب تختی دی گئی کہ چلیں جب آپ چیلنج کرتے ہو کہ تم بھی پڑھ گئے ہو ثم عرضہم علی الملئکۃ فقال انبونی باسمآ ہولاءِ ان کنتم صدقین کہتے ہو، تم نے اس بیوقوف کو کیوں اتنا بڑا کر دیا؟ اس جاہل اور ظالم کو اتنا بڑا رتبہ کیوں دے دیا؟ تو اللہ نے کہا، ٹھیک ہے، تم بھی تختی لے لو اور آدم بھی لے لیتا ہے۔ یہ اسامیں Go ahead، کرو مقابلہ۔

اس مقابلے میں دس بیس ہزار سال کا عرصہ تو گذرا ہی ہوگا۔ دونوں کو اللہ نے مہلت دی۔ دس ہزار سال بعد فرشتے واپس آئے اور کہا قالو سبحانک لا علم لنا الا ماعلمتنا اے اللہ میاں! تو پاک ہے ہم سے غلطی ہوئی۔ ہمیں صرف اتنا ہی علم ہے، جتنا تو نے ودیعت کیا ہے۔ ہمارے پاس آگے کا نہ پیچھے کے تجربات کا کوئی علم ہے۔ لوکل آرڈر اور لوکل استحکام ہے۔ جتنا تو نے عطا کیا، اس کے بغیر ہمیں ایک لفظ نہیں آتا۔ اس نے کہا قال یادم انبئھم اے آدم تو بتا، تو نے بھی تختی لی تھی فلما انباھم باسماۤ ئھم وہ فرفر شروع ہو گیا۔ پورے جوش و خروش کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیا۔ میں نے یہ نام رکھا، وہ نام رکھا۔ اس کو درخت کہا اس کو لکڑی اور اس کو پانی کہا۔ اس کو اماں کہاں، اس کو ابا کہا۔ اللہ میاں نے بڑے تفاخرانہ انداز میں، جو استاد کا تفاخرانہ انداز ہو سکتا ہے، کہا قال اقل لکم نہیں کہتا تھا، تم سے اے فرشتو انی اعلم غیب السمٰوت والارض میں جاننے والا ہوں، جو زمین اور آسمانوں میں چھپا ہوا ہے۔ اس کی اہلیت کتنی اور کس کا میرٹ کتنا ہے، یہ میں جانتا ہوں و اعلم ما تبدون و ما کنتم تکتمون میں اچھی طرح جانتا ہوں، دلوں میں تم کیا ہوس چھپائے پھرتے ہو۔ کیا آرزو تھی، جو شیطان کے دل میں پلتی تھی اور کیا تمہارے دل میں پل رہی تھی۔ مگر افسوس کہ تم اس کے اہل نہیں تھے۔ یہ جو اہل ہے، وہ نااہل ہے۔ جو جنتی ہے، وہ جہنمی ہے۔ اس میں بیلنس نہیں ہے۔ ایک پاؤں ادھر اور ایک ادھر ہے۔ اس نے سیکھا اور اس نے سمجھنا شروع کیا۔ کیا پتہ، اس کی بنا پر انسان آخرت میں بخشا جائے۔ بہر حال اس نے سیکھنے کی کچھ کوشش تو کی۔

نسبت کی اہمیت

میں نے مغرب کے تمام علماء و فضلا اور دانشوروں کو دیکھا۔ مگر اللہ میاں کسی جگہ بہت سخت ہے۔ ایک جگہ وہ بڑا جذباتی ہے۔ جب حضورؐ کی بات چلتی ہے، تو وہ کہتا ہے، اے پیغمبرؐ، تیری عمر مقدس کی قسم! میں تمہاری زندگی کے ایک ایک لمحے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تیرے اوپر خراش آئے گی، تو میں نے دنیا کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ حضورؐ خدا کے محبوب ترین تعریف کرنے والے ہیں۔ مجھے عیسیٰؑ اور موسیٰؑ سے کیا تعلق۔ میرا تعلق تو خدا سے ہے۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ یہ عیسیٰؑ کون ہے؟ مجھے پتہ چلا کہ وہ خدا کا چہیتا ہے۔ مجھے وہ عزیز ہو جائے گا۔ موسیٰؑ خدا کا چہیتا ہے، تو میرے لیے وہ قابل احترام ہوگا، محترم ہوگا۔ ورنہ بطور ایک فرد مجھے ان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اگر کوئی کائنات کے سب سے محبوب شخص کا انکار کرے گا،

Marfat.com

تو اللہ اسے کیا ہدایت دے گا؟ تحسین، محبت اور رسائی کے اعتبار سے محمدؐ ہی محمود ہیں۔ وہی مقام محمود، مقام شفاعت اور مقام وسیلہ پر فائز ہیں۔ ان سے بڑا اور کون ہے؟ اور اگر آپ اللہ کے بہترین دوست کو برا بھلا کہیں گے یا اس کا انکار کریں گے، تو کیا خیال ہے، اللہ آپ کا بھلا کرے گا؟

اب اللہ کی محبت کیا کرشمہ دکھاتی ہے کہ تین ہزار سال گذر گئے ہیں، ابھی تک ہم حج میں کبھی مقام ابراہیمؑ، کبھی صفا و مروہ اور کبھی رمی جمرات کی مشق کرتے ہیں۔ کیا یہ اللہ کے کام تھے؟ یہ تو ابراہیمؑ کے تھے۔ اپنے دوست سے محبت کا یہ عالم ہے کہ اللہ کہتا ہے، تم نے یہ رسمیں پوری کرنی ہی کرنی ہیں۔ جو مرضی کر لیں، تمہیں سنت ابراہیمی پوری کرنی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ لوگ حجر اسود کو اس لیے چومتے ہیں کہ وہ جنت سے آیا ہے؟ نہیں اس لیے کہ حجر اسود سے اللہ کے تین دوستوں کے ہاتھ مس ہیں۔ اسے جبرائیلؑ، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہؐ کا مس ہے۔ ہم تو اس علامت مس کو چومتے ہیں۔ اس کا پتھر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مگر تمام لوگوں کا فرض ہے کہ میرے دوستوں نے جس پیار سے یہ پتھر اٹھا کر ادھر لگایا ہے، آپ کو اسے چومنا ہوگا، یہ لذت خیال ہے، لذت سنگ نہیں ہے۔

حقیقی راہنمائی کی طلب

پاکستان کو کس چیز کی بنیادی ضرورت ہے؟ ایک خوراک، ایک کپڑا اور ایک مکان ہے اور ہمارے پاس ان کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ اگر ہم اپنی خوراک کو مکس کریں۔ جیسے گندم ہماری کم ہو اور ہم اسے چاول کے ساتھ مکس کر لیں، تو یہ ہماری ضرورت سے بہت زیادہ ہے۔ یہی چینی کا حال ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری بیوروکریسی زمینی حقائق سے آگاہ نہیں ہے۔ وہ متاثرین مغرب ہونے کے باعث سپر سٹرکچر کے تصور میں پڑی رہتی ہے۔ وہ ہمیشہ یہ سمجھتی ہے کہ معیشت اوپر سے اٹھان پکڑے گی جبکہ اکانومی اوپر سے کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

حقیقت میں ہمارے جتنے بھی اکانومسٹ باہر سے آتے ہیں، ان کا مسئلہ یہ ہے کہ انہیں زمینی حقائق سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہ ہاورڈ اور کیمبرج کے پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ میں بھی وہاں جا چکا ہوں۔ وہ ایک غریب ملک کی صورتحال کا ادراک نہیں کر سکتے۔ علم چاہے وہ جتنا مرضی ہے، حاصل کر لیں، انہیں گلی اور کوچے کے انسان کی تفہیم ہو ہی نہیں سکتی۔ میں اپنی مثال دیتا ہوں کہ میرے ایک دو ڈپٹی کمشنر دوست اس شہر میں آئے اور ہم نے ان کے توسط سے شہر کی حالت تبدیل کر کے رکھ دی۔ آپ جس طرف مرضی ہے، نکل جائیں، گوجر خان آپ کو پاکستان کا شہر نہیں لگے گا۔

دراصل ہم میں سے احساس کمتری کم نہیں ہوتا۔ ہمیں دفتر اور غلام چاہئیں، خدمتگار چاہئیں۔ جب صوفی، ٹیچر اور حکمران اکٹھے ہوں، تب ہمارا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ آپ کو صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ دفاعی سامان کی ہے۔ یہ بھی ہمیں باہر سے منگوانے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت بھی تمام تر ذلت وخواری کے باوجود ہماری یہ صورتحال ہے کہ مجھ سے کسی نے امریکہ میں پوچھا، آپ ایک طرف بھوکے مرتے ہیں اور دوسری طرف ایٹم بم بنا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہم امریکہ کی طرح خرچ نہیں کر سکتے۔ امریکہ کر سکتا ہے کیونکہ دنیا کے وسائل میں سے تیرہ فیصد صرف امریکہ کے پاس ہیں۔ ہم آپ لوگوں کی طرح سکائی سکریپر نہیں بنا سکتے نہ ٹوون ٹاور جیسی میناراتی عمارات بنا سکتے ہیں، لیکن ہم تباہی میں آپ کے

ساتھ برابر کا شیئر کر سکتے ہیں۔ ہم اپنی جان بیچ کر بھی ایسے ہتھیار ضرور بنا سکتے ہیں، جو آپ کو مار سکتے ہیں۔ اگر ہم سو سال کا وقفہ دس سالوں میں نکال سکتے ہیں تو اگلے دس برسوں میں ہم آپ کے برابر پہنچ جائیں گے۔

پاکستانی سائنسدان اتنی تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں کہ انہوں نے ریڈی ایشن پر قابو پا لیا ہے۔ سٹریٹیجک ایٹم بلٹ کر لیے ہیں۔ میں موجودہ جنگ (جنگ افغانستان) کے ذرا اس لیے خلاف تھا کہ ہم بہت تیزی سے آگے بڑھنے کی پوزیشن میں آ چکے ہیں۔ اس وقت دو ہزار کلومیٹر تک مار کرنے والے میزائل ہمارے پاس پڑے ہیں۔ تین سالوں کے بعد ہم بڑے سے بڑے ملک پر ہٹ کرنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔ پاکستانی نمبر دو میں ویسے ہی سپیشلسٹ ہیں۔ سب سے بڑی مہارت ان میں کیا ہے کہ اگر کسی ملک نے کوئی زبردست چیز تیار کی ہے، یہ اس میں تھوڑا سا اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ ان کا بڑا کمال ہے۔ امریکہ اگر کبھی اپنا میزائل ڈیفنس سسٹم بنا بھی لے، تو یہ اپنے میزائل میں کوئی ایسی چیز ڈال لیں گے کہ وہ ان کے سارے ڈیفنس سسٹم کو ناکارہ کر کے رکھ دے گا۔ کسی زمین کی سطح دلدلی یا گیلی ہو، تو کہا جاتا ہے کہ اس میں میزائل دھنس جاتا ہے، مگر پھٹتا نہیں۔ پانی میں بھی نہیں پھٹتا۔ انہوں نے اپنے میزائل کو وہ صفت دے دی ہے کہ چاہے پانی ہو یا دلدل، اس میں ضرور پھٹتا ہے۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ یعنی ریورس انجینئرنگ کے بہت سپیشلسٹ ہیں۔ اللہ کرے گا، انشاء اللہ تعالیٰ ہمیں ضرور کوئی فرد ایسا میسر آئے گا، جو تعمیر کا انتہائی دلدادہ ہو گا۔

ہمارا کوئی بھی رہنما اپنے حساب سے باہر نہیں نکلتا۔ وہ صرف اقتدار کا خواہاں ہوتا ہے اور اس کا سب غصہ عذاب سب اقتدار کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہمارے حکمران سیکولر فلاسفی پر عمل پیرا ہیں کہ لوگوں کو کس طرح کامیابی سے استعمال کریں اور اقتدار میں آ کر انہیں بھول جائیں۔ یہی کچھ وہ تمام وقت کرتے ہیں۔ ہم نے نااہلیت کا ایک جہان آباد کر رکھا ہے۔ اگر ایٹمی سائنسدانوں نے اتنا کچھ نہ کیا ہوتا، تو ہماری چھٹی ہو چکی ہوتی۔ یہ لوگ کبھی غریب رہے ہوں، تو انہیں غربت کا پتہ چلے۔ کسی گلی کوچے میں گئے ہوں، تو انہیں پتہ چلے کہ لوگ کس طرح زندگی گذار رہے ہیں۔ تاہم ابھی ہماری حالت غرناطہ کے آخری دور کی طرح کی نہیں ہوئی۔ جس میں جرنیل جنگ کے لیے جاتا تھا، تو اچانک پیچھے سے آواز آتی تھی۔ حضور قبلہ و کعبہ جرنیل صاحب کو زکام ہو گیا ہے۔ فوجیں ہالٹ! فوجیں وہیں رک جائیں۔ اس کے بعد جرنیل صاحب کی خیر و عافیت کے لیے تانتا بندھ جاتا۔ پانچ چھ دنوں بعد وہ ناک ملتے ہوئے اٹھتے اور حکم صادر فرماتے: ''مارچ کیا جائے! ہم قوم کے لیے اس حالت میں بھی قربانی کے لیے تیار ہیں۔''

علم اور اہلِ علم

ایک بندے کی مثال کبھی بھی قانون نہیں بن سکتی۔ تصوف میں کسی بھی بڑے استاد نے اصرار نہیں کیا۔ بلکہ سید ہجویرؒ نے وضاحت کی کہ ہم ہزاروں اساتذہ سے مستفیض ہوئے ہیں۔ وہ علم کون سا ہو سکتا ہے؟ میں دیکھتا ہوں کہ علم مولوی صاحب کے پاس نہیں ہے۔ اساتذہ کے پاس بھی موجود نہیں۔ مگر مغرب میں واٹسن کے پاس موجود ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ کے پاس ہے۔ میں اس کے پاس جاتا ہی نہیں۔ اس سے ملتا ہی نہیں۔ قرآن کریم کی بنیادی آیت کریمہ ہے کہ یتفکرون فی خلق السموٰت والارض اور زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کرو۔ اس میں عمرانیات کا علم ہے۔ کاسمیاتی

Marfat.com

علم ہے اور اسی میں بین الکائناتی علوم بھی موجود ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمانوں میں کوئی بھی علمی اتھارٹی موجود نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں اساتذہ کو تلاش کرنا ہے۔ ان کے مطالعے اور تحقیق کو دیکھنا ہے یا پھر ہمیں مغرب میں جا کر علوم سے براہ راست استفادہ کرنا ہوگا۔

قرآن کریم نے وسیع کا لفظ کائنات کے لیے استعمال کیا ہے **والسماء بنینھا و انا لموسعون** ہم نے آسمانوں کو اپنی قدرت سے بنایا اور انہیں وسیع تر کر رہے ہیں۔ آپ کو پورے اسلامی علم کے تناظر میں اس کا جواب نہیں ملے گا۔ آپ کو وسعت پذیر کائنات کے تھیسز آئن سٹائن ہی سے ملیں گے۔ قرآن کی توضیح وتشریح مغرب کا ایک سائنسدان کر رہا ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ ایک مسلمان کی کیا اپروچ ہو سکتی ہے؟ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہمارے قرآن کے تراجم میں کیا لکھا ہے؟ یہ معانی لکھے ہیں کہ ہم وسیع تر کر دیں گے کہ ہم نے اس میں کشائش رزق رکھ دیا تھا۔ یہ کیا ہے؟ یہ قرآن کے اصل مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا، لیکن آئن سٹائن قرآن کے ساتھ مطابقت کرتا ہے۔ میرے استاد اس آیت مبارکہ کے ساتھ ترجمہ کا حق ادا نہیں کر پائے۔

آج کے زمانے میں نبی کریمؐ کی وہی حدیث ہے کہ علم مومن کی میراث ہے۔ جہاں سے ملے، وہ لے لے۔ تم ایک نہیں دس ہزار استاد پکڑ لو، لیکن ہو سکتا ہے، استاد اپنی جہالت کے مقام پر بیٹھے ہوں۔ تم ہی کو حریص علم ہونا چاہیے۔ جہاں سے آپ کی دانائی اور وژن کشادہ ہوتا ہے اور جہاں سے علم حاصل ہوتا ہے، وہ استاد دین کا ہو یا دنیا کا، اس سے علم حاصل کرو۔ تصوف کے علوم کی بدقسمتی یہ ہے کہ تصوف کا آدھے سے زیادہ علم تو نفسیات دانوں کے پاس ہے۔ وہ زیادہ نفسیات دان اور کم صوفی ہیں۔ ان کی بنیادی شناخت ذات تو صرف یہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اگر علم کا دوسروں پر اطلاق ہو، تو نفسیات ہے اور اپنے اوپر اطلاق ہو، تو تصوف ہے۔

ایسے نفسیات دان جو آج کل اسلامی یونیورسٹیوں میں تشنگی علم کی سیرابی کر رہے ہیں، ان میں سے کتنے صوفی بن کر نکلے ہیں۔ وہ صوفی ازم کا مطالعہ ہی نہیں کر رہے، بلکہ صرف ذات برائے ذات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کی تمام معلومات کا نتیجہ صرف ڈگری ہوتا ہے۔ فطری طور پر تصوف کا آدھا علم سائنس دانوں سے متعلق ہے اور آدھا نفس ذات سے وابستہ ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں نے پاکستان دیکھا ہے۔ اساتذہ دیکھے ہیں اور تصوف کے اساتذہ بھی دیکھے ہیں۔ میں ان کی غیبت نہیں کرنا چاہتا۔

گیارہویں کیوں منائیں

پوچھتے ہیں کہ یہ گیارہویں شریف کیا ہے؟ آپ گیارہویں شریف نہ منائیں، بارہویں شریف منالیں۔ اگر آپ کو بارہویں شریف پر اعتراض ہے، تو آپ تیرہویں یا چودہویں شریف منالیں۔ مگر خیرات وصدقات کے ارادے سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔ مجھے بتانے دیجیے کہ گیارہویں کی نیت کیا ہے۔ ایک چھوٹی سی بات کی خاطر آپ پورے ادارے اور مکتبہ فکر کی توہین نہیں کر سکتے۔ نیت یہ ہے کہ کسی آدمی کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ بڑی محبت و عقیدت تھی۔ اس نے چاہا کہ میں زندگی میں کچھ نہ کچھ ایسا کر جاؤں کہ اپنے حبیب کی محبت حاصل کر سکوں۔ وہ کہتا ہے کہ

Marfat.com

ہر جمعرات گیارہویں شریف کو ایک بکرا اللہ کے نام پر ذبح کروں گا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے لیے نہیں بلکہ خاص اللہ کے لیے۔ لیکن ثواب حضرت شیخ کی نذر کروں گا۔ اب بخاری شریف کی حدیث سامنے رکھتے ہوئے ایک شخص عبدالقادرؒ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے اس کی نذر کر رہا ہے، تو آپ کو اس پر اعتراض کیا ہے؟ آپ کے ساتھ کیا پرابلم ہے؟

آپ اعتراض کریں گے کہ یہ بدعت ہے۔ اس میں کیا برائی ہے؟ کیا اس قسم کی خیرات کی کوئی سند نہیں ہے؟ کیا یہ بدعت ہے یا گیارہویں بدعت ہے کہ تم چاند کی گیارہ کو کیوں دیتے ہو۔ چاند کی گیارہ کو نہ دیں، دسویں کو دے دیں، پندرہویں کو دے دیں تاکہ آپ کو اطمینان قلب حاصل ہو جائے۔ دن اس لیے فکس کیے جاتے ہیں، جیسے آپ بچے کی سالگرہ مناتے ہیں۔ کسی فنکشن کے لیے بلاتے ہیں۔ لوگوں کا بکھراؤ اتنا ہے کہ آپ جھٹ سے کوئی دعوت نامہ جاری کر کے لوگوں سے یہ تقاضا نہیں کر سکتے کہ وہ اس میں شریک ہوں۔ فاصلے اتنے ہیں کہ ایک دن پیغام، تار یا ٹیلی فون سے آپ کہیں کہ آج ہی آ جائیں، تو کوئی بھی نہیں پہنچ پائے گا۔ اس سے بھی بڑے شہر ہیں جن کی معاشرت اتنی تنگ اور تیز ہے کہ جب تک آپ سات دن پہلے اطلاع نہ دیں، کوئی پہنچ نہیں سکے گا۔ سات دن پہلے آپ کہتے ہیں کہ گیارہ تاریخ کو بچے کی سالگرہ منانی ہے، آپ پہنچ جائیں۔ مقررہ تاریخ کے خلاف کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کا تقرر مذہبی نہیں ہے، یہ تو آپ کی آسانی کے لیے ہے۔

مجھے انگلینڈ سے سوال کیا گیا کہ سالگرہ اسلام میں حرام ہے یا نہیں؟ میں نے کہا، کسی اور مذہب میں شاید حرام ہو، اسلام میں تو بالکل حرام نہیں ہے۔ اس نے کہا، یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا سالگرہ پر کیا ہوتا ہے؟ لوگ ملتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور بچوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ان تین چیزوں میں کون سا غیر اسلامی فعل ہے؟ اسلام تو یہ درس دیتا ہے کہ بلکہ بڑے واضح انداز میں کہتا ہے کہ اللہ کو دو نیکیاں بہت پسند ہیں۔ حسنِ اخلاق اور کھانا کھلانا۔ اگر آپ کسی کو گھر بلا کر کھانا کھلاتے ہیں اور اس کے عوض کیا طلب کرتے ہیں کہ ہمارے بچے کے لیے دعا کی جائے تو اس میں کیا کارِ حرام ہے؟ آپ انگلینڈ میں مہمانوں کو شراب نہ پلایئے گا، شراب نہ پلانا، جوا نہ کھیلنا یا ایسا پاپ میوزک نہ چلانا، جس میں لڑکیاں اور لڑکے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، ہلکی ہلکی موسیقی رکھ لینا، کیا تھوڑی سی خوشی بھی اللہ کو پسند نہیں ہے؟ کیا وہ تمہارا بدمزاج پروردگار ہے؟ وہ اپنی مخلوق، اپنے لوگوں کی اتنی سی خوشی بھی برداشت نہیں کرتا؟ یہ تصور اور رویہ اسلام کی بدنامی کا باعث ہے اسلام تو مذہب ہی دعوت کا ہے۔ ہم ایک ملک و قوم کے طور پر اسی وجہ سے ذلیل و خوار ہوئے ہیں کہ ہم نے مواخات کو ترک کر دیا ہے۔ اگر ہم آج بھی اسے قائم کر لیں تو ہمارا کلچر اسلامی بن سکتا ہے۔

بدعت کی تعریف

بنیادی طور پر بدعت زمانے میں موجود ہے۔ زمانے کے تغیر میں موجود ہے۔ جو زمانے کے تغیر میں موجود ہے وہ بدعت حسنہ کہلاتی ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ بدعت اصول میں بالکل غلط ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص چھٹی نماز کا نعرہ لگا دیتا ہے تو یہ بدعت ہے۔ میں نے بڑے پیر فقیروں کو چھٹی نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ بعض پیر خانوں پر اگر جائیں، تو آپ کو ضرور پڑھنا پڑتی ہے۔ تہجد آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ پڑھیں نہ پڑھیں، بندوں نے اسے وہاں لازم قرار دے رکھا ہے

Marfat.com

ورنہ بڑے حضرت صاحب بات بھی نہیں کریں گے۔ جس چیز کو شرع سے زائد بنالیا جائے، وہ بدعت ہے۔ شرع نبی کریمؐ کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ حلال حرام ختم ہو گیا ہے۔ اگر کوئی شخص حلال وحرام میں فقیہان اسلام کی حجت کے بغیر کوئی چیز شامل کرتا ہے یا بڑھا دیتا ہے، وہ بدعت ہے۔ اگر نمازیں پانچ ہیں، تو چھٹی نماز بدعت ہے۔ اسی طرح چار نمازیں بھی بدعت ہیں۔ اصول دین میں کوئی تغیر بدعت ہے۔ زمانہ جدید آ گیا ہے اور ہم کہیں کہ روزے فضول ہیں، یہ بدعت ہے، اگر آپ روزے نہیں رکھ سکتے، تو پھر کھانا کھلاؤ۔ تمہیں وہ کسر پوری کرنی پڑے گی، جو قرآن و شرع نے تمہیں بتادی ہے۔ اس میں انحراف ممکن نہیں۔ تم زنا کی سزا کے خلاف ہو۔ بدعت میں ڈی این اے کو شامل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ڈی این اے زندہ گواہ ہے۔ اگر زنا بالجبر کا کیس ہے پھر آپ اس پر ڈی این اے کی شہادت کا ٹیسٹ لے سکتے ہیں۔

چونکہ خداوند کریم کا طریقہ زنا کی سزا میں بخشش کا یہ نظر آتا ہے کہ اس میں چار زندہ گواہوں کی شہادت بالکل ضروری ہے۔ ڈی این اے اس وقت شامل ہوگا، جب زنا بالجبر کی شہادت کی تصدیق ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سخت ترین سزا کے لیے سخت ترین طریقہ اپناتا ہے۔ اس حد تک فقہ استدلال دیتی ہے کہ مرد اور عورت ننگے بدن چارپائی پر بیٹھے ہیں یا لیٹے ہوئے ہیں اور بوس و کنار میں مصروف ہیں، پھر بھی ان پر حد نہیں لگائی جا سکتی، جب تک کہ چار گواہ موجود نہ ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہے کہ جتنی سزا سخت ہے، اتنی ہی تصدیق سخت ہے۔ یہ ناممکن بن جاتا ہے۔

بلاشبہ خدا سزا دینا چاہتا ہے، لیکن وہ خارجی عوامل کی بنیاد پر ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سزا نہیں ہے، بلکہ ثواب کی بات ہے کہ ایک آدمی آگاہ ہو جائے، میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، وہ ایک اتھارٹی کے پاس جاتا ہے کہ مجھے پاک کیا جائے۔ میں اپنے گناہ کی سزا طلب کرتا ہوں۔ یہ اس کا انفرادی معاملہ ہے۔ اس کی بخشش اللہ کے ہاں ہے۔ مگر ایک شخص وہم پرست ہونے کے باعث سمجھتا ہے کہ گناہ کا اس وقت تک ازالہ نہیں ہوتا، جب تک کہ میں پاک نہ ہو جاؤں۔ میں اپنی جان دے کر ہی اس گناہ سے بچوں گا۔ وہ خلیفہ کے پاس جاتا ہے کہ میں نے یہ خطا کی ہے اور میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے پاک کیا جائے۔ اسے پاک کیا جاتا ہے۔ پہلے آپ پتھر مارتے تھے، اس وقت یہ طریقہ رائج تھا۔ یہاں میں اس کو بدعت نہیں کہوں گا مگر میرا خیال ہے کہ موت تک سنگ زنی سوسائٹی کے باقی لوگوں کو نفسیاتی لحاظ سے متنبہ کرنے کے مترادف ہے۔ اس میں ٹائم کا مسئلہ ہے۔ تلوار تو اس وقت بھی موجود تھی۔ تلوار سے سزا کیوں نہیں تجویز کی گئی؟ پتھر کیوں، ستون بڑا بے رحم لفظ ہے۔

لیکن حقیقت میں زنا آگ کی طرح پھیلتا ہے۔ زنا بالجبر آگ کی طرح نہیں پھیلتا، بلکہ پورا معاشرہ اس کے خلاف متحد ہو جاتا ہے، لیکن باہمی رضامندی سے زنا اندر ہی اندر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا جاتا ہے اور پورا معاشرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس چیز سے منع کرنے کے لیے ایک نفسیاتی خوف بیدار کیا جاتا ہے۔ زنا اخلاقی جڑوں کو بالکل کھوکھلا کر دیتا ہے۔ یہ ایک مضبوط قوم کی بنیاد کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسے افراد نہ امانت دار ہیں نہ ہی کسی کسوٹی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

چار شادیوں کی اجازت

شادی ایک معاہدہ باہمی ہے۔ دنیا کی ہر مہذب قوم اپنے معاہدے کی حفاظت کرتی ہے۔ اگر تم اپنے معاہدے

Marfat.com

کی حفاظت نہیں کر سکتے، تو اس سے جان چھڑالیں۔ اسے چھوڑ کر دوسری سے بیاہ کرلیں۔ تمہیں اللہ نے اجازت دے رکھی ہے مگر چونکہ اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔ عورت خطرات میں گھری ہوئی ہے اس کے بچوں کا غیر محفوظ ہو جانا اسے نظر آتا ہے۔ اس کا خاوند possessive and chauynistic ہے۔ انتشار اور خلفشار بڑھ جاتے ہیں اور پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں۔ غیر وفاداری کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتی ہے اور یہ پورے معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جاتی ہے۔

مجھے ایک شخص نے بتایا کہ آپ کی تسبیح کی وجہ سے میں مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا، ایک زمانہ تھا، میں بہت کرپٹ تھا، میں عورتوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا، مجھے کسی کی پروا نہ تھی مگر جب سے میں نے تسبیح شروع کی ہے، مجھے بڑا سکون وقرار ہے۔ اب مجھے زن پرستی بالکل پسند نہیں ہے۔ بلکہ کبھی کبھی عورتیں اپنی خاص عشوہ واداؤں سے فریب دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں، حتیٰ کہ وہ سیکس کی بھی پیشکش کرتی ہیں، میں کہاں جاؤں؟ تو میں نے کہا کہ گھر سے نہ نکلیں اور کیا ہو سکتا ہے۔

حسین بن منصور حلاج

حسین بن منصور حلاج کا واقعہ قطعاً مشکوک ہے اور کسی خاص معیار پر پورا نہیں اترتا۔ کچھ لوگ ایسے ہیں، جو جذب ومستی کو بڑا پسند کرتے ہیں۔ کچھ بزرگوں کے دعوے بڑے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی بزرگ کے پاس جائیں اور فوراً کہے کہ ہاں بچہ کیا مانگتا ہے؟ انا الحق کے بعد تو ہم نے ہی انا الحق کہا ہے۔ وہ اس دعوے کو بڑا دعویٰ سمجھتے ہیں کہ منصور کے بعد وہی اللہ بن بیٹھے ہیں۔ منصور نے ایک سادہ سی غلطی کی۔ اس کی تصنیف اور شاعری قابل قدر ہے۔ اگر اس کی شاعری اور تحریر سے ہی تعریف کرنا مقصود ہے تو پھر قرۃ العین طاہرہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ قرۃ العین کی شاعری اتنی گرانقدر اور خوبصورت ہے کہ میرے جیسا سخت ترین معیار رکھنے والا انسان بھی اس کا آدھے سے زیادہ دیوان یاد کر لیتا ہے۔ اس کی شاعری واقعی قابل داد ہے۔ میں اس کی شاعری کے بارے میں نہیں بتا سکتا، بڑی مشکل سے ایسے اچھے شعر کہیں نظر آتے ہیں۔

آپ معیار کو بھی تو کسی معیار پر چیک کرتے ہیں۔ آپ کے پاس قرآن ہے، حدیث ہے اور رسولؐ کی ساری زندگی کا نمونہ ہے۔ یہ بذات خود بہت بڑا معیار ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے کبھی کیوں نہ کہا کہ میں انا الحق ہوں۔ زیادہ حق تو ان کا بنتا ہے۔ تو یہ خرافات ہیں۔ ایک مستی وسکر کا ایسا بیان ہے جس کے پیچھے کوئی جواز نہیں ہے۔ پھر بہت سارے اظہار اور آرا اس کے خلاف جاتی ہیں۔ مورخین جیسے کہ ابن کثیر اور ابن ندیم نے حسین بن منصور حلاج کے خلاف بہت سارے دستاویزی ثبوت فراہم کیے ہیں۔ اس پر فتویٰ اسی وجہ سے لگا تھا کہ اس نے گھر میں کعبہ بنایا ہوا تھا۔ ادھر کیا جاتے ہو، ادھر ہی طواف کرو۔ حج قبول ہو جائے گا۔ وہ بھی رائے ونڈ تھا۔

مجموعی طور پر یہ زوال کا دور ہے۔ ہمارے ہاں اس قسم کے واقعات بہت ہیں۔ امریکہ جب سپر پاور بن رہا تھا، ہپی تحریک ابھری، جو ایک صوفیانہ تحریک تھی۔ Psychidelic شروع ہو گئے۔ جیسے ایل ایس ڈی کا نشہ شروع ہوا اور لوگوں

Marfat.com

نے تفریحات پر جانا شروع کر دیا۔ یہ ایک Fatigue کی سائیکی ہے، جو کہ وقت کا ساتھ نہیں دیتی۔

اب اپنے گھروں میں دیکھ لیجیے کہ ایک شخص اچھا کما رہا ہے۔ کھا پی رہا ہے، لیکن دوسرا بھائی اس جیسا نہیں بن سکتا اور وہ اس پر تنقید شروع کر دے کہ یہ گدھا ہے، نالائق ہے، ہماری طرف دیکھو، اتنی محنت کی، یہ کیا، وہ کیا، حتیٰ کہ اس مقام پر پہنچا۔ جبکہ تو نالائق ہے، کسی مقام پر پہنچ کے دکھا۔ اس میں ایک ردِعمل پیدا ہوتا ہے۔ اس ردِعمل کے نتیجے میں وہ افسردہ اور اداس ہو جاتا ہے۔ ڈیپریسڈ ہو جاتا ہے اور آخرکار سائیکی ڈیلک بن جاتا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

ہر طاقتور زمانے یا اقتدار کے اعلیٰ ترین زمانوں میں یہ جو Lesser reactions ہیں، یہ نئی Pyschidelic تحاریک شروع کرتے ہیں۔ اس سرگرمی سے فرار ڈھونڈتے ہیں۔ فرض کریں، جب مسلمان لڑنے کے لیے فوج کی بھرتی شروع کریں، تو ان میں کچھ لوگ جوش و خروش کا مظاہرہ کریں کہ ہم مالِ غنیمت پائیں گے، لیکن کچھ ایسے بھی ہوں گے، جن کو تلوار سے نفرت ہوگی۔ بزدلی میں جائیں گے اور وہ تصوف کی طرح چلے جائیں گے۔ انہوں نے افیون پینی شروع کر دی۔ بہت ساری خرافات اقتدار کے زمانے میں ردِعمل کے طور پر اٹھتی ہیں اور زوال کے زمانے میں سند بن جاتی ہیں۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے۔

اصل میں آپ کو فقر کی طلب نہیں ہوتی، بلکہ اقتدار کی طلب ہوتی ہے۔ اس میں فقر کو رسوا کیا جا رہا ہے۔ میں جب لاہور میں تھا، تو لوگ پوچھتے کہ میں فلم ایٹمی پٹاخہ بنا رہا ہوں۔ یہ فلم مقبول ہوگی یا نہیں۔ اب ایسے لوگ آنا شروع ہو گئے ہیں۔ فلاں کے پاس کالا علم ہے، کالے علم سے لوگ کام کراتے ہیں کیونکہ پہلا دن ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی خرافات ہے، جس کو خدا کی تلاش کا نام دیا جاتا ہے۔ اب تو بہت سارے لوگ مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔

بہت سارے لوگوں کا کاروبار مدھم پڑ گیا ہے۔ بہت سارے پیر اپنی گدیوں سے نیچے آ پڑے ہیں۔ انہیں علم تھا کہ وہ حق پر نہیں ہیں۔ انہوں نے غلط کام شروع کیا ہوا تھا۔ وہاں ایک ایسا شخص آ گیا، جو لوگوں کو قائل کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ اس کے پاس جائیں گے، مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ سالہا سال گذارنے کے باوجود بھی لوگ اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ سیدھے فلاں پیر کے پاس جائیں گے۔ پھر آ کر بتاتے ہیں کہ ہم تو ویسے ٹیسٹ کرنے گئے تھے۔ پھر میں کہتا ہوں کہ ٹیسٹ کر کے وہیں رہ جانا تھا۔ اللہ کا بندہ اللہ کے سوا کسی چیز پر توکل نہیں کر سکتا۔

Marfat.com

فطرت کی تعریف

فطرت تین عناصر پر مشتمل ہے۔ایک تو آباؤ اجداد کی صدیوں سے چلی آتی ہوئی جبلتیں ہیں۔جبلتیں، جو ہمارے وجود میں اتنی گہری ہیں کہ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی جانورانہ رویوں کا اظہار کرتے ہیں۔دوسری، وہ فطرت ہے، جو ہمیں والدین سے ملتی ہے اور تیسری اس تربیت کا حصہ اور وہ اکتسابی ہوتی ہے۔یعنی ایک Genertic دوسری Immediate parental اور تیسری Acquired عادتیں۔

سب سے مشکل جنیٹک فطرت ہے، جسے توڑنا مشکل ہے۔مثلاً جنسی خواہشات اربوں سال کے تسلسل کے باعث ختم نہیں کی جا سکیں۔ہم ان خواہشات کو سدھار سکتے ہیں، ختم نہیں کر سکتے۔ان کی خاطر جانے کیا کیا بن سکتے ہیں۔کھانا ہم نے ضرور کھانا ہے۔کھانا بقا ہے۔قرآن میں ارشاد ہوتا ہے، ہم نے تمام جانوں کو بخل جان پر جمع کیا ہے۔جو بقا کو ہٹائے گا، شہید کہلائے گا اور شہید کا مرتبہ ہمیشہ کی زندگی ہے۔زمین پر اور آسمان پر بھی۔

جسے نفس کہتے ہیں، وہ پیچھے کی طرف، وراثتی اور جنیٹک عادات کی طرف مراجعت کرتا ہے اور اکتسابی عادات کبھی کبھی فساد اور مکر و فریب بن کر رہ جاتی ہیں۔سپریم کورٹ کے بہت بڑے عادل جسٹس ہوئے ہیں مگر جب ڈانس کرنے اور شراب پینے کی باری آئی، تو اپنے سیکرٹری کی بیوی کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔

علم کی انتہا حیرت

دنیا میں جتنے بھی مسائل کے حل کے تھیسز اور سسٹم بنے ہیں، وہ جزوی وضاحت دیتے ہیں۔سوائے اس آدمی کے، جس کی اللہ کی طرف توجہ ہے، جو اللہ اور اس کی پروگرامنگ کو جانتا ہے۔جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے زندگی میں حیرت کبھی نہیں ہوئی۔حالانکہ اقبال کہتا ہے کہ علم کی انتہا حیرت ہے اور عشق لا انتہا ہے۔مگر دراصل اقبال بھی صوفی نہیں تھا۔وہ بہت اعلیٰ درجہ کا فلاسفر تھا۔علم وہی ہے، جس میں حیرت نہ ہو۔جب آپ خدا کو جانتے ہیں، تو آپ کو کوئی حیرت نہیں رہتی۔انکشاف سے پیدا ہوئی حیرت اعتراف شکست یا اعتراف کمتری ہوتی ہے۔مجھے اپنی بندگی کا اعتراف ان چیزوں

Marfat.com

سے ہوتا ہے، جو خدا میرے اردگرد بڑے عجیب وغریب انداز میں بکھیرتا ہے۔ مگر وہ عقلی حیرت کا باعث نہیں ہے۔

جب آپ اللہ کو مان لیتے ہو، تو عقل کی حیرت تمام ہو جاتی ہے۔ فرض کریں، یہاں ایک ستارہ ٹوٹ کے گرتا ہے۔ وہ زمین و آسمان میں معلق ہو جائے۔ نیچے گرے نہ اوپر ہی کو جائے، تو ہو سکتا ہے، سائنس دانوں کو حیرت ہو کہ کس چیز نے اس کو بیچ میں روک دیا۔ مجھے نہیں ہوگی کہ مجھے پتہ ہے، میرے اللہ نے یہ کیا ہے۔

ایک مرزائی نے مجھ سے سوال پوچھا کہ تم سائنسز میں اتنا ادراک رکھتے ہو۔ کیا تم مانتے ہو کہ پیغمبر جسمانی طور پر اوپر گئے تھے؟ میں نے اسے سوال کیا کہ جناب کیا اسے میں نے بھیجا تھا، تو پھر تو مجھے حیرت ہوتی۔ یا کسی سول سرونٹ یا کسی صدر نے بھیجا تھا؟ اگر آپ کے اور میرے نزدیک اللہ نے بھیجا ہے، تو میں آپ سے یہ سوال کروں گا کہ اللہ میں یہ قدرت ہے کہ نہیں کہ وہ کسی بندے کو جسمانی طور پر آسمان پر لے جائے، وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ میں نے کہا، ڈائریکٹ سوال پر آؤ۔ کیوں ادھر ادھر جا رہے ہو۔ جب تم اللہ کو مانتے ہو، تو یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ جو چاہتا ہے، کر سکتا ہے۔ اس کے بعد حیرت نہیں ہوتی۔ تشکر اور انکسار رہ جاتا ہے۔ سیکھنے کا جذبہ رہ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ اللہ کی ہر بات اس کے علم کے بغیر اپنی روح اور قانون کے بغیر نہیں چل سکتی۔ ہمارا کام یہ رہ جاتا ہے کہ ان تمام واقعات کو سمجھیں کہ وہ کون سے اطرافی علوم ہیں، جنہیں تلاش کریں، جو اللہ کی حکمت کا باعث بنتے ہیں۔

ماننے والوں میں فرق

اس میں دو پیٹرن ہیں۔ ایک تو مذہب کا مقررہ پیٹرن ہے۔ اس میں ہو سکتا ہے، ایک شخص شروعات میں ہو۔ ایک انجام میں ہو۔ ایک مسلم اور ایک مومن ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ کسی تہذیبی دور میں لوگ جب اسلام یا کسی دیگر مذہب پر عمل کر رہے ہوں، ایک شخص کو ہم کہیں، یہ بنیاد پرست ہے۔ اس کو عقل نہیں ہے۔ یہ کولہو کے بیل کی طرح مذہب پر عمل کر رہا ہے۔ ایک سابقون الاولون کی طرح جدوجہد کر رہا ہے۔ غور و فکر کرتا اور اللہ کے راستے میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر ایک شخص کے بارے میں اللہ کہتا ہے، الا ان اولیآء اللہ لاخوف الیھم ولا ھم یحزنون۔ یہ ولی ہیں۔ ان کو کوئی خوف اور حزن نہیں ہے۔ یہ میرے بندے ہیں۔ اس کے آگے کچھ لوگوں کے بارے میں خدا کہتا ہے، یہ کچھ اور ہی قسم کے لوگ ہیں۔ یہ صدیقین اور شہداء ہیں۔ یہ مر کے بھی نہیں مرتے۔ ان کی زندگی قائم رہتی ہے۔ مزید خدا اس سے بھی آگے کے مراتب کے لوگوں کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ آگے بڑھنے والے سابقون میں سے ہیں۔

یہ ایک ہی تحریک ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ درجاتی فرق ضرور ہے، مگر یہ اختلافی فرق نہیں۔ اس میں ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلم اور مومن میں فرق اس لیے ہے کہ دونوں میں سے ایک کسی اور چیز کو مانتا ہے اور دوسرا کسی دوسری چیز کو مانتا ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ مراتب ذہن و فکر کے لحاظ سے ہر ایک کی تفہیم مختلف ہے۔ جوں جوں لوگ آگے بڑھتے ہیں، جنہوں نے زیادہ محنت کی اور جو خدا کے زیادہ قریب تر ہوئے، اس کی بنیاد پر ان کے درجات مقرر ہوں گے اور یہ کہ لوگ خدا سے کتنی دوری پر کھڑے ہوئے۔ ایک اللہ کے حرم میں ہے، تو ایک اللہ کی بارگاہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ ایک آسمان ہشتم پہ، تو ایک چہارم اور ایک آسمان اول پر براجمان ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جائے گا کہ ان کا رستہ کوئی اور یا ان کی مجلس کوئی اور ہے۔

Marfat.com

وہ جو اللہ کے حرم مقدس کے باہر چپڑاسی کی حیثیت سے کھڑا ہے اور جو اندر کسی تخت عنایت پر بیٹھا ہوا ہے، وہ ہیں ایک ہی۔ وہ ایک سسٹم اور ایک مکتب فکر کے لوگ ہیں۔ مکتبہ فکر میں بہت سی حیثیتیں مدغم ہوئی ہوتی ہیں۔ اس حیثیت میں چیف ایگزیکٹو اس کائنات کے محمد رسول ﷺ ہیں۔ اس کا اعلان اللہ نے قرآن پاک میں کیا۔ وما ارسلناک الا رحمة للعلمین۔

اب چیف ایگزیکٹو کے تعینات ہونے کے بعد پتہ چلا کہ چیف ایگزیکٹو کے کچھ پیغامات اور کچھ کام ہیں۔ پتہ چلا کہ چیف ایگزیکٹو کا سارے کا سارا اقتدار قرآن ہے۔ وہ آیا ہی اس لیے تھا کہ اس کتاب کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔ دوسروں کو زندگی بسر کروائے اور لوگوں کو حیات ابدی وسرمدی اور خدا کی قربت کے راستے دکھائے مگر اس نے سارا کچھ ڈلیور نہیں کیا کیونکہ اس سے پہلے بہت سارے لوگ گذر چکے تھے۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ تواتر زمانہ میں اللہ کے اس رسول نے درمیان میں آنا تھا، تو خدا نے یہ کیا کہ اس چیف کے چھوٹے چھوٹے جملے اور آیات پہلے لوگوں کو بھی بانٹ دیں۔ حضور ﷺ سے پہلے قرآن میں سے ایک آیت اٹھا کے آدم کو دے دی اور کہا چل بھئی آدم! اس آیت کے مطابق تو ہدایت یافتہ ہے۔ آپ اس کو پڑھاؤ۔ ایک نوحؑ کو دے دی۔ ایک شیثؑ کو، حتیٰ کہ موسیٰؑ کو دس احکام دے دیئے۔ حضرت عیسیٰؑ کو داخلی و باطنی شریعت دے دی، مگر پورا قرآن نہ دیا۔ کیونکہ پورا قرآن ان کا تھا نہیں۔

یہ پورا پیغام اور پوری کتاب جس کی تھی، اس نے بعد میں آنا تھا۔ مگر اس کی شان یہ تھی کہ اس کی پارٹی یا انہی کی طرح کے کچھ لوگوں نے پہلے بھی پیغام ڈلیور کیا۔ فرض کیجیے، میں آدمؑ، نوحؑ اور شیثؑ کو مانتا ہوں اور موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کو بھی جانتا ہوں، مانتا آ رہا ہوں اور مذہب سے جزوی پیغام حاصل کرتا چلا آ رہا ہوں۔ پھر میں محمد رسول ﷺ تک پہنچ کر ان کا انکار کر دیتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ میں مذہب کا سب سے احمق ترین طالب علم ہوں۔ یہ انتہائی احمقانہ بات ہوگی کہ میں کتاب کے جزو پر تو اعتبار کرتا ہوں اور مجھے سو فیصد پتہ ہے کہ کتاب کا اول و آخر یہ ہے، جبکہ باقی جو پوری کتاب لانے والا ہے، اس کا انکار کر دیتا ہوں۔ یہ خدا اور اس کے پیغمبر چیف ایگزیکٹو کی توہین ہے۔ اب ایسے لوگوں کی نجات بڑی مشکل ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو ذاتی رجحان کے تحت اس کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر جو اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گیا، اسے عیسائی ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ عیسائیت کے پاس تو قوانین اور طرز زندگی نہیں ہے۔ اس میں صرف نیات کی چند باتیں شامل ہیں۔ ایم اے کے بعد مجھے دوبارہ اپنے نام کی تختی پر پانچویں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ پراگریسو مذہب ہے۔ اول و آخر آگے بڑھتا ہے۔ قرآن نے صرف اتنی بات کہی کہ دیکھو، پیچھے سے تھوڑا تھوڑا مذہب آ رہا ہے۔ ہر چیز ادھوری تھی۔ انسان اور پیغام ابھی مکمل نہیں تھا۔ اب آخری پیغمبر آ گیا ہے۔ پیغام مکمل ہو گیا ہے، اس لیے اب مزید کسی پیغمبر، کسی اور مذہب اور فیصلے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ پیغام بھی مکمل ہو گیا اور پیغام کی حفاظت کا بندوبست بھی ہو گیا۔ انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحفظون۔ حضور ﷺ کے بعد کسی اور پیغمبر کے آنے کا تصور استہزائی ہے۔ یہ مذاق ہو سکتا ہے کہ اللہ میاں نے تکمیل کرنے کے بعد بھی ادھورا پن اور قرآن لکھنے کے بعد بھی کچھ قرآن کی مزید گنجائش رکھی ہو۔ یہ بڑی احمقانہ سی بات ہے اور یہ خدا کے پیغام کو براہ راست مسترد کرنے کے مترادف ہے۔ جب وہ صاف طور پر یہ کہتا ہے، الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت۔ ایک جگہ

Marfat.com

کمال کا لفظ اور ایک جگہ تمام کا لفظ استعمال کیا، واتممت الیکم نعمتی۔ ادھر ہم نے پیغام پورا کر دیا اور شاندار ترین پیغام کو تکمیل تک لے گئے۔ ادھر ہم نے پیامبر پورے کر دیئے۔ اس کے بعد خدا اپنے پیغمبروں اور اپنے پیغام کی توہین نہیں کر سکتا۔

میں ان لوگوں کی بات نہیں کرتا، جو دنیادار یا کمیونسٹ ہیں۔ ان کی بات کرتا ہوں، جن کے پاس دیگر چوائس بھی تھے۔ انہوں نے اگر موت کو چن لیا اور اپنی کارگذاریوں کو خدا بنا لیا، تو انہیں کرنے دیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن وہ لوگ جو خدا کو جانتے اور اس کی خدائی کو تسلیم کرتے ہیں، ان کے پاس سوائے اللہ کے رسول ﷺ کو ماننے اور قرآن کو تسلیم کرنے کے اور کوئی گنجائش نہیں۔ ان کے پاس اسلام کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اگر وہ اسے تسلیم نہیں کرتے، تو وہ قطعی مذہبی نہیں ہیں۔ چاہے وہ عیسائی ہوں یا یہودی۔ یہی ان پر عذاب کی بنیاد ہے۔

قبر کی بھینچ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قبر کی بھینچ سے کوئی ذی روح آزاد نہیں۔ ہوتے، تو سعد بن معاذؓ ہوتے۔ وہ اس قدر خوبصورت کردار کے مالک تھے کہ رسول کریمؐ نے خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اس کا مطلب ہے کہ تھوڑے سے وقت کے لیے پورے انسان کو چند لمحوں کے لیے اس کے پورے جسمانی وجود میں جگایا جائے گا، اس کے بعد اس پر موت واقع ہو جائے گی۔ یہ دوسری زندگی اور دوسری موت ہے، جس کا قرآن میں ذکر ہے۔ ایک وہ موت، جو بیرونی طور پر ہم پر وارد ہو گی۔ ہم قبر میں چلے گئے، چھوڑنے والے چلے جائیں گے۔ ہم کو دوبارہ اپنے پورے وجود کی صحت میں چند لمحوں کے لیے اٹھایا جائے گا۔ اس وقت یہ سوال پوچھا جائے گا۔ یہ کوئی سائیکی سوال نہیں ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ بیٹا! جب میں مر جاؤں، تو کچھ دن میری قبر کے سرہانے رکنا، تاکہ میں آنے والوں سے مانوس ہو جاؤں۔ تمام اصحاب رسول قبر کے سوال و جواب پر یقین رکھتے تھے۔ جب یہ سوال ہو جائیں گے، اس کے بعد آپ کو جہنم یا جنت کا پاسپورٹ دیا جائے گا۔

قبر کی بھینچ اسی لیے کہتے ہیں کہ جسم کو اس اذیت کا احساس ہو گا۔ کیونکہ یہ احساس کہ ہم دوبارہ زندہ ہوئے ہیں اور قبر کی تاریک کوٹھڑی میں ہیں، جس کو ہر سمت سے وسعت دی جائے گی۔ تبھی اس کو بھینچ کہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی گرفت سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ اس عمل کے دوران کوئی استثنیٰ نہیں۔

تلاش خدا سے لاتعلقی

صدمات کی وجہ سے انسان زیادہ سیکھتا ہے۔ اب بھی آپ دیکھ لیجیے کہ ایک بڑے شاک کی وجہ سے انسان کی ساری ترقی سست پڑ جاتی ہے۔ ایک بڑا شاک...... شیل شاک...... اٹامک شیل شاک، جو آگے آنے والا ہے، اس کی مدت پانچ سے دس سال ہے۔ اس شاک کی وجہ سے جتنی ترقی آپ دیکھ رہے ہیں، دماغ اس کے دھماکے کے اثرات سے شل ہو جاتا ہے۔ اس میں جو بہترین تیزی کی صفات پیدا ہوئی ہیں، یہ ڈل ہو جاتی ہیں اور پھر انسان ماضی کی طرف مائل

Marfat.com

ہوتا ہے۔ وہ صفات جہنمی نظر آتی ہیں۔ ایک حدیث مبارک کے مطابق قرآن اٹھالیا جائے گا۔ قرآن اٹھا لیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فہم اور فراست، جو قرآن کے لیے بہرصورت ضروری ہے، وہ ختم ہو جائے گی۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ علم ختم ہو جائے گا اور اس کی وضاحت یہ فرمائی کہ علم ختم ہونے سے یہ مراد ہے کہ عالم ختم ہو جائیں گے۔ جب ہم جدید ادوار کی جانب دیکھتے ہیں، تو ہمیں اس قدر یک طرفہ علم نظر آتا ہے۔

کسی نے آج تک علم کی تلاش نہیں کی۔ اگر علم کی تلاش کی ہے، تو خدا کی تلاش نہیں کی۔ تمام مغربی فلسفہ اور جدید ترین تحقیقات کا یہی المیہ ہے کہ یہ لوگ اٹھ کر خدا کے خلاف بول لیتے ہیں اور ان کا ڈیٹا اتنا کمزور ہوتا ہے، کبھی برٹرینڈ رسل کو نقل کریں گے، تو کبھی آئن سٹائن کو۔ یعنی ان کی اپنی سوچ اور اپنی تحقیق خدا کا قرب ہی نہیں حاصل کر پاتی۔ تمام دنیا جو خدا کے خلاف فیصلے دیتی ہے، ان میں یہ بنیادی کمزوری موجود ہے کہ انہوں نے کبھی خدا کو تلاش نہیں کیا۔ وہ صرف اپنی ذاتی و سماجی مسائل حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ان مسائل کو حل کرتے ہوئے ان کو خدا رکاوٹ نظر آ رہا ہے۔ کبھی وہ مذہب کو افیون کہہ دیتے ہیں۔ کبھی اسے ماضی میں الجھا ہوا قرار دیتے ہیں۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ جادوگری کے آثار ہیں۔ کبھی اس کو حماقت فکر انسان قرار دیتے ہیں۔ کبھی اسے ضرورت انسان قرار دیتے ہیں۔ مگر خدا کے قائل نہیں۔ وجہ واضح ہے۔ ان میں سے کسی نے خدا کو تلاش نہیں کیا۔

دعا مانگنے سے احتراز

ہر آدمی اللہ کے ساتھ اپنی ذات میں مساوی حیثیت سے کھڑا ہوتا ہے۔ اس میں اس کی اپنی ذاتی زندگی، تفہیم اور تعلیم سارا کچھ آتا ہے۔ ہم نے جس طرح زندگی گذاری، جس طرح خدا کے بارے میں سوچا۔ مگر دعا آپ نہیں بھی مانگنا چاہتے، تو بھی مانگنا چاہیے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ دعا نہ مانگنے سے اس میں دو بڑی خامیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک تو دعا نہ مانگنا خود پسندی پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ چاہت ہے، جو آپ کے وجود اور آپ کے صحت خیال سے ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو دعا اس حد تک مانگنی چاہیے، اس حد تک نہیں مانگنی چاہیے۔ یہ ذہنی نرگسیت Narcissism ہے۔

دوسرا دعا نہ مانگنے والا ایک ایسا گداگر ہے، جو بخیل ہے۔ قرآن نے ہمیں خطاب کر کے کہا ہے کہ واللہ غنی و انتم الفقرا کہ فقیر کا کام تو مانگتے رہنا ہے۔ کسی نہ کسی ڈھنگ سے مانگنا چلتا رہتا ہے۔ بعض انسان میں بعض عدم کے ایسے نقائص ہوتے ہیں کہ ان سے آگہی مشکل سے ہوتی ہے۔ بعض سادہ سی خطا کاریاں ہوتی ہیں، جن کو ہم جانتے ہیں۔ جیسے جھوٹ بولنا، تکبرات ظاہرہ وغیرہ۔ مگر کچھ خفی ہوتی ہیں، جو اتنی نازک ہوتی ہیں کہ ان کا حساب زیادہ نازک ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تمام زندگی ایک دعا ہے۔ میں تقریباً روزانہ رسول اللہ ﷺ کی ڈیڑھ سو دعائیں پڑھتا ہوں اور اس خیال سے پڑھتا ہوں کہ چاہے میں جدید دور کا پڑھا لکھا ہوں، میں نے پوسٹ گریجویشن لٹریچر سمیت بہت سے مضامین میں کر رکھی ہے۔ ممکن ہے، میری ذہنی سطح عام اساتذہ اور طلباء سے نسبتاً زیادہ ہو۔ اس کے باوجود جب میں اپنے رسولؐ کی دعائیں دیکھتا ہوں، تو میں یہ پاتا ہوں کہ ان کے پڑھنے میں میرے لیے بڑی فلاح و بہبود ہے۔

Marfat.com

پھر دعا کے کچھ معانی ہوتے ہیں۔ یہاں ایک چھوٹی سی دعا، جو میں نے لکھی ہے، اسے جامع دعا سمجھتا ہوں، اللہم انی اسئلک العفو و العافیہ، اس دعا میں لفظ عافیت کے بارے میں رسول اللہؐ کی وضاحت بڑی عجیب و غریب ہے۔ حضرت عباس ابن عبدالمطلب کو یہ دعا عطا ہوئی۔ وہ پیسے کے معاملے میں بڑے چکر میں رہتے تھے، وہ حضورؐ کے پاس آئے کہ بھتیجے مجھے مال وغیرہ کی کوئی دعا دے۔ ایک دن حضورؐ نے کہا کہ چچا میں آپ کو ایک بہت اچھی دعا دیتا ہوں اور یہ دعا بتائی۔ اللھم انی اسئلک العفو والعافیہ، فرمایا، چچا! آج تک انسان نے اللہ سے عافیت سے بہتر کوئی چیز نہیں مانگی۔ مجھے عافیت کے مطالب پتہ نہیں تھے۔ اس کا جو مطلب میں جانتا ہوں، وہ بڑا معمولی سا ہے۔ مگر جب میرا رسولؐ یہ کہے کہ عافیت سے بہتر کوئی چیز اللہ سے کسی انسان نے نہیں مانگی، تو میرا خیال ہے کہ یہ ایک جامع لفظ ہے، جو جسمانی، ذہنی اور آپ کے تمام روحانی مسائل کو دور کرتا ہے۔

اب یہ دوسری دعا دیکھیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اللہ نے مجھے جامع الکلام بنایا ہے۔ یعنی میں جو بات کہتا ہوں، وہ ایک مجموئی بات ہوتی ہے۔ یہ دعا بخاری اور مسلم میں مروی ہے، ان کے خواص بھی حضورؐ نے ساتھ بتائے۔ دعا ہے، اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا و اجرنا من خزی الدنیا و عذاب الاخرہ۔ جب میں اس کا اردو ترجمہ پڑھتا ہوں، تو یہ مجھے ایک مکمل دعا لگتی ہے کہ اے اللہ میرے تمام کاموں کا انجام بہتر فرمادے اور مجھے دنیا کی رسوائی اور عذاب آخرت سے بچالے۔ اس کا ایک اور فائدہ حضور اکرمؐ نے فرمایا، کہ اس دعا کے پڑھنے والے کو موت کے سوا کوئی حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ یہ وہ وصف ہے، جو میں اپنی کسی دعا سے اس میں پیدا نہیں کر سکتا۔

اسی طرح یہ دعا ہے، اللھم اعنا علی ذکرک و شکرک و حسن عباتک۔ یہ دعا انعام کے طور پر حضورؐ نے حضرت معاذ بن جبل کو دی۔ یہ اصحاب صفہ میں سے تھے۔ ایک دن حضورؐ نے انہیں خود بلا کے کہا کہ اے معاذ! کیا تجھے ایک بہت اچھی دعا نہ دوں؟ فرمایا، ضرور یا رسول اللہ! اور آپ نے انہیں یہ دعا دی۔ اب اس دعا میں ایک بہت بڑا فلسفہ ہے۔ لفظ اعنا پر غور کریں کہ اللہ مجھے اپنے ذکر پر شکر پر اور حسن عبادت پر میری مدد فرما۔ وہ تمام لوگ جو یہ دعویٰ رکھتے اور خیال کرتے ہیں کہ وہ عبادت اپنے زور پر کرتے ہیں، درست نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ تمام عبادات کی بنیادی اپروچ میں آیا آپ ذہنی طور پر خدا کے ساتھ کمیٹڈ ہیں کہ نہیں۔ قرآن کی آیات کے مطابق وہی اختیار والی بات ہے۔ انا ھدینا السبیل و اما شاکراً و اما کفورا، چاہو تو مجھے مانو، چاہو تو میرا انکار کردو۔

انسانی کیمسٹری میں فرق

ساری زندگی کی کیمسٹری تو ایک ہی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی میں دو دل اور کسی میں دو دماغ یا چار آنکھیں ہیں۔ کیمسٹری ایک ہی ہوگی، تو اس کی اقدار اور جبلتیں بھی ایک ہوں گی۔ حصولات میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن اس کی بنیادیں ایک ہوں گی۔ ہم جبلی اقدار سے لڑتے ہوئے ایک ہی دور سے گذرتے ہیں۔ خواہشیں کرتے ہیں کہ ہمیں یہ اور یہ حصولات مل جائیں۔ مجموئی طور پر پوری نسل انسانی کی مشرق و مغرب میں بنیاد ان کے اعلیٰ اور ارفع کاموں پر نہیں ہے، ان کی جبلی اقدار اور جسمانی بناوٹ کی بنیاد پر ہے۔ اس ایک یکساں کیمسٹری کی وجہ سے ہے، جو نسل انسان میں جاری و

Marfat.com

ساری ہے۔ اگر ہم دس پاکستان، دس امریکہ اور دس روس کے بندوں کا تفصیلی سروے کر لیں، تو پتہ چلے گا کہ ہماری پیدائش، تعلیم اور بڑھنے، پھلنے پھولنے کا طور طریق اور کسب و اکتساب کا وہی پیٹرن ہے۔ خواہشات کا مقرر انداز ہے۔ ان کی زندگی میں خدا اور خدا کی پہچان ذات اور اللہ کے علم کے سوا باقی زندگی کے تواتر میں قطعی کوئی فرق نہیں۔

امریکہ میں لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ اپنے مکان میں رہتے اور سردیوں میں کمبل اوڑھتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے اور مر جاتے ہیں۔ یہی کچھ ہم کرتے ہیں۔ وہ بھی کرتے ہیں۔ اگر ہم انٹارکٹیک نہیں بھی گئے، تو وہاں کے لوگوں کے بارے میں بڑی آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ وہاں انسان کیا کرتے ہیں۔ یہ کلچر اور تعلیم کا فرق ہے، لیکن یہ کہ وہ کھاتے ضرور ہیں۔

اب جو فرق پڑا، وہ الہیاتی تھا۔ اللہ نے انسان کو کوئی بات سکھائی انسان نے سیکھی۔ اب اس کی اقدار میں فرق پڑنا شروع ہو گیا۔ دوسرا بندہ اس لیے اس کو غیر مہذب نظر آیا کہ اسے وہ تہذیب اور رہنے کے انداز میں مختلف نظر آیا۔ اسے خود کو کسی ضابطے اور دائرے میں اپنی زندگی پابند لگی۔ جبکہ دوسرا آزاد اور شعور اور عقل سے بے بہرہ دکھائی دیا۔ اس طرح وحشت، بربریت اور تہذیب میں فاصلہ بڑھنا شروع ہو گیا۔ ان فاصلوں کی وجہ کبھی مذہب، کبھی آزمودہ تہذیب، کبھی ثقافتی پہلو اور کبھی انسانی ہنر ہوا، لیکن زیادہ تر انسانی شناخت اور انسان کی عمومی اقدار میں آج بھی انسان کا بدترین اور اعلیٰ ترین انسانی اقتدار ہمیں اللہ کی وجہ سے اتنا ہی وحشی اور غیر انسانی لگتا ہے، جیسے قرآن حکیم میں اللہ نے کہا کہ ہم نے قوموں کو اس وقت پکڑا، جب وہ اپنی معیشت پر اترا رہی تھی۔ جب ان کے اعلیٰ ترین مکانات، ان کے شاندار باغات، شان و شوکت کے مظاہرات، بڑے نمایاں ہو چکے تھے، اللہ نے عین اس وقت ان کو پکڑ لیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیوں پکڑا؟ خدا نے خیال کیا کہ یہ لوگ اس کے مقاصد میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ اس کے خیال میں وہ مہذب نہیں ہیں، جو اس کی جنت کی تہذیب کے مطابق زندگی گذار سکیں۔ ایک وہ معیار ہے، جس میں میں کسی کو مہذب اور غیر مہذب قرار دیتا ہوں۔ ایک وہ ہے، جس میں خدا کسی کو مہذب اور غیر مہذب قرار دیتا ہے۔ ممکن ہے، میرے نزدیک مغربی تہذیب بہت مہذب اور بڑی بااختیار ہو۔ بڑے سلیقے والی ہو۔ انہوں نے بڑی اعلیٰ ایجادات کر لی ہوں مگر جب انہوں نے خدا کو ماننے سے انکار کر دیا، تو ان کے تمام کمالات معدوم ہو گئے اور وہ غیر مہذب اور مردود قرار پائے۔

اس کے برعکس ایک سادہ سا آدمی، جس کے پاس اتنا مال نہیں ہے، محنت کرتا ہے، روٹی کما کر بال بچوں کو پالتا اور مشکل سے بھی زیادہ مشکل میں رہتا ہے۔ جس کے پاس کوئی بڑا مکان نہیں ہے۔ ذرائع زندگی معمولی سے ہیں مگر وہ خدا پر یقین رکھتا ہے۔ ججمنٹ جو اوپر سے آئے گی، اس میں یہ آدمی معزز چنا جائے گا۔ جبکہ صدر بش غیر مہذب فتنہ سمجھا جائے گا۔ یہ سوال کہ فیصلہ کرنے والی ذات اصل میں کون ہے؟ کن کے ذمے انسانی شناخت اور کس کے ذمے انسانی ترقی کا ٹیسٹ ہے؟ کس نے ہمیں پاس اور کس نے فیل کرنا ہے؟ اس بات کو جاننے کے لیے دوبارہ ہمیں اس سوال سے رجوع کرنا ہو گا کہ آیا میں خدا میں یقین رکھتا ہوں یا نہیں رکھتا اور پھر یہ سوال کہ آیا وہ موجود ہے یا موجود نہیں ہے؟ پورے کا پورا کائناتی اشو ہیر پھیر اور گھوم پھر کر انہی دو سوالوں پر آ جاتا ہے کہ آیا خدا ہے کہ نہیں ہے اور اگر ہے، تو کیا میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ نہیں رکھتا؟

Marfat.com

غلام احمد پرویز کا تھیسز

پرویز دراصل کم معلومات کا بندہ تھا۔ اس کی سائنسز میں بی ایس سی تک تعلیم تھی۔ اس نے اہل یورپ کی انفارمیشن تو مکمل طور پر لے لی، لیکن وہ اس سے اپنا حل نہیں نکال سکا۔ مگر اس کے پاس وہ جامع نالج نہیں تھا، جس سے کوئی علمی نتیجہ نکلتا ہے۔ اپنی کم علمی کی وجہ سے اس کو کوئی دو حدیثوں پر اعتراض تھا۔ ابوذرؓ کی ایک حدیث کہ رسولؐ نے فرمایا، جانتے ہو، سورج کہاں جاتا ہے؟ کہا، اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ کہا، یہ عرش معلیٰ کو جاتا ہے۔ اسے پلٹنے کا حکم ہوتا ہے۔ ایک دن ہوگا، اسے پلٹنے کا حکم نہیں ہوگا۔ پرویز صاحب نے کہا کہ سورج تو کہیں بلندی کو نہیں جاتا۔ یہ تو مدار میں چلتا ہے۔ ریگولر ہے۔ کہیں بھی رکتا نہیں۔

دراصل اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ سائنسز اس سے کہیں آگے جانے والی ہیں، جا سکتی ہیں۔ سورج ایک مخصوص رفتار سے اپر گلیکسیز کو جاتا ہے۔ Solar Apex اسی کو کہتے ہیں۔ اس کا آپ ترجمہ کریں، تو عرش معلیٰ کہہ سکتے ہیں۔ Apex میں جا کے یہ دوبارہ پلٹتا ہے۔ حدیث دراصل اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی طرح بہت سے ہمارے عالم ایسے ہیں، جنہوں نے جلدی میں فیصلہ کیا۔

غلام جیلانی برق مرحوم نے بھی یہی کہا تھا۔ برق بہت ہی آگے بڑھ گیا، لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ لفظ اللہ کے نہیں ہیں، تو ہماری تو مذہب کی اساس ہی ختم ہو جاتی ہے۔ رجوع کر لیا تھا، تو اللہ اس کو بخش دے۔

جعلی نبوت اور کامن سنس

مرزا غلام احمد کی مثال دیکھیں۔ مسلمان اس وقت غریب تھا۔ نوکریوں کی تلاش میں تھا۔ کسی جگہ اس کو ٹھکانہ نہیں ملتا تھا۔ اسی لیے حضورؐ نے فرمایا کہ بھوک کفر کے بڑا قریب ہوتا ہے۔ انگریز نے ایک سازش سوچی۔ اس نے مرزائیت کو تخلیق کیا۔ وہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانا اور انہیں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ کرنل Halroyd کی کتاب Respected Family of Punjab میں لکھا ہے کہ مرزائی برطانیہ کے سب سے قابل اعتماد لوگ تھے۔ لوگوں کو یہ لالچ دیا گیا کہ جو مرزائی ہوگا، اسے جاب ملے گی۔ بلکہ خود مرزا صاحب نے اپنے پہلے 313 متبعین کی لسٹ بنا کر انگریز کو دی اور کہا کہ بڑی مشکل سے میں نے یہ لوگ اکٹھے کیے ہیں۔ ان کو جاب نہیں دو گے، تو یہ لوگ مذہب چھوڑ جائیں گے۔

ان تمام چیزوں کے پیچھے یا تو ایک اعلیٰ ذہنی سطح کا ضدی پن ہوتا ہے، جو ان میں ایک ذہنی رویہ پیدا کرتا ہے یا ان میں کوئی نقص ذہن ہوتا ہے کہ یہ کوئی اعتدال پذیر لوگ نہیں ہوتے۔ ان کی دنیاوی خواہشات بلند و بالا ہوتی ہیں اور وہ ہر قیمت پر ان کا حصول چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک سید کرسچن ہے اور ہر آدمی کو پتہ ہے کہ جاب، منی اور امریکہ کے باعث اس نے یہ بہروپ دھار رکھا ہے۔ آپ لوگوں کو دعوت دے کر دیکھیں کہ امریکہ جانے کے لیے عیسائی ہونا ضروری ہے، تو آپ کو ہزاروں فارم بھرے ہوئے آئیں گے۔

یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سچ ان باتوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اگر ہزاروں، کروڑوں بندے بھی اس طرف کو چلے

Marfat.com

گئے، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو معاشروں کا خاصہ ہے۔ حرام بہت ہے، حلال تھوڑا ہے۔ یقین بہت کم ہے اور بے اعتباریاں بلاشبہ سارے زمانے پر مسلط ہیں۔ قابلِ غور بات ہے کہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں بڑے بڑے دانشور، جو فلسفہ اور علم الکلام پر غور کر رہے ہیں۔ کاسمیات پر تفکر اور بیالوجی اور حیاتیات پر تحقیق میں مصروف ہیں۔ جو ایٹم کا جگر چیر رہے ہیں، ان کو خدا کا کوئی ہوش نہیں۔ وہ اس کے طلب گار ہی نہیں ہیں۔ آخر کیوں؟

خدا کو مسترد کرنا بڑا آسان ہے، کیونکہ آپ کو خدا کی طلب نہیں ہے۔ جب کسی کی طلب ہی نہ ہو، تو اس کے لیے اس کو مسترد کرنا کیا مسئلہ ہے۔ آپ ان تمام فلاسفروں، سائنسدانوں اور دانشوروں کو، جو یورپ کی پوری اکیڈیمک لائف میں گذرے ہیں، ایک سائنسدان یا فلاسفر ایسا بتا دیں، جس کی کتاب میں یہ لکھا ہو کہ میں نے چودہ پندرہ برس خدا کو تلاش کیا، میں اسے مسترد کر رہا ہوں، کیونکہ میں نے اس کو کہیں نہیں پایا۔ صرف ایک بندہ بتا دیں، جس نے اتنا تردد کیا ہو۔ جس نے تلاش ہی نہیں کی، اس کے دعوے کیا معنی رکھتے ہیں۔ ایسے کسی فرد کے دعوے کو تو ہم نہیں مان سکتے، وہ چاہے رسل ہی کیوں نہ ہو۔

میرے نزدیک رسل ایک ایسا احمق ہے، جو ہر چیز پڑھ کے یقین کرتا ہے، مگر سب سے پڑھی لکھی چیز پر احمقانہ رائے دیتا ہے۔ ہم ان لوگوں کو کیسے دانشور مانیں؟ اپنے اس قسم کے رویے اور طرزِ عمل کے ساتھ ان کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ البتہ جس چیز کے پیچھے انہوں نے محنت کی، خدا نے انہیں اس کا صلہ دے دیا۔ Principia Mathematica لکھ لیا۔ رائس نے ڈبل ہیلیکس دریافت کر لی۔ فلیمنگ نے پنسلین ایجاد کر لی۔ یہ سب درست ہے۔ جو چیز انہوں نے تلاش کی، وہ ان کو مل گئی۔ انہوں نے خدا کو کب تلاش کیا کہ ان کے فیصلے ہم سن کے مانتے پھریں۔ ضروری نہیں کہ انہوں نے اسے ماننے کے لیے تلاش کرنا ہوتا، لیکن صرف ایک سٹیٹ منٹ دکھا دیں کہ ان میں سے کسی نے 22 برس اللہ کو تلاش کیا ہو اور 22 برس بعد کہا ہو کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ایسا کوئی واحد فلاسفر دنیا میں نہیں ملتا۔ ان کی بات کو کیسے قابلِ اعتبار سمجھیں۔

مجھے امریکہ کے ایک بہت بڑے استاد نے کہا کہ میں نے اللہ کو ڈھونڈا ہے، مجھے اللہ نہیں ملا۔ تمہیں اللہ کیسے مل گیا۔ میں نے اسے کہا، تم نے اسے کیسے ڈھونڈا ہے۔ اللہ حسابی تحقیق کی کوئی ضمنی پیداوار نہیں ہے۔ اسے لازماً انٹلکچوئل تجسس میں ترجیح اول ہونا چاہیے۔ اللہ اپنی جگہ پر ملتا ہے۔ وہ مخلوق سے کم تر سٹیٹس میں نہیں ملتا۔ یہ اس کی توہین ہے۔

تعلیم سے آراستہ کون

بالعموم ہر معاشرے میں اس کی ضروریات، خیالات، اس کے عزائم اور مزاج کے مطابق اس کا نصاب تعلیم متعین ہوتا ہے یا اس کے تھیسز خصوصی کمٹمنٹ کے تحت اپنے لوگوں کو تعلیم دیتے ہیں، مگر ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس انتہائی اہم شعبے کا کوئی آئیڈیل متعین نہیں ہے۔ تعلیم کے بارے میں ایک بات تو یقینی ہے کہ ہمیں تعلیم کو واضح شعبوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ ایک وہ تعلیم ہے، جسے ہم سائنسی تعلیم کہتے ہیں۔ وہ سائنسی رجحانات ہیں، جو زمانے میں پنپ رہے ہیں اور جن کے بغیر کوئی قوم بھی ترقی یافتہ نہیں ہو سکتی۔ تعلیم ہر بندے کا حق ضرور ہے، مگر اس حق کو استعمال کرنے کے کچھ تحفظات ہونے چاہئیں۔ اگر جملہ تمام لوگوں کو تعلیم کے ادوار میں داخل کر دیا جائے، تو وہ ایک ہجوم سا بن جاتا ہے، جس میں کسی انفرادی ذہانت کی شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ہم تعلیم کے دوائر مقرر کریں۔ ذہانت کی شناخت اور تشخص کے لیے کچھ ایسا طریقہ کار متعین کریں، جس سے کوئی انفرادی ٹیلنٹ آغاز ہی سے اپنی راہ پر پڑ جائے اور وہ آگے بڑھتا ہوا اس ملک کا نامور سائنسدان بنے۔

ہمارے ہاں تعلیم بعض طبقوں کے لیے مخصوص ہو گئی ہے۔ مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے لوگ اپنے بچوں کے لیے تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے بچوں کو جلد کام اور محنت پر لگا دیتے ہیں۔ بیرونی دنیا میں چائلڈ لیبر کو سخت ناپسند کیا جاتا ہے، لیکن ہمارے ملک کے والدین مجبور ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو چاہے وہ چھوٹے یا بڑے ہوں، کام پر لگا دیں۔

پھر ہمارے ہاں مذہبی تعلیم کا ایک شعور ضرور موجود ہے، بچے کچھ اور پڑھیں نہ پڑھیں، شروع میں قرآن ضرور پڑھ جائیں۔ مساجد میں یہ کام بڑی تندہی سے ہوتا ہے مگر وہاں بچوں کو قرآن حفظ کرانے کا خبط ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ بچے میں کیا صلاحیت ہے، نہ وہ ان میں رجحانات کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے حفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں، جنہوں نے قرآن یاد کیا اور بھلا دیا۔ یہ معاشرے کے لیے بدقسمتی کی بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے تمام نصاب تعلیم نہ متوازن ہیں اور نہ جدید۔ ہم لوگ لگے بندھے دھروں کے ساتھ نصاب اٹھا کے بچوں کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔ جب میں چھوٹے بچے کا بستہ اور اس کا بوجھ دیکھتا ہوں، تو یہ مجھے

Marfat.com

جلدی تھکنے والے بچے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر والدین شکایت کرتے ہیں کہ شروع میں بچے بڑے ذہین، شاندار اور اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کررہے تھے مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتے، انہوں نے تقصیر کے میلان کو ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ کلاسوں سے فرار اور والدین کا حکم ماننے سے اجتناب ہے اور وہ ان کے احکام ماننے کی منشا کے خلاف بہت زیادہ ردِعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

تیسرے نمبر پر مجھے مغربی طرزِ تعلیم سے مکمل طور پر اختلاف ہے۔ مغربی طرزِ تعلیم سے میں نے آج تک کوئی بڑی شخصیت اٹھتی نہیں دیکھی، جو ملک کے مفاد کی خاطر کام کرسکتی ہو۔ اس میں جتنا بھی سیکولر ماحول ہے، اس سے آزاد روی اور غیر وابستگی کا طرزِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ میں پیدا ہوتے ہی بچوں کے سرہانے امریکی جھنڈا رکھتے ہیں۔ تمام عرصہ ان کو امریکن ازم کا ابلاغ دیتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ بڑے ہوتے ہیں، تو وہ اپنے ملک پر فخر کرتے اور اس کے محافظ بن جاتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں ہمارا یہ حال ہے کہ ہمارے سکولوں میں اپنے ملکی تشخص کی تعلیم کو باعث شرم سمجھا جاتا ہے۔ مذہبی تعلیم سے اختلاف کو اپنے دانشورانہ معیار کا مظہر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ احمقانہ طرزِ عمل ہماری پوری سوسائٹی کے لیے تخریب کاری کے مترادف ہے۔ یہ تخریب کاری کسی کو نظر ہی نہیں آرہی۔ اس سے ہم نہ صرف مذہب کو کھورہے ہیں بلکہ ہم ہر قسم کی اس کمٹمنٹ سے بھی محروم ہورہے ہیں، جو مسلمان کے دل میں پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ ایک ایسا زہرِ قاتل ہے، جو تعلیم کے ذریعے ہمارے بچے کے دماغ میں جارہا ہے۔

مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ ماں باپ کو اگر آپ نالائق ترین بچہ بھی دے دیں، مگر وہ انگریزی بول سکتا ہو، تو وہ سمجھتے ہیں کہ مقصدِ تعلیم پورا ہوگیا۔ یہ وہ شدید ترین احساس کمتری ہے، جس کے زیرِ اثر یہ لوگ انگلش سکولوں کو کم نہیں کر رہے بلکہ بڑھا رہے ہیں۔ ان کے کورسز مشکل ہیں۔ بعض اوقات پروفیشنل سکول بڑی اچھی تعلیم بھی دے سکتے ہیں اور دے رہے ہیں، مگر تعلیم کے مقاصد میں جو بنیادی مقصد خیال ہونا چاہیے، کہ تعلیم اپنے ملک، معاشرے یا کائناتی مقصد کے کسی کام آئے، وہ یہ لوگ نہیں کررہے۔ بلکہ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ہر تعلیم یافتہ لڑکا امریکہ اور یورپ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نظامِ تعلیم کے ذریعے گویا ہم پاکستانی نہیں، بلکہ امریکی، برطانوی اور یورپی شہری تیار کررہے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ ان تعلیمی اداروں نے ایک ٹھیکے کے تحت مغربی ممالک کے وفادار طالب علم تیار کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔

ہمارے ہاں مذہبی تعلیم اس سے بھی زیادہ ناقص ہے۔ مذہبی تعلیم کے نام پر جو پیٹرن دیا جاتا ہے، اس میں احساسِ کمتری ہے۔ ایک طرف مغربی تعلیم حاصل کرنے والا بچہ شاندار ماحول میں اور اچھے میز پر بیٹھتا ہے۔ ایک نفیس ٹائپ کی استانی یا سمارٹ استاد سے سبق پڑھتا ہے اس کے برعکس ایک دوسرا بچہ مٹی پر بیٹھا جوتی اور مار کے خوف سے حفظ کر رہا ہے یا پڑھ رہا ہے اور چوروں کی طرح سوچ رہا ہے کہ کس طرح اس تعلیم کو چھوڑ کر یہاں سے فرار کی راہ اختیار کرے۔ وہ مذہبی تعلیم کا کوئی معیار قائم کرنے میں معاون نہیں ہوسکتا۔

از غلام لذت قرآں مجو
گرچہ باشی حافظ قرآں مجو

ان بچوں کا اس مقصد کے لیے استحصال کیا جاتا ہے کہ وہاں آپ کو اچھی روٹی ملے گی۔ ان کے ذہن میں آتا ہے کہ مذہب شاید ہے ہی بھیک مانگنے کے لیے۔ اس سے ان میں ایک آزاد اور مضبوط مسلمان کی شخصیت پیدا نہیں ہوتی۔ میں قنوطی نہیں ہوں کہ پاکستان میں ہر قسم کی تعلیم سے اختلاف کر رہا ہوں۔ لیکن زیرِ نظر تعلیم میں درجہ بندی تو ہو سکتی ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ کمتر سے بہتر تعلیم کے درجات مقرر کریں۔ جب تعلیم کی ماہیت جگہ جگہ تبدیل ہو جائے گی، تو اس تعلیم سے آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ ہمارے حکمران یا سیاستدان تعلیم ہی کی بات کریں گے، لیکن اپنے بچے چاہیں گے کہ وہ امریکہ کے شہری بنیں، انہیں مغربی تعلیم حاصل ہو، یہی حال فوجیوں اور سویلین بیوروکریسی کا ہے۔

سو ایک ایسی بے حسی ہمارے نظامِ تعلیم اور محکماتی تعلیم پر طاری ہے کہ آئے روز یہی جھگڑا پڑا رہتا ہے کہ آج اسلام کتاب میں سے نکل گیا، آج اسلام آ گیا۔ کچھ مجرمانہ ذہنیت کے لوگ ہر وقت یہ اور وہ کی سازش کرتے رہتے ہیں۔ یہ اس قسم کی حرکتوں کے حوالے سے پیشہ ور قسم کے لوگ ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ یہ صرف ایک اکیلے بڑے ذہن اور دماغ کا کام ہے۔ پورے نظامِ تعلیم پر نظرِ ثانی ہونی چاہیے اور ہمیں ایک مقصد، ایک امیج اور ایک تخلیقی مقصد کے تحت پورا نظامِ تعلیم چلانا چاہیے۔ اس میں کوئی بنیادی فرق یہی ہو سکتا ہے کہ سائنسی تعلیم کے لیے ذہین بچوں کو موقع دینا چاہیے۔ انہیں آگے بڑھانا چاہیے مگر مناسب کمٹمنٹ کے بغیر نہیں۔ کمٹمنٹ کا حصہ دونوں تعلیمات میں برابر ہونا چاہیے۔ اگر آپ خواندہ لوگ چاہتے ہیں، تو میٹرک یا ایف اے کے بعد آپ بچوں کو ٹریڈ ایجوکیشن کی سہولت فراہم کریں۔ اس کے بعد یہ جائز نہیں ہے کہ آپ یونیورسٹیوں اور کالجوں کو لاکھوں اور کروڑوں لوگوں سے بھر دیں بلکہ آپ ان کو پڑھنے لکھنے کے ساتھ کام کے قابل کیجیے۔ ملک میں پروفیشنلز کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں ہے کہ ملک کو کتنے انجینئرز اور کتنے ٹیکنیشنز اگلے برسوں کے لیے چاہئیں۔ انتہائی نالائق لوگ ڈیٹا مرتب کرتے ہیں۔ پبلک کے سامنے جھوٹ بولنے کے ذمہ دار ہیں اور صبح و شام بڑی ترتیب سے جھوٹ بولتے ہیں۔ سیکولر ایجوکیشن کا ایک بڑا نقص یہ نکلا ہے کہ ہر حکمران نے اپنے لیے طے کر رکھا ہوتا ہے کہ میں نے غیروں کے سامنے سچ بولنا ہے، جبکہ اپنوں کے ساتھ جھوٹ بولنا ہے یہ اسی تعلیم کا اثر ہے۔

میں اپنی بھی تعلیم پر غور کرتا ہوں۔ ہم ٹاٹ سکولوں کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ہمیں کوئی ایسی برائی لگتی نہیں تھی۔ مگر اس وقت ایسے کوئی تقابل بھی موجود نہیں تھے۔ ایک ہی طرح کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ 1940ء اور 1950ء کی دہائیوں میں جس طرح ہم نے تعلیم حاصل کی، اسے میں برا نہیں کہوں گا۔ اس وقت دستیاب ذرائع وہی تھے۔ اب لوگ ہر بچے کو انجینئر اور ڈاکٹر تو بنانا چاہتے ہیں، میں نے یہ نہیں دیکھا کہ کوئی والدین اپنے بچے کو اچھا مسلمان بھی بنانا چاہتے ہوں۔ حالانکہ اچھا مسلمان بننے میں ڈاکٹری اور انجینئرنگ کے دونوں پیشے شامل ہو جاتے ہیں مگر وہ بنیادی ترجیحات نہیں ہیں۔ استاد اتنا بے وقار ہے کہ وہ پڑھانے کی بجائے اپنی بے وقاریت کا انتقام بچوں سے لیتا ہے۔ اس کی اس معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کوئی مقام اور احترام نہیں ہے۔ وہ ایسا مجبور ہے کہ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ہاتھوں ذلیل اور رسوا ہوتا ہے۔ اس پیشے کا بالائی لوگوں، سروسز اور حکومتوں میں اتنا عدم احترام ہے کہ ایک ٹیچر کو وہ عزت حاصل نہیں ہے جو اسے حاصل ہونی چاہیے اور میرا نہیں خیال کہ جو قوم اپنے استادوں اور اپنے بچوں کو وقار اور عزت نہیں دے سکتی، اس قوم کا کوئی

Marfat.com

مستقبل ہوسکتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا خلا ہے۔ پھر بھی ہمارے لوگ وطن پرست اور خدا پرست نکل آتے ہیں، تو یہ محض اللہ کا کام اور نوازش ہے۔ اس میں اس سلسلہ تعلیم کا قطعاً کوئی حصہ نہیں۔

تعلیمی پالیسی کیسی ہو؟

ہم سب لوگ اس قدر تنگی واقع ہوئے ہیں کہ شاید میری تنہا رائے اتنی اہم خیال نہ کی جائے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ لوگ اپنے انداز فکر، خیال اور منصب کو سمجھیں اور اپنے مسائل کو دیکھیں۔ اس وقت مجموعی طور پر ملک میں اپنے مسائل کو سمجھنے کا ایک مکمل بحران ہے۔ ہمیں ہر اشارہ کسی صاحب اقتدار سے ملتا ہے۔ ہم اسی کی پیروی کرتے ہیں اور اسی کو بہترین پالیسی کہتے ہیں۔ بہت سی تعلیمی پالیسیاں اس ملک کے مزاج اور اس سرزمین سے مطابقت ہی نہیں رکھتیں مگر جو صاحب اقتدار ہے، وہ اپنے ہی تصورات کا شکار ہے اور وہ چاہ رہا ہے کہ آپ اس کی پیروی کریں۔ نہ صرف اس کی پیروی کریں، بلکہ اس کی تعریف و توصیف میں تمام ذرائع ابلاغ کو مات بھی کر دیں۔ اس قسم کے طریقہ کار سے ہمارے ہاں تبدیلیاں نہیں آئیں گی۔ یہ کسی فرد واحد کا کام نہیں، نہ یہ سیمینارز کا کام ہے۔ بلکہ وہ ماہرین تعلیم جن کے پیچھے تجربہ ہے، ان نوجوان ماہرین تعلیم کے ساتھ مل کر جو دور حاضر کے تقاضے سمجھتے ہیں اور جن کے رجحانات ملک اور دین کی طرف مستحکم ہیں، مشترکہ تعلیمی پلان تیار کریں۔

اگر مجھے کہا گیا، تو میں اس میں غیر معاون رویہ اختیار نہیں کروں گا، نہ اپنے لیے اختیارات استعمال کروں گا۔ ہم لوگ بالعموم صورتحال کو ملکی، اخلاقی اور نظریاتی نقطہ نظر سے نہیں، بلکہ اختیارات کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کا بھی ہے، جو نظریات کا بہت پرچار کرتے ہیں اور جن کے مضامین اور تنقید سے اخبارات بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہمیں تنقید کا پہلو کچھ گھٹانا ہوگا اور تعمیری و نظریاتی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہوگا۔ یہ کام ماہر اساتذہ اور ماہرین تعلیم ہی کر سکتے ہیں۔ تاہم ہمیں یہ احتیاط ضرور ملحوظ خاطر رکھنی ہوگی کہ ہم ایک نیا نظام تعلیم اور نصاب مرتب کریں جس کے تمام پہلو ہماری نظر میں ہوں۔

مثلاً میرے خیال میں قرآن پڑھانے کا موجودہ طریقہ کوئی طریقہ تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ پانچویں یا آٹھویں جماعت تک قرآن ناظرہ ہر قیمت پر پڑھایا جانا چاہیے۔ اس کے بعد دسویں تعلیم تک اس کا ترجمہ ہر کلاس کے لیے ختم کرنا لازم ہو۔ اس کے بعد بھی قرآن کو ایک ایسا لازمی اسلامیات کا مضمون ہونا چاہیے، جو آگے جا کے قرآن، حدیث، اسوۂ حسنہ اور دوسرے پہلوؤں کی وضاحت کا احاطہ کرے۔ اس سے مجموعی طور پر ایک مذہبی کلچر پیدا ہوگا۔ اس وقت کلچرل مذہب مساجد میں پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ مساجد میں چند طالب علم ہیں، جن کی اوسط ان طالب علموں کے مقابلے میں بہت کم ہے، جو عمومی سکولوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہے ہیں۔

سب سے بڑا ہمارا مسئلہ مذہب کے بارے میں یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں جو تجسس پایا جاتا ہے اور سوالات ہیں، ان کے جوابات نہیں ہیں۔ ہمیں ایسے لوگ اور اساتذہ تیار کرنا ہیں، جو ہر سطح پر ان کے تجسس کا مداوا کرسکیں۔ اس وقت زیادہ تر تجسس جدید علوم اور جدید تصورات میں سے ابھر رہا ہے اور سائنسی ایجادات میں سے برآمد ہو رہا ہے۔

Marfat.com

اگر ہم اپنے مذہب کو جامع اور حتمی تصور کرتے ہیں، تو یقیناً اس مذہب میں تمام وضاحت طلب جواب اور باتیں موجود ہیں۔ جدلیات کی اللہ خود تائید کرتا ہے وجادلھم بالتی ھی احسن اور ان کے ساتھ ایک اچھی بحث کرو۔ مگر ایک اچھی بحث کرنے والے اساتذہ کو بھی اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ موجودہ اور جدید آلات تعلیم سے واقف ہوں اور ماضی بھی ان کے پاس ایک خوبصورت اور معتبر روایت کی طرح زندہ ہو۔ تب جا کے مذہبی تعلیم کے رخ استوار اور درست ہوں گے۔

اس کے ساتھ ہمارے جتنے بھی کورسز ہیں، ان میں کچھ عملی پہلو ہونے چاہئیں۔ مثال کے طور پر کالج اور سکولوں کی سطح پر ہم سائنسی تعلیم محض زبانی تعلیم کی صورت میں پاس کر رہے ہیں یا ان کو سادہ سی مساوات سکھا رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی عملی تجربہ گاہیں ہر جگہ ہونی چاہئیں، جہاں لڑکے تھوڑے سے جوش و جذبے کے ساتھ اپنے تجربات کو نئی صورت دے سکیں۔ ہم یورپ کی مثالیں تو دے دیتے ہیں، مگر یورپ میں تقریباً ہر گھر میں ایک ورکشاپ ہے جبکہ ہمارے بہترین سکولوں میں بھی ورکشاپس نہیں ہوتیں۔ ہمیں ہر قسم کی ورکشاپیں تیار کرنی چاہئیں۔ پریکٹیکل ورکشاپس، سیمینارز وغیرہ۔

ہمیں طلباء کے اندر عملی رجحات کو پروان چڑھانا چاہیے تاکہ وہ شروع سے ہی اپنے تعلیمی نصاب کو عملی نصاب کی حیثیت سے بھی دیکھیں۔ اس سے بچے کی بے ہمتی، توجہ کی کاہلی اور مشرق و مغرب کے درمیان موجود خلا کم ہوں گے۔ لوگ ذہنی، فکری اور عملی طور پر پروگراموں میں شرکت کریں گے اور سکول اور کالج محض گپیں ہانکنے کے ادارے نہیں رہیں گے۔ بدقسمتی سے موجودہ وقت ہمارے پوسٹ گریجویٹ لیول پر بھی مذہبی اور سماجی میدانوں میں بڑے بچگانہ اور سادہ لوحی پر مبنی سوالات ہوتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا خلا ہے، جس کو پر کرنے کے لیے ایک ملک گیر سطح کی مشاورت ہو۔ اس میں دوسرے ممالک کی مشاورت بھی شامل ہو سکتی ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کے لیے پاکستانی اور مسلمانی نصاب تیار کرنا چاہیے اور یہ کسی ایک آدمی کا کام نہیں۔

دینی تعلیم، نہج اور سطح

پوسٹ گریجویشن تک اسلام چلنا چاہیے کیونکہ لوگوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اسلامیات نصاب نہیں ہے اور یہ بطور نصاب پوسٹ گریجویشن اور نوکری کے لیے نہیں ہے۔ اسلامیات ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ اسلام ہماری اپروچ، ہماری پوری زندگی پر ایک مکمل ناقدانہ نظر ہے۔ اسلام انتہائی ترقی یافتہ مذہب ہے بلکہ میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت زمانہ ابھی وہاں تک نہیں پہنچا، جہاں تک اسلام اور اللہ کی نظر ہے۔ وہ تو کائنات ختم کر کے اور قیامت کی خبر دے کے بیٹھا ہوا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خدا بیچ کی تبدیلیوں سے بے خبر ہے۔ یہ انہی احمقوں کا خیال ہو سکتا ہے، جو اپنے آپ کو جدید تر سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان کا عہد زمانوں کے توسط سے کاٹ لیا گیا ہے۔ کیا انسان اکیسویں صدی میں اتنی ترقی کر گیا ہے کہ خدا کو اس کے امکانات کا علم نہیں تھا یا خدا اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے کہ وہ جدید تر تبدیلیوں کو سمجھ نہ سکے۔ اس قسم کے جاہلانہ خیالات کو اس وقت ہی روکا جا سکتا ہے، جب آپ خدا کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ آپ نے قرآن کو اچھی طرح پڑھا ہو اور نصاب اسلام سے اچھی طرح واقف ہوں۔

میرے خیال میں پہلی کلاس سے اسلام کی تدریس شروع ہونی چاہیے اور پوسٹ گریجویٹ لیول تک یہ لازمی

Marfat.com

نصاب کے طور پر جائے۔اس نصاب میں رفتہ رفتہ پیش رفت ہو۔جیسے ناظرہ اور ترجمہ ہے۔اس کے بعد احادیث اور فقہ کو اس میں شامل کیا جائے۔زمانے کے جدید مسائل کو گریجویشن کی سطح پر زیر بحث لایا جائے۔پوسٹ گریجویٹ سطح پر آپ فقہی مسائل کو در آمد کر سکتے ہیں اور ان پر ایک سیر حاصل بحث کر سکتے ہیں۔

اسلام کو کم تر حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ایسا کریں گے،تو ذلیل وخوار ہو جائیں گے۔زمانے میں خاسر و خائب ہوں گے۔اس کو ہماری ہر تعلیم کے انجام تک جانا چاہیے۔تبھی آپ دین کی ایک صحیح تعلیم دے سکیں گے اور دین سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔اس طریقہ تعلیم سے جس پر ایک عمومی اور جاہل مولوی کی گرفت ہے،وہ بھی ختم ہو جائے گی اور ہمارا ہر بچہ جو کسی سکول میں داخل ہوگا،وہ امامت کے قابل بھی ہوگا۔آپ کو امام ڈھونڈنے کے لیے مدرسوں میں جانا نہیں پڑے گا۔

اس کے پاس جو بے یار ومددگار مسجد میں بیٹھا ہوا ہے۔اپنے معاملات میں کھویا ہوا اور اپنے لیے طاقت اور عروج کے خواب دیکھ رہا ہے۔اکٹھے چلنے کی صورت میں آپ صحت مند اثرات کی طرح چلیں گے اور نمایاں ہوں گے۔تب بچوں کو نیچرل اسلام کی تعلیم ملے گی۔ان کو علیحدہ کریں گے،تو یہ ساری تعلیم عطائیوں کے ہاتھ میں آ جائے گی۔

اس وقت یہی کچھ ہو رہا ہے۔دیو بند سکول نے مختلف گھروندے بنائے ہوئے ہیں۔کبھی آپ کو جھنگ نظر آتا ہے،تو کبھی کئی اقسام کے جیش بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ان چیزوں کا اسلام میں کوئی وجود نہیں۔اسلام میں ایک امت اور ایک خیال ہے۔ایک کمٹمنٹ اور ایک تحریک ہے اور جب ایک محرک سے کوئی تحریک شروع ہوتی ہے،تو اس میں امریکہ نہ انگلینڈ کوئی چیز بھی وجود نہیں رکھتی۔پھر ہم سب کو پتہ ہوتا ہے کہ ہم نے موقع پر کیا کرنا ہے۔خدا ہم سے کیا چاہتا ہے۔ہم سے ہمارا معاشرہ اور ہمارا اسکول ہم سے کیا تقاضا کرتا ہے۔مجھے پورا یقین ہے کہ اسلامی اور دینی تعلیم ابتدا سے لے کر ایم اے تک تواتر کے ساتھ ہر طالب علم کے ساتھ رہنی چاہیے۔

آزادی نصاب وتعلیم

اس کا گلہ قوم کو نہیں دیا جا سکتا۔اس کا گلہ ان احمق حکمرانوں کو دے سکتے ہیں،جنہوں نے اختیار ملک کے لیے نہ عوام کے لیے ڈھونڈا بلکہ ان کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی اقتدار اور خیال کے لیے اور اپنے آپ کو مستحکم کرنے کے لیے غیروں کی امداد سے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔یہ کوئی آئیڈیل صورتحال نہیں ہے۔پانچویں تک اگر حساب لازم ہے اور میٹرک تک انگریزی بھی لازم ہوتی تھی،تو میرے خیال میں ایک مضمون کو لازم کر دینا اتنا دشوار عمل نہیں تھا۔مشکل صرف اتنی ہے کہ ہماری کسی کی کمٹمنٹ اللہ اور رسولؐ کے ساتھ نہیں ہے۔اپنے اپنے مقاصد کے ساتھ ضرور ہے۔ہر طرف یہ شور برپا ہے کہ معیشت بگڑ گئی ہے۔معیشت بہتر کی جائے۔معیشت میں مدد چاہیے۔اگر کل آئی ایم ایف آپ سے کہے کہ آپ کی ظہر اور عصر کی نمازیں کار آمد نہیں ہیں اور یہ اقتصادی نظام میں خلل ڈالتی ہیں،تو کیا آپ ان کو چھوڑ دیں گے؟ اور پرسوں آپ کو کہیں کہ حج بے مقصد اور ضیاع وقت ہے اور قربانی نامناسب اور خطرناک ہے،تو کیا اس کو بھی آپ ترک کر دیں گے۔

Marfat.com

اگر آپ اتنے ہی گر گئے ہیں، تو پھر اسلام کا نام لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کھلے طور پر یہ اعلان کر دیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں بلکہ اپنے نام ترک کر دیں اور اپنا تشخص بدل دیں، لیکن یاد رکھیں، اللہ کا دین پھر بھی غالب ہے۔ ان ہزاروں بچہ سقہ کی حکومتوں سے اللہ کا نظام نہیں ٹوٹ سکتا۔ جب میں خدا کی بات کرتا ہوں، تو میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے آپ کو بزدل محسوس نہیں کرتا۔ میں اپنی زندگی کے تحفظات کے لیے بزدلی برت سکتا ہوں، مگر جہاں خدا اور رسول کا معاملہ ہے، میرے ذہن میں جارحیت ہے نہ استعداد ہے۔ نہ میں سمجھتا ہوں کہ زمین و آسمان میں کوئی شخص خدا کی مرضی کے درمیان حائل ہو سکتا ہے۔ یہ جتنے بھی پروگرام اپنے استحکام کے لیے بنا رہے ہیں، اللہ کے ہاتھ میں ایک پل کی ان کی میعاد نہیں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص خدا اور رسول کی خواہش کے خلاف لڑ سکتا ہے۔ خداوند کریم کہتا ہے کہ تم میں جتنے بھی آسیب اور وسوسے ہیں، یہ تارِ عنکبوت یعنی مکڑی کے جال ہیں۔ لوگ اپنے گرد اور اپنی قوم کے گرد بھی بنتے ہیں۔ پاکستان ان مکڑی کے جالوں میں پھنسا ہوا ہے اور خدا کہتا ہے کہ حق ایک پتھر کی طرح آتا ہے اور وہ سارے جالے توڑتا ہوا نکل جاتا ہے۔

مگر لوگ میری بات کیسے تسلیم کریں گے؟ وہ خدا کی بات ماننے کو تیار نہیں۔ وہ اس کے مقابلے میں امریکیوں کو زیادہ مانتے ہیں۔ آج کی خبر کے مطابق دنیا کی طاقتور قوم اپنے بارہ بندے چھڑانے کے لیے خوست سے پیچھے ہٹنے پر آمادہ ہوئی۔ کیا یہ وہی طاقت ہے، جس کے بل بوتے پر وہ ساری دنیا کو ڈرانے نکلے ہیں؟ اس کا مطلب ہے کہ اس قسم کا ایک اور دھما کہ اس پوری قوم کو اتنا نروس کر دے گا کہ یہ اپنے سایوں سے بھی گھبرائے گی۔

کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے اور کوئی بھی شخص خدا سے نہیں لڑ سکتا۔ خدا تو کہتا ہے کہ تم مجھے چیلنج کرنا چاہتے ہو، سوائے اس کے کہ اپنے آپ کو پھانسیاں لگا لو یا خودکشی کر لو، تمہارے پاس کوئی اور چارہ نہیں رہے گا۔ میں اس صورتحال سے خوفزدہ نہیں ہوں، نہ ہی میں غیر ملکی آرا کے سیلاب سے مرعوب ہوں۔ غیر ملکی کسی بھی رائے یا کلچر میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ مستحکم ہو۔ کوئی بھی کلچر اس وقت دنیا میں مستحکم کلچر نہیں ہے۔ عارضی فیز کا کلچر ہے، حرکت پذیر کلچر ہے، از خود ہی ان میں بحران پیدا ہوتے ہیں اور خود ہی وہ اپنے آپ کی نفی کرتے چلے جاتے ہیں۔ کسی بھی دوام کے خلاف کوئی کلچر دو چار دن کا ہیجان تو پیدا کر سکتا ہے مگر اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے، جو پچھلے پندرہ سو برس سے ان ہیجانات کو ایک ایسے بزرگ کی طرح دیکھتا ہے، جس کی گود میں بچے کھیل رہے ہوں اور وہ مختلف شرارتیں کر رہے ہوں۔ یہ اتنا وسیع طاقتور اور بلند حوصلے والا نظریہ ہے کہ پچھلے پندرہ سو برس سے ہر فتنے کو دیکھتا چلا آیا ہے۔ ہمارے مذہب کو ان بونا صفت انفرادی نظریات سے لڑنے کا بہت تجربہ ہے۔ ان کا اور اسلام کا کوئی میچ نہیں ہے۔ میں ایمانداری سے آپ کو کہہ رہا ہوں کہ کوئی نظریہ خدا اور رسول کے نظریے سے طاقتور نہیں۔

البتہ اگر آپ آدھے نظریے سے لڑیں گے، تو آپ کارکردگی نہیں شو کر سکتے۔ اگر آپ اسلام کو صرف عقیدہ کی حد تک پیش کریں گے اور اسلام کا داخلی تشخص، اقدار، مابعد الطبیعیات اور اس کی بالائے نفسیاتی طاقت اس کے ساتھ نہیں ہوگی، جو خدا اور رسولؐ کے توسط سے ایک فرد کو حاصل ہوتی ہے، تو پھر آپ ایک بیکار کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ جنگ مولوی نہیں، صرف مسلمان لڑ سکتا ہے۔

Marfat.com

سکول آف ایکسی لینس

میں ان کے نظام تعلیم پر پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ ان کا نظام دنیوی، ارزل اور غیر مہذبانہ لگتا ہے۔ دو چیزوں کا فرق ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے، جو غلطی سے گڈمڈ ہو کے ہمیں مشکل میں ڈالتی ہیں۔ ایک تو ہم مولوی کے کلچر کو اسلامی کلچر سمجھتے ہیں۔ یہ حماقت کی بات ہے۔ اسلامی کلچر کی مولوی کو ہوا بھی نہیں لگی۔ ایک طرف وہ مذہب ہے، جس نے دنیا کو اعلیٰ ترین اقدار دیں، جو اس وقت مشرق و مغرب میں موجود ہیں۔ یہ سب ہمارے مذہب سے اثر پذیر ہیں۔ وہ قرطبہ سے مغرب میں آئی ہوں۔ قسطنطنیہ سے اس عظیم تہذیب کی ضمنی پیداوار ہیں، جس کے ذریعے سے یورپ کو کلچر کی پہلی ہوا لگی ہے۔ یہاں آپ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ تحریک اصلاح مسیحیت واحیائے علوم، جو یورپ میں شروع ہوئی، یہ براہ راست قسطنطنیہ کے سقوط کا نتیجہ ہے، جس کے بعد وہاں سے مسلمان حکماء کی کتابیں چلیں۔ خیالات کو وسعت ملی اور یہ آگے بڑھ گئے۔ ہم چونکہ اپنے علماء کے کام کو آگے نہیں بڑھا سکے، ہم زوال پذیر ہو گئے اور وہ ہم سے بازی لے گئے۔

تب ہمارے کلچر کا یہ عالم تھا کہ جب ہارون رشید نے فرانس کے بادشاہ شارلیمن کو گھڑی بھیجی، تو میرا نہیں خیال کہ آج بھی آپ کو اتنی خوبصورت ایجاد کہیں نظر آئے۔ مذکورہ گھڑی میں بارہ گھنٹوں میں ایک دروازہ کھلتا تھا۔ ہر گھنٹے بعد ایک شاہسوار باہر نکلتا اور بگل بجاتا تھا۔ یہ مکینیکل انجینئرنگ کی بڑی کلاسیکی مثال ہے۔ اس وقت بادشاہ کے سب درباری خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے کہ یہ کوئی جادوگری آ گئی ہے۔

وہ مکینیکل انجینئرنگ آگے نہیں بڑھی۔ مسلمان حکماء، سائنسدان اور حکمران فتوحات میں مگن ہو گئے۔ ذاتی اقتدار و اختیارات میں چلے گئے۔ حکومتیں زوال پذیر ہوئیں، اہل یورپ انہی تجسسات، جو انہیں مشرقی ایشیا سے نصیب ہوئے، اٹھا کے بات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن روبہ انحطاط مطالعے میں چلا گیا۔ ان مفسرین اور مقدسین کے ہاتھوں میں چلا گیا، جنہوں نے اسے مقامی خانقاہی انداز میں گروپوں کی صورت میں پڑھانا شروع کیا۔ عالمگیر وسعت چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں بٹ کے رہ گئی۔ اس کے ساتھ وہ کلچر بھی جاتا رہا۔ مسلمان ذہن کی فراخی جاتی رہی اور اس کے ساتھ اس کا رویہ، قوت اور شان و شوکت بھی ہوا ہو گئی۔

ہمیں پیچھے مڑ کے دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پیچھے مڑ کے وہ دیکھتا ہے، جس کے اثاثے پلٹ نہ سکیں۔ یہ نہیں ہے کہ آج قرآن نہیں ہے، کل قرآن بھی تھا۔ قرآن تو ہر زمانے میں اسی عزت و حرمت کا مالک ہے اور وہی کتاب ہے، جو پہلے تھی، سو اب بھی ہے۔ اب بھی قرآن کو پلٹ جانے سے ہم اس نصاب کو پا سکتے ہیں اور اسی رویے اور کلچر کو حاصل کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں اپنے چرچ کو ختم کرنا ہو گا۔ چرچ ہمیشہ ایک ملکیتی اور خبطی رویے کا مالک رہا ہے۔ ہم اس چرچ کو ختم کر کے انہی تعلیمات کو فراخدلانہ اپنے بچے بچے تک اکیڈیمک ذرائع سے پہنچائیں۔ ان کو غور و فکر پر آمادہ کریں۔ اس وقت تو عالم یہ ہے کہ آپ مذہب کے خلاف سوال نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہ لوگ نہیں ماننا چاہتے، لوگ جواب چاہتے ہیں۔ جب آپ کے پاس جواب نہیں ہے، تو لوگ یہ نہیں کہیں گے کہ مولوی کے پاس جواب نہیں، وہ سمجھیں گے کہ اسلام کے پاس جواب نہیں، کیونکہ ہم نے بدقسمتی سے اپنی نمائندگی اس نالائق کو دی ہوئی ہے۔

Marfat.com

میرا یہ مطلب نہیں کہ مولوی کا وجود ختم ہو، سب مولویوں کو رکھ لیں ان سے سکولوں میں تعلیم دلوائیں۔ وہ اپنی نوکری دیں۔ بچے ناظرہ تک ان کے ساتھ چلیں۔ دسویں تک بچوں کو پڑھائیں اور ان کے بعد آپ بہتر استادوں کو چنیں۔ ان میں سے جو اچھے استاد آگے بڑھ سکتے ہوں، ان کو آگے بڑھائیں مگر چیزوں کو لازماً منطقی طور پر آگے بڑھنا چاہیے۔ جیسے لیکچرر سے پروفیسر تک بات جاتی ہے۔ چیزوں کو ایسے دانشوروں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، جو اپنی ابتر تقسیم کو خود ختم کر سکیں اور اختلافات طبعی سے نکل کر اور سوال و جواب کے بحران سے آگے مستحکم عقیدے کے ساتھ کمٹ منٹ کرنے والے ہوں یا کر چکے ہوں۔ وہی ان باتوں کا جواب دیں گے۔

اسی لیے قرآن حکیم نے کہا کہ متشابہات کا جب شور پڑ جائے، اور تیرے ذہن میں اندیشے لاحق ہو جائیں تو ہر ایرے غیرے کے پاس نہ جانا۔ ان کے پاس جواب نہیں ہوں گے۔ **والرسخون فی العلم یقول کل من عند ربنا** پھر علم میں راسخ لوگوں کے پاس جانا **فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون** پھر اگر تم انہیں نہیں جانتے ہو، تو ان اہل ذکر کے پاس جانا، جو علم بھی رکھتے ہیں۔ یہ اہل ذکر کون ہیں؟ یہ وہ نہیں ہیں، جو خالی تسبیح لیے پھرتے ہیں یا خالی خانقاہوں میں محرابوں کے نیچے اپنے آپ کو بند کیے بیٹھے ہیں۔ یہ وہ راخون ہیں، جنہیں قرآن کہتا ہے **والذکر اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السموٰت والارض**، جو صبح و شام، دوپہر اپنے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی تخلیقات پر غور کرتے ہیں۔

خدا کے بندے کے پاس دو ڈیٹا ہیں۔ He accomplishes his feelings with the God, and he accomplishes his education with the world.

(وہ اللہ کے ساتھ اپنے احساسات کی تکمیل کرتا ہے اور دنیا کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کرتا ہے) یہ لوگ ہیں۔ جو آگے چل کر پڑھائیں گے۔

میں بھی اس عظمت خیال کا ایک خوشہ چیں اور دریوزہ گر ہوں، جو اللہ اور رسولؐ کی ہے۔ مجھے کسی بھی کلچر، سماجی نظریئے یا مغرب سے آنے والے کسی بھی بھاری بھر کم خیال کے مقابلے میں، کسی دلیل کے حوالے سے، کبھی کوئی تہی دامنی کا احساس نہیں ہوا، نہ مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہوئی ہے۔ میں آپ کو یقین سے کہہ رہا ہوں کہ میں کبھی کسی مغربی فلسفے یا نظریئے سے مرعوب نہیں ہوا۔ یہ کوئی ارتجاعی بیان نہیں ہے، اس لیے کہ میں پہلے سے اللہ اور اپنے رسول سے متاثر تھا۔ عقلاً، ذہناً اور اخلاق کے اعتبار سے اور تعلیم اور اس کے رویئے کے لحاظ سے متاثر ہوا۔ مجھے اس میں سے کوئی اتنا بڑا مفکر نظر نہیں آتا، جو اس تعلیم کے امیج کو ختم کر سکے۔

میں اس کے باوجود ان سے حسد نہیں کرتا۔ آج بھی اگر یورپ کے کسی مفکر نے اچھی بات کی ہے، تو میں اسے اپنا اثاثہ علمی سمجھتا ہوں۔ اس میں حسد کا کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ تو صرف علم کو شیئر کرنے والی بات ہے، ادھر سے آئے یا ادھر سے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ خدا کے بارے میں مجھے علم نہیں دیں گے مگر وہ مجھے خدا کی زمین اور کائنات کے بارے میں تو علم دے سکتے ہیں۔ مجھے ان سے دبنے کی ضرورت ہے نہ ذہن میں اتنا کمتر، رسوا اور ذلیل محسوس کرنے کی ضرورت ہے کہ جب بھی آپ کی آنکھ کھلے، آپ پر یورپ کی سیادت کا پردہ اس طرح تنا ہوا ہو کہ آپ اپنے آپ کو کوئی دلہن کی طرح سمجھنے

Marfat.com

تلکیں۔ جس کا پتہ نہیں، کتنا جابر خاوند پہلی مرتبہ اس کے پاس آ رہا ہوتا ہے۔

میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارے لوگوں کی آنکھوں میں یورپ کا نام سنتے اور ان کی درسگاہوں کا ذکر کرتے ہوئے عجیب سے ستارے چمک اٹھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان درسگاہوں سے نکلا کیا ہے؟ ان درسگاہوں سے نکل کے سارے لوگ سائنسدان تو نہیں ہو گئے۔ کسی اکیلی جگہ پر کوئی ایک اکیلا شخص وہاں بھی تخلیقی کام کر رہا ہے۔ کوئی سویڈن میں ہے، تو کوئی ہالینڈ میں بیٹھا ہوا ہے۔ کوئی انگلینڈ اور کوئی امریکہ میں کام کر رہا ہے۔ بات پھر انہی اکیلے افراد تک جائے گی، جو علم و عرفان کی تلاش میں رات دن ایک کئے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی سیلاب کی بات نہیں ہے کہ پورے سلسلہ تعلیم میں جاری ہو۔ ہمارے کتنے لوگ مغربی تعلیم سے نکلتے ہیں، جنہوں نے آگے بڑھ کر ملک وملت کے لیے کارہائے نمایاں سرانجام دے دیئے ہوں؟ دیکھیں اور سروے کریں کہ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں، وہ تو نکلے ہی مغرب کے لیے ہیں۔ ادھر ہی جا کر پروان چڑھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ بڑے سے بڑے فوجیوں کے بچے بھی وہیں کی روٹی کھا رہے ہیں۔ انہوں نے کون سا پاکستان آ کے صبر و آشتی کے ساتھ ملک کی خدمت سرانجام دینی ہے۔ باپ ادھر خدمت انجام دے رہا ہے، ساری اولاد ادھر خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ وہ اپنے ملک کے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں؟ یہ اپنے لوگوں سے حیلہ سازی کر رہے ہیں۔ یہ بالائی طبقہ ہمیں ڈاج کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے اپنی مرضی اور اپنے انداز کے سکول کھولے ہیں، جن میں پاکستان نام کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ بیکن ہاؤس وغیرہ اپنے ماحول کے لیے ایک پاکستانی جنریشن کو امریکی شہریت کے لیے تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کون واپس پلٹتا ہے کہ میں بڑی خدمت گذاری کا حق ادا کرنے واپس آیا ہوں؟ شفا انٹرنیشنل کے ڈاکٹروں میں اگر کوئی خاصیت واپس آنے کی ہے تو وہ ان میں اپنے گھریلو کلچر اور اس تعلیم کی وجہ سے ہے جو انہوں نے اپنے بچپن میں، اپنے بزرگوں اور اپنے ماں باپ سے لی۔ ان میں اگر حب وطن اور حب خدا ہے، تو یہ ان کی میراث ہے۔ یہ اسے سکولوں سے لے کر نہیں آئے۔ ہاں میں اس میں شک کروں گا، اگر ہمارا آدمی وہاں جائے اور کہے میں اس ساری چلتی پھرتی دنیا کو دیکھنے کے بعد اس کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں میں ایسا بے وقوف نہیں ہوں، نہ کوئی اور بیوقوف ہو سکتا ہے کہ ہم روز روشن میں ان ترقیاتی کاموں کو نہ دیکھیں یا اس صفائی کو نہ دیکھیں۔

مگر مجھے ایک بات یہ بتائیں، اگر یورپ صاف ہے اور ہم گندے ہیں، تو کیا یہ مذہب کا قصور ہے؟ مذہب اسلام کہتا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے، تو وہ پندرہ سو سال پہلے سے کہتا چلا آ رہا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ آپ پورے اسلام کے آدھے حصے سے محروم ہیں۔ صفائی نہیں ہے، تو آپ میں نصف ایمان کیوں ہو؟ اور پھر نصف ایمان میں بھی اگر آپ کی آرزو، خواہش اور خیال کا مرکز تمام تر یورپ اور اس کی درسگاہیں بن جائیں، تو اس کا مطلب ہے کہ آپ باقی ایمان سے بھی محروم ہیں۔ کیا دوٹوک یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ اللہ کے حکم سے پاکستان خالی خولی ایک بنجر اور ویران زمین ہے؟ اسی لیے تو پہلی کتاب میں نے ''کشت زرہار'' لکھی تھی۔ بظاہر یہ ایک ویرانہ ہے۔ ایک ایسا ویران ملک، جہاں سے کوئی شگوفہ پروردگار نہیں کھل رہا۔ جہاں کوئی دلجوئے آرزو خداوند نہیں ہے۔ اگر زمین اللہ کی ہے۔ الارض للہ، تو پھر اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا کوئی کونپل یا شگوفہ کیوں نہیں کھلا ہوا۔ اگر ایسا ہے، تو آپ اسے ایک ویرانہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح پوری مسلم دنیا ایک ویران و بنجر ایریا ہے۔ اس میں سے کوئی ایسی شخصیت، وجود یا کوئی ایسا طبقہ اور خیال سامنے نہیں آ رہا،

Marfat.com

جس کا مطلوب و مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔

جو مذہبی لوگ ہیں، ان کو یہ پیغام جانا چاہیے کہ آپ اس معاشرے میں بدترین خلاقیت کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کا تمام کا تمام رخ اسی انداز کا ہے۔ جیسے اندھیروں میں شیاطین ایک دوسرے کے گلوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ آپ اپنے اردگرد ایسی تاریکی پھیلا رہے ہیں، جس میں صرف طبقاتی جنگیں ہیں۔ مذہبی قتل و غارت ہے۔ ایک دوسرے کے لیے نفرت اور منافرت ہے۔ جس میں کسی قسم کی کوئی اسلامی بھلائی نہیں پائی جاتی۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو تبلیغ کررہے ہیں۔ یہی کچھ ان کی ملکیت اور وہ اسی کے حامل ہیں۔

ہر آدمی اپنی جگہ سوچتا ہے کہ ہمارے اس تمام رویے میں اسلام کہاں ہے؟ نماز تو اسلام نہیں ہے۔ یہ تو ایک طریقہ ہے۔ اس طرح عیسائی اپنی طرز عبادت رکھتے ہیں۔ یہودیوں کی اپنی طرز عبادت ہے۔ طریق عبادت کو کبھی بھی نظریہ نہیں کہیں گے۔ آپ کس حد تک خدا میں ایمان رکھتے ہیں۔ آپ اس سے کس حد تک مسائل کے حل کے لیے رجوع کررہے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ آپ زندگی کی اقدار میں کتنا مذہب کو استعمال کررہے ہیں؟ کس خیال سے زندگی گذار رہے ہیں؟ کس کمٹمنٹ سے آپ اپنے معاشرے کی اقدار کو دیکھ رہے ہیں؟ ایسی کوئی چیز پاکستان میں نہیں ہے۔

جتنا عرصہ میں نے پاکستان میں گذارا ہے، مجھے ابھی تک کوئی مخلص حکمران دکھائی نہیں دیا۔ شاید وہ اپنی عادات و مقاصد کے لحاظ سے تھوڑے بہت مسلمان بھی ہوں مگر کسی شخص کو پاکستان بننے کے بعد اس کمٹمنٹ کا خیال تک نہیں آیا، جس کے لیے یہ ملک وجود میں آیا، ایسی حالت میں اللہ آپ سے کیسے راضی ہوسکتا ہے؟ وہ تو اللہ کی مرضی ہے، راضی ہونا۔ مگر میرے پاس ایسی کوئی جمع تفریق نہیں، جس سے میں کہوں کہ اللہ ہم سے بہت خوش ہے اور ہماری خرمستیوں کی داد دے رہا ہے۔

اسلامائزیشن آف نالج

نالج کی اسلامائزیشن نہیں ہوتی۔ یہ کانسپٹ کوئی اتنا وقعت والا نہیں ہے۔ علم آپ کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح خدا کے لیے بھی استعمال ہوسکتا ہے علوم مسلمان نہیں ہوا کرتے۔ انتھروپالوجی مسلمان نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر آپ نے کسی زمین کی تحقیق کی ہے، تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تحقیق مغربی ہے، اب اسلامی تحقیق یہ ہوگی۔ تحقیق تو وہی رہے گی۔ ہاں اس کے نقطہ نظر سے فرق پڑ جائے گا۔ جیسے ایک شخص نے دنیا کے نقطہ نظر سے تحقیق کی ہے۔ مگر ہم اگر اللہ اور اس کی کتاب کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو ہمیں یہ احوال ملتے ہیں۔ جہاں خلا ہیں اور جہاں سائنسز رکتی ہیں، ہمارے پاس اس خلا کو پر کرنے کے لیے قرآن موجود ہے۔ انسان کی حیاتیاتی تخلیقی تاریخ اور تاریخ حیات میں بہت ساری گم کڑیاں فوسلز کی سٹیج پر ہیں کہ کب سے انسان نے سوچنا شروع کیا؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔

جب آپ مذہبی ہیں، تو آپ کو یہ مسئلہ نہیں درپیش ہوتا۔ آپ کو پتہ ہے کہ ایک بہت بڑی بالائی قوت ہے، جس نے یہ تخلیقات سرانجام دی ہیں۔ اس نے اپنے اوقات کے تحت انسان کی نشوونما کی۔ اسے آگے بڑھایا۔ سب کچھ اللہ کی کتاب میں درج ہے اس طرح مستقبل کی معلومات اور واقعات سے متعلق سب کچھ قرآن و حدیث میں درج ہے۔

Marfat.com

حتیٰ کہ ہمیں قیامت کا بتایا گیا ہے اور طریقہ کار قیامت کا بھی پتہ ہے۔ خدا کہتا ہے از الشمس کورت واز النجوم انکدرت ہمارا نظام شمسی اندھا ہو جائے گا۔ سورج بجھ جائے گا۔ ستارے ماند پڑ جائیں گے اور چاند اور سورج پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم نے یہ تمام دریافت کرنا ہے کہ یہ کب واقع ہو گا۔ مگر اللہ نے اس سب کی صورت بتا دی ہے۔

اسی طرح انسان کہاں تک آگے بڑھے گا؟ اس کا انجام کیا ہے؟ یہ بھی معلوم ہونا ہے۔ یہ دوزخ اور جنت خالی سزا اور جزا نہیں ہے۔ یہ انسانی منفی اور مثبت حرکات کے مختلف پہلو بھی ہیں۔ ایک کو شہر آسیب ملتا ہے اور دوسرے کو شہر بہشت ملتا ہے۔ کچھ لوگ پاس ہو کر ادھر نکل جاتے ہیں اور کچھ ادھر آ جاتے ہیں۔ خدا کے ہاں یہ دنیا بہت چھوٹا اور معمولی سا کیمپ ہے۔ مگر اس کے انجام اتنے بڑے اور کائنات کی وسعتیں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی ایک مثال رسول اللہؐ نے دی ہے اور کیا مثال وہ ہے جو ایک سائنسدان نے دی ہے۔ ذرا دونوں پر غور کریں، تو آپ کو پتہ چلے گا کہ مثالیں دونوں ایک جیسی ہیں مگر ایک مثال پندرہ سو برس پہلے دی گئی اور ایک آج کے زمانے میں دی گئی۔

سائنسدان کہتا ہے کہ اگر ساری دنیا کے ریگستان اکٹھے کر لیے جائیں، تو ہماری دنیا ریگذاروں کے ذرات اور کائنات اور ستاروں کی تعداد میں ریت کا ایک ذرہ بنے گی۔ بلکہ شاید اس سے بھی کمتر۔ جبکہ رسول اللہؐ نے فرمایا، اس جہان میں اس دنیا کی یہ حیثیت ہے کہ ایک بہت بڑا جنگل ہو اور اس جنگل میں ایک حلقہ پڑا ہو۔ اگر آپ دونوں مثالوں کی ڈرائی عظمت کو دیکھیں تو دونوں جس مقصد کو سمجھاتی ہیں وہ بڑی وضاحت سے سمجھ میں آتا ہے۔ اگر تازہ ترین سائنسی سٹیٹ منٹ نہ بھی ہوتی تو ایمیزون کے جنگلوں میں پڑا ہوا حلقہ پھر بھی اتنا ہی فاصلوں کی وسعت کے پہلو کو اجاگر کر رہا ہوتا۔

یہ مشکل اور دشوار کام نہیں ہے۔ ہم نے خود سے ڈیٹا جمع کرنا ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنے کی ہے کہ خدا تخلیق کار اور خالق ہے۔ خلاق عالم ہے اور اس نے طریقہ کار کے تحت چیزوں کو تخلیق کیا ہے۔ آج کا بہترین ترقی یافتہ انسان خلاق نہیں ہے۔ وہ محض اس طریق کار کو دریافت کر رہا ہے، جو اللہ نے بنیادی طور پر بنایا ہے۔ انسان کو اشیاء کی نیچر کا علم نہیں ہے۔ وہ صرف ان کے طریق کار کو جاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر کلوننگ آ گئی ہے، تو کلوننگ میں انسان نے کوئی جین تخلیق نہیں کر دیا، بلکہ وہ اس جین کے عمل اور ردعمل کے پیٹرن کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ریلیشن شپ تبدیل ہو رہی ہے اور یہی انسان کا سب سے بڑا کمال ہے کہ وہ اللہ کی قدرت، اس کی تخلیق اور اشیاء کی فطرت اور ان میں ریلیشن شپ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ خلا بڑا خلا نہیں۔ یہ گیپ اس لیے بڑا نہیں ہے کہ اگر بہترین ٹیکنالوجی کی مشین یورپ ایجاد کر لے اور آپ کوئی ایک عام سا بندہ وہاں بھیج دیں، تو وہ تین سے چھ ماہ میں وہ ٹیکنالوجی سیکھ کے واپس آ جائے گا۔ کارکردگی کا صدیوں کا گیپ ایجادات میں ہوتا ہے یا ایسی دریافتوں میں، جو پچھلے پورے کے پورے سیٹ اپ کو ایک دھماکے سے تبدیل کر دیتی ہے۔ ٹیکنالوجی میں کبھی زیادہ بڑا خلا نہیں ہوتا۔ مشین کا بنانا مشکل ہو سکتا ہے، اس کو سیکھنا اور چلانا مشکل نہیں ہو سکتا۔

ملکوں کے اندازے کے بالکل برعکس کہ پاکستان ایٹمی طاقت نہیں بن سکتا، ڈاکٹر قدیر خان ہالینڈ سے طریق کار سیکھ کے آئے اور انہوں نے ایٹمی پروگرام تعمیر کر کے آپ کو ایٹمی طاقت بنا دیا۔ ایک دماغ ہے، جس کے پاس مہارت

Marfat.com

اور انسٹرومنٹ دستیاب ہیں، جس سے وہ کسی دوسرے کی کارکردگی کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ہمارے پاس یورپ کے مقابلے میں الحمدللہ بہترین دماغ موجود ہیں۔ وہاں وہ دماغ لگے بندھے ایک ہی نسلی تناسب سے نکلتے چلے آ رہے ہیں جبکہ یہاں دنیا کی بہترین نسلیں ملی جلی ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ چوٹی کی دماغی ذہانت پاکستان میں ہے۔ اس لیے میرا نہیں خیال کہ ہمیں کسی قسم کی جھجک یا شرم کا احساس ہو۔ ہمیں اپنے مقصد سے غرض ہونی چاہیے۔ ہم نے ان سے سیکھنا ہے، ان سے سیکھ کے آ جائیں۔ ان کو خدا سمجھنا شروع نہ کر دیں۔

تعلیم میں زبان کا کردار

جب زبانیں تشکیل پا رہی ہوتی ہیں، تو ان میں کوئی ملک زیادہ اور کوئی کم ترقی کر گیا ہوتا ہے۔ جو عنصر زبان میں متعارف ہوگا، اس کے زیادہ تر الفاظ عوام کی زبان پر ہوتے ہیں اور لوگ انہی کو سمجھتے ہیں۔ مثلاً پینا سونک اور سونی جیسے الفاظ سے ہم ان کی ایجادات کی وجہ سے آشنا ہیں۔ اب اگر پینا سونک کو آپ اردو میں ڈھالنا چاہیں، تو مشکل ہو جائے گی۔ اسی طرح جب انگریزی زبان ترقی پذیر تھی، تو اس کی محض یہ خوبی نہیں تھی کہ یہ انگریزی کی زبان ہے، بلکہ یہ ایک ایسی بھوکی ننگی زبان تھی، جس نے ہر قوم کی زبان سے اپنا حصہ لے لیا۔ دوسری طرف جہاز رانی کی جتنی اصلاحات ہیں، وہ ولندیزی ہیں۔ جہاز رانی اس وقت زیادہ تر سویڈن اور نیدرلینڈ کے پاس تھی۔ اس کی جتنی اصطلاحات انگریزی میں آئی ہیں، وہ ولندیزی سے آئی ہیں۔

انگریزوں میں ایڈمرل کا لفظ عربی سے لیا گیا ہے۔ یہ اس وقت عربی کا لفظ تھا۔ امیر البحر بگڑتا بگڑتا ایڈمرل ہو گیا۔ اسی طرح اردو زبان اتنی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ عربی، فارسی اور برصغیر کی دیگر علاقائی زبانیں اس کا ماخذ ہیں۔ انگریز جب برصغیر میں آئے، تو اردو نے بہت سارے انگریزی الفاظ اپنے اندر سمیٹ لیے، وہ اس کا حصہ بن گئے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے جو مزدور پیشہ لوگ انگلینڈ گئے، ان کے بچے جب ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے تھے، تو ان کی ان پڑھ ماؤں کے دل شاد ہو جاتے تھے اور وہ سمجھتی تھیں کہ بچہ واقعی پڑھ گیا ہے۔

انگریزی زبان امتیاز کا حصہ نہیں ہے، لیکن یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جس کو انگریزی بولنا آتی ہے، وہ مقاصد حیات مکمل کر بیٹھا ہے۔ اگر آپ راہ گذر میں کسی سپاہی سے شائستہ اردو میں بات کریں، تو وہ آپ کو لفٹ ہی نہیں کراتا۔ مگر جب انگریزی میں جملہ بولا جائے، تو اس میں سو سال کا غلامی کا اثر عود کر آتا ہے۔ وہ آپ کو تھینک یو بھی کہے گا اور سلوٹ بھی مارے گا۔ ہم میں غلامی کی وجہ سے یہ اثرات آ گئے ہیں۔ خاص طور پر ہمارا اپر کلاس طبقہ، جسے ہم شائستگی کی مثال سمجھتے ہیں، وہ انتہائی نچلے درجے کی کمٹمنٹ سے وابستہ ہے میں نے ابھی تک بالائی اور اعلیٰ طبقہ میں اس قسم کا کوئی ذہن نہیں دیکھا، جو ان چھوٹے چھوٹے کمپلیکسز سے آزاد ہو۔ میرے پاس کچھ مہمان آئے۔ وہ اردو نہیں، پنجابی سمجھتے تھے۔ ادھر پنجابی گھروں سے اٹھ کر انگلینڈ گئے تھے۔ پنجابی گھروں میں بولی جاتی ہے اور باہر ان کی کارکردگی انگریزی تھی۔ مگر بیچ میں جو رابطے کی زبان ہے، وہ اسے نہیں سمجھتے۔

یہ پوری قوم کا کمپلیکس ہے۔ بعض اوقات مجھے لوگ کہا کرتے تھے کہ ہمیں آپ کی اردو سمجھ میں نہیں آتی، آپ

Marfat.com

انگریزی میں بات کریں۔ جب انگریزی میں بات کرتا، تو کہتے، ہمیں یہ بھی سمجھ میں نہیں آتی، آپ کسی اور زبان میں بات کریں۔ تو زیادہ تر ہمارے ہاں چلنے والی انگریزی کوئی اچھی انگریزی نہیں ہے۔ کلام چلاؤ انگریزی ہے۔ اس میں کسی خیال کا اظہار نہیں ہوتا۔ چنانچہ انگلش سکولوں کے پروان چڑھنے والے بچوں میں تصورات کی پشت پناہی نہیں ہوتی۔ کوئی خلاقی پروان نہیں چڑھتی۔ ان کی زبان امریکی زبان کی طرح ہے کہ آدھی زبان اور آدھا اشارہ چل رہا ہے۔ باقی جملہ وہ ہاتھ پیر ہلا کے اور بدن گھما کے پورا کرتے ہیں مگر جب کسی آرٹیکل وغیرہ کی انگریزی لکھنی پڑ جائے، تو لگتا ہے، جیسے ان کو موت پڑ گئی ہو۔ اس میں اپنے خیالات کو مجتمع کرنا اور انہیں ادا کرنا، ان کے بس کی بات نہیں۔ جب ذہن ہی نہیں پختہ ہوں گے، تو زبان کیا مدد دے گی۔

البتہ آج کل کے مغربی سکولوں کے بچوں کی انگریزی گرائمر ہم سے بہتر ہے۔ وہ ایک رواں گرائمر ہے مگر جب خیال اوپر جائے گا، تو یہ ناکام ہو جائیں گے۔ ان کو خیال کی کوئی تربیت حاصل نہیں۔ ہمارے Logical Constructs ان سے بہتر ہیں۔ ہم خیال کو کچھ اپنے مطلب کی انگریزی یا اردو میں ڈھال لیتے ہیں۔ یہ ان میں اور ہم میں ایک فرق ہے۔ انگریزی کا کمپلیکس اگرچہ اب کم ہو چلا ہے، مگر ابھی اس کی گرفت ہشت پا کی طرح ہمارے معاشرے کے نظام اور شعبوں پر کلی طور پر حاوی ہے۔ ہمیں اردو بولنے والا بندہ وقار والا نہیں لگتا۔

دوسری طرف اردو زبان بولنے والے اپنی زبان کی نفاست پر اتنے نازاں ہیں کہ وہ پنجابیوں کو عقل کا فائدہ ہی نہیں دیتے۔ ان کو احمق سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں چونکہ وہ زبان اچھی بول لیتے ہیں، اس لیے وہ اپنے کو زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ یہ وہ مغالطے ہیں، جو مختلف قوموں اور حکایت خیال میں زبان کی استعداد کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

ہم نے زبان کو بطور سٹیٹس سمبل بنایا ہوا ہے کہ جو انگریزی بولتا ہے، وہ بہت تعلیم یافتہ ہے اور جو اچھی نفاست سے اردو بولتا ہے، وہ صاحب ذوق ہے۔ اس لیے اقبال پر بھی اس وقت کے اردو والے لوگ بہت اعتراض کرتے تھے کہ ان کی زبان نفیس نہیں ہے۔ انہیں زبان کا پتہ ہی نہیں۔ ''ہمیں وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی'' میں دیکھو جی ''عار'' کو مونث باندھا ہوا ہے۔ یہ کیا ہے، وہ کیا ہے؟ اس قسم کے گرائمری تناؤ اور تفاخرات اس جاہلانہ منطق کا نتیجہ ہیں کہ اگر زبان نفیس نہیں ہے، تو دماغ بڑا گھٹیا ہے۔ وہ زبان کو براہِ راست دماغ کی استعداد پر لاگو کر دیتے ہیں۔

اسی طرح انگریزی والا یہ سمجھتا ہے کہ کسی کو انگریزی نہیں آتی، تو وہ بالکل ہی احمق ہے۔ اس کے پاس دماغ کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ غلط فہمیاں اس معاشرے میں گزشتہ بیس برس سے ہیں۔ پہلے زیادہ تھیں، اب کم ہو رہی ہیں۔

قومی زبان کا کمپلیکس

اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نظام تعلیم مربوط نہیں ہوا۔ زبانوں میں ارتباط وجود نہیں پا سکا۔ سائنس سے اردو مترادفات کو پروان نہیں چڑھایا جا سکا۔ مثلاً گیسز بننے کے عمل کو اردو میں عمل تصعید کا نام دیتے ہیں۔ صعود کر جانا، بلند ہونا۔ میٹر کا ترجمہ مادہ کرتے ہیں۔ آسان ہے۔ مگر جب آپ ٹیکنالوجی میں جاتے ہیں، تو اردو میں اس کا اظہار اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات آپ کو انگریزی کے ایک لفظ کے لیے دو اردو کے لفظ استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ میں نے جتنے ترجمے

Marfat.com

دیکھے ہیں، وہ آسان نہیں ہیں، مشکل ہیں۔ اس میں ایک وجہ تو یہ ہے کہ سائنس کی زبان آرٹ کی زبان سے مختلف ہوگی۔ جو زبان ہم انگریزی زبان کے مترادفات یا متخالف الفاظ کی صورت میں تیار کریں گے، وہ تھوڑی سی مشکل ضرور ہوگی۔ انگریزی مروجہ زبان ہے۔ اس میں زیادہ مانوسیت پائی جاتی ہے۔ جب تک مسلسل اردو کے الفاظ کو سمجھنے کے لیے استعمال نہیں کیا جائے گا، صورتحال یہی رہے گی۔

اس کے علاوہ باہر سے اطلاعات کا سیلاب آ رہا ہے۔ وہ زیادہ تر غیر ملکی زبانوں میں ہے۔ اگر جرمنی سے ایک آرٹیکل آ گیا، تو ہمارے عقلمند سائنسدان چھٹی کر جائیں گے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں ڈھونڈیں گے اور پھر اردو میں لائیں گے۔ ان کو زبان کا یہی مسئلہ ہے کہ انہیں ان کے اردو میں مترادفات دستیاب نہیں ہیں۔ ابھی تک کسی نے کوشش ہی نہیں کی۔ مقتدرہ قومی زبان کی کارکردگی قابل تسلیم کوشش نہیں ہے۔ اگر انہیں کہا جاتا ہے کہ فلاں زبان کے مترادفات یا متخالف اردو الفاظ بنائیں اور ان کو قابل اظہار زبان کی شکل وصورت میں ڈھالیں۔ ہم ان کو کورسز میں رائج کریں گے، تو شاید بات آگے بڑھتی بھی۔ چونکہ یہ کسی کورس میں رائج نہیں ہو رہے، اس لیے ان کے کام کا ایک دوسرے پر ڈھیر لگ رہا ہے۔ اردو کو ابھی تک اس قسم کی پذیرائی نہیں ملی ہے۔ وہ باضابطہ طور پر دفتری زبان ابھی بھی نہیں ہے۔ ہر جگہ انگریزی کا چلن ہے۔ جس ملک میں سول سرونٹ کے لیے اچھی اردو جاننا لازم نہ ہو، اس میں کیا پیش رفت ہوگی؟

قومی زبان، اردو یا انگریزی

اردو کے علاوہ ہمارے پاس رابطے کی کوئی اور زبان نہیں ہے۔ رابطے کی زبان صرف بالائی طبقے کی نہیں دیکھا کرتے۔ یہ نہیں ہے کہ سرحد یا سندھ کا ایک پڑھا لکھا آدمی ادھر آ کے انگریزی میں کام چلا لے گا۔ یقیناً، وہ چلا لے گا۔ مگر ایسے کتنے لوگ ہوں گے؟ جب ایک مزدور پیشہ سندھ میں جاتا ہے، تو اسے سندھی سیکھنی پڑے گی یا وہ اردو سے کام چلائے گا۔ بالائی سطح پر چند ایک لوگوں کے لیے انگریزی ممکن ہے، ٹھیک ہو، مگر نچلی سطح پر عوام کے لیے وہ زبان ہونی چاہیے، جو ان میں رابطے کا کام دے۔ مختلف طبقاتی معاشروں اور جگہوں کو مربوط کرے۔ سو اردو ہی وہ زبان ہے، جو سارے طبقات، خیال اور اہل زمین کو اکٹھا کرتی ہے۔

اسی طرح زبان کلچر پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ جب کوئی اردو بول رہا ہوتا ہے، تو سمجھا جاتا ہے کہ وہ مہذب ہے۔ جب انگریزی بول رہا ہوتا ہے، تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ باس ہے۔ وہ کلچرڈ نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ایک فرق ہے۔ انگریزی والے کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ شائستہ اور خلیق آدمی ہے بلکہ اس کے بارے میں عوام میں رائے ہوگی کہ وہ بدتمیز اور گنوار ہے، جو رعب کے لیے انگریزی مارتا ہے اور ہمیں رعب سہنا ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی بڑا یا چھوٹا صاحب اردو بول رہا ہو، تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ بڑا اچھا اور صاف ستھرا شخص ہے؟ اس کی زبان بڑی نرم ہے۔

اردو بلا شبہ ایک مہربان زبان ہے۔ دنیا کی واحد زبان ہے، جس میں شائستگی کے بے شمار لفظ ہیں۔ اتنی ادب آداب کی خلیق زبان دنیا میں کم ہی پائی جاتی ہے۔ اردو میں آپ دو چار لفظ استعمال کر کے اس کا مزاج تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہ اس میں خاصیت موجود ہے۔ یہ کتنا غلط خیال ہے کہ لشکر کی زبان کو آپ کلچر کی زبان کہیں۔ اس کے باوجود اردو میں

Marfat.com

اتنا ثقافتی تنوع اس لیے آیا ہے کہ اس کا آغاز ہی کرتسی کے لیے ہوا۔ مختلف الخیال اور مختلف النوع لوگ اکٹھے ہوئے، تو انہوں نے انداز میں نرمی اختیار کر کے دوسرے کو مخاطب کرنا چاہا۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کی شائستہ ترین زبان ہے۔ مگر یہ کہنا کہ یہ زبان صرف دلی اور لکھنؤ والوں کو آتی ہے، غلط ہے۔ انہوں نے صحیح اور مقفع الفاظ استعمال کر کے شائستگی کی زبان کو شاہانہ زبان بنا دیا۔ اب دلی کی زبان کو اس لیے قلعہ معلیٰ کی زبان کہتے ہیں کہ یہ Hyper - Tonned زبان ہے۔ Hyper - Tonned زبان کو ہم وہ اردو نہیں سمجھتے، جو لوگوں میں چلتی ہے۔

یا مثال کے طور پر رنڈیوں کے مزاج کے مطابق کہ امرا بھی اپنی تہذیب کے لیے بچوں کو ان کے پاس بھیجتے تھے۔ غور طلب بات ہے کہ کیوں بھیجتے تھے؟ اس لیے کہ رنڈی ایک ایسی مخلوق ہے، جس نے ہر ایک کو اخلاق سے اندر لانا ہے اور اخلاق سے وداع کرنا ہے۔ وہ ایک ایسی کمرشل زبان تخلیق کر رہی تھی، جس کا مقصد صرف پیسہ تھا۔ آپ یورپ چلے جائیں، آپ کو وہاں رنڈیوں کی زبان ایک جیسی لگے گی۔ اگر آپ نے پیسہ ڈال دیا، تو ان سے سنیں گے Very well done، تھینک یو، Have a nice time اور اگر پیسے نہیں ڈالے، تو وہ چیختے ہوئے آپ پر جھپٹے گی، Where is money? Hey Man Come over here

یہ ایک طوائف کی زبان ہے۔ کیونکہ طوائف کے کوٹھے پر جانے والے ہر ایک شخص کا پیسے کے لحاظ سے استقبال کیا جاتا ہے۔ جو اس نے کلچر اور زبان استعمال کرنی ہے، وہ ملنے والے پیسے کے مطابق کرنی ہے۔ اس میں رکھ رکھاؤ کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بہت سارے طبقات میں گانے بجانے یا سر کے حصے کو ان کے ذمے ڈال دیا گیا۔ ان لوگوں نے اس وقت کے مسلمانوں کی اعلیٰ سوسائٹی کے ساتھ لکھنؤ میں ربط ضبط استوار کر لیا تھا۔ اس لیے ان لوگوں میں بھی کلچر آیا۔ بلکہ طوائفوں نے خصوصی کلچر تخلیق کر لیا، چاہے ان کے پس پردہ غلاظت کا ایک دریا بہہ رہا ہو۔ مگر ان کی پردہ داری کی ظاہری سطح وہ خوبصورتی، اہتمام اور تنوع کی تھی، جس میں شائستگی اور اخلاق بہت برقرار رہا۔

دلی کی زبان مختلف ہے۔ یہ محکم اور اختیارات کی زبان تھی۔ اس لیے دونوں ایک دوسرے کو غیر مہذب ہونے کا طعنہ دیتے رہتے تھے۔ ان دونوں طبقوں کی زبان ہمیں سوٹ نہیں کرتی۔ پاکستان میں اردو قابل عمل، مستعمل اور صاف ستھری ہو۔ اس میں عمومی ادب آداب ہونے چاہئیں۔ اس میں تعلیم یہی دینی چاہیے کہ آپ اس میں قلعہ معلیٰ کے الفاظ استعمال نہ کریں۔ ''طلسم ہوشربا'' کی زبان دیکھیں، تو آج کے دور میں اس کا ایک صفحہ بھی نہیں پڑھا جا سکتا۔ ہم لوگوں کی دیوانگی اپنی جگہ، جنہوں نے اس زبان کا مطالعہ کیا یا فورٹ ولیم میں جو انداز اور زبان ڈویلپ ہوئی، وہ اب زیادہ استعمال میں نہیں۔ تاہم اس کا جاہ و جلال اپنی جگہ سلامت ہے۔

وہ ایک ماضی کی بات ہے۔ اب جو اردو ہو، وہ قابل عمل زبان ہو۔ تمام صوبوں اور لوگوں میں یہ رابطے کی زبان ہے۔ یہ ایک خوبصورت زبان ہے۔ اسے بولتے ہوئے انسان کو قلبی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ تذکیر و تانیث کی بحث میں نہ پڑیں، نہ طنز و تشنیع میں، جو اہل زبان کی طرف سے آ رہے ہوتے ہیں۔ اہل زبان اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ یہ سب سے بڑی حماقت ہے کہ وہ اہل زبان ہیں۔ جو زبان بطور ایک رابطہ زبان کے ترویج پائی ہو، اس میں اہل زبان کون ہو سکتا ہے؟ اس میں کوئی اہل زبان نہیں۔ اہل زبان تو وہ ہے، جس نے گھر بیٹھ کے یا اپنے ماحول کے مطابق اس میں بہت

Marfat.com

سارے لفظ متعارف کرائے ہوں۔ جسے فارسی اور عربی آتی تھی اور وہ ایک خصوصی ملغوبہ بنا تا رہا ہو۔ اردو ایسی زبان نہیں ہے۔ یہ رابطے کی زبان ہے۔ شروع ہی یہ رابطے سے ہوئی اور اب تک یہ بطور رابطے کی زبان چلی آ رہی ہے۔

پنجابی بولنے کی حد تک ٹھیک ہے۔ یہ آپ کی مادری زبان ہے اور آپ بڑی فصاحت سے اس میں بول سکتے ہیں، لیکن پنجابی میں جملہ لکھنا بڑا مشکل ہے۔ آپ آسانی سے اردو ہی میں لکھتے ہیں۔ جب آپ اردو کو موقع دیں گے صاف ستھرا بنائیں گے، تو یقیناً یہ ہمیں باہمی رابطے اور تعلق میں مدد کرے گی۔

یورپ سے علم کی واپسی

اب بات وسائل پر چلے گی۔ وسائل ایک خارجی چیز ہے۔ اس کا شاہین کے دماغ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا سائنسدان ایٹم بم بنا چکا ہے۔ ہائیڈروجن اور انٹرکانٹی نینٹل بنا سکتا ہے۔ وہ ہر چیز بنانے کا اہل ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ اگرچہ رئیس ترین ہمارے ہی لوگ ہیں۔ اسلامی امہ اکٹھی ہوتی ہے۔ ہمارے لوگ امت محمدؐ رسول اللہ کی طرح سوچتے ہیں۔ ایک جان کی طرح ہوتے ہیں اور پاکستان، مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں کو ان کے اپنے اپنے شعبوں میں سپورٹ کرتے، تو ان کی مہارت سے پوری اسلامی امت کو فائدہ ہوتا۔ سب سے بڑا فائدہ ہمیں یہ ہوتا کہ ہمارے پاس ایک طاقت ہے، جو ہر وقت ہمارا ساتھ دے سکتی ہے۔ ہر چیلنج کو قبول کر سکتی ہے۔ اس میں قصور ہمارا اپنا ہے، مغرب کا کوئی قصور نہیں۔

Marfat.com

مرض، علاج اور خدا

قرآن حکیم میں اللہ کہتا ہے کہ میں ہی مرض دیتا ہوں اور میں ہی شفا دیتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر طرز عمل ٹھیک کر لیا جائے کہ ہم مرض اور شفا کس سے منسوب کر رہے ہیں، تو پھر ہمیں صحت کے ساتھ کوئی بنیادی اختلاف نہیں رہ جاتا۔ جیسے کہ اللہ نے کہا، ولانبلونکم بشی من الخوف والجوع و نقص من الاموال والانفس والثمرت میں پانچ چیزوں سے انسانوں کو آزماؤں گا۔ ان میں سے ایک چیز بلا، مصیبت، بیماری وغیرہ ہے۔ ولباسا وضرا وزلزلو کہ ہم نے انہیں بیماریوں سے، سختیوں سے چھوا اور ان کو سخت ترین زلزلوں میں ڈالا۔ حتیٰ کہ وہ پکار اٹھے۔ اے پروردگار کہاں ہے ہماری صحت؟ حضور گرامی مرتبت کی حدیث مبارک ہے کہ اللہ نے تین ہزار بیماریاں پیدا کی ہیں۔ ایک ہزار کی شفا دعا میں ہے، جبکہ دو ہزار کی دوا میں ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بیماری نہیں ہے۔ مگر ہماری زیادہ سوچ بچار کی وجہ سے ہمارے اندر کا سسٹم باہم تعاون نہیں کر رہا ہوتا۔ ذہنی تناؤ یا فکری پیچیدگیاں ہمارے بدن پر اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں۔ جلد کے بیشتر مسائل ہماری اپنی سوچوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ امراض سزا کے طور پر آتے ہیں۔ مثلاً آپ زکوٰۃ نہیں دیں گے، تو آپ کو ایک خوفناک بدنی بحران سے گذرنا پڑے گا، لیکن یہ غیر مسلم کے لیے بجا نہیں ہے۔ اگر آپ حدود کراس کر رہے ہیں، تو اس کے نتائج آپ کے بدن پر کسی نہ کسی صورت میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ پھر اس میں وقفہ ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنے کو ٹھیک کر لیں، توبہ کر لیں، تو وہ مرض دور ہو جاتا ہے۔ اگر نہ کریں اور چلتے چلے جائیں، تو پھر وہ مرض اپنی آخری حدود کو پہنچتا ہے اور اس میں جان چلی جاتی ہے۔

بہت سے امراض بریت کا باعث ہیں۔ جیسے خداوند کریم نے آنے اور جانے کے بڑے طریقے رکھے ہیں۔ مگر نارمل طریقہ جانے کا وہ نہیں ہے، جس کو لوگ بیماریوں میں عمومی طور پر محسوس کرتے ہیں۔ انسان بالعموم چاہتا ہے کہ خدا اسے معقول انداز میں زندہ رکھے اور معتدل انداز میں دنیا سے اٹھا لے۔ مثال کے طور پر یہ ایک دعا کی جاتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار! موت تک ہمیں ہمارے پاؤں پر رکھنا۔ کوئی ایسی بے بسی اور لاچاری کی زندگی نہ دینا۔ دور حاضر میں

Marfat.com

گردوں اور شوگر کی بیماریاں بہت بڑھ گئی ہیں اور یہ خالصتاً تشویش اور فکر مندی (Anxiety) کا حصہ ہیں۔ جگر اور ہیپا ٹائٹس کی بہت سے لوگوں کی بیماریاں میری تسبیحات سے کم ہوئی ہیں۔ کچھ کے طبی نتائج بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔

یہ انسانی ذہن کی پیدا کردہ بیماریاں ہیں۔ بے حد و حساب خواہشات کی تیزی ان کے سکون و اعتدال کو برباد کر دیتی ہے۔ پھر ہر چیز ان کو بیماری کے رخ پر لے جاتی ہے۔ کچھ یہ عذاب و ثواب کا حصہ ہونے کی وجہ سے بھی ہے۔ کچھ بیماریوں کو اللہ نے باعث ثواب اور کچھ کو باعث عذاب بنایا ہے۔ ایک شخص مثال کے طور پر میرے پاس آتا ہے کہ جی مجھے دم کر دو۔ میں اسے دم نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی بھی منشا یہ ہے کہ جس چیز کی علم و حکمت اللہ تعالیٰ نے عطا کر دی ہے اور اس کے ذریعے آپ سینکڑوں اور لاکھوں لوگوں کے لیے باعث نفع بنتے ہیں، اس کے لیے ضد کرنا کہ جی دم پڑھو، میں ٹھیک ہو جاؤں، غلط ہے۔ یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بہت سی بیماریوں کا علاج اللہ نے انسان کو بخشا ہوا ہے اور انسان کر رہا ہے۔ خدا نے کہا ہے کہ میں نے انسان کو حکمت عطا کی ہے اور اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی کہ حکمت صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے یؤت الحکمۃ من یشآ ؑ من یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا کہ جسے حکمت عطا کی، گویا اسے خیر کثیر عطا کر دیا۔ ڈاکٹر اللہ تعالیٰ کے اسی خیر کثیر کو شیئر کرتا ہے، جو اللہ نے انسان کو دیا ہے۔

ہومیو پیتھی اور ایلو پیتھی میں بنیادی فرق ایلو پیتھک میں تحقیق، تردد، محنت اور بے شمار تحقیقات اور ان کے نتائج کا ہے۔ صرف الیگزینڈر فلیمنگ کی پنسلین بارہ سال کی محنت کے بعد سامنے آئی۔ خدائی علوم اور میڈیکل سائنسز میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ صرف ایک جگہ ہم ان سے اختلاف کرتے ہیں کہ حکمت اور میڈیکل سائنس بغیر کسی مقصد اور منزل کے تعین کے آگے بڑھ رہی ہے بلکہ وہ بعض مسائل جیسے کینسر اور ہیپا ٹائٹس وغیرہ پر زیادہ توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے۔ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ جب اتنی زیادہ سہولتیں موجود ہوں اور انسانی عقل اتنی زیادہ ترقی کر جائے، تو مرض وہ پیدا ہوتے ہیں، جو نا قابل علاج ہوں۔ مثلاً اگر ہاپاٹائٹس آ گیا ہے، تو میں نے کسی آدمی کو اس کی زد میں آ کر بچتے ہوئے نہیں دیکھا، جب وہ آخری سٹیج میں ہو اور جس کے لیے گھنٹیاں بجنی شروع ہو جائیں، مرض بھی اپنی جگہ جامد ہو جاتا ہے اور علاج بھی اور وہ بہت آہستہ اور تدریج سے آگے بڑھتا ہے۔ کچھ ہمارے ڈاکٹروں کی بھی اخلاقی قدریں نہ ہونے یا کمزور ہونے کے باعث، سوائے بہت ہی سپیشلائزڈ میڈیکل شعبوں کے، لوگوں کا اعتبار مذہبی ٹونے ٹوٹکوں پر زیادہ آ گیا ہے۔

سائیکاٹری اور روحانیت

سائیکاٹری تصوف کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اس کا آغاز اس بات کے ساتھ ہوتا ہے کہ جو اپنے آپ کو جانتا ہے، وہ دوسرے کو بھی جانتا ہے۔ مگر عمومی طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ہاں جتنا کچھ تصوف ہے، وہ اتنا قابل فہم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آپ اکثر دیکھیں گے کہ صوفی میں جس چیز کی توقع کی جاتی ہے، وہ صوفیا میں نہیں ہے۔ یعنی صوفی کی تمام تر اقدار علم پر مبنی ہوتی ہیں۔ چھوٹے ٹیکنیکل کام کے لیے آپ کو تھوڑی مشق کی ضرورت ہے، لیکن جب آپ ریسرچ کو جاتے ہیں، جیسے ایم ایس سی سے پی ایچ ڈی کو اور آپ کو پتہ ہے کہ آپ ایک اعلیٰ ترین قدر تعلیم کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں،

Marfat.com

جس طرح کسی شخص نے مخلوق سے خالق کو پڑھنا ہو، تو بجا طور پر اس کو اتنی ساری وسعت علم اور شناخت چاہیے کہ وہ دنیوی علوم سے کچھ قدم آگے جا کر اس بالاتر تفہیم کو پہنچنے کی کوشش کرے، جسے ہم اللہ یا حقیقت کبریٰ کہتے ہیں۔

ہمارے پاس اس وقت جو مثالیں نام نہاد صوفیا کی موجود ہیں، وہ زیادہ تر Quakes (مداری) ہیں۔ جیسے سڑک کے کنارے ایک شخص سلاجیت بیچتا ہوا میڈیکل سائنسز کا منہ چڑھا رہا ہوتا ہے، اسی طرح بہت سارے احباب، جو خدا کے نام پر بیٹھے ہوئے ہیں، وہ توہین مراتب کا باعث بنتے ہیں، کسی کی عزت کا باعث نہیں بنتے۔ کیونکہ صوفیاء میں علم کی قدر کے بغیر خدا کی شناخت ناممکن ہے اور کسی بھی حال میں ہم کسی بھی صوفی کو لاعلم ہونے کا کریڈٹ نہیں دے سکتے۔

علاج بذریعہ قرآنی آیات

ہر زمانے میں دعاوی تو بہت ہوتے ہیں۔ اس کی مثال میں آپ کو دوں کہ ڈاکٹر اشفاق، جو بے نظیر کے معالج تھے، اس وقت جیتے تھے۔ ان کی بہو کو کینسر کی تکلیف ہو گئی۔ میرے ایک اور عزیز دوست کی بیوی کو بھی کینسر کی تکلیف ہو گئی۔ میں وہاں تھا، انہوں نے مجھ سے مشورہ طلب کیا، تو میں نے کہا، آپ فوری طور پر آپریشن کرائیں۔ دونوں ایک ہی قسم کے کیس تھے۔ میرے دوست نے ہومیوپیتھی پر انحصار کیا۔ ڈاکٹر اشفاق خود بہت بڑے ہومیوپیتھ تھے۔ اس نے بھی یہ کہا کہ میں اپنی بہو کا علاج ہومیوپیتھی سے کروں گا، لیکن میں نے اسے کہا کہ کبھی بھی ایسا نہ کرنا۔ آپ اس کا آپریشن کرواؤ اور وقت ضائع کیے بغیر فوراً کرواؤ۔ اس نے ایسے ہی کیا۔ ڈاکٹر اشفاق کی بہو اللہ کے فضل و کرم سے بچ گئیں۔ تین سال کے بعد وہ ماشاءاللہ ابھی بھی زندہ ہیں مگر میرے دوست کی بیوی رفتہ رفتہ موت کا شکار ہو گئیں۔

سو اصول یہ ہے کہ جس علم کے پاس تشخیص اور شناخت نہیں، وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں علاج کر سکتا ہوں۔ اگر ایک ہومیوپیتھ کو ایلوپیتھک طریقہ تشخیص پر ہی فیصلہ دینا ہے، تو وہ ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ البتہ نارمل چھوٹی چھوٹی چیزیں حکمت میں ہیں، جن سے اب بھی آپ بہتر علاج کر سکتے ہیں۔ اس میں وہ چبھن نہیں ہے، جیسے السر کے ایلوپیتھی طریقہ علاج میں ممکن ہے، جس میں مزید مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ جیسے معدہ سست پڑ جاتا ہے یا دوائی کے کسی جز سے اس کا معدہ بالکل ہی خراب ہو جائے۔ ایلوپیتھی بھی چھوٹے علاجوں میں بہتر مؤثر ہو سکتی ہے۔ نزلے کے لیے ان کی ایک چھوٹی سی گولی نے مجھے فوری مدد دی تھی۔ ممکن ہے، ہومیوپیتھی بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں مؤثر ہو سکتی ہو۔ مگر قرآن حکیم میں اللہ کہتا ہے کہ ہم کچھ علوم اکٹھے چلاتے ہیں، جو انسانوں کی بہتری اور فلاح کا باعث ہیں۔ ان کو رکھ لیتے ہیں اور ان کو ترک کر دیتے ہیں، جو فلاح کا باعث نہیں ہیں۔ شروع میں حکمت، ہومیوپیتھی، آیوویدک یہ سب اکٹھے چلتے تھے۔ انہی علوم کی زیادہ عملی اور سائنسی صورت ایلوپیتھی میں آ گئی۔ اب ایلوپیتھی کے ہوتے ہوئے آپ دوبارہ چھوٹے علوم کو پلٹیں، تو ایسے ہی لگے گا، جیسے ایم۔ اے کرنے کے بعد آپ پانچویں جماعت کی کلاس میں دوبارہ داخلہ لے لیں۔

جوں جوں آبادی بڑھ رہی ہے، لوگوں کے مزاج کے مطابق چھوٹی تکالیف کے لیے آپ ابتدائی علوم کا ضرور آسرا لیں گے۔ مگر جہاں تک پیچیدہ بیماریوں کا تعلق ہے، ان کے لیے میں بالکل تجویز نہیں کروں گا کہ آپ جان بوجھ کر اپنی جان کے دشمن بنیں۔ کسی شخص کو اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

طب نبوی کی حیثیت

اس زمانے کے مطابق حضور گرامی مرتبتؐ نے مختلف اوقات میں لوگوں کو کچھ چیزیں تجویز کیں۔ بظاہر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہمارے پیغمبر پر اگر یسو نہیں تھے۔ اب جب پیغمبرؐ فیصلہ دے رہے تھے، تو ان کا اپنا ماحول اور اپنی صورتحال ان کے سامنے تھی۔ وہ اس وقت کے مریض کو بتاتے ہوئے کسی جدید ٹیکنیکل دوائی کا نام استعمال نہیں کر سکتے تھے یا اسی طرح کی کوئی بڑی ٹیکنیکل جزک نیم آف میڈیسن نہیں دے سکتے تھے۔ کلونجی کی آپ نے تعریف فرمائی۔ اسی طرح اور بہت ساری ایسی چیزوں کی، جو اس وقت مستعمل تھیں۔ حضورؐ نے سرجری کروائی ہے۔ پچھنے لگوائے ہیں۔ چنانچہ عمومی جو علم و حکمت ہے، اس سے دریغ نہیں کرنا چاہیے بلکہ حدیث میں آیا ہے، جب لوگوں نے کہا، یا رسول اللہ پچھلے زمانے میں ہمیں یہ چیز سکون دیا کرتی تھی، تو آپ نے فرمایا، جیسے حکمت انسانیہ ہے، اس پر عمل کرو۔ صرف ایک جگہ پر آپؐ نے ایک شخص کو اسہال پر شہد پینے کی تلقین فرمائی۔ کچھ عرصے بعد اس کا پیٹ اور خراب ہو گیا۔ وہ واپس آیا اور کہا یا رسول اللہ! میرا تو مرض اور بڑھ گیا ہے۔ فرمایا، تمہارا پیٹ جھوٹا ہے، اللہ سچا ہے۔ ابھی اس کو استعمال کرتے رہو۔

اب میں دیکھتا ہوں کہ قریباً وہی بات ORS کے بارے میں ڈاکٹر کہتے ہیں۔ بچے کو جلاب لگے ہوئے ہیں، لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ORS دیتے رہو۔ اس کی کمی نہ آئے۔ چونکہ شہد میں تھوڑا سا انٹی بائیٹک بھی ہے اور غذائیت بھی، تو آپ کا مطلب تھا کہ شہد دیتے رہو، پیٹ کے فسادات ختم ہونے لگیں گے۔ ORS کی طرح اس زمانے میں آپ نے شہد کے معاملے میں یہی تلقین فرمائی۔

میڈیسن، روحانیت سے انکار

ایسا انکار کوئی بھی نہیں کرتا۔ میڈیسن لوگوں کے سامنے کیا ہے؟ جب وہ پریکٹیکل چیک کرنے کے لیے جاتے ہیں، تو دیکھتے ہیں، ملتانی بابا یا کوئی جناتی بابا بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ اتنے سادہ لوح ہیں۔ جیسے ایک صاحب میرے پاس آئے۔ انہیں پیٹ کی تکلیف تھی۔ کہنے لگے ڈاکٹر سے آرام نہیں آیا۔ میں ایک مرشد گرامی کے پاس گیا۔ انہوں نے زعفران کھانے کو دیا۔ میں نے اسے کہا کہ زعفران کو فوری بند کرو، ہو سکتا ہے کہ تم کہیں بہت ہی آگے نہ نکل جاؤ۔

حقیقت میں جب ہم حقائق کو دیکھتے ہیں، تو میں سائنسدانوں کی سائیڈ پر کھڑا ہوتا ہوں، جو ان تمام ہتھکنڈوں اور وطیروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جو یہ مداری مذہب میں استعمال کرتے ہیں۔ ان رجحانات سے لوگوں کے لیے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ Down Syndrom کے بچے، جو بہت کثرت سے ہو رہے ہیں، اس کی بنیاد قطعاً بیماریوں میں نہیں، عورتوں کے رویوں پر ہے، جب بچے پیٹ میں ہوتے ہیں۔ میرے پاس سو فیصد ہسٹری یہ ہے کہ وہ ذہنی دباؤ، پریشانی اور غصے میں ان بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ اپنی سوچ اور پریشان کن خیالات کا اثر ان بچوں پر اس حالت میں پڑ جاتا ہے، جو ان کے اندر ہوتی ہے۔

یہ ہسٹری میں نے کنفرم کی ہے کہ جو بچے اس طرح پیدا ہوتے ہیں، ماں کی ذہنی حالت اس کی ذمہ دار ہوتی

Marfat.com

ہے۔ بعض اوقات کہتے ہیں کہ کزنز کے ساتھ میرج کے باعث کہیں جینٹک ڈسٹربنس تو نہیں ہے۔ کزنز میرج تو حضرت آدمؑ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے اور جہاں کہیں پیچھے کزنز میں سے کسی میں جین کا نقص ہوگا، وہ آگے آئے گا۔ تاہم بے شمار کزنز کی شادیوں میں ایسے مسائل نہیں اٹھتے، لیکن جب ایک فریق میں کوئی نقص آ جائے، تو وہ نقص آگے چلے گا۔ اس کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ کزنز میرج کی وجہ سے ہے۔ بلکہ سلسلہ نسب میں کوئی نقص آ جاتا ہے۔ پھر اگر آپ اس شادی کو محدود تر کرتے جائیں، تو وہ پرابلم بچوں کے لیے مسائل کھڑے کر دیتا ہے۔

اختناق کی بیماری اسی لیے نسل سے نسل میں سفر کرتی ہے۔ اپی لیپسی کی بھی یہی صورتحال ہے۔ میرے ایک پرانے دوست کرنل کے دو بچے Down Syndrom کا شکار ہیں۔ ڈاکٹروں نے انہیں سختی سے منع کیا کہ وہ مزید بچے پیدا کرنے سے باز رہیں۔ وہ مجھے کوئٹہ میں ملے۔ میں نے کہا کہ میں ڈاکٹروں سے اختلاف نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے کہ نقص آپ لوگوں میں ہے۔ میں نے انہیں تسبیح کے لیے کہا۔ تین سال کے بعد وہ ایک اور بچے کے لیے آمادہ ہوئے۔ انہوں نے پھر ڈاکٹروں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے ٹیسٹ وغیرہ کرنے کے بعد کہا کہ وہ اس کا مشورہ نہیں دیں گے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا، میں نے کہا Go ahead اللہ نے انہیں بہت خوبصورت اور نازک بچے سے نوازا۔ اتنا عرصہ انہوں نے پوری طرح خدا کی طرف توجہ دی جب وہ ایک اور بچے کی خواہش کرنے لگے تو میں نے انہیں کہا کہ اگر انہوں نے اپنے پچھلے احتساب میں کوئی کمی نہیں کی تو Go ahead جب سات ماہ کا بچہ پیٹ میں ہوا، تو ٹیسٹ پر پتہ چلا کہ سر پھر چھوٹا آ رہا ہے۔ سیریبرم کا ڈایاگرام چھوٹا ہے۔ وہ بڑے گھبرا گئے کہ شاید تیسرا بچہ بھی معذور ہو۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ پہلے جتنی تسبیح کرتے تھے، اس سے بہت زیادہ کرلیں اور یہ نہ بھولیں کہ صرف اللہ ہی اس نقص کو دور کرسکتا ہے۔ وہ نقص آٹھویں مہینے کے شروع تک آیا۔ اس کے بعد الحمدللہ دور ہوا اور انہیں اللہ نے بہت صحت مند بچی عطا کی۔

یہ سچ ہے کہ بہت سے امراض جنہیں ڈاکٹرز یا ریسرچرز نے پرکھا ہے، بس صحیح ہیں، لیکن ان کا حل بھی تو کسی کے پاس ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے کہا ہے کہ میں مرض دیتا ہوں اور میں ہی شفا دیتا ہوں۔ بعض اوقات جیسے حضرت زکریاؑ تین سو برس کی عمر میں خدا کی طرف سے ملائکہ نے آواز دی کہ اللہ نے فیصلہ کردیا ہے، تجھے بچہ ملے گا۔ انہوں نے حیرت سے کہا کہ پروردگار یہ کیسے ہوسکتا ہے، میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ خدا نے جواب میں کہا، زکریا تجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے۔ تجھے تو یہ کہنا چاہیے کہ میرا رب جو چاہے کرسکتا ہے۔ تمام عقیدہ اللہ مکمل اور فائنل اتھارٹی کو ماننے میں مضمر ہے اور اس میں مرض کی کوئی حیثیت نہیں۔ اللہ چاہے، تو آپ کی زندگی کم کرسکتا ہے، بڑھا سکتا ہے۔ بلکہ حضور گرامی مرتبتؐ کی حدیث مبارک ہے کہ ممکن ہے، دنیا کی عمر آدھا دن اور بڑھ جائے۔ پوچھا گیا، آدھا دن کتنا؟ فرمایا، پانچ سو برس۔ جو اوپر بیٹھا ہوا ہے، وہ زندگی کی پوری سکیم کو پانچ سو برس بڑھا سکتا ہے۔ کتنی بے شمار نسلیں پانچ سو برسوں میں آئیں گی۔ کتنے ان کے بندوبست ہوں گے۔ ان کے لیے رزق چاہیے۔ روٹی پانی سارا کچھ چاہیے۔ اس کے لیے یہ چیزیں کتنی معمولی ہیں۔

پیغمبروں نے جو معجزے دکھائے ہیں۔ خاص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے اس طرح کے معجزے نہیں ہیں۔ وہ صرف طاقت کے مظاہر ہیں۔ ان سے لوگوں کو Hard-Basis حل ملتا ہے۔ مثلاً آج آپ کو Diffusion اور Fusion پر پہنچنے کے لیے کھربوں روپے کے کمپلیکسز چاہئیں۔ تب کہیں جا کر آپ ایک دھات کو الیکٹرانکس کے شعاعی وجود میں تبدیل کر

Marfat.com

کے کسی دوسری جگہ لے جائیں گے۔ مگر ایک وہ شخص ہے، جس کو سپر کمپیوٹر کی چابی حاصل تھی۔ جس کو اسم اعظم کہتے ہیں۔ جس کو کتاب کا علم حاصل تھا کہ وہ زبان سے دو لفظ ادا کرتا ہے اور تخت سبا Diffuse ہو کر سیکنڈ کے اٹھارہ ہزارویں حصے میں وہاں پہنچتا ہے۔ دوبارہ Fuse کر کے اسے تخت کی صورت دی جاتی ہے۔ انسانیت یقیناً اس سٹیج تک پہنچے گی، لیکن اسے بہت ہی مشکل اور سخت مراحل سے گذرنا پڑے گا۔

لوگ کہتے ضرور ہیں کہ ہم اللہ پر یقین رکھتے ہیں، مگر یہ وہ یقین نہیں ہے، جو اللہ کو چاہیے۔ تمام عقیدہ الفاظ سے عملی روپ دھارتا ہے۔ میں ساری زندگی بہت زیادہ سگریٹ نوشی سے ڈرتا رہا ہوں۔ میں نے گیارہویں، بارہویں کلاس سے سگریٹ پینا شروع کیا اور اس میں تقریباً چالیس برس گذر گئے ہیں۔ اس وقت میں ساٹھ برس کا ہوں اور میڈیکل کے اعتبار سے میں نے اس بات کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ میں ڈرگز کے باعث بیمار ہونے کی کئی وجوہ کو مانتا ہوں، لیکن میں تمام زندگی اللہ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اس خطرے سے محفوظ رکھنا۔ میں لیکچر میں جاتا ہوں، اس میں مجھے بارہ بارہ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ چھ چھ گھنٹے سوال و جواب ہوتے ہیں۔ میں کبھی تھکاوٹ سے دوچار نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے۔ وہ میری دیکھ بھال کر رہا ہے اور بعض ایسی چیزوں کے شر سے بھی اللہ بچاتا ہے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ آگ کی نیچر بدل سکتا ہے، تو جس شخص کو بھی اللہ پہ بہت یقین ہوگا، اعتماد ہوگا، وہ اسی طرح اشیاء کی نیچر کو بدل سکتا ہے۔

جیسے خالد ابن ولیدؓ کے پاس جنگ میں ایک دشمن آیا، کہ حضرت میں اپنے ساتھ زہر ہلاہل لایا ہوں کہ اگر آج صلح نہ ہوتی، تو میں اپنی قوم کو منہ دکھانے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ کے سامنے زہر پھانک لوں گا۔ حضرت خالدؓ ہنس پڑے اور اس سے کہا، دکھانا، وہ زہر کون سا ہے۔ اس نے زہر کی پڑیا نکالی۔ حضرت خالد نے مسکرا کر کہا کہ تم سمجھتے ہو کہ زہر زندہ رکھتا ہے، زہر مارتا ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور آپ نے زہر کی وہ پڑیا کھالی۔ وہ دشمن اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ اس نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ وہ انتظار میں تھا کہ ابھی یہ گریں گے اور مر جائیں گے جبکہ حضرت خالدؓ طویل عرصہ تک زندہ رہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ آخری زندگی حضرت خالدؓ نے جو سخت بیماری اور کرب میں گذاری ہے، خدا نے اس وقت تو زہر کو اپنا اثر دکھانے سے روک دیا تھا، لیکن وہ اسی زہر کی وجہ سے اپنی عمر آخر میں جا کر فوت ہوئے۔

دور کیوں جاتے ہیں۔ افغانستان کی حالت کو دیکھیں کہ ایک عقیدے کا ایک سادہ سا لیول ہے، جس نے دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی کا مقابلہ کیا۔ بہت ہی سمپل لیول تھا۔ میں نے طالبان کی مذہب کی تعبیر سے کبھی اتفاق نہیں کیا، لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے ماحول اور اپنے خیال کے مطابق مذہب کی بنیادی تعبیر کی تھی۔ ٹوپی رکھنا اسلام میں لازم نہیں۔ خواتین پر اپنی بالادستی رکھی اور وہاں کی عورتوں نے اسے اس لیے قبول کر لیا کہ یہ وہاں کا عمومی رویہ ہے۔ میں ان کے نظریاتی سطح کے اس تناظر کی جدوجہد کو Appreciate نہیں کرتا۔ اگر میں طالبان کا عقیدہ اختیار کروں، تو میں اسلام کا دفاع نہیں کر سکتا، اس تمام تنقید کے خلاف جو مغربی اسکالر اسلام کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اسلام اس تنقید کا سامنا کر سکتا ہے۔ مگر طالبان کا عقیدہ اس کی مزاحمت نہیں کر سکتا۔

اس کے باوجود وہ انتہائی سادہ سا عقیدہ اتنا جارحانہ تھا کہ اس پر اتنے زیادہ ٹیکنالوجیکل حملوں کے باوجود انہوں

Marfat.com

اس کی مزاحمت کی۔ یہی پاور اگر کسی میدانی علاقے میں استعمال ہوتی، تو چند دنوں میں ہر چیز ختم ہو چکی ہوتی۔ مگر وہ لوگ اس کے باوجود کہ انہیں کہیں سے بچاؤ کا امکان نظر نہیں آتا تھا، انہوں نے ایک عرصہ مزاحمت جاری رکھی۔ اس میں خدا کی حکمت بھی ہے کہ ایک بہت بڑی متکبرانہ قوت کا اضمحلال جاری ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ اس عرصہ بعد امریکہ اندر سے ٹوٹ جائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔

کلینیکل ڈیتھ، سہل موت

پہلے تو یہ تعین کرنا پڑے گا کہ کلینیکل ڈیتھ کس کو کہتے ہیں۔ نارملی حرکت قلب بند ہو جانے کے باوجود جب تک برین ڈیڈ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹرز حضرات کلینکلی کسی کو مردہ ڈیکلیئر نہیں کرتے۔ اصولاً اس وقت کلینکلی ڈیڈ ڈیکلیئر کرتے ہیں، جب اس کے ذہن میں برقیاتی رو ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے روس میں دل کی موت کے پانچ منٹ کے بعد بھی مختلف طریقوں سے مریض کو دوبارہ زندگی میں لے آیا گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر کلینکلی ڈیتھ اس کو کہتے ہیں، جہاں کسی مریض کا مزید علاج ممکن نہیں، لیکن اگر ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اس کا مزید علاج ممکن نہیں ہے یا اس کا وقت بھی مقرر کر دے کہ دو چار چھ سال یا دو چار مہینے یا دو چار چھ دنوں کے بعد مریض مر جائے گا۔ مزید اس کا علاج ممکن نہیں، تو یہ صرف انسان اپنی بہترین استعداد کے باوجود اپنی نااہلیت کا اعتراف کر رہا ہوتا ہے۔ کوئی بھی ڈاکٹر اس قسم کے تمام امراض میں جہاں کسی مریض کو ایک لمحہ آخر کی بشارت دیتا ہے، وہاں وہ یہ اعتراف بھی کر رہا ہوتا ہے کہ میرے پاس اس سے بہتر علاج یا طریقہ علاج ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ہم اس کی مزید کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

اب جیسے کومے کی صورتحال ہے۔ بعض لوگ کومے میں پندرہ اٹھارہ برس جیتے ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ کی بھی مثال موجود ہے۔ عملی طور پر تو وہ آدمی ایک مردہ ہی ہوتا ہے مگر چونکہ زندگی کے آثار اس کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کو خوراک مل رہی ہوتی ہے اور وہ زندہ ہوتا ہے، اس لیے لوگ اس کو زندگی سے فارغ نہیں کرتے۔

اس میں دو طریقے ہیں۔ جیسے ابھی میرے خیال میں سویڈن میں ڈاکٹروں نے یہ فیصلہ کیا، یہ اجازت دے دی کہ جو لوگ زندگی سے قطعی مایوس ہوں یا ان میں دوبارہ پلٹنے یا احیا کا خیال ہی ختم ہو جائے، تو وہاں ان کو موت کے حوالے جان بوجھ کر کرنا اس کے زندگی کی طرف سے اس کا علاج کرنے سے بہتر ہے۔ امریکہ میں بھی ایک ڈاکٹر کو اسی لیے سزا ہوئی ہے کہ اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ میں نے مرنے کو آسان کیا ہے۔ ڈاکٹر کسی بھی صورت میں مرنے کو آسان کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ یہ ان کے ضابطہ اخلاق میں شامل نہیں ہوتا۔ جہاں وہ دکھ، درد اور عذاب کو سہل کرتے ہیں اور شدید ترین تکلیف میں مریض کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں ان کے طبی مقاصد میں شاید شروع سے لے کر اب تک یہ قانون شامل نہیں ہے کہ موت کو سہل کیا جائے۔

فرض کریں ایک شخص کی موت نظر آ رہی ہے، تو جو صاحب یقین ہے، جس کو اللہ پر اعتبار ہے، وہ اس ایک نکتے کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ خدا جب چاہے کسی کو دوبارہ احیا پذیر کر سکتا ہے۔ زندگی کی طرف لا سکتا ہے۔ اب اس میں دیکھا

Marfat.com

بھی گیا ہے کہ بعض اوقات ایک آدمی دس سال کے قومہ کے بعد ٹھیک ہو گیا ہے۔ سال یا مہینے کے بعد درست ہو گیا۔ مدتوں کا بڑھنا یا کم ہونا کوئی ایسا یقینی عمل نہیں ہے، جس پر کوئی میڈیکل سائنس فیصلہ دے سکے۔ سو میرے خیال میں انسان اگر علاج سے بے بس بھی ہو جائے، تو بھی ایک امید کو جو اللہ کے ساتھ ہے، منقطع کرنا کسی ڈاکٹر کی خوبی کا باعث نہیں ہو سکتا۔

میڈیسن سے زندگی کا اختتام

کم از کم انسان کو سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کیا میں زندگی کا خالق ہوں یا مالک ہوں؟ جیسے پیدائش کے وقت اسقاط حمل کو سختی سے مذہب ممنوع قرار دیتا ہے۔ اسے قتل قرار دیتا ہے۔ حالانکہ وہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے، جس میں زندگی بھی اپنی فارم طے نہیں کر چکی ہوتی۔ ایک پراپر فارمیشن میں نہیں آئی ہوتی۔ اس کے باوجود پروردگار عالم قرآن حکیم میں کہتے ہیں کہ اولاد کو رزق یا کسی اور خوف سے مارنا قتل کے مترادف ہے۔

اسی طرح فرض کریں ایک شخص کی بیماری یا قومہ یا اس کا موت کے قریب پہنچنا اس کے خاندان یا لواحقین کے لیے ایک قابل آزمائش عرصہ ہے، ایک ایسا وقت ہے، جس میں بہن، بھائی، بچے سب آزمائے جا رہے ہیں، اسی ایک موت کی وجہ سے یا قریب المرگ حیثیت کی وجہ سے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خدا کے ان اعمال کی نفی کر رہے ہیں، جو دوسروں کے لیے اس نے مرتب کیے ہیں۔

کوئی بندہ اس وقت تک دنیا نہیں چھوڑتا، جب تک اس کی وجہ سے لوگوں کی آزمائش نہیں ہو جاتی اور اس کی اپنی آزمائش پوری نہیں ہوتی۔ سو یہ عرصہ حیات چاہے صحت یا بیماری کا ہو۔ مرگ کا ہو، ایک ایک لمحہ مخلوقات کے آپس میں جڑے ہوئے جذبات کی آزمائشوں کا ہے۔ اس لیے ایک شخص اگر بستر مرگ پر پڑا ہے اور وہ مرنے والا ہے، اس کے مرنے کا پورا یقین بھی ہے، تو اس کے ساتھ جو دوسرے زندہ لوگوں کی قرابت ہے، وہ آزمائی جا رہی ہے۔

فرض کریں، ایک شخص ماں کی زندہ لاش لیے بیٹھا ہے۔ اس کو ایک آس ہے کہ یہ شاید بچ جائے اور جب تک زندگی کی وہ معمولی ترین آس موجود ہے، وہ اپنی ماں کی خدمت کر رہا ہے۔ چنانچہ اس آدمی کے ثواب وعذاب کا راستہ آپ نہیں روک سکتے۔ اس لیے کسی بھی حال میں مریض کو مارنا مذہبی یا عملاً ایک انتہائی غلط قدم ہے۔ یہ ایک ایسی بے حس سائنٹفک دنیا میں ممکن ہے، جہاں آپ آبادی کے ذخائر اور آبادی گن رہے ہیں اور آپ کو لگتا یہ ہے کہ اگر ایک ہزار سے بارہ سو لوگ ہو جائیں گے، تو زندگی تنگ ہو جائے گی۔ چنانچہ دو سو لوگوں کو ختم کر دینا چاہیے۔ یہ ذخائر اور آبادی کے اس تناسب کو کم کرنے کے مشینی طریقے آزمائے جائیں گے۔ اس کے بعد یہ بوڑھے اور بیڈ پر پڑے مریضوں کی خصوصیت نہیں رہے گی۔ اس ایک بات کی اجازت دے دیں تو پھر مجھے پوری امید ہے کہ دنیا ئیں اپنی فالتو آبادی کو ختم کرنے کے بہت سے طریقے ڈھونڈیں گی۔ اس سے جرمنی کی گیس چیمبرز کی داستانیں بھی فرسودہ ہو جائیں گی۔

ازخود زندگی کا خاتمہ

بالکل نہیں۔ جنگ بدر کا واقعہ ہے۔ ایک شخص کے بارے میں اصحاب نے کہا کہ وہ بہت شدید جنگ کے بعد

Marfat.com

زخمی ہے۔ وہ تو جنتی ہے۔ آپ نے فرمایا، بلکہ جہنمی ہے۔ اصحاب نے فرمایا، یارسول اللہؐ! ہم نے اس کو دیکھا ہے، اس نے اتنے سارے کافروں کو قتل کیا ہے اور وہ بڑی دلیری سے لڑا ہے۔ ہمیں تو گمان ہے، وہ جنتی ہے۔ فرمایا، نہیں جہنمی ہے۔ اصحاب تجسس میں اس شخص کے پاس گئے۔ اس نے درد کی تاب نہ لا کر تیر سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا۔ خودکشی کر گیا۔ اس کے باعث حضورؐ نے اسے جہنمی قرار دیا۔

یہ اتنی واضح حدیث ہے کہ ہر وہ شخص جو اپنی زندگی کا خاتمہ کرتا ہے، وہ دو اسباب کے تحت کرتا ہے۔ ایک تو اللہ سے قطعی مایوسی ہے۔ وہ حقائق کو اپنی نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور اس حقیقت کے تحت اس کا صبر کم ہو گیا ہے۔ وہ اللہ پر کوئی امید نہیں رکھتا کہ اللہ اس کے درد یا تکلیف کو کم کرے گا۔ اس لیے خودکشی کرتا ہے اور چونکہ قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے کہ اللہ سے مایوسی کفر ہے، تو وہ بندہ اس وقت حالت کفر میں چلا جاتا ہے، جب وہ اپنی زندگی کو خدا کے بغیر خود ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا ایک طریقہ وہ پاگل پن ہے، جیسے کوئی Psychosis یا Neurosis ہے۔ جہاں ذہن مفلوج ہو جائے، وہاں اس پر ویسے ہی شرعی گرفت اٹھ جاتی ہے۔ اس مرحلے کے بارے میں تو کوئی اشتباہ نہیں ہے کہ باہوش وحواس اپنی زندگی ختم کرنا صریحاً کفر ہے۔

برصغیر کی تقسیم نامناسب

مجھے کوئی شخص برا نہیں لگتا۔ کوئی ہستی ایسی نہیں، جس کے ساتھ میں گذر بسر نہ کرسکوں۔ مگر بدقسمتی دیکھئے کہ اس ذہنی سطح پر مجھے ہندو قطعی طور پر ناقابل برداشت لگتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں ہندو اور ہندومت کو شرف انسانیت کی تذلیل سمجھتا ہوں۔ مجھے محسوس یوں ہوتا ہے کہ جیسے دو بلین سال پرانا ثقافتی رویہ ان مہذب لوگوں کے باطن میں چھپا ہوا ہے۔ ان کی رجعت اتنی کڑی اور اتنی شدید ہے کہ آج بھی آپ ان کا کلچر دیکھیں، تو پتھر کے بتوں کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس قدر ذہنی اپج اور کلچر کے باوجود ان کی بنیاد قطعی بے لوچ، پست اور اتنی غیر عقلی ہے کہ وہ ایک خدا پر ایمان نہیں لا پاتے۔ اس صورتحال میں وہ مسلمان کے لیے کس قدر فراخدل ہو سکتے تھے یا ہو سکتے ہیں؟ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر ان کا وہ رویہ ابھی تک سلامت ہے، تو ہم کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

دوسری بات یہ کہ انگریز جان بوجھ کر ایسی کمپلیکس قوم چھوڑ کر جانا چاہتا تھا کہ ہندو بڑی آسانی سے اس پر قابو پا لے۔ انگریز کی نظر میں ہندو زیادہ تصنع والا تھا اور یہ ان کا فراڈ تھا کہ وہ اپنی جبلت کو بڑی نفاست کے ساتھ نئے رویوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ آج بھی ان کا وہی رویہ ہے۔ جو کچھ ہم ان کے بارے میں ٹی وی پر دیکھتے ہیں، حیران کن نہیں ہے۔

They are over conscious of the fact that they have no religion. Hindusim is no religion.

(وہ اس حقیقت پر بہت حساس ہیں کہ ان کا کوئی مذہب نہیں۔ ہندومت کسی مذہب کا نام نہیں)

مگر ہندو یہ بات کہنا نہیں چاہتا۔ وہ رسم و رواج اور ممنوعات سے اپنی آشنائی کو آپ پر مسلط کرنا ضرور چاہتا ہے۔ مثلاً پوچھئے کہ تم بت کیوں پوجتے ہو تو کہے گا، علامت ہے، ورنہ پوجتے تو ہم اسی خدائے واحد کو ہیں۔ اب اس صورتحال میں ہم تو قطعاً ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ پاکستان اجماع امت کے نتیجے میں بنا ہے۔ یہ سائنس دانوں یا فلاسفروں کے کہے پر نہیں بنا۔ اجماع، حضور اکرمؐ کی حدیث ہے کہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اور یہ دیکھ لیجیے کہ تمام علماء نے اس وقت پاکستان کی مخالفت کی۔ یہ واحد امت ہے کہ جس کی امت درست سوچتی ہے اور اس کا عالم غلط سوچتا ہے۔ اجماع

Marfat.com

امت کے نتیجے میں چھبیس کروڑ انڈیا اور دس کروڑ جو بنگلہ دیش میں مسلمان نظر آتا ہے، نے پاکستان بنایا ہے۔ اجماع امت یہ تھا کہ چاہے ہم انڈیا میں رہیں، لیکن ایک خطہ ایسا ہونا چاہیے اب ہم کہتے ہیں کہ ہم نے ایک کی بجائے دو مسلم ممالک بنا لیے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مسلمان ممالک نہیں ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جس دن پاکستان بنا ہے اسی دن ہم نے اس کمٹمنٹ سے غداری کی اور فرار اختیار کیا ہے، جس کا نعرہ تھا، پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ!

ہمارے پاس دو حل ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ ایک مولوی کا اسلام ہے، جو خوفناک ہے۔ دوسرا اسیکولرازم ہے، جو اسلام کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ پچاس سال کے دوران عوام کو ذرہ برابر چانس نہیں ملا کہ وہ کوئی کردار ادا کر سکیں۔ اگرچہ موجودہ نظام سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔ تاہم ایک لوکل سسٹم میں جان بوجھ کر میں نے حصہ لیا۔ صرف اس غرض سے کہ میں کم از کم ایک اسلامی ادارے کی ابتدا کر جاؤں۔ میں نے ان کے سامنے کمٹمنٹ کی کہ میں اپنی یونین کونسل میں صدقات کا اجرا کروں گا۔ جس روز میرا کزن انتخابات میں کامیاب ہوا، ہم نے اسلامی صدقات کی ابتدا کی۔ اس صدقات فنڈ میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ ہم روزگار کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ سات ہینڈ پمپ لگا بیٹھے ہیں۔ بجلی کے بے شمار پول نصب کروا چکے ہیں۔ ابھی ہم بیٹھے بھی نہیں اور ہم نے اسی فیصد وعدے پورے کر لیے ہیں۔ اس علاقے میں میرا ایک اسسٹنٹ کمشنر دوست آ گیا۔ وہ بھی مجھ سے ایک ٹیچر اور اللہ سے بندگی کی حیثیت میں کمیٹڈ تھا۔ یہ شہر کھنڈر تھا۔ ہم دونوں نے شہر کا دورہ کیا۔ گورنمنٹ کی جانب سے ہمیں کوئی مدد نہیں ملی۔ آپ اس شہر کا چکر لگا کر دیکھیں، آپ کو ہر جگہ مضبوط سڑکیں نظر آئیں گی۔ آپ کو ترقی کا لوگوں تک پہنچتا ہوا اثر محسوس ہوگا۔

سچ یہ ہے کہ ہم جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں کہ ہم بنیادی مسئلے کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمارے محلوں میں نوجوان کثرت سے تسبیح پڑھتے نظر آئیں گے۔ یہ بھی غلط ہے ہمارے پاس ان کے لیے کوئی نوکریاں نہیں ہیں مگر ان کو صبر کی کیفیت تو حاصل ہے۔ ہم انہیں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو اللہ کے فضل سے ایک اتحاد تخلیق کر کے ضرور بتاؤں گا، جسے آپ دینی تحریک کہہ سکیں۔ اس میں مولوی کا نہیں، اللہ کی رحمت کا اثر ضرور نظر آئے گا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم گریز کرتے بہت دور چلے گئے ہیں۔ پاکستان بننے کا فیصلہ صحیح تھا۔ پاکستان کو خراب کرنے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر عائد نہیں ہوتی، اس کے مولوی پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے بڑے لوگوں اور رہنماؤں پر ہے۔ اس کی کرپٹ لیڈر شپ پر ہے۔

پاکستان، راہِ فرار

اگر آپ کی بات کو ٹیکسٹ کے حساب سے لیا جائے، تو بات سو فیصد درست ہے مگر اسلام یہ نہیں کہتا کہ ساری دنیا کو فتح کرو، اس پر قبضہ کرو، جہاد بنیادی طور پر ایک ایسا دفاع ہے، جس میں آپ چھوٹی سی جگہ میں اپنا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی کو محفوظ نہیں پاتے۔ اس کے خلاف مسلسل جارحیت ہو رہی ہے، تو آپ کا حق بنتا ہے کہ آپ اس جارحیت کا مقابلہ کریں، ان کے ساتھ لڑیں۔ اس میں بھی اللہ میاں نے کہا کہ لڑو، مگر اعتدال سے آگے نہ بڑھو۔ اسلام میں دارالامن اور دارالحرب کا کانسیپٹ ہے۔ وہ لوگ انڈیا سے ادھر نہیں آئے، لیکن پاکستان بنانے پر ان کے دل آمادہ تھے۔ اس پر ان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے لحاظ سے وہاں ٹھہرنا زیادہ بہتر خیال کیا۔ پھر اتنے زیادہ اخراج عوام کی ایک نئی

Marfat.com

جگہ متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ بہت سارے مسلم لیڈر یہ خیال کر رہے تھے کہ اگر پاکستان بن گیا، تو ایک سائیڈ کے دارالامن کی وجہ سے ہمارے پاس ہر وقت ایک Way out رہے گا کہ پاکستان جا سکیں۔

دوسرا ان کا خیال یہ تھا کہ اس طرح اگر ہم سارے لوگ یکجا رہے، تو اکثریت غلبہ حاصل کر کے اقلیت کو بالکل ختم کر دے گی۔ جیسے اب ہماری دو ریاستیں پاکستان اور بنگلہ دیش کی صورت میں بن گئی ہیں۔ اگر ہمارے ساتھ انڈیا میں کچھ ہوتا ہے، تو اس کا جواب پاکستان اور بنگلہ دیش باہر سے دے سکے گا۔ اس طرح انہیں اپنی حفاظت کے لیے ایک مضبوط لیوریج مل گیا ہے۔ انڈیا میں ذرا سی گڑ بڑ ہوتی ہے، تو حکومت پاکستان اور حکومت بنگلہ دیش اس پر احتجاج کرتی ہے۔ چنانچہ یہاں سے سیاسی اظہارات و بیانات سے انہیں امن قائم کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ ہندوانہ فلاسفی تو مکمل فنا کی قائل ہے۔ اس کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جتنی بھی مذہبی تحریکیں ہندوستان میں اٹھی ہیں، وہ مکمل طور پر ختم ہو گئی ہیں۔ چاہے وہ جس فرقہ یا مذہب کی تھیں، کوئی مذہب سوائے اسلام کے ہندومت میں پھل پھول نہیں سکا۔

اسلام صرف اپنے وحدانی نظریے کی وجہ سے زندہ رہ گیا۔ وہ کسی قیمت پر بھی خدا کے تصور پر مصالحت اختیار نہیں کرتا۔ دو خداؤں کا تصور اسلام میں نہیں۔ یہ اتنا سائنٹیفک کانسپٹ ہے کہ مسلمانوں نے اس کے لیے خوب جم کر لڑائی کی، اس کا دفاع کیا۔ ایک ہزار سال کے تصادم کے باوجود اسلام ان کے قبضے سے بچ نکلا۔ آپ آئیڈیل ازم کو کسی موقع پر بھی الزام نہیں دے سکتے۔ آپ کو اپنے آپ کو موردالزام ٹھہرانا چاہیے۔ آپ اپنے وعدے سے مکر گئے ہیں۔ آپ کو نظریے نے کوئی فریب نہیں دیا۔ یہ نقص میرا، آپ کا اور ہر اس بندے کا ہے، جس نے اپنے عہد کے ساتھ کمٹ کیا تھا، لیکن اسے پورا نہیں کیا۔ آج بھی ہم اتنے منافی اور جذباتی لوگ ہیں کہ ہمارا سیکولر حکمران بھی اوپر چڑھ کر یہی کچھ کہتا ہے۔

ہمیں زندگی میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ خیال کی حد تک ہم کسی چیز سے کمیٹڈ ہیں۔ اگر ہم اپنے مذہب سے کمیٹڈ اور نظریاتی تشخص سے متفق نہیں ہیں، تو اس میں کس کا قصور ہے؟ اس میں آئیڈیا کا نہ ملک کا قصور ہے۔ اسرائیلیوں کو دیکھ لیں، وہ اپنے جیوش لینڈ کے ساتھ کس قدر کمیٹڈ ہیں کہ بیسیوں مسلمان ملکوں کو انہوں نے نکر پر رکھا ہوا ہے۔ ان کے بالمقابل مسلمان ممالک کو بمشکل قوم پرستی سے باہر نکلے ہیں۔ کون بچائے گا، تو اس نے کہا امریکہ۔ یہ نہیں کہا، ہمیں خدا بچائے گا۔ یہ ہمارے اپنے ایمان کی بات ہے۔ خداوند کریم نے جب وعدہ کیا ہے کہ ولا تھنو کہ سستی نہ کرنا میرے بارے میں ولا تحزنو اور غم نہ کرنا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین مجھے اپنے عزت و جلال کی قسم ہے، تم ہی غالب رہو گے، اگر ایمان والے ہوئے تو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مومنین نہیں ہیں۔ ہمیں بلاتکلف یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ہم میں مومنین سرے سے ہیں ہی نہیں۔ ہم وہ ایمان ظاہر نہیں کر رہے ہیں، جس سے خدا ہمیں انفرادی یا اجتماعی طور پر برکت اور عزت دے۔ مجھے یہ سو فیصد یقین ہے کہ اگر ہماری ترجیحات درست ہو جائیں، تو کوئی طاقت پاکستان کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ ہم اسلامی دنیا کی قیادت کرنے کے پابند ہیں۔

پاکستان کا مسئلہ

پاکستان کا مسئلہ بدعہدی، غداری اور خدا کے دین سے بھاگنا ہے۔ پاکستان سے اللہ بالکل خوش نہیں۔ نبی

Marfat.com

اسرائیل کے ضمن میں اللہ نے فرمایا کہ انہوں نے مجھ سے کہا کیا، نبھایا، بخش دیا۔ انہیں اپنی سرزمین پر اتارا اور ان کے لیے دودھ اور شہد کی نہریں چلائیں۔ مگر جب یہ پلٹ گئے، تو میں پلٹ گیا۔ جب آپ کو مصیبت تھی، عذاب تھا، ہندوؤں اور انگریز کی غلامی سے نکلنے کے لیے مچل رہے تھے۔ وجوہات اور بھی تھیں۔ آپ کے پاس نوکریاں اور رزق کم تھا۔ آپ کے اکابر کے لباس آپ کے چپڑاسی پہن رہے تھے۔ آپ کو روز ذلت و رسوائی سے روشناسی دی جا رہی تھی۔ آپ کا کوئی نعرہ اتنا موثر نہیں تھا کہ آپ کو جمع کر سکتا۔ پھر سب نے مل کر نعرہ مارا، پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ

اس وقت شیخ العرب والعجم اور شیخ الہند اور از خود بڑے بڑے خطاب یافتہ لوگ موجود تھے۔ برصغیر میں بہت تھے۔ تو مرا حاجی بگو من ترا ملا بگو۔ ایک دوسرے کی تعریف میں صفحے کالے کر رہے تھے۔ بڑے بڑے علماء ظاہر و باطن موجود تھے مگر ایک شخص جو نہ بکنے والا تھا، ان میں کوئی نہ تھا۔ مکر و فریب کا جال تانا اور بنا ہوا تھا۔ موہن داس کرم چند، اپنے وقت کا ٹاپ انٹلکچوئل گنا جاتا تھا۔ تمام امرائے اسلام اس کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتے تھے۔ یہ لوگ اس قابل نہیں تھے کہ خدا ان کی طرف، جو آج بڑے بڑے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، آنکھ بھی اٹھا کر دیکھتا۔

اس کے برعکس جس کی ظاہری زندگی میں بظاہر کوئی اسلام نہ تھا۔ جو مغربی ماحول میں پلا بڑھا اس نے شاید سوٴر بھی کھایا ہو، شراب بھی پی ہو، اس کی زندگی میں کوئی ایسا قرینہ نظر نہیں آتا تھا کہ اس کے باطن میں چھپا ہوا ایک کٹر ترین اور اپنے موقف پر اڑا ہوا سخت ترین مومن موجود ہے۔ اس سے کسی نے پوچھا، قائداعظم، یہ تو اتنی محنت جو کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے؟ اس نے کہا، میں صرف ایک کام کے لیے کر رہا ہوں۔ میں مرنے کے بعد اللہ کے پاس جاتا ہوں، تو مجھے اللہ یہ کہے کہ Well done Mr.Jinnah! اس کی جوابدہی صرف اللہ کے ساتھ تھی۔ وہ کسی اور کو جوابدہ سمجھتا نہیں تھا۔ لارڈ ویول نے جب اسے کہا

Muhammad Ali One can become the Lieutenant Governor of India, why cannot another be? (محمد علی اگر ایک ہندوستان کا گورنر بن سکتا ہے، تو ایک اور کیوں نہیں) ہم آپ کو لیفٹیننٹ گورنر بناتے ہیں۔ انہوں نے ٹوپی اٹھائی اور دوڑ لگا دی۔ وہ پیچھے پیچھے بھاگا، مسٹر جناح، مسٹر جناح۔ انہوں نے کہا،

Your Lordship, I have not come to bargain on my national interest, (جناب میں اپنے قومی مفادات پر سودے بازی کے لیے نہیں آیا)

پھر اللہ نے انہیں اٹھا لیا کہ جو اس کا کام تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ شاید بنانے کے بعد وہ سارے پیٹرن کو چلا نہ پاتا کہ وہ اسلام سے اتنا واقف نہ تھا۔ قانون اسلام سے واقف ضرور تھا۔ اچھا ہوا کہ وہ دنیا میں اپنا کیس بہت اچھی طرح پیش کر کے رخصت ہو گیا۔ آنے والوں نے نہ صرف اس سے اور پاکستان سے غداری کی، بلکہ ملک اسلام سے غداری کی۔ اب خدا کہتا ہے کہ مجھ سے پلٹ جاؤ گے، تو میں پلٹا ہوا ہوں۔ جب تم میری طرف لوٹو گے، تو میں بھی تمہاری طرف لوٹ آؤں گا۔

برصغیر میں دو بڑے دشمن اسلام کے پیدا ہوئے۔ ایک سیکولر، دوسرا مولوی۔ مولوی نے اتنے بڑے مابعد الطبیعیات کی مذہب کو انتہائی پست درجۂ خیال میں قید کر دیا۔ جدھر چلے جاؤ، رسم و رواج کے سوا اسلام کہیں نظر نہیں

Marfat.com

آ تا۔ اسلام کی نفیس ترین قدر جستجوئے پروردگارِ حق ہے۔ وہ اس وقت سرے سے غائب ہے۔ اب خدا کی بجائے سکولوں (مکاتبِ فکر) کی پرستش کی جاتی ہے۔ خداوند کریم بڑی وضاحت سے کہتا ہے۔ ان الذین فرقوا دینھم......جن لوگوں نے اپنے اپنے دین کے پیٹرن بنا لیے۔ فرق کیا، وکانو شیعاً اور گروہ بنا لیے، لست منھم فی شی، اے پیغمبر! تو ان میں سے کسی میں بھی نہیں۔ نہ پیغمبر دیوبند میں ہے نہ بریلی میں ہے۔ پیغمبر تو اجماعِ امت کے سینے میں ہے۔ جو بظاہر گناہگار اور کمزور لگتے ہیں، مگر آج بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے جان دینے کو تیار ہیں۔ اسی کے بارے میں اقبال نے کہا کہ شیطان مولویوں سے نہیں ڈرتا۔ سیاستدانوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ البتہ وہ اس فاقہ کش سے ڈرتا ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

یہ وہ سادہ سا آدمی ہے، جو گلی کوچے میں ایک سادہ سا ایمان لیے پھرتا ہے۔ وہ فلسفہ خداوند سے آگاہ نہیں ہے۔ مگر وہ روحِ محمدؐ سے سرشار ضرور ہے۔

پاکستان، تعمیر میں خرابی

یہ بھی اللہ کا اصول ہے، آپ کا نہیں ہے۔ جب بنی اسرائیل سے نجات کا وعدہ کیا گیا اور عسکائیل بنی کے زمانے میں ان کے بڑے لوگ اکٹھے ہوئے، تو انہوں نے ہیکلِ سلیمانی میں جا کر بت رکھے اور وہ اس پر بحث کر رہے تھے۔ ہم بھی وہی کچھ کر رہے ہیں۔ خدا نے جبرائیل امین کو عسکائیل بنی کے پاس بھیجا، جو قوم کی جگہ معافیاں مانگ رہے تھے۔ ان کو اٹھایا کہ چلو، ہیکل کے اندر جا کے دیکھو۔ تم جن کے لیے معافیاں مانگ رہے ہو، وہ کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے جا کے دیکھا کہ وہ بتوں کی جگہیں بنا رہے تھے، اور بحث و مباحثے میں مصروف تھے کہ کس پر گولڈ اور کس پر چاندی فکس کرنی ہے۔ ممکن ہے، اب بتوں کے نام تبدیل ہو گئے ہوں۔ اب ہمارے بت ذرا مختلف قسم کے ہوں۔ اس کے نتیجے میں ان پر بڑی طویل غلامی آئی اور پھر حضرت دانیال نے ان کو حیاتِ نو بخشی۔

آپ غور کریں کہ ہم نے ایک وعدہ کیا تھا۔ اس وقت ہمارے پاس ملازمتیں اور کام نہیں تھے۔ ہمیں بڑی ذلت نصیب ہو رہی تھی۔ انگریز ہمیں ہر حال میں رسوا کر رہا تھا۔ مالی طور پر ہم بڑے پریشان حال تھے۔ چپڑاسیوں اور منشیوں کے ہمارے کام تھے۔ لیبر اور جوتے پالش کا کام مسلمان کرتے تھے۔ اس سے لگتا تھا کہ برٹش ایمپائر ایک محارب مسلمان قوت کو رسوا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہمارے پاس ایک سو ایک وجوہ برٹش اور ہندو کے خلاف بغاوت کی تھیں۔ مگر ان میں سے کوئی وجہ بھی امت کو اکٹھا کرنے کا باعث نہ بن سکتی تھی۔ جاب، عزت، حیثیت نہ ہی پارلیمنٹ ان کے اکٹھ کی بنیاد بن سکی۔ جو بات ان کے کام آئی، وہ تھی پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الا اللہ یہ وہ نعرہ تھا، جس نے ہر مسلمان کو اپنے شکنجے میں لے لیا۔ صبح و شام اس کا زور لا ہوا۔ جو فرنٹ لائن پر سلوگن آیا اور جس نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا، وہ اسلام تھا۔ اقبال نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ یہ اسلام ہے، جو ہر دفعہ مسلمانوں کی مدد کو آتا ہے۔ مسلمانوں نے کبھی اسلام کی مدد نہیں کی۔ اسلام نے ہی ہمیشہ مسلمانوں کی مدد کی۔

Marfat.com

جب پاکستان بن گیا، تو سب سے پہلی کوشش ہم نے اپنی کمٹ منٹ سے علیحدگی کی کی۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم پلٹ جاؤ گے، تو میں پلٹ جاؤں گا۔ تو لوٹ آؤ گے، تو میں لوٹ آؤں گا۔ اپنے عہد سے پلٹنے کا یہ نقص ہوا کہ پاکستان کبھی اطمینان میں نہیں پڑا۔ آپ میں سے بہت سارے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہاں خدا کے کچھ بندے ہیں، جن کی وجہ سے ملک قائم ہے۔ میں سمجھتا ہوں، پاکستان قائم تھا، ہے اور انشاءاللہ رہے گا بھی، لیکن خدا کی ناراضگی اس سے کبھی بھی نہیں ہٹے گی۔ یہ خدا کی ناراضگی کا ثبوت ہے کہ ہم کبھی امن میں نہیں رہے۔ ہماری معیشت کبھی نہیں سنوری۔ کیونکہ خدا ایسے لوگوں کی پروا نہیں کرتا، جو اس کے ساتھ عہد کر کے اسے توڑ دیتے ہیں۔ ہم نے بہت بڑا عہد توڑا ہوا ہے۔ اب بھی جب کبھی اسلام کا نام آتا ہے، تو یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کس کا اسلام؟ دیوبندی، اثنا عشری، وہابی، کس کا اسلام؟ حالانکہ یہ بہت معمولی سوالات ہیں۔ سیکولرسٹ کی نیت یہ ہے کہ مسلمان کبھی یکجا نہ ہوں۔ سیکولرسٹ ہی اس حکومت پر رول کرتا آیا ہے اور وہ بہت ہوشیار ہے۔ آپ کا پورے کا پورا ماحول مل کر بھی ایک ہوشیار سیکولر کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ بہت ہوشیار اور بہت ذہین ہے۔ اگر مذہب میں توازن اور شائستگی نہیں ہے، تو یہ مذہب کا قصور نہیں ہے۔

ایک آدمی اندلس اور ماریشس کے ساحل پر اترتا ہے۔ عرب ہے، اس کی زبان بھی اجنبی ہے۔ اس کا کیا کلچر ہو گا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک شہر کو تبدیل کر دیا۔ ملک میں اسلام پھیلا دیا۔ انڈونیشیا میں چار بندے اترتے ہیں اور انہوں نے اترتے ہی سارا انڈونیشیا مسلمان کر دیا۔ ہم میں وہ کلچر نہیں رہا، جو بنیادی اسلامی کلچر ہے۔ اسلامی بندے کو کیا لگے کہ جب وہ قرآن میں لا اکراہ فی الدین پڑھ کر باہر کافر کو اس کی آزادی دیتا ہے، لیکن مسلمان بھائی کو نہیں دیتا۔ یہ کیا کلچر ہے، جو اسلام کری ایٹ کرتا ہے۔

مذہب نے کہیں بھی پگڑ باندھنے کے لیے کوئی مسئلہ نہیں کھڑا کر رکھا۔ کہیں بھی ننگے سر پر سب وشتم نہیں ہوئی۔ اکثر اصحاب رسول، رسول اللہؐ کے زمانے میں ننگے سر نماز پڑھتے تھے، اور جو واحد حدیث آئی ہے، وہ ننگے سر پر آئی ہے۔ اس کو حدیث مشعر کہتے ہیں۔ اس وقت کنگ کے بھی بندوبست نہیں تھے۔ جب وہ سجدے میں جاتے تھے، تو ان کے بال آگے پڑتے تھے اور سجدے کے عالم میں ہی انہیں سنوارنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو فرمایا کہ مشعر کو چھوڑ دو، مشعر کو چھوڑ دو، مشعر کو چھوڑ دو۔ یہ صرف ایک حدیث بالوں کے بارے میں ہے، جو بخاری اور مسلم میں موجود ہے۔ اب اگر کوئی بندہ اٹھتا ہے اور آپ کو بتاتا ہے کہ پگڑی باندھنا ضروری ہے، یا داڑھی نہ ہونے کے بارے میں پوچھتا ہے کہ کیا یہ فسق و فجور کی علامت نہیں؟ میں نے کہا، تم فسق کی تعریف نہیں جانتے کہ یہ کتنا شدید لفظ ہے؟ یہ لفظ قرآن صرف کافر پر استعمال کرتا ہے۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلم معاشرے میں جہاں سب داڑھیاں رکھتے ہیں، داڑھی نہ رکھنا مکروہ ہے مگر مکروہ تو پیاز اور تھوم کھانا بھی ہے۔ جمعہ کی نماز میں سختی سے منع کیا گیا کہ ایسی چیزیں مت استعمال کرو، جس سے دوسرے لوگوں کو تکلیف ہو۔ بہت ساری حلال چیزوں پر کراہت کا حکم آتا ہے۔

مگر اس کے باوجود جب طالبان پر حملہ ہوا، تو میرے جیسا مسلمان سو فیصد ان کے ساتھ تھا۔ میرا اپنا مذہبی احساس یہ کہتا ہے کہ چاہے کم ترین سطح سہی، مگر مجھے پندرہ بیس دن ان کے حق میں دعائیں مانگتے ہو گئے۔ طالبان نے وہ

Marfat.com

دعائیں نہیں مانگی ہوں گی، جو میں نے ان کے لیے مانگیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک کشادہ اور بلند مذہب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارا کیا حال ہے؟ ایسی بلندی ایسی پستی! مسلمان کی پستی دیکھ کر میں خداوند کریم کو کئی مرتبہ طنزاً کہتا ہوں کہ تو نے اس قسم کے لوگوں سے جو ادھر ادھر پھرتے ہیں، کیا لینا ہے؟ دنیا کو تو نے سب سے ذہین انسان دیئے ہیں۔ معیشت، سائنس اور سپورٹس میں سپیشلسٹ ہیں۔ انہیں اعلیٰ ترین ٹیلنٹ دیا ہوا ہے اور اپنے لیے تو نے کیا چنا ہوا ہے؟ یہ، جو اپنی رسوم اور رواج میں سخت گیر قسم کے جرائم پیشہ ہیں۔

مگر خدا کا کہنا یہ ہے کہ لوگ چھوٹی چھوٹی منازل پر نہ رک جائیں۔ مذہب کے اصل مقصد کو پہچانیں اور مذہب کا صرف ایک مقصد ہے کہ یہ خدا کی جانب راستہ ہے، کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ مذہب صرف اسی ایک مقصد کو پورا کرتا ہے۔ جب کسی مذہب میں خدا ہی نہ ہو۔ اس کا شعور، احساس اور خیال ہی نہ ہو۔ جواب وہی کہیں بھی اللہ کی طرف نہ مڑتی ہو، تو اس مذہب میں کیا رہ جائے گا؟ آپ وہاں بھی Occult کی پرستش کرتے ہیں۔ جہاں بھی عقل رکتی ہے، وہاں بت خانہ پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ کے ساتھ عقل کہیں نہیں رکتی۔ یہ آگے سے آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس میں ادراک اور نفاست ہے۔ اس میں الہام ہے۔ سب سے بڑھ کر وہ چیز ہے، جو اللہ کے رسولؐ نے فرمائی کہ فراست مومن سے ڈرو، وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ہم یہاں کس کے پاس فراست مومن یا علم کہہ سکتے ہیں؟ کس کو کہیں گے کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے؟ ہمارے علماء کرام الاماشاء اللہ اکیڈیمک سے آگے سوچتے ہی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نماز پڑھ کر ہمارا فرض پورا ہو گیا۔ میں کہتا ہوں، ان کا بھی طرز فکر ٹھیک ہے مگر وہ پرائمری کلاس سے آگے جانے کے قابل نہیں۔ آپ ان کی مدد سے اپنے بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھا سکتے ہیں۔

پاکستان، ایک نیشن سٹیٹ

حقیقت میں ہمارے ہاں زمین سے تعلق کا مذہب میں کوئی تصور نہیں۔ بلکہ آپ اگر ایک مشہور مثال دیکھیں کہ طارق بن زیاد جب اندلس کی سرزمین پر اترا، جسے اقبال نے بڑے مشہور اشعار میں لکھا۔

طارق چوں بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا است

کہ یہ کیا آپ نے بے عقلی کی، کہ اب ہم واپس پلٹنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، کیا کیا کہ ساری کشتیاں جلا دیں۔ تو اس کا جواب تھا۔

دوریم از سواد وطن باز چوں رسم
ترک سبب ز روح شریعت کجا رواست
خندید دست برد بہ شمشیر خویش، گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

بالعموم مسلمان کا نظریہ یہی رہا ہے کہ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست۔ تازہ ترین ریسرچ کے حوالے

Marfat.com

سے دیکھیں کہ ہماری جینز کس سے جا کر ملتی ہیں؟ ہم سب کا یہاں Survivalists arrival ہے۔ جب ایک بہت بڑے عالم دین نے یہ کہا تھا کہ ملتیں اوطان سے بنتی ہیں، تو اقبال نے اسلام کے فلاسفر کے طور پر اس پر سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
گر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کبھی نیشنلسٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمیں ایک زمین اس لیے بے پناہ عزیز ہو سکتی ہے کہ خدا نے ہمیں یہ زمین اپنے اپنے مسلک اور خیال کی تائید کے لیے دی ہے۔ اس لیے ہم اس زمین کو اللہ کا انعام سمجھ کر اس کا پورا پورا دفاع کر رہے ہیں۔ ہم زمین کے اس تختے کے لیے اس لیے جان دیں گے کہ یہ ہماری نہیں، بلکہ یہ خدا کا انعام ہے، جو اس نے ہمیں عطا کیا ہے۔ اس ملک سے ہماری وابستگی اور محبت بڑی لازم ہے، لیکن جب میں اسلام کے حوالے سے مسلمان کو دیکھتا ہوں، تو پاتا ہوں کہ ہم اچھی طرح تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ ہر وہ کوشش جو اسلام کو مزید کمزور کر دے، ناقص ہے اور اس چیز کو ہم کبھی بھی اسلامی رویہ نہیں سمجھ سکتے۔ پوری اسلامی دنیا میں ابھی یہ شعور پیدا نہیں ہوا کہ ہمیں اتنا طاقتور ضرور ہونا چاہیے کہ ہم مغرب کی بالادستی کے مقابلے میں ڈٹ سکیں۔

(افغانستان کے حوالے سے) ہماری حکومت نے جو فیصلہ کیا، اس میں حکومت غلط تھی، مگر اجماع کی نمائندگی ہو گئی۔ ہم کسی بھی جنگ کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ ہمارے پاس پناہ گاہیں نہیں تھیں۔ ہم تو چٹیل میدان میں بیٹھے ہیں۔ ذرا سی تند و تیز ہوا بھی پورے ملک کو بہا لے جا سکتی ہے۔ ہماری حکومت سمیت مسلم ملکوں کی حکومتوں نے مغرب کو برابری کی سطح پر جواب دینے کا کبھی نہیں سوچا۔ پاکستان واحد ملک ہے، جسے اس پوزیشن میں آنے کے لیے کہ وہ مغرب کو جواب دے سکے، کم از کم تین سے پانچ سال چاہئیں۔ اس میں اتنی ذہانت اور گنجائش ہے کہ اگر آپ 35 سو میل تک مار کرنے والا میزائل بنا سکتے ہیں، تو آپ انٹر کانٹی نینٹل بیلسٹک میزائل بھی بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں، تو ہم پاکستانیوں نے بھی کیا ہی کچھ نہیں۔ ہم نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری مسلم دنیا کے لیے قربانی دیتے آ رہے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو بھوکا رکھا۔ ہزاروں مسائل سہے اور ہم نے ایک ایسی سمت میں پیش رفت کی ہے، جس میں کسی اور مسلم ملک نے پیش رفت نہیں کی۔

لوگوں کو اس بات کا شعور نہیں دیا گیا کہ ہم اتنی بڑی قربانی کس لیے دے رہے ہیں۔ جب ہم دوسرے مسلمان ملکوں کے حالات دیکھتے ہیں، تو پتہ چلتا ہے کہ انہیں بھی احساس نہیں ہے۔ پاکستان واحد ملک ہے، جس میں کبھی بھی قوم پرستی اتنی مضبوط نہیں ہوئی کہ ہم اسلام کو بھول گئے ہوں۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کے جذبات بڑے خالص اور صاف ستھرے ہیں۔ مگر علم کی کمی کی وجہ سے ہم نیچے آئے ہیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں پر ذلتیں اور پڑنے والی ماریں غلط نہیں ہیں۔ اب عراق بھی عمومی اسلامی تصور کی طرف پلٹا ہے۔ اس سے پہلے تو صرف بعث کمیونسٹ پارٹی تھی۔ اس نے تبدیل ہو کر اسلامی تشخص اختیار کیا ہے۔ اس تمام بحرانی عرصے میں کس نے اس کی مدد کی ہے؟ پاکستان اس کی ادویات اور دیگر ضروریات کے حوالے سے ہر ممکنہ طریقہ سے امداد کر رہا ہے۔ کیونکہ پاکستان میں جو کچھ بھی ہے، ایک خالص اسلام ضرور ہے۔ مذہب کے لیے جو جذبات پاکستان میں ہیں، کسی عرب میں نہیں ہیں۔ مثلاً اسلام سعودی عرب کا قبائلی مذہب ہے۔

Marfat.com

مذہب ان کے ایک قبیلے کو اقتدار میں رہنے میں مدد کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اتنی بے پناہ دولت ہے کہ ایک انگریز نے کہا تھا، جہاں تیل ہے، وہاں مسلمان ہیں اور جہاں مسلمان ہیں، وہاں تیل ہے۔

ان تمام ابتدائی ممالک میں اگر کوئی بھوکا ننگا پھرتا ہے، تو وہ پاکستان ہے۔ ہم کیوں مغرب کی جانب دیکھیں؟ ہم پر بہت دباؤ آ گئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ہمیں جو مسلسل ذلتیں مل رہی ہیں، وہ ہمیں اکٹھا ہونے کی سوچ پر مجبور کر رہی ہیں۔ امید ہے، چند ماہ کے اندر مسلمان کم از کم ایک ملک کو اتنا سپورٹ کریں گے اسے مضبوط بنائیں گے کہ وہ جواب دینے کے قابل ہو سکے۔ اس کے بعد حدیث مبارک کے مطابق اسرائیل کا نام ونشان مٹ جائے گا اور دجال سے براہ راست لڑائی بھی ہوگی۔ میں نے اپنی ایک تقریر ''فتنۂ آخر زماں'' میں کہا تھا 2005ء میں ایک باقاعدہ جنگ شروع ہو جائے گی اور 2002ء میں ایک دو ایسے بڑے واقعات ہوں گے کہ اس کی بنیاد پڑ جائے گی۔

پاکستان میں اسلام

آپ کسی بھی گروپ میں چلے جائیں، وہ بالآخر ایک بڑے گروپ کا حصہ بن جاتا ہے۔ میں بڑی سختی سے اس موقف پر قائم ہوں کہ میری زندگی صرف ایک شناخت پر ہے کہ میں ایک مسلمان ہوں۔ اس سے آگے میں کسی بھی قسم کی گروہی مناسبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں انہی خطوط پر کام کر رہا ہوں۔ تنظیم میں تو لوگ گنے جاتے ہیں۔ میں الحمدللہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے احباب گنے نہیں جاتے اور مجھے یقین ہے کہ جتنی بڑی تعداد میں لوگ تبدیل ہو رہے ہیں، سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جو اپنے معاشروں اور سیاسی نظاموں میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ بہت بڑھ گئے ہیں۔ اللہ نے ہمیں بڑی بڑی کامیابیاں بخشی ہیں مگر (1) میں بطور استاد بہت زیادہ ہجوم میں گھر گیا ہوں۔ (2) میرے ساتھ عام آدمی وابستہ ہے۔ (3) میں منتظم نہیں ہوں۔ میں ابھی تک اسی طرح ہوں، جیسے میں نے آغاز کیا تھا۔ (4) میرے پاس ہر قسم کے فنڈز اور اشیاء کی کمی ہے۔ سوائے، اس کے کہ خدا مجھے مہمان نوازی کا خرچہ دے، میں عام طور پر ٹیلیفون بھی افورڈ نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود میرا اپنا یہ یقین ہے کہ مجھ سے خدا نے اتنی عنایت فرمائی کہ لاکھوں لوگ میرے ساتھ وابستہ ہیں۔

بڑی بات یہ ہے کہ وہ تبدیل ہو رہے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہیں وہ آرمی میں ہیں، چاہے سول سروس کے لوگ ہیں۔ کوئی ایک ٹیچر ایسا نہیں ہے، جس کے ساتھ اتنا الیٹ وابستہ ہو۔ فوج کے تقریباً پچاس فیصد افسر، اسی طرح پچاس فیصد سے زائد سول سرونٹ اور پچاس فیصد سے زائد پولیس آفیسر میرے ساتھ وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر بے شمار ہیں۔

مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ مجھے تقویت دے رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ترجیحات کو نئے سرے سے سیٹ کر رہے ہیں۔ یہ انقلاب کا نہیں، تدریج کا سلسلہ ہے۔ اس کے مقابلے میں تمام مذہبی لوگ، جو پہلے سے موجود ہیں، ایک ایسا انقلاب ملک میں لانا چاہتے ہیں، جس کی خدا کبھی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی انقلاب کے تمام داعی ایک بات بھول لیتے ہیں کہ کوئی انقلاب اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں آ سکتا اور اللہ کی مرضی ان کے ساتھ شامل حال نہیں۔

یہ ایک مسئلہ ہے جو کبھی بھی اسلامی جماعتوں نے نہیں سمجھا۔ طاقت کا نشہ ان سب کے ساتھ وائرس کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ یہ اس بات کو سمجھتے نہیں کہ طاقت کے نشے والے کو خدا کبھی اقتدار نہیں دیتا۔ پھر وہ اپنی اتنی بڑی امانت ان کے

Marfat.com

سپرد کیسے کرسکتا ہے۔ یہ تو اس کو دوسرے دن تہہ و بالا کر کے ذاتی اغراض کی بھینٹ چڑھا دیں۔ یہ ساتھ (افغانستان میں) اسلام آیا، قبائلی نظام اور مذہب کو اسلام کے نام پر پیش کیا جاتا رہا۔ ہاں میں یہ کہوں گا کہ کچھ قبائلی لوگوں نے اپنے سسٹم میں دو چار اسلامی شقیں شامل کیں۔ کون کہتا ہے کہ اسلام پگڑی باندھنے پر زور دیتا ہے۔ تعلیم نسواں کو روکتا ہے یا بند کرتا ہے؟ کون کہتا ہے کہ اسلام نے اتنا سخت پردہ رکھا ہوا ہے کہ تم باہر ہی نہیں نکل سکتے؟ یا بوڑھیوں پر اللہ نے پردہ رکھا ہوا ہے؟ جیسے چاہیں چلیں، وہ کہاں چادریں سنبھالتی پھریں۔

دوسرا ایک طبقہ ہے، جن کو انسان میں ٹھوڑی کے اگے ہوئے چند بالوں کے ساتھ کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر وہ بال اگے ہوئے ہیں، تو آپ کو صحیح مانتے ہیں۔ اگر نہیں ہیں، تو تم جو چاہے کرلو، تم مسلمان نہیں ہو۔ محمد رسول اللہؐ نے ایک بدتمیز ترین کلاس اٹھائی۔ وحشی، بے تمدن، جاہل مطلق، رنج دینے والے، آزاد پیشہ اور جنگلی۔ ایسی بدتمیز کلاس پہلے کسی استاد کو نہیں ملی اور ایسا خوبصورت، حسن مروت والا استاد بھی پہلے کسی کو نہیں ملا۔ بائیس برس تعلیم دی اور بدترین لوگوں کو کائنات کے بہترین انسان بنا کر ابھارا۔ یہ استاد ہوتا ہے۔ یہ استادی ہے۔ چھڑی ماری نہ گالی دی۔ سرزنش کی نہ ان پر کوئی بوجھ ڈالا۔ بس محبت ہی محبت بانٹی اور ان وحشیوں کو ایسا متمدن اور خوبصورت کر دیا کہ کہاں وہ ابوجہل اور کہاں اصحاب رسول۔ یہ معجزہ تعلیم ہے۔

اور اب کلاشنکوفوں سے گھیرنے، مارنے اور تعصبات گہرے کرنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ مسلمان کو تعصب سے کیا غرض۔ جو آغاز ہی لا اکراہ فی الدین سے کرتا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں، وہ کہاں سے تعصب پالے گا؟ اسلام کہتا ہے کہ جس نے مسلمان بھائی کو مارا، قتل کیا، وہ دونوں جہنمی ہیں۔ پوچھا گیا، یارسول اللہ! مقتول کیوں؟ فرمایا کہ اس کے بس میں ہوتا، تو وہ بھی اس کو قتل کر دیتا۔ کیا ان کو سادہ سی حدیث کا نہیں پتہ، جو نعرے مارتے ہوئے کلاشنکوفیں لے کر باہر نکلتے ہیں اور بندے مار دیتے ہیں؟

پاکستان کا مستقبل

حضورؐ سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی۔ فرمایا، جب زمین پر ایک بھی شخص اللہ اللہ کرنے والا نہ رہے گا۔ پاکستان ابھی خوش قسمت ہے کہ یہاں ابھی بہت سارے لوگ اللہ اللہ کررہے ہیں۔ اس لیے اس پر قیامت نہیں ٹوٹے گی۔

Marfat.com

بست وکشاد

خدا۔۔۔۔ ترجیحِ اول

پچاس ساٹھ سال پہلے ہمارے بڑے معظم ومحترم فلسفی شاعر علامہ اقبال نے منطقی اور فلسفیانہ دلائل کے ساتھ وحی اور خدا کا اثبات کرتے ہوئے ایک نئے ذہن کی تشکیل کی کوشش کی۔ ایک پرانے مذہبی رسم ورواج سے ہٹ کر انہوں نے مذہب کو ایک اعلیٰ ترین فکری سطح پر اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ناقابل فہم ہونے یا شاید بہت زیادہ علمیت کے انداز نے علامہ کو بہت سارے لوگوں تک پہنچنے نہیں دیا، مگر ان پچاس ساٹھ برسوں میں ایک بات ضرور واضح ہوگئی ہے کہ جو چیلنج آج کے مسلمانوں کو درپیش ہیں، وہ اُن چیلنجوں سے بڑے مختلف ہیں، جو علامہ کو درپیش تھے۔

آج کا چیلنج فلسفیانہ اور علمی نہیں ہے، بلکہ سائنس نے اتنی حیرت انگیز ترقی کی ہے اور وہ اتنی سرعت سے قدیم انسانی افکار اور یقین کو پامال کرتے ہوئے آگے بڑھی ہے کہ ذہنی بالادستی اب اہم نہیں رہی۔ اس کے برعکس عملی اندازِ نظر، عملی طرزِ عمل اور طاقت کا تصور نئے تعصبات لے کر آیا ہے۔ نئی پسندیدگیاں لایا ہے۔ آج کا مغربی ذہن اور مغربی فکر زیادہ سے زیادہ اعداد وشمار پر مبنی ہے۔ وہ آپ کو کسی کے جذب وایثار واحساس سے بالکل محروم کر دیتی ہے۔ وہ آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس معروضی دنیا میں آپ کے احساسات اہم نہیں ہیں، بلکہ سائنس نے بالآخر ان کی روح کو اس کے افق اور سمت کو اتنی تیزی سے تبدیل کر دیا ہے کہ آج بڑی مشکل سے ایسا انسان نظر آتا ہے، جس کی توجہ اور تلاش خالصتاً علمی ہو۔ پھر ہزاروں فکر، عام نفسیاتی اور مابعد النفسیاتی عوارض نے انسان کی زندگی کو ایک غیر روحانی وجود میں بدل کے رکھ دیا ہے۔ آج ہم اتنے جدید اور خوفناک صورت سے پھیلتے ہوئے حملے کا سائنسی ایجاد اور دریافت کی صورت میں شکار ہیں، جس کا سامان ہمیں فائیو سٹار ہوٹل، لگژری پول، بوتیک، سپر سانک جیٹ، ایٹم، نیوٹرون اور اینٹی میٹر کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ اتنی تیز رفتاری سے آگے بڑھتا ہوا زمانہ اب ہمیں اتنا وقت بھی نہیں دیتا کہ ہم سوچ سکیں، رک سکیں یا ہم اقبال کے تشکیل الٰہیاتِ جدید پر لیکچر ہی پڑھ سکیں۔ اس زمانے میں نظریاتی طور پر اسلام کو جو دو بڑے مسائل درپیش ہیں، میں نے ان کا تجزیہ کیا ہے۔

میرے نزدیک پہلا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان مجموعی طور پر، اور اسلامی ذہن خصوصی طور پر، مغرب سے احساسِ

Marfat.com

کمتری کا شکار ہے۔ دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنی بنیادی ترجیحات' جو مذہب نے متعین کی ہیں' سے بالکل غافل ہو چکے ہیں۔ مذہب کی بنیادِ ترجیح کیا تھی۔ اس کے برعکس ہمارے پاس ایک اور نمونہ ہے' جسے ہم سیکولر مسلم کہتے ہیں۔ وہ مغربی دریافت' ایجاد' ترقی اور اس کے تمدن سے اس درجہ مرعوب ہے کہ اس کا تمام تر تجسس مغرب کے ایجاد کردہ' دریافت کردہ اور عطا کردہ خیالات کی تحقیق و جستجو میں گزرتا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اسلام آج کے زمانے کے لیے ایک پسماندہ' بہت پرانا اور ختم شدہ نظریہ ہے۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ چونکہ نظریۂ طاقت کے تحت تمام تر طاقت اس وقت مغرب کو نصیب ہے اور معاشرتی اور سیاسی توازن سراسر ان کے حق میں ہے' اس لیے وہ اپنے طوز پر بے مزہ مذہبی اندازِ نظر اور بے مزہ مذہبی تنظیمات کو دل ہی دل میں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے خیال میں مذہب میں کوئی جدت نہیں۔ کوئی نفاست اور کوئی ایسی دلیل نہیں' جس سے سیکولر مسلمان قائل ہو سکے' اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ مذہب تعصب' شدت پسندی اور کہیں کہیں مکمل حماقت کا نام ہے۔

اس کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر مذہب زندہ ہو گیا' تو یہ موجودہ تمام تمدن کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ وہ پورے اعتماد و یقین کے ساتھ کوشش کر رہا ہے کہ کسی بھی قیمت پر کسی بھی مذہبی اندازِ نظر کو کامیاب نہ ہونے دے۔ اس کے برعکس اس کا خیال یہ ہے کہ مغربی تصورِ حیات اور اس کا کلچر اسے اجازت نامہ دیتا ہے۔ ایسی فراغت اور ایسے مواقع دیتا ہے' جو اس کے ذوق (Taste) کے مطابق ہوں۔ اس کو اتنی جگہ ضرور دیتا ہے کہ جہاں وہ جدید نظریات سے نہ صرف متعارف ہو سکے' بلکہ اس کے ساتھ ان کی زندگی سہولت کے ساتھ گزر سکے۔

سیکولر مسلمان اظہار مذہب میں شرمندگی کا اظہار ضرور کرتا ہے اور اپنے آپ کو ایک پکا مسلمان کہتے ہوئے شرماتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے شرماتا ہے اور اسلام سے بھی شرماتا ہے۔ وہ بزدلی کے باعث کھل کے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اس مذہب سے بیزار ہوں۔ وہ دوسری طرح کے حربے استعمال کرتا ہے۔ وہ خیالات کی انارکی پیدا کر کے اور تصوراتی بحران کھڑا کر کے مذہب کی اساس پر ایسے حملے کرتا ہے' جس سے بہت سارے درمیانے علم کے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ واقعی مذہب کوئی قابلِ قبول نظریہ نہیں ہے۔

دوسری طرف ہمارا Scholastic Religionist ہے۔ وہ مذہبی عالم ہے' جو ایک لگے بندھے اصولوں پر ایک اندھادھند تقلید کے ساتھ عمل پیرا ہے۔ جس کو مذہب بھی میراث میں ملا ہے اور معلومات بھی میراث میں ملی ہیں۔ خواہ وہ چودھویں یا پندرہویں صدی عیسوی کی کیوں نہ ہوں۔ وہ صدیوں سے ایک اندھے اعتقاد پر قائم ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں' اس کے پاس کوئی سوال نہیں ہے۔ وہ اختیار اور سوال سے خالی ہے۔ مذہب کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہے' جو اس نے آثارِ قدیمہ اور آباؤاجداد کی میراث کے طور پر اپنے سینے سے ہر قیمت پر لگائے رکھنا ہے۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ وہ آدھا پڑھا لکھا ہے اور آدھا تہذیب یافتہ ...... وہ ترقی کا تو نام ہی نہیں لیتا۔ اس کے اندر ایسے ممنوعہ جزیرے اور ایسے راسخ نظریات قیام پذیر ہیں جو اس کے اکثر دلائل' عمومی بحث اور منطقی استدلال کے مقابلے میں محض ضد اور بوریت پیدا کرتے ہیں۔ کوئی درشتگیِ خیال اور کوئی شگفتگی اظہار پیدا نہیں کرتے۔

ہمارا مذہب آج بھی فرقہ' خیال' نسل اور ایک انتہائی بدتر ترجیحات کا شکار ہے۔ ہمیں پتہ ہی نہیں کہ مذہب کس

Marfat.com

لیے اور کیوں ہے؟ ہماری بنیاد مذہب کے ساتھ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر مذہب اہرام کی طرح ہوتا' تو میرے خیال میں آج کوئی ایسا نہیں' جو اس اہرام کی چوٹی پر یہ کہہ سکے کہ میں خدا کو جانتا ہوں۔ اسے محسوس کرتا ہوں اور میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ جو کوئی بھی اسلام کو اس لیے اختیار کرتا ہے کہ وہ اللہ کا قرب حاصل کرے۔ اس کی ہمسائیگی حاصل کرے۔ اس کے خیال میں ڈوبے اور خیال میں لذتِ وصال بھی ہو' وہ بالآخر اس جدوجہد میں منافقانہ ابہام اور انتہائی مبہم اور غیر واضح تصوف کے نظریات پر بات ختم کرتا ہے۔

میں یہاں ایک استثنیٰ پیدا کر رہا ہوں۔ ایسے لوگ جو اس تلاش میں نکلے' وہ کم علمی یا حواس پر پوری طرح گرفت نہ ہونے کی وجہ سے تلذذ اور جذب میں ڈوب گئے' انہیں آگے بڑھنے کا رستہ نہ ملا۔ ایسے مجذوب' جو اپنے لیے' اپنے قریبی ساتھیوں کے لیے کوئی تلقین خاص نہیں رکھتے تھے۔ ایک عام معاشرے اور ایک علمی احساس کے لیے بالکل بے کار تھے۔ ان کے پاس اپنے جذبوں کی وضاحت کے لیے کچھ کہنے کو نہیں تھا۔ جو لوگ ان سے ملنے اور ان سے کچھ سیکھنے جاتے تھے' بجائے وضاحت کے مزید پراسرار داستانوں کے سراپے گھڑ کے واپس آ جاتے تھے۔

آج کا زمانہ پچھلے زمانوں سے کچھ مختلف ہے۔ آج کا زمانہ اور اس کا موضوع خود خدا ہے۔ جدید زمانے میں مذہب ایک ذاتی دلچسپی کی طرح ہے۔ ایک کم سے کم تر توجہ طلب مسئلہ ہے اور پرانے رسم و رواج کا ایک سیٹ ہے۔ ہماری یہ عادت ہو گئی ہے کہ جو ہم میں سے خدا کا انکار کرتے ہیں' وہ بغیر کسی دلیل' تحقیق' تجسس اور احساس کے کرتے ہیں' کیونکہ انہیں خدا کے خلاف بولنا ہے۔ چنانچہ وہ خدا کے خلاف بولتے ہیں۔ آج کل زیادہ تر دفاع خدا کا نہیں ہوتا' بلکہ مسلمان کا دفاع صرف اسلام بطور ادارہ کے ہوتا ہے۔ اسلام بطور مذہبی رسومات کے ایک سیٹ کا دفاع ہوتا ہے۔ اسلام بطور طرزِ زندگی اور انصاف کے دفاع ہوتا ہے' خدا کا نہیں ہوتا۔ کسی فرد کو خدا کے دفاع میں دلچسپی نہیں ہے۔ ان کی دلچسپی اسلام بطور ایک نظامِ حیات کے دفاع میں ہے۔ ویسے ہی' جیسے اس طرح کے کئی اور نظامِ حیات معاشرے میں موجود ہیں۔ اسلام اب خدا سے آزاد ایک مکتبہ خیال بن چکا ہے' جس میں رسمی سربراہ کے طور پر خدا کا نام ضرور استعمال ہوتا ہے' مگر ذہنی تجسس اور تلاش کی انتہا اس پورے مذہب میں خدا نہیں بلکہ خود مذہب ہے۔

بدقسمتی سے آج کے سارے چیلنج اور مسائل ایک اعلیٰ مابعد الطبیعاتی سطح پر موجود ہیں۔ وہ خدا کو سرے سے ماننے ہی سے انکار کرتے ہیں۔ دور حاضر کے وہ فلسفی' جن کے نام کے ساتھ بیسویں صدی منسوب ہے یا وہ (Logical Positivists) جیسے رسل (Russell) یا آئر (Iyer) ہے۔ وٹگن سٹائن (Wittgenstein) ہے۔ انہوں نے لادینیت کا بھرپور دفاع کرتے ہوئے سرے سے مذہب ہی کو نان سینس قرار دیا۔ پھر یہ نان سینس کے معنوں میں نہیں ہے' بلکہ اس کے پیچھے ان کا یہ تصور ہے کہ چونکہ صدیوں سے خدا کے بارے میں کوئی اعداد و شمار موجود نہیں ہیں' اس لیے خدا موجود نہیں۔

جب ہر چیز ہی معروضی ہو رہی ہو۔ اعداد و شمار کو بڑھا رہی ہو' تو پھر خدا کے لیے بھی اعداد و شمار ہونے چاہئیں۔ چونکہ نسل انسان کے دامن میں ایسا کوئی ڈیٹا نہیں' جو خدا کی طرف سے راہنمائی کرتا ہو' اس لیے God is nonsense جواب دیا جاتا ہے۔ یورپ کا بہترین دماغ اعتراض کرتا ہے اور مذہب کا بدترین دماغ جواب دے رہا ہوتا ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے۔ یہ دفاع موزوں نہیں ہے۔ اسلام کا دفاع مناسب نہیں ہے' اس لیے کہ اعلیٰ ترین اداروں سے نکل کر اعلیٰ

Marfat.com

ترین منطق وفلسفہ کے ردل کے ساتھ اچھے اور بہترین دلائل کے ساتھ اعتراض کرنے والا ایک موثر اعتراض کر رہا ہو اور جواب دینے والا اضداد اور عناد کی بنیاد پر انکار کر رہا ہو' تو اس کا دفاع اتنا موثر اور مناسب ہو سکتا ہے' جو کسی بھی پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی کو متاثر کر سکے۔

ادھر رسل اعتراض کر رہا ہے' تو یہاں سے مولوی قمر دین جواب دے رہے ہیں۔ مولوی صاحب کے ساتھ بدقسمتی یہ ہوئی کہ چونکہ وہ میٹرک پاس نہیں کر سکے' تو ماں باپ نے انہیں قرآن حفظ کرایا اور سوچا کہ مذہب کی بنیاد پر مسجد سے دو روٹیاں کھالے گا۔ سوال و جواب کا یہ بُعد' یہ فاصلہ انتہائی بدقسمتی کی بات ہے۔ کیا عجیب بات ہے کہ وہ لوگ' جو مذہب کو ایک مکمل نظامِ حیات کہتے ہیں' صبح وشام لوگوں کے بڑے بڑے دعوے سنتے ہیں کہ اسلام بہترین نظامِ حیات ہے' بہترین نظامِ عدل اور بہترین نظامِ اخلاق ہے۔ اسلام بہترین نظامِ حکومت ہے۔ بدقسمتی کی انتہا ہے کہ یہ بہترین نظام عدل' نظامِ حیات' نظامِ اخلاق اور نظامِ حکومت یکجا ہو کر ایک ایسا مسلمان پیدا کرنے سے قاصر ہیں' جس کو تمام مسلمان بندۂ خدا کہہ سکیں۔

بحران نئے نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ بھی نیا نہیں ہے۔ ایسے ہی بڑے مراحل سے اسلام گزرا ہے۔ کبھی اس کو باطنیہ اور قرامطہ سے رنج پہنچا۔ کبھی اسے معتزلہ نے چھیدا۔ کبھی ماتریدیہ اور اشاعرہ نے اس پر ظلم کئے۔ مگر ہر زمانے میں اسلام نے بھی اپنے دامن سے کبھی جنید بغدادیؒ پیدا کر لیا' تو کبھی گیلان کا عبدالقادرؒ پیدا کر دیا۔ کبھی علی بن عثمان ہجویریؒ جیسا انٹلکچوئل پیدا کر لیا۔ اس جنگ میں وہ ہارے' یہ جیتے۔

یہ بھی بدقسمتی کی بات ہے کہ پوری صدی سے مسلمان اس اہرام کی چوٹی کو دیکھ رہا ہے اور خواہش کر رہا ہے کہ کاش کوئی ایسا خداشناس اس کی چوٹی پر آئے' جسے دیکھ کر ہمیں دلیل بھی ملے' جذبہ بھی حاصل ہو اور ہمت آرزوئے خداوند بھی ملے۔ جیسے علامہ اقبال نے بہت ہی خوبصورت شعر میں کہا ہے کہ

در دشتِ جنونِ من جبرئیل زبوں صیدے

کہ میری تلاش وجنوں کے صحرا میں جبرئیل ایک معمولی سا شکار ہے۔

یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

اگر تو اپنے آپ کو عاقل و بالغ و متجس سمجھتا ہے' تو پھر سیدھی کمند اللہ پر پھینک کے دیکھو۔ نیچے کیا جانا۔ اگر آپ ہی کے لیے یہ کائنات اور زمانہ ہے' تو پھر اپنے خالق پر کمند پھینک کے دیکھو۔

ایک بڑا نقص جو ہماری سوچ وفکر کے نظام میں در آیا' وہ یہ ہے کہ تمام کا تمام علمی اور ذہنی تجسس اسلوب کی وضاحت میں صرف ہو رہا ہے۔ جب یہ خدا کے باب تک پہنچتا ہے' تو بالکل ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی وضاحت نہیں دیتا کہ ہم اپنے اعتقادات کی بنیادی اساس کو کسی دلیل پر کیوں نہیں قائم کر سکتے۔ جبکہ وہ رب کریم' جو اپنے آپ کو عقل کل اور حکمت کل کہتا ہے' اپنی کتاب میں ایک بڑی واضح بات لکھتا ہے کہ جو ہلاک ہوا' وہ دلیل سے ہلاک ہوا اور جو زندہ ہوا' وہ دلیل سے زندہ ہوا۔

اس کے برعکس جو اندھا دھند اعتقاد رکھتے ہیں' ان کے بارے میں تختی نے کہتا ہے کہ میرے نزدیک انسانوں میں

بدترین جانور وہ ہیں' جو اندھے' بہرے اور گونگے ہیں۔ سنتے نہیں۔ غور وفکر نہیں کرتے اور عقل نہیں رکھتے۔ اب ایسے رب کو اگر آپ اندھے عقیدے سے سلجھائیں گے' تو وہ بذات خود بڑی غضبناکی کے ساتھ آپ کو شکست دینے کے لیے آئے گا۔

اللہ پر جو تین بنیادی بیانات ہیں' وہ میں آپ کو بتانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ان کا تعلق کس چیز کے ساتھ ہے۔ حضرت عیسیٰ سے پوچھا گیا کہ خدا کیسے پائیں؟ جواب ملا Know thyself and you shall know thy God اپنے آپ کو جانو اور خدا کو جان لو گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور قول ہر زمانے میں لوگوں کے سامنے رہا' و من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچانا' اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ سب سے بڑھ کر فیصلہ کن بات کرتے ہوئے رسول کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ خدا جس کو اپنا علم دینا چاہتا ہے' اس کی آنکھ اس کے اوپر کھول دیتا ہے۔

خدا کا علم آپ کی ذات کے علم سے فروغ پاتا ہے۔ آپ کی ذات کا علم ہی وہ دروازہ ہے' جس میں سے گزر کر آپ حقیقت کبریٰ کے شناسا ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ کام کسی ان پڑھ کا نہیں ہے' نہ یہ کام اتنا سادہ ہے' جتنا سوچا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بہترین عقل اور متوازن اندازِ نظر کی وجہ سے ہے۔ جب تک انسان اپنی جبلی بے اعتدالی سے نہیں گزرتا' وہ اپنے عدم توازن کو توازن میں تبدیل نہیں کرتا اور اس توازن تک نہیں پہنچتا' جو خدا کی شناسائی کے لیے ضروری ہے۔ وہ کبھی بھی ان ترجیحات سے گزر کر ترجیح اول تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اس کی تمام تر زندگی کمتر ترجیحات کی تلاش وجستجو میں گزر جائے گا۔ وہ کبھی بھی علم ودانش' عقل' زندگی اور مرتبہ کی ترجیح اول تک نہیں پہنچ سکے گا۔ جب توازن آتا ہے' تو یقیناً خدا کے علم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ جب ایک انسان اپنے آپ کو اچھی طرح سمجھتا ہے' خوب اچھی طرح تحلیل نفسی کرنے کے قابل ہو جاتا ہے' تو انسانی جبلت بھی جگہ چھوڑتی ہے۔ وہی اپنے نعم البدل کے طور پر خداوند کریم کی طرف اعلیٰ ترین صفت کا مظہر بنتی ہے۔

جب انسان اپنے غصے کو ترک کرتا ہے' تو خداوند کریم کی صفت حلیمی تک پہنچتا ہے۔ جب وہ اپنی نفرت کو کم کرتا ہے اور اعتدال اختیار کرتا ہے' تو پروردگار عالم کی صفاتِ رحمت تک پہنچتا ہے۔ سیدنا علی بن عثمان ہجویریؒ نے فرمایا کہ فنا فی اللہ کی تعریف یہ ہے' کہ انسانی صفات سے گزر جائے اور اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کرے' مگر یہ ایک دن کا کام نہیں۔ یہ بہت غور وفکر کا کام ہے۔

سب سے پہلا تجسس کسی انسان کو یہ ہوتا ہے کہ اس میں کوئی خامی ہے بھی یا نہیں۔ اگر وہ تمام عمر اپنی ذات پر مروت اور محبت کی نظر رکھے گا' تو کبھی بھی اپنی ذات کو فہمائش اور تنبیہہ نہیں کر سکے گا۔ یہ ضروری ہے کہ اس بات کے جاننے کے لیے خدا کا یہ قانون اپنایا جائے' واما من خاف مقام ربہ ونہی نفس عن الھوٰی کہ جو خدا کے خلاف کھڑا ہونے سے ڈرا' اللہ کے خلاف جنگ کرنے سے بچا' اس نے اپنی خواہش' اپنے نفس کی مخالفت کی۔ ایک ہمدردانہ ذات جو اپنے آپ کو بہتر سمجھتی ہے' اپنے آپ کو معتبر سمجھتی اور خود کو کسی نہ کسی اچھائی کی بنیاد پر پرکھتی ہے' وہ کبھی بھی خدا کی آگاہی حاصل نہیں کر سکتی۔

انسانی عقل تین حصوں میں بٹتی ہے۔ اس کا پہلا حصہ جسے جبلت کہتے ہیں' انسان اور جانور میں یکساں ہے۔ تمام انسان اور تمام زندگی کو بنیادی طور پر ایک جبلت پر جمع کیا گیا ہے۔ جیسے پروردگار نے فرمایا واحضرت الانفس الشح ہم نے تمام جانوں کو بخل جان پر جمع کیا۔ خواہ وہ جانور ہے یا انسان' ہر ایک میں سب سے پہلی اور بنیادی جبلت حس بقاء ہے۔

اس کے بعد انسان پیدائش کے مراحل سے گزرتا ہوا تعلیم حاصل کرتا ہے۔ ایسی باتیں سیکھتا ہے' جو بظاہر اس کی شخصیت کو موزوں و متناسب کرتی ہیں۔ وہ ایک درجہ علمی تک پہنچتا ہے' جسے آپ انٹلکچوئل علم کہتے ہیں۔ ایک ایسا علم' جو شواہد پر مبنی ہو۔ جس کے پیچھے بہت سارا ڈیٹا ہو۔ ادب اور علوم ہوں اور عمرانیات ہو۔ جب وہ یہ معلومات اکٹھی کر لیتا ہے' تو اپنے آپ کو تعقل کے درجے پر فائز سمجھتا ہے۔ پہلا درجہ جبلت اور دوسرا تعقل کا ہے۔

جب کوئی تعقل اور تجسس کو ایک ہی مسئلے پر مرتکز کر دے اور سالہا سال اس کی ذہنی الجھن اور مشقت کا وہی باعث رہے' تو وہ ایک درجۂ وجدان تک پہنچتا ہے۔ اس وجدان میں مسلمان اور کافر' بے یقین اور صاحب یقین سب ایک جیسے ہیں۔ جیسا وجدان ہمارا ہے' ویسا وجدان کسی غیر کے پاس ہو سکتا ہے۔ نیوٹن بارہ برس تک ایک مسئلے پر ارتکاز کے بعد آخر کار کشش ثقل کے قانون تک پہنچتا ہے۔ الیگزینڈر فلیمنگ کی آٹھ سال کے ارتکاز کے بعد خدا نے یہ مدد کی کہ باہر سے آتی ہوئی ڈبل روٹی کے ٹکڑے نے اسے پنسلین تک پہنچا دیا۔ اسی طرح نامیاتی کیمیا کے Snake-tail فارمولا میں مدتوں جب ایک سائنس دان بیٹھا ہوا سوچتا رہا' تو اس کو آگ کے اٹھتے ہوئے شعلوں سے Snake-tail فارمولا کی بنیاد ملی۔ چنانچہ تعقل مسلمانوں اور غیر مسلموں میں مشترکہ صفت ہے۔

مسلمان کے پاس ایک اور درجہ علمی بھی ہے' جو وجدان سے ذرا آگے ہے اور اسے الہام کہتے ہیں۔ الہام کوئی غیر مرئی یا ڈھلنے والی شے نہیں ہے' بلکہ اسی علم و عقل و فراست کی نزہت ہے۔ جب یہ مزید تنزیہہ میں جاتی ہے۔ جیسے ایک جبلت تعقل بنتی ہے اور تعقل وجدان بنتا ہے' اسی طرح وجدان ایک مسلسل ارتکاز کے بعد خدا تک پہنچتا ہے' تو اسے الہامی کیفیت حاصل ہوتی ہے' لیکن یہ کسی بھی غیر مسلم کو اس لیے دستیاب نہیں ہے کہ اسلام آنے کے بعد پروردگار عالم نے باقی مذاہب کو کم تر توجیہہ' کم تر تعلیم' تعبیر اور نصف تعلیم قرار دیتے ہوئے فرمایا **و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ** (پ ۳' س آل عمران' آیت ۸۵) اب اگر آپ کو میرا وجود اور حصول چاہیے' تو آپ کو اب میں اسلام کے سوا اور کہیں نہیں ملوں گا۔

بدقسمتی سے ہمارے لیے اسلام مجبوری ہو گیا ہے۔ ہر خدا طلب کرنے والے کے لیے اسلام مجبوری ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ آپ تبت کا لاما ہو کر خدا کو پا سکتے نہ ہندو یوگی' افریقہ کا شامان یا عیسائی راہب ہو کر خدا کو پا سکتے ہیں۔ اب مجبوری یہ ہے کہ خدا نے ملنا اسلام میں ہے۔ چاہے کہیں کوئی بھی خدا کی تلاش میں نکلے گا' کسی بھی مذہب کا ہو گا' بالآخر ڈھونڈتے ہوئے وہ خدا کی تلاش کے لیے اسلام تک ضرور پہنچے گا۔

پروردگار نے جب انسان کو پیدا کیا۔ ایک امانت خاص اسے عطا کی' جسے عقل کہتے ہیں۔ انسان کو پورا پروٹوکول دیا۔ جگہ پہلے سے سنواری اور پہلی آیات کریمہ' جو زندگی اور انسان کے بارے میں ہے' میں پروردگار نے واضح طور پر کہا کہ دو دن لگائے میں نے دنیا کو بنانے میں اور دو دن اشیائے ضرورت انسان رکھنے میں لگائے۔ یہ ہوئے چار دن' یعنی چار ارب سال۔ اللہ تعالیٰ کا دنیا بنانے اور اجرام فلکی کو رول کرنے کا پیمانہ ایک دن برابر ایک ارب سال ہے۔ اجرام فلکی کی ساری عمر چھ بلین سال ہے اور سچائی پروردگار کے قول کی یہ ہے کہ ہم نے چھ دن میں آپ کی دنیا بنائی اور ایک دن ایک بلین سال کے برابر ہے۔ دو ارب سال لگے زمین کو علیحدہ کر کے سنوارنے میں اور دو ارب سال اس میں اشیائے ضرورت کا

Marfat.com

سامان رکھنے میں لگ گئے اور بلند کیا ہم نے آسمانوں کو اور درست کیا ہم نے زمین وآسمان کو۔ اور یہ ہوئے چھ دن۔ مگر یہ پروٹوکول بخشنے کے بعد پروردگار نے ایک حتمی فیصلہ کیا کہ چونکہ میں نے تمہیں اپنی آگہی روزِ الست سے دی ہوئی ہے۔ تم سب کو ارواح کے عالم میں شناخت بخشی ہے اور میں نے تمہیں بتایا ہوا ہے کہ میں کون ہوں' اس آیت کے مصداق' جسے آیت میثاق کہتے ہیں' فرمایا، حجت تمام ہوئی۔

اب میں آپ سے یہ سامنا چھین لیتا ہوں۔ اب میں جھروکے میں بیٹھوں گا اور تمہیں دریافت کا انسٹرومنٹ دے دوں گا۔ تعقل' جان پہچان کی اہلیت' تجسس' دریافت' تحقیق' جستجو۔ اب جاؤ' تمہیں شواہد مہیا کروں گا۔ اشارے دوں گا اور کام صرف ایک لوں گا اور وہ بھی دنیا میں نہیں۔ جب تم دنیا چھوڑ کر آراستہ قبر میں پہنچو گے۔ ایک لمحے کے لیے تمہیں زندہ کروں گا۔ صرف ایک بات پوچھنے کے لیے کہ من ربک ، بتاؤ تمہارا رب کون ہے؟ آپ گزر آئے۔ پروٹوکول انجوائے کیا۔ لطاف دنیا سے آگہی ہوئی۔ لذائذ ومشروبات سے خوب لطف اندوز ہوئے مگر وہ میرا کام کہاں گیا' جس کے لیے میں نے آپ کو بھیجا تھا؟ یہ زندگی کے دوران سے گزرتے ہوئے کبھی آپ نے میرے بارے میں سوچا؟ کبھی مجھے ترجیح دی؟ کبھی یہ دیکھا اور خیال کیا کہ کس نے ہمیں کس کام کے لیے بھیجا؟ میں تو آپ سے یہ سوال ضرور کروں گا کہ من ربک یہ چھوٹا سا جملہ اور اس کے ساتھ ایک رعایتی سوال۔ یہ آپ کا اربوں اور کھربوں سال کی جنت اور دوزخ کی کہکشاں (گلیکسیز) کے لیے پاسپورٹ ہے۔

جب کسی بندے نے شبہے کا اظہار کیا یا صحیح طور پر دریافت نہ کرسکا' تو خدا نے خود فرمایا کہ بے شک میرے بندے نے جھوٹ کہا' بے شک میرے بندے نے سچ کہا۔ اس کے بعد جنت یادشت کی ایک نئی دنیا کا سفر ہے۔ مذہب' آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ تک بڑی سمتیں بدلتا رہا۔ بڑی شریعتیں تبدیل کیں۔ کبھی کوئی قانون جائز اور کبھی ناجائز رہا۔ کبھی سوال پوچھنے پر سزا دی گئی' کبھی حرام حلال اور کبھی حلال حرام ہوا۔ بہت سی چیزیں' جو بنی اسرائیل کو حرام کر دی گئی تھیں' ہمارے لیے حلال ہوگئیں۔ بہت ساری' جو ان میں کبھی حلال تھیں' ہمارے لیے حرام کر دی گئیں۔ شریعتیں ہر دور اور ہر زمانے میں انسانی بلوغت' ابلاغ اور ترقی ذہن انسان کے ساتھ انداز بدلتی رہیں مگر آدمؑ لے کر محمدؐ تک تمام تر مذہب کا ایک مقصد کبھی اللہ نے نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ وہ اس تمام ترد و بدل کے باوجود خود اللہ کا مقصد ہے۔

جب حضرت انسان کے دل میں ہر قسم کی بیزاری اور بے چارگی پیدا ہوگئی۔ ہر چیز سے اس نے قطع تعلق کیا' تو اسے پروردگارِ عالم کی جستجو ہوئی۔ اسے مربی اور محسن کی آرزو ہوئی' جسے وہ اپنے دل کے دکھ سنا سکتا۔ اسے محسوس کرسکتا۔ جس کے مہربان ہاتھ کو اپنی جلتی ہوئی پریشانی پر محسوس کرسکتا۔ ایسے وقت اس نے ہمیشہ خدا کا نام لیا۔ جب خدا کا نام لیا اور اسے جستجو اور آرزو ہوئی کہ کیا ایسا رستہ ڈھونڈوں جس سے خدا تک پہنچوں' تو اس وقت صرف اور صرف مذہب نے اسے یقین دلایا کہ میں ہی خدا تک پہنچنے کا رستہ ہوں۔

گذشتہ کئی برسوں سے ہم نے دیکھا ہے کہ مذہب میں بہت سے طبقہ ہائے خیال پیدا ہوگئے ہیں۔ ان تمام تر دبستانوں کی بنیاد طریقے اور ضابطے پر رکھی گئی۔ کسی نے اندازِ نماز پر اپنے آپ کو علیحدہ کیا۔ کسی نے اعمال کی ترقی و ترویج پر اور کسی نے چند ایک ظاہری اصولوں کو اپنانے میں اپنا تشخص اپنایا۔ یوں تمام تر مذہبی جماعتوں میں ایک فارمیٹ

Marfat.com

(Format) اور اندازِ نقد و نظر کا ایک طریقہ قائم ہو گیا اور اسی طریقے کو بغیر تحصیل اور تجسس کے اور یہ جانے بغیر کہ یہ مذہب کا مقصد اول نہیں ہے، حتمی طور پر مقرر کر دیا گیا۔

اپنی ذات کے علم میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ نفسیات، تحلیل نفسی اور عرفانِ ذات کی بنیاد علومِ نفسیات ہے۔ اگر علومِ نفسیات سیکھنے اور پڑھنے کے علاوہ کسی دوسرے انسان پر استعمال کئے جائیں، تو یہ سائنس ہے۔ مگر انہی نفسیاتی اصولوں کے ذریعے خود اپنا تجزیہ کریں، تو کم از کم آپ نے تصوف میں خدا کی شناخت میں پہلا قدم اٹھا لیا۔ ہمارا اور مغرب کا بنیادی فرق یہ ہے کہ مغرب خدا کے خیال اور تصور سے نا آشنا ہے اور معروضی علوم اس کا مقصد نظر ہے۔ وہ بہت معروضی تھے۔ علوم، حقائق اور اعداد و شمار پر یقین رکھتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ان میں ایسی کوئی حس نہیں پائی جاتی تھی، جس سے وہ کسی غیر مرئی وجود، کسی فلسفہ الٰہیات یا کسی کائناتی ارتقاء میں بڑھتے ہوئے خدا کی شناسائی کا شرف حاصل کر سکیں۔ اس کے برعکس ہر مسلمان کے سینے میں خدا کی تلاش، اس کا تجسس اور کچے پکے احساسات موجود رہے۔ ناخواندہ، کم تعلیم یافتہ تڑپ موجود رہی۔ مگر بدقسمتی یہ تھی کہ وہ کبھی بھی معروضی انداز اختیار نہ کر سکے۔ اس کے ارادے بہتر ہونے کے باوجود اس لیے بہک گئے کہ اس نے ہمیشہ خواب و خیال، وہم و وسوسہ اور سراب کی کیفیتوں کا آسرا لیا۔ مسلمانوں سے جو چیز اٹھ گئی، وہ وہی مغربی معروضیت تھی۔ اعتدال چاہیے تھا۔ اُدھر وہ بے اعتدالی ہو گئی، اِدھر یہ بے اعتدالی ہو گئی۔

اس وقت مسلمانوں کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ کم تر اور کم اہم معاملات کو بڑی ترجیح دے دیتا ہے اور اعلیٰ ترین ترجیح کو کم تر درجہ پر رکھتا ہے۔ تمام کا تمام نظامِ خیال اوپر نیچے ہو گیا ہے۔ میں اس آیت کا ترجمہ نہیں کر رہا کہ نحن اقرب الیه من حبل الورید میں آپ کو ایک ذاتی تیقن کی بات کر رہا ہوں کہ خدا ایک قریب ترین احساس ہے۔ جب بھی کسی انسان کا دل اس کو سوچنے کی طرف مائل ہوتا ہے، اس کی محبت اور خیال میں ترقی کرتا ہے، تو یوں سمجھیے کہ اس بین الکائناتی نظام میں جہاں نوری سال بھی گننے کے لیے کم ہیں، اس دل کے دریچے سے انسان متواتر خدا کو جھانک سکتا ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اس وسیع و عریض کائنات اور مافوق الفطرت فاصلوں میں پروردگار عالم ایک چھوٹی سی راہداری میں ہر وقت موجود ہے۔ پوچھا گیا، یا رسول اللہؐ! خدا کہیں سماتا ہے؟ فرمایا کہیں نہیں۔ فرمایا، یا رسول اللہؐ! کہیں؟ فرمایا، دلِ مومن میں۔

بغیر اپنی ذات کو سمجھے کوئی شخص عرفانِ خدا حاصل نہیں کر سکتا اور بغیر ایک درجہ اعتدال کے تمام تجرباتِ روحانی مشکوک ہیں۔ تصوف اعتدال کی زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ اعتدال، جو شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے مگر ہم نے خدا کی تلاش کو نارمل اور اعتدال کی تلاش سے نکال کر اسے مافوق الفطرت حرکات کا نتیجہ قرار دیا۔ پُراسرار اور دیومالائی کہانیوں کا مرکز بنا دیا۔ معاذ اللہ ہم نے خدا کو شاید کسی جناتی مخلوق سمجھ کر اس کے لیے چلہ کشی شروع کر دی جبکہ وہ ہی خدا یہ کہہ رہا تھا کہ لا رهبانیة فی الاسلام اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ لا سرورة فی الاسلام اسلام میں فاقہ نہیں ہے۔ اسلام اسی طرح ہے جیسے نبی اکرمؐ نے پیش کیا اور خدا اسی طرح ملتا ہے، جس اعتدال سے اللہ کے رسولؐ نے پایا۔ جس اعتدال سے صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین اور تبع تبع تابعین نے پایا۔ آج بھی اصولِ عاشقی وہی ہیں۔ محبت خداوند کا کوئی قرینہ نہیں بدلا۔ اپنی ذات کے محاسبے اور اعتدال کے بعد عرفانِ خداوند اسی اعتدال میں نصیب ہوتا ہے۔

Marfat.com

اہم بات یہ ہے کہ اعتدال صرف علم سے ممکن ہے۔ خدا کے ہاں کسی انسان کے درجات معجزہ وکرامت پر مبنی نہیں ہیں۔ خدا کسی انسان کو اس لیے فضیلت نہیں دیتا کہ اس کو وہ بہت سارے درجات عطا کرتا ہے بلکہ اللہ نے ارشاد فرمایا ونرفع درجت من نشاء جس کے چاہتا ہوں' درجات بلند کر دیتا ہوں وفوق کل ذی علم علیم (پ ۱۳' س یوسف' آیت ۷۶) اور ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔ بار بار پروردگار نے اساسِ علمیہ کے تجسس اور غور وفکر میں ہمیں دعوت دی۔ اپنے بہترین بندوں کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ الذین یذکرون اللہ قیاما وقعوداً وعلی جنوبھم کھڑے' بیٹھے اور کروٹوں کے بل وہ مجھے یاد کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ ویتفکرون فی خلق السموٰت والارض (پ ۴' س آل عمران' آیت ۱۹۱) زمین وآسمان کی تخلیق پر غور وفکر کرتے ہیں۔

جب حضورؐ نے یہ ارشاد فرمایا اطلبوا العلم ولو کان بالصین علم تلاش کرو خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے' تو علم تو اس وقت مدینے سے باہر تھا ہی نہیں۔ پھر وہ کس علم کی تلاش کے لیے ان کو ترغیب دے رہے ہیں؟ دراصل یہ وہ علم حقائق ہے' جو دنیا میں اردگرد اور ہمارے آس پاس اعداد وشمار کی صورت میں بکھرا ہوا ہے۔ وہ ہمیں کسی جذباتی یقین کی بجائے ایک محققانہ تحقیق تک لے جاتے ہیں اور ہم خدا کے بارے میں جتنا بہتر حقائق سے سمجھتے ہیں' خواب وخیال اور وہم ووسوسہ سے اتنا نہیں جان سکتے۔ بدقسمتی سے ہم نے علم کی بجائے تصوراتی' سنی سنائی باتوں اور غیر معروف دقیانوسی واقعات کو اساس بنا کر تمام تصوف کو جادوگری بنا دیا۔ اعتدال کو ہم نے انتہا پسندی بنا دیا۔

ہمارے نزدیک کائنات کا سب سے بڑا علمی خزانہ کتاب اللہ ہے' قرآن حکیم ہے۔ دیکھا جائے کہ وہ کس صورت میں رکھا گیا ہے؟ کیا کسی غیر معتدل انسان میں رکھا گیا ہے؟ کیا کسی انتہا پسند میں رکھا گیا ہے؟ کیا کسی (Dejected down trodden?) میں رکھا گیا ہے؟ لیکن دیکھتے ہیں کہ بہترین علم بہترین تناسب میں رکھا گیا ہے۔ قرآن اور رسولؐ کا وجود علم کا ایک بنیادی اصول فراہم کرتے ہیں۔ جوں جوں کسی کا علم بہتر ہوگا' توں توں وہ اعتدال کو بڑھے گا۔ مسلم کی آٹھ احادیث ملحقہ اور تمام احادیث کا صرف ایک مقصد ہے کہ آقا اور رسولؐ نے ارشاد فرمایا' اعتدال اختیار کرو۔ اگر مکمل اعتدال نہ ہو سکے' تو کم از کم اس کے قریب ترین رہو۔

جب ایک داخلی توازن قائم ہو جائے۔ جب خدا کسی وجود کی ترجیحِ اول ہو جائے' تو یہ بگڑی ہوئی کائنات' یہ نظامِ اصغر' یہ انائے صغیر کا وجود' اس کائنات کی طرح' جو بگ بینگ (Big Bang) سے پھیل رہی ہے' ایک دھماکہ خیز پیدائش کے بعد بکھرتا چلا جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں سمٹتا' جب تک اس کو واپس کھینچنے والی کوئی قوت نہ ہو۔ صرف اللہ اور صرف اللہ اور صرف اللہ ایک ایسی ذات گرامی ہے' جو اس کو مرکزیت عطا کرتی ہے۔ اس کی ترجیح اول اس کو اس کے وجود کا تشخص دیتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے' جب وہ ایک مرکزی وجود انسان کے باطن میں آزادی' محبت اور انتخاب سے مرکزیت اختیار کر لیتا ہے۔ مشقت اور جرم سے نہیں' بلکہ پروردگار نے فرمایا فاذکروا اللہ کذکرکم آباءکم اواشد ذکرا (پ ۲' س البقرۃ' آیت ۲۰۰) مجھے ایسے یاد کرو جیسے اپنے آباؤاجداد کو کرتے ہو۔

ذرا زیادہ میتھوڈسٹ مسلمان کہتا ہے کہ اعمال ہی ذکر ہیں۔ قرآن ذکر ہے۔ ایک اہم آیت قرآن' جس میں قرآن کا بھی ذکر ہے اور نماز کا بھی ذکر ہے' سنا رہا ہوں۔ مگر ان کو اتنا اہم نہیں قرار دیا گیا' جتنا کہ ایک تیسری بات کو۔ یہ

Marfat.com

ضروری ہیں مگر ان سے بہت بڑی بات ایک اور ہے اتل ما اوحی الیک من الکتب کہ کتاب کی تلاوت کرو۔ یہ تمہیں امر و نہی سے آگاہ کرے گی۔ واقمو الصلوٰۃ اور نماز قائم کرو۔ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشآء والمنکر یہ تمہیں فحش و منکر سے روک دے گی۔ ولذکر اللہ اکبر (پ ۲۱' س العنکبوت' آیت ۴۵) مگر ہماری یاد تو بہت بڑی ہے۔ نماز اور روزہ یاد کا حریف نہیں ہے۔ جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ نماز اور روزہ پر زور نہیں دیتے' تسبیح پر زیادہ زور دیتے ہیں' تو میں نے عرض کی کہ کب تک آپ پرائمری میں کھڑے رہیں گے؟ جو مسلمان ہوا' کیا اس کو پتہ نہیں کہ نماز اور روزہ کے بغیر انسان مسلمان نہیں ہے؟

کیا ایک اسلوب سے گزر کر ایک مقصد کو نہیں پہنچنا؟ جس شریعت کے پیچھے خدا کی خواہش اور خیال نہیں۔ جس شریعت کے پیچھے حصول خداوند کی چاشنی نہیں' طلب اور جستجو نہیں۔ غم واندوہ و بلا نہیں۔ دوست تک پہنچنے کی کوفت نہیں' وہ محض میعتقد ہے۔ رسم و رواج ہے اور اس سے آگے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ مگر جس شریعت اور مذہب کے پیچھے ایک مسلمان مرد اور عورت کا یہ تصور جاگتا ہو کہ یہ طریقہ ہے۔ منزل مقصود خدا ہے۔ میں نے خدا کو حاصل کرنا ہے' وہی شریعت طریقت ہو جاتی ہے۔ یہی سیدنا محمد بن اسماعیل بخاری کی وضاحت ہے۔ اس حدیث میں' جس میں آپ نے ارشاد فرمایا انما الاعمال بالنیات آپ کو نصیب ہو جائے اور آپ کی ذات مرتکز ہو جائے' تو کائنات آپ کی اسیر ہے۔ معاملات آپ کے قیدی ہیں۔ خیالات آپ کی جولان گاہ ہے۔ جدت' حدت' ندرت اور قدرت یہ سب آپ کی ہیں۔ آپ مرید بھی ہیں۔ قدیر اور متکلم بھی ہیں۔ جب آپ خدا کے ساتھ ہیں اور خدا آپ کو اس کا جواب بھی دے رہا ہے' تو خدا خود اپنی ذات مبارک سے ارشاد فرماتے ہیں۔ ولا تھنوا غم نہ کرنا والا تحزنوا میری یاد میں سستی نہ کرنا وانتم الاعلون تم ہی غالب ہو۔ ان کنتم مومنین (پ ۴' س آل عمران' آیت ۱۳۹) اگر ایمان لانے والا ہو۔

بنیادی سوسائٹی میں توحید

دنیا کا ایک خطہ ایسا تھا جس میں انسان کبھی نہیں تھا۔ یہ اسکیموز کا خطہ تھا۔ پانچ ہزار سال قبل مسیح کی یہ مخلوق اکیلی علیحدہ پروان چڑھ رہی تھی۔ ان پر کسی دوسری تہذیب کا اثر نہیں ہے۔ جب یہ دریافت ہوئے' تو لوگوں نے سوچا کہ شاید یہ بغیر عقیدہ کے چلے آتے ہیں۔ اسکیموز سے پوچھا گیا کہ کیا تم کسی بات میں ایمان رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں ہم آسمانوں میں ایک طاقت کو مانتے ہیں۔ سیل کا شکار کرنا ہوتا ہے' اور جب ہمیں مدد مانگنی ہوتی ہے' تو ہم آسمانوں سے مدد مانگتے ہیں۔ اگر اس اصلی' سادہ اور بنیادی سوسائٹی سے پوچھا جائے کہ ان کا اعتقاد کس پر تھا؟ تو وہ ایک خدا پر اعتقاد رکھتے تھے' اس لیے آج کے دور میں اس سے پہلے یا کسی اور دور میں خدا کی آگہی تمام بنی آدم کو حاصل تھی۔

حضرت نوحؑ کا طوفان ساری دنیا پر آیا۔ دنیا نے سائنسی اور مذہبی طور پر ریکارڈ کیا ہوا ہے۔ جو نسل اس میں سے بچی' وہ تمام خدا پرست تھی۔ وہ حضرت یافث' حضرت سام یا حضرت حام تھے۔ خدا پرست تھے۔ جب آگے ان کی اولاد میں مذہب اترا' تو ان کے پاس معاشروں کی تاریخ تھی اور تمام معاشروں کا پہلا تعارف خدا پرستی تھی۔ اس کے بعد یہ تبدیل ہوئے تھے۔

Marfat.com

جب اسلام ہندوستان میں بڑھا پھیلا' تو درمیان میں ایک تحریک پھیلی' جس کو بھگتی تحریک کہتے ہیں۔ بھگتی میں راماننداور کرشنن نے یہ دعویٰ کیا کہ نہ صرف مسلمان ایک خدا میں یقین رکھتے ہیں' بلکہ ہندومت کا بنیادی عقیدہ بھی ایک خدا پر یقین رکھنا ہے۔ اسی لیے وہ منو کو نقل کرتے ہیں۔ منو حضرت نوحؑ کے ہم عصر ہیں۔ سمرتی ایک کتاب قانون ہے اور اس میں منو کا قول نقل کرتے ہیں۔ ایک بچے نے پوچھا' یہ برہما' شیوا اور وشنو کیا ہے؟ اس نے کہا کہ حقیقت مطلقہ ایک ہے۔ یہ اس کے پرتو ہیں مگر کبھی اس غلطی کا ارتکاب نہ کرنا کہ حقیقت مطلقہ کو تقسیم شدہ سمجھ لے۔ چنانچہ ہندو کی بنیادی تعلیمات میں خدا ایک ہے۔

جہاں تک آپ کی دوسری بات کا تعلق ہے' خانہ کعبہ کی کوئی مسلمان عبادت نہیں کرتا۔ اصولاً عقیدہ مسلمان کا بڑا واضح ہے' ہندوستان میں رہنے کے باوجود' ایک مغربی مصنف نے چھوٹا سا جملہ لکھا کہ انڈیا میں مسلمان نے خدائے واحد کا تصور اس لیے بچا لیا ہے کہ ان کے ہاں اسلام میں خدائے واحد کا تصور بہت ہی واضح تھا۔ چنانچہ کسی مائتھالوجی کا امکان نہ تھا۔ چاہے یہ زیارت کعبہ اور طواف کرنے کا تعلق ہے' تو کوئی بھی مسلمان اسے نہیں پوجتا' بلکہ مسلمان اسے کالا کوٹھا ہی کہتے ہیں۔ کوئی مسلمان اسے خدا نہیں کہتا۔ حج رسم ہے' خدا کی عبادت ہے۔ اس جگہ ہم نے کسی چیز کی عبادت نہیں کی۔ ہندوؤں کا یہ طعنہ کہ تم بھی ایک کالے پتھر کو چومتے ہو' جسے حجر اسود کہتے ہیں مگر حجر اسود کا چومنا اس کے پتھر ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔

یہ الجھن اس لیے ہے کہ ہم مذہب اور اس کے بنیادی فلسفے کو نہیں سمجھ پاتے۔ حج میں اس پتھر کا چومنا اس لیے نہیں ہے' بلکہ ہم علامتی طور پر لمس دستِ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ چومتے ہیں۔ ہم ان ہاتھوں کے لمس کو چومتے ہیں' جو اس پتھر کو لگے ہیں۔ اس کو دیگر انبیا کے علاوہ حضرت محمدؐ کا لمس حاصل ہے۔ یہ پتھر بذات خود توجہ کا مرکز نہیں ہے۔

اسلام کسی بھی ٹھوس امیج کو عدم مرکزیت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر یہاں پتھر چومنے ہوتے' تو پتھر مرکزی حیثیت اختیار کیے ہوتا۔ مگر ہم خیال میں کسی ایک ایسی چیز کو چوم رہے ہیں' جو اسے چھو کر نکل گئی ہے۔ سکھ موحد ہیں' مگر وہ پنجہ اگر چومتے ہیں' تو ان کو کوئی کافر اس بات پر نہیں کہتا۔ کافر اس بات پر کہتے ہیں کہ چالوکیہ خاندان کے زمانے میں بنگال میں ذرائع مواصلات کا واحد طریقہ ہاتھی تھا۔ ہاتھی کی افادیت انہوں نے بڑھائی' تاکہ ہاتھی قتل نہ ہو۔ اس وقت کے لوگوں نے ہاتھی کو دیوتا بنایا۔ اس کو مقدس کیا۔ اس وقت ہندو نے ہاتھی کو بچانے کے لیے ایسا کیا' کیونکہ دانتوں کے لیے ان کو مارا جا رہا تھا۔ انہوں نے ایک دیوتا گنیش اور گھنشام کو سونڈ لگا دی۔ اسی طرح گائے' جسے گھٹیا نسل کہا جاتا ہے' ان کے ہاں پالتو تھی اور ہل میں بھی جوتی جاتی تھی۔ گائے کا قتل بچانے کے لیے انہوں نے اس کو دیوی یعنی سرسوتی بنا دیا۔

عبادات اور ان علامات میں فرق ہے۔ اگر تو یہ کریں کہ آسمان کی کسی علامت کو زمین میں قید کر لیں' مگر یہاں اس کے الٹ ہے۔ زمین میں کسی چیز کی اوقات بڑھانے کے لیے آپ اسے دیوتا کا رتبہ دے رہے ہیں۔ مسیحیت میں یسوع' مقدس روح اور ماں کی تثلیث ہے۔ یہاں خدا کہتا ہے کہ تم میرے بارے میں وہ کہتے ہو کہ میری کوئی بیوی ہے۔ میرا کوئی بچہ ہے اور تم یہ دعویٰ رکھتے ہو کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے' اس لیے وہ بڑا پیغمبر ہے۔ غور کرو' ارشاد باری ہے کہ بغیر باپ کے بچے کو صرف اس لیے خدا سمجھتے ہو' جبکہ ہم نے تمہارے ماں باپ آدمؑ کو بغیر کسی باپ کے پیدا کیا اور واحد سیل سے حوا کو پیدا کیا۔

Marfat.com

تمام مسیحیت کا بنیادی خیال فرار پر مبنی ہے' جو یسوع مسیح کے خون میں نہلا گیا' وہ پاک ہو گیا۔ جب بھی آدمی خود کو قصور وار سمجھتا ہے' تو وہ اس قسم کے خیالات سے ازالہ کرتا ہے۔ یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ بات رسم ورواج میں آ جاتی ہے۔ مسلمان رسم ورواج میں نہیں پڑتا۔ مسلمان ایک عقیدے پر قائم ہے۔

وحدت الوجود کی بحث

یہ بحث قطعاً اسلام میں کوئی وجود نہیں رکھتی۔ وجود کی بحثیں ویدانت سے شروع ہوئیں' بلکہ سب سے پہلے ہمیں اس کا وجود منوسمرتی میں ملتا ہے۔ منو سے اس کے بیٹے نے سوال کیا کہ بابا! یہ حقیقت مطلقہ وجود میں کیسے ہے؟ اس نے کہا' بیٹے ایک لگن لاؤ اور اس میں نمک ملا کر لاؤ۔ جب بیٹا لگن لایا اور اس نے نمک ملایا' تو اس نے کہا' بیٹے اب نشاندہی کرو کہ نمک اس میں کہاں ہے؟ اس نے کہا' بابا! مجھے کیا پتہ کہ نمک کہاں ہے؟ ہر جگہ ہی نمک ہے۔ اس نے کہا' اچھا یہ نہیں کر سکتا' تو اس پورے گیلن میں وہ جگہ بتا جہاں نمک نہیں ہے؟ اس نے کہا' ایسا بھی نہیں ہے۔ تو باپ نے کہا کہ برہما اسی طرح وجود میں ہے۔

آج کے دنوں میں جب ہم آگے بڑھتے ہیں' تو وحدت شہود کے آثار ہمیں سب سے پہلے مصر کے پلاٹینس میں نظر آتے ہیں۔ پلاٹینس نے سب سے پہلے ذہانتوں کا نظریہ پیش کیا تھا کہ وجود مطلق پروردگار اپنے نورانی وجود میں جب نیچے ڈھلتا ہے' تو اس کے درمیان میں جمادات' نباتات تک آنے کے مراحل آتے ہیں بلکہ مولانا رومی نے ''مثنوی'' میں اس کا ذکر کیا اور فرمایا کہ یہ کبھی ملائکہ میں آیا۔ اس میں زیادہ تر نورانی ہے۔ ذرا آگے بڑھا۔ اس میں تھوڑی سی میل شامل ہوئی۔ دوسرے وجود بنے۔ پھر جنات بنے۔ حتیٰ کہ یہ نفوس کے پیکر یعنی انسانوں تک آیا۔ زمین میں مادیت تک آیا۔ پلاٹینس کہتا ہے کہ صرف ایک ہی وجود میں یہ اللہ نے آسانی رکھی کہ وہ واپس جا کر وجود مطلق میں شامل ہو سکتا ہے اور وہ انسان کا وجود ہے۔

اسلامی معاشرے میں یہ بحث یونانی اثرات سے جو نو افلاطونی نظریات اس میں داخل ہوئے' اس سے اشاعرہ ماتریدیہ' معتزلہ نے وجود پایا اور اسلام میں نئی سے نئی بحثیں شروع ہو گئیں' مگر پرانے صوفیا میں ہمیں صرف ایک سوال نظر آتا ہے کہ جبر وقدر کے مسائل پر اس وقت گفتگو شروع ہو چکی تھی اور واصل بن عطا نے حضرت امام جعفر صادقؒ سے سوال کیا تھا کہ کافر کا بچہ کہاں جائے گا؟ پھر جو امام کی مجلس سے اٹھا' تو وہ سب سے پہلے معتزلہ کا استاد بنا اور اسی سے یہ تحریک شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ اور کوئی مسئلہ اس لمحے نظر نہیں آتا۔

شیخ جنید بغدادی کے زمانے تک آتے ہوئے' ہمیں پتہ لگتا ہے کہ اتنا زیادہ یونانی فلسفے کا اثر پڑ گیا تھا اور اس کی بہت زیادہ آگہی بڑھ گئی تھی کہ ہم تصوف کو بھی تسلسل کے ساتھ پیش رفت کہتے ہیں۔ ایک منزل فکر سے اگلی منزل فکر کو جانا۔ پھر اس سے آگے بڑھنا۔ پھر اس سے آگے بڑھنا' حتیٰ کہ لاانتہا تک کی منازل میں چلا جانا' جہاں صرف خدا ہی رہنما ہو سکتا ہے۔ جیسے آج کل کے زمانے میں جب شاعری شروع ہوئی' تو نیا نیا فلسفہ وجودیت پر لٹریچر یورپ سے آ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کسی اردو دان نے ژاں پال سارتر' البرٹ کامیو یا کیر کے گارڈ (Kierkegaard) کو پڑھا ہو۔ ہم نے ان

لوگوں پر مضامین لکھے اور پڑھے۔ تو مجھے پتہ ہے کہ وجودی تحریک ہمارے معاشرے میں شروع ہوئی' مگر جب میں باہر آتا تھا' تو ہر شاعر کو وجود کا شاعر پاتا تھا۔

بہت سے انٹلکچوئل نمبر میں یہ ہوتا ہے کہ لوگ علم نگلتے ہیں اور اگل دیتے ہیں۔ علم ان کے درمیان رکتا ہے نہ ٹھہرتا ہے۔ اسے سمیٹتے ہیں' نہ اسے مناسب طور پر ہضم کرتے ہیں۔ اس کو خدا ہوا کہتا ہے۔ یعنی جو فیشن ایبل خیالات' میلانات اور رجحانات آتے ہیں' نفس ان کی بے تحاشہ ترغیب رکھتا ہے۔ اہل حدیث' جو آپ کو ٹخنوں کے اوپر شلواریں کیے پھرتے نظر آتے ہیں' ایک ایسا زمانہ آیا کہ تمام کی تمام خواتین اہل حدیث کی پیروکار ہو گئیں۔ پچھلے سال جو فیشن آئے' اس میں سارے زمانے کی شلواریں ٹخنوں سے اوپر تھیں۔ یہ فیشن کسی بھی چیز میں ہو سکتا ہے۔ خیال سے لے کر ایک معمولی سی معمولی رہائش گاہ تک۔

مسلمان کلچر کیا تھا اور فیشن کیا تھا؟ جب سے عمارات اور رہائش گاہ کا یورپی کلچر آیا' صحن گم ہو گیا۔ مسلمانوں میں بڑا صحن' جہاں سب کے رستے گزرتے تھے۔ مجبوراً سلام اور دعا کرنا پڑتی تھی۔ کسی کو ابا' کسی کو چچا' امی کہا جاتا تھا۔ اور تو اور ہر صورت ساس اور بہو کا آمنا سامنا ہوتا تھا۔ جب جدید کلچر آیا' تو انہوں نے اس کا خاص خیال رکھا کہ کوئی کسی کا سامنا نہ کرے۔ چھوٹے چھوٹے کمرے خود کفیل کر دیئے کہ اسی میں غسل خانہ ہے۔ اسی میں کچن ہے۔ اسی میں سب کچھ ہے۔ تا کہ کوئی جھانک کے ہی باہر نہ دیکھے کہ ادھر کون بستا ہے۔

یہ رجحانات قریباً قریباً زندگی کی ہر بات میں چلے آتے ہیں۔ جیسے قرآن میں اللہ نے کہا ہے واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى (پ ۳۰' س النازعات' آیت ۴۰) نفس مستقل' مضبوطی جبلی رویئے پر قائم ہے۔ اس کو ہوا اسی لیے کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر نفس ترغیب پاتا ہے' تو وہ ایک قابل تغیر حالات اور رجحانات سے ترغیب پاتا ہے' جو باہر کے زمانے میں چل رہے ہوتے ہیں۔ بہت تیز رفتار تبدیلیاں ہیں۔ میرے خیال میں یہ چیز بہت سے افراد کو کرپشن کی طرف مائل کر رہی ہے۔ تبدیلی اس قدر سیماب پا ہے کہ آپ کو سرمایہ زیادہ خرچنا پڑتا ہے۔ نت نئی چیزوں کی تبدیلی کے لیے اور بالعموم لوگوں کے پاس یہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ بے چینی اس زمانے میں بڑھ رہی ہے۔ لوگ تیز رفتار تبدیلی سے اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہے ہے۔

بازیافت خدا' ہندوانہ اندازِ نظر

اللہ کبھی بھی یہ نہیں چاہتا کہ آپ دنیا کو ترک کر کے اس کی طرف جائیں لا سرورة فى الاسلام لا رهبانيته فى الاسلام ترجیح کی بات یہ ہے کہ اگر آپ خدا کو پہلے لے لیں اور پھر کہیں کہ یہ ساری چیزیں اس کے توسط سے لینا ہیں' تو یہ ایک اندازِ نظر ہے۔ اصل میں ہم جس اندازِ نظر پر قائم ہیں' وہ ہندوانہ ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہندوؤں نے زندگی کو چار آشرم میں بانٹ رکھا ہے۔ برہم چری آشرم' پچیس سال تک سیکھنا' پڑھنا' لکھنا۔ اس کے بعد گھرست آشرم' بیوی کام کاج۔ پھر گھرب آشرم' ذرا بڑے ہوئے۔ بڑے آفس کی تلاش۔ کسی نے جرنیل بننا ہے' کسی نے ایم ڈی۔ کسی نے جی ایم۔ یعنی عہدوں کی جنگ اور جب پچھتر سال گزر جائیں' تو اگلے پچیس برس رشی منی آشرم ہے۔ یہ اللہ کی عبادت کے دن

Marfat.com

ہیں۔اب جنگل پکڑو۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے گلے سڑے انگور مسجد نبوی میں صدقے کے طور پر لٹکا دیئے۔اللہ کو بڑا غصہ آیا۔اس نے کہا، دیکھو یار! اگر تم میرے لیے بہترین چیز نہیں دے سکتے' تو بدترین تو نہ دو۔کم از کم درمیانی دے دو۔اگر خدا کو ہم اپنی ابتدائی عمر نہیں دے سکتے' تو کم از کم اپنی عقل وشعور والی درمیانی عمر تو دے دیں۔جب سماعت نہ رہی۔بال جھڑ گئے۔کان نہیں رہے' تو پھر ہم نے کہا کہ دنیا نے ریٹائر کر دیا۔اب چلو' اللہ کے پاس چلے جائیں۔یہ تو ہین ذات پروردگار ہے۔اللہ آپ سے بالکل تقاضا نہیں کرتا۔وہ اصل میں ذہنی فرق بتاتا ہے۔یعنی آپ کو ذہنی طور پر اس قابل ہونا چاہیے کہ میں ترجیح اول ہوں۔آپ یقین جانیے کہ میں نہیں کہتا کہ میں اسے ترجیح اول سمجھتا ہوں۔میں اسے صرف کہتا ہوں کہ اے میرے مالک! میں نے ذہنی طور پر تجھے ترجیح اول سمجھ لیا۔اب مجھے توفیق دے کہ میں اس ترجیح کو برقرار رکھ سکوں۔عمل کی توفیق وہ اس وقت دے گا' جب ہم اس میچ میں پڑیں گے۔کہنے کی بھی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے۔رسول اللہؐ نے ایک بڑی خوبصورت بات فرمائی۔زبان سے کہنے کا بھی اثر ہے۔فرمایا جس شخص نے زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا' پھر مرتے دم تک اس پر قائم رہا' تو جنت اس پر واجب ہے۔قائم رہنا' ہمیں منافق نہیں رہنے دیتا۔

ہماری جبلتوں کی جنگ ہمارے یقین کے ساتھ جنگ ہوتی ہے۔مجھے سخت بھوک لگی ہوئی ہے' تو اللہ کہتا ہے کہ تو تھوڑا سا کھا لے۔جب تسلی ہو جائے' تو پھر مجھے خدا مان۔بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے دماغ کو ایک سگنل دینا ہے' یہ کمپیوٹر اگر ترجیحات کے لیے تیار نہیں ہوگا' تو زندگی بھر آپ کو غیر مطمئن رکھے گا۔آپ اللہ سے دور جا کر یا اس ترجیح کو ترک کر کے کبھی سکھی نہیں رہ سکتے۔الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (پ ۱۳' س الرعد' آیت ۲۸) میرے خیال اور میری یاد کے بغیر تمہیں اطمینان قلب نہیں ہوگا۔رتبہ مل جائے گا۔درجہ واقتدار حاصل ہو جائے گا' مگر اطمینان قلب نہیں ہوگا۔

علم' حواس' ادراکِ خدا

علم حاصل کرنے کے لیے حواس خمسہ کی ضرورت ہے اور کچھ چیزیں اس کے علاوہ ہیں۔عقل اور حواس خمسہ کے علاوہ کون سے طریقے ہیں۔جیسا کہ ''کشف المحجوب'' میں داتا صاحب کا خواب بیان ہوا' جس میں حواس کے بند کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔میری نظر سے یہ خواب اس طرح نہیں گزرا۔میں ان کا شاگرد ہوں' ان سے ہدایت پائی ہے۔اتنا بے پناہ علم اس صاحب کتاب کا ہے کہ مشکل ترین نفسی اشکال میں انہوں نے میری رہنمائی فرمائی ہے' مگر وہ حواس خمسہ بند کرنے کی بات نہیں کرتے' بلکہ تمام تصوف اور تمام اللہ کی طرف بڑھنا خارجی افزائش ہے۔

دو چیزیں تصوف کا خاصہ ہیں۔ایک تلف کرنے کا عمل اور ایک خارجی افزائش۔جیسے آپ کے گھر کی باڑ بڑھ جائے اور بے ترتیب ہو جائے' تو اس کو کاٹ دیتے ہیں' تا کہ وہ تواتر اور توازن میں رہے۔تواتر اور توازن سے وہ خوبصورت اور معتدل لگتی ہے۔اس طرح انسان کے اندر بہت ساری ایسی باتیں ہیں' جو خدا کے علم سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔جیسے ایک شاعر ہے' لیکن شاعری کیا فرق ڈالتی ہے؟ اگر وہ حسن' خوبصورتی اور فطرت کا طلب گار ہے۔اعلیٰ ذوق کا مالک اور اس کی حسیات ہیں' جو عمومی حسیات سے بالاتر ہیں' وہ خدا کا کیوں نہیں قائل ہوتا؟ خدا کی محبت میں

Marfat.com

کیوں نہیں آگے بڑھ جاتا؟ اس لیے کہ وہ تلف نہیں کرتا' کیونکہ شعرا جھوٹ کی وادیوں میں سفر کرنے والے ہیں۔ قافیہ اور ردیف کے متلاشی ہیں۔ زبردستی اشکال دیتے ہیں۔ اپنے خیالات کو اوریجنل نہیں' بلکہ زبردستی قافیہ اور ردیف ڈھونڈ کے ان میں بند کرتے ہیں۔ اسی لیے خدا نے کہا کہ وہ جھوٹ کی وادیوں کے سفر کرنے والے ہیں۔ جب شعر و شاعری اتنی مرغوب اور اتنی دل پسند ہو جائے کہ وہ اللہ کے رستے میں آنے لگے۔ آپ کو خود پسندی اور اپنی صفت شعر مرغوب ہو تو وہ آپ کو خدا کے قریب بھی جانے نہیں دے گی۔ آپ کے ہاتھ میں اللہ کی آرزو کی مقراض ہونی چاہیے۔

یہ آرزو تو بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

اس کے ساتھ ساتھ آپ کے ہاتھ میں مقراضِ محبت خدا ہونی چاہیے۔ آپ کو اس بات کا ڈر ہونا چاہیے کہ آپ میں کوئی بڑھی ہوئی ذاتی صفت خدا کے حصول اور خواہش پر غالب نہ آ جائے۔ آپ کو ہر اس سرگرمی کو تلف کرنا پڑتا ہے' جو آپ محسوس کریں کہ خدا کے رستے میں حائل ہو رہی ہے۔ ایسا حسان بن ثابتؓ کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنی تمام شاعری اللہ اور رسولؐ کے لیے استعمال کی۔ بردہ کے ساتھ نہیں ہوا کہ اس نے صفت شعر گوئی رسولؐ اللہ کی تعریف کے لیے استعمال کی۔ مگر جب بھی آپ میں کوئی غیر معمولی صفت پیدا ہو گی اور وہ ضرورت سے بڑھ جائے گی' تو اس کا مبالغہ آپ کو خدا کے لیے اقتدار حاصل کرنے میں رکاوٹ بن جائے گا۔

اس لیے آپ کو پہلی چیز تو اپنے حواس خمسہ کے ذریعے حاصل کی ہوئی صلاحیتوں کو کاٹنا ہے اور تلف کرنا ہے۔ دوسری بات جو سید ہجویریؒ نے بتائی کہ تمام تصوف سحر علمیہ ہے۔ یہ علم کی ایک منزل سے دوسری منزل کو بڑھ جانے کا نام ہے۔ اس میں منازل وہ نہیں' جو چلے اور مراقبے میں ہیں۔ یہ تمام چلوں اور مراقبوں کا فراڈ تصوف کا حصہ نہیں ہے۔ تصوف کی تمام منازل ایک علم کے حصول سے اگلے علم اور ایک قربت کے حصول سے دوسری قربت کی خواہش کرنا ہے۔ مگر ایک منزل سے دوسری منزل کے درمیان جو فاصلے ہیں' اس میں صرف اور صرف آپ کے نفس کے ارتکازات اور آپ کی خواہشاتِ ذات حائل ہوتی ہیں۔ اسی لیے پروردگار عالم نے فرمایا کہ جو شخص میری محبت حاصل کرنا چاہتا ہے' وہ ان تمام عادتوں' خصلتوں اور ان تمام چیزوں کو ترک کر دے گا' جو میرے رستے میں آئیں گی اور وہ ایک ایک کر کے اپنی عاداتِ حواسِ خمسہ سے متنفر ہو گا۔ اس لیے کہ خدا کا حصول حواسِ خمسہ سے ذرا آگے ہے۔ خدا کسی ذائقے' کسی حس میں نہیں آتا۔ خدا کسی بھی دیکھنے کی حس میں نہیں آتا۔ خدا نہیں حواس کی مدد سے آگے ایک ایسی ریفائنمنٹ حاصل کرنا ہے' جو آپ کی عقل کی اعانت کرے۔ نادیدہ خدا کی موجودگی کا احساس آپ کو دے۔

دیکھیے خدا نظر نہیں آتا' تو کوئی بات نہیں ہے۔ خدا کو نظر نہیں آنا چاہیے۔ وہ کوئی عمومیت نہیں کہ آپ کے سامنے بھوت پریت بن کے آپ کو ڈراتا پھرتا۔ خدا کو کوئی نظر نہیں دیکھ سکتی۔ فرمایا رسولؐ اللہ نے کہا خدا کا ایک حجاب نور ہے۔ اگر وہ اس حجاب کو اتار دے' تو پوری کائنات جل کے خاک ہو جائے۔ اس لیے آپ اپنی استطاعت سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ اللہ کے ستر ہزار حجابات نوری اور ستر ہزار حجابات ناری ہیں۔ یعنی خدا ایک ایسا پیکر ہے۔ ایسی شخصیت مبارک ہے' جو ستر ہزار تباہ کن انرجی اور ستر ہزار تعمیری انرجی کے پیٹرن میں چھپا ہوا ہے۔ آپ کے پاس کتنی

Marfat.com

انرجیز کا علم ہے؟ گاما ریز' ایلفا ریز' بیٹا ریز' یہ سب خدا کے حجابات ہیں' الیکٹرک ریز' مگر آپ دیکھیں کہ ان کے علاوہ کچھ ایسی انرجیز ہیں' جو بہت تخریبی اور تعمیری ہیں جیسے بجلی ہے۔ ابھی آپ کو روشنی دے رہی ہے' لیکن اس کی قربت آپ کو تباہ اور ہلاک کر دیتی ہے۔ اتنے سارے پیٹرن سے نکل کر خدا آپ کو کیسے نظر آئے؟ آپ میں اس نے اتنی استطاعت نہیں رکھی۔

البتہ اللہ نے اپنی دید موت کے بعد جنت میں رکھی ہے۔ ان کے لیے' جنہوں نے حصولِ جنت یا حورانِ جنت کے لیے نہیں' مکانوں کے لیے یا موتی' سیپ اور گھونگے کے محلات کے لیے نہیں' بلکہ محض خدا کی عبادات اور خدا کی محبت کے لیے زندگی کو سنوارا۔ جب وہ جنت میں جائیں گے' تو خداوند کریم ان کے لیے سب سے بڑا انعام جو تجویز کرتا ہے' وہ اپنا دیدار ہے۔ اس دنیا میں خدا کا نظر آنا ممکن نہیں اور ضروری بھی نہیں۔ ہوا بھی تو نظر نہیں آتی' مگر کون سی ایسی کیفیت ہوا ہے' جو محسوس نہیں ہوتی۔ کیا صبح کی شبنمی' گداز' ہلکی ٹھنڈی ہوا آپ کو محسوس نہیں ہوتی؟ کیا صحراؤں میں چلتی ہوئی بادِ سموم آپ کو محسوس نہیں ہوتی' کیا ان کا فرق محسوس نہیں ہوتا' کیا تپتی' اجاڑنے والی' سن سٹروک کر دینے والی لو محسوس نہیں ہوتی؟ جب ہوا نظر نہ آنے کے باوجود اپنے تمام اثرات آپ کو محسوس کروا دیتی ہے۔ اللہ نظر آئے نہ آئے' آپ کو اپنا احساس پورا پورا دیتا ہے۔ جو بھی اس کے لیے کوشش کرتا ہے' خدا اس کو مستقل اور پائیدار حواس دیتا ہے۔

اس احساس اور ان حواس کا بھی تصوف ہے۔ ہر چیز کی ایک تکمیلیت ہے۔ سونگھنے کی بھی ہے۔ سونگھنا کتنی بڑی چیز ہے' مگر آپ کے پاس کتے کی سمجھ نہیں ہے' وہ کتنی باریکی سے سونگھ لیتا ہے۔ آپ کے پاس شہباز کی آنکھ نہیں ہے' وہ کتنی بلندی سے دیکھ لیتا ہے۔ تو ان حسیات' ان حواسِ خمسہ کا بھی ایک تصوف ہے' جب یہ ریفائن تر ہوتی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے' کسی اندھے کو دیکھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس کے دیکھنے کی حس اتنی ہو جائے۔ آپ کو پتہ ہے' حواس خمسہ کے لیے آپ کو آلات چاہئیں؟ آلات کا حواس سے کیا تعلق؟ اس کا مرکز تو دماغ ہے۔ وہ پورے اعصابی نظام کے ذریعے آپ کے مختلف مقامات تک پہنچتا ہے۔ اگر یہ ریفائن ہو جائیں اور جو چیز بھی ریفائن ہو جاتی ہے' وہ درمیان کے ذرائع سے نجات حاصل کر لیتی ہے۔ اگر آپ کے حواس ریفائن ہو جائیں گے' تو آپ انسٹرومنٹس سے نجات حاصل کر لیں گے۔ آپ کو چھونے کے لیے ہاتھوں کی اور دیکھنے کے لیے آنکھوں کے قرنیہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ اتنے ریفائن ہو جائیں گے کہ بغیر دیکھے دیکھیں گے' بغیر چھوئے چھوئیں گے۔ یہ لذت انسان کے ذہن میں اتنا نفیس کمپیوٹر ہے کہ وہ جب چاہے' ان حواسِ ظاہرہ سے نجات حاصل کر کے ایک اعلیٰ ترین کوالٹی آف پرسپشن (Quality of Perception) پر چلا جاتا ہے' جو دیکھنے سے بہتر ہوتا ہے۔

خدا کے وجود کی دلیل

(انعام الرحمٰن سحری) جس گہرائی میں جواب کی توقع کی جا رہی ہے' وہ تو پروفیسر صاحب ہی دیں گے۔ میں یہاں جٹکا قسم کا جواب دیتا ہوں۔ مستنصر حسین تارڑ صاحب کو بھی یہی مسئلہ ہوا۔ ان کو ان کے استاد نے بڑے اچھے طریقے سے راستہ بتا دیا کہ گوالمنڈی میں جہاں پر یہ کھڑے ہوئے ہیں' آپ کو گوجرانوالہ نظر آتا ہے؟ انہوں نے کہا' نہیں

تو۔ انہوں نے کہا کہ پھر آپ کے ذہن کی رسائی ہی اتنی ہے۔ یہاں سے آپ کو گوجرانوالہ نظر نہیں آتا' تو اللہ تعالیٰ کیسے نظر آئے گا؟

ہم سب لوگ خدا کو مانتے ہیں اور ہر ایک کے ذہن میں کوئی نہ کوئی دلیل ہے۔ جیسے یہ ہوگی کہ فرض کریں' میرا نام زید ہے۔ مجھ سے ایک آدمی سوال کرتا ہے کہ آپ کے والد کا کیا نام ہے؟ وہ کہتا ہے' آپ کو کیسے پتہ؟ اب اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں کہ میرے والد کا نام وہی ہے' جو میں جانتا ہوں۔ مجھے اپنے والد کا نام اس لیے یاد ہے کہ مجھے میری ماں نے بتایا۔ میرے والد نے اور میرے رشتہ داروں نے بتایا اور اس کا مجھے اپنے پڑوسیوں سے پتہ چلا۔ اگر سوال کرنے والے سے اس قسم کا سوال کیا جائے' کہ وہ اپنے والد کو کیسے جانتے ہیں کہ یہی ان کے والد ہیں' تو اس کے لیے ان کو کون سا راستہ اختیار کرنا پڑے گا؟ وہ اپنی والدہ کے پاس جائیں گے۔ اپنے والد' ماموں اور رشتہ داروں کے پاس جائیں گے کہ وہ کہیں گے کہ یہ آپ کے والد ہیں۔ اگر آپ ان کی باتوں پر یقین کر رہے ہیں' تو انہی سے پوچھ لیجیے کہ خدا کون ہے؟ اس سے ان کی تسلی اس لیے ہو جائے گی کہ جب ہم ایک چیز کو ایک سٹیج سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ہماری پیدائش کیا ہے؟ پیدائش کے عمل میں کون کون سے ثبوت روا رکھے جاتے ہیں' وہی ثبوت آپ اللہ کے لیے فٹ کر لیجیے۔ تسلی ہو جائے گی۔

خدا ہے' نہیں ہے

ہر فرد کے خیالات کا ایک پیٹرن ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرے کا ذہن اس دلیل کو قبول کرتا ہو۔ چاہے پیش کرنے والے کے لیے وہ دلیل بڑی موثر ہو۔ ذہنوں کا فرق ایک دوسرے کی دلیل کو قبول نہیں کرتا۔ آیئے چلتے ہیں' اس معیار کی طرف' جس پر بات شاید سب کے لیے قابل قبول ہو۔ ہم عقیدے سے آغاز نہیں کرتے' بلکہ انکار سے کرتے ہیں۔ ایک بات کا ہمیں فرق کرنا پڑے گا کہ جو گلی کوچے کے اعتراضات ہیں' اوپر کی سطح پر بھی وہی اعتراضات ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایک سادہ ذہن میں یہ اعتراض بغیر کسی منطق' وضاحت اور لفظیات کے ہوتا ہے۔ وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ اس کو لفظوں کا لباس نہیں پہنا سکتا۔ اس میں اپنے خیالات کی چاشنی کا اضافہ نہیں کر سکتا۔ بڑے لیول کے لوگ اسے شاید منطق' فلسفہ' تاریخ اور توارد خیالات کے معانی دے کر اسی بات کو بیان کر دیتے ہیں۔ کہنے کے لیے ہمیشہ بات بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ہم الفاظ کے مینرازم (Mannerism) کا بھی شکار ہیں۔ مگر سوال یہ بڑا اصلی ہے۔

وکٹر ہیوگو کا ایک قول نقل کرتا ہوں کہ ہر انسان کے دل اور ذہن میں ایسے ایسے خیال آتے ہیں کہ اگر ان پر سزا دی جائے' تو دنیا کا ہر آدمی دن میں دس مرتبہ پھانسی پر چڑھنے کا مستحق قرار پائے۔ مگر یہ خیالات آپ کے ذہن میں بھی موجود ہوتے ہیں کہ خدا ہے کہ نہیں ہے؟ کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیونکر ہے؟ مگر اثباتِ حق کے لیے جیسے جوش ملیح آبادی نے کہا:

کہ ہم اہل نظر کو اثباتِ حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

میں آپ کے سامنے انکار کی سب سے بڑی دلیل رکھتا ہوں۔ سب سے بڑی دلیل' جس نے دنیا کو بہت متاثر

Marfat.com

کیا اور جس نے ایک صدی کو اپنے نام سے منسوب کیا' وہ لارڈ برٹرینڈ رسل' آئزن سٹائن' Semantics کے ماہرین اور Logical Positivism کے ماہرین تھے جن کا مختصر خیال یہ تھا کہ نسل انسان اس چیز کی قائل ہے جس کا Logical construct اس کے ذہن میں موجود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک اندھے آدمی نے ہاتھی نہیں دیکھا ہوا' تو وہ آپ کو کبھی قیامت تک نہیں بتا سکتا کہ ہاتھی کیا ہے؟ اس کے برعکس یہ ایک گول میز ہے مگر چونکہ میز کی بناوٹ ہمارے ذہن میں موجود ہے۔ اس لیے میز چورس ہو' لمبا یا چوڑا ہو یا تپائی ہو۔ کسی قسم کا بھی میز ہوگا' تو فوری طور پر میرا Logical construct مجھے بتائے گا کہ یہ میز ہے اور میں اسے ٹیبل ہی سمجھوں گا۔

ایک بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ لارڈ برٹرینڈ رسل سے' جب وہ عیسائیت پر اعتراض کر رہا تھا' کسی نے خط لکھ کر کہا کہ کیا آپ نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا' اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمام گاسپل سچائیاں ایک جیسی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ علمی بددیانتی کی بہت بڑی مثال ہے۔ اس لیے کہ بغیر ایک کتاب کو پڑھے' انہوں نے اس کی مماثلت دوسری کتاب سے کر دی اور اس پر رائے دے دی۔ ایک بڑے سے بڑا عالم بھی کبھی ریفرنس کی غلطی ضرور کرتا ہے اور یہی غلطی ان سے بھی ہوگئی۔ ان کا مختصر ترین نظریہ یہ تھا کہ چونکہ ہمارے برین کے Constructs میں خدا کا کوئی ڈیٹا موجود نہیں ہے' اس لیے خدا کا کوئی وجود نہیں۔ خدا کے بارے میں کوئی ڈیٹا نہیں ہے اور یہیں سے شاید سب سے زیادہ غیر منطقی پیٹرن شروع ہوتا ہے۔

'میں قرآن پر الہامی کتاب کا یقین نہیں رکھتا۔ میں قرآن کو خدا کی کتاب نہیں سمجھتا۔ میں قرآن کو کتاب مقدس نہیں کہتا۔ میں معترض ہوں۔ میں عالم تشکیک کا مسافر ہوں۔ مجھے اعتراض ہے۔ آپ کہتے ہیں' رسولؐ نے کہا۔ میں کہتا ہوں کہ میں رسول کو مانتا' تو پھر کام آسان نہ ہو جاتا۔'

Semantics کے ماہرین نے کہا کہ ہم نے لفظ دے دے کر ایک واہمہ کو حقیقت بنا دیا۔ خوف اور وحشت کے الفاظ نے اس کو اتنی عزت دی ہے۔ ہم نے ایک تصور کو اتنے لفظ دے دیئے۔ خدائے ذوالجلال والاکرام' یارحمٰن' یارحیم' یاکریم' یا سلام' یامومن' یاحی۔ کیا کیا ہم نے اس کو صفات نہیں دیں۔ وہ صفات اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اب چھلکے اتارنا ہم سے ممکن نہیں رہا۔ ہم ان کو نکال کر' چھلکوں کو اتار کر یہ نہیں لوگوں کو بتا سکتے کہ کوئی خدا نہیں ہے۔ آپ خوامخواہ ڈر رہے ہیں' اوکے!

یہ اعتراضات موثر اور خوبصورت ہیں۔ مگر انسان سے سب سے بڑی غلطی اس وقت ہوتی ہے' جب وہ اپنی ہی دلیل کو اپنے خلاف استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ رسل کہہ رہا ہے کہ خدا کے بارے میں کوئی ڈیٹا نہیں ہے۔ ایک کتاب دعویٰ کر رہی ہے کہ میں خدا کا ڈیٹا ہوں۔ ہمیں اس کتاب سے دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ میری زندگی' میری آزادی اور میری حریت کی سب سے بڑی حریف وہ کتاب ہے' جو مجھے ایک ایسے آقا کی خبر دے رہی ہے' جس کا میں غلام ہوں۔ چنانچہ میں قرآن کو اطاعت کے ساتھ نہیں دیکھوں گا' بلکہ میں اسے اپنی بے عزتی سمجھ کر دیکھوں گا۔

ایک کتاب جو میری آزادی سلب کر رہی ہے' وہ قرآن ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارا اللہ ہے۔ میں اس کا ڈیٹا ہوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم ڈیٹا کی پرکھ کے لیے تیار ہیں؟ کیا ہم میں اتنی جرأت ہے کہ ہم اس پر تنقید کر سکیں؟ کیا خدا تنقید سے خوفزدہ ہو سکتا ہے؟ اگر وہ خدا ہے' جو کوئی بھی ہے' جو اس کتاب کا مصنف اور مالک لکھنے والا ہے' جو یہ کہتا

Marfat.com

ہے کہ یہ میرے الفاظ ہیں' کیا اس بات سے ڈرتا ہے کہ انسان اس پر تنقید کرے؟ کیا وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ وہ ہمارے شکوک وشبہات کو برداشت کر سکے؟ اگر آپ قرآن کھولیں گے' تو پہلی دہشت جو وہ آپ پر طاری کرتا ہے۔ وہ یہ ہے الم' ذلک الکتاب لا ریب فیہ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

اب قرآن کے مطالعے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے تنقید کے معیار پر پرکھیں۔ اسے اپنی دانش' حاصل کردہ علم اور فلسفیانہ منطق کے اعلیٰ ترین ممکنہ قانون سے جانچیں۔ ہمت کی پستی اور کم علمی کو تنقید نہیں کہا جا سکتا۔ ایک کتاب کے برابر آنے کے لیے ہمیں اس کتاب پر پورا پورا عبور حاصل کرنا ہوگا۔ اس کتاب کے محل وقوع پر نظر رکھنی ہوگی۔ قرآن کس وقت سے یہ دعویٰ کر رہا ہے؟ آج سے پندرہ سو برس پہلے۔ شاید گریکس کے پندرہ سو برس ادھر۔

ہمارے پاس بہت سے اعتراض ایسے آئے' جن میں بغیر سوچے سمجھے کہا گیا کہ قرآن پرانی تہذیبوں کے الفاظ کو دہراتا ہے۔ بہت سارے جدید ترین علماء نے کہا کہ قرآن آج کے علوم پر پورا نہیں اترتا۔ اس کو تکنیکی بنیادوں پر جج کیوں نہ کیا جائے؟ مگر ایک شرط تو موجود ہے کہ قرآن چونکہ فلکیات کی بات کرتا ہے۔ بیالوجی اور حقیقت اشیاء کی بات کرتا ہے۔ وجود اشیاء کو متعین کرتا ہے' اس لیے کم از کم قرآن کو سمجھنے کے لیے ہماری مدت علم اور دانش اتنی وسیع تر تو ہو کہ ہم قرآن کے دیئے ہوئے بیان کو اسی تناظر سے پرکھ سکیں۔

قرآن میں دو قسم کے بیانات ہیں۔ ایک وہ بیانات ہیں' جن کا تعلق عبادات سے ہے۔ اللہ کہتا ہے' نماز پڑھو۔ آپ کہتے ہیں' نہیں۔ میں اس میں یقین نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ تم یہ ثابت نہ کرو کہ میں اس میں یقین نہیں رکھتا۔ قرآن کہتا ہے' صدقات دو۔ آپ کہتے ہیں' خوامخواہ میں کیوں اپنا مال ضائع کروں؟ قرآن میں صرف یہی بیانات نہیں ہیں۔ حقائق اشیاء سے متعلق سینکڑوں ایسے بیانات موجود ہیں' جن کا تعلق عبادات سے' فرضی خیالات سے نہیں ہے۔ وہ تمام موضوعات پر گفتگو کرتا ہوا فائنل اور حتمی فیصلے دیتا ہے۔ اگر ان میں سے ایک حتمی فیصلہ ٹوٹ جائے۔ ایک بات غلط ہو جائے' تو قرآن نہیں' صاحب قرآن غلط ہو جاتا ہے۔ کتاب کا مصنف غلط قرار پاتا ہے۔ وہ پھر خدا نہیں ہے۔ اگر خدا کی تعریف میں کوئی چیز شامل ہے' تو یہ کہ آپ اس کو اللہ کہتے ہیں' جو غلطی نہیں کرتا۔ اگر کتاب کی غلطی ثابت ہو جائے' تو وہ اللہ نہیں رہتا۔ بلکہ آپ کی جان بھی آزاد ہو جاتی ہے۔ کائنات کی ہر چیز میں حرکت سے لے کر پانی سے ہر چیز کی پیدائش تک قرآن کی ہر بات کو آج سائنس درست تسلیم کر رہی ہے۔

اب ذرا پانسہ پلٹایئے۔ صرف سائنس کی حد تک محدود نہ رہیں۔ عمرانیات کی بنیاد تو اللہ نے نہیں رکھی۔ یہ تو جدید علم ہے۔ مگر عمرانیات کی بنیاد اللہ نے اس وقت رکھی' جب اس نے کہا ولکم فی القصاص حیوۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون (پ ۲' س البقرۃ' آیت ۱۷۹) اے اہل عقل! غور کرو' ہم نے قصاص میں زندگی رکھ دی۔ ہم نے زندگی بچائی ہی قانون قصاص سے ہے۔ اگر میں قصاص کا قانون نہ بناتا' تو تم آپس میں لڑ لڑ کر مر جاتے۔ تم ایک دوسرے کو قتل کر دیتے اور یہ ایسے ہی ہوا۔

انتھراپالوجی کے بنیادی فلاسفر سے رجوع کرتے ہیں' جو نسل انسان اور معاشرے کی ترقی پر غور کرتے ہیں۔ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ پہلا قانون' جو نسل انسانی میں بنا' وہ قانون قصاص ہے۔ پرنس حمورابی آف بابلون

Marfat.com

پہلا قانون دان سمجھا جاتا ہے۔ اس کے کتبے پڑھ لیجیے اور قرآن کی آیات پڑھ لیجیے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ' کان کے بدلے کان' ناک کے بدلے ناک' حیرت کی بات یہ نہیں ہے کہ دونوں ملتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قرآن کے زمانے میں یہ کھنڈر دریافت نہیں ہوئے تھے۔ یہ بہت بعد میں دریافت ہوئے اور اگر کتبے لکھے ہوئے بھی کوئی تھے' تو پیغمبر پڑھے لکھے نہیں تھے۔ سب سے بڑی دلیل' جو اللہ نے پیغمبر کے وجود میں دے دی' یہ تھی کہ بڑا ہی کرم فرمایا کہ انہیں اُمی رکھا۔ انہیں نبی اُمی کا تفاخر دیا' تا کہ وہ کسی سے کچھ اور سیکھے ہی نہیں۔ جو کچھ اس نے کہنا ہے' مجھ سے کہے۔ جو کچھ سیکھنا ہے' مجھ سے سیکھے اور یہی ہوا۔ سیدنا ابوبکرؓ نے ایک شعر پڑھا۔ سرکار رسالت مآبؐ نے اس شعر کو دہرایا' تو غلط پڑھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا' یارسول اللہؐ! شعر ایسے نہیں ہے۔ آپ نے پھر پڑھا اور پھر غلط پڑھا۔ تو ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا' میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ آپ شعروشاعری کے لیے ہیں ہی نہیں۔ آپ کو آئے کیسے؟

لیکن ہمیں ابھی اس کی تصدیق کرنی ہے۔ آپ کے پاس منطق ہے۔ قرآن کا سارے کا سارا ڈیٹا جو آپ کے سامنے بکھرا پڑا ہے' اسے آپ مروت اور محبت سے نہ پڑھیے۔ جزدان میں مت سجائیے۔ پوری پوری تنقیدی صلاحیت سے پڑھئے۔ اس کی ایک ہی آیت غلط ثابت کر لیجیے' میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں بھی اس کا انکار کر دوں گا۔ مجھے بھی ایسا خدا نہیں چاہیے' جو میری طرح ہی غلطیاں کرتا ہو۔ لیکن یہ تیس سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے' میں بڑی بری طرح ناکام ہوں کہ اسے غلط ثابت کرسکوں میں اس میں یقین رکھتا ہوں' کیونکہ وہ ہمیشہ سچا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ سچا ہے۔

آپ سائیکالوجی کی بات کرتے ہیں' وہ سائیکالوجی کے بارے میں کہتا ہے کہ ہم نے تمام جانوں کو بخل جان پر جمع کیا۔ تشریح کا فرق ہے۔ پرانے زمانے کا سکالر جب شح کی وضاحت کرتا تھا' تو اسے بخل کہتا تھا۔ مگر خدا تو تمام جانوں کا ذکر کر رہا ہے۔ ایک چیونٹی اور ایک بلی میں کیا بخل ہے؟ بخل تو صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ مال اور پیسے کے ساتھ مخصوص ہے۔ پیسے پر سانپ بن کر بیٹھنے کو بخل کہتے ہیں۔ مگر خدا انسانوں کی تخصیص تو نہیں کر رہا ہے۔ اس نے تمام جانداروں کو بخل جان پر جمع کیا۔ جو لوگ انسانی زندگی کی جبلتوں کا مطالعہ کرتے ہیں' وہ سب ایک بات پر متفق ہیں کہ تمام حیات ارضی میں جو جبلت مشترک ہے' وہ ان میں بقاء کی جبلت ہے۔ ہر چیز اپنی بقاء کی خاطر ردِعمل کا اظہار کرتی ہے۔

خدا کہتا ہے کہ بادلوں کو کس نے آسمانوں میں تھام رکھا ہے؟ اگر میں قانون نہ بناتا' تو یہ کبھی نہ تھمتے۔ ابھی پانچ سال پہلے کس کو معلوم تھا کہ بادل تو کشش ثقل سے تھمے ہوئے ہیں۔ خدا یہاں بس نہیں کرتا۔ خدا تو آپ کو آخری کائنات کا نقش دیتا ہے۔ وہ تو آپ کو یہ کہہ رہا ہے کہ اے نسل انسان! تجھے اچھی طرح جانتا ہوں۔ تیرا انجام بھی جانتا ہوں اور تیرا آغاز بھی جانتا ہوں۔ وہ دن بھی آئے گا' جب ساری کائنات برباد ہو جائے گی۔ ہم سورج کو لپیٹ لیں گے۔ ستارے ختم ہو جائیں گے۔ ہر چیز جھڑ جائے گی۔ زمین زلزلوں میں آئے گی۔ روئی کے گالوں کی طرح پہاڑ اڑیں گے۔ مزید کیا ہوگا؟ سورج چاند پھر جمع کر دیئے جائیں گے۔ اب انسان بھی اسی نتیجے پر پہنچ رہا ہے۔

ایک بڑا تھیسز' جو انسانوں نے بڑا سوچ سمجھ کر کہا کہ کائنات کے ختم ہونے کا ایک بڑا سبب یہ ہوگا کہ سورج بجھ جائے گا۔ خدا نے کہا کہ ہم سورج کو لپیٹ لیں گے۔ ایک بات کا فرق ہے۔ سائنسدانوں نے کہا کہ دس ارب سال میں بجھ جائے گا۔ خدا کہتا ہے' جب چاہوں' بجھا دوں۔ جس پراسیس سے میں اسے چلا رہا ہوں' اس پراسیس کو میں ایک لمحے میں

Marfat.com

بھی ختم کرسکتا ہوں۔مگر خدا نے اپنے قوانین بنائے ہیں۔سارا قانون اور ساری حکمت اللہ سے ہے۔تمام سائنسز اللہ سے تعلق رکھتی ہیں۔جس کو چاہا' سودے دیا۔خدا حکمت کی کتنی تعریف کرتا ہے؟ سائنسز کی کتنی تعریف کرتا ہے؟ فرماتا ہے یوتی الحکمته من یشاء جسے چاہتا ہوں' حکمت عطا کر دیتا ہوں ومن یوتی الحکمته فقد اوتی خیرا کثیرا اور جسے میں نے حکمت عطا کی اسے خیر کثیر عطا کر دیا ہے مگر کہتا ہے وما یذکر الا اولو الالباب (پ ۳' س البقرہ' آیت ۲۶۹) مگر اہل عقل کے سوا مجھے کون یاد کرتا ہے۔تمام وقت وہ عقل' فکر اور تجسس کے لیے کہہ رہا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ آپ سچائی کا تعین کریں۔اس کے کہے پر مت جائیں۔اس کے ڈیٹا کی ریسرچ کریں۔میں اسے پسند کروں گا کہ آپ کبھی خدا کا ڈیٹا کا مطالعہ کریں اور اس میں کسی بڑے خدا کی نشاندہی کریں۔میں اس کا مطالعہ بڑی خوشی سے کرنا پسند کروں گا۔

خدا کی پہچان کیسے؟

جب تک آپ ذہنی کمٹمنٹ میں کمزور رہتے ہیں یا ایک مکمل علمی یقین خدا پر نہیں رکھتے' اس کے بغیر خدا سے مکمل آگہی' شناسائی اور اس کا عرفان ممکن نہیں ہوتا۔جس چیز کو آپ وسوسہ اور فریب خیال کہتے ہیں' وہ دراصل ہماری کمٹمنٹ کی کمی کے متوازن ہوتا ہے۔جب ایک دفعہ ہم مکمل طور پر خدا سے کمٹ کر لیں' تو باوجود چند باتوں اور غلطیوں کے اعادے پر' پروردگار کا دوسرا قانون ہم پر عائد ہوتا ہے کہ وماتوفیقی الا باللہ علیه توکل والیه منیب (پ ۱۲' س ھود' آیت ۸۸) وہ ہمارے اخلاص کا گواہ ہوتا ہے۔اسی لیے اس نے شیطان کو کہا کہ تو بہت سارے لوگوں کو بہکائے گا الا عبادا اللہ المخلصین (پ ۲۳' س الصافات' آیت ۶۰) مگر جن کے ساتھ میرا اخلاص ہے' تو انہیں کسی قیمت پر بھی بہکا نہیں سکے گا۔

حدیث مسلم یہ ہے کہ بہت سارے نیک پاک لوگ جنت میں لے جائے جا رہے ہوں گے کہ پروردگار کہے گا' ان سب مہاتماؤں کو جہنم میں پھینک دو۔چونکہ ذرا خلاف واقعہ بات ہوگی' تو ملائیکہ بڑی انکساری سے عرض کریں گے کہ پروردگار ان کے نامہ اعمال کی نیکیاں لکھ لکھ کر شرقاً غرباً ہم نے کاغذ ختم کر دیے اور آپ یہ فرما رہے ہیں کہ ان کو جہنم میں پھینک دو۔فرمایا' میرے اور بندے کا ایک معاملہ ہے' جو میں ہی جانتا ہوں اور وہ اخلاص ہے۔اخلاص شاید واحد وہ قدر ہے کہ جو انسان کو یقین کے ساتھ ساتھ اس کے عرفان کی طرف آگے بڑھا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سات چیزوں پر دوزخ کی آگ حرام قرار دی گئی۔خاص طور پر اس جوان کی آنکھ' جس سے اللہ کے لیے ایک آنسو نکلا۔اب یہ چیز ہمیں بتاتی ہے کہ اخلاص سے بڑھ کر بھی جب انسان کو علمی یقین ہوتا ہے' تبھی وہ اصلی طور پر جذباتی بھی ہوتا ہے۔میرا یہ یقین ہے کہ وہ جذبہ جو علم پر استوار نہیں' وہ جبلی اور جاہلیت کا جذبہ ہے اور وہ جذبہ دیوانگی اور مستی' جو اخلاص اور محبت اور پورے علمی یقین پر قائم ہے' وہی اصلی جذبات کہلاتے ہیں۔احسان دانش کا شعر ہے۔

یونہی دنیا کے لیے ایک تماشا نہ بنے
جس کو بننا ہو سمجھ سوچ کے دیوانہ بنے

قریب ترین راستہ

اسلام' اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ میری طلب کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد اس کا ذکر ہے۔ آپ اللہ کو ذہنی اعتبار سے ترجیح اول قرار دیتے ہیں اور اسے محبت اور کمٹمنٹ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ تیسری چیز جس میں پھر اللہ آپ کی مدد کرتا ہے' وہ آپ کا اپنی ذات اور اس سے باہر توازن کا حصول ہے۔ تصوف بھی یہی ہے۔ خدا کی پہچان بھی یہی ہے اور اس کی محبت کا آسان ترین طریقہ یہی ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ کو یہ پتہ ہے کہ آپ کا بنیادی نقص کون سا ہے' جو آپ کے اور خدا کے درمیان حائل ہے' تو پھر آپ بڑی آسانی سے اس نقص کو دور کر کے اللہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اگر کسی بھی موقع پر آپ کی کوئی حساسیت' کوئی بوجھل خیال' جو آپ کی ذہنی عادت بن جائے اور مستقل طور پر آپ میں ایک ناقص رویہ پیدا کر دے' تو پھر آپ کا اللہ تک پہنچنا آسان نہیں ہوگا۔ کسی بھی شعبے میں سپیشلسٹ یا استاد اس نقص کا تعین کرتا ہے' جس کی وجہ سے انسان کی ترقی رکی ہوئی ہوتی ہے۔

تمام تصوف میں کسی بیعت اور کسی استاد کی ضرورت نہ تھی۔ اگر تھی' تو صرف ایک کام کے لیے کہ وہ ایک ایسا ماہر ہے' جو انسانی میکانیت سے واقف ہے اور وہ اس کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے' جو ایک عمومی آدمی کے سپیشل کانسپٹ سے پوشیدہ ہے۔ یہی صوفی کا کمال ہے۔

خدا کس دل میں

یہ جو دل ہے' اس کے بارے میں ایک بڑی عجیب سی میڈیکل حقیقت سامنے آئی ہے کہ اس کے اوپر وصول کرنے والے چھوٹے چھوٹے خلیے سے لگے ہوتے ہیں۔ خلیے ذہن کو اپنے نروس آرڈر یا ڈس آرڈر کے سگنل بھیجتے ہیں۔ امریکہ کی ریاست میں سائیکالوجی میں جب سالز تجربات ہو رہے تھے' تو وہاں یہ موضوع زیر بحث آیا' جو ورڈز ورتھ نے لکھا تھا کہ میرا دل اس وقت اچھل جاتا ہے' جب میں آسمان میں قوس وقزح کے رنگ بکھرے دیکھتا ہوں۔ سائیکالوجسٹ اس بات کو چیک کرنا چاہتے تھے کہ آیا یہ درست ہے کہ واقعی کسی نظارے یا خیال کا پہلا تاثر دل پر ہوتا ہے۔ ان تجربات کو ہم Sals Experiments کہتے ہیں۔ ان تجربات کے بعد یہ بات بالکل طے پا گئی اور اس ضمن میں مزید تجربات بھی جاری ہیں کہ سب سے پہلا کسی بات کا تاثر دل قبول کرتا ہے اور اسے اتنی نازک حسیات میں ریکارڈ کرتا ہے کہ صرف آدھ سیکنڈ میں یہ پیغام دماغ تک پہنچتا ہے۔ دماغ کا سارا عمل ایک سادہ کمپیوٹر کا سا ہے' جو ان اندھے جذبات اور ریفرنسز کی تعبیر و توجیہ کر کے ایک باقاعدہ موضوع میں ڈھال دیتا ہے۔

تو دل ہی دھڑکنے کی جگہ ہے۔ وہی مرکز احساس ہے۔ دل ہی توجہ اور دل ہی خیال ہے۔ البتہ ہمارا کمپیوٹر اسے نقش پا اور رہگزر دیتا ہے۔ اس کو اس کا لباس اور زبان دیتا ہے۔ یہ اندھے جذبات کا مقام ہے' مگر اس کے ابتدائی تاثرات بہت اہم ہوتے ہیں۔

خدا تک رسائی کے ذرائع

ہم خدا کو مانتے اور چاہنے والے بھی ہیں۔ اس کے باوجود ہماری زندگی کا تساہل اور ہمارے بہت سارے معاملات اور ملی جلی ترجیحات ہمیں وہاں تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ اس میں کسی کا خیال یہ تھا کہ ہمیں کوئی ایسا مثبت طریقہ کار بتایا جائے کہ ہم اپنی اپ سیٹ ترجیحات کو دوبارہ مرتب کر کے آسانی سے قربِ خداوندی حاصل کر سکیں۔ ہمارے پاس اصول اور قانون قرآن اور متابعت حضورؐ اکرم کی مثال میں موجود ہے۔ کسی نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ حضورؐ کا اخلاق کیسا تھا؟ فرمایا' تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ وہ قرآن تھے۔

اصحاب رسول جب بھی بات کیا کرتے تھے اور جب بھی انہیں اپنی لاعلمی ظاہر کرنا ہوتی' تو کہتے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ چونکہ ہم نے زندگی کا بیشتر وقت اور اپنی بہترین صلاحیتوں کا وقت ایک ایسی تعلیم کو دیا ہوتا ہے' جو تمام تر دنیاوی مقاصد پر مشتمل ہوتی ہے۔ جب ہم جستجوئے خداوند میں آگے بڑھتے ہیں' تو ہمیں سب سے بڑی دشواری ڈیٹا کی پیش آتی ہے۔ ہمارے پاس قرآن کا علم ہوتا ہے نہ حدیث' فقہ' سیرت' مغازی نہ روایت و درایت اور نہ اسمائے الرجال کا علم ہوتا ہے۔ خدا اگر ہمارا تجسس اور جستجو سلامت رکھے' تو روزانہ یہ شکل بنالیں کہ فکر اور سوچ کے ساتھ دو بڑی کتابوں کا واضح طریقہ کار سے مطالعہ کریں اور اس کے ساتھ اگر خدا کی یاد' دوستی' محبت اور انس سے کی جائے' تو وہ آپ کی کشادۂ قلبی کے لیے بہت سارے وسائل مہیا کر دے گا۔

خدا کی چاہت کا اسلوب

خدا کی خدا کے لیے چاہت کے صرف تین اصول ہیں۔ میں اپنی ذاتی زندگی کا نچوڑ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ جب میں رہِ تلاش خداوند میں قدم رکھ رہا تھا' تو میرے سامنے بہت بڑا مسئلہ روایتی تصوف تھا۔ مجھے خوف آتا تھا کہ جو داستانیں مجاہدینِ رہِ خدا کی سن چکا ہوں' اگر مجھ پر یہی وارداتِ قلب گزری' تو بہت عرصۂ زندگی گزرنے سے پہلے ہی ہاتھ سلب ہو جائے گا۔ خوف یہ تھا کہ کیا میں اتنی مشقتیں اٹھا سکتا ہوں اور اتنی اذیتیں جو بہت سارے صوفیا کے ساتھ مشہور اور منسوب تھیں' جن میں ایک چلہ معکوس بھی تھا' یعنی کنویں میں الٹا لٹکنا۔ جب میں اس کا سوچتا' تو خوف و دہشت سے مجھے بخار سا ہو جاتا۔

دوسرا ایک مراقبہ قبر تھا' جو تین ماہ سے تین سال تک واقع ہو سکتا ہے۔ یعنی آپ ایک قبر میں اپنے آپ کو بند کر لیں۔ لامحالہ اس قسم کی مشقتوں کا تصور مجھے بے قرار رکھتا تھا۔ ایک رات ساون بھی برسا اور میں بھی بہت رویا۔ میں نے اللہ سے یہ عرض کی کہ اگر تجھے چاہنا ہم جیسے کمزوروں کا کام نہیں ہے اور اگر تجھے چاہنا' پسند کرنا اور تیرا قرب صرف طاقتوروں کے پاس ہے' جو اپنے اوپر اتنی سختی کر سکتے ہیں' تو میرا استعفیٰ بصد حسرت و یاس۔ اور اگر تو کمزوروں کا خدا ہے اور کمزوروں تک اسی طرح آتا ہے' جیسے طاقتوروں کو آتا ہے' تو میں اپنی جانب سے صرف ایک سادہ سی چیز کا تجھ سے وعدہ کر سکتا ہوں اور وہ میرے ارادے کا اخلاص ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد میں نے اپنے خلوص کو اللہ کے چند گنے چنے ناموں کے پڑھنے سے ظاہر کرنا شروع کیا۔ ایک بات میرے تجربے میں آئی ہے کہ جس سرعت اور جس تیزی سے خداوند کریم میری طرف بڑھا ہے' مجھے تو یوں لگا' جیسے میں کچلا جاؤں گا۔ میری تسبیح میں بھی اسی سرعت سے اضافہ ہونا شروع ہوا۔ میں نے سات مرتبہ آیت الکرسی تنہائی میں پڑھنی شروع کی۔ یہی کچھ میں خدا سے وعدہ کرسکا۔ یہ میں نے بڑا احسان اللہ پر کیا اور کہا کہ اپنے اخلاص کا ثبوت دینے کے لیے میں سات مرتبہ آیت الکرسی تیرے لیے پڑھوں گا لیکن صرف تین ماہ کے عرصے میں میری تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ چھ ماہ میں بارہ ہزار اور ایک سال میں تقریباً تیس ہزار تک پہنچ گیا۔ اگلے سال میرے شوق کا یہ عالم تھا کہ میں ساٹھ اور ستر ہزار کے درمیان روزانہ تسبیح کرنے کے جنون میں مبتلا ہوا۔ یہ سلسلہ جاری رہا' تا آنکہ میں خلق میں گھیرا گیا۔ میرا وقت کچھ تعلیم و تربیت میں صرف ہوا۔ اس سے میں نے ایک بات جانی ہے کہ خداوند کریم کسی بھی طور کسی بھی آدمی کو مایوس نہیں کرتا۔ چاہے وہ میرے جیسا تساہل پسند اور بے کار منش انسان ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے کہیں مقام حاصل نہیں تھا' لیکن اس کے بعد میں نے ایک پالیسی اپنائی اور اس پالیسی نے مجھے مدد دی۔ لوگ مجھے کہتے تھے کہ آپ سگریٹ پیتے ہیں۔ میں انہیں کہتا تھا' برا کام ہے۔ مگر اس کے لیے میں اچھا کام نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ سگریٹ پیتے ہوئے تسبیح چھوڑ دوں' تو یہ نہیں کرسکتا۔ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ تسبیح دکھا کر کرتے ہیں۔ میں نے کہا' میں نے جائزہ لے لیا تھا کہ خلق کی رائے کا مجھ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ میں نے سب سے پہلے خلق کی رائے سے بے نیاز ہونا سیکھا' پھر تسبیح باہر نکالی۔

تین بڑے اصول جو تیس سالہ زندگی میں میں نے دیکھے ہیں' وہ یہ ہیں کہ جس شخص نے خدا کو ترجیح اول سمجھا' اس کو خدا ضرور صلے میں رسپانس دیتا ہے۔ میں نے بھی اپنی ترجیح کی برقراری تسبیح سے کی۔ اللہ اسے بہت ہی زیادہ یاد کرتا ہے۔ تیسری چیز' جو اسے خدا کے ہاں سے ملتی ہے' وہ صرف ایک اور ہے وہ قرآن میں درج ہے الا ان اولیآء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (پ ۱۱' س یونس' آیت ۶۲) ہم اپنے دوستوں پر خوف اور غم نہیں رہنے دیتے۔ جو شخص بھی خدا کی طرف آگے بڑھے' وہ اس دن اپنے آپ کو ریکارڈ کرلے۔ دو چار ہفتوں میں ہی اس کا رسپانس آجاتا ہے۔ وہ انسان کو سکون اور طمانیت کے لمحے میسر کردیتا ہے۔ اب اس سے زیادہ انسان کے لیے اللہ کیا کرے؟

اللہ کے رسپانس کو سنبھالنا اور جذب کرنا کبھی یک طرفہ اور اچانک نہیں ہوتا۔ آپ کی بہت ساری انسانی جبلتیں ہیں اور بہت ساری خدائی صفات ہیں۔ فنا فی اللہ کی سٹیج پر سیدنا عثمان ہجویریؒ کہتے ہیں کہ ایک دم سے تبدیلی نہیں آتی۔ جب ہم تسبیح کرتے ہیں' تو ہماری جبلتیں اس کے خلاف جنگ کرتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ وہ دبنا شروع ہو جاتی ہیں۔ بعض سخت گیر افراد کو اس جدوجہد میں کئی سال لگ سکتے ہیں۔ جبکہ بعض افراد جن میں مقبولیت کی کلی حس پائی جاتی ہے' ان کے لیے صرف چند دن لگتے ہیں۔

آج کے زمانے میں مقبولیت کا ریٹ اتنا زیادہ ہے کہ میرے تجربے میں خدا کی طرف چلنے والے افراد کو سال نہیں' دن لگے۔ حد بندی صرف ایک ہے اور وہ اللہ نے فرمایا کہ اے بندگانِ خدا! میں نے کچھ حدود بنائی ہیں تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا ومن یتعد حدود اللہ فاولٓئک ھم الظلمون (پ ۲' س البقرۃ' آیت ۲۲۹) جوان

Marfat.com

حدود سے تجاوز کرتا ہے' وہ ظالم ہوتا ہے۔ اگر انسان صرف اتنا ہی کر سکے الذین یجتنبون کبیر الاثم والفواحش (پ ۲۷ 'س النجم' آیت ۳۲) کہ بڑے بڑے گناہوں سے بچے۔ خدا کہتا ہے' چھوٹے چھوٹے تو تم ضرور کرو گے' مجھے پتہ ہے اور کبھی بھی اپنے آپ کو بے گناہ نہ سمجھنا۔ وہ سرزنش کرتا اور سختی سے تنبیہ کرتا ہے کہ اپنے آپ کو مقدس نہ کہنا ھو اعلم بمن اتقی میں اچھی طرح جانتا ہوں' تم کتنے متقی ہو۔ کبھی دعویٰ تقدس نہ کرنا۔

یہ دعویٰ تقدس نہ کرنے والا وہ انسان ہے' جو نارمل ہے اور اپنے آپ کو ہمیشہ لغزش و خطا و جزاء کے درمیان محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے سیدنا صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ ایمان بیم و رجا کے درمیان ہے۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میرے اچھے اعمال کیا ہیں' تو خیال آتا ہے' سب سے پہلے جنت میں داخل کیا جاؤں گا اور جب اپنے گناہوں کو دیکھتا ہوں' تو ڈرتا ہوں کہ سب سے پہلے جہنم میں داخل کیا جاؤں گا۔ تو فرمایا' ایمان بیم و رجا کے درمیان ہے۔ انسان زندگی کے اختتام تک کبھی اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھے اور خطا کو اتنا بڑا نہ سمجھے کہ خدا اسے معاف نہیں کر سکتا۔ یقیناً آپ معتدل ہوں گے۔ اعتدال میں علم ہے۔ اعتدال میں شناخت ہے اور اعتدال میں خدا ہے۔

اللہ کا تمثیلی تعارف

الله نور السموت والارض مثل نوره کمشکوة فیها مصباح المصباح فی زجاجة الزجاجة کانها کوکب دری یوقد من شجرة مبرکة لاشرقیة ولا غربیة یکاد زیتها یضیٔ ولولم تمسسه نار نور علی نور یهدی الله لنوره من یشآ ویضرب الله الامثال للناس والله بکل شئی علیم o

(اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے' جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو۔ چراغ ایک فانوس میں ہو۔ فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا تارا اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو' جو شرقی ہو نہ غربی۔ جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو۔ چاہے آگ اس کو نہ لگے۔ روشنی پر روشنی۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے' رہنمائی فرماتا ہے۔ وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے)

سب سے بڑی مشکل جو کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے ساتھ پیش آ سکتی ہے' وہ اس کی صلاحیت' تعلیمی معیار اور کمیونیکیشن گیپ ہے۔ کمیونیکیشن گیپ نسلوں میں نہیں ہوتا' بلکہ ذہنوں میں ہوتا ہے۔ ایک ذہن کے پاس مناسب انسٹرومنٹس اور جدت خیال نہ ہو کہ وہ ایک اعلیٰ ترین مثال اور تفہیم کو پا سکے' تو ایک ماورائی ہستی کو سمجھنے میں مشکل آتی ہے۔ پروردگار عالم نے انسانی ذہن کو مدنظر رکھتے ہوئے ان آیات میں اپنے بارے میں بہت سارے گیس ورک کا خاتمہ کر دیا ہے یعنی اس کے بازو اور ہاتھ ہیں' تو وہ نور کے ہیں۔ وہ مجسم صورت نور اور توانائی ہے۔ الله نور السموت والارض

مگر جب ہم نور کی اہمیت اور نیچر سمجھنا چاہتے ہیں' تو ہم بری طرح الجھ جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نور کی دریافت شدہ قسمیں بہت تھوڑی ہیں۔ پچیس نہیں تو تیس ہوں گی۔ جیسے الفاریز' گاماریز' بی ٹاریز' الیکٹرک ریز' لیزر' پروٹون ریز اور ریڈی ایشن وغیرہ۔ تاہم ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے انوار کو سمجھنے کا علم بہت محدود ہے' جبکہ انوار کی اقسام ایک لاکھ 40 ہزار ہیں۔ حضور گرامی مرتبتؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے 70 ہزار حجابات نوری اور اتنے ہی ناری

Marfat.com

ہیں۔ناری سے مراد تخریبی انرجی اور نوری تعمیری انرجی ہے۔اس کے ساتھ جب ہم الیکٹرک نور کو دیکھتے ہیں' تو پتہ چلتا ہے کہ بیچ میں 70 ہزار ایسے انوار بھی ہوں گے' جو بیک وقت تعمیری اور تخریبی ہیں۔انسانوں کی فلاح و بہبود میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور شاک کی صورت میں ان کے لیے خطرے کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔

خداوند کریم نے ایک نہایت خوبصورت مثال سے کائنات کی فطرت کا اظہار کیا ہے۔کائنات کی فطرت وہ نہیں ہے' جو آج کل کے سائنسدان بتا رہے ہیں' بلکہ ایک کنارے سے اس کا سارا مخرج ہے۔یہ ایک بہت بڑی روشنی کا مخرج ہے' جو جتنی دور تک پہنچتی ہے' ہر چیز کو روشن کئے دیتی ہے۔چنانچہ بنیادی طور پر کائنات مرکزی فکر میں نہیں ہے' بلکہ یہ ایک ہی طرف سے روشن ہو رہی ہے اور جہاں تک اس کا پھیلاؤ ہے' وہاں تک اللہ کا نور پہنچتا ہے۔اللہ کے پیچھے غالباً کچھ بھی نہیں ہے۔بلکہ جو کچھ بھی ہے' وہ آگے ہے۔کیونکہ اس میں مشکوٰۃ کی جو مثال دی گئی ہے' جو طاق میں پڑا ہوا ہے' وہ انسانی دل کو بھی دی گئی ہے مگر اس کی زیادہ بہتر تفہیم اس وقت ہوتی ہے' جب ہم تعمیر کائنات اور خود کائنات کو دیکھتے ہیں۔تمام کہکشائیں منضبط ہیں سخر الشمس والقمر والنجوم مسخرت با مرہ چاند' سورج ستارے سب بڑی ترتیب سے اپنی اپنی کہکشاؤں میں چل رہے ہیں۔سورہ یٰسین میں اللہ کے بیان کے مطابق ہر ایک اپنے اپنے دوائر میں تیر رہا ہے' مگر الیکٹرک موومنٹ یا بننے والے دائروں کا مخرج دائرے میں نہیں ہے۔یہ اس لیے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کو ذہناً وعقلاً کنٹرول کر رہا ہے۔ھو الاول والاخر والظاھر والباطن وھو بکل شئی علیم اس میں اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ نور کی اعلیٰ ترین اور مُصَفّٰی قسم کون سی ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں سب سے بہترین مثال انسان کے دل اور دماغ کی سی ہے' جو پورے جسم' اس میں پھیلاؤ اور اس کی نس نس کو کنٹرول کرتا ہے۔اسی طرح پوری کائنات کا نظام وھو بکل شئی علیم' علم کے ذریعے قابو میں آتا ہے۔اس نے ایسے طریقے سے دنیا کو سنبھالا ہوا ہے' جو صرف علم اور عقل پر مبنی ہے۔یہ ضروری نہیں کہ اتنی بڑی کائنات اور مکان کا مالک سارے مکان میں خود ہی بیٹھا ہوا ہو۔مگر وہ سارے مکان کو جانتا اور اس کا احاطہ اسی طرح رکھتا ہے' جس طرح کیمرے وغیرہ لگا کر آپ کو ضرورت نہیں کہ آپ اپنی جگہ سے حرکت کر کے ہر چیز کو دیکھنا چاہیں۔آج کے جدید دور میں دوری کائنات میں چیزیں اتنی وضاحت سے نظر آ سکتی ہیں' تو خدا کا سسٹم تو اس سے بہت زیادہ مکمل ہے۔

مذکورہ آیت میں زیتون کے تیل کی مثال دی گئی ہے۔اس تیل کی لو زیادہ بھڑکتی نہ زیادہ کم ہوتی ہے۔ایک مستقل رفتار سے جلتی ہے۔اس کے صاف ستھرے تیل میں گند یا غلاظت نہیں ہے۔اسی طرح اللہ کے نور میں کمی بیشی ہے' نہ اس کی طاقتوں کو کوئی زوال ہے۔کوئی اس کا عروج بھانپ سکتا ہے نہ زوال۔بلکہ وہ ایک ذہانت کی مکمل شکل میں ہے۔تمام کائنات بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثم استوی الی اسمآء فسوھن سبع سمٰوت۔ہم نے سات آسمان درست کئے۔اگر فسوھن کا عمومی مطلب ہر چیز کو ترتیب اور بیلنس میں ڈالنا ہے' تو ہو سکتا ہے' ہماری کہکشاں کا بیلنس اپر گلیکسی میں ہو۔چاند' ستارے' سورج قائم نہ رہ سکیں' اگر ان کو بھی کسی کشش نے نہ روک رکھا ہو۔ایک چھوٹی سی زمین کی گیند کو سنبھالنے کے لیے کشش کے دائروں کی ضرورت ہے' تو اس کے لیے شاید بلین اور بلین سالوں کا ڈھانچہ بنانا پڑا ہو' جو اس چھوٹی سی گیند کو روک رکھے۔یہ گلیکسیز اسی طرح بنتی چلی جاتی ہیں اور ان کا مقصد پوری کائنات کو بیلنس اور توازن میں رکھنا ہے۔

Marfat.com

اسی طرح اور کائناتیں ہیں۔ کل یوم ھو فی شان خداوند کریم ہروقت شانِ تخلیق میں ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک دنیا یا ایک کائنات بنا کر تھک گیا ہے۔ یہ اللہ پر طنزِ غریب ہوگا۔ پروردگارِ عالم مستقل تخلیق کار ہے۔ اس نے کہا کہ تم اگر میری صفات گننا چاہو تو ساری دنیا کے سمندر سیاہی اور درخت قلم بن جائیں' تو بھی تمہیں میری باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ یہ کوئی محاورہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر ساری دنیا کے درخت کاٹ کے ہم قلمیں بنالیں' تو ہمیں شاید اپنی دنیا کے واقعات کا احاطہ علم ہی نصیب نہ ہو۔ چہ جائیکہ اتنی بڑی کائنات میں اس کی قدرتوں کو قلمبند کر سکیں۔ اس کے لیے ہمیں عمریں اتنی طویل چاہئیں کہ ہم ان کا تصور نہیں کر سکتے۔

خدا زمین کے موجودہ پیٹرن کو مصنوعی سمجھتا ہے وما الحیوۃ الدنیا الا قلیل وما الحیوۃ الدنیا الالھو ولعب اس کا یہ کریکٹر ہے کہ انسان اس کو ضائع نہ کرے مگر وما الحیوۃ الدنیا الامتاع الغرور ظاہر کرتا ہے کہ یہ دنیا سرابِ تخیل ہے۔ اب سرابِ تخیل آپ کو ایسے تصوراتی پیٹرن دیتا ہے' جو انسان کو تکبرات میں ڈال دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اہم سمجھنے لگتا ہے۔ سب سے بدترین بات جو پوری نسلِ انسانی میں ہے یہ ہے کہ وہ خود پسند ہے۔ یہ کہنا کہ صرف ہم ہی انسان اور ہم ہی کائنات میں اکیلے ہیں' احمقانہ خود پسندی کی مثال ہے۔ اس لیے میری رائے میں اللہ کو واقعی وہی لوگ سمجھتے ہیں' جو علم رکھتے ہیں انما یخشی اللہ من عبادہ العلمٰو اللہ کے عالم ہی اس سے ڈرتے ہیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں' جب تک آپ کی تعلیم اور معرفت کے معیار اتنے بلند نہ ہو جائیں کہ آپ اشیاء کی حقیقت تک پہنچ جائیں۔

اشیاء کی حقیقت میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ایک بہت بڑا دماغ ہے' جو بیک وقت مرید' متکلم اور قدیر ہے۔ جس میں جو سوچ آ رہی ہے' وہ عملی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ خدا کو صرف سوچنے کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ جتنا سوچ رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے' اسی طرح اس کی سوچیں عمل پذیر ہو رہی ہیں۔ جس دن اس نے سوچا کہ بس بھئی کل من علیھا فان تو ہر چیز کو فنا آ جائے گی۔ اب وہ چاہے گا' تو ہر چیز دوبارہ وجود میں آئے گی۔ وہ ایک ایسے بہت بڑے عالم کی طرح ہے' جو رطب و یابس' خیر و شر اور نیکی و بدی ساری چیزیں سوچتا ہے۔ اپنے ذہن کے اندر بے شمار خاکے رکھتا ہے اور ایک دن ان سب کو اس لیے تباہ کر دیتا ہے کہ اب اس میں سے کارآمد چیزیں باہر رکھ لے۔ یہی بات اللہ نے قرآن میں کہی ہے کہ ہم علوم کو چلاتے تو اکٹھا ہیں' مگر وہ رکھ لیتے ہیں' جو کارآمد ہیں اور انہیں ترک کر دیتے ہیں' جو ناکارہ ہیں۔

اللہ نے مذکورہ آیت میں علم اور عقل کے نور کی بات کی ہے۔ وہ علم و عقل' جو بہرحال سب سے بڑی اللہ کی قوت اور سب سے بڑی شناخت خداوند ہے۔ خدا یہ نہیں چاہتا کہ اسے چنگیز اور ہلاکو جیسا خدا سمجھا جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی حقیقی عزت اور پہچان کی جائے۔ حقیقی عزت صرف عالم کی ہے۔ دنیا میں بھی دل سے انہی افراد کو مستقل عزت ملتی ہے' جن کی بات لوگوں کے دل کو لگے اور جب تک اللہ کی بات ہمارے دل کو نہیں لگے گی' ہم اس کی شناخت کے قابل نہیں ہو سکتے۔

اللہ شہ رگ سے قریب

اگر آپ پورے جسم اور دماغ کی سائیکالوجی کو جانتے ہوں' تو آپ کو معلوم ہے' برین سے اس کے تمام مسلز اور ان کی سرگرمی کنٹرول ہوتی ہے۔ اگر نہ ہو' تو پورا جسم بیکار ہے۔ اس کو Fore Brain کہتے ہیں۔ فور برین میں انسان کے

اعلیٰ تصورات، تخلیقی صلاحیتیں اور اس کے چانسز ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہا وما من دآبۃ فی الارض الا ھو اخذ بنا صیتھا ان ربی علیٰ صراط مستقیم کہ اب کوئی ذی حیات نہیں ہے، جسے میں نے اسے ماتھے سے تھاما ہوا نہ ہو۔ ماتھے سے تھامنے کا قطعاً مطلب یہ نہیں کہ اللہ نے کسی کو بالوں سے گھسیٹنا ہے یا جلد سے پکڑا ہوا ہے، بلکہ یہاں اس سے مراد Fore Brain ہے۔ فور برین قابل فہم طور پر تمام امکانات زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔ ذہن اور جسم کے بنیادی احکام جاری کرتا ہے۔ اس فور برین پر اللہ کا ریموٹ کنٹرول ہے۔ یعنی خدا نے ہر تخلیق پر ایک ریموٹ کنٹرول رکھا ہوا ہے، تاکہ اس کے اعمال کو گائیڈ کر سکے۔

اعمال کو گائیڈ کرنا اور نتائج اور چانسز میں بڑا فرق ہے۔ آپ کے تمام اعمال مقدر کی مدد سے گائیڈ ہوتے ہیں۔ چانسز ان اعمال کے بیچ ہیں۔ عمل تو آپ کو دے دیئے جائیں گے، لیکن چانسز آپ پر چھوڑ دیئے جائیں گے، جو ان اعمال میں سے آپ انتخاب کریں گے۔ تو خداوند کریم نے خالی آپ کو نہیں، ہر ذی حیات جانور کو اس کے ماتھے سے کنٹرول کر رکھا ہے۔ اگر یہ کنٹرول نہ ہوتا، تو کوئی سانپ کسی کو نہیں کاٹ سکتا۔ کوئی بچھو ڈسے نہیں۔ کوئی بھڑ کاٹے نہیں۔ کوئی جانور اس طرح عمل نہ کرے، جس طرح وہ کرتا ہے یا اس میں جارحیت پیدا نہ ہو۔

چنانچہ خداوند کریم نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے تمام واقعات کی ظہور پذیری کو کنٹرول کیا ہوتا ہے۔ خدا کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری سوچوں سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہوں۔ ماتشآنون الا ان یشآء اللہ میں اگر چاہوں کہ تم نہ چاہو، تو تم چاہ بھی نہیں سکتے۔ میں تمہیں رنج دیتا ہوں۔ تم جب مریض ہوتے ہو، تمہیں شفا دیتا ہوں۔ میں تمہارے اولین لمحہ زندگی کا مالک ہوں۔ تمہارے آخری لمحہ زندگی کو بھی ترتیب دیتا ہوں اور ان کے بیچ میں جو کچھ ہے، اسے بھی۔ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ اللہ مالک ہے زمین و آسمان کا وما بینھما اللہ مالک ہے دو کناروں کا، اور جو ان کے بیچ میں ہے۔ چنانچہ خدا کا یہ کہنا اس کا حق ہے کہ نحن اقرب الیہ من حب الورید

صرف یہی نہیں ہے۔ شیطان بھی کبھی رگوں کے قریب آ جاتا ہے۔ تمہاری رگ جان سے اس قدر قریب ہوتا ہے کہ تمہارا خون بن کر دوڑ رہا ہوتا ہے۔ وہ ترغیب اور سراب کے ذریعے دوڑتا ہے جبکہ اللہ خیر کے احکامات کے ذریعے۔ جادو اور اس میں فرق یہ ہے کہ جادو سراب تصور پیدا کرتا ہے۔ جیسے انسان کو حقائق نظر آتے ہیں، ایسے حقیقت میں وہ ہوتے نہیں ہیں۔ اللہ آپ کو حقائق دکھاتا ہے۔ شیطان آپ کو تصور اور سراب دکھاتا ہے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کو جادوگروں نے اپنے کرشمے پیش کئے۔ موسیٰ کو رسیاں چلتی نظر آئیں، حالانکہ وہ ایسی تھیں نہیں۔ خدا حقائق پیش کرتا ہے اور آپ کے وژن میں حقیقت ہی پیش نظر ہوتی ہے۔ مثبت دلیل و محبت اللہ کی طرف سے جبکہ منفی محبت شیطان کی طرف سے ہے۔

خدا یا مذہب کیوں ضروری؟

اپنے ایک دوست کے ہاں نشست میں مجھے کسی نے آواز دی کہ اللہ کی ایک آدھ بات بتا دیں۔ وہاں ایک آرٹسٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ چالیس برس کے تھے۔ میں نے کہا کہ کیا آپ کے تجسس نے بھی آپ کو کبھی بہتر سوچ کی طرف مائل کیا؟ باقی لوگ بڑا اشتیاق ظاہر کر رہے ہیں۔ آپ بڑے خاموش بیٹھے ہیں۔ کہنے لگے، چالیس برس ہو گئے، کبھی

Marfat.com

ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں نے کہا' یہاں تک تو میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ چالیس برس تک آپ کو خدا کی ضرورت نہیں پڑی۔ مگر اگر اکتالیسویں سال پڑگئی' تو پھر کیا کریں گے؟

میں نے امریکہ جا کر دیکھا' لوگوں کو اللہ سے دلچسپی ہی نہیں ہے۔ آپ جوش وجذبے سے بتانا چاہتے ہوں' تو الگ بات ہے۔ میں نے ایک امریکی سے پوچھا' کیا تمہیں اپنے آپ کو جاننے سے دلچسپی ہے؟ اس کا جواب تھا' میں اپنے آپ کو جانتا ہوں۔ میں نے کہا' تم اپنے آپ کو نہیں جانتے۔ کہنے لگا' اے مین! تم مجھے مجھ سے بہتر کیسے جانتے ہو؟ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا' ہاں' میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس نے برامنانا شروع کردیا۔ میں نے اسے بتایا کہ تم میں یہ عادت ہے۔ وہ ایک دم سے اچنبھے میں پڑ گیا۔ تم یہ کیسے جانتے ہو؟ میں نے کہا' میں نے تمہیں اسی لیے کہا کہ میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ یقین کریں کہ پندرہ منٹ کے بعد سارے کا سارا نقشہ بدل گیا۔ وہ بڑا حیران ہوا۔ اس نے کہا' یہ تمہیں کیسے پتہ لگتا ہے۔ میں تو پہلی مرتبہ تم سے ملا ہوں۔ نیچے اتر آیا اور اس نے مجھ سے بڑا عجیب وغریب سا سوال کیا کہ میری اور تمہاری ملاقات محض اتفاق تھی یا کہ مقدر؟ میں نے کہا' میرے حساب کتاب میں تو اتفاق نام کی کوئی شے ہی نہیں۔ جدھر جاؤ' ہم مقدر سے بندھے ہوئے ہیں۔

تو بات یہ ہے کہ خدا کی ضرورت اصولاً نہ مجھے چاہیے نہ آپ کو چاہیے۔ مگر حقیقت سے نظر پوشیدہ رکھنا اور اپنے آپ کو سرابوں میں بند رکھنا' اس پر محاورہ Astrich life فٹ آتا ہے۔ ریت میں شتر مرغ گردن چھپالیتا ہے۔ جب اس پر بھیڑیئے حملہ آور ہوتے ہیں' تو وہ اپنی گردن چھپا کے سمجھتا ہے' میں چھپ گیا ہوں۔ اس سوال سے بچ کوئی نہیں سکتا۔ جس انسان نے زمین پر زندگی پائی اور جب انسان کو اللہ نے شعور عطا کیا' اس کو فکر کی ترقی وترویج سے نکلنا اور بتدریج ایک سوال سے دوسرے سوال تک جانا ہے۔ ہوسکتا ہے' مجھ میں اور آپ میں فرق یہ ہو کہ میں نے فلسفہ ترجیحات کو ابتداء میں حل کرلیا تھا۔ ممکن ہے' میرے سوال کرنے والے دوست اس فلسفہ ترجیحات کو اس وقت حل کریں' جب سماعت اور نظر نہ رہے صرف زبان رہ جائے۔ اس وقت ذرا ٹاسک مشکل ہوجاتا ہے۔ انسان کو مسئلہ اس وقت حل کرنا چاہیے' جب اس کے پاس مسئلہ حل کرنے کا انسٹرومنٹ موجود ہو۔ اس وقت پر بات چھوڑنی نہیں چاہیے کہ جب آپ بالکل بیکارِ محض کی طرح مسئلے کو اپنے اوپر مسلط دیکھیں اور آپ کے پاس حل کوئی نہ ہو۔

Marfat.com

تشکیل الٰہیات جدید

موضوع زیر بحث بظاہر فلسفیانہ اور داخلی تفکر کی نوعیت کا ہے۔ مگر آج کے زمانے میں اس موضوع کا اطلاق ہماری زندگی کے قریباً ہر شعبے پر ہوتا ہے۔ تشکیل الٰہیات جدید سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم کسی نئی مذہبی فکر کی تلاش، کسی شرح کی تبدیلی یا کسی تازہ ترین تخلیقی تصوف یا مذہب کی تیاری کے لیے سرگرداں ہیں۔ بلکہ خیال یہ ہے کہ ایک ایسا مذہب یا پروگرام، جو پروردگار کی طرف سے ہر زمانے کے لیے ایک حیثیت رکھتا ہے۔ جب کسی زمانے میں اس کا اطلاق مکمل نہیں ہوتا، یا وہ نمو نہیں پاتا، تو مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی خطا یا غلطی ہے، جو ہمیں اپنے مذہبی تصور کو کسی اصل میں متوازن کرنے یا اسے لے کر چلنے کی راہ میں آڑے آتی ہے۔ آخر وہ کون سا المیہ ہے، جس کی وجہ سے اسلام دور حاضر میں اپنی خاص حیثیت میں تشکل نہیں رکھتا؟ اس پر طرح طرح کے الزامات اہل مغرب کی طرف سے آتے ہیں یا ہمارے اپنے ذہین لوگ، جو زندگی میں علم و فن میں کچھ ترقی کرتے ہیں، اس پر عائد کرتے ہیں؟ کیا بات ہے کہ انہیں مذہبی تصور کو اپناتے ہوئے ذہنی کوفت محسوس ہوتی ہے......؟

اس کی صرف دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ شاید یہ نظام اس قابل نہیں رہا کہ آئندہ زمانوں میں چل سکے۔ یا نعوذ باللہ اس نظام کی مقتدر قوت یعنی اللہ رب العزۃ کی الٰہیاتی قوتوں میں کوئی فرق آ گیا ہے، جس کے نتیجے میں وہی نظام، جو اس نے قیامت تک کے لیے دیا تھا، دور حاضر تک پہنچ کر کمزور ہونا شروع ہو چکا ہو۔

دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مذہبی تصور کی توجیہات پیش کرنے اور اسے آگے بڑھانے والے نقاد، فقیہہ، مجتہد اور مفسر ممکن ہے، اپنا عقلی معیار کھو بیٹھے ہوں جس کی وجہ سے یہ مذہب قرون اولیٰ سے آگے جدید ترین دور میں، جس صورت میں اسے پیش ہونا چاہیے تھا، اس انداز میں پیش نہیں ہو رہا۔ دراصل بارہویں اور پندرہویں صدی کے بعد اس مذہب کے تناظر، توجیہ اور اس کی وضاحت میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پروردگار نے ہر دو میں اپنا دفاع خود کیا ہے۔ کوئی انسان خدا کے لیے دلیل بیان نہیں کرتا۔ الا یہ کہ خدا اسے اپنی دلیل تک پہنچائے۔ یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ آج کے زمانے میں عظیم المرتبت مذہب اسلام کو پڑھنے اور پڑھانے والے اور آگے پہنچانے والے اس ذہنی سطح و عذر کے مالک نہ

تھے' جس کی وجہ سے اس کے خلاف بے شمار اعتراضات جاری ہیں اور اس کی کمزوری اور نااہلی کے افسانے زمانے بھر میں عام ہیں۔

اس کے مقابلے میں جو جواب اور استدلال پیش ہو رہا ہے' وہ اتنا کم وزن ہے کہ شاید ہی وہ اسلام کو اپنا اصلی مقام اجاگر کرنے میں مدد دے۔ خداوند کریم کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آیا اس کے مذہب کو کون لوگ مان رہے ہیں یا نہیں مان رہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ذہنی معیارات اس پایہ تحقیق تک نہیں پہنچتے جہاں ہم قرآن جیسی کتاب عظیم کو اس درجے اور سطح کی تفہیم عطا کرسکیں اور اسے اپنے اور باقی اقوام کے لیے انتہائی شعوری اور ذہنی و عقلی مہم کے طور پر ایک جدلیاتی تصور کی طرح پیش کرسکیں۔

اسلام قطعاً تسلیم کا مذہب اس وقت تک نہیں بنتا' جب تک آپ اللہ کے بارے میں ذہنی کمٹمنٹ اور دلیل اختیار نہ کریں۔ اسی لیے پروردگار عالم نے ان لوگوں کے بارے میں جو قرآن بغیر کسی بصیرت اور بصارت کے پڑھتے ہیں' بڑے سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا' ان شر الدواب عند الله الصم البکم الذین لایعقلون (پ ۹' سورہ الانفال' آیت ۲۲) کہ بدترین اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں' جو خدا کی آیات پر اندھوں اور بہروں کی طرح گرتے ہیں۔ جو عقل و شعور نہیں رکھتے اور اللہ کو بھی اسی عقل و شعور کی منزل پر لانے کی کوشش کرتے ہیں' جو ان کو حاصل ہوتی ہیں۔ جبکہ خدا نے قیامت تک کے لیے آپ کو ایک مکمل نقشہ حیات پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ کائنات بالآخر ایک وقت مقررہ تک چلے گی اور ایک ذہنی ارتقاء تک پہنچتے ہوئے بالآخر فنا پذیر ہوگی۔ نہ صرف یہ کہ یہ فنا پذیر ہوگی' بلکہ اس فنا کا پورا پورا نقشہ بتایا اور فرمایا اذا الشمس کورت واذالنجوم انکدرت (پ ۳۰' سورہ التکویر' آیت ۱'۲) سورج بجھ جائے گا اور ستاروں کی روشنی ماند پڑ جائے گی۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ ہم چاند اور سورج کو جہاں سے یہ بکھر کے علیحدہ ہوئے تھے' اس طرح دوبارہ جمع کردیں گے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ دنیا کے ہر علم اور ہر طالبعلم کو ترقی حاصل ہے۔ ایک آدمی پہلی کلاس سے شروع کرتا ہے اور بالآخر ڈاکٹریٹ تک جا پہنچتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص نے علم و دانش میں ترقی کی ہے۔ ایک دوسرا انسان سائنسی طریق کار پر چلتے ہوئے ایم بی بی ایس کرتا ہے۔ اس سے آگے بڑھتا ہوا سپیشلسٹ بن جاتا ہے۔ وہ محنت' تدبر اور فکری کاوشوں سے ترقی کرتے ہوئے بالآخر اس مقام تک پہنچتا ہے کہ ہم اس کی ترقی کے گواہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ کیسی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہم سب چھوٹی چھوٹی یونیورسٹیوں سے پڑھ کر اپنے آپ کو مقام علم' مقام تشخص اور مقام عزت و ترقی تک پہنچاتے ہیں۔ مگر وہ جو کائنات کا سب سے بڑا علم اور کلمہ ہے۔ جب ہم اس کی طرف حرکت کرتے اور چلنا شروع کرتے ہیں' تو ستر اور اسی برس کی عمر میں بھی ہم وہیں قائم ہوتے ہیں' جہاں سے نماز و روزے کے ساتھ چلے تھے۔ ہمارے اندر کوئی علمی ترقی نہیں ہوتی۔ کوئی اخلاقی توازن قائم نہیں ہوتا۔ کوئی ایسی چیز پیدا نہیں ہوتی' جسے دیکھ کے کوئی دوسرا ہمیں کہہ سکے کہ اس نے خیال مذہب' خیال پروردگار' فلسفہ خیال مذہب و تصوفِ جمال و جلال خداوندی کی پہچان میں ترقی اور عزت پائی ہے۔

یہ بدقسمتی اس لیے واقع ہوئی ہے کہ جب ہم باقی علوم کو جاتے ہیں' تو ہماری توجہ' خیال اور ہماری محنت ایک مکمل مقصد بن کر ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب ہم پروردگار عالم کی جانب بڑھتے ہیں' تو محض تقلید اور آثار

قدیمہ کی طرح ایک ایسے بت کی پرستش کو جا رہے ہوتے ہیں' جس کے لیے ہمارے دل میں محبت ہوتی ہے نہ کوئی حزن و ملال نہ طلب وجستجو اور نہ کوئی ایسی کیفیت جس کے تحت ہم پروردگار کے لیے کسی قسم کا اخلاص محسوس کر رہے ہوں۔

یہ وہ رجحان ہے' جس کی پروردگار نے شدت سے قرآن حکیم میں مخالفت کی اور قرآن حکیم میں بار بار اس بات سے ڈرایا کہ تقلید کرنے والے لوگ اپنے آباؤ اجداد سے ایک میراث کفر لیے بیٹھے ہیں۔ اگر یہ عقل وشعور کو استعمال میں لاتے اور غور وفکر کرتے' تو یقیناً یہ ہمیں پا لیتے۔ اگر ایک کافر کو اللہ یہ طعنہ دیتا ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے دین پر بغیر کسی غور و فکر کے قائم ہے' تو کیا یہ طعنہ اس مسلمان پر لاگو نہیں ہوتا' جو اپنے آباؤ اجداد کی روایت پر بغیر کسی غور وفکر کے قائم ہے؟ جس کے دل میں کبھی جستجو اور آرزوئے الٰہی نہیں پیدا ہوئی۔ جس کے خیال میں مقصد حیات اللہ نہیں رہا اور نہیں ہے۔ اس فارمیٹ میں' جو اس کے پاس ہے اور اس فارمیٹ میں' جو کسی عیسائی' کسی بدھسٹ یا ہندو کے پاس ہے' بظاہر کیا فرق ہو سکتا ہے؟

اگر خدا مقصود حیات نہیں ہے۔ آپ اسے نہیں چاہتے یا نہیں پانا چاہتے' تو آپ کا مذہب بھی وہی Occult ہے' جیسے کہ باقی مذاہب Occult ہیں۔ جیسے وہ رسوم ورواج کا مجموعہ ہیں' اسی طرح آپ کا مذہب بھی رسوم ورواج کا مجموعہ ہے۔ صرف ناموں کے فرق سے کوئی اسلام نہیں پا سکتا' جب تک آپ خدا کو شریک مذہب نہیں کریں گے۔ اس کی طلب و جستجو کو مقصد خیال اور مذہب کے مقصد کی جستجو نہیں بنائیں گے' اس وقت تک آپ کا مذہب محض رسوم ورواج ہوگا۔ اس کا ایک رسمی سربراہ ضرور ہے' جسے آپ اللہ کہتے ہیں' مگر اس رسمی سربراہ سے کبھی آپ کا واسطہ پڑا؟ کبھی آپ نے اسے خیال میں چاہا؟ اس کی محبت کا ایک ذرہ آپ کے دل میں پیدا ہوا؟ اسی پروردگار کے بارے میں رسول اللہ کا ارشاد گرامی ہے کہ جب کسی نوجوان کی آنکھ سے میرے لیے ایک آنسو نکلا' اس پر میں نے ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ حرام کر دی۔

اپنی مختصر سی زندگی میں ذرا غور کیجیے۔ خالصتاً اللہ کے لیے ہماری آنکھ سے کبھی ایک آنسو نکلا؟ ہمیں اس بیچارگی اور اپنی خامی کا احساس ہونا چاہیے' جسے ہم نے آج تک غور وفکر سے سنوارا نہیں۔ مذہب ایک طریق فکر' ایک کوڈ اور ایک ضابطہ ہے۔ اس وقت تک بے معنی ہے' جب تک اس کا مقصد آپ کے خیال میں نہیں ہے۔ اس لیے پروردگار نے فرمایا کہ میری طرف آنے کا صرف ایک رستہ ہے اور وہ اسلام ہے۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن الیقبل منه (پ ۳' س آل عمران' آیت ۸۵) اگر میرے پاس تم اسلام کے سوا کسی اور رستے پر چل کے آئے' تو میں قبول نہیں کروں گا۔

کیا اس آیت سے یہ واضح نہیں ہے کہ رستہ بذات خود مقصود ومطلوب مومن نہیں ہے بلکہ اللہ ہے۔ جس نے اللہ کا ارادہ کیا اور پھر اچھے عمل کیے' فھو مومن اور جس نے محض اسلام کا ارادہ کیا' وہ صرف مسلم ہے۔ ہماری ابتلاء اور منعیبت اور ہمارے سارے مسائل کا حل یہ ہے کہ ہم اپنے تصور مذہب کی تشکیل نو کریں۔ ہم الٰہیات کے تصور کی دوبارہ تدوین کریں۔ ہمیں برتر ترجیحات کو کمتر ترجیحات پر رکھنا ہے۔ اس کے بغیر آپ کو مذہب سے کیا مل رہا ہے' یہ سوال ہے۔

آج کے زمانے میں مذہب بذات خود سب سے بڑی زوال پذیر قدر ہے۔ مذہب کائنات کے تصور میں سب سے بڑی رکاوٹ اور سب سے بڑا خیال سمجھا جاتا ہے' جو بقول کچھ لوگوں کے' آپ کی ترقی میں رجعت کا عنصر پیدا کرتا ہے۔ یہ اس وقت تک درست ہے' جب تک آپ مذہب کے مقصد کو نہیں جانتے۔ قرآن کو ڈیٹا آف گاڈ کی حیثیت سے

Marfat.com

نہیں پرکھتے۔ جب آپ قرآن کو فہم وفراست' تدبر اور پوری محنت اور عرق ریزی سے پڑھیں گے' تو آپ کو ضرور محسوس ہوگا کہ قرآن اور خدا جدید ترین سائنسی تحقیقات سے کچھ آگے ہے۔ خالق کائنات نے جو باتیں قرآن میں لکھی ہیں' ابھی تک دنیا کے عظیم ترین سائنسدان بھی ان تک نہیں پہنچ سکے۔ جب تک آپ اپنے مذہبی تصور کی تشکیل تو نہیں کرتے۔ اسے اسی محنت سے نہیں پڑھتے' جس محنت سے آپ اپنے پی ایچ ڈی کا تھیسز کرتے ہیں اور اس کے ساتھ بھی وہی توقع فلاح و بہبود کی وابستہ نہیں کرتے' جو آپ عمومی زندگی میں اپنے مستقبل اور مقصد کے بارے میں بیان کرتے ہیں' اس وقت تک خدا آپ کا مطلوب ومقصود نہیں ہو سکتا۔

مثلاً پروردگار نے آپ کو ایک چیلنج سے آشنا کیا ہے۔ اللہ کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ماؤں کے پیٹ میں جانتا ہے' وہاں کیا پل رہا ہے۔ وہ آسمانوں سے بارش برساتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں نے کہا کہ اب تو یہ انسان بھی بتا سکتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے۔ وہ بھی بارش برسا سکتا ہے۔ ماہرین طبیعات وطب مریض کے مرض کی تشخیص کر سکتے ہیں کہ وہ اس سے بچے گا یا نہیں' بتا سکتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدائی کے یہ کام انسان بھی کر سکتا ہے' تو خدا میں آخر کیا تخصیص رہی؟ کیا دعویٰ خدائی باطل نہ ہو گیا؟

اگر آپ غور کریں کہ جس اعتراض کو آپ مان رہے ہیں' اس اعتراض کی بنیاد پر تو خدائی کا دعویٰ باطل ہوتا ہے۔ اگر اللہ کا یہ دعویٰ کہ میرے سوا ماں کے پیٹ میں کیا ہے' کوئی نہیں جان سکتا اور اگر انسان اسے جان لے' تو اللہ کا دعویٰ تو پھر غلط ہے۔ آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ کہیں کوئی تفاوت موجود ہے۔ کہیں تفریق اور اختلاف آ گیا ہے۔ قرآن سچا ہے یا انسان؟ کبھی لوگوں نے اس بات کا جائزہ لیا کہ اس قسم کے اختلافات کو ہم کس دلیل سے رد کریں گے؟ کبھی سوچا کہ آپ کا مذہب یا خدا کے بارے میں شعور پختہ نہ ہوا' تو آپ اس شخص کو' جو بنیادی سائنسی دلیل دے رہا ہے' کیسے رد کر سکیں گے؟ قطعاً نہیں۔ آپ اپنی بنیادی اساس کو پختہ نہ رکھتے ہوئے اگلے موڑ سے مڑ تو سکتے ہیں۔ کسی پر گولی چلا سکتے ہیں' مگر اسے دلیل سے قائل نہیں کر سکتے۔

چنانچہ آپ کو یہ ڈھونڈنا اور دیکھنا ہے کہ آیا اس سوال کا جواب ہمیں کہیں ملتا ہے؟ پروردگار نے بہت ساری مستثنیات اور زمانوں کی بات کی' وہاں تمام پیمبر ایک زمانے کی مستقل نشاندہی کرتے چلے آئے ہیں۔ خدا کے لیے مسئلہ اتنا اہم نہیں تھا لیکن بندوں کے لیے تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا' جب دجل وفریب سے بھرپور ایجادات ہوں گی۔ انسان حیرت انگیز کمالات اور فتنے کے مظاہرات دکھائے گا۔ ایک صاحب ایمان کے لیے جو خدا پر یقین رکھنا چاہتا ہے' خدا پر یقین رکھنے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہے گی۔ عصر حاضر میں یہ سب ہو رہا ہے۔ وہ لوگ تحقیق جستجو سے کلوننگ کر رہے ہیں۔ ایک انسان کے مثل دوسرا انسان پیدا کر رہے ہیں۔ یہ بات ہمارے خدا اور رسولؐ نے پندرہ سو برس پہلے بتا دی تھی۔ جدید زبان میں اسے انسانی تعقل پسندی کہا جاتا ہے۔ یہ اس درجہ ترقی کرے گی کہ وہ اپنے دعوے کو خدا کے مقابلے میں لائے گی اور اعلان کرے گی کہ جو کچھ خدا تخلیق کر سکتا ہے' میں بطور انسان اسے تخلیق کر سکتا ہوں۔ چنانچہ خدا میں کوئی تخصیص باقی نہیں رہی۔

اس فتنے کی تمام پیمبروں نے نشاندہی کی۔ تاکہ وہ لوگ جو کسی بھی دور میں بچا کھچا اثاثہ ایمان رکھتے ہیں' ان کو کوئی دلیل مہیا آ جائے۔ وہ اپنے ایمان کو قائم رکھ سکیں۔ ہر مذہب نے استثنیٰ تخلیق کیا اور اسے تمام پیمبروں نے دجال کا

Marfat.com

نام دیا اور واضح کیا کہ لوگوں کا ایک ایسا گروپ اور حلقہ افراد ہے' جو ترقی کر کے اس چیز پر قادر ہونے کی کوشش کرے گا' جس پر پروردگار قادر ہے۔ حضرت دانیال نے حضرت جبرائیل سے جب پوچھا کہ اس کی واضح ترین نشانیاں کیا ہوں گی؟ فرمایا' دانیال! جب اجاڑنے والی مکروہ چیزیں نصب کی جائیں' اور جب انسان اجرام فلکی میں دراندازی کرے' تو سمجھنا وہ دجال ہے۔ مگر اے دانیال! تو اس وقت زندوں میں نہیں ہوگا۔ دوسرے پیمبروں نے بھی اپنی امتوں کو اس فتنے سے آگہی دی۔ حتیٰ کہ رسول گرامی کا زمانہ آیا۔ چونکہ آخری پیمبر تھے۔ اس کے بعد وضاحت نہیں آنی تھی۔ کتاب آخری تھی' اس لیے سرکار رسالت مآبؐ نے جس وضاحت کے ساتھ اس فتنے پر روشنی ڈالی' اتنی کسی اور فتنے پر روشنی نہیں ڈالی۔

مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اس مذہبی تصور سے منسلک نہیں ہے' اسے روایت قرار دے سکتا ہے۔ ہمیں یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ محض اتفاق ہے کہ آپ نے ایک آدھ حدیث سے کھینچا تانی کر کے موجودہ معاملات کو اس پر استوار کر لیا ہے۔ مگر میں آپ کو قرآن حکیم کی آیت سنا رہا ہوں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ بات جو اللہ نے کہی۔ جو سائنسدانوں کے پیش منظر میں تو موجود ہے' کیا اس کے حقیقی منظر پر نمودار ہو چکی ہے؟ پروردگار نے کہا اللہ الذی خلق سبع سمٰوٰت ومن الارض مثلھن کہ اللہ ہی تو ہے' جس نے سات آسمانوں کی تخلیق کی اور اسی کی طرح کی سات زمینیں بھی بنائیں۔ مگر یہاں تک بس نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے' سات زمینیں تو ہوتیں' مگر وہاں زندگی نہ ہوتی۔ چنانچہ پروردگار نے دوسری آیت سے اسے کوالیفائی کیا یتنزل الامر بینھن کہ ان تمام زمینوں پر میرا حکم اترتا ہے لتعلموا ان اللہ علی کل شی قدیر (پ ۲۸' س الطلاق' آیت ۱۲) تاکہ تم جان سکو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس میں تھوڑے بہت اشتباہ کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم انسان بہر حال خود پسند ہیں۔ اتنی بڑی گلیکسی میں ابھی جو ایک چھوٹی سی گلیکسی دریافت ہوئی ہے' اس کا عرض سائنسدانوں کے مطابق 40 بلین نوری سال کے برابر ہے۔ اتنی بڑی وسیع کائنات میں اتنے مختصر سے مقام میں ٹھہرے ہوئے ہم لوگ ضرور کوئی ایسی ذہنی کمی رکھتے ہیں کہ ہم اپنے وجود کی خود پسندی کا شکار ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کی سرزمین پر اس کی سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ پسندیدہ مخلوق ہیں۔ اگر اس خدائے حکیم وعلیم کی نظر سے دیکھیں' تو ہم کائنات میں اس کی صرف ایک کالونی ہیں۔

مگر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سات کالونیاں حتمی ہیں؟ کیا زندگی کا یہ تواتر' یہ سلسلہ حیات ایک زمین میں ایک مرتبہ چھ یا آٹھ بلین سال کی زندگی دے کر ختم ہو جائے گا؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ صحیح مسلم کی حدیث کے مطابق رسول اللہ نے فرمایا کہ جب قیامت قائم ہو چکے گی اور لوگ جنت اور دوزخ میں داخل کر دیے جائیں گے' تو جنت میں بڑی جگہ بچ جائے گی۔ پھر اللہ نئے لوگ پیدا کرے گا اور پھر نئے لوگوں کی آزمائش ہوگی۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ خدا کے ہاں زندگی کے ایک مستقل پراسس کے تحت انسان پیدا ہو رہا ہے۔ اس کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اسے ایک جگہ سے نکال کے دوسرے آسمانوں اور گلیکسیز میں بھیجا جاتا ہے۔ وہاں جگہ کم ہوگی نہ انسان کبھی پورے ہوں گے۔ اس طرح یہ ایک مستقل زندگی کا پراسس ہے' جو جاری رہے گا۔

آج کے زمانے میں قرآن صرف ہدایت کی کتاب نہیں رہ سکتی۔ جو لوگ اسے صرف ہدایت کی کتاب کہتے ہیں' ان کو یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ یہ صرف ہدایت دینے والے کی کتاب نہیں ہے۔ یہ تخلیق کرنے والے کی کتاب ہے۔ اس کا

اس نوعیت کا کوئی جملہ کسی بھی موضوع پر تفننِ طبع اور مذاق کا جملہ نہیں ہوگا۔ جیسے پروردگار نے کہا' یہ کبھی نہ سوچنا کہ میں نے کسی بھی چیز کو محض تفریح کے لیے پیدا کیا۔ بلکہ جب بھی تمہیں خیال آئے' یہ دعا ضرور پڑھنا ربنا ماخلقت هذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار (پ ۴' س آل عمران' آیت ۱۹۱) کہ تو نے کوئی چیز جھوٹ اور لہو ولعب سے نہیں بنائی۔ بغیر کسی مقصد کے تخلیق نہیں کی۔ اس لیے تو ہمیں عذاب نار سے بچالے۔ ہمیں اس خیال سے بچا کہ ہم تیری کسی بھی چیز کو فضول' ناقص اور بے مقصد کہیں۔ جب کوئی ایسا بنانے والا رائے دیتا ہے' تو وہ اس باعث اتنی پختہ' واضح اور مکمل ہوتی ہے کہ اس ایجاد کی دریافت میں سینکڑوں برس لگ جاتے ہیں۔

15 سو سال پہلے خالق نے جن آیات میں کہا تھا کہ یہ زمین و آسمان پہلے سب ملے ہوئے تھے' اکٹھے تھے۔ پھر ہم نے انہیں پھاڑ کے جدا کیا۔ علیحدہ علیحدہ کردیا اور یہ کہ ہم نے تمام حیات کو پانی سے پیدا کیا۔ یہ عبادات یا گناہ وثواب کی آیات نہیں ہیں۔ سوچنے والوں کے لیے یہ ایک لمحہ ہائے فکریہ ہیں کہ پندرہ سو برس پہلے اگر کوئی شخص آپ کو یہ کہہ رہا ہو کہ دیکھو! یہ زمین و آسمان پہلے سب اکٹھے تھے۔ پھر ہم نے ان کو پھاڑ کر جدا کردیا اور پھر علم حیاتیات کو مختصراً بیان کرے۔ یہ موضوع' یہ فلکیاتی حقیقت پندرہ سو سال پہلے موجود کہاں تھی؟ ان لوگوں کو کیا پتہ تھا کہ زمین و آسمان اکٹھے تھے کہ نہیں تھے۔ یہ تو علم فلکیات میں اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے۔ یہ قانون حال ہی کی دریافت ہے۔ اس وقت کے لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ یہ جملہ اولم یر الذین کفرو...... (پ ۱۷' س الانبیا' آیت ۳۰) کل کے مسلمانوں کے لیے نہ تھا' آج کے مسلمانوں کے لیے' جن کا یہ دعویٰ ہے کہ خدا مفروضہ ہے۔ اساطیر الاولین سے ہے۔

اسی طرح نہ صرف اس موضوع پر' بلکہ جس بھی تخلیق کے موضوع پر اللہ بات کرتا ہے' وہ ایک مکمل اور حتمی بات کرتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ خالق کو اپنے بیان میں کوئی کنفیوژن نظر آئے۔ چنانچہ پروردگار نے فلکیات پر دوسری رائے دی۔ یہ آپ کا کام ہے جاننا کہ یہ کہیں ماضی سے لی گئی' یا یہ اوریجنل بیان ہے۔ یونان کے بطلیموس نے کہا کہ زمین ساکت ہے اور ستارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ بات ایسے ہی نہیں۔ بڑی مدتوں تک یہی لوگوں کا خیال رہا۔ 1524ء میں کاپرنیکس نے اس کی تردید کی اور کہا' یہ درست نہیں ہے۔ سورج کھڑا ہے اور باقی سیارگان اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

اس کے بعد گلیلیو آیا۔ اس سے جدید زمانے کی تحقیق شروع ہوتی ہے۔ اس پر عدالتی تحقیق کا اتنا دباؤ تھا کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کوپرنیکس کی بات صحیح نہیں ہے' اس کی تردید نہ کرسکا اور یہی تھیوری برقرار رہی۔ مگر اس میں تھوڑی سی اصلاح کے ساتھ بعد کے لوگوں نے یہ کہا کہ کچھ ستارے ساکت ہیں اور کچھ سیار ہیں۔ کوپرنیکس اور بطلیموس کے درمیان قرآن آیا۔ دیکھنا یہ تھا کہ آیا قرآن حکیم نے بطلیموس کی رائے اختیار کی یا کوپرنیکس کی؟ معلوم ہوا کہ وہ بطلیموس کا ساتھ دیتا ہے نہ کوپرنیکس کا۔ وہ بالکل ہی مختلف بات کررہا ہے وسخر الشمس والقمر کل یجری الی اجل مسمی (پ ۲۲' س فاطر' آیت ۱۳) وہ تو اصول دیتا ہے کہ یہ چاند' ستارے جو میں نے مسخر کیے۔ کل یجری تمام چل رہے ہیں الٰی اجل مسمی وقت مقررہ تک۔

یہ استعجاب کی بات نہیں ہے؟ بلکہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ویقین کی بات ہے کہ آخر 15 سو برس پہلے بغیر ریڈیو/ ٹیلی سکوپ اور بغیر کسی جائزہ آسمانی کے' جبکہ پرانے علم سے استفادہ ہو رہا ہے۔ نہ نئے آنے والوں کو Predict کیا

Marfat.com

جارہا ہے' بلکہ بالکل ہی انوکھی بات کی جارہی ہے کہ سورج کھڑا ہے' نہ زمین کھڑی ہے۔ بلکہ وقت مقررہ تک' کائنات میں جو کچھ بھی ہے' چل رہا ہے۔

قرآن نے نہ صرف سائنس اوران موضوعات' جن میں پروردگار نے جو کچھ بھی تخلیق کیا' کے بارے میں حتمی اصول دیئے' بلکہ ان موضوعات کے بارے میں بھی' جو سائنسی نہیں تھے' جن پر بڑی جدوجہد سے انسانی معاشرہ اور انسانی مفکر پہنچے' ان اصولوں کو وضع کیا۔ جیسے کہ تمام ماہرین نفسیات اور تمام معاشرتی سائنسدان اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ انسان کی سب سے پہلی جبلی قدر' اور پہلا وجود استحقاق اس کی حس بقاء میں ہے۔ یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے اور عمرانیات اور نفسیات کے فلسفی بھی اس سے آگاہ ہیں کہ انسان کی اولین حس اس کی بقاء کی حس ہے۔

اب قرآن حکیم میں خداوند کریم ایک چھوٹا سا اصول دیتا ہے کہ احضرت الانفس الشح (پ ۵' س النسا' آیت ۱۲۸) کہ میں نے تمام جانوں کو بخل جان پر جمع کیا۔ بے شک تمام جانیں بخل پر حاضر کی گئیں۔ ہمارا کام قرآن کو سمجھنا ہے۔ اگر آپ بخل کو بخل ہی لیں گے۔ جیسے کہ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے' تو پھر آپ تمام جانوں میں کیسے بخل ثابت کریں گے؟ اس جان میں تو کوئی تخصیص نہیں۔ ایک چیونٹی بے چاری یا ایک گائے اور بھینس میں کیا بخل ہوسکتا ہے؟ ان کے پاس تو کوئی ملکیت ہی نہیں ہے۔ یہ جملہ یقیناً صرف ایک بنیادی جبلت پر صادق ہوتا ہے کہ ہم نے جانوں کو بخل جان پر جمع کیا اور بقاء کی جبلت کو اللہ نے بحیثیت قانون بنا دیا۔ جب اس بقاء کی جبلت کو واضح کیا' تو بتایا کہ اگر جب جان بچانے کا مقابلہ میرے ساتھ بھی پڑ جائے' اور تمہاری جان جارہی ہو' تو تم ضرور مجھے بھولو گے۔ تمہاری یہ جبلت اتنی بنیادی ہے کہ تم اس کے تحت مجھے بھی بھول جاؤ گے۔ اس لیے میں تمہیں تھوڑی سی گنجائش دے دیتا ہوں اور یہ گنجائش کہاں دی؟ انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اھل به لغیر الله یہ چار چیزیں حرام مطلق ہیں۔ جما ہوا خون' خنزیر کا گوشت' مردار اور غیر اللہ کا نام جس چیز پر لیا گیا ہو۔ مگر اللہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بقاء ایک ایسی جبلت ہے کہ جب بقاء کا مسئلہ آئے گا' تو لوگ اس کے حکم کو بھولیں گے' تو اس نے اجازت دے دی فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیه (پ ۲' س البقرہ' آیت ۱۷۳) اگر جان اضطراب میں ہو۔ اگر زندگی خطرے میں ہو' تو ہم تمہیں نیست کرنے کے لیے نہیں کہیں گے۔ اتنا بڑا اے حضرت انسان! تم سے امتحان نہیں لیں گے۔ تم ایسے کرنا کہ تھوڑا بہت' جو جان کی بقاء کے لیے ضروری ہے' کھالینا۔ تم پر کوئی گناہ نہیں۔

اب ہمارے سامنے بڑا مسئلہ دور حاضر میں اصطلاحات کا ہے۔ ہم عجیب وغریب اصطلاحات اور دانشورانہ تصورات کو آگے رکھ کر اسی اصطلاح کے بالمقابل ایک زوال پذیر اصطلاح کے شکار ہیں۔ یہ مفہومیات کا قصور ہے۔ اس لیے کہ قرآن' آپ کے دین اور آپ کے مذہبی خیال پر یورپ کا بہترین انسان وعالم اعتراض کرتا ہے۔ آپ کے دین پر اعتراض بائز' برٹرینڈ رسل اور کارل مارکس کر رہا ہے۔ اپنے سوشل سیٹ اپ میں اس قسم کے بے شمار لوگ کر رہے ہوں گے' جو اپنے وقت کے بہترین لوگ ہیں۔ جنہوں نے تفکر کے لیے اذیتیں اٹھائیں۔ غم اور اداسی سے پڑھا۔ زندگی کے مسائل کو دیکھا۔ خدا تک تو نہ پہنچے' مگر انسانی حزن وملال کی تحقیق انہوں نے ضرور کی۔ انسانی رنج وابتلا کی گہرائیوں تک پہنچے۔ ہم ان کو الزام نہیں دیتے۔

Marfat.com

مگر جب اتنی کاوشوں اور ذہانتوں والے ایسے لوگ اعتراض کریں گے اور اعلیٰ معیار تفہیم سے کریں گے، تو مسئلہ تو ہوگا۔ ان کی Pharaseology اور Methodology اور ان کی مفہومیات مختلف ہیں۔ ان کے جملے اور ان کی بناوٹ مختلف ہے۔ یہ وہ جملے ہیں، زبان اور مفہومیات کا وہ بحران ہے، جس میں آج کا انسان بری طرح اسیر ہے۔ ہماری طرف سے جواب کن کا جائے گا؟ جواب کون دے گا؟ ہماری طرف سے جواب دینے کے واسطے جو لوگ آتے ہیں، ان کی اصطلاحات سے ان کا کوئی واسطہ نہ ان کے طرز کا ان کا کوئی فہم و تدبر۔ ان کی ٹیکنالوجی کی ان کو کوئی سمجھ نہ ان کے خیال سے ان کی کسی قسم کی مساوات ہے۔ جب ان کا محاورہ، خیال ہی نہیں سمجھیں گے، تو کیا خیال ہے، ہماری طرف سے ایک رو بہ انحطاط زبان اور ایک زوال پذیر ضد کے سوا بھی کچھ تدارک ممکن ہے؟

یہ خدا کا قصور نہیں ہے۔ یہ تو میرا اور آپ کا قصور ہے کہ ہم ایک اچھی ڈگری کے لیے ولایت سے کم نہیں سوچتے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا کا سوچتے ہیں۔ مگر قرآن، خدا اور ان تمام مذہبی علوم کے لیے ہمارے پاس ایک کم ترین پڑھے ہوئے انسان کی تخصیص ہے۔ وہ لوگ جو شاید میٹرک کا امتحان بھی پاس نہ کر سکیں، جو اتنے بھی ذہین نہیں کہ سائنس کا ایک لفظ ہی سمجھ سکیں، ہم یہ ذمہ داری ان پر ڈالتے ہیں۔ جب تک آپ اس غلطی کا مداوا نہیں کریں گے۔ انفرادی طور پر مذہب کے نصب العین کو نہیں اپنائیں گے اور ترجیح اول کے حصول کے لیے عقلی اور ذہنی طور پر محنت نہیں کریں گے، الٰہیات کی تشکیل نو نہیں ہو سکتی۔

ایک استثنیٰ یہ ہے کہ چند دانشور مذہب کی اپنی تعبیر کرتے ہیں۔ اگر ایک شخص میں حس جمالیات بڑھ گئی ہے، تو وہ اللہ پر یہ اعتراض کرے گا کہ دیکھو جی! پروردگار نے یہ فضول سے قوانین کیوں بنائے ہیں؟ انہیں میں نہیں مانتا۔ وہ اس حدیث پر اعتراض کرے گا، جس میں کیڑے مکوڑوں کا چھپکلی کا ذکر ہوگا۔ جس میں چوہے مارنے کا ذکر ہوگا۔ اور وہ کہے گا کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ یہ حدیث سچ نہیں ہو سکتی۔ میں نہیں مانتا اس خدا کو۔ ایسے دانشور کے لیے خداوند کریم نے یہ کہا کہ تم تو یہ کہتے ہو کہ خدا کرتا کیا رہا؟ بڑی بڑی چیزیں بنانا تو ٹھیک تھیں، اس نے مچھر کیوں بنا دیا؟ اگر ایسا ہے، تم ذرا مچھر بنا کے تو دکھا دو۔ تم جو بڑی ذہانتوں، علم اور عقل والے ہو، اگر تمہیں یہی گمان ہے کہ میں نے مچھر کیوں بنایا، تو تم ایسے کرو کہ ایک مچھر ہی بنا لو۔ ایک عام سا دانشور اپنے خیال کے مطابق اپنے متبعین کو مجبور کرتا ہے کہ مذہب ایسا اور ایسا ہونا چاہیے اور مذہب کو جیسا کہ وہ ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

ایک بات ضرور ہے کہ قرآن، مذہب اور خدا چند ایک کار نرزدہ قلاش ذہنوں، دانشوروں اور چند ایک اپنی مرضی کی سوچوں والوں کے لیے نہیں آیا، بلکہ قرآن حکیم ایک معمولی سی معمولی سطح کے انسان سے لے کر ایک اعلیٰ ترین فکری جائزے کے لوگوں کے لیے آیا ہے۔ اب یہ اس بات پر منحصر ہے کہ کوئی ناظرہ قرآن پڑھتا ہے یا کوئی اسے انتہائی گہرے تفکر سے پڑھتا ہے۔ ایک شخص اسے ناظرہ پڑھتا ہے، اس میں اس کا اپنا ثواب ہے۔ پھر اسے اقبال بھی پڑھتا ہے اور آپ بھی پڑھتے ہیں۔ اس سے میں بھی خیالات اخذ کرتا ہوں اور آپ بھی کرتے ہیں۔ یہ واحد کتاب ہے، جو معقول و منقول کی حد تک تمام تجسس کی تشفی کرتی ہے، جو بزم انسان میں پیدا ہو سکتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی اپنی زندگی کا قیمتی حصہ ایک کم تر مقصد اور دنیا کو دیتا ہے، وہ ایک اعلیٰ ترین مقصد حیات یعنی اللہ کو نہیں دیتا۔

Marfat.com

اللہ کے نزدیک جس زندگی کی جو جدوجہد آپ کر رہے ہیں' وہ ایک دانشورانہ مغالطہ ہے۔ ذہنی غلطی ہے۔ اس پر تمہارا استحقاق نہیں۔ میں نے بحیثیت کمیونٹی تمہیں بھیجا۔ تمہارا تمام بندوبست میں نے کیا۔ جو چیز تم اپنے ذمہ لے رہے ہو۔ پانی' ہوا' سمندر' پہاڑ' وہ سب زمین میں' میں نے رکھ دیئے۔ کوئی رطب دیا یابس ایسا نہیں۔ زمین کی تہہ میں کوئی پودا نہیں اُگتا۔ جس کے پتے اور دانے میں نے نہ گنے ہوں۔ پورے پروٹوکول سے حساب لگا کے ہر چیز کا تمہارے لیے بندوبست کر دیا۔ ایسی کوئی چیز نہیں' جو کتاب مبین سے وارد ہو۔ میرے حساب کتاب اور میری کتاب میں تھی اور میں نے تمہارے لیے فراہم نہ کی ہو۔

اب اگر تم اپنی جدوجہد کو فائنل کہتے ہو اور سمجھتے ہو کہ تم خالق ہو۔ ان چیزوں کے لینے والے اور حاصل کرنے والے ہو' تو مجھے یہ بتاؤ کہ ان چیزوں کے بنیادی ذرائع کس نے رکھے ہیں؟ اگر میں تمہیں اس مشقت میں ڈال دوں کہ تم نے کمانا کیا ہے؟ بچے کیسے پالنے ہیں؟ تمہاری ماں کون اور تمہارا باپ کون ہے؟ تو پھر تم اعتراض کر سکتے تھے کہ اے مالک! تو ہم سے اپنے بارے میں سوال کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ قبر کا وہ سوال کہ من ربک بے معنی ہو جاتا ہے۔ انسان کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ ہوتی کہ چونکہ تو نے مجھے یہ جاب دیئے تھے' میں ایک جاب سے نکلتا' تو دوسری کرتا۔ یقین رکھئے کہ اللہ نے ایسی کوئی چیز بنی نوع انسان کو نہیں دی۔

اٹلی کے ایک محقق لیپلاس نے سائنسی جبریت کا نظریہ دیا ہے' جسے ہم مقدر کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں لیپلاس کہتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ' ہر واقعہ اور زمان و مکان کا ہر لمحہ طے ہے۔ مقدر کا مطلب یہ ہے کہ ایک لمحہ زمانہ کو ایک مکان میں سمو دیا گیا ہے۔ اگر خدا پہلے سے مقدر متصل انداز میں نہ جوڑتا' تو کسی انسان کو زمین پر کچھ بھی ہاتھ نہ آتا۔ ان کے اوقات اتنے مختلف ہوتے اور ان کی صورت حال اتنی مختلف ہوتی کہ ہو سکتا ہے' ایک شخص گھر کو جاتا ہوا سمندر میں جا گرتا۔

اب ہمارے نقطہ نظر سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سارے ہی کام اللہ میاں نے بطور پروٹوکول کے ہمیں دیئے ہیں' تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم کس لیے ہیں؟ ایک تو ہم غلط بات کے دعویدار ہیں کہ ہم دنیا میں زندگی گزارنے اور پھلنے پھولنے کے لیے آئے ہیں۔ بال بچوں اور ماں باپ کے لیے آئے ہیں۔ اسے خدا نہیں مانتا۔ خدا کہتا ہے' ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تمہیں خالصتاً ایک اعلیٰ ترین صلاحیت سے نوازا۔ تمہیں ملائکہ کے مقابلے میں نمایاں کیا۔ اس کے باوجود جب فرشتے اعتراض کر رہے تھے کہ اس فتنہ و فساد کی Homoerectus مخلوق کو جو زمین میں فتنہ و فساد کر رہی ہے' تو نے خلیفة الله فی الارض بنا دیا۔ یہ ان کا اعتراض تھا۔ اللہ نے اپنا فیصلہ ثابت کرنے کے لیے ہمیں ایک شعور خاص اور عقل عطا کی اور اس عقل کی صلاحیت کی بنا پر ایک امتحان ملائکہ کو اور ایک ہمیں دیا۔ 50-60 ہزار سال بعد واپس بلایا اور پوچھا کہ تم لوگوں نے اس علم میں سے کیا حاصل کیا؟ فرشتے ایک ایسا کمپیوٹر ہیں' جن میں آزادانہ استنباط کی کوئی صلاحیت نہیں۔ اس تختی کو لے کر وہ پانچ لاکھ سال بھی لگے رہتے' تو شاید انہیں کچھ حاصل نہ ہوتا۔ انہوں نے اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے کہا قالو سبحانک لا علم لنا الا ماعلمتنا انک انت العلیم الحکیم (پ ۱ س البقرہ آیت ۳۲) اے پروردگار! تو پاک ہے۔ ہم سے اندازے کی غلطی ہو گئی۔ ہمیں تو صرف اتنا پتہ ہوتا ہے' جتنا تو بتاتا ہے۔ ہم تو وہ کمپیوٹر ہیں' جو تھرڈ ڈیٹا پر چل رہے ہیں۔ ہمارے پاس یہ صلاحیت نہیں ہے کہ الف کے ساتھ ب کو جوڑ سکیں۔ ہم معافی

Marfat.com

چاہتے ہیں' جو صلاحیت تو نے انسان کو بخشی ہے' اس کا مظاہرہ ہم نہیں کر سکتے۔ قال یآدم انبهم باسمآئهم اللہ نے کہا اے آدم! تو نے اس تختی کا کیا کیا؟ فلما انباهم باسمآئهم (پ ا' س البقرہ' آیت ۳۳) وہ فرفر شروع ہو گیا۔ اس نے حروف تہجی میں پوری کائنات کو جوڑ لیا۔ ہر چیز کے نام رکھ دیئے۔ ان کے واسطے بنا لیے۔ ان کے توسط قائم کر لیے اور اس نے ہر چیز کی وضاحت علیحدہ علیحدہ سے کر دی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے پچھلی نسلوں سے خیال اور تجربات لیے اور اگلی نسلوں تک پہنچانے کے نقشے سمجھا دیئے۔ ایک بہت بڑے علم کی مضبوط بنیاد رکھ دی۔

جب یہ مظاہرہ ہو چکا' تو خداوند کریم نے کہا' میں نہ کہتا تھا انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض واعلم ماتبدون وما کنتم تکتمون (پ ا' س البقرہ' آیت ۳۳) کہ جو زمین و آسمان کا غائب ہے' میں ہی جانتا ہوں۔ جو تمہارے دلوں میں ہے اور ان میں جو آرزو تم چھپائے لیے پھرتے تھے' اس سے بھی آگاہ ہوں۔ جب عقل بسیط کی کہانی اور انسان کی صفت حکمرانی قائم ہو گئی' تو پھر اللہ نے ان سے کہا و اذ قلنا للملٰٓئکة اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس (پ ا' س البقرہ' آیت ۳۴) کہ اب اس انسان کو سجدہ کرو۔

ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ انسان کو سجدہ کرنے کا حکم اس کے کسی جسمانی پہلو کی وجہ سے نہیں دیا گیا' بلکہ امانت عقل و شعور کے اظہار' اس کے ترفع اور ذہانت کی وجہ سے دیا گیا' جس سے کام لے کر اس نے خود اصول استنباط کیے تھے۔ اس سے اللہ کی منشا پوری ہوئی۔ اس سے ایک نیا تخلیق کار پیدا ہوا۔ ایک مصور' ایک ادیب پیدا ہوا۔ اس سے ایک سائنسدان پیدا ہوا۔ اللہ کو اس علم کی قدر و عافیت اس قدر منظور تھی کہ اس نے اپنی بہترین مخلوق کو حکم دیا کہ اس صلاحیت کی وجہ سے یہ تمہارا خلیفہ ٹھہرا۔ تم اس کو تعظیم کا سجدہ کرو۔ اگر خلیفۃ الارض میں صلاحیت عقل و شعور نہ ہوتی' تو اس کے لیے ہدایت بھی بیکار ہوتی۔ یہ تمام فسانہ اخلاق آپ کے لیے ''فسانہ آزاد'' ہوتا۔ خدا نے کہا' اب میں نے تمہیں ضروری آلاتِ دانش اور عقل و معرفت عطا کر دیئے ہیں انا ھدینه السبیل واماشاکراً واما کفورا (پ ۲۹' س الدھر' آیت ۳) اور واحد مقصد رکھ دیا ہے کہ چاہو' تو ہمیں مانو' چاہو تو ہمارا انکار کر دو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے' کہ اگر یہی واحد مقصد ہے' تو ہم زندگی کی عقل و شعور کے ساتھ کیسے تشکیل نو کر سکتے ہیں؟ جن لوگوں نے ترجیح اول کا خیال رکھا' اور یہ جان لیا کہ عقل و شعور اور ہدایت کا صرف ایک بنیادی مقصد اللہ کو جاننا اور پہچاننا ہے' تو انہوں نے اپنا بنیادی مقصد پورا کر لیا۔ انہیں کوئی خوف نہیں رہتا۔ یہ وہ لوگ ہیں' جنہوں نے اپنی زندگیوں کا جائزہ لیا۔ اپنی ترجیحات کو مرتب کیا اور بڑی آسانی سے یہ نکتہ جان لیا کہ خداوند کریم ہی عقل و شعور کی اعلیٰ ترین ترجیح ہے۔

God is the only top priority of intellectual curiosity

اس کے بعد عقل کا وہاں پہنچ کر کام ختم نہیں ہو جاتا' بلکہ اپنی ترجیح اول کو مطمئن کرنے کے بعد یہی عقل آپ کی کم تر ترجیحات کو سدھارنا شروع کر دیتی ہے۔ یہی عقل انسانی کمپیوٹر ہے' جس میں کسی دنیاوی کمپیوٹر کے برعکس اللہ نے پیدائشی صلاحیت یہ دی ہے کہ آپ اسے پروگرام کریں نہ کریں' اسے بتائیں یا نہ بتائیں' یہ آپ کی ترجیحات کی آپ کو خبر دیتی ہے۔ آپ صبح اٹھتے جائیں' لسٹ آپ کے سامنے آ جاتی ہے۔ یہ آپ کو بتاتی ہے کہ یہ بہت اہم ہے' بہت اہم ہے' بہت اہم ہے۔ عمومی طور پر آپ کم تر ترجیح کو اولین ترجیح پر ہمیشہ قربان کر دیتے ہیں' چاہے کتنی بھی ترجیحات پڑی ہوں' کسی عزیز

Marfat.com

کی موت کی خبر آ جائے' تو آپ باقی تمام ترجیحات ترک کر کے اسے اولین ترجیح کے طور پر چن لیتے ہیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جب آپ کو اللہ نے چننے کی پیدائشی صلاحیت دی' تو Next کہاں واقع ہے۔ Next فاصلے میں واقع ہوتا ہے۔ وقت کا فاصلہ ہے کہ ایک دن کی ترجیحات تو بہت واضح ہوتی ہیں۔ ایک ہفتے کی اس سے ذرا مبہم ہوتی ہیں۔ مہینے کی اس سے زیادہ غیر واضح' جبکہ ایک عمر کی ترجیح سرے سے غائب ہو جاتی ہے۔ یہ ایک المیہ ہے' جو انسان کے ساتھ ہے۔ اسے ہفتے' مہینے اور سال کی ترجیحات کا تو پتہ ہوتا ہے' مگر پوری زندگی کی ترجیح غائب ہو جاتی ہے۔ پوری زندگی کی ترجیح جب غائب ہو گئی اور آپ کم تر ترجیحات میں الجھے رہے۔ ذہن اور خیال ڈسٹرب رہا۔ بے اطمینانی میں سفر کرتے رہے۔ دست نوامیدی کو دیکھتے رہے۔ آرزو کا کرب رہا۔ دجل وفریب خیال میں الجھے رہے۔ موت کے قریب پہنچ گئے' مگر جان نہیں چھٹتی۔ ترجیح اول اپنا مضبوط اثر پیچھے سے ناسٹلجیا کی صورت میں ڈالتی ہے۔ اداس کیفیتیں پیدا کر دیتی ہے۔ پس منظر میں یہ ایک بہت بڑی ترجیح ہے' جو آپ کو اطمینان سے جینے نہیں دیتی۔ جب ذہانتیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ زندگی میں زندگی کم ہو جاتی ہے۔ خیال میں وہ ترفع نہیں رہتا اور جب تمام ادبیت بلیک میل ہو جاتی ہے' تو پھر ترجیح اول کا خیال آتا ہے۔

آج کے دور میں اس کی کو سامنے رکھیں' تو آپ اپنے پورے الٰہیاتی تھیسز کی تشکیل نو کر سکتے ہیں۔ مذہب بذات خود بے معنی ہے۔ خدا کے لیے جب آپ مذہب چنتے ہیں' تو یہ آپ کے لیے خوش ترین رستہ ہے۔ خوش ترین زندگی ہے۔ Love labor is always sweet (محبت کی مشقت ہمیشہ شیریں ہوتی ہے) اگر اللہ سے انس اور محبت ہو' تو یہی مذہب' یہی خیال اور یہی قرآن آپ کو بین الکائناتی سفر کرا سکتا ہے۔ یہی وہ قرآن ہے' جو یہ کہتا ہے کہ ایک صاحب کتاب کو یہ وصف حاصل تھا کہ اس نے چار ہزار میل سے تخت سبا پلک جھپکنے میں حضرت سلیمانؑ کے دربار میں حاضر کر دیا۔ جو یہ کہتا ہے' کہ اگر میری آیات پہاڑوں میں پڑھی جائیں' تو وہ خدا کی خشیت سے ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ یہی قرآن دعویٰ رکھتا ہے ثم قست قلوبکم من بعد ذلک فھی کالحجارۃ او اشد قسوۃ میرے خوف اور محبت سے بعض پتھر چٹختے ہیں اور ان میں سے پانی پھوٹتا ہے۔ بعض میں سے لما یشقق فیخرج منه الماء (پ ۱' س البقرہ' آت ۷۴) بعض میں سے نہریں پھوٹتی ہیں۔ مگر اے انسان! تو اتنا سخت دل کا مالک ہے کہ قرآن کا تجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

اور ہو بھی کیسے؟ جس انسان نے عقل وشعور کو استعمال نہیں کیا۔ تجسس کو نہیں چاہا' نہ پہچانا۔ جس کے دل میں غرض وغایت زندگی کا سوال نہیں ابھرا' وہ اللہ کو کیوں تلاش کرے گا؟ مصیبت تو یہ ہے کہ انجام زندگی کے وقت انجام سفر ہو جائے گا۔ وہ جو پاسپورٹ لینے والے آگے کھڑے ہیں' وہ دوستوں کا پوچھتے ہیں نہ وہ پیچھے چھوڑے ہوئے محلات کو درخور اعتنا سمجھتے ہیں۔ وہ ایسی ہی کوئی اجڈ اور گنوار مخلوق ہے کہ اس کو رشوت بھی نہیں دی جا سکتی۔ وہ دو ہی سوال کرتے ہیں کہ من ربک آتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ چلو۔ یہ تمہارے لیے دوسری گلیکسیز ہیں۔ ایک جہنم کی دنیا ہے' ایک جنت کی دنیا ہے۔

آج کے زمانے میں بہت کچھ ایسے ہو گا' جو آپ کے یقین واعتبار کے لیے بڑی مصیبت لائے گا۔ جب تک آپ نے مذہب کو ذاتی خیال اور توجہ سے نہیں پڑھا اور علم سے نہیں دیکھا' آپ ہمیشہ کنفیوزر ہیں گے۔ شاید ہمارا مذہب اتنا کافی نہیں ہے کہ وہ ہمیں موجودہ زندگی میں کچھ حیثیت دے سکے۔ یہ مذہب کا قصور نہیں ہے۔ اس میں تضاد بھی نہیں ہے۔ یہ ہماری علم سے تہی دامنی اور مذہب اور خدا کے بارے میں کم علمی کا قصور ہے۔ ہماری اللہ پر کوئی محنت نہیں ہے۔ ہماری

اپنی زندگی پر نہ اپنے مذہب پر کوئی محنت ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے یہ مسائل اسی لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہم سمجھیں اور مذہب کے بارے میں اپنے تصورات اور خیال کی تشکیل نو کریں۔ اسے اللہ کے لیے نہ کہ کسی علمی مشق کی خاطر انجام دیں۔ ہم تحقیق و جستجو کے دروازے کھولیں۔ وہ بنیادی حیثیت حاصل کریں' جو ہمیں دنیا اور اقوام عالم میں ممتاز کرے۔ جب تک ہماری ترجیحات درست نہ ہوں گی۔ خدائے حقیقی کے خیال سے دوری ختم نہیں ہوگی اور طریقت شریعت کا جزو نہیں بنے گی' اور جب تک اللہ مذہب کی بنیادی اساس قرار نہیں پائے گا' ہم ہمیشہ اس کمی اور بحران کا شکار رہیں گے۔

اجتہاد اور تشکیل نو

اجتہاد اور تشکیل نو ہم معنی ہیں۔ مگر ہمیں یہ ہر حال میں خیال رکھنا پڑے گا کہ کسی بھی جدید نظریے سے مرعوب ہو کر ہم کسی بھی قسم کی نئی شرح داخل کریں اور نہ اس شرح میں کوئی چیز خارج کریں۔ اگر وقتی طور پر ہمارا یہ تصور ہو کہ کوئی قانون اللہ یا رسولؐ کا ہمارے دور سے مطابقت نہیں رکھتا' تو یہ ایک انسانی ذہن کا عارضی ردعمل کا فیز ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب انسانی قانون کی بدقسمتی ظاہر ہوگی' تو پھر آپ کو اپنے قانون کی بہتری کا یقین ہونا شروع ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر اب مغرب نے کریمنل سائیکالوجی شروع کی ہے۔ انہوں نے ایک نیا تھیسز دیا ہے کہ جرائم پیشہ کے ساتھ محبت اور ہمدردی ہونی چاہیے۔ ان کی اصلاح کی جانی چاہیے۔ مجموعی طور پر بے شمار نفسیات دان جیلوں میں کام کر رہے ہیں' لیکن ان کا یہ علاج بالآخر غلط نکلا اور اصلاح کی بجائے جرائم پیشہ افراد کو نئے فرار کے مواقع مل گئے۔ اسی طرح اور بہت سارے قوانین ہیں' جو مغرب نے دریافت کیے۔ عورتوں کی آزادی کا قانون ہے مگر عورتوں کی آزادی کے قانون نے جتنا نقصان مغرب میں عورتوں کو پہنچایا ہے' اتنا کسی اور کو نہیں پہنچایا۔ نتیجتاً وہاں شادیاں بند ہو گئیں۔ اس سے ناشناخت بچوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔ نکاح بند ہو گئے۔ لوگ بغیر نکاح رہنے لگے۔ چنانچہ امریکی حکومت نے ان کے اکٹھے رہنے ہی کو نکاح تصور کرنا شروع کر دیا۔ جہیز کے اور دوسرے مسائل' جو ہمارے ہاں موجود تھے' مکروہ قرار دیئے گئے۔ مگر وہاں عورت کے تحفظ کے لیے مرد پر بہت زیادہ بوجھ ڈالنے سے مرد کو یہ آسان لگا کہ وہ ایک عورت سے نکاح کی بجائے اسے خرید لے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جائیداد اور دوسری چیزوں میں بھاری بھرکم تقسیم کے باعث وہاں مردوں نے نکاح کرنا اور رجسٹرڈ ہونا ہی بند کر دیا۔ انہوں نے عام افراد کی طرح زندگی گزارنا شروع کر دی۔ اس مجبوری کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مزید ایک قانون بنا دیا اور وہ قانون یہ تھا کہ کوئی بھی مرد اور عورت اکٹھے رہ رہے ہوں' تو ان پر نکاح کا حکم لاگو ہوگا۔

یوں قاعدہ قانون' جو انہوں نے اسلام یا کسی اور مذہب کے قانون کے خلاف بنایا تھا' وہ انہی کی نظر میں ناکام ہو گیا۔ آزادی کے تصورات ناکام ہو گئے۔ اب دوسری ناقص قانون سازی سے لوگ بچوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑیں گے۔ اس وقت تمام یورپ ہمیں شرح آبادی میں کم نظر آتا ہے۔ جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں میں لوگ بچے پیدا کرنا پسند نہیں کرتے۔ ان کی افرادی قوت اور جنیٹک ڈویژن کم ہو رہی ہے۔ اگر وہ اس قانون پر قائم رہے' تو شاید لاکھوں کروڑوں مسلمان جو دھڑا دھڑ دیواروں کی طرح بڑھ رہے ہیں' بالآخر جرمن حکومت کی بنیاد رکھیں گے۔

Marfat.com

اکیسویں صدی کا مذہب

خدا الوکل نہیں ہے اور خداوند کریم کسی بھی صدی کا قیدی نہیں۔ بلکہ جس قرآن میں تعلیم و تربیت کے میدان میں قیامت کی پیشن گوئی کی گئی ہے' اسی پروردگار عالم نے اس دنیا کی عمر' اس کے خیال' اس کے تمام تر مسائل اور انسانی ذہنی ترقی کا پہلے سے احاطہ کیا ہوا ہے۔

جدید ذہن انسانی کا یہ آخری سوال ہوگا کہ خدا نعوذ باللہ روبہ انحطاط ہے اور وہ جدید صدی پر مہارت نہیں رکھتا۔ فرق ہمارا ہے کہ ہم اسلام کے جتنے حوالے بھی اس وقت دے رہے ہیں یا جو ہماری تفاسیر میں درج ہیں' وہ کبھی بھی بارہویں صدی سے آگے نہیں بڑھے۔ اصول علم یہ تھا کہ جوں جوں زمانہ اور علم آگے بڑھ رہا تھا' اس کے ساتھ ساتھ ہماری وضاحتیں اور ہماری تحقیقات بھی آگے بڑھتیں۔ مثلاً قرآن حکیم کی دو آیات ہیں' جن میں عبادات کا کوئی حکم نہیں۔ جن کا کوئی تعلق کسی چیز کے ساتھ نہیں ہے' سوائے ایک معروضی سائنس کے۔ جیسے خدا نے کہا کہ آغاز میں آسمان اور زمین اکٹھے تھے۔ پھر ہم نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا۔

پندرہ سو برس پہلے بغیر کسی تجربہ گاہ اور سائنسی تجربے کے ایک ہستی یہ اعلان کر رہی ہے کہ ہم نے تمام حیات کو پانی سے پیدا کیا۔ سائنس جو یونانی نظریات اور تصورات پر مبنی ہے' اس میں مختلف قسم کے خیالات تھے۔ کوئی صاحب کہہ رہے تھے کہ حیات پانی سے بنی ہے۔ کوئی آگ سے اور کوئی خاک سے قرار دے رہا تھا۔ ان تمام کنفیوژن میں ایک حتمی بیان دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ کہا و جعلنا من الماء کل شی حی (پ ۱۷' س الانبیاء' آیت ۳۰) بیسویں صدی تک بیالوجین زندگی کی تخلیق کے قانون تک نہیں پہنچے تھے۔ انہوں نے صرف چند سال پہلے اس امر کی تصدیق کی تھی۔ انہوں نے یہ قانون بنا دیا کہ تمام تر تحقیق و جستجو کے بعد تمام سائنسی دنیا کے فلاسفر ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تمام زندگی کی تخلیق پانی سے ہوئی ہے۔ جو اسلامی تحقیق از روئے قرآن اور اللہ کا بیان تھا' وہ درمیان کی صدیوں میں ہمیشہ مشکوک رہا۔ وہاں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم انتظار کرتے' تا آنکہ معروضی حقائق خدا کی بات کا اثبات کرتے۔

بارہویں صدی میں جو اس آیت کی وضاحت ہوئی تھی' وہ اس آیت میں موجود نہ تھی۔ اس سے مراد نطفہ انسان لیا جاتا تھا' جو قطعی غیر معقول تھا۔ کیونکہ اس میں کل حیات کے معنوں میں لیا گیا تھا اور پانی کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ کا اظہار نہیں تھا۔ جبکہ اللہ کا یہ کہنا تھا کہ میں نے تمام حیات پانی سے پیدا کی۔ اب جبکہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہمارے سینوں میں خوف وجود پاتا ہے کہ عقل انسان' جدوجہد اور یہ تحقیق و جستجو شائد ہمیں ایسے حقائق کو لے جائے' جس میں خدا نے قرآن حکیم میں جو دعوے کیے ہوئے ہیں یا جو باتیں اس نے سائنسی فینومنا کے بارے میں کہی ہیں' وہ کہیں غلط نہ نکل آئیں۔ کہیں قرآن کا کوئی بیان غلط ثابت نہ ہو جائے۔

اور یہ خوف بڑا سچا ہے۔ اس لیے کہ اگر خدا کی بات کوئی غلط نکل آئی' تو کم از کم اس صدی کا ماننے والا کبھی بھی حقیقت میں خدا کو نہیں جان سکے گا۔ اس لیے کہ حقائق کچھ اور کہہ رہے ہوں گے اور خدا کچھ اور کہہ رہا ہوگا۔ وہاں انسانی تجسس اپنی کم فہمی کا اعتراف کرے گا یا یہ فتویٰ صادر کر دے گا کہ یہ کتاب، کتاب اللہ نہیں ہے اور خدا جو نہ غلطی کرنے والی

Marfat.com

ہستی ہے' وہ ایسی نہیں ہے۔ یہ خوف ہماری سیکولر فلاسفی اور ہماری جدید ترین تعلیم سے ابھرا ہے۔ مگر پچھلے تیس سالوں سے میں جتنے بھی جدید حقائق کا قرآن سے مطالعہ کر رہا ہوں' اس میں مجھے بڑی حیرت کی بات لگتی ہے کہ قرآن وحدیث مل کر جس سائنسی ترقی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں' وہ ابھی نہیں پہنچی۔ جینٹک انجینئرنگ تیزی کے ساتھ علم میں شمار ہونے لگی ہے' لیکن وہ ابھی اس حدیث کے مقام تک نہیں پہنچ پائی کہ وہ ایک انسان کو ڈی این اے کے سٹرکچر سے مکمل طور پر دوبارہ زندہ کر لے۔ ابھی وہ اس قابل نہیں ہوئے۔ مگر حدیث اشارہ کر رہی ہے کہ انسان اس قابل ہو جائے گا کہ وہ انسان کی نقل لیبارٹری میں تیار کر لے۔

اکیسویں صدی کا جہاں تک تعلق ہے' اسلام اس سے بہت آگے ہے۔ اتنا آگے ہے کہ وہ تباہی کے دن کی پیشگوئی کرتا ہے۔ وہ پورے انسانی تہذیب کے قافلے کا انجام بتا رہا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ یہ سوال اسلام پر لاگو نہیں ہوگا۔ اسلام کے ماننے والوں پر لاگو ہوگا۔ اگر ہم نے اپنی تعلیم کو تقسیم کر دیا۔ دین و دنیا کو علیحدہ علیحدہ سمجھا اور دین کو فرار دنیا کا ایک ذریعہ بنایا۔ تجسس کو چھوڑ دیا اور قرآن کی اس آیت کو چھوڑ دیا کہ ربنا ماخلقت هذا باطلا دعا یہ کر' یہ کہہ کہ اے میرے رب! تو نے یہ باطل تخلیق نہیں کیا سبحانک فقنا عذاب النار (پ ۴' س آل عمران' آیت ۱۹۱) یہ ہمارے سوچنے' پڑھنے' لکھنے کی باتیں ہیں۔ ہمارے اندازِ فکر کی بات ہے۔

جیسے ''قانون شفا'' کے مصنف ابن سینا کی بات ہے کہ ہنگام مرگ جب اس پر سکرات کا عالم طاری ہوا' تو اس کا ایک شاگرد اس کے پاس بیٹھا تھا۔ شاگرد نے ازراہ تلطف اسے کہا کہ استاد تو مر رہا ہے۔ اس عالم میں بھی تو فلسفہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے؟ اس نے کہا، اے نادان! میں اللہ کے حضور اس طرح جانا چاہتا ہوں کہ میں طالب علم کی طرح پڑھتے پڑھتے شہید ہو گیا۔ مجھے ایک بڑا وعدہ نصیب ہے کہ طالب علم کی تحصیل کرتے ہوئے مر جائے' تو وہ شہید ہے۔ میں نے کلمہ پڑھ کر کیا کرنا ہے۔ میں اللہ کے حضور اس طرح جانا چاہتا ہوں کہ خدا کو یقین ہو کہ یہ آخری لمحے بھی تحصیل علم کر رہا تھا۔

اکیسویں صدی میں اسلام کا نہیں' بلکہ مسلمان کے رویے کا بڑا کردار ہے۔ اگر ہم اسی طرح اعتقادی اور سیکولر میں تقسیم ہوتے گئے اور ہم نے خداوند کریم اور اس کی کتاب کو ایک اعلیٰ ترین کائنات کا ڈیٹا سمجھ کر مطالعہ نہ کیا۔ سمجھا نہ غور و فکر کی عادت ڈالی' تو اکیسویں صدی میں اسلام کا کوئی کیریئر نہیں ہے۔ ہمیں کرنا یہ ہے کہ جیسے جنگ میں ہمیں گھوڑے تیار کرنے ہیں۔ تیر اور تلوار تیار کرنی ہے' اسی طرح ہمیں علم کے لیے خالصتاً جدوجہد کرنی ہے۔ مراتب کے لیے علم حاصل نہیں کرنا' بلکہ علم کے لیے علم کو حاصل کرنا ہے اور پھر علم کو خدا کی اطاعت میں استعمال کرنا ہے۔ پھر ہمیں کوئی صدی کچھ نہیں کہہ سکتی۔

اجتہاد بغیر علم اور مسلمان

موجودہ ملکوں کی موجودگی میں اجتہاد ممکن نہیں ہے۔ اجتہاد کا پس منظر بغیر علم نہیں بنتا۔ اجتہاد غور و فکر کی ایک آخری اور فیصلے کی ڈگری ہے' جو بغیر علم نہیں ہو سکتی۔ میں نے ابتدائی فکر کی نشاندہی کی ہے' آخری کی نہیں کی۔ میرے خیال میں اجتہاد تو ابھی دور کی منزل ہے' اے کاش کہ ہم اجتہاد کے لیے ضروری علمی تحقیق کر لیں۔ اس کا طریق مشاورت ہے' جو

Marfat.com

اللہ نے ہمیں دیا ہے۔ مسلمان اکٹھے بیٹھیں گے۔ جب کوئی ایک دوسرے سے اپنے آپ کو متقی نہیں سمجھے گا' تو میرا خیال یہ ہے کہ ہدایت آسان ہو جائے گی۔ محبت اخلاق بن جائے گا اور کسی طریقے کی مزاحمت نہیں کی جائے گی' جیسے کہ اب کیا جا رہا ہے۔ قبولیت عام ہو گی۔ نقارۂ خدا گونج اٹھے گا۔ علم سرداری پیغمبر بلند ہو گا اور امت مسلمہ اپنے مقام غلبہ تک پہنچے گی۔ انشاءاللہ یہ جلدی ہو جائے گا۔

حدیث' ثبوت قرآن

قرآن ہمارے پاس بنیادی طور پر بحیثیت حدیث وجود رکھتا ہے۔ ایک ہی زبان مبارک سے دو لفظ نکلتے ہیں اور اس پر صرف اور صرف ایک ہی آدمی جج ہے۔ وہ محمد رسول اللہؐ ہیں۔ آقا ورسولؐ ایک مقام پر اپنی بات کہتے ہیں اور تھوڑے عرصے کے بعد جب دوسری بات کہتے ہیں' تو وہ کہتے ہیں کہ یہ وحی ہے۔ اس کو لکھ لو' یہ خدا کا کلام ہے۔ اگر آقا ورسولؐ اس بات کی شہادت نہ دیں کہ مجھ پر جو اتر رہا ہے' وہ قرآن ہے' تو قرآن کے وجود کے لیے ہمارے پاس کوئی دوسرا ثبوت نہیں۔ قرآن کا بنیادی ثبوت جو ہمارے پاس بحیثیت قرآن موجود ہے' وہ حدیث رسولؐ ہے۔ بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ قرآن انداز اور ڈائیلاگ سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ کسی عرب کے لیے تو ہو سکتا ہے' میرے اور آپ کے لیے نہیں ہو سکتا۔ میرے اور آپ کے لیے اللہ تعالیٰ کے رسول کے منہ سے نکلی بات کی پرکھ کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ قرآن ہے اور یہ حدیث ہے۔ ہمیں تو صرف اور صرف مخبر صادقؐ کے قول سے پتہ لگتا ہے کہ یہ قرآن ہے۔ اس کے لیے حدیث کی حیثیت انتہائی بنیادی ہے۔

چنانچہ جب آپ قرآن وحدیث کی تفریق شروع کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن اور یہ حدیث ہے' تو اس میں ہمیں ایک بات کا اعتماد ہوتا ہے کہ رسول امینؐ جنہوں نے بڑی احتیاط سے کلام خداوند ہم تک پہنچا دیا ہے' ہمیں یہ نہ بتائیں کہ یہ کلام خداوند ہے' تو ہمارے پاس اس کی کوئی دوسری تصدیق روئے زمین پر موجود نہیں کہ یہ قرآن ہے۔

اسی طرح حدیث رسولؐ کو نظر انداز کرنا یا اس کی حیثیت کو کسی طرح بھی کم کرنے سے ہمارے پاس قرآن کا متن واضح نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر دو چار آیات کے بارے میں بظاہر ایسے لگتا ہے کہ یہ قرآنی حکم مطلق ہے۔ مگر اس کی وضاحت سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ مطلق نہیں ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے بہت سارے قوانین نجی زندگی کے بارے میں قرآن صرف اجمالاً ذکر کرتا ہے۔ اگر ہم لفظ قرآن پر جائیں' تو طہر کا لفظ پاکیزگی کے لیے ہے۔ مگر اگر آپ رسول اللہ کی حدیث کو ساتھ نہ رکھیں گے اور اس کو عملی تفصیل میں نہ لائیں گے' تو ہم قرآنی الفاظ کی بلاغت کی ہمہ جہتی کو اپنے لیے عذاب پائیں گے۔ رسول گرامی مرتبتؐ نے قرآنی احکام کو جس انداز سے ادا کیا اور جس طریقے سے اپنایا' وہ تمام زندگی خدا کے قانون کا عملی مظاہرہ ہے۔ اس لیے اس کی وضاحت بھی ہمارے لیے اتنی ہی اہم ہے' جتنا رسول خدا کا یہ کہنا کہ یہ قرآن ہے۔

مثلاً ایک خاتون اور ایک مرد کا ایک دوسرے کو دیکھنا گناہ عظیم ہے۔ مگر حدیث پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے رسول نے ناشائستگی کا برا منایا۔ زمانے میں ہزاروں مرد اور عورتیں ہیں۔ رستوں پر چلتے ہیں۔ ایک دوسرے پر نظر پڑتی ہے۔ اس کو ہم گناہ وثواب کا حصہ نہیں بنا سکتے۔ مگر ایک متفق علیہ حدیث ہے۔ حج کا موقع ہے۔ رسول گرامی مرتبتؐ اونٹ

Marfat.com

پر بیٹھے ہیں۔ پیچھے ان کے چچیرے بھائی فضل بن عباس بیٹھے ہیں۔ ایک خاتون احرام باندھے ہوئے ہے۔ ایک مسئلہ پوچھنے حضورؐ کے قریب آتی ہے۔ فضل بن عباس اسے ٹکٹکی لگا کے دیکھ رہے ہیں۔ یہ پیغمبرؐ کے لیے اس قدر ہراساں کرنے والی بات تھی کہ جب وہ باز نہیں آئے' تو حضورؐ نے ان کا منہ ہاتھ میں لے کر اسے دوسری طرف کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑے استاد کا طریق کار ہے۔ اس حدیث سے ہمارے سامنے سائیکالوجی واضح ہوتی ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت' ان کو یہ کہا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو ہراساں کرنے کی کوشش نہ کریں' شائستہ بننے کی کوشش کریں۔ مگر اس میں وہ بات نہیں آتی' جو ایک یا دو نظروں کے حوالے سے ہمارے Guilt Formation میں آتی ہے۔ ایسے احکام کی وضاحت صرف عملی حدیث سے ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارے لیے یہ امر محال ہے کہ ہم قرآن کو بغیر حضورؐ کی عملی وضاحت کے سمجھ سکیں۔

کچھ لوگوں نے بعض احادیث پر اعتراض کیا ہے۔ بخاری' مسلم' سنن ابی داؤد' احمد بن حنبل کی مسند یا موطا امام مالک میں مجھے کوئی ایک حدیث ایسی نظر نہیں آتی' جو خلاف عقل و معرفت ہو یا جس پر یہ گمان ہو کہ یہ حدیث ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاید حدیث کو سمجھنے والا ابھی ون ٹریک مائنڈ ہوتا ہے۔ وہ ایک مخصوص زاویئے سے اسے پڑھ رہا ہوتا ہے۔ وہ اسے اس معاشرے کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھ رہا ہوتا' وہ جس کے لیے وہ حدیث آئی ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک حدیث پر بڑا اعتراض کیا جاتا ہے' جب ان کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر' عروہ بن مسعود کے ساتھ ان سے مسئلہ پوچھنے گئے کہ کیا ایک ساع پانی سے غسل ہو سکتا ہے؟ حدیث بخاری صرف اتنا کہتی ہے کہ ام المومنین نے انہیں غسل کر کے بتایا اور بیچ میں پردہ تھا۔ یہ وہ حدیث ہے' جس پر قریباً ہزاروں اعتراض وارد کئے گئے ہیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ایک ایسی جگہ جہاں پانی بہت کم ہے' پانی نہیں مل رہا۔ جیسے ڈی آئی خان یا ڈی جی خان' جہاں شہر سے باہر نکل جائیں' تو پانی چکھنے کو بھی نہیں ملتا' لوگوں کو پانی کی قدر کا کیا پتہ چلتا ہے۔ ایسے علاقے میں جب نہایا جائے' یا غسل جنابت کیا جائے' تو اس کے لیے حضورؐ نے یہ رخصت دی کہ ایک ساع پانی سے غسل ہو سکتا ہے' یہ جائز ہے۔

اب حدیث پر اعتراض اس حوالے سے وارد ہو رہا ہے کہ ام المومنین نے غسل کر کے بتایا۔ مگر دوسرے لفظ پر کسی کا دھیان نہیں گیا کہ بیچ میں پردہ ہے۔ جب پردہ ہے' تو پھر اعتراض کس بات کا؟ حدیث کا معترض یہ کہتا ہے کہ یہ فحش حدیث ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ مسئلہ پوچھنے والا سر پر کھڑا ہے اور وہ ام المومنین کے بڑے بھائی ہیں۔ نہ صرف خود کھڑے ہیں' بلکہ ان کے ساتھ ایک اور آدمی کھڑا ہے' جو سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا گمان موجود ہے کہ کوئی خاتون خواہ وہ مغرب کی کیوں نہ ہو' اس قسم کا پیٹرن بے حجابی کا شو کر سکتی ہے' جیسے اس حدیث پر گمان کیا جاتا ہے؟

بسا اوقات حدیث کی تشریح میں ایک مقامی تنگی ذہن ضرور حائل ہو جاتی ہے۔ ایک لوکل گمان اپنے ذہن سے دیکھنے کا رجحان موجود ہوتا ہے۔ ورنہ اس حدیث سے ایک بڑا فائدہ امت مسلمہ کو یہ مل جاتا ہے کہ تھوڑے سے پانی سے بھی ایک مخصوص طریقے سے انسان اپنا غسل پورا کر لیتا ہے۔ ایک ساع پانی اڑھائی کلو ڈبے کے برابر ہے۔

اندھا عقیدہ اور عقل و شعور

یہ ضروری نہیں ہے کہ عقل و شعور پڑھنے لکھنے سے مرتب ہو۔ یہ تو ضرور ہے کہ پڑھنا لکھنا اور اہلیت کا حاصل کرنا

Marfat.com

عقل وشعور کی وجہ سے ہے۔ مگر اگر یہ چیزیں نہ بھی ہوں' تو بھی انسانی عقل وشعور کی بلوغت اور اس کا محل فکر اس میں موجود ہے۔ یہ میرا نظریہ نہیں ہے کہ اندھا عقیدہ ایک بری بات ہے۔ خداوند کریم مسلسل قرآن کریم میں ایک طعنہ اہل کفر کو دیتا ہے اور وہ طعنہ یہ ہے کہ اگر تم میں عقل وشعور ہوتا' تو تم ضرور خدا کو پہچان لیتے۔ تم اپنے آباؤ اجداد کے دین پر قائم نہ رہتے۔ اگر تم میں اتنی ہوش ہوتی' تو تم بت پرستی چھوڑ کر ضرور میری طرف مائل ہو جاتے اور تم اپنے آباؤ اجداد کے دین پر قائم نہ رہتے۔

اگر آپ غور کیجیے' تو یہی اللہ میاں کا طعنہ ہم مسلمانوں پر بھی اسی طرح عائد ہے۔ ہم بھی اپنے آباؤ اجداد کے دین پر قائم ہیں اور خدا کے لیے اس کے سوچنے سمجھنے اور اس کی راہ میں غور وفکر کے لیے ہم بھی کسی قسم کا تردد نہیں کرتے۔ ہم بہت سارے علوم پر بہت ساری توجیہات بڑے زور وشور سے لگاتے ہیں۔ اپنے رزق کے اسباب اور اپنی ناقص ترجیحات کو زندگی کا بہترین حصہ دیتے ہیں۔ مگر ہم نے ابھی زندگی کا تھوڑا سا مسلسل حصہ خدا کے لیے وقف نہیں کیا ہوتا' تو خدا ایسی چیز میں خواہ میں کتنا ہی پڑھ جاؤں' مجھے ضرور جاہل ہی سمجھے گا۔

اندھے عقیدے کی ایک قسم ایک صاحب تسلیم انسان میں ضرور ہوتی ہے۔ جب مجھے احساس ہو جائے کہ کوئی بڑا سوال میری حدود میں نہیں ہے یا میرے فہم وادراک سے بالا ہے' تو میں پھر اپنے لیے ایک راہبر کا انتخاب کرتا ہوں۔ اسی لیے قرآن حکیم نے کہا کہ ہر آدمی اپنے راہبر وگائیڈ کے ساتھ لایا جائے گا۔ جسے آپ ایک کم علم اور بالکل ان پڑھ آدمی کہتے ہیں' وہ بھی اتنا غور وفکر ضرور رکھتا ہے کہ اپنے لیے کسی راہبر کی رائے کو منتخب کرلے۔ اسے تقلید کہا جا سکتا ہے' اندھا عقیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بھی ایک سوچا سمجھا ہوا راستہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک راہبر کا انتخاب کرے اور کس راہبر کو منتخب کرے۔

مسلمان فلسفے یا فقہ تک محدود

(بلال قطب) مسلمانوں کا کردار کبھی بھی تاریخ میں فلسفے اور فقہ تک محدود نہیں رہا۔ اس کی چھوٹی سی مثال ہے کہ مصر کے شہر اسکندریہ میں جو ایک لائبریری بنائی گئی' جس سے مسلمانوں نے بہت علم حاصل کیا' اس کے ختم ہونے کے بعد مامون رشید کے دور میں مسلمانوں نے اس کی مثل بیت الحکمہ بنایا۔ اس کے اندر سات سو ہزار کتب موجود تھیں' جو آج بھی اتنی تعداد میں شاید ہی دنیا کی کسی اور لائبریری میں ہوں۔

دوسرا گیارہویں صدی تک مسلمانوں نے جو سائنسی اور تکنیکی لحاظ سے ترقی کی' اس کی زندہ مثال آج بخارا میں وہ رصدگاہ' جس سے آپ فلکیات کے ان اصولوں کو مرتب کر سکتے ہیں' جو آج بھی اتنے ہی سچ ہیں' جتنی کہ تازہ ترین حسابی اقدار ہیں۔ پھر البیرونی نے سالٹ رینج پر کھڑے ہو کر افق کا جو فاصلہ نکالا' اس میں اور آج کے افق کے اختلاف میں صرف تین ڈگری قدری اختلاف نکل سکا ہے۔ اس بات کو ہرگز ذہن میں نہ رکھیں کہ مسلمان صرف فلسفہ' فقہ اور فتنے تک محدود رہے' مسلمانوں کا بہت بڑا اور بہت زیادہ رول تاریخ میں ہے۔ یہ صرف چند سو سال پہلے کی بات ہے کہ ہم زوال کی طرف گئے ہیں۔ گیارہویں سے تیرہویں صدی تک ہم سائنسی ٹیکنالوجی میں اپنے عروج پر رہے ہیں۔

مسئلہ جبر وقدر

ایک معمولی سے لے کر ایک بہت بڑے انسان تک ایک ہی وقت میں دونوں کو ایک ہی آسمان' ایک ہی تقدیر' ایک ہی جبر اور ایک ہی اختیار کا گلہ کرتے پایا۔ مسئلہ جبر وقدر ایک فقیر کا مسئلہ بھی ہے اور ایک امیر کا بھی۔ ایک بوڑھا آدمی جب مشقتوں سے جھکی کمر کے ساتھ گلہ گزار آنکھوں سے آسمان کو تکتا ہے' تو لگتا یہی ہے کہ وہ اپنے مقدر کا گلہ کر رہا ہے۔ تمام مال واسباب' تمام رعایات دنیا اور ہمہ قسم ناز ونعم کے باوجود جب ایک امیر آدمی ہیپا ٹائٹس کا مریض ہوتا ہے اور اس کے گردے بدلنے کی کوشش ہو رہی ہوتی ہے' تو وہ بڑی حسرت سے آسمان کے مالک کی طرف دیکھتا ہے کہ ان تمام آسائشوں کے باوجود اس زندگی سے کوئی حظ نہیں اٹھا سکا۔

یہ ایک ان پڑھ جاہل کا مسئلہ ہے' تو ایک ادیب ومفکر کا بھی مسئلہ ہے۔ ایک معمولی انسان' جس کی کوئی علمی حیثیت نہیں' کوئی دینی وقار نہیں اور جس کو آپ بالکل غبی سمجھتے ہیں' وہ بھی تقدر کے کسی نہ کسی پہلو سے چھوا جاتا ہے۔ عقرب آسمان سے کہیں نہ کہیں اسے بھی ڈنگ لگ جاتا ہے۔ وہ بھی اپنی مشکلات کے لمحے میں جب اپنی حالت کو بیان کرنے لگتا ہے' تو سوائے تقدیر کے اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلتا۔ ایک ادیب ومفکر' جب اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھے کائنات پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ مسائل کا حل ڈھونڈتے ہوئے سماجی پہلوؤں پر غور وفکر کرتا ہے۔ کچھ ایسے اقدامات' ترجیحات وتوجیحات کو دیکھتا ہے' جو اس کے فہم وادراک سے بالا' کسی حکومتی نظام کے پس منظر سے ماورا کسی سماعت اور شعوری کاوشوں سے کہیں آگے ایک لاینحل مسئلہ پیش کرتی ہیں' تو وہ تقدیر کا منکر ہو جاتا ہے یا قائل ہو جاتا ہے۔ انسان کو جبر وقدر ایسے ہی چھیڑتا جاتا ہے' جیسے کسی دل کو دل کا درد چھیڑتا رہتا ہے۔

ہم اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود' ہر قدم اور ہر منزل حیات پر جبر وقدر کو اپنا راستہ روکتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ مائیکروکازم (Microcasm) پر بھی حاوی ہے اور میکروکازم (Macrocasm) پر بھی حاوی ہے۔ یہ کائنات بالا کا بھی فلسفہ ہے۔ ہمارے اردگرد بھری ہوئی فضائے بسیط ہمیں کائنات پر محیط ہر لحہ' ایک منضبط' مربوط اور ایک ناقابل تغیر عمل کا احساس دیتی ہے' جس کی زندگی اور جس کی مدت لمحات صدیوں پر نہیں' بلکہ ایک لاانتہاء لاابدی امر اور ایک بے پناہ وقت

Marfat.com

کے دورانیے پر قائم ہوتی ہے۔ جب ہم اپنے وجود اور ایک مختصر سے وقفہ حیات میں آئے ہوئے انسان پر نظر کرتے ہیں۔ اپنی ساٹھ اور ستر سال کی زندگی کو دیکھتے ہیں' تو ہمیں اپنی ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا ہی کی خبر۔ وہ انسان' جو اپنی زندگی کے پہلے اور زندگی کے آخری لمحے کے انتخاب سے عاری ہے' وہ جسے اپنی مرضی سے نہ اپنا باپ' نہ اپنی ماں مل سکتی ہے۔ جو اپنے بہن بھائیوں کے انتخاب میں آزاد نہیں ہے۔ اپنی پیدائش سے لے کر تب تک' جب تک وہ کسی شعوری کاوش میں نہ آ جائے' اسے اپنی زندگی کے اثبات کا یقین نہیں ہوتا۔

انسان کے بچے کا حلیہ دیکھئے۔ وہ پیدا ہونے کے بعد بھی اتنا ہی مجبور و مقہور ہے۔ وہ کسی مدد و استعانت' ماں باپ اور رشتوں ناطوں کی پشت پناہی کے بغیر ایک قدم بھی اپنی زندگی شعور کے مطابق نہیں گزار سکتا۔ یہ میکروکازم' جس میں ہماری زندگی' ہمارے واقعات' ہماری پل پل کی خبر' ہماری سوچ اور ہمارے راہ عمل کی فکریں تمام حائل ہیں' جبر و قدر ان پر ایک ایسی چادر کی طرح تنی ہوئی ہے' جس کے کانچ کے ریزے ہم اپنی آنکھوں سے چنا کرتے ہیں۔ ایک ازل ہے' ایک ابد ہے اور ایک دنیا کا ازل اور ایک کائنات کا ابد ہے۔ ہم پر ایک الیکٹران اور نیوٹران سے لے کر ذرہ تخلیق کائنات تک حاوی ہے۔ ایک ایٹم کی پہلی تخلیق سے بگ بینگ (Big Bang) تک جبر و قدر ہی مسلط ہے۔ ایک قوت مطلقہ' قوت قاہرہ اور ایک ایسا اللہ' جسے آپ اللہ نہ بھی کہیں' ہم پر حکمرانی کر رہا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ لوگ خدا کو مانیں۔ اقرار ذاتِ خداوندی کریں۔ اس کے باوجود دائمی جبر کے ایک ایک لمحے کو ہر سائنس دان' ہر مفکر اور ہر مفسر محسوس کرتا ہے۔ چاہے وہ خدا کا نام لے' چاہے نہ لے۔ اصول کائنات' اصول سائنس اور اصول تخلیق ایسے منضبط اور مربوط ہیں کہ کوئی بھی باہوش انسان ان کی گرفت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ مسائل و مصائب میں جبر و قدر کا ہر لمحہ اسی طرح ذکر ہوتا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جو کچھ جس پہلو سے آئے۔ جس گلی سے ہم سفر کریں۔ جس بازار کی نکڑ کو دیکھیں۔ جس کونے پر ہم کھڑے ہوں۔ ہم ہبل کی نگاہ سے دیکھ رہے ہوں یا ایک فقیہہ' دل کی آنکھ سے جھانک رہے ہوں' جبر و قدر سے نجات ممکن نہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے' جو رگِ حیات میں خون کے قطرے کی طرح چلتا ہے۔ موت و حیات اس کے درمیان ایک حد فاصل نہیں بنتی۔ یہ اول و آخر کا مسئلہ ہے۔ میری یہ جسارت ہے کہ میں جبر و اختیار کے اجزاء کو جدا کر سکوں۔ بظاہر یہ ایک تعلّی اور دعویٰ ناقص ہے۔ مجھے خود بھی ایسے ہی لگتا ہے مگر شاید میں مکمل جبر کے حالات میں بات کہنے کا اختیار استعمال کر رہا ہوں۔ میری یہ کوشش ہے کہ ان تمام مقتدر آرا کو مذہباً' اخلاقاً' جو اس موضوع پر آئی ہیں' ایک مسلمان کا اندازِ نظر واضح کروں۔

میں نے جبر و قدر کو ایک واقعہ یا حادثہ کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اسے ایک انفرادی زاویے اور نقطہ نظر سے نہیں جانچا۔ یہ نہیں کہ مصیبت آئی اور میں نے مصیبت کی ذمہ داری اپنے وجود سے نکال کر اپنے پروردگار پر ڈال دی۔ لوگوں کو جبر و قدر کے الیے کا احساس اس وقت ہو' جب وہ کسی ابتلا و آزمائش میں پڑیں۔ بلکہ میں نے جبر و قدر کو ایک سسٹم کی حیثیت سے دیکھا۔ ایک ایسا نظام' جو خالق کائنات نے بہر حال انسانوں کی سہولت کے لیے بنایا۔ انسانوں کے امن و سکون کے لیے بنایا۔ ایک ایسا نظام' جس کی وجہ نظر آتی ہے۔ اس کا طریقہ کار سمجھ میں آتا ہے۔ ایک ایسا قابل فہم میزان' جو زمین سے

نہیں' آسمان سے ہمارے لیے جاری ہوا ہے۔ اب تک جتنی بھی جبر وقدر پر آرا آ چکی ہیں۔ میں جتنے بھی لوگوں کا اس جگہ حوالہ دوں گا' آپ ان میں ایک نکتہ ضرور دیکھیں گے کہ جبر وقدر کو ہر انسان اپنے زاویے سے دیکھ رہا ہے۔ محدود زاویے...... اپنی مرضی اور اپنے مصائب کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ پروردگارِ عالم' جب مختلف نظاموں کو ترتیب دے رہا تھا' تو اس نے یہ نظام خاص طور پر انسان کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی رحمت بیکراں سے بنایا۔ اس کا ایک ذرہ بھی انسان کے لیے مضر نہیں ہے۔ میکرو کازم میں انسان کے لیے ایک ذرہ بھی مضرت رساں نہیں ہے۔

میں حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ سے آرا شروع کروں گا۔ حضرت موسیٰؑ تھوڑے سے غصیلے بھی تھے اور تیز مزاج بھی۔ کہیں ملائے اعلیٰ میں حضرت آدمؑ سے ملاقات ہوگئی۔ چھوٹتے ہی گلہ کر دیا کہ بابا تم نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال دیا۔ یہ ساری ابتلا تمہاری وجہ سے ہے۔ تمہاری غلطی نے ہم نسل انساں کو اتنی کلفتوں میں مبتلا کر رکھا ہے کہ آج تک ہم جنت کی آرزو لیے پھرتے ہیں۔ آپ نے کیوں ایسی غلطی کی؟ یہ حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔ حضرت آدمؑ نے کہا' تو مجھ سے اس بات کا گلہ کرتا ہے' جو میرے مقدر میں چالیس برس پہلے لکھ دی گئی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا' اس طرح حضرت آدمؑ حضرت موسیٰؑ پر غالب آئے۔ حضرت آدمؑ کی بات سچ تھی۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ بظاہر ایسے لگتا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داری کا کوئی تعین نہیں کر سکے۔ جرم وگناہ' عذاب وثواب ایک افسانہ لگتا ہے۔ حقیقت صرف اس حدیث کے مطابق یا اس کتاب کے مطابق ہے' جو اللہ کے پاس ہے۔

ایک دوسری حدیث کے مطابق دنیا اور مخلوقات بنانے سے پچاس ہزار سال پہلے قلم لکھ چکا۔ قلم کی سیاہی خشک ہو چکی کہ جو لکھنا تھا' اللہ نے لکھ دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم کس بات کے لیے یہاں ہیں؟ ہماری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ ہم گناہ وثواب کے اس مسلسل تسلسل میں کیوں پھنسے ہوئے ہیں؟ ہمیں یہ سوال کچھ نہ کچھ خود حل کرنا ہیں کہ بالآخر انسان کا کوئی اختیار ہے کہ نہیں؟ اگر پروردگارِ عالم نے سب کچھ لکھ دیا ہے اور طے کر دیا ہے' تو کیا اس تحریر کردہ یا طے شدہ وقت کو ہمارے مائیکرو کازم' ہمارے اندرونِ ذات اور ہمارے بیرونِ ذات سے کوئی تعلق ہے یا جو کچھ لکھا ہوا ہے' وہ ایک سراسر خارجی ذات کا قصہ ہے؟ مثال کے طور پر جب آپ یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص چاہے جتنی نیکیاں کرلے' اس کا انجام لکھا ہوا ہے۔ ایک شخص چاہے جتنی برائیاں کرلے' جب ایک قدم رہ جائے گا' تو وہ کسی خیر کے انجام کو پہنچے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم قسمت کی مشین کے ہاتھوں میں ایک روبوٹ یا مکینیکل سسٹم کی طرح ہیں؟ جیسے تخلیق کائنات کے وقت اللہ نے آسمانوں کو خطاب کیا اور ان میں امر ڈالا کہ تم چاہو یا نہ چاہو' تم کو یہ کرنا پڑے گا۔ کیا انسان بھی زمین وآسمان کی طرح ہے۔ اس وجودِ مادیہ کی طرح ہے' جس نے چاہے نہ چاہے وہی کچھ کرنا ہے' جو اس کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے؟

گلینڈ بلیشر کی رائے آپ کو دلچسپ لگے گی۔ یہ وہ موضوع ہے' جو ایک سادہ ترین عقل کو بھی چیر کے نکلتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں مقدر پرست تھا۔ مسئلہ یہ نہیں کہ ہم جو چنتے ہیں' اس پر عمل کرتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم اپنے چناؤ میں آزاد ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی چناؤ پہلے سے متعین قوانین سے آزاد نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی غصے میں آ کر ایک شخص کو قتل کر دیتا ہے۔ وہ اتنا حسد' اور غصہ اور کینہ میں آتا ہے کہ ایک آدمی کو قتل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے اور اس میں وہ آزاد لگتا ہے۔ کیا ان کیفیتوں میں' جنہوں نے اسے اس فیصلے تک پہنچایا' آزاد تھا؟ اس کا بچپن' اس کی جینیٹکس' ماں باپ کے اثرات'

Marfat.com

سماجی اثرات' سوسائٹی میں اسے جو گلے اور طعنے ملے۔ جو سختیاں اس نے اٹھائیں۔ کیا اس کا قدرتی نتیجہ وہ چناؤ نہیں تھا' جس کے تحت اس نے ایک انسان کو قتل کر دیا تھا؟ بلیشر کی رائے یہ ہے کہ ہم اس چناؤ کے مطابق عمل کرنے میں آزاد ہیں۔ مگر ہمارا چناؤ آزاد نہیں۔

Crasdaro Canstavo اپنی رائے دیتا ہے کہ بہت سی کہانیاں ایسی ہیں' جن سے انسان ظالم' ستمگر اور نامہربان ثابت ہوتا ہے۔ جیسے چنگیز خان اور ہلاکو خان کے بہت سارے قصے ہیں۔ اسی طرح ہماری گھریلو زندگیوں میں بہت سے خاوند اپنی بیویوں کی نگاہ میں ستمگر اور نامہربان ہوتے ہیں۔ بہت ساری بیویوں کے ظلم وستم میں پسے ہوئے مجبور خاوند بھی میں نے دیکھے ہیں۔ کیا یہ واقعی ایسے ہیں؟ کیا واقعی انسان اتنا ہی ستمگر اور نامہربان ہے؟ شیطنت' جرم' گناہ اور آزادی رائے کو آپ حقیقت سمجھ لیں' تو خدا انسان کے جزا وسزا کے المیے سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اگر ہم شیطان' ظالم' مجرم اور ستمگر ہیں' تو پھر اللہ کی چھٹی ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم ایسے ہی ہیں' تو پھر اللہ جو ہمارے ساتھ کر رہا ہے' اس سے نہ صرف اللہ اس المیے سے آزاد ہو جاتا ہے' بلکہ انسان بھی ہر قسم کے عمل کے لیے آزاد ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ نے اس کو ایسا نہیں کرنے کو کہا اور وہ اپنی مرضی سے کرتا ہے' تو ہم کسی طور پر بھی کسی انصافِ الٰہیہ کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ ہر ظلم وستم' جو ہم پر وارد ہوگا' وہ ہمارے جیسے انسان کریں گے۔ اور اگر ہمیں ان کا دفاع کرنا ہے' تو ہم اپنی ہی طرف سے ان کا دفاع کریں گے۔

چارلس ڈارون کا کہنا ہے کہ انسان نے بھی باقی مخلوقات کی طرح ابتدائے حال میں ایک جرثومہ حیات سے آغاز کیا۔ زمانوں کے تواتر سے نکلا۔ فیملی کلاس بندروں کی ایک تھی۔ پھر وہ Homosapien میں آیا۔ اس کی Origion of Species میں کھوج لگایا۔ مگر وہ بے بڑا جبریت پسند۔ اس کا کہنا ہے کہ فطرت میں ہر چیز متعینہ اصولوں کا نتیجہ ہے۔ فطرت میں کوئی چیز آزاد نہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں' جو کسی سبب اور نتیجہ کے دائرے سے آزاد ہو۔

نظریہ اضافیت کے مصنف عظیم سائنسدان آئن سٹائن نے بڑی خوبصورت بات کی ہے۔ ہر چیز متعین ہے Fixed اور Determined ہے۔ ایسی وقت کے ہاتھوں میں' جس پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ ایک ایسی قوت' جو کسی بھی پل اپنے نتائج کو اپنے بنائے ہوئے اصولوں کے تحت وقوع پذیر کر سکتی ہے۔ ایک کیڑے سے لے کر ایک ستارے تک سبھی جبریت کے اسیر ہیں۔ معمولی سی معمولی تخلیق سے لے کر اعلیٰ ترین تخلیق تک ایک ہی جبر کی تار سے بندھے ہوئے ہیں۔ انسان ہو' سبزہ زار یا کائنات کے ذرات کی دھول ہو۔ ایک نظر نہ آنے والے موسیقار کی دھنوں پر رقص کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں یہ Piper کون ہے؟ یہ کس کی صدا ہے' کس کی دھن ہے؟ اس طرح یہ کائنات بالا کا Piper ایسی دھن بکھیر رہا ہے کہ کل مخلوق اس کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ مگر اس جبریت میں اختیار موجود ہے کہ ہم بھی انہی دھنوں پر رقص کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

سگمنڈ فرائیڈ' جس کی دنیائے نفسیات میں ایک باپ کی حیثیت ہے' نے ایک بہت بڑے انسانی زندگی کے باب سے آغاز کیا اور لگتا یہ تھا کہ یہ جرأت آزمائی فکر' جو تمام پس ماندہ خیالات کو خیر باد کہتی ہے' شاید انسان کے اختیار کی نئی منزلوں کو روشناس کرتی ہے۔ شاید یہ مفکر ایسے نئے نتائج نکال رہا تھا' جس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ انسان ایک وسیع اور بالا کائنات ذہن کا مالک ہے اور اس کے اوپر کوئی حکمران نہیں ہے۔ مگر یہی فرائیڈ بڑی مجبوری سے کہتا ہے کہ ہم بھول

Marfat.com

جاتے ہیں کہ ہماری تمام زندگی اتفاقی اور حادثاتی ہے۔ وصال نطفہ سے لے کر انسانی وجود کے مکمل ہونے تک تمام زندگی اتفاقی ہے۔ اس میں چانس کے علاوہ کوئی عنصر ہمیں شامل نظر نہیں آتا۔ عقل' شعور اور تدبر کا کوئی عنصر اس میں دکھائی نہیں دیتا۔ انسان کا یہ مفکر' یہ نفسیات دان ایک بے بسی کا اظہار کر رہا ہے کہ اگر ہم میں کوئی بس ہوتا' تو ہم کلوننگ' جینٹک اور اتصال نطفہ' جو سیر مائے زون سے شروع ہوتا ہے' میں ردوبدل کر کے شاید حالاتِ انسان کو بدل سکتے۔ اس وقت کی سائنس کیونکہ فرائیڈ سے بہت آگے چلی گئی ہیں' اس تصور میں بہتری ممکن ہے۔ نئی سائنسز کے ذریعے انسان اب ایک حد تک دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نطفے کی حد تک دخل اندازی کے قابل ہو گیا ہوں۔ کلوننگ کے سائنس دانوں کی اپنی رائے ہے۔ وہ اپنے آپ کو فرائیڈ سے بھی زیادہ مجبور پاتے ہیں۔

جان ہاسپس کہتا ہے کہ ہمارے حالات و واقعات کچھ بھی ہوں اور آپ سے کوئی یہ کہے کہ مستقبل میں آپ کو کوئی مرض چھو لے گا' اس کا جواب آپ کیا دے سکتے ہیں؟ شاید کہیں' اللہ کی مرضی۔ شاید ایسا ہو' شاید ایسا نہ ہو۔ ہم جبر کرتے ہوئے اور دوسرے لوگوں پر ستم گری کی روایات قائم کرتے ہوئے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ شاید کل ایسا ہو۔ مگر جب ان سے ذاتی طور پر پوچھیں کہ یار تمہیں مستقبل میں بیماری لگ سکتی ہے؟ آپ کہیں گے کہ شاید ایسا ہو' شاید ایسا نہ ہو۔ یعنی مستقبل میں ایک خطرہ' ایک امکان اسی لیے ذہن انسان میں ہر حال میں موجود رہتا ہے کہ مستقبل کی غیر یقینیت ایک جبر ہے۔ مستقبل کا غیر یقینی ہونا ایک جبر ہے اور اس جبر مطلق سے کوئی انسان آزاد نہیں ہو سکتا۔ ہم کسی پامسٹ کی خدمات حاصل کر لیں۔ کسی ہندو پروہت یا ماہر نجوم کے چرن چھو رہے ہوں۔ اگر آپ کسی ایسے فرد سے سوال کریں' جو ان تمام قیاس آرائیوں اور ضعیف اعتقادیوں کو مانتا ہو۔ پھر وہ یہی کہے گا' مجھے یقین ہے کہ شاید ایسا ہو' شاید ایسا نہ ہو۔ اس شاید کے باوجود انسان ظلم و ستم' مکر و فریب اور ریا و کبر میں مصروف نظر آتا ہے۔ یہ اصول ہمارے ذہن سے چلا جاتا ہے کہ شاید ایسا نہ ہو اور ہر وہ چیز اور واقعہ' چند ایسے اصولوں پر منحصر ہے' جو مستقبل کو ناقابل اعتبار حالات و واقعات کے تسلسل میں سمو دیتا ہے اور اس میں کوئی استثنیٰ نہیں ہے۔

بیسویں صدی کا نامور مفکر لارڈ برٹرینڈ رسل بھی ان مجاہدان فکر میں سے ہے' جنہوں نے دنیا کو نئی جہت فکر دی۔ نامور ہوا۔ بڑے بڑے فلسفیاتی تصورات میں کمال حاصل کیا۔ ریاضیات کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ آئن سٹائن اس کا استاد تھا۔ جبر و قدر پر وہ رائے دیتا ہے' جو آپ بغیر فلسفی ہوتے ہوئے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تحصیل علم میں سب سے پہلے مجھے جس چیز کے بے حقیقت ہونے کا علم ہوا' وہ انسانی اختیار ہے۔ آزادیٔ ارادہ ہے' انتخاب ہے۔ تمام مادہ قوانین حرکت کا پابند ہے اور انسان کا ارادہ کسی قانون پر کوئی اثر نہیں لاتا۔ اگر پانی کا رو یہ ڈھلان کی طرف بہنے کا ہے' تو آپ ساری دنیا کے ارادے اکٹھے کر لیں' پانی نے اُدھر ہی جانا ہے۔ اگر کائناتِ خارجی میں ہم کسی چیز کو اپنی مرضی کے ڈھال نہیں سکتے' تو ہم بدقسمتوں کا اختیار کہاں موجود ہے۔ حتیٰ کہ جو کیچڑ کے چھینٹے اڑتے ہیں' وہ بھی ریاضیاتی قوانین کے تحت ہوتے ہیں۔ ان کا مختلف اطراف میں انتشار بھی ریاضیاتی قوانین کے تابع ہے۔ اب اس مکمل جبری حالت میں انسان بے چارہ کس اختیار کو چیلنج کرتا ہے۔ یہ تو بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہے۔ منہ سوج کے باہر آ جائے گا۔

شوپنہار کہتا ہے کہ انسان ارادہ کر لے تو وہ پورا کر لیتا ہے۔ مگر وہ اپنے ارادے میں آزاد نہیں ہے۔ میری زیادہ

Marfat.com

دلچسپی ان بڑے سائنس دانوں میں ہے' جنہوں نے حیرت انگیز علمی انقلاب برپا کئے۔ان میں وہ اپاہج اور مفلوج سٹیفن ہوپکنز بھی ہے' جسے خدا نے اعلیٰ ترین ذہنی مشقت کا صلہ یہ دیا کہ اس نے بلیک ہولز کے اصول دریافت کئے۔ سٹیفن کہتا ہے کہ جیسے اللہ نے کائنات کا بنیادی خاکہ بنایاهو الله الخالق البارى المصور (پ ۲۸'س الحشر'آیت ۲۴) یعنی وہ خالق تھا' باری تھا' مصور تھا۔ جیسے اللہ نے کائنات کا بنیادی خاکہ بنایا اور ایسے مضبوط اور منظم سائنسی اصولوں میں ترتیب دیا کہ لگتا ہے' یہ کائنات انہی ترقی پذیر اصولوں کے تحت ترقی کر رہی ہے اور اس میں کوئی مداخلت نہیں ہوسکتی۔

جبریت کی تعریف ان تعریفوں کے بعد یہ نکلتی ہے کہ یہ سب وجہ (Cause) اور نتیجہ (Effect) کا ایک سلسلہ ہے۔کائنات میں کوئی چیز بغیر کسی وجہ کے نہیں ہوتی۔ وجہ در وجہ کا سلسلہ پھیلتا جاتا ہے اور بالآخر یہ وجہ آخر تک پہنچتی ہے' جسے آپ کائنات یا اللہ کہتے ہیں۔ ہر چیز کی آپ وجہ ڈھونڈنا شروع کردیں تو سٹیفن ہاپکنز کہتا ہے کہ وجہ در وجہ کا سلسلہ اتنا مربوط نظام فکر ہے' جو اوپر سے اترا ہوا لگتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ ہم اپنے مقدر کے خود مالک ہیں۔ یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ ہمارے پاس آزاد مرضی ہے۔اس پیچیدہ آہنی نظام کے متعلق جیسے اللہ نے کہا ہے کہ میں نے یہ کائنات بنائی ہے۔اگر تم میں ہمت ہے' تو اس کے کناروں سے گزر جاؤ۔ اگر تمہیں دعویٰ خروش ہے کہ گنبد افلاک میں بڑا شوروغل کر سکتے ہو تو اقطار السموت سے گزر کے دکھاؤ۔ بنانے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے یہ نظام انسان کی استطاعت فکر' اس کے ذہنی ڈیٹا سے کہیں وسیع تر بنایا ہے۔ آپ اس سے باہر نہیں جاسکتے۔

ہوباخ (Hobach) ایک جرمن فلاسفر کہتا ہے کہ اپنے اختیار کو محسوس کرنا ایک فریب نظر ہے' سراب ہے۔ وہ ایک دلچسپ مثال سے سمجھاتا ہے کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک مکھی کار کے ہینڈل پر بیٹھی ہو اور وہ یہ دعویٰ شروع کردے کہ کار کے موڑ میں کاٹ رہی ہوں بجائے اس ہاتھ کے جو کار کا اسٹیرنگ موڑ رہا ہے۔ اسی طرح انسان بھی گمان رکھتا ہے کہ میں کارِ جہاں چلا رہا ہوں۔ جبکہ حالات و واقعات کے چلتے ہوئے چکر کے مضبوط پہیے میں بالآخر بڑے سے بڑا انسان پستا نظر آ رہا ہے۔ شاید ان کی قبروں کے نشان بھی مٹ گئے ہیں۔ جو لوگ نمرود' ہامان اور شداد کی طرح دعویٰ کرتے تھے کہ اس کائنات کے مالک ہم ہیں۔ ہم اسے چلاتے ہیں۔ ہم ہی اس کے سنوارنے والے ہیں۔

سپینوزا (Spinoza) اداس قسم کا فلاسفر ہے' جو مشکل سے کوئی خوشی کی بات سوچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جبر وقدر میں بھی کوئی تازگی کی بات نہیں بتائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ ذہن انسان میں کوئی چیز مکمل نہیں ہے۔ کوئی آزاد ارادے کے تابع نہیں۔ انسان کی ہر خواہش کے پیچھے کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اس وجہ کے پیچھے کوئی اور وجہ ہوتی ہے۔ پھر جاتے ہوئے یہ لامحدودیت کی طرف نکل جاتا ہے۔ وجوہات ہی نہیں گن سکتا۔ وجہ در وجہ یہ وجوہات کا سمندر اتنا بھر جاتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ہمارے پاس اتنا ڈیٹا نہیں ہے کہ ہم اس سفر کو مکمل کرسکیں۔ اتنی زندگی نہیں ہے کہ ہم وجوہات کے اس تسلسل کو جاری رکھ سکیں۔

والٹیئر (Voltaire) آزادی رائے کا مبلغ اور انقلابی' ہر چیز میں باغی ہے۔ کہتا ہے کہ ہر انسان اس نظام فکر کے خلاف بغاوت کر رہا ہے۔ مارکس بھی بغاوت کر رہا ہے۔ وجودی بھی روحانی تسلط کے خلاف بغاوت کر رہا ہے اور فلسفہ وجود کو آگے بڑھا رہا ہے۔ ہر چیز غیر متبدل قوانین کے تابع ہے۔ فرض کریں' کوئی کہتا ہے کہ نہیں ایسے نہیں ہے۔ کچھ لوگ اپنی

Marfat.com

آزادی رائے استعمال کر سکتے ہیں، تو کہتا ہے، کیا تم ایسے مانو گے کہ آدھی دنیا تو کسی نظام کے تحت چل رہی ہے، لیکن آدھی دنیا کسی نظام کے تحت نہیں چل رہی ہے۔ آدھی دنیا میں تو نظام جبر چل رہا ہے اور باقی آدھی دنیا میں نہیں چل رہا؟ مجھے قرآن کریم کی ایک خوبصورت آیت یاد آ گئی لو کان فیہما الہتہ الا اللہ لفسدتا (پ ۱۷، س الانبیاء، آیت ۲۲) اگر کائنات میں ایک خدا کے سوا کوئی اور بھی ہوتا، تو فساد ہو جاتا۔ یعنی اگر اس کائنات میں دو خدا ہوتے، تو فساد ہو جاتا۔ آدھی دنیا جبر اور آدھی دنیا اختیار کے تحت ہوتی۔ دنیا آپ کو کبھی اس طرح چلتی نظر نہ آتی۔ لفظ انسان ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے، جو طے شدہ حالات میں طے شدہ واقعات کو ظہور پذیر کرتا ہے۔

اب دو بڑے لوگ رہ گئے ہیں، جنہوں نے اس مسئلہ پر غور کیا۔ ایک نے کوانٹم کی تھیوری کے تحت بغاوت کا نظریہ دیا ہے۔ اس سے پہلے لیپالانس کا نظریہ جبریت آپ کو بتاؤں گا، جو میرے نزدیک اسلام کے بڑا قریب ہے۔ وہ کہتا ہے، جبریت صرف یہ ہے کہ ایک لمحہ زمانہ، ایک واقعہ دنیا سے منسلک ہے۔ زمان و مکاں کو جوڑنا ہی جبر ہے۔ اگر اللہ نے اس جبر کے تحت اس مکان کو اس زمانے میں نہ جوڑا ہو، تو پھر یہ تمام لوگ حادثاتی رخ کو اختیار کرتے۔ وہ کبھی بھی یہاں جمع ہونے کو نہ آتے۔ جبر کو جبار یعنی جوڑنے والے نے تمام انسانوں کی سہولت کے لیے زمان و مکاں کے دونوں یونٹوں کو ایک دوسرے میں مدغم کیا ہوا ہے۔ اسی لیے ٹرین اور جہاز کا ملنا ممکن ہے۔ سڑک پر چلنا ممکن ہے۔ نوکری ملنا ممکن ہے۔ یہ صرف اس جبر کے تحت ہے، ورنہ دنیا میں کوئی کام زمان و مکاں کے اختلاف سے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ناممکن بات ہے۔

کوانٹم کے نظریے کے خالق کا یہ کہنا ہے کہ جبریت کو کوانٹم نے توڑ دیا ہے۔ جب یہ دیکھا گیا کہ ایک الیکٹران کا رویہ مختص نہیں ہے۔ وہ لگے بندھے اصولوں کے تحت کام نہیں کرتا۔ غیر یقینی کیفیت اور خوف کے تحت کبھی کبھی ان ذرات کا عمل غیر یقینی ہو جاتا ہے۔ اگر یہ غیر یقینی ہونا موجود ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ کائنات میں سخت گیر قسم کی جبریت موجود نہیں ہے۔ اگر کوئی ذرہ اصل اور ایک بہت بڑے حاکمانہ تسلطی اصول کے خلاف بغاوت کر سکتا ہے، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جبریت مکمل نہیں ہے۔ کوئی گنجائش موجود ہے۔ مگر بدقسمتی دیکھیے کہ اس کا نقاد کہتا ہے کہ اللہ نے جبر کے بعد اتفاق اس لیے پیدا کیا کہ حضرت انسان تمہیں یہ گمان نہ گزرے کہ تو روبوٹ کی طرح ایک مشین ہے۔ تمہیں کبھی کبھی جان بوجھ کر تھوڑی سی آزادی بھی دے دی۔ بہت سارے اصول بنا کر تھوڑی سی بے اصولی چھوڑ دی کہ آدمی یہ نہ کہے کہ میں ہر وقت مکمل جبر و قدر کی قید میں ہوں، جس سے میری صلاحیت عمل دیگر باقی نہیں رہی ہے۔ اس میں کسی اور رخ کو اختیار کرنے کی صلاحیت زیرو نہ ہو جائے۔ اس لیے جبریت میں اتفاق کا عنصر تخلیق کر دیا۔

اب کمپیوٹر، سائنسز اور کوانٹم کے نظریے کی وجہ سے ہم واپس ماضی میں بھی جا سکتے ہیں۔ جتنا آپ مستقبل میں آگے بڑھتے ہیں، اتنا ہی آپ پچھلے وقت میں جا سکتے ہیں۔ جیسے ایک لڑکا ویڈیو گیم کھیل رہا ہے۔ اس کا انجام لکھا ہوا ہے، طے ہے۔ وہ اس انجام تک پہلی بار تو پہنچ جاتا ہے۔ اگلی بار اس کو خطرے کا احساس ہے کہ وہ گیند کو دوبارہ پلٹا کر اس خطرے سے بچ کر نکل جاتا ہے۔ انسانی ذہن پیچھے جا سکتا ہو اور اس خطرے کا احساس اس کے اندر موجود ہو، جو مستقبل میں پیش آ سکتا ہے، تو وہ جب دوبارہ حرکت کرے گا، تو وہ اس خطرے سے بچ کر نکل جائے گا۔ وقت سے واپس جانا ممکن ہے۔ اس سے جبریت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اس خطرے کا احساس، جس سے وہ گزر گیا ہے، اسے کون

Marfat.com

دے گا؟ اگر اس کو گیم کے عوامل اور نتائج کا علم ہے اور پتہ ہے کہ گیم کا یہ نتیجہ ہے اور یہاں یہاں خطرات ہیں' تبھی وہ واپس پلٹے گا۔ ورنہ تو وہ اسی طرح ہر قدم بڑھتا چلا جائے گا۔ اگر کوئی بچہ غلطی کرے اور آپ اس کو تھپڑ مار دیں یا منع کر دیں اور وہ منع ہو جائے' تو یہ اختیار کی ایک نوعیت ہوگی۔ اس لیے کہ اس سے پہلے آپ کو پتہ ہے کہ اس رستے پر چلنے کا خطرہ ہے۔ آپ اس خطرے سے بچے کو روکنے کے لیے تھوڑی سی سزا دے دیتے ہیں۔ بچہ اس خطرے کی طرف نہیں جاتا اور اس طرح اختیار کی وجہ سے اپنے آپ کو جبری انجام سے بچالیتا ہے۔

ایک اور مغربی تنکر' جس نے جبریت پر تھیوری دی۔ کہتا ہے کہ ماں باپ کے اختیارات کی وجہ سے بچے منافق' جھوٹے' بدکار اور پریشان حال ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے' کیوں ماں باپ جبریت پر یقین نہیں رکھتے۔ فرض کریں' ایک بچہ تعلیم پا رہا ہے اور وہ رزلٹ شو نہیں کر رہا ہوتا' جو ماں باپ نے اس کے لیے طے کر لیا ہوتا ہے' تو وہ بچوں کو زیادہ محنت کی تلقین کر کے' زیادہ نالائق کہہ کر' زیادہ جبر کر کے اس بچے کو ہمیشہ کے لیے ڈھیٹ اور شرمندہ کر دیتے ہیں۔ اس کی شخصیت کو قتل کر دیتے ہیں۔ جبر پر اگر والدین کا اعتبار ہو اور یہ جان لیں کہ بچے جو کچھ کر رہے ہیں' ان عوامل کے تحت کر رہے ہیں' جو ہم نے ان کو دیے ہیں اور وہ اسی حد اختیار تک جا سکتے ہیں' تو ان کے بچے کبھی نہ بگڑیں اور پوری دنیا غلطی سے پاک بن جائے۔ سائنس دان مشورہ دے رہا ہے کہ جبریت سے بہتر کوئی ایسا طریقہ نہیں' جسے تم اپنے گھروں میں استعمال کرو۔ اپنے جھوٹ' مکر وفریب' اپنی آرزوؤں اور خیالات کو بچوں پر مسلط نہ کرو۔ بلکہ بچوں کو ان کے عوامل کے تحت ترقی کرنے دو۔ اس سے آپ بھی خوش ہوں گے اور اگر وہ غلطی کرے گا' تو آپ کو دکھ نہیں ہوگا۔ بلکہ آپ کہیں گے کہ ٹھیک ہے' یہ اس لیے ہے کہ بچے کی زندگی بھی جبریت میں جکڑی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر پیٹر گل اسی مسئلے پر مسلسل غور وفکر کرتے چلے آئے ہیں اور انہوں نے والدین کو جبریت پر کافی قیمتی مشورے دیئے ہیں۔ یہ چند آرا مغربی مفکرین کی تھیں۔ اس میں میں نے ارسطو اور افلاطون کا حوالہ نہیں دیا۔ کیونکہ وہ کسی عملی صورت حال سے ڈیل نہیں کرتے۔ ان کی رائے ایسی ہے کہ کوئی عام آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا مقدر پر رائے دے سکتا ہے۔ اگر ہم چھ ارب انسان ہیں' تو ہماری اتنی ہی جبریت اور انتخاب پر آرا ہیں۔

Determinism, Predestined اور Fatalism جسے مقدر پرستی کہتے ہیں' میں تھوڑا سا فرق ہے۔ Determinism یہ کہتا ہے کہ پوری کی پوری کائنات اسباب اور نتائج کی زنجیر میں الجھی ہوئی ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے' جو کسی وجہ کا باعث نہ بنتی ہو اور تمام مقدر سبب اور نتیجہ کے باعث طے شدہ ہے۔ Fatalism ایسا نہیں سمجھتا۔ Fatalism یعنی مقدر پرستی میں اسباب ہیں۔ نہ ان کے نتائج۔ سینٹ آگسٹائن کے نظریات کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ خدا نے مقدرات تخلیق کیے۔ کچھ کے نصیب میں جنت لکھ دی' کچھ کے نصیب میں جہنم لکھ دی' بس ختم۔ کسی کو خالق کے ساتھ دلیل بازی کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ مقدر پرست بغیر سبب اور نتیجہ کے مقدر کو حتمی قرار دیتا ہے۔

Predestined یہ کہتے ہیں کہ مقدرات تو ہمارے ابتدائے حال سے لکھے جا چکے ہیں' مگر ان میں علت معلول موجود ہیں۔ پھر اس کے بعد مقاصد کی طرف بڑھتے ہوئے وجوہات تخلیق کی جاتی ہیں۔ یہ جبریت کی تعریف ہے۔ اختیار کا مطلب یہ ہے کہ ہم سبب اور نتیجہ کے سلسلے سے آزاد ہو کر اپنی ذہنی اور اخلاقی طاقت کے ساتھ کائنات میں اشیاء کے

Marfat.com

حالات پر تصرف کر سکتے ہیں۔ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے کے دعوے کر سکتے ہیں۔

بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

مسلمانوں میں جو مکاتیب فکر آئے' جیسے غلام احمد پرویز' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ یہ جبریت کو مانتے ہوئے ایک مخصوص فعالیت کے قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اختیارات کی ایک دنیا آباد ضرور ہے۔ مگر وہ کہیں کنفیوزڈ ہیں۔ مسلمان علماء میں سب سے پہلے خواجہ حسن بصری نے ایک خط کے ذریعے حضرت امام عالی مقام حسن بن علیؑ سے پوچھا' کیونکہ معتزلہ نے اس وقت انسانی اختیار کی ایک بحث چھیڑی ہوئی تھی کہ انسان صاحب اختیار ہے یا نہیں؟ کیا وہ عقل و شعور رکھتا ہے؟ وہ اپنی قسمت کا کہاں تک خالق ہے؟ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ کس حد تک جبریت اور کس حد تک اختیار ہے؟' حضرت حسنؑ نے کہا کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ مکمل مقتدر ہے اور یہ کہ اس نے کوئی گنجائش انسان کے اختیار کے لیے نہیں چھوڑی۔ انسانی گناہ کا سبب بھی وہی ہے اور خیر و شر کا سبب بھی وہی ہے۔ وہی شر کا خالق اور شر کے کرانے کا سبب بھی وہی ہے' تو اس سے تناقص ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی انسان یہ کہے کہ میں مکمل صاحب اختیار ہوں۔ میں حالات کی قدرت رکھتا ہوں اور اپنے لیے خود ذمہ دار ہوں تو دونوں غلط ہیں۔ بات ان کے مابین ہے۔ میں آپ کو اس کی مزید وضاحت دے بھی نہیں سکتا' کیونکہ اس کی مزید وضاحت حسن بن علیؑ نے نہیں کی۔

اب میں آپ کو تقدیر پر کچھ قرآنی آیات' جو میں نے منتخب کی ہیں' سناتا ہوں کہ جبر و قدر انصاف اور آزمائش و ابتلا کے محکمے پر محیط ہے۔ جبر و قدر تقدیر بھی ہے۔ ان تینوں کو ملا کے دیکھتے ہیں کہ جبر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے این ماتکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروجٍ مشیدة۔ وان تصبهم حسنة یقولوا هذه من عند الله و ان تصبهم سیئة یقولوا هذه من عندک قل کل من عند الله فمال هؤلاءِ القوم لا یکادون یفقهون حدیثا۔ ما اصابک من حسنة فمن الله وما اصابک من سیئة فمن نفسک وارسلنک للناس رسولا وکفی باالله شهیدا (پ ۵' س النساء' آیت ۷۸-۷۹) جہاد اور موت سے ڈرنے والوں کو کہا جا رہا ہے کہ تم کہیں رہو' تمہیں موت آ کے رہے گی۔ بڑے محلوں اور برجوں میں جا کر چھپ جاؤ۔ اپنی حفاظت کے لیے چاہے کتنے حصار بھی بنالو اور کتنے پہریدار بھی رکھ لو' مگر تمہیں موت وہاں سے بھی نکال لے گی۔ اگر ان لوگوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے' تو کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچتا ہے' تو کہتے ہیں کہ یہ مصیبت آپ کی طرف سے ہے۔ اگر آپؐ نہ ہوتے' تو ہمیں یہ مصیبت نہ پڑتی۔ سب رنج و راحت اللہ کی طرف سے ہے۔ آپ کی کیفیات کے دکھ سکھ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ مگر جب بات اعمال تک پہنچتی ہے' تو کہتا ہے کہ تمہارے نتائج کی ذمہ داری اچھی یا بری تمہارے نفس پر ہے۔ ہم نے آپ کو لوگوں کو ہدایت کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اور اس بات کا خدا ہی گواہ ہے۔ اللہ فرماتا ہے فالق الاصباح وجعل الیل سکنا والشمس والقمر حسبانا ذلک تقدیر العزیز العلیم (پ ۷' س الانعام' آیت ۹۶) صبح کو ابھارنے والا' رات اور دن کو بنانے والا' چاند اور سورج کو متعینہ حرکت دینے والا یہ اندازہ قدرت بے پناہ اس کریم' عزیز اور علم والے کا اندازہ ہے۔ ..

اللہ نے ہر دماغ کو ڈیٹا دیا اور یہ بات سمجھنے والی ہے کہ آپ کو کسی بحث سے کوئی نہ روکے گا۔ مگر زلیغ دلوں میں

Marfat.com

اس وقت پیدا ہوتا ہے' جب آپ کے ذہن اور انفارمیشن میں کوئی ڈیٹا مکمل نہ ہو اور آپ اس کی بحث چھیڑ دیں جبکہ اس کے حل کا ایک مناسب اطلاعاتی طریقہ بھی نہ ہو۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کنفیوژن اور الجھن میں پڑ جائیں گے۔ اللہ ایک نصیحت فرما رہا ہے۔ اے لوگو! جن آیات کی تمہیں سمجھ نہ آئے' ان پر فوری نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ ہر چیز کی تحقیق و جستجو ہی تمہیں اپنی منزل تک پہنچائے گی۔ بغیر علم اور تحقیق و جستجو کے میری آیات پر احمقانہ غور نہ کرو۔ بلکہ ان لوگوں کی طرح ہو جاؤ کہ جب ان کو کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی' تو وہ کہتے ہیں کہ یہ میرے اللہ کی طرف سے ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد باری ہے' ہم نے کوئی قوم تباہ نہیں کی' جب تک انہیں راہنمائی نہیں دے دی۔ ہم نے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا' جو اس قوم کی زبان میں نہ ہو۔

لوگوں کا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا ہندوؤں میں کوئی پیغمبر نہیں ہو سکتا؟ خدا کے قول کے مطابق ہمیں رام چندر اور کرشنا کا کردار ایک پیغمبر کا سا لگتا ہے۔ بدھا کا کردار بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ ہم واضح طور پر اس کو پیغمبر کہنے سے قاصر ہیں۔ ورنہ گیتا کے کچھ اسباق ایسے ہیں' جو قرآن مجید کی پیروی کرتے ہیں۔ ارجنا نے جب جنگ سے انکار کر دیا' تو کرشن نے اس سے کہا کہ مہاراج یہ بتاؤ' کس کے لیے لڑ رہے ہو؟ رشتوں' ناطوں' برادری' حکومت یا مال کے لیے؟ اگر ان چیزوں میں سے کسی چیز کے لیے لڑ رہے ہو' تو پلٹ جاؤ۔ یہ قتل و غارت ہے۔ اور اگر سچائی کے لیے لڑ رہے ہو' تو سچائی کسی کی رشتہ دار نہیں ہوتی۔ اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا۔ پھر صرف سچائی کے لیے لڑنا پڑتا ہے۔ میں صرف الابلسان قومه (پ ۱۳' س ابراہیم' آیت ۴) کی وضاحت کر رہا ہوں۔ چونکہ ہمارے علم و ادراک میں ان کے مناصب واضح نہیں ہیں۔ شاید ہم انہیں واضح طور پر پیغمبر کہنے کی جرأت اظہار نہ کر سکیں۔ مگر ہم جینا کو پیغمبر نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ جینا کی تھیوری میں مبالغہ ہے۔ وہ ننگے پاؤں اس لیے چلا کرتا تھا کہ اس کے پاؤں کے نیچے کوئی کیڑا مکوڑا نہ آ جائے۔ لیکن جہاں تک بدھا' راما' چندرا کا ان کی کہانیوں کے توسط سے تعلق ہے' تو یہ کہانیاں ان کے پیروکاروں نے گھڑی ہیں۔

اب پیروکار کس کی کہانیاں نہیں گھڑ لیتے۔ قرآن حکیم میں اللہ کہتا ہے کہ جب عیسیٰ کو امت پر گواہ بنا کے پیش کیا جائے گا' تو پوچھا جائے گا' اے عیسیٰ! آپ نے ان کو یہ کچھ کرنے کو کہا تھا؟ یہ ماں مریم آپ نے ان کو دی تھی؟ آپ نے روح القدس کا سراپا دیا تھا؟ تثلیث اور خدا کے بیٹے کا نظریہ دیا تھا؟ حضرت عیسیٰ اللہ سے عرض کریں گے۔ اے میرے مالک! میں جب تک ان میں رہا' میں نے ان کو وہی کچھ بتایا' جو تو نے مجھے بتایا تھا۔ اب جب میں ان میں نہیں رہا' پھر تو جانے اور یہ جانیں۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔

بہت سارے پیغمبروں کی زندگیاں بڑے ترپ افسانوں میں الجھی ہیں۔ ان میں پیغمبروں کا کوئی قصور نہیں۔ مثلاً جیسے حضرت داؤد کا اریاہ کی بیوی سے ناجائز رومانس یہودیوں نے بنا دیا۔ اسی طرح حضرت سلیمانؑ کے بارے میں بہت ساری باتیں پھیلائیں۔ مگر یہ جو کریکٹر اور کردار نظر آتا ہے' اس سے تو لگتا ہے کہ یہ لوگ پیغمبرانِ خدا میں سے ہے۔ مگر خدا جسے چاہتا ہے' گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے' ہدایت دے دیتا ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

سورۃ النحل میں فرمایا ان تحرص علی هدهم فا الله لا یهدی من یضل ومالهم من نصرین (پ ۱۴' س النحل' آیت ۳۷) اگر آپ ان کی ہدایت کی حرص کریں' تو بے شک اللہ نہیں دیتا' جسے گمراہ کرے۔ ان کا کوئی

Marfat.com

مددگار نہیں ہے۔ یہ اپنے رسول کو کہا جا رہا ہے کہ اگرچہ آپ کی کتنی بھی خواہش ہو کہ کچھ لوگ ایمان لے آئیں۔ اگر اللہ نہیں چاہے گا' تو ان کو ہدایت نہیں ہوگی۔ آپ کی خواہش کے باوجود یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ یہ ایمان لائیں۔

خود ہی پیغمبر بھیجا۔ قرآن اتارا۔ خود ہی لوگوں کی ہدایت اور بخشش کے لیے تبلیغ کا حکم دیا اور خود ہی فرما دیا کہ میری مرضی ہے۔ آپ جتنا زور لگا لیں' میں کچھ لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ بعض اوقات اللہ واقعی قادر مطلق نظر آتا ہے۔

فرمایا ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ویتبع کل شیطن مرید (پ ۱۷' س الحج' آیت ۳) بعض لوگ ایسے ہیں' جو خدا کی شان میں علم کے بغیر جھگڑتے ہیں اور سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ جس کے بارے میں کہہ دیا گیا ہے کہ جو اسے دوست رکھے گا' وہ اس کو گمراہ کرے گا۔ دوزخ کے عذاب کا راستہ دکھائے گا۔

تخلیق کائنات کی کچھ آیات پیش کرتا ہوں۔ قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ اندادا' ذالک رب العلمیں تم اس سے انکار کرتے ہو' جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا۔ تم بتوں کو اس کا مدمقابل بناتے ہو۔ وہ تو سارے جہان کا مالک ہے۔ یہ پتھر کے ٹکڑے اس کی خدائی میں کیا مداخلت کریں گے۔ اس نے زمین میں پہاڑ بنائے۔ زمین میں برکت رکھی۔ اس میں سامان معیشت مقرر کیا وبرک فیھا وقدر فیھا اقواتھا (پ ۲۴' س حم السجدہ' آیت ۹' ۱۰) ہم نے اس میں انسان کے لیے سامان معیشت رکھا الذی لہ ملک السموت والارض ولم یتخذ ولد ولم یکن لہ شریک فی الملک وخلق کل شیء فقدرہ تقدیرا وہی ہے' آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے۔ اس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا۔ اس کا بادشاہی میں کوئی شریک نہیں۔ جس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ اس کا اندازہ ٹھہرایا۔ اس کی مقدار اور اس کا وقت ٹھہرایا۔ انا کل شیء خلقنہ بقدر وما امرنا الا واحدۃ کلمح بالبصر (پ ۲۷' س القمر' آیت ۴۹' ۵۰) ہم نے ہر چیز اندازے سے مقرر کی۔ ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ہوتا ہے ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شیء قدرا (پ ۲۸' س الطلاق' آیت ۳) جو کوئی خدا سے ڈرے' وہ اس کے لیے رنج سے جان چھڑانے کا بندوبست کرتا ہے اور وہاں سے اسے رزق دیتا ہے' جہاں سے اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور جو کوئی خدا پر بھروسہ رکھے' وہ اس کی کفایت کرے گا۔

تقدیر پر کچھ آیات ہیں سبح اسم ربک الاعلی الذی خلق فسوی والذی قدر فھدی (پ ۳۰' س الاعلیٰ' آیت ۱' ۳) لوگو! اپنے رب کی تسبیح کرو۔ اس نے انسان کو بنایا۔ اس کے اعضاء کو درست کیا۔ اس کا اندازہ ٹھہرایا اور اس کو رستہ بتایا۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے' سب خدا کا ہے۔ تم اپنے دلوں کی بات ظاہر کر دیا چھپاؤ' خدا تم سے اس کا حساب لے گا۔ وہ جسے چاہے بخش دے' جسے چاہے عذاب دے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ کل نفس ذائقۃ الموت ہر بشر نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہم نے خیر و شر دونوں کو آزمائش بنایا۔ ولکل درجت مما عملوا ہر آدمی کے جیسے کام ہوں گے' اس کے مطابق درجے دیئے جائیں گے ولیوفیھم اعمالھم وھم لا یظلمون (پ ۲۶' س الاحقاف' آیت ۱۹) ان کو اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ کسی کا ذرہ بھی نقصان نہیں کیا جائے گا فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ (پ ۳۰' س الزلزال' آیت ۷' ۸) خیر و شر کے ایک ایک ذرے کا حساب لیا جائے

Marfat.com

گا۔ ارشاد باری ہے کہ اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا۔ لوگوں نے برے کام کئے۔ ان کو اعمال کا بدلہ برا دیا۔ جنہوں نے نیکی کی' ان کو نیک اجر دیا۔

جبر وقدر پر کچھ احادیث ہیں۔ انس بن مالکؓ نے حضورؐ سے روایت کی ہے۔ خدا رحم پر ایک فرشتہ مقرر کرتا ہے۔ جب بچہ چالیس دن کا ہوتا ہے' تو خدا سے فرشتہ پوچھتا ہے' پروردگار! یہ مرد ہوگا یا عورت؟ نیک بخت ہوگا یا بد بخت؟ اس کی روزی اور عمر کیا ہے؟ پھر جیسا حکم ہوتا ہے' بچہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے کہ ویسے ہی لکھ دیا جاتا ہے۔

حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے۔ وہ اللہ کے رسولؐ سے روایت کرتے ہیں کہ کیا (یا رسول اللہؐ) بہشتی اور دوزخی پہچانے جا چکے ہیں؟ فرمایا بے شک! ہاں ایسے ہی ہے۔ فرمایا' یا رسول اللہؐ! عمل کرنے والے عمل کیوں کرتے ہیں؟ بڑا جائز سا سوال تھا۔ فرمایا' جو جس کام کے لیے پیدا ہوا ہے' اس کی تقدیر میں اس کے موافق اعمال کرنے کی توفیق لکھ دی جاتی ہے۔ وہ چاہے نہ چاہے' کام اور انجام اس کے نصیب میں لکھا جا چکا ہوتا ہے۔

حضرت سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے۔ کسی نے حضور اکرمؐ سے سوال کیا کہ کافروں کے بچے کہاں جائیں گے؟ دوزخ میں یا جنت میں؟ فرمایا' اللہ خوب جانتا ہے' جو وہ بڑے ہو کر عمل کرتے۔ دوسری حدیث ابو ہریرہؓ سے مشرکوں کی اولاد کے بارے میں ہے۔ جواب وہی ہے کہ وہ خوب جانتا ہے' جو وہ عمل کرنے والے تھے یا کرتے۔

رسالت مآبؐ نے ایک مثال دی ہے کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے' وہ پیدائشی دین فطرت پر ہوتا ہے۔ ماں باپ پھر اسے یہودی یا نصرانی بناتے ہیں۔ جیسے تم اپنے جانور گائے' اونٹنی' بکری کو جنتے ہو۔ ان میں کوئی پیدائشی طور پر کان کٹا نہیں ہوتا۔ جب وہ بڑے ہوتے ہیں' تو تم کسی کے کان کاٹ دیتے ہو۔ کسی کے مہریں لگا دیتے ہو۔ تم اپنے جانوروں کی علامات خود مرتب کرتے ہو۔ اسی طرح ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر ماں باپ اسے جس قسم کی تعلیم دیتے ہیں' اس کے مطابق وہ ڈھل جاتا ہے۔

عورتوں کو سبق دیتے ہوئے رسولؐ نے فرمایا کہ کوئی عورت اپنی سوکن کی طلاق نہ مانگے کہ اس کو یہ گمان ہو کہ میرا رزق کم ہو جائے گا۔ وہ اپنے خاوند کے اثاثوں کی کلی مالک بن جائے گی۔ ایسا نہ کرو' کیونکہ تمہارا نصیب ہی تم تک پہنچے گا۔ چاہے' جو مرضی کرو' اس کے سوا تمہیں کچھ زائد نہ ملے گا۔ الٹا اس گناہ میں شریک ہو گی کہ تم نے اپنی کسی بہن کا زوال چاہا۔

آنحضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے بیٹے علی بن ابو العاصؓ دم توڑ رہے تھے' تو تیزی سے انہوں نے آنحضورؐ کی طرف دعا کے لیے بھیجا۔ آپؐ نے جواب دیا کہ اللہ ہی کا مال ہے' جو وہ لے لے' جو وہ عنایت فرمائے۔ ہر چیز کی ایک مدت مقرر ہے۔

ایک انصاری رسولؐ کے پاس آیا اور پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! ہمیں مال پسند ہے اور ہمیں باندیاں پسند ہیں؟ تو کیا ہم عزل کریں؟ فرمایا تم ایسے کرتے ہو' کچھ قباحت نہیں۔ مگر اگر تم ایسا نہ کرو' تو جس جان کو اللہ نے مقدر کر دیا ہے' وہ ضرور پیدا ہو گی۔ سراقہؓ بن مالک کہتے ہیں کہ حضورؐ زمین پر چھڑی مار رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا' تم میں سے ہر ایک شخص کا ٹھکانہ لکھ دیا گیا ہے' خواہ دوزخ میں ہو یا بہشت میں ہو۔ سراقہؓ نے پوچھا' یا رسول اللہؐ! کیا ہم تقدیر کے لکھے پر بھروسہ کر لیں اور محنت کرنا چھوڑ دیں؟ آپؐ نے فرمایا' نہیں عمل کئے جاؤ۔

Marfat.com

ایک دلچسپ اور بڑی سبق آموز حدیث ہے۔ اس میں ہمیں بڑے عجیب و غریب نتائج ملتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص بظاہر بڑا اسلام کا دعویٰ کرتا تھا۔ وہ جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے لڑا۔ بڑا جنگ و قتال کیا۔ لوگ حیران ہو گئے۔ جب وہ اس کی خبر حضورؐ کے پاس لے کر آئے' تو کہا' وہ تو مطلق جنتی ہے۔ اس نے تو اس طرح بے دریغ جنگ کی۔ فرمایا' وہ دوزخی ہے۔ شبہ سا ہوا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مسلمان بھی ہوا اور اتنی بے دریغ جنگ بھی لڑ رہا: وا اور حضورؐ کا فرمان ہے کہ وہ دوزخی ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیے۔ جب وہ جنگ میں بری طرح زخمی ہوا اور شکست کھا کے زخموں سے چور ہو کے گرا' تو اس کو درد کی برداشت نہ رہی۔ اس نے ایک تیر نکال کر اس کی نوک سینے کے بیچ رکھ دی۔ اس پر گر کر فوری طور پر مر گیا۔ خودکشی سے پہلے اللہ پر ایمان اٹھ جاتا ہے۔ اس کی رحمت سے انسان مکمل طور پر مایوس ہو جاتا ہے۔ رہے وہ لوگ اور اس کی مدد' تو رسولؐ نے فرمایا' بعض اوقات اللہ اپنے دین کی مدد کسی فاسق سے بھی کرا لیتا ہے۔

لوگ نذر سے تقدیر پلٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا' تقدیر نذر سے نہیں پلٹی' مگر اللہ کسی بخیل کا مال نکلوا دیتا ہے۔ ویسے تو اس نے نکالنا نہیں' جب اسے مصیبت آتی ہے' تو اسے کہا جاتا ہے کہ کوئی نذر دے دو' تب جان چھوٹے گی۔ اس طرح کوئی بخیل اپنا مال نذر سے کھو بیٹھتا ہے۔ شاید ہر نذر دینے والا بخیل نہ ہو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو اللہ کے رسولؐ نے ایک کلمہ بتایا' جو براہ راست تقدیر کے متعلق ہے۔ فرمایا' میں تمہیں ایک کلمہ بتاتا ہوں کہ بہشت کے خزانوں میں ایک خزانہ ہے اور وہ کلمہ تھا لا حول ولا قوت الا باللہ میری کوئی قوت نہ میرا کوئی ارادہ' جو کچھ ہے' میرے اللہ کا ہے۔ جب انسان اس قابل ہو جائے' تو اس کی زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ یہ وہ احادیث تھیں' جو بخاری اور مسلم میں مشترک ہیں۔

جبر و قدر کی جو باتیں میں نے کافی عرصہ غور و فکر کر کے سوچی ہیں' ان میں دو دارے ایسے ہیں کہ اگر انسان کا ان پر اختیار نہ ہو' تو بہت ساری آیاتِ قرآنی بے مصرف ہو جاتی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے یہ آیات کیوں لکھی ہیں؟ اس نظام میں کیا ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ جتنے پیٹرن بنتے اور جتنے حقائق ہمارے اردگرد گھومتے ہیں۔ تنگی و ترشی' عذاب و ثواب اور جہل و عقل کے' ان تمام نظامات میں ہم خدا کی ذمہ داری کا تعین کہاں ترک کرتے ہیں؟

جب کوئی باپ کسی بچے کو کسی دوسرے شہر بھیجتا ہے۔ جب کوئی حکومت کسی وفد یا جب کوئی جنرل کسی آرمی کو کہیں بھیجتا ہے۔ جگہ بھی پرائی ہو۔ انوکھی اور اجنبی ہو اور وہاں کے بارے میں پہلے سے کچھ پتہ بھی نہ ہو' تو پھر لازم ہے کہ اس کا بندوبست کر کے بھیجا جائے۔ جب اللہ نے انسان کو زمین پر خلیفتہ اللہ فی الارض بنا کر بھیجا تھا۔ اگر وہ جماعت انسانی کے ذمے دریافت رکھ دیتا۔ بے پناہ محنت سے رزق رکھ دیتا' لیکن رزق کے ذرائع نہ رکھتا۔ پیاس رکھ دیتا' پانی نہ رکھتا۔ آگ کی تلاش رکھتا' درخت نہ رکھتا۔ ایٹم بم کی ہوس دیتا' لیکن یورینیم نہ رکھتا' تو زمین کا مجموعی طور پر لائف پیٹرن وہ نہ ہوتا' جو ہے۔ جو چیز حضرت انسان کے مستقر کے لیے ضروری تھی' اس کا بندوبست کر دیا گیا۔ انتظامات اور بندوبست طے شدہ تھے۔ حضرت انسان کو اول و آخر پورا پیکج پچاس ہزار سال پہلے بنا کر دے دیا گیا۔

Marfat.com

پچاس ہزار سال پہلے ایک اور بھی بات ہوئی۔ اس سے پہلے بھی اللہ نے اپنے ذہن میں ایک خیال بنایا۔ وہ جاہلوں اور بے دماغوں کی عبادات سے تنگ تھا۔ روبوٹ جھک رہے تھے۔ ٹی ٹی کی آواز دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے یا اللہ یا اللہ۔ وہ اس یکسانیت کے انداز سے تنگ تھے۔ اسے لگتا تھا کہ یہ توہین خدائی ہو رہی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ میں وہ ذات گرامی ہوں هو الله الذى لا اله الا هو' عالم الغيب والشهادة هو الرحمن الرحيم' هو الله الذى لا اله الا هو الملك القدوس السلم المومن المهيمن العزيز الجبار المتكبر سبحان الله عما يشركون۔ هو الله الخالق البارى المصور له الا سماء الحسنىٰ' يسبح له ما فى السمٰوٰت والارض وهو العزيز الحكيم (پ ۲۸' س الحشر' آیت ۲۲' ۲۴) اس رب کو پہچانتا کون؟ اس عالم امر کے شہنشاہ کا وقار کون پورا کرتا۔ کنتم کنزا مخفیا میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ ما احببت ان اعرف میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں۔ کوئی واقعتاً میری تعریف کرے فخلقت خلق لیعرفونی میں نے مخلوق کو اپنے تعارف کے لیے پیدا کیا اور تعارف کے معیار رکھے۔ ایک تعارف کا معیار وہ ہے' جو جبلّی ہے اور ایک تعارف کا معیار عقلی اور عرفانی ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ خدا کو کون سا معیار پسند ہوگا! وہ سوچتے ہوئے' سمجھتے ہوئے اور غور وفکر کرتے ہوئے اللہ کو اللہ جانتا ہے۔ وہی خدا انسانوں میں بے عقلی اور غور وفکر نہ کرنے والوں پر اتنی سختی کرتا ہے کہ صاف صاف کہہ رہا ہے کہ میرے نزدیک یہ لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ وہ انسانوں سے کس معرفت خیال کی توقع کرتا ہے؟ پورا اختیار دو سوالوں پر مبنی ہے اور کسی چیز سے انسان کا تعلق نہیں ہے۔ رزق سے نہ بچوں سے۔ یہ تمام کام اللہ کے ہیں' جنہیں انسان اپنے سمجھتا ہے۔ جو چیز آپ کی نہیں' وہ آپ اپنی سمجھتے ہیں۔ جو چیز آپ کی ہے' اسے بھولے بیٹھے ہیں۔ یہ وہ بھول ہے' جو آپ کو بہت کاسٹ کرتی ہے۔ اس بھول کا عذاب جہنم ہے۔ جنت کا نقصان ہے۔ ابد کے مسائل ہیں۔ یہ بھول جو آپ اپنے کمپیوٹر کو تجویز نہیں کرتے' ایک نازک فرق کی حامل ہے۔ ایک انسٹرومنٹ آپ کو دیا گیا ہے۔

انسان خیالوں میں بھی آزاد نہیں وما تشآئون الا ان یشاء الله (پ ۲۹' س الدہر' آیت ۳۰) ابھی دماغ کی جتنی تحقیق ہو رہی ہے' اس میں یہ تحقیق ابھی مکمل نہیں ہوئی کہ خیال خارجی ہے یا اندرونی۔ مگر آپ دیکھئے کہ خدا خیال کے بارے میں کیا کہہ رہا ہے کہ دماغ ریسیو کرنے کا آلہ ہے۔ یہ تخلیق کا مرکز نہیں۔ ونفس وما سوبھا اور ہم نے نفس انسان کو درست کیا فالھمھا فجورھا وتقوٰبھا (پ ۳۰' س الشمس' آیت ۷' ۸) اس کو فسق وفجور بھی الہام کئے اور تقویٰ ونیکی بھی الہام کئے۔ اس کے بعد آپ کے پاس کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ آپ یہ کہیں کہ نیکی کا خیال میرا ہے اور بدی کا خیال میرا نہیں ہے۔ یہ تو دونوں باہر سے آ رہے ہیں۔ ان کی مثال کارڈیوگرافی کی سی ہے کہ جس دل میں دو لائنیں چل رہی ہیں۔ دماغ میں دو لائنیں چل رہی ہیں۔ ہر لائن کا مخرج جدا ہے۔ ہر لائن پر جدا جدا تعلیمات چل رہی ہیں۔ ایک آتش فکر کی لائن ہے۔ اس میں نقص الہام ہو رہا ہے۔ دوسری طرف خیر الہام ہو رہا ہے۔ دونوں ہی خارجی الہام ہیں۔ آپ کے پاس وصول کرنے والا جو آلہ ہے' وہ دماغ ہے' جس میں وصول کرنے کی استعداد ہے۔ جس میں Decoding اور Deciphering کی صلاحیت ہے۔ اتنی چھوٹی سی صلاحیت کہ اس سمندر خیال اور بہتی ہوئی رووں میں سے آپ نے ایک خیال کو پک کرنا ہوتا ہے۔ پل صراط تو آسمان پر لگی ہوئی ہے۔ مگر جو بال سے باریک تر پل صراط آپ کے ذہنی انتخاب

Marfat.com

میں سے گزرتا ہے' یہ اتنا باریک انتخاب ہے کہ شعلے کی لپک کی طرح ہے۔ اچانک ذہن سے گزرتا ہے۔ آپ پر ہے کہ کس خیال کو تھام لیا قد افلح من زکیھا وقد خاب من دسیھا (پ ۳۰' س الشمس' آیت ۹'۱۰) جس نے اچھے خیال کو چن لیا' وہ نجات پا گیا۔

اور نجات کیا ہے؟ کیا خداوند کریم نے علیت میں نجات رکھی ہے؟ علیت میں درجات ہیں' نجات نہیں۔ بڑا معمولی سا ایک کام ہے۔ میثاق کے دن ہر ایک نے اقرار ذاتِ خداوند کیا۔ پھر اللہ نے اس زبانی اقرار کو عملی کرنا چاہا۔ اس نے کہا' میرے سامنے تو سبھی اقرار کرتے ہیں۔ کس کو اللہ کے سامنے انکار کی جرأت ہو سکتی ہے! اس نے کہا' میں آزماؤں گا۔ مگر اس المیے کے تحت ہم اپنی مرضی سے نہیں آئے۔ اس نے ہمیں انتخابات' اشارات' کنایات اور معاون پیٹرن دے دیئے۔ اس معمولی سے سوال کے لیے' جو ہمارے ذہن کی دنیا کے اندر پیدا ہوتا ہے اور اس کے لیے قبر تک کی مہلت ملتی ہے۔ قبر میں پہنچ کر سوال پوچھا جاتا ہے من ربک؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک عالم سے بھی من ربک اور ایک جاہل سے بھی من ربک ایک دانشور سے اور ایک مزدور سے بھی یہی سوال۔ کیا مزدور گلہ نہ کرے گا کہ اللہ' اگر تو کسی یونیورسٹی کے اسکالر سے پوچھے' تو جائز ہے' مگر مجھ میں تو نے کیا ایسی علیت دیکھی کہ مجھ سے بھی یہی سوال پوچھ لیا' من ربک یہ ناانصافی لازم آتی ہے' مگر ایسا نہیں ہے۔ تمام انسانوں کو خواہ وہ چھوٹے یا بڑے ہوں' کم تر یا بہتر ہوں' کم علم والے یا زیادہ علم والے ہوں۔ انہیں اللہ نے اور کوئی صلاحیت دی ہو یا نہ دی ہو' ایک صلاحیت ضروری ہے کہ وہ بقدر ظرف اللہ کو مان سکتا ہے۔ یہ صلاحیت اگر نہ ہو' تو پھر سوال بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کی صلاحیت آپ میں نہ ہو' تو خدا ناانصاف ٹھہرتا ہے' مگر ایسا نہیں ہے۔

اس نے اس سوال سے تین اشخاص کو رہائی بخشی ہے۔ وہ بچہ جو نادان ہے۔ وہ مجنوں' جس کا دماغ خراب ہے اور جو مستقل سویا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کسی کو نجات نہیں بخشی ہے۔ جس کے ہوش و حواس اور اس کا شعور اس کی مدد کر رہا ہے۔ جو بازار میں جاتے ہوئے ایک صابن سے دوسرے صابن میں فرق کر سکتا ہے۔ ایک رنگ کے کپڑے کو دوسرے رنگ کے کپڑے سے جدا کر سکتا ہے اور جو اپنے مفادات کی خاطر بنیادی ذہانت کو استعمال کر سکتا ہے' اس کو اس زمین میں تمام اشارات مہیا ہیں۔ وہ پہچاننے کی کوشش کرے کہ اللہ ہے یا نہیں ہے۔

انسان کا سب سے پہلا اور آخری انتخاب علم و عقل اس کا وہ اختیار ہے کہ دنیا سے گزرتے ہوئے وہ یہ جاننا چاہے گا کہ تم اللہ کو مانتے ہو یا نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں۔ اس سے اعمال کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ اس پختگی ذہن یا کمزوری ذہن میں یکساں سوال آتا ہے کہ ہم نے باراتِ عقل کو کس روشنی سے سجانا ہے؟ اگر مقدرات ایسے ہیں کہ ان میں انسان کا کوئی اختیار نہیں' تو سب سے بے مصرف آیات آیاتِ آزمائش ہیں۔ خوانخواہ مجھے آزمایا جا رہا ہے۔ مقدر لکھ کے مارا جا رہا ہے۔ مجھے کس چیز سے آزمایا جا رہا ہے؟ یہ جو مجھے اذیت دی جا رہی ہے' یہ کس لیے ہے؟ جب نروس سسٹم ٹیسٹ کیا جاتا ہے' تو اسے پن چبھوئی جاتی ہے۔ وہ سکڑتا ہے۔ یہ نروس سسٹم کے کام کی نشانی ہے۔ یہ جو میرے نروس سسٹم کو ولنبلونکم بشی من الخوف والجوع سے مارا جا رہا ہے۔ اسے پن لگائی جا رہی ہے۔ بھوک' مال و دولت اور اولاد کے نقصان کی پن لگائی جا رہی ہے' یہ کس لیے ہے؟ کیا میں یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہوں واذا اصابتھم مصیبة

Marfat.com

(پ ۲ س البقرہ آیت ۱۵۵) اور جب تم تک مصیبت پہنچے تو تم صرف اتنا کہہ دو قالو انا اللہ و انا الیہ رٰجعون کیا داستان حیات بس اتنی سی ہے؟ ایک جگہ کہا گیا ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ اب دوسری جگہ پر ہے انا للہ و انا الیہ رٰجعون غور کیا جائے' تو ان آیات کا مخاطب کافر نہیں مسلمان ہے۔ مومن ہے۔ مقدرات مسلمان اور مومن کے لکھے جا رہے ہیں اور مسلم و مومن کو کہا جا رہا ہے کہ تم گمان کرتے ہو ہم تمہیں جنت ایسے ہی دے دیں گے' ہرگز نہیں۔

پھر جنت کیا ہے؟ غور کیجیے۔ یہ علت اور معلول سے رہائی ہے۔ جنت ایک استحکام ہے' جس میں کوئی وجہ شامل نہیں۔ جنت ایک امن ہے' جسے کوئی خواہش نہیں توڑ سکتی۔ جنت ایک مستقل ذہن کا استحکام ہے۔ ایک شعوری بلکہ ایسی شعوری گرفت ہے' جس میں کوئی وسوسہ' تخریب اور زلزلہ نہیں ہے۔ کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ جب آپ ایمان پختہ تک پہنچتے ہیں' تو آپ بھی کہہ سکتے ہیں لا ریب فیہ' ایک وہی بات جو اللہ کہہ رہا ہے۔ غور و فکر کے بعد جب آپ بھی یہ بات کہنے کے قابل ہو سکتے ہیں' تو پھر اختیار کی تمام آزمائشیں فضول ہو جاتی ہیں' اگر ہمیں اس کے رسپانس کا اختیار نہیں۔ ممکن ہے یہ اختیار بہت باریک ہو۔ مگر غور و فکر کی انتہا دیکھیں کہ ابراہیمؑ کس کے گھر پیدا ہوئے؟ نوحؑ کے گھر کون پیدا ہوا؟ آپ اسے مقدر کہتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ مقدر ہے کہ نوحؑ کے گھر میں کنعان پیدا ہوا اور ابراہیمؑ آذر کے گھر پیدا ہوئے۔ کیا اس کو تعلیم نوحؑ نہ ملی تھی؟ کیا ایک پیغمبر کا وجود مبارک اس کے سامنے نہ تھا؟ کیا ان کو بار بار خیر کی ہدایات نہ ملی ہوں گی؟ ان کی جبلی اقدار کا غلبہ انہیں اس طرف لے گیا۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ ایسے نہ ہوتا' تو ایسے ہوتا۔

ایک آدمی مر گیا۔ جنازہ پڑا ہوا ہے۔ یار دوست سرہانے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر مرحوم بس میں سوار نہ ہوتا' بلکہ رکشے پر سوار ہوتا' تو شاید بچ جاتا۔ کہیں اور بات چل رہی ہوگی کہ اگر مرحوم گھر بیوی سے نہ لڑ کر جاتا' تو بچ جاتا۔ حضورؐ نے فرمایا' یہ سب باتیں غلط ہیں۔ ہونا وہی تھا' جو کچھ ہوا۔ ہمارے ساتھ بھی وہی کچھ ہونا ہے اور ہوگا اور وہ ضرور ہوگا۔ مگر ہونے سے تو ہمارا جھگڑا ہی نہیں ہے۔ مقدر سے' ابدی پروٹوکول سے تو ہمارا اختلاف ہی نہیں ہے۔ پیدا ہوئے ہیں' تو مرنا ہی ہے۔ ہمارا تو اس صورتحال سے واسطہ ہے کہ اس عرصہ حیات اور دارالامتحان میں ہم اپنے انتخاب میں کیا سوال حل کر کے نکلتے ہیں۔ پاس ہوتے ہیں یا فیل ہوتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی اختیار نہیں۔ اس کے اوپر کوئی جبر نہیں ہے۔

جبر و قدر اور تقدیر

(علامہ ساجد میر) جبر و قدر اور تقدیر کے مسئلے کا تعلق ہمارے عقیدے سے بھی ہے اور ہمارے عمل سے بھی ہے۔ جو پہلو ہمارے عقیدے اور ہمارے علم سے متعلق ہے' وہ اللہ کے علم سے جڑا ہوا ہے اور جو پہلو ہمارے عمل سے متعلق ہے' وہ اس کے حکم سے جڑا ہوا ہے۔ تقدیر کی بنیاد جبر و قدر کے مسئلہ میں یہ ہے کہ اللہ کا علم کلی اور ہر شے کو محیط ہے۔ وہ ہر چیز جانتا ہے۔ یہاں سے ہم آغاز کرتے ہیں کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اگر ہم یہ سوچیں اور یہ کہیں کہ جو کل ہونے والا ہے' اسے وہ نہیں جانتا' تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اس کے کلی علم کی نفی کر رہے ہیں۔ اگر ہم اللہ کو علیم کل مانتے ہیں اور اس کے کلی علم کے قائل ہیں' تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ کل اور اس سے آگے اور بہت آگے جو واقعات ہونے والے ہیں۔ وہ جو ہو چکے اور وہ جو ہو رہے ہیں' سارے کے سارے اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے علم میں ہیں۔ یہ ہے جبر و قدر' یہ ہے

Marfat.com

تقدیر۔ لیکن تمہارے عمل کے ساتھ جو پہلو متعلق ہے' وہ یہ ہے کہ اس کا علم چونکہ ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ جب ہمیں اس کے حکم کا علم ہو جائے' تو ہمیں اس کے حکم پر چلنا ہے۔ علم اس کا اس کے پاس ہے۔ وہ اس کے پاس رہنے دیں۔ اس پر یقین اور عقیدہ رکھیں۔ عمل جو ہم نے کرنا ہے' وہ اس کے حکم پر کرنا ہے۔

یہاں اسی قسم کے کئی سوالات ہیں۔ جیسے اگر انسان کے تمام معاملات قبل از وقت متعین کر دیے جاتے ہیں' تو اعمال صالحہ اور اس پر اجر کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ پھر یہ کہ ہم ظلم و زیادتی پر احتجاج کیوں کرتے ہیں؟ ظالم کے خلاف صف آرا کیوں ہوتے ہیں؟ انسان کلی طور پر مختار ہے یا جزوی طور پر مختار؟ اسی قسم کے مختلف سوالات کئی اشکال میں سامنے آ رہے ہیں۔ بہت سی غلط فہمیاں شاید دور ہو جائیں' اگر ہم اللہ کے علم اور حکم میں تھوڑا سا فرق کریں۔

اللہ یہی چاہتا ہے کہ ہم نیکی کریں اور برائی نہ کریں۔ کون نیکی کرے گا؟ کتنی کرے گا؟ کون برائی کرے گا؟ کتنی کرے گا؟ یہ اس کے علم میں ہے۔ علم اس کے پاس ہے۔ ہمارا تعلق عملی دنیا میں اس کے حکم کے ساتھ ہے۔ ایک سادہ سی مثال ایسے ہے کہ ایک اچھا استاد بعض اوقات کلاس میں طالب علم کا کام دیکھ کر کہہ دیا کرتا ہے کہ تم پاس نہیں ہو گے اور ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ پاس نہیں ہوتا۔ یا ایک اچھا ڈاکٹر کہہ دیتا ہے کہ یہ مریض تین یا چھ ماہ تک ہے' پھر نہیں بچ سکتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے' کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ پیشن گوئی ہے۔ اس کی زندگی لمبی ہو جاتی ہے۔ اس کی بات صحیح نکل آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ استاد نے جان بوجھ کر اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے اسے فیل کیا یا پاس کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر نے اپنے علم اور دانست کے مطابق ایک جائزہ پیش کیا کہ یہ آدمی بچ نہیں سکتا۔

ان کا علم ناقص اور محدود ہے۔ اللہ کا علم کلی اور مقدم ہے اور ہر چیز پر محیط ہے۔ وہ جانتا ہے اور اس نے پہلے ہی سے اسے تحریری طور پر منضبط شکل میں کیا ہوا ہے کہ یہ ہونا ہے اور یہ نہیں ہونا ہے۔ لیکن ہمیں نہیں بتایا۔ ہمارا تعلق اس کے حکم کے ساتھ ہے اور ہم نے اس کے حکم پر عمل کرنا ہے۔ وہ جانتا ضرور ہے کہ ہم کتنا عمل کریں گے' کتنا نہیں کریں گے۔ لیکن یہ بات ہم اپنے اچھے اور برے عمل کے سلسلے میں اکثر تقدیر کو عذر کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو اس نے لکھ دیا' ہم نے یہ برائی کرنی ہے' تو پھر برائی کرنے میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ اگر ہم اچھائی کرتے ہیں' تو اس میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟

رزق یا دوسرے معاملات میں کوئی ایسا نہیں کہتا۔ جب ہم جانتے ہیں کہ اللہ رازق ہے۔ ہر جاندار کا رزق اس پر ہے۔ پھر ہم ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ کیوں نہیں جاتے کہ وہ خود ہی ہمارے منہ میں ڈالے اور ہمیں ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوئی ضرورت نہ پڑے۔ جب اچھائی اور اچھا عمل کرنے کی بات ہو' تو پھر ہم بہانہ سازی کرتے ہیں کہ تقدیر میں پہلے ہی جنت اور جہنم کے فیصلے ہو چکے ہیں۔ اس لیے آپ کیوں کہتے ہیں کہ اچھائی کرو اور برائی سے بچو۔ فائدہ کیا؟ ہوگا تو وہی' جو اللہ نے تقدیر میں لکھا ہے۔

اگر یہی ہمارا رویہ ہے' تو پھر تمام معاملات میں یہ رویہ کیوں نہیں ہوتا؟ رزق اور دنیا کے معاملات میں بھی ہم ایسا ہی نام نہاد توکل اور بھروسہ کر کے کیوں نہ بیٹھ جائیں اور کہیں کہ جو ہوگا' وہ ہوگا۔ ہم ہاتھ پاؤں نہ چلائیں۔ ہمارے لیے حکم یہ نہیں ہے کہ ہم نیکی کی طرف نہ جائیں۔ ہمارے لیے حکم یہ ہے کہ ہم نیکی کی طرف جائیں۔ نیکی کریں' قطع نظر اس

Marfat.com

کے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ہم نے بس اپنا کام کرنا ہے۔ اللہ کے علم پر باقی بات چھوڑ دینی چاہیے۔ اللہ نے انسان کو جزوی اختیار دے دیا۔ کلی اختیار اللہ کا ہے۔ لیکن اپنی مرضی سے اس نے اختیار کا ایک حصہ انسان کو بھی دیا ہے۔ جس قدر اختیار دیا ہے' اسی قدر اس سے سوال کیا جانا ہے۔ جس قدر اسے علم ہے' اسی قدر اس سے پوچھا جانا ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ افریقہ کے لوگ یا دور دراز کے لوگ جہاں اسلام کا پیغام نہیں پہنچا' ان کا کیا بنے گا؟ اس کا علماء نے مسئلہ تقدیر کی روشنی میں جواب دیا ہے کہ التھذیب علی قدر تبلیغ جتنی تبلیغ یا بات کسی تک پہنچی ہے' اتنا ہی اس سے سوال ہونا ہے۔ جتنا اسے علم ہے۔ جتنا اس تک دین پہنچا ہے' اُس کے مطابق اس سے پوچھا جانا ہے۔ اسی طرح جتنا اختیار ملا ہے' اتنا ہی اس سے سوال ہونا ہے۔

اس کی ایک سادہ سی مثال حضرت علیؓ کے کلام میں ملتی ہے۔ وہ تقدیر کے مسئلے پر بات کر رہے تھے۔ مسئلہ چونکہ مشکل ہے' سننے والے نے کہا کہ جی آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اللہ کا علم ہے اور اس نے اسے پہلے سے منضبط کیا ہوا ہے۔ اس کے مطابق ہوتا بھی ہے لیکن ہمیں تعلق اس کے حکم کے ساتھ رکھنا چاہیے۔ پھر یہ بات کہ اختیار کچھ ملا ہے اور کچھ نہیں ملا۔ جزوی ملا ہے' کلی نہیں ملا ہے اور یہ سب اختیار اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اپنی مرضی سے اس نے دیا ہے۔ عجیب باتیں ہیں' میری سمجھ میں نہیں آتیں۔

آپ نے فرمایا کہ اختیار اور اللہ کے علم کی بات تو اپنی جگہ پر ہے۔ اختیار کی بات میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں۔ آپ اپنا ایک پاؤں اٹھائیں۔ اس نے اٹھایا۔ اسے کہا کہ اسے ہوا میں رہنے دو اور دوسرا بھی اٹھاؤ۔ اس نے کہا' یہ تو میں نہیں کر سکتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ ایک پاؤں اٹھانے کا اختیار تجھے ملا ہے اور اسی پاؤں کے رکھنے کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے اسے اچھی جگہ رکھا۔ اچھے رستے پر رکھا یا غلط رستے پر رکھا۔

لا انتہا امکانات کا سیٹ

حضرت امام جعفر صادقؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا' اگر یہ میرے مقدر میں لکھا ہے' تو ہوگا اور اگر نہیں لکھا ہوا' تو یہ نہیں ہوگا' پھر ہم کس لیے کوشش کرتے ہیں؟ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اے نادان! تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ کوئی تیسری بات بھی لکھی ہوگی۔ جب کوشش کرے گا' تو پالے گا۔ نہیں کرے گا' تو نہیں پائے گا۔ حضرت امام نے مقدر کو ایک بڑی امکانی صورت کی طرح ہمارے سامنے ظاہر کیا۔ یہ کہنا کہ مقدر مقرر ہو چکا ہے' درست نہیں ہے۔ بلکہ ایک خیال کے مطابق باہر وقوعہ اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے' جب آپ کے خیالات یا ذہنی رویئے کسی صورتحال کے ساتھ مس کھاتے ہوں۔

کمپیوٹر کے حساب میں شطرنج کی سولہ مہریں ایک بلین سے زیادہ ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بہت سارے انسانوں میں مختلف النوع واقعات کی وقوع پذیری کے امکانات مجموعی طور پر کینگریز بن جاتی ہیں۔ کسی بھی زندگی میں ایک ہی قسم کی صورتحال' خیال' موڈ اور جذبات اعادہ نہیں کرتے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ لازم نفسیاتی قوانین کی طرح تبھی بنتے ہیں' جب خاص قسم کی صورتحال میں رویوں کا اظہار ایک جیسا ہو۔ لیکن کوئی آدمی اندرونی صورتحال کو نہیں جانتا کہ ٹھیک ایسا ہی ہوگا۔

سو مقدر کبھی بھی ایک یا دو امکانات کا نہیں' بلکہ لا انتہاء امکانات کا ایک سیٹ ہے' جو کسی بھی سوچ کے ساتھ بدل

Marfat.com

سکتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اچھا بھلا گھر جا رہا تھا۔ اس کا ادھر آنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ پتہ نہیں اسے کیا خیال آیا کہ ادھر آیا' گولی لگی اور وہ مر گیا۔ اب امکانات کے سیٹ میں اس کی اندرونی سوچ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن کوئی خیال اس کے ذہن میں آیا ہوگا' جس کے تحت وہ اپنی روٹین سے ہٹ کر ادھر آیا' اور اسے گولی لگ گئی۔

اسی طرح ہمارے ذہن میں جو خیال آتے ہیں' ان کا دوسرا فرد احاطہ نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر کسی شخص کے ذہن میں مندر کا خیال آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے' وہ مندر کے لیے نکلے اور مسجد پہنچ جائے۔ اس دوران ہر لحہ قابل تبدیل خیالات کا پراسیس امکان میں کوئی تبدیلی لا سکتا ہے۔ آپ اسے چاہیں یا نہ چاہیں' عین ممکن ہے' کوئی بندہ گھر سے نکلتا ہوا بازار پہنچ جائے اور بازار سے قبرستان پہنچ جائے۔ اتنے امکانات ہوتے ہیں کہ آپ مقدر کو استحکام نہیں کہہ سکتے۔ مقدر ہمیشہ سوچنے کے عمل میں پارے کی طرح بدلتی حالت کا نام ہے۔ خدا جانے کسی سوچ اور پراسیس کے ساتھ کسی صورتحال کو فکس کر رکھا ہے۔

مجموعی طور پر تمام اہل علم جبر کو مانتے ہیں' اختیار کو کم مانتے ہیں۔ جبر کو اس لیے نہیں مانتے کہ ہمیں اختیار حاصل نہیں ہے' بلکہ اس لیے کہ ہماری زندگی کے بیشتر مقاصد کا حصول ہمارے پاس نہیں ہے۔ جیسے ہمارے لیے سب سے بڑا جبر یہ ہے کہ ہم اپنے والدین کا انتخاب نہیں کرتے۔ مجھے کوئی یہ چوائس دے کر نہیں بھیجتا کہ میری یہ بہن اور یہ بھائی ہونا ہے یا یہ باپ ہونا ہے۔ میں نے غریب یا امیر گھر میں پیدا ہونا ہے۔ پندرہ بیس سال تک آپ کا کوئی مقدر نہیں۔ موت کے وقت بھی آپ کے لیے کوئی چوائس نہیں۔ لے دے کے بیچ میں دس پندرہ سال ایسے ہیں' جس میں لگتا ہے کہ میں مالک ہوں لیکن

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہاء کی خبر

بیچ میں آ کر دس پندرہ سالوں کے لیے معلوم ہوا کہ میں سوچ رکھتا ہوں۔ میں ایکٹنگ کر رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ کو بنانا فرض ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اگر آپ اس کو بھی توجہ سے مطالعہ کریں' تو وہاں پر ایک حدیث رسول' ناطق ہے کہ جب ہر چیز اور ہر لحہ' حیات اللہ نے ہمارے لیے رکھا ہے' تو پھر انسان کیا کرتا ہے؟ فرمایا' جب اللہ نے کسی سے کوئی کام لینا ہوتا ہے' تو اس کے مطابق اس کا ارادہ اور محرک پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اس شخص کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس مقصد کو حاصل کرے اور یہ کیسے ہوتا ہے؟

یہ اس طرح ہوتا ہے کہ پروردگار نے فرمایا مامن دآبة الاھواخذ بنا صیتھا ان ربی علی صراط مستقیم (پ ۱۲' س ہود' آیت ۵۶) اس کی ایک ذرا مختلف سی مثال ہے۔ فرض کیجیے' ہم اپنے کسی عزیز اور غیر محفوظ فرد کو کہیں دور بھیجنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی پتہ ہو کہ وہ اپنی حفاظت کے قابل نہیں ہے۔ اس کے پاس اسباب نہیں ہیں' تو ہماری زیادہ سے زیادہ کوشش یہ ہوگی کہ تمام اسباب مہیا کریں' جن کی اس کو کسی وقت مشکل میں ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ جیسے امریکہ نے الجزائر میں آرمی بھیجی' تو اس کی تعریف میں یہ کہا گیا کہ اس میں کپڑے سینے والی سوئی بھی شامل تھی۔ یعنی انسانوں کی ضروریات واشیاء کا لحاظ کرنا۔ خداوند کریم نے تمام وہ حالات' واقعات اور آثار وشواہد پیدا کر دیئے اور تمام اسباب متعین کر دیئے' جو انسان کو چاہئیں تھے اور جو نسل در نسل کسی وقت پیش آنے تھے۔ یہ کیوں کیا؟ اس کی ایک بہت بڑی وجہ تھی۔

اس کی وجہ اس کے اسی متعین کردہ اصول میں ہے کہ ہم نے انسان کو اس لیے نہیں بھیجا کہ یہ زمین پر جا کے

Marfat.com

کھائے' کمائے۔ بچے پیدا کرے اور ساری زندگی اس میں الجھا رہے۔ یہ بہت بڑی ناانصافی ہوگی کہ پروردگار قبر میں ان سے پوچھتا پھرے کہ بھائی میں کون ہوں؟ وہ بڑی آسانی سے جواب دے سکتے ہیں کہ اے مالک! ہمیں کیا ہوش آتا۔ تم نے ہم پر بچوں کی ذمہ داریاں ڈال دی تھیں۔ پیسے کمانے ہمارے ذمے تھے۔ کام ڈھونڈنا ہمارے ذمے تھا اور ہر ہر چیز کرنا تو ہمارے ذمے تھا۔ اور اگر ہم اس میں اس قدر مگن تھے تو آپ ہمیں کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس میں تمہیں بھی تلاش کرتے۔

ہم نے اپنے پروٹوکول کو اپنی ذمہ داری سمجھ رکھا ہے۔ قصور اُن کا نہیں ہمارا ہے۔ اللہ نے ہمیں یہ پروٹوکول عطا کیا ہوا ہے۔ وہ انسان جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی میں خود کماتے کھاتے ہیں' ان کی زندگیوں میں دو وقت ایسے گزرتے ہیں' جب وہ کما سکتے ہیں نہ کھا سکتے ہیں۔ ایک بچپن کا اور دوسرا موت کے قریب' جب ان میں نااہلیت پیدا ہوتی ہے۔ حضورؐ سے یہی سوال پوچھا گیا اور ان کا بعینہٖ یہی جواب تھا۔

محرکات جو انسان کے دماغ میں ہیں۔ جنہیں محرک قوت کہتے ہیں' وہ انسانی ذہن کے اگلے حصے میں اس ماتھے کے پیچھے' جو دماغ کا حصہ ہے' ہوتے ہیں۔ خداوند کریم نے فرمایا' زمین پر ایسا کوئی ذی حیات نہیں' جسے ہم نے اس کے ماتھے سے نہیں تھام رکھا۔ جب اس آیت کی وضاحت کی جائے گی' تو ماتھا بذات خود کچھ نہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ وہ حصہ' جو بنیادی محرکات کا مالک ہے' وہ انسانی ذہن اور وہ نروس سسٹم' جو انسانی افعال کی قدرت رکھتا ہے' اس پر ایک ریموٹ کنٹرول اللہ کا بھی ہے۔ کوئی ایسا ذی حیات نہیں ہے' جس پر اس کا ایک ریموٹ کنٹرول قائم نہیں ہے ورنہ کوئی حادثہ نہ ہو۔ کوئی کسی کو نہ کاٹ کھائے۔ کوئی سانپ نہ کاٹے۔ کوئی بکری سینگ نہ مارے۔ ہر چیز پر اس کا کنٹرول ہے۔ جو چیزیں اس طرح وقوع پذیر ہوتی ہیں' جیسے کہ وہ چاہتا ہے۔ اس میں کچھ عرصہ ایسا آتا ہے جب انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرے پاس بھی کوئی اختیار ہے اور میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔

حضور گرامی مرتبت کی حدیث مبارک نقل کرنے سے پہلے میں یہاں کردار نہیں' اسباب کی بات کر رہا ہوں۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ دو چیزوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرنے کی بجائے ان کا اکٹھا حوالہ دے دیا جاتا ہے۔ جہاں اسباب اور رزق یہ سارا کچھ کیا جاتا ہے' وہاں ساتھ انسان کی سوچ وفکر کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ یہ وہ واحد ایسی چیز ہے' جس پر اظہار کی آزادی اور حق انتخاب دیا گیا ہے۔ اسی سے تو سوال طلب کرنا تھا۔ باقی چیزیں بنی ہوئی تھیں۔ رسولؐ سے پوچھا گیا کہ یارسول اللہؐ اگر سب چیزیں اللہ نے ہی ہمارے مقدر میں لکھ رکھی ہیں' تو ہم کیا کرتے؟ فرمایا' جب اللہ نے کسی سے کوئی کام کرانا ہو' تو اس کے مطابق اس کے خیال اور اس کی قوت وارادہ کو مضبوط کر دیتا ہے اور وہ ایسا ہی کرتا ہے۔

جہاں تک جبر یا جسے جبریہ حالات کہتے ہیں' اس کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اس کی آڑ لے سکتا ہے۔ اگر میں اپنی دنیاوی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہوں' تو میں کیسے زمین پر تمہاری پہچان کے چیلنج کو قبول کر سکتا ہوں؟ اس لیے اللہ کہتا ہے کہ میں نے تمہارے ذمہ یہ کام سونپ دیا ہے کہ تمہیں میں نے عقل اور شعور دیا انا ھدینہ السبیل اما شاکراً واما کفوراً (پ ۲۹' س الدھر' آیت ۳) چاہو تو مجھے مانو' چاہو تو میرا انکار کر دو۔ پھر دوسری آیت میں فرمایا و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون ہم نے جن وانس کو صرف اور صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

نظر سے تقدیر میں ردوبدل

تفریق تب پیدا ہوتی ہے' جب آپ اس منطق یا اس سسٹم تک نہ پہنچیں جس کو خدا نے ترتیب دیا ہے۔ جب آپ اردو میں ذوقِ نظر استعمال کرتے ہیں' تو اس سے خالی دیکھنا مراد نہیں ہوتا۔ ذوقِ نظر یا نظر سے مراد پوری شخصیت کا وہ تاثر ہے' جو اس کی نظر میں چھلکتا ہے۔ نظر کے پیچھے وہ نزاکت ہے' جو علم وادب میں اسے نصیب ہے۔ اخلاق اور اعمالِ صالحہ ہیں' جو اسے نصیب ہیں۔ اور اگر کسی شخص کی زندگی ان اعمال کی طرف ان اعمال کی پیش رفت میں گزری ہے اور پھر وہ کسی شخص کو دیکھتا ہے' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نظر اتنی اخلاص' محبت اور رسوخ والی ہوگی کہ دوسرے میں ضرور رجحان کی تبدیلی لائے گی۔ اس سے زیادہ یہ کبھی بھی نہیں ہوا کہ کسی ولی اللہ نے کسی کو غور سے دیکھا ہو اور وہ ولی اللہ بن گیا ہو۔ کسی ولی اللہ کا نظر کردہ ایک دن میں ولی اللہ نہیں بن سکتا۔

سیدنا شیخ عبدالقادر کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ حضرت میں تو اس لیے آیا ہوں کہ آپ میرے لیے دعا کریں' میں قطب بن جاؤں۔ فرمایا' تو بن گیا۔ شیخ کہتے ہیں کہ رب کعبہ کی قسم میں نے اسے ننانوے سال کی عمر میں قطب دیکھا۔ جب وہ آیا تھا تو بے چارہ نوجوان تھا۔ ایسی دعا منگوا بیٹھا کہ پچاس سال مشقت میں گزرے۔ غوث پاک سے جو ڈاکو رستے میں ملے تھے' ان کی نظر سے وہ قطب نہیں بنا۔ حضرت کے اس لفظ نے اسے اتنا متاثر کیا کہ اس نے ڈاکہ چھوڑ دیا۔ ہدایت کے رستے پر چلا۔ پتہ نہیں' اس کے بعد کتنے سال لگے۔ اس کے بعد ہم نے اس کا ذکر نہیں سنا۔ اگر وہ اقطابِ عالم میں ہوتا' تو ہم اس کا ذکر سنتے ہیں۔ مگر یہ یقین ہے کہ اسے توبہ کی توفیق حاصل ہوئی۔ شاہ جیلانؒ کے صدق وصفاء کے صدقے میں اللہ نے اسے ہدایت کا رستہ دکھایا۔

نظر سے بندہ آگ بگولا تو ہو سکتا ہے۔ اس میں حسد تو پیدا ہو سکتا ہے' مگر صلاحیت علم وعرفان نہیں پیدا ہوتی۔ اس کے لیے اکتساب اپنی جگہ رہے گا۔ البتہ دعا کی حیثیت میں نظر کسی آدمی میں وہ جہاں پیدا کر سکتی ہے' جو آگے بڑھ کر اس کے تعلیمی اکتساب اور بالآخر اس کی ولایت الٰہیہ کا سبب بن جائے۔

یہ سوال کہ انسان کو اپنی دعا کی قبولیت کا احساس ہو سکتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ بات ہو سکتی ہے؟ جی ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کے ساتھ باتیں تو سارے کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہ اللہ جواب دینے پر مکلف ہو۔ باتیں تو ہم سارے کرتے ہیں۔ آپ جب چاہیں' بات کر سکتے ہیں۔ اللہ اس کو سن بھی لیتا ہے۔ خداوند کریم کہتا ہے کہ تم ایک' دو' تین یا چار ہو۔ زمین کی تہوں میں یا آسمان کی وسعتوں میں ہو' میں ہر جگہ تمہاری بات سنتا ہوں۔ جب اصحاب رسولؐ نے عرض کیا کہ اللہ کتنا قریب ہے؟ قرآن حکیم میں آیات اتریں کہ وہ بہت قریب ہے۔ ان ربی قریب مجیب (پ ١٢' س ہود' آیت ٦١) بے شک اللہ بہت قریب ہے۔ دعاؤں کو سننے والا ہے فلیستجیبولی ولیومنوبی (پ' س البقرہ' آیت) خدا کے لیے آپ کو کہیں سے بھی سننے کے لیے کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ تو نہیں پتہ کہ اللہ کے کان کتنے ہیں اور کتنے بڑے ہیں' لیکن اس کا جو سسٹم ہے' وہ ہر چھوٹی آواز کو سن لیتا ہے۔ اللہ تو زمین میں دانے کے پھٹنے کی آواز بھی سنتا ہے۔ آپ کی آواز تو بڑی اونچی ہوتی ہے۔

Marfat.com

مرضی کس حد تک آزاد

آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی آزاد مرضی بھی کسی نہ کسی قدرتی امر یا بیرونی یا خارجی دباؤ سے بنی ہوگی؟ بات یہ ہے کہ جب ہم جبریت اور انتخاب کی بات کرتے ہیں یا آزاد مرضی کی بات کرتے ہیں' تو ہمارا کہنا یہ ہوتا ہے کہ جو امر قائم ہو چکا ہے اور وہ امر' جس کے توڑنے کی آپ کوشش کر رہے ہیں' اس سے مراد یہ نہیں کہ آپ کی آزاد مرضی کسی جبریت سے بنی ہوئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو امر آپ کے ارد گرد سبب اور نتیجہ کی زنجیر سے بنا ہوا ہے' اس میں فری ول (Free Will) وہ ہے' جو اس امر کو اس مرتبے سے ہٹا کر اپنی خواہش کا قیدی یا اسیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تھوڑا سا لفظی ہیر پھیر ہے۔

مقدر' توکل' دعا

یہ تو پورا فلسفہ مذہب ہے۔ مقدر انسان کا پروٹوکول ہے۔ جب کسی اہم مہمان نے آنا ہو' تو اس کا پروٹوکول پہلے سے طے کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے جگہ کا تعین کیا جاتا ہے۔ ملنے والے ہاتھ گنے جاتے ہیں۔ مخصوص سٹیج بنائی جاتی ہے۔ لائنیں لگائی جاتی ہیں۔ کھانا کہاں کھانا ہے؟ رہنا کہاں ہے؟ کس کس' سے ملنا ہے؟ ہر چیز تفصیل کے ساتھ مرتب کی جاتی ہے۔ ایک معزز مہمان کے لیے پورا پورا پروٹوکول طے کیا جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ اس پروٹوکول میں کوئی تبدیلی آجائے یا کوئی گڑبڑ ہو جائے تو ایک جملہ بولا جاتا ہے Security Breach ہوگئی۔ اگر پروٹوکول میں ذرا سی گڑبڑ ہو جائے تو کہتے ہیں کہ سکیورٹی میں نقص آگیا ہے۔ یہ بڑا خطرناک عمل سمجھا جاتا ہے۔ معزز مہمان' جس کی حفاظت کے لیے یہ سارا پروٹوکول جاری ہے' کسی وقت بھی سکیورٹی کے نقص میں فنا فی اللہ ہو سکتے ہیں۔

اس چیز کا اطلاق خدا اور حضرت انسان پر کیجیے۔ انتہائی غیر محفوظ مادے سے بھرے غیر معقول حالات اور منفی اثرات کی حامل دنیا میں' مشکل حیاتیاتی بقاء کے نمبر میں انسان کو بھیجا گیا۔ ساتھ ہی اس کا عہدہ بھی اعلان کر دیا گیا واذ قال ربک للملٰٓئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ (پ ۱'س البقرۃ' آیت ۳۰) نہ صرف یہ کہا' بلکہ دوسری آیات میں فرمایا لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (پ ۳۰'س التین' آیت ۴) نہ صرف یہ کہا' بلکہ یہ بھی کہ اذ قلنا للملٰٓئکۃ اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس (پ ۱'س البقرۃ' آیت ۳۴) ہر حال میں انسان کو مکرم اور معزز ہستی کہا۔ غرض و غایت تخلیق انسان کو قرار دیا اور فرمایا گیا کہ اگر تم مجھ سے پوچھنا چاہو' تو میں نے انسان کو اپنے لیے پیدا کیا اور تمام مخلوقات کو انسان کے لیے پیدا کیا۔ اس کے بعد اپنی تعریف و توصیف کے لیے معزز ترین مہمان جو تخلیق کیا' وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

جب یہ اصول بنا دیئے گئے' تو پروٹوکول میں انسان سب سے اونچا ہو گیا۔ سب سے بلند مرتبہ کائنات کے پروٹوکول میں یہ ایک انسان تھا' جو جبرئیل سے معزز ہو گیا۔ باقی انسان اس مرتبہ و عزت تک نہ پہنچے تو جبرئیل ان سے معزز ہو گیا۔ جیسے کنگھی میں کنگھی پھنستی ہے' اب انسانوں کے رتبے ملائکہ بمقابلہ انسان اس طرح ہو گئے کہ کوئی انسان تقویٰ و طہارت میں کسی ملک سے بازی لے گیا اور کوئی ملک کسی کم درجہ انسان سے بازی لے گیا۔ ان میں آپس میں اس طرح رتبے بانٹ دیئے گئے۔ مگر ایک بات پکی رہی کہ انسان مسجود ملائک اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ یہی قابل عزیز و تعظیم

Marfat.com

ہے۔ بڑا معزز مہمان تھا۔ زمین کو اس کو پورا پورا پروٹوکول دیا گیا۔ ایک ایک چیز اس کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ اس کو تنگی نہ ہو۔ تکلیف نہ ہو۔ جانے سے پہلے رشتے ٹھہرا دیئے۔ زمین پر اس کے رزق و روزگار کی نسبتیں ٹھہرا دیں۔

اللہ کے نزدیک مقدر کے اپنے طریقے ہیں۔ مقدر دو نہیں' بلکہ تین طریقوں سے جاری ہوتا ہے۔ کسی انسان کو غربت کے طریقے سے گزارا جاتا ہے۔ کسی کو سہولت کے طریقے سے گزارا جاتا ہے اور کسی انسان کو اعتدال اور میزان سے گزارا جاتا ہے۔ مقدر انہی تین صورتوں کے بے شمار امکانات کا نام ہے۔ اعتدال' کثرت اور قلت۔ یہ تمام کے تمام اس لیے ہیں کہ حدیث رسولؐ کے مطابق بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کو غریب کر دیا جائے' تو وہ کافر ہو جائیں اور بعض کو امیر کر دیا جائے' تو وہ کافر ہو جائیں۔

یہ طریقے ہیں' مقدر نہیں ہے۔ یہ امتحان کے انداز ہیں۔ جس کو آپ مقدر کہتے ہیں' وہ اندازِ امتحان ہے۔ اس کے مختلف طریقوں سے گزار کر انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو پرکھا جاتا ہے۔ اس کو سخت طریقہ سے آزمایا جاتا ہے اور پھر دیکھا جاتا ہے کہ ان آزمائشوں سے گزر کر آیا وہ عقل کے بہترین استعمال کے ساتھ اس سوال کے جواب تک پہنچا کہ نہیں من ربک ومن نبیک۔

مقدر اور ہے اور انتخاب اور۔ چوائسز کے لیے صلاحیت دی اور شعور دیا ونفس وما سوىها فالهمها فجورها و تقوىها قد افلح من زكىها وقد خاب من دسىها (پ ۳۰' س الشمس' آیت ۷' ۱۰) یہ اور کام ہے۔ پروٹوکول کا اس کام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے انسان کا ان چیزوں میں کوئی دخل نہیں۔

جہاں تک دعا کا تعلق ہے' یہ مقدر کا ایک سیکشن ہے۔ کیونکہ ہر چیز میں اللہ نے استثنیٰ رکھ دی ہے۔ اس لیے مقدر کی استثنیٰ دعا ہے۔ دعا مقدر کو بدل سکتی ہے۔ ایک سیٹ پیٹرن جو کسی انسان کے لیے اتارا جاتا ہے' اس میں استثنیٰ دعا کے طور پر رکھ دی گئی ہے۔ دعا بلا اور قضا کو ٹال سکتی ہے۔ دعا کسی بڑی ناممکن بات کو تبدیل کر دے گی۔ مقدر یہ ہے کہ اولاد نہ ہو۔ تین سو برس کے زکریا کی اولاد نہ ہوئی۔ بظاہر یہ ناممکنات میں سے ہے۔ پھر بھی زکریا دعا کئے جا رہے ہیں کہ اے پروردگار! مجھے وارث آل داؤد دے۔ دعا اس مقدر میں ایک استثنیٰ پیدا کرتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اے زکریا! تجھے ایک بیٹا دیا جائے گا۔ اس کا نام یحییٰ ہوگا۔ اس سے پہلے یہ نام کسی نے رکھا نہ ہوگا۔

جب دعا کی قبولیت کی بشارت دے دی گئی' تو زکریا نے مقدر کی طرف اشارہ کر دیا کہ اے پروردگار! جو اصول زندگی ہے' اس کے مطابق تو میرے پاس وہ اہلیت ہی نہیں رہی۔ میری بیوی کے پاس بھی وہ اہلیت نہیں رہی۔ وہ آئے گا کہاں سے؟ کتنی عجیب سی بات ہے کہ پیغمبر اللہ سے سوال کئے جا رہا ہے۔ اگر یہ اتنا ہی ناممکن تھا' تو آپ دعا کیوں مانگے جا رہے تھے؟ اب دعا قبول ہوگئی ہے' تو آپ طریقہ کیوں پوچھے جا رہے ہیں؟ اللہ نے کہا' اے زکریا! بجائے یہ بات کرنے کے تو یہ کیوں نہیں کہتا؟ ان ربی یفعل مایشآءُ کہ میرا رب جو چاہے کر سکتا ہے۔ خدا نے زکریا کی دعا کو بطور استثنیٰ مقدر میں تبدیل کر دیا نہ صرف ان کے ساتھ' بلکہ کسی بھی انسان کی دعا سے اس کا اندازِ زندگی تبدیل ہو سکتا ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھیے کہ دعا سے تقدیر بدلنے کے کچھ مراحل ہیں۔ دعا کی قبولیت اللہ کے ہاتھ میں ایک استثنیٰ ہے۔ ایک پیغمبر کا یہ کہنا ہے ان ربی یفعل مایشاء کہ بے شک میرا رب جو چاہے کر سکتا ہے' تو پھر اس میں موت وحیات کی کوئی حتمیت نہیں رہتی۔

مگر ایک سوال ہے کہ جو اس نے نظام قائم کیا ہوا ہے' وہ اسے تبدیل کیوں کرے؟ تبدیلی کی ضرورت وہاں پیدا ہوتی ہے' جہاں انداز نظر ثانی کا محتاج ہو۔ اللہ کا کوئی فیصلہ نظر ثانی کا محتاج نہیں ہے مگر دعا ایک استثنیٰ ہے۔ اس آدمی کے لیے' جیسے حضور گرامی مرتبت کا قول مبارک ہے کہ خدمت خلق کو خدا کا انعام سمجھو۔ لوگوں کی تعریف خدا کا انعام ہے اور لوگ کسی شخص کی تعریف کیوں کریں گے؟ غور طلب بات ہے۔ اس کی درازی عمر کی دعا کیوں کریں؟ اس میں لوگوں کے اپنے خود غرضانہ رجحانات بھی شامل ہوتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ دکھ' اذیت' کرب و بلا میں وہ ایک ایسے سائے کی طرح ہیں' جس سے انہیں علوم شعور و ہدایت کا نور ملتا ہے۔ لوگ خدا سے ازراہِ خلوص یہ دعا کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ان کا سایہ ہم پر دراز یا زیادہ دیر رہے۔ چنانچہ پروردگار عالم کو کچھ تبدیلیاں اپنے شیڈول میں کرنا پڑتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں کرنے میں اسے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ موت و حیات زندگی جو کچھ بھی ہے' اللہ کی نظر میں بہت معمولی ہے۔ جب خدا اپنے استثنیٰ میں جاتا ہے' تو کوئی بھی چیز کسی وقت کسی امر میں کر سکتا ہے۔

گمراہی' ذمہ دار' ذمہ داری

یہ سوال بالآخر جبر و قدر کی انتہائی پیچیدگیوں پر جا کے ختم ہوتا ہے۔ مگر یہ خالق کے علم اور اس کے اصول علم کو علیحدہ علیحدہ کرتا ہے۔ پروردگار کسی بھی ہستی کا جاننے اور بنانے والا ہے۔ اس کی بناوٹ صلاحیت' اور اس کی استعداد کا علم اس کے پاس پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ مگر اس میں کمی وبیشی' کارکردگی اور تفکر سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اللہ کے نزدیک ایک فیصلہ حتمی ہے کہ اس نے کسی انسان کو گمراہ کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ یہ اس کی اس آیت کے خلاف ہے کہ میں نے تمام حیات کو پیدا کرنے سے پہلے اپنے اوپر خود لازم قرار دیا۔ وکتب علی نفسہ رحمتہ سب سے غالب اللہ کی بات ہمارے وجود اور خیال کے لیے اس کی رحمت ہے اور رحمت کبھی ہمارا عذاب نہیں چاہے گی۔ چونکہ خالق کو اچھی طرح علم ہے کہ اس نے کسی کے چپ میں کیا رکھا ہے' تو گمراہی کا فیصلہ وہ اپنے علم پر دیتا ہے اور علم پر فیصلہ دینے کے باوجود وہ اس کو گمراہ نہیں کر رہا ہوتا' جب تک اس کا مناسب مظاہرہ نہ ہو جائے اور وہ اصول علم کو تجربتاً ثابت نہ کر لے۔ جب تجربتاً ثابت کیا' تو دوسری آیت میں کہا کہ میں نے پوری پوری کوشش کی کہ کہیں سے اس کی مزید بچت اور نجات کا پہلو نکل آئے۔ مگر انہوں نے گمراہی کو اختیار کیا۔

سو علم اور تجربہ دونوں پر علیحدہ علیحدہ خلاق عالم کی اپروچ کی وجہ سے یہ دونوں آیات اتری ہیں۔ ان میں تضاد نہیں۔ بلکہ یہ باہم مربوط ہیں کہ علم تجربے کی شہادت دیتا ہے اور تجربہ علم کی شہادت دیتا ہے۔

قسمت اور تقدیر یکساں

قسمت تو بٹوارہ ہے۔ جیسے کہ اللہ کے رسولؐ نے کہا اللہ معطی و انا قاسم مگر تقدیر قسمت نہیں ہوتی۔ قاسم کے ہاتھوں اپنا اپنا مقسوم لوگ لے کر جاتے ہیں۔ مگر تقدیر کائناتِ اکبر میں بھی اٹل ہے اور کائناتِ اصغر میں بھی۔ یہ ربِ قدرت کا کرشمہ ہے۔ مثال کے طور پر میں آپ سے کہوں کہ کون سا ستارہ اللہ نے انسان کی تباہی کے لیے بنایا ہے؟ کیا یہ

Marfat.com

کائنات اللہ نے انسان کی تباہی کے لیے بنائی ہے؟ کیا یہ دن رات کا تغیر انسان کی بربادی کے لیے ہے؟ کیا سورج اور چاند کا طلوع ہونا اور ایک جگہ پر فکس ہونا انسان کی فطرت کے خلاف بنایا گیا ہے؟ کیا مائیکروکازم کائنات میں کوئی ایسی چیز موجود ہے کہ جس سے انسان کی بھلائی مقصود نہ ہو؟ کیا زمین پر ہوا کا وجود انسان کی مخالفت کرتا ہے؟ کیا زمین پر پانی کا وجود انسان کی زندگی کے لیے ضروری نہیں؟

اگر کائناتِ اکبر کی ہر چیز انسان کی بھلائی کے لیے ہے' تو کائناتِ اصغر کا مقدر بھی انسان کی بھلائی ہے۔ یہ ایک نظام ہے' جو انسان کو حتمی نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیتا ہے۔ قسمت اس نظام کے تحت آپ کا اپنا اپنا حصہ ہے۔ یہ انفرادی سطح پر لاگو ہوتی ہے۔ جب کہ تقدیر اس سسٹم کی گورنمنٹ ہے۔

جبر اور جزا و سزا

ناحق ہم مجبوروں پہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

باریک ترین فرق' جو ہمارے اختیار اور ہمارے انتخاب میں ہے۔ جو کچھ ہم پر بندشیں ہیں اور جس چیز کا ہمیں اختیار ہے' ہم اسے جبریت کے اختلاط سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ جس چیز کا ہمیں اختیار ہے' اسے ہم ایک میکانائزڈ جبر سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ یہی شاید ہماری سب سے بڑی خطا ہے۔ مثال کے طور پر کتاب آپ کے پاس موجود ہے' جس میں گناہ و ثواب کے سارے مدارج درج ہیں۔ اس کے بعد یہ بات کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ خدا نے یہ چاہا تھا کہ میں ایسا کروں۔ وہ کبھی ایسا نہیں چاہے گا۔ اس پر معاذ اللہ استغفر اللہ کسی قسم کی منافقت کا الزام نہیں۔ وہ مالک کائنات ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ مکمل اختیار رکھتا ہے۔ سو ہم یہ اللہ سے نہیں کہہ سکتے کہ تو کہتا یہ ہے اور چاہتا یہ ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص کسی گناہ کی کیفیت میں وارد ہوتا ہے یا کوئی غلطی اور حماقت کرتا ہے' تو اس کا یہ کہنا بجا نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ خدا اور پورے قرآن کے خلاف ہوگا کہ خدا مجھ سے یہ چاہتا ہے۔ کیونکہ جس چیز کا اس نے تحریری اور ریکارڈ آرڈر دیا۔ جس کے لیے اس نے کتاب نازل فرمائی' جو پوری کی پوری قرآن حکیم میں ہمارے سامنے ہے۔ جو اس کے احکام ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ خدا یہ چاہتا ہے' ہم قرآن کے خلاف کریں' تو میرا خیال یہ ہے کہ ایسا قطعاً ناممکن ہے۔ اللہ ایسا نہیں چاہتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ضمن میں خدا کس کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے؟ پروردگار بڑی عنایت سے فرماتا ہے کہ تمام نیکی میری طرف سے ہے اور تمام حماقت تمہاری طرف سے ہے۔ ایک سمجھدار آدمی کے طور پر مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ میں ایک نادان آدمی ہوں۔ پروردگار عالم نے جبر و قدر کو ایک سسٹم بنایا ہے۔ اس میں کسی قسم کے اختیاری اور انکاری پہلو نہیں ہیں۔ یہ تمام سسٹم اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ آپ کو مکمل تحفظ کے ماحول میں رکھ کر وہ آپ کو صرف ایک اختیار دیتا ہے۔ ونفس وما سوھا کہ ہم نے نفس انسان کو درست کیا فالھمھا فجورھا وتقوٰنھا ہم نے ہی اس کو فسق و فجور الہام کئے اور ہم نے ہی اس پر تقویٰ کے خیالات الہام کئے۔

پروردگار انسان کو اس منزل تک لے کر گیا ہے' جہاں اس کو خیالات کی آزادی بھی حاصل نہیں ہے۔ خدا یہاں

Marfat.com

یہ کہہ رہا ہے وما تشآنون الا ان یشآء اللہ تم چاہ بھی نہیں سکتے' اگر میں نہ چاہوں۔ میں ہی تم پر فسق و فجور الہام کرتا ہوں اور میں ہی تم پر خیر کے الہامات کرتا ہوں۔ مگر اس نے کہا قد افلح من زکیھا جس نے پھر اچھی چیزیں اچھے خیالات چنے' وہ نجات پا گیا و قد خاب من دسیھا جس نے برائی کو چنا' وہ خسارہ پا گیا یہ آپ کو خود طے کرنا ہے کہ ہماری چوائس کہاں ہے؟ ہماری چوائس ان کمنگ پراسیس میں نہیں ہے۔ ہماری چوائس شفٹنگ میں ہے۔ ہمارا اچھائیوں کے طے کرنے اور اپنے خسارے کو پورا کرنے میں ہے۔ جب آپ کو پتہ چل گیا کہ یہ میرا خیال ہے اور یہ اچھا خیال ہے' تو خدا کا کام مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے کو خدا سے شکوے کا کوئی حق نہیں' یا تو آپ کے تصور میں برائی یا کسی خیال کا ناقص تصور نہ ہوتا۔ جب آپ اپنی زبان مبارک سے یہ کہہ رہے ہوتے کہ یہ برا ہے' یہ اچھا ہے' پھر برائی کو چنتے ہیں' تو یہ پھر خدا پر نہیں' آپ پر منحصر ہے۔ سزا تو بے معنی سی چیز ہے۔

عذاب و ثواب کی کسی کیفیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے صاف کہا کہ جب تم کوئی غلطی یا خطا کرو گے' تو تمہاری کوئی نہ کوئی جہالت زیادہ خرچ ہو گی۔ تم خسارے میں چلے جاؤ گے۔ مگر کم از کم مسلمان یا خدا پر یقین رکھنے والے کو خدا نے کسی قیمت پر جہنم کا وعدہ نہیں دیا۔ سوائے ایک کے اور وہ میں آپ کو سنا دیتا ہوں قل یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم اے اللہ کے بندوں تم نے بڑا اسراف کیا۔ اپنے آپ کو بے جا خرچا۔ ایک بہت بڑا گناہ نہ کر بیٹھا لا تقنطوا من رحمت اللہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا یہ قانون ہے۔ بے شک تمہارا اللہ بغیر کسی تخصیص کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے انه هو الغفور الرحیم (پ ۲۴' س الزمر' آیت ۵۳) اتنے بڑے وعدے اور اتنی بڑی وعید کے بعد کسی بھی قیمت پر خدا کو یہ الزام دینا' یہ بندگی کی ناشکری ہے۔

عقل اور خدا کی مرضی

سستی اور عمل سے فرار کو ہم مذہب بنا لیتے ہیں یا اسے تصوف کہہ لیتے ہیں۔ ایک طرف پچھانا دوسری طرف بہانہ۔ تو آج کل معاشرے میں ڈپریشن کی طرف رجحان ہے۔ یہ اسی سوچ کی پیداوار ہے ورنہ جو پیدا ہوا' اس کی کہانی میں محنت کرنا ہمیشہ شامل ہوتا ہے۔ شعوری کاوش کرنا' کیریئر بنانا۔ مگر کیا آپ اسے بھی فرار کہیں گے کہ کوئی شخص پڑھ نہیں سکا؟ اس نے میٹرک نہیں کیا۔ دنیا کے طریقے میں لکھا گیا کہ اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کی۔ مثلاً اس نے میٹرک یا ایف اے نہیں کیا۔ وہ کلرک نہیں بنا۔ وہ ایک ریڑھا چلا رہا ہے اور بڑی مشقت اٹھا رہا ہے۔ اگر آپ پڑھے لکھے اور ان پڑھ کی مشقت کو دیکھیں' تو جوان پڑھ ہے' وہ اتنی مشقت اٹھا رہا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اسے زیادہ ریوارڈ ملے۔ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک آدمی ایم۔ اے' بی۔ اے کر کے آتا ہے۔ چار گھنٹے کلاسز میں ٹال ٹول کے آ جاتا ہے' تو اس کے پیچھے اس کی ان دنوں کی محنت ہوتی ہے' جب اس نے کام کیا ہوتا ہے۔ تو یہ کہا نہیں جا سکتا کہ نکھٹو کی بارات کیا ہے اور کام کرنے والے کی کیا بارات ہے۔

مگر ایک فرق ضرور ہے کہ فوائد کی نوعیت لوگوں کے علم میں نہیں ہوتی۔ اگر میں نے تعلیم حاصل کی ہے' تو مجھے یہ اچھی طرح جاننا چاہیے کہ میرا ریوارڈ کیا ہے؟ میرا ریوارڈ مال و دولت اور آسائش دینا نہیں ہے۔ میرا ریوارڈ ظاہر ہے' وہی

Marfat.com

ہے: جس کے لیے میں نے تعلیم حاصل کی اور وہ لڑکا جس نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ جاہل رہا۔ بے وقوف اور بے عمل رہا۔ اس کو قدرت نے موقع دیا۔ اس نے بہت مال و دولت کمائی۔ تو اس کو بھی ہم بے عمل اور ناقص اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ جو اس نے کیا' اس کا ریوارڈ اس کو ملا۔ وہ صرف مال و دولت کی توقع رکھ رہا تھا۔ لیکن پروفیسر صاحب پیسے کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ وہ تو اس کے برعکس عزت' احترام اور محبت کی خواہش کر رہے تھے اور وہ انہوں نے حاصل کی۔ لیکن انجام میں پروفیسر صاحب نے فیصلہ کیا کہ میں تو اس کے مقابلے میں غریب ہوں۔ تو کسی کی حالت پر خالص ججمنٹ دینی مناسب نہیں کہ کس نے کیا حاصل کیا اور کیا حاصل نہیں کیا۔

جبر' اختیار اور بے اختیاری

اختیار کے حوالے سے ہم نے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انسان بنیادی طور پر کس کام کے لیے زمین پر آیا؟ کیا کام کرنا تھا اور کیا کام کر رہا ہے؟ کیا زندگی کے باقی آثار و شواہد اس کے اپنے چوائسز ہیں؟ جب وہ خود سوچ رہا ہوتا ہے کہ میں سوچ رہا ہوں' تو کیا وہ خود سوچ رہا ہوتا ہے؟ کس حد تک اس کو آزادی حاصل ہے؟ یعنی اختیار حاصل ہے اور کس حد تک وہ مجبور ہے؟ یہ ایک بڑی سائنسی جبریت ہے' جو پوری کائنات میں جاری ہے۔

جبر کی اصل تعریف یہ نہیں ہے کہ کوئی چیز مقدر میں لکھی گئی ہو یا نہ لکھی گئی ہو۔ جبر کی نوعیت ہر چیز کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ جب آپ بین الکاسمیاتی جبر کی بات کرتے ہیں' تو اس میں ستاروں کا' چاند تاروں کا' ہر چیز کا اپنے مدار میں گھومنا شامل ہے۔ کل یجری الی اجل مسمی و سخر الشمس والقمر والنجوم مسخرت باامرہ تو یہ تسخیر اس جبر کے تحت ہے جیسے کہ پروردگار نے کہا کہ ہم نے ان کو مسخر کیا۔ اپنے دائرہ کار میں ڈالا۔ پھر ہم نے زمین و آسمان کو حکم دیا کہ یہ کام ہمارے حکم سے کرو' چاہو یا نہ چاہو۔ طوعاً و کرہاً۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جبر مطلق ہے کہ زمین و آسمان اور ستارے' جو بھی نظام چل رہا ہے' یہ اللہ کے حکم سے ایسے ہی چلے اور اس میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ آئے۔

ایک مقام پر قرآن حکیم میں اللہ فرماتا ہے کہ یہ نظام' جو میں نے چلایا ہے' ٹل نہیں سکتا۔ اگر یہ ٹل جائے' تو اس کو میرے سوا تھامنے والا بھی کوئی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام اور اس میں زندگی' جو ہمارے سر پر مسلط ہے' جو ہم خلاء میں دیکھتے ہیں' یہ نہایت متعین قوانین کی پابند ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر تبدیلی ہوگی' تو یہ اللہ کی مرضی سے ہوگی۔

ایک تبدیلی جو اس موضوع سے متعلق ہے' وہ یہ ہے کہ قیامت کسی ایک قانون میں تبدیلی ہے اور قیامت کے دن نظام شمسی کا ٹوٹنا پھوٹنا اس جبر مطلق کا ختم ہونا ہے۔ انسان کی زندگی پر اگر آپ غور کریں' تو یہ سراسر دونوں سطحوں پر جبر میں گھری ہوئی ہے۔ آپ کو کچھ پتہ نہیں کہ آپ کب مریں گے۔ کل کا آپ کو پتہ نہیں۔ یہ پیش گوئی ہے۔ عمومی زندگی کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ کب تک جاری رہے گی۔ ایک کینسر کے مریض کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ آج نہیں مرے گا۔ شاید دو سال بعد مرے۔ اس کے باوجود آپ ٹھیک یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ کب مرے گا۔

اسی طرح ابتدائے زندگی میں کوئی آدمی اپنا باپ نہیں چنتا۔ بہن بھائی نہیں چنتا۔ اگر آدمی کو چوائس دی جاتی' تو

شاید سارے کے سارے بل گیٹ کے گھر پیدا ہونا پسند کرتے۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ ہم پندرہ سولہ سال تک اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ اپنی سوچوں کو مرتب کر سکیں یا کوئی فیصلہ لے سکیں۔

اگر آپ زمین پر دیکھیں، تو ایک قسم کا خاکی جبر کسی اور چیز پر بھی قائم ہے۔ یہ بھی جبر مطلق ہے۔ مثال کے طور پر یہ حال ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ آپ ہیں۔ یہ ایک جگہ کو ایک وقت سے جوڑ دیا گیا ہے۔ زمانے کو مکاں میں جوڑ دیا گیا ہے۔ یہ دوسرا جبر مطلق ہے، جو کائنات میں جاری و ساری ہے کہ زمانے کے ایک لمحے کو ایک مکان میں قید کیا جاتا ہے یا جوڑا جاتا ہے۔ اس جبر کے بھی ہم اہل نہیں ہیں۔ ہم زمان و مکاں کو نہیں جوڑتے، بلکہ زمان و مکاں جڑے جڑائے اسی طرح آتے ہیں۔ کیونکہ ہم زمانے پر اختیار رکھتے ہیں نہ مکاں پر ہی اختیار رکھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا کام پیدا ہونا، بڑھنا، زندگی گزارنا اور مر جانا تھا یا وہ کسی خاص کام کے لیے بھیجا گیا تھا؟ اس کے لیے اس کے پاس کوئی چوائس تھا یا نہیں تھا؟ یا کہ ہم مکھیوں کی طرح خدا کے کھیل کود میں مارے جاتے ہیں۔ جیسے البرٹ کامیو کہتا ہے یا جیسے تمام وجودی فلاسفر کہتے ہیں۔ جیسے جبریت مطلق کے ایک فلاسفر کا قول ہے کہ ہماری کوئی چیز ہمارے بس میں نہیں ہے۔ مگر اگر کوئی چیز ہمارے بس میں نہیں ہے اور ہم نے کچھ کام کے لیے یہاں نہیں آنا تھا، تو کیا خدا کا اشتیاق صرف نسل انسان کو پیدا کرنا اور پروان چڑھانا اور مارنا تھا؟ کیا اس کا اس تمام پراسیس میں حقیقی مقصد محض انجوائے کرنا تھا؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا کنکشن ہے، جو بندے اور خدا کے درمیان زندگی کا باعث بنا؟ معمولات زندگی کا باعث بنا؟ دیکھنا یہ ہے کہ کیا انسان خدا کی ایک پیچ اور معمولی مخلوق کے طور پر سلوک کیا گیا ہے؟ جواب نہیں میں ہے۔ زمین کی مخلوقات کو دیکھتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ ہم ان سب سے برتر ہیں۔ کوئی انسان یہ گلہ نہیں کر سکتا کہ مجھے ایک پسماندہ اور گھٹیا مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس ہم اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں، ہم زمین پر ایک اعلیٰ ترین مخلوق ہیں۔

خدا سے دوبارہ رجوع کیا جائے اور دیکھا جائے کہ آسمانوں میں کون تھا؟ پتہ چلتا ہے کہ ہم آسمانوں میں بھی سب سے معزز مخلوق ہیں۔ اس لیے کہ ملائکہ نے ہمیں سجدہ کیا۔ ہمارے باپ آدم کو سجدہ کیا۔ حتیٰ کہ اس میں جبرئیل بھی شامل تھے۔ گویا ہم آسمانوں میں بھی اعلیٰ ترین مخلوق ہیں۔ خدا کا اس اعلیٰ ترین مخلوق کو پیدا کرنے کا مقصد اور مطلب، آزادی اور اس کا خیال کتنا تھا۔

اب یہ ایک اصول ہے کہ وزیر اعظم کسی طرف جاتا ہے، تو اس کا پروٹوکول مرتب ہوتا ہے۔ اس کے بیٹھنے اٹھنے اور تقریر کرنے کی جگہ سب مرتب ہوتی ہے۔ کن لوگوں نے ملنا ہے، کن لوگوں نے نہیں ملنا۔ ایک طرف اس کی سکیورٹی چیک ہوتی ہے، دوسری طرف اس کے روٹین کے معاملات چیک ہوتے ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ دو محافظ لگا دیئے ہیں۔ میں نے تمہیں شیاطین سے محافظت دی ہے۔ تمہیں ہر چیز سے بچا بچا کر رکھا ہے۔ ہم بہت اہم لوگ ہیں، کیونکہ زمین پر اللہ کے خلیفہ ہیں۔ ہم زمین پر اللہ کے بہت اہم مہمان ہیں۔ اب یہ مہمان روٹی کیا کھائے گا؟ کیا وہ اپنے لیے بیوی بچے خود چنے گا؟ بچے کتنے اور کیسے چاہے گا؟ اللہ کہتا ہے، یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ یہ

سب کچھ میں کرتا ہوں۔حضورؐ سے پوچھا گیا' اگر یہ سب کچھ اللہ ہی کر رہا ہوتا ہے۔ ہر چیز کا اس کا انتظام اور بندوبست ہے' تو ہم کیا کرتے ہیں؟ فرمایا تم کچھ بھی نہیں کرتے۔ اللہ نے جس شخص سے جو کام بھی لینا ہوتا ہے' اس کی قوت' ارادہ اور خیال کو مضبوط کر دیتا ہے۔ تم وہی کام کرتے ہو' جو تم سے اللہ نے لینا اور تم نے کرنا ہوتا ہے۔ تمہیں وزیراعظم بننا ہے' تو وہ تمہیں سیاست میں گھسیٹ دے گا۔ تم نے جرنیل بننا ہے' تو فوج میں بھیج دے گا۔ پولیس میں بھیج دے گا۔ تمہارے خیال میں وہ مضبوطی اور مجبوری پیدا کر دے گا' جس شے میں وہ تمہیں بھیجنا چاہے گا۔ ممکن ہے آپ ایکٹر یا ایکٹریس بن جائیں۔ جرنل یا سپاہی جو بھی حیثیت ہے۔

اس پر مابعدالطبیعات کی سطح پر جا کر یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ اللہ ہر چیز کرتا ہے' تو کیا کیا جائے؟ کون سی ایسی چیز ہمارے پاس ہے؟ کون سی چیز ایسی تجھے مرغوب تھی' جس کی خاطر تو نے ہمیں بھیجا' مصیبت میں ڈالا؟ مستقراً ومتاع الی حین (پ ا' س البقرۃ' آیت ۳۶) کہ تھوڑا سا زمین پر قرار پکڑو۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ اللہ کے پاس ملائکہ تھے۔ خوبصورت ترین مخلوق تھی۔ جنات تھے۔ شیاطین تھے اور جنت والی حوریں تھیں۔ ہر چیز اتنی خوبصورت تھی۔ اس نے کیوں زمین پر ایسی مخلوق پیدا کی؟ اس نے ہمیں کیوں پیدا کیا؟ جس کو وہ بار بار یاد کرتا ہے صلصال کالفخار (پ ۲۷' س الرحمٰن' آیت ۱۴) گلا سڑا ہوا کیڑا' جو ایک کھنکتے ہوئے گارے کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ کیوں؟

خدا کہتا ہے' میں نے مخلوق کو اپنے تعارف کے لیے پیدا کیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے' میں خدا سے سوال کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں' حق بھی رکھتا ہوں کہ اے اللہ میاں! کیا فرشتے اور باقی مخلوقات تیری پہچان کے لیے کافی نہیں تھی؟ مجھ سے کیا بیر تھا کہ تو نے مجھے پہچاننے کے لیے چن لیا۔ میں ہی کیوں؟ خداوند کریم فرماتے ہیں کہ بات یہ ہے کہ باقی مخلوق استعداد نہیں رکھتی تھی' جس سے وہ از خود شر اور اچھائی و برائی میں چناؤ کر سکتی ہے۔ یہ صرف تم میں ہے۔

ہم اسے کہتے ہیں' برائی کا بھی تو خالق ہے اور اچھائی کا بھی تو خالق ہے۔ ہم آزاد کہاں ہیں؟ وہ کہتا ہے' نہیں' ایک سوال میں تم آزاد ہو۔ وہ بڑی بڑی تخلیقات کا ذکر کرتا ہے۔ والشمس والضحھا والقمر اذا تلھا والنھار اذا جلھا والیل اذا یغشھا والسمآء ومابنھا والارض وماطحھا ونفس وما سوّٰھا (پ ۳۰' س الشمس' آیت ۱'۷) میں نے سورج بنایا' چاند بنایا' زمین کو پیدا کیا۔ میں نے بڑی بڑی عجیب تخلیقات کیں۔ اس کے بعد میں نے نفس انسان بنایا۔ والنفس وما سوّٰھا اس کے بعد فرمایا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا کہ دونوں لائنیں میں نے اس میں کراس کیں۔ آج کا ایک عجیب وغریب سائنسی کرشمہ دیکھیں کہ دونوں دولائنوں میں چل رہے ہوتے ہیں۔ منفی اور مثبت ونفس وما سوھا میں نے نفس انسان کو بیلنس کر دیا۔ بالکل برابر میں رکھ دیا۔ اسی طرح میں نے الہام کئے فالھمھا فجورھا وتقوٰھا خیال خیر بھی الہام کیا اور فسق وفجور بھی الہام کیا۔ تمہیں ایک ہلکا سا چناؤ دے دیا قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا ایک ہلکا سا انتخاب دیا' جس کا پریکٹیکل سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ ذہن سے پیدا ہوا سوال' یہ ذہن میں واردات ہوئی۔ ذہن سے آپ نے چنا کہ اچھا کیا ہے یا برا کیا ہے؟ جب آپ نے ذہن سے کیفیت خیر چنی' تو آپ کے لیے خیر کے امکانات کے در کھل گئے۔ جب آپ نے ذہن سے کیفیت شر چنی' تو آپ کے لیے وہ سیٹ کھل گئے۔ یہ چناؤ کی اہلیت اس زمین وآسمان میں اور کسی مخلوق کے پاس نہ تھی۔ یہ

ذہن کے چناؤ کی طاقت اس کے بنیادی تعقل سے پیدا ہوئی۔ اس کی قوت شعور سے پیدا ہوئی۔ یہ وہ قوت شعور تھی‘ جسے امانت کے طور پر اللہ نے انسان کو دیا۔ ان عرضنا الا مانة علی السموت والارض والجبال کہ میں نے اس امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کو پیش کیا۔ کوئی بھی نہیں اٹھا سکا۔ سب نے انکار کیا۔ سب ڈر گئے کیونکہ اس چوائس کے بدلے زحمت بڑی تھی۔ وحملہا الانسان انسان نے آگے بڑھ کر اسے اٹھالیا انه کان ظلوماً جهولا (پ ۲۲‘ س الاحزاب‘ آیت ۷۲) بڑا ظالم اور بڑا جاہل تھا۔ اس نے کام کو کمتر اور اپنے آپ کو برتر خیال کر لیا۔

کچھ عرصہ پہلے ہم پکے مسلمانوں کے گھر میں سوشلزم آیا۔ ہم نسلی مسلمان بڑے پکے اور کٹر جذباتی تھے۔ ایک سردار آیا۔ اس نے سوشلزم کا نعرہ لگایا اور دیکھتے ہی دیکھتے دو کروڑ مسلمان سوشلسٹ ہو گئے۔ اب میں آپ سے ایک سوال احتراماً کہوں کہ یہ پکے مسلمان‘ جو ماں باپ سے مسلمان تھے۔ جن کا خاندان اور معاشرہ مسلمان تھا۔ ان کے ہاں ایک نیا نظریہ آیا۔ جو ان کو بھا گیا‘ تو وہ اسلام کو چھوڑ کر ادھر چلے گئے۔ اسلام کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ محمدؐ رسول اللہ کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہا۔ خدا کو افیون کہا۔ یہ ساری چیزیں کہی گئیں۔ مسلمان کمیونسٹ اور سوشلسٹ ہو گیا۔

یہ آپ کی بات کا جواب ہے۔ انسان کسی معاشرے میں بھی پیدا ہو۔ کسی بھی سماجی سیٹ اپ میں خواہ ہندو کے گھر پیدا ہو۔ اگر اسے حقیقت اور سچائی کی تلاش ہے‘ تو وہ کہیں نہ کہیں اپنا انتخاب ضرور کرے گا۔ چاہے وہ مسلمان کے گھر پیدا ہو کر کمیونسٹ بن جائے۔ چاہے ہندو کے گھر پیدا ہو کر کے۔ ایل۔ گابا بن جائے۔ مسلمان ہو جائے۔ چاہے وہ کسی عیسائی کے گھر پیدا ہو کر ڈاکٹر فاطمہ بار کر بن جائے یا کسی تبت کے گھر لاما پیدا ہو کر مسلمان ہو جائے۔ جیسے آخری لاما ہو گیا تھا۔ اصل میں انتخاب لوگوں کے ساتھ ہے۔ یہ چوائسز سارے لوگوں کو دیئے جاتے ہیں۔ ان کی ذہانتیں اور ان کے شعور استعمال ہوتے ہیں اور اندھا دھند تقلید کرنے والا اللہ کو بالکل پسند نہیں ہے۔ بلکہ خدا تو اسے جانور کہتا ہے۔ چنانچہ اس نے انسان کو شعور دیا ہے‘ جو پوری طرح بروئے کار آتا ہے۔

آپ اپنی زندگی میں خدا کے اعتقاد کو سلامت رکھتے ہوئے ہزاروں انتخاب کرتے ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ ایک صابن کی ٹکیہ کا انتخاب بھی اسی شعور سے ہوتا ہے‘ جو اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ ایک لباس کے رنگ کا انتخاب بھی اسی شعور سے ہوتا ہے‘ جو اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ مگر یہ اس کی کمتر قدر ہے۔ آپ کبھی بھی یہ نہیں کہتے کہ اللہ نے میرے لیے یہ چنا‘ وہ چنا۔ آپ ہمیشہ اپنے انتخاب اور فیصلے کے لیے اقدام کرتے ہیں اور آپ یہ کبھی نہیں کہتے کہ میرے پاس یہ چوائس کی پاور نہیں ہے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ میں نے اپنے ایک خوبصورت دوست کے ساتھ ایک معمولی سی شکل کی خاتون دیکھی‘ تو میں نے کہا کہ شادی تو اچھی کرنی تھی۔ اس نے کہا، یہ میرا انتخاب ہے‘ آپ کون ہوتے ہیں؟ میں نے ایک جگہ سے گزرتے ہوئے ایک مرد اور عورت کو دیکھا۔ ایک انتہائی خوبصورت خاتون تھی‘ جبکہ مرد اس کے برعکس تھا۔ وہی Beauty and Beast والا معاملہ تھا۔ میں بڑا حیران ہوا اور کہا اے پروردگار! تو نے اگر انسان کو انتخاب نہ دیا ہوتا‘ تو جمالیات کے معیار کتنے عجیب وغریب ہوتے۔ 99.99 فیصد تو جمالیات کے ان معیار تک کبھی پہنچتے ہی نہیں۔ مگر جب ہم چھوٹی چھوٹی ہنگامی ضرورتوں کے کمپلیکسز کے تحت چوائسز استعمال کرتے ہیں‘ تو وہ ہمارے زندگی کے انداز متعین کرتے ہیں۔

ہم سب آزاد ہیں۔ ہماری عادات ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ مجموعی طور پر کسی اشتراک عمل پر ممکن ہے‘

عادات مل جائیں۔ نماز پڑھنے میں روزہ رکھنے میں مل جائیں۔ کیونکہ ہم تمام اللہ کو ماننے والے ہیں۔ لیکن کبھی آپ نے جماعت والوں کو دیکھا کہ تمام ایک سی شکل' ایک سے انداز' ایک سی عادتیں' ایک سوچ اور ایک فکر ہوتی ہے۔ یہ مذہب تو نہیں چن رہے ہوتے' کبھی نہیں۔ بلکہ اپنی عادات کے مطابق ایک پیٹرن چن رہے ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا' یہ سب ایک انداز ے کے لوگ ہوتے ہیں۔ لوگ مذہب کو بھی اپنی عادات وخصائل کے مطابق چنتے ہیں۔ جبکہ اللہ کو چننے والے اپنی کسی عادت سے واقف نہیں ہوتے۔ کیونکہ ان کی ہر دوسری عادت کا اللہ مخالف ہے۔

جس نے خدا کا انتخاب کیا' وہ آزاد اور معتدل ہے۔ اس کو ہر صورت اپنی عادات سے گزرنا ہوتا ہے اور اللہ کی صفات اپنانی ہوتی ہیں۔ اس لیے جبر وقدر کے مسئلے میں آپ کی ذرا سی خواہش آپ کی زندگی کی پورے اقدار بدل سکتی ہے۔ اگر آپ اللہ کے واقعی طلبگار ہیں۔ چاہے آپ کسی ہندو کے بیٹے ہیں یا عیسائی یا کسی مسلمان کے بیٹے ہیں' تو اس کے لیے ہمیشہ اللہ تک پہنچنے کا چانس موجود ہے۔ لیکن اگر آپ کو دلچسپی نہیں ہے۔ خواہ آپ ہندو ہوں یا مسلمان' کمپیوٹر کمپیوٹر نکال رہا ہوتا ہے۔ ہندو کا بیٹا ہندو' مسلمان کا مسلمان' کافر کا کافر اور مشرک کا مشرک۔ کمپیوٹر سے کمپیوٹر نکل رہا ہوتا ہے۔ ایک چھپا لو دوسرا نکال لو۔ ہم مسلمان اتنے کاہل اور منافق ہو گئے ہیں کہ ایک مسلم چھپاؤ' دوسرا نکال لو۔ عادات وخصائل معاشرے سے پک کی جاتی ہیں۔

مگر جب کسی کا چوائس اللہ ہو جائے' تو اس کی عادات وخصلت بدل جاتی ہے۔ زمین پر ہم اسی کے لیے آئے ہیں۔ یہی ہمارا قانون ہے اور ہم نے اسی کو جانا ہے۔ مقصد دور ہو جائے اور ترجیح اول مس ہو جائے' تو ہم کم تر ترجیح میں جبر وقدر کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ ترجیح اول اسی لیے ہے کہ وہ ہمیں جبر مطلق سے آزادی دیتی ہے۔ اللہ کا ساتھ اسی لیے ہے کہ ہم زندگی کی جبری حدود سے ان بندوں کی حدود میں شامل ہو جائیں' اللہ جن کا ہاتھ اور جن کا پاؤں بن جاتا ہے۔ جن کی زبان بن جاتا ہے۔ خدا جن کا اختیار مطلق بن جاتا ہے۔ وہی قادر ہوتے ہیں' جو اللہ کے بندے ہیں۔ چاہے وہ عبدالقادر کیوں نہ ہوں۔

عمرؓ کے لیے دعا کی قبولیت

حضرت بلالؓ حبشی اور حضرت عمر بن خطابؓ اکٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت بلالؓ کو غلام زادے کہہ دیا۔ حضرت بلالؓ نے جا کر آنحضورؐ سے شکایت کی کہ مجھے حضرت عمرؓ نے غلام زادہ کہا۔ حضورؐ نے خاموشی برتی اور صرف اتنا کہا کہ عمرؓ ابھی تم میں جاہلیت کا تعصب نہیں گیا۔ عمرؓ روتے ہوئے آئے۔ اپنا رخسار زمین پر رکھا۔ بلالؓ کا پاؤں اوپر رکھا اور کہا اے غلام زادے! ذلیل کر اس شریف انسان کو۔ ذلیل کر اس شریف کی اولاد کو۔ عمرؓ کی ججمنٹ اور اس کا پلٹنا ایسے ہی تھا۔

اب ذرا عمر بن ہشام کی بات سنیں۔ ابو جہل موت کے وقت بدر کے میدان میں معوذؓ اور معاذؓ کے ہاتھوں زخمی پڑا تھا۔ ایک انصاری اس کی گردن کاٹنے کے لیے بڑھا' تو اس نے کہا کہ تو کن لوگوں میں سے ہے؟ اس نے کہا' میں انصار میں سے ہوں۔ اس نے کہا' وائے مرگ! سردارِ قریش کو چرواہے کے ہاتھوں سے مروایا۔ اے ساربان زادے! میری گردن کو ذرا اونچا کاٹنا' تا کہ نیزے پر چڑھے' تو سردار قریش کا سر لگے۔ وہ بھی سردار قریش تھا۔ اس کا پلٹنا دیکھئے اور اس سردار قریش کی ضد دیکھئے۔

Marfat.com

مقام وسیلہ

وسیلہ کیا ہے؟ ملک کے مختلف طبقات کے درمیان جاری بحث کے کینوس کو دیکھیں، تو پتہ چلتا ہے کہ وسیلہ زیادہ سے زیادہ ایک ڈیپارٹمنٹل حدود میں رکھا گیا ہے اور اس قسم کے سوال تک ایک دوسرے سے الجھا گیا ہے کہ آیا کسی پیر فقیر سے دعا کرانا جائز ہے یا ناجائز؟ مقام وسیلہ کا یہ مطلب بجا نہیں ہے۔ مابعد الطبیات کی سطح پر ہم پروردگار عالم کی کسی بات کو اتنا حقیر کیوں جانیں کہ اسے چھوٹے چھوٹے مسائل میں چھیڑ کر اور اپنی چھوٹی سی حدود عقل میں سیٹ کر کے ان پر رائے زنی کریں۔ ہمیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ وسیلے کا خالق پروردگار عالم ہے اور اگر وسائل کا خالق وہ ہے، تو ہمیں کم از کم اپنے حدود ذہن سے کچھ تو تجاوز کرنا ہوگا۔ مابعد الطبیعات کا کوئی تو ایسا لیول اختیار کرنا ہوگا، جہاں سے ہم کائنات بالا کی اس حکمت عالیہ کو سمجھ سکیں، جس سے ہمیں وسیلہ کی کسی بھی حیثیت کا تعین اور احساس ہو۔

سیدنا علی بن عثمان ہجویریؒ سے ایک سوال پوچھا گیا کہ خدا ظاہر کیوں نہ ہوگیا؟ فرمایا، اگر خدا ظاہر ہو جاتا، تو ایمان جبر ہو جاتا۔ جبکہ نسل انسانی اور اس کے ذہنی معیار کی تخلیق کو تعقل سے نوازنا اور اس کو خلیفۃ اللہ فی الارض بنانا پورے آفس کا تقاضہ آزمائش تھا لیبلوکم ایکم احسن عملا دیکھنا تھا کہ یہ اپنی عقل و معرفت، جو خدا نے اسے جانچنے، پرکھنے، سوچنے اور سمجھنے کے لیے عطا کی تھی، کس حد تک استعمال میں لاتا ہے۔ اگر اول انسان کی تخلیق کا انداز بھی آپ قرآن حکیم میں دیکھیں، تو خداوند کریم فرماتا ہے کہ ایک دور انسان پر ایسا گزرا، جب وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔ پھر ہم نے اس کو دوہرے نطفے سے پیدا کرنا شروع کیا۔ وجہ کیا تھی؟ تاکہ ہم یہ جان سکیں اور اس کو آزما سکیں کہ ہماری دی ہوئی عقل و معرفت اور ہمارے دیئے ہوئے شعور کو یہ کس طرح استعمال کرتا ہے۔ انا ھدینا السبیل اما شاکراً و اما کفوراً اتنے بڑے ٹیسٹ کے لیے لازم تھا، بقول سیدنا ہجویریؒ کہ خدا غیاب میں چلا جاتا اور جب خدا غیاب میں چلا گیا، تو وسائل کی تخلیق ہوئی۔ اگر خدا غیاب میں نہ جاتا، تو آج تک انسانوں پر براہ راست وحی اور القاء ربانی ہوتا۔ ہر انسان کو جدا جدا ذاتی طور پر ہدایت اور شعور سے آشنا کیا جاتا۔ ہر انسان کو شہد کی مکھی کی طرح وحی کی جاتی۔ جیسے اس نے پہاڑوں کو وحی کی۔

خدا کے ظاہر ہونے کا ایک جبر یہ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے انکار نہ کر سکتے تھے۔ اگر ہم بغیر کسی وسیلہ کسی درمیانی رابطے یا بغیر کسی شعوری بیلنس کے پروردگار عالم کو براہ راست سمجھنے کی کوشش کرتے' تو وہ براہ راست ہم پر الہام کرتا۔ القا کرتا اور وحی کرتا۔ اس کے بعد پھر کسی بھی انسان کے پاس نجات کا کوئی ذریعہ نہیں رہ جاتا۔ شیطان رجیم نے پروردگار کے حضور اللہ کا حکم نہیں مانا اور آدم سے' باوجود اس انتہائی باخبری کے کہ وہ اللہ کے سامنے موجود تھا' خطا سرزد ہوئی۔ اسی طرح اگر سارے انسان کرتے۔ سب انسانوں کی اندازِ فکر یکساں ہوتی اور وہ باوجود اللہ کو واضح طور پر جاننے اور ماننے کے اس کا انکار کرتے۔ ہم سے گناہ سرزد ہوتے' تو پھر ہم میں سے کسی کی بخشش کا کوئی امکان نہ تھا۔ دراصل وسیلے کی تخلیق انسانوں پر رحمت اور ان کی بخشش کے امکانات پیدا کرنے کے لیے ہوئی۔

وسیلہ بندوں تک موقوف نہیں۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے' جو شجیے سے گزرتا ہوا بندگانِ خدا تک آتا ہے اور ماحول تک جاتا ہے' جو کائنات میں ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ بین الکائناتی Cosmos میں چاند کی روشنی کا وسیلہ سورج ہے۔ اگر سورج کی روشنی اس کا توسل نہ بنتی' تو چاند ایک اندھی آنکھ کی طرح بھٹکتا ہوا سیارہ ہوتا۔ اسی طرح کائنات میں جہاں جہاں بھی پروردگار عالم نے تخلیق کی۔ تمام تخلیقات کے بنیادی جو جو اسباب تخلیق کئے' ان کے مطابق اس نے ان کے وسائل رکھے۔ اگر خداوند کریم یہ وسائل نہ رکھتا' تو آج کے انسان کے لیے کس درجہ دشواری پیدا ہوتی۔

اللہ نے زمین کو تخلیق کیا اور کہا کہ یہ میرا انکار کرتے ہیں۔ قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون له انداداً ذالک رب العلمین زمین کو ہم نے دو دنوں میں تخلیق کیا اور اس کے بعد وجعل فیھا رواسی اس میں پہاڑ رکھے من فوقھا وبرک فیھا پھر اس کو برکت دی اور برکت کے لیے وقدر فیھا اقواتھا فی اربعة ایام سواء للسائلین (پ ۲۴' س حم السجدہ' آیت ۹' ۱۰) پھر ہم نے اس میں وہ وسائل رکھے' جو انسان کو ابدیت تک کام آنے والے تھے۔ اس زندگی اور اس زمین کی ابتداء' اللہ نے ان تمام قوتوں اور وسائل سے کی' جو قیامت تک انسان کو کام آنے والے ہیں۔

اگر ہم ایسی بستی میں بھیج دیئے جاتے' جہاں ہمارے پاس زندگی گزارنے کا کوئی سبب موجود نہ ہوتا۔ ہمارے تمام نوزائیدہ بچے بغیر کسی وسیلے کے بھیج دیئے جاتے' تو ان کا زمین پر کیا حشر ہوتا؟ مگر اللہ نے کسی بچے کو پیدا کرنے سے پہلے اس کے وسائل تخلیق کئے۔ اس کو نگہداشت کرنے والے ماں باپ دیئے اور اس کو رزق کے اسباب مہیا کئے۔ یہ نوزائیدہ بچہ' جو پانچ سات سال تک اپنی زندگی کو کسی نہج پر استوار نہیں کر سکتا' کسی طریقے بھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں کر سکتا کہ مقامات زندگی سے متصادم حالات زندگی یا معاشرہ سے لڑ سکے' اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسانی فرمائی کہ اس کی زندگی کے وسائل مہیا کئے۔ کیا کسی بچے کو پہلے پتہ ہوتا ہے کہ میرے ماں باپ کون ہیں؟ کیا اس کو اس سکیم کے تحت اپنے کسی سبب کا علم ہوتا ہے کہ میں کس گھر میں جا رہا ہوں؟ کس مقام پر جا رہا ہوں؟ کیا انہیں کسی قسم کا یہ حق انتخاب ہوتا ہے؟ اگر پروردگار عالم ان کے لیے افراد' ماں باپ یا بعض اوقات حکومتی اداروں کی صورت میں وسائل مہیا نہ کرے' تو کیا خیال ہے' تمام نوزائیدہ بچے اپنے بحرانوں میں الجھ کر زندہ رہ سکتے تھے؟

اللہ تعالیٰ کے صرف اسی غیاب میں جانے کی وجہ سے بحیثیت ایک رحمت کے تخلیق کئے گئے وسائل کا بنیادی

Marfat.com

مقصد یہ تھا کہ انسان کو توجہ اور تربیت فراہم ہو۔ جب انسان کے تعلق کی آزمائش شروع ہوئی اور اللہ نے انسان کو آزمانا چاہا تو اس نے انسان کے لیے رحمت کا ایک نظام رکھا۔ اس میں ایک صفت نسیان رکھ دی ہے۔ وہ مشغولات دنیا میں اپنے بنیادی مقصد اور ترجیح کو بھولتا رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے اس کی تعلیم کے لیے بنیادی طور پر ایک وسیلہ اختیار کیا۔ یہ وسیلہ اگرچہ انسانی تھا، مگر یہ مکمل طور پر خدا کی نگرانی میں تھا۔ انسانوں کی ذہنیت تربیت کے لیے بار بار اعادہ تخلیق کے ساتھ اور اس وقت سے اس کا آغاز ہوا جب یوم میثاق والے دن، جب خدا اپنی مخلوقات کے سامنے تھا، اس نے ان سے پوچھا تھا، الست بربکم؟ کیا تم اپنے رب کو پہچانتے ہو؟ قالو بلی سب نے کہا تھا، ہاں؟ مگر اس ہاں کے بعد انسان، وما الحیات الدنیا الا لہو ولعب (پ ۱۲، س العنکبوت، آیت ۶۴) لہو ولہب کی مشغولیت، قلیل دنیا میں اتنی ساری مصروفیات اور اشغال، سطحی اور غیر اہم ذمہ داریوں میں گھر گیا کہ اسے وہ پیغام الست بربکم کیسے یاد آ سکتا تھا؟ آج بھی دنیا میں کوئی ایسا بندہ نہیں، جسے یوم میثاق میں خدا کے حضور اپنی حاضری یاد ہو۔ ہماری یادداشت کے تالے اس حقیقت کبریٰ کے لیے نہیں کھلتے، جو ہم نے اقرار خداوند کیا تھا۔ اس صورتحال کا خوبصورت اظہار ایک فارسی شاعرہ نے یوں کیا ہے

بجواب طبل الست تو زد لاچوں قوس بلا زوم
کہ ہمہ خیمہ زد بہ در دلم چہ پہ غم زخشم و بلا

جب تم نے الست کا طبل بجایا تھا، تو میں نے اپنے دل پر ہاں کی ضرب لگائی تھی، ہاں پروردگار! ہم تجھے جانتے ہیں، ہم تجھے مانتے ہیں۔ ہم سے اب تو کبھی نہیں بھول سکتا۔ مگر اس اقرار کے بعد ہمارے دلوں کے دروازے پر غم وخشو وبلا نے خیمے ڈال دیئے۔ ہمیں اس طرح گھیر لیا ہے کہ میں پوری کوشش کرتی رہی کہ تمام دنیا اور مصروفیات دنیا کے باعث کسی طریقے سے اس اقرار وفا، اظہار محبت اور اظہار عبودیت سے گریز حاصل کروں۔

پروردگار کو اس بات کا بہتر علم ہے اور وہ جانتا تھا کہ میں نے یہ بندہ پرفیکٹ پیدا نہیں کیا۔ اس کو میں نے بہت بڑا بنایا۔ وارث تخت الٰہی اور اس کو خلیفتہ اللہ فی الارض کیا۔ یہ جنتوں کا آباد کار ہے، جو میری اربوں کھربوں ستاروں کی گلیکسیز پر محیط آئیڈیل یوٹوپیا پر محیط ہے، اس کا وارث ہے۔ مگر بھولنے والا ہے۔

چنانچہ تعلیمی مقاصد کے لیے سب سے پہلے جو وسیلہ یادداشت پیدا کیا گیا، وہ پیغمبر تھے۔ وہ آدمؑ سے لے کر محمدؐ تک وسیلہ علم، وسیلہ تربیت، وسیلہ اخلاق اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وسیلہ یاد میثاق تھے۔ اسی کے نتیجے میں ایک حیرت انگیز بات ہمارے سامنے یہ آتی ہے کہ پہلا انسان، جس نے اپنی بستیاں آباد کرنے اور اپنے گھر بنانے شروع کیے۔ وہ متمدن انداز میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کی بستیاں Priest Sociities تھیں۔ توجہ طلب بات ہے کہ آخر انسان نے عقل پاتے ہی پریسٹ سوسائٹیاں، استادوں کی اور پیغمبران سوسائٹیاں ہی کیوں تعمیر کیں؟

دراصل انسان کا شعور ایسی معمولی چیز نہیں کہ وہ ایک دن میں سارا اجاگر ہو جاتا۔ شعور کو درجہ کمال تک پہنچتے پہنچتے اتنا عرصہ لگ جاتا ہے کہ اگر درمیان میں اس کی تعمیر رک جائے، تو ایک آدمی یا تو Morone (کم عقل) رہ جاتا ہے یا Half Morone غیر تعلیم یافتہ رہ جاتا ہے۔ آخر دنیا میں کتنے وائٹ مین پیدا ہوئے؟ افلاطون اور سقراط سے لے کر آج تک ذرا انسانی ریکارڈ کو دیکھ لیں، کتنے ہیں، جو اپنے ذہن کو مکمل طور پر استعمال کر پائے یا جنہوں نے انسان کو قانون

Marfat.com

فراست اور عقل و معرفت دی' کتنے تھے؟ شاید آپ ایک سانس میں سو دو سو بندہ گن سکیں۔

چنانچہ اگر وسیلہ کا ادارہ نہ ہوتا' تو آپ کے رسول کیوں دعا مانگتے۔ حدیث رسولؐ صحیین میں ہے کہ اے لوگو! جنت میں ایک مقام ہے' اسے مقام وسیلہ کہتے ہیں۔ میں اپنے رب سے امید کرتا ہوں کہ وہ مجھے عطا ہوگا۔ تم بھی میرے لیے اس کی دعا کیا کرو۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ مقام وسیلہ پہلے پیغمبروں کو کیوں نہیں عطا ہوا؟ اگرچہ وہ بھی وسائل تھے۔ آدم اور نوح بھی وسیلہ خداوند تھے۔ یہ سارے وسائل تھے' تو پھر آخر یہ مقام وسیلہ ایک شخص پر کیوں مرتکز ہوا اور کیوں محمدؐ نے یہ آرزو کی کہ جنت میں ایک مقام ہے' جسے مقام وسیلہ کہتے ہیں۔ میں اپنے رب سے امید کرتا ہوں کہ وہ مجھے عطا کیا جائے گا۔

اس کی بڑی سادہ اور صاف سی وضاحت ہے کہ کسی ادارے کی ابتدا بھی ہوتی ہے' اس کا انجام بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک وقت کے آنے سے پہلے بھی بات ہو اور ایک وقت کے جانے کے بعد بھی بات ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص آج آیا ہے' اس سے پہلے اس کی گرفت یا حالات پر اس کی حکومت نہ ہو۔ بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے پہلے جو حالات تھے' ان میں بھی محمدؐ کا مقام وسیلہ تھا اور ان کے بعد بھی جن لوگوں نے سنت رسول کو اپنایا اور جو رسولؐ کی رسالت پر یقین رکھتے تھے' ان پر ان کی گرفت تھی۔ اس لیے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میری امت کے اولیاء بنو اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح ہیں۔

بنو اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح جو امت محمدیہ کے افراد ہوں گے' وہ نبوت کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے۔ کیونکہ نبوت ختم المرسلین کے بعد اب کوئی بھی پیغمبری یا نبوت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سوال یہ ہے کہ پھر وہ کس سلسلے میں بنو اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور گرامی مرتبتؐ کے بعد جن اہل ایمان' اہل عقل اور اہل شعور نے غرض و غایت پیغمبر سمجھی۔ انہوں نے اپنی زندگیوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ کو ترجیح اول قرار دیا اور اپنی زندگیاں اس کے لیے صرف کیں۔ ان کے پیغام کو عام کرنے کے لیے وقف کیں۔ وہ یقیناً اپنے لوگوں کے لیے اسی طرح خیر و برکت کا باعث بنتے ہیں' جیسے حضورِ گرامی مرتبت کی نگاہِ عنایت سے اس دور میں ایک سلسلہ معرفت اور مغفرت چل رہا تھا۔ وہ لوگ' جو خدا اور رسولؐ کے لیے اپنی زندگیاں تج دیتے ہیں۔ جو ظاہری اور باطنی زندگی میں درجہ کمال حاصل کرتے ہیں' امت مسلمہ کے لیے اسی فنکشن اور وسیلے کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

مگر اس میں ایک شک و شبہہ کی بڑی سخت گنجائش رہ جاتی ہے۔ ایک مکتبہ فکر کا خیال ہے کہ انسان کو وسیلے کے بغیر خدا سے مانگنا چاہیے۔ ہم اتفاق کرتے ہیں کہ بغیر وسیلے کے مانگنا چاہیے۔ ایک فرد کا اللہ سے اپنا ذاتی تعلق بھی ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ ہر فرد اللہ سے اپنا ذاتی تعلق قائم رکھ سکتا ہے۔ جب وہ تعلق موجود ہو' تو یقیناً خدا کی یاد اور محبت میں کوئی لمحہ دعا اس کے لبوں پر آتا ہے' تو وہ دعا قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ سارے انسان حسن گمان سے بنے ہیں۔ اس کی اپنے کردار و افعال و مقاصد پر نظر جاتی ہے' تو وہ سمجھتا ہے کہ شاید میں اس عالم تربیت میں نہیں رہا۔ میں نے پیغام کی قدر نہ کی۔ مجھ سے بڑی کوتاہیاں اور غلطیاں ہوئیں۔ شاید میں شفاعت خداوند حاصل کرنے کا اتنا اہل نہیں ہوں' جتنا شاید میرا وہ بھائی' جس نے اپنی پوری زندگی اللہ کے لیے صرف کی۔ اگر خلوص دل سے میرے لیے دعا کرے' تو اس دعا اللہ ضرور قبول کرے گا۔ حضور گرامی مرتبتؐ نے فرمایا کہ اگر کسی مسلمان بھائی نے غیر حاضری میں اپنے مسلمان بھائی کے لیے دعا کی' وہ ضرور قبول

کی جائے گی۔ یہ بھی حدیث رسولؐ ہے کہ اگر کسی نے بتا کے نہ جتا کے کسی کے لیے دعا کی' تو اللہ ضرور اس مسلمان بھائی کے بارے میں وہ دعا قبول کرتا ہے۔

دعا وسیلے کا ایک ذریعہ ہے۔ ایک آلہ ہے۔ وسیلہ ایک آفس اور ایک دارہ ہے۔ اس ادارے پر اللہ کی طرف سے اگر کسی کی اجارہ داری ہے' تو وہ صرف ایک انسان کی ہے۔ اس ادارے سے لوگوں کے لیے ہدایت اور بخشش نکلتی ہے۔ یہ شخص اپنی زندگی میں ارشاد فرما رہے ہیں کہ جنت میں صرف ایک مقام ہے۔ باقی سارے مقامات شیئر ہوتے ہیں' مگر ایک مقام جسے مقام وسیلہ کہتے ہیں' میں اپنے رب سے یہ امید رکھتا ہوں کہ صرف مجھے اس پر متمکن کیا جائے گا۔

یہ وسیلہ اتنا اہم اس لیے ہے کہ یہ ہماری زندگیوں اور ہمارے ماحول سے باہر نکلتا ہوا تخلیق زمین پر چلا جاتا ہے۔ اس سے آگے بڑھتا ہوا بگ بینگ تک چلا جاتا ہے۔ یہ وسیلہ پوری کائنات کی تخلیق پر منتج ہوتا ہے۔ آخر پروردگار عالم کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ جب وہ اکیلا اور خوش تھا۔ خود کفیل اور اپنی ذات میں وہ سب کچھ تھا' تو ہمارا یہ حق نہیں بنتا کہ ہم اللہ میاں سے پوچھیں' تو نے ہمیں کیوں پھنسوا دیا؟ مگر کسی تخلیق کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے خالق پر اعتراض کرے۔ آج تک کسی تصویر نے مصور پر اعتراض نہیں کیا۔ اسی طرح ہمارا بھی یہ حق نہیں بنتا کہ ہم خدا کو یہ کہیں کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ مگر یہ حق تو بنتا ہے کہ اس سے کہیں کہ آخر ان تخلیقات کل کا کیا مقصد تھا؟ اس کائنات' بگ بینگ' سات آسمانوں اور ان میں الجھی اور پھنسی ہوئی سات زمینوں کو تو نے کس لیے پیدا کیا؟ ایک چھوٹی سی زمین' جس پر ہم متمکن ہیں۔ جس کے بارے میں رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ ان آسمانوں میں ایسی ہے' جیسے ایک بڑے بھرپور گھنے جنگل میں پڑا ہوا ایک حلقہ یا چھلا۔ کس کو نظر آئے گا؟ کیا اتنی بڑی کائنات میں اتنی معمولی سی زمین کی تخلیق کے لیے بگ بینگ ہوا تھا؟ کیا اتنی معمولی زمین کی تخلیق کے لیے سب کچھ بنایا گیا؟

یہ سارے کائناتی وسائل جو اختیار کیے گئے' سات آسمانوں کی تخلیق اور یہ توازنِ کشش ثقل جو ترتیب دی گئی۔ سورج کو زندگی کا وسیلہ بنایا گیا۔ اسے ایک مخصوص اور مختصر فاصلے پر ٹھہرایا گیا۔ یہ چاند' جو راتوں کو روشن کرتا ہے۔ اس کو مخصوص فاصلہ دیا گیا اور یہ فاصلے انتہائی پیچیدگی سے متوازن کیے گئے کہ اگر سورج ایک لاکھ میل پرے چلا جائے' تو آپ ٹھٹھر کے مر جائیں اور ایک لاکھ میل ادھر ہو جائے' تو آپ جل کر خاک ہو جائیں۔ چاند رہے نہ ستارے۔ اتنی ترتیب اور اتنا توازن ذالک تقدیر العزیز العلیم (پ ۷' س الانعام' آیت ۹۶) یہ سب چیزیں اسی بڑی قدرت' حساب اور علم والے پروردگار نے کیوں ترتیب دیں؟ کیا ایک سادہ سی وجہ سے کہ ہم صرف اس کائنات' جس سے ہم آگاہ ہیں' میں سوچنے والی واحد مخلوق ہیں؟ ہماری خود پسندی تو یہی کہتی ہے۔

چلیں' ہم مغربی خیال کو مان لیتے ہیں۔ ان کے کوانٹم اور اضافیت پر اعتبار کر لیتے ہیں کہ ان کی تحقیقات کے مطابق انہیں کہیں اور کسی دوسری انسانی زندگی کا سراغ نہیں ملا۔ مگر ہم قرآن کی اس بلاغت نظام کو کیا کہیں' جس میں اللہ کہتا ہے ھو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعًا (پ ۱' س البقرۃ' آیت ۲۹) اور اللہ الذی خلق سبع سموت ومن الارض مثلھن (پ ۲۸' س الطلاق' آیت ۱۲) کہ جیسے میں نے سات آسمان تخلیق کیے ہیں' اسی طرح کی سات زمینیں بھی بنائیں۔ اور یہ نہیں کہ وہ زمینیں برباد' بنجر اور ویران پڑی ہیں' بلکہ تمہاری زمین کی طرح وہ بھی ویسے ہی آباد ہیں۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا' یہ نہیں کہ صرف تمہاری زمین پر پیغمبر اترے ہیں' دوسری زمینوں پر بھی آدم ہیں۔ وہاں بھی نوح اور وہاں بھی شیث ہیں۔ مگر محمد رسول اللہؐ ایک ہی ہیں۔ محمد رسولؐ اللہ کا تمام زمینوں پر ایک ہونا کتنا عجیب سا تصور ہے۔ یہ تناسخ ہے نہ توارد ہے۔ یہ دائمی بین الکائناتی فاصلوں کا عجیب سا سیلاب ہے۔ کیا آپ ان سسٹمز آف انٹیلی جنس تک پہنچ گئے ہیں' جو اللہ نے تخلیق کئے؟ ابھی کچھ عرصہ پہلے ایک بڑی عجیب سائنس ایجاد ہوئی کہ موجودہ سائز سے کہیں چھوٹا سا کمپیوٹر تیار ہو گیا ہے۔ یعنی مٹی کا ایک ذرہ' ناقابل تصور حد تک سمارٹ' اور وہ استعمال کے قریب ہے۔ فرض کیجئے اگر یہاں تھوڑی سی راکھ بکھیر دی جائے' تو وہ Cosmic Intelligence بن جائے گی۔ کہیں مرکزی آفس میں بیٹھا ہوا شخص ہمارا ایک ایک لفظ اور ایک ایک شکل دیکھے گا۔

یعنی اس نہج پر جب انسان کی ترقی چلی گئی ہو' تو اس ذرہ وجود جسے آپ روح کہتے ہیں' وہ انتہائی ذہانت سے بنائی گئی مائیکرو چپ' جو آپ کے اندر موجود ہے' کی ہدایاتی فلاسفی کی کوئی بنیاد کسی کے پاس تو ہوگی۔ جب پروردگار عالم نے آغاز و انجام میں ایک ہی قرآن کو اتارنا تھا' تو صاحب قرآن تو دو نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر ہوا کیا؟ تمام پیغمبروں نے رسولؐ اللہ کو مقام وسیلہ میں مدد فراہم کی۔ جب قیامت کا دن ہوگا' تو بات کھل جائے گی۔ حدیث پاک ہے کہ شفاعت و دعا و وسیلہ ایک ہی اداراتی پیٹرن ہیں۔ جب شفاعت کا وقت آئے گا' مخلوقات عالم اضطراب میں ہوگی۔ جان لبوں تک آئی ہوگی اور اوپر سے آواز آ رہی ہوگی کہ لمن الملک الیوم اب بتاؤ کون بادشاہ ہے؟ ملک کس کا ہے؟ وللہ الواحد القہار (پ ۲۴' س المومن' آیت ۱۶) میں اکیلا واحد القہار ہوں۔ کس کس کے پیچھے بھاگتے رہے ہو؟ اپنے مقاصد کی تخلیق میں کون کون سے وسائل طلب کرتے رہے ہو؟ وسیلوں کا مالک تو میں تھا۔

سب لوگ بھاگیں گے۔ جانِ اضطراب کو لے کر حضرت آدم کے پاس جائیں گے اور عرض گزار ہوں گے کہ یا نبی اللہ! آپ انسان اول ہیں۔ ابوالانسان ہیں۔ آپ ہمارے لیے شفاعت کی دعا کریں۔ کہیں گے' نہیں بھائی! میرا تو یہ مقام نہیں۔ میں نے تو اپنی زندگی کا آغاز ہی خطا سے کیا تھا۔ میں نہیں کر سکتا۔ ایسا کرو' تم حضرت نوحؑ کے پاس جاؤ۔ اللہ نے انہیں بڑی عمر اور بڑا علم دیا تھا۔ بحیثیت استاد کے انہوں نے بڑی محنت کی تھی۔ وہ خلق و راستی کے مالک تھے۔ ان کے پاس جاؤ۔ پھر یہ سلسلہ طویل ہوتا جائے گا۔ حضرت نوحؑ سے حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ' پھر حضرت عیسیٰؑ' جملہ تمام انبیاء کہیں گے' بھائی یہ سٹیٹس ہمارا نہیں ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ براہ راست دعا کے علاوہ کوئی اور پروسیجر نہیں ہے' ذرا قیامت کے دن کے بارے میں غور کریں کہ بڑے بڑے اللہ کے دوست' اللہ کے ولی' کریم اور بڑے بڑے نفیس لوگ وہاں موجود ہوں گے۔ پیغمبروں سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر کی زبان شرف سے کلام نکلے اور اللہ اسے قبول نہ کرے؟ ایک چھوٹی سی دعاء کے لیے وہاں کتنا بحران پڑ گیا۔ کیا مسئلہ پڑ گیا کہ آدم سے عیسیٰؑ تک سب پیغمبر انکار کرتے ہیں۔ پھر سب مل کر محمد رسول اللہؐ کے پاس جائیں گے' تو حضورؐ فرمائیں گے' ہاں میرے ساتھ اللہ کا یہ وعدہ ہے۔ مجھے یہ شفاعت کا حق دیا گیا ہے اور میں تمہارے لیے خدا سے دعا کروں گا۔

یہ تو تھے رسول اللہؐ۔ اس کے علاوہ صحیحین میں ایک حدیث ہے کہ میری امت کا ایک شخص قیامت کے روز میری

امت کے قبیلہ بنی حذر کی بھیڑوں کے بالوں کے برابر شفاعت کرے گا اور اصحاب رسول متفق ہیں کہ یہ بات حضرت خواجہ اویس قرنیؒ کے بارے میں ہے۔ یہیں پر یہ بات صادق آتی ہے کہ مقام وسائل کا اختیار رسول اللہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا مندی اور رحمت سے دیا۔ وسائل کا انچارج رسول اللہ کو بنایا گیا۔ تاہم یہ بات اچھی طرح یاد رہے کہ پروردگارِ عالم کسی معاملے میں اختیارات شیئر نہیں کرتا۔ وہ اپنے اختیارات میں کسی کو دخل نہیں دینے دیتا۔ یہ کہنا قطعاً ناجائز ہوگا کہ کوئی شخص بھی خدا کی طرح ایکٹ کر سکتا ہے۔ وہ تو موت وحیات کو بھی وسائل گنتا ہے۔ الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا (پ ۲۹' س الملک' آیت ۲) موت وحیات ہمارے عمل کا پیٹرن کیسے بن سکتی ہے؟ وجہ یہ ہے کہ ایک زندگی کی عطاو بخشش سے آپ اس امتحان گاہ میں داخل ہوتے ہیں اور موت آپ کو اس امتحان گاہ سے نکالتی ہے۔ اللہ نے یہ دونوں وسائل اس لیے تخلیق کئے کہ ایک آپ کے لیے زندگی کا باعث بنا' تاکہ آپ امتحان کے لیے تیار ہوں اور ایک آپ کے اخراج کا وسیلہ بنا اور دونوں ذرائع الٰہی وسائل میں شریک اور شامل ہوئے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ان وسائل میں ہمیں کیوں شبہ ہوتا ہے؟ جہاں بھی کوئی مسلمان تھوڑی سی عملیت اور عبادات کی سختی میں گیا اور اس نے خیال کیا کہ میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں' روزے رکھتا ہوں' اللہ تعالیٰ کے احکام ظاہرہ پورے کرتا ہوں' تو میرا استحقاق ہے کہ اللہ میری سنے۔ یقیناً ایسی ایک حدیث بھی موجود ہے کہ جب ایک صحابی رسولؐ کے پاس آئے اور کہا کہ یارسول اللہ آپ کیا کہتے ہیں کہ میں جنت میں کن اسباب سے داخل ہوں گا؟ فرمایا' پانچ وقت کی نماز۔ اس نے کہا' یارسول اللہ ایک زیادہ نہیں پڑھوں گا۔ فرمایا' روزے رکھنا۔ کہا' ایک بھی رمضان سے زیادہ نہیں رکھوں گا۔ خیرات و صدقات ضرور دوں گا۔ فرمایا' جس نے جنتی کو دیکھنا ہے' اسے دیکھو۔

اعمال کی صحت سے تو کسی کو قطعاً انکار نہیں' مگر اعمال کی ذہنی سطح ہمیشہ فرد سے فرد مختلف ہوتی ہے۔ ایک عمل کی نیت کچھ اور دوسرے عمل کی نیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اسی لیے پروردگارِ عالم نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ ظاہری اور باطنی گناہوں سے بھی بچو۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کسی بڑے شخص' جو اللہ کے نزدیک بڑا آدمی ہے' کی توہین کر دیتے ہیں۔ جسے اللہ نے پوری کائنات' پوری زمین اور پورے انسانوں کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنایا' اس کی زجر و توبیخ کر دیتے ہیں اور اس کے مقام عزت پر حرف لاتے ہیں' تو پروردگارِ عالم کی ناراضگی کا سبب تو بنے گا۔ اس لیے کہ خدا احسان فراموشی کو سب سے زیادہ بدتر حالت ذہن سمجھتا ہے۔ احسان فراموش خدا کے حضور کوئی جگہ نہیں پاتا۔

پورا مذہب یہ بتاتا ہے کہ دراصل یہ جو وقفہ حیات ہے' صرف یہی ایک قبر ہے۔ یہ ہمارا Dead Period ہے۔ ایک لامتناہی سلسلہ حیات زمان و مکان کو زمانی اور مکانی حدود دنیا میں قید کیا گیا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا الدنیا سجن المومن دنیا مومن کی قید ہے۔ پورے کائناتی دلائل میں جب ہم اس گلیکسی کے نظام وقت کی لاانتہا اور مکاں کی وسعت کو دیکھتے ہیں اور اس کی نسبتی تفہیم پر نظر ڈالتے ہیں' تو ہمیں صرف ایک جگہ اور یہ دنیا جعلی لگتی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ ہم پوری کائنات کے تمام سلسلے سے کٹ گئے ہیں۔ ہمارے قوانین زندگی کی بقاء کے کائناتی قوانین سے مختلف ہیں۔ یہاں جو قیود لگائی گئی ہیں' وہ یہاں سے خلا میں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں کا وزن اوپر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ کسی فرد کے لیے جو اس زمین پر رہ رہا ہے' بہت ہی مشکل ہے کہ وہ اپنے اسی پیٹرن میں کسی اور دنیا میں چلا جائے۔ بڑا ہی مشکل ہے۔ اس کو اس Part of

Marfat.com

life سے اس Pattern of life میں جانے کے لیے بے پناہ حفاظتی اقدامات کرنے ہوں گے۔ وسائل اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر تخلیق کیے اور ان کے سبب محمد رسول اللہؐ اور دیگر انبیاء ہیں۔ یہ تمام کی تمام دعا و برکت صرف ایک شخص حکیم ایک بندۂ خدا کو حاصل ہے۔ وہی مقام وسیلہ پر اختیار رکھتا ہے۔ اس سے متعلق بخاری میں حدیث مبارکہ ہے کہ واللہ معطی و انا قاسم اللہ عطا کرنے والا ہے اور میں بانٹنے والا ہوں۔ شفاعت قیامت کے دن بھی انہی کے توسط سے بٹے گی۔ جملہ وسائل زندگی رسولؐ اللہ کی معرفت و حکمت ہے۔

ہم نبیؐ کو صرف اس لیے قبول کرتے ہیں کہ جو بات ہمارے علم ظاہرہ اور باطنہ سے باہر ہیں' اس کو پیغمبر جانتا ہے۔ اس کی ہمیں تلقین کرتا ہے۔ کوئی بندہ خدا کو نہیں جانتا ہوتا یا معرفت الٰہی نہیں رکھتا۔ زمانے میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا پتہ نہیں ہوتا۔ ایک پیغمبر ہی اپنی شہادتِ باطنیہ' وحی الٰہی اور کئی طریقوں کے ذریعے آپ کو آگاہ کرتا ہے کہ خدا ہے اور میں اس کا نمائندہ ہوں۔ پھر وہ جب اپنے نبی ہونے کا اعلان کرتا ہے' تو پھر بنو اسرائیل میں ایک ہی وقت میں بہت سارے انبیاء کی موجودگی کے باعث یہ سوال اٹھتا تھا کہ غلط اور صحیح نبی کون ہے۔ بنی اسرائیل کے انبیاء میں مسلسل اصلی اور نقلی نبی ہونے کا ٹمیسٹ جاری رہتا تھا۔ بخت نصر کے زمانے میں کم از کم پندرہ نبی موجود تھے۔ بخت نصر کے خواب اور اس کی تعبیر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت دانیال پر جبرائیل کے ذریعے وحی کی۔ ذرا جبرائیل کو نکال دیجیے' پھر دیکھیں۔

یہ سارے کا سارا جھگڑا اس لیے پیدا ہوا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی نبی یا کسی فرد بشر میں داخلی کوالٹی ایسی موجود ہے کہ وہ غائب جانتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ کسی عالم یا پیغمبر نے ایسا دعویٰ کیا کہ ہم میں ساری داخلی انفارمیشن ہے اور ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا۔ آپ کسی بھی بزرگ سے بات کر کے دیکھیں۔ خواہ وہ عبدالقادرؒ ہوں' علی بن عثمان ہجویریؒ' جنید بغدادی یا خواجہ ابوالحسن شاذلیؒ ہوں۔ ان اولیاء اللہ کو بھی چھوڑیں۔ کسی پیغمبر سے جا کر پوچھیں کہ حضور یہ جو خبر غیب کی آپ کو ملتی ہے' یہ کہاں سے ملتی ہے؟ اور نبی کا مطلب ہے خبر بتانے والا۔ کسی نیوز کاسٹر کو تو میرا خیال ہے' کوئی نبی نہیں مانے گا۔ عربی نیوز سناتے وقت لفظ 'الانباء' آتا ہے۔ اس اعتبار سے تو نیوز کاسٹر کو نبی ہونا چاہیے۔ وہی ہمیں خبر سناتا ہے۔ مگر نبی کی تعریف یہ ہے کہ وہ ایسی خبریں سناتا ہے' جن پر عام کوئی گواہ نہیں ہے۔ وہ ہمیں غیب کی خبر بتاتا ہے اور سب سے بڑی غیب کی خبر یہ ہے کہ اللہ ہے۔

بھلا اس سے بڑی غیب کی خبر کیا ہو سکتی ہے کہ وہ حضرت کل' شہنشاہ پروردگار عالم' جو بصارت میں نہ کسی کے فہم و ادراک میں آسکتا ہے۔ کسی کے خیال تصور سے ماورا ہے۔ جس کو کسی طریقے سے جانا نہیں جا سکتا۔ ایک بندہ' ہمیں شہادت دیتا ہے کہ وہ ہے اور ہم اس پر اعتبار کرتے ہیں کہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ کیونکہ اس کی باقی خبریں بھی ٹھیک ہیں۔ وہ صادق ہے۔ اگر یہ صادق اور امین' ہمیں یہ کہتا ہے کہ اللہ ہے' تو پھر وہ صحیح کہتا ہے۔

انبیاء کے سٹیٹس کو بڑی احتیاط سے پرکھنا چاہیے۔ یہ بندگانِ زمین پر احسان کرنے والے لوگ ہیں۔ اللہ کے یہ وہ بندے ہیں' جو رشد و ہدایت کا منبع اور سراغ ہیں۔ ہم ان سے دعا کے طلبگار نہیں ہوں گے؟ ہمارے پاس اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے' جس میں ہم تھوڑا بہت خدا کی مرضی کا ادراک بھی کر سکیں۔ قرآن براہ راست تعلیم کا واحد منبع ہے اور دوسرے درجے پر حدیث ہے۔ اگر آپ کو قرآن یا اس کے سنانے والے پر اعتبار نہیں ہے' تو قرآن کی حیثیت مشکوک ہو

Marfat.com

جاتی ہے۔ پوری تاریخ علم وعقل میں قرآن کا صرف ایک ثبوت ہے اور وہ قولِ رسول پاکؐ ہے۔ ایک ہی شخص کی زبان سے جو جملے نکلتے ہیں۔ ایک کو وہ کہتا ہے کہ یہ میری بات ہے اور دوسرے کو کہتا ہے کہ یہ قرآن ہے۔ کسی نے نہ اس وقت جبرئیل امینؑ کو دیکھا نہ آج دیکھا۔ یہ یقین نہ ہو تو پروفیسر میکڈوگل جیسا شخص پیغمبرؐ کو کہہ سکتا ہے کہ وہ کہاں کا نبی ہے؟ یہی بات ' ' نے اقبال کو لکھی کہ تو اتنا پڑھا لکھا آدمی ہے' پی ایچ ڈی ہے' تو بھی یہ سمجھتا ہے کہ قرآن اللہ کے لفظ ہیں؟ یہ تجھے کیسے خیال آیا؟

ایک اور بہت بڑا مغالطہ ضمناً آ گیا ہے کہ قرآن کو اللہ کا لفظ نہ سمجھنا۔ اس پورے دین کی اساس کو ختم کرنا ہے۔ آج اگر میں بطور ایک چھوٹے طالب علم خدا پر کوئی دلیل قائم کرتا ہوں' تو وہ صرف اور صرف قرآن کی وجہ سے ہے۔ اگر قرآن اللہ کا کلام نہ ہو' تو یہ زبان اور معانی دونوں میں Adjustable ہے۔ جیسے حدیث پر اعتراض وارد ہوتے ہیں' اس پر بھی اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ بہت سی باتوں کے بارے میں اس کی ثقاہت قابل اعتراض ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک اچھے مسلمان کے طور پر ہمارے عقیدے کا تقاضا ہے کہ قرآن کا ہر لفظ اللہ کا لفظ ہے۔ اس میں ہر بات اللہ کی بات ہے۔ مگر یہ ثبوت صرف اللہ کے رسول سے مہیا ہوتا ہے۔ حضور اپنی زبانِ معجز سے ہی دو باتیں کہتے ہیں۔ یہ میری حدیث ہے اور یہ قرآن حکیم ہے اور ہم ان پر اعتبار لاتے ہیں۔

اگر ہم نبیؐ کے سٹینس کو کمزور سمجھیں۔ ہر نبیؐ کے علم' ان کی دانش اور ان کی براہ راست قبولیت پر شک کریں' تو ہم رسول اللہؐ کے امتی ہونے کا حق بالکل نہیں رکھتے۔ جو شخص پیغمبر کے علم پر اعتراض کرتا ہے' وہ اس پیغمبر کا پیروکار نہیں ہو سکتا۔ نبیؐ کے علم اور شناخت پر شبہ کرنے والا کسی قیمت پر مسلمان نہیں ہو سکتا۔ بہت ساری باتیں ایسی لگتی ہیں' جیسے پیغمبر ایک عام آدمی کی طرح Behave کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک پیغمبر ایسے گزرے کہ ان کی زندگی معجزہ تھی۔ پیدائش سے وفات تک پوری کی پوری زندگی معجزانہ تھی۔ وہ حضرت عیسیٰؑ تھے۔ حتیٰ کہ آج بھی ہمیں بہت سارے مقتدر عیسائی علما طعنہ دیتے ہیں کہ تمہارے پیغمبر نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا جبکہ ہمارا پیغمبر تو بنا ہی کرامات اور معجزات سے ہے۔

حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں کے ساتھ گزر رہے تھے۔ دیکھا ایک عورت کو دورہ پڑ گیا ہے۔ اس نے کپڑے پھاڑ دیئے ہیں۔ بائبل میں یہ واقعہ تمام حواریوں سے منقول ہے۔ آپ نے حواریوں یوحنا' متی' مرقس' لوقا سے کہا کہ جو میں نے تم کو آیات دی ہیں' جاؤ' وہ آیات اس پر دم کرو تا کہ مریض صحت یاب ہو۔ وہ سارے گئے اور انہوں نے دم کیا مگر وہ مریضہ ٹھیک نہ ہوئی۔ حضرت عیسیٰؑ نے حواریوں سے کہا کہ جاؤ' اس پر وہ تمام دم پڑھو' جو میں نے تمہیں عطا کئے۔ حواری گئے' مگر کسی دم کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ واپس پلٹ کے آئے اور کہا یا نبی اللہ! ہم نے پوری کوشش کی۔ دم بھی وہی ہے' جو آپ نے بتایا ہے اور ہم آپ کے دوستوں اور تابعداروں میں سے ہیں۔ پھر حضرت عیسیٰؑ گئے اور دعا کی۔ لڑکی نے ایک بڑی چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ ساتھ گلے میں سؤروں کا ایک بہت بڑا باڑہ تھا۔ ان میں سے ایک سور پر وہ جا کے لگی اور پھڑک کے جھیل میں جا پڑی۔ حواریوں نے سوال کیا کہ اے نبی اللہ! ہم نے بھی وہی کیا' جو آپ نے بتایا تھا۔ ہمارے سے کیوں نہیں ٹھیک ہوئی؟ فرمایا' کسی مرض کے لیے نبی کی دعا چاہیے۔

وسائل کی ترتیب اور ان کے مقامات میں سب سے بڑا المیہ' جس پر اعتراضات وارد ہوتے ہیں' یہ ہے کہ کبھی

Marfat.com

کبھی کوئی انسٹی ٹیوشن بڑا کرپٹ ہو جاتا ہے۔ جب میراث رسول اللہ لوگوں تک پہنچ گئی۔ انبیاء کے بعد اولیاء اللہ تک یہ مقام وسیلہ پہنچے تو کہا نہیں جا سکتا کہ شاید کچھ لوگ اس کے حقدار نہ ہوں اور وہ دعوے کر رہے ہوں۔ کچھ لوگ اس ادارے کے وقار کے قابل نہ ہوں اور پھر بھی وہ موجود ہوں اور لوگ ان سے وابستگی اختیار کریں۔ ان کے کردار میں کوئی نہ کوئی ضرور کمی و تشنگی ہوگی' جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں چند ایک مذہبی مسالک بڑی شدت میں پڑ جاتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ سے گزرتی ہوئی بات' انبیاء اور اولیاء اللہ سے گزرتی کم تر مزاج' دنیا پرست اور وجاہت طلب لوگوں تک آتی ہے' تو ظاہر بات ہے کہ انسٹی ٹیوشن کرپٹ ہو جاتے ہیں۔ مگر وسیلہ کو کوئی ضرب نہیں پہنچتی۔ اصلیت میں مذہب اور نہ مذہب کے ادارے کرپٹ ہوئے۔ مگر اس وقت' جب لوگوں نے انہیں اپنی اغراض کے لیے استعمال کیا۔

آج کل سب سے زیادہ مصیبت تصوف اور اولیاء اللہ تعالیٰ کے مساکن پر آئی ہوئی ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں' جو عزت و حرمت کے تھے۔ جو لوگوں کی خوشی' بخشش اور کرم کا وسیلہ تھے' ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئے اور ان پر ایسا ہی وقت آیا' جس طرح آج سے پہلے بارہویں اور تیرہویں صدی میں عیسائیت پر بھی وقت آیا تھا۔ جب ایسے ایسے اکیڈمک ولی اللہ پیدا ہو گئے تھے' جنہوں نے نجات کے سرٹیفکیٹ بیچے۔ اس زمانے میں چرچ اور کلیسا کے مقتدر لوگ نجات کے سرٹیفکیٹ بیچتے تھے اور کہتے تھے کہ پانچ پونڈ دو گے' تو چھوٹے درجے کی جنت تمہیں عطا کریں گے اور دس پونڈ دو گے' تو ذرا بہتر جنت ملے گی۔

آج تک کسی بندے نے کسی مقرب الٰہی کے کسی مقام پر شبہ نہیں کیا۔ یہ وہ آفتاب ہے' جب طلوع ہوتا ہے' تو تمام ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جب ان کا بحران اور قحط الرجال ہوگا۔ مقام وسیلہ تک پہنچنے والے افراد استحقاق نہ رکھیں گے' تو لوگوں کو کوئی برا نہیں کہے گا۔ ہر چیز کے پابند اس کی صفات کہیں گے۔ مگر دوسرے معترض کو اس پیر کی خامیاں ضرور نظر آئیں گی۔ اس ایک شخص کی وجہ سے بہت بڑا ایک ادارہ خراب ہوگا۔ اللہ نے بدر میں کہا' میں نے تمہیں نصرت اور فتح دی۔ تین ہزار ملائکہ بھیجے۔ عجیب سا لگتا ہے کہ اللہ وسائل کیوں استعمال کرتا ہے۔ وہ اللہ جو خود مدد دے سکتا ہے اور فتح اور شکست اس کے قبضہ میں ہے' وہ مسلمانوں سے کہہ رہا ہے' میں تمہیں فتح تو دے سکتا تھا' مگر میں نے تمہیں تین ہزار ملائکہ سے مدد دی۔ پھر آگے جا کر کہتا ہے' میں نے تمہیں پانچ ہزار ملائکہ سے مدد دی۔ جنگ حنین میں مسلمان بھاگ نکلے۔ اللہ نے ملائکہ کی مدد بھیجی۔ کیا مسلمانوں کے لیے خود اللہ کافی نہیں تھا؟ جیسے بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ ملائکہ سے کیوں مدد دی گئی؟

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جب اللہ غیاب میں چلا گیا' تو اس کے حجابات ہمیں براہ راست تفہیم تک نہیں پہنچنے دیتے۔ چنانچہ ہمیں اسباب چاہیے ہوتے ہیں۔ تمام معجزات اور ملائکہ اسی قسم کے اسباب ہیں' جن میں ہم ان کو اپنے قریب محسوس کر کے نفسیاتی طور پر زیادہ خدا کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ درمیانی اسباب ایک نفسیاتی انسان کی ضرورت ہیں۔ متوکل انسان کوئی کوئی نکلتا ہے۔ اللہ پر اعتبار کرنے والا ابراہیم نکلے گا کہ جب نار میں جھونکے گئے' تو جبرئیل امین حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! حکم ہو تو' میں اس آگ کو اہل کفر پر پلٹا دوں۔ فرمایا' اے جبرئیل! میرے اللہ کو میرے اس عالم کا پتہ نہیں؟ فرمایا' اللہ جانتا ہے۔ فرمایا' پھر مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں۔ اب ذرا دیکھئے کہ جس نے وسیلے سے

Marfat.com

بے نیازی حاصل کی' اس کے لیے اللہ نے مدد بھی براہ راست بھیجی۔ اس نے جبرائیل کو نہیں کہا کہ آگ کو ٹھنڈا ہونے کا حکم دے۔ یہ انسانوں کے معیار عقل و فکر اور ان کے ایمان پر ہے۔

مگر جب قرآن اتر رہا تھا' آپ کا خیال ہے کہ خدا نے غلطی کی تھی' جب رسول اللہؐ کو کہا کہ میں نے ہر مومن کو دو سو لوگوں پر بھاری کر دیا۔ میں نے ایک ایک مومن کو دو سو حریفوں پر غالب کر دیا۔ مسلمان ڈر گئے۔ آپ جانتے ہیں' وہ کون مسلمان تھے؟ اصحاب رضوان' اصحاب بدر' اصحاب احد' جن کے ایمان کی راہ گزر کی خاک بھی ہمارے لیے ماتھے کے چمکتے ہوئے چراغ ہیں۔ مگر ان لوگوں کو جب خدا نے کہا کہ میں نے ایک ایک شخص کو دو سو پر غالب کیا' تو اصحاب ڈر گئے۔ اصحاب اس لیے ڈر گئے کہ یہ بڑی مشقت کی بات تھی۔ ایک صحابی کو اس مقام کو حاصل کرنے میں دو سو کافروں کو قتل کرنا پڑتا تھا۔ اللہ نے قرآن میں کہا' ہم نے تم لوگوں کی کمزوری دیکھ لی۔ چلو دو سو نہ سہی' اب تم میں سے ایک دو پر غالب رہے گا۔ حکم وہ بھی نہیں گیا۔ قرآن کو سمجھنے والوں کو یہ پتہ ہونا چاہیے کہ دو سو والا بھی موجود ہے۔ مگر عمومی طور پر جو حکم متعارف کیا گیا' یہ تھا کہ ایک عام مومن تو دو کافروں پر بھاری رہے گا' مگر وہ جن کے ایمان مضبوط ہیں اور درجہ اقدار میں اللہ کے لیے جانفشانی کا مظاہرہ کریں گے' وہ آج بھی دو سو پر غالب ہیں۔ عجیب سی بات ہے کہ کارگل میں صرف ایک چھوٹے سے سپاہی نے 185 انڈین سپاہی مارے۔ میجر کرنل شیر نے 185 کافروں کو جہنم رسید کیا۔ تو آرڈر وہ بھی چل رہا ہے اور ایک کم تر پیٹرن کا بھی چل رہا ہے۔ مگر لوگوں کو مدد چاہیے۔ ہر آدمی اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ اس درجہ ایمان و تقویٰ پر فائز ہو۔ وسائل اس لیے تخلیق کیے گئے کہ خداوند کریم ان لوگوں کو تھوڑی تھوڑی تسلی انہی کے ذرائع سے دے۔ اعتبار اللہ ہی کا ہوتا ہے اور یقین اللہ ہی پر ہوتا ہے۔ مگر خداوند کریم نے دیکھیں' کیسی بات کی ہے واذا قیل لھم تعالو یستغفر لکم رسول اللہ لو واۓ و سھم یصدون وھم مستکبرون (پ ۲۸' س المنافقون' آیت ۵) جب ان سے کہا جائے کہ آؤ اور رسول اللہؐ آپ کے لیے مغفرت کے لیے دعا کریں' تو یہ منہ چڑاتے ہیں اور تکبرات میں پڑ جاتے ہیں۔

ذرا آیت کو غور سے دیکھئے۔ اللہ نے تو اس میں اپنا نام نہیں لیا۔ بلکہ سپیشلائز کیا اور کہا کہ تمہارا وسیلہ مغفرت رسول اللہؐ ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اے گروہ منافقین! آؤ اور رسول اللہؐ کے پاس حاضر ہو جاؤ اور رسول اللہؐ سے استغفار کی دعا کرواؤ' تو ان کے منہ بگڑ جاتے ہیں۔ ان کے انداز بدل جاتے ہیں اور یہ استکبار میں پڑ جاتے ہیں۔ تکبر کتنی بڑی برائی ہے کہ جس کے دل میں رائی برابر بھی کبر ہے' وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ رسول اللہؐ سے مغفرت کی دعا کرانے کی بات ہے' اس کو آپ کیا کہیں گے یا جسے رسول اللہؐ حاضر نہیں ملتے یا ان کے حضور جانے کا اسے موقع نہیں ملتا' وہ کیا کرے؟ وہ کسی بندۂ خدا' جس پر وہ رسول اللہؐ کی تقلید اور ان کی استعانت کا شبہہ رکھتا ہو کہ یہ شخص اگر میرے لیے دعا کرے' تو یہ دعاؤں کے سلسلے نسل در نسل چلتے ہوئے اللہ کے رسول تک پہنچے' سے کہہ سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے' کوئی پیر فقیر' جب کمرے میں جاتا ہو' تو کہتا ہو۔ اللہ کے بندو! مجھ سے کیا دعا منگواتے ہو۔ میں تو خود خاک قدم پیغمبر ہوں۔ تو ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ اس کے لیے کہ یہ مسکین میری وجہ سے سب کو دعا دے رہا ہے' تو میں استغفار کی دعا اس کے لیے کروں۔ اللہ نے یہ استحقاق بخشا ہے کہ لوگوں کے لیے دعا کروں۔

Marfat.com

پھر ایک اور آیت دیکھئے۔ بڑی کلیئری آیت ہے، جس کے ہوتے ہوئے ممکن نہیں کہ ہم پھر بھی کسی مغالطے میں پڑ جائیں ولو انھم اذ ظلموا انفسم وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کئے بڑی خطائیں کیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اللہ سے معافی مانگیں۔ خدا کہتا بھی ٹھیک ہے کہ وہ مجھ سے معافی مانگیں۔ مگر میرا کوئی پتہ نہیں کہ میں معاف کروں یا نہ کروں۔ میں آپ کو ایک طریقہ بتا دیتا ہوں، جس سے میں یقیناً معاف کر دوں گا ولو انھم اذا ظلموا انفسھم وہ لوگ، جنہوں نے اپنی جانوں پر بہت ظلم کئے، بڑی خطائیں کیں، یعنی بڑے گناہ کئے۔ ان کو چاہیے کہ وہ مجھ سے پناہ مانگیں، اس سے توبہ کریں۔ مگر اے پیغمبر تھوڑی سی بات ہے واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما (پ ۵' س النساء، آیت ۶۴) اگر اے پیغمبر! تو بھی ان کے لیے مغفرت اور بخشش کی دعا مانگے، تو پھر ہم بخشنے والے ہیں۔ ذرا غور کیجیے۔ قرآن کی اس آیت میں قطعاً کوئی ابہام موجود نہیں۔ اپنا ذکر کیا۔ انسان کے گناہوں کا ذکر کیا ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جن لوگوں نے اپنی جانوں پہ ظلم کئے، گناہ کئے، یہ وہ ظلموا ہے ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخسرین (پ ۸، س الاعراف، آیت ۲۳؛) جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کئے اور گناہ کئے جاۓ وک واستغفر اللہ اگر اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگیں۔ پھر یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وستغفر لھم الرسول اے پیغمبر تو بھی ان کے لیے بخشش کی دعا کرے لوجد اللہ توابا رحیما تو اللہ ضرور توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ایک بات کلیئر کرنا ضروری ہے کہ رسول اللہؐ تو مدینہ میں استراحت پذیر ہیں اور ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مدتیں ہوئیں، حضور کا چہرۂ انور حجاب میں ہے اور ہم ان کے اس رخِ کریم سے کوئی آرزو صرف ان کے مزارِ گرامی پر جا کر کر سکتے ہیں۔ تو قرآن یہ کہہ رہا ہے، اگر تم اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور رسولؐ اللہ تمہارے گناہ کے لیے معافی مانگیں، تو ہم بخشنے والے ہیں، یہ کیا بات ہوئی؟

سوال یہ ہے کہ ہمارا کیا سٹیٹس رہے گا؟ اگر یہ ان اصحاب کے لیے مخصوص ہوتی، جو ان کو دیکھتے تھے۔ رسول اللہؐ کے پاس چلے جاتے اور ان سے کہتے تھے، میرے لیے رسول اللہؐ دعا فرمائیے۔ میرے لیے اللہ سے یہ مانگ لیجیے، مجھے یہ لے دیجیے۔ حضور پیغمبرؐ ہی نہ تھے، ان سے محبت کرنے والے باپ بھی تھے۔ بخشنے والے انا قاسم بانٹنے والے تھے۔ سیرت ابن ہشام میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضور بانٹ رہے تھے۔ بدو زور کر رہے تھے اور انہوں نے اتنا زور کیا کہ حضورؐ کو گھسیٹتے گھسیٹتے ان کی چادر اور ان کو جھاڑی میں پھینک دیا۔ حضور گھبرا کے چادر کھینچتے تھے اور اپنے آپ کو کانٹوں سے علیحدہ کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ خدا کی قسم! اگر ان کو پتہ ہو کہ میں ان کے حق میں کتنا فیاض ہوں، تو یہ اتنا زور نہ دیں۔ وہ وقت ہم پر نہیں تھا۔ کیا قرآن اتنے محدود وقت کے لیے تھا؟ کیا اصحابِ رسولؐ کے لیے تھا؟ کیا صرف انہی کے لیے مغفرت تھی؟ کیا آج ہمیں اس مغفرت میں سے کچھ نصیب نہیں ہوگا؟ اگر میں اللہ سے معافی مانگوں اور اپنے پیغمبر سے دعا کروں کہ یا رسول اللہؐ! میں خدا سے معافی مانگ رہا ہوں۔ آپ بھی میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائیے، تو کیا قرآن کے وعدے کے مطابق یہ دعا پوری نہ ہوگی؟

جب بیبیاں ناراض ہوئیں، تو پروردگار نے اک عجیب سا جملہ فرمایا۔ فرمایا، دیکھو بھئی میرے پیغمبر، میرے

دوست گھبرانا نہیں۔اگر یہ بیبیاں تم سے علیحدگی چاہیں، تو انہیں مال و دولت دے کر رخصت کردو اور ذرا غور کیجیے گا ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما و ان تظھرا علیہ فان اللہ ھو مولٰہ وجبریل اپنے بعد ھو مولٰہ و جبریل و صالح المومنین والملائکۃ بعد ذلک ظھیر (پ ۲۸ س التحریم، آیت ۴) میں، میرے فرشتے، صالح مومنین، بعد میں آنے والے، پھر ملائکہ سب تیرے ساتھ ہیں۔کیا جملہ فالتو نہیں لگتا؟ کیا یہ بعد کا جملہ تکنیکی لحاظ سے فالتو نہیں لگتا؟ یہ جو کہہ دیا کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔بعد کے جملے کچھ ایسے نہیں لگتے کہ یہ اللہ میاں نے کیا کہا؟ میں ھو مولہ و جبرئیل جبریل کا کیوں تذکرہ؟ جبریل اور بعد میں آنے والے ملائکہ، صالحین و مومنین کیا کوئی بڑی مدد ہیں؟ اللہ سے تو بڑی مدد نہیں ہیں۔جب اللہ نے پیغمبر کو کہہ دیا، میں تیرے ساتھ ہوں، تو بات ختم ہو جاتی ہے۔

مگر اس جملے کو ذرا اس طرح ترجمہ کر کے دیکھیں کہ پیغمبر آپ پریشان نہ ہوں۔میں اور میرے تمام وسائل آپ کے ساتھ ہیں، تو جملہ بامعنی بھی ہو جاتا ہے اور مطلب بھی خوب نکل آتا ہے۔خداوند کریم ہمیں کبھی توفیق نہ دے کہ ہم اپنے پیغمبر کے علم و دانش اور ان کے فضائل پر اعتراض کریں۔ایک ولی اللہ نے بڑی خوبصورت بات کہی تھی کہ خدا کی قسم آج تک ساری زندگی پتہ نہ لگا کہ نفس کے فریب کتنے ہیں اور محمد رسول اللہؐ کے مقام کتنے ہیں۔

ایک بات کی تھوڑی سی وضاحت کہ بعض باتیں ایسی کیوں لگتی ہیں کہ بظاہر پیغمبر نہیں جانتے تھے یا بعض باتیں ایسی کیوں لگتی ہیں کہ پیغمبر سے کوئی خطا سرزد ہوئی۔بڑی اہم سی بات ہے۔اصل میں پیغمبر ایک مکمل کنٹرول یونٹ ہوتا ہے۔ پیغمبر اپنے لیے نہیں ہوتا، یہ ایک مکمل گائیڈڈ یونٹ ہے۔اس کا ہر عمل اس کے اپنے ریفرنس سے نہیں دیکھا جاتا۔اس کے تمام اعمال اس کی پیروی کی ریفرنس سے دیکھے جاتے ہیں۔

ہر قدم، جو وہ اٹھائے گا، اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ خلق تک اس کے کیا نتائج پہنچائے جا رہے ہیں۔ہمارے رسول کی بڑی بات یہ ہے کہ ان کو ایک ٹیکسٹ بک قرآن کی صورت میں دی گئی۔اللہ کے اپنے پیغمبر کے لیے سخت آرڈر یہ تھے کہ وہ اپنی ٹیکسٹ بک سے باہر نہیں جا سکتا۔آپ کی تمام زندگی ایک ایک حرف، ایک ایک لفظ اور ایک ایک لمحہ کنٹرولڈ ہے۔آپ سے جو کچھ بھی سرزد ہوگا، اس کے سبق خلق تک پہنچ جائیں گے۔ایک دفعہ جبریل نہ آئے، تو حضورؐ نے فرمایا کہ جبریل تم زیادہ آیا کرو۔ہمیں تم سے ملنے کا بڑا شوق ہے۔فرمایا رسول اللہؐ! آپ بھی پابند الٰہی ہیں، میں بھی پابند الٰہی ہوں۔ میں اللہ کی مرضی کے بغیر ہل بھی نہیں سکتا۔جیسے آپ سے کوئی عمل سرزد ہو نہیں سکتا، اسی طرح میں بھی خدا کی مرضی سے آتا جاتا ہوں۔میں کسی اور چیز کا مستحق یا کسی اور آرڈر یا خواہش کے تسلط میں نہیں۔

اسی طرح ایک دفعہ حضورؐ نے کھجور کے معاملے میں بظاہر لگا کہ خطا کی اور لوگوں کا خیال یہ ہے کہ رسول کو پتہ نہیں تھا کہ کھجور کی یہ فصل کیسی ہے۔خدا کی قسم! اتنا بڑا اصول رسول اللہؐ نے مسلمانوں کو یہ بخشا کہ پیروں فقیروں کی دعاؤں سے اپنے تکنیکی پراجیکٹس کو طے نہ کیا کرو۔رسول اللہؐ نے اس خطا میں شریک ہو کر لوگوں تک ایک پیغام پہنچایا کہ انسانی زندگی اور تجربہ کو کبھی نظرانداز نہ کرو۔اگر ایک چیز تمہارے ہاں ہزاروں سالوں سے چلی آ رہی ہے، تو ایک پیر کی دعا نہ لو کہ وہ تجربہ الٹ جائے۔ورنہ تمام علوم و فنون غلط ہو جائیں گے اور کسی وقت بھی کوئی معجزاتی کرشمے کی تلاش میں ساری دنیا پیچھے رہ جائے گی۔جیسے آج کی پوری کی پوری قوم ہر میدان میں معجزے کا گمان کرتی ہے۔حالانکہ حالات وہی ہیں، جو پہلے تھے۔

Marfat.com

ابھی بھی ہم کردار و اخلاق میں ویسے ہی ہیں، جیسے پہلے تھے۔ اس طرح دیگر معاملات میں جو بظاہر آپ کو رسول اللہ کا ہلکا پھلکا سا انحراف لگتا ہے، وہ انحراف نہیں ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ آپ کو وہ بات غیب کی کیوں بتائیں گے، جس کے بتانے سے یہ گمان ہو کہ اللہ سے آزاد بھی کوئی رہ رہا ہے۔ رسولؐ اتنے مکمل کنٹرول میں ہیں کہ ان کے منہ سے کیا بات نکلے گی، جو اللہ کے بغیر نکلے۔

وسیلہ کی تعریف

وسیلہ کی تعریف یہ ہے کہ ایسے تمام عوامل جو کسی شے یا کسی شخص کی استعداد میں اضافہ کر کے اسے مقصد کے حصول کے قابل کریں، اسے ہم وسیلہ کہتے ہیں۔ وسیلہ کبھی خیر اور کبھی شر کا ہوتا ہے۔ وسیلے پر اچھے برے کی کوئی قید نہیں۔ یہ ضرورت نہیں کہ خیر ہی وسیلہ ہو۔ کبھی خدا کی طرف سے شر وسیلہ بن جاتا ہے اور کبھی ایسی چیزیں وسیلہ خیر بن جاتی ہیں، جن پر ہم سہوات کا گمان کرتے ہیں۔ حضرت فضائل بن ایاز ڈاکو تھے۔ لوٹ مار کرتے تھے۔ ڈاکہ مارتے ہوئے ایک خیمے کے پاس سے گزرے، تو انہیں اندر سے قرآن شریف کی تلاوت کی آواز سنائی دی۔ وہیں ہر چیز سے توبہ کی اور اپنے وقت کے بہت بڑے استاد اولیاء بھی ہوئے اور ولی حق بھی۔ اگر وہ ڈاکہ نہ مارتے، تو یہ صورتحال شاید کبھی پیدا نہ ہوتی۔

حضرت عبداللہ بن مبارک بہت بڑے محدث، فقیہ اور بہت بڑے اللہ کے ولی تھے۔ انہیں گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔ روزانہ طوائف کے پاس جا کے کھڑے ہوتے۔ استطاعت زیادہ نہ تھی۔ گانا سننے کے لیے نیچے کھڑے ہو جاتے۔ ایک دن ساری رات نیچے کھڑے رہے۔ دروازہ کھل نہ سکا۔ کھڑے کھڑے صبح کی اذان ہوئی۔ جب اذان ہوئی، تو عبداللہ بن مبارک نے اپنے آپ سے کہا، اے بدبخت! ایک ناقص عورت کا گانا سننے کے لیے ساری رات گزار دی اور اپنے اللہ کے لیے دو لمحے نہیں کھڑا ہو سکتا۔ تب ان کے حالات تبدیل ہوئے۔ وہ بہت بڑے مراتب پر فائز ہوئے۔

وسائل ضروری نہیں کہ سارے خیر سے نکلیں۔ قرآن شریف میں خدا کہتا ہے کہ خیر و شر دونوں فتنہ ہیں۔ وسائل میں اللہ کی طرف سے بعض اوقات شر اور بعض اوقات خیر وسیلہ بن جاتا ہے۔ یہ تمام وسائل اللہ کی طرف لانے کی کوشش ہیں۔ فرض کیجیے، ایک آدمی بڑا منافق اور ظالم ہے۔ ٹی وی پر کسی مقرر کی کسی بات سے متاثر ہو گیا۔ اس نے کوئی ایسی بات کہی ہے، جو رقت قلب یا اس کی کیفیت میں اس کے لیے وسیلہ تقرب بن سکتی ہے۔ چنانچہ اول و آخر وسیلہ کی تعریف میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے تمام عوامل جو کسی شے یا شخص کی استعداد کو مقصد کے حصول کے لیے مکمل کرتے ہیں، ہم اسے وسیلہ کہتے ہیں۔

وسیلے کے لیے جدوجہد

قرآن حکیم میں اللہ میاں کے فرمان کے مطابق وسیلے کے لیے تھوڑی بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے نیت میں ذرا سا اخلاص ضروری ہے۔ شیطان نے جب یہ کہا کہ میں تیرے بندوں کو اوپر سے، نیچے سے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے بہکاؤں گا، تو اللہ نے کہا، ٹھیک ہے۔ میں نے تیرا اور تیرے ساتھیوں کا حصہ جہنم میں لکھ دیا ہے۔ الا عباد الله المخلصين (پ ۲۳، س الصافات، آیت ۱۶۰) مگر وہ بندے جو میرے ساتھ اخلاص برتیں گے اور مخلص

Marfat.com

ہوں گے، ان کو تو کچھ نہیں کر سکے گا۔

بظاہر ہم بڑے گنہگار ہوں۔ کم تر محسوس کر رہے ہوں اور بوجہل ہوں۔ مگر اگر ہمارے دل میں خدا اور رسولؐ کے لیے ذرا سی محبت اور اخلاص موجود ہے، تو زندگی کے کسی نہ کسی لمحے میں ہمیں پروردگار عالم ہماری منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے اشتیاق میں دو چار دس جعل سازوں کے ہاتھ بھی چڑھ جائیں۔ مگر یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ آپ خدا کی تلاش کر رہے تھے یا قوتوں اور معجزوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جسے خدا کو تلاش کرنا ہے، وہ دل کو تھوڑا سا دیکھ لے، پہچان لے کہ میرے دل میں اللہ کی آرزو ہے یا معجزات کی تمنا ہے۔ میں کوئی معجزاتی کام دیکھنا چاہتا ہوں یا پاورز طلب کر رہا ہوں، اس کو خود بخود پتہ چل جائے گا کہ اس کی طلب کیا ہے اور کیا منزل ہے۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ جس کو اللہ کی آرزو ہے، اللہ اس کو منزل تک ضرور پہنچا دے گا۔ خواہ وہ کے۔ ایل۔ گابا ہو یا تبت کا لاما، اینا ماری شمل یا ڈاکٹر فاطمہ بارکر ہو، جس کے دل میں خدا کی آرزو پیدا ہوئی، وہ اپنے اللہ تک کسی نہ کسی طریقے سے ضرور پہنچ جائے گا۔

وسیلے کی حد اور شرک

بڑا خوبصورت سوال ہے۔ ابن عباس سے کسی نے پوچھا، شرک کیا ہے؟ فرمایا، کسی سے پانی کا گلاس مانگنا بھی شرک ہے۔ اگر انسان شک و شبہہ میں نہ پڑے اور باوجود اس کے کہ ہمارے دلوں میں رسولؐ کے لیے بے حد انس و محبت ہے، ایک سوال تو آپ سب اپنے آپ سے کر سکتے ہیں کہ آپ رسول کو کیا سمجھتے ہیں؟ کیا آپ انہیں خدا سمجھتے ہیں؟ جب وہ نہیں ہیں، تو نہیں ہیں۔ اس کے بعد اللہ انہیں کیا عطا کرتا ہے، کیا نہیں کرتا، آپ کے عقیدے میں ایک وضاحت ضرور ہونی چاہیے اور یہ بالکل واضح ہونا چاہیے کہ مخلوق ہر حال میں مخلوق ہے اور خالق ہر حال میں خالق ہے۔ خالق کے لیے کوئی چیز ناگزیر نہیں ہے۔ بخدا وہ چاہتا، تو وہ بہت سارے محمد رسول اللہ اور بے شمار موسیٰ و عیسیٰ پیدا کر لیتا۔ اس نے نہیں چاہا۔ اس نے ایک ہی محمدؐ کو چاہا۔ اس کی رضا ہے۔ وہ اپنے پروٹوکول کو سختی سے قائم کرتا ہے اور اس فرق کے ساتھ ہمیں بھی قائم کرنا ہے کہ

با خدا دیوانہ باشد با محمد ہوشیار

اللہ سے لڑنا ہے، تو لڑ لیا کرو، جھگڑ لیا کرو۔ دو اس سے سنو، دو اپنی کہو۔ کچھ اپنا گریباں چاک کچھ دامن یزداں چاک۔ مگر خیال رہے محمد رسول اللہ کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہو۔ اس لیے کہ وہ ہمارا پروٹوکول ہے۔ اللہ پر ہمارے کسی طعنے، کسی لفظ کا اثر نہیں ہوتا۔ مگر اگر ہماری کسی ناقص بات کا چہرۂ رسولؐ پر انقباض آ جائے، تو اللہ آپ کو نہیں چھوڑے گا۔ قرآن حکیم میں اللہ نے کہا کہ اے لوگو! اللہ کے نبی کے سامنے آوازیں بلند نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے آواز بلند کرنے سے تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں۔ اُولٰئِک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرۃ (پ ۲، س البقرہ، آیت ۲۱۷) ایسا نہ ہو، تم جہنم میں صرف اس لیے ڈال دیئے جاؤ کہ تم نے رسول اللہؐ کے مقابلے میں آواز بلند کی۔

ایک صحابی جن کی آواز قدرتاً بلند تھی۔ جب انہوں نے قرآن کی یہ آیت سنی، تو وہ اپنے گھر چلے گئے۔ دروازہ بند کیا اور اپنے آپ کو ستونوں سے باندھ لیا۔ رویا کئے۔ جب دھاڑیں مارنے کی آواز باہر آئی، تو لوگ بھاگے۔ دیکھا کہ عمرو بن معدی کرب ہے۔ اس خوف سے مر رہا ہے کہ میری تو آواز اونچی ہے۔ میں رسول اللہؐ کے سامنے جا ہی نہیں سکتا۔

Marfat.com

جاؤں گا، تو میری آواز اونچی ہو جائے گی۔ حضورؐ نے سنا، تو مسکرائے اور فرمایا، یہ قرآنی آیت قدرتی اونچی آوازوں پر لاگو نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد گستاخانہ فکر اور اللہ کے رسولؐ پر خوانخواہ کے اعتراض چننے پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے مراد ان کے مقامات گننے، ان کی حدود کا تعین کرنے اور ان کے مقامات علم پر اعتراض کرنے پر لاگو ہوتی ہے۔ اگر آپ اتنے بڑے عالم ہوتے اور آپ کی اتنی بڑی پہچان اور اتنی بڑی شناخت ہوتی، تو اللہ آپ ہی کو ان کی جگہ پیغمبر بنا دیتا۔ مگر جو اس نے چنا، وہ بہترین چنا۔ اسی لیے حسان بن ثابت نے کہا، اے اللہ کے رسول! مجھے تو ایک ہی بات سمجھ آئی کہ جیسے آپ نے سوچا کہ آپ کو بنایا جائے، ویسے ہی اللہ نے آپ کو بنا دیا۔

یہاں شرک اس لیے نہیں ہو سکتا کہ طاقتیں Inherent ہیں اور رسولؐ اللہ کی عطائی ہیں۔ یہ تھوڑا سا فرق سمجھ لیں، تو آپ سے قیامت تک شرک نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی تمام قوتیں اس کی ذاتی ہیں۔ محمد رسولؐ اللہ کی تمام قوت و بلاغت عطائی ہے۔ اگر کوئی سوال یہ ہو کہ رسول اللہ ؐ کو ساری چیزیں کہاں سے ملیں، تو آپ آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں اللہ نے عطا کیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ اللہ کی طاقتیں کہاں سے آئیں، کس نے اسے دیں؟ آپ جانتے ہیں کہ کسی نے اسے نہیں دیں۔ خالق اور مخلوق کا فرق یہی سارا بڑا فرق ہے۔ جو فرد اس فرق سے آشنا ہے، وہ کبھی بھی غلطی نہیں کر سکتا۔ مقام محمدؐ مقام محبت ہے اور مقام محبت اللہ کی بہترین پسند کا مقام ہے۔

حدیث مبارک کے مطابق فرمایا، اے جبریل! یہ منادی کر دے کہ زمین و آسمان میں فلاں شخص میرا دوست ہے جو میرے دوست کے خلاف لڑے گا، میں اس کے خلاف خود لڑوں گا۔ وہ ایک عام دوست کی توہین برداشت نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ محمد رسول اللہ کی برداشت کرے، جو غرض و غایت کائنات ہیں۔ وسیلہ تخلیق ہیں۔ وسیلہ تعلیم، وسیلہ ایمان اور وسیلہ محبت ہیں۔ آپ میں سے کتنے لوگ ہیں، جو خدا کی تعریف اس طرح کر سکتے ہیں جیسے محمدؐ کر سکتے ہیں؟ ہر بلا سے بڑی محمد کی بلا تھی۔ ہر آزمائش سے بڑی آقائے رسولؐ کی آزمائش تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ بات کہ جو جزوی طور پر قرآن پیغمبروں کو دیا گیا، وہ پورے کا پورا محمد رسولؐ اللہ کو دے دیا گیا۔ ایک ایک لفظ کی صداقت اس نے اپنے اعمال سے ظاہر کی۔ ایک ایک عمل کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کے اوقات و لمحات اللہ کی راہ میں تج دیئے۔

یہ تو وہ شخص ہیں کہ جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا، یا رسول اللہؐ جب اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے، تو پھر آپ کیوں مشقت اٹھاتے ہیں؟ فرمایا، عائشہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ یہ تو بندگی کا کمال ہے۔ حسن سلوک کی معراج ہے۔ یہ وہ رومانس ہے، جو زمین و آسمان پر مشہور ہے۔ یہ بڑا رومینٹک تعلق ہے۔ مجھے تو خدا پر حیرت ہے، آپ رسول اللہ کی بات کرتے ہیں۔ رسول اللہ کے وجود کرم سے اتنا تو ثابت ہوا کہ اللہ کے دل میں بھی کوئی محبت کا گوشہ ہے۔ ورنہ اس طاقت کے معیار پر محبت کا نام و نشان بھی جرم ہوتا ہے۔ شکر ہے کہ رسول اللہؐ کے وجود مبارک سے ہمیں یہ پتہ چلا کہ اللہ بھی کسی کے بارے میں نرم گوشہ رکھتا ہے۔

اولیاء اللہ وسیلہ کس طرح

میں نے بہت ساری احادیث وقت کی کمی کی وجہ سے نقل نہیں کیں۔ حضورؐ ہم میں موجود نہ ہوں گے، جب

قیامت آ رہی ہوگی۔ اس وقت شاید ہم بھی موجود نہ ہوں۔ قیامت جو آ رہی ہوگی اور قیامت نہیں آئے گی۔ حضور یزداں یہ پوچھا جائے گا کہ جی آپ قیامت لا کیوں نہیں رہے؟ چہ اب لوگ تو کافر ہیں۔ بدتمیزی پر اتر آئے ہیں۔ تجھے مانتے نہیں ہیں۔ تجھ سے سرکشی کر رہے ہیں۔ یہ منکر قوم تباہ کیوں نہیں ہو رہی یا خدا؟ یہ تو اتنی بڑی Wastage کیوں کر رہا ہے؟ تجھے نہیں، لیکن ہمیں غصہ آ رہا ہے کہ اتنی ساری دنیا میں اتنے سارے لوگوں میں سے تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہے، تو قیامت کیوں نہیں لا رہا؟ اللہ کہے گا، اپنے رسول سے پوچھ لو کہ کیوں نہیں قیامت لا رہا؟ تو ہم رسول اللہؐ سے پوچھیں گے، یا رسول اللہؐ قیامت کیوں نہیں آ رہی؟ فرمایا، جب تک زمین پر ایک بھی شخص اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے، قیامت نہیں آئے گی۔ اس وقت تو حضور نہ ہوں گے۔ بڑے بڑے اولیاء بھی گزر گئے ہوں گے۔ مگر جب تک اخلاص قلب سے ایک شخص بھی اللہ کو یاد کرنے والا زمین پر ہوگا، قیامت نہیں آئے گی۔ قیامت، بنجر، ویران، مردہ تن اور بدسرشت لوگوں پر آئے گی، جو اللہ سے مکمل آگاہ نہ ہوں گے۔ صرف جبلی شعور سے آشنا ہوں گے۔ جو جانوروں اور پرندوں کی طرح زمین پر زندگی بسر کریں گے۔ مگر ان میں اگر ایک اللہ اللہ کرنے والا بھی نکل آیا، تو قیامت قائم نہیں ہوگی۔

حدیث رسولؐ ہے کہ اتنا خدا کو یاد کر کہ تیرا دل ایک ویرانے کی طرح ہو جائے اور اس ویرانے میں ایک چراغ اللہ کی یاد کا جلتا ہوا ہو۔ اور اتنا اللہ کو یاد کر کہ لوگ تجھے پاگل سمجھنا شروع کر دیں۔ جب اتنا اللہ کو یاد کرنے والا شخص آگے بڑھے گا، تو سوال یہ ہے کہ اس کا زمین و آسمان میں کچھ مقام تو ہوگا؟ وہ کس حیثیت کا شخص ہوگا، جو اس قدر بے چینی، اضطراب، قلبی خشوع اور خضوع سے اللہ کو یاد کر رہا ہوگا۔ آخر اس کا بھی کوئی لحاظ تو اللہ کے نزدیک ہوگا؟ اللہ کہتا ہے کہ اے پیغمبر! کہہ دے کہ میں اس شخص کی دعا کے عوض بارش برساؤں گا۔ میں زمین پر اس کی وجہ سے زرخیزی لاؤں گا۔ اسی کی وجہ سے میں زندگیاں بڑھاؤں گا۔ اسی کی مخالفت میں میں لوگوں کو تباہ و برباد کروں گا۔ یہ شخص ہے، جو محور زمین ہے۔ خلیفۃ الارض ہے۔ جس کی سرشت پاک کے عوض خدا ترتیب نظام اوقات رکھتا ہے۔ جب یہ ختم ہوگا، تو قیامت آ جائے گی۔

اس لیے ہمارا اور کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ شاید دنیا اور جہان میں خدا کے دوستوں کی کمی ہے۔ ورنہ ابھی پچاس سال پہلے بہت سارے نہیں، تو دس بیس تو اللہ کے ایسے بندے موجود تھے، جن پر لوگ اچھا گمان کرتے تھے۔ وہ اس گمان کے اہل تھے۔ وہ خدا کے بندوں کو سکون اور طمانیت کی دولت عطا کرتے تھے۔ آج کے اتنے مضطربانہ عہد میں اور خوف، بے چینی اور اضطراب کے اس زمانے میں اگر کوئی شخص آپ کو ایک شمہ برابر بھی سکون بخش جائے، تو وہ اللہ کے ولی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

محمد، احمد اور مقام محمود

مقام محمود، مقام وسیلہ، مقام شہادہ علیحدہ علیحدہ Connotations ہیں۔ وسیلہ، انسٹرومنٹ اور ایک انسٹی ٹیوشن ہیں۔ اس کا ایک رخ شہادہ اور ایک رزق کا ہے، جیسے تمام کائنات میں وسائل کے ذریعے رزق بٹتا جا رہا ہے۔ مقام محمود ان دونوں میں ذرا سا اس لیے جدا ہے کہ یہ خدا کی تعریف کا مقام ہے۔ محمود کا مطلب ہے، جس کی تعریف کی گئی۔ زمین کے لوگ رسول اللہؐ کو محمد اور احمد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یعنی زمین پر وہ تعریف کیا گیا ہے، جبکہ آسمان پر وہ تعریف کر رہا

Marfat.com

ہے اور کرنے والا ہے۔ خدا ان کے دونوں کے عوض جو مقام رسول اللہ کو لوٹائیں گے، وہ مقام محمود ہے یعنی سب سے احسن، اعلیٰ تر تعریف کا حقدار اور سب سے زیادہ خدا کی محبت کا جاننے والا، انس رکھنے والا، اللہ کی تعریف میں یکتا اور اللہ کی تعریف میں دوسروں سے قطعاً مختلف۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ تمام اہل قدیم کے صحائف اور تمام کتب ہائے زبور وانجیل پڑھ لیجیے، ان کے مقابلے میں جس لہجے میں رسول اللہؐ نے خدا کی تعریف کی ہے، پہلے کبھی نہیں کی گئی نہ بعد میں کبھی کی جائے گی۔ یہودیوں کی کتابوں میں یہوداہ کو گاڈ آف اسرائیل کہتے ہیں۔ ''ہسٹری آف ریلجن'' کے مصنف کو اٹھا کے دیکھ لیجیے، مذہب کے جہاں تک نقوش دکھائی دیتے ہیں، تمام خاندانوں، قبیلوں اور قوموں نے اللہ کو ایک انفرادی اور مقامی تصور دیا۔ سوائے اسلام اور اللہ کے رسول محمد رسول اللہؐ کے، جنہوں نے خدا کا تصور بین الکائناتی، مکمل اور ایک حتمی ہستی کے طور پر پیش کیا، جو جزوی آثار میں قید نہیں ہے۔ میرے خیال میں اللہ کے صحیح مقام کی وضاحت یا ان کی توجیح صرف رسول اللہؐ نے کی ہے۔ اس لحاظ سے صرف اسلام ہی بین الاقوامی مذہب ہے۔

شفاعت سے محروم کون

حضورؐ کا شفاعت کے لیے تین مرتبہ اٹھنا تو راز و نیاز میں شامل ہے۔ کبھی کبھی میرے دل میں آتا ہے، اللہ کو پتہ بھی ہے کہ رسول اللہؐ نے تین مرتبہ اٹھنا ہے اور میں نے تینوں مرتبہ بخشنا ہے، تو بھلا پہلے ہی کیوں نہ سب کو بخش دیا۔ جتنے سوال اللہ کے رسولؐ پر آئے، ویسے ہی قریباً اللہ پر آتے ہیں۔ مگر چونکہ سارے سسٹم اللہ ہی کے تخلیق کردہ ہیں، میں پوچھوں کہ یہ سسٹم اس طرح کیوں ہے؟ وہ سسٹم ایسا کیوں ہے؟ خدا ان سے آزاد بھی تو سارے کام کر سکتا تھا؟ جیسے جنگ بدر میں اللہ نے کہا، میں تمہاری خود بھی مدد کر سکتا تھا۔ مجھے ملائکہ وغیرہ کے بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر میں نے تمہارا دل رکھنے کی خاطر ان کے خلاف ملائکہ کی مدد بھیج دی، جنہوں نے تمہارے ساتھ مل کر جنگ کی تھی۔ یہاں بھی بالکل اسی قسم کے اصولوں کا اعادہ ہوتا ہے۔

چنانچہ پہلی مرتبہ رسول اللہؐ اٹھیں گے تو اللہ کہے گا، اے نبی! میرے دوست جاؤ، جو کچھ آپ نے چھڑانا ہے، چھڑا لاؤ۔ آپؐ چھڑا کے لے آئیں گے۔ پھر عرض کریں گے، یا رسول اللہؐ ابھی کچھ لوگ امت کے باقی ہیں۔ آپؐ پھر اٹھیں گے۔ پھر تعریف خداوند کریں گے۔ اس میں آپ کو راز کی بات بتاؤں۔ اللہ میاں، ہو سکتا ہے، کچھ لوگ رسول اللہؐ کو شفاعت کرتے وقت بھلا دیتے ہوں۔ اس بھلانے کی مصلحت بتاتا ہوں۔ پروردگار کی تعریف و توصیف کے بعد فرمایا گیا، تو نے مجھ سے مقام شفاعت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا اور کہا تھا کہ میری شفاعت قبول کی جائے گی۔ فرمایا، ہاں میں نے وعدہ کیا تھا، شفاعت فرمائیں گے۔ تو فرمایا میرے کچھ لوگ ابھی باقی ہیں۔ حکم ہوگا کہ جہنم میں یہ یہ جو لوگ ہیں، نکال لاؤ۔ پھر جب تیسری مرتبہ رسولؐ اللہ کو پتہ چلے گا کہ ابھی بھی کچھ لوگ باقی ہیں، تو پھر کہا جائے گا، یا رسول اللہ! ابھی کچھ اور لوگ باقی ہیں۔ حضورؐ کو پھر یاد آئے گا۔ آپؐ خداوند کے حضور دست بستہ عرض فرمائیں گے، یا پروردگار عالم! مقام شفاعت کے بارے میں آپ کا وعدہ ابھی پورا نہیں ہو۔ فرمایا ان اللہ یا یخلف المیعاد (پ ۳، س آل عمران، آیت ۹) ہم وعدہ

Marfat.com

بالکل پورا کریں گے۔آپ بتائیں، کیا کہتے ہیں۔ پروردگار ابھی کچھ لوگ باقی ہیں۔اچھا جاؤ، ان کو بھی نکال لاؤ۔

تو تین دفعہ حضورؐ شفاعت کے لیے کھڑے ہوں گے۔تین دفعہ مختلف گروہ جہنم سے آزاد کیے جائیں گے۔لیکن کبھی آپ نے یہ سوچا کہ ایک ہی دفعہ کیوں نہیں؟ بات یہ ہے کہ کچھ لوگ دس ہزار سال کی سزا کے مستحق ہوں گے۔کچھ بیس ہزار سال اور کچھ تیس ہزار سال کے۔پہلی مرتبہ ان کو بلائے گا، جن کی سزا دس ہزار سال تھی۔تیسری مرتبہ ان کو بلائے گا، جن کی سزا تیس ہزار سال تھی۔شفاعت تو مقرر ہے۔اس میں ایک تو حکمت الٰہی پوری ہو جائے گی۔دوسرا اللہ کے رسول کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔

چوتھی مرتبہ رسول اللہ ؐ پھر کھڑے ہوں گے کہ ابھی بھی کچھ لوگ باقی ہیں۔اللہ فرمائے گا، اے میرے رسولؐ! میں نے تجھ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کر دیا ہے۔اب تیری امت کے جو لوگ تجھے جہنم میں نظر آتے ہیں، ان میں اور تیری شفاعت میں کتاب حائل ہے۔وہ لوگ، جو بظاہر مسلمان نظر آتے ہیں اور مسلمان لگتے تھے، مگر مسلمان نہ تھے۔یہ وہ منافق مسلمان ہیں، جو خدا کے تمام احکام سے زیادہ سیکولر قدروں کو حیثیت دیتے تھے۔اس لیے اب وہی لوگ رہ گئے ہیں، جنہیں قرآن نے روک رکھا ہے۔یہ قرآن کافروں، مشرکوں اور منافق مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کرنے والی کتاب ہے۔ان میں اب تیرا کوئی بندہ نہیں۔یہ تجھے مسلمان لگتے ہیں، لیکن یہ یا منافق ہیں یا مشرک یا کافر ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں، جن کو شفاعت فائدہ نہیں دیتی۔

شناخت منزل

شناخت منزل سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی گزارنے نکلیں اور اپنے مقام حیات کی ابتداء سے انجام تک ہم یہ چاہیں کہ اپنی زندگی قرینے، سلیقے اور خیر سے گزاریں، تو ہمیں سب سے پہلے اس رہبر اور اس تعلیم دینے والے کا نشان ڈھونڈنا پڑتا ہے، جو ہمیں آرام وسکون اور عافیت کے ساتھ اس منزل دارِفتن سے گزار دے اور ہمیں اپنی قبر کے دہانے تک امن سے پہنچا دے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا، بہت سارے لوگ آگ کے گڑھے کے گرد جمع ہیں۔ اس میں ٹوٹ پڑنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں جبراً انہیں کمر سے کھینچ کھینچ کر پیچھے کر رہا ہوں۔ یہ حال اس استاد کا ہے، جس کی تمام زندگی اپنے لوگوں کے لیے ڈرتے، خوف کھاتے اور خدا سے آرزو کرتے ہوئے گزر گئی۔ فرمایا، تمام انبیاء نے اپنی دعا میں جلدی اور میں نے اپنی دعا کو اپنی امت کے لیے چھپا لیا۔ جب آخر زماں آئے گا، روز محشر ہوگا۔ جب قیامت ہوگی اور میں مقام شفاعت پر رکھا جاؤں گا، تو پھر میں اپنی دعا کو خدا کے حضور پیش کروں گا۔ اس دعا کا خلاصہ یہ ہے کہ جس نے دل سے ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ کہا، اے پروردگار! تو اس پر نار دوزخ کو حرام کر دے۔

جب انسان کی عقل ابھی بلوغت کو نہ پہنچی تھی۔ جب شعور ابھی پختہ کار نہیں ہوا تھا، تو خدا کو انسان کو سبق سکھانے کے لیے ایسے طریقوں کی ضرورت پڑی، جنہیں ہم معجزات، خارق عادت اور محیر العقول کام کہتے ہیں۔ جب انسان یہ دیکھتا تھا کہ اس کی استطاعت میں کوئی کام کرنا نہیں یا اس کی عقل وفراست میں کوئی وجہ اس کام کے ہونے کی نہ نظر آتی ہو، تو خدا وہ کام کر کے بتاتا اور لوگ یہ یقین کرتے کہ جب ہم ایک کام نہیں کر سکتے، تو ہم سے کوئی بالا قوت یہ کام کر سکتی ہے۔ اس کا نام اللہ یا خدا رکھا جاتا ہے۔ تمام معجزات بنیادی طور پر اس کم عقل اور بے شعور معاشرے کے لیے ایک دلیل کی حیثیت رکھتے تھے جن کے نزدیک خدا کا اقرار یا انکار کوئی حیرت انگیز واقعہ پر مبنی ہوتا ہے، وہ اگر کسی غیر مرئی قوت یا کسی بالائی طاقت پر یقین رکھتے ہیں، تو اس واقعہ کی وجہ سے یقین رکھتے ہیں، جو ان کی عقل ودانش میں نہ آئے۔ جسے وہ اپنی تمام تر انسانی قوتوں سے سرانجام نہ دے سکیں۔

اسی لیے جب پروردگار عالم نے یہود کا مسلسل انکار اور ان کی اطاعت سے ان کا گریز دیکھا، تو ان کے سروں

پرطور پہاڑ اکھاڑ کے کھڑا کر دیا اور کہا، اب بتاؤ؟ اگر تم میری بات نہ مانو گے، تو یہ پہاڑ دیکھتے ہو، تم پر گر جائے گا۔ چنانچہ ان حجت آزماؤں نے جب یہ دیکھا کہ اتنا حیرت انگیز اور خوفناک واقعہ ہم میں سے کسی فرد کے بس کی بات نہیں کہ پہاڑ اکھاڑ دے۔ سوایک ایسی ذات بھی ہو سکتی ہے، جسے موسیٰ اللہ کہہ رہا ہے۔ رب اور خدا کہہ رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے جبراً اطاعت قبول کی۔

مگر اللہ نے جبراً اطاعت کے لیے انسان کو پیدا نہیں کیا نہ معجزات کے لیے انسان کو پیدا کیا تھا۔ جب تک ان میں شعور کی کمی تھی۔ معاشرہ، جبلی اقدار کا حامل تھا اور جب تک ان کے ہاں ہوش اور شعور کی کمی تھی، خدا معجزات کا سہارا لیتا رہا۔ اللہ کو ضروری محسوس ہوا کہ وہ ان کے لیے ان کی جبلی قدروں کے پیش نظر یہ انداز اختیار کرے۔ کچھ ان میں حیرت اور خوف پیدا کرے۔ مگر یہ طریق اللہ کے نزدیک مناسب ترین طریقہ نہ تھا۔ پرانے انبیاء میں معجزات کی کثرت ملتی ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تمام زندگی پیدائش سے لے کر آسمان پر اٹھائے جانے تک معجزات سے بھرپور ہے۔ کہاں کوڑھیوں کو ٹھیک کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، بے جان میں جان ڈالنا اور کہاں اتنے سارے ہنگاموں میں لوگوں سے صرف ایک اقرار لینا کہ انا ھدینہ السبیل واما شاکراً واما کفورا (پ۲۹، س الدھر، آیت ۳) اگر تم یہ سارے شواہد دیکھ کے بھی ایک سادہ سی بات نہ کہہ سکو کہ اللہ ہے، تو پھر ان معجزات کا کیا فائدہ؟

مگر معجزات میں ایک پرابلم بھی تھا۔ خدا کہتا ہے، میں دو علم ایک ہی جگہ سے اکٹھے شروع کرتا ہوں۔ پھر جس میں حضرت انسان کا فائدہ ہو۔ اس کے لیے فضل ہو اور اس میں حضرت انسان کو کافی دور تک اس کی نسلوں کو فوائد پہنچیں، وہ انسان کے لیے رکھ چھوڑتا ہوں۔ فرمایا پروردگار عالم کے رسولؐ نے کہ اللہ پہلا عالم ہے۔ اللہ سب سے بڑا فیاض ہے اور سب سے بڑی فیاضی اللہ کی یہ ہے کہ اس نے انسان کو قلم اور علم عطا کیا۔ پھر سب سے بڑا عالم میں ہوں، جس نے تمہیں آگ سے بچنے کے اصول دیئے۔ جس نے تمہیں جنت میں داخلے کے اصول دیئے اور میرے بعد وہ عالم سب سے بڑا عالم ہے، جو لوگوں کو خدا کے لیے علم دے۔ خدا کے لیے تعلیم دے اور ان سے صلہ نہ طلب کرے۔

اس عالم اول نے انسانوں کو بنائے عقل دیتے ہوئے جو حصہ انسانوں سے لے لیا، وہ معجزات تھے۔ وہ اس لیے لے لیا کہ یہ معجزات اور جادوگری کی سوچ اکٹھی تھی۔ سحر اور جادوگری بھی حیرت انگیز کام سرانجام دیتے۔ اگر معجزات کا سرچشمہ خدا کی ذات تھا، تو جن اور بھوت بھی جس چیز کا علم حاصل کر کے لوگوں کو فریب ذات دیتے تھے یا لوگوں کے ساتھ دھوکہ کرتے تھے، بنیادی طور پر اس کی بھی تخلیق اللہ ہی کے پاس تھی۔ مگر سحر صرف اور صرف اس لیے تخلیق کیا گیا کہ یہ لوگوں کے ایمان، راستی اور عقل کی آزمائش تھی۔ قرآن میں ہے کہ اللہ کے پیغمبر کفر نہیں کرتے تھے۔ وہ جو تعلیم دیتے تھے، ان کے پاس حیرت انگیز کمالات تھے۔ جانوروں کی زبان سننے کا ملکہ تھا اور ان کے پاس تسلیم و رضا تھی۔ ہواؤں کو مسخر کرنا اور ان کی جنات پر قوت تھی۔ یہ سب اللہ کی مدد سے تھی۔ اللہ کے لیے تھی اور اللہ ہی کے لیے وہ استعمال ہوئی۔

مگر اس معاشرے کے لوگ اپنے اختیارات کی خواہش کو اتنا بڑھا چکے تھے کہ جب خداوند کریم نے دوسری سمت اور اس دوسری طرز جہالت کو ان کے لیے پیش کیا، تو بجائے صحت مند عقلی افتخار کے جاہلانہ روش کی طرف مائل ہوئے۔ اگرچہ ملائکہ انہیں یہ کہتے تھے کہ خبردار! ہم نے اس لیے نہیں ہاروت و ماروت کو نازل کیا تھا کہ خدا کی طرف سے

Marfat.com

لوگوں کو سحر سکھائیں، بلکہ اس لیے نازل کیا تھا کہ دیکھو، یہ ایک ناقص چیز ہے، جو خدا کی راہ سے تمہیں بہکا دیتی ہے۔ یہ ایک غلط طرز عمل اور غلط طرز فکر ہے۔ جادو کی رغبت رکھنا، سحر کی فکر کرنا، سحر کی سمت جانا بہتر انسانوں کا شیوہ نہیں ہے۔ یہ تمہیں یقیناً خدا کے راستے سے بہکا دے گی۔ اس لیے اس کی طرف نہ جانا اور اگر جانا ہوا، تو کفر کا ارتکاب لازم ہو جائے گا۔ اگر تم اس طرف گئے، تو یقین جانو کہ تم ایمان کو چھوڑ کر کفر کے رستوں پر جا رہے ہوں گے۔ لیکن اس وارننگ کے باوجود وہ علم کی ان ناقص ضروریات کی طرف جاتے تھے۔ حالانکہ پروردگار عالم نے فرمایا کہ اس سحر اور اس جادو کا اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ بھولی بھالی عورتوں کو بہکا کر ان کو خاوندوں سے جدا کر دیتے ہیں۔ اس کے اثرات میں میاں بیوی میں فرق ڈال دیتے ہیں۔

مگر کیا جادو اور سحر فراق ڈال دیتا ہے؟ کیا اس میں اتنا علمی کمال موجود ہے کہ خدا کے ہوتے ہوئے اور اس کی بندگی کرتے ہوئے یہ اتنا بڑا فرق ڈال دے؟ ایسا بالکل نہیں ہے۔ بلکہ ایک بنیادی وجہ سحر کے اثر کی یہ ہے کہ جو رحمٰن کے ذکر سے غافل ہوا، اللہ اس پر ایک شیطان کو غلبہ دیتا ہے اور وہ اس کے قریب رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جادو کا بنیادی وصف یہ بتایا کہ تم ایسی بات کیوں سیکھتے ہو، ایسی بات کی طرف کیوں جاتے ہو، جس کا کوئی ضرر ہے نہ کوئی نفع۔ سائیکالوجی کا ایک قانون اعتبارات کا قانون ہے کہ چاہو تو اعتبار کرو، چاہو تو نہ کرو۔

علم اور اعتبار میں بڑا فرق ہے۔ علم اعتبار کرواتا ہے۔ علم کے پاس دلائل، شواہد اور براہین ہیں، تجربات ہیں۔ آپ نہ بھی ماننا چاہو، علم آپ سے حقائق کی بنیاد پر اپنے آپ کو تسلیم کرواتا ہے اور اعتبار کے لیے آپ کو دانستہ اپنے عدم اعتبار کو معطل کرنا پڑے گا۔ اپنے شک وشبہ، تنقید اور اپنے ذہن کے تمام سوالات کو معطل کر کے آپ کو اس بات پر یقین لانا پڑے گا۔ اگر آپ کا شک وشبہ، عقل، دین، خدا پر اعتبار اور اسلام سلامت رہا، تو آپ کسی سحر کاری، کسی جادوگری اور کسی تعویذ اور اس کی کسی نقصان دہ چیز پر اعتبار نہیں کر سکتے۔

اس کی وجہ؟ دیکھو، جو خدا علم کو آپ کی پیدائش سے بہت پہلے شروع کرتا ہے۔ جو مقصد انسان یہ بتاتا ہے کہ اناھدینہ السبیل اما شاکراً واما کفورا اب اس کا انجام دیکھیں۔ جب آپ قبر میں جاتے ہیں اور مردہ جانے والوں کے قدموں کی آواز سنتا ہے۔ جب وہ جانے والے اسے رخصت کر کے اپنے عدم کو سدھار جاتے ہیں اور یہ دوسرے عدم کی تیاری کر رہا ہوتا ہے، تو منکر نکیر تشریف لاتے ہیں۔ وہ رسول اللہؐ کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ شخص کون تھا؟ اس شخص نے تمہیں کیا دیا؟ یہ جسے تم زندگی میں رحمتِ دو عالم اور رسول اللہؐ کہتے تھے۔ جس کی نعتیں پڑھتے اور گیت گاتے تھے۔ جسے ملائے اعلیٰ سے سب سے بڑی ہستی سمجھتے تھے۔ بعد از خدا بزرگ تو ئی قصہ مختصر کہتے تھے، اب ذرا بتاؤ کہ یہ کون ہیں؟ جس نے دنیا میں باقاعدہ تعلیم و تربیت اور قرآن وحکمت کے ساتھ اپنے رسول پر ایمان رکھا، وہ تو فوراً پڑھ کے سنا دے گا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھدان محمد عبدہ و رسولہ کہ اس صورت گرامی کو نہ پہچانوں، تو میں اپنی اصل نہیں پہچانتا۔ یہ تو وہ ہیں، جنھوں نے مجھے آگ کے گڑھے سے نجات دی۔ جن کی برکات ازلی مجھ تک ہیں۔ قیامت تک انہوں نے میرے ساتھ جانا ہے۔ ان کو کیسے بھول جاؤں؟ پھر اس کو کہا جاتا ہے، تو اپنے جنت میں مقامات دیکھ لے۔ رنجیدہ نہ ہو، تیرا جواب درست ہے۔ دور تک دیکھ! یہ رحمتیں، یہ قبر کی کشادگی، یہ تیری روح پر سے

Marfat.com

بوجھ کا اٹھنا، یہ سب اسی شخص کی برکت سے ہے۔

یہ بڑی اہم بات ہے، جو میں آپ کو بتانے والا ہوں۔ یہ بات اس سسٹم پر ضرب لگاتی ہے، جس سسٹم پر ہمارا آج کا اعتقاد کھڑا ہے۔ جب ایک دوسرے بندے سے پوچھا جائے گا کہ تو کیا اس شخص کے بارے میں کہتا ہے؟ کہے گا، میں ٹھیک طور پر نہیں کہہ سکتا I don,t know exactly میں نے خود تو سوچا ہی نہیں۔ میں تو وہی کہتا تھا، جو دوسرے لوگ کہتے تھے اور دوسرے لوگ تو یہ اور یہ کہتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے۔ ملائکہ یہ کہیں گے کہ اے بدبخت! تو نے زندگی بھر اپنی عقل استعمال نہیں کی۔ تو نے کبھی کتاب پر غور وفکر نہیں کیا۔ تو منافق ہے اور تیری سزا یہ ہے کہ ستر سال کا بوجھ تیرے سر پر آن پڑا ہے۔ یہ عذاب تیرے لیے ہے اور تیرا مقدر ہے کہ تو نے خدا کی دی ہوئی سب سے بڑی نعمت کی بے قدری کی۔ تو نے علم ومعرفت کی بے قدری کی۔ تو نے اپنے وصف کو زمین میں دبا دیا۔ تو اب ہم سے کیا توقع رکھتا ہے کہ ہم تجھے کیا دیں؟

ایک بات اچھی طرح یاد رکھیے کہ آپ کے تمام علوم اور آپ کے تمام پیشے کسی کردار کا تقاضا نہیں کرتے۔ کسی ڈاکٹر کا پیشہ جب وہ تعلیم حاصل کر رہا ہوتا ہے، کسی کردار کا تقاضا نہیں کرتے۔ آپ بدکار ہوں یا بے کار، آپ غصے والے ہوں یا جذباتی، آپ لعنت وملامت والے ہوں یا رحمت والے، آپ کو اپنا استاد یہ نہیں کہے گا کہ پہلے یہ اخلاق پیدا کرو، پھر میڈیکل سائنسز کا مطالعہ کرو۔ آپ کو صدر شعبہ یہ نہیں کہے گا کہ اس فارمولے کے پیچھے فلاں کردار چاہیے۔ یہ نہیں ہوتا۔ تمام پیشہ ورانہ علوم آپ سے حصول علم کے وقت کسی کردار کا مطالبہ نہیں کرتے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سوسائٹی آپ کو اخلاقی نظام دیتے ہوئے ایک پروفیشنل اخلاق دے۔ ڈاکٹر یا انجینئر کہے کہ ڈاکٹری یا انجینئرنگ حاصل کرنے کے بعد یہ اخلاق آپ کو چاہیے۔

جو بھی آپ چار بندے حصول تعلیم کے بعد جب کوئی نظام مرتب کریں، تو وہ اخلاقی نظام ہوتا ہے، اس مضمون کا نظام نہیں ہوتا۔ کوئی بھی سائنسی علم یا حساب آپ کے خیالات اور جذبات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ کسی قسم کے مخصوص کردار کا تقاضا نہیں کرتا۔ ہم اس کو علم نہیں کہتے۔ پیشہ ورانہ مضامین کو ہم علم نہیں کہتے۔ وہ چیز جو آپ کو جزوی زندگی گزارنے میں آپ کو مدد دے رہی ہے، اسے علم نہیں کہتے۔ علم وہ ہے، جو آپ کی پوری زندگی کی ترجیح اور آپ کی بنیاد ہے۔ جو آپ کا انجام ہے اور جو آپ کو اس دنیا سے بسلامت گزارتا ہے۔ اس دنیا کے بعد اگر کوئی منزل عقلی اور ذہنی طور پر ہے، تو آپ کو اس منزل سے بھی بسلامت گزارتا ہے۔ یہ علم کائنات اور زمین میں صرف اور صرف خدا کی طرف سے انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جاری ہوا۔ یہی وہ لوگ تھے، جنہوں نے انسانوں کی کردار سازی کی۔ انسان کی اخلاقی عمارت کو استوار کیا۔ وہی لوگ تھے، جنہوں نے معاشرے کو غاروں کی منازل سے سکائی سکریپر اور ایسکلیٹر تک پہنچایا۔ مگر وائے قسمت کہ انسان اتنا احسان ناشناس ہے کہ انہی اور اپنے لوگوں کی محنتوں سے مسلسل انکار کیے جا رہا ہے۔

علمیت کی جب ہم انتہا دیکھتے ہیں، تو علم تین قسم کے فیصلے کرتا ہے۔ یہ آپ کے ماضی سے آپ کی غلطیوں اور خوبیوں کو آگے بڑھاتا ہے۔ علم فیصلہ کرتا ہے کہ آپ کے ماضی میں سے کیا سلامت رکھنا ہے اور کیا ترک کرنا ہے۔ علم آپ کو تجربات کی زندگی سے گزار کر آپ کو ایسے ناقص تجربات سے گریز کرواتا ہے، جس کی وجہ سے آپ اپنی بقا میں، ماضی

Marfat.com

میں غلطیاں کر چکے ہیں۔ یہ معاملات حاضرات کو حل کرتا ہے۔ آپ کے موجود کے لیے باعث رحمت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علم آپ کی شناخت منزل ہے۔ علم آپ کو انجام کی منزل خیر تک پہنچاتا ہے۔ جو علم کے نزدیک آخری اور فانی ہے۔ آپ کو عالم کے سوا کون یہ بتا سکتا ہے کہ جس دنیا سے آپ گزر رہے ہو، یہ قلیل ہے۔ لہو ولعب ہے۔ آپ ایک سراب کی تمنا کر رہے ہیں۔

مگر کیا پھر انہوں نے آپ کو ترک دنیا کا مشورہ دیا؟ یہ اچھی طرح یاد رکھیے کہ کسی پیغمبر نے بھی اپنی امت کو ترک دنیا کا فتویٰ نہیں دیا، علم نہیں دیا۔ صرف اہمیتوں اور ترجیحات کی وضاحت کی۔ مگر یہ نہیں کہا کہ ان کو ترک کر کے گوشہ نشین ہو جاؤ۔ راہبانیت اور فاقے اختیار کرو۔ صرف ایک بات کہی کہ خدا کے مقابلے میں ان کو زیادہ اہم مت سمجھو۔ اس دنیا سے گزرتے ہوئے، سب سے مضبوط اثاثے کی فکر کرو۔ صرف یہ کہا کہ یہ آگ والا گھر ہے۔ اس تمام گھر کو شہوات کی، زینتوں کی آگ لگی ہوئی ہے۔ جب کسی گھر میں آگ لگی ہوئی ہو، تو سب سے قیمتی چیز بچاتے ہیں۔ جب گھر کو آگ لگی ہوئی ہو، تو تنک سک نہ بچاؤ بلکہ سب سے اہم چیز یہاں سے بچا کے نکل جاؤ اور سب سے اہم چیز لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ یہ اتنے بڑے سبق تو نہیں تھے کہ جو ہمیں تواتر سے بھولتے چلے آتے ہیں۔

بہت سارے رستوں پر چل کر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خیر کا طلب گار ہے اور شر سے اجتناب کرنا چاہتا ہے۔ چند ایک شوریدہ سر لوگوں کو چھوڑ کر ایسا کوئی نہیں ہے جس کو خیر کی طلب نہ ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ خیر کا رستہ کون سا ہے؟ یہ کیسے دیکھا جائے کہ خیر شر نہ ہو اور شر خیر نہ ہو جائے؟ اگر آپ یہ کہیں کہ تعداد کی کثرت خیر ہے، تو یہ بڑا مشکل فیصلہ ہوگا۔ مسلسل روزہ رکھنا ہی ثواب اور خیر ہے، تو بڑا مشکل ہوگا؟ میں نے اپنی زندگی بھر کوئی ایسا خیر کا خیال نہیں سوچا، جو میرے رسولؐ نے پہلے سے نہ سوچا ہو اور پہلے سے اس خیر کا جواب نہ دیا ہو۔ خیر کے سارے رستے ادھر کو جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ عقل ہے۔ معرفت اور دانائی ہے اور وہ ہم نادانوں کی پناہ ہے۔

پروردگار عالم نے خیر کو خیر نہیں، بلکہ فتنہ کہا ہے۔ خیر و شر دونوں کو فتنہ کہا ہے۔ اگر آپ سمجھیں گے نہیں اور غور نہیں کریں گے اور آپ اللہ کے رسول کی زندگی کا مطالعہ خود نہیں کریں گے، تو آپ ہمیشہ شر تو بڑی دور کی بات ہے، خیر کے فتنوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ ایک حقیقی بات ہے۔ جیسے وہ لوگ مبتلا ہوئے، جو رسول اللہؐ کے پاس آئے۔ امہات المومنین سے رسول اللہؐ کی زندگی پر سوال کیے گئے اور کہا، وہ تو بخشے بخشائے ہیں۔ ہم تو ساری عمر روزے رکھیں گے۔ کبھی نکاح نہیں کریں گے۔ جب حضورؐ کو اس کی خبر ہوئی، تو حضورؐ غصے میں آ گئے۔ فرمایا، تم میرے لوگوں میں سے نہیں ہو۔ کیونکہ ہماری رسمیں کچھ اور ہیں۔ ہم تو نکاح کریں گے، روزے رکھیں گے، افطار کریں گے۔ ہم تو نماز پڑھیں گے اور سوئیں گے۔ کثرت خیر ذہنی ابتلا اور فتنوں کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ اگر ایک شخص مجھے کہے کہ ایک سترہ سال کا جوان مسلسل تہجد پڑھ رہا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، میں اعتبار کر لوں گا؟ مجھے پتہ ہے، یہ عمر تہجد پڑھنے کی نہیں ہے۔ یہ ضرور سڑیل اور دیوانہ ہوا ہے۔ میں ضرور یہ جاننا چاہوں گا کہ یہ کثرت خیر کہیں معاملات عشق میں بیکاری تو نہیں ہے؟ کہیں حصول مطلب کی وجہ سے اللہ کے ہاں سر تو نہیں پٹخ رہے ہیں؟ یہ بڑا ضروری ہے کہ خیر کے ہر معیار کے لیے بھی ہم رسول اللہ کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

حضورؐ کی حدیث ہے، فرمایا' لوگو! شر کے بارے میں سوال نہ کرنا۔ صرف خیر کا مطلب پوچھا کرو۔ دیکھیے کتنی واعظانہ اور کتنی عقل مندی کی بات ہے کہ شر تو بڑا واضح ہوتا ہے۔ تم اس کے بارے میں پوچھ پوچھ کے اتنے وساوس میں کیوں اضافہ کرتے ہو؟ حضرت عباسؓ نے عرض کی، یارسول اللہؐ! نماز میں بڑے وسوسے آتے ہیں لیکن مثال یہ فرمائی کہ اتنے تلخ وترش اور خوفناک وسوسے آتے ہیں کہ دل جاتا ہے، کوئلے کی طرح جل کے خاک ہو جاؤں۔ اس استاد معظم نے فرمایا، تم شکر نہیں کرتے ہو، خدا نے تمہارے حقائق امثال میں بدل دیئے ہیں۔ کیا خوبصورت بات فرمائی کہ بجائے وسوسے سے ڈرنے، گھبرانے اور پریشان ہونے کے، اگر اتنا بدتر وسوسہ تمہیں ذہن میں آرہا ہے، تو بھی خدا کا فوراً شکر ادا کرو کہ اے پروردگار عالم! تیرا ہزار ہزار کرم ہے کہ یہ وساوس عملی نہیں ہیں۔ یہ عمل پذیر نہیں ہے۔ یہ خیال میں آئے، خیال سے نکل گئے اور بجائے ان سے ڈرنے کے آپ اللہ کی تعریف کرو اور تعوذ پڑھو اور تین مرتبہ بائیں طرف تھتکار دو اور یہ کہو امنت باللہ و رسولہ تو ہر وسوسہ ختم ہو جائے گا۔ حضورؐ نے فرمایا، یہ ایک شیطان ہے، جو نماز میں وسوسے ڈالتا ہے۔ اس کا نام خنزب ہے۔ یہ حرمتوں کی بے حرمتی کرتا ہے۔ ایسے ایسے نکمے سوال اٹھاتا ہے کہ انسانی عقل اس کا جواب نہیں دے سکتی۔

دور عہد قدیم ہو یا عہد حاضر، انسانی ذہن کا سب سے بڑا المیہ ایک ہے کہ ایسا سوال اٹھا لینا، جس کے جواب کا ڈیٹا اس کے پاس نہیں ہے۔ سوال کرنا کہ اس چیز کو کس نے پیدا کیا؟ اس چیز کو کس نے پیدا کیا؟ سوال Teleological کرتے جانا، کرتے جانا۔ اس نے اس کو کیا۔ اس نے اس کو پیدا کیا۔ اس نے اس کو پیدا کیا اور آخر میں سوال کرنا کہ اللہ کو کس نے پیدا کیا اور سوال کرنا کہ کیا اللہ اپنے سے بڑا پتھر بنا سکتا ہے؟ یہ وہ سوال ہیں، جن کے جواب کا ڈیٹا انسان کے پاس نہیں ہوتا۔ جب تک آپ کے پاس اس گورکھ دھندے سے نکلنے کے لیے عقل ورشد کی سبیل نہ ہو، آپ ان سوالوں میں الجھے ہوئے شکوک وشبہات کی دنیا کے قیدی ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ سراب ہے، جہاں عقل آپ کی پیاس بجھانے نہیں آتی۔ اس لیے کہ وہ بھی ڈیٹا پر چلتی ہے۔

رسول اللہؐ کی تمام زندگی لوگوں کو ان کی مقدور بھر حیثیت دماغ بتانے میں صرف ہوئی۔ وہ تمام وقت کے انٹلیکچوئل تھے۔ زمین پر ایسا عاقل کوئی نہیں گزرا۔ کیا حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک زمین وآسماں میں آدم اس حقائق پر تو نہیں پہنچے تھے۔ جس حقیقت تک محمد رسول اللہ پہنچے۔ پوچھا گیا، یارسول اللہؐ! خدا زمین وآسمان بنانے سے پہلے کہاں تھا؟ فرمایا، وہ تو دھند میں تھا۔ اوپر بھی ہوا تھی، نیچے بھی ہوا۔ بہت انسانوں نے ترقی کی اور کائناتوں کے اور یجن کی ترقی کی۔ مختلف قسم کی تھیوریاں بنائیں۔ بگ بینگ تک پہنچے۔ پھر اس سے پیچھے گئے اور اس حیرت کا اظہار کیا کہ کائنات میں کسی مادی وجود کے آنے سے پہلے اگر کائنات میں کوئی چیز تھی، تو وہ بادل تھے، دھند والے بادل، جنہیں انگریزی میں Mosturized Gases کہتے ہیں۔ وہ اتنی کثیر تعداد میں جاری ہوئیں کہ جب وہ جمنی شروع ہوئیں، تو ان میں پھر مادی وجود پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ یہ جتنے بھی سیارے اور نظام شمسی ہیں اور جتنی بھی کائناتیں ٹھوس وجود رکھتی ہیں، وہ انہی کی وجہ سے ہیں۔ ایک دفعہ پھر اس حدیث پر غور کیجیے۔ پوچھا گیا، یارسول اللہؐ! آسمان وزمین اور ستارے بنانے سے پہلے اللہ کہاں تھا؟ فرمایا، دھند میں تھا۔ یعنی Moisturized Gases میں تھا۔ اب رسولؐ آپ کو مکینیکل فارمولے تو نہیں بتا

Marfat.com

رہے۔ وہ آکسیجن کا نام تو نہیں لیں گے گیس کا فارمولا تو نہیں بتائیں گے۔ انہوں نے اپنے اندازِ علم میں آپ کو کائنات کے آغاز کی بات بتادی ہے۔ زندگی کے ہر قرینے اور ہر بات میں رسول اللہؐ کا یہ طرزِ فکر جاری رہا۔

بہت سارے لوگ دعا کی فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں، ہم بہت دعائیں مانگتے ہیں۔ پوری نہیں ہوتیں۔ حضورؐ نے فرمایا، دعا میں جلدی نہ کرو۔ پوچھا گیا، یارسول اللہؐ! دعا میں جلدی کیا ہوتی ہے؟ فرمایا، دعا میں جلدی یہ ہوتی ہے کہ تم یہ کہو کہ اللہ میاں میری سنتا کیوں نہیں؟ دیکھئے، ایک اندازِ تہذیب ہے کہ تم پروردگار کے سامنے یہ مت کہو، تم دعا کر رہے ہو کہ اللہ سنتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ دعا ہر حال میں سنی جاتی ہے۔ چاہے اس کا نتیجہ اترے نہ اترے۔ فرمایا، دعا کرتے وقت کبھی یہ نہ کہو کہ خدا! اگر تو چاہے تو یہ کر دے۔ تو چاہے تو یہ کر دے۔ خدا کو کہو تو کر دے۔ اس لیے کہ خدا کے اوپر کوئی اتھارٹی نہیں ہے۔ کام کرنے والی اتھارٹی خدا مطلق العنان ہے۔ پوری کائنات ایک انسان کی جھولی میں ڈال کر بھی خدا کی ملکیتوں کے تصرفات کم نہیں ہوتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ غافل دل سے دعا نہ مانگو۔ جب بھی مانگو، زور سے، پورے یقین اور استحکام سے مانگو۔ خدا پر دعوے سے مانگو۔ اس لیے کہ اس کے سوا کسی نے دعا کو پورا نہیں کرنا۔ تمہارے سوا کسی نے اس سے دعا بھی نہیں مانگنی۔ جب آپ پورے یقین کے ساتھ دعا مانگیں، تو وہ آپ کا یہ حق ضرور پورا کرے گا۔ خدا سے لڑو، خدا سے جھگڑو۔ اس لیے کہ اور کوئی ذات تمہارے لیے لڑنے جھگڑنے کے لیے نہیں ہے۔ اہل خاندان اور بھائیوں سے مت کہو کہ تم نے میری خبر گیری نہیں کی۔ چچا سے مت کہو کہ چچا تم نے میرا کوئی بندوبست نہیں کیا۔ باپ سے کہ تم نے مجھے جائیداد میں سے حصہ نہیں دیا۔ ماں سے مت کہو کہ تو نے مجھے بچپن میں دودھ نہیں پلایا۔ ان سب باتوں سے بڑی ذات دینے والی، جھگڑنے والی، حاصل کرنے والی، بندگی والی، عبودیت والی صرف اللہ کی ہے۔ صرف اللہ کو جان کر دعا مانگیں۔ حاضر ہو کر دعا مانگیں۔ وہی مالک، وہی کریم، وہی صاحب عطا ہے۔

رسول اللہؐ طریق تقسیم بتا رہے ہیں کہ ایک عورت ہنڈیا پکا رہی تھی۔ حدیث رسولؐ ہے۔ ہنڈیا پکاتے اس کا بچہ ساتھ کہیں بیٹھا تھا۔ آگ کبھی تیز ہو جاتی، کبھی آہستہ ہو جاتی۔ جب آگ کی لپک تیز ہوتی، تو وہ بچے کو اٹھا کے دور کر دیتی۔ جب لپک کم ہوتی، تو قریب کر لیتی۔ اسی شعلے لپکنے سے اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا۔ وہ بچہ اٹھا کر رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ فرمایا، یارسول اللہؐ! میں ایک ماں ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میرے بچے کو آگ کی لپک محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ جل جائے، تو میں نے اس سے دور کر دیا اور جب اسے محفوظ پایا، تو اسے قریب کر لیا۔ مگر جب بھی خدشہ محسوس ہوا کہ آگ اسے چھوئے گی، میں پہلے اس کی فکر کرتی، اسے دور کر دیتی تھی۔ تو کیا اللہ میاں ایک ماں سے زیادہ مہربان نہیں ہے؟ اگر میں اپنے بچے کو آگ کو لپٹ میں نہیں لینے دیتی، تو پھر اللہ کیسے پسند کرے گا کہ اپنے بندوں کو آگ میں ڈال دے گا؟ حضور نے چہرہ مبارک چھپالیا۔ بہت روئے، بہت روئے۔ کچھ دیر کے بعد سکون ہوا، تو اس عورت نے پوچھا، یارسول اللہؐ! آپ اتنے مضطرب کیوں ہوئے؟ فرمایا، ایک ماں اپنے بچے کے لیے اتنی مہربان ہے کہ وہ اسے صرف تپش پہنچنے پر اتنی مضطرب ہو جاتی ہے، تو اللہ اپنی مخلوق پر کتنا مہربان ہو سکتا ہے۔ افسوس کہ اس کے باوجود انسان بہتر سے زیادہ ماؤں سے مہربان اللہ کو نہ پہچانے۔ اپنے مالک، کریم، رحمٰن ورحیم، خالق الباری المصور کو نہ پہچانے۔ اس کا تو پھر یہی انجام ہونا چاہیے۔

Marfat.com

پہچان کے لیے بچے کا ماں کو آنا ضروری ہے۔ اصولاً ضروری ہے اور جو پہچانتا نہیں ہے، اس کا انجام صرف جہنم ہے۔
رسول اللہ کی تمام تر زندگی اپنے لوگوں کو بشارت کی نوید دیتے ہوئے گزر گئی۔ جہاں بھی تھوڑی سی فہمائش ہوئی، آپ نے تساہل کو روکنے کے لیے فرمائی۔ وہ بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے چھڑی نہیں استعمال کرنی تھی۔ انہوں نے گالی نہیں دینی تھی۔ انہوں نے کوئی سزا کسی کو نہیں دی۔ صرف زبان استعمال کی۔ فصاحت اور بلاغت استعمال کی۔ کوشش کہ کہ لوگ انداز سے لہجے سے ڈر جائیں۔ وہ کام چھوڑ دیں' جو مسلسل کر رہے ہیں۔ جب ایک گروہ وضو کرتے کرتے جلدی کر رہا تھا اور پاؤں پر پانی پھینک کے بھاگ رہا تھا، تو آپ نے ہلکے سے لہجے میں فہمائش کی کہ ایڑیوں کو دھویا کرو۔ وضو پورا کیا کرو۔ ایڑیوں میں آگ ہے۔ سمجھنے والے کو اشارہ کیا کہ تمہاری یہ چھوٹی سی سستی تمہیں آگ میں نہ ڈال دے۔ حضورؐ کا تمام طریقہ تعلیم یہ ہے کہ اگر 999 خوشخبریاں دیں، تو صرف ایک میں خبردار کیا۔ لوگوں کو دیکھ لیتے تھے کہ علم حاصل کرنے کے لیے تیار بھی ہیں کہ نہیں۔

حضرت معاذ بن جبلؓ نے جب طویل نماز پڑھائی' تو ایک بوڑھے نے رسول اللہؐ سے شکایت کی کہ میں بوڑھا ہوں۔ یہ قرائتیں لمبی لمبی کر رہے ہیں۔ جیسے آج کے ماشاء اللہ مولوی جنون میں ہوتے ہیں کہ لوگ مریں جئیں، ہماری تقریر ضرور پوری ہوگی۔ حضورؐ نے معاذ کو بلا کر فرمایا، کیا تو چاہتا ہے کہ لوگ اللہ کے دین سے نکل جائیں؟ تمہیں نہیں پتہ، نماز میں پیچھے بچے اور بوڑھے ہوتے ہیں اور وہ اتنی دیر کھڑا نہیں ہو سکتے۔ ادھر یہ عالم ہے کہ رات بھر کے مسجدوں میں شبینے چل رہے ہیں۔ بھلا قرآن ایک رات میں ختم کرنا کیا کمال کی بات ہے؟ کیا یہ کمال کی بات نہیں ہے کہ جاپانی 235 میل کی رفتار سے ٹرین چلاتے ہیں۔ اس سے کچھ مخلوق کو فائدہ ہوتا ہوگا۔ مگر جسے قرآن کی سماعت کی خبر نہ ہو، انہیں اس طرح قرآن سنا دینا کیا کوئی اچھی بات ہے؟ کیا یہ توہین قرآن نہیں ہے کہ جس قرآن کے بارے میں اللہ کتاب میں یہ کہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو باادب ہو جاؤ۔ خاموشی اور توجہ سے سنو۔ اس قرآن کو آپ خراٹے لیتے ہوئے پڑھ ڈالتے ہیں۔ کم سے کم قرآن پڑھنا تین دنوں میں ہے۔ ایسے نہ کرو کہ قرآن رد ہو جائے۔ نافہم اور کم فہموں کی طرح اسے نہ پڑھو۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند فرماتا ہے کہ آپ طریقہ رسول سے ہٹو۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ کے طریقہ فہم اور انداز فکر کی خبر لی جائے۔ جہاد کی بڑی لوگ تعریف کرتے ہیں' کیوں کرتے ہیں؟ اگر ان کے پاس رسول اللہ کی ایک ہی خبر موجود ہوتی، تو کوئی شک وشبہ نہ ہوتا۔ کوئی کہہ رہا ہے، جہاد یہ ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے، جہاد وہ ہے۔ حضورؐ نے تین باتیں مختصراً فرمائیں۔ فرمایا کہ جہاد میری امت میں جب سے شروع ہوا، اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک میری امت کا آخری فرد یا آخری گروہ دجال کو شکست نہ دے دے۔ جب تک میری امت کے افراد ظلم کرنے والے کے ظلم کو باطل نہ کر دیں اور جب تک میری امت کے افراد انصاف نہ کرنے والوں کو انصاف پر آمادہ نہ کر لیں۔ یہ ہیں جہاد کے بنیادی تین مقاصد۔ یہ جہاد امت مسلمہ میں اول وآخر ضرور جاری رہے گا۔

مجھے حیرت ہے اس عالم پر جو اللہ کے رسولؐ کی باتیں پڑھتا ہے اور پھر لوگوں پر فہمائش، تہدید اور کوڑے کے سوا کوئی ہاتھ میں چیز نہیں رکھتا۔ علم کی شناخت کا ایک اصول ہے کہ عالم وہ ہے، جو لوگوں کو ان کی حیثیت علمی سے خطاب

Marfat.com

کرے۔ جو اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل سے متاثر نہ کرے۔ بلکہ اپنے علم سے ان کی استعداد دیکھ کر ان کو فہمائش کرے یا نصیحت کرے۔ اگر ایک جاہل آدمی کے پاس لہجہ یا اندازِ گفتگو نہیں ہے، تو کیا آپ اس سے توقع کریں گے کہ آپ کو لکھنوی انداز میں آداب وسلام کہے۔ یہ بات آپ کے رسولؐ میں تھی کہ ہر آدمی کو اس کے علمی وفکری حیثیت کے مطابق اسے ٹریٹ کرتے۔ کوئی بندشا کی نہیں۔ حتیٰ کہ جانور تک شاکی نہیں۔ جب سے میں نے رسول اللہؐ کے طرزِ عمل کے حوالے سے حدیث دیکھی ہے، آپ یقین جانئے، کوئی انسان ان سانظر میں نہیں بچ سکا۔

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

اتنی خوصورت اور اتنی مہربان ہستی ہے کہ آدمی ان کی شفقت اور محبت کا عالم دیکھ کر سکتے میں آ جاتا ہے۔ ایک شخص نے ہرنی کے کچھ بچے اٹھا لیے اور ان کو چھپا لیا۔ ماں ان بچوں کو ڈھونڈتی ہوئی آئی، تو ماں کو بھی پکڑ لیا۔ وہ رسول اللہؐ کے پاس لے آیا اور بڑے تفاخر سے کہا، یارسول اللہؐ! اس طرح ہوا تھا کہ میں نے بچے کو پکڑ لیا۔ وہ آہ وزاری کر رہے تھے۔ پھر ان کی ماں آ گئی، تو میں نے ماں کو بھی پکڑ لیا۔ انہیں پکڑ کر یہاں لے آیا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا، تم نے کتنے اچھے جذبے کی توہین کی ہے۔ تجھے خیال نہیں آیا کہ ماں کس طرح محسوس کرتی ہے؟ تم نے کتنے خوبصورت جذبے کو دکھ پہنچایا ہے۔ جا اسے وہیں چھوڑ کے آ اور اسی جگہ رکھ کے آ، جہاں سے تو نے انہیں لیا تھا۔ حضورؐ کی پیغمبری سب کے لیے تھی۔ رحمت عالم کے توسط سے جن وانس اور جانوروں کے لیے تھی۔ یورپ اب آپ کو جانوروں کے ساتھ حسن سلوک سکھا رہا ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ امریکہ وغیرہ میں یہ جو سمور اور لومڑی کی کھال ہے یا ہرن کی کھال، یہ پہننی اس لیے منع ہے کہ تم نے جانوروں پر بڑا ظلم کیا ہوا ہے۔ ان کو شکار کیا ہوا ہے۔

شیخ سعدیؒ ایک شہر سے گزرے۔ لوگ بڑے بدتمیز اور بدتہذیب تھے۔ اینٹ پتھر روڑے مارتے۔ انہوں نے مسافروں پر کتوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ شیخ سعدی بھاگتے ہوئے جس پتھر کو ہاتھ لگاتے، وہ زمین سے بندھا ملتا۔ تنگ آ کر کہنے لگے، کمال رسم بے محل اس شہر کی ہے کہ سنگ ہارا بستند وسگاں را آزاد کردند۔ یہ معاشرہ اس منزل تک ضرور آ رہا ہے کہ جہاں کتے آزاد ہوں گے اور پتھر زنجیروں سے بندھے ہوں گے۔

حضور گرامی مرتبتؐ نے فرمایا، حذیفہ کو کہا کہ میری امت میں بڑے بڑے فتنے آئیں گے۔ یہ سرا اور وہیمہ کے فتنے ہیں۔ شب قدر، رات کے تاریک ٹکڑوں کی طرح فتنے آئیں گے۔ پہلا فتنہ یہ ہے کہ لوگ لوگوں سے ڈریں گے۔ لوگ لوگوں کا مال کھائیں گے۔ دوسرا فتنہ عیش وعشرت کا فتنہ ہے اس میں دولت کی کثرت ہوگی۔ پھر تیسرا فتنہ جو آج کل جا رہا ہے، وہیمہ کا فتنہ ہے۔ وہیمہ کے فتنے میں اتنی تاریکی، اتنا رنج وغم اور اتنا کرب وبلا ہوگا کہ لوگوں کو کہیں امن وسکون نہیں ملے گا۔ کیا عجیب حدیث ہے۔ لوگ اسے کسی اور طرح معنی دیں گے، مگر میں اس کو کچھ اور معنی دیتا ہوں۔ فرمایا کہ عرب سے زمانہ آخر میں دجال کے وقت کے قریب ایک بڑی آگ ایسی لپکے گی' جو لوگوں کو مشرق سے مغرب میں لے جائے گی۔ میں اسے شہوات طلب وآرزو اور لالچ کی آگ کہتا ہوں۔ یہ ساری آگ آج اسی طرح جل رہی ہے کہ کسی سے بھی پوچھ لیں، وہ مشرق سے مغرب میں ہی جانے کی بات کرتا ہے۔ اسے اپنے مقام میں سکون محسوس نہیں ہوتا۔

Marfat.com

استاد،طریقہ تعلیم،ظرف

خداوند کریم نے کہا ویحذر کم اللہ نفسہ (پ ۳، س آل عمران، آیت ۸۲) اللہ تمہیں اپنے نفس سے ڈراتا ہے۔مگر اس کے لیے تھوڑا سا پیچھے جانا پڑے گا۔احمد بن حنبل کے زمانے میں ان کا اعتراض یہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔یہ مسئلہ بہت پہلے حل ہو گیا تھا۔اس لیے آپ کو سنا رہا ہوں۔اللہ کہتا ہے اللہ خالق کل شی وھو علی کل شی وکیل (پ ۲۴، س الزمر، آیت ۲۶) تو قرآن کو بھی ھذا شی عجیب کہا۔اس لیے قرآن شے ہے اور اللہ خالق ہے۔تو قرآن خالق کا کلام نہیں ہو سکتا، بلکہ مخلوق ہے۔یہ فتنہ ایک سو سال تک عالم مسلمانان میں بڑا ترقی پذیر رہا۔

کچھ لوگ حضورؐ کے پاس آئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ ہم کھجور کو پیوند لگاتے ہیں۔فرمایا، میں پیوند پسند نہیں کرتا۔وہ لوگ گئے، خسارہ ہوا۔واپس لوٹے اور بڑے گلہ گزار ہوئے کہ آپؐ کے کہنے پر ہم نے پیوند نہیں لگایا، ہماری فصل خراب ہو گئی۔تو کہا، پھر ایسے کیا کرو، جیسے تمہارا تجربہ ہے۔یہ اتنی خوبصورت مثال ہے۔حضور اکرمؐ نے بظاہر لگتا ہے، ایک خطا کی اور ججمنٹ کی غلطی کا ارتکاب کیا۔مگر ایسے نہیں ہے بلکہ انہوں نے بظاہر اپنی غلطی سے اپنی امت کو ایک زبردست سبق دیا کہ وہ انسانی تجربہ، جو صدیوں تک تمہیں حاصل ہے۔جس پر تم ہزار مرتبہ علم وحکمت سے تجربہ کر چکے ہو، اگر اس کے خلاف دعا چاہو گے، تو تم غلطی کرو گے۔وہ اس قسم کے پیغمبر ہیں۔ان کا تمام تر وجود علمی تھا۔علم ان کی ہر رگِ مو سے پھوٹتا تھا۔پیغمبر کی نفسیات پر آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔نہ ان کے اقدامات مقاصد پر کوئی کتاب لکھی گئی۔تہذیب ایسے سکھانا ان پر ختم۔وہ اتنے بڑے استاد تھے۔

حافظ ابن قیم کا واقعہ سناتا ہوں کہ ان کے استاد ومرشد آئے۔انہوں نے نئے کپڑے پہنے۔غسل کیا۔سرمہ لگایا۔اپنے سر پر عمامہ باندھا۔آئینے میں دیکھا۔دو قدم چلے۔شبہے میں پڑے۔پتہ نہیں کہ حقیقت متوازن ہے یا نہیں؟ دوبارہ پلٹے۔آئینے میں دیکھا۔دروازے تک گئے۔جب دروازے تک گئے، تو ابن قیم کہتے ہیں، میرے دل نے مجھ سے ایک سوال کیا کہ ابن قیم! آج اگر رسول اللہؐ زندہ ہوتے، تو کیا تم اسی اہتمام سے ان کے حضور میں جاتے؟ میرے دل نے قسم کھا کر کہا کہ قطعاً نہیں۔میں جس حال میں ہوتا، چلا جاتا۔

سو جتنا کم تر درجے کا استاد ہے، اس کے رکھ رکھاؤ میں اضافہ ہوگا۔مگر جتنا بڑا استاد ہوگا، اس کے ظرف میں اتنا اضافہ ہو جاتا ہے۔وہ کافر ہو، بدکار ہو۔برا ہو۔اس تک پہنچنے میں اس کا احساس یہ کہتا ہے۔اسی طرح حضور اکرمؐ کو خوش گمانی اتنی پسند تھی کہ جب ایک بدو نے رسول اکرمؐ سے سوال کیا کہ اے پروردگار کے رسول! قیامت میں حساب کون لے گا؟ فرمایا، اللہ خود۔وہ ہنسا اور چل دیا۔حضورؐ نے اس کے پیچھے آدمی بھیجے کہ بھلا کیا عجیب بات ہوئی۔یہ ہنسا کیوں؟ کون سی بات ہے کہ جس پر وہ ہنسا؟ اسے بلایا گیا۔حضورؐ نے پوچھا، ایسا کیوں؟ فرمایا رسول اللہؐ ہم نے زندگی میں دیکھا ہے کہ جب کوئی اعلیٰ ظرف حساب لیتا ہے، تو نرمی سے لیتا ہے اور خدا سے بڑا اعلیٰ ظرف کون ہوگا؟ رسولؐ نے فرمایا، دیکھو! اس بدو کا گمان اللہ پر کتنا اچھا ہے اور ہدایت فرمائی کہ خدا پر ہمیشہ خوش گمان رہو۔کم از کم زندگی کے آخری حصے میں ضرور رہو۔جو کام اللہ نے کیا، ہم بھی اپنے رسول کے لیے کریں۔اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد وبارک وسلم۔

حضورؐ کی تعریف اور پیغام

جتنے لوگوں نے بھی رسول اکرمؐ کی تعریف فرمائی اور سب سے بہتر تعریف تو اس عورت نے کی، جس کے پاس حضور اکرمؐ نے مدینے میں دودھ پیا، مدینے کے رستے میں۔ اس سے بہتر تو کسی نے تعریف نہیں کی۔ ایک مقامِ رسالت اور ایک مقامِ ذاتِ رسولؐ ہے۔ یہ جتنے لوگوں نے بھی تعریف فرمائی ہے' اگر ان کو دوبارہ گنیں، تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ان اصحاب خیر نے حضورؐ کے پیغام پر بھی مکمل آگہی پائی تھی۔ ان لوگوں نے خدا کے لیے اور رسولؐ کی سنت کی متابعت کرتے ہوئے اپنی پوری زندگی تج دی تھی۔ ان کا تو یہ واقعی حق بنتا ہے کہ یہ رسولؐ کی ظاہری تعریف بھی کریں اور ان کے باطنی مراتب کی بھی تعریف کریں۔

میرا گلہ ان لوگوں سے تھا، جو تمام تر تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ جن کو کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا اور وہ صرف ایک ہی کام جانتے ہیں۔ ٹھیک ہے، خالی نعت پڑھنے کا بھی بہت ثواب ہوگا، مگر ایک بڑے استاد کے لیے کتنی کوفت کی بات ہے کہ اس کے پیغام کا تو کوئی احترام نہ کیا جائے اور اس کی تعریف پر زندگی گزار دی جائے۔ آج ہمیں یہ اخلاص بھی چاہیے کہ جہاں تعریف آپ کر رہے ہیں، دراصل اس سے بڑا کام یہ ہے کہ جو اللہ کے رسولؐ لائے اور جو انہوں نے ہمارے لیے پیغام چھوڑا، اس پر بھی عمل کیا جائے اور سب سے بڑا پیغام، جس کی وجہ سے آج کی نشست ہے، یہ ہے کہ انہوں نے ہی ہمیں یہ بتایا کہ اللہ ترجیح اول ہے۔

یومِ مسرت وانبساط

کوئی شخص کیا اس ہستی کی بات کرے، جس نے آپ کو کائنات کا اول بھی بتایا اور انجام زندگی بھی بتا دیا۔ فتنوں کی بات بھی بتائی اور سکون وعافیت کے نسخے بھی آپ کو عطا کیے۔ اس امام کو آپ کہاں بھلا پائیں گے؟ ان کے مقابلے میں آپ جن کو امام عقل سمجھتے ہیں، وہ صرف ووکیشنل آرٹس کے استاد ہیں۔ وہ آپ کے کردار کی تعمیر کر سکتے ہیں، نہ آپ کے اخلاق کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کے لیے مشعل راہ ہیں، نہ آپ کے حزن وملال کی کیفیتوں پر کام کر سکتے ہیں۔ آپ اپنی اساس البیت کو ترک کیے جا رہے ہیں اور اپنی معرفت خیال میں اس مینارہ نور کو بھولے جا رہے ہیں۔ جب یہ عید میلاد ہو، تو وہ کہتے ہیں، میلاد کیوں کر رہے ہیں۔ بہت سے مسلمان ایسے اکیڈیمک ہیں، جو میلاد کو برا سمجھتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی میلاد ہوا کرتی تھی۔ حضورؐ کو کہا گیا کہ نویں محرم کو یہود عید مناتے ہیں اور نویں محرم ایک اہم دن تھا۔ تو میلاد کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی محترم دن کو آپ مناسکتے ہیں کہ نہیں مناسکتے؟ اگر کوئی دن اہم ہے اور اس میں کوئی خاص بات ہوئی ہے، تو کیا آپ اس دن کو مناسکتے ہیں کہ نہیں؟

جواب یہ ہے کہ آپ حج مناتے ہیں۔ ساری نسبتیں حج کی ابراہیمؑ کے ساتھ ہیں۔ ایک ایک نسبت اس واقعہ کی جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے ساتھ گزرا۔ کتنی اللہ کے ساتھ اس کی اہمیت تھی کہ آج تک ہم سے اس واقعہ کو منواتا چلا آتا ہے۔ مقررہ اوقات، مقررہ دن اور مقررہ مراحل ہیں۔ حتیٰ کہ جب مسلمانوں نے کہا کہ چلیں ہم ابراہیم کے عمل تو منا لیتے ہیں۔

Marfat.com

ابراہیم اللہ کا دوست ہوا۔ ہاجرہ سے ان کا کیا واسطہ تھا؟ ان کا کیوں منائیں؟ تو اللہ کو اتنا غصہ آیا کہ قرآن میں کہاں الصفا والمروۃ من شعآئر اللہ (پ ۲، س البقرہ، آیت ۱۵۸) کہ صفا اور مروہ بھی اللہ کے قانون ہیں۔ اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ یہ نہیں کہ اگر ان میں ابراہیم نہیں تھے، تو تم اس واقعہ کی رسم کو نہ مناؤ۔ میرے دوست کی بیوی اور اس کے بیٹے کی رسم بھی مناؤ۔

اہل یہود نویں محرم کو عید مناتے تھے۔ جب آپ نے حلال وحرام دیکھنا ہو، تو آپ فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ وہ قرآن وحدیث میں حرام آیا کہ حلال آیا؟ جب انڈے پر کوئی فتویٰ نہیں تھا کہ آیا وہ حلال ہے کہ حرام ہے، تو ایک بار اللہ کے رسولؐ نے یہ فرمایا کہ جو شخص جمعہ کی نماز میں ایسے پہنچا کہ عین خطبہ ختم ہو چکا تھا، نماز شروع ہو چکی تھی، تو اس کا ثواب انڈے کی طرح ہے۔ ظاہر ہے، حرام چیز کا ثواب تو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے پتہ لگا، انڈا حلال ہے اور تو کوئی واقعہ اس میں ہے ہی نہیں۔ جب نویں محرم کے دن کو منایا گیا، تو آیا حضورؐ نے اسے ناپسند فرمایا کہ نویں محرم کو منانا غلط ہے؟ الٹا، آپ نے فرمایا کہ دیکھو، وہ نویں محرم کو مناتے ہیں۔ ہمارا قومِ موسیٰ اور موسیٰ پر زیادہ حق ہے۔ ہم دسویں بھی منائیں گے۔ اگر وہ نویں کو روزہ رکھتے ہیں، تو ہم دسویں کو روزہ رکھیں گے۔ ایک کی بجائے دو روزے رکھیں گے۔ دن منانے سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر دن منانے کا انداز تو ہونا چاہیے۔ ناچ، رنگ، ڈسکو، فضول خرچی یہ طریقہ عید میلاد کو منانے کا ہے؟ احسن کو احسن طریق سے نباہنا چاہیے۔ خوبصورت انسان کی خوبصورت طریقے سے سواگت کی جانی چاہیے۔ یہ مقامِ شکر اور روزِ شکر ہے۔

اللہ کے رسول کی پیدائش سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کے متبعین ایسٹر مناتے تھے۔ وہ تین رہنماؤں کے دن بھی مناتے تھے۔ یوم میلادِ عیسیٰ بھی مناتے تھے۔ حضورؐ نے اس قسم کی باتوں کا برا نہیں منایا۔ اس طرز کا ضرور برا منایا، جو ان مقدس دنوں میں لوگ اختیار کرتے ہیں۔ یہ خیرات کا دن ہے۔ یہ پیغمبر سخی ہے۔ اللہ کے رسول سخاوت اور علم کی معراج ہیں۔ شناخت کا دروازہ ہیں۔ ہم ان کو خراج عقیدت ایسے پیش کرتے ہیں، جیسے کسی انٹلکچوئل، ایک عالم زمانہ کو کرتے ہیں۔ رہبر مکمل اور جیسے رہنمائے دین کو کرتے ہیں۔ اس طریقے سے خیرات وصدقات کریں اور اپنے آپ کو اس شخص عظیم کی مروت اور ان کی محبت کے قابل کریں۔ ہمارے رسول کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ انہیں اپنی امت کی یاد کبھی نہیں بھولی۔ اگر آپ نے سب سے بڑی سنت رسول پر عمل کرنا ہے، تو آپ بھی اپنے رسول کی امت کے دوسرے بھائیوں کو مت بھولیں اور کوشش کریں کہ ان کے لیے میلاد کا دن خوشی، فرحت اور انبساط کا دن ہو۔

حضورؐ کا دیدار

کسی آدمی کا یہ دعویٰ کرنا کہ میں نے رسولؐ اللہ کو خواب میں دیکھا، اس کی پرکھ بہت سارے اصولوں کے تحت ہوتی ہے۔ جب تک کہ معاملات نارمل نہ ہوں اور پہلے سے تقربات موجود ہوں۔ مثال کے طور پر ایک شخص ایک لاکھ مرتبہ درود تاج پڑھ رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مجھے رسول اللہؐ خواب میں نظر آئیں۔ پھر وہ ایک دن آ کے کہتا ہے کہ میں نے رسولؐ اللہ کو خواب میں دیکھا۔

Marfat.com

ایک آدمی بڑا گنہگار ہے اور وہ اپنے عصیاں کے بحران میں کسی مقدس ہستی کے حضور اپنی یہ تقصیر چھپانا چاہتا ہے۔ اس کو پتہ ہے کہ میں بڑے مکروہ عزائم اور بڑے غلط افعال کا مالک ہوں۔ مگر لوگوں کو تاثر یہ دینا چاہتا ہے کہ میں نے رسولؐ اللہ کو خواب میں دیکھا، تاکہ لوگوں کی اندھی عقیدتیں اس کے جرائم کا پردہ بنیں۔

تیسری صورتحال نفسیاتی ہے۔ اس کے لیے نفسیاتی طور پر ایک بندہ جج اور چیک ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں عصیانی رسپانس میں کوئی نہ کوئی بزرگ صورت ضرور آتی ہے۔ کسی کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نظر آتے ہیں۔ کوئی آگے بڑھ کر رسولؐ اللہ کو دیکھنے کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے۔ کوئی اکثر ولی اللہ دیکھتے ہیں اور یہ خواب تو بہت ہی عام ہیں کہ مصیبت آئی نہیں اور مزار نظر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ کسی مزار سے کوئی تسبیح دے رہا ہے۔ کسی مزار سے کوئی تعویذ۔ تو ہمارا مجرمانہ ذہن کسی مذہبی شخصیت کو مزار کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ ایک سماجی کمزوری اور بیماری ہے، جس کو ہم معاذ اللہ، استغفر اللہ دیدار رسول نہیں کہہ سکتے۔

دوسری بات کہ کیا خیال ہے، اگر دعویٰ کی پرکھ ہو اور دعویٰ کی پرکھ کے اصول لاگو کیے جائیں، تو کیا آپ سب لوگ ہر اس آدمی کا دعویٰ قبول کر لیں گے، جو آپ کے پاس یہ دعویٰ لے کر آئے کہ مجھے رسول اللہؐ ملے اور مجھے حکم دیا کہ فلاں شخص سے ایک لاکھ روپیہ لے لو۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی بندہ بھی اس خواب کو سچا سمجھے گا۔ اگر آپ کے مفاد پر ضرب پڑ رہی ہو، تو آپ اس خواب کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ دستور یہ ہے کہ ہم انسانی صحت، ذہنی اور اخلاقی صحت کو دیکھتے ہیں۔ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ پہلے کذاب تو نہیں رہا۔ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس شخص کے عمومی کریکٹر میں جھوٹ تو نہیں شامل۔ وہ لوگوں کو دھوکہ تو نہیں دیتا رہا یا ان سے جھوٹ بولتا رہا ہے۔ جو اصول روایت حدیث کے لیے ہیں، وہی اصول خواب پر استعمال ہوتے ہیں۔ جب وہ روایت اور درایت سے نکلے گا، تو پھر اس خواب کو تسلیم کرنے میں ہمیں کوئی عذر نہیں ہوگا۔

رسولؐ اللہ کو دیکھنا حدیث ہے اور حدیث کی پرکھ کے لیے وہی قانون لاگو ہوں گے، جو پرانے محدثین نے کسی حدیث کی پرکھ کے لیے لگائے ہیں۔ اس لیے یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ اس قسم کے دعوے مان لیے جائیں یا کر لیے جائیں۔ مرزا غلام احمد اور غلام احمد پرویز کے وہی دعوے ہیں۔ ان سب کو دیکھ لیجیے۔ اگر ہم ان دعووں کو ماننا شروع کر دیں، تو کس کس کو آپ مہدی مانیں گے؟ ایک صدی میں مجھے ڈیڑھ کروڑ مہدی نظر آ رہا ہے۔ اس لیے یہ بڑا مشکل امر ہے۔ یہ بڑے احتیاط سے پرکھنا پڑتا ہے۔ اس خواب کی معقولیت کیا ہے؟ استحقاق کیا ہے؟ سچائی کتنی ہے؟ بندے کے کردار کو دیکھنا پڑتا ہے۔ پھر البتہ تسلیم کا عذر کیا جا سکتا ہے۔

میلادالنبیؐ کی مخالفت

میں نے قرآن وحدیث میں کسی مقررہ دن جمع ہونے کی کوئی مخالفت نہیں دیکھی۔ آج کل کے زمانے میں کوئی کہے کہ میں میلاد منانا چاہتا ہوں اور وہ میلاد منائے اور لوگ بکھرے ہوئے ہوں۔ سوشل سیٹ اپ بڑا عجیب وغریب ہو چکا ہے۔ لوگ کام کرتے ہیں۔ کوئی چھٹیاں نہیں ہیں۔ آپ میلاد کو چھوڑیں، سالگرہ ہی مناتے ہیں، تو سب سے بڑا گلہ جو

Marfat.com

سالگرہ میں شریک نہ ہونے والوں کا ہوتا ہے کہ بروقت اطلاع نہ ملی، پتہ نہیں تھا۔ کسی دن کو کسی فنکشن کے لیے مخصوص کر لینا یا کر دینا اس میں قطعاً کوئی حرج نہیں۔ اگر مخصوص نہ کیا جائے، تو آپ کبھی پاکستان ڈے نہ منا سکیں۔ حج کا دن نہیں منا سکتے۔ یہ دنوں کا مخصوص کرنا کسی طور پر بھی بدعت ہے نہ موجب عذاب ہے۔ طریق کار میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ اگر آپ مسلمان ہیں اور اپنی سب سے مقدس، متبرک، مہربان اور شفیق ہستی کی یاد منانا چاہتے ہیں، تو انداز بھی تو کچھ بہتر ہونے چاہئیں۔ کچھ بااخلاق طریقے ہونے چاہئیں۔ رسولؐ اللہ کو حسن اخلاق سب سے زیادہ پسند تھا اور اللہ کو سب سے زیادہ کھانا کھلانا پسند ہے۔ مسلم کی حدیث ہے کہ جنت میں ایک شخص کا درجہ بلند کر دیا گیا۔ صبح حضرت سراسیمہ اٹھے کہا، میرے مولا! میں نے کون سا ایسا کام کیا کہ تو نے جنت میں میرا درجہ بلند کر دیا۔ فرمایا، تو نے پیچھے ایک نیک بیٹا چھوڑا تھا۔ وہ تیرے لیے استغفار کرتا تھا۔ ہم نے اس استغفار کی وجہ سے تیرا درجہ بلند کر دیا۔ رسول اللہؐ نے تو ایک ارب بیٹے پیچھے چھوڑے ہیں۔ کیا آپ ان کے بیٹے نہیں لگتے؟

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تین چیزیں موت کے بعد کام آئیں گی۔ ایک صدقہ جاریہ، وہ چیز جسے آپ نے خلق کے لیے چھوڑ دیا اور اس کے استعمال میں آپ کے لیے ثواب ہے۔ دوسرا علم، کسی عالم نے ترتیب علم دی اور جو ہدایت اس نے بخشی، اس سے مخلوقات کو نفع اور فائدہ ہے اور بہترین نیک اولاد۔ کیا غضب ہے کہ آپ رسول اللہ کی اچھی اولاد بننے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہیں؟ اگر رسول اللہ کی بیویاں امہات المومنین ہیں، تو رسولؐ کیا ٹھہریں گے؟ آپ کو تو اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ آپ کا رسول، رسول ہونے کے علاوہ آپ کا باپ بھی ہے۔ ایسا باپ، جو ہر قسم کی خوبی کا حامل ہے۔ کہاں رسل، کانسٹائن، نپولین، سیزر اور کہاں یہ ہنی بال! کیا بڑے بڑے لوگ دنیا میں آئے اور گزر گئے۔ ان میں سے کس کا کردار مثالی بن کے رہ گیا؟ کس کی خوبصورت ذات ابھی تک ہمارے دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے؟ ہمیں ناخلف بیٹا بننے کی کیا ضرورت ہے؟ باپ کا دن نہ منائیں' تو کس کا دن منائیں گے؟

مگر طریق کار میں اختلاف ہوتا ہے۔ یہ خیرات اور صدقات کا دن ہے۔ محبت اور انس کا دن ہے۔ یتیم کی نگہداشت اور جانوروں کی پرداخت کا دن ہے۔ یہ تمام دن نیکیوں کا، محبت تمام کا دن ہے۔ عہد استوار کرنے، سنت رسولؐ اور اخلاق رسولؐ کی متابعت کا دن ہے۔ آپ اس دن کو منا کر کتنے خوش نصیب ہو سکتے ہیں! یہ تو وہ جانے، جس کو ان سے سب سے زیادہ محبت ہے۔ آپ نے کیا محمد رسول اللہ کا مقام پہچانا ہے؟ کیا آپ کے پاس ان کی کوئی شناخت ہے؟ کیا بات کہی تھی غالب نے۔

غالبؔ ثنا خواجہ بہ یزداں گذاشتیم

میرے خیال میں غالبؔ کو تو یہی شعر جنت میں لے جائے گا کہ

غالبؔ ثنا خواجہ بہ یزداں گذاشتم

کہ اے غالبؔ میں نے اپنے خواجہ اپنے آقا محمد رسول اللہ کی تعریف اللہ پر چھوڑ دی۔

آں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

Marfat.com

کہ وہی ذات پاک محمد رسول اللہ کا مرتبہ جانتی ہے۔

آپ کس کا دن منائیں گے؟ اپنے بیٹے کی سالگرہ منائیں گے؟ اپنے باپوں اور فقیروں کے عرس منائیں گے؟ اور نہ مناؤ گے، تو کیا آقا اور رسولؐ کا دن نہ منائیں گے؟ یہ تو یوم تشکر ہے۔ مگر انداز وہ ہوں، جو آقا کو پسندیدہ ہوں۔ طریق یا دوہ ہو، جو رسولؐ اللہ کو پسند آئے۔ اللہ کو سارے انسانوں کی تعریف تو پسند نہیں آئی۔ اس نے وضاحت سے کہا، میں صرف محمد کو محمدؐ سمجھتا ہوں۔ اگر کسی شخص نے میرے شان شایاں تعریف کی ہے، تو یہ محمدؐ ہیں۔ اس لیے زمین پر آپ کا اسم گرامی محمدؐ ہے، تو آسمانوں پر احمد ہے۔ ہم نے پسند کیا کہ ساری کائنات میری تعریف کرنے والے کی تعریف کرے۔ سو زمین پر اسم گرامی محمدؐ ہوا۔ آپ تو صرف اپنا حصہ ہی ڈال سکتے ہیں۔ درود سے، سلام سے، خیرات اور صدقات سے، علم، محبت اور غریب کی پرورش ہے، یتیم کی نگہداشت سے۔ اس سے زیادہ بڑھ کر آپ میلاد کو کیا کر سکتے ہیں۔ ناچ، رنگ، گانا......؟

میں نے میلاد کو حج کے ساتھ بالکل نہیں ملایا۔ بلکہ میں نے یہ کہا کہ کسی دن کو مقرر کر لینا کوئی خلاف فطرت اور شرع نہیں ہے۔ حج کو چھوڑ دیجیے۔ حج کے پیچھے آپ یہ دیکھیے، کچھ روز مقرر ہیں۔ کسی رسم وعبادت کے لیے۔ جیسے میں نے آپ کو مثال دی کہ نویں محرم کو اگر قوم موسیٰ نیل سے گزرنے کا دن مناتی تھی، تو رسول اللہؐ نے اسے ناپسند نہیں فرمایا۔ اس زمانے میں عیسائی موجود تھے اور قوم عیسیٰ باقاعدہ اپنے نبی کا یوم ولادت بھی مناتی تھی۔ حضورؐ کے پاس سے ہمیں ایسی کوئی دلیل نہیں ملتی، جس سے حضورؐ نے فرمایا ہو کہ یہ طریقہ ناپسندیدہ یا غلط ہے۔

اب رہا آپ کے پہلے سوال کا جواب کہ اصحاب رسولؐ نے اپنی زندگی مبارکہ میں یہ دن نہیں منایا۔ اس کی بنیادی وجہ بالکل سمجھ میں آتی ہے کہ جتنا عرصہ بھی اصحاب رسولؐ زندہ رہے اور جتنا عرصہ بھی اس سوسائٹی میں رہے، ان کے لیے امت مسلمہ کے بڑے بڑے کام پیش نظر تھے کہ ان کا کوئی سسٹم ابھی واضح طور پر تخلیق نہیں ہوا تھا۔ جیسے حضرت عمرؓ بن خطاب کے پاس پہلی مرتبہ ایران سے جو لوگ آئے، انہوں نے کہا کہ آپ صدقات اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی ٹیکس لگائیں، تو انہوں نے کہا، کیسے لگاؤں؟ انہوں نے کہا، ایران میں ہم گھوڑے داغتے ہیں اور راہداری لیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، ٹھیک ہے، ہم بھی ایسا کریں گے۔ انہوں نے سرکاری گھوڑوں کو داغنا شروع کر دیا اور راہداری لینی شروع کی۔

آپ کو یہ خیال ہونا چاہیے کہ ابتدائے اسلام سے تمام سسٹم ترتیب پا رہے تھے اور میلاد سسٹم میں نہیں۔ میلاد انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ میلاد کا ہمیں یہ قطعاً پتہ نہیں ہے کہ رسول اللہؐ کے اصحاب یوم ولادت مصطفیٰؐ پر کیا طرز عمل رکھتے تھے۔ مگر ہمیں ایک بات کا یقینی علم ہے کہ رسول اللہؐ کے اصحاب ہر روز کو یوم میلاد سمجھتے تھے۔ ہر روز وہ سنت رسولؐ کی مطابقت کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ہمہ تن رسول اللہؐ کے پیغام اور ان کے طریقۂ کار کو مخلوق میں پھیلانے کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ چونکہ یہ ایک انفرادی عمل تھا، تمام اصحاب رسولؐ اس وقت یہ کوشش کر رہے تھے کہ بحیثیت ایک حکومتی اور عملی نظام کے اسلام کی عملی صورت ہو جائے۔ اس میں ایک انفرادی اور ذاتی چیز اتنی نمایاں نہیں ہو سکتی۔

باقی مسلمان یوم ولادت مصطفیٰؐ کو اور اصحاب رسولؐ اسے کیا سمجھتے تھے؟ اگر آپ احادیث غور سے پڑھیں، تو آپ کو احساس ہوگا کہ رسول اللہؐ کے ہر دن کی روداد، ہر لمحے کی بات اور ایک ایک انداز کسی صحابی کو عمر بھر نہیں بھولا۔ اب

Marfat.com

وہاں اتنی بڑی یاد کے عالم میں آپ میلاد نہیں ڈھونڈ سکتے۔ یہ تو آپ کی بات ہے کہ جب آپ اللہ کی یاد سے بھی غفلت کریں اور رسول اللہؐ کے عادات و خصائل سے بھی ہماری غفلت ہو، تو آج ہمیں زبردستی یاد کرانا پڑتا ہے۔ میں ایک بار لاہور میں تھا۔ میلاد کا جلوس گزر رہا تھا اور اس دن کے بعد میں نے میلاد کا جلوس کبھی نہیں دیکھا۔ قوم واہیات کو میں نے دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کو دھکے مار رہے تھے۔ زن و مرد آپس میں بے اعتدالیاں کر رہے تھے۔ فلمی میوزک ان کی گاڑیوں پر چل رہے تھے۔ مجھے ذہنی طور پر اتنی کوفت ہوئی کہ میں نے اس دن کے بعد کوئی میلاد کا جلوس نہیں دیکھا۔ سارے مسئلے کو چھوڑ دیجیے، دل پر صرف ایک بات کو رکھیے کہ اگر آپ کو یہ پتہ ہو کہ آج رسولؐ اللہ کی پیدائش کا دن ہے، تو آپ کیسا محسوس کریں گے؟ بس اتنا ہی!

آپ کو صرف اتنا پتہ ہو کہ آج رسولؐ اللہ کی پیدائش کا دن ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہوں کہ آج ہے، تو منانا کس کو کہتے ہیں؟ کچھ نہ کچھ تو آپ کا احساس زیاں جاگے گا؟ کچھ تو آپ کو خیال آئے گا، کہ آج تھوڑا سا زیادہ پرہیز گار ہو جاؤں۔ تھوڑے سے عمل نیک اور کرلوں۔ کیا رمضان کوئی نرالا مہینہ ہے؟ ادھر رمضان آیا، ادھر شرارتوں کی لٹیا ڈوب گئی۔ ادھر آپ نیکوکاروں میں سے ہو گئے۔ ادھر بازار بند ہو گئے۔ مسافروں کے کھانے بند ہو گئے۔ کیا نالائقی ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ تو اجازت دیتا ہے کہ مسافر روزہ نہ رکھے۔ مسافر بے چارے کو پانی کہاں سے ملے گا کہ مقدس مسلمانوں نے بازار اور ریڑھے بند کر رکھے ہیں۔ وہ تو لٹھ لے کر "مگر" پڑے ہوں۔ کیا تفہیم ہے دین کی اور دین کے اعمال کی، جو ہمارے ذہن میں آتی ہے؟

اگر ہم نے اچھے دنوں کو یاد نہ رکھا، تو برے دنوں کو ضرور یاد رکھیں گے۔ ہمیں ہر ایک دن یاد ہے۔ ہر دنیا والے کا دن مناتے ہوئے ہمیں ایک ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہوتا۔ آج قائداعظم ڈے منا رہے ہیں۔ کل اقبال ڈے منا رہے ہیں۔ اس میں کوئی اخلاقی حرج نہیں، کوئی بدعت نہیں ہے کہ اقبال کا دن منائیں۔ چھٹی لے کے ہم سب خوش ہوتے ہیں۔ کوئی فائدہ ہو نہ ہو، اقبال ڈے کی چھٹی تو ہوتی ہے۔ اس چھٹی کے لیے ہم اس دن کی آرزو کرتے ہیں اور جو دن ہمارے گناہوں کی برأت کا اور شافع محشر کا دن ہو۔ اس کی محبت کو یاد کرنے کا دن ہو اور اپنے نقائص سے فروگذاشت کرنے کا دن ہو، اسے بدعت کہتے ہیں۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ وہ انسان کبھی گنہگار نہیں ہوتا، جو پشیمانی محسوس کرے اور توبہ کرے۔ اگر آپ کے دل میں یوم پیدائش رسول اللہؐ ایک ذرہ برابر اللہ کا شکر پیدا کر جائے کہ اے میرے مالک و کریم! آج تو نے میرے آقا اور رسولؐ کو پیدا کر کے مجھے کتنی جہالتوں سے نجات بخشی ہے۔ مجھے اپنے ساتھ کتنی امیدیں بخشی ہیں، تو شاید اسی میں آپ کی نجات ہو جائے۔ آپ جلسے کریں نہ ہنگامے کریں۔ اس خرافات میں نہ پڑیں، جن کو میں نے دیکھا۔ ایک جلوس نکلا ہوا ہے۔ ادھر دیوبندی ہے، اُدھر بریلوی ہے۔ بریلوی خرافات میں مصروف ہیں اور دیوبندی اس سے بڑھ کر خرافات میں مصروف ہیں۔ جب جلوس پاس سے گزر رہا ہے، تو وہ بار بار کیسٹ چلا رہے ہیں۔ اعوذ باللہ مین الشیطان الرجیم۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بھئی اگر وہ شیطان ہیں، تم تو انسان ہو۔ اگر دونوں ہی فساد کی راہ ڈھونڈ رہے ہو، تو میلاد نہیں ہو سکتی۔

Marfat.com

میلاد کوئی مخصوص اور نرالی چیز نہیں ہے۔ یہ بدعت بھی نہیں ہے۔ بدعت تو تب ہوتی، حضورؐ نہ پیدا ہوئے ہوتے اور آپ مناتے۔ یہ تو رسول اللہ کی سالگرہ ہے۔ ہوسکتا ہے، سالگرہ منانا آپ کو پسند نہ ہو۔ میں تو بڑا خوش ہوتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے رسول اللہؐ نے یہ بتایا کہ اللہ کو دو چیزیں سب سے زیادہ پسند ہیں۔ ایک حسن کلام، اچھا اخلاق اور دوسرا حسن طعام۔ یعنی اچھا کھانا کھلانا۔ اتفاق سے دیکھیں کہ سالگرہ کے موقع پر آپ کو بڑی مہمان نوازی کا موقع ملتا ہے۔ آپ رشتہ دار اور دیگر لوگ بلاتے ہیں۔ اچھا اخلاق برتتے اور کھانا کھلاتے ہیں، مٹھائیاں بانٹتے ہیں۔ مجھے تو سالگرہ بری نہیں لگتی۔

اسی طرح یوم ولادت رسول اللہؐ ہے۔ میں نے اپنا ثواب اس میں جانا کہ اپنے باپ کی خدمت میں ہدیہ تبرک پیش کیا۔ کچھ پکایا، کچھ پڑھا، کچھ ذکر کیا اور اس کا ثواب ان کو بخشا۔ بیشتر باپوں کی اولاد جنت میں صرف اس لیے چلی گئی کہ جب اللہ نے باپ سے پوچھا، تو بے چین کیوں ہے؟ اس نے کہا، میں تو جنت میں بھی آ کے پریشان ہوں۔ انہوں نے کہا، کیوں پریشان ہو؟ کہا، اللہ میاں تم نے میرے بچے جہنم میں پھینک دیئے، میں کیسے خوش ہوسکتا ہوں؟ یار ٹھیک ہے، اس کی وجہ سے اس کے بچے بھی لے آؤ۔ تو یہ تو نسبتوں کے سوال ہیں۔

ہم اپنے باپ کے لیے درجات کی بلندی مانگ لیں، تو درجات تو ان کے اتنے بلند ہیں کہ ہمارے ذہن سے ہی بالاتر ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا، جب تم نماز کی اذان سن لو، تو میرے لیے دعا کرنا۔ آپ نے فرمایا، جنت میں ایک مقام ہے۔ یہ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے۔ اس مقام کا نام مقامِ وسیلہ ہے۔ جس وسیلے سے آپ سب انکار کرتے ہیں۔ میں خدا سے امید رکھتا ہوں کہ وہ مقام مجھے عطا کیا جائے گا۔ تم بھی میرے لیے مقامِ وسیلہ کی دعا کیا کرو۔ جب اذان کے بعد آپ دعا کرتے ہیں۔ چاہے دیوبندی یا بریلوی کرے یا وہ اہلحدیث ہو، تو مقام محمود، مقام شفاعت اور مقام وسیلہ کی دعا کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ تو میلاد کچھ نہیں۔

یہ میں آپ کو بتادوں، یہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔ کوئی کسی کو زبردستی نہیں یاد رکھ سکتا۔ اگر آپ کو یاد آتے ہیں، تو آئیں گے۔ نہیں یاد آتے، تو نہیں آئیں گے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ خیرات میں بھلائی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اللہ اور رسول اللہؐ کے اچھے بندے ہیں۔ رسولؐ کے اچھے تابع ہیں، تو پھر آپ کو اس دن کا خیال کرنا پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی بہتر کام کروں، جس سے میرا خدا اور میرا رسولؐ راضی ہو۔ اس سے زیادہ میلاد کی کوئی حیثیت نہیں۔ اجماع تو اسی وقت اس کو منائے گا، جب اخلاق باختگی سے پرہیز کرے گا۔ جب اپنے بھائیوں کی مدد کرے گا اور ان کی خدمت سرانجام دے گا۔ یہ میں نے نہیں دیکھا کہ میلاد والے دن لوگ اٹھیں، یتیموں کے گھر ڈھونڈیں۔ کپڑے سئیں اور بے لباس کو لباس دیں۔ میں نے نہیں دیکھا کہ لوگ قرض داروں کے قرض اتاریں جو کہ ہونا چاہیے۔

واقعہ معراج کی حقیقت

معراج کے دو بڑے سوالات ہیں۔ پہلا یہ کہ کیا یہ بدنی معراج تھی؟ اور کیا رسول اللہؐ نے اپنے رب کو دیکھا؟ دوسرا گروپ یہ کہتا ہے کہ جبریل امین کو دیکھا۔ اگر میں پہلے قول پر یقین رکھوں کہ یہ معراج بدنی نہیں تھی اور یہ کہ رسول اللہؐ نے جبریل امین کو دیکھا، تو یہ معراج بنتی ہی نہیں۔ معراج ایک ایسی سیڑھیوں کی تکمیل ہے، جو اپنی انتہا تک پہنچتی ہیں۔

Marfat.com

معراج درجات کی بلندی ہے اور انتہا ہے۔ ان تمام درجات کی، جو انسانوں پر وارد ہوئیں۔ اگر رسول اللہؐ بدنی طور پر آسمانوں پر نہیں گئے، تو اس میں کوئی رسولؐ اللہ کا کمال نہیں۔ اس لیے کہ خواب میں کائنات کے آسمان، خدا، جنت اور جہنم دیکھ لینا ایسی کون سی کمال کی بات ہے؟ اس دنیا میں چھ ارب لوگوں میں سے کم از کم آپ کو ساٹھ ہزار آدمی ایسے مل جائیں گے، جنہوں نے یہ معراج حاصل کی ہو۔ جس نے جنت اور خواب میں دوزخ دیکھی ہوئی ہو۔ ممکن ہے، ملائکہ سے بھی ملاقات کی ہو۔

ابھی کچھ دن پہلے ایک صاحب نے مجھے کہا کہ اس نے خواب میں خدا بھی دیکھا۔ تو اس میں قطعاً کوئی صفت پیغمبر نہیں پائی جاتی۔ اگر خواب میں خدا کو دیکھنا صفت ہوتی، تو ابو جہل، ابو بکرؓ کو کہنے کی ضرورت ہی نہ سمجھتا کہ آج تیرا پیغمبر نرالا دعویٰ لے کر آیا ہے۔ اگر رسول اللہؐ نے خواب دیکھا تھا اور خواب میں وہ آسمانوں پر بلند ہوئے تھے، تو پھر ابو جہل کو کیا ضرورت تھی کہ آج ہر قیمت میں ابو بکرؓ جھٹلائے گا۔ اس لیے کہ حضرت ابو بکرؓ حقیقت کے آدمی تھے۔ وہ اپنی قوم کے سیانے، عملی اور سچے آدمی تھے۔ جھوٹ کو برداشت نہیں کرتے تھے۔

فرض کریں، ابو جہل حضرت ابو بکرؓ کے پاس چلا جاتا اور کہتا کہ آج تیرے پیغمبر نے یہ خواب دیکھا ہے، تو اس نے اعتراض کیا کرنا تھا؟ مگر وہ تو ابو بکرؓ کا صدق اور یقین رسول اللہؐ پر آزمانے جا رہا تھا اور اس نے جا کے سیدنا حضرت ابو بکرؓ سے کہا، تیرا پیغمبر کہہ رہا ہے کہ میں پلک جھپکنے میں ساتوں آسمان عبور کر کے ملائے اعلیٰ پر پہنچ گیا ہوں اور سدرۃ المنتہیٰ پر جا کے لوٹ آیا ہوں۔ بتاؤ، یہ بات سچی ہو سکتی ہے؟ انہوں نے کہا، کس نے کہا ہے؟ اس نے کہا، محمدؐ رسول اللہ کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا، اگر وہ کہتے ہیں، تو سچ کہتے ہیں۔ اسی دن سے سیدنا عبداللہ بن قہافہ کا نام صدیق پڑا۔ حضورؐ نے فرمایا، ہر نبی کا ایک صدیق ہے اور میرا صدیق عبداللہ بن قہافہ ہے۔

اب دوسری بات، حضرت عیسیٰ کمال درجات پر پہنچے۔ حضرت موسیٰ کو اللہ میاں نے کال کیا۔ ذرا اور پیچھے چلے جائیے۔ حضرت ابراہیم کو اللہ نے کہا کہ میں نے ابراہیم کو آیات کبریٰ دکھائی ہیں۔ آیات کبریٰ اور آیات الٰہی کیا ہیں؟ وہ تمام غیبی آثار ابراہیم کو دکھائے گئے، جو کسی بھی صورت ممکن نہ تھے۔ ان میں فرشتے زمین پر چلے آ رہے ہیں۔ سلام دعا لے رہے ہیں۔ آ کر ابراہیمؑ سے مصافحہ فرما رہے ہیں۔ سارہ خاتون پر سلام بھیج رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ابراہیم تیاری کرو۔ بھئی کدھر آئے ہو؟ جی ہم تو قوم لوط کی طرف جا رہے ہیں۔ فرمایا، ادھر تو میرا بھائی لوط بھی ہے۔ کہا، ان کو بچا لیا جائے گا۔ یہ ایک نارمل واقعہ نہیں ہے۔ ملائکہ کا زمین پر اترنا، بندوں کے ساتھ باتیں کرنا، فیملی کے ساتھ گپ شپ لگانا، ملائکہ کی دعوت کے لیے ابراہیم کا بچھڑا ذبح کرنا اور ملائکہ کا کہنا کہ ہم فرشتے ہیں، کھانا نہیں کھاتے۔ یہ معمول کا واقعہ نہیں ہے۔

ابراہیم گئے، موسیٰ آ گئے۔ صبح شام جبریل آ جا رہے ہیں۔ ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ حتیٰ کہ موسیٰ کی تسلی ہی نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا، اللہ میاں! میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ نے کہا، دیکھ! تو نہیں دیکھ سکے گا۔ میں تو دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہا، اچھا اس پہاڑ کو دیکھ۔ اس پر میں ذرہ برابر اپنا جاہ وجلال اور جمال ڈالوں گا، جو میں ہوں۔ یہ یاد رکھیے، اللہ نے پہاڑ پر کوئی جعل سازی نہیں کی۔ کوئی چمتکار نہیں دکھایا۔ بلکہ کہا، اے موسیٰ! میں ذرا سا اپنا جاہ وجلال اس پہاڑ طور سینا پر ظاہر کر رہا ہوں۔ اگر وہ تو نے تھوڑا سا دیکھ لیا، تو تو مجھے دیکھ پائے گا۔ پھر وہ زلزلہ آیا۔ دکا دکا ہوا۔ موسیٰ بے ہوش ہو گئے۔ مگر لوگ

Marfat.com

کہتے ہیں، موسیٰ نے خدا کو نہیں دیکھا۔ کیا خیال ہے، آخر وہ کیا دیکھ کے بے ہوش ہوئے؟ وہ اللہ ہی تو تھا، جس کا نور دیکھ کے بے ہوش ہوئے۔ ابھی صرف جھلک ہی دیکھ پائے تھے۔

ان کی حریم ناز کہاں اور ہم کہاں
نقش و نگار پردۂ در دیکھتے رہے

ابھی تو اللہ پوری طرح ظاہر ہوا ہی نہیں پایا۔ ذرا سی جھلک دکھائی رخ انور کی اور موسیٰ گئے حواس سے۔ اللہ میاں نے کہا، چلو تجھے ایک اور بڑی نعمت دیتا ہوں۔ تو مجھے نہیں دیکھ سکا نہ سہی، مگر تجھے کلیم کا میں دعویٰ دے دیتا ہوں۔ تو مجھ سے کلام کرلے۔ یہ بڑا رتبہ ہے پیغمبروں میں۔ پہلے کسی سے براہ راست کلام نہیں کیا۔ تو بڑا عظیم المرتبت نبی ہے۔ تو مجھے بہت پسند ہے۔ میں تجھ سے کلام کرلیتا ہوں۔ سو اللہ نے اس سے کلام کیا اور کلام معراج مقام موسوی ٹھہرا۔

مگر اس پوری زمین پر کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اللہ ہے۔ کیونکہ اس پوری زمین پر کسی شخص نے اللہ کو بالمشافہ نہیں دیکھا ہوا تھا۔ کوئی شخص خدا پر شاہد نہ تھا۔ نذیر ضرور تھے، شاہد کوئی نہ تھا اور شاہد بذاتہ وجود سے شہادت دیتا ہے کہ میں نے خدا کو دیکھا ہے۔ موسیٰ کا جگر تو نہیں چیرا گیا تھا۔ ان کو انشقاق قلب نہیں ہوا تھا۔ ان کے دل میں صفائی نہیں ہوئی تھی۔ جب محمدؐ رسول اللہ کو بلایا گیا، تو ایک ایسا اعزاز بخشا گیا، جو پہلے کسی کو حاصل نہ تھا۔ کلام اگر موسیٰ کو بخشا گیا، تو جبریل عیسیٰ کو بخشے گئے۔ جبریل کوئی نرالی شے نہیں تھے۔ جبریل عیسیٰ کو بخشے گئے وایدنہ ھو بروح القدس (پ ا' س البقرہ، آیت ۸۷) جبریل ہی ہیں نا روح القدس؟ روح القدس کا یہ عالم تھا کہ عیسیٰ کے ساتھ ساتھ لگے پھرتے تھے۔ عیسیٰ کی جگہ لوگوں کو زندہ کرتے تھے۔ کوڑھیوں کو صحیح کرتے تھے۔ برص کے مرض کو دور کرتے تھے۔ ان کے جنون اور سرسام کا علاج کرتے تھے۔ ہر جگہ حضرت جبریل امین عیسیٰ کے ساتھ تھے۔ اس میں کون سا بڑا کمال تھا؟ اگر رسول اللہؐ یہ کہتے کہ معراج، معراج جبریل تھا۔ مگر یہ معراج حضرت عیسیٰ کو نصیب تھی۔ یہ کمال نبوت مصطفےٰ نہ تھا۔ سو اللہ نے دلیل اور محبت تمام کرنے کی خاطر یہ اہتمام کیا، تاکہ پوری بنی نوع آدم میں سے ایک انسان یہ شہادت دے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے، اپنے خیال سے اللہ کو دیکھا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیسے؟

وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا
میری آرزو سے کم تر میری تاب سے زیادہ

اب یہ اللہ پر منحصر تھا کہ وہ کس انداز میں آئے گا۔ اس کو اپنے بندے کی استطاعت، اس کی طاقت، علم وحکمت اور اس کے وژنری پراسیس کا علم تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ رسول اللہ کا ظرف کیا تھا؟ مجھے اقبال کا ایک شعر بہت پسند ہے۔ وہ ایک ہلکا سا تقابل حضرت موسیٰ اور رسول اکرمؐ میں ہے۔

تو برنخل کلیم بے تحاشہ آتش ریزی

کہ جب موسیٰ نے تجھے دیکھنے کی آرزو کی، برنخل کلیم۔ تو تو کلیم کے درخت پر آگ بن کے گرا۔

تو برنخل .. کلیم بے تحاشہ آتش ریزی
تو بر شمع یتیم صورت پروانہ می آئی

Marfat.com

اور یتیم کی شمع پر تو خود پروانے کی طرح آیا۔

میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں تمام صحابہ کے ساتھ اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ رسول اللہؐ بدن سے معراج پا گئے اور انہوں نے حضور یزداں میں جگہ پائی۔ اللہ کو دیکھا اور شہادت اول و آخر مکمل کی۔ یہ اس لیے بھی تھی کہ اس کے بعد اللہ پر کسی شہادت کو نہیں آنا تھا۔ اب شہادت کلام اور شہادت ملائکہ نہیں چاہیے تھی۔ شہادت رویت یزداں مراد تھی اور یہ وہ رسولؐ اللہ کو عطا ہوئی۔ اس میں قطعاً کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔

معراج کا یہ دوسرا پہلو ہے کہ اللہ نے قرآن میں کہا، اے گروہ جن وانس! اگر تم کوشش بھی کرو، تو اقطار السمٰوت سے نہیں گزر سکتے۔ الابسلطان ہاں مگر سلطان کے ساتھ، دلیل غالب اور حکمت غالب کے ساتھ۔ ابھی تک زمین وآسمان اور کائنات میں کوئی انسان ان ساتوں افلاک اور ساتوں کائنات سے نہیں گزرا۔ بہت سے پیغمبر بھی گئے۔ کوئی آسمان اول پر کوئی دوئم پر۔ مگر ان پیغمبروں میں سے کسی نے بھی اقطار السمٰوت سے آگے گزر نہیں کی۔ کیونکہ اس میں الابسلطان کی کوئی دلیل ضرور چاہیے تھی۔ زمین پر ایک ایسا انسان ہے کہ جو یہ دعا مانگتا ہے رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق و جعل لی من لدنک سلطناً نصیرا (پ۱۵، س بنی اسرائیل، آیت ۸۰) اے پروردگار! مجھے اپنی طرف سے سلطان نصیر عطا فرما اور یہ وہ سلطان نصیر ہے کہ زمین پر ایک شخصیت بغیر کسی راکٹ اور کسی انسٹرومنٹ کے ایسے مقام سے بھی آگے گزر گئی، جہاں جبرئیل امین بھی رہ جاتے تھے اور شکایت کرتے تھے کہ اگر میں ذرا بھی آگے بڑھا، تو میرے پر جل جائیں گے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اور کتنی حیرت کی بات ہے کہ لوگ کہیں، رسول اللہؐ نے جبریل کو دیکھا اور جبریل یہ کہہ رہے ہیں کہ یارسول اللہ! اگر مقام سدرۃ المنتہیٰ سے ایک بال بھی آگے بڑھا، تو فروغ تجلی بسوزد پرم۔ اللہ کی تجلی میرے بال و پر جلا دے گی۔ آپ نے فرمایا، میں آگے جا رہا تھا کہ مجھے اور ملائکہ ملے۔ فرمایا، میں نے عرش کے نیچے لوح وقلم کے فرشتوں کی کنک کی آوازیں سنیں، جو وہ لکھ رہے تھے۔ یہ اتنا بڑا جہان، اتنی بڑی دنیا، اتنی بڑی کائنات اور اس میں صرف ایک ہی شخص مراد کائنات، مراد زندگی اور مراد پروردگار تھا۔ اللہ اپنے بندے کو یہ رنگ بھی نہیں دے سکتا، تو کس نے دینا تھا؟

حضورؐ پر جادو

رسولؐ اللہ کی حیات مبارکہ میں ایک ذرہ برابر بھی غلط فہمی اور کم علمی کا شائبہ نہیں ہے۔ کوئی بات سرکار رسالت مآبؐ نے ایسی نہیں کہی، جس کے نتائج اور جس کے علمی فوائد امت کے لیے عمومی نہیں۔ لوگ بہت سوال کرتے ہیں کہ حضورؐ پر جادو کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ اور اگر حضورؐ پر جادو ہو سکتا ہے، تو پھر عام بندوں کی اس میں کیا حیثیت ہے؟ میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ اگر ایک بہت بڑا استاد، جس نے قیامت تک کے لیے انسانوں کے لیے علم وتعلیم میں آخری حرف چھوڑنا ہو، کیا وہ ایک چیز کی حقیقت کو جانے بغیر اس کا علم دے گا؟ کیا کوئی ایسا استاد اچھا استاد کہا جا سکتا ہے، جس کو ایک چیز کا علم نہ ہو اور وہ علم کے بارے میں گفتگو کرے؟ یہ یاد رکھئے کہ رسولؐ اللہ کی ہی ایک حدیث مبارک ہے کہ بہترین علم یہ نہیں کہ میں جانتا ہوں۔ بہترین علم یہ ہے کہ جب کسی بات کا پتہ نہ ہو تو کہے، میں نہیں جانتا۔ ایسا بڑا استاد اگر سحر کے

Marfat.com

بارے میں گفتگو کرتا اور وہ سحر کے اثرات کو نہ جانتا ہوتا، تو پھر آپ اس استاد کو کیا کہتے؟

واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضورؐ نے رہتی دنیا تک اپنی امت کے لیے جادو، اس کی علامات اور اس کے اثرات کے بارے میں آپ تک علم چھوڑنا تھا۔ اس لیے حضورؐ پر جادو نہیں ہوا، بلکہ حضورؐ کے باطن سے جادو گزارا گیا۔ اگر اللہ اور جبریل کے ہوتے ہوئے جادو ہو جاتا، تو پھر اللہ کی کیا حیثیت تھی اور جبریل کی کیا حیثیت تھی؟ پھر ان ملائکہ، مقربین کی کیا ضرورت تھی؟ ان کی کس ضمن میں بڑائی ہوتی۔ اگر خدا کے ہوتے ہوئے شیطان رسول اللہ پر دسترس حاصل کر لیتا؟

واقعہ یہ ہے کہ بحیثیت ایک بہت بڑے استاد کے حضور کی حدیث مبارکہ ہے کہ سب سے بڑا سخی اللہ خود ہے اور سب سے بڑا سخی پھر میں ہوں جو لوگوں کو علم دیتا ہوں۔ اس کے بعد وہ عالم ہے، جو اللہ کے لیے لوگوں کو علم دیتا ہے۔ کائنات میں جادو اور سحر کا وجود تو ہے۔ جنات کی گرہیں، جیسے قرآن کی آیت بھی بتاتی ہے، گرہیں لگانے والی عورتیں اور حاسدوں کے حسد میں جادو ہے۔ اسی طرح غیبت کرنے والوں کی غیبت میں جادو ہے۔ حضورؐ سے بہت پہلے حضرت موسیٰ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بھی یہ واقعات ہوئے۔ کسی پیغمبر نے سحر یا جادو کے مظاہرات نہیں پیچھے چھوڑے۔ پہلی دفعہ قرآن حکیم میں موسیٰؑ کے ضمن میں اللہ نے واضح کہا کہ اصل میں جادو کا اثر خیال اور یادداشت پر ہے۔ اس چیز کو حقیقی سمجھنا جو حقیقی نہیں ہے۔ جیسے جادوگران قوم موسیٰ نے رسیاں بانٹ رکھی تھیں۔ رسیاں کیوں حرکت میں آئیں، اس کی منطق موجود تھی۔

اخبار میں خبر پڑھنے کو ملی کہ ہندوؤں نے مسلمانوں پر غالب آنے کے لیے ویدانت کے منتروں سے استفادہ کرنے کا سوچا ہے۔ ویدانت کے منتروں میں کچھ تراکیب ایسی ہیں، جنہیں ہمارے سنیاسی بھی جانتے ہیں۔ ایک سنیاسی مجھ سے ملا۔ اس نے کہا، اگر بستر پر بچے پیشاب کر دیتے ہیں اور اس کو روکنا ہو تو جنگلی کبوتر کی بیٹیں ابال کر اس کو پلا دو، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب میں نے سنیاس تو لیا ہوا نہیں ہے، نہ بن باس لیا ہوا ہے۔ اس نے طریقہ مجھے بتا دیا۔ درد گردہ کا بھی طریقہ میں نے اس سے سیکھا۔ مگر وہ آدمی نروس کا علاج نہیں کر سکا۔ اس کو انتہائی شدید تکلیف ہوتی تھی۔ وہ یورالوجی کا مریض تھا۔ چیختا چلاتا میرے پاس آیا۔ اس نے کہا، پروفیسر صاحب! اگر آپ میری یہ تکلیف کچھ ٹھیک کر دیں، تو میں آپ کو بڑے بیش قیمت نسخے بتاؤں گا۔ مجھے تو ضرورت نہیں تھی۔ سو اس نے مجھے بڑے بیش قیمت نسخے بتائے۔ ان میں سے دو میں نے آپ کی نذر بھی کر دیئے۔ چاہے آپ بیٹیں ابالیں نہ ابالیں، میں نے ان پر عمل نہیں کیا۔

سنیاس پن کا ایک نسخہ میں ڈاکٹروں کو بہت بتاتا ہوں۔ کہتا ہوں، میں نے یہ نسخہ سنا اور یہ اتنا خطرناک مرض کا ہے، جس کا علاج کوئی نہیں ہے۔ جسے آپ رعشہ کہتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک بندہ صحت یاب ہوتے دیکھا۔ اس کا ہاتھ کانپتا تھا۔ پیالی تھامے نہیں تھامی جاتی تھی۔ یہ تو نے کیسے کیا؟ اس نے بتایا کہ میں نے کرنات مرغا لیا۔ اب کسی کو کیا پتہ، کرنات مرغا کیا ہوتا ہے؟ اب دیکھیں، اس ٹرمنالوجی میں بھی اسرار ہے۔ کرنات مرغا اس کو کہتے ہیں، جس کی چونچ اور پاؤں سیاہ ہوں۔ پھر اس نے کہا، میں نے آک کا دودھ لیا۔ اس میں کرنات مرغے کے پاؤں کی ساری ہڈیاں دودھ میں بہت سارا جمع کر کے ڈال لیں۔ اس کو گرم کیا۔ اتنا گرم کرو کہ مرغے کی ہڈیاں پس جائیں۔ دودھ خشک ہو جائے اور سفوف بن جائے۔ اس سفوف کا ایک چمچ صبح، ایک دوپہر اور ایک شام کو لیں۔ پرکنسن ختم ہو جائے گی۔ چونکہ میں نے

Marfat.com

اس کی پرکنسن ختم ہوتے دیکھی ہے، اس لیے میں اس پر گواہ ہوں۔ اب مجھے نہیں پتہ کہ اس کا اثر دیرپا ہے یا نہیں۔

بہت بڑے عالم اور استاد کی یہ شان نہیں ہے کہ ہوائی باتیں کرے۔ رسول اللہؐ کے باطن سے جادو گزرا گیا اور جب جادو گزرا گیا تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جادو کا اثر یہ ہے کہ آدمی بھولنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک خیال سے بہت زیادہ چپک جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضورؐ اپنی بیویوں کی باری بھول جاتے تھے۔ اب آپ پھر قرآن کی بات یاد کیجیے کہ خدا کہتا ہے فیتعلمون منھما مایفرقون بین المرء والزوجه (پ ا،س البقرہ آیت ۱۰۲) ان کے مقاصد یہ ہیں کہ تعویذ حب دے دیا۔ تعویذ بغض دے دیا۔ میاں بیوی میں فرق ڈال دیئے۔ دوسروں کے کام بگاڑ دیئے۔ رسول اللہؐ پر جب جادو ہوا، تو یہ اس کا عملی مظاہرہ تھا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ اثرات ہوتے ہیں۔ باریاں بھول گئے یا انہوں نے محسوس کیا کہ کچھ چیز یاد آرہی ہے۔ نماز میں وقفے بڑھ گئے۔ جب حضورؐ کو نجات دی گئی، تو حضورؐ ایک ایسے عالم باعمل تھے، جن کو پتہ تھا کہ سحر کیا ہے۔ اس کے اثرات کیا ہیں اور یہ بندوں پر کس طرح عمل کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا علاج دے دیا یعنی سورہ الناس اور سورہ الفلق اور فرمایا کہ آسمان کے عرش کے نیچے سے مجھے دو سورتیں ایسی شاندار چمکتی ہوئی عطا ہوئیں۔ اس سے پہلے دفع سحر کے لیے حضورؐ بہت ساری آیات پڑھتے تھے، مگر جب الناس اور الفلق اتریں، تو حضورؐ ان پر اکتفا فرماتے تھے۔

پیغمبر پر اس طرح جادو نہیں ہوا۔ بلکہ وہ ایک عالم کے علم کا تجربہ ہے۔ اس تجربے کو آپ تک انہوں نے پہنچایا۔ انہوں نے کوئی بات ایسی نہیں کہی، جس کے بارے میں ان کو مکمل علم نہ تھا یا جس کے بارے میں علم نہ ہو۔ حضورؐ کی حدیث ہے کہ عالم وہ ہے، جو یہ نہ کہے کہ مجھے ہر بات کا علم ہے۔ بلکہ وہ ہے، جو یہ کہے کہ مجھے اس بات کا علم نہیں ہے۔ خدا اس کو بہتر جانتا ہے۔

Marfat.com

اسلام اور عورت

قرآن حکیم میں خواتین نے ایک دفعہ عرض کی، یارسول اللہؐ! یہ کیا مصیبت ہے۔ لگتا ہے سارا قرآن مردوں کے لیے ہے۔ خطاب اور بات میں ہر حکم مردوں سے ہے۔ ہمیں تو آپ نے کسی حساب کتاب میں ہی نہیں رکھا، کہیں شمار ہی نہیں کیا۔ حضور گرامیؐ مرتبت ابھی خاموش تھے کہ اللہ نے اپنی بندیوں کی بات سن لی۔ فوراً آیات اتریں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ معاشرہ مردانہ غلبے کا ہے، تو ہم مرد کو خطاب کرتے ہیں۔ وہ مختصراً اور تفصیلاً جا کر بیوی کو یہ بات بتادے گا۔ باپ بیٹی کو اور بھائی بہن کو بتادے گا۔ مگر یہ تمہارا گلہ بڑا ٹھیک ہے کہ ہوسکتا ہے، آئندہ آنے والی نسلوں میں یہ اجماع بن جائے کہ قرآن ہمارے لیے ہے ہی نہیں۔ خدا نے ہمیں تو خطاب ہی نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا، ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ پوری آیات میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا ذکر ہے۔ والقنتین والقنت والصدقین والصدقت والصبرین والصبرت اور والحفظین فروجهم والحفظت (پ ۲۲، س الاحزاب، آیت ۳۵) اور آخر میں بڑے کمال کی بات کی۔

قرآن حکیم کے انداز کا آپ کو پتہ ہو تو خدا کے ہاں پیچھے آنے والا پہلے آنے والوں سے بہتر ہوتا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے، جو قاعدہ اور قانون ربانی میں آئی ہے۔ جیسے حضرت آدمؑ سے سلسلہ شروع ہوا اور صحف آدم سے بات شروع ہوئی۔ چلتے چلتے قرآن تک آئی۔ مگر جب قرآن آیا، تو پیچھے آنے والا سب آگے آنے والوں سے آگے بڑھ گیا۔ جب محمدؐ رسول اللہ آئے، تو یوں سمجھو، رسالت اپنی پناہ میں چلی گئی۔ محمدؐ رسول اللہ جب تشریف لے آئے تو پھر ہدایت و رشد اور انسان کی بہتری کا کوئی ایسا درجہ نہ رہا، جو پیچھے بچتا تھا۔ اسی لیے تمام کام کو سمیٹ کر ایک مقتدر اور اعلیٰ ترین نبوت پر اسے ختم کر دیا۔ قرآن حکیم جب یہ لسٹ دے رہا تھا، تو آخر میں اس نے کہا، والذکرین الله کثیرا والذکرت (پ ۲۲، س الاحزاب، آیت ۳۵) ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں۔

میرے اپنے تجربے میں ایک بڑی عجیب بات آئی ہے کہ مردوں کو اگر آج بھی تھوڑا سا ذکر دیں، تو وہ کہتے ہیں، زیادہ ہے جبکہ بہت ساری خواتین ایسی آتی ہیں، جو کہتی ہیں، تھوڑا ہے۔ تھوڑا سا اور دے دیں۔ میں ان سے یہی کہتا

Marfat.com

ہوں کہ تم گھروں میں الجھی ہوئی ہو۔ بہت سارے کام کاج کرنے ہوتے ہیں۔ یہ کہاں تم ساری تسبیحات پڑھوگی؟ وہ کہتی ہیں،نہیں جی، میں تو بڑی آسانی سے پڑھ لوں گی۔صبح اٹھتی ہوں۔ آسانی سے پڑھ لیتی ہوں۔شام کے لیے کوئی دے دیں۔ میں تو خدا کی اس آیت کا قائل ہو گیا ہوں کہ آخر میں آنے والے ہر حال میں مردوں کے ذاکروں سے عورتوں کی ذاکرات بہتر ہوتی ہیں۔

یہ بات عملی طور پر اس وقت سامنے آئی، جی ایک وقت میں صوفیائے کرام کا آغاز ہوا، تو اس زمانے میں اس وقت پانچ بڑے عظیم ترین صوفی موجود تھے۔ حسن بصریؒ اور پھر حسن ابن علی۔ سلاسل تصوف میں ان تینوں ناموں سے جا ملتے ہیں اور دوسرے حضرت ذوالنون مصری ہیں، جو اتنے بڑے زاہد مرتاض ہیں۔ بہت مجاہدہ ومشقت کے عادی اور قائل ہیں کہ انہوں نے زمانے بھر میں مجاہدات کی مثال قائم کر دی۔ ایک دفعہ غلطی سے اللہ کو کہہ بیٹھے کہ اللہ میاں تو جیسے چاہتا ہے، مجھے آزمالے۔ محبت میں اللہ سے کہہ تو بیٹھے کہ میں تیری خاطر ہر جبر سہنے کو تیار ہوں۔ اللہ نے کچھ بھی نہیں کیا، صرف مرض اسہال میں مبتلا کر دیا۔ چار پانچ دن گزرے کہ کہا اللہ میاں! بس بہت ہو گیا۔ میں بالکل اس آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔

ایسے علمائے تصوف اس وقت موجود تھے۔ حضرت ذوالنون مصری کی طرح۔ حضرت خواجہ سری سقطیؒ اور خواجہ حبیب عجمیؒ موجود تھے۔ ان چار بڑے نامی گرامی ولیوں کے ہوتے ہوئے بصرہ میں ایک عورت بھی موجود تھی۔ وہ تھیں رابعہ بصری، یہ کتب تصوف کے ریکارڈ پر ہے کہ یہ چاروں صوفیا ہدایت ورشد کے لیے رابعہ کے حضور جاتے تھے۔ انہیں اپنی خدمات پیش کرتے تھے۔ ان سے درس تصوف لیتے تھے اور مدینہ میں حضرت رابعہ کا نام مشہور تھا کہ یہ رونے والی گڑیا ہے۔ کبھی ان کی آنکھ آنسوؤں کے بغیر نہ دیکھی گئی۔ خواجہ حسن بصری چونکہ بہت بڑے استاد تھے۔ ایک دن رابعہ سے کہا کہ رابعہ میرا بڑا دل چاہتا ہے، میں آپ سے نکاح کروں۔ آپ بھی اللہ کی طلب کرنے والی ہیں اور میں بھی۔ اچھا ہوگا ہم دونوں مل بیٹھیں گے۔ ایک ہی گھر میں ہوں گے۔ اجنبیت ختم ہو جائے گی۔ دونوں نے اللہ اللہ ہی کرنا ہے۔ رابعہ نے کہا، کیا کہہ رہے ہو؟ میرا تمہارا نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ حسنؒ نے کہا، کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس نے کہا کہ طالب خداوند مرد ہے اور طالب دنیا عورت ہے۔ جو دونوں کو طلب کرے، وہ مخنث ہے۔ میں اور تم دونوں مرد ہیں، ہمارا نکاح کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسے نفیس نکات تصوف والی وہ خاتون اور یہ اکیلی نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہمارے پاس تصوف کی دنیا میں ایسی بے شمار خواتین موجود ہیں۔

میں نے کسی کو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بڑا استاد نہیں پایا۔ جیسے حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ چار عورتیں بڑی معزز ہیں۔ سیدنا سارہؑ جیسی عورت زمین پر گزری ہی نہیں ہے، جو نسب کے لحاظ سے اتنی معزز ہو، جس کا باپ نبی، خاوند نبی، بیٹا نبی، جس کا پوتا بھی نبی ہے اور جس کے پوتے کا بیٹا نبی ہے۔ ایسے نسب والی عورت زمین پر نہیں گزری۔

پھر حضرت آسیہ بنت مزاحم فرعون کی بیوی ہے۔ انہوں نے اپنے اصول کی خاطر، محبت مرشدی اور محبت خداوند میں جو قربانی دی، حضرت موسیٰؑ کو سب کچھ جانتے ہوئے پالا۔ تو حضرت آسیہؑ نے اللہ کے ہاں بڑی عزت وتوفیق پائی۔

پھر سیدنا مریمؑ ہیں، جن کو اللہ نے صدیقہ فرمایا۔ ان کا رتبہ تمام جہان کی عورتوں سے بلند فرمایا اور ان کی آغوش میں ایک معجزاتی پیغمبر رکھا۔

Marfat.com

پھر ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں۔ حضورؐ نے ان کے ہوتے ہوئے ان کے مال سے تمتع فرمایا۔ ان کے وجود سے فرمایا۔ اولاد ان سے حاصل کی اور جنت میں ان کے مکان کی ان کو خوش خبری دی۔ حدیث رسولؐ ہے کہ دنیا میں یہ چار عورتیں بڑی معزز ہیں۔ مگر اے عائشہ! تیری حیثیت ان میں ایسے افضل ہے، جیسے ثرید کو باقی کھانوں میں فضیلت حاصل ہے۔

اب سوچنا پڑتا ہے کہ حضرت عائشہ کیوں اتنی معزز ہیں؟ لیکن اس سے پہلے ان پر جو ایک اعتراض پیش کیا جاتا ہے۔ معاذ اللہ! استغفر اللہ! مگر یہ نہیں کسی نے جاننے کی کوشش کی کہ آخر اس چھوٹی سی لڑکی کی اتنے بڑے آدمی کے ساتھ شادی کی ضرورت کیا تھی؟ اگر آپ اپنی مذہبی کتابوں کو دیکھیں، تو آپ کو ایک عجیب سا جملہ نظر آتا ہے کہ حضورؐ بڑے اداس تھے۔ سیدنا ابوبکر نے تالیف قلب کے لیے حضرت عائشہ کو ان سے بیاہ دیا۔ کیا تالیف قلب کے لیے کوئی اور خاتون نہیں تھی؟ صرف ایک چھوٹی سی بچی رہ گئی تھی؟ حضورؐ نے فرمایا، جبرئیل نے ایک نوزائندہ بچے کی طرح عائشہ کو ایک پالنے میں مجھے دکھایا۔ میں سوچتا تھا کہ اللہ میاں میں نے اس کا کیا کرنا ہے؟ باون سال یا پچاس سال کی عمر کے شخص کو آپ ایک نوزائیدہ بچی دکھاتے ہو۔ میں نے اس کا کیا کرنا ہے؟ سوچتا رہا کہ اس میں اللہ کی کیا مرضی ہوسکتی ہے۔ اللہ کے رسول ہماری طرح اللہ پر طنز و تشنیع نہیں کر سکتے۔ فرض کریں، میں ایسی صورتحال میں ہوں، تو کہوں گا، اللہ میاں کا دماغ ٹھیک ہے کہ نہیں؟ کیوں ایسی مصیبت ڈال دی ہے؟ یہ کیا چیز پیش کر رہے ہیں؟

اس کی ایک بہت بڑی وجہ تھی۔ آج وہ وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ آپؐ کی تمام ازواج مطہرات سے جتنی احادیث مروی ہیں، ان کی تعداد صرف 17 ہے جبکہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پانچ ہزار احادیث مروی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ دین کا ایک چوتھائی اس حمیرہ کے پاس ہے۔ اب آپ کو سمجھ آ گئی؟ ان عورتوں میں کسی کی یادداشت اتنی تازہ نہیں تھی کیونکہ تمام ازواج مطہرات ایک خاصی زندگی گزار چکی تھیں۔ جبکہ ام المومنین کو خدا نے صرف اسی لیے اٹھایا۔ پالا اور تازہ نوخیز ذہن دیا کہ اس نے ایک ایک لفظ، ایک ایک بات اور خیال حضرت محمدؐ کی عائلی زندگی کا محفوظ رکھا۔ وہ اس علم پر اتنی بڑی اتھارٹی ہیں۔ اللہ نے ان کو اولاد نہیں دی، بلکہ تمام مسلمان ان کی اولاد ٹھہرائے گئے۔ تمام عورتیں آج کسی مرد سے وہ سبق نہیں پڑھتیں، جو انہوں نے اپنی ماؤں کے ذریعے اور پھر اپنی ماؤں کے ذریعے بالآخر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حاصل کیا۔

وہ اتنی بڑی عالمہ اور اتنی بڑی استاد ہیں کہ بائیس سال تک انہوں نے لوگوں کو احادیث کا درس دیا ہے۔ عائلی زندگی کی تمام احادیث اور تمام مسائل ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا، اگر یہ یادداشت صاف ستھری سلیٹ نہ ہوتی اور تر و تازہ نہ ہوتی اور انہیں اتنی شدید محبت محمد رسول اللہؐ سے نہ ہوتی۔ حضورؐ فرماتے ہیں، عائشہؓ میں اچھی طرح جان لیتا ہوں، جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو۔ پوچھا، یا رسول اللہؐ! کس طرح؟ فرمایا، عموماً تم مجھے محمدؐ رسول اللہ کہتی ہو۔ جب تم ناراض ہوتی ہو، تو مجھے یا رسول اللہ نہیں کہتیں۔ یہ حدیث آپ دیکھیں، کتنی خوبصورت ہے۔ اس کے بغیر مسلمان کو اس معتدل عائلی زندگی کا پتہ ہی نہیں لگ سکتا۔ جو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ خبر دیتی ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے حضورؐ سے کہا، آئیے، ذرا دوڑ لگائیں۔ صحن کشادہ تھا۔ کون آگے

Marfat.com

نکلتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، چلو ہو جائے۔ دوڑ لگی۔ حضورؐ آگے نکل گئے۔ فرمایا، میں تو عائشہ جیت گیا۔ فرمایا، حضورؐ پھر کبھی سہی۔ کافی عرصہ یا کچھ سال گزر گئے۔ تو حضورؐ جسم سے ذرا تھوڑے سے بھاری ہو گئے۔ میں نے کہا، یارسول اللہ! آج پھر دوڑ ہو جائے۔ فرمایا، ہاں ہو جائے۔ اس مرتبہ دوڑ لگی، تو میں آگے نکل گئی۔ میں نے کہا، حضور، دیکھا! آج میں جیت گئی۔ فرمایا، شکر ہے، آج حساب برابر ہوا۔ تم سے کب جان چھٹتی تھی۔

اب دیکھئے، یہ واقعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سوا کون سنائے گا؟ کس نے آپ سے کہا کہ عائلی زندگی میں اتنا خوبصورت توازن ہمارے پیغمبر کے درمیان موجود ہے اور زندگی کیسی خوشگوار ہے، جہاں ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ فرمایا، میرے اور رسولؐ کے پاس ایک ہی چٹائی تھی۔ اس پر میں اور رسول اللہؐ آرام فرماتے تھے۔ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے، تو عموماً یہ ہوتا کہ میرے پاؤں ان کے سجدے کی طرف ہوتے تھے۔ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو میں پاؤں پھیلا لیتی اور وہ جھکتے، تو میں پاؤں سمیٹ لیتی تھی۔

براہ راست حدیث پڑھنے اور خدا اور اس کے رسولؐ کے باتیں جاننے کا جو مزہ ہے، تبھی آپ کو پتہ لگے گا کہ آپ کے رسولؐ کیسے تھے۔ کس قسم کی زندگی انہوں نے گھر کے اندر اور گھر کے باہر گزاری۔ تب آپ کو اس ہستی کا پتہ لگے گا، جس نے چھوٹی سی عمر میں اس لیے اللہ کے رسول کو عطا فرمائی کہ علم کا بیشتر حصہ آقائے رسلؐ کی پوری زندگی کا انہوں نے مجھ تک اور آپ تک پہنچانا تھا۔ اس لیے فضیلت عائشہ پر کبھی کوئی اشتباہ نہیں ہوا۔ وہ دنیا کی سب سے پہلی عظیم ترین معلمہ ہے۔

آپ کے غصے کا یہ عالم تھا کہ آپ کے غصے سے سارے ڈرتے تھے۔ کمال کی بات ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کا وہ غصہ آج بھی ہر عائشہ میں چلا آیا ہے۔ کوئی عائشہ ایسی نہیں، جس کو غصے والا میں نے نہ پایا ہو۔ آج بھی اگر کسی عائشہ کو کوئی پیشہ اختیار کرنا ہو تو، وہ ٹیچری میں سب سے اچھی رہے گی۔ یہ آپ کو اس نکتے کی بات بتا رہا ہوں کہ عائشہ سے بہتر کوئی ٹیچر نہیں ہے۔ اتنی ٹینشن، اتنا غصہ اور اتنی جھاڑ پھونک کہ کسی کا لحاظ تک نہیں کیا۔ کھڑے کھڑے حضرت علیؓ کو ڈانٹ دیا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کو عبداللہ ابن عمرؓ کو ڈانٹ دیا اور لوگ تسلیم کرتے تھے کہ ماں کا حق ڈانٹنے کا ہے۔ چھوٹی سی عمر میں یہ عقل و معرفت میں ہم سے اتنی آگے ہیں۔

سو ذاکرین اور ذاکرات کے اس سلسلے میں ایسی ایسی باکمال خواتین اسلام میں گزری ہیں کہ میرا نہیں خیال، عورتوں میں کسی قسم کا کمتری کا احساس موجود ہو۔ دین کے معاملے میں عورتیں آگے رہی ہیں۔ برصغیر میں عورتوں کی ذہنیت اور عادتیں ہندو کلچر نے کرپٹ کر دی ہیں۔ ایسی عادتیں مسلمان عورتوں کی نہ تھیں۔ شروع میں ہندو معاشرہ مردانہ بالادستی کا شکار تھا۔ برہمن اپنی سیادت کو قائم رکھتے ہوئے سب سے زیادہ دباؤ عورتوں پر ڈال دیتے تھے۔ چونکہ آرین بنیادی طور پر پیٹری آرچ یعنی پدرانہ نظام کے حامل تھے، جیسے صحرائی معاشرے ہیں، جن میں خاندان کا سربراہ باپ ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مقامی معاشرے مادرانہ نظام کے تھے۔ جہاں زمین کی حکومت ہے، وہاں ماں کی حکومت ہے اور جہاں صحرا اور پہاڑ ہیں، وہاں باپ کی حکومت ہے۔

ہندوستان وہ علاقہ ہے، جہاں مادرانہ نظام اور پدرانہ نظام آپس میں کش مکش میں آئے۔ مادرانہ نظام نے شکست کھائی۔ شکست کے بعد پالیسی یہ بنائی گئی کہ جتنی دیر تک باپ طاقتور ہے، اس کے سامنے سر جھکائے رکھنا ہے اور

Marfat.com

جب اولاد سر اٹھالے، بڑی ہو جائے، تو باپ کو ایک طرف کر دو۔ آج بھی وہی رسم قائم ہے۔ کسی مرد کی غریب اور شریف بیوی مدتوں ظلم اور جبر سہتی رہتی ہے، مگر لحاظ تو نہیں کرتی۔ بچوں کو ساتھ ساتھ بہکاتی رہتی ہے اور بہکانے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جب باپ بوڑھا ہوتا ہے۔ جس وقت اسے بچوں کی استعانت کی ضرورت ہے، اس وقت ماں باپ بن کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ اب تم مزید کیا چاہتے ہو؟ بہت سہہ لیا، ہم نے تمہارے جبر واستبداد کو۔ اسے اپنے معاشرے اور کلچر سے نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ بطور ٹیچر میں جو آج ہر بوڑھے آدمی کو اس بلا کا شکار دیکھتا ہوں، تو اسے کہتا ہوں کہ اس وقت عقل کرتے نا، جب تم اس پر رعب ڈال رہے تھے۔ ان پر جبر کر رہے تھے اور انہیں حقیر سمجھ رہے تھے۔

مردانہ غلبے میں ایک بڑی غلطی عقلی بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ مرد ان پڑھ ہو کر بھی اپنے آپ کو پڑھی لکھی عورتوں سے عقلمند ترین سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک میٹرک پاس خاوند کی شادی ایک ایم اے پاس لڑکی سے ہوگئی۔ مجبوری ہے۔ معاشرے میں اس قسم کی بے ہنگم شادیاں بہت ہوتی ہیں۔ یہ جبر اس لیے ہے کہ ہمارے ہاں چونکہ رسم ورواج کی اتنی پابندیاں ہیں کہ کوئی اور ذریعہ باقی نہیں ہے۔ خاوند اٹھتے بیٹھتے بیوی کو یہ یاد دلاتا ہے کہ یہ تم نے ایم اے کر لیا ہے، پھر بھی میں تم سے زیادہ قابل ہوں۔ اب وہ بے چاری جس نے دو چار حرف پڑھے ہیں، اس چیلنج کو قبول کر سکتی ہے۔ مگر اس کو پتہ ہے کہ یہ جاہل مطلق ڈگری کے باوجود مجھے طلاق دینے پر قادر ہے۔ اس لیے وہ خوف کے مارے بولتی ہی نہیں اور ایک ناقص شاؤنزم مرد کے دماغ میں چلا جاتا ہے۔ تو قدر ناشناسی کے عوض ہمیں ہندوؤں سے جو بہت سارا دوسرا کلچر ملا ہے، اس نے عورت میں تمام عرصے میں دفاعی رویہ پیدا کر دیا ہے۔ بیٹی ہے، تو مدافعانہ ہے۔ بیوہ ہے، تو مدافعانہ ہے۔ یہی حال ماں بیچاری کا ہے اور اس کا دفاع میں جھوٹ بڑا آ گیا ہے۔ جھوٹ اس مدافعانہ میکنزم کا ایک بنیادی حصہ بن گیا ہے۔ بہانہ سازی، جھوٹ بولنا، ذہن میں مسلط انجانے خوف کے تحت بہانے بنا لینا، غلط بات کرنا اور غلط کو صحیح ثابت کرنے کی سعی کرنے کا ایک سلسلہ ہے کہ اس کے تحت اغلاط کی طوالت ختم ہونے میں ہی نہیں آتی۔

اسلام میں ایسا بالکل نہیں تھا۔ مسلمان عورتوں کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا گیا۔ ہمارے پاس جو اصحاب، تابعین اور تبع تابعین کی تاریخ موجود ہے، اس میں کسی قسم کے شائبات نہیں پائے جاتے ورنہ اتنی جھوٹی ماں کا سچا بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ جسے اپنی آغوش سے جھوٹ سننے کی عادت پڑ گئی ہو، اس بچے نے کہاں بڑے ہو کر سچ بولنا ہے؟ امانت کا احیاء نہیں ہوا۔ اسلامی اقدار پر ہندوانہ اقدار غالب آ گئیں۔ ہندو مکر وفریب کی اتنی گہری استعداد رکھتا تھا کہ تین ہزار سال سے ہندوستان میں جو مذہب بھی آیا، وہ ہندو کا شکار ہو کے رہ گیا۔ کتنی جلدی شکار ہو گیا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بدھ مت میں مہاتما بدھا نے کبھی خدا کا نام نہیں لیا۔ اس لیے نہیں لیا کہ مہاتما کے زمانے میں ہزاروں بت اور ہزاروں خدا موجود تھے۔ اس شریف آدمی نے سوچا کہ میں اگر خدا کا نام لیتا ہوں، تو ان لوگوں میں ڈکشنری تو نہیں بدل جائے گی۔ میں اسے برہما کہوں، شیوا کہوں، وشنو کہوں، حقیقت اعلیٰ کا کوئی نام دوں، تو وہ ایک دیوتا ہی رہ جائے گی اور میری جداگانہ ریسرچ یا تحقیق اور خدا کے وجود پر میرا اعتقاد کبھی لوگوں تک نہیں پہنچ پائے گا۔ اس نے بجائے خدا کا نام لینے کے عرفان وآگہی ونروان اس کیفیت کا نام رکھ دیا۔ اس نے اللہ کا نام نہیں لیا۔

بدھ مت میں شروع سے ہی دو فرقے ہو گئے۔ بلکہ مہاتما نے لازم قرار دیا کہ تلقین حیات کے لیے آٹھ بنیادی

Marfat.com

اصول ہیں۔ ان میں سے کوئی اصول ایسا نہیں، جس سے اسلام اختلاف کرتا ہو۔ جیسے راست اقدام، راست خیالی، راست بازی، ایک بات بھی ایسی نہیں ہے کہ حضورؐ کے سامنے کی جاتی، تو حضورؐ فرماتے، یہ غلط ہے۔ مہاتما کے تمام قوانین اسلامی ہیں۔ میں تو مہاتما کو ایک پیغمبر ہی سمجھتا ہوں۔ اگر چہ ہم وضاحت سے نہیں جانتے۔ مگر خدا کا ایک قول مبارک ہے کہ ہم نے کسی امت کی طرف تباہی نہیں بھیجی، جب تک کہ اس کی طرف کوئی پیغمبر نہیں بھیج لیا۔ نہ صرف یہ بلکہ الابلسان قومه اسی قوم کی زبان میں۔

تو ظاہر ہے کہ موہنجوداڑو کی تباہی سے پہلے پیغمبر بھی آیا ہوگا اور وہ انہی کی زبان میں ہوگا۔ کوئی سریانی میں کوئی عبرانی میں اور کوئی عربی میں۔ کسی زبان و ڈکشنری میں کوئی لفظ ایسا ہوگا، چاہے وہ جو بھی لفظ ہو، جس کی حقیقت اور آثار کے کوئی دوسرا لفظ نہیں لگتا اور وہ صرف اور صرف ایک ذات واحد کی ترجمانی کرتا ہو، تو وہ اللہ کا نعم البدل ہوگا۔ اگر آپ پرانی تہذیبوں میں خدا کے نام سنیں، تو آپ کہیں گے کہ یہ کیا نام ہیں؟ اناہیہ، ماطنی، جونی، سراشا یہ افریقہ کی اقوام میں اللہ کے نام ہیں۔ اگر آپ پیچھے چلتے چلے جائیں، تو آپ کو دیوا، اخدیثا، ہندوستان میں اللہ کے نام ملتے ہیں۔ ادھر ایران میں اہرمن اور اہورا مزدا، جبکہ اس کا نام یہودیوں نے یہواوہ دے دیا۔ ان زبانوں میں یہ نام خدائے مطلق کی ہی نمائندگی کرتے ہیں۔ فارسی میں یہ خدا ہو گیا۔

اب یہ ضرور ہے کہ اللہ اسم ذات ہے اور اللہ کے بعد کسی اور اسم کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر اللہ نے قرآن حکیم میں فرمایا، تم اسے رحمٰن کہو یا سلام کہو یا تم اسے مومن، جبار یا قہار کہو، سب اللہ ہی کے نام ہیں۔ هو الله الخالق البارئ المصور له الاسمآء الحسنى سب اسی کے نام ہیں له مافى السمٰوٰت والارض وهو العزيز الحكيم (پ ۲۸، س الحشر، آیت ۲۴) وہی عزت وحکمت والا ہے۔ اس کے بے شمار نام ہیں۔ کوئی آدمی، کوئی نام اس طرح لے کہ اس نام سے کوئی اور مراد نہ ہو اللہ کے سوا، تو وہ اللہ ہی ہے، چاہے وہ کسی ہی زبان میں ہو، وہ اللہ ہی ہوگا۔

میں آپ کو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی وجہ بتا رہا تھا کہ خدا نے کیوں انہیں چنا اور کیوں زوجیت پیغمبر میں دیا؟ دفاع کرنے والے اتنی معمولی سی بات نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے انتخاب کو اللہ کی نظر سے دیکھنا چاہیے نہ کہ میں اس کی وجہ دوں کہ یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا۔ اگر کسی انگریز کو جواب دوں اور اگر وہ رسول اللہؐ کو پیغمبر ہی نہیں مانتا، تو ام المومنین حضرت عائشہؓ کی کیا توقیر کرے گا؟ وہ اللہ اور رسولؐ کو مانتا ہو، تو تب جا کے وہ اس نکتے کا قائل ہوگا۔ ورنہ ان کے بے شمار اعتراضات ختم ہونے میں ہی نہیں آتے۔

انڈیا میں پدرانہ اور مادرانہ کلچر کے درمیان بدترین دو چار باتیں ہیں، جو ہمارے زنانہ کلچر میں آئی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مدافعانہ میکنزم جھوٹ کا آیا ہے۔ آج تک آپ نے کسی اخبار میں کسی عورت کی تعریف میں یہ پڑھا ہو کہ ماشاء اللہ ہمیشہ سچ بولنے والی ہے، کتنا عجیب سا لگتا ہے۔ کیوں نہ ہو کہ ایک مسلمان عورت کی عزت وحرمت اس بات میں ہو کہ وہ دانستہ کسی سے جھوٹ نہ بولے۔ ایک مسلمان معاشرے میں یہ بات کیوں ہو کہ ہمارے لیے سچ بولنا محال ہے؟ یہ سوال میں اپنے آپ اور دوسروں سے بھی کرتا ہوں کہ ہم کیوں نہ اسلام کی ایک سادہ قدر کو بھی اہتمام سے عمل میں نہیں لا سکتے؟ ایک شخص، جس سے رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ جھوٹ نہ بولنا۔ وہ گیا اور کچھ عرصے بعد آیا کہ حضورؐ آپ نے کیا

Marfat.com

مصیبت ڈال دی ہے؟ مجھ میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ ایک جھوٹ نہ بولنا اتنا مشکل ہے کہ اس نے مجھے تمام برائیوں کو گرفتار کرنا آسان کر دیا ہے۔

آیئے میں آپ کو حضورؐ کی دو چار دعائیں سناؤں۔ ایک دعا کے پہلے حصے میں ہی اتنا علم ہے کہ بندہ حیران ہو جاتا ہے، حضورؐ نے یہ پیٹرن آف تھاٹ کہاں سے لیا۔ فرمایا اللھم انی اعوذبک من دعا لایسمع اے اللہ اس دعا سے پرہیز مانگتا ہوں، جو تو سنے نہ۔ دیکھئے قصہ ہی ختم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ میری زبان سے صرف وہ دعا نکال، جو تو قبول کرے۔

ایک اور دعا سنئے۔ میں نے اس سے بہتر دعا اپنی ذات کے تکبرات کے لیے کبھی دیکھی نہیں ہے۔ فرمایا اللھم اجعلنی شکورا۔ اے اللہ مجھے اپنی یاد والا بنا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا فاذکرونی اذکرکم (پ ۲، س البقرہ، آیت ۱۵۲) تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا و اشکرولی اور یہ شکر ہے کہ تم مجھے یاد کرتے رہو، میں تمہیں یاد کرتا رہوں۔ فرمایا اللھم اجعلنی شکورا واجعلنی صبورا اور مجھے صبر والا بنا۔

یہاں میں صبر کا ایک تھوڑا سا پہلو بتا دوں۔ عموماً ہم لوگ سارے ہی کہتے ہیں کہ ہم صبر کرتے ہیں۔ بڑے صابر ہیں۔ حضور گرامی مرتبتؐ ایک خاتون کے پاس سے گزرے، بڑی رو رہی تھی، چیخ چلا رہی تھی۔ کوئی قریبی کا رخصت ہو گیا تھا۔ حضور پاکؐ نے فرمایا، صبر کر۔ اس نے کہا یا رسول اللہؐ! بھلا ایسے عالم میں بھی کہیں صبر ہوتا ہے؟ حضورؐ یہ کہہ کے چلے گئے۔ اب اس کو کیا سمجھاتے؟ تین دن کے بعد جب وہ خوب رو چکی، آنسو خشک ہو گئے۔ رہ نہیں پائی۔ کوئی دل سے آواز بھی نہیں نکلتی تھی۔ حضورؐ کے پاس آئی۔ کہا، یا رسول اللہؐ! میں نے صبر کر لیا۔ فرمایا، اب بھی کوئی صبر ہوتا ہے۔

صبر اور علم اکٹھے ہوتے ہیں۔ جس کا علم بڑھتا ہے، اس کو صبر زیادہ ملتا ہے۔ ایک جاہل آدمی ذرا سی بیماری پر تڑپنا پھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ بہت بے چینی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ گھبرائے ہوئے تھے تو حضرت خضر نے کہا کیف صبرک؟ نیک بخت! تجھے کیسے صبر آئے مالم تحب...... تجھے علم جو نہیں ہے۔ علم ہو گا تو تجھے سمجھ آئے گی۔ صبر اور علم کی کیفیت ایک ہے۔

حضورؐ جب صبر کی دعا مانگتے ہیں، تو دراصل علم کی دعا بھی مانگتے ہیں اللھم اجعلنی شکوراً وجعلنی صبوراً کہ شکر عطا فرما، صبر عطا فرما وجعلنی فی عینی صغیراً اے اللہ! مجھے میری نگاہ میں ہمیشہ چھوٹا رکھ وفی عینی الناس کبیرا اور لوگوں کی نگاہ میں مجھے بڑا کر۔ اگر یہ توازن ہو گا، تو آپ قابل عزت سمجھے جائیں گے۔ جب آپ اپنی نگاہ میں چھوٹے رہیں گے، تو پھر خدا آپ کو دوسروں کی نگاہ میں بڑا کرے گا۔

رسول اللہؐ کی ان دعاؤں کو ضرور دیکھا کریں، مطالعہ کیا کریں۔ یہ معانی خیال اور انکشاف کی ایک بہت بڑی دنیا ہے۔ یہ دنیا آپ کا نصیب، میراث اور آپ کے لیے عطا و بخشش ہے۔ اس سے ضرور آپ فائدہ اٹھایا کریں۔

میاں بیوی اور والدین

آپ کے اپنے انتخاب کے مطابق جب آپ کو حوالے کر دیا جاتا ہے، تو میں ذہنی اور سماجی طور پر میاں بیوی کو ایک پارٹی سمجھتا ہوں۔ اللہ نے بھی اسے ایک ہی پارٹی کہا ہے ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (پ ۲، س البقرہ،

Marfat.com

آیت ۱۸۲) اگر آپ اس آیت کے لغوی پہلو پر غور کریں، تو خدا کہتا ہے کہ میاں بیوی کی دو رائے نہیں ہونی چاہئیں۔ ایک رائے ہونی چاہیے کیونکہ ایک لباس ہے۔ ایک اندازِ فکر ہے۔ ایک گھر اور ایک سوچ ہے۔ میں اکثر لوگوں کو کہتا ہوں کہ تم اپنے ماں باپ کے رہے، نہ تم اپنی ماں باپ کی رہیں۔ اب ایک پالیسی بنائیں، جس سے دونوں کے ماں باپ خوش رہیں۔ لیکن آپ ہمیشہ مسائل کھڑے کر لیتے ہیں۔ جب ایک گھر میں ایک پارٹی ہوتے ہوئے دوسری پارٹیوں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ بیوی اگر خاوند کے گھر میں بھی اپنی وابستگیوں کی ترجیح اپنے والدین کے خاندان کو رکھے گی اور خاوند اگر اپنی بیوی کے مقابلے میں دیگر ترجیحات کو اختیار کرے گا، تو وہ خاندان ہمیشہ برباد ہوگا۔ وہ گھر ٹوٹا رہے گا۔

اس کے برعکس یہ چاہیے کہ میاں بیوی اتنے قریب اور اتنے مخلصانہ ہو کر ایک دوسرے کے لیے سوچیں۔ ایک دوسرے کو بتائیں کہ دیکھو بھئی! تمہاری ماں میں یہ ہے اور میری ماں میں یہ ہے۔ بیوی کو بتانا چاہیے کہ اماں بڑی ضدی ہیں۔ آپ ازراہِ کرم ان کی تھوڑی سی عزت زیادہ کرو۔ خاوند کو اپنی بیوی کو بتانا چاہیے کہ دیکھو، مجھے تم سے تو کوئی گلہ نہیں۔ مگر پالیسی یہ رکھتے ہیں کہ بی بی اماں تھوڑی سڑیل سی ہیں اور تھوڑی سی چبھتی ہوئی بات کرنے والی ہیں۔ اگر دو چار طنز کر جائیں، تو چپ کر جانا۔ اگر وہ اس طرح ایک دوسرے سے انہام و تفہیم قائم کر لیں، تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ قرآن حکیم نے ان پارٹیوں کو گنا ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایک ہی پارٹی کو گنتا ہے ھن لباس لکم وانتم لباس لھن (پ ۲، س البقرہ، آیت ۱۸۲) کہ بیویاں تمہارے لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو اور اس لباس میں ماں باپ تو گھس ہی نہیں سکتے۔

نکاح وطلاق، سوشل کنٹریکٹ

طلاق اور شادی کو قرآن ایک سوشل کنٹریکٹ کی حیثیت دیتا ہے۔ یہ سوشل کنٹریکٹ ساری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ فرض کریں، آپ نکاح پڑھتے ہیں۔ باہر سے ایک ایسا جوڑا آ جاتا ہے، جو کافر ہے، ہندو ہے اور وہ آپس میں شادی شدہ ہیں، تو مذہب انہیں بھی شادی شدہ مانے گا۔ یہ نہیں ہے کہ ان کا اگر خدا کے نام پر نکاح نہیں ہوا تو ان کو غیر شادی شدہ کہے گا۔ کیونکہ کسی بھی سوسائٹی، معاشرے اور مذہب میں سوشل کنٹریکٹ ہیں۔ اس کی شرائط متعین ہیں۔ ان کی شرائط کا ان کے مذہب کے مطابق احترام کرنا پڑتا ہے۔ آج کل کے لوگ بڑی مشکل سے کرتے ہیں۔

طلاق کس حالت میں ہونی یا نہیں ہونی چاہیے، یہ ہر کیس میں مختلف ہے۔ زیادہ تر فقہا یہ کہتے ہیں کہ مشرک اور بدزبان عورت کو طلاق ہو سکتی ہے۔ جو عورت کا فحش گنا گیا ہے، اس میں دو چیزیں آتی ہیں۔ سخت پسند فقہا، جیسے امام احمد بن حنبل کے بقول، جو اپنے خاوند کو گالی دے، اس پر طلاق کا حق واجب ہو جاتا ہے۔ گالیاں فحش میں آتی ہیں اور فحش، زنا اور خاوند کو گالی دینا یہ ہم مرتبہ جرم سمجھے جاتے ہیں۔

عائلی زندگی کا حسن اور توازن

کراچی کی ایک ذہین عورت نے مجھ سے پوچھا کہ خدا کے نزدیک کون بہتر ہے، کون بدتر ہے؟ عورتیں بہتر ہیں یا مرد بہتر ہیں؟ میں نے کہا، مجھے تو نہیں پتہ کہ کون بہتر ہے۔ مگر ایک بات کا مجھے پتہ ہے کہ اگر مرد وہ کرے، جو اللہ نے

Marfat.com

اسے عورت کے بارے میں حکم دیا ہے اور عورت وہ کرے، یعنی اللہ کے احکام بجالائے جو مرد کے بارے میں اسے اللہ نے حکم دیئے تو کسی گھر میں کوئی فساد نہیں ہوگا۔ یہ سارے جھگڑے اور فساد اس انحراف کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ جتنے ہم خدا کے احکام سے دور ہوتے ہیں، اتنے بڑے جھگڑے ہمارے گھروں میں ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے عائلی زندگی میں بہت سارے احکام دیئے ہیں اور رسول اللہ کی اپنی زندگی میں بھی آئے ہیں۔ حضورؐ کی بیویاں بھی کچھ ایسی تھیں۔ دراصل وہ طریق یہ تھا کہ شادیاں بھی ہوگئیں۔ حضورؐ کے نکاح میں خواتین بھی آئیں۔ فوری طور پر ان کی داخلی حد کی خصوصیات تھیں، وہ نہیں گئیں۔ یہ زیادہ تر حضرت حفصہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے درمیان تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی چونکہ عمر تھوڑی تھی۔ اس لیے مقدار حسد کی کچھ زیادہ تھی۔ یہاں ان کی تقصیر شان نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان کی سچائی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اپنی کسی کیفیت کو چھپاتی نہیں ہیں۔

وہ آپ کو بتاتی ہیں کہ میں کوئی غیر معمولی نہیں ہوں۔ کوئی آسمان سے اتری ہوئی نہیں ہوں۔ تمہیں عورتوں میں سے ایک عورت ہوں۔ میں نے بھی رسولؐ سے سیکھا ہے، آپ بھی سیکھ سکتے ہیں۔ حسد ایک عمومی کیفیت ہے، جو ہر سینہ انسان میں تھوڑی بہت ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ آدھی رات کو اٹھ کر چلے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ حضورؐ میری باری چھوڑ کر کسی دوسری بیوی کے پاس تو نہیں چلے؟ میں بھی پیچھے پیچھے چل پڑی۔ حضورؐ بڑا لمبا سفر کرتے ہوئے قبرستان میں پہنچے۔ میں بھی وہاں پہنچ گئی۔ حضورؐ نے مجھے دیکھ لیا۔ آگے حدیث بارش کے معنوں میں چلی جاتی ہے۔

حضورؐ کی عائلی زندگی اتنی خوبصورت اور شاندار ہے۔ کاش اس کا عشر عشیر ہی ہم مسلمانوں کے گھرانوں میں نصیب ہو جائے۔ جھگڑے تو بہت دور کی بات ہے، ایسا اعتماد اور خوبصورتی نہ مشرق میں ہے، نہ مغرب میں۔ یہ صرف ایک مسلمان گھرانے میں ہو سکتی ہے۔

عورتوں اور مردوں کا کردار

2 یا 3 فیصد وہ خواتین، جو یورپ میں آباد ہیں، وہ تقریباً 2 کروڑ کے لگ بھگ ہوں گی۔ ہم ان کی انفرادیت یا ان کے برسر روزگار آنے کی بنا پر مجموعی طور پر ساڑھے تین ارب عورتوں کے کردار کا تعین نہیں کر سکتے۔ سوائے عام عورتوں میں سے بہت تھوڑی تعداد کے۔ اب بھی تمام دنیا میں عورتیں بچوں کے لیے گھروں میں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے اپنے اردگرد کی جگہوں میں کام کرتی ہیں اور مرد ہی کمانے والے اور ان کی نگہداشت کرنے والے ہیں۔ شاید آدم و حوا کے زمانے سے عورتوں اور مردوں میں ایک معاہدہ چلا آ رہا ہے کہ بہر حال بچوں کو پالنا اور پرورش دینے کے لیے ایک جگہ استحکام اور یقین ضروری ہے اور اسی معاہدے پر آج کل کام ہو رہا ہے۔ اگر دو چار دس عورتیں یا ایک دو کروڑ عورتیں ساڑھے تین ارب میں سے مساوات کا تقاضا کریں یا اپنے آپ کو برسر اقتدار اور برسر اختیار گنیں، تو اس سے عمومیت تبدیل نہیں ہوتی۔ افریقہ، ایشیا اور دوسری جگہوں پر اس سے قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ مرد کے غلبے کا مطلب عورتوں کو محکوم اور ہاتھ کی میل سمجھا جائے۔

ہمارے ہاں مرد اور عورت کی تقسیم اس طرح نہیں ہوتی، جس طرح آپ لوگ گنتے ہیں۔ آپ خارجی جسمانی

Marfat.com

اثرات پر مرد اور عورت کو گنتے ہیں۔ میرے پاس ایک جوڑا آ گیا ہے، تو میں اس کی اندرونی فعالیت پر مرد اور عورت کا انحصار کرتا ہوں۔ میں سینکڑوں ہزاروں عورتوں کو دیکھ چکا ہوں، جو اپنے مردوں سے کہیں زیادہ محفوظ اور طاقتور ہیں اور وہ تمام شرائط منواتی ہیں۔ مرد بیچارے ان کے لیے لے پالک اور پالتو سے لگتے ہیں۔ کئی مرتبہ خواتین سے میں نے درخواست کی کہ وہ اپنے مردوں سے اتنا برا سلوک نہ کیا کریں۔

اسی طرح بعض مرد ہیں، جن کے اندر نسوانیت کا غلبہ ہے اور بعض عورتوں میں مردانیت غالب عنصر کے طور پر موجود ہے، جو ان کی جنسیت کی نوعیت کا تعین کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ داخلی اور خارجی اعتبار سے مختلف ہیں۔ یہ تعلیم کا بحران ہے۔ جونہی تعلیم کم ہوتی ہے، چیزیں محدود اور جذبات تنگ ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اب آپ دیوبندی اور بریلوی ہیں۔ یہ اور وہ ہیں۔ جب تعلیم بڑھے گی، تو آپ مسلمان بن جائیں گے۔ جونہی آپ کا معیار عقل و نقد نظر بڑھے گا، تو آپ کو جو خوشی مسلمان کہلوانے سے ہوگی، وہ دیوبندی یا بریلوی کہلوانے سے نہیں ہوگی۔ میں کتنا دیوانہ ہوں کہ پڑھ لکھ کر ایک کائناتی اور بہت بڑے سکول مکہ اور مدینہ کو چھوڑ کر اپنے آپ کو انڈیا کے چھوٹے سے اسکول میں بند کر دوں۔ بریلی یا دیوبند کے اسکول تک محدود کر لوں۔ یہ صرف تعلیمی بحران ہے۔ جب شناخت اور علم بڑھتا ہے۔ فراخی خیال و مزاج آتی ہے تو پھر شاید یہ نہیں رہتا۔

تعددِ ازواج کا مسئلہ

جب اللہ کریم دیکھتے ہیں کہ یہ نظام میرا نہیں ہے۔ کسی مرد یا عورت کا نہیں ہے۔ اللہ نظام بناتا ہے اور دیتا ہے۔ کچھ باتیں اللہ کے نظام میں میرے خلاف چلی جائیں گی۔ اگر میں غصیلا، واہیات اور بدتمیز ہوں۔ اپنی بیوی کو روزانہ دو چار سناتا جاتا ہوں۔ اس پر ہاتھ اٹھاتا ہوں یا اس سے جھگڑا کرتا ہوں۔ مگر ادھر خدا مجھے منع کرتا ہے۔ وہ مجھے اس کی کبھی اجازت نہیں دیتا۔ وہ بدکلامی کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ وہ سختی کرتا ہے کہ تم اپنی بیویوں سے محبت اور انس کا سلوک روا رکھو۔

پھر رسولؐ کی زندگی دیکھتے ہیں۔ مرد اصولاً وہ قانون چھپا جائے گا، جو اس کے خلاف جاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو وہ تمام قانون پڑھائے گا، جو اللہ نے اس کے حق میں لکھے ہیں۔ وہ عورت کو دکھائے گا کہ دیکھو اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر درجہ دیا ہے اور تم مجھے بڑا مانتی ہی نہیں ہو۔ مگر وہ قانون، جو اللہ نے اس کو عورت کے بارے میں دیئے ہیں، وہ اسے کبھی نہیں سنائے گا۔

اب یہی عورتوں کا حال سن لیں کہ وہ اتنی قبضے کی خواہاں اور سخت موڈ کی ہیں کہ اگر ان سے کہو کہ آپ اللہ کو مانتی ہو کہ نہیں مانتی؟ تو وہ کہے گی کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا تم زیادہ اللہ کو مانتے ہو؟ مگر جہاں چار کا مسئلہ آئے گا، فوراً گڑبڑ ہو جائے گا۔ سارا مزاج الٹ جائے گا۔ پھر اتنے عذر آئیں گے، اتنے حادثے پیش آئیں گے۔ اتنے ڈپریشن اور جھگڑے ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ عورت مرد کو تین ماہ سے زیادہ دستیاب نہیں ہوتی۔ جیسے مرضی ہے، حساب کر لیں۔ اللہ نے صحیح اندازہ رکھا ہوا ہے۔ یہ کتنی بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ایک مسلمان عورت یہ چاہے گی کہ اس کا خاوند ہر قسم کے گناہ میں ملوث رہے۔ جھوٹ بولے۔ بدکاری کرے، مگر دوسری شادی نہ کرے۔ یہ نہیں اجازت ہو سکتی۔ اگر آپ غور کریں، تو یہ سخت

Marfat.com

ترین تسلط اور ملکیت کے موڈ ہیں اور یہ انڈیا میں ستی ورتا اور پتی ورتا کی وجہ سے آئے ہیں۔ یہ اسلام میں متعارف نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر اگر آدمی افورڈ کر سکے۔ صرف رسول اللہ کا اسوہ حسنہ ہی نہیں، اگر اصحاب رسول کے طرز عمل کو دیکھیں، تو پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے شادیوں کی حد بندی کی ہے۔ ان کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ حضرت سلیمان کی ننانوے بیویاں تھیں۔ پرانے زمانے میں جو معاشرہ تھا، اس میں کسی پدرانہ سوسائٹی میں ایک لیڈر یا بادشاہ یا کسی گھرانے کے بڑے کی اہمیت جو تھی، اس کی بیویوں سے نکلتی تھی۔ جیسے باقی چیزوں سے نکلتی ہے، اسی طرح جس آدمی کی جتنی زیادہ بیویاں ہوتی ہیں، وہ اتنا ہی زیادہ معزز خیال کیا جاتا ہے۔ یہ دستور زمانہ تھا۔ کیوں بھلا؟

اس کے پس منظر میں بڑی عجیب سی بات ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کوئی نیا بندہ، کوئی نوجوان اور غیر تجربہ کار دو یا چار بیویوں میں انصاف کر ہی نہیں سکتا۔ جس قدر کوئی نوجوان، ناانصافی، زیادتی اور بے اعتدالی کا بندوبست کر سکتا تھا، اسی قدر وہ بہت سی عورتوں کا بھی انتظام کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس آدمی کی عزت کا نشان ہر قبیلے میں اس کی زیادہ بیویوں کا ہونا سمجھا جاتا تھا۔ اس کی عزت سمجھی جاتی تھی۔ پھر عورتوں میں بھی ان دنوں یہی خیال تھا۔ کیوں کہ لڑائیاں زیادہ تر مردوں کی ہوتی تھیں، عورتوں کی تو نہیں ہوتی تھیں۔ عموماً ہر زمانے میں عورتیں بچ جاتی تھیں اور مرد مقتول ہو جاتے تھے۔ اگر مرد اس زمانے میں اس کا خیال نہ کرتے، تو عصمت فروشی معاشرے کا مروج فیشن ہوتی۔

مثال دوسری جنگ عظیم کے بعد کی ہے۔ آپ جتنی بدتمیزی، بے حیائی اور یورپ میں جو جنسی آزادی دیکھ رہے ہیں، یہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک کروڑ عورت کے بیوہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ ان کے پاس مرد نہیں تھے۔ رومن کیتھولک مذہب دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک جرمن عورت نے از خود کہا کہ آپ کے پیغمبر ایک دانا شخص تھے۔ اگر ہمیں اجازت ہوتی تو جرمنی میں ہر عورت دوسری یا تیسری بیوی بننے کے لیے تیار تھی۔ مجھے رومن کیتھولک ازم نے روک رکھا ہے۔ وہ اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس لیے بجائے مذہبی پیٹرن میں ذمہ داری سے کسی کے شریک حال ہونے کے وہ تمام عورتیں کرپشن کو نکل گئیں۔ جنسی آزادی عام ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ اس سے آگے لوگ بڑھ گئے۔ اس وقت عورت ان کے لیے مرد کی لذتِ وجود کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔ جب یہ لذت انتہا کو پہنچے گی اور کثرت سے دستیاب ہوگی، تو لوگ ان چیزوں کو بڑھ جائیں گے، جیسے اب یورپ میں ہوتا ہے۔

میں آخری دن جب امریکہ سے چل رہا تھا، تو ہم جنس پرستوں کا کم از کم ایک لاکھ کا جلوس نکلا ہوا تھا، جو وہ حق ملکیت مانگ رہے تھے اور حکومت نے انہیں دے دیا۔ عورت کو اس حوالے سے سوچنا چاہیے۔ میں آپ کو تنبیہ کے طور پر بتا رہا ہوں کہ اس وقت بھی پاکستان میں ایک کروڑ عورت غیر شادی شدہ ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اس سے وہ مردوں کو نقصان پہنچا سکیں گی؟ اس سے وہ صرف عورتوں کو ہی نقصان پہنچے گا۔ یہ مسئلہ بقا ہے۔ اسی کی وجہ سے معاشرے میں توڑ پھوڑ ہوتی ہے۔ اگر آپ صحیح مسلمان نہیں ہیں اور آپ خود کے ساتھ اپنے احساس ذمہ داری کو شیئر نہیں کر رہیں، تاکہ معاشرے کو ڈیل کیا جا سکے، تو دیکھ لیجیے کہ دس یا پندرہ سال کے بعد جو سیلاب ہمارے مطمئن اور سادہ گھروں پر چڑھ کے آرہا ہے، جو اب بھی آرہا ہے، مگر دس سال کے بعد وہ اتنا کھلا ہوگا کہ کوئی بھی شادی شدہ عورت اپنے گھر میں محفوظ نہیں ہوگی۔ آپ کو

Marfat.com

اس بارے میں محتاط ہونا ہوگا۔ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے۔

اس کا فیصلہ کرنا کسی فقیہ کا کام ہے کہ غیر مسلم عورت خدائے واحد کی پرستش کرتی ہے یا مشرک کی۔ آج کل کے عقائد میں تو رومن کیتھولک بھی مشرک ہیں، جن کا عقیدہ روح مقدس، بیٹا اور باپ ہے۔ ان پر شرک کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لیے رومن کیتھولک کے ساتھ بھی شادی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ قرآن حکیم میں اللہ نے وضاحت کے ساتھ عقیدہ کی ڈگری بتائی ہے۔ ولا تنکحوا المشرکت حتی یومن کہ مشرکات کے ساتھ نکاح نہ کرو، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ولامۃ مومنۃ خیر من مشرکۃ ولو اعجبتکم (پ ۲، س البقرہ، آیت ۲۲۱) ایک غلام مسلمان عورت ایک آزاد مشرکہ سے بہتر ہے، اگر تم غور کرو۔ یہ صرف مردوں کے لیے ہی نہیں ہے، بلکہ عورتوں کو بھی براہ راست حکم دیا کہ ولا تنکحو المشرکین حتی یؤمنوا (پ ۲، س البقرہ، آیت ۲۲۱) مت شادی کرو، مشرک مردوں کے ساتھ، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ جب میں باہر گیا، تو مجھ سے دس مسلمان عورتوں نے پوچھا کہ ہمارے تعلقات کئی عیسائیوں کے ساتھ ہیں۔ ہم ان سے شادی کریں یا نہ کریں؟ اور یہ میرے لیے بہت خوفناک بات تھی کہ کس طرح اپنے مذہب سے عدم آگہی لوگوں کو مذہب سے دور لے جاتی ہے۔ خدا مسلمان عورتوں کو سختی سے کہتا ہے کہ ولا تنکحوا المشرکین حتی یؤمنوا ولعبد مؤمن خیر من مشرکٍ ولو اعجبتکم ایک غلام مسلمان بھی ایک آزاد اور رئیس ترین مشرک سے بہتر ہے، اگر تم غور کرو ورنہ جہنم اور آگ ہے۔

حجاب اور بے حجابی

حجاب صرف شناخت کے لیے ہے۔ پہلی جنگوں میں عورتیں ساتھ جاتی تھیں۔ جنگ یرموک میں حضرت خالد بن ولید جب آٹھ تلواریں توڑ کے پیچھے پلٹے اور مسلمان لشکر دباؤ میں تھا، تو ابوسفیان کی بیوی ہندہ اسے ملیں۔ اس نے ہاتھ میں خیمے کی چوب اٹھائی ہوئی تھی۔ اس نے کہا، خالد! تو کیا جرنیل ہے کہ تیری فوج بھاگ رہی ہے؟ خالدؓ کو اس وقت غصہ تو بہت تھا۔ خون آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا، اے دشمن خدا اور رسول! پیچھے ہٹ۔ ان کو بعد میں ماروں گا، پہلے تیری گردن اڑاؤں گا۔ اس وقت بے حجاب چہرے دیکھے جاتے تھے۔ بے حجابی میں اور چہرہ دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔

مسئلہ یہ ہوا کہ بنوقریظہ سے گزرتی ہوئی ایک مسلمان عورت جب خرید و فروخت کے لیے ایک یہودی کے پاس گئی، تو اس نے اسے بے حجاب کر دیا۔ مسلمان عورت نے شور مچایا۔ پاس سے ایک مسلمان گزر رہا تھا۔ اس نے اس یہودی کو قتل کر دیا۔ گرتے گرتے اس یہودی نے اپنی قوم کو پکارا۔ اور ان سب نے مل کر مسلمان کو شہید کر دیا۔ مسئلہ حضورؐ کے سامنے پیش ہوا۔ حضورؐ جب آئے، تو یہودیوں نے ایک اعتراض کیا کہ ہمیں کیا پتہ تھا کہ یہ مسلمان عورت ہے۔

اسی طرح جب حضور گرامیؐ کے دور میں ٹائلٹ وغیرہ تو نہیں ہوتے تھے۔ خواتین صحرا میں یا دور دراز جاتی تھیں۔ امہات المومنینؓ بھی جاتی تھیں۔ ان میں حضرت سودہؓ کا قد ذرا لمبا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ خاص کر امہات المومنین کا جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے پکارا۔ کہا کہ سودہؓ میں نے آپ کو پہچان لیا۔ حضرت ام المومنین سودہؓ نے آ کر

آنحضورؐ سے شکایت کی کہ مجھے اس طرح عمرؓ نے کہا ہے۔ حضورؐ خاموش رہے۔ اس پر یہ پردے کی آیات اتریں۔ حجاب کی آیات پھر اس کے بعد اتریں۔

حجاب میں اتنا ہی لازم ہے، جتنا کہ اللہ نے کہا ہے۔ اس میں بھی عارضی اور وقت کے مطابق رد و بدل ہو سکتا ہے۔ مگر یہ اتنی بڑی شناخت ہے کہ میں جب ورجینیا میں گیا تو مجھ سے ایک لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا کہ یہاں میری سوسائٹی بہت اچھی ہے۔ بڑے نیک اور نائس لوگ ہیں۔ میں نے اگر سر نہ بھی ڈھانپا ہوا ہو، تو کیا اس میں مسئلہ پیش آ سکتا ہے؟ میں نے کہا، بی بی! تو نے پوچھنا ہی نہیں تھا۔ تمہاری بے خبری تمہارے لیے باعثِ رحمت ہوتی۔ مگر اگر پوچھ لیا ہے، تو میں آپ کو بتاؤں۔ اگر دور سے چلتا ہوا آ رہا ہوں اور تم بھی باقی عورتوں میں موجود ہو، تو میں تمہیں کبھی مسلمان عورت نہیں سمجھوں گا۔ آپ کو دوسری عورتوں کی طرح لوں گا۔ نائس، معقول اور ہر حوالے سے قابلِ احترام عورت۔ مگر مسلمان عورت نہیں سمجھوں گا۔ ہاں اگر تم نے دوپٹہ اوڑھا ہوا ہو، سکارف پہنا ہوا ہو۔ تمہارا گریبان ڈھانپا ہوا ہو، تو میں دور سے، چاہے تمہاری شکل چھپی یا نہ چھپی ہوئی ہو، تمہیں سمجھوں گا کہ یہ مسلمان عورت ہے۔

پالش والے ناخنوں کا وضو

اگر ناخنوں پر رنگ لگانا منع ہے، تو بالوں پر مہندی بھی منع ہوتی اور پھر آپ مہندی پہلے اتارتے، پھر مسح کرتے۔ یہ وہ باتیں ہیں، جو مسلمان میں اپنے مذہب کا تنافر تو پیدا کر سکتی ہیں، اسے اس کے قریب نہیں کر سکتیں۔ آپ غور کریں کہ جن پاؤں میں آپ نے وضو کے لیے جوتے پہنے ہوتے ہیں، اللہ حضر میں اڑتالیس گھنٹے اور سفر میں تین دن ان پر مسح کرواتا ہے۔ اس کو ناخنوں سے کیا دلچسپی ہے۔ اتنی آسانیاں پروردگارِ عالم نے آپ کو دے رکھی ہیں کہ اگر آپ کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے، تو اللہ کیا کہے گا کہ پٹی کھول کر، زخم صاف کر کے دوبارہ اس پر پٹی کرو؟ خدا کے بارے میں یہ بدگمانیاں پیدا کرنا کسی بہت چھوٹے سر والے کا کام ہو سکتا ہے۔ اللہ میاں یہ نہیں کہے گا کہ ناخن رنگے ہیں، تو وضو نہ کرو۔ آپ کہیں بھی قرآن و حدیث میں ناخنوں کا وضو بتا دیں؟ ہاتھوں کا تو لکھا ہوا ہے۔ مگر ناخن کا وضو کہاں لکھا ہوا ہے کہ جی آپ کے ناخن آپ کے ہاتھ کا حصہ نہیں ہیں۔ یہ سب کو پتہ ہے کہ یہ گوشت ہے اور یہ سخت ہے۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ مجھے بتائیں کہ کہاں قرآن و حدیث میں لکھا ہوا ہے کہ ہاتھوں کے ساتھ ناخنوں کا وضو بڑا ضروری ہے۔

اللہ بڑا حقیقت پسند ہے کہ جب ایڑی کی بات ہوئی اور کسی شخص نے وضو کرتے ہوئے ایڑھی کو چھوڑ دیا تو رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ ایڑی میں آگ ہے۔ اگر ایڑی پاؤں کی نہ دھوؤ گے، تو اس میں آگ ہے۔ ناخنوں کا تو ذکر ہی کوئی نہیں اور یہ اچھی طرح یاد رکھیں کہ جس چیز کا ذکر نہ ہو، اس کا ذکر لایا نہ کریں۔ مصیبت پڑ جاتی ہے۔

جنت میں بیوی مثل حور

میں نے بدترین جگہ پر تین سال گزارے۔ گرمی اور حبس بہت تھا۔ مچھر اور مکھیوں کی بہتات تھی۔ رات کو آنکھ لگے نہ صبح آنکھ لگے۔ بیٹھا ہوا ایک دن سوچ رہا تھا۔ میں نے اللہ میاں سے کوئی گلہ دلہ نہیں کیا۔ بس ایک بات کہی کہ اللہ

میاں! یہ دنیا آرزو اور خواہشات کی جگہ ہے۔ اس دنیا میں ہر وقت کوئی نہ کوئی طلب رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص بدترین حالات میں، جیسے وارد ہو رہے ہیں، تجھ سے راضی ہو اور یہ کہے کہ چلو تو نے اس حال میں جیسے بھی مجھے رکھا ہے، ٹھیک رکھا ہے۔ اسے جنت کا فریب تو کیسے دے سکتا ہے؟ میں نے اسے یہ کہا کہ اگر اس دنیا میں جہاں اتنے حالات تلخ ہیں اور انسان اتنا الجھا ہوا اور بے بسی کے عالم میں بھی تجھے ہی اپری شی ایٹ کرے اور تجھے ہی داد دے کہ تو نے جس حال میں رکھا ہے، ٹھیک رکھا ہے، تو تو جنت میں اسے کیا خوشی دے سکتا ہے؟

جنت تو ایک ایسی جگہ ہے، جہاں آرزو نہیں ہوگی، خیال نہیں ہوگا۔ اگر جنت میں خوشی بے حد نہیں ہوگی یا آرزو نہیں ہوگی یا غم نہیں ہوگا یا حسن نہیں ہوگا، تو بندے کو اور کسی چیز کی کتنی آرزو ہوگی؟ دوسری بات یہ ہے کہ ایک ہی عورت کے بھی تو ستر چہرے ہو سکتے ہیں۔ یہ ستر بڑی اہم چیز ہے۔ میں آپ کو بڑی عجیب وغریب بات بتانے لگا ہوں۔ جیسے ایک عورت ایک مرد کا چہرہ دیکھتی ہے یا مرد ایک عورت کا چہرہ دیکھتا ہے، تو وہ اپنے اپنے خیال میں خوبصورتی کی بلندترین ٹیکنیکل قسمیں چننا شروع کر دیں، تو میرے خیال میں روایت اس پر جاتی ہے کہ پوری دنیا میں صرف ستر اقسام کے چہرے کی خوبصورتی نکلتی ہے۔

اب آپ خود غور کریں۔ جو اللہ ستر حوریں دے سکتا ہے، کیا وہ اسی اچھی بیوی کی ستر شکلیں نہیں بنا سکتا؟ ایک دن اس نے آرزو کی، وہ جو میں نے مادھوری ڈکشت دیکھی تھی، وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ اگلے دن بیوی مادھوری ڈکشت بن کے آ گئی۔ اس سے اگلے دن وہ آرزو کر رہا ہے یا اللہ! کلاڈیا کارڈینیل بڑی پسند آ گئی تھی، تو وہ کلاڈیا کارڈینیل بن گئی۔ تو یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ستر حوریں ہوں گی ستر شکلیں اسی بیوی کی ہوں گی؟

باقی رہی بیوی کی بات، تو میں آپ کو یہ نئی بات بتا رہا ہوں کہ بیوی کے پاس چوائس ہوگی کہ یا مرد بن جائے یا اچھی بیوی کی طرح رہے۔ اس کے پاس بھی چوائس ہوگی۔ یہ جو جتنا بھی نظام ہے، وہ تو اس دنیا تک محدود ہے۔ کیا پتہ جو جنسی یا جسمانی تسکین یا انسان کا جو طریق محبت یہاں ہے، یہ لازماً جنت میں نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی بناوٹ ہوگی، کوئی اور بہتر طریق ہوگا۔ جو میاں بیوی یہاں ایک پروسیجر سے گزرتے ہیں، ہو سکتا ہے جنت میں ایک دوسرے کو دیکھنے سے ان کی تسکین ہو جائے مگر جنت کی سب سے خوشی اور لذت خدا کو دیکھنا ہے۔ جمعہ کے دن پروردگار عالم اپنے چاہنے والوں کو اپنی صورت زیبا دکھائیں گے۔

مستقبل قرآن وحدیث کی روشنی میں

یہ موضوع کسی قسم کی پیشین گوئی پر مشتمل نہیں ہے، نہ کسی طریقے سے کسی مسلم یا غیر مسلم ماہر فلکیات یا کسی سائیکک کے وجود سے مشابہ ہے۔ اس سے یہ تعلق نہیں رکھتا، بلکہ اس عنوان سے جو مطالعہ اور تاریخ عالم کا میرے پیش نظر رہا، جس طرح انسانوں اور ان کی تہذیبوں نے عروج پایا، جس طرح انسانوں نے اپنے آپ کو معاشروں میں ڈھالا اور ڈھالنے کے بعد بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں۔ پھر ان حکومتوں کو زوال ہوا۔ اس طرح انسانی تاریخ ہمیں از خود ایک ایسا جائزہ عطا کرتی ہے کہ بڑے سے بڑے جاہ وجلال کے مالک دارا وسکندر تہِ زمین میں نہ صرف ہمیں نشانِ عبرت کی طرح ملتے ہیں، بلکہ ان کی تہذیبیں آج ہمارے لیے ایک کلاسیکل نمونہ بن جاتی ہیں۔ اس سے ہم بڑی آسانی سے اپنے نتائج مرتب کر لیتے ہیں۔

تاریخ دنیا میں کوئی بڑا یا چھوٹا نہیں۔ جب سے حیاتِ انسانی نے ترقی شروع کی، حالات وواقعات اکیلے نہیں ہوتے۔ قرآن حکیم میں پروردگار عالم نے فرمایا، ومامن دآبۃٍ فی الارض ولا طٰٓئِرٍ یطیر بجناحیہ الاامم امثالکم (پ ۷، س الانعام، آیت ۳۸) کہ زمین پر ایسی کوئی حیات نہیں ہے، نہ فضاؤں میں ایسا کوئی پرندہ اڑتا ہے، جو تمہاری طرح امتیں نہیں ہیں۔ ہمارے خیالات اور واقعات بھی امتوں کی طرح ہیں۔ کوئی خیال خیال سے اور کوئی واقعہ اپنی میراث سے جدا نہیں ہوتا۔ خیال وواقعات بھی اسی طرح خاندان، نسل اور انداز رکھتے ہیں۔ ان کے بھی ماں باپ ہیں۔ اولادیں اور نسلیں ہیں۔

تھوڑی سی توجہ اور تاریخ کے طویل مطالعہ سے آج کا کوئی بھی واقعہ حیران کن نظر نہیں آئے گا۔ کیونکہ اسی کی نسل کے کئی بزرگ واقعے بہت پہلے بھی ہو چکے ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہیں کہ ہم پورے کے پورے خیالات کے سیٹ کو خیر کا نام دیتے ہیں اور دوسرے خیالات کے سیٹ کو شر کا نام دیتے ہیں۔ ہم نے ایک عام سی بنیادی تقسیم یہ کی ہے کہ بجائے تفصیلات میں جانے کے عموماً اسے مقابلہ خیر وشر قرار دیتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ خیر کی قوتیں، واقعات اور معاملات ایسے تھے، جنہوں نے دنیا کو آگے بڑھاتے ہوئے ہمیں اس منزلِ فکر اور تمدن تک پہنچایا ہے اور شر وہ تمام واقعات ہیں، جو انسانوں

Marfat.com

کے اس تمدن اور تہذیب کو ناقص کرتے ہیں اور جو بالآخر انسانوں کی ترقی اور اس کی خدا تک رسائی کے لیے خطرے کا سبب بنتے ہیں۔

انسان کی سب سے پہلی مہذب سوسائٹی Agena سوسائٹی تھی۔ Greek سوسائٹی تھی۔ Create اور Athens میں یہ دونوں سوسائٹیاں پلیں اور انہوں نے عروج پایا۔ مگر ان کی عمر زیادہ نہیں رہی۔ اس کے بعد بھی آنے والی سوسائٹیوں میں Fonations, Samarians کلدانین، Medians، اخامنشی اور ساسانی ہیں۔ ان تمام خاندانوں کی زیادہ سے زیادہ مدت حیات اسی سے لے کر تین سو برس تک بنتی ہے۔ بڑی مشکل سے کوئی سوسائٹی اس عرصے سے آگے چلتی دکھائی دی ہے۔

مگر جب سوسائٹیوں کو آپ بغور دیکھیں، تو ان کی تباہی کی دو بنیادی وجوہ تھیں۔ ایک داخلی اور دوسری خارجی۔ داخلی وجوہ سے مراد یہ ہے کہ جب بھی کوئی معاشرہ اپنے اندر استحکام اور بنیادی ذریعہ زندگی نہیں رکھتا، تو تمام تر جو ہماری پرانی سوسائٹیاں گزری ہیں، وہ حیرت کی حد تک زیادہ تر آگ سے تباہ ہوئی ہیں یا پھر بیرونی جارحیت کے گھاٹ اتری ہیں۔ بیرونی حملوں کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ کسی سوسائٹی کے اندر ان بلٹ سورسز نہیں تھے۔ تمام وہ انسانی سوسائٹیاں، جنہوں نے عظمت حاصل کرنا چاہی۔ خواہ وہ سکندر یونانی یا بخت نصر کے لوگ تھے، ان لوگوں نے اپنی سوسائٹیوں کو پھیلایا، تو ان کی وسعتیں، ان کے آگے بڑھتے ہوئے لشکر اور ان کے اخراجات حدود سے اتنے آگے نکل گئے کہ بالآخر ان کی پوری سلطنتوں پر دباؤ پڑا اور اسی سال یا کوئی سوسائٹی تین سو برس سے آگے نہیں بڑھی۔ دور حاضر میں کمیونسٹ تہذیب کا آپ کو یہی نقشہ نظر آتا ہے کہ وہ اپنے اندر قائم نہیں رہ سکے۔ انہوں نے اپنے اندر اپنے اِن بلٹ سورسز کو استعمال نہیں کیا۔ جب انہوں نے توسیع اختیار کی، تو وہ ۷۰ سال بھی اپنی زندگی کو قائم نہ رکھ سکے۔

اس میں ایک استثنیٰ مذہبی معاشروں کی آ گئی۔ مذہب کی سوسائٹیاں زیادہ پائیدار نکلیں۔ پہلی سوسائٹیوں میں اگرچہ فلسفہ تھا۔ جیسے پہلی یونانی سوسائٹی علم، فلسفہ اور فکر و دانش کی امام سمجھی جاتی تھی اور آج بھی ارسطو اور افلاطون کے نام عقل و دانش کی معرفت کے بغیر نہیں لیے جاتے۔ مگر جب مذہب آیا۔ اخلاقی قوانین کو برتری حاصل ہوئی اور کانسٹنٹین کے زمانے سے لے کر آگے تک ایک ایسی مضبوط عیسائی سوسائٹی تشکیل پائی کہ جس میں بادشاہ تو بدلتے رہے، مگر طویل عرصے تک ان کی حکومتیں زمانے پر قائم رہیں۔

آزادیوں کے بل پاس ہوتے ہوئے بیچ میں ایک بہت بڑی رومن سوسائٹی آئی، جو بعد میں عیسائی سوسائٹی ہو گئی۔ مگر میں آپ کو اس کے اخلاقی ابتلاء کا صرف ایک جملہ سنا دیتا ہوں۔ جب سب سے پہلے آزادیوں کے بل رومن سینٹ میں پیش کیے گئے، تو ان کے سب سے بڑے مفکر سسرو نے کہا کہ اے لوگو! میں تمہیں یہ خبر دیتا ہوں کہ تمہاری یہ عظیم رومن سوسائٹی پچاس برس میں تقسیم ہو جائے گی۔ وہ عجیب اس کی پیشین گوئی نکلی کہ پچاس برس میں رومن ایمپائر ایسٹر ایمپائر اور ویسٹرن ایمپائر میں تقسیم ہو گئی۔ ان کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ اوپر تلے روم کے سات بادشاہ ایسے تھے، جن کے ماں باپ ثابت نہیں تھے۔ یہ اخلاقی ابتلاعین اس وقت تھی، جب ایسٹرن ایمپائر اپنے عروج پر تھی۔ صحرائے عرب سے خوشبودار ہوا چلی۔ پیغمبرؐ نے اپنے علم حقانیت کو بلند کیا۔ خدا کی رحمت انسانوں کے حصے میں آئی اور ایک بہت بڑی مسلم

Marfat.com

سلطنت کا وجود قیام عمل میں آیا۔

مسلم سلطنت کی تمام ابتدائی جدوجہد اور تمام جنگیں دفاعی تھیں۔ کسی بھی مقام پر کوئی مسلمان جارح نہیں ہوا۔ بلکہ مدینے کے حصار توڑنے کے لیے مرتدین پر جب سیدنا صدیق اکبرؓ نے حملے شروع کئے اور اس کے بعد ہر موقع پر جب بھی جزیرہ نمائے عرب میں ان کو اپنی زندگی مسلسل خطرے میں نظر آئی، تو اس کے ساتھ ساتھ پھر دفاعی اقدامات آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ تبوک کی جنگ میں یہ دفاعی اقدامات رومن سرحدوں پر پہنچ گئے۔ مگر بحیثیت ایک اصول کے اس وقت کی دوسب سے بڑی قوتیں یعنی روما اور ایران اپنے سامنے ان عربوں کو کیسے برداشت کرسکتی تھیں، جن کے بارے میں مغیرہ بن شعبہ کو رستم ایران نے کہا کہ تم وہ لوگ ہو، جو سوسمار (گوہ) کھاتے تھے اور تم وہ لوگ ہو، جن کو دو وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ تم کو پیسے چاہئیں؟ دولت اور مال واسباب چاہیے، تو ہم سے لے لو اور ہمیں ہماری سلطنتوں کو تاراج کرنے کی ہمت نہ کرو۔ حضرت مغیرہؓ نے کہا، جیسے تم کہتے ہو، ہم ویسے ہی تھے۔ ہم ایسے ہی پست اور گئے گزرے تھے۔ مگر پھر اللہ نے ہم پر رحم فرمایا، ایک نبی مبعوث ہوئے۔ ہمیں خدا کا احترام آیا۔ انسان کی محبت، انصاف اور جرأت اخلاق آیا۔ پھر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم تم لوگوں کو اپنے اوپر حکومت نہیں کرنے دیں گے۔

مسلمان اور عیسائی معاشرے کی جنگ اتنی شدید تر ہوتی گئی کہ بالآخر یرموک اور اجنادین کے معرکوں کے بعد مسلمانوں نے عیسائی پوری سوسائٹی کو اپنے عرب علاقے سے نکال باہر کیا۔ چنانچہ ایسٹرن ایمپائر کے سارے عیسائی کبھی بھی ان زرخیز علاقوں کی یاد نہیں بھولے۔ یروشلم، انطاکیہ اور حمس کو فراموش نہ کرسکے۔ ان کو ہمیشہ یہ یاد ستاتی رہی کہ ہم دوبارہ واپس پلٹیں اور اپنے ان علاقوں پر قبضہ کریں۔ اس کے لیے چرچ، ان کے پیٹر دی راہب جس کو کہتے ہیں، تاریخ میں اس کا نام مشہور ہے، نے ایک مسلسل کروسیڈ کو جاری رکھا اور مسلمانوں سے ان کے علاقے واپس لینے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ ۱۰۹۹ء میں انہوں نے یروشلم کو واپس لے لیا۔

اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے پروردگار عالم نے مسلمانوں میں صلاح الدین ایوبی جیسا بندہ پیدا کیا۔ اور باوجود ابتلاء اور نفاق کے دور کے، مسلمانوں نے صلاح الدین کی قیادت میں یروشلم کو نہ صرف واپس لیا، بلکہ اس کے تمام علاقوں سے عیسائی خانقاہیت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ یہ ایک موروثی کمپلیکس کی طرح مغربی سوسائٹی میں اب تک موجود ہے۔ اسی طرح جس طرح یہود کو آج بھی یثرب کی یاد آتی ہے، اس کے ضمیر میں یثرب سے نکلنا ابھی تک گم نہیں ہوا۔ بنو قریظہ کو جب خیبر سے نکالا گیا، تو وہ اس حسرت اور اس دعوے کے ساتھ گئے کہ ہم ایک دن ضرور ارض موعود کو پلٹیں گے۔

وہ اس کو ارض موعود کیوں کہتے ہیں؟ اگر آپ قرآن حکیم پڑھیں، تو آپ کو احساس ہوگا کہ خداوند کریم نے ایک بہت خوبصورت آیت ہمیں عطا فرمائی۔ اس میں یہ تھا کہ اے پیغمبر! ابھی تو آیا بھی نہ تھا اور یہ تیرے وسیلے سے ہم سے دعائیں مانگا کرتے تھے اور ہم ان کی دعائیں قبول کیا کرتے تھے۔ جب تو آ گیا ہے، تو یہ تیرا انکار کررہے ہیں۔ اس لیے کہ یہود بنیادی طور پر اپنے آپ کو خدا کی عظیم ترین مخلوق گنتے ہوئے یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ خدا ان مہذب فلسطینیوں کو چھوڑ کر ان اجڈ اور گنوار عربوں پر مہربان ہوگا۔ ان کے تعصبات اتنے گہرے تھے کہ وہ عرب کا کوئی نبی کسی قیمت پر قبول نہیں کرسکتے تھے۔ جب وہ نکالے گئے، تو یہ بحران آج بھی ہر یہودی کے دل ودماغ میں زندہ ہے۔ وہ اس وقت کی آرزو

Marfat.com

رکھتے ہیں، جب وہ مسلمانوں پر موقع پا کر قابو پائیں گے اور دوبارہ یثرب کو روندنے کے لیے گھر بنائیں گے۔

ایک بڑی عجیب وغریب حدیث ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بیت المقدس کی آبادی یثرب کی تباہی ہے اور یثرب کی تباہی جنگ عظیم ہے۔ جنگ عظیم کے بعد دجال کا خروج ہے۔ ہر لحاظ سے یہ وہ واقعات کی ترتیب ہے، جس کے بارے میں رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا، جب ہم دور حاضر کی سوسائٹیز کو دیکھتے ہیں، تو ایک عجیب سا اتفاق ہوتا ہے کہ اس وقت موجودہ جتنی بھی مغرور تہذیبیں ہیں، کسی اخلاقی اصول پر ان کے تکبر کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ تمام تر خارجی کائنات اور خارجی ایجادات پر اپنے تفاخر کی بنیاد رکھتی ہیں۔ جب سے جمہوری اصول آئے ہیں، تو ڈیموکریسی ایک ایسا Immoral سسٹم ہے، جس میں اخلاق ہے نہ بداخلاقی ہے بلکہ عوام کی اکثریت جسے چاہے، ان کو اخلاق اور بداخلاق بنا لیتی ہے۔ ڈیموکریسی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ اپنے تفاخر کی بنیاد کسی اخلاق پر نہیں رکھتی، بلکہ اس ٹیکنیکل ترقی پر رکھتی ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ ۱۶ ویں اور ۱۷ ویں صدی کے بعد ان کو نصیب ہوئی۔

۱۶ ویں اور ۱۷ ویں صدی تک مسلمانوں کے عروج کا یہ عالم تھا کہ دنیا میں تین بڑے بادشاہ تھے اور تینوں مسلمان تھے۔ ماوراالنہر اور ہند میں سلطان جلال الدین محمد اکبر تھے۔ ایران میں شاہ عباس اعظم اور ایشیائے کوچک میں یورپ کو روندتا ہوا سلطان سلیمان ذیشان تھا۔ یہ تینوں بڑے مسلمان بادشاہ تھے۔ ان کے مقابلے میں پوری عیسائیت بونا لگتی تھی۔ کسی حیثیت سے یہ بڑے مسلمان بادشاہ ان ایمپائرز کو اپنے مقابلے کا تصور نہیں کرتے تھے۔ ۱۶ ویں اور ۱۷ ویں صدی کے بعد انہوں نے مسلمانوں سے تہذیب سیکھنی شروع کی۔ قسطنطنیہ کے زوال کے بعد ان کے علمی ذخائر لندن، کیمبرج اور آکسفورڈ پہنچے۔ ادھر سپین سے قرطبہ یونیورسٹی سے علم ومعرفت انگلستان، سپین اور اٹلی کے کتب خانوں تک پہنچی۔ ایک نیا دور شروع ہوا جسے تحریک احیائے علوم اور تحریک احیائے مذہب کہتے ہیں۔ ان دو تحریکوں نے یورپ میں نئے دور کی بنیاد رکھی۔

دوسری طرف بدقسمتی سے مسلمانوں کو ان کی فتوحات کے غرور نے علم سے غافل کر دیا۔ علم کی اس غفلت کی وجہ سے مسلمان اپنی کارکردگی اور اپنی کامیابی سے آگے نہ جا سکے۔ مگر ایک نئے متجسس دماغ، جو یورپ میں پیدا ہوا، نے بڑی تیزی سے اپنے آپ کو مہذب کرنا اور سائنسی مہارت کی تحصیل حاصل کرنا شروع کی۔ بڑی سرعت کے ساتھ ایک بحری طاقت بنتے ہوئے انگلینڈ نے ترقی کا آغاز کیا اور ایک نئی جدید تر تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔ یہ جدید تر تہذیب بھی توسیع پسندی کی قائل ہو گئی۔

جیسے کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ تمام وہ تہذیبیں، جن کے پاس ان بلٹ سورسز نہیں ہیں، وہ جب آؤٹ بلٹ اور توسیع میں جاتی ہیں، تو کچھ عرصہ ان کو صرف اس لیے ترقی اور عروج حاصل ہوتا ہے کہ وہ دوسری اقوام کے وسائل پر پھلتی پھولتی ہیں۔ جب وہ دوسری اقوام کے وسائل پر پلتی اور بڑھتی ہیں، تو کچھ عرصہ یا کوئی ایک آدھ صدی کے لیے ان کی ترقی بڑی بے مثال اور ان کی شان وشوکت مستحکم ہو جاتی ہے۔ مگر جب ردعمل کی تحریکیں شروع ہو جائیں اور وہ اقوام جن پر ان کا غلبہ ہوتا ہے، از سر نو اپنے اقتدار کے حصول کے لیے بے چین ہو جائیں اور کوشش اور جدوجہد شروع کر دیں، تو وہ جو ان کی آؤٹ بلٹ ہے، وہ ٹوٹنا شروع ہو جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ یہ بڑی ایمپائرز سکڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔

Marfat.com

یہی حال حکومت برطانیہ کا ہے۔ جب استعماری طاقت کمزور ہوئی تو اس کے قبضے سے ملک آزاد ہونے شروع ہو گئے۔ ایک وسعت جو پہلے ان کو حاصل تھی، نہ رہی۔ آسائشات جاتی رہیں، تو انہوں نے اپنے اِن بلٹ نظام کو دیکھا۔ انہیں پتہ چلا کہ ان بلٹ نظام میں کوئی ایسی وسائل کی طاقت فراہم نہیں تھی، جو انہیں دور تک لے جاسکتی۔ ایک موقع پر فرانس اور امریکہ اکٹھے آزاد ہوئے اور ایک نئی حریت فکر، ایک نئی جدوجہد اور ایک تازہ نمود قوم ہوئی۔ شروع شروع میں آزادی کے خیال سے امریکی قوم بڑی متحرک اور فعال تھی۔ ہر جگہ انقلاب انسانیت اور آزادیت کے تصورات کی حامل تھی۔ ہر جگہ یہ اپنے آپ کو مظلوم انسانوں کا چمپئن سمجھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ شاید اصلی فطرت امریکیائی باہر آنی شروع ہو گئی۔

اگر آپ ان کی پالیسیوں پر غور کریں کہ دنیا کے ۳۱ فیصد وسائل صرف امریکہ کے پاس ہیں اور یہ وسائل ایک طویل المدت منصوبہ بندی کے تحت محفوظ پڑے ہوئے ہیں۔ امریکہ پوری کوشش کر رہا ہے اور شاید اس کو تاریخ کے مطالعے سے علم ہے کہ جب ہم دنیا کے باقی وسائل ختم کر لیں گے، تو پھر صرف ہمارے وسائل بچیں گے اور پھر ہم انہیں استعمال کرنا شروع کر دیں گے۔ مگر جو سٹائل حکومت اور انداز حکومت انہوں نے اختیار کیا اور جس کثرت سے انہوں نے سرمائے کا بہاؤ شروع کیا۔ ان پر ٹیکسیشن بننا شروع ہو گئیں۔ ان کی معیشت پر اس کا دباؤ پڑنا شروع ہو گیا اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی معیشت کہہ رہے تھے اور کہلواتے تھے، ان کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا کہ اگر ہم نئے ذخائر معدنیات اور وسائل تک نہیں پہنچیں گے، تو شاید ہم آئندہ کچھ عرصہ کے بعد اپنے معیارِ زندگی کو برقرار نہ رکھ سکیں۔

اس تناظر میں جب ہم مسلمانوں کو دیکھتے ہیں، تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس عرصے میں مسلسل عیش و عشرت کی طرف رغبت کی۔ اس سیال سونے کو، جس کی برکت سے دنیا میں ہر چیز متحرک ہے اور جس کی بنیادی قوت مسلمان کے پاس تھی، انہوں نے کبھی بھی اپنی تعمیر اور اِن بلٹ کے لیے استعمال نہیں کیا۔ ان کمزور تنصیبات والے مسلمانوں کو جب اس قدر کثرت سے مال ملا، تو ان کے تمام رجحانات عیش و عشرت کی طرف ہونے شروع ہو گئے۔ ان کے بیچ میں ایک ملک، جو اعلیٰ ترین مہارت اور ذہانتیں رکھتا تھا، وہ مملکت پاکستان ہے۔

پاکستان کا ملک بالکل اسی طرح ہے جیسے Thoroguh bred ہارس ہوتا ہے۔ دنیا کے بہترین دماغ اس کھٹالی میں پگھلتے ہیں۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارا نمبر دو دماغ بڑا تیز ہے۔ دنیا کی ہر چیز کی نقل کر سکتے ہیں۔ ہر فراڈ اور مکر و فریب کو بڑی آسانی سے اپنا لیتے ہیں۔ یہ اس کے اعلیٰ ترین دماغ ہونے کی نشانی ہے۔ بدقسمتی سے قائداعظم کے بعد ہمارے سیاستدانوں نے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں کیا۔ ایک عظیم تر ملک کے عظیم تر اذہان بے بسی اور بے چارگی کا شکار ہوتے گئے۔ اس کے نتیجے میں ہمیں بہت سارے سماجی، معاشی اور اخلاقی بحران دیکھنے پڑے۔ مگر ایک کام بڑا عجیب و غریب ہوا کہ اس بھوک و افلاس کے باوجود ہمارے سائنسدان کہیں چھپ چھپا کے اپنے کام میں لگے رہے۔ انہوں نے عسرت و افلاس، پانی اور گندم کے بحران، انفرانسٹرکچر کے توڑ پھوڑ اور معاشرتی زندگی میں درپیش ہمہ قسم بحرانوں کے باوجود، جو ہمیں درپیش ہیں، ہمیں خدا کے فضل سے ایک قابل احترام حیثیت دے دی۔ یہ حیثیت ایک دنیا کی نظر میں بھی ہے اور ان ملکوں کی نظر میں بھی، جن کا خیال یہ تھا کہ ان کی توسیع کا خیال کسی طرح مجروح نہیں ہونا چاہیے۔

جیسے میں نے پہلے کہا کہ اس جنگ میں، جو یورپ اور مشرق اور مغرب کے درمیان لڑی گئی، مغرب کو ہمیشہ ایک خطرہ رہا۔ ویسٹ میں ہمیشہ جتنی حکومتیں بھی قائم ہوئیں، وہ تھوڑے عرصے کی حکومتیں تھیں۔ مشرق میں جتنی حکومتیں بھی قائم ہوئیں، ان کے پیچھے بنیادی نظریہ ایک ہونے کی وجہ سے ایک طویل عرصہ حکومت رہی۔ اسلام اپنی پیدائش کے بعد سے لے کر 16 ویں اور 17 ویں صدی تک مسلسل حکومت کرتا چلا آیا تھا۔ بندے بدل جاتے تھے مگر نظریہ وہی رہتا تھا اور ویسٹ کو یہ آگہی تھی کہ ہم اس نظریے کے خلاف جنگ نہیں لڑ سکتے۔ چنانچہ بنیادی موروثی کمپلیکس، جو مغرب میں آیا، دو تھے۔ ایک تو اپنا عرصہ حکومت کو طول دینے کا ہر حربہ استعمال کرنا اور دوسرا اسلام کو ہر طریقے سے جدید ترین ٹیکنالوجی اور عروج طاقت سے روکے رکھنا تاکہ جو مختصر عرصہ انہیں اپنے عروج کا ملا ہے، وہ کہیں پھر زوال کی زد میں نہ آجائے۔

آج سے پہلے جب بھی کوئی سوسائٹی عروج میں آتی ہے، طاقت پکڑتی ہے، وہ اپنے آپ کو ازخود اپنی عظمت کے ساتھ ہپناٹائز کرتی ہے۔ یہ تمام سوسائٹیوں کا خاصا رہا ہے۔ جیسے جب رومن تھے، وہ کبھی بھی اپنے آپ کو انسان نہیں کہتے تھے۔ وہ رومن گاڈ کہلاتے تھے۔ حتیٰ کہ جولیس سیزر نے اپنے لیے انسانیت کا نہیں، بلکہ خدائے روم کا لقب چنا۔ جو بھی سوسائٹی اپنی انتہا کی طاقت کو پہنچتی ہے، وہ تکبر انسانیت میں سب سے پہلے ملوث ہو جاتی ہے۔ جیسے ہمارا مذہبی آدمی ذرا سا پاک صاف ہو جائے اور جو اکیڈیمک والا ہے، وہ ہر دوسرے بندے کو گنہگار سمجھتے ہوئے اس کی زجر و توبیخ شروع کر دیتا ہے۔ اس پر لعنت و ملامت شروع کر دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں متقی ہو گیا ہوں اور میرا دوسرا بھائی گنہگار ہو گیا ہے۔ میرا حق بنتا ہے کہ میں اس کو کوڑے اور درے ماروں۔ اس کو نالائق سمجھوں۔ اس کو طعنے دوں اور اس کی زندگی اجیرن کر دوں تاکہ جو تھوڑا بہت اسلام اس میں باقی ہے، وہ بھی نکل جائے۔

اسی طرح متکبر قومیں ان قوموں کو، جن کے ابھی تک مراتب بلند نہیں ہوئے ہوتے یا جو ٹیکنالوجی میں تھوڑی سی پست ہوتی ہیں، اپنے سے حقیر سمجھتے ہوئے مسلسل کوشش کرتی ہیں کہ یہ اس ٹیکنالوجی یا اس طاقت تک نہ پہنچ جائیں، جو کبھی ان کو چیلنج کر سکیں۔ امریکہ اور یورپ اپنی ٹیکنالوجی کو ایک عرصہ خفیہ رکھتے ہوئے کوشش کرتے رہے کہ یہ کسی مسلمان ملک تک نہ پہنچے مگر مکروا و مکر الله والله خير المكرين (پ ۳، س آل عمران، آیت ۵۴) تقدیر اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت کی طرح کام کرتی رہی اور بالآخر ان کی بہت سی خفیہ معلومات اور ٹیکنالوجی مسلمان ملکوں کے پاس بھی پہنچ گئی۔ آج انہیں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کوئی مسلمان اسی ٹیکنالوجی کی بنا پر ترقی کرتا ہوا امریکہ یا یورپ اور ان کی موجودہ تہذیب کے لیے چیلنج نہ بن جائے۔

اسلام کو ایک عالمی حکومت پر شرعاً، اخلاقاً اور فقہی اعتبار سے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر اقوام عالم مل کر اپنے میں سے کسی کو دنیا کا صدر چن لیں اور وہ دنیا کو امن اور تہذیب اور سکون کا پیغام دے، تو میرا نہیں خیال کہ کسی مسلمان اور صاحب اسلام کو اس بات پر اعتراض ہو مگر یہ خطرہ اس لیے نہیں مول لیا جا سکتا کہ آج کے تصادم میں وہ قومیں' جو اپنی تہذیب اور ٹیکنالوجی پر ناز کرتی ہیں' وہ مسلمان کو مہذب سمجھنے سے قاصر ہیں۔ افغانستان کے ساتھ تصادم میں بار بار ایک بات جو دہرائی گئی کہ ہم مہذب اقوام کو جانگلی مسلمان سے خطرہ لاحق ہے۔

مگر اس تہذیب کی بنیاد انہوں نے کن اصولوں پر رکھی ہوئی ہے' آج تک یہ پتہ نہیں چلا۔ کس اخلاقی اصول پر

Marfat.com

مغربی تہذیب کی بنیاد ہے؟ اگر شہروں کی صفائی پر بنیاد ہے' تو وہ مسلمان کی کمزوری' خامی اور حماقت کہی جا سکتی ہے کیونکہ اسلام کی اس سے بڑی سٹیٹ منٹ اور کیا ہوگی' جو اللہ کے رسولؐ دے بیٹھے ہیں کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ ایمانداری کا جو تحفظ قرآن یا رسول کرتے ہیں' اس سے بہتر تحفظ قطعاً کسی اور معاشرے میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ ہماری خامیوں کے اعتبار سے وہ مغربی تہذیب کے ساتھ تصادم کی بنیاد نہیں ہیں بلکہ ہماری تہذیب میں سب سے بڑا ابتلا اور بحران اپنی ہی اقدار سے دور ہونا ہے۔ یہ ہمارا سب سے بڑا بحران ہے۔

ہمیں دیانت اور امانت کا سبق پڑھنے اور اپنی ذہانتوں کے موزوں استعمال کے لیے کسی ہارورڈ' کیمبرج اور آکسفورڈ میں نہیں جانا پڑتا۔ ہماری اپنی درسگاہ کے دروازے ہم پر بند ہو چکے ہیں۔ تلاشِ علم ختم ہو چکی۔ محبت رسولؐ صرف نعت گوئی تک رہ گئی اور ہمارے اخلاقی نظام میں رسولؐ کے اسوہ کے ساتھ مطابقت نہیں رہی۔ ہماری ترجیحات گڈمڈ ہو گئی ہیں اور وہ اسلام' جو بنیادی طور پر اللہ کا مذہب اور اللہ کے لیے آیا تھا' جو اللہ کی شناخت اور اس کی محبت کے لیے تھا' وہ مسلمانوں سے ہماری بنیادی ترجیح ہی ختم ہو گئی۔ ہم ایک ایسے خانقاہی نظام اور ایسی رسمی عبادات میں پڑ گئے جس کے بعد ہمارا براہ راست تعلق خدا سے ٹوٹ گیا۔ اخلاص نام کی کوئی شے مسلمان کے دل میں اللہ کے لیے نہیں رہی۔ اب اگر مسلمان کی واپسی ہوگی تو ادھر ہی ہوگی کہیں اور نہیں۔

کیا آپ کو وعدے نہیں چاہئیں؟ کیا چیز ہے' جو رسول پاکؐ بیان نہیں کر چکے؟ جو جناب رسالت مآب نے اپنی زندگی میں بیان نہیں کی؟ قیامت تک کے واقعات بیان کر چکے۔ میں ان کو پیش گوئی نہیں سمجھتا۔ یہ پیش گوئیاں نہیں ہیں۔ مگر آپ کے لیے ایک خطرے کی بات ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا' نوح نے سب سے پہلے دجال کی خبر دی۔ پھر ہر پیغمبر نے اپنی امت کو دجال سے خبردار کیا۔ میں سب سے زیادہ تمہیں اس کی خبر دے رہا ہوں۔ اب اس امت کو دیکھئے' جس نے کبھی دجال کی کوئی حدیث ہی نہیں پڑھی تو اس کو اس خبر سے کیا فائدہ پہنچے گا جو رسول اللہ بہت پہلے دے چکے ہیں؟ جناب رسالت مآب نے زمانوں کے بارے میں کیا خوبصورت محاورہ ارشاد فرمایا کہ دجال کے زمانے میں زمانے قریب آ جائیں گے' بہت قریب ہو جائیں گے۔ اور فرمایا کہ قیامت اس لباس کی طرح قریب آ جائے گی جو صرف ایک دھاگے سے لٹکا ہوا ہے یعنی اس کا اتنا قرب خروج دجال کے ساتھ ہو جائے گا۔ فرمایا کہ پیدائش آدم اور اس زمین کی تخلیق سے لے کر قیامت تک کوئی فتنہ دجال سے بڑا فتنہ نہیں ہے اور تخلیق زمین سے لے کر بربادیٔ زمین تک کوئی فتنہ دجال سے بڑا نہیں۔

مگر یہ کیوں فتنہ ہے؟ ایک بڑی خوبصورت حدیث میں رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ایک مومن جب دجال کے پاس جائے گا تو وہ سمجھے گا' میں ایمان والا ہوں مگر شام تک اس کو شک پڑ جائے گا کہ میں صحیح بھی ہوں کہ نہیں۔ یہ کس چیز کی طرف اشارہ ہے؟ شک و شبہ کی ایک فضا قائم ہو جائے گی۔ اتنا طاقت ور ترغیبات کا معاشرہ مغرب تخلیق کرے گا۔ اتنا طاقت ور کانسپٹ دے گا کہ ایک بڑے سے بڑا صاحب ایمان بھی جب ان کے معاشروں میں جائے گا اور ان کے نظام کو دیکھے گا تو وہ شبے میں پڑ جائے گا کہ آیا ہم ٹھیک ہیں یا وہ ٹھیک ہیں؟ ہم غلط ہیں کہ یہ غلط ہیں؟ ان لوگوں پر نظر ڈالیں جو یہاں سے مغرب کو گئے ہیں۔ اس سوسائٹی میں کچھ عرصہ قیام کیا۔ واپس آ کر کئی سادہ دل بزرگوں سے سنا کہ امریکہ بہت بڑا ہے۔

Marfat.com

امریکہ خدا ہے۔ اپنی بڑائی اور برتری کے تکبرات میں وہی شعور' جو رومن میں پیدا ہوا تھا' ہر امریکن میں صبح و شام پیدا کیا جا رہا ہے۔ انہیں سبق پڑھایا جا رہا ہے کہ تم بندگان خدا نہیں ہو بلکہ دیوتان زمین ہو۔ تم بڑے لوگ ہو۔ ایران ہو یا کوریا' ان کو امریکہ کے ابدی نظام انصاف کا سامنا ہے۔ یہ ابدی انصاف کیا ہے؟ جو یورپ کلچر دے رہا ہے' کیا یہ ہے؟ بہت پہلے اقبال نے ایک بڑی خوبصورت سی بات کہی تھی کہ

صلۂ فرنگ سے آیا ہے ایشیا کے لیے
مئے قمار و ہجوم زنانِ بازاری

یہ وہ صلہ ہے' جو بہت پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ وہ مغربی کلچر ہے جو ہماری رگ رگ میں سمائے جانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے مگر ہمارے پاس اس کا سامنا کرنے کو کیا ہے؟ بدقسمتی سے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ انٹلکچوئل اور ذہن رسا کی سطح پر مسلمانوں میں کوئی ایسی تحریک نہیں ہے جو جوابی وژن کی طاقت پیدا کرے جو کم از کم اپنے فلسفہ خیال اور اپنے نظریے کو سمجھے اور یہ نہ سمجھے کہ مسلمان صرف عبادات کے لیے پیدا ہوا ہے جو یہ نہ سمجھے کہ وہ صرف چند عملی اقدامات کی پیروی کا نام ہے بلکہ یہ کائنات کے اعلیٰ ترین مابعد الطبیعاتی فلسفے کا نام ہے۔

سوال یہ ہے کہ کس مذہب میں خدا ملتا ہے؟ کس فلسفہ حیات میں خدا کے ساتھ ایک براہ راست اپروچ ملتی ہے۔ سوائے اسلام کے کسی اور نظریے سے خدا نہیں ملتا اور خدا ہی مابعد الطبیعات کی جان ہے۔ خدا ہی مابعد الطبیعات ہے۔ اگر ایک مذہب صرف اسلام سے خدا ملتا ہے اور باقی جگہوں پر انہوں نے روحانیت اور تصوف کو خدا سے تعلق کا نام دے رکھا ہے' تو آج تک زمانے میں وہ چیز پیدا کیوں نہیں ہو سکی' جو مسلمان میں پیدا ہو سکتی ہے۔ مختصراً وہ حدیث ہے کہ فراست مومن سے ڈرو' وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ جب ایک عیسائی لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ عیسائیت اور اسلام میں کیا فرق ہے؟ آپ کی چند عبادات اور قسم کی ہیں' ہماری چند اس قسم کی ہیں۔ تو اتنا بڑا کیا فرق ہے کہ آپ ہمیں اپنے برابر کا سمجھتے نہیں ہیں؟ آپ کیوں مغرور ہیں؟ کس رسائی پر کس پہنچ پر آپ کا دعویٰ ہے اور کس جرم کی وجہ سے آپ ہمیں ذلیل و خوار کرتے ہیں؟

میں نے کہا' میرے عزیز! بات تو آپ کی درست ہے۔ جو عبادات آپ کرتے ہیں وہ بھی اللہ کے لیے بجا ہونی چاہئیں اور جو ہم کرتے ہیں' وہ بھی اسی کے لیے ہونی چاہئیں۔ تم اپنے طریقے سے عبادات کر لیتے ہو' ہم اپنے طریقے سے پانچ وقت کی نماز پڑھ لیتے ہیں مگر دراصل بات یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں خدا کی آرزو پیدا ہوتی ہے' وہ اللہ کو چاہتا ہے جب وہ رستہ تلاش کرتا اور خدا کی راہ ڈھونڈتا ہے تو دنیا کا کوئی نظریہ اسے خدا تک نہیں پہنچا سکتا۔ ان الدین عنداللہ الاسلام (پ ۳' س آل عمران' آیت ۱۹) اللہ کے نزدیک خود اس کا رستہ' تعین کردہ دین وہ نہیں ہے جسے آپ پریکٹس کر کے فارغ ہو جائیں گے بلکہ وہ نظریہ دین اور وہ آئیڈیا' جو آپ کو اللہ تک پہنچائے گا۔ وہ صرف ایک ہے اور وہ اسلام ہے۔

مزید اس پر فرمایا' دین میں اکراہ نہیں ہے لا اکراہ فی الدین (پ ۳' س البقرہ' آیت ۲۵۶) جو چاہو چنو' جس رستے پر جاؤ جا سکتے ہو۔ خدا کو آپ سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اللہ آپ پر کوئی جبر و تشدد نہیں کرتا۔ اس نے تو عقل دی ہی

صرف اس لیے ہے کہ آپ اپنا رستہ چن سکو۔ چاہے اللہ کو مانو' چاہے نہ مانو مگر اسلام مجبوری ہے ہر اس شخص کی' جسے خدا چاہیے۔ آپ تبت کے لاما ہو جائیں یا افریقہ کے شامان یا لارڈ پادری بن جائیں' آپ کو سب کچھ مل سکتا ہے' عزت و حرمت مل سکتی ہے۔ مادام ثریا کی سی قبولیت مل سکتی ہے مگر خدا نہیں مل سکتا۔ زمین پر کوئی شخص کسی دوسرے معاشرے سے خدا کی شناخت کلیم کر رہا ہو' سوائے مسلمانوں کے۔ اولیاء اللہ تعالیٰ کی ایک لمبی لائن ایسے لوگوں کی موجود ہے جو خدا سے نہ صرف تعلق رکھتے ہیں' بلکہ ان پر خدا کا نور چھلکتا ہے۔ وہ اس فراست مومن کے مالک ہوتے ہیں' جو صرف اور صرف اللہ کے حضور سے اشو ہوتی ہے۔ ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلا یقبل منہ (پ ۳' س آل عمران' آیت ۸۵) اللہ نے بالکل صاف لہجے میں کہا کہ میں اسلام کے رستے کے سوا کسی اور رستے کو قبول نہیں کروں گا۔ اسلام کے سوا مجھے کوئی اپروچ پسند نہیں ہے۔ اگر ایک مابعد الطبیعاتی سچائی اور حقیقت یعنی خدا کو صرف ایک اپروچ پسند ہے تو اس سے بڑا مابعد الطبیعاتی مذہب کون سا ہو سکتا ہے؟

مگر کیا پھر اگر رسل اور برگساں کو پڑھتے ہوئے آپ کو اعلیٰ معیار' ایک جدت خیال اور انسٹرومنٹ چاہیے' جس سے آپ کائنات کو فہم و فراست کے ادراک میں لے سکتے ہیں تو پھر کیا خدا کو جاننے سمجھنے کے لیے آپ کو تعلیمی کاوشیں نہیں چاہئیں؟ ضرور چاہئیں۔ یہی وہ فرق ہے جو آج مسلمان میں نہیں ہے۔ تعلیمی بحران' اپنے مذہب میں غور و خوض نہ کرنے اور دنیاوی علوم میں دسترس ہونے کے باوجود قرآن حکیم کو سمجھنے میں معذوری کی وجہ سے مسلمان پر ہے۔ اگر افغانستان میں معجزہ اور کرامت نہیں ہوئی تو اس کی وجہ خدا اور اسلام نہیں ہے۔ اس کی وجہ اللہ کی طرف توجہ کا نہ ہونا ہے۔

اب میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس نے مجھ پر جھوٹ بولا' وہ جہنم میں داخل ہو گیا۔ اخباریں تو آپ پڑھتے رہے۔ مسلسل ملا عمر کے ساتھ ایک خواب کی تعبیر آتی رہی کہ انہوں نے چار پانچ مرتبہ حضور گرامی مرتبت کو دیکھا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اٹھ جہاد کر' جنگ کر۔ تو افغانستان کو اکٹھا کرے گا' فتحیاب ہو گا۔ کیا اس خواب کی تعبیر یہی نکلتی تھی؟ جب فارن دجال کا میڈیا آپ کو پیغمبر کا چوغہ دکھاتا ہے تو اس کا مقصد یہ بالکل نہیں ہوتا کہ وہ آپ کو پیغمبر کا لبادہ دکھائے۔ اس کی بنیادی سائیکی یہ کہتی ہے کہ تمہارے پیغمبر کے لبادے نے بھی تمہاری مدد نہیں کی۔ تم پیغمبر کے خواب دیکھتے رہو۔ فتح ہم معروضی لوگوں کو حاصل ہو گی۔ یہ کتنے بڑے جھوٹ تھے' جو اللہ کے رسول پر باندھے گئے۔

رسول اللہؐ کے دو سچے خواب' جو تاریخ میں درج ہوئے' میں ان کی آپ کو چھوٹی سی بات سناتا ہوں۔ یہ دونوں فیصلہ کن انسٹی ٹیوشنز ہیں' جو تاریخ میں ہوئے۔ معرکہ عین جالوت سے ایک سال قبل ہلاکو خان کا پوتا قزل بوغا ایک لاکھ شاہسواروں کے ساتھ دمشق کی فصیل کے نیچے آ کر رکا۔ شہر میں کوئی فوج نہیں تھی۔ دروازے بند تھے۔ عورتیں آہ و بکا کر رہی تھیں اور کوئی سامان حرب نہ تھا مگر شہر میں ایک شخص محمد بن ادریس الشافعی الجزری موجود تھے۔ وہ بڑی مشہور حدیث کی ایک کتاب ''حصن حصین'' لکھ رہے تھے۔

''حصن حصین'' کا مختصر تعارف یہ ہے کہ اس میں دعا کو مضبوط قلعہ فرمایا گیا ہے۔ محمد بن ادریسؒ مختلف احادیث سے رسول اللہ کی تمام دعائیں اکٹھی کر کے یہ کتاب تیار کر رہے تھے۔ اس رات اسے مکمل کرنے کے بعد دعا میں حضورؐ کو نذر کی اور کہا' یا رسول اللہؐ بہت بڑے خطرے میں امت مبتلا ہے۔ اگر یہ کل دمشق میں داخل ہو گئے تو پورے عرب میں پھر

Marfat.com

انہیں کوئی روکنے والا نہ ہوگا۔ بہت قتل وغارت ہوگی۔ اے شاہ امم! اپنی امت کو اس خطرے سے بچا لیجیے۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ رات میں نے رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا۔ مجھے اپنے بائیں ہاتھ میں لیا۔ اس کا مطلب کسی کو عرب کے دستور میں حفاظت میں لینے کو کہتے ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں کہ مجھے حضورؐ نے بائیں ہاتھ لیا اور فرمایا' گھبراؤ نہیں۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔

دو واقعات تاریخ میں ایسے رہے ہیں' جن کی وجہ آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تاریخ کے اسرار ہیں۔ ایک کی وجہ تو آپ کو ابھی بتا دی۔ ایک اور واقعہ بڑا عجیب وغریب گزرا ہے۔ خداوند کریم کہتے ہیں اذا اسئلک عبادی انی فانی قریب' یہ پوچھتے ہیں کہ اللہ میاں! تو دعا سنتے وقت کہاں ہوتا ہے؟ فرمایا' کہہ دو میں بہت قریب ہوتا ہوں۔ تمہارا صبر ہی اتنا ہے کہ تم میری قربت کو بھی بہت بڑا فاصلہ سمجھتے ہو۔ روم کے دروازے پر وقت کا سب سے بڑا سفاک حکمران آ کر رکا۔ وقت کا سب سے بڑا سفاک حکمران اٹلہ دی ہن۔ ہن ادھر انڈیا میں بھی آئے اور اُدھر یورپ میں بھی گئے۔ اِدھر آنے والے تو رامان اور مہر گل تھے اور اُدھر جانے والا اٹلہ تھا' جس کے نام کی دہشت آج بھی یورپ میں قائم ہے۔ وہ تہہ و بالا کرتا ہوا روم کے دروازے پر پہنچا۔ روم کے اندر بھی فوج نہیں تھی۔ یہ اسلام سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے اور عیسائیت اس وقت صحیح مذہب تھی۔ وہ سارے کے سارے اپنے گرجا میں بیویوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر جمع ہو گئے اور خدا سے آہ وزاری کرنا شروع ہو گئے۔ اے پروردگار! اس آفت زمانہ سے صرف تو ہی بچا سکتا ہے۔ بعینہٖ یہی واقعہ دمشق میں پیش آیا۔ صبح کے وقت دونوں فورسز کیسے پلٹ گئیں کدھر گئیں؟ کیونکہ صبح جب شہر والوں نے اٹھ کر دیکھا تو ایک بھی دشمن کا سپاہی سامنے نہیں تھا۔ روم کے دروازے پر' نہ دمشق کے دروازے پر کوئی نظر آیا۔ اگر رسول اللہؐ کسی خواب میں نظر آئیں گے پھر تو ایسے ہوگا۔

ایک چھوٹا سا واقعہ اور سن لیجیے۔ سیدنا علی بن عثمان ہجویریؒ ابھی ہندوستان میں وارد نہیں ہوئے تھے۔ وہ تحصیل علم میں کہیں سے کہیں گھوم رہے تھے۔ ایک دفعہ وہ دمشق کی جامع مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے۔ فرمایا کہ میں نے دیکھا' باب مشرق سے رسول اللہؐ داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک نحیف اور نزار آدمی کو آغوش میں اٹھایا ہوا ہے۔ فرمایا' مجھے بڑا رشک آیا کہ یہ کون ہے جسے رسول اللہؐ نے اٹھایا ہوا ہے۔ میں دوڑ کر قدم بوس رسولؐ ہوا۔ حضورؐ نے میرے خطرۂ قلب پر آگہی پائی اور کہا علی بن عثمان! ذرا غور سے سنیے گا۔ یہ تیرا اور تیرے لوگوں کا امام ابوحنیفہؒ ہے۔ اس وقت تک تبلیغ دین کا وہ فشار شروع ہوا تھا' نہ اس وقت تک سید ہجویر ولایت عظمیٰ اور قطب الاقطاب کے منصب پر فائز ہوئے تھے مگر آج بھی اس خواب کی سچائی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ماوراالنہر سے لے کر راس کماری تک کچھ تعداد کو چھوڑ کر تمام ہندوستان کی فقہ حنفی ہے۔ اس خواب کی سچائی دیکھئے کہ اس میں دو باتیں رسول اللہؐ نے ارشاد فرمائیں۔ فرمایا' اے علی بن عثمان! ہندوستان تجھے بخشا اور اے علی بن عثمان! ان لوگوں کا غزنی سے لے کر راس کماری تک کی فقہ حنفیہ ہوگی۔ حتیٰ کہ آج بھی اس حقیقت کا انکار ممکن نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افغانستان میں کون سے خواب دیکھے جا رہے تھے؟ جو رسول اللہؐ پر صاحب صدق و صفا پر بہتان باندھتا ہے' اس کو تو آگ میں داخل ہی ہونا ہے۔ اگر باوجود اس کے کہ ہمارے دل ان کلمہ گو لوگوں کے ساتھ

Marfat.com

دھڑ کتے تھے اور آج بھی اس صدمے سے شاید ہمارے دل چاک ہیں۔ خوف' ابتلا اور اس رنج سے کہ مسلمانوں کو عراق کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ پہنچا ہے۔

یہ کچھ احادیث دجال کی پہچان پر ہیں' بڑی عجیب و غریب ہیں۔ لوگ کہتے ہیں دجال کون ہے؟ زمانہ کون سا ہے؟ کیا عصر بنتا ہے؟ کون سی قوتیں اسے بناتی ہیں؟ سب سے پہلے میں آپ کو دو ڈھائی ہزار سال پہلے حضرت دانیال کے چند لفظ بتانا چاہتا ہوں۔ حضرت دانیال نے خواب دیکھا کہ چار سینگوں کے درمیان ایک چھوٹا سینگ نکلا ہے اور دیکھتے دیکھتے وہ سینگ بہت بڑھ گیا ہے۔ وہ بڑے پریشان ہوئے پھر دیکھا' اس پر ایک سر نمودار ہوا اور وہ بڑے غرور اور گھمنڈ کی باتیں کرتا ہے۔ دانیال بڑے پریشان ہوئے۔ جبریئل امین سے کہا' میرا دل بڑا متغیر ہے۔ مجھے یہ بتاؤ' اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟ حضرت جبریئل نے کہا' دانیال! یہ تیرے عہد کا خواب نہیں ہے۔ ایک دن اور دوسرا دن اور آدھا دن۔ یعنی تیرے ڈھائی ہزار سال بعد یہ واقعات پیش آئیں گے۔ یہ ایک بہت جابرانہ حکومت بنے گی اور انہوں نے بڑی عجیب و غریب نشانی بتائی کہ وہ اجرام فلکی کو پامال کریں گے۔ ان کے قدم اجرام فلکی پر جائیں گے۔ دائمی قربانی کو بند کر دیں گے۔ اس قوت کی پہچان بتائی جا رہی ہے کہ خداوند کے قدوسوں کو قتل کریں گے۔ دائمی قربانی صرف ایک ہے۔ حج کے وقت کی قربانی۔ یہ بند کر دی جائے گی۔ حضرت نے پوچھا کہ جبریئل امین! ہم اس کو کیسے پہچانیں گے؟ فرمایا' مملکت رس' بحیرہ بالٹک اور پانیوں کے گرد آباد قومیں دجال کی مخلوق ہوں گی۔

حضرت دانیال کا یہ واقعہ پورے کا پورا رویا ہے۔ اسے مکاشفہ' دانیال کہتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر پورے پورے اس خطرے کی نشاندہی کرتا ہے کہ خانہ کعبہ پر بنو اسرائیل کے ذریعے چڑھائی ہوگی۔ یہ خداوند گھمنڈ کی باتیں کرے گا۔ قدوسوں کو رسوا کرے گا اور اپنے آپ کو خدا کا ہم عصر جانے لگا۔ اصلی بزرگ و برتر خدا کو حقیر سمجھے گا۔ پھر اس کو طاقت دی جائے گی۔ حیرت کی بات ہے کہ حضرت دانیال نے اس کا وقت بھی بتایا۔ تین سو سینتیس دن خروج کے بعد اس کی طاقت رہے گی اور یہ سات سال کے قریب بنتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حواری جمع تھے۔ حواریوں نے عرض کی یا نبی اللہؑ! ہمارے دل بے چین اور مضطرب ہیں۔ آج آسمانوں سے کھانا اترے' تو دل کو تسلی ہو۔ یہ معجزہ ہمارے حق میں ہو۔ ہمارے دل تسلی پائیں۔ تاکہ ہم اس قابل ہوں کہ خدائے قدوس بزرگ و برتر کی تعریف کریں۔ حضرت عیسیٰؑ نے ایک دعا فرمائی۔ قرآن میں درج ہے کہ اے پروردگار! آسمانوں سے ان کے لیے خوانِ نعمت اتارا' جو ان کے اگلوں کو بھی پہنچے اور ان کے پچھلوں کو پہنچے تو بے حساب رزق دینے والا ہے۔ اللہ نے کہا' ٹھیک ہے دیتا ہوں' تمہاری تسلی ہو جائے گی مگر ساتھ ایک بات میں بھی کہتا ہوں کہ پھر تمہاری اس قوم سے ایسے بدکار ذہن اٹھیں گے' جو میرے ساتھ شریک بنائیں گے اور توحید کو پامال کریں گے۔ پھر اتنا یاد رکھنا کہ میں ان اقوام کو ان لوگوں کو سزا کچھ ان کے ہاتھوں بھی دوں گا۔ جنگ عظیم اول' دوم اور سوم جس کے بعد ایک ایسی جنگ عظیم ہے' جس کا سراغ رسول اللہؐ نے ہمیں دیا ہے۔

اب ذرا قرآن کی طرف آیئے۔ بار بار آپ نے سنا ہوگا کہ جس کو دجال کا خطرہ ہو' وہ سورۂ کہف کی پہلی دس آیات ضرور پڑھے۔ سوال یہ ہے کہ سورۂ کہف کی یہ دس آیات کہتی کیا ہیں؟ ان کا ترجمہ ہے۔

Marfat.com

''سب خوبیاں اللہ کو جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔ تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کردے اور ایمان لاکر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور ان لوگوں کو ڈرادے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے نہ ان کے باپ دادا کو تھا۔ بڑی بات ہے' جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ وہ محض جھوٹ بکتے ہیں۔'' اس کے بعد نماز والوں کی بات ہے۔

یہ دس آیات دجال کے تحفظ کے لیے ہیں۔ فرمایا' جس کو کوئی شک ہوگا یا اسے کوئی بحران پیش ہوگا' جب وہ ان دس آیات کو پڑھے گا' تو دجال سے محفوظ ہو جائے گا۔ دیکھئے' اللہ کیا کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں کو ڈرائیں جو تثلیث پر یقین رکھتے ہیں۔ جو اللہ کا بیٹا اور اس کی بیوی بناتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دجال کی تشکیل کر رہے ہیں۔ اور فرمایا' اس بارے میں وہ کچھ علم رکھتے ہیں نہ ان کے باپ دادا۔ کتنا بڑا بول اور کتنی غلط بات ہے' جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ تو کہیں تم اپنی جان پر کھیل جاؤ گے' ان کے پیچھے' اگر وہ ایمان نہ لائیں گے تو؟ ایک علامت یہ ہوئی کہ وہ اللہ کا بیٹا اور اولاد بتاتے ہیں۔

دوسری علامت' بے شک ہم نے زمین کا سنگار کیا' جو کچھ اس پر ہے' انہیں آزمائیں کہ ان میں کس کے کام بہتر ہیں؟ اگر ان کو دولت دنیا دی ہے۔ سکائی سکریپر اور وال سٹریٹ دی ہے تو اس لیے بالکل نہیں دی کہ وہ غرور گھمنڈ اور تکبرات کی زندگی بسر کریں بلکہ ہم نے یہ آسائشیں' یہ خوبصورتی ان کو آزمانے کے لیے دی ہے لیبلو کم ایکم احسن عملا (پ ۹' س الملک' آیت ۲) ہم یہ دیکھیں کہ وہ کیا اچھے عمل کرتے ہیں۔ کیا آسائش میں خدا کو بھول تو نہیں جاتے؟

ذرا سزا کے اور قریب آجایئے۔ تو ایک اگلی جنگ کے بعد جو حشر ہونا ہے وہ اللہ نے بالکل وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ بے شک جو کچھ ہے' اس پر ایک دن ہمیں اسے میدان سفید کر کے چھوڑ دینا ہے۔ تہذیب کی تمام علامات کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ کوئی چمک' کوئی خوبصورتی اور کوئی شناخت نہیں رہے گی۔ جو کچھ بھی یہ اونچائیاں بنی ہوئی ہیں' ڈھیر کردی جائیں گی۔ زمین کو زمین سے برابر کر دیا جائے گا۔ پھر اس میں بھی نشانی ہے کہ پہاڑ کی کھوہ میں جو رہتے تھے' ہم نے انہیں تین سو برس سلایا۔

ان آیات میں تین چیزوں کا ذکر ہے کہ دجال کی علامت کے طور پر خدا کا بیٹا بناتے ہیں۔ معیشت پر اتراتے ہیں۔ انہیں اپنی بلند و بالا چیزوں پر تفاخر ہے اور تیسری بات یہ ہے کہ ہدایت طلب نہیں کرتے بلکہ اپنے بنائے ہوئے قانون پر ناز کرتے ہیں۔ وہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کو فرسودہ سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ دجال کی بنیادی خصوصیات کی حامل یہ عیسائی قومیں ہیں۔ جیسے کہ حضرت دانیال نے کہا تھا' جو اس وقت پانیوں کے گرد آباد ہیں۔ سو حضرت دانیال اور قرآن کی دونوں باتیں ملالی جائیں' تو بڑی وضاحت سے پتہ لگتا ہے کہ اس وقت زمانے میں جو آخری عنصر تخلیق ہو رہا ہے' جسے آپ اینٹی کرائسٹ کہہ لیں' وہ ایک اتنی بڑی قوت ہے' جو اپنی تہذیب کا زوال نہیں دیکھ سکتی اور اس زوال کو روکنے کے لیے وہ ہر کوشش اور تردد میں برسرِ پیکار ہے۔

1945ء میں ''گیٹ'' کا ٹریفک اور ٹیرف کا معاہدہ ہو۔ یوراگوئے میں یہ ''گیٹ'' دوبارہ مرتب ہوا اور ٹیرف

Marfat.com

اور ٹیکسوں کے قوانین کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ 2005ء کے بعد کوئی ٹیکس اور کوئی ٹیرف نہیں رہے گا کسی قسم کی بندش نہیں رہے گی۔ یہ جب ختم ہو جائے گا تو وسائل آزاد ہو جائیں گے چنانچہ امریکہ اور یورپ کو اچھی طرح علم ہے کہ پابندیوں سے آزاد تجارت کے آغاز سے پہلے پہلے اگر ہم نے ٹرانس ایشیا نا اور مشرق وسطیٰ کے وسائل پر قبضہ نہ کیا تو ہم اس مقابلے میں مارے جائیں گے۔ یورپی اقوام آزاد ہوں گی۔ مسلم ممالک کو اپنا خام مال بیچنے کی پوری آزادی ہوگی۔ اس سے مشرقی اقوام کو اجارہ داریاں حاصل ہونی شروع ہو جائیں گی۔ اس کے تحفظات کے طور پر امریکہ اور باقی لوگ بہت سخت جدوجہد کر رہے ہیں کہ 2005ء سے پہلے پہلے وہ ان تمام ایشیائی اقوام کے وسائل تک پہنچ جائیں' جن میں ممکنہ طور پر خام مال موجود ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ 2005ء کے بعد ایسی ایک بے پناہ دوڑ شروع ہو جائے' جس میں کوئی ملک دیکھتے دیکھتے سال میں غریب تر ہونا شروع ہو جائے اور یورپ کا تمام معاشرہ اور یہ تمام عروج قصہ پارینہ بن کر نہ رہ جائے۔ یہ ایک اور بڑی وجہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ 2005ء تک ایک بڑی جنگ کے ذریعے ایشیائی اقوام کو مکمل مغلوب کر لیا جائے۔

جہاں پریشانی ہے' وہاں اللہ کے رسولؐ نے ہمیں اچھی خبریں بھی دی ہیں۔ ایک دو خبریں بڑی دلچسپ ہیں جو آج کی ترقی کی دوڑ کے بارے میں ہیں۔ جینٹک سائنس کا جو نقشہ رسول اللہؐ نے پیش کیا ہے' وہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ جو ترقی اور عروج علوم حاضرہ کو حاصل ہونے والا ہے' وہ بھی ابھی تک نہیں پہنچا۔ دجال کہاں تک جائے گا۔ اس کی رسول اللہؐ نے بڑی خوبصورتی سے نشاندہی فرمائی ہے۔ پھر قرآن حکیم کی تکمیل مطالب تک دنیا نے رہنا ہے۔ کچھ باتیں قرآن کی پوری ہو چکیں' جبکہ کچھ باتیں ابھی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر عیسیٰؑ نے کوڑھی اور برص والے کو ٹھیک کیا ہے' اس کا ثبوت انسانی فراست اور محنت میں دیا جائے گا۔ یہ لوگ بھی اس بات پر قادر ہوں گے کہ کوڑھی اور برص والے مریض کو درست کریں۔ اگر کسی پیغمبر نے چیونٹی یا پرندوں سے بات کی تو یقین جانئے' آج کا انسان بھی کرے گا اور یہ بات بھی ثابت ہوگی۔ فرمانِ رسولؐ کے مطابق قیامت نہیں آئے گی' جب تک انسان درندوں سے کلام نہیں کر لے گا۔ جب تک انسان کے جوتے کا تسمہ اس کو اس کے حال کی خبر نہیں دے گا۔ قیامت نہیں آئے گا۔ جب تک کہ عورت کی ران خبر نہ دے گی کہ اس کے ساتھ کیا زیادتی ہوئی یا کیا ہوا؟

ابھی جنیٹک سائنس میں جانوروں کی زبان بھی ڈی کوڈ ہو رہی ہے اور ڈی این اے ٹیسٹ موجود ہیں' جو کسی بھی قسم کے المیہ کی خبر دے سکتے ہیں۔ جوتے کے تسمے سے مراد ایک اتنا حساس ترین جاسوس سسٹم ہے کہ ایک انسان کی کوئی چیز اس کے بدن سے آپ کو مل جائے گی' تو آپ کو اس کا پورے کا پورا سراغ اور اس کی ہر چیز معلوم ہو جائے گی۔ یہ حدیث جنیٹک سائنس کے پورے کے پورے جدید تھیسز کو پیش کرتی ہے' جن میں سے ایک بات یعنی ڈی این اے ٹیسٹ میں نے کہا' وہ تو ہو چکا ہے۔ ابھی تازہ ترین یہ ہے کہ جانوروں کی زبان ڈی کوڈ ہو رہی ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ العزیز وہ بھی اللہ کے رسولؐ کی بات ضرور پوری ہوگی۔ حضرت سلیمان کا ہدہد سے بات کرنا کسی کو عجیب نہیں لگے گا۔ پھر تخت کا کنورٹ ہونا بھی کسی کو عجیب نہیں لگے گا۔ بات اب اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی دھات کو ڈی فیوز کر کے دوبارہ اصل شکل میں لے آئے ہیں۔ ابھی انسانوں پر انہوں نے اس کے بے پناہ اخراجات اور انسانی زندگی کو لاحق خطرات کے باعث

Marfat.com

تجربہ نہیں کیا مگر جو تجربات اس وقت ہو رہے ہیں' وہ قرآن کی ہر اس بات کو ثابت کریں گے جو پیغمبروں کے ذریعے ہوئی۔ جیسے میں نے آپ کو سورۂ کہف کی آخری آیات سنائیں۔

فرق صرف اتنا ہے کہ خدا یہ کہتا ہے اے بندے! جس چیز تک تو تین ہزار سال کی محنت شاقہ کے ساتھ پہنچے گا' میں اسے اپنے بندے کو ایسے ہی عطا کر دیتا ہوں۔ جیسے کہ میں نے سلیمان کے پاس بیٹھے ہوئے آصف بن برخیا کو کتاب کا علم عطا کیا۔ اگر تم خدا کی طرف چلو' تو تب معجزہ ہوگا۔ یہ توکل' یہ انداز' یہ عبادت کے رنگ ہوں گے' تو ہوگا مگر خدا سے اتنی دوری' اتنی پستی کی باتوں سے کوئی اوسط نہیں رہ جاتی کہ انسان اپنے لیے خدا کی طرف سے کوئی خیر و برکت کی توقع کر سکے۔

واقعات کی ظہور پذیری کی ترتیب ملاحظہ کریں کہ جنگ عظیم' فتح قسطنطنیہ اور خروج دجال چھ سال میں ہے اور دجال ساتویں سال نکلے گا۔ اب یہاں سب سے بڑی علامت ہے۔ اصل میں علامت کو ایڈجسٹ کرنا سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا' فتح قسطنطنیہ کی فتح کی جو جنگ عظیم ہے' وہ ایشیائے کوچک کے میدانوں میں لڑی جائے گی۔ اس وقت آج کی طرح کی تخصیص نہیں تھی اور صرف بڑے بڑے شہروں کے نام لوگوں کو آتے تھے' اس لیے جیسے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مسلمان مدینہ منورہ میں محصور ہو جائیں گے۔ اسرائیل کی فتوحات آگے بڑھیں گی۔ کعبہ تک پہنچیں گی۔ دائمی قربانی موقوف ہوگی مگر وہ مدینہ کے اندر داخل نہ ہو سکیں گے۔ مدینہ کی حفاظت اللہ خود کرے گا' ملائکہ کریں گے۔ رستے میں خسف واقعہ ہوگا اور دشمن افواج کا رخ شام کی طرف موڑ دیا جائے گا جہاں حضرت مہدیؑ ان کا قتل عام کریں گے۔

حضورؐ ہر زمانے کی بڑی عقل ہیں۔ فرمایا قسم ہے اس ذات کی' جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ دنیا ختم نہیں ہوگی' یہاں تک کہ لوگوں پر ایسے دن نہ آ جائیں کہ قاتل نہیں جانے کہ اس نے کیوں قتل کیا اور مقتول کو معلوم نہیں ہوگا کہ اسے کیوں قتل کیا گیا۔ عرض کی گئی' ایسا کیوں ہوگا؟ فرمایا' قتل عام کے باعث قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہوں گے۔ اچھی خبریں ساتھ ساتھ ہیں۔ فرمایا' میری امت کا ایک گروہ قیامت تک غلبے کے ساتھ حق کی خاطر لڑتا رہے گا۔ حتیٰ کہ عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے۔ ان کا امیر کہے گا کہ آیئے' ہمیں نماز پڑھایئے۔ وہ فرمائیں گے نہیں۔ تم ہی آپس میں ایک دوسرے کے امام ہو۔ یہ اللہ نے اس امت کو عزت بخشی ہے۔ یہ ساری صحیحین کی حدیثیں ہیں۔

البتہ ایک حدیث بڑی دلچسپ ہے جو بیہقی نے ''کتاب البعث والمنشور'' میں نقل کی ہے۔ حدیث کہتی ہے کہ دجال ایک سفید گدھے پر نکلے گا' جس کے دونوں کانوں کے درمیان ستر ہاتھ کا فاصلہ ہوگا۔ یہ وہ گدھا ہے جس کے بارے میں ایک اور حدیث کہتی ہے کہ وہ زمین پر بھی چلے گا اور ہوا میں بھی اڑے گا۔ یہ علامت ہے۔ اگر شکل و صورت دیکھیں تو میرے خیال میں فائٹر جہاز جیسا بدشکل گدھا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے کان بھی اتنے لمبے ہوتے ہیں اور رنگت بھی اس کی سٹیل گرے ہوتی ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ دجال کی قوت زیادہ تر اس کی ایئرفورس میں ہوگی۔

فرمایا دجال مشرق کی جانب سے مدینہ منورہ داخل ہونے کے ارادے سے آئے گا' یہاں تک کہ احد کے پیچھے اترے گا۔ پھر فرشتے اس کا منہ شام کی طرف پھیر دیں گے اور وہیں ہلاک ہوگا۔ یہ متفق علیہ حدیث ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت قائم نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ دو عظیم لشکروں کی آپس میں جنگ نہ ہو جائے اور ان کا دعویٰ ایک جیسا ہوگا۔ یہاں تک کہ تیس کے قریب دجال اور کذاب آئیں گے۔ یہ دجال اصلی اور آخری ہوگا۔

یہاں بہت بڑے خطرے کی بات' جو آپ کو سنانی ہے' یہ ہے کہ فرمایا' تین نشانیاں جب نکل آئیں تو کسی جان کو اس کا ایمان لانا نفع نہیں دے گا جبکہ وہ پہلے ایمان نہ لایا ہو یا اپنے ایمان کے ساتھ نیکی نہ کمائی ہو۔ ان تین نشانیوں میں سورج کا مغرب سے طلوع ہونا اور دجال اور دابتہ الارض کا نکلنا ہے۔ دجال اور قیامت میں بہت بڑا بعد ہے اس لیے ہمارے زمانے تک ہمارے ایمان کو جو سب سے بڑا خطرہ ہے' وہ دجال کی معاشرت اور انداز پر یقین کرنا ہے۔ حدیث میں دجال کے ساتھیوں کا بھی ذکر ہے۔ یہ مسلم کی حدیث ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا' اصفہان کے ستر ہزار یہودی دجال کی پیروی کریں گے اور ان پر کالی سیاہ مخملی ریشمی چادریں ہوں گی۔ خیال یہ کہتا ہے کہ یہ ایک لفظ مسلم میں لفظ یہودی موجود ہے مگر عین ممکن ہے کہ ایسے لوگ موجود ہوں' جو یہودی ہوں اور ایران میں رہتے ہوں اور یہ جنگ عظیم ہو' تو وہ اس کا ساتھ دیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا' قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک زمین میں اللہ اللہ کہا جائے گا اور دوسری روایت ہے کہ ایسے کسی شخص پر قیامت قائم نہیں ہوگی' جو اللہ اللہ کہے گا۔ آپؐ نے فرمایا' چھ چیزوں سے پہلے اعمال کی جلدی کرو۔ زمین پر ایک دھوئیں نے آنا ہے' دجال' دابتہ الارض' سورج کا مغرب سے طلوع ہونا' عام فتنہ اور خاص فتنہ' عام فتنہ وہ ہے جو فیشن کے طور پر سارے زمانے میں جائے گا۔ جبکہ خاص فتنہ وہ ہے جو خفیہ طور پر آپ کی ذاتی شخصیت میں آ جائے گا۔ یہ دونوں فتنے ہیں۔

مگر اس میں ایک خوشخبری کی بات سنئے۔ میں آپ کو بری اور اچھی خبریں ساتھ ساتھ سنا رہا ہوں تاکہ آپ ایک متوازن ذہن کے ساتھ ان چیزوں پر غور کریں۔ فرمایا' قتل عام کے زمانے میں عبادت کرنا' میری طرف ہجرت کرنے جیسا ہے۔ حضرت اسماء بنت زیدؓ نے فرمایا کہ نبی کریمؐ میرے غریب خانے پر جلوہ افروز تھے۔ آپ نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا' دجال کے آنے سے پہلے تین سال ہیں۔ پہلا سال آسمان تہائی بارش روک لے گا اور زمین تہائی نباتات روک لے گی۔ دوسرے سال آسمان دو تہائی بارش روک لے گا اور زمین دو تہائی نباتات روک لے گی۔ تیسرے سال آسمان ساری بارش روک لے گا اور زمین پر ساری نباتات اور جانور مرنے شروع ہو جائیں گے۔ اس وقت دجال کہے گا تمہارے جانوروں' تمہارے مال و اسباب اور تمہارے بھائیوں کی زندگی میرے پاس ہے۔ میں تمہارے بھائی زندہ کروں گا اور شیطان ان کے بھائیوں کی صورت بنے گا۔ ان کی کمانڈ بنے گا۔ حضرت اسماءؓ خاتون تھیں' فرمایا رسول اللہؐ ہم آٹا گوندھتے ہیں' اس وقت جب ہمیں بھوک لگتی ہے۔ یعنی ہم بھوک روکے رکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ جب مجبوری ہو تو ہم روٹیاں پکائیں۔ اتنی زیادہ گرسنگی اور اتنی کمی کے وقت اس وقت مسلمانوں میں کیا حال ہوگا؟ فرمایا' وہی کفایت کرے گا جو آسمان والوں کو تسبیح و تقدیس کے ذریعے کفایت کرتا ہے۔

عمرو بن حرث نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے روایت کی کہ ہم سے گفتگو کرتے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا' دجال مشرق کی جانب سے سرزمین خراسان سے نکلے گا۔ خراسان افغانستان اور اس پورے علاقے کو کہتے ہیں۔ اس کی پیروی ایسے لوگ کریں گے جن کے چہرے کٹی ہوئی ڈھالوں جیسے ہوں گے۔ آپ نے شمالی اتحاد کے چہرے تو دیکھے ہوں گے۔ چپٹے' ناکیں چپٹی ہوئیں ساتھ۔

اس کا دوسرا حصہ یہود کی طرف آتا ہے۔ یہود جس نے یہود و خدائے یہود کو چھوڑ کر ایک نئے خدا کی پرستش شروع کی۔ اب اس کا خدا یہود نہیں۔ اسماعیلؑ اور ابراہیمؑ کا خدا نہیں ہے۔ اب اس کا خدا امریکہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا' قیامت قائم نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ مسلمان یہودیوں سے جنگ نہ کرلیں۔ مسلمان انہیں قتل کریں گے۔ یہاں تک کہ یہودی جس پتھر یا درخت کے پیچھے چھپا ہوگا' وہ درخت اور پتھر کہے گا' اے مسلمان! اے اللہ کے بندے! میرے پیچھے یہودی ہے' اس کو قتل کردو۔ سوائے غرقد کے درخت کے' کیونکہ وہ یہودیوں کا ہوتا ہے۔

پندرہ سو سال پہلے حضورؐ نے چار باتیں کہیں۔ تین پوری ہو چکی ہیں' چوتھی رہتی ہے۔ فرمایا' حضرت نافع بن عتبہؓ سے روایت ہے۔ مسلم کی حدیث ہے کہ تم جزیرہ عرب سے جہاد کرو گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں فتح دے گا۔ پھر ایران سے جہاد کرو گے تو اللہ تمہیں فتح دے گا۔ پھر روم سے جہاد کرو گے تو اللہ تمہیں فتح دے گا۔ پھر تم دجال سے جنگ کرو گے اور اللہ تمہیں فتح دے گا۔ فرمایا' خدا کی قسم! ابن مریم تم میں ضرور نازل ہوں گے۔ جب دکھ اور اتنا عذاب بڑھے گا۔ بین الکائناتی ٹریجڈی کی حد تک بات پہنچے گی' تو پھر ضرور ابن مریم اتریں گے۔ آپ سرکار فرما رہے ہیں کہ ابن مریم تم میں ضرور نازل ہوں گے۔ حاکم عادل کی صورت میں اور وہ ضرور صلیب کو توڑیں گے۔ ضرور خنزیر کو قتل کریں گے اور جوان اونٹنیوں کو کھلا چھوڑ دیں گے۔ محنت کا کوئی کام نہیں لیں گے۔ پھر آپس میں دشمنی' بغض اور حسد ختم ہو جائے گا۔

مشکل بات ہے لیکن حضورؐ کہتے ہیں تو سچ ہے کہ دشمنی' بغض اور حسد ختم ہو جائے گا۔ فرمایا' کیا حال ہوگا تم لوگوں کا اس وقت' جب عیسیٰؑ ابن مریم تم میں اتریں گے اور امام تم میں سے اپنا ہوگا۔ اور فرمایا' مجھے امید ہے کہ میری امت اپنے رب کی بارگاہ میں اس بات سے عاجز نہیں ہوگی کہ اسے نصف دن کی مہلت اور مل جائے۔ حضرت سعدؓ نے گزارش کی نصف یوم کتنا ہے' فرمایا' پانچ سو برس۔

جب حضرت عیسیٰؑ نزول فرمائیں گے تو ہر اچھا عیسائی' ہر اچھا مسلمان اور ہر اچھا یہودی حضرت عیسیٰؑ کو دیکھے گا' مانے گا اور تمام مذاہب اللہ اور رسول اللہؐ پر یقین لائیں گے۔ نزول عیسیٰؑ اور ہدیٰ پر یقین لائیں گے اور تمام جھوٹے خدا جڑواں بہنوں اور بھائیوں کے مالک' بڑے بڑے بحری بیڑوں کے مالک رسوائی کے عالم میں جائیں گے۔

بظاہر ابھی کچھ نصیب میں رسوائی اسلام ہے۔ کچھ جنگوں میں شکست ہے کیونکہ ان ہنگاموں کے باوجود ابھی مسلمان کا ضمیر خالصتاً خدا کی توجہات کے لیے آمادہ نہیں ہو پارہا مگر مجھے پورا پورا یقین ہے اور میں آپ کو اس بات کی بھی خبر دیتا چلوں کہ پاکستان وہ ملک ہے کہ حضورؐ نے فرمایا' مجھے ہند سے خوشبو آتی ہے۔ یہ خوشبو مال یا عبادات ظاہرہ کی نہیں ہے۔ خوشبو پھول میں ایک مخفی احساس کی طرح ہوتی ہے۔ یہ آپ کے ان افکار اور جذبوں کی ہے۔ آپ کی اس محبت کی ہے' جو رسول اللہؐ کے لیے آپ رکھتے ہیں۔ ہم وہ فاقہ کش ہیں' جو اسم گرامی محمدؐ پر جاں سپرد کرتے ہیں۔ اگر ہم بزدل ہی کیوں نہ ہوں' ہم اب بھی دو بنیاد پرستانہ آئیڈیاز کے مالک ہیں اور دنیا کی کوئی قوت پاکستان کے مسلمانوں سے یہ دو چیزیں نہیں چھین سکتی۔ ایک الوہیت یکتائی واحدنیت پروردگار اور دوسرا حب رسولؐ پر ایمان ہے۔ اسی لیے رسول اللہؐ نے فرمایا کہ ہند کے لوگ' مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ ہم جن مسلمانوں کو عرب ملکوں میں جانتے ہیں' وہ کبھی نیشنلسٹ اور کبھی

Marfat.com

کمیونسٹ ہو جاتے ہیں مگر یہاں کے مسلمانوں کی اکثر دھڑکنیں اپنے رسولؐ کے لیے دھڑکتی ہیں۔ یہ وہ دل ہے' جو اسلام کے ہر نقصان پر رنجیدہ اور اسلام کی ہر فتح پر تفاخر کا اظہار کرتا ہے۔

اب حالات اپنا فائنل راؤنڈ لینے میں زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ میرا اندازہ ہے اگرچہ میں وقت مقرر نہیں کر سکتا' مگر میرا دل یہ کہتا ہے کہ اس تمام تغیر اور تمام واقعات وحادثات کے وقوعے کو صرف سات سال کا عرصہ باقی ہے۔ واقعات بڑی جلدی جلدی ظہور پذیر ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اس سات سال کے عرصے میں وہ ڈرامہ' جو حضرت دانیال کو خواب میں دکھایا گیا اور اسکائیل نبی کو جس کی خبر دی گئی' وہ ان شاء اللہ بہت جلد اس آیت قرآن تک پہنچنے والا ہے کہ

ھو الذی ارسل رسوله بالھدی و دین الحق لیظھره علی الدین کله (پ ۲۸' س الصف' آیت ۹)

اسلام کی قبائلی تعبیر

ایک وقتی' مختصر اور مشتعل معاشرہ کسی بھی صورت میں اسلام کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ میں افغانی معاشرے کو اسلامی معاشرہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔ وہاں اس قسم کی حکومت کو میں کیسے اسلامی کہہ سکتا ہوں؟ مگر میرا دل بہرحال ان کے کلمہ گو ہونے کی وجہ سے دکھتا ہے۔ ایک کہے سنے مسلمان ملک کی تباہی ہمارے دل پر بہت گراں گزرتی ہے۔ اگرچہ میں ان کو اسلامی کلچر' مذہب' رویہ اور تہذیب کا کبھی بھی نمائندہ نہیں سمجھ سکتا' جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ کی آٹھ حدیثیں ہیں مسلم کی اوپر تلے کہ اعتدال اختیار کرو اور اگر مکمل اعتدال نہ ہو سکے تو اس کے قریب ترین رہو۔

افغانستان میں جس قسم کا کانسپٹ مذہب کا جاری تھا' وہ محض اسلام کی قبائلی تعبیر تھی۔ اپنے مقاصد کو سوٹ کرتے ہوئے مذہبی قوانین کو ہم اختیار نہیں کرتے۔ مجھے افسوس ہے کہ آج ایک مسلمان مغرب میں جاتا ہے اور ان کے کلچر سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ جب تک جوانی نہیں گزر جاتی' اس کا اخلاق پلٹنے کو نام نہیں لیتا۔ ایک ہمارا وہ وقت تھا کہ جب مسلمان کسی بیرون ملک جاتا تھا' اصحاب کے دور میں تو ایک ملک کو مسلمان کر کے پیچھے ہٹتا تھا۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسی شہادت ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک انڈونیشیا میں کوئی فوج اتری تھی؟ کوئی جنگ ہوئی' جس میں کوئی مسلمان اترے تھے' اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ہمارے کلچر میں اتنی خوبصورتی تھی' مسلمان کے انداز میں اتنا حسن اور ایسی جلوہ گری تھی کہ مضبوط سے مضبوط کلچر بھی اس سے متاثر ہو جاتا تھا۔

آج ہم دریوزہ گر مغرب اور فقیران مروت مغرب ہیں۔ ہم اپنی کشکول لیے ان سے کلچر اور اخلاق کی بھیک مانگتے ہیں۔ یہ سرے سے اسلام نہیں۔ مسلمانوں کے پاس صرف ایک اعتقاد رہ گیا ہے۔ اگر ان سے پوچھ لیا جائے کہ اللہ کتنے ہیں تو جھٹ سے جواب دیتے ہیں' ایک اور اس کو بھی ہم نہیں جانتے۔ آپ افغانستان کی بات کرتے ہیں' میں ساری دنیا کی بات کرتا ہوں۔ اقبال نے کہا تھا کہ ہر بحران اور مصیبت میں اسلام نے مسلمانوں کی مدد کی۔ مسلمانوں نے کبھی اسلام کی مدد نہیں کی۔

پھر یہ وہی نظریہ ہے جو بارہ اور چودہ سو سال سے مسلسل متحرک اور ایک فعال نظریہ رہا ہے۔ یہ نظریہ ایک ملک کی جنگ دوسرے ملک سے نہیں کراتا۔ یہ وہ نظریہ ہے جو چودہ سو سال سے ہر دوسرے نظریہ پر غالب رہا اس لیے کہ خداوند

کریم نے یہ لکھ دیا ہے کہ میں' میرے رسولؐ' میرے مومنین اور میری کتاب تمام ان لوگوں پر غالب رہیں گے جو اس کے خلاف جنگ کریں گے مگر جب کتاب نہ رہے گی' مومنین نہ رہیں گے' حرمت رسولؐ اور محبت پروردگار نہ رہے گی تو افغانستان کیا پاکستان کیا' سب ایک چٹیل بیابان ہیں' جہاں انسان نہیں بلکہ تھوہر کی فصل اگتی ہے۔

میں نے یہ لیکچر بالخصوص آلودہ خاطروں اور ان اداس لوگوں کے لیے دیا ہے جن کے دل ناامیدی' یاس اور اس قسم کے ہزاروں وساوس کی زد میں ہیں۔ جو یہ سوچتے تھے کہ کیا پتہ پھر کبھی اسلام سربرآور ہو کہ نہ ہو۔ اسلام ہر حال میں سربرآور ہوگا' چاہے مسلمان کتنی ہی پستی میں کیوں نہ گر جائیں' اس لیے کہ خدا کو اسلام کو فتح دینے کے لیے کسی مسلمان گروہ اور جماعت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ ایک شخص موسیٰ کی مدد سے تین سو سالہ رعمسیس دوم کی حکومت جابرانہ کو پلٹ سکتا ہے تو وہ کیا آپ کو فتح و نصرت عطا نہیں کر سکتا؟ اس کے لیے کیا مشکل ہے؟

مگر اپنی طرف سے کچھ کیے بغیر آپ آسمانوں سے معجزات کی توقع رکھیں' مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اللہ نے کہا' میرے بارے میں سستی نہ کرنا' غم نہ کرنا' تمہیں کچھ مشکلات ضرور آئیں گی مگر تم ہی غالب رہو گے۔ ان کنتم مومنین' اگر تم مومن ہو۔ مسئلہ تو سیدھا سا ہے کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ چاہے افغانستان میں ہوں یا پاکستان میں اور چاہے عربستان کے ریگزاروں میں ہوں۔ ہم نے اپنی چراگاہوں کو سنوارنا نہیں ہے۔ ہم نے دنیاوی معیشت کو استوار نہیں کرنا۔ بلکہ ہم نے اپنے بنیادی خدا کے کلچر کو درست کرنا ہے۔ ہم نے اپنے اللہ سے انس' محبت اور اخلاص کی رسم ڈالنی ہے۔ پھر دیکھو' وہ آپ کی طرف کیسے پلٹتا ہے۔ وہ کہتا ہے' تم ایک قدم آؤ گے' میں دس آؤں گا۔ تم تیز چلو گے' میں بھاگتا ہوا آؤں گا۔ یہ وعدۂ پروردگار ہے اور خدا سے سچا قول کس کا ہو سکتا ہے۔ مخالف دنیا ایک فاسقانہ تختی سے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے آپ سے پہلے کہہ دیا کہ ان کو دو کمپلیکس ہیں۔ مذہب اور دوسرا مانیٹری کمپلیکس۔ ان کی ان بلٹ اکانومی کے کوئی ذرائع نہیں ہیں۔ انہیں آپ سے وسائل کی ضرورت ہے۔ چاہے مروت سے لیں' چاہے جنگ سے لیں۔

گاہ بحیلہ می برد گاہ بزور می کشد

آپ پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے وہ ہر طریقہ استعمال کریں گے۔

دوسرا ان کا مدتوں کا صدیوں کا وہ کمپلیکس ہے جب 1099ء میں یروشلم کو فتح کرنے کے بعد جنگ منصورہ میں ان کے متعدد بادشاہ یورپ سلطان رکن الدین بیبرس کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور یہ آخری جنگ صلیب تھی۔ کیا اس کے بعد ان کو افسوس اور صدمہ ان کے خوابوں اور کتابوں اور ان کے ایک ایک حرف میں صلیب کی صورت میں جھلکتا نظر نہیں آتا؟ کیا اداسی امڈتی نظر نہیں آتی؟ کیا مسلمانوں سے ان کا رویہ آپ کو بتاتا نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی آپ کو فرسٹ ٹریڈ سٹیزن شمار نہیں کیا۔ یہ وہ لوگ نہیں ہیں جن کے اپنے کمپلیکسز کی یہ انتہا تھی کہ قرطبہ میں جب 80 ہزار حمام تھے اور ہر جگہ اسٹریٹ لائٹ موجود تھی' اس وقت فرانس کے شان الیزے میں گھٹنے گھٹنے پانی کھڑا ہوتا تھا اور اعلیٰ ترین خواتین فرانس بھی آدھی ٹانگوں تک پائینچے اتار کر اپنے گھروں کو جاتی تھیں۔ یہ وہ کلچر تھا۔ وہ ہمیں کلچر سکھا رہے ہیں۔ یہ وہی قوم ہے کہ شارلمین کے دربار میں جب بغداد کے خلیفہ کا تحفہ ایک گھڑی پہنچی' تو سارا دربار اس لیے اٹھ کے بھاگ گیا کہ یہ جادو کا کرشمہ لگتا تھا۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دفاع نہیں کر رہے۔ ہمیں ان کے خلاف کوئی ڈیفنس نہیں دینا۔ ہمیں بس اپنی روایت' اپنی محبت' اخلاق اور اپنے دستور کے مطابق اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ ان کی ترقی ہمیں مسحور نہیں کرتی بلکہ اپنی غربت اور اپنا زوال ہمیں رسوا کر رہا ہے۔ جس چیز کی آج ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم خدا کے ساتھ کیا تعلق قائم کریں اور اپنے مذہب کے حوالے سے کسی تعصب' ضد اور تنگ نظری سے ماورا اعتدال' مروت اور محبت کا رشتہ بحال کریں۔ یہی وہ لوگ ہیں' جو مہدی کے ساتھ ہوں گے۔ ہزاروں لوگوں کے دعویٰ مہدویت کو میں نے سپورٹ نہیں کیا مگر اس شخص کو میں کیسے روک سکتا ہوں' جیسے رسولؐ نے اس دنیا میں اذن باریابی دے دی ہو یا جسے خدا نے اس زمین میں اسلام کے احیاء اور تجدید کے لیے پیدا کیا ہو۔ اسے میں اور آپ کیسے روک سکتے ہیں؟

باقی رہی جھوٹوں کی بات' تو ہم میں سے اس وقت بھی کوئی مرزائی نہیں ہے۔ جھوٹوں کے گروہ کا اللہ کے فضل و کرم سے امت مسلمہ میں سٹنٹ زیادہ دیر چلا ہی نہیں ہے۔

ملا عمر کا خواب اور افغانستان

''ملا عمر کے جھوٹے خواب کی وجہ سے افغانستان میں تباہی آئی'' میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ ملا عمر کے نام کے ساتھ منسوب مسلسل اخباروں میں اس خواب کو ایڈورٹائز کیا گیا۔ اس کے علاوہ لبادۂ رسول کو مسلسل دکھایا گیا۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو ہمارے دشمنوں نے ملا عمر کی تحقیر کے طور پر نہیں معاذ اللہ! استغفر اللہ! توہین پیغمبر کے ضمن میں مسلسل دکھائیں۔ اگر مجھے غم کرنا ہو تو آپ مجھے بتائیں کہ میں ملا کا غم کروں یا توہین رسالت کا؟ اس خبر میں ساتھ یہ لفظ شامل کیے گئے کہ ملا عمر کو حکم ہوا کہ افغانستان میں جہاد کرے۔ امن اور حکومت قائم کرے اور دشمنوں سے لڑے۔ یہ خواب ایسے وقت میں آیا' جب یہ کام ہو چکا تھا اور وہ امریکہ سے لڑ رہا تھا۔ یہ خواب اس تائید میں آیا کہ ملا نہ صرف جہاد میں امریکہ کو شکست دیں گے' بلکہ فاتح ہوں گے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کی بنائی حکومت بھی خس وخاشاک کی طرح بہہ گئی۔ اب اس میں کوئی بھی مسلمان میرے سوا اس خواب کو کس ضمن میں رکھے گا؟ آپ کتنی تائید اس کی کریں گے اور کتنی تصدیق چاہیں گے؟

اسی سوال کا جزوی حصہ ہے کہ قرآن وحدیث کی رو سے یہ کیسے پتہ چلا کہ یہ جھوٹ ہے؟ یعنی خواب جھوٹ ہے۔ کتنی سادہ لوحی کی بات ہے۔ میں نے آپ کو دو خواب سنائے اور ان کی تعبیر آپ کو بتائی کہ اگلے دن نکلی۔ یہ خواب اپنی تعبیر کے بالکل برعکس ثابت ہوا۔ یعنی کیا عجب بات ہے کہ رسول اللہؐ بشارتِ فتح' اتحاد اور اتفاق دے رہے ہوں اور واقعہ یہ پیش آیا ہو کہ حکومت رہے نہ ملک رہے' نہ استحکام رہے بلکہ ہر چیز زار و نزار ہو جائے۔ ایک انگریزی اخبار نے بڑی عجیب وغریب ٹائٹل لگایا تھا کہ یہ تاریخ کے واحد امیر المومنین ہیں' جو مفرور ہیں۔ یہ میں نے نہیں کہا' یہ ایک مغربی تاریخ دان نے مسلم امہ پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ آپ ان باتوں کو برداشت کر سکتے ہیں مگر جس کو خدا اور رسولؐ سے انس اور محبت ہے جس کو امت اسلام کا مستقبل عزیز ہے جن کے دل ودماغ میں اسلام کی توقیر اور عزت ہے وہ یہ سوال کرنا چاہیں گے کہ ایسا کیوں ہوا؟ انہوں نے رسول اللہؐ کے خواب کو کیوں استعمال کیا؟

Marfat.com

اب اسی سوال کا تیسرا حصہ سنئے کہ اگر ملا عمر کے خواب کی بدولت افغانستان کی تباہی ہوگئی تو طاہر القادری صاحب کو تو خواب بیان کیے آٹھ سے دس سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ پھر پاکستان کی تباہی کیوں نہیں ہوئی اور اگر آپ کے بقول آنی ہے تو کب آئے گی؟ آپ عدالت کے فیصلے کے علاوہ قرآن وحدیث سے جواب دیں؟

اب اس کا میں کیا جواب دوں سرکار؟ اگر طاہر القادری امہ کے کسی معقول حصے کی نمائندگی نہیں کرتے نہ وہ امہ کے کسی بڑے حصے پر حق رکھتے ہیں' تو اس میں امہ بے چاری کا کیا قصور ہے؟ اگر اس میں سے کوئی آدمی دیوانگی شعور کے عالم میں نئے نئے دعوے کرے' تو اس میں میرا اور آپ کا کیا قصور ہے؟ مگر افغانستان میں صورت حال یہ ہے کہ ان کا رہنما' ان کا حکمران اور قیادت کرنے والا اور سب جس کو فالو کر رہے تھے' یہ اس کا دعویٰ تھا' اس لیے وہاں تو آفت کا آنا نہ آنا جائز تھا مگر ہمارے ہاں حضرت علامہ کی وہ حیثیت نہیں ہے کہ ہم ان کی خاطر خواہ مخواہ کولہو میں پس جائیں۔

ملا عمر' جواب در جواب

ہمارے معزز دوست کو جو بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ ہم نے صرف ان کو اسلامی حکومت کے حوالے سے اپنا نمائندہ ماننے سے انکار کیا' اس لیے اگر وہ افغانستان میں بحیثیت افغان مسلمان لیڈر کے لڑ رہے ہیں اور لڑ رہے تھے' تو ہمیں اس پر کوئی قطعاً کلام نہیں ہے۔ آغاز میں امیر المومنین کے ٹائٹل نے مجھے بہت دکھ دیا تھا' اس لیے کہ میرے میں مومنین کے ٹائٹل کا کوئی مسلم اس وقت دعویٰ کر سکتا تھا نہ اس وقت اس ٹائٹل کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ مسلم ہم ضرور اپنے آپ کو کہہ سکتے ہیں' مگر مومن ہم اپنے آپ کو کلیم اس لیے نہیں کر سکتے کہ یہ باطنی پرکھ ہے' جو صرف اور صرف اللہ کے پاس محفوظ ہے۔ اس دور میں جب ایک سادہ ساحل موجود ہو تو پرانے لوگوں کی طرح انہوں نے امیر المومنین کے ٹائٹل استعمال کر کے پہلی فقہی غلطی کی ہے' جو ان کی مذہبی امور کے متعلق فہم کے فقدان کو ظاہر کرتی ہے۔

دوسرا بہت سارے قوانین انہوں نے پہلے ہاتھ ہی ایسے بنا دیئے جس سے بجائے اسلام سے محبت پیدا ہونے کے ایسے لگتا تھا' جیسے اسلام ان پڑھ بچوں کے ہاتھ میں الجھ گیا ہے۔ مثال کے طور پر پگڑی کا کوئی مسئلہ قرآن میں نہیں ہے۔ میرے معزز دوست نے بھی اس وقت پگڑی نہیں پہنی ہوئی۔ جب انہوں نے پگڑی کو مذہب کا لازمی عنصر قرار دیا اور جس شخص نے بھولے سے بھی پگڑی اتاری' اسے میاں خوجی کی طرح چپت پڑ گئی۔ اسی طرح جو ٹیمیں ادھر فٹ بال کھیلنے گئی تھیں' وہ بے چارے نیکر پہن کر فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ان کے سر منڈوا دیئے۔ جوتیاں ماریں اور ان کی اتنی ذلت کی کہ آئندہ وہ کبھی فٹ بال کھیلنے کا نام نہیں لیں گے۔

سو مسلسل ایسی احمقانہ روایات کی بنیاد پڑ گئی۔ اگر ہم اس طرز عمل کو اسلام مانیں' تو پھر ملا عمر واقعی امیر المومنین ہیں مگر ان کا اسلامی فہم اتنا کم تھا کہ جب عورتوں کو پردے کا حکم دیا تو بوڑھی عورتوں کو جن کو نظر بھی نہیں آتا تھا' بازاروں میں دھکے کھانے کے لیے چھوڑ دیا اور قرآن کے اس حکم کو نظر انداز کیا کہ عورتیں بوڑھی ہو جائیں تو ان کو چھوڑ دو جیسے چاہیں گزر کریں۔ اسلام تو ہر چیز میں ہر جگہ کو ایک وقفہ دیتا ہے۔ اس کا ایک عہد رکھتا ہے۔ ہم نے یہ دیکھا کہ وہ ایک قبائلی مذہب کی نمائندگی کر رہے تھے مثلاً پگڑی قبائلی رواج ہے' اسلامی رواج نہیں ہے۔ اسی طرح شخص کا پاؤں کھولنا یا نہ کھولنا اس کے گھٹنے

Marfat.com

سے اوپر مرد کا ستر تو صرف ران ہے۔ ایک بہت بڑے امام حضرت معاذ بن جبل نے اس طرح سنن ابی داؤد کے مطابق نماز پڑھائی اور اس طرح کہ مسلم کے مطابق ان کا ستر بھی عریاں ہوتا تھا۔ پندرہ پندرہ گز کی شلوار قمیصوں سے تو مذہب قائم نہیں ہوتا۔

اگر ان کو اپنا مذہب بنانا تھا' قائم کرنا تھا' تو اسے مذہب کے حوالے سے نہ کرتے۔ اپنے آپ کو امیر المومنین کے حوالے سے متعارف نہ کرواتے۔ پھر ذرا ساد باؤ آیا' تو انہوں نے فوراً پیغمبر کو ملوث کرلیا۔ پیغمبر کو نہ صرف شامل کیا' بلکہ ملکی اور غیر ملکی میڈیا' بلکہ پاکستانی میڈیا میں انٹرویوز اور بات چیت ہورہی ہے۔ بیان دیئے جارہے ہیں کہ ملا کو ایک عام آدمی نہیں بنایا جارہا بلکہ انہیں ایک انتہائی وجود کے طور پر پیش کیا جارہا تھا۔ ملا دلیر ہے' شجاع ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کیا یا امریکیوں کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ ایک قبائلی سردار کے طور پر سراہتے ہیں' لیکن بطور ایک اسلامی حکمران نہیں۔

اسامہ' افغانستان' امریکہ

(ڈاکٹر عبدالجلیل خواجہ) ہمیں میڈیا سے پتہ چلا کہ اسامہ بن لادن کا کسی زمانے میں جب افغانستان میں روس کے خلاف جہاد ہورہا تھا' اس سارے جہاد کو منظم کرنے میں بڑا کردار تھا۔ اسے اپنے خاندان سے جو بزنس ایمپائر ورثے میں ملی' اس کی مزید توسیع کے لیے امریکی سی آئی اے نے معاونت کی جس سے اسے بہت سے نفع بخش کاروباروں میں سرمایہ کاری کرنے میں مدد ملی۔ سو اس کا مانیٹری سیٹ اپ اتنا وسعت اختیار کر گیا کہ امریکیوں کو بھی اس کا علم نہیں ہے۔ کہاں کہاں اس کی سرمایہ کاری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکیوں نے اس کی تمام تجارتی سرگرمیوں کی سہولتیں فراہم کیں اور پروموٹ کیا لیکن یہ کہنا کہ وہ اس وقت امریکی ایجنٹ ہے' مشکل ہے۔

لوگوں کے تجزیے کے مطابق اس جہاد کے دوران اس نے اتنی قربانی دی ہے۔ وہ اپنی آرام دہ زندگی چھوڑ کر جہاد میں شریک ہوا' تو اس کے پس منظر میں یہ ہے کہ امریکیوں نے وعدے کیے تھے کہ وہ افغانستان کو آباد کرنے میں مدد دیں گے یا فلسطین کا جو بنیادی ایشو ہے' اس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوں گے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تو اسامہ نے انتقام لیا اور یہ کہا کہ امریکہ نے بدعہدی کی۔ چنانچہ اس نے جہاد کا رخ امریکہ کی طرف موڑ دیا لیکن یہ کہنا کہ اسامہ امریکہ کا ایجنٹ ہے' میرے ذاتی خیال میں اس کی فتح یا اس کی شکست کو ہمیں اپنے ذمے نہیں لینا چاہیے۔ ہم جان چھڑانا چاہتے ہیں یہ کہہ کے کہ اسامہ تو امریکہ کا ایجنٹ تھا۔ سو جو کچھ ہوا' اس کا ذمہ دار اسامہ ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ ثابت کرنا نظری نہ عملی کسی طور پر ممکن نہیں ہے۔

دو مسلمان فریقوں میں جہاد

اگر افغانستان میں کفر سے لڑ رہے ہوتے' تو پھر ہم کہہ سکتے تھے کہ ان کی ریاست نے ایک پیغام جاری کیا مگر چونکہ طالبان نے جنگ کے ذریعے نہیں' بلکہ پیسے کے ذریعے شکست کھائی اور بڑے بڑے طالبان کے قریبی لیڈر بھی ڈالرز کے دھوئیں میں اڑ گئے تو اس سے دو باتوں کا احساس ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ طالبان اس سطح کے اپنے عوام میں مقبول نہ

Marfat.com

تھے جیسے کہ وہ شروع میں دکھائی دیتے تھے۔ دوسرا ان کے حریف بہت تھے اور قبائلی معاشرے پر استوار جو قبائلی علاقے تھے انہوں نے اپنے فوائد کو فوراً ہی طالبان کی حکومت سے علیحدہ کر لیا اور وہ دوسری جگہوں سے فوائد لینے کے چکر میں پڑ گئے۔

میں آپ سے جوابی سوال کرنا چاہتا ہوں' جو بڑا دلچسپ ہے کہ جناب محمد عمر نے اپنا ٹائٹل امیر المومنین رکھا تھا۔ جب مومنین کو دیکھا تو وہ ڈالر کے پرستار نکلے۔ میں یہ سوال کر سکتا ہوں کہ یہ کون سے مومن تھے اور کن لوگوں نے بلندیٔ اسلام کے لیے بہ روایت صحابہؓ جدوجہد کی اور کتنا آسان ہوا ایک غیر قوم کے لیے اتنی دور سے آ کر ان مسلمانوں میں افتراق اور انتشار کا بیج بونا اور ان کو ذلت و رسوائی سے ہمکنار کرنا۔ آخر کیوں؟

رسولؐ کا خواب اور حنفی مذہب

سوال یہ نہیں تھا جیسے میں نے اس سے پہلے جو خواب بتایا' وہ شافعی عالم کے لیے تھا۔ شیخ محمد بن عبدالرحمٰن الجزری شافعی عالم تھے۔ مگر حضورؐ کے اس خواب کے مطابق یہ ایک پیشین گوئی بن جاتی ہے کہ برصغیر میں حنفی فقہ کو عروج ہوا۔ پھیلا اور بڑھا۔ میں صرف آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ صداقت دیکھئے۔ حضرت امام ابو حنیفہ کی ایک صفت ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ ذہین فقیہہ تھے۔ وہ اتنے بڑے محدث یا مفسر نہ ہوں' مگر ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انسانی مسائل پر انتہائی گہری نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ایک انوکھی مربوط اور مضبوط فقہ مدون کی ہے' جو بڑھتے ہوئے اسلامی معاشرے کے لوگوں کے مسائل کو کور کرتی ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اگر رسول اللہؐ کو اپنے اس غلام سے زیادہ انس ہو تو عجیب نہیں لگتا۔

دجال اور مہدی کا وقت

دجال کا وقت آیا نہیں' بلکہ دجال اپنے وجود کو مشخص کر چکا ہے۔ حضرت دانیال سے لے کر جو واضح پیشینگوئیاں ہمیں ملی ہیں' اس کے مطابق یہ ایک سسٹم بھی ہے اور ایک فرد بھی ہے۔ بحیثیت ایک سسٹم اس کی نشاندہی ہو چکی ہے۔ دجال نے 40 برس تک زندہ رہنا ہے اور اس سے لڑنا ممکن نہیں ہے۔ اس کا اگلا نشان یہ ملتا ہے کہ وہ اصفہان سے خروج کرے گا۔ یہی لگتا ہے کہ اگلی بڑی جنگ کا خروج ایران پر حملہ سے ہوگا۔ اس سے مزید وضاحتیں ہمارے سامنے آئیں گی۔

لوگ حضرت امام مہدی کے تصور کو بڑی حیرت سے دیکھتے ہیں اور بڑا استعجاب توقع اور تلاش رکھتے ہیں۔ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ امام مہدی اتنی بڑی دنیا میں' اتنی بڑی مخلوقات اور متضاد نظریات کے لوگوں میں شاید اپنا تشخص نہ پا سکیں۔ میرے خیال کے مطابق دجال کے خروج اور مہدی کے ورود کی واضح ترین علامتوں میں سے ایک تیسری عالمی جنگ ہے' جو اس کا ایک مظہر ہوگی۔ تیسری عالمی جنگ میں بہت ساری زندگیاں اور چیزیں تباہ ہو جائیں گی۔ اس کے بعد بچے کھچے لوگوں میں مہدی کا نزول یا ورود ایک بڑی ہی ممکنہ بات لگتی ہے۔ اس وقت ہر آدمی اپنے مربی اور محسن کو ڈھونڈ رہا ہوگا تو مہدی کا ڈھونڈنا مشکل نہیں ہوگا۔

مگر اس وقت چھ ارب لوگوں میں اگر مہدی نمودار ہوں تو مسلمانوں میں اتنی گہری تقسیم کے باعث ممکن ہے

Marfat.com

انہیں تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بڑی جنگ اور تباہی کے بعد کچھ لوگ بچ جائیں اور وہ مسلمان اور عیسائی بھی ہوں۔ کسی نہ کسی پناہ دینے والے یا کسی کراماتی انسان کی تلاش میں ہوں اور اسے وقت میں امام مہدی کی پہچان مشکل نہ رہے۔

آپ نے سورۂ بقرہ میں مصور فی الارحام کا ذکر کیا ہے' تو دجال اگر خدا کی طرح کے کام انجام نہ دے گا تو وہ دجال کہلوانے کا مستحق نہیں ہوگا۔ جیسے دجال کے بارے میں ایک حدیث ہے کہ ایک گدھے پر سوار ہوگا جو زمین پر چلے گا اور آسمانوں میں اڑے گا بھی اور اس کے کان چالیس چالیس ہاتھ لمبے ہوں گے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اتنی تیزی انسانی ایجادات میں آئی ہے اور انسان اس قدر تیز رفتاری سے سائنسی میدان میں ترقی کر رہا ہے کہ یہ فنامنا ایک غیر معمولی نظام کی نشاندہی کر رہا ہے۔ بہت سارے لوگ امریکہ کو واقعی خدا سمجھتے ہیں۔ ان کے دعوے کو دیکھیں تو وہ کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی ایک عظیم ترین قوم ہے۔ آپ ایک بڑی قوم کے ایک عظیم فرد کی طرح اس کے شہری بن رہے ہیں۔ اس پر آپ کو فخر و مباہات ہونی چاہیے۔

ایک دوسری حدیث ہے کہ دجال کے ساتھ زیادہ تر بغیر شناخت کے بچے ہوں گے۔ یعنی وہ لوگ ہوں گے جن کے ماں باپ کا پتہ نہیں ہوگا۔ امریکہ میں اکثر نوجوان کہتے ہیں کہ انہیں اپنے والدین کا علم نہیں ہے۔ پھر دجال کے ساتھ زیادہ عورتیں ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حرص میں عورتیں مردوں سے نسبتاً زیادہ تیز ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق زمانے کے موڈ اور مزاج میں خواتین بدلتے رجحانات کو جلد اختیار کرتی ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام آثار ایک جدید ترین میکینکل' سائنٹفک معاشرے کے ہیں' جو اس وقت یورپ میں جاری ہے اور تمام اطلاعات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ وقت آنے والا نہیں بلکہ آ چکا ہے۔ اب کچھ دو چار اصلاحات تین سے پانچ برس میں قائم ہوں گی۔ مجھے امریکہ میں بہت سے امریکی نوجوان ملے جو اپنے ملک کو اس خوف سے چھوڑنا چاہتے تھے کہ ان کو ایک تیسری جنگ عظیم شروع ہونے کا خوف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنہیں ہم بہت زیادہ ترقی یافتہ سمجھتے ہیں' وہ بھی Occult کے اتنے ہی قائل ہو سکتے ہیں' جتنے کہ ہم ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں گوئبلز نے جرمنوں کی طرف سے نوسٹرڈیمس کی وہ پیش گوئیاں لاتعداد چھپوا کر جہازوں کے ذریعے یورپی ممالک میں پھیلائیں' جن میں یہ درج تھا کہ ایک بہت خوفناک انسان جنگ اٹھائے گا اور وہ یورپی ممالک کو تباہ کر دے گا۔ امریکیوں نے دیکھا کہ نوسٹرڈیمس کی کتاب میں ایک نئے ملک کا ذکر بھی ہے' جو ہٹلر کو شکست دے گا اور وہ رد مسیح کو فنا کرے گا' تو انہوں نے جواباً یہ پیش گوئی صدر روز ویلٹ کے حکم سے چھپوا کر جہازوں سے پھینکنی شروع کر دی۔ پروپیگنڈہ وار میں نوسٹرڈیمس دونوں طرف سے استعمال ہوا۔ اب بھی امریکی عوام متوقع ہیں کہ کوئی بڑی تباہی آنے والی ہے۔ اس تباہی سے پہلے پہلے ہم کسی محفوظ جگہ میں چلے جائیں۔

تباہی' خوف اور دہشت کا تصور ہر حال میں یورپی دنیا میں موجود ہے۔ ان کی سب سے بڑی نفسیاتی بے چینی تیسری جنگ عظیم کے حوالے سے ہے۔ خوف خوف کا باعث بنتا ہے۔ ان کے بہترین تجزیہ نگاروں کا تجزیہ ہے کہ اگر دنیا میں کوئی چیز امریکی بالادستی' عالمی امن اور ان کی پرآسائش زندگیوں کو معرض خطر میں ڈال سکتی ہے' تو وہ اسلام ہے۔ چنانچہ

Marfat.com

ان کے نزدیک اس سے پہلے کہ مسلمان کوئی کارروائی کریں' تم پہل کر جاؤ۔

چنانچہ ہر تیسرے چوتھے ہفتے ''جنگجو اسلام'' پر ان کے میگزینوں ''نیوز ویک'' اور ''ٹائم'' میں ضرور کچھ نہ کچھ چھپتا ہے۔ اس میں وہ اس خطرے کو مسلسل نمایاں کر رہے ہیں کہ ایک اور صلیبی جنگ وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ مسلمان یکجا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو کسی بھی قیمت پر طاقت کے حصول سے روکا جائے۔ ایک بڑی دلیل پاکستان کے خلاف یہی ہے۔ اسی طرح کی بڑی دلیل ایران کے خلاف بھی ہے' جو انٹرنیشنل میزائل بنانے کی راہ پر ہے۔ روس ایران کی بم بنانے میں مدد کر رہا ہے۔ فوری طور پر دجال کی توجہ عراق پر ہے۔ اس کے بعد ایران پر حملے سے چیزیں تیزی سے اور وسیع پیمانے پر پیش رفت کریں گی۔ اس سے مکمل تباہی کی ابتداء ہو جائے گی۔ اس لیے اب دجال کوئی تصوراتی شے نہیں رہی۔ یہ ممالک کا گروپ ہے۔ یہ تھاٹ کا سسٹم ہے اور اس کے ساتھ ایک بڑا انسانی فرد کسی وقت بھی اس قیامت کا باعث بن سکتا ہے۔

دجال کا ساتھ دینے والے

میرا خیال یہ ہے کہ سوال ہمارے پس منظر میں جلا نہیں پاتا۔ جب تک ہم یہ نہ دیکھیں کہ جن لوگوں نے ساتھ دیا ہے' ان کی مجبوریاں کیا تھیں؟ صورت حال کو دیکھنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات سینئر حاکم ایک تباہی اور اپنی قوم کی ذلت دیکھتا ہے' وہ اس سے گریز کرنے کے لیے کچھ ایسے قدم اٹھاتا ہے جو بظاہر ہمیں اچھے نہیں لگتے ہیں۔ اس میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ ضرور نقل کر دوں کہ ہر وہ کوشش' جو اسلام کو مزید کمزور اور اسے مزید رسوا کر دے' وہ اخلاقاً منع اور ممنوع ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جس عالم میں آپ کی کسی بڑی جنگ کے لیے تیاری نہیں تھی' لوگ تیار ہیں نہ آپ کے پاس ایسے اسباب مہیا ہیں۔ اگر اس عالم میں آپ جنگ چھیڑ دیتے ہیں' تو عقل و معرفت یا دنیاوی حقائق یہ کہتے ہیں کہ چلو اگر ہم بالکل نہ بھی مرتے تو ایک بہت بڑے بحران اور نقصان سے آشنا ہوتے۔

دوسرا میں پاکستان کے تناظر سے بات کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے خلاف بھی استعمال کرنے کے لیے ان کے پاس ایک بہت بڑی طاقت موجود تھی اور ہو سکتا ہے کہ ہماری سزا و جزا کے لیے یہ خداوند زمین' طلسم ہوشربا کا یہ جادوگر افراسیاب' ناکامیاب اور امریکہ ایسے ایسے ہتھیار استعمال کرتا کہ ہمارے پاس چوکھی لڑنے کے لیے شاید اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے بالا بھی میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ خدا جب اپنے دین کی مدد کرنا چاہتا ہے تو بعض اوقات ایک فاسق سے بھی کام لیتا ہے۔ یہ قول معتبر ہے اور صحیح ہے۔

یہود و ہنود کا وقتِ آخر

یہود و ہنود جیسے آپ دیکھ رہے ہیں' یہ بھی ایک پارٹی ہے' جو اللہ کے حکم سے اکٹھی تیار ہو رہی ہے اور ان کی تباہی بھی اکٹھی ہے۔ اللہ نے یہود پر تین دفعہ لعنت ڈال دی۔ نوبخت نصر کے زمانے میں' اس کے بعد اسے Cassidines نے تباہ کیا اور وہ بکھیر دیئے گئے۔ پہلی دفعہ اسرائیل نبی کی دعا سے اکٹھے ہوئے۔ دوسری مرتبہ یہ حضرت دانیال کی دعا سے اکٹھے ہوئے۔ اللہ نے کہا کہ تیسری مرتبہ میں تمہیں کوئی چانس نہیں دوں گا۔ یہودیوں نے اپنی تاریخ کا زیادہ تر وقت مسلمانوں

Marfat.com

کے علاقوں میں گزارا۔

انگریزی کا پہلا ناول Pamela ہے۔ اس میں یہودی ہیروئن باپ سے کہتی ہے کہ یورپ میں تو ہم کہیں بھی امن سے نہیں رہ سکتے۔ جہاں جاتے ہیں' ہمیں مار پڑتی ہے' تو ہم مراکش چلتے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں کے زیر تسلط علاقہ ہے۔ وہ بڑے باانصاف لوگ ہیں۔ وہیں ہمیں امن ملے گا چنانچہ تمام تر تاریخ میں یہ کم بخت مسلمان بادشاہوں کے زیر اثر امن پاتے رہے۔ ورنہ ان کو سارے ہی مارتے رہے۔ جب سے برٹش نے ان کو ادھر آباد کیا' تو حقیقت میں سب اللہ کی مشیت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔ یہ ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔

یہودیوں میں اب اصلی یہودی کوئی بھی نہیں۔ جیسے اصلی برطانوی کوئی نہیں جس قوم میں نسب صحیح نہ ہو' اس قوم میں نسلی تعصب بڑا ہوتا ہے۔ مثلاً برطانیہ کے آبادکار پہلے سیکسنز تھے۔ اینگلز نے ان پر چڑھائی کی۔ اب اینگلز نے بری طرح ان کو رگڑا کہ ان کی اصلی نسل ہی غائب ہوگئی۔ وارلارڈز کا ایک اصول تھا کہ ہر شادی کے قابل لڑکی شادی سے پہلے دو یا تین دن وارلارڈز کے ساتھ گزارے گی۔ اب بتائیے کہ پھر سیکسنز کی کیا نسل رہی تھی؟ اس پوری نسل کو گڈمڈ کر کے اینگلو سیکسنز کہا جانے لگا۔ وہ کچھ دیر چلی ہوگی کہ اوپر سے وائی کنگز نے حملہ کر دیا۔ وہ بھی دو ہی چیزوں کے رسیا تھے' چنانچہ برٹش کو دوبارہ اسی بحران سے گزرنا پڑا کہ ان کی اصلی نسل ہی غائب ہوگئی۔ جب وہ ہٹے' تو رومنز چڑھ کے اوپر آگئے۔ رومنز نے کچھ عرصہ غلبہ کیا اور ان کی نسل بگاڑ کر چلتے ہوئے۔ پھر فرنچ آئے' نارمنڈی کے نارمنز آئے۔ سو یہ اتنی بار پامال ہوئے کہ اب بمشکل ہی کسی برٹش کو اصل نسل کا کہہ سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے اپنے مورخین کہتے ہیں کہ برطانیہ کے سات بادشاہ کم از کم بے نسلے تھے۔

یہی حال یہود کا ہے۔ اگر آپ ان کی پوری تاریخ دیکھیں تو پوری تاریخ میں انہیں سزا ہی ملتی رہی۔ ان کو سزا یہ ملی کہ جوانوں کو قتل کر دو یستحیون نساء کم (پ ۹' س الاعراف' آیت ۱۴۱) اور لڑکیاں زندہ چھوڑ دو۔ یہ انہیں اللہ کی طرف سے سزا مل رہی تھی۔ غلامی' بچوں کا قتل اور یہ اتنے بدبخت تھے کہ اسکائیل نے خدا سے عرض کی' یہ تیرے محبوب پیغمبر کی قوم ہے۔ تو ان کو کیوں قتل کرتا ہے؟ اللہ نے کہا' اسکائیل اٹھو! میرے فرشتوں کے ساتھ ہیکل سلیمانی میں آؤ۔ ہیکل سلیمانی میں اس نے کہا' دیکھئے' یہ بدبخت کیا کر رہے ہیں؟ وہاں ایک بحث چھڑی تھی کہ اللہ کا بت کہاں بنایا جائے اور کیا بنایا جائے۔ یہوواہ بنایا جائے یا ایلیا بنایا جائے۔ یہ چاندی کا بنایا جائے یا سونے کا بنایا جائے تو اللہ نے کہا کہ انہوں نے میرے پاک استھانوں کو پلیدی سے ناپاک کیا ہے۔ میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ دوسری مرتبہ پھر یہ برباد ہوئے۔ نوبخت نصر کے زمانے میں۔ اب یہ بکھرے ہوئے تھے تو اس سے قرآنی آیت خطرے میں پڑی ہوئی تھی۔ اللہ یہ کہتا ہے کہ جب بھی یہ جمع ہوں گے' یہ وہی حرکتیں کریں گے اور پھر ہم ان کو ماریں گے۔ اس دفعہ حتمی ہے۔

نبی کریمؐ کا ارشاد ہے' یہ بہت بڑی جنگ ہے۔ اس جنگ میں یہود پہلے فتح پائیں گے اور دائمی قربانی کو معطل کیا جائے گا۔ یہ مکہ تک دخول کریں گے' اس کے بعد یہ مدینہ کو بڑھیں گے اور مدینہ کی حضورؐ نے فرمایا' ملائکہ حفاظت فرمائیں گے۔ ان کا رخ پلٹایا جائے گا اور شام میں جا کر آخری جنگ ہوگی' جس میں یہود صاف ہو جائیں گے اور اس حد تک کہ کوئی بچہ' کوئی بوڑھا' کوئی عورت نہیں بچے گی۔ مکمل طور پر ان کا صفایا ہو جائے گا۔ رسولؐ نے فرمایا' سوائے غرقد کے درخت کے

کیونکہ یہ یہود کا درخت ہے۔ یہ ان کا کچھ چھپالے گا۔ ادھران کی اورادھران کی تباہی مقدرات میں سے ہے۔

ضیاء الحق کی ایک بات مجھے بڑی پسند ہے۔ اس نے بھارت کوایک پیغام دیا۔ جب جنگ کی باتیں ہو رہی تھیں کہ تو معصومیت کی باتیں کرتا ہے مگر پاکستان نہ رہا' تو بھی اسلام رہے گا کیونکہ ہم خالی مسلمان نہیں ہیں مگر اگر تم مر گئے' تو ساتھ سارا ہندو بھی رخصت ہو جائے گا۔ چنانچہ اب مقدر کا رخ ہندوؤں کی طرف بھی ہے اور یہودیوں کی طرف بھی۔

جب اللہ میاں ان سے کہتا ہے کہ تم نے مجھ سے کون سا کاغذ لکھوالیا تھا کہ تم ساری یہ حرکتیں کرتے رہو گے اور میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟

چینی تہذیب کا رول

شروع کی جو روایت ہمارے ہاں چلتی آئی ہے' اس میں اسلام اور چینی تہذیب ایک ساتھ اٹھتے رہے۔ چین کی تہذیب میں جو سب سے بڑا شعوری فیصلہ ہے کہ وہ اپنے علاقے سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مانچو' تانگ' منگ جتنی بھی سلطنتیں ہو گزری ہیں' ان میں جو ہم نے وصف دیکھا ہے کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے پیغام اور سرحدوں کو آگے بڑھانے میں دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ جب سوشلزم کا پرچار ہوا اور روس بزعم خود اپنے انقلاب کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلانے کے لیے آگے بڑھا تو اگرچہ چین نے اسی انقلاب کو قبول کیا اور لینن ازم سے ماؤازم جاری ہوا مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے اس پیغام کو کسی دوسرے علاقے میں پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا اپنا اختیار کردہ تہدیدی رویہ ہمیشہ مسلمانوں کے حق میں رہا۔ جب مسلمان بلند ہوئے' تو اس کے ساتھ اس زمانے میں سب سے بڑی تہذیب جو پرورش پائی' وہ چینی تھی۔ میری رائے میں جب سے مسلمانوں کو زوال آیا' چینی بھی زوال پذیر ہو گئے۔ اب دوبارہ یہ دونوں تہذیبیں ایک ساتھ بن رہی ہیں۔

مگر فکر کی صرف ایک بات ہے کہ مسلمان اور عیسائی لڑ جھگڑ کے فیصلہ مسلمان اپنے حق میں کرا لیں گے۔ مگر چینی جس وقت یاجوج و ماجوج بن کر نکلیں گے' تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کو روک نہیں سکے گی۔ کیونکہ یاجوج و ماجوج کے فرانس کے میونسپلٹی ہال میں جو دو بت لگے ہوئے ہیں He Cog اور Me Cog کے نام سے' اس سے پتہ یہ لگتا ہے کہ یہ کوئی خارجی یا آسمانی نسلیں نہیں ہیں' بلکہ دنیاوی نسلیں ہیں۔ یہ حضرت نوح کے تیسرے بیٹے بنو یافث کی اولاد ہیں۔ یافث سے آپ سمجھیں گے کہ یہ بالکل وہی چینی نسلیں ہیں۔ یہ تعداد میں اس قدر زیادہ ہیں کہ زمین کی ہر چیز چٹ کر جاتے ہیں۔ وہ تو پاکستان سے کتے بھی منگوا کر کھا بیٹھے ہیں۔ وہ بلی چھوڑتے ہیں نہ بندر' نہ مینڈک۔ ہر وہ چیز جس کا نام سن کر ہمیں کراہت آتی ہے' ان کے معدے میں پہنچ چکی ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر یاجوج و ماجوج نہیں ہو سکتے۔

ظہور مہدی اور انڈیا

مہدی کے ظہور کا کوئی وقت نہیں ہے۔ مہدی ایک وقت کی ضرورت ہے۔ اس وقت جو سیناریو (Scenrio) بن رہے ہیں' یہ اتنا لمبا عرصہ نہیں چلیں گے۔ پہلی دفعہ مجھے حضور کی حدیث سمجھ میں آئی کہ زمانے چھوٹے اور مختصر ہو گئے

Marfat.com

ہیں۔ جو باتیں پہلے سو سال میں ہوتی تھیں' وہ اب پانچ' سات سال میں ہونے لگی ہیں۔ واقعات خزاں کے پتوں کی طرح گر رہے ہیں۔ پہلے زمانے اور آج میں فرق ہے کہ اس دور میں واقعات برپا ہونے میں بڑا وقت لیتے تھے۔ ایک آج ہوا ہے تو دوسرا سات برس بعد اور تیسرا دس برس بعد ہوتا تھا۔ اس وقت ایسا نہیں ہے۔ اب ہر روز آپ کے لیے ایک بڑی خبر ہے۔ حالات زمانے کی گرفت سے نکل چکے ہیں۔ وہ وقت کو ڈکٹیٹ کر رہے ہیں' جس سے بڑی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔

میں انڈیا کو اپنا حریف نہیں سمجھتا۔ انڈیا ہمیشہ متعدد ریاستوں کا مجموعہ رہا ہے۔ برصغیر کی ریاستوں کے اجتماع میں صرف ایک ریاست جو طاقتور ترین ہے' وہ پاکستان ہے۔ انڈیا کا ریاستی نظام کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔ کیا ان کو جوڑنے والی قوت انڈین نیشنلزم اور ہندوازم ہے؟ جس لمحے بھی انڈیا ہندوازم کو تج کرے گا' سب سے پہلے ہندوؤں میں ہندو ہی اس کے خلاف ہو جائیں گے۔ اچھوت جو عدم مساوات پر قطعاً سودا بازی کے لیے تیار نہیں۔ اپنے مذہب کے اندر رہتے ہوئے بھی وہ اس کو برداشت نہیں کرتے۔ اس کے بعد سکھ اور تامل گروہ بھی ہیں۔

انڈیا میں چلنے والی تحریکیں مذہب کے اندر بھی ہیں اور اس سے باہر بھی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی علاقائی قوم پرستانہ تحریکیں اس کے علاوہ ہیں۔ مذہب کے اندر چلنے والی تحریکوں میں سے ایک تحریک اسلام بمقابلہ ہندوازم ہے۔ دوسری ہندو بمقابلہ ہندوازم ہے۔ ان تمام اختلافات کے ساتھ ان کو مذہب یا نیشنلزم اکٹھا نہیں کرتا' بلکہ کلچر اکٹھا کرتا ہے۔ انڈین ایک اور یکساں کلچر کی وجہ سے اکٹھے ہیں۔ وہ اپنے سیاستدانوں اور بلکہ اپنے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی وجہ سے یکجا ہیں۔ یہ بڑی دلچسپ چیز ہے۔ انڈین کی نفسیات میں موسیقی اور ڈانس کی روایات ان کی شناخت ہیں۔ ہندوستانی اتنا اندرا گاندھی پر فخر نہیں کرتے' جتنا کہ دلیپ کمار' ایشوریا رائے اور اس طرح کے دوسرے لوگوں پہ فخر کرتے ہیں۔ ان کی ہم آہنگی اور مفاہمت قومی جغرافیے کو نہیں' بلکہ ان کے کلچر کو ثابت کر رہی ہے۔ آپ ان کے تمام ٹی وی اسٹیشن دیکھیں' تو ان کی ہم آہنگی اور مفاہمت جغرافیائی حدوں پر بنتی نظر نہیں آتی بلکہ ایک کلچر میں ڈوبی نظر آتی ہے۔

جہاں تک انڈیا کی اسلحہ سازی کا تعلق ہے' وہ ہم سے اتنی بھی ایڈوانس نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ انڈیا خوف کے مارے اپنی ہر چیز کی پبلسٹی میں مبالغہ آرائی کرتا ہے۔ جبکہ تمہاری ہر دریافت خفیہ رکھی جاتی ہے۔ مگر ہندوستان اپنے چھوٹے سے چھوٹے ہنر کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ وہ نمایاں اس لیے کرتا ہے کہ امریکہ اور دوسرے ممالک کے بقول انڈیا ان علاقوں میں ایک کلیدی رول ادا کر سکتا ہے۔ انڈیا چائنہ کے مقابلے میں کیسے رول ادا کر سکتا ہے؟ اگر ہم طاقت اور قوت کی بات کرتے ہیں' تو پھر چین انڈیا سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے تو سادہ سے شماریاتی پیمانے ہیں۔

چین کا کلچر انتہائی بہتر حالت میں ہے۔ چینی بنیادی طور پر بدھ ازم کے پیروکار ہیں۔ عرصہ دراز سے آپ چین کی تاریخ میں زبردستی قبضہ اور توسیع پسندی کا ایک واقعہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ وہ توسیع پسند نہیں' روس البتہ ہے۔ ہم چین پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ وہ ایک ایسا سود مند ترقی پسند ملک ہے' جس سے مشورہ لیا جا سکتا ہے' یا مدد مانگی جا سکتی ہے۔ کافر ہونے کے باوجود روائتی طور پر وہ زبردستی قبضہ کے قائل نہیں ہیں۔ چین کے برعکس انڈیا میں اتنا لالچ' طمع اور گھٹیا پن ہے کہ اشوکا کی فلاسفی میں صرف برصغیر نہیں' بلکہ ماوراء النہر تک زبردستی تسلط قائم کرنے کا ٹارگٹ دیا گیا ہے۔

Marfat.com

اگر ایران کی تاریخ کو بغور دیکھیں' تو پتہ چلتا ہے کہ دو ہزار سالہ جشن ایران میں ایرانیوں نے کبھی بھی ہندوستان والوں کو اتنا طاقتور نہیں سمجھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایرانیوں نے ہمیشہ ہندوستان پر حقیرانہ نظر ڈالی ہے۔ ان کا بھی احیا ہو رہا ہے۔ اس کے بعد ان کا حق ہے۔ مشرق وسطیٰ کے کئی علاقے ان کے قریب ہیں۔ اگر جنگ ہوتی ہے تو ہم چین' ایران حتیٰ کہ ترکی پر بھی اعتماد کر سکتے ہیں۔ یہ سب مل کر ہندوستان کو بالکل فنا کر دیں گے اور اگر ایٹمی جنگ چھڑ گئی' تو یہ بالکل نابود ہو جائیں گے۔

امریکہ اور مغرب کا کردار

دراصل امریکہ اور مغربی ملکوں کی نظر ہندوستان کی ایک بلین عوام کی مارکیٹ پر ہے۔ لیکن آپ امریکہ یا یورپین ممالک کو زیادہ عقل و ذہانت کا کریڈٹ نہیں دے سکتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ کبھی بھی سمجھدار نہیں رہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم ہم نے تو نہیں شروع کی۔ ہم ان جنگوں کے ہرگز بانی نہیں ہیں۔ جو آپ بتا رہے ہیں' وہ صرف اور صرف ٹیکنالوجی ہے۔ اتفاقاً سو دو سال کے دورانیہ میں کچھ ممالک ترقی کی طرف گامزن تھے اور کچھ تنزلی کی جانب رواں رہے۔ ان کے زمانہ نشاط میں علم نہیں بڑھا' بلکہ ٹیکنالوجی نے نمو پائی ہے۔ بجلی کی ایجاد کے بعد تمام تر کامیابیوں کا سہرا صرف تکنیکی آلات کے سر جاتا ہے۔ آپ نے کچھ نہیں کیا۔ ان کے پاس ذرائع ہیں۔ ان کے گھر گھر ورکشاپس ہیں اور آپ کے ایک شہر میں بھی نہیں ہے' جہاں بیٹھ کر کوئی کام کر لیا جائے۔

ہم نے کہوٹہ اور دوسری جگہوں پر ورکشاپس کا آغاز کر دیا ہے۔ ہماری ترقی کا حجاب کم ہو گیا ہے۔ پہلے سو سال کا تھا' پھر پچاس سال کا رہ گیا ہے۔ ایٹم بم بننے کے بعد ہماری اور ان کی ترقی کے درمیان بُعد صرف پانچ سال کا رہ گیا ہے۔

پاکستان بمقابلہ ہندو اسرائیل

میرا شروع سے خیال یہ ہے کہ ہم پاکستانی ہی مذہبی اعتبار سے اس قابل ہیں کہ وہ ہندوؤں اور اسرائیل سے لڑیں گے۔ مذہبی اور ذہنی شرائط پر ہمارے علاوہ کوئی پورا نہیں اترتا۔ باقی لوگ ذہنی اعتبار سے اتنے Committed نہیں ہیں۔ اگر ذہنی اعتبار سے ہیں' تو دلی اعتبار سے کمیٹڈ نہیں ہیں۔ ہم اصولی طور پر دو بنیادی رویے رکھتے ہیں۔ یہ دونوں رویے اکٹھے کیے جائیں' تو اسلام بنتا ہے۔

پہلی بات خدا کو ترجیح اول قرار دینا اور اس پر کوئی مفاہمت نہ کرنا اور دوسرا پیغمبر سے محبت اور اس پر کسی قسم کی مصالحت سے انکار ہے۔ یہ دو رویے ہی مسلمان کے بنیادی اجزائے ترکیبی ہیں۔ جب میں پوری دنیا پر نظر دوڑاتا ہوں اور مشرق وسطیٰ اور مختلف خطوں میں آباد لوگوں کے اسلام اور ثقافتی اسلام کا جائزہ لیتا ہوں' تو مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ سے اتنی گہری محبت رکھنے والے نہیں ہیں۔ وہ مذہبی لوگ ہیں اور بہت مذہبی لوگ ہیں۔ لیکن مذہب ان کا تعصب ہے' پسند اور محبت نہیں ہے۔

اس کے برعکس برصغیر کے لوگوں میں تمام مذہب اولیاء اللہ کے ذریعے آیا ہے۔ انہوں نے اس کی بنیاد محبت پر

Marfat.com

رکھی ہے۔ چاہے وہ چشتی تھے' قادری یا شیخ ہجویر۔ انہوں نے مذہب کی بنیاد خلوص اور محبت پر رکھی ہے۔ پھر انہوں نے لوگوں کو طریقہ سکھایا۔ ایسے مذہب صرف طریقہ ہی سکھاتے ہیں اور اس پر انحصار کرتے ہیں۔ چنانچہ میرا یہ پکا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم انڈیا کے خلاف لڑیں گے اور اسرائیل کے خلاف لڑیں گے۔ یہ دو پاکستانیوں کی جنگیں ہیں۔ اس حدیث میں بعینہٖ یہی بات کہی گئی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مسلمان جب ہند کی جنگ سے فارغ ہوں گے' تو وہ مہدی کے ساتھ شامل ہوں گے' جو اسرائیل کی جنگ کے لیے تیار ہوں گے۔ یہ اس وجہ سے ہوگا کہ مسلمان ایک دو تین دفعہ شکست کھا چکے ہوں گے۔ فتح پاکستانی مسلمانوں کی ہوگی کہ وہ جائیں گے اور مہدی کو مدد فراہم کریں گے۔

غزوۂ ہند کی حدیث

میں نے بہت تلاش کی' مجھے غزوہ ہند والی حدیث کی سند نہیں ملی۔ میری خواہش تھی کہ میں اس کی روشنی میں کچھ نہ کچھ آپ کو اطلاع بہم پہنچا سکوں' مگر بے پناہ کوشش کے باوجود غزوہ ہند کی کوئی سند نہ ڈاکٹر جلیل صاحب نے نکال کے دی نہ میرے پاس موجود تھی۔ مگر وہ حدیث' جو میں نے آپ کو نقل کی کہ مجھے ہند سے خوشبو آتی ہے' اس کی ہمیں کہیں نہ کہیں سے سند مل گئی ہے۔ میں ہندوستان کو اپنا حریف نہیں سمجھا اور ہندوستان کبھی بھی ہمارا حریف نہیں ہوگا۔ پاکستان کچھ عرصہ گزارنے کے بعد اگر اس کا کوئی کام باقی ہے' تو مغربی یلغار کے سامنے آئندہ تین سے پانچ برسوں میں پاکستان ایک سپر پاور بن کر کھڑا ہوگا اور اللہ کی عنایت اور مدد سے تمام مسلم سرمایہ پاکستان کو سپورٹ کرے گا۔

پاکستان کی مہارت' اس کا اسلحہ' اس کے رنگ روپ مسلمان ملکوں میں جائیں گے۔ اس توہین کے بعد' جو مسلمان ممالک کو ابھی یورپی ممالک سے ہوئی ہے' مسلم دنیا کی حمایت اور امداد کا بہاؤ پاکستان کی طرف ہوگا۔ کیونکہ ہمارے پاس وہ سب کچھ ہے' جس سے ہم عرب ملکوں کو تحفظ بھی دے سکتے ہیں' اسلحہ بھی دے سکتے ہیں اور کلچر بھی دے سکتے ہیں۔ انشاءاللہ العزیز پاکستان آئندہ آنے والے مشکل وقت میں مسلم امہ کی قیادت کرے گا۔

پاکستان اور بنگلہ دیش

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا تعلق اسلام سے نہیں' بلکہ اس کی جغرافیائی ضرورت تھی۔ جس قسم کی غلط فہمیاں دونوں مسلمان بھائیوں میں پیدا ہو رہی تھیں' وہ اتنی بڑھ گئی تھیں کہ شاید ان کا اکٹھا رہنا اسلام کے مفاد میں نہ ہوتا۔ پروردگار نے ان کو ضرور جدا کیا' مگر میرا ایک اور بھی یقین ہے کہ آنے والے سات سے دس برسوں میں ان کا اشتراک عمل دوبارہ وجود میں آ جائے گا اور انشاءاللہ العزیز کوئی صورت کنفیڈریشن کی نکل آئے گی۔ میرا نہیں خیال کہ انڈیا نے بنگلہ دیش سے وہ فوائد حاصل کر لیے ہوں' جو وہ چاہتا تھا۔ پاکستان توڑنا ایک بات ہے' مگر بنگلہ دیش سے وہ فوائد حاصل نہیں کر سکا' جو اصل میں بننے کی نیت تھی۔ ایک جنگ کے نتیجے میں ہم جدا ہوئے ہیں' دوسری جنگ کے نتیجے میں اکٹھے ہو جائیں گے۔

Marfat.com

Marfat.com

اُٹھتے ہیں حجاب آخر

زمان ومکاں اور انسان

پروردگارِ عالم نے زمانے کو تقسیم کا آلہ کہا ہے بلکہ عرب میں مشہور روایت ہے الوقت سیف قاطع کہ وقت ایک کاٹتی ہوئی تلوار ہے۔ مقدراتِ زمان ومکاں اور اس میں تمام رنگ وروغن اس تقسیمی اوقاتِ لمحات سے ہیں۔ ورنہ بحیثیت مجموعی تمام زندگی ایک عالم میں یکساں ہے۔ جب اس کو کاٹ دیا گیا' تو یہ زمانے میں ڈھل گئی اور پروردگار نے اسے ہمیشہ اپنے ساتھ منسوب کیا اور فرمایا کہ زماں اور مقدر کو برا مت کہو۔ زمانہ اور مقدر میں خود ہوں۔

تکنیکی اعتبار سے ہمارے پاس اس وقت زمان ومکاں کا جو فلسفہ ہے' میں نہیں کہتا کہ یہ قرآن سے لیا گیا ہے مگر قرآن ہی اس کی بنیادی اساس ہے۔ اگر کوئی ہم میں سے مسلمان ہوتا اور وہ نظریۂ اضافیت پر تحقیق کے ساتھ قرآن بھی پڑھ رہا ہوتا' تو وہ اس آیت سے ضرور زماں ومکاں کا نظریہ استنباط کر رہا ہوتا کہ والسماء بیننھا باید یھم ہم نے آسمانوں کو اپنے زور بازو سے بنایا' وانا لموسعون اور ہم انہیں وسیع تر کر رہے ہیں۔

کائنات اور مکاں کی رواں توسیع مذکورہ آیت سے پوری طرح واضح ہے۔ نظریۂ اضافیت یا آئن سٹائن کی کائنات میں وسعت کا نظریہ بہت پہلے سے قرآن حکیم میں بڑے سادہ سے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ تخلیق کار پیچیدگیاں نہیں جانتا۔ وہ بڑے عام سے اصول میں ان ساری چیزوں کو واضح کر دیتا ہے۔ جیسے اس نے یہ کہا کہ شروع میں ساری کائنات ایک تھی۔ پھر ہم نے اسے پھاڑ کر جدا کر دیا۔ اب زماں ومکاں پر بگ بینگ کے تھیسز اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

میری رائے میں زمانے میں مکاں ایک سجاوٹ کی سکیم ہے۔ زماں کے لحاظ سے جب اشیاء کو فاصلے عطا کیے گئے تو یہ فاصلے اللہ تعالیٰ نے داخلی سجاوٹ' حسن تناسب اور ان کی باہمی رگڑ اور ٹکراؤ کو بچانے کے لیے سیٹ کیے۔ ان فاصلوں کے درمیان کی جگہ کو ہم مکاں (Space) کہتے ہیں۔

اصل آلہ خدا کے ہاتھ میں صرف اور صرف زماں ہے اور مکاں اس کی آگہی ہے۔ اگر مکاں نہ ہوتو ہم زمانے

Marfat.com

سے آزاد نہ ہوتے۔ اگر مکاں ہے تو ہم زمانے سے آزاد ہیں۔ اگر نہیں ہے' تو ہم زمانے سے آزاد نہیں ہوتے۔ مکاں محدود ہے کیونکہ پروردگار نے اقطار السموات والارض کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مکاں کی ایک حد ہے۔ مکاں پر حد لگانے والا وقت ہے۔ مغرب میں جتنے بھی تصورات زمان ومکاں کے ہیں' وہ سارے کے سارے تجریدی ہیں۔ کوئی فرد اس نظام کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرتا۔ اگر خدا کی طرف سے دیکھا جائے تو دونوں آلاتی عناصر ہیں اور ہماری سمجھ میں بڑی آسانی سے آجاتے ہیں۔

یہ زمین جس پر زمان ومکاں کی کوئی قدر جاری ہے اور زمین پر جتنے قوانین ہیں' وہ زماں ومکان کے قوانین سے انحراف سے بنے ہیں کیونکہ اس جگہ مخصوص شرائط اور مخصوص صورتحال کا احیاء کر کے ان تمام قوانین کو معطل کرنا پڑا' جو باہر مکاں میں ہے۔ اس لیے کہ اس زمین پر رہتے ہوئے ہم زمان ومکاں کو کسی بھی تعلیمی حد میں قید نہیں کر سکتے' مگر جب ہم باہر نکلتے ہیں تو تمام زمانہ مکاں کو متعین کرتا ہے اور تمام مکاں سجاوٹی مقاصد (Decorative Purposes) کے لیے جگہوں اور فاصلوں کو متعین کرتا ہے اور رگڑ کو بچاتا ہے۔ یہ سہولت زمانہ کے لیے ہے۔

اگر آپ اس حدیث اقدس کو پڑھیں تو خدا کے نزدیک زمانہ زمانہ نہیں ہے' مقدر ہے۔ قسمت اور مقدر کو برا مت کہو' کیونکہ جب تم یہ کہہ رہے ہو کہ وقت برا ہے یا وقت اچھا ہے تو تم وقت کو نہیں بلکہ مجھے برا کہہ رہے ہو' اس لیے کہ میں نے اسے بنایا۔ میں نے اسے عطا کیا۔ یہ میرا زعم ہے کہ جتنی بھی اشیاء ہیں' وہ میں نے وقت میں رکھیں۔ کسی نے پوچھا تھا کہ عدم کیا ہے؟ وجود کیا ہے؟ تو میں نے اسے کہا کہ خداوند نے جو سوچا' وہ وجود ہے' جس کے بارے میں نہیں سوچا وہ عدم ہے۔

ایک صاحب کی وضاحت

اگر سائنسی اعتبار سے پوچھا جائے کہ زماں ومکاں کیا ہے' تو ایک جدید پی ایچ ڈی فرسٹ' اپنی کتاب Parallel Universe میں لکھتا ہے کہ زماں اور مکاں دو مختلف چیزیں نہیں' بلکہ یہ ایک ہی چیز اور وجود ہیں۔ آئین سٹائن نے اس کو Time Space کا نام دیا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ ہماری کائنات ٹائم سپیس میں ایک جھول ہے۔ ایک چھوٹا سا جھول' جس سے ہماری کائنات وجود میں آگئی۔

پھر زمان ومکاں میں حال' ماضی اور مستقبل مختلف چیزیں نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی چیز ہے اور چونکہ ہمیں وقت کی قید میں مقید کر دیا گیا ہے' اس لیے ہم ان میں سے صرف ایک حالت میں رہ سکتے ہیں۔ حال سے ماضی میں نہیں جا سکتے اور نہ حال سے مستقبل میں جا سکتے ہیں۔

وقت کے مختلف تصورات

وقت کے مختلف تصورات کے حوالے سے ایک جگہ اللہ نے فرمایا۔ میرا فرشتہ ایک دن اور رات میں اتنا چڑھتا ہے کہ اگر تم پچاس ہزار سال بھی بلند ہوتے ہو' تو تم اس کے برابر نہیں ہو سکتے۔ خداوند کریم نے کہیں بھی کوئی زیادہ سے

Marfat.com

زیادہ رفتار متعین نہیں کی۔ ایک جگہ حضورؐ نے فرمایا کہ دنیا کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ کہیں ایک رات کو ایک ہزار سال کی عبادت قرار دے دیا۔ کہیں ایک سال کو ایک دن کے برابر فرمایا۔ میں نے صرف یہی کہا ہے کہ کائنات کی تخلیق میں جو خداوند کریم نے پیمانہ استعمال کیا ہے' وہ فی ستۃ ایام کا کیا ہے۔ سائنس کے جدید ترین انکشافات اور اکتشافات کی روشنی میں ہمیں پتہ چلا ہے کہ خدا نے وہاں جو چھ دن Constellation کی عمر کے لیے استعمال کیے ہیں' وہ چھ ارب سال ہیں۔ لیڈ کرسٹل جب زمین میں یورنیم میں ڈھلتی ہے تو اس کو دو ارب سال لگتے ہیں۔ اسی سے سائنس دانوں نے زندگی کو متعین کیا ہے مگر جب زمین دو ارب سال کی ہے' جیسے اللہ نے کہا ہے کہ دو دن' تو آپ دیکھتے ہیں کہ سائنس کوئی نئی دریافت نہیں کر رہی ہے۔ وہ الہیاتی بیان کو سپورٹ کر رہی ہے۔ اسی طرح سورج سے علیحدگی اور زمین کے درمیان جو وقفہ گزرا ہے' یہ بھی دو ارب سال پر محیط ہے۔ گویا اس Constellation کی سیٹنگ میں چھ ارب سال لگ گئے۔

کائنات کی تخلیق

(پروفیسر فہیم) کائنات کی تخلیق کے بارے میں جدید تھیوری جو آئن سٹائن نے دی' وہ یہ تھی کہ کائنات کی تخلیق بگ بینگ سے ہوئی۔ کائنات سے پہلے آگ کا ایک بہت بڑا بال تھا۔ Per ten days minus 39 seconds کے انٹرول میں جو کچھ ہوا' ہم اس کے بارے میں نہیں جانتے۔ Per ten days minus 39 seconds کا جو انٹرول ہے' کہہ سکتے تھے کہ اس دور میں فزکس کے قوانین' جواب موجود ہیں' وجود میں آئے۔ اس کے بعد اس نے وسعت پذیر ہونا شروع کیا۔ اس سے لے کر اب تک کائنات پھیل رہی ہے۔

مزید تھیوری یہ ہے کہ کائنات اس وقت تک پھیلتی رہے گی' جس وقت تک اس کو پہلی طاقت توسیع کے تحت ملی ہے اور جو آخر میں کشش ثقل ہے' اس کی وجہ سے واپس سکڑے گی اور امکانات کا دائرہ کئی دفعہ وجود کرے گا۔

جہاں تک مکان کا تعلق ہے' یہ ایک ایسی جگہ ہے' جس میں چیزیں پڑی ہوتی ہیں۔ جب تک چیزیں نہ ہوں' اس وقت تک مکاں ہے ہی نہیں۔ مکاں میں جب تک ستارے اور سورج ہیں' اس وقت تک یہ مکان رہے گا۔ آپ ستاروں اور سورج کو نکال دیں' تو اس وقت سپیس رہے گی ہی نہیں۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) جس کو ہم مقام اور جگہ کہتے ہیں وہ مسئلہ الجھن کا شکار رہا ہے۔ اللہ نے اس کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ اللہ نور السموت والارض۔ جہاں جہاں بھی توانائی کا انجماد ہے' وہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو سپیس کہتے ہیں۔ اس موضوع پر ہمیں بہت ساری وضاحتیں حاصل تو نہیں ہیں' لیکن اس وقت جتنا کچھ تصدیق شدہ موقف سائنس دانوں نے بیان کیا ہے' اس کے مطابق ایک یکجا وجود اتنی شدت اور تیزی سے پھٹا کہ اس کے پھٹنے اور سرعت میں جو مقامات پیدا ہوئے' اس کو سپیس کہتے ہیں۔ یہ ذرات کے فاصلوں اور پیکیجز پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے۔ اس کو قرآن نے ان معنوں میں کہا کہ والسماء بنینھا بایدیھم وانا لموسعون ہم نے آسمانوں کو اپنے زور بازو سے بنایا اور ہم انہیں وسعت دے رہے ہیں۔

Marfat.com

حضور گرامی مرتبتؐ سے پوچھا گیا کہ دنیا کی تخلیق سے پہلے عرش کہاں تھا' فرمایا' اس سے پہلے اللہ کا عرش پانی پر تھا۔ اس کے بعد ایک سوال پوچھا گیا کہ اس پوری کائنات کی تخلیق سے پہلے خدا کہاں تھا؟ فرمایا' **كان في عما ما تحته هوا وما فوقه هوا.**

بہر حال بہت سے لفظ تھیسسز نہیں بنتے۔ ہم جن لفظوں کو استعمال کرتے ہیں ان کا سادہ ترین جواب یہ ہے کہ جب توسیع شروع ہوئی تو اس وسعت کے ساتھ جتنا جتنا ایریا اس نے متعین کیا وہی سپیس ہے۔ اس کی مزید وضاحت پروفیسر صاحب کریں گے۔

(پروفیسر نہیم) اس میں جو پہلے چیز موجود تھی' وہ فائر بال تھا۔ انتہائی کثیف مادہ توانائی کی شکل میں موجود تھا۔ وہ ایٹم نہ وہ مالیکیول تھے' بلکہ اس سے بھی چھوٹے ذرات تھے' جس پر مالیکیول اور ایٹم وجود نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح یہ مادے کا ایک حصہ تھا۔ اس کو ہم Quark کہتے ہیں۔ اس میں لپٹانز اور الیکٹرانز وغیرہ ہیں۔ اس وقت ایٹم بھی فائر بال میں موجود نہیں تھے۔ جب ہم زیرو سیکنڈ سے سٹارٹ کرتے ہیں' تو اس مختصر گھڑی میں کائنات میں جو کچھ ہوتا رہا' ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا تھا؟ کیونکہ فزکس کے تمام قوانین اسی وقفے کے عرصے میں بننے شروع ہوئے۔ اس سے پہلے ہمارے پاس قوانین ہی نہیں ہیں' جن کی بنیاد پر ہم نے قوانین معلوم کرنے ہیں۔ جب وہ موجود ہی نہیں ہیں' تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اس سے پہلے کیا تھا۔ فزکس اس کو جاننے کی کوشش میں ہے' جن کی بنیاد پر ہم نے قوانین معلوم کیے ہیں۔

قرآن یہ کہتا ہے' ہم نے کائنات کو وسعت دی۔ فزکس کے جدید نظریات کے مطابق جو لائٹ مختلف کہکشاؤں سے آ رہی ہیں' ان کا جب تجزیہ کرتے ہیں سپیکٹرم کی صورت میں' تو ہم یہ پاتے ہیں کہ ریڈ شفٹ کی وجہ سے روشنی کا ویولینگتھ بڑھتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ اب جب کائنات پھیلتی ہے تو کشش ثقل' جس کی وجہ سے ہم زمین کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی بھی اس پر قوت لگا رہی ہے۔ ایک وقت آئے گا جب کائنات کی توسیع پر کشش ثقل حاوی ہو جائے گی اور دوبارہ ساری کائنات سکڑنا شروع کرے گی۔ یہی قرآن کہتا ہے۔ سائنس دانوں کے کچھ مفروضات ہیں' جن کے بارے میں ہمارے پاس شواہد نہیں ہیں کہ کائنات دوبارہ واپس فائر بال بن جائے گی اور فائر بال پھر بگ بینگ کی صورت میں توسیع کرے گا۔

اب ایک Law of Entropy ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تمام اشیاء کی بے ترتیبی بڑھتی ہے جیسے کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا اور پھر وہ بد سے بدتر کی طرف لوٹ گیا۔ اسی طرح کائنات میں چیزیں بے ترتیبی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ ہر سسٹم ڈس آرڈر کی طرف پیش رفت کر رہا ہے۔ فزکس کا یہ قانون Entropy کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ جو دائرہ ہے' یعنی کائنات کی دوبارہ Formation کا' فائر بال بننے کا' وہ پھیلتا رہے گا اور آخر میں ایک وقت آئے گا کہ اس میں مزید توسیع نہیں ہوگی۔ اس کا عرصہ لامحدود ہو جائے گا۔ پھر لامحدود وقت موجود رہے گا۔ یہی قرآن کہتا ہے کہ اس میں جنت بھی ہوگی اور دوزخ بھی ہوگی اور یہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

Marfat.com

چھ دن یا کن فیکون

کن فیکون کا مطلب کائنات کا پیدا ہو جانا نہیں ہے بلکہ کن فیکون کا مطلب ہے ماسٹر پلان کا آغاز ہو جانا۔ اس سے پہلے پروردگار عالم نے ایک ماسٹر پلان تیار کیا جو کچھ بھی اس میں زندگی ارواح اور وفات کا ذکر ہونا تھا' وہ اس نے لوح محفوظ میں درج کیا اور اسے سیل کر دیا۔ لوح محفوظ دراصل ماسٹر پلان ہے۔ جب ماسٹر پلان میں ہر چیز درج ہو گئی تو اللہ نے اس کا آغاز کیا۔ اس آغاز کے وقت جو لفظ استعمال ہوا' وہ کن فیکون ہے۔

آج ہم میں اللہ نے اتنی عقل ضرور دی ہے کہ ہم پیمانۂ خداوند کو سمجھ سکیں۔ زمین کی تخلیق میں اللہ نے جو پیمانۂ وقت استعمال کیا ہے' وہ ایک دن ایک ارب سال کے برابر ہے کیونکہ اللہ کے پاس نسبتی وقت کی بہت تخصیص ہے۔ چنانچہ کسی وقت کسی دن کو ہزار سال کے برابر کہا اور کسی دن کو پچاس ہزار سال کے برابر قرار دیا جبکہ زمین کی تخلیق کا جو اس نے پیٹرن بنایا' اس میں ایک دن مساوی ایک ارب سال ہے۔

سائنس اور قیامت

قیامت کیا ہے اور سائنسی طور پر کیسے وقوع پذیر ہو گی؟ میں تو یہاں قیامت کا ذکر نہیں کر رہا۔ قیامت ابھی دور ہے۔ قیامت کوئی تقریباً ہزار سال کے فاصلے پر لگتی ہے۔ یہ پیشین گوئیاں اس بارے میں نہیں ہیں کہ قیامت آ رہی ہے۔ یہ پیشین گوئیاں دنیا کے خاتمے کے بارے میں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک دنیا کے انجام کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ دنیا استوار ہو گی اور بڑی خوبصورت دنیا ہو گی۔ اللہ کا دین غالب ہو گا۔ نسل انسان کو فروغ ملے گا۔ رفتہ رفتہ پھر بگاڑ پیدا ہو گا۔ حتیٰ کہ ہم قیامت تک پہنچیں گے۔ قیامت کا ذکر بڑی وضاحت سے قرآن حکیم میں اللہ میاں نے خود کیا ہے۔ فتنہ آخر زماں قیامت نہیں ہے۔ وہ فتنہ ہے ہی نہیں۔ فتنے اور قیامت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

زمین کے اپنے کناروں سے گھٹنے کے حوالے سے جہاں تک بات ہے' وہ اصل میں پرانی پیشین گوئی کو میں نے دہرایا اور کہا کہ سائنسی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ زمین اپنے کناروں سے گھٹ رہی ہے۔ یہ خالی اس پیشین گوئی کی بات نہیں تھی بلکہ قرآن حکیم نے کہا کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹا رہے ہیں۔ میں نے صرف اتفاق کی بات کی ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ پرانی تہذیبی معاشرت میں یہ عقیدہ تھا اور قرآن نے اس کی تصدیق کی اور حیرت کی بات ہے کہ دور حاضر میں ویسے ہی ہو رہا ہے۔

میٹافزکس پر اعتراض

کسی نے لفظ میٹافزکس (مابعد الطبیعات) پر اعتراض کیا تھا۔ ہر سبجیکٹ اور مذہب میں ایک میٹافزکس وجود ہے۔ میٹافزکس سے کبھی فلسفہ مراد نہیں لیا گیا۔ اس سے ہمیشہ یہ چیز مراد رہی ہے کہ وہ خیالات اور وہ تجسس' جس

Marfat.com

کے لیے طبیعاتی وجود موجود نہ ہوں۔ اس تمام عرصہ خدا' نبوت یہ تمام چیزیں میٹافزکس رہی ہیں۔ اس سے فلسفہ مراد نہیں ہے۔ مگر اس سے مراد وہ حقائق ہیں' جن کے ثبوت ہم مہیا نہ کریں۔ خارجی اور معروضی انداز میں ہم سب ان کو مابعدالطبیعات کہتے ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ سائیکالوجی اور پیراسائیکالوجی میں پہلے بہت بڑا فرق تھا' مگر جب سے سائیکالوجی سائنس ہوئی ہے' انسانی تحقیق کے ادارے' جو پہلے پیراسائیکالوجی کے تھے' اب سائیکالوجی کی حدود میں آ گئے ہیں۔ جوں جوں وسعت فکر انسان بڑھ رہی ہیں اور وہ احساسات' جذبات اور پس پردہ محرکات و خیالات میں زیادہ بڑھتا جا رہا ہے' اسی انداز سے اس کے تمام مابعدالطبیعاتی خیال طبیعاتی تصورات بن اور ٹوٹ رہے ہیں' اس کے آگے بھی کوئی ایسا جہاں شروع ہو جاتا ہے' جس پر پھر کسی لفظ پیراسائیکالوجی اور میٹافزکس کا گمان شروع ہو جاتا ہے۔

آج تک کسی مغربی مفکر اور فلاسفر نے میٹافزکس میں تجرید کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔ آپ کبھی خود کو نہیں جانتے۔ آپ نے ہمیشہ سچائی' نیکی اور انصاف کو خدا جانا' اقدار کو خدا بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ یہ ہم میں اور ان میں فرق ہے۔ ہم جب اپنے طبیعاتی جنگل سے نکلتے ہیں' تو ہم اصولی طور پر ایک حقیقی مابعدالطبیعاتی وجود کو جا رہے ہوتے ہیں اور یہ خود خدا ہوتا ہے۔ ایک سیارہ' جو فضائے بسیط میں بغیر کسی منزل کے بے نام و نشان منزل کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہو گی؟ اور وہ جو اپنی مستقل امید' ایک توقع اور ایک یقین کے ساتھ الگ متعینہ منزل کو جا رہا ہو۔ اس سے بڑا مابعدالطبیعاتی کون ہوگا؟ یہ ہے خدا اور دوسری چیزوں میں فرق۔ مغرب اور اسلام کے میٹافزکس میں فرق۔ ہم یقیناً ایک حقیقی میٹافزکس کے مالک ہیں۔ ہماری مابعدالطبیعات کی بھی طبیعات ہے ہماری جہت کی بھی ایک جہت ہے۔ ہمیں قرآن میں اللہ نے بتایا ہے کہ ایک اور جہت بھی ہے۔ وہ چوتھی جہت' جو مدتوں بعد انسان نے دریافت کی' وہ قرآن حکیم میں ہمیں کتنی آسانی سے اللہ نے دے دی۔

اس لیے کہ وہ خالق اور ماسٹر ہے۔ لارڈ برٹرینڈ رسل کا مشہور جملہ ہے کہ ہم صرف اشیاء کے درمیان تعلق کو جانتے ہیں' ہم اشیاء کی فطرت سے آگاہ نہیں۔ بیسویں صدی کے انجام پر' جسے دنیا کا سب سے بڑا فلاسفر اور ریاضی دان کہا جاتا ہے' بڑی بے بسی سے کہتا ہے کہ ہم صرف اشیاء کے باہمی تعلق کو جانتے ہیں۔ بس اتنا ہی۔ اس کے برعکس پندرہ سو برس پہلے محمد عربیؐ کی دعا دیکھئے کہ اے پروردگار! مجھے اشیاء کی فطرت کا علم دے۔ کتنا تضاد ہے۔ قرآن جنریشن کے لفظ کو پہلے دہراتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ جو میرا انکار کرتے ہیں' ان کا عالم یہ ہے مثلھم کمثل الذی استوقد نارا۔ وہ اندھیرے بیابان میں آگ دیکھنے کے عادی ہو گئے ہوتے ہیں' اس لیے مزید اندھیروں میں چلے جاتے ہیں۔ ان کی مثال ایسے ہے' جیسے طغیانیوں میں کشتی ہو۔ فوج در فوج اندھیرے آ رہے ہوں اور تھوڑی دیر کے لیے بجلی چمکے اور پھر وہ چلی جائے۔ ان کو امید پیدا ہو کہ رستہ مل جائے اور پھر مزید اندھیروں میں چلے جائیں۔

لارڈ رسل کی ایک اور تحریر نقل کرتا ہوں۔ اس نے کہا' میں ایک ایسے آدمی کی طرح ہوں' جو ایک وسیع و عریض سمندر میں ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا ہے اور اس کے پاس چپو بھی نہیں ہے۔ بعض دفعہ روشنی آتی ہے۔ میں تھوڑا سا رستہ

Marfat.com

دیکھ لیتا ہوں اور اس کے بعد دوبارہ مکمل تاریکی میں گم ہو جاتا ہوں۔ اندازہ کیجیے کہ وہ لفظ جو اللہ نے رسل کے بارے میں کہے اور جو خود رسل نے اپنے بارے میں کہے' ان میں کتنا فرق ہے؟ خدا کا نکل آنا کافی نہیں ہے۔ یہ علم الیقین ہے۔ جب آپ اس کی طرف چلنا شروع کرتے ہیں اور اس کے مشاہدات آپ کو ثابت کرتے ہیں' تو یہ عین الیقین ہے۔ جب آپ اس کے ساتھ رہنا پسند کریں گے تو یہ حق الیقین ہے۔

Marfat.com

کائنات میں حسن

کائنات میں حسن کا تصور بدصورتی کے بغیر نہیں ہے۔

چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

اگر آئینے کے ایک طرف زنگ نہ لگا ہوا ہو تو دوسرا شفاف نہیں ہو سکتا۔ آپ کو صورت نہیں دکھا سکتا اور چمک اور اجالا نہیں دے سکتا۔ بدصورتی اور خوبصورتی اپنے تیئں وجود نہیں رکھتی، بلکہ بہترین چیز، جو پروردگار نے زمانے میں تخلیق کی ہے، وہ اعتدال اور توازن ہے۔ تمام کائنات چونکہ توازن کے اصول پر کھڑی ہے اس لیے خوبصورتی اور بدصورتی بھی اعمال کے توازن کے لیے ضروری تھی۔ ان کو آپ کے ایک سکے کے دو رُخ کہہ سکتے ہیں کہ بدصورتی کے بغیر خوبصورتی کے اخلاقی مراتب نہ پیدا ہو سکتے۔ حدیث قدسی ہے کہ اللہ جمیل و یحب الجمال، خوبصورت تو صرف اللہ ہے اور خوبصورتی سے اس کا انس ہے جو خدا کی عادات اپنائے گا، وہی حسین ہے۔

کائنات اور داخلی بدی

کائنات اور انسان کے اندر کی بدی ایک ہی چیز ہے۔ بدی یہ ہے کہ انسان کے باطن کی اکائی اور اس کے بکھرے ہوئے اعصاب، خیالات اگر ایک مرکزی نظریے کے گرد گھومتے پھرتے ہیں، تو وہ مجتمع ہوتا ہے، طاقتور ہوتا ہے۔ جب اس بنیادی شخصی رجحان سے انسان ہٹتا جاتا ہے، رفع ہوتا ہے تو اس کی شخصیت میں بکھراؤ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام کہکشائیں ایک مرکز اور محور کے گرد گھومتی ہیں۔ اگر ان کا مرکز ثقل کسی وجہ سے ختم ہو جائے، تو یہ تمام کہکشائیں تباہ ہو جائیں، بکھر جائیں اور فضائے بسیط میں غائب ہو جائیں۔ انسان کی شخصیت کا بھی وہی اصول ہے اور کائنات کا بھی وہی اصول ہے۔ مجتمع ہونا، جمع ہونا اور ایک مرکزی محور کے گرد اپنے آپ کو قائم رکھنا۔

کائناتوں تک رسائی

اصل میں پوری کائنات کتاب حکیم سے کھلتی ہے۔ بہت ساری ایسی باتیں اور ایسے لوگ ہیں جو کتاب حکیم تک

Marfat.com

رسائی نہیں پا سکتے۔ بہت سارے پڑھنے والے آیاتِ الٰہی کے مفاہیم کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ عالم اسلام میں ہمارے جتنے بھی فکری اور علمی نظریات ابھرے ہیں' انہوں نے مبادیاتِ مذہب اور عملیات مذہب پر تو بہت زیادہ زور رکھا' لیکن وہ قرآن کی اعلیٰ ترین رسائی تک لوگوں کو لے جانے کی بجائے انہیں پیچھے لے جانے لگے۔ ہم بہت زیادہ اکیڈیمک ہو گئے ہیں اور ہماری عملیت پسندی میں جارحیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہم اس کے پیچھے نیات' خلوص' محبت اور رجوع الی اللہ کے بنیادی فلسفے سے غفلت برت رہے ہیں' جو عمل کی بنیاد ہے۔ عمل اس کی بنیاد نہیں ہے' بلکہ نیات عمل کی بنیاد ہیں۔

انما الاعمال بالنیات' رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی کام کے بارے میں تمہیں شبہ ہو کہ یہ اچھا ہے یا برا تو اسے دل پر رکھو۔ آج کا فلسفہ یہ ہے کہ ٹائم ہی نہیں ہے۔ ایک کمپیوٹر آج برین کا کام کرتا ہے مگر ایک برین' جس میں ہم نے ڈیٹا نہیں ڈالا ہوا' وہ کیا جواب دے گا۔ دماغ کی حیثیت ایک ڈیٹا کنٹرول اور ڈیٹا بیس کی ہے۔ اس میں صلاحیت یہ ہے کہ وہ مطلوب ڈیٹا سے اپنے نتائج بھی اخذ کر سکتا ہے۔ بدقسمتی سے کسی علامہ' اسلام' کسی سائیکالوجسٹ' پیراسائیکالوجسٹ یا کسی مفکر مشرق و مغرب نے ابھی تک قلبی علوم پر ریسرچ نہیں کی۔ ایک مغربی مفکر نے کہا ہے کہ دل سوچتا ہے اور اس نے یہ ثابت کیا کہ دل سے ایک احساس' جو دماغ کے کمپیوٹر تک پہنچتا ہے' وہ صرف آدھا سیکنڈ لیتا ہے۔ پھر دماغ اس پوری کیفیت کو رنگ و بو کی شکل و صورت عطا کرتا ہے۔ ہمارے دماغ میں اگر اللہ کی پہچان کے لیے ایک خصوصی ڈیٹا اور خصوصی نیات نہ ہوں' تو شاید ہم قرآن حکیم کی اس گہرائی تک نہیں جا سکتے' جس کے لیے ایک بالاتر انٹلیکچوئل معیار چاہیے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت امام زین العابدینؒ کے پاس ایک شخص سورۂ حدید کی وضاحت کے لیے گیا کہ ''اللہ جانتا ہے' جو زمینوں میں اور جو آسمانوں میں ہے۔ جو زمینوں سے آسمان کو بلند ہوتا ہے یا آسمانوں سے زمینوں کی طرف ڈھلتا ہے۔ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔'' پوچھا' اے امام المتقین' یہ بتا کہ اس کی تفسیر کیا ہے؟ ان کے پراسیس کیا ہیں؟ حضرت امام نے فرمایا' نزلت للمتقمقین فی آخر زمان کہ تم آج کے لوگ اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ زمانہ آخر میں' جو خدا پر غور و فکر اور غور و خوض کریں گے' جو لوگ خدا کی طرف متوجہ ہوں گے اور سمجھنے سوچنے کی کوشش کریں گے' ان کو یہ بات ضرور سمجھ میں آ جائے گی۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ بندۂ خدا کی نگاہ کہاں تک جاتی ہے۔

سب کے سامنے ہے کہ اب ایک سکائی لیب آسمان سے گزرتے ہوئے زمین کی چوٹی کی خبر لیتی ہے۔ اس وقت اس بندہ کی نگاہ میں یہ تھا کہ اتنی ترقی پذیری ہو جائے گی کہ زمین کے اندر اور زمین کے اوپر کی خبریں کوئی معجزانہ کام نہیں سمجھا جائے گا۔ یہ سائنسی آلات میں محیط ہو جائیں گی۔ ہم لوگوں کو آج کوئی تعجب نہیں ہے کہ اللہ زمین اور آسمانوں کی باتیں کیسے سنتا ہے۔ ہمارے سامنے وہ سائنسی آلات آ چکے ہیں۔ اگر انسان ایسے آلات تخلیق کر سکتا ہے' تو اللہ تو اللہ ہے۔ اس کی بات کرنا ہی محال ہے۔ زندگی اور آسمان اور دنیا اس وقت تک ہیں جب تک قرآن کی تمام آیات کا اثبات نہیں ہو جاتا۔ قرآن حکیم میں ابتدائے کائنات سے اس کے انجام تک اور ان دونوں فاصلوں کے درمیان انسان نے جو کچھ پانا ہے' اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

آخری مرتبہ جب میں باہر گیا' تو میں نے ایک شخص سے کہا کہ ہمارے نزدیک سات کائناتیں ہیں اور سات

Marfat.com

زمینیں بھی ہیں۔ آپ کو اس کائنات میں کسی دوسری زمین کا سراغ اس لیے نہیں مل رہا کہ آپ سات آسمانوں کا جو تصور لیے بیٹھے ہیں' جبکہ ہم سات بگ بینگ کے قائل ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے زین السماء الدنیا بمصابیع ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے سجایا۔ والشمس و ضحیٰھا اللہ نے سورج کو کہا۔

وہ سورج کو چراغ کہتا ہے' مگر بیرونِ آسمان اربوں کی تعداد میں سورج موجود ہیں۔ وہ ایک چراغ کی بات نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ میں نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے سجایا۔ اربوں کی تعداد میں کہکشائیں ہیں' جہاں سورج جل رہے ہیں۔ وہ آسمان دنیا کے ہیں۔ اس سے ورا بھی ہوسکتا ہے کئی ایسی کائناتیں ہوں جہاں سرے سے سورج وجود ہی نہ رکھتا ہو۔ جہاں شعائی منبع' شعاعیں اور روشنی بالکل مختلف ہو۔

حضور مرتبتؐ نے جب قرآن کی اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ جنت کی چوڑائی ساتوں آسمانوں اور زمین کی طوالت کے برابر ہے تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ جس جنت کا تصور ہمارے نزدیک ایک چھوٹے سے باغ کا ہے' وہ اللہ کے حساب و کتاب میں ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کی لمبائی اور چوڑائی کے برابر ہے۔ یہ کتنی بڑی گلیکسی ہوگی' جس کو ہم جنت کہتے ہیں۔ اصحاب نے عرض کیا' یارسول اللہؐ! اگر جنت اتنی بڑی ہے تو دوزخ کہاں ہوتی ہوگی؟ فرمایا' جب دن طلوع ہوتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔ غور طلب بات ہے۔ اس پر حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے جو رائے دی ہے' آپ کے جدید ترین علوم اس سے مطابقت رکھتے ہیں اس سے آگے نہیں جا سکتے۔

مثال کے طور پر ابھی تک ہم نے کوئی ایسی اعلیٰ ترین گلیکسی دریافت نہیں کی' جسے ہم جنت کہہ سکیں۔ مگر رسول اللہؐ نے جو مثال دی ہے' اس میں ایک مثال زمین کی ہے اور ایک کیفیت کی ہے۔ یعنی عرض اور چوڑائی اور لمبائی زمین کی ساخت اور اس کے حدود اربعہ میں ہے' مگر اس کی جس کیفیت کے بارے میں حضورؐ نے جواب دیا ہے' وہ حدود اربعہ نہیں' بلکہ کیفیت ہے۔ یعنی جب رات طلوع ہوتی ہے' تو دن کہاں ہوتا ہے؟ ذرا سا غور کریں' تو حضورؐ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری زمین پر دن اور رات سورج کی وجہ سے ہیں۔ رسول اللہؐ نے اشارتاً فرمایا کہ جنت اور دوزخ ایک ہی جگہ پر ہیں۔ جدھر جلال و جمالِ یزداں کی جھلک ہے' وہ جنت ہے اور جدھر سے خدا کا رخ پھر گیا ہے' وہ دوزخ ہے۔

ایک اور تکنیکی بات کہ آپ کی زمین جس پر آپ قائم ہیں اس کے اندر جا کے دیکھیں' تو آپ کو بالکل دوزخ کا سماں لگے گا۔ اسی طرح پگھلتے لاوے' جن کا ذکر آیا ہے' زقوم کے درخت میں نمک کے ستون اور بالکل وہی کچھ ہے جیسے قرآن حکیم میں اللہ نے Terrestrial World کا نقشہ بیان کیا ہے' بعینہٖ جہنم کا نقشہ ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جہنم ایک ایسی گلیکسی ہے' جو Under-Making ہے۔ جو ابھی تکمیل تک نہیں پہنچی اور جنت ایک ایسی گلیکسی ہے جو تکمیل تک پہنچ گئی ہے۔ وہ قدرتی طور پر جہنم کا بالائی حصہ ہے۔ جہنم اس کا زیریں حصہ ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں' جو ابھی تک سائنٹفک اعتبار سے ہمارے سامنے نہیں آئیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے فشن (Fission) اور فیوژن (Fusion) کی مثال تخت کی صورت میں دی ہے۔ آئن سٹائن کے Fission اور نظریۂ اضافیت کے مطابق ایٹم بم تو بن گیا' مگر اس کا دوسرا حصہ ابھی پورا نہیں ہوا' جسے ہم فیوژن کہتے ہیں۔ کیا حضرت انسان اس قابل ہو سکے گا کہ بکھری ہوئی توانائی کو دوبارہ کسی مادی شکل میں لے آئے؟ میں کہتا ہوں' یہ بالکل کھلا آپشن ہے کیونکہ خدا نے ایسا

Marfat.com

کہا ہے۔ آج سے کئی ہزار سال پہلے بغیر کسی سائنسی انسٹرومنٹ کی مدد کے ایک شخص نے تختِ سبا کو توانائی میں بدلا اور بجلی کی رفتار سے مملکت سلیمان میں لا کر دوبارہ اسے ڈھال دیا۔ انسانیت اس پوزیشن تک پہنچے گی اور وہ لوگ جو اس کو ایک خیالاتی اور تصوراتی بات سمجھتے ہیں وہ قرآن کی اس آیت کا ثبوت لائیں گے کہ ایسا ہو سکتا ہے اور ایسا ہوگا۔

تازہ ترین انکشاف کے مطابق امریکہ میں فیوژن کنفرم ہو چکا ہے۔ آپ نے بہت ساری موویز دیکھی ہوں گی جن میں سٹار ٹو سٹار حرکت اور مواصلات توانائی کے ذریعے نقل و حمل کرتی ہے۔ ایک آدمی کو توانائی میں تبدیل کیا گیا اور وہ دوسرے سٹار پر جا کر اپنے وجود میں دوبارہ ڈھل گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ مادہ اور توانائی کی تبدیلی اگلے برسوں میں کنفرم ہو جائے گی۔ اس وقت فیوژن کنفرم ہو چکی ہے اور اس کے تجربات آگے بڑھ رہے ہیں اور میرے خیال میں دو چار برسوں میں یہ آیات الٰہیہ اپنے مطالب کو پہنچیں گی۔

اسی طرح آیاتِ الٰہیہ کے مطابق ہی قرآن حکیم کی جب تک ہر متشابہ آیت محکم میں نہیں بدل جاتی' انسان زندہ ہے۔ جب یہ تمام آیات ثابت ہو جائیں گی اور اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی وقت دے دیا ہے تو پھر قیامت آ جائے گی۔ لیکن اسے ابھی کچھ اور کرنا ہے۔ آپ کو ایک دو سالوں میں ایسی دوسری زمین کے سگنل ملنے شروع ہو جائیں گے۔ مغرب میں تمام فزیشن اور حساب دان اس آپشن کو مانتے ہیں کہ ایک اور جگہ بھی زندگی ہو سکتی ہے۔ آخری مرتبہ جب میں امریکہ سے رخصت ہوا تو اس وقت ایک اور بگ بینگ دریافت ہو چکا تھا۔ اگر ہم سات زمینیں نہ بھی دریافت کر سکیں اور صرف ایک اور زمین کا بھی سراغ مل گیا تو یہ دوسری زمینوں کے وجود کا ایک اشارہ ہوگا اس لیے زندگی انسان قرآن کی ہر آیت کے استحکام تک ہے۔

میں کچھ باتوں میں عاجز ہوں مگر میں آپ کو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اچھا قرآن پڑھنے اور جاننے والا ہوتا تو قیامت تک جتنے واقعات آنے والے ہیں' ان کا نقشہ دے دیتا۔ سب کی باتیں لکھتا کیونکہ قرآن میں روزِ جزا تک کی ہر بات کا اندراج ہے۔ سائنس دانوں کے جتنے بھی دنیا کے خاتمے کے تخمینے ہیں' جیسے زمین کا کششِ ثقل سے نکل جانا' کسی اور ستارے کی کششِ ثقل کا اسے متاثر کرنا' اپنے بیلنس سے نکلنا' دوبارہ افلاک میں کلیتاً رجعت کا ہونا اور بگ بینگ کی طرف Retraction کا ہونا پہلے Centrifugal فورسز اور اب Centripetal کے تحت کائنات کے خاتمے کے عنوان قرآن بہت پہلے سے طے کر چکا ہے۔ قرآن نے لکھے نہیں ہیں' اللہ مقرر کر چکا ہے۔

معراج' سائنسی توجیہ

شب معراج کا واقعہ اس کے لیے کافی آسان ہے' جس نے Relative Times کے کانسپٹ پڑھے ہوں۔ چونکہ خدا قدرتِ کاملہ اور قدرتِ مطلقہ کا مالک ہے' اب یہ نہیں معلوم کہ اس نے کوانٹم کو استعمال کیا' یا Relativity کو۔ ایک واقعہ ہوا جس کی ایک طرح سے نہیں' پانچ چھ طرح سے وضاحت ممکن ہے۔ جیسے عطاء اللہ شاہ بخاری نے اسی واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا:

تیرے لونگ دا پیا لشکارا تے ہالیاں نے ہل ڈک لے

دور سے کسی ایسی صورت کو دیکھ کے یہ مصرعہ پڑھا گیا۔ اسی طرح جب رسول اللہؐ نے اوپر جانا تھا تو پوری

Marfat.com

کائنات کو منجمد کر دیا گیا۔ ممکن ہے کہ ارب ہا سال کا سفر ہوا ہو مگر چونکہ کائنات منجمد تھی اور اس میں کوئی حرکت نہیں تھی' اس لیے وقت شمار ہی نہیں ہوا' جس میں وہ گئے اور واپس آ گئے۔

دوسرا پہلو Compaction کا ہے کہ آپ کا ایک دو لمحے کا ٹائم وہاں اندازاً دو چار بلین کو کور کرتا ہو اور حقیقت میں یہ درست ہے۔ ارب اور کھرب ہا سال کی گلیکسیز کی زندگی کو جب ہم میں Compact کیا جائے' تو وہ ساٹھ ستر برس کی زندگی بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زندگی کے ساتھ نہ کوئی مناسبت ہے نہ کوئی قدر بنتی ہے۔ نہ یہ خیال ہمارے لیے خوش کن ہے کہ ہم اتنی بڑی کائنات میں اتنی سی زندگی لے کر راہ گزری کر رہے ہیں۔ وہاں بھی اسی قسم کا کانسپٹ ہے کہ ٹائم کو Relative کر دیا گیا ہے۔ ایک لمحہ یہاں کا وہاں کا اتنا طویل عرصہ بنتا ہے۔

مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ آپ پڑھے لکھے ہیں' سمجھ دار ہیں' کیا آپ واقعی مانتے ہیں کہ معراج ہوئی تھی۔ میں نے کہا' ہاں میں مانتا ہوں۔ اس نے کہا' کیا آپ کے پاس اس کی کوئی سائنسی توجیہ ہے؟ میں نے کہا' اس سے پہلے کہ میں جواب دوں' میں تجھ سے ایک سوال پوچھتا ہوں کہ کیا محمد رسول اللہؐ کو میں نے بھیجا تھا وہاں؟ کہنے لگا نہیں۔ میں نے کہا' تم نے بھیجا تھا؟ کہنے لگا نہیں۔ میں نے پوچھا' کیا کسی سول سروسز کے افسر نے بھیجا تھا؟ کہنے لگا نہیں۔ میں نے پوچھا کس نے بھیجا تھا؟ کہنے لگا' اللہ نے۔ تو میں نے اس سے کہا کہ کیا اللہ میں یہ طاقت ہے کہ نہیں کہ وہ اس طرح کسی کو بھیج سکتا ہے؟

اگر اللہ موجود ہے اور ہم اسے سب سے طاقتور' حاضر ناظر اور ہر وقت کا دیکھنے والا مانتے ہیں۔ خدا نے جو سوچا' وہ وجود ہو گیا۔ جو نہیں سوچا' وہ عدم ہے۔ اگر اللہ نے اپنے بندے کو وہاں تک لے جانے کا سوچا تو یہ حقیقت بن گیا۔ اگر نہ سوچتا' تو یہ واقعہ ہی نہ پیش آیا۔ سائنسی نظریات' نظریہ اضافیت اور زمان و مکاں کی ہر پہنچ سے اللہ کے رسول کی معراج کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ اس میں کوئی غیر یقینی پہلو نہیں ہے مگر یقین و اعتبار اسی میں ہے کہ اگر پروردگار عالم چاہے' تو وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

میں آپ کو تجویز دیتا ہوں' جس سے ساری بات واضح ہو جائے گی۔ فرض کریں' ایک فکر میں اللہ میاں بیٹھے یہ ساری باتیں سوچ رہا ہے' جو گزر رہی ہے۔ زندگی' موت' واقعات' پہاڑ سب کچھ سوچ رہا ہے۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے دفع کرو' کیا فضول سوچیں سوچ رہے ہو۔ تو پھر باقی کیا رہ جائے گا؟ اگر ہم غور کریں تو پوری کی پوری کائنات ایک واہمہ' ہیولا اور ایک تصور ہے۔ البتہ آپ کی اور خدا کی سوچ میں صرف ایک فرق ہے کہ آپ بھی اسی طرح سوچتے ہیں۔ جب آپ اٹھ جاتے ہیں تو تمام چیزیں فنا ہو جاتی ہیں۔ آپ بھی بیٹھے یہ منصوبہ بندی کر رہے ہیں کہ میں انگلینڈ گیا۔ مجھے مکان ملا۔ میرے بچے ہوئے۔ میں وہاں ٹھہرا۔ آپ ایسا سوچ سکتے ہیں مگر آپ میں اور خدا میں صرف یہ فرق ہے کہ آپ کا خیال ساتھ ہی عملی صورت میں نہیں ڈھلتا۔ مگر اللہ میں یہ قدرت ہے۔ وہ قدیر ہے' مرید اور متکلم ہے۔ قدرت والا اور ارادے والا ہے۔ کلام والا ہے۔ مصور اور باری ہے۔ وہ سوچتا جا رہا ہے' چیزیں ہو رہی ہیں۔ کسی دن وہ کہے' بہت ہو گیا۔ اسی دن تمام کائنات وجود سے عدم ہو جائے گی۔

شہاب ثاقب اور سائنس

سائنس اس کو کوئی اور مظہر نہیں کہتی بلکہ سائنس آسمان میں ٹوٹنے والی روشنیوں کے مقصد کو پانے میں ابھی تک

Marfat.com

کامیاب نہیں ہو سکی۔ سائنس کو اس سسٹم سے آگاہی نہیں ہے کہ اوپر ایسا بالائی نظام موجود ہے جو اچھی طرح سے حفاظت میں ہے۔ شہاب ثاقب اینٹی ایئر کرافٹ گن کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ہم بھی اینٹی ایئر کرافٹ گن استعمال کرتے ہیں۔ اس کے گولے بھی شہاب ثاقب کی طرح اپنے ٹارگٹ کو لپکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے جہاز بھی اڑتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے۔

ہمیں کائنات کے بالائی سسٹم کا پوری طرح علم نہیں ہے مگر زمین پر ایک حکومت کی طرح شہاب ثاقب بھی آسمانوں اور فضاؤں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ آسمان ایک بہت بڑی کائنات کی حفاظت میں ہے۔ یہاں تو آپ کو پتہ ہے کہ دشمن فلاں فلاں ہے۔ مگر فرض کیجیے شیاطین دنیا پر چڑھائی کر دیں اور وہ نظر نہ آئیں، تو آپ کی گنیں تو نہیں چل سکتیں مگر شیطان عالم بالا کو جاسوسی کے لیے چڑھتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک مقام سے دوسرے مقام تک صحراؤں اور سمندروں نے ہمیں تقسیم کر رکھا ہے اور ہماری سمندری حدود ہیں۔ وہاں ہو سکتا ہے، کسی گلیکسی کو کسی د، ، گلیکسی نے تحفظ فراہم کر رکھا ہو۔ جب کوئی شیطان اس گلیکسی کی حدود میں داخل ہوتا ہے، تو وہ اس پر شہاب بے انداز پھینکے جاتے ہوں۔

چاند کی سطح پر بہت شہاب گرتے ہیں۔ لگتا یہ ہے کہ جنات کی حدود پرواز چاند تک ہے۔ جنات تین ہزار سال کی زندگی رکھتے ہیں۔ یہ گیسز میں محدود بھی ہیں اور ایک قسم کا الیکٹرانک عنصر بھی ان کے پاس ہے۔ یہ شکل بدل لیتے ہیں۔ فضاؤں سے ہو سکتا ہے یہ بجلی کی رفتار سے گزرتے ہوں یا عالم بالا میں ان کی سیکرٹ سروسز موجود ہوں۔ اللہ کو اس کا بہتر علم ہے۔ اس لیے سائنس کے حوالے سے ہم اس پر اعتراض نہیں کر سکتے، کیونکہ سائنس کو اللہ کا پتہ ہے نہ اللہ کے نظام کا۔

خدا کی دید کا امکان

پروردگار نے بڑی وضاحت سے کہا کہ چونکہ تمہارے ویژن میں وہ انسٹرومنٹ نہیں جو مجھے دیکھ سکے، اس لیے تمہاری بصارت مجھے نہیں دیکھ سکتی، البتہ تمہاری بصیرت مجھے محسوس کر سکتی ہے۔ خدا کو ہوا کی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر آپ ہوا کو دیکھ سکیں تو خدا کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر ہوا نہ دکھائی دینے کے باوجود اپنے پورے اثرات رکھتی ہے۔ وہ محسوس ہوتی ہے۔ چھوئے، تو پتہ لگتا ہے۔ تیز چلے، تو صرصر ہے۔ ہولے چلے، تو بادِ نسیم ہے۔ بہت تند و تیز ہو، تو یہ طوفان ہے۔ انسان ہوا کے ہر انداز کو محسوس کر سکتا ہے۔ اسی طرح پروردگار کو بغیر نظر شہادت آپ محسوس بھی کر سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں مگر پوری کائنات کی تاریخ میں صرف ایک انسان نے بشری نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ واقعہ معراج میں رسول اللہؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہؐ نے شب معراج میں اپنے رب کو دیکھا اور یہی ایک ہمارے پاس اللہ کے ویژن کی شہادت مطلق موجود ہے مگر قیامت کے دن تو نہیں، البتہ جنت میں جمعہ کے روز سارے لوگ اپنے پروردگار کو دیکھ سکیں گے۔ خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد۔ پوچھا گیا، کہ یا رسول اللہؐ کیسے دیکھیں گے؟ فرمایا، جیسے ہلکے سے بادلوں کی اوٹ میں آپ چاند دیکھتے ہیں۔

Marfat.com

قصۂ ابلیس و آدم

آدم تو وہی تھا' جسے خدا نے پیدا کیا اور شیطان جانتا تھا کہ یہ اس کا حریف ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس میں جو عقل اللہ کی طرف سے عطا ہوئی' یہ منفی اثرات کو قبول کرتی ہے۔ بابا نے کہاں غلطی کی؟ حضرت کو یہ پتہ چلا کہ میں ان ابدی مخلوقات کے مابین ایک فنا ہونے والی مخلوق ہوں۔ آدمؑ کو یہ گمان ہوا کہ میرے اردگرد ابدی مخلوقات ہیں۔ ابدی ہیں' ازلی ہیں۔ میں تو مرنے والا ہوں۔ مجھے تو پیدا بھی کیا گیا ہے' تو مرنے کے لیے۔ شیطان نے اسے بالکل وہی لالچ دیا' جو آج بھی ہمارا سب سے بڑا لالچ ہے۔

اگر آپ کو وہ لالچ دیا جائے کہ کیا آپ ابدی زندگی کو پسند کرتے ہیں؟ ایسی زندگی جس کو کبھی موت نہ آئے۔ ایسی زندگی' جس میں لامتناہی زندگی موجود ہو۔ آپ فوراً ہاں کر دیں گے۔ بدقسمتی سے اسی خواہش کا آج بھی ہم شکار ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے حضرت آدمؑ کو اچھی طرح پتہ ہو کہ میں یہاں کا مقامی نہیں ہوں۔ ان مخلوقاتِ ازلیہ کے درمیان ایک ایسا شخص ہوں' جو ان سے میل نہیں کھاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین پر بھیجا۔ وہاں بھی لفظ مستقر استعمال کیا۔ یہ جگہ مستقل نہیں تھی' مگر موت کے بدلے اللہ نے انسان کو ایک ابدیت دی۔

ارضی و سماوی آدم

یہ غلط بات ہے کہ انسان اس وقت نہیں پیدا ہوا تھا۔ انسان تو بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ سے پوچھا گیا کہ انسان سے پہلے کیا تھا' فرمایا آدم۔ پوچھا' آدم سے پہلے کیا تھا؟ کہا' آدم اور کہا آدم کے آنے سے پہلے ستر ہزار آدم گزر چکے تھے۔ زمانے پر چار برفانی ادوار گزرے ہیں۔ علم الانسانیات کے ساتھ ان کا مطالعہ کریں تو خدا نے انسان کے بارے میں یہ نہیں کہا' جو آدم کے بارے میں کہا۔ بلکہ خدا نے کہا' هل اتی الی الانسان حین من الدھر لم یکن شی مذکورا' بلاشبہ انسان زمانے میں طویل عرصہ تک کوئی قابل ذکر شے نہ تھا۔

آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آدم بڑا قابل ذکر ہے۔ یہ کون ہے جو قابل ذکر نہیں ہے؟ یہ ایک سیل' حقیر

ذرّے یا کسی کائی کی حیثیت میں زمین کے کسی گوشے میں بے نقاب پڑا تھا۔ جیسے ول ڈیورانٹ کہتا ہے: ''Perhaps it was a form of very primitive life.'' جس نے فیصلہ کیا کہ حیاتِ ابدی کے لیے زندگی و موت قبول کرلوں اور پھر اس کی افزائش شروع ہوگئی۔ آدمؑ جو جنت میں ایک روحانی پروٹو ٹائپ بن رہا تھا' وہ مکمل ہوگیا۔ نیچے انسان زمین پر ایک جبلی مخلوق کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ اس اسٹیج پر آیا' جسے Homosapian کہتے ہیں۔

جب یہ اس مقام تک آیا' تو کچھ انسان سے مشابہ لگا۔ پھر یہ Homo-erectus اور Homo-hablis بنا۔ اب یہ انسان تو لگتا ہے مگر عادات انسانی ابھی بھی نہیں ہیں۔ شعور انسان ابھی پختہ نہیں ہوا کہ دماغ کا حجم کم ہے۔ تفکر سے ابھی اس کا واسطہ نہیں ہے۔ ایک خطا کی وجہ سے روحانی وجود میں ایک جسمانی کوالٹی آ گئی۔ روحانی وجود مادی خواہش رکھنے لگ گیا۔ پہلے آدم کو یہ آرزو نہیں تھی۔ جنت میں گھومتا پھرتا تھا۔ عیش و عشرت کا سماں تھا۔ سکون و ثبات تھا۔ جب اس نے خطا کی' تو خطا کے پراسینگ کے ساتھ ساتھ جسمانی خواہشات کی ایک منفی عقل پیدا ہونا شروع ہوئی۔ Fore-brain کے بالکل نیچے جنسی طلب کا حصہ ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ انگیٹھی نیچے ہے اور دھواں اوپر اٹھ رہا ہے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوگئی تو روحانی پروٹو ٹائپ میں خواہش نفس پیدا ہوگئی۔ تو کہا گیا: **اھبطو بعضکم لبعض عدو** ' جاؤ نیچے۔

ایک روحانی وجود کہاں جاتا ہے؟ روحانی وجود ایک مادی وجود میں گیا۔ برفانی دور کے بعد جس انسان کا ہمیں سراغ ملتا ہے' وہ ناگہاں سوچنے والا ہے۔ ایک عربی قول کے مطابق اللہ نے انسان کو بنایا۔ اس پر نظر کرتا رہا۔ پھر اچانک اس پر شعلہ برق گرا اور یہ سوچنے والا ہوگیا۔ ول ڈیورانٹ کہتا ہے کہ یہ جاہل انسان اسی طرح گھومتا پھرتا' قتل و غارت کرتا تھا۔ کہیں سے آیا۔ اس کے دماغ کی مقدار میں اضافہ ہوا اور اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ زمین پر دماغ کے بڑھنے اور اس کے سوچنے کا اور کوئی فلسفہ رائج الوقت نہیں ہے۔ جب کہ ہوا یہ تھا کہ روحانی اور مادی وجود کو آپس میں جوڑ دیا گیا۔ یہی آخر میں ہوتا ہے۔ وجود یہاں رہ جاتا ہے اور روحانی وجود آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں آنے کے لیے اسے مادی وجود چاہیے تھا۔

یہ وجود جو زمین پر حرکاتِ نازیبا فرما رہا تھا' وہ تھا جسے فرشتے دیکھ رہے تھے اور اسی کے بارے میں اللہ کے حضور اپنے اعتراضات پیش کر رہے تھے۔ **اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک** ' وہ اپنی تسبیح پر نازاں تھے۔ انہیں اپنی عبادات پر تفاخر تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ اللہ نے آخر کیا کیا؟ Homoerectus کو خلافت دے رہا ہے' جبکہ جنت کے روحانی وجود کو دنیا کے مادی وجود کے ساتھ ملا کر اسے خلافت ارضی کا مستحق ٹھہرایا گیا۔

حدیث یہ کہتی ہے کہ چالیس دن تک لوتھڑا ہے۔ پھر اس میں روحانی عناصر داخل ہوتے ہیں۔ سعادت' سخاوت اور رزق داخل ہوتا ہے۔ مائنڈ انٹر ہوتا ہے۔ اب بھی وہاں سے وجودِ روحانی زمین پر بنے ہوئے وجودِ مادیہ میں آ کے ڈھلتا ہے۔ اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ قرآن کے نقطہ نظر سے' نہ سائنسی نقطہ نظر ہی سے۔ آپ کو Accomplishment کا فارمولا چاہیے۔ بدقسمتی سے اس فارمولے کی طرف مذہبی رہنماؤں کی نظر نہیں جاتی اور سائنسی لوگوں کی نظر اس روحانی فارمولے پر نہیں گئی۔ آج تک دنیا کا کوئی مفکر حیاتیات یہ نہیں بتا سکا کہ انسان نے اچانک کیسے سوچنا شروع کر دیا۔

Marfat.com

مختلف رنگ اور نسلیں

ماشاء اللہ حواؑ کے رنگ کا تو کسی کو نہیں پتہ' وہ کیا تھا مگر ایک روایت موجود ہے (میں اس کو کنفرم نہیں کہتا کہ اس کے پیچھے کوئی تصدیق حاصل نہیں ہے۔ اسے اسرائیلیات میں سے کہہ سکتے ہیں) حضرت آدمؑ آسمان سے بہت بوڑھے اترے تھے۔ پھر جب وہ زمین میں آئے تو ناسازگار حالات کی وجہ سے کالے ہو گئے۔ اپنا رنگ ایک دفعہ پانی میں دیکھا اور سیاہی دیکھی تو رونے لگے۔ بارگاہِ الٰہی میں درخواست کی کہ یہ میرے گناہ کی سیاہی ہے۔ جبرئیل امین تشریف لائے اور کہنے لگے کہ نہیں یہ ناسازگار حالات کی وجہ سے آپ کا چہرہ ایسا ہو گیا ہے۔ اگر آپ ایامِ ابیض کے روزے رکھیں تو آپ پھر سفید ہو جائیں گے۔ چاند کی 13' 14' 15 کو ایامِ ابیض کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں تمام انبیاء ایامِ ابیض کے روزے رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جب وہ بوڑھے ہوں تو کوئی پیدا ہو گئے ہوں اور جب وہ کالے ہوں تو کوئی اور پیدا ہو گئے ہوں۔

تھوڑا بہت فرق حالات کا بھی ہے۔ رنگت کی تبدیلی کا قرآن میں اللہ نے ذکر کیا ہے اور کہا کہ یہ میں نے جان بوجھ کر اپنی حکمت سے تمہیں دیئے ہیں۔ اسی طرح اس نے پتھروں کے رنگوں کا ذکر کیا اور درختوں کا ذکر کیا۔ وہاں انسان کے رنگوں کا بھی ذکر اللہ نے پالیسی کے طور پر کیا ہے۔ ایک آدم سے پیدا ہونے کے باوجود ہم میں اور یورپ میں بہت سا فرق ہے۔

امانت کی بحث

خدا نے انسان میں ذہن کے موزوں استعمال کے سوا کبھی کوئی چیز نہیں کی' مگر آپ نے کیوں کا سوال کیا تو جہاں خدا نے یہ امانتِ عقل و شعور عطا کی' وہاں ایک فیصلہ بھی سنایا اور وہ یہ تھا انه کان ظلوماً جھولا' کہ یہ ظالم بھی ہے اور جاہل بھی۔ اس کا آسان مطلب یہ ہے کہ انسان نے اپنے آپ کو برتر خیال کیا اور اپنے کام کو کم تر گردانا۔ وہ قضیہ اب تک چلا آ رہا ہے۔ ہم بہت پر اعتماد تھے کہ ہم یہ کام کر لیں گے' مگر ہم بھی اپنے کام کو سرانجام دینے کے قابل نہیں رہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے کم تر ترجیحات کو زیادہ اہم کر دیا اور ترجیح اول کو کم اہم بنا دیا۔ ہم واپس جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت دو چار دس انسان نہیں' پوری امت ترجیح اول کے بارے میں کنفیوژن میں مبتلا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کس کی پرستش کر رہے ہیں اور کیا پرستش کر رہے ہیں؟ خدا ہمارے لیے ایک Taboo اور ایک علامت ہو گیا ہے۔ اساطیر الاولین میں سے ایک داستان بن گیا ہے۔ چنانچہ ہم قرآن اور تعلیمات رسولؐ کے اصل معانی کو زندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

انسان' ظالم اور جاہل

یہ سب خدا کا فیصلہ ہے۔ انسان کی اس عجلت کے حوالے سے' جس میں اس نے یہ خیال کیا کہ عقل کو حاصل کرنا

اور خدا کا اقرار و اعلان کرنا بڑی سادہ سی بات ہے۔ جب خدا کے حضور ہم کھڑے تھے اور اللہ نے پوچھا' الست بربکم' تمہارا رب کون ہے؟ قالو بلیٰ' ہم نے کہا' ہاں بالکل تو ہے۔ اس میں کیا تعجب کی بات ہے؟ سامنے تو ہم اسے مانیں گے۔ پھر اللہ نے ہمیں عقل و معرفت سے نوازا اور کہا' میں اشارہ بھی کروں گا اور پیغمبر بھی بھیجوں گا۔ کتاب بھی دوں گا۔ اولیاء اللہ سے بھی زمین خالی نہ ہوگی۔ بار بار تمہیں رجائیت بھی دیں گے اور تمہیں اس پیغام کی طرف بھی بلائیں گے۔

انسان نے کہا' یہ کوئی مشکل امر نہیں۔ اگر آپ کو رہنما مل جائے اور استاد بھی مل جائے اور ہر قدم پر آپ کو رہنمائی اور ہدایت کے مینار بھی روشن ملیں تو آپ کا دعویٰ ہو سکتا ہے کہ میرے لیے خدا کو جاننا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنے بنیادی کام کو بڑی آسانی سے پورا کرلوں گا۔ مگر اللہ کہتا ہے کہ انسان بدقسمت ہے کہ اس نے فیصلہ عجلت میں کیا' اس لیے کہ وہ تفاخر اور جاہ و منصب چاہتا تھا' اذقال ربک انی جاعل فی الارض خلیفہ' اس منصب کے بالمقابل خلافت اور عزت و جاہ کا منصب مل رہا ہے۔

مگر اس بندے نے خطرہ مول لیا۔ بجائے احتیاط کرنے کے کہ اس کے منفی اثرات کیا ہیں اور اس کا عذاب کیا ہے' اس نے جلدی کے تحت یہ فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔ خدا یہ کہتا ہے کہ ظلوماً جھولا کا مطلب قطعاً ظالم اور جاہل نہیں ہے۔ اللہ یہاں عالمانہ فیصلہ دیتا ہے کہ اس نے اپنے کام کو کم تر خیال کیا جبکہ خود کو برتر خیال کیا۔ اس تعبیر سے آپ کو واضح ہو جانا چاہیے کہ اس نے جس کام کو آسان سمجھا وہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو Over-estimate کیا۔ ان دونوں الفاظ کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے' جو ایک کام کرنے کا دعویٰ کرتا ہے' مگر جب وہ عملی طور پر اسے کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اسے نہیں کر سکتا۔ ہم اسے ظالم اور جاہل کہتے ہیں۔

Marfat.com

خدااور مردانِ کار

حدیث رسولؐ کے مطابق اس زمین پر کچھ افراد ہمیشہ ایسے موجود رہتے ہیں جو دنیا میں ایک کارساز رول ادا کرتے ہیں اوران کا نام رجال غیب ہے۔اسی طرح انڈیا میں بہت بڑے محدث نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے ایک حدیث پر اتفاق کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا' جب تم میں سے کوئی کھوجائے تو بلند آواز سے یہ کہے **اعیونني یعباد الله**' کہ اے اللہ کے بندو! میری مدد کو پہنچو۔

نواب صدیق حسن کا دیو بند اور اہل حدیث سکول سے تعلق واضح ہے۔ان کا کہنا ہے کہ میں ایک دفعہ دریائے نربدا کے پار اتر رہا تھا تو میری بہلی پانی میں پھنس گئی۔ جب کوئی طریقہ نہ رہا تو میں دریا کے پار اترا۔منہ اس طرف سے پھیرلیا اور بلند آواز میں کہا' اعیونني یعباد الله' جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو میری بہلی دریا کے پار تھی۔ میں اس کو عام آدمی نہیں سمجھتا۔ایک بہت بڑے محدث کا یہ اپنا بیان ہے کہ جس حدیث پر وہ شبہہ کر رہا تھا' اس پر ناطق ہے۔

اس دنیا و مافیہا میں خدا کی اتنی افواج ہیں اور اتنے قسم کے لائف پیٹرن ہیں' جن کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔مگر کچھ لوگ اسی زندگی میں ترفع پا کر خدا کے ہاں اتنے مقبول ہوجاتے ہیں جس طرح حضرت برناس کے بارے میں حدیث مشہور ہے کہ وہ قیامت تک زندہ اور پوشیدہ ہیں۔جب عیسیٰ آئیں گے تو برناس ان کے ساتھ ہوں گے۔اس وادی کا نام دیا گیا ہے۔ بعد میں حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت بھی موجود ہے کہ انہوں نے برناس سے ملاقات کی اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

میرے خیال میں یہ چوتھی اور پانچویں جہت کا سوال ہے۔جب ہم اس جہت میں داخل ہوتے ہیں جس میں روح ہے یا اس قسم کی باتیں ہیں' تو اس بارے میں پروردگار نے خود کہا' وما اوتیتم من العلم الا قلیلا' کہ ہم نے اس کا علم بہت مختصر لوگوں کو دیا ہے۔ ہمارے پاس ایک اور مثال موجود ہے۔ایک بڑے سائیکک کی مثال نقل کر رہا ہوں۔ میں کمرے کے اندر تھا اور بیچ میں چار دیواریں حائل تھیں۔اس نے مجھ سے کہا کہ باہر سے ایک شخص میری بات کرتے ہوئے گزر رہا ہے۔میرا ان باتوں پر کوئی اعتقاد نہیں۔ میں بڑا ہی معروضی اور سائنسی آدمی ہوں۔ میں باہر نکلا' تو میں نے ایک آدمی کو

دیکھا اور پوچھا' ابھی تم میں کیا بات ہو رہی تھی؟ اس نے بتایا کہ ہم اس بارے میں بات کر رہے تھے تو میری تصدیق ہو گئی۔

ایک بیماری اور مرض کا ارتکاز ESP کو ابھار دیتا ہے یعنی Extra Sensory Perceptions کو اجاگر کر دیتا ہے۔ ہم ESP اسی کو کہتے ہیں کہ جب انسانی سیل کی تمام طاقت مساوی چارج نہ لے اور ایک خصوصی کیفیات کے سیل پر زیادہ مرتکز ہو جائے تو وہ یہ کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ واقعات چونکہ متعین ہیں تو وہ ان کو پڑھ لیتے ہیں۔ ہزاروں ایسے واقعات ہیں جن میں ہماری یہ جہت ڈیل نہیں کرتی۔ میتھوڈسٹ اس لیے ان پر اعتبار نہیں کرتا کہ اس کی زندگی میں اسے اس کا تجربہ نہیں ہوا ہوتا' مگر تجربہ نہ ہونے سے فنامنا کا نہ ہونا ضروری نہیں ہے۔

فنامنا موجود ہوتا ہے۔ اس فنامنا کی قرآن مجید نے ہمیں خود خبر دی ہے کہ بعض واقعات اس روئے عالم پر ایسے ہوتے ہیں جو تمہارے قانون سے ملتے جلتے نہیں ہیں۔ جو اطلاق نہیں رکھتے۔ ہمیں سب سے پہلا واقعہ اس وقت ملتا ہے' جب حضرت سلیمان کے دربار میں ایک جن نے فزیکل انجیکٹو پاور کا اظہار کیا اور کہا کہ اے پیغمبر میں ملکہ بلقیس کا تخت لا سکتا ہوں۔ اگر آپ دوپہر تک مجلس میں رہیں' مگر دوسرے صاحب نے کہا' کہ اے نبی اللہ! اگر مجھے اجازت ہو تو میں پلک جھپکنے میں تخت لا سکتا ہوں۔ یہ حضرت آصف بن برخیہ تھے۔ قرآن نے اس کو نقل کیا ہے اور تخت اسی وجہ سے پلک جھپکنے میں آیا۔ میرے پاس اس کی وضاحت موجود ہے کہ وہ کس طرح آیا؟ مگر وہ وضاحت سائنٹفک' سہل اور قابل فہم ہے کہ وہ شخص جو خدا کے اتنا قریب تھا اس میں اتنی لاجسٹکس موجود تھیں۔

بہت سارے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اپنے زمانے کا بہت بڑا ولی تھا اور کوئی بھی ولی اپنے زمانے کے نبی پر شہادت بھی ہوتا ہے۔ اس نے اسم اعظم کی تلاوت سے اس تخت کو وہاں مادے سے توانائی میں تبدیل کیا اور توانائی کی صورت میں ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے تخت سفر کرتا ہوا حضرت سلیمانؑ کے دربار میں پلک جھپکنے کے اٹھارہویں ہزار حصے میں پہنچا۔

اگر آج دیکھا جائے تو انسانی ذہن بھی بالکل اسی قسم کے پراجیکٹس رکھتا ہے جتنے بھی نئے ہمارے پاس سائنسی امکانات آ رہے ہیں' فلمیں آ رہی ہیں' اس میں منتقلی کا عنصر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ آپ کبھی سٹار ٹریک مووِیز میں دیکھیں تو وہ اس تھیسز کو ممکن اور قابل فہم سمجھتے ہیں۔ اس پر عملی اعتبار سے تجربات بھی جاری ہیں اور شاید اس صدی کے دوسرے نصف میں انسان انرجی میں تبدیل ہو کر سفر کے قابل ہو سکے۔

فرشتوں کا کردار

فرشتوں کا رول وہی ہے' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یعنی کارکنان قضا و قدر۔ مگر ہر مخلوق کو اپنی حیثیت کا کم علم ہوتا ہے' جس کام میں ہم غیاب میں ہیں' وہ شہود میں ہیں جس کام میں وہ غیاب میں ہیں' کوئی اور شہود میں ہے۔ اس لیے مخلوق ارضی پر متمکن ملائکہ ہمارا بندوبست کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ جب لوح محفوظ سے اسکیم اترتی ہے' تو وہ ایک ہزار سال کی اترتی ہے۔ پھر ایک ہزار سال میں سے لوح محفوظ سے اتار کے ایک سو سال کا ٹکڑا آسمان اول کے ملائکہ کو دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جسے شب برات کہتے ہیں' یعنی شعبان کی پندرہویں کو ایک سال کا حساب ملائکہ دنیا کے حوالے کیا جاتا

Marfat.com

ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک شخص شادی کی تیاری کر رہا ہے اور ملائکہ کے حساب میں اس کی زندگی ختم ہے یا کوئی شخص حج کی تیاری کر رہا ہے اور اس کا حادثہ ہو جاتا ہے۔ یوں ایک سال کی سکیم اس شب کو اترتی ہے اور اس کی ہینڈلنگ ملائکہ کرتے ہیں۔
جیسے اللہ نے بدر میں کہا کہ ہم نے تمہیں پانچ ہزار ملائکہ سے مدد دی' مگر اگر ہم چاہتے تو اس کے بغیر بھی مدد کر سکتے تھے جو طریقہ کار اس نے وضع کیا' وہ یہی ہے کہ اس کے آگے کارکنان قضا و قدر اس کی دنیا کا بندوبست کریں۔ اسی طرح جب ہم سائنس دانوں پر غور کرتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ سائنس نے یہ کیا' وہ کیا۔ خدائے علیم وحکیم نے کچھ لوگوں کی محنت اور ان کی مسلسل جدوجہد کے باعث ان کو ایسی اصلاحات ذہن' ترجیحات دیں کہ وہ انسانوں کے بندوبست میں خدا کے حکم کے ساتھ ان کی معاونت کرتے ہیں۔ یہ بڑی بڑی ایجادات اور بڑی بڑی اصلاحات ہیں' جو چھ ارب انسانوں کے کام آ رہی ہیں۔ اگر آج سے سو سال پہلے کا زمانہ ہوتا' تو ایک موچی' درزی' کاریگر کام کر رہا ہوتا' تو آج کی وہ ضرورت پوری نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سائنس دانوں کا کمال نہیں ہے بلکہ وقت کی ضرورت کے ساتھ ساتھ وقف لوگوں' جنہوں نے ارتکاز کیا' خدا نے صلاحیت فکر کے ساتھ وہ حل بخشے' جو ایک بڑی دنیا کو چلانے میں ان کے ممد و معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ ہر جگہ قضا و قدر کے کارکن موجود ہیں۔

معین وقت میں کمی بیشی

موت کا وقت ضرور مقرر ہے مگر موت کا جو وقت مقرر ہے' اس کا امکان ایک ہزار سال تک بھی ہے۔ ہمیں اپنے مطالعہ سے اس بات کا علم ہے کہ حضرت آدمؑ کی عمر ہزار برس ہے اور قرآن حکیم میں حضرت نوحؑ کی عمر 950 سال لکھی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی موت ضرور مقرر ہے۔ اس میں آپ اپنی نگہداشت' کاوش اور جدوجہد سے کتنا اضافہ کر سکتے ہیں' کتنی کمی بیشی کر سکتے ہیں' اس میں ضرور کوئی گنجائش ہوگی مگر یہ کہنا کہ خدا کوئی وقت تبدیل نہیں کر سکتا' سراسر غلط ہے۔ اس لیے کہ وقت بھی اللہ کا ہے' موت بھی اللہ کی اور وقت مقررہ بھی اللہ کا ہے۔ اللہ نے خود قرآن حکیم میں یہ ارشاد فرمایا' جب ہم کسی آیت کو تبدیل کرتے ہیں وما ننسخ من ایۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا......تو ہم اس سے بہتر آیت دے دیتے ہیں۔
اگر ایک آیت ہمارے زوال کی وجہ سے ہم پر مسلط ہے اور ایک آیت ہماری ناقص دوا یا کم خوراکی یا برے آثار کی وجہ سے ہے تو جب اسباب کے ساتھ اس زندگی کا تعین ہوگا اور وہ بہتر ہو جائیں گے تو پروردگار اوسط عمر بھی بڑھا دیں گے۔ سب سے بڑا تخلیق کار تو یہ بھی کہتا ہے کہ میں چاہوں تو ایک آدھ دن میں تم سے نجات حاصل کر لوں' تم پر موت وارد کر دوں مگر میں نے فیصلہ کیا ہوا ہے کہ وقت مقررہ تک تمہیں ڈھیل دوں گا' چنانچہ وہ جو کچھ کرتا ہے' وہ اس کے اپنے موڈ کا پرتو ہوتا ہے۔ یہ اس کی اپنی ماہرانہ سرگرمی یا غیر سرگرمی پر منحصر ہے۔ ہماری سب کی زندگیوں کا دارومدار اسی پر ہے۔
حضورؐ فرماتے ہیں کہ دعا قضا کو بدل سکتی ہے۔ جب لوگ کسی کے لیے زندگی کی طوالت کی دعا کرتے ہیں' تو خدا اس کی زندگی بڑھا بھی دیتا ہے۔ جب کوئی چیز نہیں ہے تو کیا ہمیں خدا کو یہ کہنا چاہیے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا؟ کیا ہمیں خدا کو یہ کہنا چاہیے کہ آپ تو عمر بڑھا ہی نہیں سکتے؟

کسی کا سوال آیا کہ اس کے خیال میں خدا ماضی نہیں بدل سکتا۔ آپ کا خیال کیا ہے؟ تو میں نے اس سے صرف یہ کہا کہ اس کا جواب دو باتوں میں دیتا ہوں اور وہ یہ کہ ماضی، حال اور مستقبل سب ہمارے لیے ہیں، خدا کے لیے نہیں ہیں۔ خدا کے لیے کوئی ماضی نہیں ہے۔

دوسرا میں نے کہا کہ ماضی بدلے گا وہ، جب اس نے اسے ادھورا بنایا ہو۔ خدا کو ماضی بدلنے کی ضرورت کیا ہے؟ کیا اس نے کوئی کمی یا خامی چھوڑ دی تھی کہ اسے بنانے کے لیے واپس پلٹے؟ وہ کامل ہے اور اس سے کاملیت کا اخراج ہے۔ ماضی بھی اس نے ویسے ہی بنایا ہے۔ وہ اسے کیوں تبدیل کرے؟ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ سوال کہہ دے کہ کیا اللہ اپنے سے بڑا کوئی پتھر نہیں بنا سکتا۔ اس طرح کے بہت سے سوالات ہمارے رستے میں آتے ہیں، جو شاید الوہیت کے لیے ایک چیلنج ہوں، کم از کم میرے لیے نہیں ہیں۔ یہ براہ راست اللہ کے لیے چیلنج ہے کہ وہ زندگی کو تبدیل کر سکتا ہے کہ نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ بہت مرتبہ ایسا ہوا بھی ہے کہ زندگی بڑھی ہے۔

حضرت انس بن مالک اور حضرت سعد کی ہمارے پاس روایت موجود ہے۔ دونوں کیسوں میں اللہ کے رسولؐ نے ان کے لیے دعا کی اور انسؓ کے لیے خاص طور پر درازیٔ عمر کی دعا کی۔ انہوں نے بڑی لمبی عمر پائی۔ دو ہتوں پوتوں کے وارث ہوئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ان کی درازیٔ عمر کی وجہ رسول کی دعا تھی۔

علم نجوم اور علم ہیئت

حضور گرامی مرتبت نے فرمایا کہ نجوم ایک پیغمبر کو عطا کیا گیا جس کی لائن اس سے مل جائے، وہ ٹھیک ہے۔ نجوم ایک سہولت انسان تھی۔ اس وقت کے لوگوں نے اسے انسانی ہدایت و رہنمائی کے لیے سیکھا۔ اس کا مقصد عادت کو منضبط کرنا اور اس کو قید میں لانا ہے۔ ستارے مسلسل ایک روٹین کے ساتھ چلتے ہیں۔ لوگوں نے مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ مریخ، مشتری کی جگہ پہنچے تو یہ واقعات اور موسم میں یہ ردّ و بدل ہوتا ہے اور اگر مشتری مریخ کی جگہ، یا زہرہ عطارد کی جگہ پہنچے تو صورت حال میں یہ تبدیلی آتی ہے۔ ایک سرکل سا بنا ہوا ہے، جیسے کوئی آسمانی گھڑی ہو۔ ان کے ہیر پھیر میں جس وقت میں جو کیفیتیں محسوس کیں، انہیں لوگوں نے نوٹ کیا۔ یہ ماقبل سائنس تھیسز اور حساب کتاب ہے جو کبھی ٹھیک بھی نکلتا ہے مگر اس کا مقدر کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔

اس لیے حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے یہ کہا کہ ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی، وہ مردود ہے اور جس نے یہ کہا کہ اللہ کی وجہ سے ہوئی، وہ سچا ہے۔ نجوم کی حیثیت ایک علمی تحقیق کے طور پر اب بھی موجود ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے کہا کہ خدا دو قسم کے علوم میں سے اس علم کو رکھ چھوڑتا ہے، جس میں انسان کی بہتری ہو۔ اسٹرالوجی اور اسٹرانومی اکٹھے تھے۔ ان میں تقسیم ہوئی۔ اللہ نے جس میں انسان کی فلاح و بہبود دیکھی، وہ اسٹرانومی (علم ہیئت) تھا۔ اس کو عزت اور ترقی بخشی اور علم نجوم اب اندھیری راتوں میں امید و یاس و شیطانی وساوس کا مرکز بن کر رہ گیا ہے۔

اجرامِ فلکی کا انسانی زندگی پر اثر صرف شعاعی اثرات کی حد تک ہے۔ وہ آپ کا مقدر نہیں ہیں۔ چاند اور باقی ستاروں سے بھی ایسی شعاعیں نکلتی ہوں۔ الفا، بیٹا، گاما ریز، ضرور آپ پر اثر انداز ہوں گی، مگر ان کا مقدر سے کوئی تعلق

نہیں۔ جس انسان نے یہ گمان کیا کہ ستارہ اس پر حکمران ہے‘ اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔ البتہ آپ ان میں علمی حیثیت سے دلچسپی لے سکتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ کس قسم کی گیسیں ہیں اور کیا امکانات ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ نے ان کو انگل پچو والے خناس کا نام دیا ہے۔ اس سے زیادہ ان کی کچھ اہمیت نہیں۔

ماورائی قوتیں‘ پیشین گوئی

انسان ماورائی قوتوں سے نہیں‘ پیشین گوئی نارمل قوتوں سے کر سکتا ہے۔ ماورائی قوتیں وجود نہیں رکھتیں۔ ماورائی قوتیں ابنارمل اور سب نارمل کیٹیگریز میں چلی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ جو اقتصادیات کے ماہر ہوتے ہیں‘ جو رجحانات اور امکانات پر نگاہ رکھ سکتے ہیں‘ وہ آسانی سے کسی مارکیٹ کے عروج و زوال کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں نے‘ جنہوں نے تاریخ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے‘ وہ بڑی آسانی سے کسی قوم کے عروج و زوال کی وہ ساعتیں گن سکتے ہیں‘ جس سے وہ قوم گزر رہی ہوتی ہے۔ ان میں کوئی علم ماورائی علم نہیں ہے۔

بہت سارے علوم پہلے عام نفسیات میں پیرا سائیکالوجی بنے ہوئے تھے۔ سائیکالوجی ان چیزوں کو جن کو وہ سمجھ نہ پائی تھی‘ پیرا سائیکالوجیکل اثرات کہتی تھی۔ نفسیات چونکہ اب سائنس ہے تو جن کیفیات کو نفسیات اصولاً بیان نہیں کر سکی‘ ان کو مابعد النفسیات کہتی ہے۔ جیسے روح ہے مگر جب سے نفسیات اور پیرا سائیکالوجیکل کانسپٹ شروع ہوئے اب یہ عالم ہے کہ بے شمار وہ مضامین‘ جو پیرا سائیکالوجی کے تھے‘ باقاعدہ نفسیات کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہ اب پیرا سائیکالوجیکل نہیں ہیں۔

دراصل اب پیرا سائیکالوجی کے پاس صرف ایک دو موضوعات رہ گئے ہیں۔ جن میں سب سے سرکردہ سپرٹ کا ہے‘ جسے آپ روح کہتے ہیں یا چار چیزیں ایسی ہیں‘ جن کو آپ ٹیلی پیتھی‘ ٹیلی کائناسس کلیئروائنس کہتے ہیں۔ ان کو پیرا سائیکالوجیکل انسٹی ٹیوشن سمجھا جاتا ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ کل کو سو دو‘ چار سال برس گزرنے کے بعد یہ بھی اصولاً سائیکالوجیکل قابل فہم قوانین ہو جائیں۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں ایک انسان کی کیفیات نفسی کا مطالعہ ہے۔

علم کے چار درجات ہیں۔ ایک جبلی ہے۔ دوسرے درجے میں تعقل ہے۔ تعقل مسلسل غور و فکر سے وجدان میں ڈھلتی ہے۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں۔ مزید ریفائنمنٹ کے نتیجے میں الہام پیدا ہوتا ہے۔ یہ تعقل کی آخری ڈگری ہے۔ الہام کا سادہ سا قانون اللہ نے قرآن حکیم میں دیا ہے۔ فرمایا: ونفس وما سوھا‘ ہم نے نفس انسان کو درست کیا۔ فالھمھا فجورھا و تقوبھا‘ ہم نے ہی اس پر الہام کیے‘ فسق و فجور اور ہم نے اس پر تقویٰ کے خیالات الہام کیے‘ چنانچہ ہمارے الیکٹرو کارڈیوگراف اور برین گراف میں دو مختلف اقسام کے خیالات کی رو ئیں سموئی گئیں اور ہر کرنٹ اپنے ساتھ ایک پیکیج آف تھاٹ رکھتی ہے۔ یہ خیالات کا پیکیج منفی ہے یا مثبت۔ اگر آپ منفی خیالات کو خدا اور مذہب کی تفہیم کے ذریعے ختم کر دیں تو بالآخر آپ کے پاس صرف خیالات کی ایک سیریز رہ جاتی ہے اور وہ الہام خیر ہے۔

لوگ جو الہام کا دعویٰ کرتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ ہمیں الہام آیا۔ جب وہ الہام غلط ہو جائے تو وہ اس کی تاویل دینا شروع کر دیتے ہیں۔ الہام کبھی غلط نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ قرآن حکیم میں اللہ نے کہا کہ خیر و شر دونوں الہام ہیں‘ اس لیے بہترین وہ انسان ہے جو شر کی ٹیکنالوجی کو زیادہ جانتا ہے‘ کیونکہ اس سے الہام خیر تک پہنچنا بڑا آسان ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

ان کے دل سے وسوسہ شیطان گزرتا ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے ذہن کے کمپیوٹر کو اللہ کا ڈیٹا صحیح طور پر پہنچایا ہوا ہے تو یہ مائنڈ اتنا خبردار ہوتا ہے کہ جونہی اس سے منفی خیال گزرتا ہے' اس میں گھنٹی بج اٹھتی ہے کہ یہ غلط ہے' غلط ہے' غلط ہے۔

بعض اوقات یہ کراس کرنٹ اتنی نازک ہو جاتی ہے کہ کبھی سارا خیر شر ہوتا ہے اور کبھی سارا شر خیر ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں پروردگار نے کہا ہے کہ خیر و شر دونوں فتنہ ہیں۔ دونوں آزمائش ہیں۔ گفتہ کہ خیر اونہ شناسی ہمی شراست۔ کبھی شر ندامت اور توبہ پیدا کرتا ہے اور یہ خیر ہے۔ کبھی خیر تکبر اور استہزا پیدا کرتا ہے اور یہ شر ہے۔ دونوں کی کیفیتیں معروضی ہیں۔ بذاتہ ان دونوں انسٹرومنٹس کو اچھا یا برا نہیں کہا جا سکتا۔ ایک پیکیج کو پیکیج آف گڈنس کہتے ہیں اور ایک پیکیج کو پیکیج آف ایول کہتے ہیں۔ مگر جب ہم ان پر عمل کریں گے تو ہمارا رویہ ان میں طے کرے گا کہ کس حیثیت سے ہم خیر کو پہچانتے ہیں اور کس کو ہم شر سے پہچانتے ہیں۔

یہ ایک ایسی نازک سائنس ہے' جس کو سمجھنے کے لیے ہمیں بہت زیادہ نیّاتِ رسولؐ کے قریب جانا پڑتا ہے۔ ہم حدیث رسول کو بڑی توجہ سے پڑھیں۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹی سی حدیث معانی میں کتنی گہری ہے کہ ایک پوری کتاب اس پر لکھی جا سکتی ہے۔ فرمایا' زیادہ مت ہنسو۔ زیادہ ہنسنے سے روح مردہ ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کو تھوڑی روشنی دی جائے تو وہ قابل برداشت ہے۔ لیکن اگر آپ اندھیری سڑک میں بہت بڑی فلیش کے سامنے آ جائیں تو آپ کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ آپ بہت زیادہ روشنی کے مقابلے میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے کہا جائے کہ جو لوگ خوشیوں کی آرزو کرتے ہیں جو ہر وقت آسانیاں ڈھونڈتے ہیں جب ان کو مشکل حالات سے واسطہ پڑتا ہے تو تاب مقاومت نہیں ہوتی۔ وہ جلدی نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شفاعت اور قانونِ عدل

شفاعت قانون عدل کے بالکل خلاف نہیں ہے۔ جن لوگوں نے زمین پر کوئی ایسا کام کیا ہے تو خدا اسے زمین پر ہی ایسی مصیبت میں ڈال دیتا ہے کہ وہ زمین پر اپنا حساب کلیئر کر جاتا ہے۔ شفاعت ہر مسلمان کے لیے اس لیے واجب ہو جاتی ہے کہ جسے دل سے خدا اور رسالت کا یقین ہے' اس کا حساب کافی حد تک دنیا میں ہو جاتا ہے۔ باقی جو اس کے ذاتی گناہ ہیں' وہ اللہ اور بندے کے درمیان ہیں۔ خدا کی ایک صفت ستار العیوب بھی ہے۔ جب ایک گناہ کا لوگوں کو نہیں پتہ' تو خدا کہتا ہے' اے بندے! لوگوں سے تو نے اپنی عیب پوشی کی' میں بھی تیری عیب پوشی کروں گا۔

ان ربی یفعل مایشاء کے تحت بے شک خدا کسی چیز کو بھی استثنیٰ قرار دے سکتا ہے۔ مگر آپ کا دین بڑا عجیب و غریب ہے۔ یہ قانون ایسے بنا دیا گیا ہے کہ ہر قانون میں استثنیٰ ہے۔ حتیٰ کہ نماز میں 127 استثنیٰ ہیں۔ اتنا عجیب قانون ہے کہ اس میں ہمیشہ باہر نکلنے کا راستہ موجود ہے۔ ایک شخص کو جب زنا کی سزا دے رہے تھے' تو اصحاب نے کہا' یا رسول اللہؐ! اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ فرمایا' بھاگنے دیا ہوتا۔ بدترین نا قابل معافی گناہ قتل ہے۔ تین استثنیٰ اس میں بھی موجود ہیں۔ چاہے تو معاف کر دے' چاہے تو اس کا خون بہا لے لے اور چاہے تو اسے کم تر سزا پر ڈال دے۔ کیونکہ یہ وارثین کی مرضی ہے۔ ہر قانون میں اللہ تعالیٰ نے اتنی استثنیٰ رکھی ہیں کہ میرے خیال میں دنیا کا کوئی ایسا قانون دان اتنا مہربان نقطہ نظر نہیں رکھ سکتا' جتنا کہ اللہ نے اپنے مذہب کو بنایا ہوا ہے۔ ما انزلنا الیک القرآن لتشقی۔ ہم نے قرآن کو مشقت کے لیے نہیں اتارا۔

نجات کی کم سے کم شرط

نجات کی کم سے کم شرط اتنی کم ہے کہ میں اکثر سوچتا ہوں کہ نجات مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اس حوالے سے دو چار احادیث تواتر سے جو ہمیں ملتی ہیں ان میں ایک یہ حدیث موجود ہے جس میں معیار اتنا کم ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ فرمایا' جس نے دل سے ایک مرتبہ بھی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دیا' اسے دوزخ کی آگ نہیں جلا سکتی۔ اسی کے ساتھ تھوڑے سے اور پیٹرن بھی ہیں کہ جس جوان کی آنکھ سے اللہ کے لیے ایک آنسو نکلا' اس پر بھی دوزخ کی آگ حرام

Marfat.com

ہے۔قرآن حکیم میں خود اللہ نے فرمایا' شیطان سب لوگوں کو بہکائے گا مگر جس کے دل میں میرے لیے ایک ذرہ بھی اخلاص موجود ہے تو اسے بہکا نہیں سکے گا۔ الا عباداللہ المخلصین۔ ان کو تم نہیں چھو سکتے۔

نجات بہت آسان ہے اور یہ اتنی آسان ہے کہ ساری زندگی ہم نجات سے نجات حاصل کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہم یہ کیا کرتے پھرتے ہیں۔ مسلمانوں کی زیادہ کوشش یہ ہے کہ نجات کے انسٹی ٹیوشن سے ہی نجات حاصل کر لیں۔

حور و قصور اور شرابِ طہور

ایک عمومی حالت پر خدا کے ڈیزائن کا گمان نہیں کرنا چاہیے کیونکہ پروردگار کے ہاں پورا قرآن کم از کم صورتحال پر اترا ہے یعنی اس پست ترین حالت کو کور کر رہا ہے' جو کسی انسان کی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر نماز' روزہ جیسا قانون بہترین پر لاگو نہیں ہوتا۔ نماز کا ستر اس شخص کے لیے نہیں ہے' جس کے پاس کپڑا موجود ہے بلکہ اس شخص کے لیے' غلام کے لیے ہے' جس کے پاس سرے سے کپڑا موجود ہی نہیں۔

تو کم از کم پر جا کر اللہ کا قانون لاگو ہوتا ہے اور کم از کم پر اس کے ثواب و عذاب ہوتے ہیں۔ پروردگار نے یہ فرمایا کہ ماانزلنا علیک القرآن لتشقیٰ' کہ ہم نے قرآن کو مشقت کے لیے نہیں اتارا۔ ثواب و عذاب کی جن آیات کو ہم پڑھتے ہیں' وہ ایک عمومی آیات ہیں۔ کوئی بھی آدمی گروہ میں سے مختلف سوچ رکھ سکتا ہے مگر اٹھانوے بندے آپ کی طرح نہیں سوچیں گے۔ وہ عذاب و ثواب کو بعینہٖ انہی معنوں میں لیں گے جو خدا نے بتائے ہوئے ہیں۔

مثال کے طور پر بازار میں ہزاروں آدمی ہیں۔ پھل بیچنے والا ہے۔ ریڑھی والا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا۔ ایک ریڑھی والا بڑی مشقت کر رہا ہے۔ مدتوں سے ریڑھا چلا رہا ہے۔ سوچا' یہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟ میں نے اپنی زندگی پر نفرین کی کہ مجھے دیکھو' میں نے ایک دن بھی ریڑھا نہیں چلایا لیکن اس سے زیادہ کما رہا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟ مجھے یہ یقینی خیال آیا کہ اگر اللہ نے اس کی محنت کے ساتھ اس کی عقل نہ محدود کر دی ہو' تو شاید دنیا میں کوئی بھی اپنے سٹیٹس آف لائف سے مطمئن نہ ہوتا۔ بڑا انسان وہ ہے جو چوائس رکھتا ہے اور پھر ایک چھوٹے سے سٹیٹس میں قید ہے مگر جن کو آپ چھوٹے سٹیٹس کا شکار سمجھتے ہیں' وہ اپنے ساتھ اسی سٹیٹس کے ذہنی رویے رکھتے ہیں۔

اسی لیے انعام و اکرام میں بھی پروردگار نے جو جنرل کیڈر مقرر کیا ہے' ان میں تو حور و قصور بڑی قیمتی بات ہے مگر دراصل خداوند کے انعامات اوپر چلتے ہوئے کچھ اور بھی ہیں جیسے مقام رضا' مقام محبت' مقام توکل' پھر خدا کی چاہت۔ جو زیادہ سمجھدار ہے' وہ آگے بڑھتا ہے۔ تین جنتیں سنائی گئی ہیں۔ تینوں گلیکسیز کے معیار چناؤ کے مختلف ہیں۔ اس میں ایک وہ لوگ ہیں جو گناہوں سے بچتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو نیکیاں کرتے اور عام قانون کے تحت چلتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو سابقون السابقون یعنی آگے بڑھنے والے ہیں۔ مگر آگے بڑھنے والوں کو جو انعام اللہ نے دیا ہے' وہ اپنا آپ ہے۔ اپنی زیارت اپنی صورت اور اپنا سایہ ہے۔ اپنی محبت ہے' اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سب بڑا انعام جو رسول اللہ کو دیا' وہ ہے ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ مقام رضا بھی کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔

Marfat.com

جنت دوزخ' ذہنی کیفیت

یہ سوال ایک مخصوص وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم پروردگار عالم کی کچھ صلاحیتوں پر شبہہ کرتے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جو وعدے وعید ہمیں دیے گئے ہیں' یہ مفروضے ہیں۔ جنت ایک کیفیت امن ہے اور دوزخ ایک کیفیت ذہن کا عذاب ہے۔ بعض انٹلکچوئل' جن میں غلام احمد پرویز بھی شامل تھے اور اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ ایسے تھے' جنہوں نے جنت اور جہنم کی کیفیات پر عملاً شبہہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ انسانی امن کی کیفیت جنت ہے۔ جب ایک آدمی اچھے کام کرے گا تو ہمیشہ کے لیے دوامی امن نصیب ہوگا۔

مگر اس کی جو عملی صورت قرآن مجید میں آئی ہے۔ باغات' حور و قصور اور نعمت ہائے دنیا کی' اس کی روشنی میں یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ یہ خدا کے وعدے پر شک ہے۔ میں جو ذہین ہوں' میرے نزدیک ہوسکتا ہے امن بہت اعلیٰ ترین کیفیت ہو' مگر میرے جیسے کتنے لوگ ہیں جو اس ذہنی سطح پر ہیں اور جو اپنی آخری اور حتمی منزل قرار امن سمجھتے ہیں؟ ذہنی کیفیت امن کو جنت قرار دیں گے؟ ان لاکھوں کروڑوں کے بارے میں کیا خیال ہے' جو ابھی رہ گزر میں ہیں۔ اس شخص کا کیا بنے گا جو ایک ریڑھی پر بیٹھا ہے۔ اس سے کوئی سیب لینے آیا ہے' سیب خراب ہے' وہ خدا کے خوف سے آگہی پا کر اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی جگہ اسے اچھا سیب دے دیتا ہے۔

ایک معمولی سی سطح عقل و ایمان کا وہ آدمی' جس کو اتنے دانشوروں سے واسطہ نہیں ہے' لیکن اندرونی طور پر وہ خدا پر یقین رکھتا ہے۔ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ میں اس وقت تنگی اور عسرت و بلا کے عالم میں ہوں۔ مجھے اس کے عوض اللہ نے گھونگھے اور موتی کا محل آفر کر رکھا ہے۔ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے ایسی متحیرانہ سہولتوں کا وعدہ کیا ہے' بشرطیکہ اس زمین پر میں اس کے احکامات پر عمل کرسکوں۔ ایمان اور خیال کی یہ وہ سطح ہے جو میرے پاس ہے' اتنی محدود ہے کہ جنت صرف معدودے چند لوگوں کو نصیب ہوگی اور بے شمار لوگوں کو ایسی کوئی چیز نصیب نہ ہوگی جن کا وعدہ اللہ نے انہیں دیا ہے۔

مگر قرآن میں دیکھئے کہ جنت کیا ہے؟ جو پروردگار عالم بے پناہ گلیکسیز کا مالک ہے۔ جو زمین و آسمان کی تخلیقات کا باعث ہے اور ایک نہ حساب میں آنے والے حساب کا مالک ہے۔ وہ جنت کو خالی و خیالی دنیا بنا کر آپ کے سامنے پیش نہیں کرسکتا۔ جس خدا نے اس معمولی سے اطمینان اور تعیشات کی ایسی دنیا کو تخلیق کیا ہے' جس کی حیثیت بقول رسولؐ ایسی ہے جیسی کہ وسیع و عریض جنگل میں ایک پڑا ہوا چھلہ یا حلقہ ہو اور اس کی کائنات اتنی وسیع ہے کہ جس کائنات میں ارب ہا ارب سورج ہیں۔ یہ اتنے مختلف رنگوں کے ہیں کہ کوئی سورج کرمزی شعاعیں پھینک رہا ہے تو کوئی سبز۔ کوئی سورج سرخ شعاعیں پھینک رہا ہے تو کوئی نارنجی۔ ان کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں ہے۔ اس خدا نے جس جگہ جنت بنائی ہے جو گلیکسی اس نے تعمیر کی ہے' اس کا ایک حدود اربعہ قرآن نے دیا ہے۔ فرمایا: عرضها السموات و الارض۔ ہم نے اہل ایمان کے لیے جو جنت تخلیق کی ہے' اس کی چوڑائی زمین و آسمان کی لمبائی کے برابر ہے۔ یہ اتنی بڑی وسیع و عریض گلیکسی اللہ نے بنائی ہے۔

اگر آپ کے دنیا کے پہاڑ میں ایک سبز پٹی زمردیں پہاڑ کی طرف اشارہ کرسکتی ہے تو کتنے ہی ارب ہا سالوں سے یہ قائم جنت کے پورے کے پورے پہاڑ بھی زمردیں ہوسکتے ہیں۔ یہ ایک اور اشارہ اور ایک کنایہ ہے۔ اگر کسی سمندر

Marfat.com

کی کوکھ سے نیلم نکل سکتے ہیں تو کسی سمندر کی زمین بھی نیلم ہو سکتی ہے۔ اگر مارکونی کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک اپنا پیغام پہنچانے کے بعد آج اتنے عظیم الشان الیکٹرانک کمپلیکس تعمیر ہو سکتے ہیں تو خدا بھی مثال کے طور پر جنت کی ہر کیفیت کو زمین پر وارد کرتا ہے تاکہ آپ کو کوئی شبہ نہ رہے کہ وہ گھونگھے اور موتی کے محل تخلیق کر سکتا ہے۔ ایسی بھی مٹی پیدا کر سکتا ہے جو دودھ کی طرح سفید اور مشک کی طرح خوشبودار ہو۔ ایسے تمام سوال اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہم اللہ کی قوت تخلیق پر سوال کرتے ہیں۔

جنت اور دوزخ مفروضے نہیں' حقائق ہیں۔ ہم نے ابھی پہلے آسمان کی دہلیز کو عبور نہیں کیا۔ پچھلے دنوں ناسا کی رپورٹ کے مطابق انہوں نے ایک نیا ایسا ستارہ دریافت کرلیا ہے۔ ایسی گلیکسی دریافت کی ہے جس کو انہوں نے کرائسٹ کی گلیکسی کا نام دیا ہے۔ وہ اتنی روشن اور منور ہے کہ انہوں نے گمان کیا' یہ جنت ہے مگر وہ جنت نہیں ہے۔ جنت اتنی بڑی ہے کہ رسولؐ گرامی کے مطابق اس کا ایک مکان دوسرے مکان سے پانچ سو برس کے فاصلے پر ہے۔ پوچھا گیا' یارسول اللہؐ! لوگ ایک مکان سے دوسرے مکان تک کیسے جائیں گے؟ فرمایا' براق کے ذریعے۔ براق برق سے ہے۔ یعنی جنت ستاروں کی گلیکسی کی طرح ہے' جس میں ہر ستارہ مکمل طور پر آزاد ہے۔

ذرا شیخ عبدالقادرؒ کی چہل کاف پڑھیے۔ ایک صوفی کو شاید اس بات کا علم تھا۔ کہا' اے ستارہ دل من کہ مشابہ ہستی ستارہ آسمان را کہ میرے دل کی صورت کے مقابل میرا ایک ستارہ ہے۔ میری افلاک میں ایک زمین ہے' جس زمین میں میرا اکتساب اس پر اثر ڈالتا ہے۔ کیا آپ رسول گرامی مرتبت کا یہ قول بھول گئے کہ جس نے ایک مرتبہ زبان سے سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم استغفر الله کہا' اس نے جنت میں درخت لگایا اور جتنی مرتبہ چاہیں' آپ اس جگہ میں جو آپ کا مقسوم ہے' آپ کا نصیب ہے' اپنی کارکردگی سے اس کی فضا کو منور کر سکتے ہیں۔ اپنے اعمال سے اس کی زمین روشن کر سکتے ہیں۔

پھر خدا نے خلیفۃ اللہ فی الارض بنا کر آپ کو دیا کیا ہے؟ کیا آپ اس چیز پر نازاں ہیں کہ افلاس کے مارے ہوئے ایک غریب' چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے کو جا کر یہ فخر سنائیں گے کہ تم مخلوقات ارضی کے خلیفہ ہو؟ کیا آپ اسے یہ تفاخر دیں گے؟ وہ تو کہے گا کہ ہر چیز جہنم میں جائے' میں ہوں کیا؟ میں تو بھوکا ننگا مر رہا ہوں۔ میں کہاں سے خلیفۃ اللہ فی الارض ہوا؟ دراصل خلیفہ کا مطلب یہ تھا مستقر او متاع الی حین' کہ زمین پر اس خلافت کی ابتلا و آزمائش ہے۔

خلیفۃ اللہ فی الارض اور فی السموات بنانے سے پہلے تو وہ خلیفۃ اللہ فی السماء ہوا' جب اسے ملائکہ' شیاطین اور جنات نے سجدہ کیا۔ پھر اس کو نکال کر اس زمین پر اس لیے پھینکا گیا کہ وہ لفظی عقیدے سے ایک عملی عقیدے میں جائے۔ جب وہ لفظی سے عملی عقیدے کو جاتا ہے تو پھر اسے خلافت آسمانی دی جاتی ہے۔ اس کو ستار بخشا جاتا ہے۔ ایک گلیکسی عطا کی جاتی ہے جس میں وہ اپنی عبادات کے اشغال کے ساتھ ساتھ اپنی مرضی کے مطابق زندگی تخلیق کرتا ہے۔ وہاں وہ اللہ کی طرح خالق اور باری ہے۔ اللہ کی طرح مصور ہے۔ یہ تخلیق کی انتہا ہے۔ یہ ایک مخلوق کا اعلیٰ ترین رتبہ ہے۔

خداوند کریم نے انسان کو زمین پر دو چیزیں دیں اور ایک چیز چھین لی۔ وہ مرید تھا' قدیر تھا اور متکلم تھا۔ اللہ مرید ہے' قدیر ہے متکلم ہے۔ ارادہ کرتا ہے اور ارادہ قدرت رکھتا ہے۔ جب کلام کرتا ہے تو وہ چیز ہو جاتی ہے مگر انسان سے اس

نے حسِ مزاح برتی، مرید بنادیا، متکلم بنادیا، قدرت چھین لی۔ وہ قدرت دے بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ ایگزیکٹو پاور کے کچھ ٹسٹ ہوتے ہیں۔ آپ نے اس قدرت کو تھوڑا سا استعمال کر کے دجل و فریب کی ایک دنیا آباد کر لی۔ خدائی کو چیلنج کرنا شروع ہو گئے۔ آج چھ ارب انسانوں میں سے پانچ ارب اللہ پر کسی قسم کا یقین و اعتقاد نہیں رکھتے۔ وہ آپ کو تمام طاقتیں کیسے دے سکتا تھا؟ اس نے یہ طاقت آپ کے لیے آخرت میں سنبھال لی۔ جنت کیا جگہ ہے کہ جس میں آپ صرف خواہش کریں گے اور وہ چیز آپ تک پہنچ جائے گی۔ آپ آرزو کریں گے اور وہ پوری ہو جائے گی۔ آپ ارادہ کریں گے، وہ مکمل ہو جائے گا۔ ان دو صفات کے ساتھ، جو زمین پر ہیں، آپ کو قدرتِ الٰہی کا کچھ حصہ بھی انعام میں ملے گا اور اس قدرت کے ساتھ آپ اپنا دہاں گھر بھی سنواریں گے۔ آپ کو خلافت ارضی کا مستحق سمجھا جائے گا۔

اسی طرح جہنم کو دیکھ لیجیے۔ زمین کی تہوں میں اتر جائیے اور قرآن کے الفاظ ساتھ لے کر جائیے۔ پگھلا ہوا تانبا، پگھلی ہوئی دھاتیں، نمک کے ستون، ابلتا ہوا لاوا، خروش۔ آپ زمین کے مرکز کو دیکھیے، تو جہنم کی اس سے زیادہ کوئی خوبصورت تعبیر نہیں ہو سکتی۔ جہنم ارب ہا سالوں کا وہ سٹار ہے، جو ابھی بننے کے اسٹیج میں ہے۔ جیسے زمین کا کرسٹ آباد ہے، جو ابھی ٹھنڈک میں نہیں آیا۔ آپ جہنم کو دور کیوں دیکھنے جاتے ہیں۔ اگر آپ کو زمین کے باطن میں قید کر دیا جائے تو آپ جہنم سے بدترین فضا دیکھیں گے۔ سموم آگ جلانے والی، پگھلے ہوئے لاوے، زقوم اور وہ پتھر جو دھنک رہے ہیں آگ میں۔ یہی فضا جہنم کی ہے۔ جہنم ایک ایسے سٹار کی طرح ہے جو ابھی تخلیق کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ ایک ایسا جلتا ہوا، بھڑکتا ہوا ستارہ ہے، جس میں آپ کو رکھا جائے گا۔

حضور اکرمؐ سے پوچھا گیا، یا رسول اللہؐ! اگر جنت اتنی بڑی ہے تو جہنم کہاں ہے؟ اگر جنت کی چوڑائی ساتوں زمین و آسمان کی لمبائی سے بڑی ہے تو پھر جہنم کہاں ہے؟ فرمایا، جب دن طلوع ہوتا ہے، تو رات کہاں جاتی ہے؟ اگر غور کیجیے، تو جواب ذہنی طور پر مناسب نہیں لگتا ہے۔ اس لیے کہ دن اور رات کی کیفیات اور نتائج ہیں۔ جب کہ سوال پوچھا جا رہا ہے جگہ کا۔ مگر رسول اکرمؐ نے بڑی ذہانت سے جواب دیا کہ دن اور رات دونوں ایک کیفیت سے ہیں، سورج سے ہیں۔ جب زمین سورج کے سامنے ہوگی تو منور ہوگی۔ جب زمین سورج کے سامنے نہ ہوگی تو تاریکی ہوگی۔ جنت چونکہ جلال و جمال پروردگار کے سامنے ہے اس لیے جنت اور آخرت میں جو چیز خدا کے دیدار سے محروم ہے، وہ جہنم ہے۔ جس مقام پر پروردگارِ عالم کے کرم کی نوازشات کی نظر نہیں پڑ رہی، وہ جہنم ہے۔ سب سے بڑا انعام جنت میں اشیاء کا نہیں، حور و قصور کا نہیں بلکہ دیدارِ خداوندی کا ہے۔

جنت زمین پر ممکن

آپ مرنے کے بعد بھی ہمیں مرواؤ۔ اس زمین سے تو ہم پہلے ہی تنگ ہیں۔ اب مرنے کے بعد بھی آپ ہمیں یہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسا کہنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ حدیث یہ کہتی ہے کہ ارواحِ انسانی کی جو نیک روحیں ہیں، وہ عالمِ علیین کو جائیں گی اور جو مردہ روحیں ہیں، وہ عالمِ سجین کو جائیں گی۔ کسی نے پوچھا کہ عالمِ سجین کیا دنیا میں واقع ہے؟ تو حضورؐ نے اس کے جواب میں ہاں فرمائی۔ عالمِ سجین کی روحیں جہنم میں روانہ ہونے سے پہلے Terrestrial Under World میں رکھی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے زمین کم از کم جنت نہیں ہو سکتی۔

Marfat.com

نفس اور روح

نفس اور روح دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ روح پروردگار کا امر ہے۔ یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی ' یہ اللہ کا حکم ہے' بنیادی چپ ہے۔ معمولی سی ڈسک' باریک سے ذرے کی شکل میں' جس میں پورے انسان کی جینٹک کوڈ محفوظ ہے۔ جب حضرت آدمؑ کو ان کی اولاد بے شمار ذروں کی شکل میں دکھائی گئی تو وہ اتنے باریک تھے کہ وہ تمام ان کی ہتھیلی پر سما گئے۔ ان میں سے کچھ سیاہ اور کچھ چمکدار تھے۔ آدمؑ ان کو دیکھ کر روئے کہ میری اولاد میں سے کچھ عذاب پائیں گے اور کچھ ثواب۔

مگر اس حدیث آدم سے روح کی نوعیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ امکانی حد تک ایک باریک ایٹم ہے۔ ممکن ہے کہ ہیسان اور میسان سے بھی باریک ایٹم' جو انسان کے جسم باطن میں بڑی ہی باریکی اور احتیاط سے رکھی جاتی ہے۔ اس میں پورے پورے احکامات خداوندی کی کوڈ ہے' جو اللہ کی شناخت کا علم ہے اور وہ نسیان کا شکار ہو چکی ہے۔ جب یہ عمر ختم ہو جاتی ہے تو پھر اسی کو واپس نکالا جاتا ہے۔

مگر نفس جبلی اقدار اور آپ کی حاصل کردہ حیوانی اور شعوری جبلتوں کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ نفس کو انگریزی میں Id ego اور سپر ایگو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عربی میں اسے نفس عمارہ' نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کہا جاتا ہے یا جبلت' انائے مطلق اردو میں کہا گیا ہے۔ یہ اس کی تین کیفیتیں ہیں جس میں یہ بتدریج ترقی کر کے جاتا ہے۔ ہمیشہ خدا مخالف ہے' اس لیے پروردگار نے کہا کہ امامن خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی کہ جو اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا' اس نے ہمیشہ اپنے نفس کی مخالفت کی۔ چاہے وہ اس کو کتنا ہی نیکی پر کیوں نہ اکسائے۔

لیکن روح کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں اس کے بارے میں بہت تھوڑا علم دیا ہے اور یہ اللہ کا حکم ہے۔ یہ یقیناً دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ روح علیحدہ چیز ہے' نفس علیحدہ چیز ہے۔

نفس کی ورغلاہٹیں

نفس کس چیز کی آرزو کر سکتا ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کے زیادہ عنوانات نہیں ہیں۔ اس کے ہیڈز اللہ

Marfat.com

نے گنوا دیئے ہیں۔زین للناس حب الشھوٰت من النساء و البنین والقناطیر للمقنطرۃ والفضۃ یہ خاصائے نفس ہے۔میں نے کبھی نفس کو یہ نہیں کہا کہ تو کم بخت ہے۔میں اس کی صلاحیت خیر سے آگاہ ہوں۔جو اپنے اندر کی دی ہوئی صلاحیت عقل کو نہیں پہچان سکتا' وہ دراصل نفس کے شر کا شکار ہے۔

نفس میں ایک بڑی اچھی عادت بھی ہے جہاں یہ آپ کو ورغلاتا ہے' ترغیب دیتا ہے' وہاں تجسس پیدا کرتا ہے۔ یہ تجسس ہو سکتا ہے' پورنوگرافک موویز کو چلا جائے۔ایک بچہ گھر سے بھاگ کر باہر کوئی فلم لگی ہو' اس پر چلا جائے۔اسی تجسس میں کوئی بچہ کسی مشین کے اندر ہاتھ دے دے مگر نفس تجسس کو ابھارتا ہے۔جب اس کو علم مل جائے' تو یہ سیدھا ہو جاتا ہے۔یہ نفس کی خوبی ہے کہ جن جبلتوں کا مجموعہ ہے' ان تمام جبلتوں کا علاج علم ہے اور علم کا انسٹرومنٹ انسان کے پاس ہے۔ہو سکتا ہے کہ باوجود بے پناہ علم کے اس کی شرارتیں باقی رہ جائیں۔اس کے تحفظات اتنے نہ ہو سکیں' جتنے آپ چاہتے ہیں لیکن یہ تو بتائیے کہ خدا کب آپ سے اتنی پاکیزگی کی توقع رکھتا ہے؟ خدا تو آپ سے پاکیزگی کا لفظ ہی نہیں سننا چاہتا۔

رسول اکرمؐ کی حدیث ہے کہ جب اصحاب موسیٰؑ کے تقویٰ اور ان کی عبادات کا ذکر ہوا تو اصحاب رسولؐ نے کہا' یارسول اللہؐ! ہم بھی گناہ کبھی نہیں کریں گے۔جیسے تمازت آفتاب سے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے' غصے سے آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔فرمایا' تم ایسی بات کہتے ہو' خدا تمہیں زمین کے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دے گا۔تمہاری جگہ وہ لوگ پیدا کر دے گا جو خطائیں کریں گے' گناہ کریں گے اور توبہ کریں گے۔اللہ ان کو بخشنے میں زیادہ خوشی محسوس کرے گا۔وہ بھلا آپ سے کہاں تقدس کی آرزو رکھتا ہے؟ یہاں تو خطاؤں کا ڈھیر لگا ہوا ہے' جس انسان کا لباس دیکھو' گناہ آلود ہے۔کوئی نہ کوئی کسبِ غلط لیے پھرتا ہے۔

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

میں نے صلاحیت دی تھی' نماز کے لیے تم نے شراب خانے میں گزار دی۔پڑھنے لکھنے کے لیے' تم نے جہالت اور تاش شطرنج میں گنوا دی۔کوئی حرج نہیں۔اے ابن آدم! تو بڑی حماقت کرے گا۔مگر یہ حماقت نہ کر بیٹھنا کہ اللہ کی طرف سے مایوس ہو جائے۔یہ کلی حماقت ہے۔اگر وہ گناہ معاف نہ کرے تو وہ غفور اور رحیم ہی نہیں ٹھہرتا۔اللہ کہتا ہے' میرے بندو! یاد رکھو کہ تمہارے گناہ وقتی ہیں۔تمہاری زندگی کتنی ہے؟ ساٹھ برس' سو برس میں کیا کر لو گے؟ کتنی چوریاں' کتنے ڈاکے مار لیں گے؟ کیا میری رحمت بیکراں کے مقابلے میں تمہارا یہ وقفہ حیات بہت بڑا ہے؟

وہ ہر انسان خدا کا کفر اور اس کی توہین کرتا ہے' جب وہ یہ کہتا ہے کہ میرے گناہ اللہ کی رحمت نہیں بخشے گی۔وہ لامتناہی رحمت کو محدود کر دیتا ہے۔خطا تو ہم کرتے ہی رہتے ہیں۔جہالت سرزد ہو جاتی ہے۔میں گناہ و ثواب کو اس نظر سے نہیں دیکھتا۔میں اسے حسن اور بدصورتی کے ضمن میں دیکھتا ہوں۔ہمارا حسن عمر اور عقل کے ساتھ کم ہو جاتا ہے۔ہم وقتی طور پر بدصورت ہو سکتے ہیں' مگر ہمارا حسن اس کے ساتھ ہے' جو بہت خوبصورت ہے۔اللہ جمیل و یحب الجمال' نیکی خوبصورتی ہے' توازن ہے۔حسن' نیکی اور اخلاق ہے۔بشرطیکہ ہم میں سے کوئی ان میں سے کسی پر مقام رہے۔

ایک بندہ جب خدا سے بخشش کے لیے رجوع ہی نہیں کر رہا' تو اسے خدا کیا معاف کرے گا۔کافر کو سزا مل رہی

Marfat.com

ہے کہ وہ بخشش کے لیے رجوع ہی نہیں کر رہا۔ کافر اپنے عقیدے کے مطابق اپنے انجام تک پہنچتا ہے۔ اسی لیے خدا نے کہا' جو کچھ تمہیں برائی پہنچتی ہے' تمہارے نفس سے پہنچتی ہے۔ کسی سے جا کر کہو کہ مرنے والے ہو' ایک دفعہ کہہ دو کہ اللہ میاں مجھے معاف کر دو۔ خدا کہتا ہے کہ جس نے دل سے ایک مرتبہ لا اللہ کہا' اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ کہیں تو سہی۔ جب آپ بخشنے والے' معاف کرنے والے کو نہیں پہچانتے تو پھر وہ کیا کرے؟ آپ نے اللہ کو جبر میں ڈال دیا۔ شفاعت کے وقت رسول اکرمؐ ایک مرتبہ جائیں گے' بخشوائیں گے۔ دوسری مرتبہ جائیں گے' بخشوائیں گے۔ تیسری مرتبہ جائیں گے بخشوائیں گے اور پھر اللہ کہے گا اے محمدؐ! ہم نے آپ کو شفاعت بخشی تھی۔ ہم نے وہ سارے لوگ بخش دیئے جن کی آپ نے شفاعت کی تھی۔ اب وہ لوگ باقی ہیں' جنہیں قرآن نے روک رکھا ہے جنہوں نے کبھی میرا اقرار خداوندی نہیں کیا۔

جسے روح کہتے ہیں

جسے آپ روح کہتے ہیں' یہ ہیسان اور میسان سے بھی ایک باریک چپ ہے۔ اسے بڑی احتیاط سے انسان کے اندر رکھا جاتا ہے۔ وقت ختم ہوتا ہے' تو یہ چپ نکال لی جاتی ہے۔ نکالنے والے بھی اسی طرح نکالتے ہیں۔ دو فرشتے آ جاتے ہیں۔ ایک ہلکا پھلکا سا آپریشن کرتے ہیں۔ تکلیف تو ہوتی ہے مگر آپریشن سے خون نہیں بہتا۔ ناقابل دید سا آپریشن ہے۔ باریکیوں سے نکالتے ہیں۔ قبر تک بندہ مشکل سے پہنچتا ہے...... یہ چپ بڑی مشکل سے نکلتی ہے۔ اگر آپ کی ملکیتیں بہت مضبوط ہوں' تو اس چپ کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں کمی بیشی اور اس کے سامانِ زیست سے پیدا ہوتی ہے۔ جب آپ کی مال و جائیداد اور اس سے رغبت مضبوط ہوتی ہے' تو اس سے ناقابل شناخت دھاگے اتنے بن جاتے ہیں کہ آپ کو زندگی چھوڑنا مشکل لگتا ہے۔ دیکھئے! خودکشی کرنے والا کتنی آسانی سے مر جاتا ہے۔ کتنے حیران ہوتے ہو آپ کہ کتنی آسانی سے مر گیا۔ ہمیں تو مرنے کے خیال ہی سے خوف آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی وابستگی اور دلچسپی کوئی نہیں رہتی۔ ڈیپریشن' اداسی اور فرسٹریشن رفتہ رفتہ احوال دنیا سے اکتا جانے کا نام ہے۔ کہتا ہے' میں کیوں جیوں؟ میرا ادھر کون ہے؟ میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی بھائی بہن نہیں ہے۔ مجھے کھانا بھی نہیں سوٹ کرتا۔ میں مر ہی جاؤں تو بہتر ہے۔ جب منفی دلائل اتنے وزنی ہو جائیں گے کہ مثبت دلائل دب جائیں تو خودکشی کی تمنا پیدا ہوتی ہے مگر جو شعوری بندہ اپنے آپ کو زندگی سے اتنا عدم وابستہ رکھے کہ کوئی خوشی اس کو زیادہ خوش نہ کرے اور کوئی غم اسے زیادہ غمگین نہ کرے' تو وہ اعتدال کا ایسا بندہ ہے جو قبر تک بڑی آسانی سے جاتا ہے۔

روح' پراسس' مراحل

عالم ارواح کے بارے میں میری رائے بڑی منفرد ہے۔ تمام احادیث جو ملتی ہیں' وہ روح کو ایک بڑی فائن ترین امکانی چپ کی شکل میں دیکھتی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں جو حدیث ہے اور فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی ذریت چمکدار ذروں کی صورت میں دکھائی گئی۔ ان میں سے کچھ سیاہ تھے اور کچھ بہت روشن تھے۔ اس

پرآدم علیہ السلام بڑے روئے اوران کو بتایا گیا کہ سیاہ ذرّے وہ ہیں جو عاقبت نااندیش نکلیں گے۔

وہ صورت‘ جو روح نکالنے کی ہے۔اس میں روح ایک اچھے یا بڑے کپڑے پر ہے۔جیسے پروردگار یا حدیث کہتی ہے۔ٹھیک وہ بھی اس کی تشریح نہیں کرتے۔اس میں نکالی جاتی ہے اور یہ ایک قطرے کی صورت میں ہوتی ہے۔اب خیال یہ ہے کہ جیسے کسی کمپیوٹر کا ایک مین آئی سی یا چپ ہوتا ہے۔اسی طرح انسان کی روح بھی فائن ترین امکانی چپ کی صورت میں ہے۔ڈی این اے سٹرکچر کوڈ وغیرہ سب اس پر درج ہوتی ہے‘ مگر اس کے بعد عالم برزخ کبریٰ میں اس کو داخل کیا جاتا ہے اور عالم برزخ کبریٰ وہ ہے‘ جس میں اسے شکل دی جاتی ہے مگر جسم نہیں دیا جاتا۔پھر جب زمین پر اسے بھیجا جاتا ہے‘ تو اسے شکل اور وزن دونوں چیزیں دی جاتی ہیں۔جب اسے دوبارہ رخصت کیا جاتا ہے تو پھر وہ اسی پراسیس سے گزرتا ہے۔وہ عالم برزخ میں اس طرح جاتا ہے کہ اپنا وجود زمین پر چھوڑ جاتا ہے۔جب اس سے مرتبہ علیین کو رفعت کرتا ہے تو جیسے حضورؐ نے فرمایا کہ شہیدوں کی روحیں پرندوں کے پوٹوں میں ہیں جو جنت کے درختوں کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں۔

روح کی واپسی

عالم برزخ دو ہیں۔ایک کو برزخ کبریٰ اور ایک کو برزخ صغریٰ کہتے ہیں۔برزخ ایک ایسا عالم ہے جسے آپ Non existing material existance کا عالم کہتے ہیں۔اوپر سے جو ارواح آتی ہیں‘ وہ اس عالم میں رکتی ہیں۔تین عالم ہیں۔ایک بغیر شکل وصورت کے ہے۔ایک دوسرا عالم ہے‘ جہاں شکل موجود ہے لیکن وزن نہیں ہے اور ایک وہ عالم ہے جس میں شکل وصورت اور وزن تینوں موجود ہیں۔آپ کے موجودہ عالم میں آپ کا وزن موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کی شکل وصورت اور روح بھی موجود ہے۔اس کو جب آپ خیرآباد کہتے ہیں تو وزن ختم ہو جاتا ہے۔شکل و صورت اور روح باقی رہ جاتی ہے۔جب برزخ سے روح عروج کرتی ہے‘ تو وہ شکل وصورت کھو بیٹھتی ہے۔بنیادی چپ کی شکل میں آجاتی ہے۔کسی دوسرے بدن کو لگا کر اس کی پھر کلوننگ کی جا سکتی ہے۔ایک مستقل کلوننگ کا پراسیس جاری ہے۔

مگر کوئی روح پریشانی یا کوئی نیک روح دعا‘ فکر یا رہنمائی کے لیے خدا کے حکم سے دوبارہ پلٹ سکتی ہے۔تلخی کے باعث یا اپنے پچھلے والوں پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھی پلٹ سکتی ہے مگر دونوں قسم کے معاملات میں خدا کی اجازت لازم اور ضروری ہے۔مگر وہ قابل دید نہیں ہوتی۔وہ صرف خواب کے پیٹرن میں ہی آسکتی ہے۔روح کو دیکھنا ناممکن ہے کیونکہ روح بھی ویسے ہی ہے جیسے اللہ کو دیکھنا۔

انسانی جسم اور روح

(ڈاکٹر عبدالجلیل خواجہ) انسانی جسم میں روح پھونکنے سے جو مراد ہے‘ وہ حیوان کے جسم میں روح سے مختلف نہیں ہے۔انسان میں دو قسم کی روح ہے۔ایک تو وہ ہے جو ہم میں اور تمام جانوروں میں مشترک ہے یعنی کسی قسم کے جو جانور ہوں گے‘ ان میں روح ہوگی۔اسی طرح آپ کہہ سکتے ہیں جو مادہ ہے‘ اس کے اندر بھی ایک روح ہے کہ وہ بھی ایک

Marfat.com

طرح کا فنکشن ادا کر رہا ہے۔ ایک دائرے کی صورت میں نیوکلیئس کے گرد ایٹم چکر کاٹتے ہیں۔ ایک تو وہ روح ہوگی۔ دوسری جانور کی روح ہوگی۔ تیسری انسانوں میں روح پھونکنے سے مراد شاید عقل وشعور کی دولت ہے' جس کو ہم روح کہیں گے اور اسی روح سے حساب کتاب بھی ہوگا۔ جبکہ جانوروں کی روح سے اس قسم کا کوئی سوال وجواب نہیں ہوگا۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) یہ جدید مسئلہ بھی ہے اور بڑا قدیم سوال بھی ہے۔ اس کی قرآن وحدیث سے وضاحت ملتی ہے۔ جب تک مرد کا مادۂ تولید رحم مادر میں نہیں ٹھہرتا اور مرد اور عورت کے مادۂ تولید علیحدہ علیحدہ ہیں' ان پر زندگی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس قرآن کی اس آیت کا اطلاق نہیں ہوتا کہ اولاد کو رزق کے خوف یا اور فتنوں کی وجہ سے قتل نہ کرو مگر جب ہم کسی خاتون کا معائنہ کراتے ہیں اور ڈاکٹر ایک ماہ بعد ہی بتا دیتا ہے کہ رپورٹ مثبت ہے تو پھر ہر شخص کو پتہ ہوتا ہے کہ پیدائش ہو چکی ہے۔ متحرک ہے اور زندگی بن چکی ہے۔ اب اس کے بعد یہ کہنا کہ جس وقت تک بچہ تین ماہ کا نہیں ہوتا' اس کا نصیب نہیں لکھا جاتا' بے معنی بات ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ پرانی غلط فہمی ہے۔ زندگی کا اس وقت اطلاق ہو جاتا ہے' جب رپورٹ میں اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ زندگی موجود ہے۔ زندگی جو بن گئی ہے' وہ حرکت پذیر ہے۔ خدا اور میڈیکل سائنسز دونوں پر اعتماد کر لینا چاہیے۔

جیسے حدیث کہتی ہے' اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ اس وقت اس پر زندگی کا اطلاق نہیں تھا بلکہ اگر تین ماہ میں یا اس سے پہلے زندگی ختم ہو جاتی ہے تو اس کے مقدرات کی تفصیل اس پر درج نہیں کی جاتی مگر جو کچھ اس نے کرنا ہے یا کھانا کمانا ہے' تین ماہ کے بعد بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس کو مقدرات کی لسٹ دے دی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ بالکل نہیں کہ اس وقت روح اور زندگی نہیں ہوتی۔

Marfat.com

گوتم بدھ کی روشنی

دراصل مہاتما، جسے سدھارتا بدھا کہتے ہیں، ایک خوف کا شکار تھے۔ تمام عرصہ اپنے زمانے میں وہ ایک خوف کا شکار رہے۔ وہ اللہ کا نام نہیں لے سکے۔ اس لیے کہ ان کے اردگرد اس درجہ بتانِ آذری کا ہجوم تھا اور اتنے زیادہ نام دیوؤں اور دیویوں کے چلے ہوئے تھے کہ اگر مہاتما کسی کا نام لیتے، تو وہ ایک اور بت بن جاتا۔ دراصل بدھا نے احتیاط کی ہے کہ اس کا نام اس نے روشنی اور نروان رکھ دیا۔ اللہ نہیں رکھا۔ اس لیے کہ وہ ڈرتا تھا اس بات سے کہ میں شیوا، وشنو، بھگوان جو نام بھی رکھوں گا، یہ بتوں میں ایک بت ہو جائے گا۔

مگر مہاتما اس لحاظ سے یقینی پیغمبر تھے۔ ہمیں ان کی ایک شہادت ملتی ہے کہ ان کے قریب ترین شاگرد کا نام نندا تھا۔ جب مہاتما وفات پا رہے تھے، تو نندا نے پوچھا کہ کیا استاد تو آخری استاد ہے؟ کہا، نہیں۔ آخری میرے بعد آئے گا۔ نندا نے کہا، استاد! کیا میں اس وقت موجود ہوں گا؟ بدھا نے کہا، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ تو نندا نے کہا کہ استاد اگر میں موجود ہوا تو اس کو پہچانوں گا کیسے؟ مہاتما نے کہا، وہ مترا ہے۔ مترا سنسکرت میں ٹھیک معانی رحمت رکھتا ہے۔

میرے خیال میں سدھارتا، بدھا اپنے وقت کے پیغمبر تھے، جنہوں نے پیغمبر آخر الزمان کی پیشین گوئی کی تھی کیونکہ اللہ نے بھی قرآن میں کہا ہے کہ ہم نے امتوں کی طرف رسول بھیجے ہیں اور نہیں بھیجے ہم نے رسول الا بلسانک قومه، ہم نے اس قوم کی زبان میں بھیجے۔ ظاہر ہے کہ انڈیا میں بہت سارے پیغمبر آئے ہوں گے بلکہ گمان تو کرشنا اور راما چندرا پر بھی پیغمبری کا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس معاملے میں ہم بہت محتاط ہیں، مگر جہاں تک بدھا کا سوال ہے، وہ کافی تصدیق شدہ ہے کہ وہ پیغمبر تھے۔

دانیال کے بارے میں

حضرت دانیال بنو اسرائیل کے بڑے مشہور اور صاحب رویا پیغمبر ہیں۔ ان کا ذکر اگرچہ قرآن حکیم میں اس طرح نہیں آتا، مگر ان کو سریانی اور عبرانی میں دانیئل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ عسکائیل، دانیئل یہ سارے بنو اسرائیل

Marfat.com

کے تھے پیغمبر ہیں۔ حضرت دانیال کا ذکر اور رویائے دانیال عہد نامہ عتیق میں کثرت سے ہے۔ عہد نامہ عتیق کی بائبل پیغمبران بنواسرائیل پر مشتمل ہے۔ یہ اتنے زیادہ ہیں کہ قرآن نے ان میں سے سب اہم پیغمبروں کا ذکر کیا ہے جیسے حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ۔ باقی جو بیچ میں ہیں، جیسے فلم Sampson and player میں سیمپسن اللہ کے نبی تھے، حضرت شمعون کہلاتے ہیں۔ ان کا ذکر بھی اسی میں ہے۔

اسی طرح حضرت دانیال بنواسرائیل کے مشہور پیغمبر ہیں۔ بخت نصر کے زمانے میں ہوئے۔ ان کا ذکر قرآن میں وہاں آتا ہے، جہاں پہلی دفعہ اسرائیل کی تباہی کا ذکر ہے۔ جب بنواسرائیل نے اللہ سے انحراف کیا اور خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ تم پر وہ سخت قوم چڑھا کے لاؤں گا جو تمہیں تباہ و برباد کردے گی تو بخت نصر بنواسرائیل پر حملہ آور ہوا اور یروشلم سے 70 ہزار قیدی پکڑ کرلے گیا۔ ان قیدیوں میں حضرت دانیال بھی تھے۔

حضرت دانیال کے پکڑے جانے کے بعد بخت نصر نے ایک خواب دیکھا۔ یہ ایک لمبا باب عہد عتیق کا ہے۔ مختصراً یہ کہ بادشاہ نے کہا میں نبی اسے مانوں گا جو مجھے میرا خواب بھی بتائے گا اور اس کی تعبیر بھی بتائے گا۔ ہر زمانے میں کذاب ہوتے ہیں۔ حضرت دانیال کے زمانے میں پندرہ سولہ کذاب پیغمبر تھے۔ جب یہ واقعہ ہوا اور اللہ نے دانیال کو ظاہر کرنا تھا، تو انہوں نے یہ خواب ان کو دکھایا۔ وہ خواب اتنا پریشان کن تھا کہ بادشاہ نے یہ قید لگا دی کہ میں اسے پیمبر مانوں گا، جو مجھے خواب بھی بتائے گا اور اس کی تعبیر بھی بتائے گا۔ جھوٹے پیغمبروں کو پتہ نہیں لگ سکتا تھا۔

اسے بتایا گیا کہ بنواسرائیل کا ایک شخص ہے جو نبی ہے اور غیب کی خبر بتاتا ہے۔ نبی کا ترجمہ ہی غیب کی خبر بتانے والا ہے۔ اگر آپ اسے کال کریں تو وہ شاید آپ کو بتائے۔ بادشاہ نے حضرت دانیال کو حاضر کیا۔ اس سے پہلے حضرت جبرئیل امین نے دانیال کو خواب اور اس کی تعبیر کی خبر دی اور کہا کہ اب ہم نے بادشاہ کو تیرے بس میں کیا ہے۔ بخت نصر حضرت دانیال کا معتقد ہوا۔ دانیال نے بادشاہ سے بنواسرائیل کو بچایا اور انہیں واپس یروشلم لے آئے۔ دوبارہ آبادی ہوئی، جو دوسری بار تباہ ہوئی۔ قرآن میں ان کا نام تو نہیں لیا گیا مگر ان کا ذکر کئی حوالوں سے کیا گیا ہے۔

ہندو اور تبدیلیٔ مذہب

اللہ کہتا ہے، جن لوگوں نے مجھ سے دنیا میں عزت و برکت چاہی، میں نے ان کو ہر چیز دے دی۔ وہ تو اس سے کچھ مانگ ہی نہیں رہے۔ اس کے لیے درخواست ہی نہیں کر رہے۔ میں آپ کو ہندو کی بات بتاؤں۔ سرگنگا رام یا دوسرے تیسرے ہیں۔ قبر میں چلے جاتے ہیں اور ملائکہ ان سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون تھا؟ اس جنگل میں وہ کس کا نام لے گا؟ شیوا، وشنو، برہما، کالی یا درگا کا، کس کا نام لے گا؟ اسی لیے خدا کہتا ہے کہ جنہوں نے مجھے خدا جانا، وہ گنہگار ہیں یا نہیں ہیں، ان پر میری بخشش لازم ہے۔ چاہے کچھ دیر کی سزا کے بعد ہو۔ ہندو کے گھر پیدا ہو کر مسلمان ہونا مشکل کام ہے، بجا۔ لیکن عقل کا کام ہی مشکل کام کرنا ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ شروع میں سب مواحد تھے، مگر لوگوں نے بت پرستی، سحر یا خدا سے دریغ قبول کیا۔

آپ کہتے ہیں مشکل کام ہے۔ پاکستان میں سوشلزم آیا۔ میں لاہور میں ٹیچر تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ

Marfat.com

دس کروڑ مسلمانوں میں سے دو کروڑ سوشلسٹ ہو گئے۔ ان کو ایک آئیڈیا پسند آیا مگر وہ آئیڈیا کس نہج کا تھا؟ ایک نوجوان طالب علم میرے پاس آیا۔ اس نے کہا' پروفیسر صاحب! میں تو سوشلسٹ تھا۔ باقی باتیں ان کی مجھے پسند تھیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہ خدا افیون ہے۔ آج میں آپ سے یہ بات پوچھنے آیا ہوں کہ میرے استاد نے کہا ہے کہ محمدؐ سرمایہ داروں کے ایجنٹ تھے' جن کو سرمایہ داری کے مفاد کے لیے استعمال کیا گیا۔ میں تو ساری عمر یہ سنتا رہا ہوں کہ حضورؐ ساری عمر بوریا پر سوتے رہے۔ کھانا بھی ایک وقت کا کبھی نصیب نہ ہوا۔ ساری عمر غربت' ناداری اور فقر میں گزاری۔ میرا دل نہیں مانا کہ ان کی یہ بات مانوں۔ میں نے کہا' تو بچ گیا ہے۔

اب بطور اصول آپ دیکھیں کہ اگر اس زمانے میں دو کروڑ سخت گیر مسلمان سوشلزم' کمیونزم کا عقیدہ رکھ سکتا ہے تو باقی قوموں کو بھی آگہی حاصل ہے۔ بڑا مسئلہ یہ نہیں کہ کسی کو جاننے کی ضرورت ہے کہ خدا ہے یا نہیں' بلکہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اس کو جاننے کا ذرا تردد نہیں کرتے۔

آل ابراہیم اور یہودی

اس کا فیصلہ قرآن حکیم نے کر دیا ہے۔ اگرچہ قرآن حکیم کی آیات ان الله اصطفی آدم و نوح و آل ابراهیم و آل عمران علی العالمین کہ ہم نے اولاد ابراہیمؑ اولاد نوحؑ اور عیسیٰؑ اور موسیٰؑ اور اولاد عمران کو برکت بخشی۔ ان کو زمین و آسمان میں غلبہ دیا اور کہا' یا بنی اسرائیل اذکرو نعمت التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العالمین ' اے بنی اسرائیل! ہم نے تم کو عالمین پر غلبہ دیا مگر جب بنو اسرائیل اس عہد کو پورا نہ کر سکے' تو خداوند کریم نے ان پر لعنت بھیجی اور کہا' وضربت علیهم الذلة والمسکنة وبآوبغضب من الله ذالک بانهم کانو یکفرون بایت الله ویقتلون النبیین بغیر الحق ذالک بما عصوا و کانو یعتدون کہ تم لوگوں نے میرے اس حق کی نافرمانی کی' جو میں نے تم پر کرم فرمایا تھا۔ تم نے اس میں گستاخی کی۔ میرے انبیاء کو قتل کیا اور میری حدود کی خلاف ورزی کی۔ میری کتابوں کو مسخ کیا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ میں نے تمہارے لیے مسکینی اور ذلت لکھ دی۔

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پروردگار نے بڑا واضح وعدہ فرمایا تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے کلمات سے آزمالیا تو فرمایا کہ میں نے امت انسانی پر تمہیں امام مقرر کیا۔ حضرت ابراہیم نے عرض کیا' قال من ذریتی' اے مالک کائنات! میری اولاد کا کیا بنے گا؟ فرمایا' قال لاینال عہدالظلمین' ہم ظالموں سے عہد نہیں نبھاتے۔ خداوند کریم نے تمام ظالم اہل یہود کو عہد سے نکال دیا اور اب یہ درود و سلام صرف انہی پر بھیجتے ہیں' جو ذریت ابراہیم علیہ السلام اور اس کے ساتھ ساتھ آل ابراہیم علیہ السلام ہونے کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔

آل ابراہیم کی وضاحت قرآن مجید میں اللہ کریم نے دی ہے کہ جب حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کنعان کے بارے میں کہا' اے میرے رب! کنعان میرا بیٹا ہے' جو پہاڑ پر رہتا ہے اور میری آل میں سے ہے' تو اللہ نے کہا' یہ تیری آل نہیں ہے۔ اس کے اعمال اس قابل نہیں ہیں' اس لیے ہمارا درود و سلام آل ابراہیم میں ان لوگوں تک پہنچے گا' جن پر اللہ کی طرف سے درود و سلام ہے۔ اولٰئک علیهم صلوٰت من ربهم و رحمة و اولٰئک هم المهتدون۔

Marfat.com

مدر ٹریسا کے لیے صلہ

اس شخص کے متعلق آپ کیا کہیں گے جو ایک پورے تکمیل شدہ مذہب پر رائے دیتا ہے؟ خدا نے پوری کائنات اپنے دوستوں کے لیے مرتب کی ہے۔ اپنے دوستوں کے لیے بنائی اور اپنے دوستوں کی محبت کو عام کیا۔ جیسے حج کی مثال لیجیے۔ تمام کا تمام حج ابراہیمؑ کی سنت ہے۔ ابراہیمؑ تو کب سے گئے' مگر اللہ کی محبت اور دوستی کا عالم یہ ہے کہ آج تک سنتِ دوست کو سلامت رکھے ہوئے ہے۔ اس کالے سیاہ پتھر کو دیکھیے کہ شاید اسے اتنا چوما گیا کہ بمشکل نظر آتا ہے۔ اس میں پتھر ہونے کے سوا کیا ہے؟ اس کی محبت کا یہ عالم ہے کہ آج تک لمس دست ابراہیمؑ کو ہم سے چھواتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس کو میرے دوستوں کے ہاتھ لگے ہوئے ہیں' اس پتھر میں اور کیا خوبی ہوسکتی ہے؟

اب اور ذرا دیکھیے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ نے کہا کہ حضورؐ سے پوچھا گیا' یا رسول اللہؐ! صفا و مروہ میں تو ابراہیمؑ مصروف نہیں تھے۔ کیا ہم اس کو چھوڑ نہ دیں؟ تو غیرت خداوند کا عالم دیکھیے کہ دوست کی بیوی جو پیغمبر نہیں ہے' اس کو بھی کہا' ایسا نہیں ہوسکتا۔ میرے دوست کی ایک ایک چیز میری دوست ہے۔ ان الصفا و المروۃ من شعائر اللہ' خبردار! سن لو! صفا و مروہ بھی اللہ کا طریقہ کار ہے۔ اللہ دوستی میں اتنا پکا ہے۔ وہ مدر ٹریسا' سینٹ آگسٹائن یا اور جو کوئی رہا ہو' جس کی نظر اس کے بہترین دوست پر نہیں پڑسکتی جو معرفت رسول سے لاعلم رہا۔ کائنات میں واحد وجہ غرض غایت کائنات سے غافل رہا۔ اس کا اللہ کے قریب کیا حق ہے کہ وہ اللہ سے انعام مانگے۔

ایک روایت کے مطابق اللہ نے کہا: کنت کنزا مخفیا ما اجبت ان اعرف فخلقت محمدا' کہ میں نے محمدؐ کو اپنے تعارف کے لیے پیدا کیا۔ خدا نے کہا: الحمدللہ رب العالمین' خدا نے کہا: کتب علی نفسہ رحمہ' میں عالمین کا رب تھا۔ میں نے تخلیقات کے لیے رحمت کو چنا اور تمام رحمت سمیٹ کر وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین' کیا اس شخص کو نظر انداز کر کے کوئی بارات عاشقانہ پاسکتا ہے؟ کیا اس کی محبت کے بغیر کوئی نقش و نگار پروردگار دیکھ سکتا ہے؟

کوئی صوفی ہو یا بہترین انسان' اس کی شناخت یہی ہے کہ وہ خدا کو جانتا ہے یا نہیں؟ دوسری اس کی شناخت یہ ہے کہ اپنی دوستی اور اپنے دوست کو پہچانتا ہے کہ نہیں؟ یہ دوست کتنی بڑی شے ہے کہ حضور گرامی مرتبتؐ کے سامنے سیدنا ابی بکر صدیقؓ نے شکایت کی' یا رسول اللہؐ! مجھ سے غلطی ہوئی تھی' عمرؓ بن خطاب کی وجہ سے۔ میں نے معافی مانگی۔ عمرؓ مجھے معاف نہیں کرتے۔ حضور گرامیؐ مرتبت طلوع آرائے مسند رسالت ہوئے۔ بار بار فرماتے تھے' تم میرے دوست کو بھی نہیں چھوڑتے۔ میرے دوست کو بھی نہیں چھوڑتے۔ حتیٰ کہ عمرؓ گھٹنوں کے بل رینگے اور کہا' پروردگار کے رسولؐ! غلطی ہوگئی۔ آئندہ تیرے دوست کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔

کسی بھی نیک اور پاک ہستی' زمین کی کیا حیثیت ہے۔ اس مقام پر' جہاں صرف محبت کا دخل ہے اور رسول گرامیؐ کے تسلیم کیے بغیر۔ پھر میں یہ بھی نہیں کہتا کہ ہمارا رسولؐ۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ جب تھامس کارلائل نے اس رسول پر ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ کتاب لکھی تو اس کا اپنا پیغمبر موجود تھا۔ لیکن اس نے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر کو بطور ہیرو منتخب کیا اور

Marfat.com

وہ حضرت محمدؐ تھے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب سو بڑے آدمی کتاب لکھی گئی وہ آپ نے نہیں لکھی' میں نے نہیں لکھی' کسی مسلمان نے نہیں لکھی۔ اسے تاریخ دانوں کے ایک گروپ نے لکھا۔ اس کتاب نے دنیا کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس کی چوٹی پر محمدؐ رسول اللہ تھے۔ کیا مدر ٹریسا کو یہ نظر نہیں آیا؟ اس کا اللہ اور اس کے دوستوں سے کچھ طلب کرنے کا کیا حق ہے؟

مدر ٹریسا کا انجام

مجھے تو مدر ٹریسا سے کوئی دشمنی نہیں ہے مگر اللہ کو اس سے ایک دشمنی ہے۔ وہ اس دور میں پیدا ہوئی جب اسے اچھی طرح یہ پتہ تھا کہ آدھے مذہب سے بات آگے بڑھ کر الیوم اکملت لکم دینکم تک پہنچ چکی ہے۔ حضرت عیسیٰ کے بعد محمد رسول اللہؐ آ چکے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ کے نزدیک اس پیغمبر کی اطاعت کے بغیر اسے شفاعت نہیں ملے گی۔ مگر مدر ٹریسا پھر بھی اللہ کے رسولؐ کو مان نہیں رہی۔ وہ کتنی ضدی ہے۔ ساری انرجی مخلوق کی خدمت میں لگا رہی ہے۔ اللہ میاں نے کہا' اچھا میں بے انصافی نہیں کرتا جن کے لیے کام کر رہی ہو' وہ تمہیں بہت عزت دیں گے۔ میرے لیے تو' تو نے کچھ نہیں کیا۔ میرے ساتھ ناانصافی کی۔ میرے دوست کو دھتکار دیا۔ جانتے ہوئے بھی میری محبوب ترین شخصیت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ہاں تجھے خلق سے محبت ہے' خلق تجھے بڑی تعظیم دے گی۔ تو نے خلق کی خدمت کی ہے' خلق تیری خدمت کرے گی۔

اصولاً دیکھا جائے تو مدر ٹریسا کا کوئی حق اللہ پر نہیں بنتا۔ جو حق بنتا ہے' اللہ رب العزت نے اس کو مکمل واپس کر دیا ہے۔ آج وہ دنیا کے ہر اخبار کی زینت ہے۔ جتنی پروجیکشن وہ مانگ سکتی تھی' اسے مل چکی ہے۔ جتنی عزت اسے اس صلے میں دی جا سکتی تھی' وہ اس کو دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اللہ سے کیا مانگتی ہے؟ وہ جنت کیوں مانگتی ہے' اس کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔ جو اس کو چاہیے تھا' وہ اس کو مل چکا۔

کافر بچے کا انجام

حضورؐ کی کسی بات کو اشتباہ کی نظر سے دیکھنا ایک قدرتی امر ہے۔ یہ سب کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے' مگر آپ اس حدیث کو دیکھیں کہ اس میں قطعیت نہیں برتی گئی۔ کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی گئی کہ کافر بچہ ضرور جہنم میں جائے گا اور مسلمان بچہ لازماً جنت میں جائے گا۔ اگرچہ میرے پاس ایک دلیل ہے کہ کافر بچے کو جہنم میں جانا ہے اور وہ دلیل پیش کرتا ہوں۔ رسولؐ نے یہ بات نہیں کی۔ رسولؐ نے وہ بات کی' جو ان کے شایان شان تھی کہ انہوں نے ذمہ داری اللہ پر ڈال دی۔ میں اللہ کی نیت کو نہیں جانتا اور میں اس بات کو قطعیت سے نہیں کہہ سکتا کہ کافر کے بچے کا انجام کیا ہوگا مگر انسانی تعقل کو اپلائی کرتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جبریت کے علت و معلول کے ردّ و بدل میں ایک جبریت کا رجحان ہے۔ اس کے مطابق اگر آپ نے آئس کریم بنائی ہو اور آپ آئس کریم کے اجزا ہی ڈال رہے ہوں' اس توقع کے ساتھ کہ اس میں سے آئس کریم نکلے گی تو اس میں سے گاجر کا حلوہ نہیں نکل سکتا۔ یہ بات سبب اور نتیجہ کے ردوبدل میں محال ہے۔ اس میں یہ ہو سکتا ہے کہ اچھی نہ نکلے' گندی آئس کریم نکلے۔ کھانے کے قابل نہ ہو۔ اس کے ذائقے میں کمی بیشی ہو مگر یہ ہرگز نہیں ہو

سکتا کہ اجزا کی فطرت ہی تبدیل ہو جائے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ایک کافر کے بچے کو اس کے جینیٹک اور موروثی اثرات سے کیا ملا ہے؟ ایک بچے کے ماں باپ کی طرف سے اس کے جینز پر فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کی ایسی زندگی پر فیصلہ ہوتا ہے' جس کو پہلے سے کرپٹ نہیں کیا گیا۔ تو پھر وہ بچہ وہی نکلے گا' جو اس کے ماں باپ کی خواہش اور ان کا فیصلہ ہے۔ جب تک کہ وہ بلوغت تک نہ پہنچے اور سوچے سمجھے نہیں۔

ہر بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ دین فطرت سے مراد یہ ہے کہ اس بچے کو پیدا ہونے کے بعد جو سوشل سیٹ اپ ملے گا اور جن سماجی حالات سے اسے واسطہ پڑے گا' ان پر وہ غور وفکر کرے گا۔ غور وفکر میں وہ قبولیت ظاہر کرے گا جو اس کے والدین کر چکے ہیں۔ خدا کی طلب کسی کافر یا مسلمان کے بچے میں ہوگی' تو وہ بالآخر اللہ کریم تک ضرور پہنچے گا۔ بہت سارے مسلمانوں کے بچوں میں یہ آرزو پیدا نہیں ہوتی۔ بہت سارے ہندوؤں کے بچے میں یہ آرزو پیدا ہو جائے کہ وہ حقائق کو پرکھیں اور جانیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آرزو اور خواہش کی سطح پر ابتدائے زندگی کے لیول میں ہر بچہ اپنے لیے کوئی بھی آرزو تعین کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کی سلیٹ صاف ہے' جس پر اثرات بار بار وارد ہو کر یا اس کے جینیٹک اور مادرانہ پدرانہ اثرات کو ثابت کریں گے یا اسے رد کریں گے۔

دین فطرت سے قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ وہ اللہ کے بارے میں پڑھا لکھا ہے۔ شریعت تو بڑی سادہ سی ہدایت دے رہی ہے کہ چودہ پندرہ سال تک کسی بچے کو جواب دہی نہیں ہے' جب تک اس کی بلوغت نہیں ہوتی۔ جب تک وہ بالغ نہیں ہوتا' وہ شرع کے امور کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔

لیکن جہاں تک اس کے سیکھنے کے ذرائع اور اس کے تحصیلی رویوں کا تعلق ہے' وہ بڑے صاف ستھرے ہیں۔ وہ بچہ اپنے انسٹرومنٹ سے کے ایل گابا بھی نکل سکتا ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ بارکر بھی نکل سکتی ہے' جو اپنے اپنے دین میں یا اپنے اپنے موضوعات میں بڑے متشکل تھے۔ کوئی رومن کیتھولک بھی بن سکتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی مسلمان کسی وقت اپنا رویہ تبدیل کر سکتا ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں وہ بچے' جو مسلمان پیدا ہوئے۔ مارکسزم اور ماؤازم کے فلسفے کے تحت انہوں نے اپنے پیغمبر کو یہ بھی کہا کہ وہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ تھے۔

Marfat.com

جستجو و آرزوئے خدا

میں نے ایک سال سے آپ کے اندر جستجو اور آرزوئے فراق کو زندہ رکھا ہے' اس سے آپ زندہ ہیں۔

تو نمی دانی ہنوز چیست ، حیات دوام
چیست حیات دوام سوختن ناتمام

حضرت شیخ شہاب کے پاس جب خواجہ بہاء الحق نقشبند گئے تو تین دن کے بعد آپ نے اسے کلاس سے فارغ کر دیا۔ دوسرے شاگردوں کو بڑا اعتراض ہوا کہ حضرت ہم سالہا سال کے بیٹھے ہیں' یہ اتنی جلدی فارغ ہو گئے ہیں۔ آپ نے کہا' تم گیلی لکڑیاں ہو۔ دھواں دیتی ہو۔ وہ خشک لکڑی تھی' جل کر خاک ہو گئی۔ اگر اضطراب' تجسس اور حقیقت کے سراغ کے ہم معنی ہو' تو یقیناً اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک ڈھونڈنے والے دل سے بڑا سراغ رساں کوئی نہیں ہوتا' مگر اگر اضطراب و جستجو سے مراد جبلتوں کی طرف رجحان ہے تو پھر بھی یہ ایک جہاد بالنفس ہے جس کی جدوجہد میں ہم پڑے ہوئے ہیں۔ مگر اگر اضطراب سے مراد نالائقی' مایوسی اور نامرادی ہے تو پھر ہم یقیناً ناکام ہو رہے ہیں۔

ہم میں سے اس تیسری صورت میں کوئی نہیں۔ کوئی فرد اس اعتبار سے ناکام نہیں ہو رہا بلکہ ہر شخص اپنی ذات کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے۔ ہر آدمی سچائی' حقیقت اور اپنی ذات کے بارے میں جاننے کی فکر کا امکانی حد تک نفیس کام کر رہا ہے۔ ہم اس تقابل کو مزید بڑھا رہے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ ہم مزید اضافی خصوصیات کو سیکھیں۔ ہمارے لوگ دنیادار ہیں۔ ہم میں سے کوئی دنیا سے باہر نہیں بیٹھا ہوا۔ کسی نے جنگل کا رخ نہیں کیا۔ کسی نے حجلہ نشینی نہیں اختیار کی اور کوئی بھی گوشہ نشین نہیں ہوا۔ ہم ٹھیک دنیا کی منجدھار میں اپنی ذات کے خلاف سخت ترین جنگ میں شریک ہیں۔

میں آپ کو بھی اس جہاد کا یقیناً بہت بڑا مجاہد سمجھتا ہوں اور وہ بھی' جنہوں نے کہاں کہاں سے اپنی زندگیاں شروع کی ہیں۔ کس کس مقام پر ذہنی اور اخلاقی جدوجہد شروع کی ہے۔ کہاں وہ پیچھے رہے' کہاں آگے گئے لیکن جدوجہد میں پیچھے جانا حکمت عملی ہو سکتی ہے' شکست نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم اپنے ذہن کو سچائی اور حقیقت کے بارے میں برانگیخت کر سکیں تو ہم اپنے آپ کو کامیاب کہہ سکتے ہیں۔ میں یہاں خدا کو ضرور زندہ دیکھتا ہوں' اس لیے کہ یہ واحد مجلس ہے' جس

Marfat.com

میں لوگ محض اس لیے اکٹھے ہوئے کہ وہ خدا کی کچھ اور باتیں سنیں۔ خدا کو یقیناً اس بات پر تفاخر ہوگا کہ کچھ تو لوگ ہیں' جو میری بھی سنتے ہیں اور میرے بارے میں بھی بات سنتے ہیں۔

تعقل' دلیل' شناخت خدا

اس لفظ کو جو اتنا اوپر چڑھا دیا جاتا ہے کہ خدا بے دلیل سمجھا جاتا اور بے دلیل جانا جاتا ہے۔ خدا کے لیے کوئی دلیل ہی کوئی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب خدا کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ تو اللہ کو ہمیں عقل سکھانے کا کیا حق ہے؟ اگر خدا نے اپنے لیے عقل کے رستے کھلے نہیں چھوڑے اور اس نے اپنی شناخت اور اپنی جان پہچان کے لیے عقل کا رستہ نہیں کھلا چھوڑا تو کیا وہ نعوذ باللہ ایسے نفاق والا رب ہے کہ جو چیز اپنے لیے پسند نہیں کرتا' تمہارے لیے پسند کرتا ہے؟ قرآن میں تو ایسا نہیں ہے۔ اللہ کہتا ہے جو ہلاک ہوا' وہ دلیل سے ہلاک ہوا۔ جو زندہ ہوا' وہ دلیل سے زندہ ہوا۔

ادھر تو اللہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔ ادھر ہم نے رٹ لگائی ہوئی ہے کہ ایک اندھا دھند اعتبار اور ایک اندھا دھند اعتقاد ہی خدا کی طرف لے کر جاتا ہے۔ اب اندھا دھند اعتقاد کرنے والوں کو ذرا خدا کی نظر میں دیکھئے' تو آپ کو یقین ہوگا کہ شاید ہماری تمام بنیاد تعلق خداوندی غلط ہے۔ خدا کہتا ہے بدترین جانور وہ ہے جسے میں نے انسان تو بنا دیا لیکن وہ اندھا اور بہرہ ہو کر میری کتاب پر گرتا ہے اور عقل استعمال ہی نہیں کرتا۔ ان قرآنی آیات کے بعد کیا گنجائش رہ جاتی ہے کہ ہم اندھے اعتقاد کو اختیار کریں۔

دنیا تو پراگریسو میٹریل سے بھری ہوئی ہے۔ جگہ جگہ آپ کے رستے رکے پڑے ہیں۔ آپ کی تعقلی فراست کو روکا جا رہا ہے اور اس کے توسط سے خیال خدا کو روکا گیا۔ شیطان کو آپ کے کردار سے تعلق ہے نہ اس کو آپ کو گمراہ کرنے سے دلچسپی ہے۔ وہ تو صرف آپ کو اغوا کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ آپ سے گناہ وغیرہ نہیں کرانا چاہتا۔ یہ اس کا مقصد ہی نہیں ہے۔ وہ صرف آپ کو اس بنیادی عقیدے جو عقل و شعور کی مدد سے خدا کی پہچان میں مدد دیتا ہے' سے تھوڑا سا ہٹانا چاہتا ہے۔ آپ کو انٹلکچوئل اور دانشور بنانا چاہتا ہے۔ آپ کو رسل' وڈ کانسٹائن' واٹسن اور ہاکنز بنانا چاہتا ہے مگر وہ بندۂ خدا نہیں دیکھ سکتا۔

اس نے کہا' میں آسمانوں سے آؤں گا۔ زمینوں سے آؤں گا۔ دائیں بائیں سے اور اوپر اور نیچے سے آؤں گا اور اے پروردگار! میں حضرت انسان کو تھوڑا سا اغوا کروں گا۔ آپ گناہ و ثواب کو اغوا سمجھتے ہیں۔ گناہ و ثواب تو ٹیکنالوجی کا حصہ ہے۔ ایک آدمی کی جبلت بہت طاقتور ہے۔ جبلت میں غصہ بہت ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ ایک دن میں نکل جائے گا؟ وہ بار بار غصے کو ایکسرسائز کرے گا۔ اس غصے کی وجہ سے جوتیاں کھائے گا۔ کبھی جیل جائے گا۔ کبھی اس کو عقل آئے گی کہ آئندہ پانچ دس سال کے بعد غصہ کرنا بند کر دے۔ جبلتیں ایک دن میں قابو میں نہیں آتیں۔ امام جعفر صادق کے بقول' توبہ آسان ہے' ترک گناہ مشکل ہے۔ یہ ترک گناہ کبھی عادت بن جاتی ہے اور عادت کا چھوڑنا بڑا مشکل ہے۔ حتیٰ کہ 62 سال کا ہو کر اور زندگی بھر خدا کے بارے میں سوچ و بچار کے باوجود سگریٹ تو میں ابھی تک نہیں چھوڑ سکا۔

خدا تو وہ ہے جو نیچر بنا رہا ہے۔ وہ تو تخلیق کر رہا ہے۔ میں یہاں ایک چھوٹی سی دعا آپ کو رسول اللہ کی بتا دوں

اور میں نے اپنی زندگی میں پیغمبرؐ سے زیادہ انٹلکچوئل شخص کسی کو نہیں دیکھا۔ جب وہ کوئی بات کرتے ہیں تو ان کے لہجے سے ان کا ذہنی سٹینس سامنے آتا ہے۔ ان کے اندرونی نیچرل سٹینس کی جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ اے پیغمبر! اگرچہ تو بہت بڑا پیغمبر ہے اور زمین پر تیرے جیسا وجدانی اور انٹلکچوئل کوئی نہیں ہے۔ الہام تجھ پر ختم ہے۔ قرآن تجھ پر ختم ہے۔ تو ختم المرسلین اور خاتم النبیین ہے اور ختم زبانت یہ ہے کہ اب انسان نے تھوڑا تھوڑا تجھ سے سیکھنا اور لینا ہے مگر اس کے باوجود فرمایا کہ اے پیغمبر! یہ کہنا قل رب زدنی علم اے اللہ! میرا علم بڑھا' اس لیے کہ تو جس کا دوست ہے' اس کا علم کبھی ختم نہیں ہونا' یعنی اللہ ایک ایسی انتہائے علم ہے جس کے علم کا کوئی حساب و کتاب نہیں ہے' اس لیے بہترین عالم بھی اللہ ہی سے بہترین سمجھ سکتا ہے۔

اللہ سے ایک عجیب سی دعا حضور گرامی مرتبت علم کے بارے میں مانگا کرتے تھے۔ **اللھم نبنی بحقیقت للاشیا** دیکھئے! رسل کے بیان پر دوبارہ غور کیجیے وہ کہتا ہے کہ:

"We only know the relationship of things. We don't know the nature of things."

ہم صرف اشیاء کے تعلق کو جانتے ہیں' ان کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ ذرا رسول اللہ کی دعا پہ غور کیجیے کہ اللھم نبنی بحقیقت للاشیا' اے پروردگار! مجھے اشیاء کی فطرت کا علم دے۔ کتنا اپروچ کا فرق ہے۔ ایک شخص' جو بصیرت کے اعلیٰ ترین مقامات پر فائز ہے جو خدا پر شاہد اور خدا کا نظیر ہے۔ وہ پھر بھی ملتجی ہے کہ اے پروردگار! تو مجھے اشیاء کی فطرت کا علم دے۔

علم کے تین مقاصد بیان کیے گئے تھے۔ ایک وہ علم ہے جو آج ہم سب سیکھ رہے ہیں اور دے رہے ہیں۔ یہ نارمل علم کا وہ رینک ہے' جو ہماری زندگی کو سہل بناتا اور اس میں سختیوں کو کم کرتا ہے جو بحران زندگی کو کم کرنے کے لیے ہم نے خود بنایا ہے جیسے ٹریفک کے قوانین ہیں۔ ہم نے کہا' یہ جو مسلسل متصادم معاشرے کی حرکیات ہیں' ان میں کچھ سہولت تخلیق ہو۔ ہم نے بینکوں کے قوانین بنائے۔ یہ علم ہمیں زندگی گزارنے میں آسانی دیتا ہے۔ اس سے بھی ذرا بہتر مقصد وہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص یہ جنون رکھتا ہو' جیسے سقراط میں تھا۔ وہ عالم بننے کا بڑا جنون رکھتا تھا۔ بڑی دیوانگی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں سب سے بڑا عالم بنوں۔ وہ گاڈس آف ڈیلفی کے پاس گیا' پیتھنس کے پاس۔ اس سے کہا' سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اس نے کہا تو ہے۔ سقراط کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے؟ اس نے کہا' نہیں نہیں میں کیسے جانوں گا۔ اس نے کہا' جا ذرا چکر لگا' مذہب دنیا کے لوگوں کو دیکھ' ان کو جانچ پرکھ کر آ۔

وہ ایک موچی کے پاس آیا۔ کہنے لگا' میں عالم نہیں ہوسکتا۔ مجھے تو جوتی بنانی نہیں آتی۔ میں دو چار دن تیرے پاس بیٹھ جاؤں۔ چند دن بیٹھا۔ ٹانکے ٹونکے لگانا آسان تھے' اس نے لگا لیے۔ پھر اس نے اس کو کہا کہ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تو ذرا جوتی کو اس طرح سی دیا کر۔ موچی نے کہا' جا بھئی کام کر۔ ہمیں صدیوں سے اسی طریقے کا پتہ ہے تو کہاں سے اختراع کار آ گیا۔ سقراط اٹھا۔ اس نے کہا' اس کا علم تو میں نے حاصل کرلیا۔ یہ میرا علم نہیں لے سکا۔ جب سارے پروفیشنلز کے پاس سے ہو کر آ گیا' تو اس نے کہا' اصول یہ کھلا ہے کہ تھوڑا تھوڑا علم تو میرے پاس ہے مگر جو کچھ میں جانتا ہوں' وہ کسی کے پاس نہیں۔ اس لیے میں سوسائٹی میں سب سے زیادہ علم والا شخص ہوں۔

Marfat.com

ایک علم کا مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے زمانے کے بہترین علماء میں شمار ہوں۔ بہترین اتھارٹی علم کی ایک یقینی انتہا کو حاصل کریں۔ ماہرین کے ماہر ہوں۔ مگر یہ مقاصد حیات پست تر ہیں۔ خدا کے اِن تمام علم کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ آگہی وعرفان ذات خدا اور اس کی پہچان ہے۔

تعلق باللہ اور ترقی

میں واحد استاد ہوں' شاید اس زمانے میں اور پرانے زمانے کے لحاظ سے بھی کہ جس نے سب سے پہلے علم اور معرفت کے لیے جدوجہد شروع کی ہے۔ ہم تصوف میں ان تمام سکولوں کو رد کرتے ہیں' جو اندھا دھند تقلید پر ابھارتے ہیں۔ اس تمام عرصے میں اگر آپ میرے موضوعات ہی دیکھ لیں' ان کا تعلق قطعاً کسی روایتی موضوع سے نہیں ہوتا بلکہ قرآن کے اعلیٰ ترین موضوعات کے اوپر ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ مذہب پر گفتگو کے آغاز سے پہلے میں نے پوری کوشش کی کہ میں ہر اس سوال کو دیکھوں۔ ہر اس مسئلے کو سمجھنے اور سوال کو جاننے کی کوشش کروں' جو خدا کے حق میں یا اس کے خلاف جاتا ہے جو لوگوں کے ذہن میں اعتراض یا شک وشبہ کی فضا پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ پروردگار عالم نے بڑی وضاحت سے اپنی انتہائی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان شر الدواب عندالله صم بکم الذین لایعقلون کہ بدترین جانور انسانوں میں میرے نزدیک وہ لوگ ہیں' جو اندھے' بہرے اور گم سم ہو کر میری آیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور غور وفکر نہیں کرتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تقلید اور سنے سنائے عقیدہ کے اتنا سخت مخالف ہے کہ مسلسل اہل کفر کو قرآن حکیم میں طعنہ دیتا ہے کہ اگر تم عقل رکھتے اور اپنے آباؤ اجداد کے دین پر تھوڑا سا غور کرتے تو تمہیں حقائق کا پتہ چل جاتا۔ سچائی کا کھوج مل جاتا اور تم کبھی بھی خدا سے غافل نہ رہتے۔ یہ پروردگار وہ ہے' جسے علم سب سے زیادہ پسند ہے۔ جو علم سے محبت رکھتا ہے۔ جس نے اپنی شناخت علم میں رکھی ہے اور ہر موضوع میں رکھی ہے۔ یہ نہیں کہ دینی تعلیم میں رکھی ہے' بلکہ جب اپنی شناخت اور اپنی تسبیح اور اذکار کا ذکر کیا تو بڑی وضاحت سے کہا' الذین یذکرون الله قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون فی خلق السمٰوت والارض' کہ میرے بہترین بندے وہ ہیں' جو صبح' دوپہر' شام تسبیح کرتے ہیں۔ لیٹے' بیٹھے کروٹوں کے بل کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ زمین وآسمان کی تخلیقات پر غور بھی کرتے ہیں۔

مصیبت یہ ہے کہ مسلمان کے پاس سائنٹفک طرز فکر نہیں رہا۔ معروضی حقائق کی سمجھ بوجھ نہیں رہی اور صرف موضوعی اور داخلی رجحانات پر بنیاد کر کے وہ جو تعلیم دینا لینا چاہتے ہیں' اس کی مغربی اقدار اور اعلیٰ معیار کے مطابق کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے ہم لوگ مغرب کی نظر میں ناکارہ سمجھے جاتے ہیں اور خود اپنی نظروں میں بھی گر جاتے ہیں۔

یونیورسٹیاں ضرور بنائیے' مجھے بھی موقع دیجیے۔

جہاں تک کسی ادارے کی خود تشکیل کا سوال ہے' پتہ نہیں' آپ کے پاس علم کی کیا شناخت ہے؟ مگر میں جن استادوں کا ریزہ چین ہوں' ان کا کہنا ہے کہ علم جب بہت بڑھ جاتا ہے تو آدمی جبریت کا مکمل قیدی ہو جاتا ہے۔ اس معاملے میں' میں جبریت کا قائل ہوں اور ابھی سیکھنے کے مراحل میں ہوں۔ جب اللہ چاہے گا' اس قسم کے اسباب مہیا ہوں

Marfat.com

گے۔لوگ آگے آئیں گے اور وہ میری استعانت کریں گے۔ہم ایک بہت جدید ہائی کلاس' ٹاپ یونیورسٹی تعمیر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

اللہ کا دائمی ساتھ

خدا کی رضا اور دائمی ساتھ ہر دور میں ایک بہت بڑا متصوفانہ تصور رہا ہے۔تصوف ان ادوار میں' جن سے ہم گزر کے آئے ہیں۔ایک انتہائی پیچیدہ عمل ہو گیا تھا' جس کی وجہ سے ایک عام آدمی نے اسے اپنی زندگی سے بالکل نکال دیا تھا۔میں نے پروردگار سے عرض کی کہ نہ میرے پاس صائم الدہر ہونے کے عناصر موجود ہیں نہ ہی میں ضرورت سے بہت زیادہ نمازیں پڑھ سکتا ہوں۔حالات اور واقعات کے تحت میں اتنا مصروف ہوں کہ شاید میں تیرے احکامات کی بمشکل پابندی کر سکوں۔جو ہمارے اردگرد آثار موجود ہیں' ان کے تحت لذات' فواحشات اور اپنی خواہشات اتنی زیادہ ہیں کہ ان میں شاید میں ثابت قدم بھی نہ رہ سکوں۔کیا ان حالات میں میری نیت اور اخلاص کے مطابق تو مجھے نظر انداز کر دے گا کہ تو صرف طاقتور لوگوں کا خدا ہے یا شاید تو بایزید اور ذوالنون مصری کو مل سکتا ہے؟ ہم جیسے کمزور لوگوں کو نہیں ملتا؟ میں نے اسے کہا کہ ان تمام باتوں کے پیش نظر' جو مجھے درپیش ہیں' میں تجھے صرف ایک چیز پیش کر سکتا ہوں۔میرا تجھ سے صرف ایک وعدہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ مخلص رہوں گا۔بس اتنا ہی۔

میرے پروردگار نے جو اس کے بدلے میں مجھے صلہ بخشا۔عنایات عطا فرمائیں۔علم و حکمت میں سے جو خیرات بخشی' وہ ایسی تھی کہ میرا نہیں خیال کہ میں کسی بھی پرانے صاحب تصوف سے حاسد ہوں۔ان پر اللہ کی عنایات اپنی جگہ' میرے سامنے ایک قانون بڑے واضح طور پر آیا ہے کہ تمام انسان' صوفی ہوتے ہیں' صوفی ہو سکتے ہیں۔تصوف کوئی غیر معمولی ہونا نہیں بلکہ تصوف نام ہے' نارمل ہونے کا۔تصوف اللہ کے توسط سے اپنی بے محابا حیوانی جبلتوں کو اعتدال میں لانے اور خدا کے احکامات کے تحت حدود اللہ سے تجاوز نہ کرنے کا نام ہے۔تصوف باطن اور ظاہر دونوں خطاؤں سے ذہناً اور بدناً بچنے کا نام ہے۔اس لیے جب مجھ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ طریقت کیا ہے اور شریعت کیا ہے' تو میں ان سے کہتا ہوں کہ طریقت شریعت کی نیت ہے۔

جن اعمال شرع کے پس منظر میں خدا کی خواہش ہے' وہ طریقت ہے اور جو اعمال شرع محض شریعت کے لیے سرانجام دیئے جا رہے ہیں' وہ شریعت ہیں۔ان سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔شاید اسی لیے میں نے یہ طویل لیکچر دیا ہے کہ آپ اپنی عبادات کو ضائع نہ کریں۔آپ کی عبادات اس وقت ضائع ہوتی ہیں' جب صاحب عبادات کا تصور نہیں ہوتا۔کم از کم ایک سادہ سی خواہش تو پال لیں کہ کبھی نہ کبھی ہم خداوند کریم کی ہمسائیگی میں جا تریں گے۔

آپ کے تمام سوالات بنیادی طور پر ایک ہی سوال کو ریفر کرتے ہیں۔وہ یہ ہے کہ فرض کیجیے خدا نہیں ہے تو یہ تمام سوال' سوال بن جائیں گے اور ان تمام کے جوابات فرضی' نظریاتی اور فلسفیانہ ہوں گے' لیکن سچائی پر مبنی نہیں ہوں گے۔اگر خدا ہے' تو یہ تمام سوالات مفروضے اور دھبے بن جائیں گے اور ان کا وجود کسی طور بھی قائم نہیں رہ سکتا' چنانچہ ہمیں اپنے کو بنیادی سوال کی طرف رجوع کرنا ہوگا کہ مذہب تو سرے سے اہم ہے ہی نہیں۔مذہب کو ہم ایک ایسے قانون کے

Marfat.com

طور پر جانتے ہیں' جو کسی فرضی یا حقیقی رب نے ہمیں زندگی گزارنے کے لیے دیا ہے۔ اگر وہ فرضی ہے' تو ہمارے وہم کی پیداوار ہے یا کسی صحرا میں کھڑے بے بس انسان کا احساس ہے' جب اسے اپنے اردگرد سے خوف پیش آیا۔ یا شاید یونانی میتھالوجی میں چشموں کے قریب سے گزرتے یا فصلوں کی سرسراہٹ سنتے ہوئے کسی کو اپنے پیچھے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے اس کا نام پین گاڈ رکھ لیا اور وہاں سے Panthyism شروع ہو گیا۔

بہت سارے خدا جو زمانے نے بنائے یا انسان نے تخلیق کیے' معاشرے میں یا علم الاصنام میں ہیں' وہ زیادہ تر ان کے خوف و وحشت اور ان کی توقعات کی وجہ سے پیدا ہوئے' مگر یہ تبھی ممکن ہے' جب خدا نہ ہو۔ ہمیں جو ایک خدا کا تصور ملا ہے' ہمیں پوری اجازت ہے کہ ہم اس کی نفی کریں۔ خدا کا انکار کریں مگر ہمیں انکار کرانے والا کہتا ہے کہ تمہارا انکار علم کے لیے اور یہ جاننے کے لیے ہونا چاہیے کہ میں ہوں یا میں نہیں ہوں۔ تمہارا انکار ایک خیال یا ایک واہمہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ مسلسل تحقیق کا عمل ہونا چاہیے۔ اگر آپ پندرہ برس میں علم سیکھ رہے ہیں اور انکار کی حالت میں ہیں اور علم سیکھتے ہوئے تیس برس کی عمر میں جا کر خدا کو ماننے والے ہیں' تو یہ اللہ کو زیادہ قابل قبول ہے بہ نسبت اس کے کہ آپ بغیر سوچے سمجھے 30 برس کی عمر کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے پہنچیں۔

کلمے پر غور سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا کلمہ ہی جدلیات فکر کا ہے لا الہ الا اللہ یعنی خداوند کریم نفی سے انسان کو اثبات کی طرف لے کر آتا ہے۔ پہلے یہ کہو کہ کوئی اللہ نہیں۔ پھر تم الا اللہ تک پہنچو گے۔ کسی کو یہ کہنے سے پہلے کہ یہ اللہ نہیں ہے' یہ سمجھنا پڑے گا کہ یہ اللہ ہے۔ شواہد اور غور و فکر کے بعد تم غیر ضد خدا کو رد کرو اور پھر الا اللہ تک پہنچو۔

سو اسلام میں اللہ نے جو ہمیں قانون دیا ہے' وہ ایک بنیادی جدلیات سے شروع ہوتا ہے اور بنیادی جدلیات میں اس کا قول مبارک ہے کہ دیکھو' مجھ پر اس وقت تک تم یقین نہیں لا سکتے' جب تک کہ تم دوسرے خداؤں کو ترک نہیں کرو گے۔ ظاہر ہے کہ پراسس عقیدہ ایک سادہ اعتبار کا نہیں ہے۔ یہ ایک انتہائی مشکل فیکلٹی' انتہائی سوچ سمجھ اور غور و فکر اور ایک انتہائی تیز جدوجہد کا نام ہے' جس کے ذریعے ہم معاملات اور حقائق کو پرکھتے ہیں اور بالآخر کسی خدا کے یقین تک پہنچتے ہیں۔

اب ایک اور نقطہ' نظر کہ اللہ نے بہت سے پیغمبروں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست کہا بلکہ اس سے اتنا خوش ہوا کہ کہا' انی جاعل للناس اماما' میں نے تجھے تمام الناس کا امام مقرر کیا۔ اولادِ ابراہیم کو بھی ممتاز کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام میں وہ کیا صفت تھی کہ انہیں اولادِ بنی آدم کا سردار کہا؟ قرآن میں وہ کیا پراسس لکھا ہوا ہے' جس میں وہ اپنے زمانے کے مروجہ خداؤں کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر ان کو بحث و تمحیص اور تحقیق کا موضوع بناتے ہیں اور پھر انہیں رد کرتے ہیں۔ جب ستارہ چڑھا تو ابراہیم نے کہا' ھذا ربی یہ میرا رب ہے۔ جب ڈوب گیا تو کہا' نہیں' میں زوال پذیر کو خدا نہیں سمجھتا۔ ابراہیم نے ایک ایسی کسوٹی سامنے رکھی جس کو لے کر وہ اپنی بحث اور اپنی منطق کو آگے بڑھا سکتے تھے۔ ان کی کسوٹی یہ تھی کہ خدا کوئی بھی ہو' وہ ہو گا جو زوال پذیر نہیں ہو گا۔ خدا لازوال ہے' جن چیزوں کو انہوں نے اپنے اعتبار پر پرکھا' ان کو زوال پذیر پایا۔ حتیٰ کہ وہ اس حتمی نتیجے پر پہنچ گئے کہ میرے اردگرد ستاروں میں کوئی خدا نہیں ہے۔ سب زوال پذیر ہیں۔

Marfat.com

جب وہ اس مقام عقل تک پہنچے تو انہوں نے تسلیم کیا اور ان کا دانشورانہ یقین پورا ہوگیا۔ پھر بھی ابراہیم علیہ السلام کو خلش رہی۔ قال رب ارنی کیف تحی الموت کیا تو مجھے دکھا سکتا ہے کہ مردہ کو زندہ کیسے کرتا ہے؟ اللہ نے کہا' اولم تومن اتنی ذہنی مشقت اور اتنے تردد کے بعد بھی تو اس بات پر ایمان نہیں لایا؟ ابراہیم نے کہا' بلا ولکل یطمئن قلبہ' ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مکمل ذہنی طور پر قائل ہو چکا ہوں مگر میرا دل ہے' جو مشاہدے کی طلب کرتا ہے۔ یہ پراسس علم الیقین سے عین الیقین کی طرف بڑھنے کا ہے۔

جب میں خدا کے تصور پر ریسرچ کر رہا تھا' تو میں نے ان تمام دلائل کو رد کیا' جو فلسفے یا منطق سے نکلتے تھے۔ میرے خیال میں کوئی بھی فلسفیاتی دلیل کسی دوسری فلسفیاتی دلیل سے رد ہو سکتی تھی اور اقبال کے بھی Cosmological' Teleological' Antological دلائل کے بعد بہت سے فلاسفرز نے دھجیاں اڑا دیں۔ Logical Positivists اور دیگر فلاسفروں نے اس کے تمام تشکیل الٰہیات کے فلسفے کو رد کر دیا۔

میں کسی دلیل کی تلاش میں تھا' جو اقبال کی تشکیل الٰہیات جدید کو آگے بڑھائے۔ ایسی دلیل جس کی بنیاد فلسفے پر نہ ہو۔ آیا مجھے خدا کا دفاع اپنے ذمے لینا تھا؟ میں اتنی بڑی ذات گرامی اور حقیقت مطلقہ کا اتنا ادراک ہی نہیں رکھتا کہ میں اس کا دفاع کر سکوں۔ چنانچہ مجھے کوئی اور طریقہ ایسا ڈھونڈنا تھا' جس سے میں خدا کے اثبات کا تعین کر سکوں۔ میرا یقین تھا کہ اگر خدا خدا ہے تو اس نے ہر زمانے میں اپنے لیے ناقابل شکست دلیل رکھی ہوگی۔ اگر وہ خدا ہے' تو مجھے اس دلیل تک پہنچنا ہے۔

میں اس دلیل تک اس وقت پہنچا' جب میں نے قرآن حکیم کی پہلی آیت پڑھی جس میں اللہ نے کہا' الم ذالک الکتاب لاریب فیہ' یہ وہ کتاب ہے' جس میں کوئی شک نہیں۔ یہ میرے لیے تھیسز بن گئی۔ خدا اس آیت کو لکھنے کے بعد ایک عجیب سے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہہ رہا ہے کہ اے معترض! کوئی شک ہے تو نکال لاؤ۔ مجھے ایسے لگا' جیسے یہ آیت میرا منہ چڑا رہی ہو اور کہہ رہی ہو کہ تو جو اپنے آپ کو دانشور اور عالم سمجھتا ہے' بہت ساری کتابوں کا حافظ سمجھتا ہے تیرے پاس جدید Skepticism کے لاز ہیں۔ تشکیک کے بحران ہیں۔ بات بات پر تو شک کرتا ہے۔ اگر تجھے میرے ہونے کا شک ہے تو یہ کتاب جو کہ میرا ڈیٹا ہے' اس کا ایک لفظ ہی غلط ثابت کر دکھا۔ اگر ایسا کرے تو میں سچا خدا نہیں ہو سکتا۔ آپ اور میں ایک آدھ غلطی کے باوجود سچے رہیں۔ لوگ ہمیں گنجائش دے دیں مگر یہی گنجائش خدا کو نہیں دی جا سکتی۔ اگر خدا کی لکھی ہوئی ایک بات بھی غلط ہو جائے تو وہ خدا نہیں رہتا۔ ایک کتاب یہ دعویٰ کر رہی ہے کہ میں اللہ کا ڈیٹا ہوں۔ میں اللہ کے لفظ ہوں۔ تمام معلومات جو مجھ میں ہے' اللہ کی ہے۔ تو پھر آپ کا یہ حق بنتا ہے کہ قرآن کو دوستوں کی طرح نہیں چاہے دشمنوں کی طرح پرکھو۔

کیوں؟ میں یقین رکھتا ہوں کہ انسان کی آزادی اور انسان کی غلامی میں صرف قرآن حائل ہے۔ قرآن نہیں ہے تو میں آزاد ہوں۔ اگر قرآن ہے تو میں غلام ہوں۔ اگر قرآن ہے تو خدا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خدا کوئی نہیں۔ جب اس ڈیٹا کو رد کر کے میں خدا سے آزادی حاصل کر سکتا ہوں تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں اسے محبت' خلوص اور عبودیت سے پڑھوں۔ آپ میں سے کوئی شخص ایسا ہے' جو اپنی آزادی غلامی کے بدلے میں دے گا؟ اگر آپ میں یہ حوصلہ اور تنقید

Marfat.com

ہے تو پھر آپ کو قرآن ایسے احساس اور معروضی سائنسی انداز سے پڑھنا پڑے گا جس سے آپ خدا کی تلاش کر سکیں اور اسے پا سکیں۔

اسی نقطہ نظر سے میں نے قرآن حکیم کا مطالعہ شروع کیا۔ میرے پیش نظر اپنی آزادی کا تحفظ تھا۔ بحیثیت انسان ایک جابر مطلق ذات سے آزاد ہونے کا خیال تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس سے نکلنے کا کوئی چانس نکل آئے گا۔ آخر 365 صفحے کی کتاب ہے۔ بے شمار واقعات و حادثات میں کوئی تو غلط نکل آئیں گے۔ میں ناکام ہو گیا۔

مجھے عذاب قبر سے واسطہ نہیں ہے۔ مجھے یہ ساری چیزیں فضول لگتی ہیں۔ ان ساری چیزوں کا وجود اللہ سے ہے۔ اگر آپ عالم برزخ اور موت کے بعد کے واقعات پر غور کریں۔ قبر کے عذاب اور ملائکہ کی باتوں پر غور کریں، تو یہ ساری چیزیں وجود رکھتی ہیں اگر اللہ ہے۔ اگر اللہ نہیں ہے۔ توان چیزوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اب یہ سوال کہ کیا مذہب ہے کہ نہیں؟ کیا مذہب ایک تاریخ ہے یا یہ Occult کا ایک سیٹ ہے؟ اس کے لیے آپ کو یہ ضرور جاننا ہوگا کہ اس کے پیچھے جو اتھارٹی ہے وہ حقیقی ہے کہ نہیں۔ یہ وہ بنیادی سوال ہے، جس کا ہم کبھی سامنا نہیں کرتے۔ باقی سوالات ایک ہی سوال کے ٹوٹے ہوئے مختلف پہلو ہیں، لیکن جب ہم سب سے بڑے سوال کی طرف جاتے ہیں تو پہلا سوال یہ ہے کہ انسان آزاد ہے کہ انسان غلام ہے؟ پہلے سوال کو محکم کرنے کے لیے دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ آیا خدا ہے کہ خدا نہیں ہے؟ اگر خدا ہے تو پھر آپ آزاد نہیں ہیں۔

بنیادی سوال ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ آیا میں اس بحران کو حل کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں؟ کیا میرے ذہن میں یہ سوال شدت سے آ رہا ہے کہ میں خدا کے موضوع اور وجود اور اس کی موجودگی کے لیے اتنی مشقت کروں؟ ریسرچ سے جاننے کی کوشش کروں اور شواہد اور دوسرے طریقوں سے یہ کھوج لگاؤں کہ آیا خدا ہے یا خدا نہیں ہے؟ میں نے تو اس طرح سے خدا کو پایا۔ میرے پاس خدا سے انکار کی کوئی دلیل نہ رہی۔ یہ آٹھ سال کی جدوجہد ہے، جو میں نے ایک سوال پر صرف کی۔ ایک انتہا درجے کے کرب میں ڈوبے انسان کا سوال، جو کوشش کر رہا تھا کہ بہت بڑے بوجھ سے آزاد ہو اور چکی کے پاٹ میں پسنے سے بچ جائے۔ بالآخر میرے پاس فرار کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

دوسرا سوال اس کی طرف حرکت کا ہے۔ اسے ہم تصوف کہتے ہیں۔ علمی سوال کے حل کے بعد اب خدا کی طرف جانے یا نہ جانے کا سوال ہے۔ جو خدا کی طرف بڑھنے کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہ عین الیقین کی طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ مشاہدات ربانی کی طرف پیش رفت کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کو ہم تصوف کہتے ہیں۔

انتھراپالوجی کے اعتبار سے خدا کے بغیر مذہب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پہلا اور آخری مذہب اس وجہ سے وجود میں آیا کہ زندگی کے مصائب، اداسیوں، تنہائیوں اور رشتہ داروں کی محرومیوں میں اسے کسی بڑی ذات کے آسرے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو اسے خدا کا خیال آیا۔ اسے پتہ چلا کہ مذہب خدا کی طرف جانے کا رستہ ہے۔ اس نے مذہب کو اختیار کیا۔ مذہب کا بذات خود اپنا کوئی وجود نہیں۔ مذہب اپنے وجود کے اعتبار سے پرانے زمانے کا Occult تو بن سکتا ہے، مذہب نہیں رہتا۔ رسم و رواج جہاں آ کر رک جائیں، وہاں ایک بت پیدا ہوتا ہے۔ خدا کے ساتھ کسی کی عقل اور شعور نہیں رکتا۔ خدا کے ساتھ کوئی Occult نہیں ہے جبکہ خدا کے بغیر ہمیشہ ایک Occult ہے۔ چاہے وہ کسی فلسفی کا Occult ہی کیوں نہ ہو۔

پلٹنے کی اہمیت

بعض اوقات جبلت اتنی طاقتور ہوتی ہے کہ وہ صحت دماغ پر غالب آ جاتی ہے۔ جیسے کبھی کبھی غصہ انسان کے اچھے احساسات پر غالب آ جاتا ہے۔ انسان ہر وقت کمزور ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی چاہتا ہے کہ انسان اس کے سامنے طاقت ور نہ بنے۔ ہمارے تکبرات اور ہمارے جہل و خرد کا علاج یہ ہے کہ ہم اللہ کے سامنے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے رہیں۔ خطا و نسیان ہمارا ڈس کریڈٹ نہیں ہے۔ ہمارا ڈس کریڈٹ واپس نہ پلٹنا ہے۔ توبہ کے دروازے کھلے ہیں۔ احساس ندامت کا احساس بغیر خیال کے نہیں آتا۔ میں اللہ میاں کو طاقت ور سمجھ کر اس کی طرف نہیں پلٹتا۔ میں جب بھی اللہ کی طرف جاؤں گا تو میں تو ایک ایسی مہربان ذات کی طرف جاؤں گا جس کے بارے میں مجھے پتہ ہے وہ اختیارات کلی کی مالک ہے اور میری خطا و نسیان اور میرے ثواب و عذاب اسی کے پاس ہیں۔ اگر میں ثواب مانگنے اس کے پاس جا سکتا ہوں تو پھر خطا کی معافی مانگنے بھی جا سکتا ہوں۔

آپ کو پتہ ہے انسان نے سفر کیسے شروع کیا؟ خطا سے شروع کیا اور مغفرت پر ختم ہوا۔ انسان کا پہلا ایکٹ غلطی کا ارتکاب ہے اور سب سے پہلا خدا کا ایکٹ اس کو معاف کر دینا ہے۔ آپ ستر مرتبہ خطا کریں۔ اگر تمام زندگی خطا کرتے رہیں، مگر آپ کے دل میں خیال راسخ ہے کہ اللہ بخشنے والا ہے تو اللہ بخشے گا۔

ایک شخص کو پوری زندگی میں اپنی ایک نیکی بھی نظر نہ آئی۔ اس نے اپنے بچوں کو وصیت کی کہ مرنے کے بعد مجھے جلا دینا اور میری راکھ کچھ سمندر میں، کچھ پہاڑوں پر اور کچھ صحراؤں میں بکھیر دینا تاکہ میں جمع نہ ہو سکوں۔ مرنے کے بعد اس کی وصیت پوری کی گئی۔ اللہ نے ہواؤں، پہاڑوں اور سمندروں کو حکم دیا کہ جو کچھ تمہارے پاس اس کا ہے، واپس لاؤ۔ انہوں نے ایک ایک ایٹم جوڑا اور بندہ سامنے آ گیا۔ اللہ میاں نے کہا، باقی باتیں صحیح ہیں۔ یہ کیا تو نے عجیب بات کی، کیوں کی؟ اس نے کہا، سرکار عالی مقام! میں نے اپنی کریڈیبلٹی اور بیلنس شیٹ دیکھ لی تھی۔ پوری زندگی میں ایک بھی نیکی نہیں تھی۔ میں بہت ڈرا کہ اب تو اللہ سے بہت مار پڑے گی، بہت سختی ہو گی۔ میں نے کہا کہ ایسی حالت میں اپنے آپ کو ایسے ماروں کہ کبھی جمع نہ ہو پاؤں۔ خدا نے کہا، کیا تجھے یقین تھا کہ کوئی مارنے والا بخشنے والا ہے؟ خطا کی جزا اور سزا دینے والا کوئی ہے؟ اس نے کہا، پروردگار! ساری زندگی باقی بڑی خطائیں کیں لیکن ایک بات کا مجھے پورا یقین رہا ہے کہ کوئی اللہ ہے، جزا اور سزا کا جو مالک ہے تو اللہ نے کہا، اس سے بہتر یقین تو کسی بڑے ولی کا بھی نہیں ہو سکتا۔ تجھے میں نے بخش دیا۔

پہلے چونکہ طریقہ کار متعین نہ تھا، لیکن ہمیں قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ قابیل نے قبر میں اتر کر اپنے بھائی کو پنجوں سے زمین کھود کر چھپایا تھا۔ ابھی بھی ہمارے پاس جو ماقبل تاریخ کی لاشیں دریافت ہوئی ہیں یعنی پتھر کے زمانے میں یا نیوسٹون ایج کی، وہ ڈھکی ہوتی ہیں اور کھدی ہوئی قبریں ہیں۔ ان میں ہمیں کوئی اس قسم کی نعش سوزی نظر نہیں آتی، بلکہ آگے چل کر انہی نعشوں کو ممی کرنے اور انہیں محفوظ کرنے کا عمل جاری رہا۔ یہ رسم کالنگا کی جنگ کے بعد ہندوؤں میں پھیلی۔

پہلے جب قربانی آسمانوں سے قبول ہوتی تھی تو ایک برقی بجلی آتی تھی۔ ہابیل و قابیل پر یہی مرحلہ آیا۔ انہوں نے بھی قربانی رکھی۔ جو قربانی قبول کی جاتی تھی۔ آسمانوں سے آگ گرتی تھی اور لے جاتی تھی۔ ہندوؤں کی میتھالوجی

Marfat.com

میں پہلی تثلیث اندرا' متھرا اور وروناکی ہے۔ دوسری شیوا' وشنو اور برہما کی ہے۔ دونوں میں آگ پاوترتا کا سمبل ہے۔ یعنی پاک کرنے والی۔ حضور کی حدیث ہے کہ آگ' پانی اور خاک تینوں چیزیں پاک کرتی ہیں۔ ہم پر دو چیزیں حلال کی گئی ہیں یعنی پانی اور خاک۔ وہ چونکہ قدیمی قربانیوں کے زمانے سے چلے آتے تھے تو بنیادی طور پر ویدک مذاہب اور ویدانتا کا مذہب بھی الہیاتی مذہب ہے۔

اس لیے کہ پہلی تثلیث کا جو زمانہ اندرا' متھرا اور وروناکا ہے' اس میں آریاؤں کا بنیادی خدا صرف ایک ہے اور وہ اندرا ہے۔ اندرا کے دو پہلو ہیں۔ جنت کا خدا اور طاقت کا خدا۔ یہ ان کے اللہ کے بارے میں بنیادی تصورات ہیں۔ جونہی وہ انڈیا کے اندر داخل ہوتے گئے' انہوں نے اپنی اندرا کی شادیاں کرا دیں۔ ان میں سے طہارت کی دو چار چیزوں میں ایک آگ بھی ہے۔ وائکنگ بھی اس پر عمل پیرا رہے ہیں۔ ان کے ہاں دو پہلو نمایاں تھے۔ سمندر' سفر اور آگ۔

مگر چائنیز جو پرانے ہیں' وہ بڑا گڑھا کھود کر نیچے لاش رکھتے اور اس کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھتے ہیں' چنانچہ جس قوم کا مرنے کے بعد یہ کانسپٹ ہو' اس کے مطابق اس نے اس کا طریقہ اختیار کیا ہوا ہے تو میرا خیال ہے کہ جلانے کا عمل اس لیے پیدا ہوا کہ بڑی جنگ میں بہت سارے لوگ قتل ہوئے اور ان سے انتہائی بدبو پھیلی۔ سو اس کے لیے یہ طریقہ استعمال ہوا۔

بعد میں مسلمانوں نے اس کانسپٹ کو بدلا۔ تمام بڑے مذاہب دفناتے ہیں۔ چاہے وہ یہودی یا عیسائی ہوں۔ بنیادی طور پر خدا کا طریقہ کار وہی ہے' جو ان بڑے مذاہب کا ہے۔ کہتے ہیں کہ کلنجا کی جنگ میں ہزاروں لوگ مارے گئے' جو اشوکا نے لڑی' جس کے بعد وہ بدھ مت کا پیروکار ہو گیا۔ اس جنگ میں اتنی بدبو پھیلی کہ لاشوں کو جلانے کا طریقہ اپنایا گیا۔ یہ ڈسپوزل کے طریقے ہیں۔ اللہ کے پاس یہ طریقہ نہیں ہے۔ ایک دفعہ ایک کافر کو بجور سول کی وجہ سے جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جلایا تو حضورؐ نے منع فرمایا کہ ہم اس قسم کا عذاب دینے والے نہیں ہیں۔ ہندو بڑی سیانی قوم ہے جو انہیں آخرت میں ملنا ہے وہ ادھر بھی لے لیتے ہیں۔

آزمائش کی پہچان

پروردگار عالم نے فرمایا' ولنبلونکم بشی من الخوف و الجوع و نقص من الاموال والانفس والثمرت' بلاشبہ حضرت انسان ہم تمہیں آزمائیں گے۔ بھوک' غم و بلا' نقصان' مال و دولت کے نقصان سے وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبة ہماری طرف سے بشارت دو ان کو' جن پر مصیبت آئی اور وہ ثابت قدم رہے اور صرف اتنی سی بات کہی' وقالو انا للہ وانا اللہ الیہ رٰجعون' میں نے آپ کو علاج بتا دیا ہے۔ اس کی تسبیح کثرت سے کیا کریں اور کہا کریں کہ اے پروردگار! یہ بلا تیری طرف سے آئی ہے اور ان شاء اللہ ہم اس میں سے گزر جائیں گے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی گرسنگی کے عالم میں بڑی دور نکل جاتے تھے۔ ابتدائے عہد میں پریشانی اور بلا میں گرفتار ہوتے۔ ایک دفعہ تین دن کے فاقے سے زمین پر لوٹ رہے تھے۔ شیطان نے آتے ہی کہا کہ دوستی کا مزہ چکھ لیا؟ اللہ

Marfat.com

میاں کے بڑے دوست بنے تھے نا' دوستی کا مزہ چکھ لیا؟ یہ کیسا دوست ہے جس نے تمہیں کھانے کو کچھ نہیں دیا اور بھوک سے مار رہا ہے۔ کم از کم اب تو اسے چھوڑ دو۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا کہ میں نے اس کو دیکھا اور پایا اور میں نے کہا کہ تو جھوٹا ہے۔ میرا رب سچا ہے۔ فان مع العصر یسراً وان مع العسر یسراً میرے رب نے کہا ہے کہ ہر تنگی کے بعد کشادگی ہے۔ بلاشبہ ہر تنگی کے بعد کشادگی ہے اور جس کو مصیبت میں اپنے رب کی بات پر یقین ہوا' وہ بلا سے اخلاص پا گیا۔

عذاب اور آزمائش

عذاب اور آزمائش میں بڑا فرق ہے۔ آزمائش اپنے نتیجے کو دوبارہ پلٹتی ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال حضرت ایوبؑ کے ضمن میں آتی ہے۔ وہ بلا اور آٹھ برس تک بیماری میں مبتلا کیے گئے۔ حتیٰ کہ وہ پکار اٹھے انی مسنی الضر وانت ارحم الرحمین' خدا نے ان سے عذاب اتارا اور اتارنے کے بعد ان کو سارا کچھ واپس کیا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ انہیں شان و شوکت دی۔ بلا' عذاب اور آزمائش میں ایک فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ اگر آزمائش ہے اور آزمائش میں آپ خدائے حقیقی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور خدا سمجھتا ہے کہ میرا بندہ انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر امتحان میں کامیاب ہوا تو آپ کی نہ صرف مصیبت کٹتی ہے' بلکہ آپ پہلے سے بہتر حال میں چلے جاتے ہیں اور جو عذاب ہے' اس میں بہتری نہیں ہوتی۔ وہ زوال نہ رکتا بلکہ وہ بالآخر آپ کو تباہ و برباد کر کے ہی دم لیتا ہے۔

Marfat.com

علم بطور انسٹرومنٹ

علم بطور انسٹرومنٹ کی اہمیت یہ ہے کہ ہم سب لوگ خدائے ذوالجلال کے اس مخصوص پیٹرن سے ہیں' جس میں اللہ نے اپنے لیے جو سب سے بہترین اور اولین چیز منتخب کی' وعلم آدم الاسما کلھا' اس نے معلم ہونا اور تعلیم دینا پسند کیا۔ جب اس کے شاگرد کا مقابلہ اعلیٰ ترین صفاتی مخلوقات ملائکہ سے پڑا تو بطور ایک استثنائی کیس اس نے مجبور نہیں کیا کہ میرا شاگرد تم سب سے بہتر ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ میں تم دونوں کو ایک پرچہ اور ایک ٹیسٹ دے دیتا ہوں۔ ملائکہ کو کہا' تم بھی اسی یقین اور علم کی وجہ سے کسی منصب کے دعوے دار ہو' تمہیں بھی میں ایک پرچہ دے دیتا ہوں۔ تم بھی کوشش کرو۔

یہ وہ وقت تھا' جب علامت سے انسان زبان کو بڑھ رہا تھا۔ اشارہ اور کنایہ سے ایک زبان کو دریافت کر رہا تھا' جس سے وہ اپنا مافی الضمیر بیان کر سکے۔ وہ ان غاروں میں' جہاں اس کی تصاویر آج بھی پائی جاتی ہیں' جیسے سپین کے غار ہیں اور ان میں جو نقش بنے ہوئے ہیں' وہ اپنے آپ کو صرف اشاروں سے بیان کرتا ہے۔ اب اس کو ایک زبان کی بنیاد دے دی گئی۔ یہ آپ کے پاس جو بنیادی چودہ حروف ہیں قرآن حکیم میں جنہیں آپ حروف مقطعات کہتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ تختی حضرت آدمؑ کو بھی عطا ہوئی اور حضرت ملائکہ کو بھی عطا ہوئی۔ پھر ان کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ ممکن ہے اس امتحان کو کلیئر کرنے میں ہزاروں' لاکھوں برس خرچ ہو گئے ہوں۔ ہمارا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ نیوسٹون ایج کے بعد جب انسان نے بستیاں بنانی شروع کیں۔ گھر آباد کرنے اور بچوں کی حفاظت کرنی شروع کر دی تو ساتھ ہی اس نے زبان کو ڈیولپ کرنا بھی شروع کر دیا۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد متحارب فریقین جو علم کا دعویٰ رکھتے تھے' میں سے ایک فریق واپس آیا اور واپس آ کے کہا' قالو سبحانک لاعلم لنا کہ اے مالک' تو پاک ہے' خطا سے۔ لاعلمنا ہمیں تو کچھ علم نہیں ہے الا ماعلمتنا سوائے اس کے کہ تو ہمیں کچھ بتا دے جو پروگرامنگ ہماری کر دے۔ ہمارے اندر ڈیٹا ڈال دے' اس ڈیٹا کے علاوہ ہم میں یادداشت ہے نہ ادغام نہ تسلسل ہے۔ ہم اپنی سابقہ نسلوں سے تجربہ لے نہیں سکتے۔ آنے والی نسلوں کو دے نہیں سکتے۔ ہمارے معاملات محدود ہیں۔ ہم اپنے دعوے کو چھوڑتے ہیں اور تجھ سے معافی کے طلبگار ہیں کہ تیری ایک

Marfat.com

خصوصی اور اعلیٰ ترین مخلوق کے سامنے ہم نے دعویٰ خطاب کیا۔ خداوند کریم نے پہلا سجدہ تعظیم اسی علمیت کے سامنے کرنے کا حکم دیا۔ واذقلنا للملئکة السجدو لادم فسجدو الا ابلیس' والا واقعہ علم و دانش کا مظاہرہ تھا۔ حضرت آدم کی اس سیکھنے کی سہولت کے بعد تمام مخلوقات وہ ارضی ہو یا سماوی پر سجدہ تعظیم لازم ہوا۔ یہ جسمانی سجدہ نہ تھا' یہ علم کو' تعلیم کو سجدہ تھا۔ اس کے بعد بہت سارے اساتذہ اللہ کے اس علم کو جاری رکھنے' خدا کی دی ہوئی شناخت کو آگے بڑھانے اور علم و عقل و معرفت کے ان اسباق کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے آتے رہے۔

مگر ایک سوال درمیان میں یہ پیدا ہوا کہ خدا کے نزدیک انسان کی اس خوبی کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ اگر آپ نے سورہ دھر کو دیکھا ہو تو آپ کو بڑی آسانی سے سمجھ آتا ہے کہ اللہ کا آپ کو زندگی گزارنے کی سہولتیں دینا ایک ضمنی مقصد تھا۔ یہ اصل مقاصد میں نہیں ہے۔ وہ تخلیق اور تسلسل ضمنی مقاصد میں سے ہیں۔ اصل مقاصد میں سے نہیں ہیں۔ وہ آپ کو یاد دلاتا ہے کہ بلاشبہ زمانے میں انسان پر ایک ایسا وقت گزرا کہ وہ کوئی قابل ذکر شے نہ تھا جبکہ آدم قابل ذکر شے ہے۔ آدم وہ ہے' جس کے بارے میں اللہ زبان حال سے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ زمین و آسمان کا خلیفہ ہے۔ کائنات کا وارث ہے۔

علم کی تمام فیکلٹی سمجھنے اور سوچنے کی طاقت پر انحصار رکھتی ہے۔ انسانی تعقل ہے' جو اسے اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اللہ کو بطور ترجیح اول شناخت کرے اور اسے ایسا ہی تسلیم کرے۔ ذہن وہ واحد پیچیدہ کمپیوٹر ہے' جس کو آپ ترجیحات کا سبق از خود نہیں دیتے۔ یہ آپ کو صبح سویرے اپنے طور پر ترجیحات کی تمام لسٹ پیش کرتا ہے۔ آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ ان میں سے ہم نے ترجیح اول کس کو چننا ہے۔ کس کو دوسری ترجیح اور کس کو تیسری ترجیح قرار دینا ہے۔ بدقسمتی سے ہمیں زندگی کی فوری ترجیحات تو بڑی آسانی سے یاد رہتی ہیں لیکن اولین ترجیح کی کوئی فکر ہی نہیں۔

جیسے سکول جانا' اپنے کام کرنا' کپڑے سلانا اور بات چیت' معاشرت کے آداب وغیرہ۔ مگر ایک پوری زندگی کی ترجیح یعنی اللہ ہم سے مس ہو جاتا ہے۔ بالعموم جب ہم اپنی کمٹمنٹ اور مذہبی رویہ کو جاتے ہیں تو ہم یہ ذمہ داری نیم پڑھ یا ان پڑھ لوگوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ اللہ ہی کائنات میں تعقل کا واحد منبع و مرکز ہے اور علم و حکمت تمام کی تمام اسی سے جاری ہوتی ہے تو کم از کم اس کی کتاب کا بھی تو کوئی رینک ہوگا؟ کتاب کے مقاصد عالیہ کا کوئی رینک اور کوئی انٹلکچوئل پیٹرن تو ہوگا۔ یہ بہرحال رسل کی پرنسپل آف میتھمیٹکا سے بڑی کتاب ہونی چاہیے۔ یا وائٹ ہیڈ یا ڈبل ہیلیکس سے اس کو بہتر ہونا چاہیے۔ یا کسی بھی Behaviourism کی سائیکالوجی کی کتاب سے۔ کیونکہ وہ سائیکالوجی دینے اور عطا کرنے والا ہے۔ ظاہر ہے' اس کتاب کی ایک ایسی سطح بھی ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے اہل علم کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

میں ان ڈگریوں کو محض سوچنے کا انسٹرومنٹ خیال کرتا ہوں۔ ایم اے' ایم ایس سی' پی ایچ ڈی تو صرف آپ کو انسٹرومنٹ مہیا کرتے ہیں۔ سوچنے کا وقت تو بعد میں آتا ہے۔ ان ڈگریوں کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو پتہ ہوتا ہے کہ ہم نے اس انداز سے سوچنا ہے۔ اس ترتیب سے ہم نے تحقیق کرنی ہے۔ پیٹرن یہ ہے۔ سیمینار ایسے مرتب ہوتے ہیں مگر جب آپ خدائے واحد کے بارے میں سوچیں گے' غور کریں گے تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ ہم نے کائنات کی سب سے بڑی کتاب کو ایک ایسے ان پڑھ کی تحویل میں دے دیا ہے' جو شاید میٹرک پاس کرنے کے قابل نہ تھا۔ اسی مولوی کو جس کو

آپ آٹھویں کلاس میں داخلہ بھی نہیں دے سکتے' اس کو آپ نے دنیا کی سب سے بڑی کتاب کا وارث بنا دیا۔ یہ ہمارا قصور ہے۔ مولوی کا نہیں' اہل علم کا قصور ہے۔

علم' دعویٰ' دجال

ایک مخصوص وقت کی تمام پیغمبر نشاندہی کر گئے ہیں۔ حضرت دانیالؑ سے لے کر حضور اکرمؐ کے ارشاد گرامی کے مطابق ایک وقت ضرور ایسا آئے گا جب انسان وہی کام کرے گا جو اللہ کرتا ہے۔ بہت سے دعوے اپنے ساتھ ایسے منسوب کرے گا جو اللہ کے ساتھ منسوب ہیں اور وہ زمین پر خدائی کا دعویٰ دار ہوگا۔ اسے دجال اس بنا پر کہیں گے کہ بہت سارے لوگ اس کے تابع ہوں گے۔ اس استثنیٰ کی طرف اللہ اور اس کے رسولؐ نے نشاندہی کی ہے۔

میرے خیال کے مطابق ہم دور دجال میں داخل ہو چکے ہیں۔ خاص طور پر جب قرآن کی ان آیات کے بارے میں لوگ شبہ کرتے ہیں جن میں اللہ نے کہا ہے کہ ان پانچ چیزوں کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔ پہلا یہ کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ کسی کی موت اور زندگی کا قیام کہاں ہے؟ رزق کی فراہمی؟ بادل کون برساتا ہے؟ سو بہت سارے لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آج کے دور میں انسان مصنوعی ذرائع سے بارش بھی برسا رہا ہے۔ سونوگرافی کی مدد سے وہ بچے کی جنس بھی جان لیتا ہے۔ پھر کیا یہ خدا کی آیات غلط ہو گئیں؟

مگر اس سے بہت پہلے پیغمبروں نے مسلسل اور متواتر ایک استثنائی دور کی نشاندہی کی ہے جب خدائی کا دعویٰ ایک بندہ یا ایک گروپ آف ٹھاٹ دہرائے گا اور اپنے آپ کو خدا محکم کرے گا۔ اس کی ایک آنکھ ہوگی اور وہ بڑی روشن ہوگی۔ اس کو سمجھنا آسان ہے کہ اس کی دوسری آنکھ' جو روح تسلیم اور مقبولیت ہے' وہ نہیں ہوگی۔ وہ اپنی شاندار سرگرمی اور اپنے خیال کی پختگی کی بنا پر اپنے آپ کو خدا کا تصور قرار دے گا۔ ابھی کچھ عرصے سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ اقوام مغرب میں خود پسندی وجود پا رہی ہے۔ وہ اپنے آپ کو کبھی گاڈ امریکہ کبھی گاڈ وائٹ مین کہتے ہیں۔ یہ اصطلاحات اب حرکت میں آ رہی ہیں۔ استثنائی دور شروع ہو چکا ہے۔ اگلے زمانے میں شاید خدا پر یقین ایسے ہی کسی عجیب و غریب واقعے سے ہوگا۔ ہمیں حدیث میں بتایا گیا ہے کہ ایک شخص دجال کے پاس جائے گا اور کہے گا کہ کیا تو مجھے مار کر زندہ کر سکتا ہے؟ وہ کہے گا کہ ہاں۔ وہ اسے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ وہ کہے گا کہ اب تو دوسری بار ایسا نہیں کر سکے گا۔ وہ پھر اسے مارے گا اور پھر زندہ کرے گا۔ وہ تیسری مرتبہ ایسے نہیں کر سکے گا۔

اس سے یہ دلیل نکلتی ہے کہ خدا کی قدرت میں اس قسم کے تسلسل میں کوئی بریک نہیں ہے۔ وہ اگر ہزار مرتبہ بھی چاہے تو انسان کو مارے اور زندہ کرے مگر دجال کی اس صلاحیت کی ایک حد ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اگلے زمانے میں میڈیسن یا جنیٹک سائنسز اتنی زیادہ ترقی کر جائیں گی کہ وقتی طور پر موت کا مداوا ہو جائے گا۔

تعقل اور متضاد رستے

میرا بھی پہلے یہ خیال تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ میں قبر میں جاؤں گا تو میرے لیے وہاں کوئی عزت و احترام

Marfat.com

کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ صرف یہی پوچھیں گے کہ تمہارا خدا کون ہے؟ اسی طرح ایک مزدور بھی قبر میں جائے گا اور اس سے بھی یہی کہا جائے گا کہ تمہارا رب کون ہے؟ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں یا تو خدا بے انصاف ہے کہ وہ آدمیوں کی صلاحیت پر کھے بغیر ان سے ایک ہی سوال کر رہا ہے یا پھر دوسری بات ہے کہ اور کسی چیز کی صلاحیت اللہ نے انسان کو دی یا نہ دی ہو' اپنے آپ کو پہچاننے کی داخلی صلاحیت ہر فرد و بشر میں ضرور رکھی ہے اور یہی درست ہے۔

تساہل' حادثہ' بیداری

تساہل مسلمانوں اور خاص کر پاکستان کے مسلمانوں میں اتنا ضرب المثل ہے کہ جناب اقبال نے مصرعہ لکھا: ''ایک مردتن آسان تھا تن آسانوں کے کام آیا'' جس قوم کو اقبال کی شاعرانہ غیرت نہیں جگا سکی' اسے اور کیا کوئی حادثہ جگائے گا۔ ہمیں ایک زیادہ بڑے جھٹکے کی ہوش میں لانے کے لیے ضرورت ہے۔ ہمارا نروس سسٹم تقریباً بے حس رہتا ہے اور وہ ایک بہت بڑے جھٹکے سے ہی دوبارہ زندگی کو استوار ہو سکتا ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ مسلمان بہت زیادہ ہوں گے' مگر ان پر وہن غالب ہو گا۔ میرے نزدیک تقسیم کے فوری بعد ہماری نالائقیوں نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہم تمام کے تمام دنیا کو پلٹ گئے ہیں۔ ہماری کمٹمنٹس ختم ہو گئیں۔ ہماری مقصد کے ساتھ دیانت ہوا ہو گئی۔ ہمارا مقصد حیات اور مقصد اخلاق جاتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اپنے آپ کو زوال پذیر گنتے ہیں۔ میرے خیال میں جب بھی اس قوم کی کچھ کرنے کی قوت جاگے گی' اس دن سے اس قوم کی کایا پلٹنی شروع ہو جائے گی۔

کارکردگی اور ذہانت میں یہی لوگ جب بیرون ملک جاتے ہیں تو معجزات برپا کرتے ہیں۔ حیران کن کارنامے انجام دیتے ہیں۔ یہ زمین پر اللہ کے بہترین لوگ ہیں۔ ان کا کارکردگی اور علم میں کوئی ثانی نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اندرونی ملک ہماری ذاتی انا' ہمارے تکبرات' جہالتیں' تعصبات اور ہمارے خاندانی حالات ہمیں ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے اٹھنے میں مدد نہیں دے رہے۔

طوفان اور رسول اللہؐ

انما یخشی اللہ من عبادہ العلمو کہ اللہ سے سب سے زیادہ تو اللہ کے عالم ہی ڈرتے ہیں۔ رسول اللہؐ سے بڑا اللہ کا عالم کون ہو سکتا ہے؟ معمولی سا ایک پتہ بھی ہلے تو خشیت والا دل اس میں ناراضگی اور رضامندی کے امکان محسوس کر لیتا ہے۔ خدا کے رسولؐ اتنے دلیر تھے کہ جب ایک دفعہ مکہ میں آفت آئی تو سارے لوگ گھروں میں گھس گئے' بھاگ گئے۔ صرف ایک آدمی جو باہر نکلے' دیکھا کہ رسول اللہؐ مخالف سمت سے آ رہے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ امن ہی امن ہے۔ گھبراؤ مت! اتنے دلیر آدمی کو چھوٹی موٹی باتیں نہیں ڈرا سکتیں مگر یہ خشیت اللہ رسول کے ہاں خدا سے انتہائی انس' انتہائی محبت کے تحت پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس قسم کے آثار کو شبہہ سے دیکھتے تھے کہ کہیں خدا ناراض نہ ہو جائے۔

اس کے ساتھ چونکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے تذکرہ کیا تھا کہ جیسے قوم عاد و ثمود اور قوم شعیب اور اصحاب

Marfat.com

مدین پر اللہ تعالیٰ نے چنگھاڑ، آندھیاں اور تیز ہوائیں بھیجی تھیں قدرتی طور پر ایک پیغمبر کا دل جب ان آثار کو دیکھتا تھا اور وہ چونکہ بہت زیادہ امت کا درد محسوس کرنے والے تھے اس خوف سے ڈر جاتے تھے کہ کہیں میری امت سے کوئی ایسی غلطی تو نہیں ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا کے لیے یہ ہوا بھیجی ہے۔

پیار، محبت اور عشق

پیار، محبت اور عشق ہمارے ہاں ادب میں، گفتگو میں بعض اوقات ایک ہی معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن علم کی حد تک یہ جان لیں کہ قرآن میں لفظ مؤدت استعمال ہوا ہے۔ اس کشش یا اس دلچسپی کے لیے جو مرد کے دل میں عورت کے لیے رکھا گیا اور عورت کے دل میں مرد کے لیے رکھا گیا۔ قرآن نے اس کو مؤدت کہا لیکن محبت اس کے لیے مخصوص ہے۔ اگر ہم اسے لٹرل صوفیانہ معنوں میں لیں اور اس محبت میں کوئی شریک ہوگا تو یہ شرک ہوگا۔ خواہ وہ عورت ہو، مرد ہو، خواہ دولت ہو۔

رہ گیا عشق، تو تفصیل میں نہیں جاتے۔ وہ اقبال نے کہا تھا کہ عشق خلل ہے دماغ کا۔ یہ بنیادی طور پر دماغ پر طاری محویت ہے۔ کسی خیال، منظر یا کسی فرد کا آپ کے اعصاب پر اس طرح سوار ہو جانا، گویا یہ جذبات کا بھوت دماغ پر سوار ہونے کے معنوں میں ہے۔ بیماری کی حد تک کسی جذبے کا آپ پر مسلط ہو جانا، صحت مندانہ نہیں ہوتا۔ باقی پیار اور محبت کی حد تک ٹھیک ہے۔

Marfat.com

اسلام، پُر پیچ رستہ

سوال یہ کیا گیا ہے کہ" آپ کے بقول منزل مقصود اللہ ہے، اسلام صرف رستہ ہے۔ میرے خیال میں حضرت انسان کا چودہ سو سال کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اسلام کوئی صراط مستقیم نہیں، بلکہ پر پیچ اور پُر خار رستہ ہے۔ اس قدر پر پیچ اور پُر خار راستہ کہ صحابہ کبار خود اس رستے پر گامزن نہ رہ سکے۔ صحابہ تو اس رستے سے نکل گئے۔ اگر آپ تابعین، تبع تابعین، تبع تبع تابعین اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کا ذکر کرتے، تو شاید اس کا مطلب اور ہوتا جبکہ نبی اکرم کی وفات کے چند سال بعد ہی حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان جنگ میں صحابہ نے ایک دوسرے کو قصداً مار ڈالا۔

یہ آپ کی رائے ہو سکتی ہے۔ میرے علم کے مطابق حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کی جنگوں میں زیادہ سے زیادہ سات اصحاب نے شرکت کی۔ باقی تمام وہ لوگ تھے، جو تازہ ترین مسلمان تھے۔ ان میں صحابی کوئی نہ تھا۔ جنگ جمل میں حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ تھیں اور جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت عمار بن یاسر اور دوسری طرف عمرو بن العاص اور حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ یہ کل ہمیں چار ہی نام نظر آتے ہیں۔ پانچواں اور چھٹا نام بھی شاید ہوگا۔ ان بڑی جنگوں میں اصحاب رسول شہید نہیں ہوئے، نہ انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا بلکہ یہ نو واردان شوق تھے۔

تازہ واردان مسلمان تھے۔ یہی آپس میں لڑتے رہے۔ الا ماشاء اللہ اصحاب رسول میں اس قسم کی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ جنگ حنین میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کسی صحابی کے ہاتھوں نہیں مارے گئے۔ جب حضرت علیؓ کے مقابل آئے، تو حضرت علیؓ نے کہا، اے طلحہ! اے زبیر! تمہیں پتہ نہیں ہے کہ رسول اللہؐ نے کہا تھا کہ اے طلحہ! اے زبیر! تم علی کے خلاف لڑو گے اور علی اس وقت حق پر ہوگا۔ وہ اتنے اچھے لوگ تھے کہ انہوں نے فوراً اس بات کی شہادت دی اور میدان جنگ چھوڑ کے نکل گئے۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو معاف کیا اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جنگ صفین میں عمرو بن العاصؓ اور امیر معاویہؓ بھی نہیں رہے۔ حضرت علیؓ

Marfat.com

بھی نہیں مرے۔ صرف ایک لے دے کے حضرت عمار بن یاسرؓ شہید ہوئے۔ وہ بھی کسی صحابی کے ہاتھوں نہیں مرے۔ اس لیے تمام سوال ایک ایسے مفروضے پر قائم ہے جس کی شہادت تاریخ پر ہے‘ دین نہ مذہب سے ملتی ہے۔

اسلام‘ دین فطرت

اسلام دین فطرت اور اعتدال کی وجہ سے ہے۔ اسلام اگر پوری طرح سوچا سمجھا جائے تو انسان کے اندر جبلی اور عقلی توازن اور اعتدال قائم کرتا ہے۔ پروردگار نے کہا کہ اسلام دین فطرت ہے‘ تو اس کی تاریخ انسانی معاشرے کی ابتدا سے شروع ہوتی ہے۔ ایک حیاتیاتی آدمی‘ جو عقل سلیم سے بے گانہ باقی حیاتیاتی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو قتل و غارت میں مبتلا کیے ہوئے تھا‘ جب وہ تاریخ کے ادوار سے بڑھا تو اس پر اللہ نے ایک ایک قانون وارد کرنا شروع کر دیا۔ ہمیں عمرانیاتی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ زمانہ قدیم کے جو دور یا معاشرے ہیں‘ وہ ایک ایک قانون پر پہنچتے چلے آئے ہیں اور جب وہ آگے بڑھتا ہوا حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کے زمانے تک آیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی فطرت واضح طور پر جبلی رجحتوں اور عقلی یقین میں بٹ چکی تھی۔

یہود کی سب سے زیادہ باعث تحقیر بات اللہ کے نزدیک یہ تھی کہ بہترین تعلیم اور مشاورت کے باوجود یہ قوم ہمیشہ جبلی عادتوں کو پلٹ گئی تھی اور تمام عقلی ذرائع اپنی جبلتی عادتوں کے تحفظ کے لیے استعمال کرتی تھی۔ جیسے یوم سبت کا واقعہ ہے۔ خدا نے ان کو منع کیا کہ اس تالاب سے فلاں دن مچھلی نہیں پکڑنا۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ خدا کا حکم ہے‘ بلکہ یہ کہا کہ خدا کا حکم تالاب سے مچھلی پکڑنے کا نہ تھا۔ انہوں نے اس حکم سے اغماض کا راستہ یہ نکالا کہ بیچ میں سے نالیاں نکال کر گھروں میں لے گئے اور یہاں پروردگار نے کہا کہ میں بھی ان کو تنگ کرنے کا طریقہ نکالوں گا۔ وہ ہفتے والے دن زیادہ مچھلیاں اوپر لے آتا تھا۔

مگر جب حضرت عیسیٰ کا زمانہ آیا‘ تو لوگ سخت عبادت گزار تھے جنہیں ہم فلسطین کہتے ہیں‘ وہ بڑے متقی تھے۔ میں کبھی اپنے معاشرے میں دیکھتا ہوں تو بہت سارے ایسے گروہ دیکھتا ہوں جو مجھے بے پناہ متقی نظر آتے ہیں اور ہر وقت تلقین نماز میں لگے رہتے ہیں۔ اس وقت حضرت عیسیٰ نے انہیں اندرونی علم سے آشنا کیا اور ان کو بتایا کہ تم منافق ہو۔ تمہارا ظاہر اور ہے باطن اور ہے۔ تمام تر عیسوی شریعت باطنی تعلیم پر مشتمل ہے۔ انہوں نے کوئی قانون شریعت کا اضافہ نہیں کیا۔ کوئی نیا قانون نہیں دیا بلکہ تمام تر باطنی شریعت کی نشاندہی کی‘ جسے فلسطین مکمل بھول چکے تھے۔

انسان جب اگلے معاشرے یا دور میں آیا تو پروردگار عالم نے اب ایک ایسے انسان کو چنا جو بظاہر بڑا کرپٹ‘ اجڈ‘ جاہل‘ گنوار اور قتل و غارت کا شائق تھا مگر اس میں کچھ بہترین انسانی خصوصیات موجود تھیں۔ خدا نے اسے پرکھا‘ جانچا اور پھر اپنے رسولؐ کے ذریعے پیغام دیا‘ تو اس پیغام نے جس طرح ان انسانوں کو بدلا اور جس چیز میں انہیں ڈھالا‘ وہی ہمیں اس چیز کا سب سے بڑا ثبوت دیتی ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اگر آپ اصحاب رسول کی وہ زندگی‘ جو اسلام سے پہلے تھی اور وہ زندگی‘ جو اسلام کے بعد ہے‘ کا مطالعہ کر لیں تو اسلام کی اس قوت سے شناسا ہو جائیں گے جو ایک وحشی اور غیر متمدن سوسائٹی کو‘ جس نے قانون کا کچھ نہیں جانا تھا‘ جو محض ایک تناور درخت کی طرح انا‘ بغض اور کینہ میں ڈھلی ہوئی تھی‘ اصحاب رسولؐ میں ڈھالا‘ تو بخدا یقین ہو جاتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اس سے بڑا اور کوئی ثبوت نہیں ہے۔

Marfat.com

علماء کی تفرقہ بازی

علم جب کم ہوتا ہے' تو گھروندوں میں بٹتا ہے۔ جب بڑھتا ہے تو تمام دنیا میں علم کے بڑھنے کا صرف ایک نشان ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک اندھی بہری لڑکی کو استاد نے بڑی محبت سے پالا۔ اس نے پی ایچ ڈی کی اور وہ علوم عالم نسواں کی اقوام متحدہ میں محافظ بھی نکلی۔ ڈاکٹر ہیلن کیلر نے The best result of education is tollerence کہ علم کا بہترین نتیجہ برداشت ہے۔ یہ گروہوں کی بات نہیں' سنی شیعہ کی بات ہے بلکہ اس سے آپ بڑی آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علم کم ہے۔ اگر کوئی آپس میں لڑ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے پاس الفاظ کم ہیں۔ ان کے دلائل غارت ہو چکے ہیں۔ وہ صرف جبلی عادات سے غور و فکر شروع کر دیتے ہیں اس لیے وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر بحیثیت استاد میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرے دائیں طرف شیعہ اور بائیں طرف اہل حدیث نماز پڑھ رہے ہیں۔ میں کبھی اہل حدیث' کبھی اہل دیوبند اور کبھی حضرت بریلی کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوں۔ مجھے تو آج تک یہ خیال نہیں آیا کہ میں اپنی اولین شناخت کو مجروح کر رہا ہوں۔ بریلوی یا سنی ہونا میری شناخت نہیں ہے بلکہ میری شناخت میرا مسلمان ہونا ہے۔ ہاں اگر کوئی میری مسلمانی چھینے گا تو پھر میں بقیہ ماندہ اداروں تک آؤں گا۔

اب دیکھیے' اہل حدیث کس کو کہتے ہیں؟ جو حدیث کو زیادہ جانتے ہیں۔ میں نے اپنے معزز دوست سے کہا کہ میں نے قرآن اور حدیث پڑھی ہے۔ قرآن میں بہت ساری صفات رسول اللہ کی آئی ہیں۔ سب سے بڑی صفت اللہ نے یہ دہرائی ہے وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین کہ میرا محبوب رحمت عالم ہے۔ آگے جا کے کہا' یہ وہ شخص ہے' جو میرے ہی ناموں کا اسم با مسمی ہے۔ رؤف الرحیم ہے۔ یہ نہیں کہا کہ عبدالرؤف یا عبدالرحیم ہے۔ اگر بین الکائناتی رؤف الرحیم کے شعبے میرے پاس ہیں تو زمین پر انسانوں کے رؤف الرحیم کے ٹائٹل اس کے پاس ہیں۔

آپ کا کیا خیال ہے' کیا آپ کو خدا کنفیوز کر رہا ہے؟ بالعموم تو لوگ کہتے ہیں کہ کسی کو رحمان یا رحیم کہہ کے نہ بلاؤ' بڑا گناہ ہے۔ عبدالرحمٰن اور عبدالرحیم کہو۔ ورنہ لوگوں کے خیال میں یہ شرک اور کفر ہے۔ معاذ اللہ استغفر اللہ۔ قرآن میں اللہ خود ترغیب دے رہا ہے کہ میرے پیغمبر کو رؤف اور رحیم کہو۔ گویا اس کا وہ مطلب نہیں' بلکہ یہ ہے کہ صفات کے درجات ہیں۔ ایک صفت کائناتی سٹیج کی ہے۔ وہاں اللہ رؤف و رحیم ہے۔ وہ کائنات کی ہر چیز شجر و حجر' درختوں' پرندوں' چرندوں کے لیے رؤف الرحیم ہے۔ اسی طرح رسولؐ اکرم اپنی حدود کے اندر رؤف الرحیم ہیں۔ خدا اپنے لیے کہتا ہے' الحمدللہ رب العلمین رسولؐ کے لیے ہے' وما ارسلنک الا رحمتہ للعلمین جہاں جہاں رب العالمین ہے' وہاں وہاں رحمت للعالمین ہیں۔

قرآن سے تو دور جانا ہی نہیں۔ آپ حدیث کو بھی نہ جائیں۔ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ خدا کوئی مغالطہ پیدا کر رہا ہے؟ ایسا بھی نہیں ہے۔ خدا اپنے اختیارات بانٹتا نہیں ہے مگر جب اللہ کسی کو دینا چاہے تو کسی کو کس پر اعتراض ہوگا؟ میں اپنے آقا سے اس لیے جلوں' رسول اللہ کی اس لیے کسر شان کروں کہ اللہ نے سب کچھ انہیں دے دیا ہے؟ حضورؐ سے کوئی جلتے تو پیغمبر جلتے۔ میرا تو یہ حق ہی نہیں بنتا مگر جب چوتھے' پانچویں یا چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ سے حضور کی ملاقات

Marfat.com

ہوئی تو موسیٰ سے پوچھا' کیا ہوا؟ کیا میرے آنے سے آپ کو کوئی زحمت ہوئی؟ فرمایا نہیں' میں اللہ سے گلہ گزار ہوں کہ یہ ابھی نوجوان لڑکا سا ہے اور اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ جنت میں جائیں گے۔

دیکھیے حضرت موسیٰ نے ذاتی حسد کا اظہار نہیں کیا۔ دونوں پیغمبر حریص خیر امت تھے مگر حریص کا لفظ صرف رسول اللہؐ کے لیے استعمال ہوا۔ منفی لفظ ہے۔ محبت رسولؐ اجاگر کرنے کے لیے پوری عربی زبان عاجز ہوگئی۔ اتنا زیادہ انس رسول کو اپنی امت سے ہے کہ کسی مثبت لفظ سے وہ ادا نہیں ہوسکا۔ اسے حریص کے منفی لفظ سے پورا کیا گیا۔

لاہور والے جب کسی کو بہت اچھا پائیں تو کہتے ہیں کہ یہ تو نرا قتل ہے۔ دراصل وہ اس کے حسن کمال کی داد دے رہے ہوتے ہیں۔ وہی جملہ اللہ میاں نے اس سے بہت پہلے استعمال کیا اگر اس کی خوبی کی بات کروں کہ وہ بہت اچھا ہے' تو پھر تم نہیں سمجھ سکتے۔ اب تمہیں یہ کیسے کہوں کہ یہ نبی اپنی امت کی رہائی' اس کی تسکین اور اس کی بخشش کے لیے کتنا حریص ہے' تو پھر ہمیں جلدی سمجھ آ گئی کہ ایسا اور کوئی پیغمبر نہیں ہے جو رسول اللہ کی طرح اپنی امت کی اتنی فکر کرنے والا ہو۔

حضورؐ نے ایک خواب سنا۔ فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں' لوگ آگ کے گڑھوں کے گرد کھڑے ہیں۔ اس میں گرنے کے لیے بے چین ہیں اور میں انہیں کمر سے کھینچ کھینچ کر پیچھے کر رہا ہوں۔ نبیؐ کو آپ لوگوں کے لیے بڑی مشقت اور مزدوری کرنی پڑ رہی ہے۔ میرا خیال ہے' آپ تو گرنے کی کوشش میں بے چین ہیں۔ اللہ کرے' انہی کی کوشش بخشش اور رحمت و مغفرت ہمارے کام آ جائے۔

مذہبی جماعت کی تشکیل

میں بڑا خوفزدہ رہتا ہوں کہ کوئی جماعت بنے یا بنائیں یا میں اس میں شریک ہوں۔ قرآن کی آیت ہے ان الذین فرقوا دینهم و کانو شیعا لست منهم فی شیأ جن لوگوں نے اپنے اپنے دین میں فرق کیا اور گروہ بن گئے' اے پیغمبر! تو ان میں سے نہیں ہے۔ میں بنیادی طور پر بڑا خوفزدہ ہوتا ہوں اور آپ نے بھی جماعت کا نام لے کر مجھے خوفزدہ کر دیا ہے۔ پروردگار مجھے یہ شوق نہ بخشے کہ میں ایک جماعت بناؤں۔ مجھے اس کا امیر بننے کا شوق ہو اور میں اسے بہترین گروہ کہوں یا میں اپنے آپ کو اصلاح کے کاموں کے لیے چنوں۔

جو میں کر رہا ہوں' وہ لوگوں کے لیے سوچنے سمجھنے کی راہیں کشادہ کرنے کی ایک کوشش ہے۔ میرے خیال میں گروہی جماعتوں نے سوچنے کے راستے بند کر دیے ہیں۔ یہ کمپیوٹر لاک ہو گئے ہیں۔ انفارمیشن کلوز ہو گئی ہے۔ جب میں کسی مذہبی آدمی سے گفتگو کرتا ہوں تو مجھے اس کے کمپیوٹر کی سلیٹ پر لکھا ہوا ملتا ہے Exit denied بار بار آتا ہے Exit denied اور اس کی کون مجھے آج تک نہیں ملی کہ یہ Exit کا Denial میں کیسے توڑ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ میں بار بار اس پر خیال و فکر کی بمباری کروں۔

تنظیم سازی کی ضرورت

ہم سب کی اس معاشرے اور ملک کے حوالے سے کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ مجھے کوئی ملک عزیز نہیں ہے اور یہ

Marfat.com

ملک بھی اس لیے عزیز نہیں ہے کہ میں یہاں پیدا ہوا بلکہ اس لیے کہ خدا نے مجھے یہ ملک آزادی سے خدا کے احکامات بجا لانے کے لیے دیا ہے۔ ہم سب کو کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی مثال قائم کرنی ہے۔

مثال کے طور پر میں اپنے ایک اچھے دوست کے پاس تھانے میں گیا تو وہاں مجھے ایک بزرگ نے کہا کہ میں ذکر کے لیے تسبیح چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے کہا' آپ کیوں چاہتے ہیں؟ اللہ کی طرف جانے میں آپ کو بہت محنت کرنی پڑے گی۔ یہ عملی طرز فکر ہے۔ اس نے مجھے بڑی عجیب سی بات کہی' کہا کہ فلاں صاحب آپ کے دوست اور شاگرد نہیں ہیں؟ میں نے پوچھا' آپ نے کیا ان میں ایسی بات دیکھی ہے کہ آپ بھی یہ کرنا چاہیں؟ کہنے لگے کہ پیسے تو وہ ہمارے جتنے لیتے ہیں۔ اتنا حرام کھانے کے باوجود ہمارے چہروں پر کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ مجھے حیرت ہے' اس کے پاس کوئی پیسہ نہیں ہوتا' اس کے باوجود وہ ہنس کھیل رہا ہوتا ہے۔

پہلے ہمارے پاس مثال کوئی نہیں تھی۔ اب چونکہ مثال ہے' اس لیے اب ہم پردہ اٹھا سکتے ہیں۔ کوئی شخص بھی نیک نیتی سے خدا کے رستے پر چلتا ہے اور اپنی اصلاح کرتا ہے' تو اس میں کوئی نہ کوئی اثر ضرور ہوتا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کی اصلاح کا باعث بنتا ہے۔ اس لحاظ سے کئی لوگوں کے میں نے کرشمات دیکھے ہیں۔

جہاں تک تنظیم سازی کا تعلق ہے میں اس کو سخت ناپسند کرتا ہوں کیونکہ تنظیم سازی نے ہی مذہب کو اکیڈیمک اور فنڈامنٹلسٹ میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تنظیم سازی تھی' جس کی وجہ سے لوگ مذہب کی داخلی فطرت کو بالکل بھول گئے بلکہ ہمارا حال وہی ہے جو یہود کے فلسطین کا تھا۔ جب حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے۔ وہ اتنے مذہبی' نیکوکار اور پرہیز گار تھے کہ جس کا کوئی حساب نہیں تھا۔ مگر اس کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کو یہ کہنا پڑا کہ اس طوائف کو پہلا پتھر وہ مارے' جس نے خود یہ کام نہ کیا ہو اور کوئی فرد واحد آگے نہ بڑھا۔

ہمیں بہت ساری باطنی اصلاح چاہیے۔ اصلاح کا جذبہ خطرناک ہے۔ کوئی فرد اس انقلاب کو نہیں روک سکتا' جس کا وقت آ چکا ہے۔ یہ ایک اصول ہے مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ برصغیر میں ہر شخص اس انقلاب کو اس وقت کے بغیر لانے کے لیے کوشاں ہے اور یہ شیزوفرینیا کی ابتداء ہے۔ بہت سارے بندے میں نے اس مرض کا شکار دیکھے ہیں۔

پچھلے برس سیشن میں ایک خاتون محترم نے یہ رائے دی تھی کہ ہم اپنے کام کو منظم کریں' تو اس سے ہم لوگوں کی زیادہ توسیع ہوگی۔ میں نے کہا' نہیں۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو ہم قدرتی انداز میں پیش رفت کریں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قدرتی انداز میں بڑھ رہے ہیں۔ میری بڑھوتری اور توسیع کی خواہش اور ارادے کے بغیر آپ بڑھ رہے ہیں۔

انقلاب بغیر رضامندیٔ خدا

ایک تو ہم ویسے لاعلم ہیں اور دوسرا اس لاعلمی پر ہمیں مصر رکھنے والا ایک معاشرتی نظام ہے' جو ہمیں متعین رکھتا ہے۔ خداوند کریم نے ارشاد فرمایا ہوا ہے کہ جب ہم کسی قوم کو ذلیل ورسوا اور خوار کرنا چاہتے ہیں تو اس کے امرا کو بدفعلی اور بدکاری پر مائل کر دیتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی اور اکیڈیمک تاثر ہے کہ وقت کے ساتھ جو میں نے سماجی سیٹ اپ میں دیکھا ہے

Marfat.com

کہ خدا' سچائی اور علم کے لیے خواہش بیدار ہو رہی ہے۔

البتہ بہت سارے وہ لوگ' جو انقلاب کے داعی ہیں' انقلاب لانا چاہتے ہیں' وہ انقلاب مدینہ سے لانا چاہتے ہیں' مکہ سے نہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم فوری طور پر فتوحات کے زمانے میں داخل ہو جائیں۔ بغیر اپنی تربیت کیے' جانے بوجھے' جانچ پرکھ اور بغیر ذات کی اصلاح کیے۔ ہم سب محقق اور نقاد ہیں۔ شاید جب تک ہم ان تیرہ برسوں سے نہ گزریں' جس میں پروردگار کا رسولؐ اور اس کے اصحاب گزرے۔ جب تک ہم بھی اذیت ذہن کرب و بلا کے اس دور سے نہ گزریں جس سے بلال اور صہیب گزرے' میرا نہیں خیال کہ کوئی بھی انسان اخلاقیات کے کسی بھی سوال کا جواب دینے کے قابل ہو جائے گا۔

ایک بڑے مشہور مفکر نے یہ بات کہی کہ کوئی آدمی اس انقلاب کا رستہ نہیں روک سکتا' جس کا وقت آ چکا ہو۔ ہمارے بڑے بڑے ناصحین اور انقلاب کے لیڈر اس قانون کو صحیح نہیں سمجھتے۔ مگر ہم لوگ چاہتے ہیں کہ وقت آئے نہ آئے' ہم ضرور انقلاب لائیں۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ ہر مذہبی جماعت بری طرح ناکام ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی اللہ پر تھوپ رہے ہیں۔ اس کے لیے وقت موجود ہے نہ خدا کی مرضی دستیاب ہے۔ کوئی بھی اتنی کوشش نہیں کرتا کہ پہلے تھوڑا سا انتظار اور جاننے کی کوشش کرلے کہ خدا کی مرضی کیا ہے؟ وہ مجھے چاہتا بھی ہے کہ نہیں؟ کیا میں وہ فرد ہوں' جو کسی کی قیادت کر سکتا ہے؟ کیا میں وہ منتخب کردہ ہوں؟

یہ برصغیر ہے۔ ہماری سرزمین میں شیزوفرینیا بڑی تیزی سے پیدا ہوتا ہے اور بڑی جلدی رخصت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہر رہنما جو آتا ہے' وہ طاقت اور انقلاب کے تصور میں ڈوبا ہوتا ہے۔ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی ہو۔ ان چالیس پچاس برسوں میں بہت سارے آفتاب آئے' اترے اور جل کے رخصت ہو گئے۔ انقلاب نہیں آ سکا۔ انقلاب کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے' جب خیال کی انارکی میں انسانی شعور کسی اصول کی طلب کرے۔ اس وقت ہماری حسِ بقا خطرے میں ہے۔ ہم سالمیت کے اصول کی تلاش میں ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہم اپنی ترجیح کی طرف رجوع کر رہے ہیں اور یقین ہے کہ ہماری منزل قریب ہے۔

مذہب کا استحصال

اتنی قابلیت ہونے کے باوجود ہمارے ملک میں ممکنہ حد تک مذہب کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ہر مذہبی آدمی خبطی ہے۔ اسے طبعی طور پر مالیخولیا ہو گیا ہے۔ وہ پاگل بن گیا ہے۔ وہ توجہات اپنی ذات کے لیے مرتکز کرتا ہے۔ جو اٹھتا ہے' جماعت بنانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ ہر کوئی امیر المملکت اور امیر المسلمین کے خواب دیکھنے لگ جاتا ہے۔ یہ کیسا احساس ہے؟

تبلیغیوں کو دیکھ لیں' وہ کیوں کعبہ کے مقابلے میں ایک نیا کعبہ تشکیل دے رہے ہیں؟ ان کا کیا مقصد ہے؟ اب ایک شخص کہتا ہے کہ چلو کعبہ نہیں جا سکا' رائے ونڈ ہی ہو آئیں۔ یہ کس قسم کا جملہ ہے کہ کعبہ کے بعد دنیا کے مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع رائے ونڈ ہوتا ہے۔ کیا وہ کعبہ کے مقابلے میں ایک نیا شہر بسانے کی تگ و دو میں ہیں؟ یہ کیسا شماریاتی جملہ

Marfat.com

ہے کہ بیس لاکھ مسلمانوں نے رائے ونڈ جا کر دعا مانگی ہے۔ وہ دعا کہاں چلی گئی کہ فاسق ترین لوگ حکمران بن رہے ہیں؟ بے ایمانی حد وحساب سے بھی گزر گئی ہے۔ تین سو تیرہ لوگوں کی دعا عرش پر جا پہنچتی ہے اور یہاں بیس لاکھ لوگوں کی اجتماعی دعا پاکستان کے لیے کچھ نہیں کر سکی۔ برصغیر پاک و ہند کا اجماع یعنی اکثریت ہمیشہ صحیح فیصلہ کرتی رہی ہے اور اجماع کے کئی فیصلے ہمارے پیش نظر ہیں۔

پاکستان کی تخلیق کے وقت اجماع نے پاکستان کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ تمام دینی جماعتوں کے بڑے بڑے زعما اس کے خلاف تھے۔ ایک عام مسلمان جو فکر و اعمال کی وجہ سے اتنا بلند بھی نہیں ہے وہ تو ایک عام مسئلے پر صحیح فیصلہ کرتا ہے، مگر شیخ العرب والعجم یا شیخ الحدیث اس کے برعکس غلط فیصلہ کرتا ہے۔

جیسے جماعت اسلامی والے بنے بنائے اور گھڑے گھڑائے ذہن ہیں۔ میں اپنے مزاج کے مطابق عمومی لوگوں میں نہیں رہ سکتا، اگر میرا مزاج کڑا یا تنقیدی ہے، میرے ذہن پر اصلاح کا خناس حاوی ہے، میں عظمت کے خوابوں میں کھویا ہوا ہوں، میرے اندر انقلاب، خونی انقلاب کی ایک ناجائز حس جنم لے چکی ہے، بیماری پیدا ہوگئی ہے، تو میں ایسی جماعت چنوں گا، جو میرے مقصد کو سوٹ کرتی ہو۔ جماعت اسلامی میں آپ اول و آخر کسی آدمی میں اختراع پسندی (Ingenuity) نہیں پائیں گے۔ وہ سارے ایک جیسے ہیں۔ وجہ یہ نہیں کہ مذہب انہیں ایسا بنا دیتا ہے، بلکہ انہوں نے ہمیشہ کوشش ہی اسی قسم کی کی ہے۔

تبلیغی جماعت والوں میں آپ کو کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ ان کی درویشانہ اپروچ اور مسکینوں جیسی طبع کو میں اینٹی اسلام سمجھتا ہوں۔ میرے ذہن میں فوری یہ تصور جنم لیتا ہے کہ اگر اسلام کی انہی لوگوں نے تبلیغ کرنی ہے تو میں قیامت تک مسلمان نہیں ہو سکتا۔ جس قسم کے روّیے کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں، وہ ہرگز خوش اخلاقی نہیں ہے۔ کیا آپ اسے خوش اخلاقی سمجھتے ہیں؟ بلکہ یہ ایک بیماری اور لاغرپن ہے۔ میں تو انہیں دیکھ کر Depressed سا ہو جاتا ہوں۔ ان کے پاس اندازِ گفتگو ہی نہیں کیونکہ دین کی بات کی ترسیل کے لیے آپ کی علمیت بے شمار ہونی چاہیے۔ وجادلھم بالتی ھی احسن اور بحث کرو مگر بحث کا طریقہ اتنا خوبصورت ہونا چاہیے کہ دوسرے پر اثر انداز ہو۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ وہ تو مسجد میں دو چار چلوں کی بات کرتے ہیں اور چلوں سے تو عقل نہیں بڑھتی۔ اس سے دو صفحوں کی معلومات میں اضافہ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اسلام میں اس طریقہ کار اور تبلیغ کے اس طریقے کا وجود نہیں ہے۔

میں کوئی حتمی رائے دینے یا ٹھونسنے کی کوشش نہیں کر رہا لیکن جس قسم کا وہ رویہ رکھتے ہیں، اول تو اس قسم کا تبلیغی ڈھانچہ یا چار ماہی چلوں کا نظام اسلام میں کوئی معانی نہیں رکھتا نہ وہ کبھی جگہ بنا سکے گا۔ یہ زیارت کی پرانی تاریخ ہے جو انگلستان میں بھی چلتی رہی ہے اور بعض دوسری جگہوں پر بھی۔ یہ طریقہ Hypnosis (تنویم) کو آگے لاتا ہے جو مذہب میں ایک نام نہاد اور جعلی طریقہ ہے۔ حشیشین کا بھی یہی وطیرہ تھا اور ابھی بھی تمام انتہا پسند مذہبی جماعتوں کا یہی طریقہ کار ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میں رائے ونڈ جا کر دعا بھی مانگوں تو میری سزا میں کوئی کمی ہو جائے گی۔ یہ اجتماعی دعا کی بات کرتے ہیں۔ آج تک اجتماعی دعا کس کی قبول ہوئی ہے؟ جبکہ آپ میں صاحب دعا ہی موجود نہیں ہے۔

مجھے تبلیغ والوں سے قطعی عداوت نہیں ہے۔ ذہنی و فکری طور پر میں انہیں قبول کرتا ہوں۔ مقصد اسلام تو صرف اللہ

Marfat.com

ہے۔تم میں کون یہ اعلان کرتا ہے کہ میں اللہ کا شناسا ہوں؟ جماعت اسلامی میں کوئی ایسا شخص ہے' جس کا یہ نعرہ ہو کہ میں خداشناس ہوں؟ کسی بھی فرقے اور تنظیم میں اللہ کے تصور کا ادراک ہی نہیں ہے۔ وہ کس طرح اسلام کی خیر مانگ سکتے ہیں۔ ان کے ہاں صرف اللہ ہی غائب ہے' باقی سب کچھ حاضر ہے۔ خدا ان کے درمیان کسی قسم کا نشان اور وجود نہیں رکھتا۔

یہی میرا ان سے بنیادی اختلاف ہے۔ پندرہ کروڑ عوام میں سے ڈیڑھ کروڑ یہ لے جائیں۔ ساڑھے تیرہ کروڑ مفلوک الحال عوام' جو کاروانِ حیات میں تماشا بنے ہوئے ہیں' وہ بھی اللہ اور رسولؐ کے بندے ہیں۔ انہیں پگڑیاں نہیں تبدیل کرسکتیں۔ دو ہزار کا جمگھٹا ادھر لگا ہے۔ پانچ ہزار کا لشکر ادھر بیٹھا ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جیسے اکرم اعوان اعلان کرتے ہیں' پانچ لاکھ ادھر ہیں اور باقی پانچ کروڑ پیچھے بیٹھے ہیں۔ اتنے عظیم مذہب کے پیروکار اتنا بڑا سفید جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ نہ ادھر پانچ لاکھ تھے نہ ادھر پانچ کروڑ کا جمِ غفیر تھا۔ مذہب کے بڑے سٹار اتنے غیر مصدقہ بیانات دیں تو نچلے لوگوں میں جھوٹ و کذب بیانی کا حساب کیا ہوگا؟ اگر اپروچ بھی ناقص ہو اور پہنچ بھی نہ ہو' تو ہم ان مسلمان رہنماؤں اور لوگوں کے ساتھ کیا کریں گے؟

میں کیوں کسی کی پیروی کروں یا اسرار کے پیچھے چلوں؟ میں ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ ان کے دعویٰ کو ہرگز رد نہیں کرتا لیکن مجھے یہ ثابت کرکے دکھائیں کہ یہ نبی کریمؐ کا اسوۂ حسنہ تھا۔ یہ ہمارا نصاب ہے اور ہم نبیؐ کے نصاب کے عین مطابق ہیں۔ اصولی طور پر اگر تبلیغ والے یہ کہتے ہیں کہ یہ محمد رسول اللہؐ کا نہج تھا' تو پھر انہیں ثابت کرکے دکھانا ہوگا کہ زمانۂ نبوت میں اس قسم کے بستر اٹھتے رہے ہیں۔ زمانۂ نبوت میں حضور اکرمؐ عالی مرتبت نے حفاظ کرام گروہ کی شکل میں نہیں' بلکہ ایک ایک کرکے بھیجے ہیں۔ اگر گروہ کی شکل میں بھیجے بھی ہیں تو ان کے نتائج اتنے غلط نکلے کہ ایک جگہ پورے اسی حفاظ مارے گئے۔ اس پر نبی کریمؐ نے منع فرمادیا۔ مدینہ منورہ میں لوگ آتے تھے۔ وہ ایک علمی و دینی اکیڈمی تھی۔ بہت سارے صحابہ کرامؓ کے جانی نقصان ہونے پر نبی کریمؐ کو گہرا رنج ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قنوتِ نازلہ کا نزول ہوا۔ خداوند کریم نے بہت بڑے نقصان کے ذریعے ہمیشہ کے لیے اس طریقے سے باز رکھنے کا حکم بھی دیا۔ یہ خدا کا انتخاب ہے کہ کس نے اللہ کی طرف آنا ہے' کس نے نہیں۔ آپ کو انتظار کرنا چاہیے کہ لوگ آپ کے بارے میں جان جائیں' پھر درِ مصطفیؐ پر آئیں۔ وہاں آکر علم سیکھیں۔ واپس جائیں اور باقی قوم کی رہنمائی کریں۔ ایک ایسا واقعہ' جس کے بعد کیا تبدیلی آئی' ہم دیکھتے ہی نہیں۔ اس حادثے کے بعد یہ نظام ہی ترک کردیا گیا۔ تب آنحضرتؐ کے زمانے میں حفاظتی انتظامات کیے گئے۔ لوگ مدینہ میں آتے تھے۔ سبق لیتے' تربیت حاصل کرتے اور بعد ازاں چلے جاتے۔

ایک ہی قبیلے کے لوگ آتے' سیکھتے' واپس جاتے اور جاکر تعلیم دیتے۔ اس طرح کبھی نہیں ہوا کہ امریکہ جائیں اور وہاں تبلیغ کریں۔ کیوں جائیں؟ کیا وہاں کی زبان آتی ہے؟ کلچر سے متعارف ہیں؟ وہاں کے انداز و ادا کا علم ہے؟ آپ وہاں پر طعن و تشنیع کا سبب بن جاتے ہیں۔ وہ آپ سے متاثر بھی نہیں ہوتے۔ آپ دنیا کو تماشا لگتے ہیں۔ ان کے کلچر اور تہذیب کے سامنے آپ اس بات پر ناز کررہے ہیں کہ ہم نے پانچ ہزار مسلمان بنا لیے ہیں۔ ٹھیک ہے' لیکن ہندو راج نیش پانچ لاکھ ہندو بنا کر گیا ہے۔ حال ہی میں وہاں ایک بدھسٹ گیا۔ اس نے امریکہ میں دس لاکھ

انسان اپنے ساتھ ملا لیے۔

وہ ایک ایسی ہی تھرڈی، بنجر اور ویران قوم ہے کہ کوئی بھی انہیں جوش و جذبہ دے کر اور چمتکار سے اپنے ساتھ ملا سکتا ہے۔ وہاں پر ہندو برادری میں سے کوئی جادوگر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا سحر لوگوں کو حیرت زدہ کرنے لگا۔ اس نے وہاں پر تین لاکھ آدمیوں کی جماعت بنالی۔ یہ کوئی کریڈٹ نہیں ہے کہ ہم نے پانچ ہزار مسلمان کر لیے ہیں یا جاپان میں تبلیغ سے دو ہزار مسلمان کیے ہیں۔ اگر یہ حقانیت کا ثبوت ہے کہ تم نے پانچ ہزار مسلمان کیے ہیں' تو پھر اس ہندو جوتشی کو داد دیں' جس نے پانچ لاکھ ہندو بنا لیے۔

میں کہتا ہوں' بیس لاکھ تبلیغی پاکستان میں موجود ہیں۔ مجھے تو کسی قسم کی پاکستان میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔ کوئی واضح فرق نظر نہیں آتا۔ بدقسمتی سے لوگوں کے اندر قلوب کی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ تو عیسائیت کی طرح ایک فلسفہ تلافی ہے' یعنی نجات کا فلسفہ۔ ہم میں سے جو جتنا بڑا مجرم اور گنہگار ہوتا ہے' وہ اس میدان میں اپنا جرم دھونے جاتا ہے یا تبلیغ کے ذریعے اپنا جرم دھونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تو ازالے کا فلسفہ ہے۔

میں مصر ہوں کہ تبدیلی کیوں نہیں آتی؟ میں کسی چیز کا دعویٰ نہیں کرتا' لیکن میرے شاگردوں میں سے کوئی اگر ایسی چیز موجود ہو تو وہ تبدیلی لے آئے گا۔ جہاں کہیں میرے احباب موجود ہیں' ان میں احساس ذمہ داری اور جواب دہی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ جہاں جاتے ہیں' کار خیر کرتے ہیں۔ میں ان کی برائیاں نہیں دیکھتا۔ وہ اکمل اور کامل نہیں ہیں۔ وہ میری طرح ہیں۔ اتنے کمزور کہ جیسے تھے یا جتنے تھے' لیکن ان میں کچھ کرنے کا احساس ذمہ داری ضرور موجود ہے۔ وہ جہاں جاتے ہیں' خوش اسلوبی سے کام کرتے ہیں' تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔

یہ تبلیغی کہاں جاتے ہیں؟ غرقابی دریا، آفات تو نہیں ہو جاتے؟ یہ کدھر جاتے ہیں؟ مجھے بتائیں کہ وہ کہاں ہیں؟ وہ اپنے علاقوں میں محسوس کیے جانے چاہئیں۔ تبلیغ کا اصول سب سے سنہری ہے۔ حضور عالی مرتبتؐ کے آغاز سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس معاشرے میں وہ امین و صادق کے لقب سے موسوم ہیں' وہاں جا کر تبلیغ دین کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ بلکہ پہلے استفسار کرتے ہیں کہ آپ کو مجھ پر اعتبار ہے کہ نہیں؟ کیا میں امین ہوں کہ نہیں؟ صادق ہوں یا نہیں؟ میرے پاس سال بعد کوئی آدمی تبلیغ کرنے آ جائے' تو مجھے قطعی طور پر علم نہیں ہے کہ وہ چور ہے' نیک یا بد ہے؟ بزرگ ہے یا عابد ہے؟ میں جس آدمی کی خبر ہی نہیں رکھتا' کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ میں اس پر کیسے اعتبار کراؤں؟ تبلیغ کے لیے ایک علاقہ طے کیا جاتا ہے۔

میں یہاں ایک جگہ بیٹھا ہوا ہوں۔ لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ انہیں پہلے پوچھنا پڑتا ہے کہ پروفیسر صاحب آپ سے کتنا فراڈ کرتے ہیں؟ انہوں نے کس کس کے ساتھ زیادتی کی ہے؟ نقاد آئیں گے۔ لوگوں سے بار بار پوچھیں گے۔ میرے ماننے والے دس آتے ہیں تو نہ ماننے والے بیس آتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ ہر لحظہ مطالعہ اور مشاہدہ کے عادی ہوتے ہیں۔ میں یہاں الیکشن لڑا ہوں تو اخبار والوں نے مجھ پر ایک پورا ضمیمہ لکھ ڈالا۔ یہ جماعت اسلامی کا اخبار تھا۔ اس نے لکھا کہ پروفیسر صاحب کو نااہلی کی وجہ سے لاہور سے نکال دیا گیا۔ لیکن میں ایسی چیزوں کی ہرگز پروا نہیں کرتا۔ اگر لوگ مجھ پر یقین کرتے ہیں۔ اظہار رائے کی آزادی رکھتے ہیں'

Marfat.com

تو وہ ہمیں منتخب بھی کر سکتے ہیں۔

اگر آپ کے پاس کسی شہر کا مسافر آئے اور پوچھے کہ مجھے پروفیسر صاحب کے پاس جانا ہے۔ چار معززین کا تو مجھے علم نہیں' جو میرے خلاف ہیں لیکن آپ یہ ضرور دیکھیں گے کہ ایک سادہ لوح آدمی کے دل میں میرے لیے کیا تصور ہے۔ وہ اس کو ساتھ لیتے ہیں۔ میرے گھر لے کر آتے ہیں۔ خاطر داری کے لیے بھی کہتے ہیں۔ یہ وقار' یہ تعظیم باہر نکل کر نہیں پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ان کا اپنے دلوں میں پیدا کردہ مقام ہے۔ ان کے اپنے مشاہدوں پر مبنی ہے۔ میرا اندرونی باطن تو ان تک نہیں پہنچ رہا ہوتا۔ میری سوچ بھی ان تک نہیں پہنچ پاتی۔ وہ سادہ لوح لوگ ہیں لیکن ان تک میری سوچ کا عمل پہنچتا ہے۔

اللہ کے لیے میں ان کی سڑکیں یا گلیاں تعمیر کروا دیتا ہوں۔ پچاس ساٹھ فی سبیل اللہ پانی کے نلکے لگوا دیے ہیں۔ یہ میری ذاتی جیب سے نہیں نکلے بلکہ یہ رقم میں نے اکٹھی کی ہے۔ لوگ باخبر ہیں کہ وہ سب کچھ ہماری فلاح و بہبود کے لیے سرانجام دے رہا ہے۔ یہ ایسا کام ہے جس کی سیاست میں بھی اشد ضرورت ہے۔ میں نے تو صرف تھوڑا سا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا ہے۔ لوگ چار چار گھنٹے میری باتوں کو کیوں انہماک سے سنتے ہیں؟

وجہ ہے۔ میں جو کہتا ہوں' اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ اگر میں حب الٰہی کی بات کرتا ہوں تو میرا اس پر کامل یقین ہے۔ اگر میں رحمت خداوندی کا ذکر کرتا ہوں تو میرا اس پر کامل یقین ہے۔ اگر گناہوں کی بات کرتا ہوں تو اس پر بھی یقین رکھتا ہوں۔ میں اپنی خطا پر یقین رکھتا ہوں۔ یہ میرا ایک حصہ ہے۔ یہ میرے کمپیوٹر کا ایک حصہ ہے۔ اگر وہ خطا کرتا ہے تو میں کس طرح غافل ہو سکتا ہوں۔ کوشش تو میں بھی یہی کرتا ہوں کہ نہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں اپنی قوتِ ارادی اور مرضی سے اس سے اجتناب کرنے کی ہر تگ و دو کروں گا۔ مگر مجھے علم ہے کہ اپنے بہترین علم و ذہن کے ہوتے ہوئے بھی میں غلطی کر سکتا ہوں' لیکن یہ ہمارے بزرگ وہ ہیں جو کبھی غلطی نہیں کرتے۔ یہ غلطی سے ماورا بنتے ہیں۔

انسانی جبلت کسی استعداد کی تکمیل کا نام ہے کیونکہ انسان کی ایک مستقل عادت یہ ہے کہ وہ اپنی کسی عادت سے جان نہیں چھڑاتا جیسے میں پچھلے پچاس سالوں سے سگریٹ نوشی کر رہا ہوں۔ بہت سارے لوگ مجھ سے استفسار کرتے ہیں کہ تم اس سے کیوں نہیں بچتے؟ تمہاری قوت ارادہ اور ارادہ دونوں مضبوط ہیں۔ آپ خدا کے راستے کی طرف گامزن ہیں یعنی صراط مستقیم کی طرف۔ آپ میں اتنا حوصلہ ہونا چاہیے کہ آپ اسے ترک کر سکیں۔

ہاں مجھ میں اتنی ہمت و حوصلہ ہے کہ میں اسے چھوڑ سکوں۔ اس لیے نہیں کہ میرے پاس قوت ارادی موجود ہے۔ میرے ہاں قوت ارادی نہیں ہے۔ جب سے لاحول ولا قوۃ کا ذکر شروع کیا ہے' اس کے بعد میری قوت ارادی نہیں رہی۔ میں تو صبح و شام یہ کہتا ہوں کہ نہ میرے پاس قوت ہے نہ ہی ارادہ ہے۔ جو کچھ ہے' میرے اللہ کریم کا ہے۔ پھر میں اپنی قوت ارادی اور پرعزم ارادوں کا کیسے دعویٰ کر سکتا ہوں۔ سگریٹ نوشی صرف میری جبلت اور عادت ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں اس عادت کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو اپنی اس عادت سے ہمدردی کر رہا ہوں۔ اب مجھے خوف و خطرات نے بھی آن گھیرا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے۔ خوف کینسر کا ہے' گلے کی خرابی کا ہے۔ میں پچھلی دفعہ شفا انٹرنیشنل گیا تو میں نے گلے کے بارے میں معلوم کیا کہ بیماری سنجیدہ تو نہیں ہے۔ وہ خوف ختم ہوا تو میں اپنی عادت پر آ گیا۔

Marfat.com

تشخیص کے ساتھ علاج

جب بھی میری زندگی میں کوئی فرد آیا تو جو کچھ میں جانتا تھا' وہ ضرور اس تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جس طریقہ سے تھوڑی بہت اپنی اصلاح کر سکا' وہی طریقہ میں نے اس کو بتایا ہے۔اکیڈیمک سے تو کسی مسلمان کو انحراف نہیں ہے۔اس مقام پر اتنے بڑے عالم موجود ہیں کہ غالباً ہمیں کسی تازہ اکیڈیمک ورشن کی ضرورت نہیں ہے۔مگر بدقسمتی سے وہ اکیڈیمک کہیں استعمال نہیں ہو رہے۔ہم ذاتی زندگی اور اندازفکر میں مضلح ضرور ہیں مگر اپنے ماحول اور پیش منظر میں ہمیں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی۔ہر دفعہ یہ خبر اخبار میں پڑھنے کو لگتی ہے کہ رائے ونڈ میں اس سال بیس لاکھ فرزندانِ توحید حاضر تھے۔اگلی سال پتہ چلتا ہے کہ ان کی تعداد پچیس لاکھ ہوگئی ہے۔یہی حال رہا تو شاید اگلے چند سالوں میں ان کی تعداد پچاس لاکھ تک پہنچ جائے لیکن جس جگہ ایک بھی شریف آدمی موجود ہو' وہاں شمع سے شمع ضرور جلتی ہے۔

اکو کوک فرید دی سچے کر گئی تھل

مگر یہ عجیب سی بات ہے کہ پچیس لاکھ فرزندانِ توحید جب رائے ونڈ سے نکلتے ہیں تو اس کے بعد ان کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ کہاں جاتے ہیں اور ملک مزید ذلت' ادبار' رشوت ستانی' خرابی کی طرف بڑھ جاتا ہے۔شاید کوئی نقص ایسا ہے جو ان فرزندانِ توحید میں جاری ہو۔

میں ممکنہ حد تک اس نقص کی نشاندہی بھی کرتا ہوں اور ممکنہ حد تک اس کے حل کی کوئی صورت بھی پیش کرتا ہوں۔ ہم تقویٰ اور تزکیہ کے بہت اعلیٰ معیار سے شروع کرتے ہیں۔خدا کو اعلیٰ ترین ترجیح دیتے ہوئے ہم اپنے ظاہر و باطن میں سے کچھ نہ کچھ' کوئی نہ کوئی شے سنوارنے کی کوشش ضرور کر رہے ہیں۔امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس مقصد میں کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہوں گے۔

ہمارا یہ دوسرا اجتماع ہے۔یہ اجتماع بھی مذہبی سیشن نہیں ہے۔بلکہ عید کے بعد ہم ملا کرتے ہیں۔اس مرتبہ ہم اتنے سارے اکٹھے ہو کر چل رہے ہیں۔اس کا مقصد جماعت بنانا یا کوئی تنظیم کھڑی کرنا نہیں ہے' البتہ جائزے کا ضرور ہے۔ہم اپنی ذہنی و اخلاقی اور ظاہر و باطن کی جدوجہد میں کوشش کرتے ہیں کہ توازن حاصل کریں۔ایک دوسرے کی مدد کریں۔بہت سے علم حاصل کریں' کم تر تک پہنچائیں تاکہ اللہ ہمیں یہ توفیق بخشے کہ آئندہ آنے والے وقتوں میں ہم اپنی نسلوں کو بہتر سراغ علم اور بہتر آئیڈیل دے سکیں۔

Marfat.com

اسلام میں تصوف

اسلام میں تصوف کا وہی مقام ہے جو مسلم اور مومن کے مقامات ہیں۔ اگر آپ اللہ کے ارادے سے عبادات کریں گے تو آپ صوفی اور مومن ہیں اور اگر اللہ کے لیے اعمال شرع کا نفاذ نہیں کر رہے' تو آپ مسلم ہیں۔ حضرت سعدؓ حضور گرامی مرتبتؐ کے پاس کھڑے تھے۔ ایک اعرابی آیا' آپ نے اس کو کم مال دیا۔ حضرت سعدؓ نے کہا' یارسول اللہ! یہ مومن ہے۔ فرمایا' بلکہ مسلم ہے۔ فرمایا' نہیں یارسول اللہؐ! میرے خیال میں یہ مومن ہے۔ فرمایا' نہیں سعد! یہ مسلم ہے۔ جب تیسری مرتبہ کہا' تو حضورؐ نے فرمایا کہ سعد' تو مجھ سے اس بات پر جھگڑتا ہے' جو میں تجھ سے بہتر جانتا ہوں۔

صوفی ہم معنی مومن اور مسلم ایک ابتدا کرنے والا مسلمان ہے۔ دونوں میں فاصلہ صرف نیات کا ہے کیونکہ انما الاعمال بنیات صوفی کوئی انوکھی شے نہیں۔ عجیب وغریب ہستی اور معجزانہ وجود نہیں ہے۔ ایک ایسا صاف ستھرا انسان ہے' جس نے ترجیحات میں اللہ کو اولین ترجیح بنایا اور اسی کے لیے اپنی زندگی کی ترجیحات مرتب کیں جو مشقیں آپ دیکھتے ہیں' وہ صوفی کا حصہ نہیں ہیں' یہ آرڈر کا حصہ ہیں۔ صوفی غیر معمولی اس لیے ہوا کہ جب علم وادب کے رستے بند ہو گئے' تو صوفیا نے جسمانی مشقت شروع کر دی اور خیال کیا کہ شاید اس طریقے سے خدا ملتا ہو۔ ویسے آج تک جسمانی مشقت سے خدا ملا نہیں۔ اللہ میاں نے خود ہی پابندی لگا دی کہ لا سرورۃ فی الاسلام لا رھبانیۃ فی الاسلام' اسلام میں رہبانیت ہے' نہ اسلام میں فاقہ ہے۔

Mystic or Mystique

لفظ Mysticism کی لفظی تعریف پر جائیں' تو آپ حیران ہوں گے کہ تمام ڈکشنریوں میں اس کا صرف ایک مطلب لکھا ہے کہ The relationship of individual to God۔ آپ نے جو اصطلاح استعمال کی ہے یہ Mystique ہے Mystic نہیں ہے۔ ہم ادب اور اعلیٰ ترین ادبیات میں دونوں لفظوں کو بالکل علیحدہ استعمال کرتے ہیں جہاں Mysticism کی تعریف فرد کا خدا کے ساتھ تعلق ہے' وہاں Mystique کی تعریف میں ذات اور خارج کے

Marfat.com

بارے میں پراسرار ہیولے تخلیق کرنا شامل ہے۔ جب دھوکہ ڈالا جائے تو Mystic کو Mystique سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف زبان دانی کی بات ہے۔ انگریزی زبان میں دونوں لفظ ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب ہم نے کسی پر طنز کرنا ہو تو ہم کہتے ہیں You are a mystique مگر کسی کو داد دینے کے لیے Mystic کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

تصوف عربی لفظ ہے۔ میں لفظ صوفی کی مختصراً تعریف سیدنا ہجویرؒ کے قول سے کرتا ہوں۔ اس کے چار ذرائع ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اصحاب صفہ سے نکلا ہے۔ ان کے اندازِ زندگی کو اپنانے کا نام تصوف ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ لباس صوف سے نکلا ہے۔ درویش لوگ زیادہ تر غربت کا لباس یعنی اونٹ کا پہنتے تھے' اس لیے صوف ہو گیا مگر سیدنا ہجویرؒ نے لکھا کہ ہم صوفی اس کو سمجھتے ہیں جو صفائے قلب پر مشتمل ہو۔

تصوف کی مزید وضاحت

(ڈاکٹر عبدالجلیل خان) ایک چیز Mysticism ہے' جس پر بڑی بحث ہوئی۔ یہ وہ شخص ہے جو اپنے اور خدا کے درمیان رابطہ استوار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شطرنج کے مہروں کی تعداد شاید 16 ہوتی ہے اور ان کی چالیں اگر کمپیوٹر پر شمار کی جائیں' تو ایک بلین سے زیادہ بنتی ہیں لیکن نفس انسانی کے محرکات کی تعداد شاید نوے سے زیادہ ہے۔ اگر ان کی چالیں شمار کی جائیں تو وہ ٹریلین کو کراس کر جائیں' لیکن اگر ان میں سے کوئی مہرہ اکیلے حرکت کرے۔ جیسے نفرت اکیلے حرکت کرے۔ تو آپ کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ کسی سے نفرت کر رہے ہیں لیکن اس وقت جو میں گفتگو کر رہا ہوں وہ میں جانتا ہوں کہ یہ گفتگو میں اللہ کے لیے کر رہا ہوں یا اپنی پروجیکشن کے لیے کر رہا ہوں۔ یہ ایک پیچیدہ حملہ ہے' جو میرے نفس نے مجھ پر کیا ہے۔ اب اگر میں اس کی پہچان کر لوں اور اپنے نفس کے تمام پیچیدہ واروں کو سمجھ جاؤں' جو وقتاً فوقتاً وہ مجھ پر کرتا رہتا ہے تو جیسے کسی صوفی نے کہا ہے کہ دو چیزوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ایک نبی کا مقام اور ایک نفس کے حملے۔ وہ شخص جو اپنے نفس کے پوشیدہ اور پیچیدہ واروں کو سمجھ جاتا ہے وہ اپنے جبلی تقاضوں سے آگے نکلتا ہے اور جب ایسا کرتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق استوار کرے۔ وہ شخص جو میری طرح بسیار خور ہو یا جسے لباس فاخرہ پہن کے اپنا قد بڑھانے کا شوق ہو' اس کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں۔

صوفی تو وہ ہے کہ وہ لباس فاخرہ یا پھٹا ہوا لباس پہنے' اس کے نفس میں تغیر نہ آئے۔ اگر مقام اس کو اپنی بزرگی کا احساس دلا دے تو وہ صوفی نہیں ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایک دفعہ ایک محفل میں بیٹھے تھے کہ کسی نے آ کے خبر دی یا شیخ! آپ کا بحری جہازوں کا قافلہ' جس پر گرم مصالحے لدے ہوئے تھے' ڈوب گیا۔ شیخ نے سر نیچے کیا اور کہا' سبحان اللہ! پھر کسی نے خبر دی کہ شیخ وہ خبر غلط تھی۔ وہ قافلہ نہیں ڈوبا۔ شیخ نے پھر نگاہ کی اور کہا' سبحان اللہ! کسی شخص نے کہا' یا شیخ! سمجھ نہیں آئی۔ دونوں دفعہ آپ نے سبحان اللہ کہا۔ آپ نے جواب دیا کہ پہلے نقصان ہوا تھا۔ میں نے اس کم بخت کو دیکھا کہ پریشان تو نہیں؟ تو یہ متغیر نہیں ہوا۔ میں نے کہا' اللہ تیری ذات پاک ہے۔ پھر جب خبر آئی کہ قافلہ نہیں ڈوبا' تو پھر میں نے نگاہ کی کہ کم بخت خوش تو نہیں ہوا؟ تو اس میں تغیر نہیں آیا۔ میں نے اللہ کی تعریف کی۔ اس کا احسان ہے کہ مجھے اس نے ان

Marfat.com

پھندوں سے بچایا۔ اسی چیز نے شیخ عبدالقادر کو پیرانِ پیر بنا دیا۔ باقی پاکھنڈ بھی پہچانے جاتے ہیں اور اصلی بھی پہچانے جاتے ہیں۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) جب صوفی ازم شروع ہوا۔ جدید خیالات آئے۔ تضادات شروع ہوئے۔ متقابل نظریات متصادم ہونا شروع ہوئے تو دیکھا یہ گیا ہے کہ وہ نظریہ جس کے ساتھ ان کی کمٹمنٹ مضبوط نہ ہو' ہمیشہ اس نظریے سے شکست کھا جاتا ہے جس کے ساتھ انسان کی بہتر کمٹمنٹ ہو۔ صوفی کا لفظ دو مرتبہ اس معنے میں استعمال ہوا ہے کہ شاید یہ زندگی سے گریز ہے۔ شاید یہ ٹوٹے پھوٹے لوگوں کے دلوں کا سہارا ہے۔ شاید احساس کمتری کا مداوا ہے' یا شاید احساسِ محرومی کا پر تکلف لباس ہے مگر ایسا نہیں ہے۔

میں لفظ صوفی پر اتنا ہی معترض ہوں جتنے کہ کوئی اور صاحب ہیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ جب ہم لفظ صوفی پر غور کرتے ہیں تو از منہ وسطیٰ کی ڈکشنری ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے صرف حافظ شیرازی ہے۔ سعدی شیرازی ہے۔ ہمارے سامنے وہ تمام ملامتی ہیں جو رقص و سرود میں صوفی ازم کو ڈھونڈتے ہیں مگر کیا ہمیں اس وقت یہ حدیث یاد نہیں آسکتی' جب جنگ تبوک سے رسولؐ پلٹے اور تھکے ہارے مسلمانوں کو خطاب کیا اور کہا' اب ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کو پلٹ رہے ہیں۔ اصحاب رسولؐ نے عرض کی' یا رسول اللہؐ! میدانِ قتال میں تلواروں کے ساتھ خدا کی راہ میں خون بہانے سے بھی بڑا کوئی جہاد ہے؟ فرمایا' ہاں جہاد بالنفس ہے۔ صوفی کمزور اور بزدل نہیں ہوتا۔ وہ واحد ایک ایسا شخص ہے جو خارجی بحران سے تو لڑتا ہے ہی' مگر وہ اپنے وجود کی عریانیت اور احساس کمتری کا بھی مطالعہ کرتا ہے۔ وہ محرومیوں کے سیلاب سے بھی گزرتا ہے مگر اپنے ہی سیلف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی نفی اور اس کا بطلان کرتا ہے۔ وہ خداوند کریم اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں بڑھتا ہوا' اعمال صالح کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر ایک فکر مسلسل کے ساتھ اپنی ہر اندرونی کمزوری کا سامنا کرتے ہوئے ہر روز مرتا ہے۔ اگر وہ ہر روز نہ مرتا تو وہ بڑا مجاہد نہیں ہوسکتا تھا۔

مجاہد ایک وقت اشتعال میں مبارزت میں تلوار سے بچنے کی بھی امید رکھتا ہے مگر صوفی یہ امید نہیں رکھتا۔ اس کو پتہ ہے کہ میں نے ہر حال میں ہر رنگ میں اپنے آپ کو قتل کرنا ہے' کیونکہ ہوائے نفس ہے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلط فکری کو جائے گا۔ اس میں کوئی چیز میرا ساتھ نہیں دے گی۔ اس لیے کہ خداوند کریم کے قانون کے مطابق اس کو پتہ ہے واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی' ہمارے صوفی کی تعریف یہی ہے کہ وہ جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کو بڑھتا ہے۔ دنیاوی جدوجہد میں توازن تخلیق کرنے کے بعد ایک باطنی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اس آیت پر عمل کرتا ہے کہ خارجی گناہوں سے بھی بچو اور باطنی گناہوں سے بھی بچو۔

مسئلہ یہ ہے کہ باطنی یا خارجی گناہ میں کیا صوفی کے دل میں کوئی واپسی نہیں ہوسکتی اور اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم پلٹ نہیں سکتے؟ کیا کہیں وہ شکست نہیں کھا سکتا؟ اس کے دو بڑے حریف ہیں' جن کی اللہ نے خود خبر دی ہے کہ شیطان تمہیں چھپ کے دیکھ لیتا ہے۔ تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اس کے پاس بھی کوئی ایسا اثاثہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے اس خفیہ دشمن سے اپنا بچاؤ کر سکے۔ دونوں ہی اس کے خفیہ دشمن ہیں۔ اس کا نفس اور اس کا شیطان بھی۔ Recurrence Of Thought اندر بھی اور External Thought بھی۔ اب ان دونوں کے درمیان توازن اور اعتدال صرف اور صرف

Marfat.com

متابعت رسولؐ میں ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ حدیث پر غور کرنے والے اور بہت سارے حدیث کو پڑھنے والے حدیث کے ظاہرہ معنوں پر اتنے سختی سے کاربند ہوتے ہیں کہ پیغمبر کا مقصد ہمیشہ گم ہو جاتا ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ بخاری اپنی کتاب میں جو پہلی حدیث لائے، تو یہ لکھا کہ میں اعمال رسولؐ نقل کر رہا ہوں، مگر جب تک نیات رسول تک نہیں پہنچو گے اُس وقت تک تم کبھی بھی مراد کو نہیں پہنچ سکو گے۔

صحاح ستہ کا ایک ایک صفحہ کھول لیجیے۔ یہ بڑے عجیب پیغمبر ہیں کہ کہیں ایک حدیث بھی اپنی ذات کی تعریف میں نہیں ہے۔ وہ شخص کریم، جس کو خدا خود رؤف و رحیم کہتا ہے وہ ایک لفظ بھی اپنی تعریف میں نہیں کہتا۔ اتنا ٹو دی پوائنٹ اور ٹو دی ٹیکسٹ استاد میں نے آج تک زمین و آسمان میں نہیں دیکھا جو صرف ایک سبق دینے آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا واحد ہے۔ اس میں کسی کو شریک نہ لاؤ۔ مجھے بھی شریک نہ کرو بلکہ رسولؐ سے سوال کیا گیا کہ جنت میں لوگ کیسے داخل کیے جائیں گے؟ فرمایا، اللہ کی رحمت کے ساتھ۔ ایک صحابی نے پوچھا کہ آپؐ بھی؟ فرمایا، ہاں میں بھی اللہ کی رحمت سے داخل کیا جاؤں گا۔

یہ وہ شخص فرما رہے ہیں جن کے بارے میں قرآن اور خود خدا یہ کہتا ہے کہ وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین جو خود مجسم رحمت ہے۔ احتیاط رسول کا یہ عالم ہے کہ پوری احادیث میں اپنے اس خطاب کو بھی استعمال نہیں کرتے اور ان کی نگاہ پورے اسباق میں صرف ایک چیز پر ہے کہ حتمی ترجیح اللہ ہونی چاہیے نہ کہ میں۔ آج جب ہم اللہ کی ترجیح کی بات کرتے ہیں جو متابعت رسولؐ میں۔ اللہ کے رسولؐ نے جو بات ذہنی اور عملی سطح پر اجاگر کرنا چاہی، یہی تھی کہ خدا کی صفات اور اس کے معاملات میں کسی فرد بشر کو اتنی اہمیت نہ دینا اور مجھے بھی نہ دینا۔

شیخ جنیدؒ نے توحید کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ قدیم کو حادث سے علیحدہ کرنے کا نام توحید ہے۔ سچ پوچھیں کہ بغیر نبی اکرمؐ کے یہ دانشورانہ استعداد پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور یہ صوفی ازم وہ نہیں ہے جس کو سعدی شیرازی یا حافظ شیرازی نے پیش کیا۔ میں اگر صوفی کی تعریف کروں گا تو صرف سادہ سی کروں گا کہ جس شخص کو اپنے مناسب وقت میں مناسب صلاحیتوں کے ساتھ اس بات کا احساس ہو جائے کہ زندگی کی واحد ترجیح اللہ ہے، اس دن سے اس کا صوفی ازم کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔

تصوف شریعت سے متصادم

چار ہزار تین یا سات سو کے قریب احادیث رسولؐ بخاری میں ہیں۔ آٹھ ہزار کے قریب مسلم میں، سنن ابی داؤد اور موطا میں ہوں گی۔ ہم تو صوفی اس کو سمجھتے ہیں جو زیادہ تعداد احادیث تک پہنچ جائے۔ ایک آدھ کے ترک سے نہیں یا ظاہرہ یا خارجی سنتوں کے اتباع سے بھی نہیں، بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جسے آپ فنافی الرسولؐ کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ عاداتِ رسولؐ سے مکمل یکسانیت حاصل کر لیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میں اہل حدیث ہوں۔ ہمارا تھوڑا سا انداز یا پیٹرن سمجھنے کا جدا ہے۔ میں بھی حدیث پڑھتا ہوں، آپ بھی پڑھتے ہیں اور وہ شخص بھی پڑھتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ پوری حدیث سے شانِ رسولؐ کا

Marfat.com

ایک پہلو نکلتا ہے اور وہ پہلو یہ ہے کہ میرا یہ بندہ میری ہی طرح رؤف و رحیم ہے۔ محمد رسول اللہؐ میں کوئی اور صفت اجاگر ہو نہ ہو' یہ جو اللہ نے کہا کہ میرا یہ بندہ رؤف و رحیم ہے۔ تو تمام کی تمام حدیث اس بنیادی انسانی پہلو کو رسول اللہ میں اجاگر کرتی ہیں۔ جو بھی حدیث پڑھے گا' اس تک یہ مظاہر شان رسولؐ ضرور پہنچے گا اور رؤفیت اور رحیمیت کے اوصاف اس کو نچ کریں گے۔

اب کوئی شخص حدیث پڑھتا ہے۔ اگر حدیث پڑھنے کے بعد اس کا مزاج سخت گیر ہو جائے۔ وہ زیادہ سخت ہو جائے اکڑی توجیہات کا اور وہ لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دے تو ہم بڑی آسانی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے حدیث بالکل نہیں پڑھی یا اگر پڑھی ہے تو اس نے حدیث کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ رسولؐ کے مطابق نہیں کیا تو متابعت ظاہرہ کے علاوہ بھی ایک متابعت ہوتی ہے جسے ہم کہتے ہیں' نفسیات پیغمبر کو سمجھنا۔

تصوف اپنی ذات کے خلاف کرنے کا نام ہے۔ تصوف کا بنیادی نکتہ یہی ہے وامامن خاف مقام ربہ ونہی النفس عن الھویٰ رسول کی پیروی میں سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ ہمیں اپنے نفس کے خلاف جانا پڑتا ہے۔ ایک خصوصی تہذیب نفس سے آگہی حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا تک کوئی بھی راستہ بغیر محمدؐ کے طے نہیں ہو سکتا۔

شریعت یا طریقت

مذہب چلنے کا رستہ ہے' یہ منزل مقصود نہیں ہے۔ جب لوگ مذہب کی چار دیواری میں قید ہوتے ہیں تو وہ فرقہ بن جاتے ہیں۔ ایک قسم کا بت کدہ' جس میں نیت اور اخلاص اللہ کے لیے شامل نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ تمام پرانے مذاہب اسی لیے خوار اور رسوا ہوئے۔ خاص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں بنو اسرائیل جن کو ہم فلسطین کہتے ہیں' اتنے پکے نمازی اور کٹر تھے مگر ساتھ ساتھ سود اور محتسب کا کام کرتے تھے۔ اس لیے جب مذہب روایت کا حصہ بن جائے' تو اسے ایک اصطلاح میں Taboo کہتے ہیں کہ وہ آپ کی روایت اور کلچر کا حصہ بن جاتا ہے وہ ایک علمی موومنٹ اور تحریک نہیں رہتی۔ آج کے زمانے میں بھی بدقسمتی سے یہ دیکھا گیا ہے کہ تمام مذہب سکولوں کی چار دیواری میں قید ہو گیا ہے۔ وہ سکول اس طرح طالب علم کا ڈیٹا قید کرتے ہیں کہ اسے کسی دوسرے سکول کی ہوا لگنے نہیں دیتے۔ مسلمان کا کام یہ تھا کہ جہاں اسے عقل و معرفت اور دین و مذہب کی بات ملتی' وہ وہاں سے اسے سیکھتا۔ چاہے وہ بریلوی ہے' دیوبندی یا اہل حدیث ہے۔

سکولوں کی قید اور بندش سے علم اپنے اپنے مقاصد کے تحت محدود ہوا اور تمام غرض و غایت دین ایک لوکل اتھارٹی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ میں نے اسی حقیقت کی طرف دھیان دلایا تھا۔ مذہب کا صرف ایک مقصد ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ تک تہذیبیں اور شریعتیں بدلتی رہی ہیں۔ وہ کبھی ایک نہیں ہیں۔ کبھی انسان اتنا مجبور نہیں تھا کہ اس پر یہ اصول لاگو ہوتے' جو آج ہم پر بحیثیت مسلمان عائد ہیں۔ دو دو تین تین قوانین پر معاشرے اور تہذیبیں چلیں۔ حمورابی کے زمانے میں ایک قانون قصاص پر سارا مذہب چلا' جس کو آپ آج بھی قرآن میں پڑھتے ہیں۔ پوری قوم اسرائیل دس قوانین جسے Ten Commandments کہتے ہیں' پر چلتی رہی۔ صرف مسلمان کو پوری کی پوری کتاب پچھلی

Marfat.com

تہذیبوں سے لے کر آج تک کی دی گئی مگر یہ تہذیبیں اور معاشرتی انداز بدلتے رہے ہیں مگر ایک مقصد دین کا ہمیشہ رہا کہ جس شخص نے بھی خدا کو طلب کیا' خدا کی جستجو کی' خدا کی محبت کا بیج اس کے دل میں پڑا' جب اس نے راستہ ڈھونڈا تو مذہب کو پایا۔

اب آپ خود ہی سوچیے کہ کیا ہم رستے کو چومتے چاٹتے رہیں اور منزل کی کوئی فکر نہ کریں۔ جب عمل خدا کے لیے نہ کیا گیا جائے تو وہ ایک شرعی نظام کہلائے گا۔ جب عمل خدا کے لیے اور اس کی انس و محبت کے لیے کیے جائیں گے تو وہ طریقت کا نظام کہلائے گا۔ اسلام میں داخل ہونا آسان ہے مگر مومن بننا ذرا مشکل ہے۔

رہبانیت اور مناقب تصوف

کوئی بھی بڑا صوفی راہب نہیں ہے۔ میں آپ کو چار بڑے صوفیاء کے اقوال بتاتا ہوں۔ لا اکراہ فی الدین' لا رہبانیۃ فی الاسلام اور لا سرورۃ فی الاسلام' یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی بڑا صوفی ہو اور معاملاتِ دین میں اس کی سند مکمل نہ ہو۔ وہ جنید بغدادیؒ ہو یا عبدالقادر جیلانیؒ۔ ابن تیمیہ جیسے سخت نقاد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب علم کی تلاش میں کوئی صوفی اپنے مقام سے آگے بڑھتا ہے' تو اس کو شروع میں اپنی جبلتوں کی سختی کی وجہ سے کچھ اقدامات بھی سخت کرنے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں یہ محسوس کروں کہ میں بہت بھوک والا آدمی ہوں تو مجھے اپنے اندر بھوک کی بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہوس کو کنٹرول کرنے کے لیے اپنے آپ کو دو چار فاقے دینے پڑیں گے۔ اس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ صوفی کبھی کبھی اپنے مقام پر سخت ہو جاتا ہے۔ مگر بالعموم تمام صوفیا انتہائی نارمل رہے۔

خواجہ ابوالحسن شاذلی' جن کو امام مغرب کہتے ہیں اور جو شاذلیہ کے امام ہیں' کی ایک بات بتاؤں۔ وہ کہتے ہیں کہ آج کے صوفیا کو کیا ہوا ہے کہ یہ اپنی بیویوں کے ساتھ اس لیے نہیں چلتے کہ لوگ کہیں گے صوفی اور بیوی! یہ بازاروں میں اس لیے سبزی نہیں خریدتے کہ لوگ کہیں گے' صوفی کو سبزی خریدنے سے کیا کام ہے۔ یعنی اتنے نارمل تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کتنے ہی سخت وظائف میں ہوتے' اگر کوئی ملنے آجاتا اور کوئی مانع نہ ہوتا' تو وظائف تک چھوڑ کر ان سے ملنے آجاتے۔ آج بھی وظائف میں بہت بڑا وظیفہ انہی کے نام سے منسوب ہے' جسے دعائے حزب البحر کہتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ پچاس سال کی ریاضت شاقہ کے بعد جب خلق میں آئے ہیں تو ان کا عالم یہ تھا کہ کتان' جو اس وقت سب سے مہنگی کاٹن تھی' کا جو کرتہ پہنتے' دوسرے دن نہ پہنتے تھے۔ اتنا نفیس لباس اور وہ اس قدر اپنے آپ کو بہترین حالت میں رکھتے تھے کہ یہ امر محال تھا مگر دوسری طرف یہ عالم تھا کہ ان کا خلیفہ خاص اس خیال کے ساتھ شیخ کے ساتھ ہو چلا کہ جمعے کا دن ہے۔ حضرت کو بہت ساری سلام دعا ہوگی۔ میں بھی ساتھ ہوں' مجھے بھی سلام دعا ہو جائے گی۔ میں ایک مشہور آدمی ہو جاؤں گا۔

جب وہ چلنے لگے تو دیکھا کہ رستے میں کسی نے سلام ہی نہیں کیا۔ اب ہر آدمی کو وہ اس نظر سے دیکھتے کہ شاید یہ آئے اور ہاتھ ملائے۔ کسی نے سلام ہی نہیں کیا۔ شیخ عبدالقادرؒ نے اسے کنکھیوں سے دیکھا اور مسکرائے۔ پھر جامعہ بغداد آئے۔ نماز پڑھائی۔ جب نماز پڑھا کر نکلے تو پھر ایک دم خلق کا رش پڑ گیا۔ کوئی پاؤں چھو رہا ہے' کوئی ہاتھ چھو رہا ہے۔ یہ

Marfat.com

بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ جب میں آگے گیا تو شیخ نے مجھ دیکھ کر کہا' بھائی! اللہ نے ہمیں تصرف فی القلوب بخشا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ تیری کیا خواہش تھی؟ مگر آتے ہوئے میری خواہش نہیں تھی کہ کوئی مجھ سے ملے۔

یہ تمام اکتساب محض بات چیت سے نہیں آ سکتا۔ اس کے پیچھے ان کی اضطرابی کیفیتوں کی مسلسل مشقت ہوتی ہے۔ ایک صورت حال بار بار اعادہ کرتی ہے۔ اس کے پیچھے توقف کرتے ہیں۔ اس پر محنت ہوتی ہے۔ صوفی اس پر مسلسل سوچتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کا سب سے بہادر انسان ہوتا ہے اس لیے کہ وہ سب سے بڑے خطرے یعنی اپنے آپ کا سامنا کرتا ہے۔ وہ خطرہ' جس کی رسولؐ نے نشاندہی کی ہے۔ انسان ایک مرتبہ مرتا ہے لیکن صوفی روز مرتا ہے۔ اسی لیے تصوف میں ایک اصطلاح ہے کہ صوفی کا قتل ہر ایک پر مباح ہے کیونکہ اس نے بدلہ نہیں لینا ہوتا۔

اسلام میں ان لوگوں کے لیے قانون آیا ہے اور ہر جگہ آیا ہے۔ اگر تم برابر کا بدلہ لو تو ٹھیک ہے اور اگر معاف کر دو تو بڑی بات ہے۔ یہ قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر جو بڑی بات کے لوگ ہیں' یہ صوفیا ہیں۔ اسی طرح ایک اور محاورہ مشہور ہے کہ چھوٹے لوگوں کی نیکیاں بڑے لوگوں کے گناہ ہیں جس کو عام آدمی نیکیاں سمجھتے ہیں' صوفی اسی بات کو گناہ سمجھتا ہے۔

تصوف اور انتقال پذیری

ہم پچھلوں سے اگلوں کا گلہ نہیں کر سکتے جیسے کہ اقبال نے کہا کہ:

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

بغیر علم کے کوئی چیز جاری نہیں رہتی۔ ایک وقت میں جب ایک عالم زمانہ کا ظہور ہوتا ہے تو اس کی اولاد اس کے مشرب اور اس کے اخلاق پر تو قائم رہ سکتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کا علم بھی میراث میں حاصل کرے اور وہ کیوں نہیں؟ اس لیے کہ علم وہ نعمت خصوصی ہے جسے اللہ بڑی جان پہچان کے بعد کسی بندے میں رکھتا ہے۔ اگر آپ نے قرآن شریف دیکھا ہو تو اللہ کہتا ہے' یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نے محمد رسولؐ اللہ کو نعمت علم کیوں بخشی؟ ان کو پتہ نہیں کہ یہ وہ چیز ہے جو خوب اچھی طرح جانچ پرکھ کے ہم انسانوں میں رکھتے ہیں۔ یہ منتقل نہیں ہوتی۔ تصوف میں بھی نہیں ہوتی۔ کوئی صوفی کتنے بڑے درجے کا کیوں نہ ہو' وہ اپنے بچے کو بھی بغیر تحصیل علم کے علم منتقل نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ اس کے بچے میں اہلیت ہے۔

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک بچہ یا شاگرد اپنے استاد سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ تمام محققینِ تصوف اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ جناب شیخ سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ اپنی جدوجہد میں اپنے اساتذہ جنیدؒ، سری سقطیؒ اور ابوالفضل قطلیؒ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے۔ بعض شاگرد اپنی طلب خالصہ' محنت اور تجسس علمیہ سے اپنے اساتذہ کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ احترام ومحبت اور خدمات میں نہیں' علم میں۔

اس کی مثال سیدنا ہجویریؒ یہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے شیخ ابوالفضل ختلی کے ہاتھ دھلوا رہا تھا اور سردی بڑی سخت تھی۔ میرے دل میں آئی کہ ہم کیوں ان لوگوں کی اتنی عزت کرتے ہیں؟ جو کچھ دینا ہے' اللہ ہی نے دینا ہے تو پھر ہم ان کی

Marfat.com

اتنی خدمت کیوں کرتے ہیں؟ میرے شیخ نے خطرۂ قلب پر آگاہی پائی اور کہا' اے سپاہی زادے! بات تو تُو ٹھیک کہہ رہا ہے مگر ہر آدمی کا دوسرے آدمی کے پاس حصہ ہوتا ہے۔ تیری تعلیم کا کچھ حصہ میرے پاس ہے۔

اسی طرح جو بڑے استاد ہیں' وہ بعض بہت ہی قیمتی سبق ذاتی سطح پر اور صورت حال کے مطابق ودیعت کرتے ہیں۔ تصوف کی ایک کتاب پڑھ لینا اور معنی رکھتا ہے' مگر تصوف کا ایک مطلب حاصل کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ جب تک صورتحال پیدا نہیں ہوگی' وہ درس آپ پر لاگو نہیں ہو سکتا۔ کتابیں رٹ لینے سے تصوف نہیں آتا۔ تصوف اذیت اور کیفیت نفس سے گزرنے کے بعد قرار حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ گنجائش ذات پر ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر میں ایک دفعہ اپنے دوست سے ناراض ہوا۔ بڑی سخت رنجش میرے دل میں تھی۔ کہیں انتقامی حس چنگاری مارتی اور کہیں غصہ میرے اعصاب پر حملہ آور ہوتا تھا۔ گھن گرج بھی تھی اور بادل بھی تھے۔ میں نے شیخ ہجویرؒ کی کتاب کے آخر میں ایک بات لکھی دیکھی کہ میرے دل میں ایک بھائی کی طرف سے رنجش تھی۔ وقت آخر تھا اور میرے شیخ کا سر میری آغوش میں تھا۔ مجھے انہوں نے کہا' علی بن عثمان! اگر تو ایک بات کو جان لے تو تُو ہر غم وفکر سے بے نیاز ہو جائے گا کہ بدی اور خیر وشر' جو کچھ اللہ نے کسی کو چنا' وہ باامر مجبوری اس کو ادا کر رہا ہے۔ تو پھر تجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں رہ جائے گا۔

اب یہ سبق ہم بالعموم بیان نہیں کرتے۔ یہ مقدرات کے وہ سبق ہیں کہ جب تک آپ کا انٹلکچوئل لیول حتمی سطح پر نہیں جاتا' یہ بات عام حالات میں کہہ دینا خطرناک ہے' مگر ایک صوفی کے مقام فکر پر پہنچ کے کہہ دینا بہت زیادہ ہے۔

اسی طرح شیخ محترم نے فرمایا کہ جوں جوں انسانوں کا علم بڑھتا ہے' وہ جبر مستقل کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کم ہوگا تو انسان اختیار کو نکلے گا۔ یہ منازلِ فکر آہستہ آہستہ طے ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے اب کہ علم برائے علم کی ہوس بھی نہیں رہی۔ جو یورپ میں ہے' ان میں علم برائے خدا کی ہوس نہیں ہے مگر آج بھی ان کی علم اور تحقیقات میں سرگرمی' علم کی تحقیق وجستجو میں انہیں آگے بڑھا رہی ہے۔ مسلمانوں سے علم برائے خدا کی ہوس بھی کھوئی گئی اور علم برائے علم کی ہوس بھی کھوگئی۔ علم کے بغیر کسی فرد کا کوئی پرسپشن نہیں ہے اور نہ خدا ہی کا کوئی پرسپشن ہے۔ وفی انفسکم افلا تبصرون' ابھی غور وفکر کرو گے تو تمہیں اپنی ذات میں آیاتِ الٰہی نظر آئیں گی۔ غور وفکر کی صلاحیت نہیں ہے تو یہ نہ ہوگا۔

آج تصوف کے میدان میں سو فیصد لوگ ان پڑھ ہیں' جو تمام تصوف کا دارومدار ابنارمل اور سب نارمل کیفیات کو رکھتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ تصوف صرف تین چیزوں پر مبنی ہے۔ کوئی چوتھی چیز نام کو بھی تصوف میں شامل نہیں ہے۔ جب یہ لوگ غیر معمولی کیفیات کو تصوف سمجھیں گے' تو سب سے پہلے عام لوگوں کو جو اپنا معیارِ عقل ہے' وہ خبط ہوگا۔ پھر اس کے بعد وہ استدراج شیطان کا شکار ہوں گے۔ وہ کس قسم کا شخص ہوگا جسے آپ خود ہی خدا سمجھنا شروع ہو جائیں گے۔ نہ صرف یہ کہ وہ خود کرپٹ ہیں بلکہ مذہبی لوگوں کو کرپٹ کرنے کا ذریعہ ہیں۔

ابھی آپ کے سامنے ایک خاندان کی تین نسلیں گزریں۔ میرا یقین ہے کہ 36ء اور 38ء میں برصغیر کا سب سے بڑا مذہبی اور صوفی عالم گولڑہ شریف والے خواجہ مہر علی تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت مشکل مقاماتِ تصوف پر

گفتگو کی ہے۔ زماں اور مکاں پر اظہار خیال کیا ہے اور ان کی حیثیت کو ابھارا ہے۔ اگر چہ میرے پاس وجوہ موجود ہیں کہ میں ان کی کہی کچھ باتوں کو تسلیم نہ کروں' مگر ان کے زمانے کو دیکھتے ہوئے کوئی شک نہیں پڑتا کہ وہ برصغیر کی تاریخ میں ایک بہت بڑے اسکالر تھے' جو پیدا ہوئے۔ وہ اس معاملے میں آخری چشتیہ تھے۔ وہ صوفی نیچر تھے۔

ان کے بچوں کے پاس وہ اور یجنل تعلیمی اظہار کا ٹیلینٹ نہیں رہا' وہ علمیت نہیں رہی' مگر روایت' محبت' انس سب کچھ باقی ہے۔ چنانچہ وہ اپنا کردار اچھے طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔ جہاں علم اور کرامت وفضیلت نہ رہی' وہاں عمومی کرامت آ گئی' وہاں علم نہیں رہا۔ اب انہوں نے اپنا وقت پاس کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دفعہ مجھے شب قدر کی علامات پر گفتگو کرنا تھی کیونکہ میرے خاندان کے کچھ لوگ بھی یہاں وابستہ تھے۔ اگر چہ میرا وہ عالم کبھی بھی نہیں تھا۔ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لاہور سے اس مسئلے کی تحقیق کے لیے سیدھا گولڑہ شریف پہنچا۔

مجھے پتہ چلا کہ ایک صاحب بڑے علم والے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ میں شب قدر کی داخلی علامات پر آپ سے گفتگو کرنے آیا ہوں۔ انہوں نے بے تکلفی سے کہا کہ میں نہیں جانتا۔ ایک آدھ اور بحث' جو میں نے وہاں سنی' وہ قطعاً تحقیقی اور علمی نہ تھی۔ میں واپس آ گیا مگر آتے ہوئے بھی مجھے یہ کبھی خیال نہیں آیا کہ بڑے شیخ میں کوئی نقص ہوگا یا بعد کے شیخ میں کوئی نقص ہوگا۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ معاملات علمیہ نسل در نسل نہیں چلتے۔ نسب جا سکتا ہے' علم نہیں جا سکتا' اس کے لیے اپنی اپنی تحصیل ہے۔ یہ قابل انتقال نہیں ہے۔ کوئی علم بھی غیبی طور پر منتقل نہیں ہوتا۔

وحدت الوجود اور تصوف

جمع وحدت میں جناب شیخ ہجویریؒ نے گفتگو کرتے ہوئے ایک بڑی سادہ سی بات کہی ہے۔ ہم وجود اور شہود کی بحث کیوں پڑھتے اور سیکھتے ہیں۔ بحیثیت ایک طالب علم کے جو تصوف میں دلچسپی رکھتا ہے' اس کا قطعاً کوئی تعلق اللہ کے علم سے نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف جاتے ہوئے کہ ذہنی پیچیدگیوں کو ختم کر کے ایک بڑی سی سادگی اختیار کرتے ہیں جہاں ہمیں عذرِ بندگی ہو اور اللہ کو شان خداوندی نصیب ہو۔

اصل میں یہ نظریات اس لیے حاصل کیے جاتے ہیں جیسے پروردگار نے کہا' ادعوالی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة' خدا کی طرف بلاؤ حکمت اور اچھی بات سے۔ وجادلھم بالتی ھی احسن اور بحث کرو احسن طریقے سے۔ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ جب ہم بحث مباحثے میں پڑتے ہیں تو ایک آدمی دوسرے آدمی سے نمبر اس لیے لے جاتے ہے کہ اس کو ایک اصطلاح کی آگہی نہیں ہوتی۔ چنانچہ صوفی جدلیات فکر و ذہن اس لیے سیکھتے ہیں کہ وہ غیر اقوام سے گفتگو کرتے ہوئے کسی معاملے میں کم نہ پڑ جائیں۔ ورنہ اس کا تعلق خدا یا خدا کی شناخت سے بالکل نہیں ہے۔

ایک دفعہ ایک یونانی Agnostic شیخ ہجویریؒ کے سامنے آ گیا۔ Agnostic یونان کا ایک فلسفیانہ سکول ہے' جس کا کہنا یہ ہے کہ تمام علم بے سود ہے۔ وہ شیخ ہجویریؒ کو کہنے لگا کہ تمام علم بے سود ہے' تم کس چکر میں پڑے ہوئے ہو۔ شیخ ہجویریؒ نے کہا کہ اگر تم نے یہ نتیجہ کسی علم کی بنیاد پر نکالا ہے تو تم علم کے ایک حصے کو صحیح اور دوسرے کو غلط کہہ رہے ہو اور یہ تضاد ذہن

ہے۔اگر تم نے یہ نتیجہ بغیر علم نکالا ہے تو تیری بات میں وزن ہی کوئی نہیں۔میں جاہل کی بات نہیں سنتا۔

کسی شخص کو کم ہی پتہ ہوگا کہ تمام بڑے صوفی جدلیات کے ماہر ہوتے ہیں جو پڑھے لکھے ہوتے ہیں' وہ علم کی ہر صنف پر نگاہ رکھتے ہیں۔اسی لیے سیدنا ہجویرؒ نے کہا کہ تمام علوم سے' جتنا خدا کی شناخت کے لیے ضروری ہے' لے لو مگر واحدت الوجود اور شہود کا تعلق اللہ سے قطعاً کوئی نہیں ہے۔جمع وحدت کے باب میں وجود و شہود کی گفتگو جب شیخ ہجویرؒ نے ختم کی تو ساتھ ایک جملہ ارشاد فرمایا' کہ اے بھائی! یہ صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ان کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اللہ تک تو صرف نیت کے اخلاص اور سادہ سی آرزو سے پہنچا جا سکتا ہے۔

قرآن حکیم میں بڑے پیمانے پر وجود اور شہود کو واضح کیا گیا ہے۔شاید ابھی فلاسفر اپنے ذہن یا محدود ڈیٹا کی وجہ سے اس مقام تک نہیں پہنچ سکے' جہاں اللہ ہے۔خدا نے کہا کہ هوالاول و الآخر والظاهر والباطن وهوبكل شئی علیم' وہی اول' وہی آخر' وہی ظاہر' وہی باطن ہے۔اسی نے کائنات و حادثات کو اپنے علم سے گھیرا ہوا ہے۔یہ وجود سے بہتر بات ہے' جو اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

Marfat.com

اولیاء اللہ میں درجات

درجاتِ اولیاء میں ایک درجہ ہوتا ہے جسے ہم عارف کہتے ہیں۔ یعنی جاننے والا۔ لوگوں میں بھی نیک لوگ ہوتے ہیں۔ انہیں اور جو ایمان کے لیے جدوجہد کررہے ہیں' ان کو بھی ولی کہہ سکتے ہیں۔ اللہ کے نزدیک دو ہی قسم کے بندے ہیں۔ یا اولیاء رحمٰن ہیں یا اولیاء شیطان۔ اولیاء اللہ تعالیٰ کثرت سے ہوتے ہیں' مگر وہ عارف نہیں ہوتے۔ عارف کو تکنیکی اعتبار سے ہم قطب ارشاد کہتے ہیں۔ جب بزرگوں کے درجے بنے تو سب سے بڑے عالم کو' جو علوم ظاہری اور باطنی میں سب سے مکمل ہوتا ہے' اس کو ہم عارف کہتے ہیں۔ ہر عارف عالم ہوتا ہے' لیکن ہر عالم عارف نہیں ہوتا۔

یہ اتنی عجیب و غریب بات نہیں ہے۔ یہ آپ کے سیاسی عہدوں کی طرح ہی ہیں۔ جیسے کسی بھی جگہ کوئی تنظیم بنائی جائے تو ان میں بہتر سے بہتر کی تلاش کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح زمین پر وہ لوگ' جو اللہ کی طرف رغبتیں رکھتے ہیں' انہیں چنا جاتا ہے۔ اصحابِ رسولؐ کے دور میں اس کی سلیکشن کی ضرورت نہیں تھی اور دھڑا دھڑ اللہ کی طرف سے اسناد جاری ہو رہی تھیں۔ وہ وقت اب نہیں آئے گا۔ کوئی ولی اللہ نہ کوئی خدا کا بندہ کسی صورت اپنا تقابل اور دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ اصحابِ رسولؐ کی خاکِ پا کے بھی برابر ہے۔ یہ لوگ وہ تھے' جن کے بارے میں اللہ نے کہا' رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ' اللہ ان سے راضی ہوا' وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ جن کے بارے میں خداوند کریم نے کہا کہ میں اصحابِ شجرہ سے خوش ہوا۔ انہوں نے تیرے ہاتھ پر نہیں' میرے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسی طرح اصحاب بدر کو کہا کہ ان کے میں نے پچھلے سب گناہ بخش دیئے۔ اب اس طرح کی اسناد آنے سے رہیں۔ آج کوئی دعویٰ امانت نہیں کرسکتا۔ کوئی بھی شخص اپنے آپ کو اصحاب کے بعد مومن نہیں کہہ سکتا۔

افغانستان میں جب وہ امیر المومنین ٹھہرے' تو مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ تکنیکی اعتبار سے نام کے تو ہم سب مسلمان ہیں مگر مومن ہونا ایک باطنی کیفیت کا دعویٰ ہے' جو بندہ ازخود نہیں کرسکتا۔ جب ہم اصحاب کو مومنین کہتے ہیں' تو اس وجہ سے بالکل نہیں کہتے کہ اصحاب نے اپنے آپ کو مومنین کہا' بلکہ اس لیے کہ اللہ نے ان کے حق میں شہادت دے دی کہ یہ مومنین ہیں۔ قرآن میں لکھا ہوا آ گیا۔ سند جاری ہوگئی۔ چنانچہ اصحابِ رسولؐ کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں مومن ہوں۔

Marfat.com

اندرونی کیفیات کا حال جاننے والا صرف اللہ ہے اور اس کا دعویٰ کرنا باطنی کیفیت ہے۔ جبکہ مسلم ظاہری حالت ہے۔ ہم سب دعویٰ اسلام کر سکتے ہیں لیکن ایمان باطنی کی پرکھ صرف اللہ کے پاس ہے۔ چہ جائیکہ آپ امیر المومنین ہو جائیں۔ وہ اگر اپنے کو امیر المسلمین لکھتے تو زیادہ اچھی بات ہے۔

جب بہت سارے بزرگوں کی جانچ پرکھ ہو جائے' تو ذہین اور متقی لوگوں کو اللہ تعالیٰ مزید ٹیسٹ دینا شروع کر دیتا ہے۔ ذہانت اور تقویٰ کا باہمی جوڑ ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے' سو میں سے پانچ اس قابل نکلیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مختلف امتحانات سے روشناس کرائے۔ ان پانچ فیصد میں ناکام بڑے ہوتے ہیں۔ جب دنیا میں خواتین کا خوبصورتی کا چناؤ ہوتا ہے' تو پیچھے سے گریڈ تھرڈ تک گریڈ ٹھیک بنتے چلے آتے ہیں۔ سیکنڈ تک بھی ٹھیک ہوتا ہے مگر جب فرسٹ آتا ہے تو دو خواتین سامنے کھڑی کر دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک مس یونیورس کا انتخاب کرتے ہیں تو دوسری بے چاری کچھ بھی نہیں ہوتی۔ وہ ویسے ہی تکمیل یونیورس کے لیے آئی ہوتی ہے۔

اسی طرح خیر کو جب آگے بڑھایا جائے تو عین ممکن ہے کہ آخر کے دو مقابلہ کرنے والے چنے جائیں۔ ان میں سے ایک اللہ کا قطب الاقطاب اور دوسرا کچھ بھی نہ ہو۔ آگے خالی تقویٰ عبادت' ذہانت اور خالی رکھ رکھاؤ ٹیسٹ نہیں ہوتے بلکہ تمام انسانی صفات کا جزوی ٹیسٹ ہوتا ہے۔ ہر چیز کو تھوڑا تھوڑا پرکھا جاتا ہے۔ جو درجۂ اعتدال پر ممیز ہوگا' اسی کو قطب الاقطاب بنایا جائے گا۔

اس سو سال کے عرصے میں چونکہ وسیلۂ تعلیم اور وسیلۂ علم بھی اولیاء بنتے ہیں تو سو سال کے عرصے میں ایک Mystic ٹیچر بھیجا جاتا ہے۔ یہ پورے سو سال کے عرصے کے لیے ہوتا ہے۔ اسے آپ عرف عام میں مجدد بھی کہتے ہیں۔ ہوا یہ کہ مجدد لفظ علما کے ہاتھ چڑھا' تو ایک ایک صدی میں دس دس مجدد پیدا ہونا شروع ہو گئے مگر یہ مجدد وہ نہیں ہوتے۔ مجدد کی خوبصورت تعریف اللہ کے ایک ولی سیدنا علاؤالدین علی احمد صابر نے کی ہے۔ جب ان سے شاہ شمس ترک پانی پتی نے پوچھا کہ حضرت مجدد کسے کہتے ہیں؟ فرمایا' جو قدیم کی پوری خبر رکھتا ہو۔ حاضر کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہو اور ان کی اصلاح کرنا جانتا اور کرتا ہو اور جو مستقبل کے لیے ارشادات کاملہ چھوڑے' وہ مجدد ہے۔ مجدد ماضی کا مکمل علم رکھتا ہے۔ حاضر کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہو اور ان کی اصلاح کرنا جانتا اور کرتا ہو اور جو مستقبل کے لیے ارشادات کاملہ چھوڑے' وہ مجدد ہے۔ مجدد ماضی کا مکمل علم رکھتا ہے۔ حاضر میں اپنے مسائل کو سمجھ کر علم کو صاف شفاف مرتب کرتا ہے اور مستقبل کے لیے اس کے مطابق ارشادات چھوڑ دیتا ہے تاکہ آدھی صدی کے لوگ گمراہی سے بچیں۔

سو حدیث مبارک کے مطابق مجدد سو سال میں ایک پیدا ہوتا ہے۔ مجدد تو چھپا رہ ہی نہیں سکتا۔ قطب ارشاد اور مجدد چھپے نہیں رہ سکتے۔ یہ دونوں ایک ہی آفس ہیں۔ باقی لوگ اپنے تقویٰ اور طہارت سے عجیب و غریب قوتوں کے مالک نہیں ہوتے' بس نیک لوگ ہوتے ہیں۔

مناصب کی تلاش

لوگوں کا خیال ہے کہ کچھ لوگ یہ عہدے بانٹتے پھرتے ہیں۔ جب کوئی کسی مرشد کے پاس جاتا ہے اور وہ نگاہ

Marfat.com

مارتا ہے کہ میں چار دن میں تمہیں قطب بنادوں گا تو وہ بے چارہ چار دن انتظار کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک مفروضہ ہے کہ پیر صاحب اسے قطب نہیں' تو قطب نما ضرور بنا دیتے ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ دنیا میں جیسے باقی درجات ہیں' اسی طرح یہاں بھی ہیں۔ آپ نے حکومتوں اور ان کی طاقتوں کا تعین کیا اور فیصلہ کیا کہ زمین پر امریکہ اور اس کا صدر دنیا کا طاقتور ترین صدر ہے۔ یہ آپ کے اپنے اندازے ہیں۔ پھر آپ نے اپنے آپ کو دیکھا تو پتہ چلا کہ آپ تو کہیں بھی نہیں ہیں۔ پھر ایک عرصہ بعد اچانک پتہ چلا کہ آپ ان سات ایٹمی ملکوں کی صف میں آ گئے۔

زمین پر جب ہم دوسرے لوگوں کی طرح مراتب اور درجات بناتے ہیں' اسی طرح آسمانوں پر دنیا اور مافیہا میں جتنے بھی لوگ ہیں' ان کے مراتب بنتے ہیں۔ یہ مراتب غیر معمولی نہیں ہوتے۔ یہ وہاں اسی طرح ہوتے ہیں جیسے یہاں پر ہوتے ہیں۔ پھر اللہ کے نزدیک یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس نے قرآن پر اتنا عمل کیا۔ اس نے حدیث پر اتنا عمل کیا۔ یہ اتنی فقہ جانتا ہے۔ یہ اتنا عالم ہے۔ ان کی لسٹ اکٹھی کی گئی۔ اس میں لاکھوں لوگ ہوں گے۔ اسے مختصر کیا گیا۔ ان میں علم و عرفان کی حیثیت دی گئی۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو معاف کیا گیا۔ پھر ایک اعلیٰ ترین علمی حیثیت پر اللہ تعالیٰ نے درجات کا تعین کیا اور فرمایا' **ونرفع درجت من نشاء**' جس کے چاہتا ہوں درجے بلند کرتا ہوں' **وفوق کل ذی علم علیم** اور ہر ایک علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے۔

جب یہ درجات آئے تو بقول کچھ لوگوں کے جن کی تصدیق ہمارے پاس نہیں ہے کہ تمام دنیا سے تین سو تیرہ لوگ چنے لگے۔ یہ تین سو تیرہ کی تعداد شاید اس لیے ہے کہ اتنی ہی تعداد میں وہ اصحاب تھے جو رسولؐ کے ساتھ مل کر مقام بدر پر لڑے۔ جن کو خدا نے ہر قسم کی مغفرت کا وعدہ دیا اور جن کے بارے میں اللہ نے کہا کہ میں ان سے راضی ہوا' یہ مجھ سے راضی ہوئے۔ جب تین سو تیرہ کی باری آئی تو مقابلہ سخت ہو گیا۔ وہ جو حتمی فیصلہ ہے' وہ کسی کے تقویٰ اور عبادت ظاہرہ پر نہیں ہوتا۔ یہ اسی طرح ہوتا ہے' جس طرح ایک مباحثے میں چار ٹیسٹ کرنے والے افراد بیٹھ جاتے ہیں اور کہا کہ ایک کی زبان بڑی اچھی ہے۔ ایک کی شخصیت' ایک کا اظہار اور ایک کا مواد بڑا اچھا ہے۔

مجموعی طور پر یہ فیصلہ ہوا کہ ہمیں خالی متقی نہیں چاہیے کیونکہ اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ صرف عالم نہیں چاہیے۔ یہ تو بے عمل ہے۔ تمام لوگوں میں ایسی معتدل روایات کو بلند کیا گیا جس کو تھوڑا تھوڑا کمال حاصل تھا۔ دو دو نمبر تمام شعبوں سے لیتا آیا اور اس طرح اس کے بھی سو میں سے نوے ہو گئے۔ جبکہ متقی کے نمبر تینتیس رہ گئے۔ اب اس منزل پر آ کے انہوں نے اعلان کیا کہ یہ قطب عالم ہے۔

اب ذرا قطب عالم کا منصب سن لیجیے۔ قطب ستارے کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ وہ صرف ایک ہوتا ہے۔ اس میں تین گریڈ ہیں۔ قطب عالم' مجدد اور قطب ارشاد۔ قطب عالم کے لیے ضروری نہیں کہ وہ قطب ارشاد ہو مگر جب قطب ارشاد کا علم بلند ہوتا ہے' تو باقی اقطاب ساقط ہو جاتے ہیں۔ قطب عالم اور مجدد ایک حیثیت رکھتے ہیں۔

حضور گرامی مرتبت کی حدیث کے مطابق ہر سو برس میں علم کا خاصا بگاڑ اور زوال آ چکا ہوتا ہے۔ اصول سے لوگ ہٹ گئے ہوتے ہیں اور بہت سی خرافات درونِ خانہ سرایت کر چکی ہوتی ہیں۔ دین میں ادھر ادھر سے بہت ساری باتیں

Marfat.com

شامل ہو کر ایسا کنفیوژن پیدا کر دیتی ہیں کہ بڑے سے بڑے متقی کو رستہ نہیں ملتا۔ مذہب کے ہزاروں دعوے دار ایسے اٹھ آتے ہیں' جن کی بصیرت نہ بصارت ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر گرین وچ ٹائم کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس سے سب دنیا کی گھڑیاں درست ہوسکیں۔ سو حضورؐ نے فرمایا کہ ہر صدی کی ابتدا یا انتہا پر مسلم امت میں کسی مجدد کا خروج ظہور ہوتا ہے۔

خواتین' ولیہ کاملہ

اسلام میں سینکڑوں عورتیں ولیہ کاملہ کی حیثیت تک پہنچتی ہیں اور یہ کسی بھی صورت میں کسی بھی عورت کا استحقاق ہے۔ جب میں قرآن حکیم کی فہرست پڑھتا ہوں تو میں نے دیکھا کہ پیچھے آنے والا اگلے پر غائب ہوتا ہے۔ مجھے لگا کہ ایک عورت خدا کی طرف جاتی ہوئی بہت سارے مردوں پر غالب آ جاتی ہے۔ اگر آپ وہ فہرست پڑھیں تو آخری لسٹ ہے والذکرین والذاکرت' ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں۔ چونکہ ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں پہلے تمام لوگوں پر حاوی ہیں' تو پھر ان دونوں میں ذکر کرنے والی عورت ذکر کرنے والے مرد پر حاوی ہے۔

اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ ہمیں کوئی چیز اللہ کے ذکر سے نہیں روکتی' لیکن عورت کو بڑے کڑے مناسک اللہ کے ذکر سے روکتے ہیں۔ اس میں اولاد' خاوند کی متابعت اور اس کے علم کی محدودیت یہ تینوں وہ بڑے نکات ہیں' جو عورت کو تحصیل علم خداوندی سے روکتے ہیں۔ پھر اگر عورت ان تینوں بڑی رکاوٹوں کو عبور کرتی ہے تو وہ کسی بھی ذاکر مرد سے آگے بڑھ جاتی ہے۔

پیر کی حقیقت اور شناخت

جب ہم یہ دعا مانگتے ہیں کہ اللھم الھمنی رشدی و اعذنی من شر نفسی' کہ اے اللہ مجھ پر خیر کا خیال الہام کر اور مجھے نفس کے شر سے بچا۔ چونکہ ابتدائے کار میں یہ اتنا آسان نہیں ہوگا کہ تمام نفس کے تجربے اور ٹیکنالوجی کو ایک آغاز کنندہ جانتا ہو۔ اسی طرح الہام خیر میں تفریق کرنا نہ کرنا یہ بھی کسی ماہر کا کام ہے' اس لیے ممکن ہے ہم سے آگے کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو انہی دونوں صورت حال میں نفس کے ماہر ہوں۔ ایک شر نفس کے اور دوسرے الہام خیر کے ماہر ہوں۔

''کشف المحجوب'' میں سیدنا ہجویرؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شیخ اپنے ایک مرید کے ساتھ جا رہے تھے۔ مرید کے دل میں خیال آیا کہ شیخ ننگے پاؤں چل رہا ہے۔ سردی بڑی سخت ہے۔ اگر میں اپنے گلے کا گلوبند اتار کر شیخ کے پاؤں میں لپیٹ دوں تو شیخ کے پاؤں بھی بچ جائیں گے اور مجھے ثواب بھی مل جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے دل میں خیال آیا کہ بھلا اتنے بڑی متقی' پرہیزگار' اور مجاہد انسان کو میری پیشکش کہاں قبول ہوگی؟ یہ نہ ہو کہ کہیں شیخ جھاڑ دیں۔ اس نے کہا' کچھ اور آگے چل کر اس نے اپنے شیخ سے پوچھا' حضرت الہام اور وسوسہ میں کیا فرق ہے؟ فرمایا' جو تجھے پہلے آیا' وہ الہام تھا اور جو بعد میں آیا' وہ وسوسہ تھا۔

سو ہم سے بہتر کچھ لوگ ضرور ایسے ہوتے ہوں گے' جو نفس کی سائنسز کے ماہر ہوتے ہیں۔ پیر ہے بھی وہی' جو اس لیے خداشناس ہے کہ وہ خودشناس ہے من عرف ربہ فقد عرف ربہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا' اس نے اپنے

Marfat.com

رب کو پہچان لیا۔ جو اپنے آپ کو پہچانتا ہے' وہ آپ کے لیے ایک ایسا ماہر ہے کہ اسی قانون اور محرک میں چلتے ہوئے اس کی رہنمائی آپ کے کام آئے گی۔ اس سے آپ کو الہام کے انتخاب میں بھی مدد ملے گی اور آپ شرِ نفس سے بھی بچ سکیں گے۔

جیسے ایک شخص شیخ جنیدؒ کے پاس آیا اور کہا' اے جنید! مجھے نہیں پتہ' تجھے عبادات سے کیا ملا مگر میں نے تیرے چند ایک وظائف کیے ہیں۔ میں روز جنت کو دیکھتا ہوں اور وہاں جاتا ہوں۔ جنیدؒ نے کہا' اے مردود! تو جنت میں نہیں جاتا' تو عذاب دوزخ میں ہوتا ہے۔ اس نے باہر جا کر کہا جنیدؒ اتنا بڑا مرشد ہوتے ہوئے میرے تجربات نہیں حاصل کر سکا۔ اس لیے ہو سکتا ہے' مجھ سے حاسد ہو۔ کافی عرصے بعد کسی شخص نے جا کر اس سے کہا کہ تو جنیدؒ کا حکم ایک دفعہ مان تو لے۔ جو وہ کہہ رہا ہے' کر لے۔ اس میں ٹیسٹ بھی ہو جائے گا۔ چنانچہ اس رات جب اس کی جنت میں پیشی ہوئی اور اس نے ولا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا' تو آناً فاناً سحر ٹوٹ گیا اور اس نے دیکھا کہ وہ غلاظت کے ایک ڈھیر پر بیٹھا ہے۔

بعض اوقات ہمارے وجود میں ہماری اپنی اتنی پیچیدگیاں ہیں۔ خود پسندی' خودستائی' خودلذتی اور خودخیالی سے اس قسم کا مکروفریب جنم لیتا ہے کہ ہم اس کی مناسب طور پر توجیہہ نہیں کر سکتے۔ نفسیات ہم میں سے بہت سوں کو اذیت پسند اور گھٹا ہوا قرار دے گی۔ Neurotic یا Psychotic قرار دے گی۔ اس کے باوجود ہم اپنے آپ کو ایسا نہیں سمجھتے۔ ہم میں سے کئی باوجود نفسیاتی مشکل کے اپنی ذات کے بارے میں اس کوفت سے آگاہ نہیں ہوتے' تاآنکہ کسی فوری مشکل کے باعث ہم کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس نہ چلے جائیں۔ وہ ہماری نشاندہی کرے کہ ہمارے باطن میں' ذہن میں' تھرڈ مائنڈ یا فرسٹ میں یہ موجود ہے۔ پیر دراصل روحانی سائیکاٹرسٹ ہے۔ خیالات اور ذہن کے بعض شعبوں میں اپنے لوگوں کو یہ سکھا سکتا ہے کہ آپ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی میں نہ رہیں۔ یہ بیلنس اور یہ عدم بیلنس ہے۔ زمانہ قدیم کے سارے اولیاء اور سارے ہی پیر اس علم سے مختص تھے۔ بدقسمتی سے آج آپ کو ڈھونڈنے پڑیں گے۔

پیر کی بیعت ضروری

جن صاحب نے یہ بات لکھی ہے' میں ان سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ غزالی کے پیر کا کیا نام تھا؟ تاریخ تصوف میں حجتہ الاسلام محمد بن محمد الغزالی کے کسی مرشد کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک سیکھنے کا پراسیس ہے۔ حجتہ الاسلام نے بہت سارے سبق سیکھے اور یہ بات انہوں نے نہیں کہی۔ اگر کہی ہے' تو پھر ان کے اپنے اوپر ہی صادر ہوتی ہے اور یہ بڑی المیائی سی بات ہوگئی۔

مگر سید اور غیر سید کی پہچان کے لیے میں آپ کو مختصر سی بات بتا دوں کہ آئمہ تصوف میں حضرت حسن ابن علیؓ کے بعد خواجہ حسن بصریؒ ہیں' جو آزاد کردہ غلام اور سید بھی ہیں۔ ان کے بعد حضرت سری سقطیؒ ہیں' جو آزاد کردہ غلام ہیں اور سید نہیں ہیں۔ جنیدؒ بغدادی کو سید الطائفہ ضرور کہتے ہیں' یعنی وہ گروہ صوفیا کے سردار کہلواتے ہیں' مگر سید نہیں ہیں۔ اب خواجہ ابوالفضل قطلی بھی سادات میں سے نہیں ہیں۔

جو معتدل طبقۂ خیال ہے' اس میں سید اور غیر سید کی ایسی کوئی تخصیص موجود نہیں ہے۔ اگرچہ سادات عالی قدر نے بڑے ولایت کے مقام پائے اور وہ بڑے نمایاں ہوئے مگر یہ تخصیص نہیں تھی کہ خدا نے صرف سادات کو اپنا اولیا مقرر کیا بلکہ کچھ گنہگار امتیوں کے ہاتھ بھی یہ نعمت آئی۔

Marfat.com

مرشد کی بیعت اور فیض

مرشد لفظ بڑا کڑا ہے۔ اگر آپ اس کو سادہ سا لیں کہ تصوف سیکھنے کے لیے اسی طرح دو چار استادوں کی ضرورت پڑتی ہے' جیسے کہ باقی علوم ہیں۔ ہوسکتا ہے استاد سے آپ کو اصل علم حاصل نہ ہو' تو آپ زندگی میں ہی کسی دوسرے استاد سے علم حاصل کر سکتے ہیں۔ سیدنا ہجویرؒ نے اپنی کتاب میں بڑی اچھی طرح لکھا ہے کہ انہوں نے کم از کم 64' 65 استادوں سے کسب فیض کیا حالانکہ ان کی بیعت حضرت شیخ ابوالفضل ختلی سے تھی۔

کسی بھی جگہ فیض ہو' وہ حاصل ہوسکتا ہے اور کسی بھی ایسی جگہ خواہ کتنا ہی بڑا استاد سمجھ کر آپ اس کے پاس جائیں' فیض ہے ہی نہیں' تو کہاں سے حاصل ہوگا۔ کسی بھی فقیر یا مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ اللہ نے فقیر کو دعا کی حد تک بااختیار بنایا ہوتا ہے۔ اللہ نے فقیر کو سب سے بڑا جو ہتھیار دیا ہوتا ہے' وہ دعا ہے۔ اگر میری دعا سے امریکہ کا صدر مر جائے تو میرا خیال ہے میں اس سے زیادہ طاقتور ہوں۔ یہ درجاتی دعا ہے' جس سے ایک فقیر دوسرے فقیر سے ممتاز ہوتا ہے۔ کسی فقیر کے منہ سے نکلتے ہی سنی جاتی ہے۔ کسی کی ہفتے عشرے کے بعد' کسی کی سال کے بعد اور کسی فقیر کی سرے سے سنی ہی نہیں جاتی۔

پیر بھائی کے ساتھ دنیا و آخرت میں انسیت کا رشتہ ہوتا ہے۔ آپ دو انسانوں کے درمیان ایک ہی استاد سے انس ہوتا ہے۔ اگر میں گورنمنٹ کالج میں پڑھا ہوں' تو اسی کالج کا کوئی سابق سٹوڈنٹ دور سے دیکھے گا تو پکارے گا' ہائے کیا تم راوین ہو؟ میں کہوں گا کہ ہاں میں ہوں۔ ورنہ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ایف سی کالج میں اکٹھے پڑھے ہوں تو ان میں انسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی خدا کے لیے کسی استاد سے پڑھتے ہیں' تو قدرتی طور پر ذرا زیادہ اٹیچ ہو جاتے ہیں۔ یہ امن کی فضا ہے' جو دو شاگردوں میں قائم ہو جاتی ہے۔

مردِ مومن اور تبدیلیٔ تقدیر

اگر آپ غور کیجئے' تو نگاہِ مردِ مومن سے کم سے کم برصغیر کے 48 کروڑ مسلمانوں کی تقدیریں بدل گئیں۔ ان اولیاء

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس کفرستان ہند میں اسلام پھیلا۔ اگر آپ باہر سے مسلمان حکمرانوں کی تعداد کو شمار کریں' تو بارہ ہزار ظہیر الدین محمد بابر کے ساتھ اور آٹھ دس ہزار محمد بن قاسم کے ساتھ آئے۔ اگر آپ یہ تعداد بھی شمار کرلیں تو بھی بے شمار لوگ جیسے بنگال' بہار اور انڈیا میں اور پاکستان کے مسلمان ہیں' تو آپ سوچ نہیں سکتے کہ نگاہِ مردِ مومن یعنی ان اولیائے اللہ تعالیٰ العزیز نے کس طرح برصغیر میں کتنے لوگوں کی تقدیر بدل دی ہے۔ فاسق و فاجر کو مسلم و مومن کر دیا ہے۔ شقی اور بدبخت کو سعید کر دیا ہے۔ اس سے بڑی تقدیر کی تبدیلی اور کیا ہو سکتی ہے۔

مجذوب اور عالم غیب

جو شخص اللہ کی توجہات میں اپنے حواس خمسہ سے گزر جائے' اس کو ہم مجذوب کہتے ہیں۔ مجذوب ایک Abnomal Divine Experience میں ہوتا ہے۔ ایک مکمل مربوط سلسلہ اس کا قائم نہیں رہتا۔ ایک بہت بڑا الٰہیاتی صبر و تحمل جو اس کے لیے چاہیے' وہ اس میں نہیں رہتا۔ وہ الٰہیاتی تصور سے مغلوب ہو جاتا ہے اور حواس خمسہ سے گزر جاتا ہے۔ اسے ہم مجذوب کہتے ہیں جبکہ Sobriety یہ ہے کہ وہ لوگ علم و عقل' تدبر اور صبر سے ان کیفیات کی تعبیر کرتے ہوئے اگلی منزل کو بڑھ جاتے ہیں۔ اسی لیے جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ سکر کا ایک سمندر سہو کے ایک قطرے کے برابر نہیں ہوتا' جو اکیڈمک کی تخصیص کے ساتھ چلتا ہے۔ وہ ظاہر ہے' بڑا استاد ہوتا ہے۔

عارف تصوف میں سب سے بڑا مقام ہے۔ باطنی پیشین گوئیوں کے مقام کی تحصیل اور بدقسمتی سے اس میں جو چیک اور ججمنٹ کے عناصر لگانے چاہئیں' وہ ہم ان علامتوں پر نہیں لگاتے۔ لوگ کسی کو آسانی سے مجذوب سمجھ لیتے ہیں اور اس کی ٹوٹی پھوٹی باتوں سے خود ہی کوئی نتیجہ اخذ کر کے اس کو جذب کی علامت کہہ دیتے ہیں۔

ادھر علماء ہیں کہ ان کو اس کیفیت سے شناسائی نہیں۔ اصل میں علماء کا ان کیفیات سے انکار کرنا ان کی بیچارگی کی علامت ہے۔ خواہش تو وہ بھی کر رہے ہوتے ہیں کہ اللہ انہیں بھی کوئی ایسی علامت دے دے اور اسی طرح کے وہ بھی دعوے کر سکیں مگر چونکہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی' ان کا علم ان کی مجبوری کی علامت بن جاتا ہے' اس لیے وہ فتاویٰ لگانے میں ماہر ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ مجھے ایک کام نہیں آتا اور دوسرے بندے کو آتا ہے' تو میں صبح و شام یہی کہتا ہوں کہ اس کو کام آتا ہی نہیں۔ یہ تو بالکل غلط ہے۔ علماء کو اس طرح کا کوئی ادراک حاصل نہیں ہوتا۔ اس کیفیت کو جاننے کی وہ اہلیت نہیں رکھتے۔ سو وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔

دوسرا کسی مجذوب کو پرکھنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں' مگر ہاں جسے اللہ قائم کر دے۔ ایسے مجذوبین گزرے ہیں جنہیں اللہ نے قائم کیا' جو چوتھی جہت کی ایک واضح مثال تھے۔ اللہ نے انہیں بڑی ترقی و عظمت سے نوازا۔ ان میں بابا تاج الدین ناگپوریؒ ہیں۔ ابھی حال ہی میں بادا لال شاہ بری والے کنفرم مجذوب تھے۔

مجذوب کی پہچان کے لیے دس میں سے تین کا حساب رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں ایک نفسیاتی ذہانت چاہیے۔ فرض کیجیے آپ ایک مجذوب کے پاس جاتے ہیں' اس سے ایک بات سچی نکل آتی ہے لیکن آپ کو شک سلامت رکھنا چاہیے۔ آپ دوسری مرتبہ جاتے ہیں اور پھر بات صحیح نکل آتی ہے۔ تو عمومی طور پر اس تمام گیس ورک میں دس میں سے

Marfat.com

تین صحیح نکل آتے ہیں۔ اس کا اصول یہ ہے کہ آپ مجذوب کی پہچان میں ایک قانون معطل کرتے ہیں۔ اس قانون کو Suspension Of Disbelief کہتے ہیں۔ آپ اپنا احساس تنقید معطل کرتے ہیں۔

تنقید دو طرح کی ہے۔ ایک اللہ واسطے کی تنقید ہے' جو پاکستان میں ہر آدمی دوسرے پر کرتا ہے۔ میں اس کی بات نہیں کر رہا۔ میں علمی اور ذہنی تنقید کی بات کر رہا ہوں۔ جب آپ اسے پرکھنے کی کوشش کریں تو اس کو اسی طرح پرکھیں' جیسے آپ کسی کوالٹی کو جج کرتے ہیں۔ یہ نفسیاتی ٹیسٹ ہے۔ ہر آدمی اس کی اہلیت نہیں رکھتا۔

مجذوب اور علمائے حقانی

فتنۂ آخر زماں کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ حدیث کی رو سے علم اٹھ جائے گا اور علماء ظاہر مال و دولت کے لیے دین کو اختیار کریں گے۔ وہ عالم' جو دنیا کے لیے دین کو استعمال کرتے ہیں' اس کی مثال کتے کی طرح ہے جس طرح علم اور علم دین استعمال ہو رہا ہے اور اس سے سیاسی' سماجی اور مالی فوائد حاصل کیے جا رہے ہیں' اس سے ظاہر ہے کہ اس میں خدا کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ علم کی بحیثیت دین حصول کی ڈگریاں ہوتی ہیں۔ ایک علم برائے خدا ہوتا ہے ایک علم برائے علم ہے۔ ایک علم برائے دنیا ہے۔

اس وقت علم برائے دنیا بہت اچھا جا رہا ہے۔ لوگ اسے روزگار کے لیے پڑھتے ہیں' لیکن دوسری سطح پر علم برائے دین موجود نہیں۔ لوگوں میں کوئی تصور نہیں کہ میرا بچہ بڑا عالم بنے۔ دانشور یا بڑا سائنس دان بنے۔ ہر آدمی صرف پیسہ کمانے کی فکر میں علم حاصل کر رہا ہے۔ مشورہ ملتا ہے' اس شعبہ میں جائیں۔ اس سے پیسے زیادہ ملتے ہیں' رزق زیادہ ملتا ہے۔

علم برائے علم کا سلسلہ بھی ہمارے ہاں اچھا نہیں ہے۔ تیسری چیز تک ظاہر ہے' رسائی مشکل ہی ہوگی۔ وہ لوگ جن کی آپ بات کرتے ہیں' ان کا قرآن میں ذکر ہوا ہے۔ الرسخون فی العلم یقولون من عند ربنا' وہ علم میں راسخ ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے علم حاصل کرتے ہیں۔ اللہ ہی کے لیے حاصل کرتے ہیں اور اللہ ہی کے لیے اس کی ترویج کرتے ہیں۔ اس کو معاشرے کی بدقسمتی کہا جا سکتا ہے مگر مایوسی نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ ایسے بندے ضرور پیدا کرے گا جن سے جہان میں تبدیلی ہوگی۔ فی الحال خارجی حالات میں یہ چیز ذرا مشکل نظر آتی ہے۔ فارسی محاورے کے مطابق کسی اچھے چہرے کو مشاطہ درکار نہیں ہوتی۔ صفاتِ علیہ اور صفات حسن میں ایک چیز بڑی مشترک ہے کہ جہاں ہو' وہاں سے ٹپک پڑتی ہے۔

حال پڑنے کی حقیقت

حال قدیم یونانی زبان میں' جس سے انگریزی نے یہ لفظ لیا ہے۔ Cathartic Processes کو کہتے ہیں۔ ایک لفظ میں اسے Catharsis کہتے ہیں' جس کا مطلب ہے' اندر رکے ہوئے مدتوں کے جذبات کا ایک جھٹکے سے اخراج۔ جب آپ کے سینے میں کوئی کیفیت بند ہوتی ہے' تو اس کو عام حالات میں انقباض کہتے ہیں۔ انقباض کا مطلب ہے' طبیعت کا قبض ہونا۔ جیسے کسی کو گیس کی تکلیف ہو' تو وہ اپنے اندر شدید گھٹن اور بے چینی محسوس کرتا ہے۔

Marfat.com

جب یہی کیفیت ذہنی ہو یعنی گھٹن اور ڈیپریشن میں اندرونِ ذات کا کھچا ہوا ہونا' تو ہم اسے انقباض کہتے ہیں۔ بالعموم انقباض کا کھلنا کسی جھٹکے' ردھم یا کسی اور صورت سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ قوال قوالی کر رہے تھے۔ جب انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو ان پر ایسی شدید کیفیت کا غلبہ ہوا کہ حضرت تین دن اسی حال میں رہنے کے بعد دنیا سے گزر گئے۔ عمومی حالات میں یہ فراڈ ہے۔ پیروں کے حلقے میں یہ گھڑی گھڑائی کہانی اور پہلے سے بنا ہوا ایک تماشا ہے۔ دو چار مقامات پر میں نے دیکھا کہ اشارۂ چشم سے حال پڑتا ہے۔ اگر مرشد گرامی موقع کو مناسب سمجھیں اور کیفیات کو پر اثر بنانا چاہیں تو ایک ہلکے سے اشارے سے یہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی کیفیت کو ہم کنڈیشننگ کہتے ہیں۔ اگلا بندہ کنڈیشن ہو گیا ہوتا ہے کہ جوں ہی حضرت گرامی کا اشارہ ہو اور مجھے حال پڑ جائے گا۔

مگر اصلی حال خطرناک بھی ہوتا ہے' کیونکہ بعض اوقات انقباض اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس میں اچانک اخراج سے آدمی مر بھی سکتا ہے۔ دو چار ایسی یقینی شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں جہاں کچھ شیوخ اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایسے موقع پر قوال حضرات کو یہ کہا جاتا ہے کہ قوالی بند نہ کریں' جس ردھم پر یہ کیفیت پیدا ہوئی' اسی ردھم سے وہ کیفیت جائے گی اور ہلکی سی کم ہو گی۔ اگر خدانخواستہ اسی کیفیت میں اس نے ردھم بدل دی یا اسے روک دیا' تو انقباض اپنی شدید ترین صورت میں اس کے جسم میں دوبارہ وارد ہو سکتا ہے اور متعلقہ فرد کی ذہنی ناکارگی کا باعث بن سکتا ہے۔

آج کل کے زمانے میں حال کا کوئی اصلی رنگ نظر نہیں آتا بلکہ حال ہسٹریا سے بڑی مشابہت رکھتا ہے۔ خاص طور پر خواتین میں کسی بھی شدت جذبہ میں ہسٹریا واقع ہو سکتا ہے۔ وہ ایک وقتی کیفیت ہو سکتی ہے' جو کبھی ریلیکس کی جا سکتی ہے مگر الٹے سیدھے نعرے لگانے اور عجیب و غریب حرکتوں کا اس میں کوئی جواز نہیں۔ کیتھارسس میں ہمیشہ Hypnoses (نظر کی نیند) کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ Hypnoses کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ آدمی Hypnotist ہوتا ہے بلکہ خود ایمائی سے اس پر اثر انداز ہوا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر ایک شخص کو کہا جائے کہ تم ہمارے سامنے بیٹھو۔ قرآن حکیم کی تلاوت کی جائے گی۔ اس سے یہ کیفیت تیار ہو گی تو قانون یہ ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے اپنا عقیدہ معطل کر دیتا ہے۔ جب وہ اپنا عقیدہ معطل کرتا ہے تو خود ایمائی اسے مکمل طور پر اپنے بس میں کر لیتی ہے اور اسے حال پڑ جاتا ہے۔ یہ ایک درست کیس بھی ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

نماز اور اللہ کا ذکر

بڑے ادب کی پہچان یہ ہے کہ وہ نارمل کے قریب ہوتا ہے اور خدا کے سب سے قریب تر وہ ہے' جو بڑا معقول ہو۔ اس لیے بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر کی صفت ادب اور صفت شاعری یہ ہوگی کہ وہ بڑا ہی قدرتی اور بڑا ہی نارمل ہوگا۔ اسی قسم کا ایک شعر جرأت کا ہے۔

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

ایک طرف وہ شاعر ہے' جو بے چارہ چاہنے نہ چاہنے کے باوجود عذر تراش کے اپنے محبوب کے کوچے میں ادھر ادھر گھومتا پھرتا ہے۔ ٹھکانہ اور بہانے ڈھونڈتا ہے۔ ادھر آپ کے محبوب کا یہ عالم ہے کہ وہ زور زاری کھینچ تان کر پانچ وقت آپ کو دن میں اپنے پاس بلاتا ہے۔ اپنی گلی کی آواز دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ کسی طریقے سے اس کی گلی میں آ جائیں۔ آپ اسے نہ دیکھیں' وہ آپ کو دیکھ لے تا کہ آپ کی بخشش اور رحمت کا کوئی سبب پیدا ہو سکے۔

ہمارے بازار' ہمارے گھر اور ہماری محبتیں' غیبتوں' شکایاتِ زمانہ اور گلہ دوستاں سے پر ہوتی ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو' جو شیطان کی ہمسائیگی میں صرف نہ ہوتی ہو۔ لے دے کے ایک نماز بچتی ہے' جہاں انسان اپنے وجود' معاشرے اور اپنے خیال سے کٹتا ہے۔ چاہنے نہ چاہنے کے باوجود وہ ایک خدا کے حضور میں آ کے کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے' اس سے زیادہ برالحہ شیطان کے اوپر کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ دفتر' بازار' چھت یا گلی میں وہ آپ کو کہیں تنگ نہیں کرے گا مگر جب آپ حضور خداوند کھڑے ہوں گے' تو وہ ضرور آپ کو تنگ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ آپ سے پہلے والوں کے ساتھ بھی ایسے ہی کرتا رہا ہے۔ اگر وسوسہ نہ آئے' تو پھر چونکنا پڑے گا کہ شیطان کو میری کون سی ایسی ادا پسند ہے کہ وہ مجھے فریب دینے کے لیے یہاں تک ابھی نہیں پہنچا۔ ضرور ہے کہ وہ آپ کو بھلا بیٹھا ہے۔

مستقلاً نماز کے دو بڑے خطرات ہوتے ہیں۔ ایک بڑا خطرہ اس ذہین شخص کا ہے' جو نماز پڑھتے ہوئے اکثر یہ بات کہتا ہے کہ اس نماز کا کیا فائدہ' جس میں خلوص ہے نہ قیام ہے۔ مجھے کبھی ایسی کوئی حقیقت نصیب نہیں ہوئی ہے' نہ کبھی

Marfat.com

اشارۂ خداوند یا کنایہ حقیقت ہوا۔ ایسی نماز پڑھنے کا کیا فائدہ؟ میں تو نماز اس وقت پڑھوں گا' جب میرا دل اور میرا دماغ چاہے گا جب میں پورے خلوص کے ساتھ پڑھنے کی پوزیشن میں ہوں گا۔

یہ سوچ غلط ہے۔ نماز میں کوئی تخصیص اللہ نے نہیں رکھی۔ اس نے بار بار ایک ہی لفظ استعمال کیا کہ نماز میں اقامت رکھو۔ اس کا قیام نہ چھوڑو۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام میں جو کریڈٹ رکھے ہیں' اس میں سب سے بڑا آپ کو کریڈٹ یہ دیا ہے کہ آپ چاہو یا نہ چاہو' اگر پانچ وقت کے لیے خدا کے حضور کھڑے ہوں گے تو اس کو بہانہ بخشش مل جاتا ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

قرآن حکیم میں نماز کی منطق یہ بتائی گئی اتل ما اوحی الیک من الکتاب (پ ۲۱' س العنکبوت' آیت ۴۵) کہ کتاب کی تلاوت کرو' قرآن پڑھو۔ قرآن پڑھنے سے آپ کو اوامر و نواہی کا علم ہو جائے گا۔ آپ کو صاف پتہ چل جائے گا کہ خدا کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ جب آپ کو پتہ لگ گیا کہ خدا کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا' تو ذہن انسانی یہ اختراع تو نہیں پیدا کر سکتا کہ خدا ہم سے گناہ یا غلطی کراتا ہے۔ قانوناً اور اصولاً خدا پر اس قسم کا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ جو وہ چاہتا ہے' اس نے قرآن میں لکھ دیا ہے۔ اس کے بعد کم از کم وہ نہیں چاہے گا جو آپ کرتے پھرتے ہیں یا جو آپ کا دل اور خواہش چاہتی ہے۔ اس نے قرآن میں لکھ دیا واقم الصلوٰۃ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (پ ۲۱' س العنکبوت' آیت ۴۵) کہ یہ نماز تمہیں منکر اور انکار خداوند سے روک دے گی۔

ایک شخص جو پانچ وقت نماز پڑھتا ہے' ظاہر ہے کہ وہ دہریہ نہیں ہو سکتا۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ خدا نہیں ہے۔ وہ منافق ہو سکتا ہے کہ نماز پڑھ کر صرف آپ کو دھوکہ دینا چاہتا ہو۔ ورنہ نماز پڑھتا ہوا انسان خدا کا منکر نہیں ہو سکتا۔ چاہے خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھے' چاہے ویسے پڑھے۔ باوجود نہ چاہنے کے ایک شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے' تو یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک بڑے افسر کے سامنے چھوٹا افسر مجبوراً اس کا حکم مان رہا ہوتا ہے۔ ممکن ہے' دل میں اسے دو چار صلواتیں بھی سنا رہا ہو کہ اس کم بخت نے کوئی لمحہ میرے لیے خیر کا نہیں چھوڑا۔ مجھے آرام کرنے دیتا ہے نہ چین لینے دیتا ہے مگر مجبوری ہے کہ اس کا کام ضرور کرنا ہے۔

رب کریم نے اقامت کی شرط اس لیے لگا دی کہ انسان کا ضمیر بڑا تغیر پذیر ہے۔ وہ کبھی چاہتا ہے کبھی نہیں چاہتا۔ تمہیں سستی پڑ جاتی ہے' کبھی حماقت لے بیٹھتی ہے۔ کبھی کوئی اور مصروفیت اس پر غالب آ جاتی ہے' چنانچہ زندگی میں ہر دوسری ترجیحات میں وہ نماز سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز کا قائم کرنا ترجیح اول کو قائم کرنے کے برابر ہے۔ یہ اس چیز کی شہادت ہے کہ خدا آپ کے نزدیک سب سے زیادہ اہم وجود اور اہم شخصیت ہے اور آپ اس کو ہی ماننے والے ہیں۔

اس کے بعد اللہ نے کہا' ولذکر اللہ اکبر (پ ۲۱' س العنکبوت' آیت ۴۵) بہت سارے اکیڈیمک کے لوگ جب ہمارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو اچھے کاموں کو بھی یاد خدا سمجھتے ہیں۔ کچھ صاحب کہتے ہیں' ہم خلق خدا کی خدمت کو بھی نیک کام اور ذکر خدا سمجھتے ہیں۔ کچھ فرماتے ہیں کہ قرآن بھی ذکر ہے' نماز بھی ذکر ہے۔ تسبیح کی خاص طور پر اتنی زیادہ اہمیت کیوں بتائی گئی ہے؟

یہ سچ ہے کہ قرآن ذکر ہے نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون (پ ۱۴' س الحجر' آیت ۹) ہم نے اس

Marfat.com

ذکر کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں' پھر خدا نے نماز کے بارے میں کہا' واقم الصلوٰۃ لذکری' نماز میری یاد کے لیے قائم کرو۔ قرآن بھی یادِ خدا ہے' نماز بھی یادِ خدا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت میں تینوں چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا یااتل مااوحی الیک من الکتاب یہ ذکر بھی پڑھو۔ ایک ذکر کرنے والا ہے' ایک ذکر پڑھنے والا ہے۔ یہ ذکر بھی پڑھو۔ اس سے اوامر ونواہی کو خوب اچھی طرح جانو واقم الصلوٰۃ اور نماز قائم کرو کہ یہ ذکر تمہیں فحش و منکر سے روک دے گا ولذکر اللہ اکبر مگر اس کے علاوہ کوئی ایسی یاد ہے' جو ان یادوں سے بڑی فضیلت رکھتی ہے۔ یہ وہ یاد ہے' جو قرآن نہیں ہے' نماز نہیں ہے ولذکر اللہ اکبر مگر میری یاد! یہ تو بہت بڑی بات ہے۔

پروردگار عالم نے پورے قرآن حکیم میں کچھ چیزیں درجہ بدرجہ رکھی ہیں۔ مثلاً اگر بدلہ برابر لے لیں' تو بہت اچھی بات ہے۔ ہم آپ کو بالکل نہیں منع کرتے۔ آپ کا حق ہے بدلہ لینا اور فرمایا کہ بدلہ لینا اتنا مناسب ہے کہ قیامت کے دن جب ہماری عدالتِ عدل سجے گی' تو حدیث مبارک کے مطابق ہم بے سینگ کی بکری کو سینگ والی سے حساب دلائیں گے۔ تو احتساب اور عدل اتنا جذباتی نگرانی کا ادارہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تینوں چیزوں میں اتنی وضاحت سے فرق کیا اور ولذکر اللہ اکبر کے بعد ایک چھوٹا سا جملہ ارشاد فرمایا ہے واللہ یعلم ماتصنعون (پ۲۱' س العنکبوت' آیت ۴۵) میں اچھی طرح جانتا ہوں' تم اپنے اندر کیا رکھتے ہو۔ آپ کا مزاج' آپ کا خیال کیا چیز اندر بنتا رہتا ہے۔ تصور کیا بنتے اور گھڑتے رہتے ہو۔

قرآن یا نماز پڑھنا کچھ ضابطوں اور قاعدوں میں قید ہے۔ مثلاً آپ قرآن بے وضو ہو کے نہیں پڑھ سکتے۔ چلتے پھرتے دو چار آیات تو آپ پڑھ سکتے ہیں' مگر پورے قرآن حکیم کی تلاوت آپ بے وضو نہیں کر سکتے۔ اسی طرح نماز بے وضو نہیں پڑھ سکتے۔ پھر نماز کے کچھ قاعدے اور کچھ قانون ہیں۔ کس طرح کھڑا ہونا ہے۔ کس طرح ہاتھ باندھنے ہیں۔ اٹھنا اور بیٹھنا ہے۔ حضور خداوند میں اس کا طریق متعین ہے اور آپ اس متعینہ طریق پر چلتے ہیں۔

جب خدا برابر کے بدلے کی بات کرتا ہے' تو وہ آپ کو گنجائش دیتا ہے کہ برابر کا بدلا لو اور اگر معاف کردیں' تو بڑی بات ہے۔ کچھ باتیں اللہ نے سابقون السابقون کے لیے رکھی ہیں۔ کچھ لوگ رستہ ماپنے والے ہیں کہ وہ اپنی مقدار اوسط سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ مگر کچھ لوگ ایسے ضرور ہوں گے' جن کے دل میں خدا کا خلوص اور محبت زیادہ ہوگی۔ کچھ لوگ وہ ہوں گے' جو زندگی کے حقائق پر نگاہ مارنے کے بعد اس چیز کے قائل ہو گئے ہیں کہ متاع الدنیا قلیل (پ ۵' س النساء' آیت ۷۷) دنیا قلیل ہے۔ لہو ولعب ہے۔ بے مقصد ہے۔ دنیا محض ایک سفر کا وقفہ ہے۔ ان ساری چیزوں کو یکجا کرنے کے بعد جو اس سراب سے آگے بڑھتے ہیں' انہیں حقیقت صرف اللہ میں نظر آتی ہے۔ وہ خدا سے زیادہ محبت کرنے والے' انس رکھنے والے اور زیادہ قائل ہو جانے والے ہو جاتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بندہ ایسا ہوتا ہے' جو اپنے محبوب کے قرب کے لیے کسی بہتر صورتحال کی تلاش میں رہتا ہے۔ جب ایسے لوگ اللہ کی نظر میں آئیں' تو آپ نے فرمایا ولذکر اللہ اکبر۔

اطمینانِ قلب کی تلاش

ہم تمام اطمینانِ قلب کو تلاش کرتے ہیں۔ کئی جتن کرتے ہیں۔ سکون چاہتے ہیں' مگر سکونِ قلب نہیں ملتا۔

Marfat.com

سکون قلب لڑکیوں میں ہے؟ لڑکوں میں ہے؟ ایک مکان میں یا جائیداد میں ہے؟ سکونِ قلب سکیورٹی میں ہے؟ دس سال کے پیسے نہ پڑے ہوں' تو سکون قلب نہیں ہوتا؟ سارے بچے کام کاج پر لگے ہوں' تو سکونِ قلب ہو جاتا ہے؟ یعنی سکونِ قلب کی وضاحتیں ہمارے پاس جدا جدا ہیں۔ مگر آپ اللہ کی تو سنتے ہی نہیں ہیں۔ آپ کو اگر خدا پر اعتبار ہوتا' تو وہ تو سکونِ قلب کا بڑا ہی آسان نسخہ دے رہا ہے الابذکر اللہ تطمئن القلوب کہ اطمینان قلب میری یاد کے بغیر ممکن نہیں۔ پیسے مل جائیں گے۔ مکان اور اولاد مل جائے گی۔ سب کچھ مل جائے گا۔ خبردار! سن لو کہ ایک چیز نہیں دوں گا الابذکر اللہ تطمئن القلوب کہ تمہیں اطمینانِ قلب صرف میری یاد سے ملے گا۔

یہ دور خوف اور فرسٹریشن کا دور ہے۔ اداسیاں بکھری ہوئی ہیں۔ مسائل کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ غم والم کربلائے زندگی ہے۔ یہ زندگی نہیں ہے۔ اس میں آپ کو اطمینان بھی چاہیے۔ آزادی اور خوف وحزن سے فراغت بھی چاہیے۔ پھر بھی آپ اللہ پر نہیں اعتبار کرتے ہو۔ پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟ یہ دنیا بھول بھلیاں کی دنیا ہے۔ اس میں جو گھستا ہے' اسے واپسی کا رستہ نہیں ملتا۔ ایک خواہش کے بعد دوسری کا سراب شروع ہو جاتا ہے۔ ایک اداسی کے بعد دوسری اداسی۔ کب انسان کا پیٹ بھرا؟ کب اسے اطمینان نصیب ہوا؟ کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ تو صرف اللہ کے پاس ہے اور فارمولا اس نے آپ کو دے دیا الابذکر اللہ تطمئن القلوب جب آپ خدا پر اعتبار کرتے ہیں۔ دل کا اطمینان اور ذہن کا سکون چاہتے ہیں' تو آپ کو خدا کی طرف پلٹنا ہوگا۔

بعض لوگ بڑے ضدی ہوتے ہیں۔ میتھوڈسٹ ہیں۔ کہتے ہیں' نماز پڑھ لیں' بہت ہے۔ میں بھی کہتا ہوں' پڑھ لیں۔ بہت ہے۔ مگر نماز کا مقصد کوئی ہونا چاہیے۔ روزے رکھو' ضرور رکھو۔ افعال کو شریعت کہتے ہیں۔ نجات کو طریقت کہتے ہیں۔ طریقت شریعت کی نیت ہے۔ اگر اعمال ظاہرہ عبادات ہوں۔ اگر آپ خدا کے لیے نہیں کر رہے۔ کوئی احساس ہی آپ کے دل میں خدا کا نہیں ہے' تو یہ اعمال شریعت کولہو کے بیل کی طرح ہیں۔ گھومتے رہیں گے' پھرتے رہیں گے۔ کوئی ثواب اور کوئی ٹیسٹ نہیں ملے گا۔ خدا نہیں ملے گا۔

طریقت اور شریعت جدا نہیں ہیں۔ اعمال کی نیت کو طریقت کہتے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے اعمال ضائع نہیں کرنے' تو کم از کم ایک نیت شامل کر لیا کریں کہ اے پروردگار! یہ نماز صرف تیرے لیے ہے۔ سست اور بے کار بہت ہوں۔ قطعاً دل نہیں چاہتا نماز پڑھنے پر۔ بس میں ہو' تو سب سے پہلے یہ ترک کروں۔ مگر تیرے لیے یہ کوفت سہہ رہا ہوں۔ اٹھ رہا ہوں۔ اداس ہو رہا ہوں۔ مگر تیرے لیے۔ دیکھو! آپ کا خدا پر دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ آپ اس کی کورٹ میں بال پھینک دیتے ہیں۔ آپ کو کیوں مجبوری ہے؟ کیوں آپ اللہ کے دباؤ میں ہیں؟ دو چیزیں ہیں' جن سے آپ کا دباؤ اللہ پر بڑھتا ہے۔ آپ کا حق اللہ پر فائق ہوتا ہے۔ اللہ میاں تخلیق سے پہلے کتاب میں لکھ بیٹھے ہیں' آپ سے وعدہ کر کے کنٹریکٹ لکھ کر دے چکے ہیں کہ کتب علی نفسہ رحمۃ' ہم تم پر بڑی مہربانی' بڑا رحم کریں گے۔ کمال کی بات ہے کہ انسان اپنے حقوق کا استعمال نہیں جانتا۔

دوسری جگہ اللہ میاں کہتا ہے' دیکھو! تم کنٹریکٹ کو استعمال کرو۔ میں پابند ہوں۔ مگر اگر تمہاری رجعت ہی میرے پاس نہیں ہے' تو میں آزاد ہوں۔ کنٹریکٹ یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر گناہ وآلام اور بندشوں کے باوجود اگر تم ہماری طرف

Marfat.com

رجعت کرو گے' تو میں تمہیں معاف کرنے کا پابند ہوں اور اگر تم رجعت نہیں کرو گے' تو پھر میں آزاد ہوں۔ فرمایا قل یعبادی الذین اسرفو علی انفسھم دیکھو! میرے سارے بندوں کو یہ میرا اعلان سنا دو۔ شہنشاہ معظم' صاحب افلاک' صاحب کائنات یہ اعلان فرماتے ہیں قل یعبادی الذین اسرفو علی انفسھم میری طرف سے ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو بڑا گنہگار سمجھتے ہیں۔ بھرپور احساس گناہ میں مبتلا ہیں۔ ان میں گلٹ در گلٹ سلسلہ چلتا آرہا ہے۔ بھئی ہو گئے' سو ہو گئے۔ اللہ کہتا ہے' ہو گئے سو ہو گئے۔ تم غلطی کر بیٹھے۔ اللہ گناہ کو گناہ ہی نہیں کہتا' اسراف کہتا ہے۔

عقل میں نے تمہیں اپنے لیے دی تھی' تم نے سول سروسز پر لگا دی۔ روٹیاں کمانے پر لگا دی۔ اسراف کیا تم نے۔ قرآن کی بڑا اصطلاح انٹلکچوئل اصطلاح ہے قل یعبادی الذین اسرفوا مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ اللہ کہتا ہے' تم نے اپنے آپ کو فضول خرچا۔ ایک بڑی غلطی میں کر بیٹھا۔ اب اللہ میاں خبردار کر رہا ہے۔ گناہوں اور خطاؤں کے باوجود پہلے سے اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ تم نے بڑی حماقتیں کیں۔ بڑی غلطیاں کیں۔ اور کہا' بڑی بیزاری سے کہہ رہا ہے۔ کیونکہ یہاں اسے کچھ دینا پڑتا ہے۔ تم نے بڑی زیادتیاں کیں۔ مگر ایک غلطی نہ کرنا لاتقنطو من رحمۃ اللہ جو کنٹریکٹ لکھا ہوا ہے۔ میں نے تمہیں لکھ کے دیا ہوا ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔

جس شخص نے یہ کہا کہ میرے گناہ اتنے ہیں کہ اللہ اسے نہیں بخشتا' اس نے کفر کا ارتکاب کیا۔ اس لیے کہ گناہ اوکل ہے۔ آدمی اوکل ہے۔ عقیدہ ٹمپریری ہے۔ انفرادیت مختل ہے اور جو ہماری حریف ہے' رحمت بیکراں' وہ کائناتی ہے۔ کیا عشق پائیدار سے ناپائیدار کا۔ ایک چھوٹی سی چیز' چھوٹی سی خطا کا اس بیکراں وسعت رحمت سے کیا مقابلہ ہے؟ میں اگر نالائقی سے اٹھ کے بیان دے دوں کہ اے میرے رب! میں بڑا گناہگار ہوں' تو کیا اللہ مجھے معاف نہیں کرتا۔ خدا کہتا ہے' تو نے بڑے گناہ کیے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ مگر ایک آخری گناہ نہ کر بیٹھنا لاتقنطو من رحمۃ اللہ پھر دُہرایا' اپنے عہد و پیمان کو انسان کے لیے ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا ان اللہ میں بڑے راز پوشیدہ ہیں۔ حتمی اور فائنل بیان ہے ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا ذرا ٹرم دیکھیے جمیعا یعنی ٹوٹل۔ اگر انگریزی میں اس کا ترجمہ کریں' تو سوائے لفظ Totality کے اور کوئی استعمال نہیں ہوتا All ٹوٹل۔

البتہ اگر گناہ معاف کرنے والے کو پتہ ہی نہیں۔ فرض کریں' آپ اس کو ہی نہیں جانتے۔ جیسے ایک ہندو ہے۔ ساری زندگیاں نیکیاں کرتا ہے۔ اللہ میاں پوچھیں گے' تم کس سے ثواب مانگنے آئے ہو؟ کس سے کیا مانگنے آئے ہو؟ آپ نے لیڈی گنگارام ہسپتال بنایا۔ بہت خوب' بہت اچھا کیا۔ مگر صلہ کس سے مانگنے آئے ہو؟ شیوا سے؟ وشنو سے؟ برہما' سرسوتی' کالی اور درگا سے؟ کس سے مانگنے آئے ہو؟ اگر وہ اللہ کو جانتا نہیں' مانتا نہیں ہے' تو اللہ کو کیوں قید کیا جائے کہ وہ ضرور ان کو صلہ دے۔

ذکر اللہ کی فوقیت

میں نے ذکر کی قرآن پر فضیلت ثابت نہیں کی' بلکہ اعلیٰ ترین قدم ہر وقت اللہ کی یاد میں مصروف رہنا ہے۔ اس سے نہ قرآن نہ نماز کی اہمیت کم ہوتی ہے۔ قرآن اور نماز بنیادی ادارے ہیں۔ ایک شخص جو خدا کی یاد کر رہا ہے' اگر اس

Marfat.com

سے پوچھا جائے اور اللہ ہی اس سے پوچھ لے کہ تسبیح تو تو بڑی پڑھ رہا ہے' لیکن چھوٹا سا حکم تو میرا تجھ سے مانا نہیں جاتا۔ یہ وہ حکم ہے' جو میں نے سب کے لیے کامن دیا ہے۔ وہ تو تو مان نہیں رہا' مجھے تسبیح پڑھ پڑھ کے کیا دکھا رہا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور اور قرب سے وہی آشنا ہوگا' جو قرآن اور نماز کے بعد بھی خدا کو اضافی وقت میں یاد کرے گا۔

یاد کو اس لیے بڑا کہا گیا ہے کہ قرآن کو بغیر وضو آپ ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ جبکہ نماز کے لیے ایک فارمیٹ اور طریق کار ہے۔ اس کے بغیر آپ نماز نہیں پڑھ سکتے۔ لیکن انسان چوبیس گھنٹے اس پیٹرن میں نہیں رہتا۔ اس لیے خدا نے ایک ایسی چیز عطا کر دی' جس کو ہر حال میں ہر آدمی ہر طریقے سے پڑھ سکتا ہے یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم کھڑے یاد کرو' بیٹھے یاد کرو' کروٹوں کے بل یاد کرو۔

حضرت یونس متی کے بارے میں اللہ نے کہا کہ اگر یونس تسبیح کرنے والا نہ ہوتا' تو قیامت کے دن بھی مچھلی کے پیٹ سے ہی اٹھتا۔ یہ بھی قرآن نے کہا کہ یہ وہ ذکر ہے' جو پیغمبروں کا فیورٹ ہے۔ حضور رسالت مآبؐ سوئے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پاس بیٹھے تھے۔ دو عجیب لوگ آئے۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ دیکھو کتنا عجیب مرد ہے! اس کی آنکھ سوتی ہے' مگر اس کا دل اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ یہ ایک ایسا تسلسل ہے' جس میں مراسم' مناسب اور تکلفات حائل نہیں ہوتے۔ آپ کسی حال میں بھی ہوں' اللہ کو یاد کر سکتے ہیں۔ اسی لیے اس کی اہمیت بڑی ہے۔

مصیبت اور اطمینان قلب

لایکلف اللہ نفس الا وسعھا کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بھی بیان عملی نہیں' نفسیاتی ہے۔ کیونکہ اللہ نے انسان کو بنایا ہے۔ بنانے والے سے زیادہ اپنی مشین کو کوئی نہیں جانتا۔ ہر انسان کو انفرادی طور پر خدا جان رہا ہوتا ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہو' تو ذرا سی مصیبت سے گھبرا کے میں کہہ سکتا ہوں کہ اے میرے پروردگار! مجھ میں صبر نہیں ہے' طاقت نہیں ہے۔ مجھ سے یہ ابتلا اور مصیبت اتار دے۔ اللہ اپنی مشین کی استعداد سے واقف ہے۔

بالعموم خالق ایک مشین پر لکھ دیتا ہے کہ یہ کتنے ہارس پاور ہے۔ اتنی اس کی پاور لینے کی ہے۔ اتنا بوجھ یہ اٹھا سکتی ہے اور اتنا اس سے زیادہ نہیں اٹھا سکتی۔ ہمارا یہ حال ہے کہ اس نازک ننھی منی سوزوکی کو' جو جاپان نے مخصوص مقاصد کے لیے بنائی تھی' ہم کسی گدھے سے بھی بدتر استعمال کرتے ہیں۔ ہم اس کو اوورویٹ کرتے ہیں' جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اچانک جواب دے جاتی ہے۔ گاڑی میں اس کا کوئی نقص نہ تھا۔ جب بنانے والے نے اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں رکھی کہ وہ اتنا بوجھ اور وزن اٹھا سکے۔ اس سے زیادہ ڈالیں گے' تو انجن چوں چرا شروع کر دے گا اور بالآخر ختم ہو جائے گا۔ پانچ سال کی زندگی' جو اس کی ریکارڈڈ ہے' وہ آدھے سال میں ختم ہو جائے گی۔

اب انسان کا یہ حال ہے کہ مصیبت اسے ہر حال میں دیکھتی ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ ہم ہر انسان کو خوف' بھوک' نقص اموال' کیفیات ذات اور مال و اولاد کے نقصان سے آزمائیں گے اور اللہ کہتا ہے کہ آپ کو اس مصیبت سے نجات نہیں ہوگی' سوائے ایک طریقے کے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ جونہی کوئی بلا آپ تک پہنچے' فوراً سر تسلیم خم کیجیے اور کہہ دیجیے کہ اے پروردگار! میں تیرا عندیہ سمجھ گیا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ تو نے بلا بھیجی ہے۔ اس کو تو اس وقت ہی لوٹائے گا' جب

Marfat.com

میں انا للہ و انا الیہ راجعون کا مفہوم پورا کروں گا۔ آپ نہ کہیں گے' تو آپ کی مصیبت اور لمبی ہو جائے گی۔ جس دن آپ نے بڑی تسلی سے کہہ دیا اے پروردگار! ٹھیک ہے' یہ تمہاری طرف سے آئی ہے' تمہاری طرف ہی لوٹ جائے گی۔ میں نے اسے قبول کیا اور تجھ سے رحمت اور بخشش کی امید رکھی۔ یہ ایسی انٹلکچوئل اپروچ ہے کہ پروردگار کہتا ہے نہ صرف یہ کہ میں اس کی مصیبت دُور کروں گا' بلکہ میں اس کو ایک صحیح انٹلکچوئل جانتے ہوئے اُولٰیک علیھم صلوٰۃ من ربھم ورحمۃ واُولٰیک ھم المھتدون میں ان پر دائمی درود و سلام اور اپنی رحمت بھیجوں گا۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں' جو بجا طور پر حقیقت کو سمجھتے ہیں۔

انسان کا نجات کا ایک طریقہ ہے۔ چونکہ اس نے پہلے اس نوعیت کی مصیبت برداشت نہیں کی ہوتی' اس لیے مصیبت آتے ہی وہ چیخ و پکار میں لگ جاتا ہے کہ مجھ میں برداشت نہیں۔ میں مر رہا ہوں۔ میں جا رہا ہوں اور خدا اس پر ہنس رہا ہوتا ہے کہ میں نے تجھے اتنی زیادہ استعداد دی ہے۔ ابھی تو اس کا آغاز ہی نہیں ہوا کہ تو نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ پھر جن لوگوں پر مصیبت آئی اور وہ زیادہ چیخے چلائے' ان کا خیال تھا کہ ہم ایک دن بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ انہوں نے ایک سال وہی مصیبت برداشت کی۔ اس لیے کہ انہیں یہ تمام کلفت برداشت کرنے کی اپنی استعداد کا اندازہ نہیں تھا۔ لیکن خدا جانتا تھا۔ اسی لیے وہ مصیبت ان پر ایک وقت ٹھہری اور اس کے بعد ان کو ریلیف دیا گیا۔

یہاں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ عذاب اور آزمائش میں تھوڑا سا فرق ہے۔ عذاب کی کیفیتوں میں سکون نہیں۔ عذاب بہرحال ایک سزا ہے۔ مگر سزا کیوں ہے؟ قرآن حکیم میں اللہ نے فرمایا مایفعل اللہ بعذابکم مجھے کیا پڑی ہے کہ تمہیں عذاب دوں وان شکر تم وامنتم اگر تم میری یاد والے ہو اور ایمان والے ہو' تو مجھے کیا ضروری ہے کہ میں تمہیں عذاب دوں گا کان اللہ شاکراً علیما یہ بڑا اہم اور ایک سائنسی قانون ہے' جو اللہ نے قرآن میں دیا ہے کہ اگر آپ کسی تکلیف' دُکھ یا عذاب کا درد محسوس کر رہے ہیں اور یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ کیوں ہے اور آپ کو خدا کا یہ قانون پتہ ہو مایفعل اللہ بعذابکم ان شکر تم وامنتم تو آپ یقین جانیئے کہ جب آپ شکر شروع کریں گے اور اللہ کو یاد کرنا شروع کریں گے' تو آپ کا وہ عذاب ٹل جائے گا۔ یہ تمام مبادلاتی اور سائنسی قانون ہے کہ عذاب خدا کی یاد کی مقدار اور گہرائی کے مبادلے کے ساتھ وابستہ ہے۔

آپ کے ایمان کے ساتھ ایک مبادلے کی صورتحال ہے۔ جہاں شکر اور یاد کم ہوگی' وہاں عذاب ہوگا۔ آج کل آپ کے معاشرے میں ایک بہت بڑا عذاب آیا ہوا ہے۔ ہر آدمی کثرت سے یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ میری ناکامی کی وجہ یہ تعویذ ہو گیا۔ وہ سایہ ہو گیا۔ یہ جادوگری ہو گئی۔ یہ ہو گیا' وہ ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں ہو گیا؟ یہ تو ہونا ہی ہے۔ تعویذ تو ہونے ہی ہیں۔ تعویذ اور جادو باہر سے نہیں ہو رہا۔ یہ بھی پروردگار عالم نے ایک بڑا سادہ سا قانون بنایا ہے ومن یعش عن ذکر الرحمٰن کہ جو ذکر رحمٰن سے غافل ہوا نقیض لہ شیطان ہم اس پر ایک شیطان کو غلبہ دیتے ہیں وھو لہ قرین وہ اس کے قریب رہتا ہے۔ اگر آپ اللہ کے ذکر سے غافل ہوں گے' تو یقیناً کوئی شیطان آپ پر غالب ہو جائے گا۔

ایک اور بات پر غور کیجیے کہ کتنے آسان نسخوں کو ہم بھلائے رہتے ہیں۔ پروردگار عالم نے ایک قانون دیا ہے۔

Marfat.com

قرآن حکیم میں فرمایا علی بذکر اللہ تطمئن القلوب یہ لاء' قانون ہے۔ خبردار کر کے کہہ دیا کہ میری یاد کے بغیر تمہیں دل کا اطمینان نہیں ملے گا۔ باقی مل سکتے ہیں۔ جسمانی سکھ مل سکتا ہے۔ پسند کی بیوی مل سکتی ہے۔ عہدہ مل سکتا ہے' جس کے لیے آپ نے جدوجہد کی۔ مگر اگر تم پوری زندگی بھی جدوجہد کرو گے' تو میری یاد کے بغیر تمہیں اطمینانِ قلب نہیں مل سکتا۔ اگر ہمارا خدا پر یقین واعتقاد ہے اور جب میرے پروردگار نے مجھے اور آپ کو یہ بتا دیا ہے' تو پھر یہ بتایئے کہ کون ایسا شخص ہے' جسے اطمینانِ قلب کی ضرورت نہیں۔

اگر ہم سب کو اس کی شدید ضرورت ہے' تو اطمینانِ قلب کا واحد اصول اللہ نے یہ بتایا ہے کہ یہ میری یاد ہے۔ اس کے سوا میں تمہیں کسی قیمت پر اطمینانِ قلب نہیں ہونے دوں گا۔ کیا اس کے علاوہ کوئی اور رستہ آپ کو نظر آتا ہے؟ کیا خدا کی یاد کے بغیر آپ اطمینانِ قلب حاصل کر سکتے ہیں؟ اس کے باوجود انسانی ضد کا یہ حال ہے کہ وہ ذکر وتسبیح اور یاد الٰہی سے گریز کرتا ہے اور پھر بھی اطمینانِ قلب ڈھونڈتا ہے۔ تمنائے حیات جاوداں کو لیے پھرتا ہوں دنیائے فنا میں۔

یہ اطمینانِ قلب کس نوعیت کا ہے؟ اللہ نے بات بالکل واضح کر دی ہے کہ میں اپنے دوستوں پر سب سے بڑا انعام دو صورتوں میں کرتا ہوں۔ جب کوئی میرا دوست بنتا ہے تو الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون تو میں ان کے دلوں سے خوف اور انتشار ختم کر دیتا ہوں۔ عجیب بات ہے کہ پندرہ سو برس پہلے اللہ نے وہ دو لفظ استعمال کیے' جن کے مساوی آج ہمارا سوشل سیٹ اپ ہے۔ تمام سوسائٹی صرف ان دو لفظوں کی زد میں ہے۔ یہ خوف اور فرسٹریشن کا ڈر ہے۔ ایک بچے سے لے کر کسی بڑے بوڑھے تک ہم انہیں ہر دو چیزوں میں مبتلا پاتے ہیں۔

اللہ آپ کو وعدہ دے رہا ہے کہ میں اپنے دوستوں کو خوف وحزن سے بے نیاز کر دیتا ہوں۔ یہ ہمارے لیے ایک اچھا چانس ہے کہ ہم کم از کم پروردگار عالم کے اس قول کو آزما کے تو دیکھیں۔ ہم اطمینان قلب کے لیے اس کی یاد اور محبت اختیار تو کر کے دیکھیں۔ اس نے کہا' جیسے چاہو' مجھے یاد کرو۔ اس نے ہر قسم کا انداز اور پابندی اٹھا دی۔ ذکر آپ کی استطاعت قلب' اطمینانِ قلب' آپ کے ذہن اور آپ کی تمام استطاعت میں اضافہ کرتا ہے۔ وہی چیز' جو پہلے آپ کو برداشت نہیں ہوتی تھی' وہ خدا کی یاد کے ساتھ ساتھ قطعاً قابل برداشت ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تسبیحات اور ذکر کا جو انداز ہے' خدا نے ان میں توجہ کا ارتکاز تلقین نہیں فرمایا۔ ارتکاز میں ایک غلطی ہے کہ توجہ کے ارتکاز سے پہلے بہرحال آپ کو کوئی خیال قائم کرنا ہوتا ہے۔ اگر آپ توجہ مرتکز کر کے تسبیح کریں گے' تو اس میں کوئی نہ کوئی طاقت کا حصول آ جاتا ہے۔ اس وجہ سے چلوں اور وظائف میں زیادہ لوگ جو بیٹھنے والے ہیں' وہ ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ شیزوفرینیا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ Psychotic, Skies eyed اور Neuroticist بن جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بڑی سادہ ہے۔

خدا کی یاد کے پیچھے طلب اور آرزو تو عام انسان کی تو ہو سکتی ہے' مگر کوئی اختیار اور طاقت کا حصول نہیں ہوتا۔ کوئی چلہ اور کوئی وظیفہ ایسا نہیں' جو خدا سے کوئی چیز زبردستی چھین سکے۔ ہم نے انتہائی انکسار اور محبت سے خدا کو یاد کرتے ہوئے اس سے اپنا اطمینانِ قلب حاصل کرنا ہے۔ اپنی شناخت اور اپنی خامیوں کی آگہی طلب کرنی ہے۔ یہ ذکر یہی کام کرتا ہے۔ اس سے بڑا کوئی کام نہیں کرتا۔

Marfat.com

ذکر، تسبیح، اہمیت

سورہ طہٰ میں ذکر اور تسبیح کا علیحدہ علیحدہ ذکر دراصل تاکید کے لیے ہے اور ایک ذہنی حالت کو دوسری ذہنی حالت میں تبدیل کرنے کے لیے ہے۔ مثال کے طور پر اللہ کہتا ہے کہ تسبیح کریں سبح اسم ربک العظیم اور سبح اسم ربک الاعلیٰ تو جب پہلی مرتبہ سبح اسم ربک الاعلیٰ آیت آئی' تو رسولؐ اللہ نے اس آیت کو سجدے کے عالم میں پڑھنے کا حکم فرمایا اور جب آیت یہ آئی سبح اسم ربک العظیم تو اللہ کے رسول نے اسے رکوع میں پڑھنے کا حکم صادر فرمایا۔ تسبیح کائنات کی ہر چیز کا شغل ہے اور تسبیح کا اصل مطلب گننا ہے۔ دانے کا ایک راؤنڈ ہے۔ جیسے غالب کا بڑا خوبصورت شعر ہے ؎

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشہ بیک کف گردن صد دل پسند آیا

کہ میرے محبوب کو تسبیح کرنا اتنا پسند ہے کہ سو دلوں کی تسبیح ہو اور وہ ایک ہاتھ میں سو دانے کی طرح رولتا ہے۔ تو تسبیح انسٹرومنٹ اور ذکر اس کا میٹریل ہے۔ بعض اوقات جب تسبیح کہا' تو انسٹیٹیوشن کا ذکر کیا اور جب ذکر کہا' تو ایک ذاتی تعلق کا ذکر کیا۔ اس لیے اس پر دوہری تاکید کی۔ یعنی تسبیح ہی ذکر ہے اور ذکر تسبیح میں ہے۔ مگر یہ ایک انسٹرومنٹ اور انسٹیٹیوشن ہے اور ایک نیت اور ارادہ ہے۔ دونوں کا ذکر اکٹھا اس پر زور ڈالنے کے لیے کیا گیا ہے۔

ذکر اور ذاتی جائزہ

جیسے کہ میں نے آپ کو حدیث مبارکہ کی رو سے بتایا کہ دو خیمے نصب ہوں گے۔ ایک نفاق کا خیمہ دوسرا اخلاص کا خیمہ۔ جو نفاق کا خیمہ ہے' اس میں موجود لوگوں میں اخلاص کی رتی بھی نہ ہوگی اور جو اخلاص کا خیمہ ہے' اس میں وہ لوگ ہوں گے' جن میں نفاق کی رتی بھی نہ ہوگی۔ حتمی فیصلہ اللہ کے پاس ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر ہے کہ جن کے دل میں رتی برابر بھی اس کے لیے اخلاص ہوگا' وہ ان کو کبھی بھی دوزخ کی طرف نہیں جانے دے گا۔

مگر ایک حدیث رسولؐ خطرے کی علامت ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے رسولؐ اللہ سے پوچھا۔ یا رسولؐ اللہ! کیا زمانہ' آخر میں مخلصین بھی پس جائیں گے؟ فرمایا' ہاں وہ بھی پس جائیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ سونے کے پہاڑ ہوں گے' مگر لوگ گذرتے ہوئے یہ کہیں گے کہ ان کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ لوگ ایک قبر پر سے گذریں گے اور یہ کہیں گے کہ اس کے اندر والا باہر والے سے بہتر ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس وقت ایک دانہ گندم کے لیے فساد ہوگا۔ یعنی اتنا قحط ہوگا۔ پوچھا گیا' یا رسولؐ اللہ! اس وقت اہل ایمان کس چیز پر گذارا کریں گے؟ حضورؐ نے فرمایا' وہ تسبیح الٰہی پر گذارا کریں گے۔ جو اللہ کو یاد کریں گے' خدا ان کو بہر صورت کچھ نہ کچھ پہنچائے گا۔

قیامت سے پہلے' قیامت کے دن اور یوم حساب کے بعد سب سے بڑا تحفظ اعمال صالحہ کے ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر ہے۔ یہ ذکر آپ کے دل کی غذا ہے اور خوراک بھی ہے۔ ذکر سے مراد جو تسبیح آپ اب کر رہے ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں

Marfat.com

لگتا کہ میں اتنی مدتوں سے اللہ کی یاد کر رہا ہوں۔ اس کے آثار وشواہد آپ کو اس وقت ملتے ہیں' جب آپ کو ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ تسبیح الٰہی کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے۔ یہ ایسا کام نہیں ہے' جو آپ کو عجیب وغریب کر دے۔ آپ دوسروں سے ممتاز یا متمیز ہو جائیں۔ بندے کا اللہ کو یاد کرنا ایک انتہائی قدرتی کام ہے۔

تسبیح کا نشان یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے' وہ ذاتی جائزے کے عمل میں چلا جاتا ہے۔ وہ کسی طاقت کے حصول میں نہیں جاتا۔ کسی قوت کی ہوس یا کسی طاقت کی نمائش کے لیے تسبیح نہیں کر رہا ہوتا' بلکہ خدا کو خدا کے لیے یاد کرتا ہے۔ جیسے پروردگار عالم نے فرمایا فاذکروا اللہ کذکرکم آباءکم اشد ذکرا مجھے ایسے ہی یاد کرو' جیسے آباؤ اجداد کو یاد کرتے ہو۔ بلکہ ذرا زیادہ سبح اسم ربک الاعلیٰ o سبح اسم ربک العظیم اپنے اللہ کو دل سے لگائے رکھو۔ وہ تمہیں دل سے لگائے رکھے گا۔ فاذکرونی اذکرکم واشکرولی ولاتکفرون تم مجھے یاد کرو' میں تمہیں یاد کروں گا۔

کتنی عجیب سی بات لگتی ہے کہ شاید ہمیں قرآن پر یقین نہیں ہے۔ جب اللہ کہہ رہا ہے' تم مجھے خالص میرے لیے یاد کرو' میں تمہیں یاد کروں گا' تو کیا آپ اللہ کی یاد کو انجوائے نہیں کرنا چاہیے؟ اعمالِ ظاہرہ کے بعد ان کی سب سے بڑی باطنی صلاحیت اللہ کو یاد کرنے میں ہے۔ اللہ سے محبت میں ہے۔ اللہ کو اپنی زندگی میں ہی ترجیح سمجھئے۔

تسبیح' اسلوب' اثر

دماغ میں اگر پہلے سے تصور کردہ خیالات قائم نہ ہوں' تو ذکر کسی قسم کی تکلیف کا باعث نہیں بنتا۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیئے کہ خدا کی یاد کسی قیمت پر کسی انسان کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں بنتی۔ البتہ جب ایک آدمی پہلے سے سنی ہوئی روایت کے ساتھ کسی چیز پر عمل کر رہا ہوتا ہے' تو اسے وہ خیالات تکلیف دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرے ایک دوست کو بڑی مجبوری تھی۔ میں نے اسے ایک ہزار مرتبہ صرف آیت کریمہ پڑھنے کو دی۔ حضرت چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد فون کیا اور بتایا کہ میرا تو کام ہو گیا۔ میں نے کہا' تسبیح نہ چھوڑنا۔ ضرورت میں تسبیح باعث ضرورت ہے اور ضرورت کے بغیر یہ باعث شکر ہے۔ اب تم شکر کرنا اور چھوڑنا نہیں۔

دو چار دن اور گذرے' تو حضرت واپس آئے اور کہا کہ میرا تو برا حال ہو گیا ہے۔ میں نے کہا' کیوں کیا ہوا؟ اے جی' میرا پیٹ پھٹنے کو آ گیا۔ بھئی وہ آیت کریمہ کا تمہارے پیٹ سے کیا تعلق؟ فرمایا کہ پھوپھی جان کہتی ہیں کہ آیت کریمہ بڑی جلالی ہوتی ہے۔ پانی میں بیٹھ کر پڑھنی چاہیے۔ چلو تم پانی میں نہیں بیٹھ سکتے ہو' تو ہر تسبیح کے ساتھ ایک گلاس پانی کا پی لیا کرو۔ جب یہ رویہ ہو گا' تو مسئلہ تو ہو گا۔

تسبیح اور احساسِ گناہ

کنفیوژن اس وقت پیدا ہوتا ہے' جیسے میں سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک آدمی نے کہا کہ آپ تسبیح بھی کر رہے ہیں اور سگریٹ بھی پی رہے ہیں؟ میں نے اس سے کہا کہ صحیح ہے کہ سگریٹ ایک بری عادت ہے۔ صحت کے لیے مضر ہے۔

Marfat.com

چھوڑنی بھی چاہیے۔ مگر اگر میں اسے مذہبی طور پر دیکھوں' تو اس پر کوئی خاص اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اس لیے میں اسے گناہ سمجھ کے نہیں پی رہا ہوں۔ میں نے اس سے کہا' تسبیح کیسی عادت ہے؟ کہتا ہے' اچھی عادت ہے۔ تو میں نے پوچھا' تمہارا کیا خیال ہے کہ بری کے لیے اچھی چھوڑ دوں؟

انسان کی ایک بڑی عجیب بات یہ ہے کہ وہ جب بری عادت کا شکار ہوتا ہے' تو وہ اچھی عادت کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ مایوسی کا ابلیسی نشان ہے۔ ابلیس کا مطلب ہے' مایوس۔ اگر میں نے ایک غلط کام کیا اور میں پروردگار سے مایوس نہیں ہوا' تو میں پھر بھی غلط کام کر سکتا ہوں اور پھر بھی اللہ کی رحمت سے امید کر سکتا ہوں۔ سو مجھے اللہ کی رحمت تسبیح الٰہیہ میں نظر آتی ہے۔

اللہ جہاں چاہتا ہے کہ میں غلط کام چھوڑ دوں' وہاں اس نے مجھ پر بہت بڑا اکرم کیا ہوا ہے کہ اس نے مجھے اپنی یاد کی توفیق بخشی ہوئی ہے۔ اگر میں اتنے بڑے کارِثواب کو چھوڑ دوں' تو میں کس قسم کا انسان ہوں؟ ایک تو گناہ کر کے میں بیوقوف ہوں' اوپر سے تسبیح چھوڑ کر میں جاہل مطلق عمر بن ہشام اور ابوجہل تو نہیں بن سکتا۔ اللہ قرآن حکیم میں یہ کہتا ہے کہ جب کوئی غلط کام کرو' تو اس کے بعد کوئی اچھا کام ضرور کرو' تا کہ میں تمہاری نیکیوں سے تمہارے گناہ صاف کر دوں۔

Marfat.com

تعویذ گنڈے اور احادیث

احادیث اور اصحاب رسولؐ سے ہمیں تعویذ کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مگر اس قسم کے تعویذات کی نہیں' جو آج کل رائج ہیں۔ بلکہ یہ کچھ آیات لکھی ہوتی تھیں۔ حضرت ابن عباس بچوں کو تعویذ ڈالا کرتے تھے۔ میرے نزدیک تعویذ صرف بچوں کے لیے جائز ہے اور وہ بھی قرآنی آیات یا اسمائے الٰہیہ' جو ہم لوگوں کو پڑھنے کے لیے دیتے ہیں۔ چونکہ بچے اتنے معصوم ہوتے ہیں اور ان کی زبان ڈیولپ نہیں ہوئی ہوتی' وہ تعویذ کی صورت میں ان کے گلوں میں ڈالے جاتے ہیں۔ جیسے رسول گرامیؐ کے زمانے میں اعوذ باللہ من شرِ ما خلق کا تعویذ ہر قسم کے آسیب کے دفع کے لیے ڈالا جاتا تھا۔

اسی طرح بچوں میں نظر بد کا دَم کیا جاتا تھا بسم اللہ اللھم الذھب حرھا بردھا و وصفھا پرانے زمانے میں جو عرب لوگ کچھ دَم پڑھا کرتے تھے' وہ پہلے سے رائج تھے۔ ایک دفعہ اصحابِ رسولؐ نے عرض کی' یارسولؐ اللہ ہمارے لوگ بچھو کے لیے پہلے سے ایک دَم پڑھتے ہیں بسم اللہ شحۃ قرنیۃ ملحۃ بحر تو کیا ہم پڑھ لیا کریں؟ پہلے بسم اللہ نہیں لگا کرتا تھا۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ یہ جنات کے معاہدوں میں سے ہے' پڑھ لیا کرو۔

اس سے ایک بات یہ واضح ہوتی ہے کہ مربعے اور ابجدی حروف' جو اس وقت رائج ہیں' وہ اس وقت نہیں تھے۔ ایک دفعہ اصحاب ایک جگہ سے گذرے۔ ایک قوم کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ ان میں سے کسی نے پوچھا کہ نئے دین والوں میں سے کوئی صاحب دَم کرنا یا جھاڑ کرنا جانتا ہے؟ ایک صحابی نے کہا کہ میں جھاڑ کر دیتا ہوں۔ انہوں نے جھاڑ کیا اور پڑھ پڑھ کے پھونکا۔ وہ آدمی درست ہو گیا۔ اس کے صلے میں انہوں نے صحابی کو بہت ساری بکریاں اور مال دیا۔ جب وہ مدینے پہنچے تو ساری بات رسولؐ اللہ کو سنائی۔ ان کو ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو' ہم نے حرام کمایا ہو۔ فرمایا کہ تم نے اس میں کیا پڑھا تھا؟ فرمایا یارسولؐ اللہ! مجھے سورہ فاتحہ یاد تھی' وہی میں پڑھ پڑھ کر دَم کرتا رہا اور وہ اچھا ہو گیا۔ فرمایا' تمہیں کیسے پتہ لگا کہ سورہ فاتحہ تمام امراض کی شفا ہے؟ پھر فرمایا' اس میں میرا بھی حصہ لگاؤ۔

اس کے علاوہ حضور گرامی مرتبتؐ اپنے ہاتھوں سے اپنی ذات پر دَم کیا کرتے تھے۔ وفات کے قریب بھی ام المومنین

Marfat.com

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا قول ہے کہ حضور مرتبتؐ معوذتین دَم کر کے اپنے جسم پر پھیرتے تھے۔ اس کے علاوہ حدیث میں ایک دافع آسیب آیات کا دم ہے۔ وہ بھی حضورؐ پڑھا کرتے تھے۔ ایک حدیث کے مطابق جسے جنون' سرسام یا مراق ہو جائے' اس کے لیے صبح و شام سات سات مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کرو۔ جب پڑھ چکو تو اپنی زبان سے لعاب لے کر اس کے سر پر لگا دو۔

احادیث میں مختلف کلمات مختلف امراض کے لیے موجود ہیں۔ رسول گرامی مرتبتؐ نے کسی چیز کا علاج کلمات عالیہ میں بتایا ہے' تو وہ یقیناً مؤثر ہے۔ جیسے سر درد ہے' تو اس کا دَم یہ ہے کہ تین مرتبہ بسم اللہ پڑھ کر اور سات مرتبہ اعوذ باللہ و قدرتہ من شر ما آجد و احاذر و کا دم ہے۔ اسی طرح کسی بھی پھوڑے پھنسی پر طریق دم یہ ہے کہ زمین پر انگشت شہادت لگا کر مٹی کے ساتھ یہ دم پڑھے بسم اللہ تربت اھنتا بریقۃ بعضنا یشفع سکیمنا باذن ربنا تو ان شاء اللہ کیسا بھی پھوڑا اور خرابی ہوگی' وہ درست ہوگی۔ ایک خاتون کے بیٹے کو السر تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج کر کے گھر بھیج دیا تھا۔ میں نے عام مٹی میں خاک پاک حرم ملا کر اسی طرح انگلی رکھ کے اس پر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کو بتایا کہ وہ بھی اس کو پڑھا کرے۔ پندرہ بیس دنوں کے بعد اتنا بڑا زخم روپے کے برابر رہ گیا۔ وہ کینسر تھا۔ بڑی حیرت ہوئی۔ ایک ہفتے بعد مجھے اس کے مرنے کی خبر آئی۔ میں نے پہلی بات یہ پوچھی کہ وہ مرا کیسے؟ پتہ چلا کہ وہ نمونیا سے مرا۔ میں ہنسا بھی اور رویا بھی کہ وہ اصل مرض اور تکلیف سے تندرست ہو رہا تھا۔ مگر خدا کو چونکہ موت منظور تھی' اسے وہ ایک اور مرض سے لے گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس ایک شخص دوڑتے ہوئے گذرا۔ آپؑ نے اسے آواز دی کہ اے فلاں بن فلاں تجھے کیا ہوا ہے؟ فرمایا' یا علیؑ! میں بے چین اور بے قرار ہوں۔ میرا بھائی سخت بیمار ہے۔ وہ بالکل مرنے کے قریب ہے۔ میں اس کی طرف بھاگ رہا ہوں۔ حضرت علیؑ نے کہا' کیا تو چاہتا نہیں ہے کہ وہ تندرست ہو جائے؟ اس نے کہا اے علیؑ! آپ مذاق کرتے ہیں۔ کیا میں یہ نہیں چاہوں گا؟ تو کہا' اس طرح کہو' یا حلیم یا کریم و آشف فلاں ابن فلاں۔ تو خدا موت کے سوا ہر مرض کی اس میں شفا دے گا۔ یقین جانئے' جس شخص کے لیے بھی میں نے اسے پڑھایا' یا اسے یہ پڑھنے کو دیا' تقریباً سو فیصد شفا کے آثار اس میں پائے۔ اسی طرح حضور گرامی مرتبتؐ نے کہا کہ جس نے بیماری میں آیت کریمہ 40 مرتبہ پڑھی لاالہ الا انت سبحانک انی کنت من الظلمین وہ شفا پائے گا اور اگر وہ شفا نہیں پائے گا اور اس کی وفات ہوگئی' تو سیدھا جنت میں جائے گا۔ سو بہت سے ایسے کلمات عالیہ موجود ہیں' خدا کے رسول کی جن کے پیچھے سند موجود ہے اور وہ اپنا اثر رکھتے ہیں۔

اب ذرا دوسری طرف آیئے وماانزل علی الملکۃ ببابل ھاروت و ماروت۔ ہاروت و ماروت کا چاہ بابل پر نزول بحیثیت ایک آزمائش کے تھا۔ بابل و نینوا کی تہذیب اس وقت نہایت ترقی پذیر تھی۔ وہ علم و حکمت پر بے شمار اثر رکھتے تھے۔ مگر ان کو غیر مرئی طاقتوں کی ہوس پیدا ہوگئی' جو ان کے بس میں نہیں تھی۔ ستاروں کا علم تہذیب بابل و نینوا کی ایک مثال ہے۔ حضرت جبرائیل امین نے ایک بہت بڑے ماہر سے پوچھا کہ کیا تو مجھے بتا سکتا ہے' جبرائیل کہاں ہے؟ اس نے فوراً حساب کتاب لگا کے کہا کہ وہ اس وقت آسمان میں نہ زمین میں ہے۔ اس

Marfat.com

وقت یا تو ہے یا میں ہوں اور میں نہیں ہوں' تو ہے۔

یہ مثال اس لیے مشہور ہے کہ سب سے پہلے سورج گرہن کا تعین بابل ونینوا کی تہذیب میں ہوا۔ اتنی ترقی یافتہ تہذیب میں لوگ ایک ناقص علم کی طرف بڑھے۔ خداوندکریم کہتے ہیں کہ ہاروت و ماروت ان سے پہلے عہد لیا کرتے تھے وما یعلمان من احد حتی یقول انما نحن فتنة فلا تکفر کہ تم سیکھنے تو آتے ہو' مگر ہم اس وقت تک نہیں سکھائیں گے' جب تک تمہیں یہ بتا نہ دیں کہ جو چیز تم سیکھ رہے ہو' یہ کفر ہے۔ ان میں تم دوسری اشیاء کو رب الارباب اور مالک القدوس کا درجہ دیتے ہو' یہ نہ سیکھو۔ اس میں تمہارا نقصان ہے۔ مگر وہ اصرار کرتے تھے کہ انہیں گنڈہ' تعویذ اور تعویذ حب وبغض سیکھنا ہیں۔ وہ کرتے کیا تھے فیتعلمون منهما مایفرقون بین المرو الزوجه ایسے تعویذ لکھنا اور گنڈے بنانا' جس میں میاں بیوی میں فرق ہو جائے۔ جیسے آج کل جگہ جگہ تعویذ حب' تعویذ بغض' عمل شیطانی اور رحمانی کے عمل جاری ہیں' وہ بھی کئی قسم کے بیشمار کام کیا کرتے تھے۔ اس پر خدا نے ایک مکمل ججمنٹ دی اور فرمایا ویتعلمون مایضرهم ولا ینفعهم تم ایسی بات کیوں سیکھتے ہو' جس کا ضرر ہے نہ کہ نفع۔

چنانچہ وہ کلمات عالیہ' جو پروردگار نے اپنے رسول کو سکھائے۔ جو انہوں نے اپنی اُمت کو تعلیم دیئے اور جن کی سند مستقل خدا اور رسول سے ہے' ان کا تو فائدہ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام چیزیں' جو ارتکاز توجہ اور طاقت کے حصول یا جنات کے عملیات سے پیدا ہوتی ہیں' ان سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا۔ یہ تمام چیزیں ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہیں۔

سحر کا یہ اصول ہے کہ یہ نظر اور دماغ پر اثر کرتا ہے۔ جب یہ دماغ پر اثر کرے گا' تو وہی خیال آپ کے ذہن میں بار بار پلٹے گا۔ Psychosis' Neurosis میں تقریباً یکساں قوانین ہیں۔ ان دونوں میں ایک جارحانہ خیال بار بار ورود کرتا ہے۔ علاجِ سائنس' ماہرین خودایمائی اور ماہرین جنات کا بالکل ایک سا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر حضرات کے مطابق اس طرح مریض کو مارنے کی کوشش کی جاتی ہے' لیکن حقیقت میں علاج کے پیچھے قوانین یکساں ہیں۔ جب کوئی عامل یا ساحر کسی بندے میں تعویذ یا جن کا اثر پائے اور وہ قدرتی نہیں ہوتا' تو وہ اس کو اتنا مارتے ہیں کہ اس میں حس بقا بیدار ہو جاتی ہے۔ زندگی کی خواہش مرض پر غالب آ جاتی ہے اور وہ بول اٹھتا ہے کہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میرا جن نکل گیا ہے۔

ہسٹیریا کے کیسوں میں میڈیکل طریق علاج میں انستھیٹک گیس اتنی مکروہ ہوتی ہے کہ اس کا ایک جھٹکا ہی حس بقا کو پیدا کر دیتا ہے۔ وہ گیس مریض کو اتنی مکروہ لگتی ہے کہ وہ فوراً مان لیتا ہے' میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ طریقہ علاج دونوں کا ایک جیسا ہے۔ وہاں مار پیٹ سے حس بقا کو ابھارا جاتا ہے۔ جبکہ الیکٹرک شاک میں خیال کے اعادے کو فور برین سے ہٹایا جاتا ہے۔ اس مسئلے میں جدید سائنسز نے پیش رفت کی ہے۔ وہ میڈیسن کے ذریعے نیند دے رہے ہیں' تو بھی اسی لیے کہ خیال کا اعادہ رُک جائے۔

مگر جنون کا یہ علاج نہیں ہے۔ یہ ریلیف اسے نہیں ملتا۔ اگر معمولی سی کیفیت ہو' تو شاید آدمی نارمل ہو جائے۔ مگر شیزوفرینیا اور اسی طرح کے دوسرے امراض کہیں بھی درست ہوتے دیکھے نہیں گئے۔ کسی بھی وقت دوبارہ عود کر سکتے

ہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ شخص اپنے خیالات کی بنیاد کو تبدیل کرے۔ فطرت کے نقائص کو بہتر بنائے اور یہ صرف اور صرف اللہ کی یاد میں ممکن ہے۔ تسبیحات الٰہیہ سے ہی وہ مرض دُور ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تسبیح میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ اس کو ابنارمل اور سب نارمل رجحانات سے دوبارہ نارمل حالت کو لاتی ہے۔

Occult پر ردِ عمل

علم نجوم، علم الاعداد، یوگا کے آرٹس، شامان ازم اور چلّے، وغیرہ جتنے علوم ہیں، ان سب کو ملا کے انہیں occult کہتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں اور غیر معمولی علوم کے مخازن Occult میں شریک ہیں۔ Occult کا ٹوٹل اصول اور اس کے حصول کے لوازم دین کے اصول کے خلاف ہیں۔ ان کا اصول دو چیزوں پر مبنی ہے۔ ایک تو یہ کہ تمام علوم اپنے نفس کی مطابقت میں اللہ کے خلاف حاصل کیے جاتے ہیں۔ یعنی اللہ کے پاس غیب ہے، تو آپ غیب کی صلاحیت پر قابو پانا چاہتے ہیں۔ آپ Gifted بھی نہیں ہیں نہ نبی یا رسول ہیں۔ اس لیے آپ چاہتے ہیں کہ آپ غیب کے پردوں میں جھانک سکیں اور خبر لا سکیں۔ وہ لوگ جو اس کو سیکھتے اور سنتے ہیں، ان پر ایک بہت بڑا نفسیاتی قانون لاگو ہوتا ہے اور اس قانون کو ہم Willing suspension of disbelief کہتے ہیں۔ از خود باہمی مفاہمت سے اپنی قوت واختیار کو معطل کر دینا۔ اپنی قوت اختیار اور اپنی تنقید کو جب آپ معطل کرتے ہیں، تو آپ کو Occult پر اعتبار آنا شروع ہو جاتا ہے۔

آپ ایک بس سٹاپ پر کھڑے ہیں اور بس لیٹ آئے، تو آپ کہتے ہیں، آج بس لیٹ ہے۔ اگر دوسرے دن بھی کھڑے ہوئے اور دوسرے دن بھی لیٹ آئے، تو آپ کہتے ہیں کہ آج بس پھر لیٹ آئی۔ اگر تیسرے دن کھڑے ہوئے۔ پھر لیٹ آئی، تو آپ کہتے ہیں، بس ہمیشہ لیٹ آتی ہے۔ حالانکہ باقی ستائیس دن بس وقت پر آئی مگر آپ تھے نہیں۔ تو سارے Occult یہی لاز ہے۔ قرآن حکیم میں انہیں خراس یعنی انکل پچو کہا گیا ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ ہاتھ یا آسمان دیکھنے والا کوئی آپ کو ایک بات بتاتا ہے۔ وہ آپ نوٹ نہیں کرتے۔ آپ کے کام کی نہیں ہے۔ دوسری بتائے گا، وہ بھی آپ کے کام کی نہیں ہے۔ تیسری بات آپ کے کام کی ہے۔ آپ کو اچھی لگی۔ آپ اسے نوٹ کر لیں گے۔ دو اور باتیں غلط نکلتی ہیں، پھر ایک بات کام کی آجاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ تیسری بات ترقی کی آپ نے ہر صورت قبول کرنی ہے۔ آپ نے کہا، ماہر فلکیات کا حساب بالکل ٹھیک ہے۔

تو اس کا بنیادی قانون ہے، دس میں سے تین۔ کیونکہ ناگوار باتیں آپ یاد نہیں رکھتے، خوشگوار باتیں بڑی خوشی سے یاد رکھتے ہیں۔ اس لیے تمام Occult کا قانون Willing suspension of disbelief ہے۔ اگر آپ میں نقادی کی بہت اعلیٰ سینس اور چیزوں کو جانچنے کی اچھی صلاحیت ہے، تو آپ کبھی بھی Occult پر مکمل اعتبار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ قرآن حکیم اسے خراس کہتا ہے۔ حدیث رسولؐ کے مطابق اگر کسی نے یہ کہا کہ اس کاہن کی کہانت یا اس نجومی کے نجوم کی وجہ سے بادل برسے اور بارش ہوئی، تو اس نے کفر کیا اور جس نے یہ کہا کہ اللہ کی وجہ سے سب کچھ ہوا، تو اس کا ایمان ٹھیک ہے۔ یہ

Marfat.com

لوگ صرف الکل پچو باتیں کرتے اور تکے لگاتے ہیں۔ ان کا حال ماڈل ٹیسٹ پیپر گیس ورک کا سا ہے۔ دو سوال آ گئے' تو انتہائی کامیاب' نہ آئے تو ٹھس۔

ذکر میں ارتکاز

ایسی کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ انڈونیشیا میں باپاک نام کا ایک سکول ہے' جو ارتکاز توجہ کا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے بقول اسے لاٹ خان کہتے ہیں۔ ان کا ارتکاز سب سے سادہ اور مؤثر ہے۔ وہ ارتکاز یہ ہے کہ بند کمرے میں بیٹھ کر وہ ہر قسم کے خیالات کو گذرنے دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ دو تین دنوں تک تمام شیطنیت اور تمام نیکیاں ان کے دماغوں سے گذرتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اصول کے طور پر منفیت کم ہونا شروع ہو جاتی ہے اور جو باقی بچتا ہے' وہ ایک بہتر خیال ہوتا ہے۔ مگر اس ارتکاز کے پیچھے خدا کی شناخت اور محبت نہیں ہوتی' نہ اسے خدا کی قبولیت حاصل ہے۔

تسبیح میں اونگھ کیوں

ایسا ضرور ہوتا ہے۔ اصل میں خداوند کریم کی طرف سے اس انسان پر امن اترتا ہے۔ جنگ اُحد میں جب مسلمان بڑے پریشان تھے اور ان کے دلوں پر شکست کا صدمہ تھا۔ رسولؐ اللہ بڑے گھبرائے ہوئے مسلمانوں کے بیچ میں پھنسے ہوئے تھے۔ دشمن خود حضور گرامی مرتبتؐ پر حملہ کر رہا تھا' تو اس وقت اللہ نے مسلمانوں کی مدد کرنے کے لیے ایک اونگھ بھیجی۔ اس کا بڑی وضاحت سے ذکر ہوا۔ اس اونگھ کے بارے میں حضرت عمرؓ کا یہ قول مبارک ہے کہ مجھے اتنی سخت نیند آئی کہ میرے ہاتھ سے تلوار گر گر جاتی تھی۔ مجھے اپنا آپ ہوش میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اللہ کی طرف سے اس میں سلام کی اونگھ ہے۔ یہ انسان کو اس کے نروس کی کمی میں رسد فراہم کرتی ہے۔ اگر آپ کو اس دوران اونگھ یا نیند آ جائے' تو کبھی بھی اس کے خلاف لڑنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ امناً نغاصاً ہے۔ یعنی امن کی اونگھ ہے' جو یقیناً آپ کے مفاد میں ہے۔ آپ کے خلاف نہیں ہے۔

وظائفِ حصولِ دُنیا

خدا کہتا ہے' اگر تم مجھے یاد رکھو' میری عبادت کرو' تو میں تم پر معیشت تنگ نہیں کرتا۔ اگر خدا کا یاد کرنا معیشت کی کشادگی کا باعث ہو سکتا ہے' تو ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے۔ پھر خدا کی دوسری حکمت عالیہ یہ ہے کہ کسی کو حیلے سے بلا رہا ہے' تو کسی کو زور سے بلا رہا ہے۔ کسی کو ڈرا کے تو کسی کو لالچ دے کر بلا رہا ہے۔ انسان کو ہر صورت مقصود پروردگار یہ ہے کہ وہ اس کی رحمت سے ہمکنار ہو۔ اللہ انسان پر اتنا مہربان ہے کہ وہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتا ہے۔ ہم جو سنت الٰہیہ کی پابندی کرتے ہیں' تو وہ اگر کسی معیشت کا لالچ دے کر خدا کی یاد کی طرف لگا دے' تو کیا عجب ہے؟

حروفِ مقطّعات کے اشکال

پروردگار نے ایک جگہ فرمایا ہے' متشابہات کے پیچھے مت پڑو کہ اس سے دل میں ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ فرمایا کہ تمہیں اس قسم کا اشکال وارد ہو جائے' تو ان لوگوں کے پاس جاؤ والرسخون فی العلم یقولون کل من عند ربنا جو علم میں راسخ ہیں اور ہر چیز اور علم کو حصول خداوندی کی طلب اور ذریعے سے حاصل کرتے ہیں اور خدا ہی کے لیے اس کو تقسیم کرتے ہیں راسخون فی العلم کے لیے ایسی کوئی تحقیق منع نہیں فرمائی۔ کسی علم یا چیز میں مہارت نہ ہو اور میں اس کی بنیاد سے بھی واقف نہ ہوں۔ اس کے باوجود میری انا مجھے یہ بتائے کہ میرا اس علم کا نہ جاننا اور انکار کرنا میرے لیے سبکی کا باعث ہوگا اور میں اس کے جاننے پر اصرار کروں' تو یہ جہالت کسی بھی انسان سے سرزد ہو سکتی ہے۔ اس لیے تجسس کو حدود میں رکھنا اور اپنے خیال اور تجسس کا مطالعہ کرنا سب سے بڑا ذہنی کارنامہ ہوتا ہے۔ جب تک آپ اپنے ذہنی افکار کا مطالعہ نہیں کرتے' آپ یہ جان نہیں سکتے کہ ہمارے بس میں کیا ہے؟

وہ ذہن بہت اچھا ذہن ہے' جو اپنی مدد خود مقرر کرتا ہے۔ حروف مقطعات کے لیے مجھے اپنی ریسرچ بتانی پڑے' تو اس میں ''میں'' کا صیغہ کثرت سے استعمال ہوگا۔ بہت عرصہ پہلے میں ایک دفعہ خدا سے گلہ گزار ہوا کہ اگر تمام قرآن ہمارے سمجھنے کے لیے نہیں تھا' تو پھر کاہے کو آپ نے تمام قرآن پڑھنے کی توفیق دی۔ کوئی آیات آپ بتا دیتے' تو ہم روز پڑھ لیا کرتے۔ مگر سارا قرآن اگر ہم نے ہی پڑھنا ہے' تو پھر سارے کو قابل فہم بھی ہونا چاہیے۔

دوسرا سوال میں نے اپنے اللہ سے یہ کیا کہ اگر نا قابل فہم رہ کر ہمارے تک اس کے معانی نہیں پہنچے اور آگے بھی نہیں پہنچے' تو مجھے نہیں سمجھ آتا کہ آپ نے حروفِ زائد کیوں قرآن حکیم میں استعمال کیے؟ اس ادھیڑبن میں ایک برس رہا کہ کوئی سراغ مجھے حروفِ مقطعات کا ملے۔ اتفاق سے ایک دفعہ لیوئی ماسینیوں کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا' جس کا حروفِ مقطعات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس میں اس نے ابن عربی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ایک فقرہ استعمال کیا کہ وہ بنیادی کیٹگریز کے علم کا ماہر تھا۔

یہ فقرہ سنتے ہی جیسے نیوٹن کو ایک جھٹکا لگا تھا' میرے ذہن میں بھی حروف کے بارے میں ایک بڑا باب کھل گیا۔

جب ان حروف کی بنیاد پر میں نے پورے حروف کو پرکھنا شروع کیا' تو رفتہ رفتہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ پوری کائنات بنیادی طور پر انہی چند حروف میں قید ہے اور صفات اور تعلقات کے لحاظ سے کوئی چیز بھی ان حروف سے غیریت کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ بہت سارے اصحاب اس کو کشف کہیں گے۔ مگر میں انسانی مطالعے میں اکتشاف سے زیادہ کشف کو بھی انسانی ذہن کی باریک بینی وسعت اور اس کا ترفع سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ کے رسولؐ کے لفظ سے بہتر کوئی لفظ نہیں کہ فراست اس کے لیے موزوں ترین لفظ ہے۔ جب ذہن اپنے اعلیٰ ارتقاء پر پہنچتا ہے' تو الہام و فراست ہم معانی ہو جاتے ہیں۔

تب سے میں نے اس علم کو کثرت سے استعمال کیا ہے مگر خدا کے لیے۔ جیسے الف لام میم ہے' اس کی وضاحت کروں گا۔ یہ ایک گروپ آف ریلیشن شپ ہے۔ خواہ وہ اشیاء میں یا انسانوں میں ہو۔ اس کے بعد ان کی اپنی اپنی کیٹیگریز متعین ہوتی ہیں۔ تفصیل میں جانے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں لاکھوں امکانات مراسم کے پیدا ہوتے ہیں۔ نارمل فنکشن کے لیے ہر انسان کی فطرت پر یہ اسماء حکومت کرتے ہیں۔ الف لام میم کی شناسائی اور ربط ہمیشہ سے مسلم رہا ہے۔ جن کے نام الف سے ہیں' وہ اپنے تعلقات کو پرکھیں گے' تو ان میں لام میم نمایاں نظر آئیں گے۔ اسی طرح لام والے جب اپنی دوستی اور محبت کے پرتولیں' تو ان میں بھی الف اور میم مظاہرہ کریں گے۔ مگر جب کوئی اسم آگے بڑھ کر دوسرے اسماء سے منسلک ہوتا ہے' تو رفتہ رفتہ بنیادی کیٹیگریز میں فرق پڑ جاتا ہے۔

اس طرح ایک شخص' جس کا کوئی بھی نام ہو' جب ہم اس کے اسماء کی بنیادی صفات پر جاتے ہیں' تو وہ انسان اسی طرح واضح ہوتا ہے' جیسے ابن عربی نے کہا تھا کہ میں ایک شخص پر تین مرتبہ نگاہ ڈالتا ہوں اور میثاق سے لے کر برزخ تک اس کے مقامات دیکھ لیتا ہوں۔ مگر اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سنا سکتا ہوں کہ ابن عربی نے ایک پیشگوئی کی تھی۔ ابن عربیؒ نے کہا کہ دخل سین فی الشین ظھرک محی الدین جب س ش میں داخل ہوگی' تو محی الدین کی قبر ظاہر ہوگی۔ بہت سارے لوگ اس کے بیان پر' جب وہ مر بھی گیا اور دفن بھی ہو گیا' بڑے پریشان ہوئے۔ مگر لوگوں کو یہ بات یاد تھی۔ اس کی قبر گم ہو گئی۔ کسی کو نہ ملتی تھی۔ لوگوں نے کوشش کی' حتیٰ کہ جب سلطان سلیم اوّل شام میں داخل ہوا' تو اس نے خاص طور پر حکم دیا کہ محی الدین کی قبر نمایاں کی جائے۔ انہوں نے ڈھونڈی۔ تب لوگوں کو سمجھ آیا کہ وہ کیا کہہ گیا تھا کہ دخل سین فی الشین ظھرک قبر محی الدین۔

حروف مقطعات کا علم

حروف مقطعات کے بارے میں پہلے سے کوئی ایسا اشارہ یا کنایہ موجود نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت کے بعد تاریخ اسلام میں صرف ایک ماہر اس کے گزرے ہیں۔ وہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی تھے۔ انہوں نے ''فتوحات مکیہ'' میں اس کی وضاحت کی ہے۔ ان سے پہلے اور اس کے بعد حروف مقطعات کا علم کسی اسکالر کے پاس کسی صورت میں موجود نہیں رہا۔ اگرچہ شیخ مجدد نے اس کے بارے میں دعویٰ کیا کہ مجھے حروف مقطعات عطا ہوئے ہیں' مگر اس علم کا مکتوبات شیخ مجدد یا کسی اور کتاب میں کوئی اظہار نہیں ہوا۔ وہ دعویٰ ناقابل تسلیم رہا۔ کچھ لوگوں نے اس کے بارے میں دعوے ضرور کیے ہیں' مگر جس دعوے کی پرکھ موجود نہ ہو یا جس دعوے کا مظاہرہ نہ ہو' اس کو تسلیم کرنے سے ہر سنجیدہ انسان کو تامل ہوتا ہے۔

ایک بات اکیڈیمیکلی صرف میرے حوالے ہی سے جانی جائے کہ اسی ادھیڑبن میں ایک دن میں نے اللہ سے عرض کی کہ لگتا ہے' سارا قرآن بندوں کے لیے نہیں ہے اور اگر سارا قرآن بندوں کے لیے نہ تھا' تو پھر آپ نے بندوں کو سارا قرآن پڑھنے کی زحمت کیوں دی؟ کوئی بارڈر لگا دیا ہوتا کہ بندے یہ پڑھیں' وہ نہ پڑھیں۔ اس لیے میں نے اللہ سے یہ خصوصی استدعا کی کہ حضور کی بارگاہ عنایت سے اس علم کا تھوڑا سا حصہ نصیب ہو۔

میری اس دُعا کے باوجود میں سننے' سمجھنے' پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن مجھے کوئی ایسا سراغ نہ ملا' جس سے میں مطمئن ہوتا کہ میں نے راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ لوئی ماسینیوں کی کتاب پڑھتے ہوئے اس کا ایک جملہ میری نظر میں آیا۔ وہ جملہ پوری طرح میرے ذہن میں اٹک گیا۔ شاید وہ بھی حکمت ربانی تھی۔ لوئی ماسینیوں نے کہا کہ It Seems that he knows some kind of knowledge of basic categories اب یہ لفظ اور جملہ Knowledge of basic categories نے مجھے سخت ضرب لگائی۔ مجھے خیال آیا کہ جب کائنات بنی ہوگی۔ خدا نے کلام کیا ہوگا اور انسان نے علم سیکھا ہوگا' تو اس کے پاس اتنا وسیع تر علم نہ تھا۔ جتنی بھی کائنات میں اسے چیزیں نظر آئی ہوں گی اور خیال اس کے ذہن میں آئے ہوں گے' ان کی اس نے ایک یا دو ہیڈز کے تحت گروپ بندی کی ہوگی۔ چونکہ تختی اسے پروردگار سے حروف مقطعات کی نصیب ہوئی' تو یہ چودہ حروف وہ کیٹیگریز ہیں' جن میں کائنات کی ہر چیز اور ان کی فطرت کا علم ضرور ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ ابتدائی طور پر اسے کیسے سیکھا جا سکتا ہے؟ جب میں نے ان پر زیادہ غور کرنا شروع کیا' تو ابتدا الف لام میم سے کی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ بنیادی کیٹیگریز ہیں' تو یہ بنیادی کیٹیگریز کے علاوہ گروپ بھی ہیں۔ یعنی الف لام میم ایک گروپ ہے۔ الف بنیادی کیٹیگری ہے۔ لام بنیادی کیٹیگری ہے' میم بنیادی کیٹیگری ہے۔ مگر یہ اکٹھے ہو کے ایک گروپ بناتے ہیں۔ جب میں نے گروپنگ کو دیکھا' تو باقی کے اسمائے مقطعات بھی گروپنگ میں نظر آئے۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ ان گروپوں کی قرابت داری کو چیک کروں۔ کیا یہ واقعی ہے کہ الف لام کی قرابت داری ہے' اور یہ قائم ہے اور کیا یہ واقعی صحیح ہے کہ یہ اسماء جب آپس میں ملتے ہیں' تو کچھ اسماء آپس میں متصادم اور کچھ آپس میں موافق ہو جاتے ہیں۔

میں ابھی اس ادھیڑبن میں پڑا ہی ہوا تھا کہ مجھے مسند اہل بیت کی ایک حدیث نظر آئی' جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے حضرت عمرؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مکالمہ درج تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کہا کہ ہم جو اچھے بھلے اللہ کے احکامات پر چلنے والے نیک لوگ ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارا دل کسی نیک کی بجائے کسی برے آدمی کی آشنائی کو جاتا ہے؟ ایک برے آدمی کو دل بھی کھینچتا ہے اور اس کی محبت بھی اچھی لگتی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہا کہ اے عمرؓ امیر المومنین! میں نے یہ سوال ایک دفعہ رسولؐ اللہ سے پوچھا تھا۔ کیونکہ میری بھی یہی کیفیت تھی کہ اچھے برے لگتے تھے اور برے اچھے لگتے تھے۔ میں نے حضور گرامیؐ سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ ہم نیکی کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ اس کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ مگر جب دوستی یاری کی بات ہے' تو کبھی برے آدمیوں سے آشنائی اچھی لگتی ہے۔ رسول گرامیؐ نے فرمایا کہ اللہ نے جب ارواح کے جنود پیدا کیے' تو اسی وقت کچھ کی کچھ سے محبتیں

ٹھہرا دیں اور کچھ کی کچھ سے نفرتیں ٹھہرا دیں۔ اب چاہو یا نہ چاہو، جب آپ زمین پر آئیں گے، تو وہی محبتیں ہوں گی، چاہے وہ اچھے ہوں، چاہے برے۔

چونکہ میں خود قرابت داری کے موضوع پر غور کر رہا تھا، مجھے ایک بڑی مضبوط سند مل گئی۔ میں نے وہ پورے پراسیس کرنے شروع کر دیئے۔ جیسے سولہ + سولہ = بتیس مہروں کی چالیس ایک ارب سے زیادہ ہیں، جب آپ ایک بنیادی حرف کی کیٹیگری ختم کر لیتے ہیں، تو اس کے جو کمبی نیشن شروع ہوتے ہیں، وہ بے پناہ مصیبت کا باعث بنتے ہیں۔ فرض کیجئے، اسم احمد ہی کو لیجیے۔ اب اسم احمد میں چار لفظ ہیں، جو علیحدہ علیحدہ حیثیت میں کمبائن ہو رہے ہیں۔ حا میم بیچ میں آ گئے۔ الف ادھر اور دال ادھر آ گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چاروں بڑے اور موثر لفظ ہیں۔ الف میں طاقت کا نشہ ہے۔ یہ لفظ ہر حال میں مغلوبیت کے خلاف ہے۔ وہ اختیارات کو اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا ہے، اس لیے بخیل ہے۔ الف کی بنیادی نشانی یہی ہے کہ یہ دو چیزوں کے لیے منضبط ہے۔ اختیارات اور بخل کے لیے۔ یہ آسانی سے دیتا نہیں اور آسانی سے چھوڑتا نہیں۔

آگے آ گئی ح۔ ح کو دیکھا، تو پتہ لگا کہ یہ تو پوری حیات ہے۔ ابتدائی حامیم یہ ہے وجعلنا من الماء کل شی حی اس میں حامیم کا تذکرہ ہوا ہے۔ ما کی میم اور ح حیات کی، یہ پہلی ح م تھی، جو اللہ نے پیدا کی۔ یعنی پانی سے حیات شروع کی۔

اب ان کی صفات کہ ما ساکن ہے۔ جبکہ ح حرکت والی ہے۔ جب دوسری حامیم پیدا کی، تو آپ دیکھیں گے کہ ہر وہ چیز، جو ما میں حرکت کرتی ہے، یہ دوسری لائف ہے۔ پہلی طرز زندگی میں ایک چیز پائی جاتی ہے، وہ حرکت اور اشتعال ہے۔ جس چیز میں ح یا خ ہوگی، اس میں یہ بنیادی صفت پائی جائے گی۔ کیونکہ وہ حیات ہے۔ اسے چین نہیں آ سکتا۔ اپنے اندر بہترین ڈسپلن کے ساتھ وہ اسے متحرک رکھے گی۔

آگے میم آ گیا۔ میم متفکر ہے۔ میم بھی دو ہیں۔ بعض اوقات یہ رنگ میں چلا جاتا ہے۔ ایک میم ماء البحر ہے۔ ایک مام ماء دریا ہے۔ صاف ستھرا پانی اچھلتا ہوا، جمپ کرتا زندگی کو سیراب کرتا اور آنکھوں کو بھلا لگتا ہوا۔ یہ صاف رنگ والی میم ہے۔ دوسری ما جسے ماء البحر کہتے ہیں، سمندر کی میم ہے۔ یہ تاریک، متفکر، وسیع، انتہائی گہری آسائشوں کا مرکز، بہت گہرے پردوں کے اندر اور اس میں بے پناہ وسعتیں چھپی ہوئی ہیں۔ جب آپ میم کا رنگ سانولا اور اس میں رنگ پائیں گے، تو وہ حرکت ہوگی۔ ایک میم باہر کی طرف اور دوسری اندر کی طرف رجوع رکھتی ہے۔

اب دو انتہائی مشتعل لفظوں الف اور ح میں موجود تیسری میم ہے، وہ رنگ پر جائے گی۔ اگر میم کا رنگ گندمی ہے، یا سیاہ ہے، تو یہ دبی ہوئی ہوگی۔ دبا ہوا اثر پہلے دو مشتعل اثرات کو کنٹرول کرتا ہے۔ آگے آ گئی دال، جو سستی، وجود کے بھارے پن، حضرت داؤد کی اور بے پناہ تقوے اور شدت غضب کی ہے۔ اب ان تینوں چیزوں میں الف کنٹرول کر رہا ہے۔ ح کنٹرول کر رہی ہے۔ میم دبی ہوئی ہے۔ دال دوبارہ غصہ دلاتی ہے۔ تو یہ نام احمد انتہا درجے کی کارکردگی کو جائے گا۔ مگر کارکردگی کے ساتھ ایک انتہا درجے کی غصے کی حساسیت کی وجہ سے تلخی و بے چینی کا شکار ہوگا۔ محقق ہوگا، مگر بیمار ہوگا۔

اگر آپ کے نام ان میں سے ہیں، تو آپ اپنی فطرت کو بڑی آسانی سے جان سکتے ہیں۔ یہ جو تمام

Marfat.com

خصائص میں نے بیان کیے ہیں' ان میں کوئی گیس ورک نہیں۔ غلطی کا کوئی چانس نہیں۔ غلطی صرف استاد کرتا ہے۔ علم نہیں کرتا۔

کلوننگ کی سائنسی تشریح

(ڈاکٹر عبدالجلیل خواجہ) کلوننگ کے بارے میں ایک پہلو یہ ہے کہ بچے کی تیاری مادر رحم سے باہر بھی کی جا سکتی ہے۔ جنیٹک کے اعتبار سے انڈہ (egg) مادہ تولید (sperm) مل کر تقسیم ہوتے ہیں اور انسان کی باڈی ڈیولپ ہوتی ہے۔ ابتدائی مراحل کو ایمبریو کا مرحلہ کہتے ہیں۔ کلوننگ ایک ایسا فنامنا ہے' جس میں مادہ تولید شامل نہیں کیا گیا۔ جو تجربہ ابھی کیا گیا ہے اور ریکارڈ ہوا ہے' وہ سویڈن کے سائنسدان ہیں۔ انہوں نے بکری کے جسم کا ایک سیل لیا۔ یہ انڈہ نہیں تھا۔ انہوں نے اسے کمزور کر کے اور ڈیولپ کیے بغیر نیند میں ڈال دیا۔ یعنی ایک قسم کی وقتی موت میں ڈال دیا گیا۔ یہ سیل نیند میں جا کے غیر متحرک ہو جاتا ہے۔ اس کا ڈی این اے' جو سارے جسم کا پیغام اور کوڈ لیتا ہے' متحرک نہیں رہا۔ بیضہ دانی میں سے انہوں نے انڈہ نکالا اور اس میں سے ڈی این اے نکال لیا۔ ڈی این اے جنیٹک آرڈر ہے' جس کے ذریعے بات طے پاتی ہے کہ بکری کے پیدا ہونے پر اس کے بال کیسے ہوں گے۔ آنکھیں کیسی ہوں گی وغیرہ۔ ڈی این اے نکال کر باقی مواد اپنی جگہ رہا۔

تیسری صورت میں انہوں نے پہلا سیل' جو انہوں نے سلایا ہوا تھا اور انڈہ' جس میں سے ڈی این اے نکالا گیا تھا' دونوں کو اکٹھا رکھ کے انہیں الیکٹرک چارج دیا۔ اس سے یہ دونوں سیل آپس میں مل گئے۔ پہلے والا انڈہ' جس میں سے ڈی این اے نکال لیا گیا تھا' اور دوسرے والے سیل کے آنے سے اس کا نیوکلیئس' جو ڈویژن میں تھا' اس نے شیئر کرنا شروع کر دیا۔ ایک دو اور الیکٹرک شاکس کے بعد ان سیلوں نے اپنے آپ کو ری پروڈیوس کرنا شروع کر دیا۔ یہ ایک بڑی بات ہے' جو سائنسدانوں نے کی تھی۔ قدرتی طور پر اللہ نے ان میں ایسی تقسیم رکھی ہے کہ جب یہ آپس میں ملیں گے' تو یہ تقسیم ہونا شروع ہو جائیں گے۔ اگر یہی فنامنا سوائے انڈے اور مادہ تولید کے ہمارے جسم کے کسی اور حصے میں ہو' تو وہ کینسر کی طرح ڈیولپ ہونا شروع ہو جائے گا۔

اب کلوننگ ایک ایسا معاملہ ہے' جس میں بغیر مادہ تولید کو لیے آپ نے کسی بھی انسان کے جسم کا کوئی بھی سیل لیں۔ اس کو ایک انڈے کے ساتھ ملایا۔ انڈے کا ڈی این اے اس میں موجود نہیں تھا اور آپ نے اس سے ایک ایمبریو پیدا کر لیا۔ یہ ایمبریو آہستہ آہستہ ڈیولپ ہو کے انسان یا جانور کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ انڈہ اور مادہ تولید دونوں آپس میں ملتے اور دونوں کے جنیٹک آرڈر یا ڈی این اے آپس میں ملتے' تو ایک تیسری شکل پیدا ہوتی۔ جیسے بچے ماں باپ کی طرح کے ہوتے ہیں۔ بہت سی خصوصیات' بہت سی شکلیں' آنکھیں' ناک اور بال ویسے ملتے ہیں۔ اب ڈی این اے اس خاص صورت میں صرف ایک سیل کا ہے۔ جو چیز تیار ہو گی' وہ بالکل اس کی کاپی ہو گی۔ وہ ویسی ہی ہو گی جیسا کہ اس کا دینے والا ہے۔

دوسری اہم بات جو سائنسدانوں نے حاصل کی ہے' وہ ایمبریو کو تیار کرنے کا ہے۔ ایمبریو انتہائی شروع کی بچے کی شکل ہے۔ یہ بہت بڑی سائنسی ایجاد ہے۔ پہلی ایجاد کہ ایک ہی ڈی این اے کو ایمبریو میں ڈالا گیا اور دوسری ایجاد کہ

Marfat.com

مادۂ تولید کی غیر حاضری میں کسی بھی انسانی جسم کے حصے کے سیل کو لے کر اس انسان کی نقل بنائی جا سکتی ہے۔ مثلاً اگر کسی انسان کا ایک بال کاٹ لیا جائے' یا اس کی جلد کھرچ لی جائے۔ پھر اس کا ایک سیل لے لیا جائے اور اس کو انڈے سے ملا دیا جائے' تو ایمبریو کا ایک پورا پراسیس شروع کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے تک یہ ممکن نہیں تھا۔ یہی کلوننگ ہے۔

میکڈوگل کو جواب

پروفیسر میگڈوگل کی باتوں کے جواب میں اقبالؒ نے لکھا کہ اگر محمد رسولؐ اللہ Psychopath تھے' تو پروفیسر صاحب ایسے Psychopath تو بار بار پیدا ہونے چاہئیں۔ دوسری بات انہوں نے یہ لکھی کہ تم اس بات پر حیران ہوتے ہو کہ وحی کیسے اُترتی ہے؟ میں ایک معمولی سا بندہ ہوں۔ وحی کا تو پتہ نہیں' مگر ایک ایک نشست میں بغیر سوچے سمجھے مجھ پر تین تین چار چار سو شعر اترتے ہیں۔ یوں مجھے پتہ ہے کہ وحی کیسے اُترتی ہے۔ اس طرح کے بہت سارے اعتراضات رسولؐ اللہ کی حالت پر ہوئے۔

مگر تکنیکی جواب اس کا یہ ہے کہ کوئی Psychopath دنیا میں کسی کو اصول نہیں دیتا۔ Psychopath کی نظر صدیوں پر محیط نہیں ہوتی۔ ہمارے پاس کسی بھی Psychopath کے اتنے بڑے نتائج موجود نہیں ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے کوئی بھی Psychopath اپنی اصل یا اپنے ایریا سے باہر کی کوئی خبر نہیں دے سکتا نہ اس کے پاس قیامت تک کی خبریں یا کوئی اصول موجود ہے۔

اہل مغرب کا اپنا تمام تر عقیدہ غیر منطقی ہے۔ اس لیے کہ ان کا عقیدہ اوّل و آخر معجزہ پر مبنی ہے۔ اس میں کسی قسم کی پریکٹیکل چیز شامل نہیں ہو سکتی۔ حضرت عیسیٰ پر اعتبار یا ان کے معجزات پر یقین کرنے کے لیے آپ کو کوئی دوسری قسم کی عقل چاہیے۔ ہم تو اس لیے اعتبار کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے حضرت عیسیٰ کی خبر ہے۔ مگر آپ ایک جدید مغربی آدمی سے پوچھیں کہ کیا تم اس کی پیدائش پر یقین رکھتے ہو؟ کیا ان سب واقعات' جیسے مردے کو زندہ کرنے اور برص کو اچھا کرنے پر یقین رکھتے ہو؟ وہ بڑی مشکل میں پڑ جائے گا۔ انہیں عقل و دانش کی سطح پر ان چیزوں میں یقین دلانے کے لیے ایک بالکل مختلف ڈائمنشن کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اس لیے وہ آج کے ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کے دور میں اپنے مذہب کی بنیادی اساس سے بہت دُور ہے۔

ایک انسان کی طرح تو عیسیٰ ابھی بھی زندہ ہیں' لیکن وہ ایک پریکٹیکل فلاسفر کے طور پر زندہ نہیں۔ یہ ایک بڑی ٹریجڈی ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا' اس کا منطقی جواز نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں کے سوا حضرت عیسیٰ کے کاموں یا ان کی علامات کی کوئی وضاحت عیسائیت یا بائبل کے پاس نہیں ہے۔ ہم ہی ان کے گواہ ہیں۔ اسی لیے اللہ نے کہا اُمة وسطا لتکونو شھدا علی الناس کہ ہم ہی وہ اُمت وسط ہیں' جو پہلوں پر بھی گواہی دیں گے اور بعد والوں پر بھی گواہی دیں گے۔

عرب کلچر کا انتخاب

ہم عرب کلچر کا انتخاب کیوں کریں؟ ہم اس ملک کے شہری ہیں۔ میں ان افراد میں سے ایک ہوں گا' جو کسی

Marfat.com

عرب کلچر کو پسند کرے۔ تاہم کسی بین الاقوامی شخصیت کی عادات کے ساتھ یکسانیت اس کے کلچر کے ساتھ یکسانیت نہیں۔ اگر ہم محمد رسولؐ اللہ کے ساتھ اپنی شناخت ظاہر کر رہے ہیں' تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ عرب تھے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محمد رسولؐ اللہ تھے۔ آج کے دَور میں میرے دل میں سعودی عرب کے بارے میں انقباض ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے قبائلی کلچر کو اسلام کے ساتھ ضم کر کے اس کو مسخ شدہ اسلامی صورت دی ہے۔ عرب کلچر کے ساتھ ہماری کوئی شناخت نہیں۔ مگر محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ نے اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا کہ یہ عرب نہ عجم کے ہیں۔ ایک گروہ کے لیے مخصوص ہیں نہ دوسرے کے لیے وما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین۔

تخلیق کار پر اعتراض

جب آپ تخلیق کار سے اس کا مقصد دریافت کرتے ہیں' تو آپ کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی تخلیق کبھی اپنے تخلیق کار سے اپنی تخلیق کے بارے میں سوال کرنے کی اہل نہیں رہی۔ ضرور بتائیے کہ آپ کسی بھی اپنی تخلیق کو حق دیتے ہیں کہ وہ آپ کو سوال کرے؟ اگر خالق کو آج تک کسی بھی تصویر نے یہ نہیں کہا کہ تو نے مجھے مونا لیزا بنایا ہے' تو اچھا بنایا ہے۔ مجھے وان گو کی ایک دشت کی تصویر بنایا ہے' تو کیوں بنایا ہے؟ آج تک کسی شاعر کو اس کی بگڑی غزل نے کوسا نہیں ہے کہ تو نے اتنے برے شعر میرے بارے میں کیوں لکھے ہیں؟ یہ ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔

سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم ناقص معلومات رکھتے ہیں اور کم علم والے کو جب کسی بڑے سوال سے واسطہ پڑتا ہے' تو ہمارے اندر ایک شیزوفرینک گلٹ پیدا ہوتا ہے۔ ہم ضدی ہیں۔ ہم سوال کو ہر قیمت پر حل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہمارے پاس اس کی انفارمیشن اور اس کا ڈیٹا نہیں ہوتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ذہن جب بڑی بات اور بڑے خیالات کو ہاتھ ڈالتا ہے' تو ہمارا مسئلہ قدرتی حد سے باہر نکل جاتا ہے۔

کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے شوق و تجسس کا مدعا خدا ہو' تو ہم تھوڑا سا انتظار کر کے مزید غور و فکر اور مطالعے کے ساتھ وقت گذاریں۔ کسی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ خدا تو نظر نہیں آتا۔ میں کہتا ہوں کہ ہوا بھی نظر نہیں آتی۔ کیا وہ محسوس نہیں ہوتی؟ اس کے تیز چلنے کا اور نام نہیں؟ کیا اس کی سست روی کا کوئی اور نام نہیں؟ کیا آندھی اور طوفان کا ہمارے پاس نام نہیں؟ اس کی ہر کیفیت کا ہمارے پاس نام ہے۔ تصوف خدا کو شاید بصارت سے نہیں دیکھتا' مگر اس کی بصیرت میں عام آثار موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے حدیث رسول ہے کہ فراست مومن سے ڈرو۔ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

تخلیق کو خالق پر اعتراض کا کوئی حق تو نہیں ہے' مگر پھر بھی ہم اللہ میاں سے پوچھتے ہی رہتے ہیں۔ ہماری زبانوں پر ہزار گلے ہیں۔ اللہ میاں توں سانوں پیدا ای کیوں کیتا سی۔ کسی شاعر نے کہا

مرا را کاش کہ مادر نہ زادے

اے کاش! مجھے ماں نے نہ جنا ہوتا اور میں حساب و کتاب کے دوران سے نہ گذرتا۔ جب ہم اللہ سے یہ کہیں کہ اے اللہ میاں! تو نے ہم سے بڑی زیادتی کی۔ اچھے بھلے عدم میں تھے۔ ہم تجھے جانتے تھے نہ تو ہمیں جانتا تھا۔ تو نے عدم سے وجود میں لا کر کیوں ہمیں خوار کیا؟ سچی بات ہے کہ ہمارا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ عدم سے وجود میں لانے کا صلہ اللہ

Marfat.com

نے انسان کو تمام گناہوں کی معافی کی صورت میں دیا ہے و کتب علی نفسه الرحمة ہر حال میں رحم کرنے کا وعدہ فرمایا۔ صرف ایک ہی دلیل اس کی مخلوق کے پاس تھی کہ یا اللہ! باقی کاموں کی تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں' مگر تو عدم سے ہمیں وجود میں کیوں لایا؟ آخر کیوں پیدا کیا' اللہ میاں نے کہا' ٹھیک ہے یار! ایک کام میں کر ہی بیٹھا ہوں' لیکن اس کے عوض میں نے تمہیں اتنی آسائشات' اس قدر آزادی' اتنا کرم اور اتنی نوازش بخش دی ہے کہ اگر تم ایک دفعہ لا الہ الا اللہ کہہ دو' تو تم پر دوزخ کی آگ حرام کر دی جائے گی۔ دیکھیں یہ کتنا بڑا فائدہ ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے گناوں کا بڑا خوف ہے۔ میں ڈرتا ہوں۔ میں بڑا پریشان ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے کہا قل یعادی الذین اسرفوا علی انفسھم ان سے کہہ دو' میرے بندو! تم نے بڑے گناہ کیے لاتقنطو من رحمة اللہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ کیوں نہ ہو؟ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا بیشک تمہارا اللہ تمام گناہ معاف کرتا ہے۔ اس کے باوجود آپ اللہ خالق کو زیادتی کرنے والا کہیں' تو بڑی مایوس کن حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

مگر پھر بھی ہم پوچھتے ہیں کہ اے اللہ تو نے کیوں ایسا کیا؟ کہتا ہے' بات سنو! تم دس پندرہ روبوٹس بنا لو اور پھر ان سب میں ایک ٹیپ چڑھا دو۔ وہ صبح و شام کہیں' میرا مالک بہت اچھا ہے' میرا مالک بہت اچھا ہے۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! ذرا میری جگہ بیٹھ کے دیکھو کہ پندرہ سولہ ٹیپیں چل رہی ہوں اور ان سب میں سے ایک آواز نکل رہی ہو' پروفیسر صاحب بہت اچھے! پروفیسر صاحب بہت اچھے! تو مجھ سے بڑا بے وقوف کون ہوگا۔ میں تو چاہتا تھا کہ میری تعریف سوچنے سمجھنے والے کریں۔ میں ان کو چوائس دوں۔ وہ اپنی عقل استعمال کریں۔ وہ میرے حق میں سوچیں۔ وہ میرے خلاف سوچیں۔ ان کو مکمل آزادی دوں انا ھدینه السبیل اما شاکراً و اما کفوراً میں نے تمہیں عقل و شعور اس لیے بخشا کہ چاہے تو انکار کرو' چاہے تو مانو۔ جب وہ لبرٹی دے گا' اس کی آرزو ہے کہ تم اس کی تعریف کرو۔ گویا اللہ نے مخلوق کو اپنے تعارف کے لیے پیدا کیا۔

سورہ بقرہ کی آیات

میں وہ آیتیں آپ کو سنا دوں ان الذین امنو والذین ھادوو النصری والصبِین من امن باللہ والیوم الاخر و عمل صالحا اصل میں یہ جملہ بتاتا ہے کہ اس سے پہلے جو تو میں اللہ پر ایمان لے آئیں۔ یعنی مسلمانوں کا ذکر پہلے ہے' کیونکہ یہ موجود اور حاضر ہیں اور اس کے بعد باقی اقوام کا ذکر ہے' جو ان سے پہلے گزر گئیں۔ صابئین' یہود و نصاریٰ۔ خدا وہاں یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہے کہ ان مومنین میں اب جو ایمان لائے ہیں اور ان قوموں کے ایمان لانے والوں میں' جو اس سے پہلے ایمان لے آئے ہیں' اگر انہوں نے اچھا ایمان رکھا ہے' تو خدا ان کو معاف کر دے گا۔ جملہ خود بتاتا ہے کہ اگلا حصہ ماضی پر قابل نفاذ ہے اور یہ حصہ موجود پر قابل نفاذ ہے۔

دانش گاہ مذہب و سائنس

میں اکثر سوچتا تھا کہ مسجد کے حوالے سے تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ نماز کی جگہ ہے۔ میں مسجد کو ہمیشہ علم کی

Marfat.com

جگہ سمجھتا چلا آیا ہوں۔ اسی طرح انکوائری یا تجسس کو کسی بھی انسان سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ میرے ذہن میں ہمیشہ ایک ایسی درسگاہ کا تصور رہا، جس میں لوگ اپنے شکوک وشبہات اور خیالات کو بڑی بہادری اور دلیری سے بغیر کسی غم وغصے اور کسی اندیشے کے بیان کریں۔ وہ لوگ، جو مذہب اور علم و دانش کے ماہر ہوں۔ وہ ایک آدمی نہ ہو، بلکہ بہت سے ایسے ماہرین ہوں، وہ سوالات کا جواب دیں۔ اُمت مسلمہ کے علم کی کمی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی فکسڈ اینٹوں کی مسجدوں میں مقید ہیں۔ اگر ہم وسیع البنیاد ماحول پیدا کرسکیں، جس میں شاید انگلینڈ کے ہائیڈ پارک کی طرز موجود ہو اور ہمارے اپنے اہرام مساجد بھی موجود ہوں، تو پھر ہم ایک نئی اور تازہ انکوائری کی بنیاد رکھ سکتے ہیں اور علم میں اصول کو منقطع کیے بغیر ہماری ذہنی ایڈجسٹمنٹ ہوسکتی ہے۔

اس کے لیے میرے تصور میں یہ تھا کہ ہم اعلیٰ ترین علوم کی ایک یونیورسٹی قائم کریں، جس کا نام اسکول آف ریلیجن اینڈ سائنسز ہو اور ان علوم کی وجہ سے جو سوالات ذہن انسان یا مسلمان کو شک وشبہ کی طرف لے کر آتے ہوں، ان کا تجزیہ اعلیٰ ترین فلسفیانہ سطح پر کریں اور دلائل کے ساتھ ہم ان شکوک وشبہات کو رفع کریں، تاکہ اُمت مسلمہ اپنے دینی میٹافزکس کو حقیر سمجھنا چھوڑ دے۔

اکثر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ مسلمان کسی سوال یا جواب میں شدت پسند ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے پاس جواب ہونا نہیں ہے۔ وہ انکوائری کا سامنا نہیں کرسکتا۔ چونکہ یہ انکوائری، ابلاغ اور انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ ایک ایسا تیزی سے پھیلتا ہوا آسیب ہے، جو گھر گھر کمپیوٹر اور اطلاعات کے میڈیا کے ذریعے پھیل رہا ہے، تو آپ کسی بچے یا بڑے کو غیر آگاہ نہیں رکھ سکتے۔ خاص طور پر آزادانہ آراء، انتخاب اور سوالات مغرب سے آرہے ہیں اور آپ بھی دل سے چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے جدید رہیں۔

مجھے سمجھ نہیں آتی، آج کل جس قسم کے پیٹرن آف ریلیجن بن رہے ہیں، ہم ان کو مسلمان کہیں یا کیا کہیں؟ اگر ان کے پاس جنگ وجدل کی وجہ نہ ہو، تو ان میں سے اکثر بچے میٹرک میں فیل ہوجائیں یا ایف اے کوالیفائی نہ کرسکیں۔ یہ اپنے تعلیمی میدانوں کے بھگوڑے اگر جہاد کو جائیں گے، تو اس جہاد کی کیا قدر ہوگی؟ یہ تو میری بھی خواہش ہے۔ مگر میں مقدر پرست ہوں اور میں آج آپ کے سامنے یہ تصور ضرور دے دیتا ہوں کہ ہم ایک یونیورسٹی یا ادارہ قائم کرنے کی پوری کوشش کررہے ہیں۔ دُعا کریں کہ اگلی مرتبہ ہم ایسے ہی مقام پر علم کا ابلاغ کریں، جہاں کشادگی بھی ہو۔ جگہ بھی ہو اور جہاں ایک مستقل حیثیت بھی نصیب ہو۔ باقی نقشہ ہمارے ذہن میں بن چکا ہے۔ صرف مال ہمارے پاس نہیں ہے۔

Marfat.com

رجوع کس سے

میں کہاں جاؤں؟ آپ کہاں جائیں؟ متصادم' متبادل' متخالف سکولوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے' ان کانٹے دار جھاڑیوں سے کون دامن بچائے' جہاں چھوٹے چھوٹے اکٹھ بنے ہوئے ہیں۔ جو سوال آپ نے مجھ سے کیا ہے' آپ کو اپنے آپ سے کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ اگر آپ تھوڑی سی جدوجہد' تھوڑا سا مطالعہ اور خیال اور تھوڑی سی کوشش خدا اور رسولؐ کے بارے میں ذاتی میراث علم کی حیثیت سے کریں' تو ان شاء اللہ العزیز جن لوگوں سے آپ کی زندگی عذاب اور کوفت میں ہے' ان سے بہت بہتر جان لیں گے اور بہت اچھے استاد بن کر نکلیں گے۔ اگر آپ کے دل میں اللہ کے لیے اخلاص اور طلب ہے۔ شیطان کے اس جواب میں ہے کہ میں تیرے بندوں کو بہکاؤں گا۔ آگے سے' پیچھے سے' دائیں اور بائیں سے اور میں انہیں اغوا کروں گا' تو خدا نے کہا کہ ہاں الا عباد اللہ المخلصین مگر جن لوگوں کو میرے ساتھ اخلاص ہے' ان کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

بنیادی اپروچ آپ کے پاس ہے۔ تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ خدا نے کہہ رکھا ہے کہ کسی مسئلے میں شبہہ پڑ جائے' زیغ فی قلوبھم ہر مولوی ملا یا ہر استاد کے پاس نہ جایئے گا۔ بلکہ والرسخون فی العلم یقولون کل من عند ربنا صرف ان لوگوں کے پاس جایئے' جو علم میں راسخ ہیں۔ جو ہر چیز کو اللہ کی طرف سے سمجھتے ہیں۔ جو علم کو خدا کی تخصیص سمجھتے ہیں اور روزانہ اللہ کے سامنے اس لیے سربسجود ہوتے ہیں کہ ربّ زدنی علما یہ بات پروردگار نے اپنے پیغمبر کو بھی ارشاد فرمائی۔

رسالت گرامی مآبؐ کا کوئی پہلو ایسا نہیں' جو چھپا ہوا ہو۔ ایک لاکھ 36 ہزار احادیث میں سے تکرار کو نکال دیں' تو بخاری میں چار ہزار آٹھ سو کے قریب ہیں۔ مسلم میں بارہ سے چودہ ہزار اور سنن ابی داؤد میں آٹھ ہزار کے قریب احادیث ملتی ہیں۔ یہ تمام احادیث افعالِ رسولؐ، اعمالِ رسولؐ اور کلماتِ رسولؐ ہیں۔ کسی بھی معاملے میں جب بھی ہمیں کوئی پیچیدگی آ جائے اور ہمیں ذاتی محنت کی عادت ہو' تو ہم اپنے خلوص و محنت سے خدا کے رسولؐ کی تائید اور محبت حاصل کر سکتے ہیں۔ رسولِ کائناتؐ ہمارے لیے بہترین نمونۂ اعتدال زندگی ہیں۔ حضورؐ نے خود فرمایا کہ اعتدال اختیار کرو اور اگر

Marfat.com

مکمل اعتدال نہ ہو سکے' تو کم از کم اس کے قریب ترین رہو۔ جو چیز ہم دوسروں کو دینا چاہتے ہیں' آپ کی اس سے اپنی جان بھی بچ سکتی ہے۔ یہ آپ کو خود کرنا ہوگا۔

زندگی میں تشنگی

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انسانی زندگی میں اتنی تشنگی کیوں ہے' مگر یہ ہے کہ انسانی زندگی میں اتنی تسکین کیوں ہو۔ ایک ایسے مقام اور ایک ایسی زندگی میں' جس کو لمحاتی' وقتی' قلیل' لہو ولعب اور معمولی قرار دیا گیا ہو' اس میں اطمینان کی طلب کیوں ہو؟ قرآن کہتا ہے وما الحیوۃ الدنیا الاقلیلاً وما الحیوۃ الدنیا الالھو ولعب اور قرآن ہی کا کہنا ہے کہ وما الحیوۃ الدنیا الاغرور کہ حیات دینا سوائے فریب تصور کے اور کچھ بھی نہیں۔ ایک مختصر سا انتہائی قلیل وقفۂ حیات ہے۔

پروردگار نے جب انسان کو زمین پر بھیجا' تو لگتا ہے' بادل نخواستہ بھیجا۔ جنت سے نکال کر ایک بات اسے کہی ولکم فی الارض مستقراً ومتاع الی حین کہ اس زمین پر آپ کا تھوڑا سا فائدہ ہے' جہاں ہم آپ کو بھیج رہے ہیں۔ تھوڑے سے فائدے' ٹیسٹ اور تھوڑی سی آزمائشوں کے لیے تم وہاں جا کے دل لگا نہ بیٹھنا۔ اسی لیے رسولؐ اللہ نے فرمایا الدنیا سجن المومن کہ دنیا مومن کا قید خانہ ہے۔ سو اس میں تشنگی کا احساس تو ہوتا ہے۔ جب انسان تکمیل آرزو کے مراحل تک پہنچتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس قابل ہوا ہے کہ اپنی تمام زندگی کی محنت شاقہ کے بعد اس سے فوائد حاصل کر سکے' تو اسی وقت ملک الموت کا بلاوا آ جاتا ہے اور تمام کوشش' جدوجہد' مال واسباب اور تمام متاع دنیا چھوڑ کر اسے رخصت ہونا پڑتا ہے۔ سب سے بڑی تشنگی کی وجہ اس عرصہ قلیل میں مختصر قیام ہے اور اس کے بعد رخصتی ہے۔

دُعا سے متعلق تصورات

بہت سارے لوگ دُعا کے بارے میں بڑے عجیب سے نظریات رکھتے ہیں۔ مثلاً کسی شریف آدمی کو کہا جائے کہ آپ ہمارے لیے دُعا کریں' تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں اس قابل کہاں۔ بلکہ آپ میرے لیے دُعا کریں۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں اس قابل کہاں۔ بلکہ آپ میرے لیے دُعا کریں۔ جتنی دُعائیں اور جتنی تسبیحات میں نے آپ کو دی ہیں' وہ سب کی سب رسولؐ کی ہیں۔ جیسے اللھم اعنا علی ذکرک و شکرک و حسن عبادتک یا اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا و اجرنا من خزی الدنیا و عذاب الآخرہ۔

جب حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ جنت میں ایک مقام وسیلہ ہے۔ میں اپنے خدا سے امید کرتا ہوں کہ مجھے یہ مقام عطا کیا جائے گا۔ تم بھی میرے لیے اس مقام کی دعا کرو۔ دعا کوئی ایسی چیز نہیں' جو ایک مقدس کرتا ہے اور ایک غیر مقدس نہیں کرتا۔ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ ایک فاسق کی دعا قبول کی جاتی ہے اور ایک مقدس کی دعا کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ آپس میں سلام کے بعد سب سے بڑا رشتہ دعا کا رکھیں۔ اس لیے میں آپ سب سے اپنے

لیے بھی دعا کی درخواست کرتا ہوں۔

قبولیت دعا کا فلسفہ

جسے آپ دعا کا نہ سنا جانا کہتے ہیں‘ اس میں صرف علم کا فرق ہے۔ آپ ایک چھوٹی سی جگہ میں قید ہیں۔ آپ کا ایک چھوٹا سا وقت ہے۔ خدا زمانوں و آسمانوں سے بالاتر آپ کے آگے بھی دیکھ رہا ہے۔ آپ کے اردگرد بھی دیکھ رہا ہے۔ اس کو مکمل یہ اختیار حاصل ہے و لا یحیطون بشئی من علمه الا بماشاء جو چیزیں آپ کو نظر نہیں آتیں‘ وہ اس کے علم میں ہیں۔ جو چیزیں گزر گئیں‘ وہ بھی اس کے علم میں ہیں۔ آپ لاعلمی‘ حماقت اور محدود حیثیت میں ایسی دعائیں مانگ جاتے ہیں‘ جو آپ کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے وعصی ان تکرھو شئی وھو خیر لکم کسی چیز سے تم کراہت کھاتے ہو‘ اس میں خیر ہوتی ہے وعسی ان تحبو سی وھو شر لکم اور کسی چیز سے تم محبت رکھتے ہو‘ اس میں شر ہوتا ہے واللہ یعلم و انتم لا تعلمون اللہ جانتا ہے‘ تم نہیں جانتے۔

دعا نہ قبول ہونے کی صرف یہ وجہ ہے کہ اللہ جانتا ہے‘ جو دعا آپ مانگ رہے ہیں‘ آخر کار یہ غلط نکلے گی۔ یہ دعا آپ کو تکلیف دے گی۔ آپ کا مستقبل اور آپ کا دین خراب کرے گی اور یہ آپ کی زندگی پر بوجھ بن جائے گی۔ اس لیے وہ آپ کی سسکیاں بھری دعائیں بھی نہیں سنتا۔ آپ کی دعائیں ہیں بھی کتنی؟ میں نے اپنے تجربے کے مطابق لوگوں کو تین چار دعائیں ہی مانگتے دیکھا ہے۔ آپ کی دعا کبھی تبدیل ہی نہیں ہوتی۔ آپ کی دعا اور نفس کی ترغیبات ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ خدا تھوڑی سی کوفت بھی دینا چاہتا ہے کہ درجات علم اور مراتب خیر بڑھائے۔ وہ آپ کو آخرت میں بھی بسانا چاہتا ہے۔ آپ صرف دنیا میں ہی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تھوڑا سا فرق ہے۔

عاجزی کے لیے دُعا

عاجزی ایک لفظی اور ایک ذہنی کیفیت ہے اور ذہنی کیفیت آدمی کی صرف علم سے مرتب ہوتی ہے۔ جیسے قرآن حکیم نے فرمایا انما یغشی اللہ من عبادہ العلمٰو کہ علم والے ہی اللہ سے ڈرتے ہیں اور ڈرنے والے ہی عاجز ہوتے ہیں۔ مگر ایک منکسر مزاجی وہ ہے‘ جو جان بوجھ کر طمع کاری اور منافقت کی خاطر کی جاتی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو مجبور کرتا ہے کسی صورتحال کے لیے کہ میں عجز کا اظہار کروں۔ وہ اپنے آپ کو فریب تقدس دے رہا ہوتا ہے۔ عاجزی بھی ایک نارمل ٹمپرا اور عمومی روّیہ انسان کا ہے‘ جو کسی بھی حال میں چیلنج نہیں ہوتا۔ ہر انسان کے ساتھ مراتب اصول کے مطابق روّیہ رکھنا‘ خدا سے ڈرتے رہنا اس بات سے کہ اس کے کسی طرز عمل سے کسی دوسرے کو انانیت کا گمان نہ ہو‘ اسی کو عاجزی کہتے ہیں۔

کافر رشتہ دار اور دُعا

یہ غلط بات ہے کہ رکاوٹ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ نے کہا‘ اے ابراہیم! اس کے لیے دعا مت مانگ۔ اللہ نے انہیں منع کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کو قیامت کے دن جب شفاعت کے لیے کہا جائے گا‘ تو وہ عرض کریں گے کہ اے پروردگار عالم!

میں نے اپنے کافر باپ کے لیے دعا کی تھی، جو مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ جب انہوں نے دعا کی، تو اللہ نے کہا، اے ابراہیم! اپنے باپ کو دیکھ۔ جس کو تو باپ سمجھتا ہے، اس کو علامات میں ایک لتھڑا ہوا وجود دکھایا گیا۔ اسی طرح حضور اکرمؐ نے کہا کہ مجھے پتہ ہوتا کہ ستر مرتبہ استغفار سے خدا میری دعا قبول کرتا، تو میں ضرور کرتا۔ مگر جب روکا گیا، تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمدؐ دونوں کو روکا گیا۔ مگر شفاعت سے وہ محروم ہیں، جنہیں قرآن نے روک رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اصول وضع کر دیا تھا اور پیغمبر کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ خدا کی رضا کے بغیر کوئی چیز نہیں کرتا۔

Marfat.com

کثرتِ عبادت' کثرتِ مسائل

جب کثرت عبادت کی جائے اور اس کی عادت نہ ہو' تو اس کا ذہن پر اثر پڑتا ہے۔ ایک بھوت سا ذہن پر سوار ہو جائے' تو اللہ اس سے روکنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کثرت عبادت پسند ہی نہیں کرتا۔ کثرت عبادت اتنی اہم نہیں ہے' جتنی کہ کثرت عبادت کے پیچھے آپ کی نیت' خیال اور موقفات زیادہ اہم ہیں۔

ایک شخص نے ہجرت کی اور اپنی بیوی کے لیے کی۔ اس کی بیوی کا نام ام قیس تھا۔ ہجرت رسولؐ اللہ کے زمانے میں باقی مسلمانوں کے ساتھ کی۔ اتنا فرق پڑا کہ اس کا نام ہی مہاجر ام قیس پڑ گیا۔ اصحاب رسولؐ اسے مہاجروں میں نہیں گنتے تھے' مہاجر ام قیس کہتے تھے۔ ہمارے ایک بزرگ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ مبالغے کی حد تک روزے رکھتے تھے۔ جب دیکھو روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ بیمار پڑ گئے' تو حضورؐ پاس سے گذرے اور فرمایا' میاں! اتنی نفس کو کیوں کوفت دیتے ہو' جو تمہارے لیے وبال بن جائے؟

سوال یہ ہے کہ کثرت عبادت ہو کیوں؟ کثرت کا لفظ استطاعت سے تھوڑا سا بڑھ کر ہے۔ اگر کثرت استطاعت کی حد میں ہے' تو اسے ہم کثرت نہیں کہیں گے اور اگر آپ استطاعت سے بڑھ کر کثرت کر رہے ہیں' تو آپ ضرور بیمار پڑ جائیں گے' پاگل ہو جائیں گے۔ آپ پر کوئی نفسیاتی ڈیپریشن وارد ہو جائے گا' یا آپ خدا سے مطلق ناراض ہو جائیں گے۔

ایک شخص کو ایک بندہ وظیفہ دیتا ہے کہ چالیس دن اس کو پڑھ لو۔ پھر اس کے نتیجے میں فلاں چیز آپ کو مل جائے گی۔ چالیس دن پڑھنے کے بعد اس کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ یہ بندہ جھوٹا ہے' جس نے وظیفہ دیا تھا۔ وہ تو کہتا ہے کہ آیت کریمہ بھی پڑھ کے دیکھ لی' کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ غلط طریقے کی وجہ سے اپنے تمام فیض ضائع کر دیتے ہیں۔ ایک بات ضرور یاد رکھیں کہ تھوڑا یاد کریں۔ زیادہ یاد کریں' مگر اللہ کو اللہ کے واسطے یاد کریں فاذکرونی اذکرکم واشکروالی ولاتکفرون تم مجھے یاد کرو' میں تمہیں یاد کروں گا اور شکر ادا کرتے رہو اور اگر شکر ادا کرتے رہو گے' تو پھر میرا انکار نہیں ہوگا۔ پھر میرا تمہارا جھگڑا ہی کوئی نہیں۔ دین میں بھی آسانی' دنیا میں بھی آسانی۔

Marfat.com

سختی تو اس پر ہے۔ معیشت اس کی تنگ ہے' جو چار دنوں کی زور آوری میں اس نے آرام کمایا اور سب کچھ کیا۔ جب اللہ نے پکڑ لیا' تو وظیفے شروع ہو گئے اور کثرت وظائف جاری ہیں۔ بہت سے لوگ آ کر کہتے ہیں کہ جی آخر سات سال سے اتنے وظائف پڑھ چکا ہوں اور اتنے بندوں کے پاس جا چکا ہوں' کوئی حل ہی نہیں نکلتا۔ مگر حل نکلے کیسے؟ خدا آپ کا خدا نہیں ہے۔ اب بھی نوکری آپ کی خدا ہے۔ مسئلہ آپ کا خدا ہے۔

ایک نوجوان شخص کا باپ میرے پاس آیا اور کہا' میرا بیٹا تہجد گذار ہے۔ میں نے کہا' عمر کتنی ہے؟ کہا' سترہ سال۔ میں نے کہا' وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے۔ ورنہ نوجوان کو کیا لگے کہ وہ سترہ سال میں تہجد پڑھ رہا ہے۔ اس کا تو دماغ خراب ہو رہا ہے۔ ڈیپریشن میں جا رہا ہے۔ کوشش کریں کہ وہ تھوڑا سا سوئے۔ لگتا ہے' اسے کسی ناکام محبت سے واسطہ پڑ گیا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایک عمر اور ایک مدت میں مذہب کی طرف رجحان جائز ہوتا ہے۔ اللہ آپ سے کوئی انتہا پسندی کا تقاضا نہیں کرتا۔ اللہ کے لیے قتل کرنا بہت بڑی بات ہے۔ جہاد بہت بڑی بات ہے۔ شہید ہونے سے بہتر اللہ کو کیا چیز پسند ہوگی۔ مگر سختی سے یہ کہا ہے کہ قتل بھی تم میرے لیے کرتے ہو ان اللہ یحب المعتدین خدا زیادتی کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہے۔ اللہ کیسے آپ سے بے اعتدالی کی توقع رکھ سکتا ہے۔ ایک عورت ہے۔ بے چاری رات بھر جاگتی ہے۔ بچے پالتی ہے۔ اس کو نماز مل جائے' تو اس کی شہادت آ گئی ہے۔ چہ جائیکہ وہ اپنے اوپر پریشر ڈال رہی ہو۔ رات کو بھی کھڑی ہو رہی ہے۔ بالآخر وہ خدا کے پاس تو نہیں پہنچے گی' سائی کی سینی ٹوریم پہنچے گی یا کسی پاگل خانے میں جا اترتی ہے۔

خدا کے رسول کی آٹھ احادیث ہیں۔ اوپر تلے مسلم کی احادیث ہیں کہ اعتدال اختیار کرو اور اگر مکمل اعتدال نہ اختیار کر سکو' تو اس کے قریب ترین رہو۔ جب آپ کو رسولؐ کثرت کا مشورہ نہیں دے رہے' تو آپ خواہ مخواہ کثرت کیے جا رہے ہیں۔ کثرت ہمیشہ انتہا پسندی کی مظہر ہے اور اسلام شدت پسندی کو پسند نہیں کرتا۔ کسی بھی صورت میں نہیں کرتا۔

حسنِ اخلاق اور منافقت

حدیث قدسی ہے کہ اللہ کو بندے میں دو عادتیں بڑی پسند ہیں۔ ایک حسنِ اخلاق اور ایک کھانا کھلانا۔ مجھ سے انگلینڈ میں کسی نے پوچھا کہ سالگرہ منانا اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟ میں نے پوچھا' سالگرہ میں ہوتا کیا ہے؟ اس نے کہا' کچھ مہمان بلائے جائیں گے۔ اس میں کھانا پینا ہوگا۔ میں نے پوچھا' اس میں رقص و سرود یا شراب یا شہوانیت تو نہیں چلے گی؟ نہیں جی نہیں' ہم تو مسلمان ہیں۔ ہمارے لوگ کھائیں پئیں گے۔ میں نے کہا' پھر تو تم بہت بڑا خدا کی مرضی کا کام کرو گے۔ اسی چیز کی تو بار بار اللہ تاکید کرتا ہے کہ بہانے ڈھونڈتے رہو۔ لوگ بلاتے رہو۔ کھانے کھلاتے رہو۔ سو سالگرہ اللہ کو اتنی پسند ہونی چاہیے' جتنی کوئی اور سرگرمی پسند ہی نہ ہو۔

حسن اخلاق اور منافقت میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے۔ بسا اوقات ہم حسن اخلاق میں منافقت کو شامل کر دیتے ہیں۔ حضور گرامیؐ بیٹھے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ تشریف لائیں۔ ایک شخص حضورؐ کی طرف سامنے سے آتا ہوا نظر آتا۔ حضورؐ نے کہا کہ یہ اپنی قوم کا برا شخص ہے۔ جب وہ قریب آیا' تو حضورؐ اٹھے' کھڑے ہوئے۔ اس کا استقبال کیا۔ جب وہ

چلا گیا' تو حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ نے بڑے تجسس سے پوچھا' یا رسول اللہ! یہ کیا؟ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ وہ اپنی قوم کا برا شخص تھا۔ ادھر آپ نے یہ کمال کر دیا۔ اٹھے' کھڑے ہوئے' اسے بڑے ادب اور اخلاق سے پیش آئے۔ فرمایا' عائشہ! اس کی خاطر میں اپنا اخلاق تو نہیں چھوڑ سکتا۔

تو حسن اخلاق کی معراج یہ ہے کہ جہاں آپ اخلاق نہ برتنا چاہتے ہوں' وہاں بھی برتیں۔ آپ کہتے ہیں' اس عورت یا اس مرد کو تو میں گھر میں گھسنے ہی نہیں دوں گا۔ مگر جب کوئی شخص گھر پر آ جائے۔ چاہے آپ کی مرضی کا نہ ہو' چاہے آپ کی مرضی کے خلاف ہو' تو اس کے ساتھ کشادگی قلب و نظر سے سلوک کرنا حسن اخلاق کا سب سے بڑا وصف ہے۔

خواب' تعبیر' اہمیت

خواب کی پانچ صورتیں ہیں۔ ان میں سے چار مغربی نفسیات میں زیر بحث آئی ہیں۔ مختلف فلسفی اور نفسیات دانوں نے خواب کے پیٹرن کی وضاحت کی ہے۔ خواب بذاتہ قابل بحث نہیں ہے' بلکہ خواب کے پیٹرن قابل غور ہوتے ہیں۔ حالت نوم میں ہمارا مذہبی فلسفہ یہ ہے کہ ہماری روح ملاء اعلیٰ کو سفر کرتی ہے۔ وہ مختلف عالمین سے ہوتی ہوئی مختلف مقامات پر رکتی اور ٹھہرتی ہے۔ جب وہ مقام شیاطین عالم' جہاں شیاطین کی مجالس ہیں' سے اوپر نکلتی ہے' تو وہاں امثال میں تین اثرات اس روح پر وارد ہوتے ہیں۔

ایک لفظ کی صورت میں' ایک تمثیل اور ایک حکم کی صورت میں۔ یہ اچھے خواب کی بات ہے۔ جب کوئی اچھی روح بلند ہوتی اور اس مقام سے نکلتی ہے' جہاں بالعموم شیاطین اور جنات کے اکٹھ ہیں' تو وہ ملاء اعلیٰ کو پہنچتی ہے' جہاں ملائکہ متوقع ہیں۔ وہاں تین طرح کے اسے اشارات دیئے جاتے ہیں۔ یا تو تمثیل کی شکل میں' جو آپ کبھی کبھی دیکھتے ہیں اور وہ سچ نکل آتے ہیں یا اشارہ آپ کو سمجھنا پڑتا ہے اور اس پر غور و فکر کرتے ہیں یا اس کی تعبیر کے لیے کسی بڑے کے پاس جاتے ہیں اور یا کلام کی صورت میں آپ کو بتایا جاتا ہے کہ یہ ایسے ہے اور یہ تینوں کے تینوں خواب سچے ہوتے ہیں۔

سیدنا عبدالقادرؒ جیلانی کہتے ہیں کہ جب ہم لوٹ رہے ہوتے ہیں' تو رستے میں شیاطین اس روح کو کنفیوز کرنے کے لیے اچھے خواب میں بری تمثیل ملا دیتے ہیں۔ وہ قبولیت اور رد اور خوف اور خوشی کا ایک عجیب سا ملغوبہ بن جاتا ہے۔ آدمی صبح اٹھ کر یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ میں نے اچھا خواب دیکھا ہے یا برا۔ اس قسم کے خواب کی کوئی وضاحت مغربی نفسیات میں نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے سمبل ایک جیسے ہیں۔ فرائیڈ درست ہو سکتا ہے' لیکن وہ خاص حوالوں سے درست نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح امام ابن سیرینؒ' امام جعفر صادقؒ' جو ہمارے متاع گراں مایہ ہیں' خوابوں کے مشرقی پس منظر میں اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں' وہ بھی ہمارے لیے اس لیے قابل یقین نہیں ہیں کہ صحرائی سمبل ہماری سویلائزیشن سے جدا ہیں۔ دین کا توجیہ کرنے والا اپنے ماحول اور اپنے مقام سے ایک مکمل گرفت لے کر کسی بھی چیز پر ایک مقامی توجیہ دیتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایک مقامی توجیہ بھی وقت کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ تمام خوابوں پر زماں اور مکاں کا اثر ہوتا ہے۔

ابن سیرین کے پاس صبح کے وقت ایک شخص آیا اور اس نے کہا اے امام! میں نے دیکھا ہے کہ میں اذان دے

Marfat.com

رہا ہوں۔ کہا' توحج کو جائے گا۔ کچھ وقت گذرنے کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے آ کر کہا' اے امام! میں نے دیکھا ہے' میں اذان دے رہا ہوں۔ کہا' اس کو پکڑلو۔ یہ کفن چور ہے۔ کسی نے ساتھ بیٹھے ہوئے کہا' امام! یہ کیا بات ہوئی۔ دونوں نے ایک ہی خواب سنایا۔ ایک کو کہتا ہے' حج پر جائے گا۔ دوسرے کو کہتا ہے' یہ کفن چور ہے۔ انہوں نے کہا' وقت نہیں دیکھتے' دوپہر کو بھی کوئی اذان دیتا ہے۔

سو' تعبیر کرنے والا خواب سے ہمیشہ اہم ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول گرامی مرتبتؐ نے مشورہ دیا کہ خواب کی تعبیر اچھی دیا کرو۔ اس لیے کہ بہرحال بہت سارے خواب جو برے ہوتے ہیں' وہ حقیقت میں علامتی لحاظ سے برے نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر آپ خواب دیکھتے ہیں کہ آپ کو پھانسی ہوگئی۔ تعبیر یہ ہے کہ آپ برائی سے روک دیئے گئے۔ خواب میں آپ نے دیکھا کہ آپ کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ تعبیر یہ ہے کہ کسی شر سے آپ کو روک دیا گیا ہے۔

سو' کوئی بھی خواب کم علم کے پاس آ کر وہم اور وسوسہ بن جائے گا' جبکہ کسی اچھے اور سمجھدار آدمی کو سنایا گیا خواب آپ کو ہمیشہ تسکین دے گا۔ برے خواب برے شگون کی طرح ہوتے ہیں۔ حدیث رسولؐ ہے کہ جب تم کو کوئی برا خواب آئے' تو بائیں طرف تین دفعہ تھتکار کے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھ دو' وہ علامت کبھی حقیقت میں نہیں ڈھلتی۔ وہ خواب کبھی حقیقت میں نہیں آئے گا۔

جہاں تک یہ سوال کہ بعض اہل تصوف کی نظر میں سوتے میں روح پرواز کرتی ہے اور ایتھر سے ہمارے لیے اطلاعات لاتی ہے' جو ہمیں خواب کی صورت میں نظر آتی ہیں' کم علمی کے باعث اور مبہم اشیاء پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر ایتھر کا کوئی تصور موجود نہیں ہے اور جو ہے' وہ پرانے قصے کہانیوں اور سلسلہ عظیمیہ کی کتابوں میں یا پیراسائیکک انسٹیٹیوشنز کی صورت میں موجود تھا' اب نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہل تصوف کی سوتے میں روح پرواز کرتی ہے' وہ کسی بھی دوسرے آدمی کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ سادہ سی بات یہ بھی ہے کہ ایک فاسق کا خواب صحیح ہوتا ہے' جبکہ ایک مقدس کا غلط ہوتا ہے۔ کسی نے ابن عربی سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بدکرداروں کے خواب صحیح نکلتے ہیں' نیکوکاروں کے کیوں غلط نکلتے ہیں؟ ابن عربی نے کہا کہ بالکل سفید کپڑے پر ایک سیاہ داغ بڑا نمایاں ہوتا ہے اور بالکل سیاہی پر سفید داغ ہو' تو وہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اس لیے جو بداعمال شخص ہے' کبھی کبھار اسے ایک اچھا خواب آئے گا' تو وہ یقیناً سچا ہوگا۔ امام مسلم بن حجاج نے کہا کہ اہل خیر جھوٹ بڑا بولتے ہیں۔ ان کے خوابوں میں اکثر مکر اور ریا کے آزمائشی پیٹرن کا دخل ہو جاتا ہے۔ اس لیے الہام پر مبنی ان کے بیشتر خواب غلط ہوتے ہیں۔

دلوں پر مہر کیسے

میرے شیخ علی بن عثمانؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے دل پر دو طرح کے حجاب وارد ہوتے ہیں۔ ایک کو وہ خطرات کہتے ہیں۔ ایک کو وطنات کہتے ہیں۔ جب پہلی مرتبہ دل پر کوئی خطرہ وارد ہو' تو وہ کچھ دیر کے لیے ٹھہرتا ہے اور انسان

Marfat.com

ندامت سے رجعت کرے' تو وہ خطرہ دُور ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان کا دل' صاف اور شفاف ہو جاتا ہے۔ مگر اگر خطرے کی نگہداشت نہ کی جائے' تو وہ خطرہ وہاں موجود رہتا ہے۔ اس کی سینس بڑھتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ خطرہ وطن بن جاتا ہے۔ جب کوئی خطرہ وطن بن جاتا ہے' تو وہ خطرہ حجاب اور رین بن جاتا ہے۔ حجاب اور رین دل کو مستقل گرفت میں لے کر حقیقت شناسی' خداوند سے دُور کر دیتا ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ دلوں پر مہر لگانے کے ذکر کی مثال دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مہر کیسے لگتی ہے؟ کیا بعض پیدا ہی مہر کے ساتھ ہوتے ہیں یا کہ یہ ایک degenerating process ہے۔ ایک ایسا پراسیس' جس میں دین فطرت پر پیدا ہوا بچہ یا ایک انسان اپنی سلامتی صحت کے ساتھ ہوتے ہوئے اس میں گنجائش پیدا کرتا ہے۔ اس بات میں مجھے سب سے زیادہ خوبصورت بات سیدنا علی بن عثمان ہجویریؒ جو میرے مرشد ہیں اور تصوف میں میرے استاد ہیں' کی اچھی لگی۔ فرمایا کہ حجابات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ حجابات ہیں' جو وقتی اور عارضی ہیں اور دل پر توقف نہیں کرتے۔ یہی بات اللہ کریم نے قرآن حکیم میں بھی فرمائی کہ ہو سکتا ہے' تم چھوٹے بڑے گناہوں میں ملوث ہو جاؤ اور بہت ساری ایسی خطائیں کرو' جو بظاہر تمہارے دل کو تاریک کر دیں۔ مگر میں بھی تمہیں یہ گنجائش دے رہا ہوں کہ واجتنبو الکبائر والاثم والفواحش اگر تم بڑے گناہوں سے پرہیز کرو' تو کچھ میں تو تم ٹھہرو گے۔ لم کہتے ہیں چھوٹے سے ٹھہراؤ کو۔ خدا کہتا ہے کہ کچھ پر تو تم ٹھہرو گے ہلکا ہلکا۔ لیکن ٹھہرنے کے اس عمل کو ہم مہر نہیں کہتے۔ دل کو جب ایک قطرہ زنگ لگتا ہے۔ جب ایک حجاب دل پر وارد ہوتا ہے' تو پھر اللہ نے اس کے پراسیس رکھے ہیں۔ عبادات اور توبہ رکھی ہے۔ یہ پراسیس بیس سال میں پورا ہو سکتا ہے' تیس سال میں بھی پورا ہو سکتا ہے ایک نومولود بچے پر مہر آخری عمر میں بھی لگائی جا سکتی ہے۔

تو مہر کا لفظ ضرور ہے' لیکن یہ اپنے پروسیجر میں بنتی ہے۔ اس لیے کسی کا یہ کہنا کہ ایک دَم سے مہر لگتی ہے' غلط ہے۔ بلکہ یہ رفتہ رفتہ وارد ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں بیشتر آیات کفار مکہ پر اتریں اور ہر بار انہیں وعید عذاب دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج نہیں تو کل تم جہنم میں ضرور جاؤ گے۔ ایسے لگتا ہے کہ یہ ساری مہریں ان پر لگ چکی ہیں۔ اپنے پیغمبر کو جلاوطن کر دیتے ہیں۔ ان سے جنگیں لڑتے ہیں۔ کشت و خون ہوتا ہے۔ مگر کیا آپ انجام جانتے ہیں؟ لا تثریب علیکم الیوم جب حضورؐ کعبہ میں وارد ہوئے۔ سند رسالت بلند ہوئی اور جزا و سزا کا فیصلہ کیا گیا' تو مکہ میں چار پانچ کے سوا کوئی کافر نہ تھا۔ کیا آپ اسے مہر کہیں گے؟ خدا تعذیب اور تعظیم کے لیے الفاظ ضرور سخت استعمال کرتا ہے۔ مگر اس کے پیچھے عنایات' رحمت و محبت کا ایسا دریا موجزن ہوتا ہے' جو ان اصطلاحات سے متاثر نہیں ہوتا۔

مومن ہونے کا ٹائٹل

میں نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان مومن نہیں ہو سکتا۔ میں نے یہ کہا تھا کہ کوئی مسلمان از خود مومن کے ٹائٹل کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میں کلمہ پڑھتا ہوں۔ پانچ ارکان خمسہ کی پابندی کرتا ہوں۔ مسلمان کہلواتا ہوں۔ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ مگر مومن ہونا ایک کیفیت ذات اور داخلی ہے۔ اس کا تعلق ہماری اس ججمنٹ سے نہیں ہے' جو ایک خارجی ججمنٹ ہے۔ بلکہ اللہ علام الغیوب ہے۔ دلوں کا جاننے والا ہے۔ ایمان خفی ہے' ظاہرہ نہیں ہے۔ ہاں اگر ایمان

ہوگا' تو اس کی کوئی نہ کوئی قسم جلی میں ضرور ظاہر ہوگی۔ ایک شخص جلی میں کتنی بھی عبادات کیوں نہ کرے' وہ پھر بھی ایمان سے خالی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث کے مطابق ایک شخص جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ لڑا۔ بظاہر وہ مسلمان تھا۔ بہت کشت و خون کیا۔ بڑی شجاعت سے لڑا۔ مگر حضور گرامی مرتبتؐ نے فرمایا کہ وہ شخص دوزخی ہے۔ اسی طرح عبادت ظاہرہ اندرونی ایمان پر دلیل نہیں بنتی۔ صرف اور صرف خدا ہی اس کی ججمنٹ کر سکتا ہے کہ کون مومن ہے اور کون نہیں ہے۔ اسی لیے میں اور آپ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

صبر کیا ہے

صبر کی تعریف اللہ کریم نے حضرت موسیٰ اور خضر کے واقعہ میں دی ہے۔ جب بار بار حضرت موسیٰ سے پیغمبر ہونے کے باوجود حضرت خضر نے ایک بات کی کہ کیف تصبر و مالم تحب بہ خبرا تجھے صبر کیسے آئے، تجھے علم جو نہیں ہے۔ علم سے صبر آتا ہے، جب تک آپ کی نگاہ آگے نہیں بڑھتی اور غور وفکر نہیں بڑھتا۔ کم علمی کے ساتھ طبع انسانی ہمیشہ اعتراض پر جا کے رُکتی ہے۔ جیسے جب کم انفارمیشن اور کم علم کے ساتھ بڑا سوال اٹھایا جائے گا، تو ہمیشہ اس میں ایک بے صبری اور عجلت سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت آ جاتی ہے۔ اسی لیے ہم بہت جلد اپنی انرجی خرچ کرتے ہوئے مختلف مسالک پر مضبوطی سے قائم ہو جاتے ہیں۔ ایک عبوری دور میں سے گذر رہے ہیں، جبکہ تمام زندگی سیکھنے کے لیے ہے۔

ایک صاحب نے ہمیں کہا کہ میں خدا میں یقین نہیں رکھتا۔ میں کمیونزم کو مانتا ہوں۔ ہم لاہور میں تھے۔ میں نے اس سے پوچھا، آپ کتنے عرصے سے اس یقین پر قائم ہیں؟ میں گذشتہ پچیس برس سے اس پر ڈٹا ہوا ہوں، اس نے کہا۔ میں نے کہا، پچیس سال سے آپ نے کسی قسم کی کوئی ترقی نہیں کی؟ کیا آپ نے ذہن کو بلاک کر رکھا ہے؟ آپ نے ڈیٹا فیڈ کر دیا ہے اور کوئی چیز اس میں داخل کرنے کی کوشش نہیں کی؟ اس طرح آپ نے زندگی کے پچیس برس ضیاع میں گذارے، اگر آپ سیکھ نہیں رہے۔

تمام عرصہ تربیت، زندگی سے سیکھنے اور علم حاصل کرنے کا نام ہے۔ جہاں ہم رُک جاتے ہیں، وہاں ایک بت خانہ اور ایک Occult پیدا ہو جاتا ہے اور آپ اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ آگے کی طرف پیش رفت نہیں کر رہے۔ جس کا علم حرکت کرتا ہے، وہ محدودیت سے لامحدودیت کو جاتا ہے اور لامحدودیت میں وہ کبھی مرگ پذیر نہیں ہوتا۔

فطرت کے بارے میں

دو ارب سال سے، جب سے زمین بنی اور حیات انسانی کا پہلا سیل وجود میں آیا۔ پھر پوری زندگی اس سیل سے پروموٹ ہوتی کئی منازل اور مراحل سے گذرتی ہوئی موجودہ انسان کے تشخص تک پہنچی، تو اس ساری زندگی میں بیشتر حصہ

انسان نے جانورانہ جبلتوں پر گذارا ہے۔ یہ جانورانہ جبلتیں ہماری ایک بنیادی فطرت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کو نفسیات نے بنیادی جبلت کا نام دیا ہے۔ اس میں محبت اور نفرت ہے اور سب سے بڑھ کر جیسے قرآن نے کہا' اس میں انسان کی بقا ہے۔ بقا کے تحت ہی انسان زندہ رہتا ہے۔ بقا کے تحت ہی وہ دفاع کرتا ہے۔ اس کی زندگی کی خواہش بڑھتی گھٹتی ہے اور جب بقا کے ذرائع منقطع ہو جائیں' تو بالعموم یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان خودکشی کر لیتا ہے۔ اس لیے فطرت بنیادی طور پر ان بنیادی جبلتوں کو کہتے ہیں' جن کا ایک پیکٹ ہر انسان اور ہر ذی حیات میں موجود ہے۔ اس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ تا آنکہ انسان مجنون یا مجذوب ہو جائے یا حواس سے خارج ہو جائے۔

فطرت کے خلاف کام

(ڈاکٹر عبدالجلیل خواجہ) لفظ Wants کو ڈیفائن کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اگر یہ سوال گناہ کے حوالے سے ہے' تو ایک مسلمان یا مومن کا گناہ ایک ایسا اضطراری فعل ہوتا ہے' جو حالت اضطرار میں انجام پاتا ہے۔ ایک مومن سے جو خطا ہے' وہ اس کی چوائس نہیں ہوتی۔ مومن انتخاب سے گناہ نہیں کرتا۔ علیؒ ہجویری سے پوچھا گیا کہ کیا اللہ کا ولی بھی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ فرمایا' ہاں ستر مرتبہ۔ اس کی تصدیق اس حدیث سے بھی ہوتی ہے' جس میں آقا و رسولؐ نے ایک صحابی کے سوال کرنے پر فرمایا کہ ایک مسلمان اگر ستر مرتبہ بھی گناہ کبیرہ کرے لیکن اخلاص سے اللہ کی طرف رجوع کرے' تو اللہ اس کو معاف کر دے گا۔ میں حدیث کا مفہوم بیان کر رہا ہوں۔ بعد میں حضرت عمرؓ کے متعجب ہونے پر حضورؐ نے دوبارہ کہا کہ ہاں عمرؓ میں نے ایسا کہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مومن گناہ ہوش و حواس سے اور پوری جذباتی وابستگی کے ساتھ ایک فیصلے کے طور پر کرتا ہے۔ بلکہ اس سے حالت اضطرار میں خطا سرزد ہوتی ہے۔ پھر وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ غلطی اس کے لیے سبق بن جاتی ہے۔ اگلی دفعہ وہ اس غلطی کے جال میں نہیں پھنستا' جس میں پھنس کر اس نے یہ غلطی پہلی یا دوسری دفعہ کی ہوتی ہے۔

یہاں اگر تو اس فرد کا انتخاب وہ گناہ ہے اور وہ اس نے کسی حالت اضطرار میں نہیں کیا' تو پھر اسے اس سے تعلق ہی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کیا کرے۔ کیونکہ اس نے گناہ کا انتخاب کر کے وہ گناہ کیا۔ اگر یہ گناہ اس سے حالت اضطرار میں سرزد ہوا' تو پھر اسے اللہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ اگر اس دوران وہ اس کیفیت کا سوال کرتے ہیں' جس کیفیت میں وہ اضطرار میں ہوتا ہے اور اس کو بدی اور نیکی میں سے کسی کا انتخاب کرنا ہوتا ہے' تو اس میں پورا تصوف آجائے گا۔ خیر و شر کے خیال کا آنا' پھر خیر کا انتخاب کرنا' اس میں بہترین طریقہ وہی ہے' جو شیخ عبدالقادر جیلانی کے مرید سے کسی نے پوچھا کہ شیخ نے وہ مقام کیسے پایا؟ آپ نے فرمایا و لاحول و لاقوۃ الا باللہ اللہ سے توفیق طلب کرنی چاہیے کہ وہ خیر اور شر کے انتخاب میں ہمیں توفیق دے کہ ہم خیر کا انتخاب کر سکیں اور شر کا انتخاب نہ کریں۔

انسان کے حیوانی مدارج

اللہ تعالیٰ نے جس حقیقت کی نشاندہی کی ہے' وہ ایسے ہی ہے۔ کیونکہ نفس واحدہ سے ساری انسانی زندگی شروع

ہوئی۔ غالباً انسان ان تمام حیاتیاتی پراسیس جن کی سائنسدان نشاندہی کرتے ہیں، میں سے گذرا اور مختلف مدارج ماہیت کی تبدیلی اور روایتی تبدیلیوں کے بعد ہی اس منزل تک پہنچا ہے۔ مجھے ایک جرمن جینٹک ماہر کی بات یاد ہے کہ جب وہ جینیاتی تبدیلیوں کی بات کر رہا تھا تو اس نے کہا کہ خطرہ یہ ہے کہ بڑی مدتوں اور طویل زمانوں سے جو اللہ نے ہمارے لیے جینیاتی تبدیلیاں کر کر کے ہمیں اعتدال بخشا ہے، ہم کہیں اپنی کوششوں سے اسے پھر خراب نہ کر دیں۔

تقسیم انسانیت اور مذہب

انسان کے پہلے معاشرے سے لے کر اب تک کے معاشرے میں اگر کوئی اچھی قدر موجود ہے تو وہ صرف مذہب ہے۔ چاہے وہ کسی وقت کا بھی تھا اس نے انسان کو اخلاقی اقدار سے روشناسی بخشی ہے۔ جبکہ انسان کی جبلی اقدار نے ہمیشہ ان روایات سے گریز کی کوشش کی ہے۔ انسانی آبادی کے نام پر آج تک جتنے بھی نظام قائم ہوئے ہیں ان میں جمہوریت بدترین ہے۔ انہوں نے انسان کے لیے سب سے بدترین اقدار کے بحران کھڑے کیے ہیں۔ ان کی عادات و فضائل ہم دیکھتے ہیں۔ جو قوانین وہاں پاس ہو رہے ہیں۔ مرد سے مرد اور عورت سے عورت کو جائیداد کے حقوق ملکیت دیئے جا رہے ہیں اور بڑے سے بڑے ان کے جس طرز زندگی پر تفاخر محسوس کرتے ہیں اس کے بعد میرا نہیں خیال کہ کوئی یہ بات کہہ سکے۔ مذہب سے ٹھیک ہے کچھ ضرور لڑائیاں ہوئی ہیں۔ مگر وہ لڑائیاں بھی ان متعصب مذہبی لوگوں میں ہوئی ہیں جنہوں نے اپنے مذہب کی روح کو نہیں سمجھا۔ جنہوں نے درگزر کرنے کو نہیں اپنایا۔ انہوں نے اختیار کردہ تعصبات کو مذہب پر مسلط کیا ہے اور یہ مذہب کا قصور نہیں ہے۔

Marfat.com

سود عصرِ حاضر میں

میں نے دلائل نہیں دیئے۔ صرف سود کے بارے میں ایک عام آدمی کی مجبوری کا اظہار کیا تھا کہ وہ ایک بڑے طبقے کو تبدیل نہیں کرسکتا۔ ملکی یا اس سے بھی آگے کائناتی سطح کے سپر سٹرکچر کے خلاف جدوجہد نہیں کرسکتا۔ جو اس کے فرائض سے باہر ہے' وہ اس کا المیہ نہیں ہے۔ ایک فرد اگر سودی قوانین سے بچنا چاہے' تو وہ غالب امکان کے طور پر یا تو پیسے گھر میں رکھے گا یا سرے سے رکھے گا ہی نہیں۔ اگر آپ سود سے بچنا چاہتے ہوں' تو سب سے بہترین حل میری طرح کا ہے کہ پیسے بچاؤ ہی نہیں۔ اگر آپ نے پیسے بچانے ہیں' تو پھر سپر سٹرکچر آپ کا رستہ نہیں چھوڑے گا۔

یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سودی نظام سے ایک ملک کے اندر جان چھڑانا بڑا آسان ہے۔ اس کی مثال ابھی بتاتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم حقیقی معنوں میں مسلمان ہیں نہ ہم طریق اسلام میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چونکہ ہم بہت ساری چیزوں کو پہلے سے ہی بغیر کسی تردد کے قبول کر چکے ہیں' اس لیے سب سے بڑی بدقسمتی ہمارے نزدیک یہی ہے کہ ہم اس نظام کو تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔ خدا کا غضب اس سے بڑھ کر اور کس ملک پر ہوگا کہ اس کی شریعت تھرڈ کلاس قانون ہو۔ آپ شریعت اسلامیہ قانون پاس کرتے' تو آپ پر کوئی گلہ نہیں تھا۔ آپ رومن قانون یا برٹش لاء کے اطلاق کو جاری رکھتے' مگر یہ خدا سے مذاق نہ کرتے کہ شریعت کے قوانین بنا کر انہیں اتنا رسوا کردیں کہ عمومی عدالت کا جج بھی اس قانون کو غیر مؤثر قرار دے سکتا ہے۔

جس ملک میں مسلمان رہتے ہوں اور اس میں شریعت ایک تھرڈ کلاس کا وجود رکھتی ہو' اس ملک پر اللہ کی رحمت کیسے ہوسکتی ہے؟ جس جج کو آپ نے سزا دینی ہو' اس کو شریعت کورٹ میں بھیجا جاتا ہے۔ نہ صرف لوگوں بلکہ حکومت اور ججوں کی نظر میں بھی سب سے بڑی سزا یہ ہے کہ انہیں ہائی کورٹ سے نکال کے شریعت کورٹ میں بھیج دیا جائے۔ اس سے زیادہ ذلت خدا کے قانون کی نہیں ہوسکتی۔ اگر آپ خدا کے قانون کو اس طرح رسوا کر رہے ہیں اور اس کی اہمیت کو اتنا ارزاں کر رہے ہیں' تو پھر آپ خدا سے کس محبت اور مروّت کی توقع رکھتے ہیں؟ لوگوں کو کم از کم معلوم ہے کہ ہمارے عذاب کی وجہ کیا ہے۔ ایک فرد کو خدا سزا نہیں دیگا۔ وہ اپنے دوست کو کبھی نہیں بھولے گا' جو اس کو اپنی ترجیح قرار دیتا ہے۔ مگر بطور

Marfat.com

ایک قوم' اُمت اور ملک پر المیہ اور مصیبت ہمارے سر پر سوار ہے کہ ہم خدا کے قوانین کو ادنیٰ درجے سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہمارے لیے دنیا اور عاقبت دونوں کی رسوائی ہے۔

سود کے حوالے سے اللہ نے سادہ سا قانون دیا ہے کہ یمحق اللہ الربٰو و یربی الصدقت اگر حکومتی سطح پر کوئی اسلامی حکومت ہو اور لوگوں کو اس اسلامی حکومت پر اعتماد ہو' تو حکومت ایک اپیل جاری کرتی ہے کہ صدقات ہمارے ذریعے خیرات کیجیے۔ ہم آپ کے لیے ایک بینک آف صدقات قائم کر رہے ہیں۔ اس بینک میں صرف ایک ارب روپیہ داخل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ارب روپیہ نہ لوٹانے کے لیے خدا کے رستے میں خیرات اور صدقات کے طور پر ہے۔ آپ یہ پالیسی بناتے ہیں کہ جن لوگوں کو ایک لاکھ روپیہ یا دس دس ہزار روپیہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے قرض درکار ہے' آپ انہیں کہتے ہیں کہ اس پر ہماری کوئی شرط یا سود نہیں ہوگا۔ بس اتنی مہربانی ضرور کرنا کہ اگر تم اللہ کے فضل و کرم سے اس پیسے سے اپنا کام اور کاروبار درست کر لو' تو کم از کم ہمیں یہ اصل ضرور لوٹا دینا' تاکہ ہم کسی اور غریب کی مدد کر سکیں۔

میں یہ چانس لینے کے لیے تیار ہوں کہ ایک ارب میں سے 80 کروڑ واپس نہیں آتا۔ لوگ فراڈ کر گئے۔ کھا پی گئے۔ مگر صدقات تو ہیں ہی اسی لیے۔ دینے کے لیے ہیں۔ صرف 20 کروڑ واپس آتا ہے یا 20 کروڑ آپ کے پاس ہے۔ مگر اگلے برس صدقات دینے والے پھر ایک ارب کے صدقات دیتے ہیں۔ اب آپ کے پاس ایک ارب 20 کروڑ ہو گیا۔ میں آپ کو پوری ایمانداری اور یقین سے کہتا ہوں کہ دس سال میں یہ بینک لوگوں میں نہ صرف شعور مروّت پیدا کر دے گا۔ اخلاقیات کا ایک نیا احساس پیدا کر دے گا' بلکہ دس سال کے بعد یہی بینک کسی بڑے سرمایہ دار سے ڈیل کرے گا اور اس سے کہے گا کہ دیکھو' ہمارے پاس یہ صدقات کے پیسے ہیں۔ ہم آپ کو نہیں دے سکتے۔ سوائے ایک شرط کے کہ لوگوں کی بھلائی اس میں ہے کہ آپ ہم سے ایک کروڑ روپیہ قرض مانگنا چاہتے ہیں۔ مگر دو وعدے کریں۔ ایک تو اصل واپس موڑیے گا اور اگر نفع کمایا' تو اس میں سے بھی خرچ کے لیے صدقات ہمیں واپس کریں گے۔ اس طرح اگر دس پندرہ برس کے عرصے میں آپ کو بینک آف صدقات سے قرض مل رہا ہو' جس میں کوئی ذمہ داری نہیں۔ سوائے ایک اخلاقی ذمہ داری کے' تو مجھے بتائیے کہ حبیب بینک اور یونائیٹڈ بینک کو کون جائے گا؟ قدرتی بات ہے کہ بغیر کسی ذمہ داری کے اگر آپ کو ایک بینک سے قرض مل رہا ہے' تو آپ دوسرے بینکوں کو کیوں جائیں گے؟ لامحالہ بینکوں کا تمام نظام صدقات بینک میں ترتیب نو پا جائے گا اور جب یہ آئے گا' تو سودی نظام خود بخود ختم ہو جائے گا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ رسول اللہ امانت دار تھے۔ لوگوں کی امانتیں رکھنے اور انہیں انتہائی دیانتداری سے تقسیم کرنے کی وجہ سے ان کو امین کہا جاتا تھا۔ اب اگر ایک بینک اپنے ساتھ یہ بھی ذمہ داری لے لے کہ آپ کے سرمائے اور امانتوں کو' جس میں مال بھی ہو سکتا ہے' اپنے پاس محفوظ رکھے۔ اس میں اسی قسم کی ڈیل ہو کہ امانت اور حفاظت سے رکھنے پر ہم آپ سے تھوڑا بہت معاوضہ لیں گے اور آپ کی امانت استعمال کی اجازت پر تھوڑا بہت معاوضہ آپ کو دیں گے' تو اس سے پورے نظام کی تطہیر ہو جائے گی۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت بھی سودی نظام میں ایک آدمی جو اپنے پیسے بینک میں رکھواتا ہے' اس پر وہ قانون لاگو نہیں ہوتا' جو شرح کے مطابق سود کی تعریف بنتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر میں کسی کو سود پر دوں' تو شرط میری ہو گی۔ مگر

Marfat.com

جب آپ بینک میں اپنے پیسے رکھتے ہیں' تو آپ کی شرائط نہیں ہوتیں' بینک کی شرائط ہوتی ہیں۔ نفع کا تعین وہ کرتا ہے۔ بغیر کسی جبر کے وہ نفع مقرر کر رہا ہے۔ اگر آپ لاکھ روپیہ اسے دیتے ہیں' تو وہ آپ کو ساتھ ایک ہزار روپیہ لوٹاتا ہے۔ یہ سود کی تعریف میں نہیں آتا۔

آپ کہتے ہیں' کوئی رقم فکس کیوں ہوتی ہے؟ افراد کی سطح پر فکس کرنا جرم ہے۔ مگر ایک بہت بڑے سسٹم میں تعین مجبوری ہے۔ کیونکہ وہ بے تکے طور پر کسی کو دس پانچ ہزار نہیں دے سکتا۔ اس لیے اس میں انہوں نے سود کی شرح مقرر کی ہوتی ہے۔ انٹرسٹ کی شرح سود کے زمرے میں نہیں آتی۔ مگر اللہ کا قانون موانعت کے بارے میں اتنا سخت ہے فالن تفعلو فضلو بحرب من اللہ و رسولہ کہ اگر تم یہ کام کرو گے' تو اللہ اور رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔

یوں اس کام میں خدا اور رسولؐ سے جنگ کا خطرہ ہے۔ کوئی مسلمان تصور میں بھی ایسی بات نہیں سوچ سکتا' جس سے خدانخواستہ وہ ایمان سے خارج ہو جائے اور خدا اور رسولؐ سے جنگ چھیڑے۔ آخر اس سود میں وہ کیا بات ہے کہ جس کی بنیاد پر اتنا سخت حکم لگایا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ وہ سود ہے' جو انفرادی طور پر لوگوں کو واقعتاً خراب کرتا تھا۔ تمام عمر ان کی سود سے رہائی نہیں ہوتی تھی۔ جو ایک جونک کی طرح انسان کے جسم سے خون چوستا تھا۔ اس سے کسی فرد و بشر کو پرانے معاشرے میں رہائی نہیں ملتی تھی۔ اس لیے یہ دوسرے کے لیے اتنا ظالمانہ اور اتنا بے رحمانہ سسٹم تھا کہ اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں تھا۔

مگر آج میری نظر میں سودی نظام میں جتنا بینک مظلوم ہے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ یعنی سود دینے لینے والے کا تو مجھے پتہ نہیں ہے' مگر جو حال یونائیٹڈ بینک' حبیب بینک اور مجموعی طور پر دوسرے بینکوں کا ہوا ہے' اس میں تو لگتا ہے کہ یہ قطعاً سودی نظام نہیں ہے۔ اس میں بے چارہ سود دینے والا ادھ موا اور قریب المرگ پڑا ہے' بلکہ اس کی بنیاد پر ایک پورا سسٹم آف بینکنگ تباہ ہو گیا ہے۔ یہ ہماری کوتاہی اور غلطی ہے۔ ہمارے جزوی اسلامی تصور کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اسلام میں جزوی طور پر کوئی نہیں داخل ہو سکتا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ نماز پڑھیں اور روزہ نہ رکھیں۔ نماز روزہ رکھیں اور وضو نہ کریں۔ اسلام کو جب بھی کبھی آپ منتخب کریں گے اور اپنائیں گے' تو ایک مکمل سسٹم کی طرح اپنائیں گے یایھا الذین آمنو ادخلو فی السلم کافۃ اسلام ایکجزوی نظام ہے ہی نہیں۔ جمہوری سیکولر نظام کی طرح یہ ایک پورا نظام بھی ہے اور اسے مکمل نظام کی حیثیت سے قبول اور رائج کرنا ہوگا۔

سود اور ذریعہ معاش

قرآن حکیم نے سودی نظام کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی۔ تین یا چار بیانات کے علاوہ سود کے بارے میں کوئی بیان نہیں۔ بلکہ اصول کی طرف ایک بیان ہے یمحق اللہ الربو و یربی الصدقت کہ اللہ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اس ملک میں سود کا کوئی کاؤنٹر سسٹم موجود نہیں۔ حکومت وقت' جو آپ کی وارث ہے' اللہ کے نظام کو چلانے کی ذمہ داری رکھتی ہے۔ اگر وہ سود گھٹانا چاہے' تو وہ صدقات کے نظام کو فروغ دے گی۔ خدا کے نزدیک یہ تبدیلی اتنی سادہ ہے کہ صرف ایک مرتبہ ذکر کیا' پھر موضوع کو چھیڑا ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ معیشت کا یہ سٹرکچر تبدیل کرنے کے اہل نہیں اور

Marfat.com

نظام کو بدلنے پر بالکل قادر نہیں ہیں' تو ایک عام آدمی پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔

دوسرا رسک جو اس کے خلاف ہے' وہی رسک ہے' جو جان کا ہے۔ اگر وہی پیسہ وہ گھر رکھ لے' تو چور اُچکا' ڈکیت اور لوٹ مار سے اسے خطرہ ہے۔ اگر جان کے ڈر سے پیسے محفوظ رکھے ہوئے ہیں اور اس پر بقا کا انحصار چلا گیا ہے' تو فلا اثم الیہ اللہ کہتا ہے' کوئی گناہ نہیں۔

صدقات کا نظام

میرے خیال میں صدقات ایک فرد کی نہیں' بلکہ اس ملک کی بلا ٹال دیں گے۔ صدقات واحد نظام ہے' جو سود کو ختم کرتا ہے۔ قرآن و حدیث کے مطابق صدقات کے نظام کے نفاذ کے بغیر دنیا کی کوئی طاقت سود کو ختم نہیں کرسکتی۔ پروردگار عالم نے فرمایا یمحق اللہ الربو و یربی الصدقت اللہ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ جس ملک' معاشرے اور پورے نظام میں صدقات کی کوئی سرکاری سطح نہ ہو' وہاں سود کیسے ختم ہوسکتا ہے؟

خطبہ حجتہ الوداع کا دن ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ آج کے دن میں تمام سود باطل قرار دیتا ہوں۔ سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود ختم کرتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خطبہ کے دن تک عباسؓ سود لے رہے تھے۔ ان کو پہلے کیوں نہیں منع کیا گیا؟ بائیس برس قرآن اترتا رہا اور عباسؓ سود لیتے رہے۔ کیا اللہ کے رسولؐ شروع سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ سود حرام ہے' جبکہ دو آیات پہلے اُتر چکی تھیں۔ آخری دو آیات میں سے ایک آیت یہ تھی کہ جو یہ کام کرے گا' اللہ کے رسولؐ سے جنگ کرے گا۔ اس سے پہلے بائیس برس قرآن کے اترنے تک لوگ اس کو لیتے دیتے رہے۔ حتیٰ کہ خطبہ حجتہ الوداع والے دن حضور اکرمؐ نے سود کو اپنے تعلق داروں سے باطل کیا اور عمومی سطح پر اس کو نافذ ٹھہرایا۔ اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

وجہ صرف ایک تھی کہ ابھی تک اسلام کے اپنے سسٹم نفاذ میں نہیں آئے تھے۔ اس کے زکوٰۃ اور صدقات کے نظام میچور ہو رہے تھے۔ خدا ایسا نہیں ہے کہ وہ محض نعروں سے کام لیتا۔ خدا ایسا بھی نہیں ہے کہ لوگوں کی جبلتوں پر بے جا دباؤ ڈالتا۔ خدا کو پتہ تھا کہ جب تک اس سسٹم میں متقابل نہ دے لوں' اس سسٹم کو باہر نہیں نکال سکتا۔ خدا نے انسانوں سے ایک ایک چیز چھڑانے میں سالہا سال لیے۔ کہاں وہ یسئلونک عن الخمر کا وقت اور شراب کے بارے میں پوچھا گیا قل فیھمآ اثم کبیرا ومنافع للناس اس میں لوگوں کے لیے کچھ نفع ہے' مگر اس کی برائیاں اس کے نفع سے زیادہ ہیں۔ کسی نے چھوڑی' کسی نے نہ چھوڑی۔

کچھ اور وقت گذر گیا۔ پھر خدا نے قرآن میں فرمایا' دیکھو! تمہاری سائیکی لات ومنات پر فکس ہے۔ شراب پی کر تمہارا شعوری یقین ختم ہوجاتا ہے۔ تمہارا lebido تمہارے ذہن سے لات ومنات کو نکالتا ہے۔ اس حالت میں جب تم نماز پڑھتے ہو' تو تم نہیں جانتے کہ تم کیا کررہے ہو؟ لا تقربو الصلوٰۃ وانتم سکری نشے کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ۔ کچھ لوگوں نے چھوڑی' کچھ نے جاری رکھی۔ حتیٰ کہ تیسرے مقام تک پہنچ گئے۔

کیا اللہ جیسے بڑے استاد کا یہ طریقہ ہوسکتا ہے کہ بغیر وقت دیئے اور بغیر تبدیلی کے احکامات کی گنجائش فراہم کیے

Marfat.com

اچانک کوئی فیصلہ مسلط کر دے؟ اسی طرح آپ کوئی بھی تبدیلی لانا چاہتے ہیں' تو اس کی قبولیت میں اس کے داخلی عقیدے کے لیے آپ کو وقت دینا لینا پڑتا ہے۔ فوری تسلیم کوئی تسلیم نہیں' ہے۔ اگر ایک شخص ایک دن شراب پی رہا ہے۔ دوسرے دن داڑھی رکھ کر تبلیغ کے لیے چلا جاتا ہے۔ وہ آپ کے نزدیک مقدس ہو سکتا ہے' ہمارے نزدیک وہ ایک ارتجاعی ہے۔ اس کے باطن میں کوئی تفہیم ڈویلپ نہیں ہوئی۔ اس وقت تک' جب تک وہ غور و فکر کے ساتھ ایک شرعی فیصلہ نہ کرے کہ میں نے اس رستے سے ہٹنا ہے اور اس رستے پر جانا ہے۔

پروردگار عالم نے اپنے دین کو فہم و فراست اور اخلاق کی پختگی کے لیے پیدا کیا۔ صدقات میں سب سے بڑے صدقے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ آپ کے پورے نظام سود کو ختم کرتا ہے۔ میرے کچھ دوست صدقات بینک قائم کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا' یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ انفرادی کام نہیں ہے۔ یہ ریاست کا کام ہے۔ کل آپ کی جگہ کوئی نا اہل آ گیا' تو صدقات بینک کہیں ایسا نہ ہو' کسی فراڈ کا حاصل نہ بن جائے۔ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ مذہب کے لیے یہ کوشش بھی ایک غلط کوشش ہے۔ یہ ریاست کا کام ہے کہ لوگوں کو اس کا مقصد بتائے اور یہ بتائے کہ ہم سود ختم کرنا چاہتے ہیں اور صدقات شروع کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہر اچھا کام صدقہ ہے۔ کسی کو رستہ دکھانا' ایک کھجور دینا صدقہ ہے۔ حسن کلام اور کسی کی طرف مسکرا کے دیکھ لینا صدقہ ہے۔ اچھے چہرے کے ساتھ برے چہرے والے کو ملنا صدقہ ہے۔ صدقے کی نوعیت اندرونی بھی ہے اور بیرونی بھی۔ صدقہ احساس ہے اور عمل بھی۔ صدقہ کسی بھی معاشرے کے سخت رویوں کو نرم کرتا ہے۔ یہ جو معاشرہ اندر ہی اندر اپنے سخت مؤقفات پر قائم ہو جاتا ہے اور جو ایک ابدی نفسیات کے تحت مقبولیت نہیں دکھاتا' تو صدقہ سے اس میں قبولیت پیدا ہوتی ہے۔ صدقہ قوتِ برداشت پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ صدقات کی وسعتیں کلام سے عمل تک ایک ہی طرح محیط ہیں۔

مہارتوں کا حصول

میں شاید اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے' خدا کی وضاحتیں اور اس کے نظام مزید نکھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ کل کی متشابہات آج کی محکمات ہو رہی ہیں۔ بعض آیات گرامی' جو اس وقت کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں تھیں' وہ آج کمپیوٹر یا جدید علوم کی وجہ سے بالکل واضح طور پر ہمیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔ سو علم جدید ہو یا قدیم' اپنے زمانے میں قوت فیصلہ رکھتا ہے۔ جب ایک شخص نے حضرت امام زین العابدینؑ سے سوال کیا کہ حضرت گرامی! آج تو آپ لوگ زندہ ہیں' جن سے ہم علم سیکھ لیتے ہیں' کل کو کیا ہوگا؟ فرمایا' ہر زمانے کا علم قرآن کی بہتر تفسیر میں مدد دیتا ہے۔ اس کے لیے آج کے علوم' آج کے زمانے میں قرآن کی بہتر تفسیر کر رہے ہیں۔ اسلام جدید علوم کے راستے کی قطعاً رکاوٹ نہیں ہے۔

رزقِ حلال کا جہاد

ہم میں اور ایمان والے میں ایک بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ ہم اس عرصے میں' جس میں' ہمیں خدا پر

Marfat.com

اعتبار کرنا چاہیے' اسی عرصے میں ہم اسباب پر اعتبار کرتے ہیں۔ خدا کو ہم نے کبھی مجبوری اور جبر کے حالات میں آزمایا ہی نہیں۔ دراصل ہم بہت زیادہ کمیٹڈ نہیں ہیں۔

ایک چھوٹی سی مثال ذاتی حوالے سے کہ لاہور کالج چھوڑا' تو میرے پاس محاورتاً پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اور مجھے قرض اتارنے کے لیے اپنی ایک چارپائی اونے پونے بیچنا پڑی۔ میں وہاں سے واپس آ گیا کہ جو روکھی سوکھی مل گئی' کھا لوں گا۔ میرا اس وقت تھوڑا سا پراویڈنٹ فنڈ بنا ہوا تھا۔ جب میں وہ لینے گیا تو بادشاہ لوگوں نے کہا کہ کچھ رقم لگے گی' ایسے نہیں نکلے گا۔ مجھے اس وقت غصہ آیا۔ میں نے پروردگار سے کہا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس پراویڈنٹ میں میری زندگی ہے یا بڑے اسباب میں میری زندگی ہے؟ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور گھر آ گیا۔ خدا نے مجھے زندہ رکھا۔ دس سال بعد وہ پراویڈنٹ فنڈ میرے گھر میں میرے محکمے نے مجھے ڈلیور کیا۔

کیوں نہ ضرورت میں ہم تھوڑا سا خدا کو آزما لیں۔ جب ہم سمجھتے ہیں کہ حالات و معاملات سے کارنر ہو گئے ہیں۔ تھوڑا سا جھک جائیں اور خدا کو یہ بتائیں کہ ہم تم میں یقین رکھتے ہیں نہ کہ اشیاء میں' تو مجھے یقین ہے کہ آپ نہ صرف خدا کو پا جائیں گے' بلکہ ان شاء اللہ معاملات کو بھی پا جائیں گے۔

ہر سسٹم کا متبادل سسٹم

یہ تمام سوالات حکومتی ڈھانچے' معیشت کے سپر سٹرکچر اور فیصلہ سازی کے سپر سٹرکچر سے متعلق ہیں۔ اس میں ایک فرد پر وہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک عالم فتویٰ دیتا ہے کہ بینکوں کی تمام نوکریاں حرام ہیں' تو یہ فتویٰ اس عالم کی جہالت کا بین ثبوت ہوگا۔ کیونکہ اگر اس قسم کے دو چار دس فتوے اور آ جائیں' تو میرے خیال میں پاکستان میں زندگی بڑی مشکل ہو جائے گی اور ہر آدمی کام کاج چھوڑ کنارے لگ جائے گا۔ چونکہ بہت سارے معاملات میں معیشت اور معاشرت کی ذمہ داری حکومتی نظام پر ہوتی ہے' تو جب تک کوئی حکومت واضح تبدیلی کا ثبوت نہ دے اور کسی مقصدیت یا اسلام کو فروغ نہ دے' اس وقت تک اسلام جزوی طور پر کسی قیمت پر نافذ نہیں ہو سکتا۔

اسلام ایک ملا جلا نظام ہے' جس میں نظام عدل بہت ضروری ہے۔ جب آپ موجودہ زمانے میں دیکھتے ہیں' تو یوں لگتا ہے کہ اسلامی شریعت غالباً سب سے مظلوم گداؤں کی طرح ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ حضرات بیٹھے ہوئے وہاں کرتے کیا ہیں؟ تمام تر قوانین و معاملات غیر اسلامی قوانین کے پیٹرن میں طے ہوتے ہیں۔ ہمیں خدا کی توہین کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے قانون کو ابتر حالت میں رکھتے رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسا ہی کرتے رہے' تو خدا ہمیں کبھی امن نہیں دے گا۔

فرض کیجیے کہ تمام مسلمان شعوری طور پر کسی نظام کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں' تو خدا نے ہر سسٹم کا متبادل سسٹم دیا ہے۔ جیسے کہ لوگ سود کی بات کرتے ہیں' مگر اللہ نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ تھوڑا سا غور کریں' تو پتہ لگے گا کہ پورے قرآن حکیم میں سود کے بارے میں صرف ایک آیت ہے' جو اصولی آیت ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ خدا نے کہا فان لم تفعلو فضل بحرب من اللہ و رسولہ کہ جو اس طرح کے کام کرے گا' وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔

Marfat.com

مگر بحیثیت اصول سود کے بارے میں اللہ نے بڑی مختصری بات کی اور بات ختم کردی یمحق اللہ الربو ویربی الصدقت کہ اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اگر سود سرکاری اور قومی سطح پر لیا جارہا ہے۔ اس کو کم کرنا ہے اور خدا کو آزمانا ہے' تو آپ کو صدقات کے نظام بھی گورنمنٹ کی سطح پر بڑھانے ہوں گے۔ جب آپ کے پاس ایسا کوئی سسٹم وجود نہیں کرتا نہ آپ اس کو چلانے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں' تو جو مرضی ہے کرلیں' آپ سود سے نجات حاصل نہیں کرسکتے۔ مگر انفرادی سطح پر اگر کوئی مجبوری ہے۔ آپ کی سلامتی' آپ کی جان اور آپ کی زندگی اضطراب میں ہے۔ پیسہ پاس رکھنے میں خطرہ ہے' تو اوّل تو خرچ کردیا کریں' ورنہ مجبوری کی بات اور ہے۔

حلال وحرام گڈمڈ

آج کے دور میں رزق حلال اور حرام کچھ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ حلال والے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے کمارہا ہے؟ کدھر سے کمارہا ہے؟ وہ محنت بھی کرتا ہے اور تردد میں بھی رہتا ہے۔ وہ اپنی حد تک تو بڑا نیک نیت ہوتا ہے' مگر حلال کھانے کے تمام رستے اس پر بند کردیئے جاتے ہیں۔ ایسے عالم میں اس پر بھی اضطراب کا قانون لگتا ہے۔ اگر جان جارہی ہے اور کوئی ذریعہ زندگی نہیں ہے' تو پھر اپنی حد تک حلال کھاؤ۔ جیسے یہ رشوت کا قانون ہے۔ ایک دیانتدار آدمی بھی موجودہ کاروبار زندگی میں کسی قسم کی حرکت کو جاری نہیں رکھ سکتا' جب تک وہ رشوت نہ دے لے۔ میرے نقطۂ نظر سے نقصان ہوتا ہے' ہوجائے۔ جو رزق نہیں ملتا' نہ ملے' میں اس رزق کو حاصل کرنے کی جدوجہد نہیں کرتا۔ یہ میری حد تک ہے۔ اگر کسی رزق میں حرام کا شائبہ ہو اور اس کے بغیر گزر بھی نہ ہو' تو اس پر بھی وہی اطلاق لگے گا کہ انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر۔

Marfat.com

قرآن کی تلاوت یا مطالعہ

ہر کتاب خواہ معمولی ہو یا بڑی' اس میں کسی نہ کسی گائیڈ یا پڑھانے والے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قرآن حکیم تو اتنی بڑی کتاب ہے کہ پوری کائنات کے موضوعات اس میں موجود ہیں۔ بہت ساری قرآن حکیم کی شرحیں' جو میں نے دیکھی ہیں' ان میں بنیادی نقص شارح میں نہیں' بلکہ شارح کے علم کے معیار میں پایا۔ ایک بڑا عالم بھی یک طرفہ عالم ہونے کی حیثیت سے کچھ آیات کی وضاحت اچھی طرح کر لیتا ہے۔ مگر وہ باقی آیات کی وضاحت میں کمزور رہ جاتا ہے۔

اگر ہم علم سے تعصب نہ رکھیں اور شارح یا مفسر سے تعصب رکھیں' تو ہمارا علم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی ناقص رہ جاتا ہے۔ اس میں مسلک ملوث نہیں ہے۔ اسی تردد میں' میں نے لاہور میں ایک قرآن دیکھا۔ اس کی اشاعت انہوں نے عدم فروختگی کے باعث بند کر دی تھی۔ اشرف بک ڈپو نے اسے شائع کیا۔ قرآن کا نام'' فوائد سلفیہ' اور دوسرا'' اشرف الحواشی'' تھا۔ میں اسے اپنے نصیب کی خوبی کہتا ہوں کہ مجھے یہ قرآن ملا۔ اس میں ایک خاص بات یہ نظر آئی کہ مدون اور مرتب نے اس میں قرآن کے ساتھ ساتھ زیادہ تر اصحابِ رسولؐ کی تفسیر درج کی تھی۔ میرے لیے یہ بات بڑی خوش آئند تھی کہ قرآن کی جس آیت کو اصحابِ رسولؐ جیسے سمجھا' اگر میں اس معیار اور سادگی تک پہنچ جاؤں' تو میرا نصیب بن جائے۔ میں آپ کو مذکورہ قرآن حکیم میں اصحاب کی تفسیر کے جو خوبصورت پہلو نظر آئے' بتاتا ہوں۔

قرآن کی ایک آیت ہے وعبد ربک حتی یا تیک الیقین کہ عبادت کیے جا' حتیٰ کہ تو یقین تک پہنچے۔ دیگر تفاسیر کی طرح شاہ رفیع الدین احمد نے بھی اپنے ترجمے میں یقین کا لفظ لکھا ہے۔ لیکن زیر نظر تفسیر میں اصحاب نے متفق علیہ یقین کا ترجمہ موت کیا ہوا ہے۔ جب میں نے موت کو یقین کی جگہ رکھ کے دیکھا' تو اس آیت کے معانی کمال کی عجیب و غریب تفسیر تھی۔ اصحابِ رسول نے یقین کا ترجمہ موت کر کے صرف ایک معمولی سی وضاحت کی کہ واعبد ربک حتی یاتیک الیقین عبادت کیے جا' حتیٰ کہ تو یقین تک پہنچے۔ Till death you cannot confirm your opinion

عبوری عرصے میں کبھی بھی اپنی رائے کو حتمی نہ جاننا۔ جب آپ زندہ ہوں اور علمی جدوجہد کر رہے ہوں' تو

Marfat.com

اس وقت تک کبھی بھی نتائج نہ نکالنا۔ اپنے آپ کو ہمیشہ ایک طالب علم کی طرح نرم رکھنا اور سیکھتے رہنا چاہیے۔ حتیٰ کہ تو موت تک پہنچے۔ میں اس شخص کا بہت شکرگزار ہوں' جس نے قرآن کا یہ ترجمہ ترتیب دیا اور وہ اتنا قیمتی قرآن ہے کہ اس کے حاشیے میں تفسیر صحابہ درج ہے۔ آج تک مجھے قرآن فہمی میں اصحابؓ کی رائے کے آگے کسی رائے کی ضرورت نہیں پڑی۔

اب ایک اور مثال سائنسی ایشو کے حوالے سے اسی قرآن میں سے بتاؤں۔ ایک جگہ قرآن نے کہا کہ زمین پہلے بنائی۔ دوسری جگہ کہا' آسمان پہلے بنایا۔ مسئلہ یہ تھا کہ زمین اور کائنات کی تخلیق کے بارے میں کس بیان کو کہاں ایڈجسٹ کیا جائے؟ کہیں ان میں تضاد نہ آ جائے۔ میں نے تقریباً تمام وضاحتیں دیکھیں۔ بڑے بڑے عالموں کی تفاسیر سے رجوع کیا' جو قرون وسطیٰ سے چلتی تھیں۔ کسی جگہ مجھے اس کی وضاحت نظر نہیں آئی۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ واحد تضاد تھا۔ جب میں زیرنظر قرآن پڑھ رہا تھا تو کسی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ٹھیک یہی سوال پوچھا تھا۔ ان کا جواب اتنا سائنٹفک تھا کہ مجھے شدید حیرت ہوئی کہ ایک صحابی کی فہم و فراست کہاں تک پہنچتی ہے۔ فرمایا کہ زمین پیدا تو پہلے کر دی گئی تھی' مگر اس کا ظہور اور پھیلاؤ بعد میں سامنے آیا۔

غور طلب بات ہے کہ دو ارب سال جمع دو ارب سال' تو زمین تو پہلے چھ ارب سال میں جدا ہو گئی تھی۔ مگر اس کے پھیلاؤ اور ٹھہراؤ میں دو ارب سال اور گزر گئے اور یہ وضاحت صرف اور صرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہی دے سکتے تھے۔ مذکورہ قرآن میں تاریخی پس منظر بھی ہے اور اصحاب کی تفسیر بھی۔

دنیاوی یا قرآنی علم

میں نے یہ بات قطعاً نہیں کی کہ دنیاوی علوم کو تلاش نہ کیا جائے' بلکہ میں نے یہ کہا کہ ہم اتنی سنجیدگی اور لگن کے ساتھ دنیاوی علوم حاصل کرتے ہیں' جو کہ ایک کم تر مقصد ہے۔ کم تر مقصد کا مطلب وہ علم ہے' جو ہمیں اپنی ترجیح اوّل کی طرف رہنمائی نہیں کرتا۔ خدا کے لیے علم کے سوا باقی تمام علوم ووکیشنل ہیں۔ ایک آرٹسٹ' ادیب' سائنسدان' ٹیچر اور فنی علوم کا استاد اپنی علمی اور ذہنی کاوش کے عوض اپنی زندگی گزارنے کے اسباب بھی مہیا کرنا چاہتا ہے' تو تمام علوم سوائے خدا کی شناخت اور پہچان کے وہ علوم ہیں' جن سے ہم زندگی گزارتے ہیں۔ کہیں بھی پروردگار یا اس کے رسولؐ نے ان علوم کی تحصیل سے منع نہیں کیا۔

ایک علم برائے علم ہے۔ بجائے علم کو توڑنے پھوڑنے کے' اسے برائے زندگی اور برائے علم رکھنے کے' اگر ہم علم برائے خدا حاصل کریں' تو پروردگار ہمیں ترجیح اوّل سے واپس لوٹائے گا۔ وہ آپ کو الیگزینڈر فلیمنگ یا آئن سٹائن سے بہت جلد اور بہت بہتر عروج اور خیال عطا فرمائے گا۔

حضورؐ نے بنوعیسیٰ میں دو بڑی خوبصورت صفات گنوائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے ظالم بادشاہوں کے ہاتھ روک دیتے ہیں۔ یتیم اور فقیر کے حق میں بڑے اچھے ہیں اور جب ان کو شکست ہو جائے' تو فوراً پلٹتے ہیں۔ یہ صفات بدقسمتی سے مسلمانوں میں نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ ان میں زیادہ موجود ہونی چاہئیں تھیں۔ بحران یہ ہے کہ اگر ایک شخص دنیا کے لیے محنت

Marfat.com

اور ترقی کرتا ہوا آئن سٹائن اور فلیمنگ بنتا ہے تو یہی محنت اور جستجو اللہ کے لیے اس کے رازہائے پوشیدہ کے انکشاف اور حقائق کی جستجو کے لیے کی جائے' تو اس سے بہت کم وقت میں خداوند کریم آپ کو ایسی ایجادات اور دریافتوں سے نوازے گا' جو شاید مغرب کے تصور میں بھی نہ ہوں گی۔

قرآن اور زبان عربی

ہم جو تعلیم حاصل کرتے ہیں' بی اے' ایم اے کرتے ہیں۔ پی ایچ ڈی کرتے ہیں' تو اس کے پیچھے ہمارے ذہن کی چھوٹی موٹی سرگرمی ہوتی ہے کہ ہم نے یہ کیریئر اپنانا ہے۔ انجینئر بننا ہے' ڈاکٹر بننا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق کوئی بیس پچیس سال کی محنت ہم اس مضمون کو دیتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح زندگی میں جس کا انتخاب اللہ ہوتا ہے' وہ اگر سال آدھ یا دو سال عربی کو دے دے' تو بطور زبان یہ سیکھنے اور اخذ کرنے میں زیادہ آسان ہے۔ ہم کم از کم اس چیز پر قادر ہو جاتے ہیں کہ قرآن کو سمجھیں۔ یہ انسان کی محنت اور لگن کے پیٹرن پر ہے کہ وہ کس چیز کو پہلے چاہتا ہے اور کیا اس کا لیول ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم ان لوگوں پر تکیہ کریں' جو ہم سے پہلے سپیشلسٹ ہوئے ہیں۔ جیسے پاکستان و ہندوستان میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر تھے۔ اگر ہم ان کے تراجم ٹھیک سے پڑھیں اور یہ سمجھیں کہ یہ عربی کے اچھے دانشور اور اسکالر تھے یا جیسے کہ آپ کو انگریزی آتی ہو' تو عبداللہ یوسف علی نے اچھا ترجمہ کیا ہے۔ ہمیں کوئی نہ کوئی رستہ مل جاتا ہے۔

پھر قرآن حکیم کے ترجمے میں بھی کوئی اتفاق نہیں ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ غلطیاں ترجمے میں اس وقت ہوتی ہیں' جب ہم محاورتاً دورِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق ان کا ترجمہ نہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر میں آپ کو ایک ترجمہ بتا رہا ہوں وجعلنا من الماء کل شئی حی ہم نے ہر حیات کو پانی سے پیدا کیا۔ اگر تو آپ اس کو سادہ رکھیں اور ترجمہ کرنے والا آپ کو یہ ترجمہ دے کہ ہم نے حیات کو پانی سے پیدا کیا' تو آپ کو کبھی کنفیوژن نہیں ہوگی۔ مگر جب مترجم یہ کہے کہ آدمی تو پانی سے نہیں پیدا ہوتا۔ وہ شبہ کرے اور ماء کی کوئی اوٹ پٹانگ سی تعبیر شروع کر دے اور کہے کہ اس سے مراد رحم مادر ہے اور اس سے مراد جینٹک ہیومن ہیں' تو مسئلہ تو ہوگا۔ قرآن کے مخصوص تراجم میں یہ مصیبت پیش آتی ہے۔

مثال کے طور پر اللہ نے فرمایا ثم استوی الی السماء فھی دخان کہ اللہ بلند ہوا آسمانوں پر' وہ دخان تھے۔ اب اصولاً دخان کا ترجمہ شاہ رفیع الدین احمد نے دھواں کر دیا۔ یہ ترجمہ کسی دوسرے مترجم کو ٹھیک نہیں لگا۔ اس نے کہا' وہ دھواں سا لگتا تھا۔ یہ ترجمہ کر دیا۔ یہ چیزیں ہمیں ترجمے سے دُور لے جاتی ہیں۔

بعض ترجمے اتنے مزیدار ہوتے ہیں کہ جیسے خدا نے کہا' یہ یاوہ گوئی کرتے ہیں۔ اب دیکھیں' لفظ یاوہ گوئی ہے۔ مترجم نے لکھا کہ خدا کہتا ہے' یہ لوگ بکواس کرتے ہیں۔ کیا آپ کو ترجمے میں آکر یہ عجیب نہیں لگتا؟ مترجم نے اپنے ماحول کی' محلے کی ڈور بیچ میں شامل کر دی۔ فضول گفتگو کی بجائے مترجم نے لکھا کہ اللہ نے کہا' یہ بکواس کرتے ہیں۔ بہت عجیب بات لگتی ہے کہ اللہ میاں اس قسم کی بات کیوں کہے گا۔

بعض اوقات مترجم ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں' عالمانہ نظر سے نہیں۔ بلکہ ایک مقامی نظر سے دیکھتے ہوئے ترجمے کو مشکوک کر دیتے ہیں۔ مگر الحمدللہ قرآن حکیم خالی اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ فارسی' انگریزی میں دنیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم تو قرآن پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ اگر میں آپ کو ایک صفحہ دکھا دوں' جو صحیفہ عثمانی ہے' تو آپ اسے ایک اچنبھے کی کارروائی سمجھیں گے' قرآن نہیں سمجھیں گے۔ اللہ اپنے دین کی مدد کسی فاسق و فاجر سے بھی لے لیتا ہے۔ جب مسئلہ غیر اقوام کا پیش آیا' تو حجاج بن یوسف نے اعراب لگوائے۔ چنانچہ اب جو قرآن نصیب ہے' اس سے ہر آدمی قرآن پڑھ سکتا ہے' سمجھ سکتا ہے اور کسی مکمل عالم سے بھی اس کے سمجھنے کے لیے مدد لے سکتا ہے۔ مگر بنیادی بات یہ ہے کہ آپ واقعی خدا کے بارے میں کچھ سمجھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر وہ جذبہ موجود ہو' تو تھوڑی کوشش کے بعد اس مشکل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

میں آپ کو اپنی مثال دیتا ہوں۔ مجھے گھر پر کسی نے ناظرہ قرآن بھی ٹھیک سے نہیں پڑھایا۔ میں قرآن پڑھنے سے بھاگ جاتا ہوں۔ پوسٹ گریجوایشن میں لٹریچر پڑھا۔ دنیا جہان کے فلسفوں کا مطالعہ کیا۔ پھر مجھے اللہ کا شوق پیدا ہوا۔ اللہ ہی کے لیے میں نے پہلی مرتبہ قرآن صدق دل سے پڑھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کس قسم کی ہستی ہے۔ اس کو سمجھا' اس کو جانا۔ اللہ کی وجہ سے اس سے تھوڑی بہت انسیت اور محبت پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ انسانی بشری تقاضوں کے باوجود۔ اللہ کی وجہ سے آج میں اس قابل ہوا کہ جو کچھ جانتا ہوں' اس کو آپ تک پہنچا سکوں۔ میرے خیال میں بنیادی شوق اللہ ہی کا ہے۔ یہ کوئی ایسی مشکل نہیں ہے' جس کا آپ تذکرہ کر رہے ہیں۔ یہ کور ہو سکتی ہے۔

جہاں تک عجمی ہونے کا سوال ہے' عجمی کا مطلب اس وقت گونگا مشہور تھا۔ عرب اپنے سوا تمام قوموں کو گونگا کہتے تھے۔ انہیں اپنی زبان پر اس قدر ناز تھا کہ وہ تمام زبانوں کو گھٹیا اور کم تر سمجھتے تھے۔ اپنے آپ کو فصیح و بلیغ کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عربی میں اُترا۔

زبانوں کے حوالے سے ذرا وضاحت ہو جائے۔ اردو زبان فرانسیسی' عربی اور سنسکرت زبان کا ملغوبہ ہے۔ انگریزی میں چاند کے لیے Moon اور Luna اور سورج کے لیے Sun اور Solar ہے۔ اس کے علاوہ تیسرا کوئی لفظ نہیں ہے۔ اردو زبان میں قمر' چاند' مہ' مہتاب ہے۔ اسی طرح سورج کے لیے متقابل پندرہ لفظ نظر آئیں گے۔ جبکہ عربی اتنی بڑی زبان ہے کہ اونٹ کے پیدا ہونے کے بعد اس کے جوان ہونے تک اس کی زندگی میں ایک سو اڑتیس لفظ ہیں۔ قرآن کو اس لیے خاص طور پر عربی میں اتارا گیا کہ اس کے ترجمے میں سہولت ہے۔ یہ جس زبان میں بھی جائے' اس کو ترجمہ کرنا آسان ہے۔ اس کے پاس اتنی فراخی اور مواد ہے کہ ساری زبانوں میں جتنا بھی کوئی مشکل لفظ ہو گا' وہ کسی نہ کسی ترجمے پر پورا اتر آئے گا۔ یہ بھی ایک کرامت اور معجزۂ قرآن ہے اور ہم عجمیوں کے لیے تحفہ ہے۔

فقہا اور فقہی مسائل

اصل میں امام اعظم کبھی محدث نہیں رہے۔ وہ بنیادی طور پر فقیہ ہیں۔ ان کو کسی نے بھی تاریخ میں محدث نہیں کہا۔ مگر بالعموم جب ایک تخصیص ہوتی ہے' تو اس کو حاصل کرنے کے لیے بھی ایک معیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت

Marfat.com

امام ابوحنیفہ نے امام عامش سے حدیث پڑھی ہے اور امام عامش اپنے وقت کے سب سے بڑے فقیہ اور محدث تھے اور ان کے استادوں میں شامل ہیں۔ کچھ عرصہ حضرت الامام اور حضرت امام مالک کی بھی آپس میں شناسائی رہی ہے۔ ابوحنیفہ نے حدیث کو اتنا استعمال کیا ہے، جتنا کسی فقہ کے لیے ضروری ہے۔ بسا اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ امام اعظم نے کسی کمزور حدیث کو بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ حالانکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی انہوں نے باقی لوگوں کی نسبت زیادہ سختی اور پابندی کا رویہ اختیار کیا ہے۔

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلے میں ہی حضرت امام اعظم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخری زمانے کی پیروی کی اور زیادہ سختی کا مظاہرہ کیا ہے، جس کی وجہ سے آج ہمیں بڑے مسائل لاحق ہیں۔ پتہ نہیں، اہلسنت و الجماعت کیا کہیں گے، جب ان سے پوچھا جائے کہ آپ کے کتنے آئمہ ہیں، تو وہ بالعموم کہتے ہیں کہ ہمارے چار آئمہ ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ کون کون سے ہیں، تو کہیں گے، حضرت ابوحنیفہ، احمد بن حنبل، انس بن مالک، محمد بن ادریس الشافعی۔ اگر کسی حنفی سے پوچھا جائے کہ ابوحنیفہ کے علاوہ بھی کسی کا فتویٰ مانتے ہو، تو وہ کہے گا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ جو اہلسنت والجماعت کے اندر کشمکش شروع ہے، یہ مختلف فقہاء و آئمہ کے مقلدین کے ذریعے ہے۔ حنابلہ اور شافعیہ میں بہت سارے سوالات کی ہم آہنگی ہے۔ اب آپ اہلسنت والجماعت سے یہ پوچھیں کہ حنفی تو شافعی کی بات ہی نہیں مانتے، وہ آپ کے امام کیسے ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ امت مسلمہ کے چار فقیہ ہیں۔ لفظ امام اور ٹائٹل ہٹا کے دیکھئے۔ امام سے ذرا نوعیت مختلف ہو جاتی ہے۔ اُمت مسلمہ کو یہ چار فقیہ نصیب ہیں، جو قانون میں اُمت مسلمہ کی آسانی کے لیے قانون کی توجیہ کر رہے ہیں۔

اب ہوتا کیا ہے کہ نعمان بن ثابت کوفہ میں رہے اور ایک آدمی مدینہ میں رہا۔ اب مدینہ میں انس بن مالک کا فتویٰ چلتا ہے۔ فرض کریں، اس کو اختلاف کی ضرورت پڑ گئی کہ ہم کسی اور فقیہ کی رائے لے لیں، تو اس کو نہیں مل سکتی۔ کیونکہ اس کے پاس گنجائش اور وسائل نہیں ہیں کہ وہ کوفہ پہنچ کر نعمان بن ثابت سے فتویٰ لے لے۔ چنانچہ پرانے زمانے میں ان آئمہ اور فقہا کو شہروں اور علاقوں میں قید ہونا پڑا۔ جیسے مالکیہ کا ایک بندہ اندلس میں چلا گیا، تو اس کی وجہ سے وہاں کی فقہ مالکیہ ہوگئی۔ مدینہ اور مکہ میں انس بن مالک کی فقہ ہے۔ باقی تمام ممالک میں ابوحنفیہ کی فقہ چلتی ہے۔

حضرت علی بن عثمان سیدنا ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ میں باغ دمشق میں سویا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہؐ ایک نحیف و ناتواں شخص کو اٹھائے ہوئے آتے ہیں۔ دوڑ کر قدم بوسہ رسول ہوا۔ میں نے خیال کیا، یہ کون مقدس ہے، جس کو رسول اللہؐ نے اٹھایا ہوا ہے۔ حضورؐ نے میرے قلب پر آگاہی پائی اور کہا، علی بن عثمان! یہ تیرا اور تیرے لوگوں کا امام ابوحنیفہ ہے۔ ابھی حضرت سیدنا علی بن عثمان ہجویریؒ ہندوستان میں نہیں آئے تھے۔ دوران تربیت میں یہ خواب دیکھا۔ مگر اس کی سچائی دیکھئے کہ کچھ عرصے بعد سید ہجویر کو ہندوستان آنا پڑا اور ولایت ہند کی تہنیت کی گئی۔ وہ اپنے زمانے کے قطب الاقطاب اور ولئ ہند بھی تھے۔ جب ان کو یہ عطا ہوئی، تو ایک عارف نے، جس فقہ کو لاگو کرنا تھی، یعنی غزنی سے لے کر راج کماری تک، وہ تمام ہندوستان کی فقہ حنفیہ تھی۔

آج کے زمانے میں مسائل کچھ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ جگہیں مختصر ہو گئی ہیں۔ امریکہ سے بھی ہم ایک پل میں

Marfat.com

فتویٰ منگوا سکتے ہیں اور ریاض سے بھی۔ اب اصولاً زندگی اتنی پیچیدہ ہوگئی ہے کہ جس امام نے بھی جس غور و فکر سے مسائل کو سمجھا اور ان پر تقریظ یا توجیہ کی ہے، میرے خیال میں اب ان چاروں آئمہ سے استفادہ کرنا ہمارا حق ہے۔ اب ان چاروں فقیہوں کی رائے کو مدنظر رکھ کر ایک نئی فقہ کو ترتیب دینا ہوگا۔

ہم فقیہ اس کو کہتے ہیں، جو قرآن کی اس آیت کے مصداق ہو طه ما انزلنا علیک القرآن لتشقی ہم نے قرآن کو مشقت کے لیے نہیں اتارا۔ اسے چاہیے کہ وہ بندگان خدا پر اسلامی تعلیمات کو آسان کر کے پیش کرے۔ ان کو سانس دے۔ یہ جو ہمارے ہاں مذاہب رائج ہیں ان کے لیے زندگی چھوڑنی پڑتی ہے۔ حضورؐ کے زمانے میں جو مذہب تھا، وہ مذہب بھی تھا اور زندگی بھی تھی۔ اب ہمیں معمول سے ہٹنا پڑتا ہے اور یہ مذہب کی غلط توجیہ ہے۔

میں بنیادی طور پر حنفی مسلک میں ہوں۔ مگر میں فتاویٰ حنابلہ اور شافعیہ کے مطابق دیتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے پتہ ہے، لوگوں کا علم نہیں ہے۔ میرے علم میں ایسی احادیث بھی ہیں اور ابن ماجہ کی حدیث بھی موجود ہے کہ وہ ابن عباس کے پاس آئے اور پوچھا۔ ابن عباس! رسول اللہؐ کے زمانے میں کیا متعدد طلاقیں ایک نہ سمجھی جاتی تھیں؟ فرمایا، ہاں۔ پوچھا کہ ابن عباس! کیا حضرت ابوبکرؓ صدیق کے زمانے میں متعدد طلاقیں ایک نہ سمجھی جاتی تھیں؟ کہاں ہاں۔ پھر پوچھا ابن عباس! زمانہ اقتدار عمرؓ میں متعدد طلاقیں ایک نہ سمجھی جاتی تھیں۔ کہا، ہاں۔ پھر جب عمرؓ نے طلاقیں کثرت سے ہوتی دیکھیں، تو پھر تینوں طلاقوں کو آخری قرار دیا۔ اب دیکھیں، یہ ایک ایڈمنسٹریٹو آرڈر ہے۔ صورتحال خراب ہو رہی تھی۔ لوگ تعلیمات علمی کو الجھا رہے تھے۔ اب ہمیں لازم پڑتا ہے کہ ہم آج کے مسائل کو سمجھیں۔ ہم لوگوں کی تعلیمات اور ان کے انتخاب میں اضافہ کریں۔ جتنے ہمارے انتخاب میں اضافہ ہوگا، ہمارا مذہب زیادہ کشادہ اور زیادہ قابل فہم ہو جائے گا۔

استخارے کا پراسس

ہر شخص یقیناً کر سکتا ہے اور کسی شخص کا استخارہ کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔ میں نے یہ بڑا عجیب و غریب طریق دیار پاکستان میں دیکھا کہ ہم نے مولوی صاحب سے استخارہ کرایا۔ اپنی فلاں پھوپھی سے بڑی نیک ہیں، ان سے استخارہ کرایا۔ بھلا ان کو اس مسئلے سے کیا تعلق ہے، جو ان کو استخارے کا جواب آئے گا؟ استخارہ بڑی سادہ سی چھوٹی سی روایت ہے۔ حدیث ہے کہ اس شخص کو کبھی خسارہ نہیں ہوا، جس نے استخارہ کیا۔ استخارہ کا مطلب یہ ہے کہ کنفیوژن میں دو راستوں میں انتخاب کے لیے آپ اپنی چوائس کی بجائے خدا کی رہنمائی طلب کرتے ہیں۔

استخارے کا سادہ پراسس یہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے دو رکعت نفل ادا کریں اور ہر رکعت میں تین مرتبہ الحمد کے ساتھ سورہ اخلاص پڑھیں۔ پھر بولیں نہیں اور خدا سے آرزو رکھیں کہ اے پروردگار! میں اس مسئلے میں الجھا ہوا ہوں، مجھے رہنمائی عطا فرما۔ جب آپ سوئیں گے، ایک دن، دو دن، تین دن کے اندر آپ کو کسی نہ کسی بڑے واضح اشارے سے ہدایت مل جائے گی۔

نفاق، نماز، شیطان

نفاق عملی نہیں ہوتا۔ عمل میں کوئی نفاق نہیں ہوتا، بلکہ نفاق تقسیم دل کو کہتے ہیں۔ جب آپ کا دل تقسیم ہو جائے۔

Marfat.com

خیر و شر میں تفریق نہ کر سکے اور آپ کی جبلی قدروں اور ذاتی خواہشوں کو ان احکام الٰہیہ سے جدا نہ کر سکے' جو حدود ہیں اور جو لازم ہیں' تو آپ کا دل نفاق کا شکار ہوتا ہے۔ جب آدمی کا دل کسی بڑی خطا یا جرم کا ارتکاب کرنے کے لیے ایسے دلائل گھڑے' جو قرآن و حدیث کی اصولی حدود کو ناقص کریں' تو اس وقت آپ کا دل منافق ہوتا ہے۔

جب آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کیوں نماز نہیں پڑھتے ہو' تو اکثر جواب یہ ہوتا ہے کہ کیا پڑھیں؟ نماز میں تو ہر وقت وسوسے آتے رہتے ہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جب نماز پڑھوں' پورے خشوع و خضوع اور اطمینان کے ساتھ پڑھوں۔ میں وساوس والی نماز پڑھنا نہیں چاہتا۔ جب کوئی بہانہ عذر بنا کر یہ کہے کہ میں وساوس والی نماز نہیں پڑھنا چاہتا' تو یہی نفاق دل ہے۔

اگر انہوں نے تھوڑا سا قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا ہوتا' تو نماز کے لیے خدا نے ہمیشہ اقامت کا لفظ استعمال کیا ہے کہ اس کو قائم ہونا چاہیے۔ آپ کا دل چاہے نہ چاہے' اتنی مدت کی جو آپ نماز پڑھتے ہیں' اس میں یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا کہ ساری زندگی ایک جوش' ایک اخلاص سے کوئی کام کیا جائے۔

کمپیوٹر کیوں ایجاد ہوا؟ اس لیے کہ انسانی یادداشت اپنی ہی کارکردگی کو اتنی ہی تعلیم کے ساتھ بار بار دُہرا نہیں سکتی۔ ایک آدمی جو ایک وقت میں سو نمبر لیتا ہے' دوسرے وقت میں ہو سکتا ہے' دس نمبر لے۔ انسان نے اپنی استعداد کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے کمپیوٹر ایجاد کیا۔ کیونکہ کمپیوٹر اس معاملے میں خطا نہیں کرتا۔ جو اس نے استعداد ایک مرتبہ دکھائی ہے' ہر مرتبہ بٹن دبانے پر وہی استعداد دکھائے گا۔ یہ کمپیوٹر کا بنیادی راز ہے۔

اب آپ دیکھیں کہ خداوند کریم' جو انسانی ذہن اور انسانی بنیادی مسائل کو سمجھتا ہے' وہ آپ سے کب یہ توقع کرے گا کہ ہر مرتبہ بڑے خلوص' بڑی محبت اور بڑے خشوع و خضوع سے نماز پڑھیں۔ نصیحت تو اس نے کر دی' مگر جیسے مسئلہ آپ کو آج پیش آ رہا ہے' جب اصحابِ رسولؐ نے عرض کیا' یا رسولؐ اللہ! نماز میں وساوس بڑے آتے ہیں؟ فرمایا' عین ایمان ہے۔ آپ کو وسوسہ برا لگتا ہے اور نماز چھوڑنے کا بہانہ لگتا ہے' جبکہ رسولؐ اللہ فرماتے ہیں کہ عین ایمان ہے۔

اب عین ایمان کی وضاحت یہ ہے کہ جب کبھی انسان نماز میں کھڑا ہوتا ہے' تو کوئی اور ایسا مقام نہیں ہے' جہاں شیطان کو انسان اپنے سے جدا لگے۔ بازار میں' گفتگو میں' ہر حرکت میں' ان کی آپس میں بہت بڑی شراکت داری ہے۔ کیوں آپ کو بازار میں جھوٹ بولتے ہوئے تنگ کرے گا؟ آپ اسی کی تو خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ کیوں آپ کو ناقص گفتگو سے منع کرے گا یا وہ کیوں خوش گپیوں میں وقت ضائع کرنے سے آپ کو خبردار کرے گا؟ وہ اس وقت آپ کی مخالفت کرے گا' جب آپ اس سے بالکل ہٹ کے اس عالم کل کے ربِ کریم کے سامنے اپنی خطا کے نسیان کا ازالہ کرنے کھڑے ہوں گے۔ وہ اس وقت آپ کو ضرور بہکائے گا۔ ضرور وساوس دے گا۔

جب ان وساوس کے باوجود آپ کی نماز نہیں ٹوٹی اور آپ نے آمنت باللہ و رسولہٖ بھی کہا کہ میں اپنے اللہ اور رسولؐ پر ایمان لایا اور احکام بجالایا' تو آپ کی نماز کہیں زیادہ بہتر ہے اس سے کہ آپ جتنے بھی خشوع و خضوع سے پڑھیں اور شیطان آپ کی پرواہی نہ کرے۔ آپ بڑے خشوع و خضوع سے پڑھ رہے ہیں اور شیطان کو آپ کی کوئی پروا نہیں۔ کوئی وسوسہ آپ کو نہیں دے رہا' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اچھی طرح پتہ ہے کہ باوجود خشوع و خضوع کے آپ کی

Marfat.com

اس سے کوئی داخلی مفاہمت ضرور ہے۔

اس لیے نفاقِ دل کے تقسیم ہونے' خرچ ہونے کو کہتے ہیں۔ دل خیر کے لیے ہے۔ اللہ کی یاد اور محبت خداوند کے لیے ہے۔ دل امن اور سکون کی آماجگاہ ہے۔ دل کا اضطراب اور اس کی بے چینی اس کا نفاق ہے۔ دل کا تقسیم ہونا اور خدا کی یاد سے غافل ہونا اس کا نفاق ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب دلوں کا اطمینان خدا کی یاد میں ہے۔ جب خدا کی یاد نہ ہوگی' تو دل ضرور اپنے آپ کو منافق محسوس کرے گا۔

علم ذریعہ گمراہی

شیطان کو کبھی علم حاصل تھا نہ وہ کبھی عالم کہلایا۔ وہاں بھی اللہ نے پہلی کیٹیگری میں اعمال پر اسے عزت اور برکت دی اور تمام عرصہ وہ جانتا تھا۔ کیونکہ جب ہم شیطان کو واپس پلٹتا دیکھتے ہیں' تو اس کا دعویٰ علم کا قطعاً نہیں ہے۔ علم کا دعویٰ تو آدم کے ساتھ پورا ہوا۔ جب ملائکہ نے ضد لگائی۔ آدم کی تخلیقی صلاحیتیں اور اس کی جانچ پرکھ کا علمی شعبہ میں عروج ثابت ہوا' تو باقی ملائکہ کو کوئی شک نہیں رہا۔ مگر جب شیطان نے آدم کی مخالفت کردی' تو اس نے علمی مخالفت نہیں کی۔ بلکہ یہ کہا کہ میں تو آگ سے پیدا ہوا ہوں۔ میں نفیس تر مخلوق ہوں اور یہ مٹی سے پیدا ہوا ہے اور غلیظ تر مخلوق ہے۔ اس طرح شیطان جاہلانہ تعصبات کا پہلا بانی ہے۔ اس کو ہم عالم تو کسی صورت نہیں سمجھ سکتے۔ علم کے ساتھ ایک چیز کی اور ضرورت ضرور ہے اور وہ توفیق الٰہی ہے۔

Marfat.com

انسانی کلوننگ اور اِسلام

(ڈاکٹر عبدالجلیل خواجہ) میں نے کلوننگ کے بارے میں سب سے پہلے پروفیسر صاحب سے ایک حدیث سنی تھی۔ حضورؐ نے دجال کے بارے میں بات کرتے ہوئے فرمایا کہ دجال کے پاس ایک شخص آئے گا اور سوال کرے گا کہ کیا تو میرے بھائی کو زندہ کرسکتا ہے؟ دجال کہے گا' ہاں کرسکتا ہوں۔ وہ اس کے بھائی کو زندہ کرے گا۔ سوال کیا گیا' کیا یہ وہی شخص ہوگا؟ حضورؐ نے فرمایا' نہیں یہ اس کی مثال ہوگا۔

اب یہ بات یہاں واضح ہوجاتی ہے کہ حضورؐ شخصیت کی بات نہیں کررہے' بلکہ آپ اس جینٹک نقل اور جینٹک کوڈنگ کی بات کررہے ہیں' جو موت کے بعد بظاہر معدوم ہوگئی۔ لیکن اس شخص کے جسم کا کوئی حصہ حاصل کرکے اس کو دوبارہ سے کلون کیا جاسکتا ہے اور ایک یکساں زندہ وجود پیدا کیا جاسکتا ہے۔ سو سائنس کی مدد سے کسی شخص کا مثل تیار کرنا ممکن ہے۔ قرآن یا حدیث اس کی تردید نہیں کرتے۔ بلکہ حدیث نے اس کو پہلے سے تسلیم کیا اور اس کے بارے میں بتادیا کہ ایسا ہوگا۔ وہ تمام کام جن کا خدا دعویٰ کرتا ہے' دجال ان تمام چیزوں کا دعویٰ کرے گا۔ ان کو کرے گا اور یہ تمام اہل ایمان کا امتحان ہوگا۔

بنیادی طور پر ڈی این اے ایک مالیکیول ہے' جس کو خلیہ کہتے ہیں۔ اس کے دو حصے ہیں۔ جیسے آپ دو انگلیوں کو درمیان میں چند چھوٹی چھوٹی چھڑیاں رکھ کر چھوڑ دیں۔ یہ ڈیزائن دو بھائیوں واٹسن اینڈ کرگ غالباً نام تھا' نے دریافت کیا کہ ڈی این اے کا یہ سٹرکچر ہے۔ اس کو lader کہتے ہیں۔ اس کو یہ کھولتے ہیں۔ اس کی ایک سائیڈ دوسری سائیڈ کے مماثل ہوتی ہے۔ جب اس کا جوڑ بنایا جاتا ہے' تو وہ ڈی این اے بن جاتا ہے۔ یہ عمومی طریق کار ہے۔

اس میں ہم کیا کرتے ہیں؟ ایک سیل نکالتے ہیں۔ میں سادہ کردیتا ہوں کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے' اس میں آدھے کروموسوم ماں سے آتے ہیں' آدھے باپ سے آتے ہیں۔ یہ مل کر اڑتالیس بنتے ہیں۔ آپس میں یہ پھر تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک سیل سے دو سیل بنتے ہیں۔ لیکن جو کلوننگ ہے' اس میں پورا ڈی این اے لیا جاتا ہے' باڈی کا کوئی بھی سیل لے سکتے ہیں اور اس سیل کو لے کر ہم کسی ایسے ماحول' جو کہ اس کی نقل پروموٹ کرسکے' میں رکھ دیتے ہیں۔ یہ سیل

Marfat.com

سیکس کے بغیر یا متقابل جرثومے سے ملے بغیر نقل بنتا ہے اور پھر متفرق ہوتا ہے۔ ایک سیل سے مختلف قسم کے سیل بنتے ہیں۔ وہ سیل جو بظاہر پہچانا نہیں جا رہا ہوتا' وہ آٹھ دس قسطوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایک دل بناتا ہے۔ ایک ہڈیاں بناتا ہے۔

اگرچہ یہ سارا کام کرنے میں سائنس کامیاب ہو چکی ہے' مگر وہ اس بات کا جواب دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی کہ ان سیلوں میں فرق اور تفریق کا کنٹرول کیا ہے؟ ایک سیل سے آٹھ سیل بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہوتا ہے کہ وہ آٹھ سیل یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم دو سیل یہ بنائیں گے۔ ہم دو ہڈیاں بنائیں گے۔ یہ تفریق آج تک سائنس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

جہاں تک اس کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا تعلق ہے' میری رائے میں کوئی بھی ہتھیار یا کوئی تکنیک بذاتِ خود اچھی نہ بری ہوتی ہے۔ اگر ایک صاحب یہ کہتے ہیں کہ میرے جسم کی فلاں چیز کام نہیں کر رہی' تو آپ کسی طرح سے ایک الگ کلوننگ کر کے میرے جسم کا وہ حصہ بنا دیجیے۔ وہ حصہ بنانے سے اگر اس شخص کی زندگی بچ جاتی ہے' تو میرے خیال میں یہ فعل احسن ہو جائے گا۔ اور اگر آپ اس کو کسی منفی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیں۔ جیسے اس علم سے آپ کوئی ایسا جراثیم یا کوئی بائیو کیمیکل ہتھیار بنا لیں' جو کہ صرف لوگوں کے ایک گروہ کو ہٹ کرے' تو یہ درست نہیں۔

جیسا کسی زمانے میں خبر آئی تھی کہ یہودیوں نے ایک ایسا ہتھیار تیار کیا ہے کہ اگر وہ گولے کی شکل میں پھینکیں' تو وہ صرف عربوں کو ہٹ کرے گا۔ کیونکہ ان میں ایک خاص جین ہے۔ یہ آپ کو شاید بڑی دلچسپ معلومات لگے۔ کوئی تعجب نہیں ہوگا' اگر کل کو سائنسدان آپ کو یہ بتائے کہ ہم ڈی این اے دیکھ کر بتا دیں گے کہ یہ اسلام کا ماننے والا ہے' یا یہ یہودی ہے۔ چنانچہ عربوں کی شناخت جو کہ یہودیوں کی نہیں ہے' اس کے لیے وہ ایک ایسا کیمیکل ایجاد کر چکے ہیں' یا کر رہے ہیں' جو کہ استعمال کی صورت میں صرف ان لوگوں پر اثر انداز ہوگا' جن کے اندر وہ ڈی این اے یا جینز کا عنصر ہوگا۔ میرے خیال میں یہ تکنیک ہے' آپ چاہے خیر کے لیے استعمال کریں' یا شر کے لیے استعمال کریں۔

توہینِ رسالت کا قانون

توہین رسالت کے بارے میں جو قانون پاکستان میں ہے' یہ اجماعِ اُمت نے بنایا ہے اور اجماع کا فیصلہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ مگر توہین رسالت کی سزا اسلام میں پیغمبرؐ نے نہیں دی' بلکہ خود خدا نے دی۔ اس معاملے میں بنیادی تشویش پیغمبر کی نہیں' رحمت للعالمینؐ ہونے کی حیثیت میں دشمنوں پر آپؐ کی اتنی نوازشیں اور قربانیاں ہیں کہ آپ کے بس میں ہوتا' تو آپ اپنے لیے کسی کو سزا نہ دیتے' مگر یہ جو سزا توہینِ رسالت کی ہمارے مذہب میں آئی ہے' یہ رسول کی نہیں' بلکہ اللہ کی دی ہوئی سزا ہے' جو کسی بھی حالت میں اپنے پیغمبرؐ، اپنے محبوبؐ اور دوستؐ کی توہین برداشت نہیں کرتا۔ اگر ہم اسے پیغمبرؐ کے حق میں نافذ نہیں کریں گے' تو پھر خدا کوئی اور صورت خود ہی ڈھونڈ لیتا ہے۔ جیسے کہ اگر حکومت اس پر عمل درآمد نہیں کرے گی' تو پھر خدا غازی علم الدین شہیدؒ کو یہ تقویت دے دیتا ہے کہ وہ

Marfat.com

توہین رسالت پر عمل کرے۔ جیسے آج بھی ہزاروں مسلمان عزم کیے بیٹھے ہیں کہ کب سلمان رُشدی ہمارے ہاتھ آئے اور کب ہم اس پر سزا کو نافذ کریں۔

توہین رسالت کی سزا صرف اس کے لیے نہیں ہے' جو ہمارے رسول کی توہین کرتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی حضرت عیسیٰ کی توہین کرتا ہے' تو وہ بھی سزا کا سزاوار ہے۔ یہ تہذیبوں کا دور ہے' جہاں معاشروں کا غلبہ ہے۔ توہین اچانک ایک اتنے بڑے ہنگامے کو جنم دے گی' جس میں ہوسکتا ہے کہ اس میں تمام اہل ذمہ کے وجود جل کر خاک ہو جائیں۔ اس لیے سزا بڑی ضروری ہے' اس فرد کو' جس نے مختلف معاشروں کے درمیان اعتماد اور ان کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا۔

فرض کریں' ایک عیسائی توہین رسالت کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر آپ ہجوم کو اس عیسائی کی شکل کیا دکھائیں گے؟ وہ آگے بڑھتے ہوئے عیسائیوں کی پوری کالونی تباہ کر دیتے ہیں۔ تو کیا اس سے بہتر نہیں ہے کہ ان تمام جذبوں کو قابو میں رکھتے ہوئے اس شخص کو سزا ضرور دی جائے' جو انسانوں کی محبوب ترین ہستی کی توہین کرتا ہے۔ مسلمانوں' ہندوؤں اور عیسائیوں میں جو عظیم تر فسادات ہوئے ہیں' وہ اسی بات پر ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ سزا انتہائی جائز ہے اور اگر رسولؐ نہ بھی دیتے' تو مسلمانوں کو یہ سزا دینی چاہیے' کیونکہ اس کے نتیجے میں اتنی بڑی آگ بھڑک سکتی ہے کہ پورا معاشرہ بھسم ہوسکتا ہے۔

ظہار قرآن میں

قرآن میں اس کو ظہار کے معنوں میں تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسے بہت سارے مرد لڑائی جھگڑے میں قسم کھا لیتے ہیں کہ اگر میں تجھے رکھوں' تو جیسے ماں کو رکھوں۔ بہت ساروں سے اکثر اس قسم کی بدتمیزی اور بدتہذیبی ہو جاتی ہے' اس کو ظہار کہتے ہیں۔ جیسے استہزا میں بیوی کو بچہ کہنا۔ اگر تو اس کو طبعی اعتبار سے بچہ کہا جائے اور فرض کریں' وہ بچی ہے' تو شوہر کو مناسب نہیں ہے کہ اس کی بلوغت تک اس سے تعلق رکھے۔

ادائیگی زکوٰۃ اور ریا

جو بات زکوٰۃ کی ادائیگی اور ریا و دکھلاوا کی کہی گئی ہے' اس بارے میں اللہ نے قرآن میں ایک بدترین مثال دی ہے۔ وہ کسی ظاہرہ گناہ کی نہیں دی' بلکہ باطنی گناہ کی دی ہے۔ غیبت اور علم کی مثال دی ہے کہ عالم جو دین کو دنیا کے لیے استعمال کرے' اس کی مثال کتے کی طرح ہے۔ جس کی زبان آدھی باہر اور آدھی اندر ہے۔ اسی طرح اللہ نے غیبت کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔ اگر آپ ان دو باطنی چیزوں سے اجتناب کریں' تو آپ کی ظاہری عادات اور خارجی کیفیات خود بخود درست ہو جاتی ہیں۔ جو کام خارج میں بغیر سوچے سمجھے کیا جائے' وہ قیامت تک محض ایک معمول کی عادت کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے کبھی بھی اندرونی اخلاص پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے ملک میں نماز کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں۔ میں سعودی عرب کے مذہب کی حمایت نہیں کرتا۔ مگر

Marfat.com

ایک بات وہاں نظر آتی ہے کہ نماز کے وقت بندہ کوئی اور کام نہیں کرسکتا۔ بازار اور خرید و فروخت بند ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو صرف ایک ہی سرگرمی جو نظر آتی ہے' وہ نماز ہے۔ سارے لوگ نماز کو چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ملک میں نماز پڑھنے کے لیے ہمیں عمومیت سے خصوصیت کو جانا پڑتا ہے۔ ایک دفتر سے اٹھنا' وضو کرنا' اپنی میز کو سنبھالنا وغیرہ۔ ایسے حالات میں کوئی بندہ اتنی کثرت سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اسلامی معاشرے میں نماز کے وقت کوئی اور سرگرمی نہیں ہوسکتی۔ اگر ایسا ہو' تو ہر آدمی نماز کے لیے جائے گا' کیونکہ اس کے کرنے کے لیے کوئی اور کام نہیں ہے۔ ایسی فضا میں ثواب کمانا کیا برا ہے؟ کچھ کام ہمارے کرنے کے ہیں اور کچھ ہماری حکومت کے کرنے کے ہیں۔

ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ اس کی خارجی دانشمندی نہیں ہوتی۔ ہر انسان نمود و نمائش کا شائق ہے۔ اپنے آپ کو معزز کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اللہ نے قرآن مجید میں کہا کہ لوگوں سے کیا عزت ڈھونڈنے جاتے ہو فان العزة لله جمیعا تمام عزت تو اللہ کے پاس ہے۔ اس کے لیے صرف قول و فعل کا تضاد ختم کرنا ضروری نہیں ہوتا' بلکہ قول و فعل و فکر تینوں کا تضاد ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تسبیح الٰہی اور اللہ کی طرف توجہ سلسلۂ فکر شروع کر دیتی ہے اور رفتہ رفتہ آپ بہتر انسان بننا شروع کر دیتے ہیں۔

صلۂ رحمی کے احکام

جہاں بھی قرآن میں ذکر آیا یسئلونک ماذا ینفقون صرف مسلمانوں میں ہی نہیں و اذ اخذنا میثاق بنیٓ اسرآئیل لاتعبدون الا الله وبالوالدین احسانا و ذی القربی والیتمیٰ والمسکین تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس تمام عرصے میں سب سے پہلا حکم جو اللہ دیتا رہا' وہ صلۂ رحمی کا ہے۔ اعزہ و اقارب سے محبت رکھنے کا حکم ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے مردوں کو مشورہ دیا ہے' عورتوں کو نہیں کہ اگر تمہارا باپ بھائی تمہیں غلط کام کرنے کو کہیں' تو ان کو نہ ماننا' میری ماننا۔ سو حدِ فاصل اللہ کا حکم ہوا۔ اس میں صلۂ رحمی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ اللہ کے خلاف بھی ان کی تصدیق کریں۔

اگر کوئی شخص اپنی ماں کے کہنے پر ظلم کرتا ہے' تو اس کی نجات نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ خدا نے اس سے ضرور پوچھنا ہے' تم نے ظلم کیوں کیا ہے؟ ماں کی جسمانی خدمت کا بہرحال حکم ہے' مگر اس کی ذہنی خدمت کا کوئی حکم نہیں۔ اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ میں عورتوں کو زیادہ جہنم میں دیکھتا ہوں۔ ماں کی خدمت کے لیے تین بار فرمایا کہ ماں کی خدمت کرو۔ اس نے تمہیں جنا اور قرآن بھی یہی کہتا ہے کما ربینی صغیرا جب یہ بوڑھے ہو جائیں' ان کو آسرا دو۔ ان سے سخت لہجے میں گفتگو نہ کرو۔ یہ ان کی خدمات کا حق ہے' لیکن جہاں فیصلہ سازی اور ذہنی اعتقاد' دین اور اخلاق کی بات ہے' وہاں آج کل کے زمانے میں دیکھا گیا ہے کہ اکثر افراد اپنی جبلی اقدار کی طرز پر سوچتے ہیں۔ گھر گھر میں غیبت ہو رہی ہے۔ ساس اور بہو کے جھگڑے ہو رہے ہیں اور ہر مرتبہ مرد کو کسی نہ کسی طرح ناانصافی پر اکسایا جا رہا ہے۔ وہ اگر آپ مانیں گے' تو ماں آپ کو جہنم سے نہیں چھڑا سکتی' نہ سزا سے بچا سکتی ہے۔

ہر آدمی کی صوابدید اس کا انعام ہے ولا تزرُ وازرة وزرا اخری وہاں ماں باپ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ ذہنی

Marfat.com

سطح پر ماں باپ کا کوئی دخل نہیں۔ ہاں پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق۔ اگر آپ نے ماں باپ کی بالکل خدمت نہیں کی' تو آپ کو ضرور سزا اور سرزنش ہوگی۔ اس کے لیے آپ پابند ہیں۔ ان کی ذہنی طور پر تقلید کے نہیں۔

یسئلونک عن الخمر و المیسر

موجودہ سائنس اللہ تعالیٰ کے قول کا ٹھیک اعادہ کرتی ہے کہ یسئلونک عن الخمر و المیسر پوچھا گیا کہ شراب اور جوا کیسا ہے؟ قل فیھمآ اثم کبیرا و منافع للناس فرمایا کہہ دو کہ اس میں لوگوں کے لیے کچھ نفع بھی ہے اور کچھ نقصان بھی و اثمھما اکبر من نفعھما مگر اس کے نقصانات اس کے نفع سے زیادہ ہیں۔ اس لیے خداوند کریم نے اس کا سب سے بڑا نقصان یہ بتایا کہ تمہاری اپنے چاہنے والوں سے دشمنیاں ہو جاتی ہیں۔ جس خدا کی تم پرستش کرنا چاہتے ہو' اسی کے بارے میں تمہیں نہیں پتہ چلتا کہ تم اسے کیا کہہ رہے ہو۔ خمر اور جوئے کی وجہ سے تمہاری آپس میں مخاصمتیں اور دشمنیاں ٹھہر جاتی ہیں۔ تم ایک دوسرے کے خلاف قتل و غارت پر اتر آتے ہو۔ خدا کہتا ہے کہ یہ انسانی معاشرے میں اتنا بڑا نقصان پیدا کرتا ہے کہ تمہیں میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیا تم مناسب سمجھو گے کہ کار شیطان اختیار کرو یا مناسب سمجھو گے کہ میری بات کو سمجھو' جانو اور مانو؟ خدا اس کے بارے میں فیصلہ سنا رہا ہے کہ اس کی برائیاں بھی ہیں اور اچھائیاں بھی ہیں۔ چونکہ اس کی برائیاں اس کی اچھائیوں سے زیادہ ہیں' اس لیے میں اس سے منع کرتا ہوں۔

اب اس میں جو لفظ Judicious استعمال کیا گیا ہے' وہ بڑا مغالطہ آمیز ہے۔ Judicious میں اگر ماہیت اور اس کی فطرت کی تبدیلی شامل ہے' تو اس پر اس کا کوئی فتویٰ نہیں لگتا۔ بہت سی ادویات میں الکوحل ان کا حصہ ہے۔ بچپن میں برانڈی ملتی تھی۔ لوگ اپنے بچوں کو شدید نمونیہ کے لیے پلا دیتے تھے۔ اگر یہ بطور میڈیسن استعمال ہو رہی ہے' تو پھر اجازت ہے' اگرچہ کراہت ہے۔ اگر یہ ذوق و شوق اور خمار اور محبت کے لیے استعمال ہو رہی ہے' تو پھر اس کی اجازت نہیں ہے۔

آپ کا انتخاب ہمیشہ اعلیٰ سطح سے ہے۔ شراب ایک معمولی چیز ہے۔ یہ خدا کی حریف نہیں ہے۔ یہی مسئلہ سور کے گوشت کھانے کا ہے۔ اگر آپ کی خدا اور اس کے احکامات کی محبت اس سے زیادہ ہے' تو آپ نہیں کھائیں گے۔ سور تو بذاتہ کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی حلال و حرام معنی نہیں رکھتا۔ کئی چیزیں جو ہمیں حلال ہیں' بنی اسرائیل کو حرام ہیں۔ خدا کا حکم اگر اچھا لگتا ہے' تو مان لیجیے۔ اگر آپ اس کی اطاعت مناسب طور پر نہیں کرتے' تو نہ مانئے۔ ہر جگہ اور ہر لمحہ' جو آپ کا سانس جاری ہے' یہ مقابلہ رہتا ہے۔ آپ کو ترجیحات طے کرنی پڑتی ہیں۔ اسی لیے پروردگار نے کہا لن تنالو البر حتی تنفقو مما تحبون تم کبھی مجھے نہیں پا سکتے' جب تک تم میرے لیے وہ چیز قربان نہ کرو' جس سے تمہیں محبت ہے۔

یہ محبت کا سوال ہے۔ ہر وقت کے تعلق کا مسئلہ ہے۔ بنا بریں عمر خیام نے کہا کہ محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تم اس کے لیے دیتے کیا ہو؟ کوئی اشارہ' کوئی کلمہ' کوئی چھوٹی سی چیز اور کوئی ایسا بھی ہے' جو اپنی زندگی قربان کر دیتا ہے۔ شہید کیوں بڑا ہے؟ اس وجہ سے کہ وہ ایک لمحہ کے فیصلے میں خدا کے لیے زندگی دے دیتا ہے۔ اس کا چوائس بڑا ہے۔

Marfat.com

منصوبہ بندی اور عزل

خداوند کریم نے اس حکم کو مخصوص کیا ہے قتل کے ساتھ۔ اور آج کے تمام جدید انسان جانتے ہیں کہ سنگل سیل کبھی بھی تخلیق کا باعث نہیں رہا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس دو احادیث موجود ہیں' جن میں اصحاب رسولؐ نے عزل کی اجازت مانگی' جو انسانی نطفہ کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ حضورؐ نے ان کے بارے میں صرف اتنا کہا کہ پھر جس نے آنا ہے' اس نے آنا ہے۔ تمام پیٹرن مل کر ہمیں صرف اتنی بات بتاتے ہیں کہ خدا یہ حکم صرف اس وقت لگاتا ہے جب آپ کو یقین ہو کہ بچہ بن چکا ہے۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ دونوں سیل مل گئے ہیں' تو پھر زندگی کا اطلاق ہوتا ہے۔ زندگی ہے اور اس وقت اس کو ضائع کرنا یقیناً خدا کے اس حکم کے برابر ہے کہ اپنی اولاد کو رزق کی تنگی کے خوف سے قتل نہ کرو۔

Marfat.com

نماز قطبین پر

نمازوں کا چونکہ پانچ وقت مقرر ہے۔ جو لوگ شمال یا جنوب میں جائیں' وہ کیسے نماز پڑھیں' سوال ہے۔ آپ اپنے ذہن رسا کو نارسا کر رہے ہیں فسبحن الله هين تمسّون و هين تصبحون و عشى و هين تظهرون یہاں تو چار مقام واضح ہیں۔ اگر آپ ہمیشہ اندازے سے کام لے کر جتنا بھی وقت آپ کو قطبین پر نصیب ہے۔ چھ ماہ ہیں' تو ان کو پہلے مہینوں میں تقسیم کریں۔ مہینے ہیں' تو انہیں دنوں میں تقسیم کیجیے۔ جب آپ دنوں میں ڈھال لیں گے' تو پھر آپ وقفہ' نماز کو متعین کر لیں گے۔ یہ آپ کی نقل و حرکت مزاجاً ہے۔ یہ نہ ہو کہ صبح و شام آپ ایک ہی نماز پڑھنا شروع کریں اور وہی ختم نہ ہو۔

قطبین پر پہلے بھی لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ اب اسکیموز ایک ایسی سوسائٹی ہے' جو پچھلے پانچ ہزار سال سے بالکل تنہا ہے۔ اس میں کسی دوسری سوسائٹی نے دخل نہیں دیا اور یہ جو خدا قرآن میں کہتا ہے کہ پہلے سب موحد تھے۔ جب شروع شروع میں اسکیموز کا سراغ ملا' تو پتہ چلا کہ وہ سادہ سی سوسائٹی ہے۔ وہ زمانوں میں اس طرح رہی ہے کہ اس میں آمیزش نہیں ہوئی۔ جب اسکیموز سے پوچھا گیا کہ تم کسی کو اپنے علاوہ بھی مانتے ہو؟ انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا کہ اس نیلگوں آسمان میں ایک ایسی طاقت ہے کہ جب ہم دُعا مانگ کے چلتے ہیں' تو ہمیں سیل (مچھلی) زیادہ دیتی ہے۔ جب ہم دعا نہیں مانگتے' تو ہمارا تجربہ ہے کہ ہمیں سیل کم ملتی ہے۔

بعض اوقات قرآن حکیم کی چھوٹی سی آیت کے لیے آپ کو بہت بڑے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا یہ کہتا ہے کہ شروع میں سب موحد تھے۔ جب ہم تاریخ میں پیچھے جاتے ہیں' تو ہمیں ماقبل تاریخ میں ساری میتھالوجی نظر آتی ہے' آدمی خیال کرتا ہے کہ تاریخ کے پیچھے تو اصنام پرستی ہے۔ مگر اگر آپ تھوڑا سا اور پیچھے چلے جائیں' تو حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ میتھالوجی کے پیچھے ایک خدا ہے۔

یونانی میتھالوجی میں ذیوس کی حفظ مراتب شروع ہوئی۔ Aphrodite, Hephastus, Appolo, Hirmis یہ جملہ خدا' ایک Cronus کی پیداوار ہیں۔ اسی طرح دیوتا اور دیویوں کے انڈیا میں جو ڈھیر لگے ہیں۔ لیکن وہاں بنیادی طور

Marfat.com

پر دو طرح کی مورتیاں ہیں۔ تمام اصنام کو مختصر کرتے جائیں' تو یہ سارے بت پیچھے ہٹتے ہٹتے تین تین بتوں تک آتے ہیں اور جب ان سے بھی پیچھے آئیں' تو دوسری تری مورتی برہما' شیوا اور وشنو کی ہیں۔ اس سے پیچھے آئیں تو پہلی تری مورتی اندرا' متھرا اور ارونا کی ہیں۔ یہ بات تصدیق شدہ ہے کہ جب آرین ہندوستان میں داخل ہوئے' تو ان کا صرف ایک خدا تھا' اور وہ اندرا تھا۔ آج بھی اندرا کی تعریف گاڈ آف تھنڈر اور گاڈ آف سورگ ہے۔ یعنی جنت کا خدا اور قہر و غضب کا خدا۔

کافر کے ساتھ تجارت

کافر کے ساتھ تجارت جائز ہے۔ اس لیے آپ ان باتوں کی کبھی بھی دلیل نہیں بنا سکتے۔ ہماری تجارت کے بنیادی مراکز ہی باہر ہیں۔ ہمیں مشینیں ان سے لینی ہیں۔ آپ کا توازن تجارت اس لیے بگڑا پڑا ہے کہ آپ کو ہر بہتر چیز کے بنانے کے لیے یورپ' امریکہ اور دوسری جگہوں سے بھاری مشینیں درآمد کرنی پڑتی ہیں۔ اگر آج یہ ٹائی یہاں کے کسی نے بنائی ہوگی' مگر میرا خیال ہے کہ آپ کے کپڑے کا ایک ایک ریشہ کسی خارجی مشین سے ہی بنا ہوگا۔ اس لیے تجارت عین جائز ہے۔ اس میں کسی قسم کا مسئلہ نہیں۔ آپ ایک اچھی چیز کو کہاں سے لیتے ہیں؟ جیسے حکمت میراث مومن ہے۔ جہاں سے ملتی ہے' اٹھالو' ایسے ہی کوئی خوبصورت پہناوا' شے اور کوئی اچھی خوراک حرام و حلال کے فلسفے سے آگے ہوتے ہوئے آپ کو کسی جگہ سے ملتی ہے' ضرور لیں اور کھائیں۔ بدخشاں کا لعل مشہور ہے۔ یمن کا عقیق مشہور ہے۔ ہوسکتا ہے اٹلی کا پیزا مشہور ہو۔

قبروں پر سنگ مرمر

کسی بڑے زلزلے میں قبر بھی گر جاتی ہے اور ایک مکان بھی گر جاتا ہے۔ یہ میں نہیں مانتا کہ پکی قبر کرنے سے گناہ و ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں اس معاملے میں عبدالوہاب کے اس پروگرام کو بھی نہیں مانتا کہ انہوں نے جنت البقیع اور ان مقابر کو اس خوف سے گرا دیا کہ یہاں پرستش ہوگی۔ میرے خیال میں چھوٹے کی کم پرستش ہوتی ہے' بڑے کی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے اصول کی بات ہے کہ انہیں سب سے پہلے آقا و رسولؐ کا مقبرہ گرانا چاہیے تھا۔ جب وہ رسول ہاشمیؐ کے مقبرۂ عالیہ کی طرف بڑھے' تو مدینے کے سارے لوگ سر بکف ہو کر نکل آئے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو صاحب! ہم نے پہلے تو کوئی تعرض نہیں کیا۔ مگر اب ہم قتل ہو جائیں گے' یہ کام آپ کو نہیں کرنے دیں گے۔ پھر انہوں نے مقبرۂ رسولؐ کو نہیں چھیڑا۔ مصلحت حکومت مصلحت دین پر غالب آ گئی۔ اس لیے اگر مقبرہ بنانا منع ہے' تو سب سے پہلے اسی مقبرے کو ڈھانا ہوگا' جو بنا ہوا ہے۔ مگر اس کو اب تمام مذاہب کے گروہوں اور تمام اہل فکر نے قبول کیا ہوا ہے۔

الزام اب کسی بریلوی' دیوبندی' اہل حدیث کو نہیں جاتا۔ کیونکہ جو لوگ وہاں پر حکمران ہیں' وہ ان تینوں سے متشدد ہیں۔ اگر انہوں نے مقبروں کے حوالے سے بات برداشت کی ہوئی ہے' تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک جائز ہے اور دوسری یہ کہ پبلک پریشر ہے۔ اگر پبلک پریشر کے تحت انہوں نے اجازت دی ہوئی ہے' تو ان

Marfat.com

پر نفاق کا حکم لگتا ہے اور اگر دین میں اجازت ہے' تو باقیوں کو بھی اعتراض نہیں ہے۔

(علامہ ساجد نقوی) اس ساری گفتگو میں شاید نبی اکرمؐ کا فرمان مدنظر نہیں رکھا گیا' جس میں آپؐ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ وہ ایک خاص مقدار سے بڑی قبروں کو ہموار کر دیں اور ان کو گرا دیں۔ اس واضح حکم پر عمل کیا گیا تھا۔ جہاں تک نبی اکرمؐ کے روضہ مقدسہ کا تعلق ہے' اس کے بارے میں بھی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ اندر سے قبر اسی طرح ہے۔ اس پر کوئی عمارت نہیں بنائی گئی۔ اس کو محفوظ کرنے کے لیے اس کے اردگرد عمارت بنائی گئی۔ اس کا بھی ایک خاص تاریخی پس منظر ہے۔

مشہور ہے کہ نورالدین زنگی کے زمانے میں کسی نے گستاخی کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ حفاظت کے لیے اردگرد اس کے دیواریں بنائی گئی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور نبی کریمؐ کی قبریں اندر سے کچی ہیں۔ بعض اوقات مصلحت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کی ایک بڑی مثال نبی اکرمؐ کا یہ فرمان ہے' جس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کو آپؐ نے فرمایا تھا کہ اگر مصلحت سامنے نہ ہوتی' تو میں حطیم' جو کعبے سے باہر نکلا ہوا حصہ ہے' کو کعبے کے اندر شامل کرتا۔ اسے گرا کر اس کی تعمیر نو کرتا۔ ان بنیادوں پر کھڑا کرتا' جن بنیادوں پر حضرت ابراہیمؑ نے کھڑا کیا تھا۔ لیکن مصلحت اس کا تقاضا نہیں کرتی۔ اس لیے منافقت کا اتنی جلدی فتویٰ نہیں لگانا چاہیے۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) میری آپ سے ایک درخواست ہے کہ ہم اتنے اچھے دوست رہے ہیں اور میں آپ کی ہر بات مانتا ہوں۔ مگر یہ بات دل کو لگی نہیں ہے۔ کیونکہ مسئلہ مقبرے کا تھا' قبر کا نہیں تھا۔ حضورؐ کے مزار مبارک میں جو کچھ تعمیر ہے' اس کو مقبرۂ رسولؐ ہی کہیں گے۔ مگر بعض باتیں ہیں' جیسے آپ نے ابھی مصلحت کی طرف اشارہ کیا' تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر کچھ اور باتوں پر بھی مصلحتاً شدت کم ہونی چاہیے اور سب سے بڑی مصلحت یہ ہے کہ اہل ایمان کے دل ایک دوسرے سے جڑے رہیں۔

ایصالِ ثواب اور اعزہ

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ کچھ بڑے کچھ چھوٹے۔ جو جنت میں جائے گا' وہ دیکھے گا کہ اس کا باپ ادھر جل رہا ہے' تو پھر خدا سے دعا کرے گا کہ اے اللہ! مجھے تو تُو نے اتنا سکون میں رکھا ہے اور قبلہ محترمہ والدہ صاحبہ کو ادھر پھینکا ہوا ہے۔ اس طرح تو میں یہاں بھی ناخوش رہوں گا۔ اللہ اس اچھے بیٹے کی خاطر اس کی بوڑھی ماں کو بھی بخش دے گا۔ اسی طرح ایک اچھے باپ کی قرآن مثال دیتا ہے۔ حضرت خضرؑ کے معاملے میں' جب وہ دیوار بنا رہے تھے' تو خضرؑ نے کہا کہ بھائی بات یہ ہے کہ بچوں کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس کی نیکی پسند تھی۔ اللہ نے چاہا کہ بچوں پر اس نیک آدمی کے توسط سے احسان فرمائے اور ان کو ان کا حق اور خزانہ ملے۔

اسی طرح حضرت سعد بن عبادہ کی والدہ وفات پا گئیں۔ وہ مدینے سے باہر تھے۔ واپس آئے۔ یہ بخاری میں باب صدقات کی چار پانچ مفصل اور متصلہ احادیث ہیں۔ جب واپس پلٹے' تو سیدھے نبی اکرمؐ کے ہاں حاضر ہوئے۔ یارسولؐ اللہ! میری ماں مرگئی ہے اور اس کے مرنے پر میں حاضر نہ تھا۔ لوگوں نے اسے دفنا دیا۔ اب اگر میں اس کے لیے

Marfat.com

کوئی صدقہ و خیرات کروں' تو کیا اسے پہنچے گا؟ فرمایا' نعم! ہاں۔ فرمایا' یارسولؐ اللہ! گواہ رہئے گا کہ میں نے فلاں باغ اپنی ماں کے لیے صدقہ کر دیا۔

ایک اور ماں خواہش حج کر کے مر گئی۔ بیٹا حضورؐ کے پاس پہنچا اور پوچھا یارسولؐ اللہ! میری ماں نے حج کی نیت کی تھی۔ وہ مر گئی۔ اب اگر میں حج کر کے ثواب اپنی ماں کو دے دوں' تو اس کو اس حج اور اس کی نیت کا ثواب پہنچ جائے گا؟ فرمایا' اگر تیرے باپ پر قرض ہوتا اور وہ مر جاتا اور تو بعد میں اس کا قرض ادا کر دیتا' تو اس کا قرض ادا ہوتا کہ نہ ہوتا؟ فرمایا' یارسولؐ اللہ! ہو جاتا۔ فرمایا' تمہارے حج کا ثواب جو تو اپنی ماں کے لیے کرے گا' اس کا ثواب اسے پہنچے گا۔ اس کا ثواب اسے قبر میں پہنچے گا۔ برزخ میں پہنچے گا۔ آخرت میں پہنچے گا۔

بظاہر انسان کی یہ ساری چیزیں مفروضہ اور وہمہ رہ جاتی ہیں۔ قبر بھی وہم رہ جاتی ہے۔ جب ہم مر گئے' تو مر گئے۔ جیسے اہل کفر کہا کرتے تھے کہ بھلا بوسیدہ ہڈیوں میں بھی جان پڑے گی۔ یا تو آپ بڑے معروضی اور سائنٹفک ہو جائیں۔ مگر غیر مرئی اور ان تمام باتوں کا' جن کا آپ کو پتہ نہیں۔ جو پردۂ غیاب اور پردۂ اسرار میں ہیں' ان سب باتوں کا تعلق صرف اللہ کے ساتھ ہے۔ باقی باتیں کم تر ترجیح ہیں۔ قبر کوئی معانی نہیں رکھتی۔ عذاب قبر اور ملائکہ کوئی معانی نہیں رکھتے۔ یہ تمام چیزیں معانی ایک خدا ہی سے پاتی ہیں۔ اگر آپ اس پر یقین رکھتے ہیں' تو پھر دیگر باتوں میں یقین کرتے ہیں۔ اگر آپ اس میں ایمان نہیں رکھتے' تو پھر آپ کو ان ساری چیزوں کو ماننے کی کیا ضرورت ہے۔

پھر اگر خدا سے محبت اور دوستی کا رشتہ قائم ہے' تو ان سے ہمیں کیا لینا۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی وجہ سے محمد رسولؐ اللہ پیدا ہو سکتے ہیں اور حضور فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا ہوں۔ یعنی پوری تیرہ نسلیں قریش کی گذرنے کے بعد اگر حضور گرامیؐ ایک بہت پہلے گذرے ہوئے باپ اور پیغمبر کی دعا کا نتیجہ ہیں' تو آپ کا کیا خیال ہے کہ ہمارا ارواح سے تعلق قائم نہیں رہ سکتا؟

اللہ تعالیٰ نے جیسے سوچ رکھا ہے کہ جنت والوں کو دکھ نہیں ہونا چاہیے۔ سو جب ایسے لوگ جہنم میں جائیں گے اور دوسرے جنت میں جائیں گے۔ اگر ان میں کتاب کا فرق ہے' تو اللہ ان کے دل سے یہ غم محو کر دے گا۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ آذر کے لیے دعا کی تھی' تو اللہ نے کہا کہ یہ دعا میں قبول نہ کروں گا۔ حضرت ابراہیمؑ کو تھوڑا سا رنج ہوا۔ اللہ نے فرمایا' دیکھ تیرا باپ' تیرا باپ نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ ایک لتھڑا ہوا کالا بجو سا ہے' جو ان کے پاؤں میں لٹک رہا ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی حضرت ابراہیمؑ نے دوبارہ اس کے لیے دعا نہیں کی۔ خدا وہ صدمہ اٹھا لیتا ہے۔

دیگر پیغمبروں کی طرح نبی کریمؐ کی زندگی مبارکہ ہم پر شہادت ہے۔ جو رسولؐ نے فرمایا کہ پیغمبروں کی بلا سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔ صدمہ جو کسی اُمت کے بندے کو پہنچا' وہ رسولؐ کو ضرور پہنچا ہوا ہے۔ اگر ان کا کوئی عزیز جہنم میں گیا' تو رسولؐ کے بھی بڑے عزیز جہنم میں ہیں۔ اگر ان کو کوئی زخم پہنچے' تو رسولؐ نے بھی زخم کھائے ہیں۔ اُمت کا کوئی ایسا عذاب نہیں ہے' جو رسولؐ خود نہیں سہتے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ پیغمبروں کی بلا سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔

سب سے بہترین ثواب' جو آپ اپنے بزرگوں کو دے سکتے ہیں۔ جو ان کی قبر کی تلخیاں بھی کم کرتے ہیں اور اگر وہ نیک ہیں' تو ان کے مدارج میں اضافہ کرتے ہیں' وہ تسبیحات کے ثواب ہیں' لیکن یہ کام نہ کیا کریں کہ ٹیم بلوا کے اور

Marfat.com

چادلوں پر بٹھا کے ان سے کیا کچھ پڑھواتے ہیں۔ وہ کیا پڑھ رہے ہوتے ہیں اور کیا کچھ نہیں پڑھ رہے ہوتے۔ قرآن ختم کرانے کے یہ طریقے نہیں۔ تھوڑا سا خود پڑھ لیجیے۔ جتنا شوق اور محبت سے ہو سکے' اس سے انہیں بخشئے۔ اللہ تعالیٰ وہ ثواب ان کو پہنچا دے گا۔

عورت' قبرستان' ہیجڑہ

ناجائز کا لفظ تو میرے خیال میں بڑا ڈورکا ہے۔ عورتوں کو قبرستان جانے کی پہلے ممانعت ضرور تھی اور اس کی وجہ بھی موجود تھی' لیکن میرے خیال میں کوئی خاتون اکیلے محرم کے ساتھ قبر پر جائے اور وہاں دعا و سلام کہے' تو ایسی کوئی رکاوٹ کسی مذہب میں موجود نہیں ہے۔ عمومی طور پر جہاں رش اور ہجوم ہو۔ مرد اور عورت کا وصال ہو' وہاں زمین فتنہ کی ہوتی ہے۔ اللہ اور رسولؐ تو یہی کوشش کرتے ہیں کہ عورتیں اور مرد فتنے سے دُور رہیں۔

حدیث مبارک کے مطابق مدحت خلق کو خدا کا انعام سمجھو۔ کسی شخص کے ظاہر و باطن میں تفاوت نہیں پاتے' تو اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اصحابِ رسولؐ کے بارے میں اُمۃ وسطا لتکونو شھدآء علی الناس کہا گیا۔ جیسے ایک جنازہ گذرا۔ اصحابؓ نے کہا' یارسولؐ اللہ! یہ اپنی قوم کا نیک آدمی ہے۔ پھر ایک جنازہ گذرا تو کہا' یہ اپنی قوم کا برا آدمی ہے۔ تو نیک لوگوں کی شہادت بذاتہٖ اللہ کا ایک فیصلہ ہے۔

جہاں تک ہیجڑے کا تعلق ہے' اللہ اس فعل پر کسی کو سزا نہیں دیتا' جو کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ ہیجڑے کی وراثت اور ہیجڑے کا جنازہ علامتی طور پر پڑھا جاتا ہے۔ حضورؐ کی حدیث اس پر ناطق ہے کہ اگر اس پر عورت کا گمان ہوگا' تو عورت کی طرح اور مرد کا گمان ہوگا' تو مرد کی طرح۔

دل اور مصنوعی دل

مصنوعی دل ہو یا اصلی' دل کی کیفیت ایک پورے نفسیاتی مزاج کے لیے استعمال کی گئی ہے۔ آج سے بہت پہلے سائنسدانوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ یہ چھوٹا سا لوتھڑا' جو انسان کے سینے میں دل کے عنوان سے ہے' اس میں سوچ ووچ کوئی نہیں۔ یہ ایک سادہ گوشت کا ٹکڑا ہے۔ اس میں کسی قسم کی ذمہ داری نہیں ہے۔ لوگ غلط کہتے ہیں کہ دل سوچتا ہے۔ دل بھاگتا ہے۔ دل ڈرتا ہے۔ دل یہ کرتا ہے' وہ کرتا ہے۔ یہ غلط العام ہے۔

مگر آج کی آراء کچھ مختلف ہیں۔ سائنز تجربات میں انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ دل واقعی سوچتا ہے۔ مگر اس کے ادھے سگنل ہیں۔ اس کے پاس زبان نہیں ہے۔ یہ احساس کی ایک نفیس ترین کیفیت ہے کہ سب سے پہلے ہر چیز اور ہر لفظ کا شاک دل پر ہوتا ہے۔ دل آدھے سیکنڈ میں سگنل دماغ کو بھیجتا ہے۔ اس کیفیت کو دماغ لفظ اور رنگ دیتا ہے۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ دماغ کمپیوٹر ہے اور سگنل دل سے جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے' کچھ عرصے بعد دل ہی مالک کائنات نکل آئے اور انسان کا یہ تضاد لفظی اور معنوی ختم ہو جائے۔

میڈیا یلغار میں چوائس

اس سوال کی ٹیکنالوجی میں تھوڑا سا فرق ہے۔ ٹی وی پر اگر کچھ یلغار غیر موزوں سی نظر آتی ہے' تو اس کا کبھی مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ٹی وی کو ختم کر دیا جائے' یا گھر والوں سے اسے بچا کے رکھا جائے۔ اس لیے کہ ٹی وی ایک انٹرنیٹ ہے' جو آپ کی قوم' یا آپ کے معاشرے کی ہدایات پر کام کرتا ہے۔ اس کا کوئی تعلق اس چیز سے نہیں ہوتا' جس کو یہ بطور انسٹرومنٹ پیش کر رہا ہوتا ہے۔

مگر اگر آپ کو ایک چوائس دیا جائے کہ آپ اپنے بچوں کو کیا چوائس دیں گے؟ مسلم کا یا جہالت کا چوائس؟ آپ ان سے جدید ترین سہولتیں چھین کر اور ان پر پابندی اور رکاوٹیں لگا کے ان کو یہ کہیں کہ ہم نے آپ پر یہ چیزیں اس لیے بند کر دی ہیں کہ یہ فحش اور خراب ہیں' تو کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے بچے یا ابھرتی ہوئی نسلیں آپ کا ساتھ دیں گی؟ وہ یقیناً آپ کے گھروں سے نکل کر بازار' گلی کوچوں میں' جہاں کہیں ان کو یہ مظاہر نظر آئیں گے' ان سے لطف اندوز ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنوں میں ماں باپ کے خلاف ایک تعصب بھی ابھرے گا کہ جس کی ہر فرد کو اجازت ہے' ان کے لیے کیوں نہیں ہے۔ وہ اسے ظلم و ستم کی ایک نئی کیفیت سمجھیں گے۔

دنیا میں تین قسم کا جبر رائج ہے۔ بقول مغربی مفکرین کے' ایک تو اللہ کا جبر ہے' جو ہر صورت پر قائم ہے۔ دوسرا مذہب کا جبر ہے' جو چھوٹی چھوٹی رسومات کی شکل میں ہے اور تیسرا جبر والد محترم کا ہے' جو اولاد پر ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ شاید لوگ باقی جبر کے خلاف کوئی جنگ نہ کر سکیں' مگر بچے بڑی مہارت اور استقلال کے ساتھ ماں باپ کے اس جبر کے خلاف اس وقت جدوجہد کرتے ہیں' جب ان کو اپنی مرضی کی چیزیں نہیں ملتیں۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ ماں باپ اتنی فراست سے کام لیں کہ دوسرا خطرہ مول لینے کی کوشش کریں۔ اللہ کے رسولؐ کے ارشاد کے مطابق بچے فطرت پر پیدا ہوتے ہیں۔ آپ یقین رکھیں کہ اگر آپ انہیں بہتر اقدار دیں گے۔ گھر میں سچ بولیں گے۔ مہربان ہوں گے۔ اسلام کی سختی کی نہیں' عمومی اقدار کا لحاظ رکھیں گے' تو آپ کے بچے یہ محسوس کریں گے کہ ہمارے ماں باپ ہمارے بہترین دوست ہیں۔ وہ کبھی بھی آپ کے پیٹرن سے بغاوت نہیں کریں گے۔

Marfat.com

اس مسئلے کا یہ حل نہیں ہے کہ آپ دورِ حاضر کی ایجادات سے قطع تعلق کر لیں۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہم جو ماں باپ' بچیاں یا بھائی بہنیں ہیں۔ اپنے اندر ایسی خوبصورت قدریں پیدا کریں' جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے توسط سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں نے کبھی ایسا شخص بور طبیعت کا نہیں دیکھا' جو اللہ پر ایمان اور اپنے پیغمبرؐ سے محبت رکھتا ہو۔ دنیا میں اس سے زیادہ حسین اور اس سے بڑا بہتر انسان نہیں ہوتا۔

تمام بچے حسن و خوبصورتی کو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو کسی نہ کسی احساس جمال سے نوازا ہے۔ آپ گھروں میں اعتدال' امن' محبت اور انس کی خوبیاں پیدا کریں۔

میڈیا' بچے اور مستقبل

یہ والدین کی ذمہ داری ہے۔ انہیں بچوں کو ناظرہ قرآن شریف تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ مذہبی معلومات تک محدود کر دینا اور یہ سوچنا کہ ہم کارہائے نمایاں سرانجام دے چکے ہیں' درست نہیں ہے۔ یہ والدین کی اپنی کوتاہی ہے۔ بچوں کی اس میں کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر کچھ بھی نہ کریں' صرف دو دو چار چار چھوٹے چھوٹے مذہبی اصول' طور طریقوں اور رویوں کے بچوں کو سکھاتے چلے جائیں' تو بچہ دس پندرہ بیس سال تک بہت کچھ اسلامی ذہن پا جاتا ہے۔ ابھی آپ جو ہٹ دھرمی اور ضد دیکھ رہے ہیں اور جو آپ بے لوث بچے دیکھ رہے ہیں۔ بے شمار پگڑیاں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو جنونیوں کی طرح مذہب کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ رہے ہیں' اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اپنی ججمنٹ کی سنس بچوں کو عطا نہیں کرتے اور پھر کوئی بھی باہر سے انہیں ترغیب دے کر اپنے ساتھ لگا لیتا ہے۔ یہ بہت خطرناک بات ہے کہ ہم انتہا پسندوں کی گرفت میں ہیں۔ ہر عالم اور دانشور اپنے مقاصد کے لیے ان نوجوانوں کو استعمال کرتا ہے۔ اصولاً اگر ان کو گھر سے تھوڑی تھوڑی تعلیم ملتی رہے' تو ان کی سنس آف ججمنٹ اور تنقیدی نظر بیدار رہتی ہے۔ وہ آسانی سے کسی کے دام فریب میں نہیں آتے۔

ڈش کہاں تک خطرناک

(مستنصر حسین تارڑ) اوورآل میڈیا بالخصوص ٹیلیویژن بہت ڈیموکریٹک میڈیا ہے۔ یہ قطعی طور پر آپ کو مجبور نہیں کرتا کہ آپ اسے دیکھیں۔ آپ پہلے 20' 25 ہزار روپے کا کلر ٹیلی ویژن بازار سے اٹھا کر لاتے ہیں۔ پھر دس ہزار کی ایک ڈش اپنے گھر کے اوپر نصب کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ سراسر آپ کا اپنا فیصلہ ہے۔ اب اس لمحے آپ نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آیا آپ کو ٹیلی ویژن یا ڈش چاہیے؟ زبردستی آپ کو ڈش کوئی بھی نہیں دکھا سکتا۔ اس کے پروگرام آپ دیکھ سکتے ہیں' تو لے آیئے' سو بسم اللہ! لیکن آپ یہ نہیں کر سکتے کہ اسے پورے معاشرے میں ممنوع قرار دیں۔ یہ کہیں بھی ممکن نہیں ہے۔ جیسے آپ ریڈیو پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ بی بی سی کے خلاف مہم چلی' ناکام رہی۔ اسی طرح وی سی آر کے خلاف مہم چلتی رہی۔ ہم کسی جزیرے میں نہیں رہتے۔ یہ گلوبل ولیج کا تصور ہے۔ اس میں یہ سوچ کہ ڈش پر پابندی لگ جائے گی' ناممکن بات ہے۔ عین ممکن ہے کہ ہماری اخلاقیات اس کی زد میں آتی ہوں' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ کوئی اور میرے

راستے بدلتا ہے۔ جب تک آپ کو اپنے تعین پر اختیار نہیں، آپ کو دوسروں کی اخلاقیات قبول کرنی پڑیں گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ٹیلی ویژن آن کرتے ہیں، تو گویا آپ پھر اپنا جمہوری حق ہاں یا نہیں کا استعمال کرتے ہوئے عمل کرتے ہیں۔ آپ کی اپنی پسند ہے کہ ڈش یا نارمل پی ٹی وی کا کوئی اسٹیشن آن کرتے ہیں۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ ڈش پر رقص و سرود وغیرہ ہوتا ہے۔ تو اگر آپ ایک ایسی جگہ جائیں، جہاں کام ہی یہ ہو رہا ہو اور کہیں کہ یہاں رقص و سرود کیوں ہوتا ہے، تو یہ اعتراض بے جا ہے۔ یہ آپ کی اپنی چوائس ہے۔ آپ کی اپنی پسند ناپسند ہے کہ آپ کون سا پروگرام دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

آخری بات، جس پر بہت گفتگو ہو سکتی ہے۔ یہ ہے کہ تبدیلیاں آپ کی مرضی سے نہیں آتیں۔ وہ تبدیلیاں معاشرے میں ہر جگہ آ رہی ہیں۔ آپ کے پاس واحد حل اب یہ رہ جاتا ہے کہ آپ اپنی اولاد کی تربیت اس طور پر کریں کہ وہ جو چیزیں دیکھتے ہیں، ان کو دیکھیں۔ لیکن ان کے منفی اثرات کو قبول نہ کریں۔ ان کی آپ تربیت کریں گے، ان کو اس سے ہٹا نہیں سکتے۔

(پروفیسر احمد رفیق اختر) کیا یہ ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم اپنے بچوں کو آگہی سے نا آشنا رکھیں؟ کیا ہمارے یا کسی بھی معاشرے میں کوئی بچہ اپنے گرد و پیش سے لاتعلق رہ سکتا ہے؟ وہ اپنے گھر میں ڈش نہیں دیکھے گا، تو بازار میں کہیں دیکھ آئے گا۔ اس کے ساتھ اس میں ایک اور بری عادت پروان چڑھے گی۔ وہ گھر سے بھاگے گا۔ کہیں اور سے چانس لے گا۔ بچہ آپ سے بہت زیادہ متجسس ہے۔ وہ دیکھنے کا جوش و خروش رکھتا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی گھٹیا کام ہو، آپ نے ایک چانس اپنے ذہن میں لینا ہے۔ میں نے وہ لیا ہے۔ آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ میں چاہتا ہوں، میرے بچے علم سے فیصلہ کریں، لاعلمی سے تباہ نہ ہوں۔ میرا فیصلہ اپنے بچوں کے حق میں یہ ہے کہ میں ان کے علم کے نقائص برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر ان میں لاعلمی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میرے پاس ٹی وی ہے۔ میں نے انہیں ٹی وی دکھایا۔ شروع میں بڑا ہیجان رہا۔ اب بمشکل کوئی اس قسم کا جوش و خروش ظاہر کرتا ہے۔

شروع میں ڈش کا بڑا رولا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ میں نے بڑی غلطی کی ہے۔ میں نے بچوں کو چوائس دیا۔ رفتہ رفتہ دو چار دس دن انہوں نے گانے سنے۔ چڑچڑے باپ کی طرح ان کو روکا نہیں۔ میں ان کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہی میں آپ سے کہوں گا کہ ان پر سے نظر نہ ہٹایئے۔ خبرداری کے ساتھ غیر متحرک رہیں۔ آپ والدین ہیں۔ اپنے بچوں میں رو پذیر ہر تبدیلی پر نظر رکھیں۔ میں اس وقت اپنے آپ اور اپنے بچوں کو محفوظ سمجھتا ہوں۔ میں اپنے بچوں کے بارے میں پروا نہیں کرتا۔ مجھے پتہ ہے کہ ان پر امیج اور اثرات کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

مگر جو بات بچوں میں پیدا ہوتی ہے، وہ ایک اصولی مؤقف میں استحکام ہے۔ ان میں ایک سیکھنے کا عمل پیدا ہوا ہے۔ یہ جو ان میں انتخابی اور اصولی صلاحیت آئی ہے، اس کے بعد میرا تجربہ کامیاب ہے۔ اسلام اس پر پابندی نہیں لگاتا۔ اسلام کس پس منظر میں اٹھا ہے؟ اس کے اٹھنے، بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے تمام عرصے میں جب تک خدا نے حکم نہیں دیا، خانۂ کعبہ کے گرد ننگے ڈانس ہوتے تھے۔ جب تک قرآن میں ممانعت نہیں آئی، اس معاشرے میں کعبۂ معظمہ کے گرد مرد اور عورتیں ننگے طواف کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ کو اپنے گھر کے تقدس کا خیال آیا اور حکم دیا کہ اب کوئی شخص کعبے کا ننگے وجود

Marfat.com

طواف نہیں کرسکتا۔

ڈش کے بارے میں شریعت کے اعتبار سے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں بنتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپ کی بینائی کا ضیاع یا فریب نظر ہے۔ یہ فقہی گناہ نہیں بنتا۔ اگر آپ خواب میں کوئی ایسی چیز دیکھ لیں' تو کیا کوئی آدمی صبح اپنے آپ کو شرعی سزا تو نہیں دیتا۔ شطرنج' تاش وغیرہ تمام چیزوں پر یہی حکم لاگو ہوتا ہے۔ اگر یہ چیزیں آپ کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کر رہیں۔ نماز سے لاپروائی برتنے کی طرف نہیں لا رہیں' تو ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر غفلت کا ارتکاب ہے' تو پھر یہ لہو ولعب ہے۔

موسیقی سننے کی اجازت

ہر چیز نیکی یا برائی کی طرف جانے کا ذریعہ ہے۔ جہاں وہ آلات صرف اور صرف غلط مقاصد یا جبلت کے ہیجان کے لیے استعمال ہوتے ہیں' ان سے یقیناً منع کیا گیا اور جہاں ایک انسٹرومنٹ لوکل ہے۔ جیسے شادیوں پر عورتیں دف بجاتی ہیں اور نغمے' گیت گاتی ہیں' حضورؐ نے اس کی اجازت بھی دی اور ان کو سنا بھی۔ ان کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ جیسے تاش ہے یا کوئی بھی چیز ہو' جو آپ کی توجہ کو ہٹاتی ہے یا اور طرف کھینچ لیتی ہے۔ آپ فرائض اور عبادات سے غافل ہو جاتے ہیں اور وہ چیز یا طلب اللہ کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے' تو وہ مردود اور حرام ہے۔ اور جو چیز اللہ سے غافل نہ کرے' بقدر ظرف اس کا کوئی حرج نہیں ہے۔

موسیقی' شاعری' قوالی

موسیقی کی ایک یا دوسری صنف پر تو قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔ البتہ موسیقی آپ کو خدا کی یاد سے غافل کر دے' تو وہ واقعی آپ کے لیے لعنت اور مصیبت ہے۔ اگر آپ موسیقی کے ہوتے ہوئے بھی احکام خداوندی کی متابعت کرتے ہیں اور اس میں آپ کی دلچسپی آپ کے بنیادی تعلق کو مجروح نہیں کرتی' تو میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی اتنا بڑا حرج نہیں ہے۔ ویسے بھی حضور گرامی مرتبتؐ کے زمانے میں دف بجائی گئی۔ گانے والیاں تھیں۔ بلکہ حضورؐ کے ایک غلام کی شادی تھی اور اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ کے پاس حضورؐ آئے' تو فرمایا اے عائشہؓ! اس کے ساتھ گانے والیاں نہیں بھیجیں؟ ام المومنینؓ نے کہا کہ میں سمجھی' آپؐ برا منائیں گے۔ فرمایا' یہ تو ان کا رسم و رواج ہے۔ اس سے کم از کم ایک شہادت تو ملتی ہے کہ لوگ موسیقی پر ایسی کوئی قید نہیں۔

یہی حکم بعینہٖ شاعری پر لاگو ہوتا ہے۔ شاعری اچھی بھی ہے' بری بھی ہے۔ چونکہ شاعری پر حضورؐ نے حتمی رائے دے دی ہے' اس لیے تمام جمالیاتی شعبوں میں یہ رائے جائے گی کہ موسیقی اچھی بھی ہے' بری بھی ہے۔ تصوف میں موسیقی کو بحیثیت ایک آلہ استعمال کیا گیا۔ اہل چشت جب ہندوستان میں آئے' تو انہوں نے دیکھا کہ ہندوستانیوں کی جمالیات بہت زوروں پر ہے۔ لوگ بنیادی طور پر جذباتی ہیں اور وہ موسیقی میں دُکھ درد اور غم بھلا لیتے ہیں۔ انہوں نے قوالی کی اختراع کی۔ اجازت نکلی' حتیٰ کہ موسیقی میں بڑا راگ بھی ایک بڑے صوفی کا ہی ہے۔ امیر خسرو نے راگ کو دریافت کیا یا ایجاد کیا۔

Marfat.com

لیکن جو پڑھے لکھے صوفی ہیں، وہ موسیقی کو آسرا اور ایک مقامی انحصار سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کے دل پر آزردگی ہے اور آپ ایک گانا سن کے اس آزردگی کو دُور کر لیتے ہیں، تو یہ آپ کی عادت کی تشکیل بن جائے گی۔ جب بھی آپ کو کوئی ذہنی کوفت ہوئی اور پریشانی محسوس ہوئی، تو آپ بغیر کوئی بہتر طریقہ استعمال کیے، موسیقی سننے چلے جائیں گے۔ شیخ سیدنا ہجویرؒ فرماتے ہیں کہ میرے دل پر اضطراب تھا۔ میں اپنے شیخ کے حضور گیا اور کہا کہ سماع کا بندوبست کیجیے۔ میرے شیخ نے میرے لیے سماع کا بندوبست کیا۔ جب مجھے قرار آیا، تو میں اٹھ کے چلا۔ میرے شیخ نے پیچھے سے آواز دی کہ اے علی بن عثمان! ایک وقت آئے گا کہ تجھے سماع اور کوے کی آواز میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا۔

اگر آپ اپنی ذات اور اضطراب کو چھوٹی چھوٹی چیزوں میں نہیں ڈالیں گے، تو آپ اس کے نتیجے میں اپنے کو ایک بہتر اور مکمل انسانیت کی طرف حرکت کرتا محسوس کریں گے۔ آپ کی میچورٹی بڑھ جائے گی۔ اگر آپ ادھر ہی رُک گئے اور موسیقی میں ہی دفن ہو گئے اور اسی کے ریکارڈ سن سن کر سر دُھنتے رہے، تو یہ یقینی بات ہے کہ اگلا شعوری مرحلہ آپ کبھی طے نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے بڑے صوفیا سماع کو زیادہ تجویز نہیں کرتے۔ عام صوفیاء اسے اختیار کرتے اور اس کو سنتے بھی ہیں۔ معاملات دونوں طرف ایک جیسے ہیں۔ اس لیے میری رائے میں موسیقی اچھی اور بری دونوں ہی ہیں۔ اگر آپ کی توجہ کا غالب حصہ یہ لے جائے، تو یہ بری چیز ہے اور اگر یہ آپ کے وقتی ٹمپر کی بازگشت ہے، تو پھر اوکے۔ نو پرابلم۔

پتھروں کا استعمال

میں نے پتھروں کی تخصیص کا علم حاصل کیا اور بہت سارے پتھر دیکھے اور ان کے بارے میں سنا۔ اس رائے میں، میں خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے بہت اتفاق کرتا ہوں۔ خواجہ نظام جب عبادات سے بور ہو جاتے۔ لگتا تو ایسے ہی ہے کہ جب عبادت گذاری یکسانیت کا شکار ہو جاتی، تو ان کے بارے میں خواجہ سجزی لکھتے ہیں کہ حضرت نظامؒ پتھروں پر نظر کیا کرتے تھے۔ پتھروں کا اس سے بڑا مقصد مجھے کوئی نظر نہیں آیا کہ آپ اپنی بوریت اور یکسانیت کو خوش نما رنگوں سے تازہ کر سکتے ہیں۔ پتھر خوش نما ہیں اور پتھر عبادت گذار بھی ہیں ثم قست قلوبکم بعض دل پتھروں سے زیادہ سخت ہیں۔ بعض پتھر خدا کے خوف سے پھٹ جاتے ہیں۔ بعض پتھروں کے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ ایسے پتھر انسانوں سے یقیناً بہتر مقام کے مالک ہیں جب کہ قساوتِ قلبی میں بعض انسان پتھروں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ مگر ایسا کوئی تصور نہیں کہ وہ آپ کی عبادت اور روزی میں معاون ہوں۔

تصویر اور مجسمہ سازی

قیامت کے دن مجسمہ سازی کے حوالے سے بڑی مشکل پڑے گی۔ وہاں اس سے کہا جائے گا کہ جو صورت بنائی ہے، اس میں جان بھی ڈالو۔ درخت وغیرہ میں تو کچھ آسانی رہے گی۔ مجسمہ سازی میں بڑی تکلیف ہوگی۔ میں ایک جگہ گیا، تو دیکھا کہ لوگ بدھا کے بت بنا رہے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آج بدھا زندہ ہوتا، تو وہ سب سے زیادہ نفرت اس بات سے کرتا کہ لوگ اس کے بت بنا رہے ہیں۔ اللہ کے اس بندے نے اپنی تمام زندگی جو تعلیم دی، وہ تمام

Marfat.com

بت پرستی کے خلاف تھی۔ اس کے گروپ میں آج بھی بنایان مہایان کا فرقہ ان کو ایک استاد کی طرح مانتا ہے۔ ہندو راجہ اشوک تھا' جس نے بدنیتی سے کام لے کر ایک فرقے کی بنیاد رکھی اور بت بنانے شروع کر دیئے۔

ایک زیادتی اشوک کر گیا۔ دوسرا ایک مسلمان کر گیا۔ تصاویر کی حد تک اجازت ہے' لیکن بت بنانے کے حوالے سے اگر بت پرستی کے پلٹاؤ کا خدشہ نہ ہو' تو ایسے میں شاید اس کی ممانعت نہیں۔ مگر جیسے رسولؐ اللہ کے زمانے میں منقش پردے لگائے گئے' تو حضور گرامی مرتبتؐ نے اس لیے اتروا دیئے کہ لوگ اس وقت کسی بھی چیز کی پرستش کرتے تھے۔ آپؐ نے سمجھا' ایسا نہ ہو کہ انہی پردوں کی نسبت سے پرستش شروع ہو جائے' اتروا دیئے۔ جب بت پرستی کا شبہ' ڈر اور خوف نہ ہو' تو ایسے میں ان چیزوں میں کوئی حرج نہیں۔

حضورؐ کی شبیہ

یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے بہت سارے لوگوں نے حضورؐ کی شبیہ تیار کی۔ کوشش کی' بنائیں۔ ہم پر لازم تو نہیں ہے کہ ہم ان شبیہات پر ایمان لے آئیں۔ اگر ہم مسلمان ہیں اور انہوں نے کوئی شبیہ یا کوئی مماثلت تخلیق کی ہے' تو ہمیں وہ مجبور تو نہیں کر رہے کہ ہم ان کی شبیہ کو واقعی انہی کی شبیہ مان لیں۔ مسلمانوں کی جانب سے اس قسم کا رویّہ سیدھا سادا غیر تعلیمی ہے۔ آپ امریکی حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ انہوں نے شبیہ مبارک بنا کر ہماری ذلت و آزاری کی ہے اور جو عملاً وہ آپ کے دین کا مطلق ستیاناس کر رہے ہیں' آپ کو اپنا سسٹم اور خیال دے کر آپ کے دین کی جڑیں کاٹ رہے ہیں' اس میں آپ کو ان سے بڑی ہمدردی ہے۔ یہ عجیب سی بات لگتی ہے۔

جہاں تک سلمان رشدی کی طرف سے غلط باتیں حضورؐ سے منسوب کرنے کا تعلق ہے' یقیناً اس کی تاریخ کمزور ہے۔ اس کا علم کمزور ہے۔ اس قدر جاہل مطلق کی باتیں تو ویسے بھی درخور اعتنا نہیں ہو سکتیں۔ مسلمانوں کو غصہ آیا۔ وہ بہت جائز تھا۔ اس کے قتل کا فتویٰ بھی جائز تھا۔ سلمان رشدی کے لیے غلط باتوں کی یہ سزا کافی ہے کہ اس کا ایک دن بھی موت کے خوف کے بغیر نہیں گذرا ہوگا۔

اسبابِ زوالِ اُمت

مذہب کی بنیادی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کیا یہ نظام حکومت یا نظام تعلیم ہوتا ہے؟ یا شاید ان دونوں باتوں سے بڑھ کر اسے کائناتی اور مابعد الطبیعیاتی حیثیت سے دیکھا جائے' کیا اللہ تعالیٰ نے کسی نظام کو زمین پر اس لیے بھیجا کہ وہ حکومت قائم کرے؟ کوئی ایک نظام استوار کرے یا اسے آزمائش کے لیے بھیجا؟ اسے کہا' تمہیں عقل دے دی' اب پیغام دے رہا ہوں۔ چاہے' تو مان لو۔ چاہے' تو نہ مانو۔ خدا کی طرف سے دیکھتے ہوئے حکومت قطعاً کسی مذہب کا حصہ نہیں بنتی۔ مگر جب اللہ نے یہ کہہ دیا کہ جو میری تابعداری کریں گے' انہیں نہ صرف میں خلیفۃ اللہ فی الآسمان رکھوں گا' بلکہ خلیفۃ اللہ فی الارض بھی رکھوں گا۔ ان کو حکومت بھی دوں گا' عزت بھی دوں گا۔

پوری حیات انسانی کا ایک ردل نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خواہ وہ عیسائی ہے۔ کافر یا مسلمان ہے' وہ مجموعی طور پر ایک چیز کا حامل ہے' جو سب میں مشترک ہے' وہ عقل انسان ہے۔ شعور اور فکر ہے۔ اس شعور کو مدد دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ اس تصور کی استعانت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قوموں کی تہذیب و تمدن اور ان کے عروج و زوال کی داستانیں دیں۔

قرآن کہتا ہے سیر وافی الارض کیا تم نے دیکھا نہیں! کتنی بستیاں اوندھی پڑی ہیں! کتنے کنویں خشک پڑے ہیں! کیا تو نے اجاڑ اور ویران نشان نہیں دیکھے؟ آج کا ماہر آثار قدیمہ ان آثار کو دیکھنے جاتا ہے' تو وہ عبرت کے لیے نہیں دیکھتا' بلکہ وہ اسے تاریخ کا ایک تسلسل سمجھتا ہے۔ وہ یہ کبھی بھی نہیں کہے گا کہ یہاں ایک قوم آباد تھی' جس نے خدا کی نافرمانی کی اور خدا نے اسے اجاڑ کر رکھ دیا۔ یہ کسی محقق نے نہیں لکھا۔ مگر اللہ کی طرف سے دیکھیں' تو ان قوموں کے آثار کے مطالعے کا واحد مقصد یہ ہونا چاہیے کہ تم غور کرو۔ سوچو سمجھو۔ اپنے آپ کو کہیں بریکیں لگاؤ۔

جب ایک بہت بڑا استاد پیدا ہوتا ہے' تو وہ اکیڈمی آف لیٹرز میں جاتا ہے۔ نبی کریمؐ سا میں نے کوئی استاد زمانے میں نہیں دیکھا۔ ان کے طریقہء تعلیم سے کیا شاگرد تیار ہوئے۔ بلال حبشیؓ پتھر کوٹتا کوٹتا یمن کا گورنر بھی بن سکتا ہے۔ صہیبؓ غلام ہے' مگر اسے آپ کوئی بھی کمانڈ دے دیں۔ کوئی سینڈھرسٹ نہیں پڑھا۔ اکیڈمی میں تعلیم نہیں پایا۔ مگر جب

Marfat.com

اسامہؓ چودہ سال کا نکلتا ہے' تو ایک فاتح لشکر کا سپہ سالار بن کر نکلتا ہے۔ چودہ سال کے لڑکوں کو کیا ہوش ہوسکتا ہے؟ اس نے کون سی تکنیک سیکھ رہی ہے؟

اس طرح خالدؓ مشہور جرنیل تو نہیں تھا۔ بہادر آدمی سمجھا جاتا ہے۔ مگر جب واپس پلٹتا ہے' تو سیف اللہ کہلاتا تھا۔ یعنی اللہ کی تلوار! یہ اللہ کے رسولؐ کے وقت تھا اور لوگوں کو انہوں نے ذاتی طور پر ترغیب دی۔ آج بھی میں اس تبلیغ اور دوسرے مشن کے صرف ایک وجہ سے خلاف ہوں کہ وہ دوسرے آدمی کو تبدیلی کے لیے مناسب وقت نہیں دیتے۔ تین یا سات دن کا آپ جتنا مرضی چلہ لگا لیں۔ اس اُمت کو بائیس سال پورے تربیت کے دَور سے گذرنے چاہئیں۔ ایک کتاب پڑھانے کے لیے ایک استاد نے تبلیغ' ہدایت اور رشد کے لیے بائیس سال لگائے اور بائیس سال کے بعد ایک ایسی جماعت تخلیق ہوئی کہ اس جماعت پر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رضوعنہ کہتے ہوئے نازکیا گیا۔

یہ لوگ عجیب وغریب اور اعلیٰ ترین کلاس تخلیق ہوئے۔ اگر خدانخواستہ کبھی آمنے سامنے بھی ہوگئے' تو ایک دوسرے کو تعلیم یاد دلا دی۔ اگر جمل کی جنگ میں طلحہؓ اور زبیرؓ حضرت علیؓ کے سامنے آئے۔ تلوار بکف ہوئے' تو ایک دوسرے کا رستہ چھوڑ گئے۔ انہیں پتہ لگا کہ ہم وہ لوگ نہیں' جو آپس میں لڑنے والے ہیں۔ ہمارے نصیب میں ایک دوسرے سے جنگ نہیں۔ پھر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حضور حضرت علیؓ جنگ جمل کے بعد پہنچتے ہیں' تو وہ سلوک بھی تاریخ کو یاد ہوگا۔ سو رسولؐ اللہ کے جو تعلیمی مقاصد تھے' ان کے فوری نتائج شاگردوں تک مکمل پورے ہوئے۔

ثم الذین یلونھم۔ حضورؐ نے فرمایا' سب سے بہترین زمانہ میرا ہے۔ اس کے بعد کا زمانہ بالواسطہ تعلیم کا ہے۔ اب لوگوں نے اصحاب سے سیکھنا ہے۔ کچھ نہ کچھ اہمیت بڑے استاد کی گم ہوجاتی ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا ثم الذین یلونھم میرے زمانے کے بعد میرے اصحاب کا زمانہ ہے۔ پھر تابعین کا زمانہ ہے۔ یہ بہتر زمانے ہیں۔ پھر تبع تابعین کا زمانہ ہے۔ پھر فرمایا' فتنہ ہی فتنہ ہے۔ یہ تبع تابعین حکومت کے لحاظ سے اہم نہیں ہیں' پیغام کے لحاظ سے اہم ہیں۔ وہ پیغام' جس کے تحت پہلی مرتبہ پانچ ہزار اصحاب بیعت رضوان میں شریک تھے۔ خدا کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ بخشے ہوئے لوگ تھے۔ اتنی بڑی تعداد میں کوئی استاد زمین پر خدا کے بندے پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ وہ کلاس گئی' تو پھر دوسرے آئے۔ یہ بہت زیادہ لوگ تھے۔ مگر اتنی آگہی اور شعور ان میں نہ تھا' جتنا اصحاب میں تھا۔ پھر تیسری کلاس آئی۔

یہ تو ہے پیغام کے لحاظ سے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ جنہیں آپ صوفیاء اور اولیاء اللہ العزیز کہتے ہیں۔ عموماً اعتقادی ہمارے ساتھ لڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں' یہ عجیب سی چیز ہے۔ تصوف یہ ہے' وہ ہے۔ اصل میں ایسا نہیں ہے۔ جب مجموعی طور پر بڑی کلاسز تک وہ پیغام ختم ہوگیا' تو انفرادی سطح پر دو دو چار چار افراد نے اسی سبق کو سنبھالے رکھا۔ یہ وہ افراد تھے' جن میں محمد بن اسماعیل البخاری بھی شامل ہیں۔ مسلم بن حجاج' نووی اور بیضاوی بھی شامل ہیں۔ جہاں بعد میں امام ابوحنیفہ بھی شامل ہوئے۔ محمد بن ادریس الشافعی اور احمد بن حنبل بھی ہیں۔

پھر اس دَور سے گذرتے ہوئے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ آتے ہیں۔ جنہوں نے واپس اسی پیغام کو رجعت کی اور اسے ہر حال میں سنبھالنے کی کوشش کی۔ خدا نے ان کو بھی عزت وتوقیر سے نوازا۔ ان کا پورا ساتھ دیا' جیسے پہلے اپنے دوستوں کا ساتھ دیا تھا۔ پہلے تو بہت بڑی تعداد تھی۔ پانچ ہزار اور کہاں اب پانچ پھر پانچ بھی نہ رہے۔ ظاہر ہے' جس جس

Marfat.com

زمانے میں ایک ایک خدا کا دوست ہوتا رہا' تو خدا زمانہ ہی اس کے نام کر دیتا تھا۔ مگر آج برصغیر میں کم از کم چھپن کروڑ مسلمان ہیں۔ یہ بے تحاشا آبادی جو مسلمانوں کی تھی۔ اسلام کا پیغام نہ ہوتا' تو یہ کہاں سے ہوتی؟ اسلام سے ہی ہوئی۔ البتہ اب یہاں میل ملاپ جو ہو گیا ہے۔ ہر تصوف کے ساتھ ہندووانہ طاقتیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ ہندوستانی بنیادی طور پر بت پرست تھے۔ ان کی اتنی طویل تاریخ تھی کہ ہر زمانے میں ہندوؤں نے صاف ستھری تہذیب کو اپنا ایک دیوتا بنا لیا۔ جین آیا' تو جینا وترا کر دیا۔ بدھ آیا تو بدھستا وترا کر دیا۔ صرف ایک اسلام بچا ہے۔

''انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن'' کا یہ جملہ مجھے بڑا پسند ہے کہ اسلام میں خدا کی وحدانیت کے متعلق اتنا ٹھیک اور بلاکم وکاست بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی میتھالوجی ممکن نہیں تھی۔ اوپر سے ہٹ کے کچھ نہیں ہوا۔ نیچے انہوں نے سب کچھ تہہ و بالا کر دیا۔ بارہ سو سال مسلمانوں کی مسلسل حکومت رہی۔ حتیٰ کہ سولہویں صدی میں تاریخ عالم میں صرف تین بادشاہ تھے۔ باقی چھوٹے چھوٹے اور بونے بادشاہ تھے۔ یہی حال یورپ کے بادشاہوں کا تھا۔ مگر جو دنیا پر حقیقی بادشاہ تھے' ان میں سلطان سلیمان ذی شان ہے۔ ادھر ایران اور ماوراالنہر میں عباس اعظم تھے۔ دوسری طرف ہندوستان میں سلطان جلال الدین محمد اکبر تھے۔ ان بڑے بادشاہوں کے مقابلے میں آپ یورپ میں کسی بادشاہ کا نام ہی نہیں جانتے۔ صرف الزبتھ کا نام جانتے ہیں۔ جلال الدین اکبر کے زمانے میں جب الزبتھ کے ایلچی آئے اور انہوں نے بڑی لمبی چوڑی داستان پیش کی اور ملکہ بحر و براور یہ وہ کہانیاں پیش کیں' تو اکبر نے اپنے وزیر ابوالفضل سے پوچھا کہ ایں جزیرہ نما چرا است کہ یہ اتنی بڑی ملکہ رہتی کہاں ہے؟ اس وقت انگلینڈ کتنا درخور اعتنا تھا' آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سترہویں صدی تک آپ کے شہر مقدس شہروں کی طرح سمجھے جاتے تھے۔ یورپ میں ان کی داستانیں سنائی جاتی تھیں۔ نیپلز کے بچوں میں اس قسم کے تصورات تھے۔ اس کے مقابلے میں شان الیزے میں اس وقت گھٹنے گھٹنے کیچڑ کھڑا ہوتا' جب ستر ہزار حمام قرطبہ میں صبح و شام جاری ہوتے تھے اور ہر جگہ سٹریٹ لائٹس لگی ہوتی تھیں۔

زیادہ وقت نہیں گذرا۔ ایک سو سال کے وقفے کے بعد بھی اسلام کو کوئی شکست نہیں ہوئی۔ نااہل قیادتوں کی وجہ سے اس پر ادبار ضرور آیا' لیکن وہ اس کے باوجود بہت اچھی طرح لڑتا رہا۔ سوائے موجودہ وقت کے اسلام پر کبھی سخت وقت نہیں آیا۔ اسلام نظریاتی طاقت کی بنیاد پر ہی لڑتا رہا ہے۔ کیونکہ اسلام میں دو اہلیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سائنس کے کبھی خلاف نہیں تھا۔ بلکہ ہر وقت سائنس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا الذین یذکرون اللہ قیماً وقعوداً وعلی جنوبھم و یتفکرون فی خلق السمٰوٰت و الارض بار بار غور و فکر پر آمادہ کرنے والا یہ مذہب سائنس کو نظر انداز تو نہیں کر سکتا۔ حوصلہ افزائی کرتا رہا۔

دوسری طرف اگر آپ نے کبھی پہلا انگریزی کا ناول پڑھا ہو' اس میں اس کی ہیروئن اپنے باپ کو کہتی ہے کہ انگلینڈ اور فرانس کا معاشرہ بڑا جارحانہ معاشرہ ہے۔ اس میں تو ہمیں کوئی پنپنے نہیں دیتا۔ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ جو بھی چار پیسے ہوتے ہیں' چھین لیتے ہیں۔ آؤ مراکش چلے چلیں۔ وہاں کے مسلمان حکمران بڑے نیک' رواداراور عادل ہیں۔ وہاں ہم سے کوئی ہمارا مال نہیں چھین سکتا۔ تب بھی اس وقت مسلم معاشرہ زیادہ روادار اور برداشت کرنے والا معاشرہ تھا۔ یہ بات لین پول نے اپنی کتاب میں لکھی ہے کہ فتح کے عالم میں جتنا روادار صلاح الدین محمد ایوبی نکلا' تاریخ عالم میں کوئی ایسا

Marfat.com

بادشاہ نہیں ہے۔ شکست میں وہ بہت اچھی طرح لڑتے' جبکہ فتح میں وہ بڑے ہی روادار بادشاہ تھے۔ انہوں نے جبراً کسی کو مسلمان نہیں کیا۔ تاریخ دنیا میں سب سے بڑی مسلمان حکومت انڈونیشیا میں ایک فوجی نہیں اترا اور وہ آج مسلمانوں کی سب سے سرکردہ ریاست ہے۔

اگر آپ آج دیکھتے ہیں' تو ہمارا میچ بڑا ہی سخت پڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں ہم سے ایک بڑی حماقت ہوئی۔ فتح کا نشہ ایسا چڑھا کہ ہم علم سے بے خبر ہو گئے۔ ہمیں بڑا واضح بحران سلطان سلیمان ذی شان کے بعد نظر آتا ہے۔ وہ ہنگری' بوڈاپسٹ اور یوگوسلاویہ کو روندتا ہوا نکل گیا۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت کی حکمت عملی اور آلات جنگ متقابل قوتوں سے بہت بہتر تھے۔ یورپ کے متحدہ بحری بیڑے کے مقابلے میں سلطان سلیمان ذی شان نے خیرالدین باربروسا کو بحری بیڑہ بنانے کا حکم دیا۔

یہ تاریخ کے حقائق ہیں' جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ امیر خیرالدین باربروسا نے بحیرۂ روم ان کے لیے مکمل طور پر سیل کر دیا تھا۔ بحیرۂ روم میں پرتگال' سپین' انگلینڈ اور فرانس کا کوئی جہاز نصف صدی تک کراس نہیں کر سکتا تھا۔ اٹلی میں خیرالدین باربروسا کے ایک شاگرد نے تین مہینے تک روم پر حکومت کی اور خراج لیتا رہا۔ مگر اس کے پاس فوج ہی نہیں تھی کہ نیچے اترتا اور سسلی کی فتح سب کو معلوم ہے۔ صقلیہ میں تین سو سال تک مسلمان قابض رہے۔

اب ہوا یہ کہ فتح کے اس غرور نے مسلمانوں کو علم سے غافل کر دیا۔ علم ایسا گیا کہ ان کے آلات بوسیدہ ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے مقابلے میں احیائے علوم اور تحریک اصلاح مذہب کی وجہ سے اہل یورپ علم کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے۔ یہ قومیں اتنی تیزی سے آگے بڑھیں کہ مسلمان پسماندگی سے دوچار ہونا شروع ہو گئے۔ اہل یورپ کی عقل اور علم میں اضافہ ہوا اور قرطبہ کے پڑھے ہوئے سبق انہوں نے ہم پر استعمال کیے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں دو سو سال تک قرطبہ کے نصاب جاری رہے اور فلاسفی کا باپ جسے ڈیکارٹ کہتے ہیں' حجۃ الاسلام غزالی کے لفظ نقل کرتا ہے اور مانتا نہیں کہاں سے لیے۔ پوری کی پوری مثال "تہافتہ الفلاسفہ" کی نقل کرتا ہے اور مانتا نہیں ہے کہ میں نے غزالی سے لی۔ یہ اتنے بے دید نقل گر ہیں۔

ابھی تک تو تاریخ عالم یہ بتاتی ہے کہ فتح علم کی' علم و دانش کی رہی ہے۔ جس کے پاس عقل و معرفت کے غلبے ہوئے ہیں' وہی حکمران ہوئے ہیں۔ آلاتی فتح کسی کی بھی نہیں ہوئی۔ آج کے دور میں ایک چیز بڑی واضح ہے کہ سب سے بڑا حملہ ہمارے دین پر ہو رہا ہے۔ حربی لحاظ سے نہیں۔ ہمیں اس بات کی پروا نہیں کہ امریکہ مسلمانوں کا قتل عام کر رہا ہے۔ ہم ایک ارب سے زیادہ ہیں۔ وہ سارے ایٹم بم استعمال کر کے بھی مسلمان قوم کو ختم نہیں کر سکتا۔

مگر مسلمان کا ذہنی طور پر مغلوب ہو جانا ایک بدترین بات ہے۔ ہم دو چیزوں سے یورپی ممالک کے مقابلے میں محروم ہوئے۔ ایک تو ہم ترجیحات کے احساس کو بالکل کھو بیٹھے ہیں۔ جہاں اللہ ایک وجود غالب ہمارے مسلمانوں کے دلوں میں تھا' اب وہ ایک ایسے مذہب کا سربراہ ہو گیا ہے' جو بالکل علامتی ہے اور جس کی حیثیت مذہب میں کوئی نہیں ہے۔ علم کی کمی اور اس کا بحران ہے۔ علم تبدیل ہوتا گیا۔ سب سے پہلے مذہبی لوگوں نے دنیاوی اور دینی علوم کو تقسیم کر دیا۔ تبلیغ والے کسی دکان پر جاتے ہیں کہ تم نے دنیا تو بہت کمائی' اب اللہ کی طرف چلو۔ کسی طالب علم کے پاس جاتے ہیں' یار سائنس تو تم پڑھتے رہے' اب اللہ کا علم پڑھو۔ آپ یہ تفریق کیسے قائم اور برقرار رکھے ہوئے ہیں؟ کون سا علم ہے' جو اللہ کا نہیں

Marfat.com

ہے؟ کیا علم ہے، جو خدا کی شناخت کو راہنمائی نہیں کرتا؟ کیا آئن سٹائن کی کائنات کی توسیع کی تھیوری خدا کی طرف راہنمائی نہیں کرتی؟ جب تک میں نے آئن سٹائن کو نہیں پڑھا تھا، مجھے انالموسعون کا لفظ ہی سمجھ نہیں آ رہا تھا والسمآء بنینھا باییدٍ وانا لموسعون ہم نے آسمانوں کو اپنے زور بازو سے بنایا وانالموسعون اور ہم ان کو وسیع تر کر رہے ہیں۔ آپ کو آئن سٹائن کے سوا کون اس آیت کا مطلب سمجھا سکتا ہے؟ وہ علم سے ناآگہی، علم کی تقسیم، شناخت کی تقسیم اور حصول علم میں سست ہونا کسی مسلمان کی فکرمندی نہیں۔ میں نے یورپ میں اور ادھر بھی دیکھا کہ خدا کی شناخت مسلمان کے پیش نظر نہیں۔ یہ سب زندگی کی سہولتوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

جب رسم ورواج خداوند جاہلوں کے ہاتھوں میں آئے گا، تو وہ اسی قسم کی باتیں کریں گے۔ خدا نے تو ایسا نہیں کیا تھا۔ کسی نے خدا کے رسولؐ سے کہا کہ ہم تو صرف دنیا مانگیں گے۔ کسی نے کہا کہ ہم صرف آخرت مانگیں گے۔ اللہ نے کہا تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو ربنا اتنافی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذا ب النار اس میں کچھ آپ کا بھی قصور ہے۔ آپ کا بہت بڑا قصور ہے کہ آپ نے عالم و بالغ ہونے کے باوجود قرآن وحدیث کو ان پڑھ کے حوالے کر دیا۔ یہ آپ کا اور میرا قصور ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا قصور ہے۔ جو شخص میٹرک نہیں پاس کر سکا اور جس کے باپ نے اسے روٹی کھلانے کا واحد ذریعہ یہ سمجھا کہ اس کو حفظ کرا دیا جائے۔ آپ لوگ اپنی شناخت اور اپنے اعلیٰ ظرف تعقل کو تمام تر دنیا کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

آپ نے قطعاً قرآن، حدیث یا تفسیر کو وقت نہیں دیا۔ کوئی براہ راست مطالعہ ہے نہ کوئی وژن ہے۔ آپ کی مجبوری اب یہ ہوگی ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی رسم کرانے کے لیے اس جاہل کا حوالہ دیتے ہیں۔ اس نے آپ کو کیا دینا ہے؟ یہ آپ کی ذمہ داری تھی، جس کو آپ نے نظرانداز کیا۔ اس کو پتہ ہے کہ علم والا کون ہے، کون نہیں ہے۔ اگر آپ پڑھ لکھ کر کوئی بات کریں گے، تو اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ آپ کی تردید کر سکے۔ جب تک آپ خود نہیں پڑھتے، اس کی عمل داری اور سیادت قائم ہے۔ جب آپ خود پڑھیں گے اور اپنے بچوں کو خود علم دیں گے، تلقین کریں گے، تو اسلام میں کوئی چرچ نہیں اور ہمیں کسی چرچ کی ضرورت بھی نہیں۔ کیا دنیا میں اسماء الرجال سے بڑا علم کہیں موجود ہے؟

دس لاکھ انسانوں کے شجرۂ نسب اور ان کی تعلیمی غرض وغایت صرف اور صرف اسلام میں ہے۔ یہ ایک سلسلۂ تحقیق موجود ہے، کیونکہ وہ لوگ بڑے سادہ سے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹیاں نہیں قائم کیں۔ تعلیم وجستجو اور ایک حدیث کی اصلاح کے لیے وہ ہزاروں دن کے سفر کرتے تھے۔ تین تین ہزار میل کا سفر امام بخاری نے کیا ہے۔ آج بھی آپ دیکھ لیں کہ جو ذہانت ابوحنیفہ کی موجود ہے، موجودہ قانون دان میں وہ موجود نہیں ہے۔ وہ تعقل میں کسی سے کم نہیں تھے۔ ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ آپ کا ایک چھوٹا سا سائنسدان آپ کو اسی رستے پر ڈال دیتا ہے، جس پر دنیا کا کوئی ترقی یافتہ ملک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دماغ کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

خدا کا قانون اور مسلمان

یہ قرآن کی اس آیت کی تفسیر ہے کہ ومکروا ومکر الله والله خیر المکرین خدا آپ مسلمانوں سے

Marfat.com

کہیں زیادہ ہوشیار ہے۔ آپ اس سے مکر رہے ہیں۔ آپ کی ترجیحات کچھ اور ہیں۔ آپ اسے ایک ایسی حیثیت دیتے ہیں' جس میں آپ تمام دنیاوی طریقے پورے کرتے ہیں۔ پوری کوشش کرتے ہیں۔ جب کوئی اور طریقہ پورا نہ ہوا' ذہن میں آیا کہ ایک اللہ ہے' اس کو بھی آزما لو۔ ہم نے اسے بھی آزما لیا۔ کام ہو گیا' تو کہا' حیرت ہے' اللہ تو ہے۔ اگر کامیابی نہ ہوئی' تو کہا' اللہ وی دیکھ لیا۔

پروردگار عالم آپ کے مکر و فریب کو اچھی طرح جانتا ہے اور اس کو اچھی طرح علم ہے کہ میں اس وقت مسلمانوں میں ترجیح اوّل نہیں۔ خدا کا قانون تھرڈ ڈگری پر پڑا ہوا ہے۔ مسلمان کی کمٹمنٹ قطعاً خدا کے ساتھ نہیں ہے۔ اگر آپ نے اللہ کو محض کسی ادارے کے رسمی سربراہ کے طور پر جانا ہے' تو انی اعلم ماتبدون و ما تکتمون اس کو آپ دھوکہ نہیں دے سکتے۔ آپ اس کے ساتھ مکر و دغا کرتے ہیں' تو وہ آپ کے ساتھ مکر و ذلت کر جاتا ہے۔ اس میں ہمارا قصور ہے' اللہ کا کوئی قصور نہیں۔ جس دن' ایک صاف ستھری کمٹمنٹ کے ساتھ مسلمان خدا کو پلٹے گا' اس دن دنیا کی کوئی طاقت مسلمان کو ذلت و رسوائی سے آشنا نہیں کر سکتی۔

اپنے آپ سے دُوری

کیا میں ان حالات سے مطمئن ہوں؟ خدا جانتا ہے کہ میں مطمئن نہیں ہوں۔ مسلمان کی توہین پر میں مطمئن نہیں ہوں۔ مسلمانوں کے زوال پر سخت مطمئن ہوں۔ ان کو جو مار پڑ رہی ہے' اس سے میرا دل باغ باغ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ حالات اور واقعات نہ ہوں' تو رسولؐ اللہ کا وعدۂ مبارک ہم تک نہیں پہنچے گا۔ اگر ہم اس قسم کے حالات' عصر دجال' ذلت و رسوائی اسلام اور مسلمانوں کی دولت دنیا کے سراب سے نہ گزریں' تو ہم تک وہ وعدۂ مبارک نہیں پہنچتا' جو رسولؐ اللہ نے ہمیں عطا فرمایا اور وہ وعدہ یہ ہے کہ میری اُمت رومیوں سے جنگ لڑے گی اور ان پر غالب آئے گی۔ ایرانیوں سے جنگ لڑے گی اور ان پر غالب آئے گی۔ میری اُمت ڈھال والے چہروں سے جنگ کرے گی اور ان پر غالب آئے گی اور زمانۂ آخر میں میری اُمت دجال سے جنگ کرے گی اور اس پر غالب آئے گی۔ تو مجھے آخر سے دلچسپی ہے۔ مجھے حالات کے بہاؤ سے دلچسپی نہیں ہے۔

اگر آپ چاہتے ہوں کہ رواں صورتحال مختصر ہو جائے۔ ذلت و رسوائی مسلمان کم ہو جائے' تو پھر عادات مسلمان اپنا لیجیے۔ آپ کو کون مسلمان کہے گا؟ ذرا ارد گرد اپنی عادات دیکھ لیجیے۔ یہ تو اللہ کے دوستانہ طریقے ہیں۔ دو ادھر سے دو اُدھر سے مار پیٹ کر کے آپ کو سمجھانا چاہتا ہے۔ واپس لانا چاہتا ہے۔ کعبہ اور حقیقت کعبہ کو موڑنا چاہتا ہے۔ محمد رسولؐ اللہ کی طرف پلٹانا چاہتا ہے۔ آپ پلٹتے ہی نہیں ہیں۔ اللہ نے کہا ہے' تم نہیں پلٹو گے' میں نہیں پلٹوں گا۔ تم لوٹ آؤ گے' میں لوٹ آؤں گا۔ قرآن تو آپ نے بھی پڑھا ہے۔ لوٹو گے' تو لوٹے گا اور تم وہ لوگ نہیں ہو' جو آرام سے لوٹ پڑو۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہم وہ لوگ نہیں ہیں' جو آرام سے لوٹ پڑیں۔ ہم تو اللہ کو سمجھتے ہی کچھ نہیں ہیں۔ جھوٹ بولنے میں' خیانت میں' بددیانتی میں' زمین کے غصب کرنے میں نہ حرام کھانے میں اللہ ہے۔ اللہ تو کھڑا ہی کہیں نہیں۔ پھر آپ کیا سمجھتے ہیں' اس ایمان کو لے کے ان سچے کافروں سے جنگ کرو گے؟

Marfat.com

کافر تو ہر چیز میں سچا ہے۔ کافر اپنے حقائق میں' آلات جنگ میں سچا ہے۔ اپنی تیاری میں اور حکومت میں سچا ہے۔ آپ امریکہ اور برطانیہ کی حکومت دیکھ لیں۔ ٹھیک ہے' ان کے باپ دادا کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ ان میں شادیاں کوئی نہیں کرتا۔ وہ اسے گناہ نہیں سمجھتے' گناہ اس کو آپ سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے سسٹم میں سچے ہیں۔ اپنے سسٹم کی حفاظت کرتے ہیں۔ ٹیکس چوری نہیں کرتے۔ غریب کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے حقائق کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ حملہ آور ہونے سے پہلے ایک ایک تفصیل جمع کرتے ہیں۔ وہ حقائق کے علوم کے ماہرین ہیں۔

آپ کے پاس کیا ہے؟ مسلمان ہونا؟ یہ نام کی مسلمانی آپ کو اتنا طنطنہ دے رہی ہے کہ آپ خدا سے بار بار فتح کی آرزو کرتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ اصلی بن جائیں گے' تو کیا ہوگا؟ ابھی نام کے مسلمان ہیں اور ہمارا یہ طنطنہ ہے کہ روز مسلمان خدا سے گلہ کرتا ہے' کیا ہم اُمت رسولؐ اللہ نہیں ہیں؟ ہمیں کیوں مار پڑ رہی ہے؟ ہم کیا مسلمان نہیں ہیں؟ تو کافر کو کیوں فتح دے رہا ہے؟ تھوڑا سا گریبان میں جھانکنے کی بات ہے۔ تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ گناہ رکھو' جیسے ہیں۔ خطار ہیں۔ خطا کار کی توجہ اللہ کو بڑی عزیز ہے۔ ایک ہی کام پکڑ لو۔ رسم و رواج میں سے ہی خرابی دُور کر دیں۔ صرف اللہ کے لیے اور کسی دن اللہ کے لیے ایک لقمہ چھوڑ دیں۔ اللہ تیرے لیے آج ایک لقمہ چھوڑ رہا ہوں۔ کسی کو ایک لقمہ کھلا دیں۔ اللہ تیرے لیے ایک لقمہ کھلا رہا ہوں۔ کچھ عادات' کچھ عادات کا سوال محض اور محض خدا کے لیے کر دیں۔

ہر چیز اصل کو پلٹتی ہے اور مسلمان ابھی اصل کو نہیں پلٹ رہا۔ اقبالؒ ایک شعر میں کہہ گیا تھا کہ مسلمان بڑی عظیم قوم ہے۔ اس کی مثال ان پرندوں کی طرح ہے' جو روز دانا دنکا چگنے کے لیے دُور صحراؤں میں نکل جاتے ہیں۔ جب شام پڑی۔ عمر گریزاں ہوئی۔ خوف و خطر سے سامنا ہوا۔ شکاری جال لیے کھڑے نظر آئے اور یہ واپس پلٹے اپنے گھونسلوں کی تلاش میں۔ پھر پلٹے مدینہ اور مکہ کی تلاش میں۔ فرمایا کہ مسلمانوں کا عالم پلٹنے کا یہ ہے ؎

چو آں مرغے کہ صحرا ہر شام
کشائد پردۂ فکر آشیانہ

اس پرندے کی طرح جو شام کو اپنے آشیانے کی فکر کرتا ہے' پلٹتا ہے۔ ابھی میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلمان اپنے آشیانے کی فکر نہیں کر رہا۔ بلکہ حال یہ ہے کہ ہمارے حکمران اپنے آشیانے دیارِ غیر میں بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس اُمت کو کیا اللہ میاں کی طرف پلٹنا ہے ہی نہیں؟

ان کے دو تعلیمی نظام ہیں۔ انگریزی طرزِ تعلیم میں ان کو پتہ نہیں کیا کیا انگریزی داستانیں اور قصے سنائے جاتے ہیں۔ ان کی تو ٹیوننگ ہی اور ہو گئی ہوتی ہے۔ ان کے مسائل مختلف ہو جاتے ہیں۔ وہ انگریزی بولتے ہوئے کہاں پنجابیوں اور پوٹھواریوں میں آملتے ہیں۔ ان میں شروع سے ہی احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں سسٹم آپس میں مل ہی نہیں سکتے۔ یہ سسٹم کام نہیں کر سکتے۔ ان کے ہاں کمٹمنٹ ہی ایک ہے کہ پڑھو لکھو' باہر جاؤ۔ کوئی ماں باپ ایسے نہیں ہیں' جو بچوں کو اس لیے یورپی سکولوں میں نہ پڑھاتے ہوں کہ پڑھیں گے۔ لکھیں گے۔ بڑی اچھی تعلیم حاصل کریں گے۔ ان شاء اللہ او لیول' اے لیول کرنے کے بعد اپنے ماں باپ کے ملک پہنچ جائیں گے۔ کوئی امریکہ چلا جائے گا۔ کوئی انگلینڈ چلا جائے گا۔ اللہ اللہ خیر سلا!

Marfat.com

میں اداروں پر تنقید نہیں کر رہا۔ میں آپ کو سادہ سی بات بتا رہا ہوں کہ یہ ادارے آپ کو کوئی کمٹمنٹ نہیں دیتے۔ خدا کی نہ رسولؐ کی نہ بنیادی انسان ہونے کی۔ ان کے معیار اور ان کی کمٹمنٹس ساری درآمد شدہ ہیں۔ وہ آپ کی نہیں ہیں۔ آپ کا اور ان کا کلچر اور ہے۔ آپ کے دو مبادیات ہیں' جو اس طریقۂ تعلیم میں موجود نہیں ہیں۔ آپ کا اور تمام مسلمانوں کا پہلا اور آخری عقیدہ خدائے واحد پر یقین ہے اور دوسرا بنیادی عقیدہ رسول اللہؐ سے اپنی جان سے زیادہ محبت ہے۔

آپ کے بدن سے روح محمدؐ نکالی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف غبی' کودن' ان پڑھ مُلّائی نظام کا نمائندہ ہے' جس نے ان پڑھ رہنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ جس نے جہالت سے عہد استوار باندھا ہے۔ اس کا نکاح ہی حماقت کے ساتھ ہے اور دوسری طرف پڑھا لکھا کہ جو کسی حال میں بھی آپ کا یہ سسٹم قبول نہیں کر سکتا۔ یہ مغائرت' یہ جدائی اور فتنہ و فساد اس ملک کے نظامِ تعلیم میں ہے اور یہ جب تک نہ سنورے گا۔ جب تک اس میں بہتر خیال' بہتر دلیل اور آپ کی کمٹمنٹ کے سبق نہ آئیں گے' اس نظامِ تعلیم میں کوئی خلا پر نہیں ہوگا۔ کوئی ایوبی پیدا نہیں ہوگا۔ اس میں وہی لوگ پیدا ہوں گے' جو کتوں کے منہ چاٹیں گے۔ بوتلوں کے ڈھکن اتار دیں گے اور نشوں میں قوموں کے فیصلے کریں گے۔

نظاموں میں فرق

سعودیہ میں بھی بنیادی طور پر مذہب کی قبائلی تعبیر ہے۔ جب ان کے مفاد اور قبائلی اغراض و مقاصد آ جاتے ہیں' تو وہ اس وقت مذہبی انصاف کو بے دریغ نظرانداز کر دیتے ہیں۔ مگر افغانستان میں مذہب ایک طرح سعودیہ ہی کا پرتو تھا۔ سعودیہ ہی کے زیرِ اثر ایک نیا تصورِ مذہب پروان چڑھ رہا تھا۔ سعودیہ میں پہلی دفعہ جو مذہبی موقف اختیار کیا گیا' اس میں محمد بن عبدالوہاب النجدی کی تحریک شامل تھی۔ اس کی نسبت اب وہاں زیادہ معقول رویے ہیں۔ مگر اب بھی ان کی سوچ کا بڑا اٹھاٹ اور پراسیس وہی ہے' جو آج سے پہلی حکومت کے وقت سعودی گورنمنٹ نے لیا تھا۔

ہمیں سعودی مذہب کے تصور کا دفاع کرتے ہوئے اب بھی مشکل محسوس ہوتی ہے۔ وہ بے پناہ وسائل کے مالک رہے ہیں۔ وہاں سے کوئی ایسا خصوصی انس باقی مسلم اُمہ کے لیے نہیں اٹھا۔ بلکہ بعض اوقات یہ ہوا کہ دانستہ امریکہ کے کہنے پر انہوں نے پاکستان کے ساتھ اپنے تعلقات توڑے۔ ہمارے لوگوں کو بھی وہاں سے نکالا۔ غور کریں کہ ایک حقارت کی نظر ان کی باقی مسلمانوں پر ہے' جو ان سے مدد کے طلب گار رہتے ہیں۔ ان کا خلوص بھی کوئی ایسا نہیں نظر آتا کہ وہ اسلامی خلوص ہو۔ البتہ ایک قبیلہ ہے' جو حکمرانی کر رہا ہے۔ جس کی سہولت اسلام میں ہے۔

دہشت گرد بنیاد پرست

مغرب کو سب سے بڑا خوف مسلمانوں سے یہ ہے کہ ان کی رواں بقا' دواں کلچر اور ترقی کا عظیم سلسلہ مسلمانوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ سب سے زیادہ بنیاد پرستانہ رویہ ہمیں یورپ میں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یورپ کے نظام کا ایک عنصر جمہوریت ہے۔ مگر جمہوریت بھی ایک ایسا نظام ہے' جسے لوگ قبول کریں گے' تو نافذ کریں گے۔ فرض کیجیے'

Marfat.com

پاکستان کے بارہ کروڑ عوام مل کر یہ کہتے ہیں کہ ہمیں جمہوریت نہیں چاہیے۔ ہم اسلام قبول کریں گے۔ یورپ آپ کو اس لیے بنیاد پرست کہے گا کہ آپ کی کیا مجال کہ آپ ہمارے سسٹم کو قبول نہ کریں۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ ضد اور سرکشی زیادہ ان لوگوں کے نظام میں ہے، جو اپنے آپ کو زیادہ مہذب کہتے ہیں۔

پڑھی لکھی ماؤں کے بچے زیادہ خراب ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مائیں اپنے پڑھے لکھے سنس اور تقابلی معیار سے اپنے معصوم بچوں پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈال دیتی ہیں۔ وہ اپنے مؤقف میں اتنی پکی ہو جاتی ہیں کہ اگر بچہ اتنی پراگریس شو نہ کرے، تو وہ قابل فہم طور پر ناراض ہوتی ہیں کہ میں اتنی زیادہ عقلمند اور تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود تم میری بات نہیں سن رہے۔

یہی حال یورپ کے بنیاد پرستوں کا ہے۔ وہ نالائق اس بات پر اڑے ہوتے ہیں کہ یہ نالائق ہماری بات کیوں نہیں مانتے؟ یہ جمہوریت کو کیوں نہیں خدائی نظام سمجھتے؟ وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ جیسے انڈونیشیا یا کسی اور مسلم ملک کا سربراہ واشنگٹن جائے، تو وہ بڑے احترام سے امریکی صدر کو کہے، جناب! آپ تو ہمارے لیے سوغات ہیں۔ خدا کا بڑا کرم ہے کہ آپ پیدا ہوئے۔ آپ امریکہ کے صدر ہوئے۔ آپ نے ہمیں جمہوریت دی۔ ہم اس خوشی میں کہ آپ نے ہمیں جمہوریت دی، اسلام کے نظام کو نیست و نابود کر دیں گے کہ وہ تو بنیاد پرستانہ واہیات نظام ہے۔ اس پر سارے کا سارا یورپ کہ آپ نے ان کی انا کی تسکین کر دی، آپ سے خوش ہو جائے گا۔ اَن پڑھ کی انا اتنی مضبوط نہیں ہوتی، جتنی ایک پڑھے لکھے کی ہوتی ہے۔ تمام یورپ اپنے تمرد، سرکشی اور اپنی انا کا شکار ہے۔ ان کی خواندگی میں رواداری اور ان کی جمہوریت میں کوئی برداشت نہیں۔ اس لیے وہ آپ کو بنیاد پرست کہتے ہیں۔

مگر دوسری طرف ہم لوگ واقعی بنیاد پرست بھی ہیں۔ ہمارے جدید طبقے اور مذہبی افراد میں واضح طور پر اپروچ کا فرق ہے۔ اگر بازار میں جدید اور ایک نئی ایجاد آ گئی ہے، تو عام آدمی کو اس کے خریدنے میں کوئی حجاب نہیں۔ جیسے ڈسک یا ڈش ہے۔ عام آدمی اسے خریدنے میں کوئی تامل نہیں کرے گا۔ اس کے مقابلے میں مذہبی آدمی اسے برا بھلا کہے گا، جھٹلائے گا۔ دس سال اس کی مزاحمت کرے گا اور اس کے بعد اسے قبول کرے گا۔ برصغیر میں اس کی برمحل مثال لاؤڈ سپیکر کی ہے۔

اس قسم کے روّیے کو ہم یقیناً بنیاد پرستانہ روّیہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ علمائے کرام کی شان نہیں تھی۔ جبکہ ہمارے ہاں ایسے ایسے محقق گزرے ہیں، جیسے علامہ ابوریحان البیرونی، جو بارہ سال ہندومت اور جین کے مندر میں رہے اور تاریخ تحقیق ہند لکھی۔ ان مسلم اسکالرز کو دیکھیں کہ انہوں نے کتنا کتنا سفر ایک چھوٹے سے مسئلے کی خاطر کیا۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری نے تین ہزار میل کا سفر کیا۔ وہ سیکھنے کی انتہا، خواہش اور آرزو تھی کہ حضور گرامیؐ نے فرمایا، علم اگر اوج ثریا پر بھی ہوگا، تو ایک عجمی اسے اتارے گا۔ اب یہ حال ہے کہ علم گھر کی دہلیز پر رسوا ہو رہا ہے۔ سسک رہا ہے اور اسے کوئی اٹھا کے گلے سے نہیں لگاتا۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے، تو کچھ یورپین ہمارے بارے میں رائے قائم کرنے میں اتنے غلط بھی نہیں ہیں۔ ہم میں بنیاد پرستانہ روّیہ موجود ہے، اگرچہ وہ ہم سے بڑے بنیاد پرست ہیں۔ وہ انائے علمیہ کے بنیاد پرست اور ہم انائے

Marfat.com

جاہلیہ کے بنیاد پرست ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ہمیشہ دس بیس تیس سال مغربیوں کے مقابلے میں پیچھے ہیں۔ اگر ہمارا رویہ صحیح ہو تو ذہانت اور عقل پر گرفت کے اعتبار سے ہمارا مسلمان کسی حال میں بھی اہل مغرب سے پیچھے نہیں۔

ایک مثال دیتا ہوں کہ وہ لوگ جو جنیٹک میں کراس بریڈ نہیں ہوتے' وہ ان سے ہمیشہ کم تر ہوتے ہیں' جو کراس بریڈ ہوتے ہیں۔ برصغیر کا مائنڈ کراس بریڈ ہے۔ اس میں اعلیٰ ترین نسلوں نے آپس میں مکس کیا ہے۔ بنو حام' بنو سام اور بنو یافث یہاں ہیں۔ عقل و معرفت کے حصول کا اعلیٰ ترین کمبی نیشن اور بہترین دماغ یہاں پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہمارا بنیادی عالم سیکھنے کی بجائے ذہنی پسماندگی کو رجوع کرتا ہے کل شی یرجع الی اصلہ کہ ہر چیز اپنے اصل کو رجوع کرتی ہے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ چونکہ ہماری اصل جہالت ہے' ہمیں اس طرف رجوع کرنا چاہیے۔ حالانکہ ہمارا تعلق اس پیغمبر کے ساتھ ہے' جس نے کہا تھا کہ **طلب العلم ولو کان بالصین** جس نے کہا تھا **اطلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة** حدیث تو یہ کہتی ہے' مگر افغانستان میں طالبان کے دور میں اس کے برعکس لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی۔ خود سوچئے کہ بنیاد پرست کون ہے؟

دہشت گردی اور مسلمان

میرا یقین ہے کہ یہ ملا عبدالرحمٰن کے لوگ ہی ہوں گے۔ جس زمانے میں اس کی تذلیل ہوئی۔ رمزی کو ان کے ٹاورز کے نیچے لے جایا گیا۔ دونوں ٹاور دکھائے اور پھر اسے گالی دیتے ہوئے کہا کہ اے باسٹرڈ دیکھو! تم انہیں تباہ کرنے کے لیے آئے تھے' وہ ابھی تک قائم ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میرے پاس بارود تھوڑا تھا۔ اگلی مرتبہ شاید زیادہ ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت سے لوگوں نے ادھار لیا ہوا تھا۔ اسامہ نے ضرور بندوبست کیا ہوگا۔

دہشت گردی کے حوالے سے ناسٹرڈیمس نے بہت پہلے لکھ دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ سفید پگڑی والا دہشت گرد ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔ اسامہ کو تو وہ پہلے سے بیان کر گیا۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ پگڑی بھی سفید ہی پہنتا ہے۔ ناسٹرڈیمس نے بہت عرصہ پہلے یہ کہا تھا کہ مشرق کا وہ دہشت گرد ہے' جو سفید پگڑی اور عبا پہنے گا۔ مزے کی بات ہے کہ اس نے اس کا نام ہی دہشت گرد رکھا۔ ناسٹرڈیمس نے دونوں ٹاورز کی بھی بات کی۔

دہشت گرد اور مسلمان میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔ ہم ایک قوم' ایک ملت کی طرح زندہ ہیں۔ غلطی سے ایک دفعہ حسین احمد مدنی نے کہا تھا کہ قومیں وطنیت سے بنتی ہیں' دین سے نہیں بنتیں۔ علامہ اقبالؒ کو اتنا شدید غصہ آیا کہ انہوں نے تین شعروں کی ایک غزل لکھی اور آخر میں کہا ۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
گر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

کہ مسلمان ہو اور مصطفیٰؐ تک نہ پہنچے!

تو وہ جو عہد ہے' اس کے تمام معاملات میں مسلمانوں کی دو مبادیات ہیں۔ ایک مبادی تو ان کے پاس ہے' دوسری نہیں ہے۔ پوری دنیا کی مطبوعات دیکھ لیں کہ ایک مبادی تو تمام مسلمانوں میں مشترک ہے کہ وہ ایک خدا میں یقین

Marfat.com

رکھتے ہیں۔مگر جو دوسرا فنڈامنٹل محبت رسولؐ ہے' اس کی جھلک مجھے پاکستان سے باہر نظر نہیں آتی۔ یہ کتنا ضروری ہے کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ فاروق سے پوچھا' مجھ سے تمہیں کتنی محبت ہے؟ بخاری و مسلم کی حدیث ہے۔فرمایا' یارسولؐ اللہ! آپ میری جان سے کم ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔فرمایا' عمرؓ ایمان مکمل نہیں ہوتا۔جب تک میں مسلمان کو اس کی جان سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔فرمایا' یارسولؐ اللہ! آج کے بعد آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔

یہ دوسرا فنڈامنٹل صرف اس جگہ موجود ہے۔ جب میں باہر کے ماحول میں دوسرے اداروں کو دیکھتا ہوں' تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر پیغمبرؐ کی شان گھٹا کر پیش کر رہے ہیں۔ہم الحمدللہ ہر دو مبادیات پر پورا اترتے ہیں۔اس میں مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ چاہے زمانہ ادھر یا اُدھر کا ہو' برصغیر کے مسلمانوں کی فتح یابی کے بارے میں حدیث رسولؐ ضرور پوری ہوگی۔

Marfat.com

اسامہ اور خودکش حملے

اگر آپ اسامہ کے اثرات دیکھیں‘ تو اس کے بدترین اثرات قریباً تمام مسلمان ملکوں پر پڑے ہیں۔ یہ بن لادن کی بات نہیں۔کوئی بھی شخص ایسے اقدامات کرے‘ جس سے جملہ مسلمین اور مومنین پر آفت آ جائے‘ تو اس کو کم از کم اسلام اپنا ہیرو نہیں سمجھتا۔صرف افغانستان‘ پاکستان‘ عراق ہی نہیں‘ جہاں جہاں بھی اس شخص کے اثرات گئے ہیں‘ مسلمان جو کام آسانی سے کر رہے تھے‘ یا جو تھوڑا سا وقت مسلمان ملکوں کو چاہیے تھا اپنی تیاریوں کے لیے‘ وہ ایک دم سے منجمد ہو گیا ہے۔ہم مغرب کی کڑی نگرانی میں آ گئے ہیں۔ایک امن سے جو کام ہم نے کرنا تھا‘ جسے ہو سکتا ہے‘ آپ اسے کریڈٹ دیں کہ اب وہی کام ہم ایمرجنسی میں کریں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس میں رئیسیت اور مال و دولت کی جو صفات بیان کی جاتی ہیں‘ ہو سکتا ہے‘ وہ کسی مسلمان ملک کے کسی ایسے سربراہ کے پاس آتا کہ تم سربراہ مملکت اسلامیہ ہو۔میں تمہاری مدد کر دیتا ہوں کہ تم اس قابل ہو جاؤ‘ کوئی بڑی چیز بنالو۔میں نہیں سمجھتا کہ اسامہ بن لادن کی انفرادی وجاہت نے کسی بھی مسلمان ملک کو کوئی فائدہ پہنچایا ہے۔ویسے بھی اسلام کا یہ قاعدہ نہیں ہے۔اسلام کا القاعدہ نہیں ہے‘ بلکہ اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ انقلاب پر یقین ہی نہیں رکھتا۔اسلام ایک ارتقائی عمل کا نام ہے۔اصحابِ رسولؐ کو تیار کرنے میں اور ایک حکومت دنیا سنبھالنے میں بائیس برس لگے ہیں۔

اب فرض کیجیے‘ میرے گلی کوچوں سے ہزاروں آدمی نکلتے ہیں۔ان کو دین کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔صرف ایک جہاد کی بنیاد کے عنوان پر انہیں استعمال کیا جا رہا ہے۔مگر جہاد کیا ہے؟ رسولؐ نے فرمایا‘ جب سے میری اُمت میں جہاد شروع ہوا ہے۔جب تک کہ میری اُمت کا ایک فرد یا گروہ دجال سے نہ لڑے گا اور فتح یاب نہ ہو گا۔جب تک ظالم کا ظلم میری اُمت کا وہ فرد یا گروہ ختم نہ کرے گا اور جب تک انصاف نہ کرنے والوں کو انصاف پر آمادہ نہ کرے گا‘ یہ قیامت تک جاری رہے گا۔یہ حضورؐ کی حدیث جہاد کے متعلق ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ایک فتویٰ ہے کہ ہر وہ کوشش‘ جو اسلام یا اُمت مسلمہ کو خطرے میں ڈال دے‘ حرام

ہے۔ خودکش حملے اسلامی نہیں ہیں۔ مگر ان کی وجوہ بجا ہیں۔ یہ مذہب کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتیں۔ تذلیل، نفرت و رسوائی اور اس استحصال کے تحت خودکش حملے ہو رہے ہیں، اسلام کے تحت نہیں ہو رہے۔ اسلام کسی دوسرے فاسق کو مانتا ہے نہ اپنے فاسق کو مانتا ہے۔ اس لیے اس قسم کی کوئی خودکشی اسلام کے ضمن میں نہیں آتی۔ مگر جب آپ ایک آدمی کو مارتے ہی جاؤ گے، تو زمانہ آئے گا، رسولؐ نے فرمایا، قاتل و مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ پوچھا گیا، یارسولؐ اللہ! مقتول کیوں؟ فرمایا، اس کے بس میں ہوتا، تو وہ بھی اسے مار دیتا۔

اب برصغیر میں سارا مسئلہ ٹینشن کا پڑا ہوا ہے۔ کسی ایک خودکش حملے کی وجہ سے ہے۔ اس قسم کے مسلمانوں کی کون تعریف کرے گا کہ خود تو اس نے مرنا ہی تھا، پیچھے پوری کی پوری قوم کو لے ڈوبے گا۔ اگر اس ایک حملے کی وجہ سے ایٹمی جنگ برصغیر میں چھڑ جائے اور ڈھائی کروڑ بندے مر جائیں، تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ سربیا کے ایک شہزادے کے قتل کے باعث دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور ہٹلر نے اس کا بہانہ بنا کر اتنی طویل جنگ چھیڑ دی۔

چنانچہ میرا خیال نہیں کہ اس کی سفارش کی جانی چاہیے۔ قومیں قوموں سے لڑتی ہیں اور ملتیں ملتوں سے لڑتی ہیں۔ ہم بھی لڑیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ العزیز۔ ہمارے پاس بھی نبی اکرمؐ کے پیغامات موجود ہیں۔ مگر اس قسم کے لوگ ہماری ملت کی آگہی اور ترقی کو گھٹا رہے ہیں، بڑھا نہیں رہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہر آدمی خوفزدہ ہے۔ ہر شخص کی عزت نفس کو مجروح کیا جا رہا ہے۔ ہم میں سے ہر آدمی عدم تحفظ اور شک و شبہ کے احساس میں مبتلا ہے اور یہ صرف ان لوگوں کی وجہ سے ہو رہا ہے، جن کو مذہبی اور اخلاقی طور پر درست نہیں کہا جا سکتا۔

خودکش حملے، شرعی حیثیت

میرے نزدیک دہشت گرد خودکشی نہیں کرتا۔ دہشت گرد تکنیکی اعتبار سے اذیت پسند ہے، جو دوسرے کو اذیت دے کر اپنی کسی جبلی قتل و غارت کی حس کی تسکین کرتا ہے۔ وہ ایسے نہیں تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے، ایسے نہیں تھے۔ ان میں اذیت پسندی کا وہ عنصر پایا نہیں جاتا۔ مگر بلاشبہ اسلام کے پاس اس قسم کے اقدام سے بھی بہتر رستے ہیں۔ قوم پرستانہ توہین کے مراتب سے گذرتے ہوئے ان لوگوں کو اپنی قومی، ملی یا ذاتی ایسی توہین کا احساس ہوا کہ اس کے ردِعمل میں دشمن کو زک اور رنج دینے میں ہی انہوں نے اپنے توازن کو مناسب سمجھا اور اس میں اس نے اپنی جان دینے سے بھی گریز نہ کیا۔

بہر حال ہمارے پاس کوئی ایسی وجہ نہیں، جس سے ہم انہیں دہشت گرد کہہ سکیں۔ کیونکہ اس واقعہ کی اصل بنیاد وہ بے شمار دہشت گردی کے واقعات ہیں، جو ان کی یادداشت میں، ان کی عزت و زندگی اور ان کے بال بچوں کے ناتے سے ان کی جگہ و مقام میں اتنے ہو چکے تھے کہ جس مرحلے پر آ کر انہوں نے اپنی جان دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ باقی مذہبی حوالے سے ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ میں اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

جہاد کے چند اصول

میں جہاد کا مطلق قائل ہوں۔ ہر لمحۂ زندگی کو جہاد سمجھتا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ ہر سانس جہاد ہے اور ذرا سی انگلی

Marfat.com

ہلانا بھی جہاد ہے۔مگر مصیبت یہ ہے کہ جب ہمیں ایک معروضی حقیقت سے واسطہ پڑتا ہے' تو میں ضرور کہتا ہوں کہ مجھے معجزوں کی توقع ہے۔میں بھی آپ کی طرح خواب دیکھنے والا ہوں۔محبت کے خواب۔کرم' اس کی بے پناہ اعانت اور فتح کے خواب۔

مگر جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ خدا نے اپنے انعام واکرام کے لیے بھی چند اصول بنا رکھے ہیں۔اگر ایک مسلمان قوم ان اصولوں سے روگردانی کرے گی' تو وہ ان پر اہل کفر کو مسلط کر دے گا۔ایسے اہل کفر' جو اہل ایمان نہیں ہیں۔لوٹ مار نہیں کرتے۔آپس میں صلہ رحمی کرتے ہیں۔جو ایک دوسرے کا دُکھ سکھ بٹاتے ہیں' وہ اس مسلمان سے بہتر ہیں۔

جب منگولوں نے بغداد پر چڑھائی کی' تو اس وقت کے صوفی شیخ نجم الدین کبریٰ زندہ تھے۔جب قتل وغارت اور تباہ کاری شروع ہوئی' تو لوگ ان کے پاس گئے اور کہا' شیخ! آپ کی دُعا کیوں نہیں قبول ہوئی؟ آپ امام زمانہ ہیں' ولی دوراں ہیں۔آپ کی دعا کیوں نہیں قبول ہورہی؟ فرمایا' میں نے ملائکہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اے کافرو! مارو ان منافق' مسلمانوں کو۔یعنی ایک منافق مسلمان سے تقسیم کار میں ایک کافر بہتر ہے' جو چند اصولوں کا پابند ہے۔جو کسی دیانت والا ہے۔مگر منافق مسلمان خدا کا ہے نہ گھر کا' دھوبیوں کا ہوسکتا ہے۔

اب اس کی دوسری صورت سورۃ بقرہ میں ہے۔'' خدا کی راہ میں نکلو خواہ ہلکے ہو یا بھاری'' ہلکے اور بھاری کی بات اسلحہ پر آئی ہے۔چاہے آپ کے پاس ایک خنجر ہے۔آپ کے پاس گھوڑا نہیں ہے۔بدر اور اُحد میں ایسی صورتحال پیش آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ہلکے اور بھاری کی تخصیص فرمائی۔بعض مسلمانوں کے پاس چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی صرف تلواریں تھیں۔بعض مسلمانوں کے پاس گھوڑے تھے اور بھاری ہتھیار بھی تھے۔دو آدمیوں کے پاس پوری زرہ بکتر سمیت سارا اسلحہ تھا۔جبکہ باقی تمام مسلمان کسی نہ کسی اسلحہ کی کمی کا شکار تھے۔کسی کے پاس تیر نہیں تھے۔حتیٰ کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس جب تیر ختم ہوگئے' تو انہوں نے لکڑیاں لے لے کر ان کی نوکیں تراشیں اور وہی کافروں کے مارنی شروع کردیں۔سو' ہلکے اور بھاری کا لفظ جو یہاں استعمال ہوا ہے' وہ سوار اور پیدل پر ہے۔

کشمیر اور جہاد

یہ انفرادی شخص پر جہاد کا فتویٰ لگے گا' کون کس نیت سے جہاد کر رہا ہے۔کیونکہ بظاہر کسی بھی جماعت نے وہاں جہاد کا اس طرح اعلان نہیں کیا۔کچھ لوگ قوم پرستانہ طریق سے لڑ رہے ہیں۔کچھ صرف ہندو کی مخالفت یا کچھ لوگ مخصوص فوائد کی وجہ سے لڑ رہے ہیں۔ان میں کوئی گروہ ضرور ہوگا' جو اللہ کی رضا کے لیے بھی لڑ رہا ہے۔اس کا فیصلہ اللہ کے پاس ہے کہ کون مجاہد ہے اور کون نہیں۔

شہید کی اقسام

شہید کی کوئی اقسام نہیں۔ویسے شہادت کی اقسام ہیں۔وہی شہید ہے' جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا شمشیر وسناں کے ساتھ شہید ہوجائے۔البتہ شہادت کا اطلاق اور حیثیتوں پر بھی ہوتا ہے' جو بظاہر جنگ وجدل سے ماورا

Marfat.com

ہوتی ہیں۔ جیسے وہ آدمی' جو جہاد بالنفس کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ میدان قتال میں نہیں مرتے' ان کو بھی شہید کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فقہ میں سات آٹھ قسمیں ایسی آئی ہیں' جیسے کوئی بیماری سے مرا۔ طاعون سے مرا' وغیرہ۔ ان پر بھی شہادت کا اطلاق ہوتا ہے۔ مگر جسے ہم شہید کہتے ہیں' عام طور پر وہی جانا جاتا ہے' جو اللہ کی راہ میں لڑتا ہوا مارا جائے۔

قتال اور صحابہؓ

فیصلہ تو جج نے دینا ہے۔ خلافت راشدہ سے لے کر جو بھی آگے آیا' ان کی نیات خلوص' ان کے معاملات اور ان کی زندگی کے واقعات پر میں تو جج نہیں ہوں۔ مگر آپ تاریخ میں ایک سند بھی نہیں نکال سکتے کہ کسی صحابیؓ نے کسی دوسرے صحابیؓ کو قتل کیا ہو۔ اگر کوئی واقعہ حادثاً ہو گیا ہو' تو میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن دانستہ کسی نے ایسا نہیں کیا۔ جو لوگ حقیقی مسلمان اور مذہبی ہیں' وہ ایسا نہیں کرتے۔ بہت سارے اس وقت کے لوگ اسلام کو گلہ دیتے ہیں کہ وہ آپس میں لڑے تھے۔ یہ بتائیے کہ کتنے لوگ رسولؐ اللہ کے زمانے میں تربیت حاصل کر پائے؟ جب بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے مسلمان ہونا شروع کیا' تو ان میں سے کتنوں کو وقت ملا تھا کہ وہ اسلام کی اقدار سے شناسائی اختیار کرتے؟ وہ صرف زبانی جمع خرچ والے مسلمان تھے۔ ان کی جبلتیں استوار نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے اخلاق و کردار' ابھی اسلام کے سانچے میں نہیں ڈھلے تھے۔ ان لوگوں نے کیا بلند اخلاقی کا مظاہرہ کرنا تھا؟

مگر اصحاب رسولؐ نے ہر دور میں جب تک وہ زندہ رہے' اسی اخلاقِ کریمانہ کا مظاہرہ کیا' جیسے حضورؐ سے انہوں نے سیکھا تھا۔ حتیٰ کہ جنگ کے دو مخالف فریقین جب آپس میں ملتے ہیں۔ اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ اور علی کرم اللہ وجہہ' تو انتہائی احترام سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اجازت لے کر ام المومنین کے ہودج تک جاتے ہیں' جو کہ میدانِ جنگ میں بڑی عجیب بات ہے۔ یہ ساری ان کی خوبیاں تھیں۔ خرابیاں ہم جیسے مسلمانوں کی وجہ سے آئی ہیں۔

Marfat.com

مسلمانانِ برصغیر، نسلِ خاص

دراصل میرے احساس میں یہ ہے کہ یہ ملغوبہ اذہان ہے۔ یہ دنیا کے بہترین اذہان کی آماجگاہ ہے۔ اس میں تاتاریوں کی سفاکی، آریاؤں کی وجاہت طلبی اور عرب بمیرین خون بھی ہے۔ ایسا علاقہ جیسے پاکستان ہے، تحقیق کے مطابق اس میں تمام بڑی اقوام کے جینز موجودہ مغربی جنیٹک آرڈر سے کہیں طاقتور ہیں۔ جیسے تھارو برید ہارس بڑا قیمتی گھوڑا ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ نے علم میں کوئی خاص ترقی نہیں کی، صرف ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے۔ اگر آپ کو ہنری شرڈ نے روشنی کی رفتار کا ایک قانون دیا تھا، یعنی بجلی کا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے، ہم اسے ڈسکوری نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ آلات کی ترقی ہے۔ ایک چیز جیسے لیزر کسی نے دریافت کی۔ اس پر کسی نے بہت کچھ تعمیر کیا۔ اس کو ہم علم نہیں کہیں گے۔

سو ٹیکنالوجی اور بنیادی علم میں بڑا فرق ہے۔ علم کا تو یہ حال ہے کہ ایک وقت تھا، جب آئن سٹائن نے آپ کو $E=MC^2$ دے دیا اور مادے سے توانائی کی تبدیلی کا نظریہ دیا۔ اس کا ایک حصہ تو تھوڑے دنوں میں پورا ہو گیا۔ دوسرا حصہ فیوژن والا آج تک ویسے ہی ہے۔ حالانکہ آئن سٹائن کو گزرے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ علم تو رینگتا ہے۔ ایک ایک اصول خدا کی مرضی سے کسی کے دل و دماغ پر پورا اترتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ مسلمان سائنسدان اور کسی دوسرے سائنسدان میں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہر چیز ویسی کی ویسی رہے اور ہم صحیح کمٹمنٹ والے ہوں۔ ہم اللہ کے بندے ہوں۔ اس سے اپنی آگہی اور جستجو طلب کریں اور یہ چاہیں کہ خدا ہمیں دوسروں سے آگے بڑھائے اور اس کے سوا ہم کسی اور سے یہ طلب نہ کریں، تو ہمارا دماغ بھی ہے اور اللہ کی مدد بھی شامل ہو جائے، تو وہ یہ وعدہ کرتا ہے ولا تھنو کہ تم سستی نہ کرو لا تحزنو غم نہ کرو۔ کیونکہ یہ ڈیپریشن اور احساس کمتری کی سرزمین ہے وانتم الاعلون یقیناً تم کو غالب کروں گا ان کنتم مومنین اگر تم ایمان والے ہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہم قیادت کرنے والے لوگ ہیں۔

حضورؐ نے فرمایا، جب ہندوستان میں مسلمان جہاد سے فارغ ہوں گے، تو شام میں مہدی کا ساتھ دیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں نہ صرف یہاں لڑنا ہے، ہمیں کہیں اور جگہ بھی جا کر جنگ کرنی ہے۔ ہم اللہ کے فضل و کرم سے

Marfat.com

لڑیں گے۔ ہم احمقوں اور اَن پڑھوں کی طرح نہیں لڑیں گے۔ ہم اپنے ذہن سے لڑیں گے۔ جسمانی اعتبار سے ہمارا ان کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ دو یا پانچ کروڑ یورپی ہمارا کیا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ ہم ایک ارب مسلمان ہیں۔ اب اصول بدل گئے ہیں۔ کبھی ایک جنگ تھی' جو پہلے خندقوں کی جنگ ہوا کرتی تھی۔ اس کو رومیل نے متعارف کرایا۔ ایک تیز رفتار جنگ' ٹینکوں والی جنگ اور دشمن کی صفوں سے اس طرف لے جانے کے اصول دیئے' تو وہ تاریخ جنگ میں ایک معرکے کی طرح رہ گئے۔

اس کے بعد آئزن ہاور جیسے لوگ آئے' جنہوں نے میٹریل کی جنگ دی۔ بدقسمتی سے آپ اسامہ بن لادن کو ایک کریڈٹ دے سکتے ہیں کہ انہوں نے میٹریل کی جنگ میں انسانوں کی جنگ کو متعارف کروایا۔ اتنے بڑے بڑے ان کے کمپلیکس کھڑے ہیں اور ایک آدمی بم باندھ کر چلا جائے اور وہ انہیں اڑا دیتا ہے۔ یہ ایک بات اس کی وجہ سے ضرور ہوئی ہے۔ لیکن میں جو صاف ستھری جنگ اللہ کی مدد سے میدان میں جیتنا چاہتا ہوں' اسے میں اس قسم کے بم دھماکوں میں کیوں ڈھونڈوں۔ میں ان کے ذہن در ذہن اور دل در دل جنگ چاہتا ہوں۔ میں ایسی جنگ کیوں کروں' جس میں کروڑوں مسلمان ذلت اور رسوائی کی چادر میں سمٹ جائیں۔ ابھی ہم اس قابل نہیں ہوئے۔ ان کے ایک عمل کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑ رہی ہے۔

سب سے پہلے پاکستان

یہ سیکولر طرز فکر ہے۔ ہم مسلمانوں میں کوئی دوسرا نظریہ موثر اس لیے نہیں ہو سکتا کہ بنیادی کمٹمنٹ جب آ نہیں کی جاتی' تو کوئی دوسری کمٹمنٹ اتنی قابل لحاظ نہیں رہتی۔ ہم معاشرے میں اگر دیکھیں' تو جو غیر اقوام ہم میں بستی ہیں۔ مثلاً سکھ' ہندو' عیسائی وغیرہ' انہیں میں اپنے لوگوں سے زیادہ کام میں دیانتدار پاتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کی جوابدہی بنیادی طور پر اللہ کے ساتھ نہیں ہے۔ جب اللہ کے سامنے جوابدہی نہیں ہے' تو پھر ہم کسی کے سامنے بھی جوابدہ نہیں ہیں۔ میں نے آج تک وہ ذہن' اچھا ذہن نہیں دیکھا' جو زمین کے ساتھ وابستہ ہو جائے یا درخت کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ ہمیں وابستگی کے لیے نظریہ چاہیے اور وہ نظریہ ہمارے پیش نظر کم از کم اس وقت اسلام نہیں ہے۔

پاکستان' آئندہ ہدف

نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ! پاکستان پر تحفظ اور امریکہ کی آنکھوں پر اندھے پن کی چادر ہے۔ یہ نہیں ہوگا۔ پاکستان اس لحاظ سے بڑا عجیب و غریب ملک ہے کہ جب بھی کسی تباہی کے بالکل کنارے پہنچتا ہے' تو اللہ تعالیٰ کوئی عجیب و غریب بین الاقوامی صورتحال پیدا کر دیتا ہے اور پاکستان پھر سنور جاتا ہے' سنبھل جاتا ہے۔

Marfat.com

مجموعہ
پروفیسر احمد رفیق اختر
گشتِ زرِبار، پسِ حجاب، بست و کشاد، اُٹھتے ہیں حجاب آخر

Marfat.com